جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ
کہئے: پس حجت پوری اللہ کی رہی

رَحمَةُ اللّٰهِ الوَاسِعَة

شرح

حُجّةُ اللّٰهِ البَالِغَة

جلد اوّل

تصنیف

امامِ اکبر، مجددِ ملت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ

(۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ — ۱۷۰۳-۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

استاذ دار العلوم دیوبند

زمزم پبلشرز

جدید نظرثانی شدہ ایڈیشن

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ

کہیے: پس حجت پوری اللہ کی رہی

رَحْمَةُ اللّٰهِ الْوَاسِعَة

شرح

حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَة

جلدِ اوّل

تصنیف

امامِ اکبر، مجددِ ملت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ — ۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

اُستاذ دارالعلوم دیوبند

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اُردو بازار کراچی



کتاب کا نام ـــــــ رحمۃ اللہ الواسعۃ (جلد اول)

(جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

تاریخ اشاعت ـــــــ جنوری ۲۰۰۵ء

باہتمام ـــــــ احباب زمزم پبلشرز

کمپوزنگ ـــــــ فاروق اعظم کمپوزرز کراچی

سرورق ـــــــ لومیز گرافکس

مطبع ـــــــ

ناشر ـــــــ زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com



ملنے کے دیگر پتے

- دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ، بالمقابل آرام باغ کراچی
- صدیقی ٹرسٹ، لسبیلہ چوک کراچی۔
- مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

ـــــــ ساؤتھ افریقہ میں ـــــــ

Madrasah Arabia Islamia.
P.O.Box 9786
Azaad Ville 1750
South Africa.
Tel: (011) 413 - 2786

ـــــــ انگلینڈ میں ـــــــ

AL Farooq International Ltd.
1 Atkinson Street,
Leicester, LE5 3QA
Tel: (0116) 2537640

دیباچہ طبع جدید

رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول، صفحہ ۳۲ پر یہ بات عرض کی گئی ہے کہ اس جلد کا اکثر حصہ (تاختم مبحث رابع) درسی تقریر ہے، جس پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ باقاعدہ تصنیف نہیں۔ اور نظر ثانی خواہ کتنے ہی اہتمام سے کی جائے، اس میں تصنیف کی شان پیدا نہیں ہوسکتی۔ کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ اتفاق سے کناڈا کے شہر ٹورنٹو کے مضافات میں ''مس آغا'' نامی بستی میں ایک بڑے عالم ہیں۔ جن کا نام حضرت مولانا وصی مظہر صاحب ندوی ہے۔ علوم ولی الٰہی سے اللہ نے آپ کو حظ وافر عطا فرمایا ہے۔ میرے کرم فرما حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی (سابق مہتمم دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، حال مقیم ٹورنٹو) نے رحمۃ اللہ الواسعہ حضرت مولانا کو پہنچائی۔ مولانا نے دیدہ ریزی سے اس کا مطالعہ کیا۔ اور بعض جگہ استدراک اور بعض جگہ تعبیرات بدلیں۔ جب جلد اول دوبارہ طبع ہوئی تو یہ تصویبات کتاب کے آخر میں درج کردی گئیں۔ پھر حسن اتفاق سے کراچی (پاکستان) کے جناب مولانا محمد رفیق صاحب زید مجدہم مالک زمزم پبلشر نے رحمۃ اللہ الواسعہ کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی رقم خرچ کی تو میں نے جلد اول پر نظر ثانی کی۔ اور وہ تمام تصویبات وتعدیلات کتاب میں شامل کردیں۔ اب ان شاء اللہ یہ کام مکمل ہے۔ پاکستان میں اس کی اشاعت کے جملہ حقوق مولانا محمد رفیق صاحب مالک زمزم پبلشر کراچی کے لئے محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے کاروبار میں برکت فرمائیں، اور اس کتاب سے اور ان کی دیگر مطبوعات سے امت کو فیضیاب فرمائیں (آمین)

جلد اول کے آخر میں آٹھ صفحات الگ تھے، اس لئے آٹھ صفحات کا اضافہ کیا گیا، تاکہ جوڑے کی پلیٹ بن جائے۔ اور بائنڈنگ مضبوط ہو۔ شارح کے احوال: جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے اپنی کتاب'' **الخير الكثير في شرح الفوز الكبير** '' میں تفصیل سے لکھے تھے، اسی سے اختصار کرکے شامل کتاب کئے گئے ہیں۔ ان شاء اللہ قارئین کرام کے لئے وہ مفید ثابت ہونگے۔

علاوہ ازیں: جب یہ شرح مکمل ہوئی، تو دارالعلوم دیوبند کے موقر مجلس شوری نے اس کی تحسین کی اور اس سلسلہ میں ایک تجویز پاس کی جس کا عکس آئندہ صفحہ پر دیا گیا ہے۔ شارح کے لئے یہ بہت بڑی قدر افزائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان اکابر کو اس ذرہ نوازی کا بہترین صلہ عطا فرمائیں (آمین)

کتبہٗ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۲۵ رصفر ۱۴۲۵ ہجری

Ph (01336)222429
Fax (01336)222768



الجامعۃ الاسلامیۃ دار العلوم - دیوبند (الھند)

Darul-Uloom, Deoband. U. P. India

الرقم   التاریخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجلسِ شوری منعقدہ ۱۳، ۱۴؍ ۱۵؍ صفر ۱۴۲۵ھ کی منظور شدہ تجویز کا متن ارسال خدمت ہے۔

تجویز ۵ باجازت صدر:

دار العلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدکم نے مسند الہند حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کی تشریح وتوضیح بنام ''رحمۃ اللہ الواسعہ'' کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے: مجلس شوری مولانا موصوف کو اس عظیم علمی خدمت پر مبارک باد پیش کرتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس شجرِ طوبیٰ کے اصل اصیل ہیں جس کے برگ وبار اکابر دیوبند اور منتسبین دار العلوم دیوبند ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی اس عدیم المثال تصنیف کی عظمت کا اعتراف کرنے کے باوجود اس سے استفادہ علماء کرام کے لئے بھی سہل نہیں تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ اور پوری جماعت کی طرف سے شکریہ وتحسین کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائیں اور ان کے ذریعہ دار العلوم اور پوری امت کو فیض یاب فرمائیں۔ آمین۔

(دستخط)

(مرغوب الرحمٰن عفی عنہ)

مہتمم دار العلوم دیوبند

۱۶-۲-۱۴۲۵ھ

پیش لفظ

از مولانا مفتی عبدالرؤف غزنوی صاحب

استاذ حدیث ومدیر مجلہ ''البیّنات'' (عربی)

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی، وسابق استاذ دارالعلوم دیو بند

الحمد للّٰہ و کفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی، اما بعد:

پیش نظر کتاب ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' شرح ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میرے استاذِ محترم، ازہر الہند جامعہ دارالعلوم دیو بند کے استاذِ حدیث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم العالیہ کی مایۂ ناز تصنیف ہے، موصوف کے حالات اسی جلد اول کے اخیر میں ''شارح کے مختصر حالات'' کے عنوان سے بقلم حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری درج کر دیئے گئے ہیں، قارئین کرام ان پر مغز اور مفید حالات کا ضرور مطالعہ فرمائیں، مجھے یہاں پر حضرت الاستاذ مدظلہم العالی کی صرف چند ہی خصوصیات کا تذکرہ کرنا ہے۔

حضرت والا نے ۱۳۸۲ھ میں تقریباً بائیس سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے سالانہ امتحان میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی، اور پھر دارالافتاء دارالعلوم دیو بند میں تکمیل افتاء کے لئے داخلہ لیا، افتاء میں اعلیٰ کامیابی اور فتویٰ نویسی میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند کو خیر باد کہہ کر چند سال تک دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں حدیث و دیگر فنون پڑھاتے رہے، اور ۱۳۹۳ھ میں نہایت اعزاز کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ہوا، اور آج (۱۴۲۵ھ) تک ایک مایۂ ناز اور مقبول ترین استاذ کی حیثیت سے حدیث اور اعلیٰ فنون پڑھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی صحت و عافیت وزندگی میں برکت عطا فرمائے۔

علمی انہماک: حضرت والا کے علمی انہماک اور کام سے جو لوگ واقف ہیں وہ شہادت دیں گے کہ بغیر روحانیت، اعلیٰ خلوص، قلبی بے چینی اور رضائے الٰہی کے شوق کے اتنے بڑے کام کوئی انجام نہیں دے سکتا، ایک طرف دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم ادارہ میں ایک اعلیٰ اور کامیاب استاذِ حدیث کے طور پر تدریس کی ذمہ داری، دوسری طرف مطالعہ اور تصنیف وتالیف کا کامیاب مشغلہ، اُدھر اپنے بچوں کو جو بحمد اللہ ایک درجن سے زائد ہیں خود ہی حفظ کرانا اور ابتدائی کتابیں پڑھانا اور خوشخطی سکھانا، اور اِدھر وقتاً فوقتاً فتویٰ نویسی کا دقیق علمی کام انجام دینا، مذکورہ تمام علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ دل میں لئے ہوئے ایامِ تعطیل میں اندرونِ ملک وبیرونِ ملک دعوتی واصلاحی دورے کرنا۔

عشق خود راہ است ہم خود منزل است ‏ ‏ ‏ ره رواں را خستگی راه نیست

یہ اسی علمی عشق وانہماک کی کرامت ہے کہ حضرت والا تھکنے کا نام نہیں جانتے ہیں، اور نہ ہارنے کو مانتے ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ: علمی انہماک اور علمی وسائل سے محبت کی مناسبت سے مجھے حضرت والا کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک مرتبہ میں ان کی اجازت سے ان کے ذاتی کتب خانہ میں مطالعہ کر رہا تھا، ایک پرانی سی کتاب اٹھائی، اس کے سرورق پر حضرت والا کے قلم سے ان کے زمانہ طالب علمی کا ایک فقرہ لکھا ہوا تھا جس کا مفہوم یہ تھا "والدہ محترمہ نے گاؤں سے کسی کے ساتھ میرے لئے گھی بھجوایا تھا، اُسے بیچ کر میں نے یہ کتاب خریدلی" سبحان اللہ! آج کل کے طالب علم کے پاس اگر کتاب خریدنے کے لئے گھر والے پیسے بھیجتے ہیں تو وہ اُسے کھانے پینے پر خرچ کرتے ہیں، لیکن ممدوح مکرم جو خالص کھانے کی چیز ہے اور وہ بھی والدہ محترمہ کے ہاتھ کی بھیجی ہوئی اسے بیچ کر علمی پیاس بجھانے میں استعمال کرتے ہیں ع

ببیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

رب العالمین کو حضرت والا کی اسی قسم کی ادائیں شاید بہت ہی زیادہ پسند آئیں کہ ایک طرف سے مختلف اور نایاب کتابوں پر مشتمل ذاتی لائبریری عطاء فرمائی، اور دوسری طرف سے "مکتبہ حجاز دیوبند" کی شکل میں نشر واشاعت کا ایسا ادارہ عطاء فرمایا جس کی مطبوعات ملک و بیرونِ ملک پھیل رہی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ آپ پر رحمتوں کے ایسے دروازے کھول دیئے کہ ان کے قلم سے "رَحْمَةُ اللّٰهِ الوَاسِعَة" جیسی مایۂ ناز شرح لکھوا کر اہلِ علم وانصاف کو اس بات کے اعتراف پر مجبور کردیا کہ "حضرت مفتی صاحب نے پوری جماعت دیوبند کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، اور پوری جماعت کی طرف سے شکریہ وتحسین کے مستحق ہیں۔" "**ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم**"

قرآن کریم سے محبت: بندہ نے حضرت والا کی ایک خصوصیت یہ دیکھی ہے کہ قرآن کریم سے حد درجہ محبت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطاء کی ہے، جب کوئی شخص حضرت والا کے سامنے تلاوت شروع کرتا یا وہ خود تلاوت میں مصروف ہوجاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کا ظاہری اور باطنی تعلق سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب سے جڑ گیا ہے، آنسو رواں دواں، چہرہ کا رنگ بدلا ہوا نظر آتا تھا، میں حضرت والا کی وہ کیفیت یاد کر کے یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کاش زندگی میں صرف ایک ہی بار ہمیں وہ کیفیت نصیب ہو جائے، شاید اُس سے بیڑا پار ہوجائے لیکن۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نبخشد خدائے بخشندہ

حضرت والا مد ظلہم العالی کی مذکورہ کیفیت کو یاد کر کے میں یہ بھی سوچتا رہتا ہوں کہ شاید ان کی ترقیوں اور بے مثال مقبولیت کا راز یہی قرآن کی سچی محبت ہو، کیونکہ یہی قرآن اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے اہم ذریعہ ہے، امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل نے بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے "...... **وما تقرب العباد إلى الله بمثل ما خرج منه (يعني القرآن)**"

اسی محبت خالصہ کا نتیجہ ہے کہ حضرت والا نے اپنی اہلیہ محترمہ اور اپنے بچوں کو جو ایک درجن سے ماشاء اللہ زائد ہیں مذکورہ تمام مصروفیات کے باوجود حفظ خود ہی کرایا، راقم الحروف نے جہاں حضرت والا کے پاس بخاری شریف جلد ثانی، ترمذی شریف جلد اول،

ابوداؤد شریف اور بعض دوسری کتابیں بھی پڑھی ہیں وہاں دارالعلوم دیو بند سے فراغت کے بعد اور دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہونے کے بعد حفظ قرآن بھی اُنہی کے پاس کیا ہے۔(اللّٰهم إني اسالك بأسمائك الحسنى ان تبارك في حياة شيخي وصحته، وأن تنفع به الدين، وأن ترزقه وأهله النجاح والفلاح في الدنيا والآخرة برحمتك الواسعة)

ایک اور واقعہ: حضرت والا کے پاس حفظ کرتا ہوا جب میں سورۂ طٰہٰ کی اس آیت "وامر أهلك بالصلاة واصطبر عليها لا نسالك رزقا نحن نرزقك والعاقبة للتقوى" پر پہنچا تو انہوں نے نمناک آنکھوں کے ساتھ ایک واقعہ سنایا کہ جب سے میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنی اہلیہ اور بڑے بچے رشید احمد (حضرت والا کے یہ صاحبزادے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ایک حادثہ میں شہید ہوئے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً) کو حفظ کرایا ہے اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے روزی میں خاص برکت عطاء فرمائی ہے اور فاقہ کی نوبت گھر میں نہیں آئی ہے جب کہ اس سے قبل بار بار اس کی نوبت آچکی ہے۔

افہام وتفہیم کا منفرد سلیقہ: راقم الحروف کو اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا احساس ہے لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے طلبِ علم کی غرض سے چار ملکوں (افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور سعودی عرب) کے بعض مایۂ ناز اہلِ علم سے استفادہ کیا ہے اور ان کے پاس پڑھا ہے "رحِمَ اللّٰه من تُوفّي منهم وبارك في صحة وحياة من هو باق منهم" میں اس وسیع واقفیت کی بنا پر (جو کسی کا ذاتی کمال اور سرمایۂ فخر نہیں) شرح صدر کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حضرت والا کے افہام وتفہیم کا انداز ان سب سے منفرد اور ممتاز تھا، مشکل سے مشکل بحث ایسی ترتیب وعمدہ انداز سے بیان فرماتے تھے کہ اعلیٰ تو درکنار ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کے لئے بھی سمجھنا آسان ہو جاتا، اور مجھے یاد ہے کہ کبھی دوسرے اساتذۂ کرام کے اسفار کی وجہ سے دو تین گھنٹے مسلسل پڑھاتے اور تمام طلبہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور "كأن على رؤوسهم الطير" کا مصداق بن کر حضرت والا کی علمی تحقیقات سے مسلسل کئی گھنٹوں تک انہماک کے ساتھ بھرپور استفادہ کرتے رہتے۔

تربیت اور مردم سازی: حضرت والا کی تربیت اور مردم سازی کا انداز بھی نرالا ہے، وہ خود بھی اخلاص کے ساتھ ہمیشہ اپنے علمی، اصلاحی اور تصنیفی کاموں میں مصروف اور بلاضرورت کی ملاقاتوں اور ملنے جلنے سے دور نظر آتے ہیں، اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو بھی اسی بات کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

گرت ہوا است کہ با خضر ہم نشین باشی — نہاں زچشم سکندر چو آب حیوان باش

میں نے دارالعلوم دیوبند کی اپنی تقریباً دس سالہ زندگی میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ جن اساتذہ یا طلبہ کو حضرت والا سے تعلق یا قرب کی سعادت حاصل ہوئی اللہ نے ان کو ترقیوں سے نوازا، اور استغناء، علمی انہماک، اعلیٰ ہمتی اور دنیوی زندگی کی پرخار وادیوں کو عبور کرنے کی صلاحیت ان کو حاصل ہوئی، اور یہ اس لئے کہ یہ تمام چیزیں جب خود مربی میں بدرجہ اتم موجود ہوں اور تربیت کا طریقہ بھی حکیمانہ ہو تو پھر استفادہ کرنا خود بخود آسان اور تربیت کا سلسلہ مؤثر اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

رَحْمَةُ اللهِ الوَاسِعَة کا مقام: حضرت مفتی صاحب نے "رَحْمَةُ اللهِ الوَاسِعَة" کا آغاز ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ میں فرمایا، اور پانچ سالہ محنتوں اور عرق ریزی کے بعد ۱۹ ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ کو پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل یہ شرح پایۂ تکمیل تک پہنچایا، برصغیر کے ممتاز

اہل علم وبصیرت نے اس شرح کو بہت سراہا ہے، اور تقریباً ڈھائی سو سال سے "حُجَّةُ اللهِ البَالِغَة" کی شایان شان تشریح کا جو علمی قرضہ اہل علم ودانش کے ذمہ باقی تھا "رَحْمَةُ اللهِ الوَاسِعَة" کو اس قرضہ کی ادائیگی سے تعبیر کیا ہے، یہاں تک کہ برصغیر کے سب سے بڑی دینی درسگاہ "دَارُالعُلُوم دِیوبَند" کی مجلس شوری (جو ممتاز اہل علم وبصیرت پر مشتمل مجلس ہے) نے ایک تجویز پاس کی ہے جس میں مفتی صاحب مدظلہم کے اس کارنامہ کو فرض کفایہ ادا کرنے کے مترادف اور آپ کو شکریہ وتحسین کے مستحق قرار دیا ہے، تجویز کا عکس صفحہ نمبر (ب) جلد اول پر دے دیا گیا ہے۔

وجہ تسمیہ: "حُجَّةُ اللهِ البَالِغَة" کا نام سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۹ "قل فللّٰہ الحجۃ البالغۃ الأیۃ" سے مأخوذ ہے جس کا ذکر خود حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اختصار کے ساتھ فرمایا ہے اور حضرت شارح مدظلہم نے جلد اول صفحہ ۹۰ پر اس کی خوب تشریح بھی کی ہے، شارح مدظلہم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بھی "رَحْمَةُ اللهِ الوَاسِعَة" کا نام اُسی جگہ اور اُسی وجہ سے اخذ کیا ہے جہاں سے اور جس وجہ سے حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اخذ کیا ہے، سورۃ الانعام آیت ۱۴۹ سے پہلے ایک آیت چھوڑ کر آیت ۱۴۷ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی "فإن کذبوک فقل ربکم ذو رحمۃ واسعۃ" شرح کا مأخذ ہے جس کی تفصیل "رَحْمَةُ اللهِ الوَاسِعَة" جلد سوم صفحہ ۲۸ پر موجود ہے۔

رَحْمَةُ اللهِ الوَاسِعَة کی اشاعت: ہندوستان میں "رَحْمَةُ اللهِ الوَاسِعَة" کی اشاعت کا بیڑا تو خود حضرت مؤلف مدظلہم ہی نے اٹھایا، اور "مکتبہ حجاز دیوبند" سے شایان شان طباعت، بہترین کاغذ اور خوبصورت جلدوں کے ساتھ طبع کرایا، اور یہ شرح اس شعر کا صحیح مصداق بن گئی۔

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اب پاکستان میں برادر محترم، فاضل مکرم جناب مولانا محمد رفیق صاحب (تقبل اللّٰہ جھودھم) فاضل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن ومالک "زمزم پبلشرز کراچی" نے اشاعت کا ارادہ فرمایا ہے، اور حضرت مؤلف مدظلہم سے اجازت بھی حاصل کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائیں، اور "زمزم پبلشرز" کی اس کتاب اور دیگر مطبوعات سے خاص وعام کو فیضیاب فرمائیں۔

ع   این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ونبینا محمد وعلی الہ وصحبہ اجمعین، والحمد للّٰہ رب العالمین.

عبدالرؤف غزنوی عفا اللہ عنہ
خادم تدریس
جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی
۱۴۲۵/۴/۲ھ

فہرست مضامین

مقدمۃ الکتاب کا آغاز

مبحث اول

تکلیف شرعی اور جزا وسزا کے اسباب کے بیان میں

مبحث دوم

دنیا میں اور موت کے بعد جزاؤسزا کی کیفیت کا بیان

مبحث سوم

ارتفاقات کی بحث

مبحث چہارم

سعادت کے بیان میں

مبحث پنجم

نیکی اور گناہ کی بحث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُخن ہائے گفتنی

زبانِ قلم میں یہ قدرت کہاں جو ہو حمدِ خالق میں گوہر فشاں

بے نہایت حمد وسپاس اس ذاتِ قدسی والاصفات کے لئے ہے جس نے مشتِ خاک کو جامۂ انسانیت پہنایا۔ پھر اس کے سر پر اشرفیت کا تاج رکھا۔ اور جس طرح اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام فرمایا، اس کی روحانی ضروریات بھی الہام فرمائیں۔ ایسی ہدایات نازل فرمائیں جن کی پیروی سے کلاہِ دہقاں بآفتاب رسید! انسان رشکِ کرُّ و بیان بن گیا۔ اور ایسے احکام نازل فرمائے جن کی تعمیل میں سعادتِ دارین مضمر ہے۔ دنیا کی خوبی اور آخرت کی بھلائی اسی کی رہینِ منت ہے۔

اور بے پایاں رحمتیں اور سلامتی نازل ہوان تمام برگزیدہ ہستیوں پر جنھوں نے انسانوں کو سنوارنے میں اور ان کو احکامِ الٰہی کے فوائد وبرکات سمجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ خاص طور پر اس گروہ کے قافلہ سالار، سید ابرار، غایتِ کائنات، فخر موجودات، حضرتِ ختمی مرتبت ﷺ پر، جنھوں نے ہر طرح سے لوگوں پر اتمام حجت کر دیا اور دین الٰہی کا کوئی گوشہ تشنہ باقی نہیں چھوڑا۔

اور آپؐ کی آل واصحاب پر، اور آپؐ کے دین متین کے حاملین: اساطینِ امت پر، جنھوں نے شریعتِ مطہرہ کے رموز واسرار کو طشت از بام کر دیا اور حقائق ودقائق کو پوری طرح واشگاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ امت کی طرف سے ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ اور ہم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

حمد وصلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو امام اکبر، مجدد اعظم، محدث کبیر، مفکر ملت، حکیم الاسلام، جامع شریعت وطریقت، حضرت اقدس مولانا قطب الدین احمد معروف بہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی تصانیف میں واسِطَةُ العِقد (ہار کے بیچ کے عمدہ جوہر) کا مقام حاصل ہے۔ البالغۃ کے معنی ہیں: پختہ، مضبوط اور کامل۔ روح المعانی میں ہے البالغة أي التي بَلَغَتْ غايةَ المتانةِ والقوةِ على الإثبات۔ پس حجۃ اللہ البالغہ کے معنی ہیں: کامل برہانِ الٰہی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ نام سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۹ سے اخذ فرمایا ہے۔ اس آیت میں تکلیف شرعی کے راز، مجازات کی حکمت اور احکام شرعیہ کے مبنی برحکمت ومصالح ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی تفصیل آگے وجہ

تسمیہ کے عنوان کے تحت آرہی ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس کتاب کا موضوع بھی یہی مضامین ہیں۔ اس لئے آپ نے اس کتاب کا نام حجۃ اللہ البالغہ (کامل برہان الٰہی) تجویز کیا ہے۔ یہ کتاب بجا طور پر آپ کی تصنیفات میں شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سید محترم، حضرت اقدس مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

''شاہ صاحب کی یہ مایۂ ناز تصنیف آنحضرت ﷺ کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد، آپؐ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے، اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ ﷺ کا اعجاز نمایاں اور اللہ کی حجت تمام ہوئی''

شاہ صاحب رحمہ اللہ کو ادراک ہوگیا تھا، اور کتاب کے مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ بھی ہے کہ آگے عقلیت پسندی کا دور شروع ہونے والا ہے، جس میں احکامِ شریعت کے متعلق اوہام وشکوک کی گرم بازاری ہوگی۔ اسی خطرہ کا سدّ باب کرنے کے لئے آپ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ اس میں آپ نے تعلیمات اسلام کو مطابق فطرت اور احکام دینی کو مبنی بر حکمت ثابت کیا ہے۔ ہر حکم الٰہی اور امر شریعت کے اسرار ومصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان فرمائے ہیں۔ جس سے ایک طرف تو متشککین اور متردّدین کے شکوک وشبہات کا ازالہ ہوجاتا ہے اور دوسری طرف معترضین کے اسلام پر معاندانہ اعتراضات کا منہ توڑ جواب مل جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت اقدس مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کی اپنی سرگذشت ملاحظہ فرمائیں:

''میں اپنی زندگی میں کسی بشر کی کتاب سے اتنا مستفید نہیں ہوا، جس قدر کہ اس کتاب سے خدا نے مجھے فائدہ پہنچایا۔ میں نے اسلام کو ایک مکمل اور مرتبط الاجزاء نظام حیات کی حیثیت سے اس کتاب ہی سے جانا ہے۔ دین مقدس کی ایسی بہت سی باتیں جن کو پہلے میں صرف تقلیداً مانتا تھا، اس جلیل القدر کتاب کے مطالعہ کے بعد الحمد للہ میں ان پر تحقیقاً اور علی وجہ البصیرت یقین رکھتا ہوں''

غیر مقلد عالم جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب ''اتحاف النبلاء'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست، امّا شرحِ احادیث بسیار دراں کردہ۔ وحِکَم واسرارِ آں بیان نمودہ۔ تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ۔ ومثلِ آں دریں دوازدہ صد سال ہجری، ہیچ یکے را از علمائے عرب وعجم، تصنیفے موجود نیست''

اس فارسی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''یہ کتاب اگرچہ فن حدیث میں نہیں ہے، مگر اس میں بہت سی احادیث کی شرح کی ہے۔ اور ان کی حکمتیں اور ان کے راز بیان کئے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ کتاب اپنے فن میں بے نظیر واقع ہوئی ہے۔ اور اس جیسی کتاب ان

اسلامی بارہ صدیوں میں، عرب وعجم کے کسی عالم کی موجود نہیں ہے''

حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم:

اس کتاب کے درج ذیل اردو تراجم ہو چکے ہیں:

① ــــ نعمة الله السابغة: یہ ترجمہ غالبًا سب سے پہلا ترجمہ ہے۔ مترجم حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی رحمہ اللہ (۱۲۶۷-۱۳۳۵ھ) صاحب تفسیر حقانی ہیں۔ ۱۳۰۲ھ میں مولانا نے یہ ترجمہ بہ تحریک جناب مولانا محمد فضل الرحمٰن صاحب رئیس اعظم عظیم آباد (پٹنہ) کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں متن کے ساتھ مطبوعہ ہے اور آج کل بازار میں یہی ترجمہ دستیاب ہے۔

② ــــ آیات اللہ الکاملة: از جناب مولانا خلیل احمد بن مولانا سراج احمد اسرائیلی سنبھلی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۴۰ھ) یہ ترجمہ متن کے بغیر ۶۲۰ صفحات میں ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں لاہور سے طبع ہوا ہے۔

③ ــــ شموس اللہ البازغة: از حضرت مولانا عبدالحق صاحب ہزاروی رحمہ اللہ۔ یہ ترجمہ ۱۳۵۱ھ میں شیخ الٰہی بخش نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ سرتا سر آیات اللہ الکاملہ کی نقل ہے۔ صرف شروع کے چند ابواب کا ترجمہ بدلدیا ہے۔ (یہ تینوں ترجمے میرے پاس ہیں)

④ ــــ ان کے علاوہ ایک اور ترجمہ جناب محمد بشیر صاحب نے کیا ہے اور کچھ تشریحی فوائد بھی شامل کئے ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ نامکمل ہے اور مبحث دوم پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چھوٹے سائز پر بغیر متن کے شائع ہوا ہے۔ میں نے یہ ترجمہ نہیں دیکھا۔ جناب مولانا معراج محمد بارق صاحب نے حجۃ اللہ مترجمہ مولانا حقانی کے مقدمہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

⑤ ــــ لاہور سے مولانا عبدالرحیم صاحب کا ترجمہ بھی بغیر عربی متن کے شائع ہوا ہے۔ میں نے یہ ترجمہ بھی نہیں دیکھا۔ مولانا بارق صاحب نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

⑥ ــــ برہان الٰہی: از مولانا ابوالعلاء محمد اسماعیل صاحب گودھروی (گجراتی) یہ غالبًا آخری ترجمہ ہے۔ مترجم غیر مقلد عالم ہیں آپ نے یہ ترجمہ بہ تحریک مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد منظور نعمانی رحمہم اللہ کیا ہے۔ اور شیخ غلام علی نے اس کو لاہور سے شائع کیا ہے۔ پھر دوبارہ یہ شائع نہیں ہوا۔ نہایت نایاب ہے۔ میرے پاس یہ ترجمہ ہے اور میں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

اس آخری مترجم نے سابقہ تراجم پر درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

''اس کتاب کے اردو تراجم پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ترجمے کیا ہیں؟ ایک چیستان ہیں۔ جس میں مغلق مقامات کو اور بھی زیادہ مغلق کر دیا گیا ہے۔ اکثر الفاظِ مفردہ کا ترجمہ الفاظ مفردہ سے کیا گیا ہے۔ جس سے مطلب

کی وضاحت تو درکنار، الجھاؤ اور بڑھ گیا ہے۔ ایسے مقامات اور الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تحت اللفظ یا تحت اللفظ جیسا ترجمہ اس کتاب کی شان کے خلاف ہے۔ بلکہ کتاب کے مطالب کو بگاڑنا ہے'' (برہان الٰہی صفحہ ۲۲)

مگر یہ آخری ترجمہ بھی سابقہ تراجم سے کچھ بہتر نہیں۔ مترجم نے بیشک جگہ جگہ شاہ صاحب کے مختصر الفاظ کو جملوں اور سطروں سے واضح کیا ہے، مگر وہ ''من چہ سرایم وطنبورۂ من چہ سراید'' کا مصداق ہے۔

علاوہ ازیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے المصالح العقلية للأحكام النقلية (جواب ''احکام اسلام: عقل کی روشنی میں'' کے نام سے شائع ہوتی ہے) مطلق تراجم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

''اس مبحث میں (یعنی مصالح عقلیہ کے بیان میں) ہمارے زمانہ سے کسی قدر پہلے زمانہ میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ لکھ چکے ہیں۔ سنا ہے کہ ترجمہ اس کا بھی ہو چکا ہے۔ مگر عوام کو اس کا مطالعہ مناسب نہیں کہ (اصل کتاب) غامض زیادہ ہے (یعنی صرف ترجمہ سے کتاب سمجھ میں نہیں آسکتی) (در دیباچہ مصالح عقلیہ)

شرح کی ضرورت:

غرض حجۃ اللہ البالغہ کے لئے شرح کی ضرورت تھی۔ اور ہر کوئی اس ضرورت کو محسوس بھی کرتا تھا۔ مگر چند دشواریاں ایسی تھیں، جن کی وجہ سے آج تک کسی نے یہ فریضہ انجام نہیں دیا۔ وہ دشواریاں یہ ہیں:

۱ — مصنف کا البیلا انداز نگارش — شاہ صاحب قدس سرہ عرش پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ شرح میں ان مضامین کو جب تک فرش پر نہ لایا جائے، بات نہیں بن سکتی۔ اور یہ کام کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔

۲ — عبارت میں غایت درجہ ایجاز — شاہ صاحب نغز نویس ہیں۔ ایک کلمہ بھی زائد از حاجت نہیں لاتے۔ بلکہ بعض جگہ تو عبارت میں بخیلی کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ تو خیر ہوئی کہ شاہ صاحب مترادفات استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مفرد کی مفرد سے، جملہ ناقصہ کی جملہ ناقصہ سے اور جملہ تامہ کی جملہ تامہ سے تفسیر کرتے ہیں، جس سے دال دَلیا ہو جاتا ہے۔ اگر شاہ صاحب کی نگارش میں یہ بات نہ ہوتی تو بہت سے مضامین لوگوں کی گرفت سے باہر رہ جاتے۔

۳ — مخصوص اصطلاحات — شاہ صاحب کی اپنی کچھ مخصوص اصطلاحات ہیں، جب تک ان کو کماحقُّہ نہ سمجھ لیا جائے مضمون ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔ اور نہ شاہ صاحب نے اپنی اصطلاحات کی کسی جگہ تشریح کی ہے، نہ کسی اور نے یہ کام بخوبی انجام دیا ہے۔

۴ — فکری بلند پروازی — شاہ صاحب کی فکری بلند پروازی کا یہ حال ہے کہ بعض جگہ تو ان کے پیچھے چلنا بھی

دشوار ہو جاتا ہے اور آپ ہی کی لکھی ہوئی کہاوت آپ پر صادق آتی ہے کہ: ''جناب تو شیر پر سوار ہیں، آپ کے پیچھے سواری کرنے کی ہمت کون کرسکتا ہے!''

۵ — مضامین کی جدّت — شاہ صاحب کی ہر بات انوکھی ہوتی ہے۔ ہر مصنف کی باتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مصادر ومراجع مل جاتے ہیں، مگر شاہ صاحب کی کوئی بات کسی کتاب میں نہیں ملتی، پھر یہ مضامین کیسے حل کئے جائیں!

غرض مذکورہ بالا وجوہ سے اور ان کے علاوہ دیگر وجوہ سے یہ قرض باقی چلا آرہا تھا کہ ایک بڑھیا اپنا مٹھی بھر کاتا ہوا سوت لے کر بازار مصر میں یوسفؑ کی خریدار بن کر آگئی۔ دیکھئے اس کا نصیب کیسا ہے!

☆ ☆ ☆

میں نے یہ کتاب حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب قاسمی قدس سرہ (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) سے پڑھی ہے۔ حضرت کو شاہ صاحب کے علوم پر کمالِ قدرت حاصل تھی۔ مگر افسوس کہ درس میں چند ابواب ہی شامل تھے۔ کاش حضرت سے پوری کتاب یا کتاب کا معتد بہ حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

پھر جب میں نے العون الکبیر فی حلّ الفوز الکبیر لکھی تو اس میں یہ التزام کیا تھا کہ شاہ صاحب کے کلام کی خود شاہ صاحب کے کلام سے شرح کی جائے۔ چنانچہ راندیر کے قیام کے زمانہ میں اس مقصد سے پہلی مرتبہ پوری کتاب کا مطالعہ کیا۔ مگر اس وقت کتاب کما حقہ حل نہیں ہوئی تھی۔

پھر جب ۱۴۰۸ھ میں دار العلوم دیوبند میں اس کتاب کا درس مجھ سے متعلق کیا گیا تو میں نے از سر نو پوری کتاب کا مطالعہ کیا۔ اور مطبوعہ صدیقی سے پوری کتاب کا مقابلہ بھی کیا۔ اس مقابلہ سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ کتاب کا بڑا حصہ بحمد اللہ حل ہوگیا اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ کتاب میں کچھ ایسی طباعتی اغلاط ہیں جن کی تصحیح کے بغیر کتاب کما حقہ حل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اسی وقت سے مجھے کتاب کے مخطوطوں کی تلاش رہی۔ بالآخر ''جوئندہ یابندہ'' مقصد میں کامیابی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

میری خواہش یہ بھی تھی کہ شرح لکھنے سے پہلے کم از کم ایک بار پوری کتاب پڑھالوں۔ کیونکہ پڑھانے سے مضامین کی تسہیل کا طریقہ ہاتھ آجاتا ہے۔ مگر یہ بات مقدر نہ تھی۔ ایک سال دار العلوم دیوبند کے استاذ، برادر عزیز جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری زید شرفہ اور مرحوم نور چشم مولوی رشید احمد رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۱۵ھ) نے اسی مقصد سے حجۃ اللہ البالغہ کے سبق میں شرکت بھی کی تا کہ وہ تقریر ضبط کریں۔ عصر کے بعد بھی قسم دوم سے سبق شروع کیا گیا۔ مگر طلبہ نے اس وقت کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری زید مجدہ سے شکایت کی کہ درس املاء

کرانے سے کتاب سمجھ میں نہیں آتی۔ کلام سننے میں تسلسل باقی نہیں رہتا۔ ذہن بات سے ہٹ جاتا ہے، چنانچہ وہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔ اور عصر کے بعد کا سبق بھی چندروز کے بعد بند ہوگیا۔

پھر اتفاق یہ ہوا کہ ۱۴۱۸ھ میں طلبہ نے پورے سال کی تقریر ٹیپ کی اور صاف کر کے مجھے دی تا کہ میں اس کو مرتب کروں۔ چنانچہ ۱۴۱۹ھ میں جب سبق شروع ہوا تو میں نے اس تقریر کو مرتب کرنا شروع کیا۔ مگر وہ تقریر چوتھے مبحث پر ختم ہوگئی، کیونکہ درس میں کتاب اتنی ہی پڑھائی جاتی تھی۔ اس طرح مجبوراً کام آگے بڑھانا پڑا۔ اور بحمد اللہ دو سال کے عرصہ میں کتاب کے ایک معتد بہ حصہ پر کام ہوگیا۔ اس میں سے یہ جلد اول قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اور دوسری جلد کی کتابت چل رہی ہے۔ وہ بھی ان شاء اللہ جلد پیش کی جائے گی۔

شرح کا انداز

شرح میں انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک عنوان قائم کر کے مسئلہ کی تقریر کی گئی ہے، جس طرح سبق میں کی جاتی ہے اور بات واضح کرنے کے لئے مثالوں وغیرہ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور کہیں کتاب کی ترتیب بھی بدل گئی ہے۔ غرض تقریر میں ہر بات شاہ صاحب کی نہیں ہے، اس میں میں نے اپنی باتیں بھی ملائی ہیں۔ البتہ مدعیٰ شاہ صاحب ہی کا ہے۔ اور یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ کتاب حل ہوجائے۔

پھر متعلقہ عربی عبارت ضروری اعراب کے ساتھ دی گئی ہے۔ پھر درسی انداز کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ تا کہ طلبہ ترجمہ کو عبارت سے ملا کر کتاب حل کر سکیں۔ پھر لغات کے عنوان سے مشکل الفاظ کے معانی اور ضروری ترکیب وغیرہ دی گئی ہے۔ اور کسی بات کی تشریح ضروری معلوم ہوئی تو وہ بھی کی گئی ہے۔ غرض متن اور ترجمہ میں میں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں ملائی۔ اور متن کو لکیروں کے چوکھٹے میں رکھا گیا ہے۔ بعض جگہ میں نے اصل کتاب میں عناوین بڑھائے ہیں۔ ان کو چوکھٹے سے باہر اس طرح [ ] کی عمودی قوسین میں رکھا گیا ہے۔ اور متن میں جہاں کہیں نمبر ڈالے گئے ہیں ان کو بھی عمودی قوسین میں رکھا ہے۔

شرح کے مآخذ

کتاب حل کرنے کے لئے میرے پاس کوئی ماخذ نہیں تھا۔ کتاب کے چار تراجم ضرور تھے مگر وہ بوقت حاجت غائب ہوجاتے تھے یا الجھا کر رکھ دیتے تھے۔ البتہ اچانک ایک امداد غیبی ہوئی، پاکستان کے شہر چشتیاں کے جناب مولانا عبد القدیر صاحب تشریف لائے۔ میں نے شرح لکھنے کا تذکرہ کیا، تو انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں حضرت استاذ الاستاذ مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کی ایک تقریر ہے جو قلمی ہے۔ میں نے اس کی خواہش ظاہر کی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں مولانا موصوف کو کہ انھوں نے واپس لوٹتے ہی اس تقریر کی دو عدد فوٹو کاپیاں بھیج دیں۔ اس تقریر سے کتاب حل

کرنے میں بڑی مدد ملی۔

مولانا سندھی رحمہ اللہ نے ایک بار مکہ مکرمہ میں حجۃ اللہ پڑھائی تھی۔ تلامذہ نے ان کی تقریر منضبط کرلی تھی۔ یہ تقریر عربی میں قید تحریر میں لائی گئی ہے اور کتاب کے تین ربع تک ہے۔ آخر کا ایک ربع اس میں شامل نہیں ہے۔ اس تقریر میں عام طور پر مفردات کی تشریح، ضمائر کے مراجع کی تعیین اور عبارت کی تصحیح اور کہیں کہیں افادات ہیں۔ کسی مسئلہ کو یا عبارت کو نہیں سمجھایا ہے۔ مگر بہرحال اس سے بڑی مدد ملی۔ اللہ تعالیٰ ان تلامذہ کو جنت کے بلند درجات عطا فرمائیں۔ انھوں نے ایک قیمتی ذخیرہ محفوظ کردیا۔ میں نے شرح میں کہیں کہیں وہ افادات نقل بھی کئے ہیں۔ اور آخر میں (سندی ؒ) لکھا ہے۔ غرض کتاب حل کرنے کے لئے میرے پاس یہی ایک مأخذ تھا۔ دوسری کوئی چیز دستیاب نہیں تھی۔ اس لئے شرح میں اگر کوئی لغزش ہوگئی ہے تو اس کے لئے وجہ جواز ہے۔

احادیث کی تخریج

شرح میں کتاب کی احادیث کی تخریج کا معروف طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس سے کتاب بہت طویل ہوجاتی اور قاری مقصد سے دور جا پڑتا۔ میں نے تخریج احادیث کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے:

۱ــــ کتب حدیث کی مراجعت کرکے حدیث کے بارے میں اطمینان کرلیا ہے۔ اور عام طور پر صرف مشکوٰۃ کا حوالہ دیدیا ہے۔ اور اگر حدیث مشکوٰۃ میں نہیں ملی تو اصل مراجع کا حوالہ دیا ہے۔

۲ــــ اگر کوئی حدیث ضعیف ہے تو اس کی اطلاع دیدی ہے، مزید وضاحت نہیں کی۔

۳ــــ اور اگر کوئی حدیث نہایت ضعیف، ساقط کے درجہ کی ہے تو اس کی پوری وضاحت کی ہے، مثلاً اسی جلد (مبحث خامس باب سوم) میں یہ حدیث آئی ہے کہ دادی حواء رضی اللہ عنہا نے شیطان کے اغواء سے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا تھا۔ یہ حدیث ترمذی کی ہے، مگر قطعاً باطل ہے، چنانچہ اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

۴ــــ اور اگر کوئی حدیث تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملی تو بس یہ لکھ دیا ہے کہ یہ حدیث مجھے نہیں ملی جیسے جلد اول مبحث پنجم، باب ۱۳ کے آخر میں یہ روایت آئی ہے کہ مؤمن کا حصہ عذاب میں سے دنیا کے مِحَن ہیں۔ یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔

۵ــــ علامہ کوثری مصری رحمہ اللہ نے **حُسن التقاضی فی سیرۃ الإمام أبی یوسف القاضی** کے آخر میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ پر یہ تنقید کی ہے کہ آپ دربارۂ احکام وفروع صرف متونِ احادیث کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کی اسانید میں نظر نہیں کرتے۔ حالانکہ اہل علم کسی وقت بھی اسانید حدیث سے قطع نظر نہیں کرسکے، اور نہ کرسکتے ہیں۔ حتی کہ صحیحین کی اسانید پر بھی نظر ضروری ہے، چہ جائیکہ دوسری کتب صحاح وکتب سنن وغیرہ۔ اور جب دربارۂ احتجاج فی الفروع

اسانید میں نظر ضروری ہے تو باب اعتقاد میں تو بدرجۂ اولی اس کی ضرورت واہمیت ہے۔ (کوثریؒ کی بات پوری ہوئی)

اس کی مثالیں اس جلد میں بھی موجود ہیں۔ روح اعظم کی روایت جس کا تذکرہ مبحث اول کے باب سوم میں آیا ہے اور عبدالحارث نام رکھنے کی روایت بے اصل ہے۔ مگر شاہ صاحب قدس سرہ نے ان کو مسلمہ حیثیت سے پیش کیا ہے، بلکہ ان پر استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔

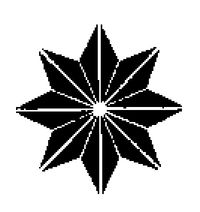
قصہ مختصر: کتاب حل کرنے میں میں نے اپنی والی پوری کوشش صرف کرڈالی ہے، کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا۔ رہی یہ بات کہ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، تو اس کا فیصلہ قارئین کرام کریں گے۔ میں تو بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ:

سُپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حسابِ کم وبیش را

والسلام مع الاحترام

کتبہٗ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دار العلوم دیوبند
۱۵ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ





مختصر سوانح حیات

حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ

(حجۃ اللہ البالغہ کے مصنف امام اکبر، محدث اعظم، مفسر قرآن، اصول تفسیر اور اسرار شریعت کے موجد و مدوّن، مجدد وقت، مفکر ملت، حکیم الامت، جامع شریعت وطریقت، آیۃ من آیات اللہ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی محدث دہلوی ہیں۔ آپ کے مختصر حالات برادر عزیز جناب مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری زید مجدہ استاذ دارالعلوم دیوبند نے الفوز الکبیر کی شرح ''الخیر الکثیر'' کے مقدمہ میں لکھے ہیں۔ یہاں ان کو معمولی تبدیلی کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے کیونکہ وہ کافی شافی ہیں)

ولادت باسعادت اور نام ونسب

آپ کی ولادت باسعادت عظیم مغل بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر رحمہ اللہ کی وفات سے چار سال قبل ۱۴ شوال ۱۱۱۴ھ بدھ کے دن طلوع آفتاب کے وقت قصبہ ''پھلت'' ضلع مظفر نگر (یو، پی) میں ہوئی —— آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کو شیخ قطب الدین احمد بختیار کاکی اوشی قدس سرہ (متوفی ۶۳۳ھ) نے خواب یا مراقبہ میں ایک نیک صالح لڑکے کے پیدا ہونے کی بشارت دی تھی، اور یہ وصیت کی تھی کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کا نام میرے نام پر ''قطب الدین احمد'' رکھنا، مگر جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے والد صاحب وصیت بھول گئے، اور آپ کا نام ''ولی اللہ'' رکھ دیا، پھر ایک مدت کے بعد جب بختیار کاکی رحمہ اللہ کی وصیت یاد آئی، تو دوبارہ آپ کا نام ''قطب الدین احمد'' رکھا، اس لئے آپ کا پورا نام ''ولی اللہ قطب الدین احمد'' ہے اور تاریخی نام ''عظیم الدین'' کنیت ''ابوعبدالعزیز'' اور ''ابوالفیاض'' ہے —— آپ کے والد ماجد کا نام ''عبدالرحیم'' اور ''کنیت'' ''ابوالفیض'' اور دادا کا نام ''وجیہ الدین'' ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر، فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک، اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ تک پہنچتا ہے۔

والدین ماجدین کا تعارف

آپ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب فقہ حنفی کے جید عالم اور دہلی کے بڑے مشائخ میں سے تھے، معقولات کے ماہر اور علامہ میر زاہد ہروی کے شاگرد تھے، بچپن ہی سے سنتوں کا اہتمام اور دنیا کی دولت وعزت سے نفرت اور آخرت کی فکر

کرنے والے صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے ــــ آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ فخر النساء بھی، جو شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی ہیں، علوم دینیہ میں خوب مہارت اور آداب طریقت و اسرار شریعت سے اچھی واقفیت رکھتی تھیں، صوم و صلوٰۃ کی پابند نیک پارسا خاتون تھیں۔

تعلیم و تربیت

پانچ سال کی عمر میں آپ نے تعلیم شروع کی، اور سات سال کی عمر میں قرآن کریم کی تکمیل فرمائی، ساتویں سال کے آخر میں آپ نے فارسی اور عربی کے ابتدائی رسائل پڑھنا شروع کئے، اور ایک سال میں ان کو مکمل کیا، اس کے بعد آپ نے صرف و نحو کی طرف توجہ مبذول فرمائی، اور دس سال کی عمر میں نحو کی معرکۃ الآراء کتاب شرح جامی تک پہنچ گئے، صرف و نحو سے فراغت کے بعد علوم عقلیہ اور نقلیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پندرہ سال کی عمر میں تمام متداول درسی علوم سے فارغ ہو کر درس و تدریس کا آغاز فرمایا، اس عرصہ میں آپ نے اکثر و بیشتر کتابیں اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سے پڑھیں۔ اور ان ہی سے بیعت ہو کر سترہ سال کی عمر میں بیعت و ارشاد کی بھی اجازت حاصل کی، اور ۱۱۴۳ھ تک اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی مسند درس و ارشاد کو سنبھالا اور خلق خدا کو فائدہ پہنچایا۔

زیارت حرمین شریفین

پھر ۱۱۴۳ھ میں جبکہ آپ کی عمر تیس سال کے قریب تھی، حرمین شریفین کی زیارت کا شوق آپ پر ایسا غالب ہوا کہ راستہ کی بدامنی کے باوجود حجاز مقدس کا سفر کیا، ۱۵/ ذیقعدہ ۱۱۴۳ھ کو مکہ مکرمہ پہنچے، اور فریضہ حج ادا کیا، پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کُردی مدنی سے بخاری شریف کی سماعت فرمائی۔ اور صحاح ستہ (بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف) موطا امام مالک، مسند دارمی اور امام محمد کی کتاب الآثار کے اطراف ان کے سامنے پڑھے۔ اور بقیہ کتابوں کی ان سے اجازت حاصل کی، پھر مکہ مکرمہ آئے، دوسرا حج کیا، اور شیخ وفد اللہ مالکی مکی سے موطا امام مالک پڑھی، اور شیخ تاج الدین حنفی قلعی مکی، جو بخاری شریف کا درس دے رہے تھے، ان کے درسوں میں چند دن شریک ہوئے، اور ان سے صحاح ستہ وغیرہ کتابوں کے اطراف سنے، اور مذکورہ کتابوں کے مشکل مقامات حل کئے، اور ان سے تمام کتب حدیث کی اجازت حاصل کی۔

الغرض حجاز مقدس میں چودہ ماہ قیام اور دو حج کرنے اور حرمین شریفین کے محدثین عظام سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے بعد ۱۱۴۵ھ کے اوائل میں ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے۔ پورے چھ ماہ سفر میں گذرے۔ اور ۱۴/ رجب ۱۱۴۵ھ جمعہ کے دن بصحت و عافیت دہلی پہنچے، چند دن آرام کرنے کے بعد پھر سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ اور تیس سال تک تصنیف و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

خودنوشت سوانح حیات

شاہ صاحب نے اپنے حالات وسوانح میں ایک مختصر رسالہ الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف کے نام سے فارسی زبان میں لکھا ہے، مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر میں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے جوحسب ذیل ہے:

بتاریخ ۱۴/شوال ۱۱۱۴ھ چہار شنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت یہ فقیر پیدا ہوا، تاریخی نام عظیم الدین نکالا گیا، ولادت سے پہلے خود والدین ماجدین اور چند صلحاء نے میرے بارے میں بہت سے بشارتی خواب دیکھے، جن کو بعض دوستوں نے مستقل رسالہ القول الجلی میں بھی جمع کر دیا ہے — عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھا دیا گیا، ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرایا، اوراس سال ''رسم سنت'' عمل میں آئی، یہاں تک کہ دسویں سال شرح ملا جامی پڑھ لی۔ اور مطالعہ کتب کی استعداد پیدا ہوگئی — چودھویں ہی برس میں شادی کی صورت پیدا ہوگئی، اور والد ماجد نے اس معاملہ میں انتہائی عجلت سے کام لیا، اور جب سسرال والوں نے والد ماجد کے تقاضوں کے جواب میں سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا، تو آپ نے ان کو لکھ بھیجا کہ میری یہ ''جلد بازی'' بے وجہ نہیں ہے، بلکہ اس میں کوئی راز ہے، لہٰذا یہ مبارک کام بلا تاخیر ہی ہوجانا چاہئے، چنانچہ والد بزرگوار کے اصرار سے اسی سال یعنی عمر کے چودھویں ہی برس میں شادی ہوگئی، اور وہ راز بعد میں اس طرح ظاہر ہوا کہ نکاح سے تھوڑے ہی دن بعد میری خوش دامن کا انتقال ہوگیا، اُس سے چند ہی روز بعد میری اہلیہ کے نانا نے وفات پائی، پھر چند ہی دنوں میں عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد قدس سرہ کے صاحب زادے شیخ فخر عالم نے رحلت فرمائی۔ اور یہ صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ میرے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ ماجدہ نے (یعنی آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم صاحب کی پہلی بیوی نے) داغ مفارقت دیا، ان صدمات کے ساتھ ہی والد ماجد پر ضعف اور مختلف قسم کے امراض کا غلبہ ہوا، اور دیکھتے دیکھتے آپ کی وفات کا سانحۂ عظیم بھی پیش آ گیا — ان حوادث کے پیہم گذر جانے پر معلوم ہوا کہ شادی کے متعلق والد ماجد کی عجلت فرمائی میں کیا راز تھا؟ درحقیقت اگر اُس وقت یہ کام اس طرح عجلت سے انجام نہ پاتا، توان حوادث کی وجہ سے پھر مدتوں بھی اس کا موقع نہ آسکتا تھا۔

شادی سے ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں والد ماجد کے ہاتھ پر میں نے بیعت کی، اور مشائخ صوفیہ بالخصوص حضرات نقشبندیہ کے اشغال میں لگ گیا۔ اور توجہ اور تلقین اور آداب طریقت کی تعلیم وخرقہ پوشی کی جہت سے میں نے اپنی نسبت کو درست کیا — اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا ان دیار کے مروجہ نصاب تعلیم سے فراغت حاصل کی، والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیانے پر خواص وعوام کی دعوت کی، اور مجھے درس کی اجازت دی، جن علوم وفنون کا درس اس ملک میں مروج ہے، ان میں ذیل کی کتابیں میں نے سبقاً سبقاً پڑھیں۔

حدیث میں پوری مشکوٰۃ شریف، سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب تک کے تھوڑے سے حصہ کے، اور صحیح

بخاری کتاب الطہارت تک، اور شمائل ترمذی کامل — اور تفسیر میں تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ، اور حق تعالیٰ کی نعمتوں میں ایک بہت بڑی نعمت مجھ پر یہ ہوئی کہ کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی، اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متن قرآن پڑھا، اور یہی میرے حق میں ''فتح عظیم'' کا باعث ہوا۔ والحمد للّٰہ علی ذلك۔

اور علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پوری پڑھیں، اور اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کافی حصہ، اور منطق میں شرح شمسیہ (قطبی) پوری اور شرح مطالع کا کچھ حصہ، اور کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف کا بھی ایک حصہ —— اور سلوک وتصوف میں عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ، اور علم الحقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص، اور فن خواص اسماء وآیات میں والد ماجد کا خاص مجموعہ، اور طب میں موجز، اور فلسفہ میں شرح ہدایت الحکمت وغیرہ، اور نحو میں کافیہ اور اس کی شرح از ملا جامی، اور علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی اس قدر جتنے پر ملا زادہ کا حاشیہ ہے، اور ہیئت وحساب میں بھی بعض مختصر رسالے پڑھے —— اور الحمد للہ کہ اسی تحصیل کے زمانہ میں ہر فن سے خاص مناسبت پیدا ہوگئی، اور اس کے خاص مسائل اور اہم مباحث میرے ذہن کی گرفت میں آگئے۔

میری عمر کے سترہویں سال والد ماجد مریض ہوئے اور اسی مرض میں واصل برحمت حق ہوگئے، اور اس مرض وفات ہی میں مجھے بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی، اور اس اجازت میں کلمہ مبارکہ یَدُہٗ کَیَدِیْ (اس کا ہاتھ گویا میرا ہی ہاتھ ہے) مکرر ارشاد فرمایا۔

خدا تعالیٰ کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ حضرت والد ماجد جب تک زندہ رہے اس فقیر سے بے حد راضی رہے، اور اسی رضامندی کی حالت میں اس دنیا سے تشریف لے گئے، حضرت والد کو جیسی توجہ میرے حال پر رہی ایسی ہر باپ کو اپنے بیٹوں کے ساتھ نہیں ہوتی، میں نے کوئی باپ، کوئی استاذ اور کوئی مرشد ایسا نہیں دیکھا جو اپنی اولاد یا اپنے کسی شاگرد یا مرید کی طرف اس قدر توجہ اور شفقت رکھتا ہو، جو حضرت والد ماجد کو میرے ساتھ تھی۔ اللّٰھم اغفرلِیْ وَلِوَالدیَّ وارْحَمْھُمَا کما رَبَّیانِیْ صغیْرا، وجَازِھما بکل شفقۃٍ ورحمۃٍ ونعمۃٍ منھما عَلَیَّ مأۃ الف اضْعَافِھَا، إنك قریبٌ مجیبٌ۔

پھر حضرت کی وفات کے بعد بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات کے درس میں اشتغال رہا، اور ہر علم وفن میں غور کرنے کا موقع ملا، اور مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں، اور ان احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات اپنے مسائل میں استناد فرماتے ہیں، نور غیبی کی مدد سے ''فقہائے محدثین'' کا طریقہ دلنشین ہوا۔

غرض والد ماجد کی وفات سے ۱۲/ برس اس طرح گزارنے کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، اور آخر ۱۱۴۳ھ میں یہ فقیر حج سے مشرف ہوا، اور ۱۱۴۴ھ میں مکہ معظمہ ومدینہ منورہ کی مجاورت، اور شیخ ابوطاہر قدس سرہ ودیگر مشائخ حرمین شریفین سے اخذ روایت حدیث کی سعادت حاصل ہوئی —— مدینہ منورہ کے دوران قیام میں روضۂ مقدسہ سرور عالم ﷺ میری توجہ کا خاص مرکز رہا، اور الحمد للہ کہ مجھ فقیر پر اس قدسی دربار سے فیوض وبرکات کی بے پایاں

بارش ہوئی ـــــ نیز اس سفر مبارک میں حرمین شریفین اور عالم اسلامی کے بہت سے علمائے کرام کے ساتھ خوب رنگین صحبتوں کا موقع ملا، حضرت شیخ ابوطاہر مدنی قدس سرہ کی طرف سے تمام طرق صوفیہ کا جامع خرقہ بھی اسی بابرکت سفر میں عنایت ہوا ـــــ پھر ۱۱۴۴ھ کے آخر میں حج سے مکرر مشرف ہوکر اوائل ۱۱۴۵ھ میں وطن کی طرف واپسی ہوئی، اور بتاریخ ۱۴؍رجب ۱۱۴۵ھ ٹھیک جمعہ کے دن بفضلہ تعالیٰ صحیح سلامت وطن مالوف دہلی پہنچ گیا۔

بہ تعمیل ارشاد ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ بعض خاص الخاص انعامات الٰہیہ کا بھی تذکرہ کرتا ہوں، حق تعالیٰ کا عظیم ترین انعام اس ضعیف بندہ پر یہ ہے کہ اس کو ''خلعت فاتحیت'' بخشا گیا ہے، اور اس آخری دورہ کا افتتاح اس سے کرایا گیا ہے، اس سلسلہ میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو ''مرضی'' ہے اس کو جمع کیا گیا، اور فقہ حدیث کی از سر نو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی، اور آنحضرت ﷺ کے تمام احکام وترغیبات، بلکہ تمامی تعلیمات کے اسرار ومصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے یہ کام اس طرح نہیں کیا تھا ـــــ نیز سلوک کا وہ طریقہ جس میں حق تعالیٰ کی مرضی ہے، اور جو اس دورہ میں کامیاب ہوسکتا ہے مجھے اس کا الہام فرمایا گیا ہے، اور میں نے اس طریق کو اپنے دو رسالوں ''ہمعات'' اور ''الطاف القدس'' میں قلم بند کردیا ہے۔

ایک کام مجھ سے یہ لیا گیا کہ متقدمین میں سے اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل وبراہین سے ثابت کیا، اور ''معقولیوں'' کے شکوک وشبہات کے خس وخاشاک سے ان کو قطعی پاک کردیا، اور ان کی تقریر الحمد للہ ایسی کی جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی، علاوہ ازیں کمالات اربعہ (۱) ابداع (۲) خلق (۳) تدبیر (۴) اور تدلی کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعدادات کا علم مجھے عطا فرمایا گیا، اور یہ دونوں ایسے علم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے ان کے کوچہ میں قدم بھی نہیں رکھا۔

اور حکمت عملی (کہ اس دورہ (زمانہ) کی صلاح وفلاح اسی سے وابستہ بلکہ اسی میں منحصر ہے) مجھے بھر پور دی گئی، اور کتاب وسنت وآثار صحابہ سے اس کی تطبیق وتفصیل کی توفیق بھی نصیب ہوئی ـــ اس سب کے سوا مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا، جس کے ذریعہ سے میں یہ تمیز کرسکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم، جو فی الحقیقت آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے؟ اور وہ کون کون باتیں ہیں جو بعد میں اس میں ٹھونسی گئی ہیں، یا جو کسی بدعت پسند فرقہ کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔

اپنے یہ حالات اور حق تعالیٰ کے یہ انعامات بیان فرمانے کے بعد حضرت شاہ صاحب اپنی اس تحریر کو ان الفاظ پر ختم فرماتے ہیں:

وَلَوْ اَنَّ لی فی کل مَنْبتِ شَعْرَةٍ لسانا لما استوفیتُ واجبَ حَمْدِہ

وفات حسرت آیات

حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد آخر عمر تک آپ تدریس وتصنیف میں مشغول رہے، اور ۲۹؍محرم الحرام ۱۱۷۶ھ مطابق ۲۰؍اگست ۱۷۶۲ء ہفتہ کے دن ظہر کے وقت انتقال فرمایا، اور اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب

کے مزار سے متصل دہلی کے مشہور قبرستان ''منہدیان'' میں آپ کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا، اللہ تعالیٰ آپ کی اور آپ کے والدین کی مغفرت فرمائیں! درجات بلند فرمائیں! اور قبروں کو منور فرمائیں! آمین یارب العالمین۔

اولاد کا تذکرہ

حضرت شاہ صاحب کی پہلی اہلیہ محترمہ یعنی آپ کے ماموں شیخ عبید اللہ صاحب پھلتی کی صاحب زادی کے بطن سے ایک صاحب زادے شیخ محمد، اور ایک صاحب زادی سیدہ امۃ العزیز تھیں، اور دوسری اہلیہ محترمہ مسمات ارادۃ بنت شاہ ثناء اللہ صاحب کے بطن سے چار صاحب زادے تھے، ان میں سب سے بڑے شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی، پھر شاہ رفیع الدین صاحب پھر شاہ عبد القادر صاحب پھر شاہ عبد الغنی صاحب تھے، جو شاہ اسماعیل شہید کے والد محترم ہیں، شاہ صاحب کی وفات کے بعد شاہ عبد العزیز صاحب آپ کے جانشین ہوئے اور اپنے تینوں بھائیوں اور شاہ اسماعیل شہید کی تربیت کی، مگر تینوں بھائی شاہ عبد العزیز صاحب کی حیات میں وفات پاگئے، اور مولانا اسماعیل شہید بعد میں سکھوں سے لڑتے ہوئے اپنے پیر و مرشد سید احمد بریلوی رحمہ اللہ کے ساتھ شہید ہوئے، یہ سب حضرات اپنے زمانہ میں علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب اور نامور فضلاء تھے۔

شاہ صاحب کا زمانہ

شاہ صاحب کے زمانہ میں ہندوستان کی حالت ہر لحاظ سے ابتر تھی، اورنگ زیب عالم گیر علیہ الرحمہ کے بعد شاہان وقت اپنے اسلاف کی دولت رقص و سرود کی محفلوں اور حسن و جمال کے بازاروں میں لٹا رہے تھے، اور مغلیہ سلطنت پر سادات بارہہ (شیعوں) کا مکمل تسلط ہو چکا تھا، وہ جسے چاہتے بادشاہ بناتے، جسے چاہتے قتل کروا دیتے، رعایا بدحال، پریشان، غربت و افلاس کے ہاتھوں برباد، اور ستم گروں کے مظالم سے پامال تھی، عوام کی اخلاقی حالت نہایت درجہ گری ہوئی تھی، اور دینی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی قدس سرہ کے الفاظ میں اس وقت ہندوستان کا حال یہ تھا:

''مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا، مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، فقہ و فتاوی کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق، مذہب کا سبب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے''

اصلاحی اور تجدیدی کارنامے

حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد آپ نے مسلمانوں کی یہ صورت حال دیکھ کر ان کی اصلاح کی طرف کامل توجہ

فرمائی، اس زمانہ کے طریقۂ تعلیم اور نصاب کو بدلا، دین میں جو بدعات وخرافات اور بے سروپا باتیں شامل کردی گئی تھیں، ان کو الگ کیا، اور دین کونکھار کر لوگوں کے سامنے اصل شکل میں پیش کیا شیعہ عقائد کی تردید کی، عقل ونقل دونوں اعتباروں سے دین اسلام کومطابق فطرت ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، عجمی تصوف اوراس کی بے سروپاباتوں کا خوب رد کیا، مختلف مکاتب فکر کے لوگوں میں ہم آہنگی اور اتفاق پیدا کرنے کی بھرپور کوشش فرمائی۔ قرآن کریم سے لوگوں کو قریب کرنے کے لئے رائج الوقت فارسی زبان میں قرآن کریم کا مطلب خیز ترجمہ کیا، تفسیر کے اصول وضوابط وضع کئے، اسرار شریعت سے لوگوں کو آگاہ فرمایا۔ اوراحادیث نبویہ سے ہندی مسلمانوں کو آشنا کیا، الغرض آپ نے تقریر وتحریر اور تصنیف وتدریس کے ذریعہ جو عظیم خدمات انجام دیں وہ رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

مشہور تصانیف کا تعارف

''حیات ولی اللہ'' کے مصنف کی تحقیق کے مطابق شاہ صاحب کی جو تصانیف چھپی ہوئی ہیں، وہ پچاس کے قریب ہیں (مگر یہ بات تحقیق طلب ہے) چند مشہور تصانیف کا تعارف درج ذیل ہے:

(۱) **فتح الرحمن في ترجمة القرآن**: یہ قرآن کریم کا فارسی زبان میں نہایت عمدہ اور مطلب خیز ترجمہ ہے، ترجمہ کے ساتھ جا بجا فوائد بھی ہیں، جو نہایت مختصر اور جامعیت وافادیت میں بے مثل ہیں — شاہ صاحب کے زمانہ میں اکثر علماء اور بیشتر مشائخ کا یہ خیال تھا کہ قرآن کریم اخص الخواص کے مطالعہ، غور وفکر اور فہم وتفہیم کی کتاب ہے، اس کو عوام کے سامنے لانا، عوام کو براہ راست اس کے پڑھنے اور سمجھنے کی دعوت دینا سخت خطرناک ہے، عوام کو ذہنی انتشار میں مبتلا کرنا ہے اور خودرائی اور علماء سے بے نیازی بلکہ بغاوت وسرکشی کی دعوت دینا ہے — جبکہ امت میں پھیلے ہوئے الحاد وزندقہ، بدعات وخرافات اور احکام شریعت سے بے اعتنائی کا خاتمہ، اور دین کی صحیح سمجھ، جذبۂ عمل، خوف خدا، فکر آخرت، بدعت سے نفرت اور سنت سے محبت پیدا کرنے کا سب سے بڑا مؤثر ذریعہ قرآن کریم ہی ہے، اس لئے شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کی عام فہم فارسی زبان میں قرآن کریم کا یہ ترجمہ کیا ہے — اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، اور دیگر بلاد عجم میں قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آرہا ہے، یہ اردو، انگریزی، گجراتی، بنگالی اور پنجابی زبانوں میں جو بیسوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہیں۔

(۲) **الفوز الكبير في أصول التفسير**: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں ہے، اوراسی مقصد کے پیش نظر فارسی زبان میں لکھا ہے، جس مقصد کے پیش نظر قرآن کریم کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے، اس میں قرآن فہمی اور تفسیر کے نادر اصول وضوابط اور مفسرین کی تفسیروں کے بارے میں نہایت مفید نکات ہیں، اس کی مختلف حضرات نے تعریب کی ہے، سب سے بہتر تعریب حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم محدث کبیر دارالعلوم دیوبند کی ہے، موصوف نے اس کی عربی شرح بھی لکھی ہے، جس کا نام ''العون الکبیر'' ہے۔ الفوز الکبیر کی پرانی تعریب کی متعدد

حضرات نے اردو شرحیں بھی لکھی ہیں، پہلے العون الکبیر بھی پرانی تعریب کی شرح تھی، اب وہ بھی نئی تعریب کے مطابق کردی گئی ہے اور طبع ہوگئی ہے اور اس تعریب جدید کی جو دارالعلوم دیوبند اور دیگر معاہد عربیہ میں شامل درس کرلی گئی ہے اس کی پہلی اردو شرح الخیر الکثیر کے نام سے لکھی گئی ہے۔ جو طبع ہوگئی ہے۔

(۳) فتح الخبير بما لابد من حفظه في علم التفسير: یہ درحقیقت الفوز الکبیر کا پانچواں باب ہے، جس کو شاہ صاحب نے مستقل رسالہ کی حیثیت دی ہے، مگر یہ فارسی کے بجائے عربی میں ہے، اس میں اسباب نزول، قرآن کریم کے غریب الفاظ کی تشریحات، اور مشکل آیتوں کی توجیہات جمع کی گئی ہیں، جو بخاری، ترمذی اور حاکم کی تفسیروں سے ماخوذ ہیں۔

(۴) تاویل الأحادیث: یہ عربی زبان میں ہے، اس میں انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے قصے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، اور جن کو عام طور پر خرق عادت خیال کیا جاتا ہے، ان کی تاویلات وتوجیہات کی گئی ہیں، اور ان کے مخفی اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

(۵) مُصَفّٰی شرح موطا: شاہ صاحب نے پہلے موطا امام مالک کی تلخیص کی ہے، پھر اس کی یہ فارسی زبان میں عمدہ شرح لکھی ہے، جو شاہ صاحب کے درس کا نمونہ ہے۔

(۶) مسوّٰی شرح موطا: یہ موطا امام مالک کی عربی زبان میں مختصر شرح ہے، اور شاہ صاحب حدیث کے درس کا جو طریقہ رائج کرنا چاہتے تھے اس کا بہترین نمونہ ہے۔

(۷) حجة الله البالغة: یہ شاہ صاحب کی نہایت معرکۃ الآراء عربی تصنیف ہے، اور دو جلدوں میں ہے، اس میں فقہ الحدیث اور اسرار شریعت کا نہایت عمدہ بیان ہے، بہت سے جامعات میں داخل درس ہے۔ اس کی یہ پہلی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

(۸) إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء: "حجۃ اللہ" کی طرح یہ بھی شاہ صاحب کی دوسری معرکۃ الآراء فارسی تصنیف ہے، اس میں آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت کا برحق ہونا قرآن کریم، احادیث شریفہ، کتب تفسیر اور تاریخ کے حوالوں سے ثابت کیا ہے، شیعہ سنی اختلاف کو نہایت عدل وانصاف سے حل کیا ہے، جس سے شیعوں کی غلط فہمیاں اور شدت تعصب دور ہوسکتا ہے، اس کتاب میں اثبات خلافت کے ساتھ ساتھ سیرت، تاریخ اور سیاست وخلافت کے بارے میں بیش بہا نکات بھی بیان فرمائے ہیں، انداز بیان نہایت شگفتہ اور سلیس ہے۔ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ: "اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں"۔ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کا تأثر یہ ہے کہ: "جس نے یہ کتاب لکھی ہے، وہ ایک بحر بیکراں ہے، جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا"

(۹) قُرة العينين في تفضيل الشيخين: یہ بھی فارسی زبان میں ہے، اس میں صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی افضلیت کا بڑے حسین انداز میں بیان ہے۔ اور حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہما کے فضائل ومناقب کا تذکرہ ہے۔

(۱۰) سُرور المحزون :ابن سید الناس نے سیرت نبوی پر ایک ضخیم کتاب عیون الأثر فی فنون المغازی والشمائل والسِّیَر لکھی تھی، پھر اس کا جامع خلاصہ نور العیون فی تلخیص سِیَر الأمین والمامون کے نام سے کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے شیخ مرزا مظہر جان جاناں دہلوی کے اصرار پر اس کا فارسی میں خلاصہ کیا ہے۔ یہ سیرت کے موضوع پر نہایت عمدہ رسالہ ہے۔

(۱۱) التفہیمات الإلٰھیة : یہ شاہ صاحب کا کشکول ہے، اس میں زیادہ تر تصوف وسلوک کی باتیں ہیں، اور بعض مقامات پر اپنے زمانہ کی خرابیوں اور لوگوں کے عیوب ونقائص کی نشاندہی کی ہے، اور معاشرہ کے ہر طبقہ کو مخاطب کر کے اصلاح پر ابھارا ہے، اس کے بعض مضامین عربی میں اور بعض فارسی میں ہیں۔

(۱۲) فیوض الحرمین : اس میں قیام حرمین کے دوران جو فیوض وبرکات بصورت خواب یا بطریق الہام آپ کو حاصل ہوئے ہیں ان کا تذکرہ ہے، بعض جگہ پیشین گوئیاں، علم تصوف کے حقائق اور دیگر مسائل بھی ہیں، یہ کتاب عربی میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

(۱۳) الخیر الکثیر: اس میں شاہ صاحب نے علم سلوک اور تصوف کے معارف وحقائق عربی زبان میں بیان کئے ہیں۔

(۱۴) البدور البازغة : یہ نہایت دقیق کتاب ہے، اس میں حجۃ اللہ البالغہ کے بعض ابواب کا خلاصہ اور تصوف کے حقائق ومعارف کا بیان ہے۔

(۱۵) الانصاف فی بیان سبب الاختلاف: یہ رسالہ عربی میں ہے، اس میں صحابۂ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد ائمہ مجتہدین کے درمیان دینی مسائل میں جو اختلاف رونما ہوا اس کا راز اور اس کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول کے آخر میں تتمہ کے عنوان سے یہ پورا رسالہ شامل کر لیا گیا ہے۔

(۱۶) عِقد الْجید فی بیان أحکام الاجتھاد والتقلید: یہ رسالہ بھی عربی میں ہے، اس میں تقلید اور عدم تقلید شخصی پر محققانہ کلام کیا گیا ہے اور تقلید شخصی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

(۱۷) أطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم: یہ سرکار دوعالم ﷺ کی مدح میں عربی قصیدہ ہے۔

(۱۸) الدُّر الثمین فی مبشرات النبی الأمین : یہ رسالہ عربی میں ہے، اس میں ان بشارتوں کا تذکرہ ہے، جو آپ کو اور آپ کے بزرگوں کو بارگاہ رسالت سے ملی ہیں۔

(۱۹) أنفاس العارفین: اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال فارسی زبان میں قلم بند فرمائے ہیں۔

(۲۰) الجزء اللَّطیف :اس میں شاہ صاحب نے خود اپنے احوال فارسی زبان میں تحریر فرمائے ہیں، جس کا خلاصہ پہلے گذر چکا ہے۔

(۲۱) المقالة الوضیة فی الوصیة والنصحیة: یہ شاہ صاحب کا فارسی میں وصیت نامہ ہے۔

طرز تحریر اور تصنیفی خدمات

آپ کی تحریروں میں تحقیقی اور علمی نکات کے ساتھ ساتھ سوز و اخلاص اور خیر خواہی کے جوہر پائے جاتے ہیں، جس کے باعث وہ تحقیقی تصانیف ہونے کے ساتھ ایک دینی مصلح کا پیغام اور اخلاقی معلم کا درس بن گئی ہیں ــــ آپ کی تصانیف نہایت پرفتن وپُر آشوب زمانہ کی ہیں، لیکن اکثر وبیشتر تصانیف میں اس کی کہیں جھلک نظر نہیں آتی ۔ بلکہ نہایت توازن واعتدال کے ساتھ قلم کو رواں رکھا ہے، اور مرکزی نقطۂ خیال سے تجاوز نہیں فرمایا۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ آپ کی اسی خصوصیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''شاہ صاحب کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے پڑھ جایئے، آپ کو یہ معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ بارھویں صدی ہجری کے پُر آشوب زمانہ کی پیداوار ہیں ۔ جب ہر چیز بے اطمینانی اور بدامنی کی نذر تھی، صرف یہ معلوم ہوگا کہ فضل وعلم کا ایک دریا ہے، جو کسی شور وغل کے بغیر سکون وآرام کے ساتھ بہہ رہا ہے، جو زمان ومکان کے خس وخاشاک کی گندگی سے پاک صاف ہے''

اس کے علاوہ آپ ایک نئے اسلوب اور جداگانہ طرز کے بانی وموجد ہیں، جو جامعیت، زور بیان، تحکم واعتماد اور فصاحت وبلاغت میں نبی کریم ﷺ کے طرز تکلم سے مشابہ ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''عربی زبان میں انھوں نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی، جو ان کا مخصوص اسلوب ہے، پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر جوامع کلم النبی الخاتم ﷺ کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے، حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاورات سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں''

نیز باوجود عجمی نژاد اور ہندوستانی ہونے کے آپ نے عربی فصاحت وبلاغت کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے کہ جس کی عظمت کے اہل زبان بھی معترف ہیں، مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ:

''شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں، جن کی عربی تصانیف میں اہل زبان کی سی روانی وقدرت، اور عرب کی سی عربیت ہے، اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں، جو عجمی علماء کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں''

منظوم کلام

شاہ صاحب جس طرح نثر نگاری میں یکتائے زمانہ تھے، اسی طرح عربی اور فارسی نظم کہنے میں بھی قادر الکلام شاعر تھے، عربی نظم میں أطیب النغم کے نام سے نبی کریم ﷺ کی مدح ونعت میں ایک بسیط قصیدہ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

كَأَنَّ نُجوماً أَوْمَضَتْ فِي الْغَيَاهِبِ عيونُ الأفاعي أو رؤسُ العقارب

اس کے علاوہ تین قصیدے اور ہیں، آپ کا عربی دیوان بھی ہے، جس کو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے جمع کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے مرتب کیا ہے، اور فارسی میں بھی آپ کی چند غزلیں اور رباعیاں ہیں، جو ''کلمات طیبات'' اور ''حیات ولی'' میں موجود ہیں، فارسی میں آپ ''امین'' تخلص فرماتے تھے۔

آپ کیا تھے؟

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماتے ہیں کہ:

''حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ سرزمین ہند کے ان اکابر میں سے ہیں، جن کی نظیر نہ صرف اپنے عصر میں اور نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ بہت سے قرون اور ممالک اسلامیہ میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی، حضرت موصوف بقول حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند: ان افراد میں سے ہیں کہ سرزمین ہند میں اگر صرف شاہ ولی اللہ ہی پیدا ہوتے، تو ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی تھا (الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۶۰)

سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں: آیۃٌ من آیات اللّٰہ، ومعجزۃُ نبیّہ الکریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم: شاہ صاحب اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہیں (ظفر المحصلین ص ۶۰)

نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی اتحاف النبلاء میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

اگر وجود او در صدر اول در زمانہ ماضی می بود امام الائمۃ وتاج المجتہدین شمردہ می شد (حوالہ بالا)	اگر شاہ صاحب کا وجود گذشتہ زمانہ میں صدر اول میں ہوتا، تو امام الائمۃ اور تاج المجتہدین شمار ہوتے

علامہ شبلی فرماتے ہیں: ابن تیمیہ اور ابن رُشد کے بعد بلکہ انہیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہ تھی کہ پھر کوئی صاحب دل ودماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانہ میں شاہ ولی اللہ صاحب جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رُشد کے کارنامے ماند پڑ گئے (حوالہ بالا)

مفتی عنایت احمد کاکوروی فرماتے ہیں کہ: حضرت شاہ ولی اللہ کا حال اس شجرۂ طوبیٰ کا سا ہے جس کی جڑ شاہ صاحب کے گھر میں ہے، اور اس کی شاخیں تمام مسلمانوں کے گھروں میں ہیں، مسلمانوں کا کوئی گھر اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس شجرۂ طوبیٰ کی کوئی شاخ نہ ہو، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اس کی جڑ کہاں ہے؟ (العون الکبیر ص ۱۶)

اور آپ کے مدنی استاذ شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کُردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

اِنّہ لَیُسْنِدُ عَنّی اللفظَ وکنت أُصَحِّحُ منہ المعنی (العون الکبیر ص ۱۶)	شاہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ حدیث کی سند ملاتے تھے اور میں ان سے معنی حدیث کی تصحیح کرتا تھا

یہ تمام احوال اور فضائل الفوز الکبیر کی شرح العون الکبیر، الفوز العظیم، مولانا محمد حنیف صاحب گنگوہی کی

ظفر المحصلین اورالفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر سے ماخوذ ہیں،اوراسی شاہ ولی اللہ نمبرکی ایک نظم پرامام اکبر، محدث اعظم،مفسر قرآن، اصول تفسیر اور اسرار شریعت کے موجد ومدون،مجدد وقت،مفکر ملت،حکیم الامت، جامع شریعت وطریقت،آیۃ من آیات اللہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہ کے فضائل کا تذکرہ ختم کیا جاتا ہے۔

مجدد وقت

تو مُبلّغ تھا حدیث فخر موجودات کا
تیرے آتے ہی جنازہ اٹھ گیا بدعات کا

تو مفسر بھی محدث بھی، فقیہ وشیخ بھی
کون اندازہ لگائے تیرے محسوسات کا

تیری فطرت بے نیازِ درگہِ شاہ و وزیر
تجھ کو دنیا میں بھروسہ تھا خدا کی ذات کا

میں سمجھتا ہوں، مشیت کا وہی مفہوم تھا
تو نے جو مطلب لیا قرآن کی آیات کا

عقل ومذہب کوسمویا تو نے اس انداز سے
صبح میں جیسے نمایاں ہو دھندلکا رات کا

تیرے ارشادات میں سامان تسکین ضمیر
روح ایماں نقطہ نقطہ تیرے ملفوظات کا

سادگی اسلام کی پھر سے نمایاں ہوگئی
نور جب پھیلا جہاں میں تیری ''تفہیمات'' کا

تیرے وارث ہیں تیرے نور ہدایت کی شبیہ
اب بھی چرچا ہے جہاں میں تیری تعلیمات کا

(ماہر القادری،حیدرآباد،دکن)

شاہ صاحب کی ایک قیمتی وصیت

اس تعارف کے آخر میں مجدد وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی ایک اہم وصیت ذکر کی جاتی ہے، تاکہ آپ اس پرعمل کر کے نزول قرآن اور بعثت رسول کے مقصد کوتقویت اورشاہ صاحب کی روح کوراحت پہنچائیں، وصیت حسب ذیل ہے:

اول وصیت ایں فقیر: چنگ زدن است بہ کتاب وسنت دراعتقادوعمل،وپیوستہ بتدبّر ہردو مشغول شدن،وہرروز حصہ ازہردوخواندن،واگر طاقتِ خواندن ندارد ترجمہ ورقے از ہردو شنیدن

ترجمہ:اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ:اعتقاداورعمل دونوں میں کتاب وسنت (قرآن وحدیث) کونہایت مضبوطی سے پکڑے،اور برابر دونوں میں تدبر (غوروفکر) جاری رکھے،اور ہرروز دونوں کا کچھ حصہ پڑھے،اور اگر پڑھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو،توکسی دوسرے سے کم ازکم ایک ورق دونوں کا ترجمہ ہی سن لیا کرے۔

❀ ❀ ❀



حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ

کا

کلامی اور فقہی مسلک

مُسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بارے میں اصحاب ظواہر (غیر مقلدین) کا خیال ہے کہ آپ تقلید ائمہ سے عام طور پر، اور حنفیت سے خاص طور پر بیزار تھے۔ ان کے خیال میں شاہ صاحب مسلک اہلِ حدیث پر تھے یعنی غیر مقلد تھے۔ چنانچہ وہ اپنا انتساب آپ کی طرف کرتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر بھی کچھ گفتگو ہو جائے:

کلامی مسائل میں اہل حق کی تین جماعتیں:

علم کلام میں یعنی عقائد کے باب میں اہل حق کی تین جماعتیں ہیں: اشاعرہ، ماتریدیہ اور سلفیہ (یا حنابلہ)

۱- اشاعرہ: وہ حضرات ہیں جو شیخ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ (۲۶۰-۳۲۴ھ) کی پیروی کرتے ہیں۔ امام ابوالحسن اشعری چونکہ شافعی تھے۔ اس لئے یہ مکتب فکر شوافع میں مقبول ہوا یعنی حضرات شوافع عام طور پر کلامی مسائل میں اشعری ہوتے ہیں۔

۲- ماتریدیہ: وہ حضرات ہیں جو شیخ ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ (متوفی ۳۳۳ھ) کی پیروی کرتے ہیں۔ امام ماتریدی چونکہ حنفی تھے اس لئے یہ مکتب فکر احناف میں مقبول ہوا۔ احناف عام طور پر کلامی مسائل میں ماتریدی ہوتے ہیں۔

اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان بارہ مسائل میں اختلاف ہے، جو سب فروعی (غیر اہم) مسائل ہیں۔ بنیادی کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے۔[1]

---

[1] ان بارہ مسائل کو علامہ احمد بن سلیمان معروف بہ "ابن کمال پاشا" رحمہ اللہ (متوفی ۹۴۰ھ) نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ مطبوعہ ہے، مگر عام طور پر علماء اس سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے وہ رسالہ ذیل میں بعینہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ علماء تک پہنچ جائے:

رسالة الاختلاف بين الأشاعرة والماتريدية

في اثنتى عشر مسئلة للمحقق ابن كمال باشا

←

→

بسم الله الرحمن الرحيم

قال الأستاذ : اعلم أن الشيخ أبا الحسن الأشعريّ إمامُ أهلِ السنّةِ، ومقدَّمُهم؛ ثم الشيخ أبو المنصور الماتريدى؛ وأن أصحابَ الشافعي وأتباعه تابعون له– أى لأبى الحسن الأشعرى – فى الأصول، وللشافعي في الفروع؛ وأن أصحاب أبى حنيفة تابعون للشيخ أبى منصور الماتريدىّ فى الأصول، ولأبى حنيفة فى الفروع؛ كذا أفاد بعضُ مشايخنا رحمه اللّٰه تعالىٰ.

ولا نزاع بين الشيخين إلا فى اثنى عشر مسئلةً:

الأولى :قال الماتريدى:التكوين صفة أزلية، قائمة بذات اللّٰه تعالى، كجميع صفاته، وهو غيرُ المكوَّن، ويتعلق بالمكوّن من العالَم، وكلِّ جزء فيه، بوقتِ وجوده، كما أن إرادة اللّٰه تعالى أزليةٌ، يتعلق بالمرادات بوقت وجودها، كذا قدرتُه تعالى الأزليةُ مع مقدوراتها.

وقال الأشعرى : إنها صفةٌ حادثة، غيرُ قائمة بذات اللّٰه تعالى، وهى من الصفات الفعلية عنده، لا من الصفات الأزلية. والصفاتُ الفعلية كلها حادثة، كالتكوين والإيجاد، ويتعلّق وجودُ العالَم بخطاب: " كن".

المسألة الثانية : قال الماتريدى: كلام اللّٰه تعالى ليس بمسموع، وإنما المسموع الدالُّ عليه. وقال الأشعرى:مسموع ، كما هو المشهور من حكاية موسى عليه السلام.

وقال ابن فُورك: المسموعُ عند قراءة القارى شيئان: صوتُ القارى وكلام اللّٰه تعالى، وقال القاضى الباقلانى : كلام اللّٰه غيرُ مسموع على العادة الجارية، ولكن يجوز أن يُسمع اللّٰهُ تعالى من شاء من خلقه، على خلاف قياس العادة، من غير واسطة الحروف والصوت، وقال أبو إسحاق الإسفرائنى ومن تبعه: إن كلامَ اللّٰه تعالى غيرُ مسموع أصلاً، وهو اختيار الشيخ أبى منصور الماتريدى، كذا فى البداية.

المسألة الثالثة: قال الماتريدى: صانعُ العالَم موصوفٌ بالحكمة، سواء كانت بمعنى العلم، أو بمعنى الأحكام. وقال الأشعرى: إن كانت بمعنى العلم فهى صفة أزلية، قائمة بذات اللّٰه تعالى، وإن كانت بمعنى الأحكام فهى صفة حادثة، من قبيل التكوين، لايُوصف ذاتُ البارى بها.

المسألة الرابعة: قال الماتريدى: إن اللّٰه يريد بجميع الكائنات: جوهرًا أو عرضا، طاعة أو معصيةً، إلا أن الطاعة تقع بمشيّة اللّٰه، وإرادته، وقضائه، وقدرته، ورضائه، ومحبته، وأمره؛ وأن المعصيةَ تقع بمشية اللّٰه تعالى، وإرادته، وقضائه، لابرضائه، ومحبته، وأمره.

وقال الأشعرى: إن رضااللّٰه تعالى ومحبتَه شاملٌ بجميع الكائنات ، كإرادته.

المسألة الخامسة : تكليفُ مالا يُطاق ليس بجائز عند الماتريدى، وتحميلُ ما لايُطاق عنده جائز؛ وكلاهما جائزان عند الأشعرى.

المسألة السادسة : قال الماتريدى: بعضُ الأحكام المتعلّقةِ بالتكليف معلوم بالعقل،لأن العقل ←



۳- سلفیہ: وہ حضرات ہیں جو صفاتِ خداوندی کی تاویل کے عدم جواز میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (۱۶۴-۲۴۱ھ) وغیرہ کے مسلک پر ہیں۔ چونکہ صفات کے تعلق سے یہ ذوق اسلاف کرام کا تھا اس لئے یہ حضرات سلفیہ کہلائے۔ اس جماعت کو کتابوں میں حنابلہ بھی کہا گیا ہے۔ مگر چونکہ فقہی حنبلیت سے اشتباہ ہوتا تھا اس لئے رفتہ رفتہ یہ اصطلاح متروک ہوگئی۔ مسئلہ خلق قرآن میں یہی نام سلفیہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ نیز اس مسلک کو مسلک محدثین بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ امام مالک، سفیان ثوری وغیرہ حضرات محدثین سے صفاتِ متشابہات کے بارے میں یہی نقطۂ نظر مروی ہے۔ اور اس زمانہ میں جو سلفیت کو بمعنی ظاہریت یعنی عدم تقلید ائمہ استعمال کیا جاتا ہے وہ تلبیس ہے اور

← آلةٌ يُدرك بها حُسنُ بعضِ الأشياء وقبحُها، وبها يُدرك وجوبُ الإيمان، وشكرُ المنعم، وإن المعرِّف والموجِب هو الله تعالى، لكن بواسطة العقل، كما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم معرِّفُ الوجوب، والموجبُ الحقيقي هو الله تعالى، لكن بواسطة الرسول عليه السلام، حتى قال: لا عذر لأحدٍ في الجهل بخالقه، ألا يرى خلقَ السماواتِ والأرضَ؟! ولو لم يَبْعثْ رسولاً لوجب على الخلق معرفتُه بعقولهم.

وقال الأشعري: لايجبُ شيئٌ ولا يَحرمُ إلا بالشرع، لا بالعقل، وإن كان للعقل أن يُدرك حُسْنَ بعضِ الأشياء، وعند الأشعري: جميعُ الأحكام المتعلّقة بالتكليف مُلقاةٌ بالسمع.

المسألة السابعة: قال الماتريدي: قد يَسْعَدُ الشقي، وقد يشقى السعيد. وقال الأشعري: لا اعتبار بالسعادة والشقاوة إلا عند الخاتمة والعاقبة.

المسألة الثامنة: العفو عن الكفر ليس بجائز، وقال الأشعري: يجوز عقلاً، لاسمعاً.

المسألة التاسعة: قال الماتريدي: تخليد المؤمن في النار، وتخليد الكافر في الجنة لايجوز عقلاً وسمعاً؛ وعند الأشعري: يجوز.

المسألة العاشرة: قال بعضُ الماتريدية: الاسم والمسمى واحد، وقال الأشعري: بالتغاير بينهما، وبين التسمية، ومنهم من قسَّم الاسم إلى ثلاثة أقسام: قسمٌ عينُه، وقسم غيره، وقسم ليس بعينه ولا بغيره. والاتفاقُ على أن التسمية غيرهما، وهي ماقامت بالمسمى، كذا في بداية الكلام.

المسألة الحادية عشر: قال الماتريدي: الذكورة شرط في النبوة، حتى لا يجوز أن تكون الأنثى نبياً، وقال الأشعري: ليست الذكورةُ شرطاً فيها، والأنوثةُ لاتنافيها، كذا في بداية الكلام.

المسألة الثانية عشر: قال الماتريدي: فعلُ العبد يسمى كسْبًا، لا خلْقًا؛ وفعلُ الحقِّ يسمى خلقاً، لاكسبًا؛ والفعلُ يتناولهما. وقال الأشعري: الفعلُ عبارة عن الإيجاد حقيقةً، وكَسْبُ العبد يسمى فعلاً بالمجاز، وقد تَفَرَّد القادر خَلْقًا، ولا يجوز تفرد القادر به كسبًا.

(تمت الرسالة الشريفة لابن كمال باشا رحمه الله تعالى)

(یہ رسالہ کتب خانہ مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ۳۳۵/۱ میں متفرق، ضمن "مجموعہ خمس رسائل" میں ہے)

لفظ کا غیر معروف معنی میں استعمال ہے۔

اور سلفیوں کا اشاعرہ اور ماتریدیہ سے اختلاف صرف ایک معمولی بات میں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ صفات متشابہات: استواء علی العرش، ید، وجہ وغیرہ کی تاویل جائز ہے یا نہیں؟ سلفیوں کے نزدیک تاویل ناجائز ہے اور باقی دونوں مکاتب فکر کے نزدیک تاویل جائز ہے۔ چنانچہ حنابلہ قرآن کریم کو جو اللہ کی صفتِ کلام ہے مطلقاً، بلا تاویل قدیم کہتے ہیں۔ اور اشاعرہ اور ماتریدیہ کلام نفسی کی تاویل کرتے ہیں اور اس کو قدیم کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے مسلک محدثین کے خلاف لفظی بالقرآن حادث کہہ دیا تھا تو حنابلہ نے جن کے سرخیل امام ذہلی تھے، ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔

غرض علم کلام میں یہی تین جماعتیں برحق ہیں۔ دیگر تمام فرق اسلامیہ جیسے معتزلہ، جہمیہ، کرّامیہ وغیرہ گمراہ فرقے ہیں۔ یہی فرقے اہل السنہ والجماعہ کے خصم (مدمقابل) ہیں اور درمختار کے مقدمہ میں ہے کہ: إذا سُئلنا عن معتقدنا ومعتقد خصومنا، قلنا وجوباً: الحقُّ ما نحن عليه، والباطلُ ما عليه خصومُنا.

شاہ صاحب کلام میں اشعری تھے:

کلامی مسائل میں حضرت شاہ صاحب اشعری تھے۔ بخاری شریف کے ایک قلمی نسخہ پر، جس کا تذکرہ آگے آتا ہے، شاہ صاحب نے بقلم خود اپنے کو ''اشعری'' لکھا ہے۔ تاہم صفات کی تاویل کے مسئلہ میں آپ محدثین کرام یعنی اسلاف کے مسلک کو بھی برحق سمجھتے تھے۔ اور صفات کی تاویل کو آپ ناپسند کرتے تھے مگر بایں ہمہ آپ نے صفات کی تاویل کی بھی ہے۔ اسی جلد میں مبحث خامس کے باب (۴) میں جو صفات الٰہیہ پر ایمان لانے کے بیان میں ہے، آپ نے پہلے صفات کے بارے میں دشواریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس کا حل پیش کیا ہے۔ پھر یہ بات بیان کی ہے کہ صفات پر دلالت کرنے والے الفاظ بعینہٖ استعمال کئے جائیں، اور استعمال سے زیادہ کھود کرید نہ کی جائے۔ پھر صراحۃً یہ بات بیان فرمائی ہے کہ صفات کے بارے میں محدثین کا موقف صحیح ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''صفات کی تاویل میں گھسنے والوں نے محدثین کی جماعت کو بدنام کیا ہے۔ وہ ان کو مُجَسِّمَہ اور مُشَبِّھَہ کہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ بلا کیف کے پردہ میں چھپنے والے ہیں۔ اور مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ان کی یہ زباں درازی کچھ بھی نہیں۔ اور وہ اپنی باتوں میں نقلاً بھی اور عقلاً بھی غلطی پر ہیں۔ اور انھوں نے جو ہدایت کے پیشواؤں پر اعتراضات کئے ہیں: وہ اس میں خطا کار ہیں''

پھر معاً بعد آپ نے صفات الٰہیہ کے معانی تفصیل سے بیان کئے ہیں یعنی ان کی تاویلات کی ہیں۔ اور بات یہاں سے شروع کی ہے کہ ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم صفات کی ایسی معانی سے تشریح کریں، جو اظہار حقیقت میں ان تاویل کرنے والوں کی باتوں سے اقرب اور زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ اشعری

ضرور ہیں: صفات کی تاویل کو جائز رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی اسلاف کے مسلک کو بھی برحق خیال کرتے ہیں۔

شاہ صاحب فروعات میں حنفی تھے:

حضرت شاہ صاحب مقلد اور عملاً حنفی تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔ یہ تحریر خدا بخش لائبریری میں صحیح بخاری کے ایک نسخہ پر ہے، جو حضرت شاہ صاحب کے زیر درس رہا ہے۔ اس میں آپ کے ایک تلمیذ محمد بن پیر محمد بن شیخ ابی الفتح نے پڑھا ہے۔ تلمیذ مذکور نے درس صحیح بخاری کے ختم کی تاریخ ۲۶ رشوال ۱۱۵۹ھ لکھی ہے، جمنا ندی کے قریب جامع فیروزی میں کتاب ختم ہونا لکھا ہے۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ہاتھ سے اپنی سند امام بخاری تک لکھ کر تلمیذ مذکور کے لئے سند اجازت تحدیث لکھی ہے اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ یہ کلمات لکھے ہیں: **العُمَریُ نسبًا، الدِّهلوی وطنًا، الأشعری عقیدةً، الصوفی طریقةً، الحنفی عملاً، والحنفی الشافعی تدریسًا، خادم التفسیر والحدیث والفقة والعربیة والکلام..... ... ۲۳ رشوال ۱۱۵۹ھ**

اس تحریر کے نیچے حضرت شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے یہ عبارت لکھی ہے کہ: ''بیشک یہ تحریر بالا میرے والد محترم کے قلم کی لکھی ہوئی ہے''

علاوہ ازیں تقلید کی ضرورت پر بحث فرماتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول کے تتمہ کی آخری فصل میں تصریح فرمائی ہے کہ: ''مذاہب اربعہ کی تقلید کے جواز پر کل امت مرحومہ یا اس کے معتمد حضرات کا اجماع ہو چکا ہے اور تقلید ائمہ میں کھلی مصالح شرعیہ موجود ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں کہ ہمتیں کوتاہ ہیں، ہوائے نفسانی کا غلبہ ہے اور ہر شخص اپنی رائے کو دوسروں کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے''

پھر اس پر مفصل بحث کی ہے کہ ابن حزم ظاہری نے جو تقلید کو حرام کہا ہے اور اس پر دلائل قائم کئے ہیں، وہ صرف ان لوگوں کے حق میں صحیح ہوسکتا ہے:

۱- جو خود اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم پورا پورا رکھتے ہوں اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ امور سے واقف ہوں۔

۲- یا اُن جاہلوں کے حق میں صحیح ہوسکتا ہے جو کسی کی تقلید اس عقیدہ سے کرتے ہوں کہ اس شخص سے کوئی غلطی اور خطا ممکن نہیں۔ اور وہ اس کی تقلید کسی بھی مسئلہ میں چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں، خواہ اس کے خلاف بڑی سے بڑی دلیل بھی کیوں نہ آجائے۔

۳- یا اُس شخص کے حق میں صحیح ہے جو مثلاً حنفی ہونے کی وجہ سے کسی شافعی سے مسائل دریافت کرنا جائز نہ سمجھتا ہو یا اس کے برعکس۔ یا حنفی: شافعی امام کے پیچھے اقتداء کو جائز نہ سمجھتا ہو یا اس کے برعکس۔

لیکن تقلید کو اس شخص کے حق میں نادرست نہیں کہہ سکتے جو دینی امور کا ماخذ نبی اکرم ﷺ کے اقوال کو سمجھتا ہو، اور حلال وحرام صرف ان ہی چیزوں کو سمجھتا ہو جن کو خدا اور رسولِ خدا ﷺ نے حلال وحرام کیا ہے۔ ایسا شخص اگر بے علمی کی وجہ سے کسی عالم کو عالم دین ومتبع سنت سمجھ کر اتباع کرے، اور غلطی کی صورت میں صحیح بات کو تسلیم کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے تو ایسے شخص کی تقلید پر نکیر کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ افتاء اور استفتاء کا طریقہ عہد نبوت سے اب تک برابر چلا آ رہا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم کسی فقیہ کو موحیٰ الیہ یا معصوم نہ سمجھیں۔

شاہ صاحب قدس سرہ کی یہ ساری گفتگو جو ان شاء اللہ جلد دوم میں آئے گی، تقلید کے ثبوت پر ایک ناطق شہادت ہے علاوہ ازیں اس جلد میں بھی مبحث خامس کے باب دوم میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مجتہدین کی طرف سے دفاع کیا ہے کہ ان کی تقلید غیر اللہ کو رب بنانا نہیں۔

تدریساً حنفی شافعی ہونے کا مطلب

اور تدریساً یعنی سبق پڑھانے کے اعتبار سے حنفی شافعی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سبق میں — اور تصنیف بھی تدریس ہی ہے — شاہ صاحب اس کے پابند نہیں کہ ہر مسئلہ میں حنفیت ہی کو ترجیح دیں۔ آپ کے نزدیک ظاہر دلائل سے جو مذہب راجح ہوتا ہے، اس کو ترجیح دیتے ہیں، مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو فقہ حنفی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے بعض بڑے اساتذہ کا بھی یہی مزاج تھا۔ آپ سبق آزاد ہو کر پڑھاتے تھے، مگر جب عمل کرتے یا فتوی لکھتے تو حنفیت کے دائرہ میں رہتے۔

اور اس کی وجہ خود شاہ صاحب نے اپنی بعض تالیفات میں بیان کی ہے کہ:

کسی مذہب کے حق ہونے کے دو معنی ہیں:

ایک یہ کہ وہ مذہب قرآن وحدیث کی نصوص کے ظاہری معنی کے موافق ہے۔

دوم یہ کہ وہ مذہب نصوص کے مقصود ومظانّ کے موافق ہے۔

چنانچہ آپ نے کسی جگہ مذہب شافعی کو ترجیح دی ہے تو وہ پہلے معنی کے اعتبار سے ہے اور حق اس مسئلہ میں بھی مذہب حنفی میں ہوتا ہے دوسرے معنی کے اعتبار سے۔ اس کی تفصیل مولانا سندھی رحمہ اللہ کی کتاب **إلهام الرحمن في تفسير القرآن** (۱:۲۳۱-۲۳۳) میں ہے۔

علاوہ ازیں، شاہ صاحب قدس سرہ حنفی تھے، شافعی تھے یا مالکی تھے، کچھ بھی تھے مگر غیر مقلد ہرگز نہیں تھے۔ یہ ظاہریت تو ایک باطل مکتب فکر ہے کیونکہ اس کی بناء انکار اجماع وقیاس پر ہے۔ شاہ صاحب نے عقد الجید میں اور حجۃ اللہ البالغہ کی قسم اول کے تتمہ میں اس کی صراحت کی ہے **والله يهدي السبيل!**

حجۃ اللہ البالغہ

(مطبوعہ اور مخطوطہ نسخے)

مشہور ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ، حجۃ اللہ البالغہ کی تبییض نہیں کرپائے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ نے کتاب کا مسودہ چھوڑا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول صفحہ ۱۴۰ کے حاشیہ میں ہے ومن ھھنا یُعلم أن المصنف رحمہ اللہ لم یتیسر لہ النظر الثانی فی ھذا الکتاب، کما ھو مشھور عند الناس اھ من ھامش الأصل یعنی محشی نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں لکھی، بلکہ کسی مخطوطہ نسخہ کے حاشیہ سے نقل کی ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ حجۃ اللہ کی تصنیف شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات سے بہت پہلے مکمل ہوگئی تھی۔ اور طلبہ نے یہ کتاب آپ سے بار بار پڑھی بھی ہے۔ اور تفہیمات میں شاہ صاحب نے متعدد جگہ اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مثلاً:

تفہیمات جلد اول، صفحہ ۵۱ تفہیم نمبر ۱۵ میں، اور جلد دوم، صفحہ ۲۰۵ تفہیم ۲۰۲ میں اور جلد دوم، صفحہ ۲۳۵ تفہیم ۲۲۷ میں اور جلد دوم، صفحہ ۲۴۹ تفہیم ۲۳۱ میں شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کا حوالہ دیا ہے۔

اور تفہیمات جلد اول، صفحہ ۳۰۹ تفہیم ۶۷ میں ہے کہ حافظ عبدالرحمٰن بن حافظ نظام الدین تتوی نزیل دہلی نے شاہ صاحب سے حجۃ اللہ بھی پڑھی ہے۔

مطبوعہ نسخے

① —— حجۃ اللہ البالغہ: پہلی مرتبہ حضرت مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۱۲ھ) کی تصحیح وتعلیق کے ساتھ مولانا محمد منیر کے مطبع صدیقی بریلی میں، بہ تحریک وتعاون فاضل گرامی جناب منشی محمد جمال الدین صاحب رحمہ اللہ (متوفی ۱۲۹۹ھ) مدار المہام ریاست بھوپال طبع ہوئی تھی۔ تاریخ طبع حجۃ اللہ البالغۃ مکمّلۃ ہے جس سے ۱۲۸۶ھ نکلتا ہے۔ مولانا نانوتوی نے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے کتاب کی تصحیح اور تعلیق کی ہے۔ کتاب کے آخر میں ان نسخوں کا تذکرہ ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا احمد حسن مرادآبادی، حضرت مولانا محمد سعد اللہ صاحب مرادآبادی،

حضرت مولانا محمد ریاض الدین کاکوروی، اور حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رام پوری کے مخطوطہ نسخوں سے کتاب اشاعت کے لئے تیار کی ہے۔ یہ پہلا ایڈیشن جہازی سائز کے ۴۹۶ صفحات میں مکمل ہوا ہے اور ایک ہی جلد میں ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں یہ نسخہ موجود ہے۔

مولانا نانوتویؒ نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات سے ایک سو دس سال بعد جب کتاب طبع کرنے کا بیڑا اٹھایا، تو اس وقت کتاب کے قلمی نسخے بڑی تعداد میں ملک کے طول وعرض میں موجود تھے۔ آپ نے محنت شاقہ اٹھا کر بڑی جانکاہی سے کتاب کا صحیح ترین نسخہ تیار کیا۔ چنانچہ مطبوعہ صدیقی تمام مطبوعہ نسخوں میں صحیح ترین نسخہ ہے۔ مگر اس میں بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جو کتاب فہمی میں سدِ راہ ہوتی ہیں۔

مطبوعہ صدیقی میں مختصر تعلیقات کے علاوہ، عبارت میں ضروری اعراب بھی لگائے گئے ہیں، جن سے کتاب فہمی میں بڑی مدد ملتی ہے پہلے خیال تھا کہ یہ تعلیقات اور اعراب مولانا نانوتویؒ نے لگائے ہیں۔ مگر جب مخطوطہ کراچی کا فوٹو آیا، جو خود شاہ صاحب کے سامنے پڑھا گیا ہے، تو یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ ضروری اعراب یا تو خود مصنف نے لگائے ہیں، یا پڑھتے وقت ان کے تلامذہ نے لگائے ہیں اور بعض حواشی بھی اس میں موجود ہیں۔ اور بین السطور میں ترکیب کے بعض اشارے بھی ہیں۔ اور ضمائر کے مراجع کی تعیین کے لئے نمبر بھی ڈالے گئے ہیں۔ غرض یہ ضروری اعراب کتاب فہمی کے لئے نہایت کارآمد چیز ہیں۔ یہ چھوٹی موٹی شرح کا کام دیتے ہیں۔ میں نے وہ اعراب نہ صرف یہ کہ باقی رکھے ہیں، بلکہ اس میں ضروری اضافہ بھی کیا ہے۔

(۲)—— پھر اس مطبوعہ صدیقی سے بہ عنایت نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ) اور بہ مصارف حکومتِ بھوپال حجۃ اللہ مصر کے مطبعہ خیریہ میں ۱۳۲۲ھ میں طبع ہوئی۔ اس طبع میں ناشر نے کتاب کو پہلی بار دو جلدوں میں تقسیم کیا اور جلد دوم بے جوڑ جگہ سے شروع کی۔ علاوہ ازیں حجۃ اللہ مصر میں دو مرتبہ اور بھی شائع ہوئی ہے ان میں سے ایک مرتبہ مطبع امیریہ بولاق میں طبع ہوئی ہے۔ مطبوعہ مصر میں اعراب نہیں ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں ٹائپ میں اعراب کی سہولت عام نہیں تھی، اور اہل لسان کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بغیر ضروری اعراب کے طبع کرنے سے کتاب فہمی کی راہ میں دشواری پیدا ہوگئی۔ اس وقت ہندوپاک میں مطبوعہ مصر کے فوٹو شائع ہورہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہیں۔

(۳)—— ماضی قریب میں مصر ہی سے قاہرہ کے دارالکتب الحدیثہ اور بغداد کے مکتبۃ المثنّٰی کے اشتراک سے سید سابق (مؤلف فقہ السنہ) کی تحقیق ومراجعت سے حجۃ اللہ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ مگر یہ کوئی اہم نسخہ نہیں ہے۔ محقق کا نام بس برائے بیت ہے۔ انھوں نے کتاب میں مقدمہ کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ بس عبارت کے پیرا گراف بنادیئے ہیں۔ غالباً ناشرین نے طباعت کا جواز پیدا کرنے کے لئے موصوف کا نام استعمال کیا ہے۔

کتاب کے مخطوطے

(۱) ـــــ مخطوطہ کراچی: کراچی (پاکستان) میں جناب خالد اسحاق ایڈوکیٹ صاحب کا ایک نہایت نادر کتب خانہ ہے۔اس میں حجۃ اللہ کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جو حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے سامنے پڑھا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائیں میرے دوست، فاضل محترم، دارالعلوم دیوبند کے سابق استاذ، جناب مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی دام لطفہٗ حال استاذ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی و مدیر ماہنامہ البینات کراچی (عربی) کو کہ انھوں نے اس نسخہ کی کھوج لگائی اور جناب خالد اسحاق صاحب سے ملاقات کی، موصوف نے خندہ پیشانی سے اس کا فوٹو عنایت فرمایا فجزاهما الله تعالى خيراً فى الدارين (آمین)

یہ مخطوطہ حضرت شاہ صاحب کی وفات سے سترہ سال پہلے ۱۱۵۹ھ میں لکھا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں اس کی صراحت ہے۔پھر یہ نسخہ طلبہ نے مصنفؒ سے پڑھا ہے۔کتاب کے شروع میں یہ تحریر ہے:''پیش حضرت شیخ مصنف بطریق تعلّم شروع نمودہ شد،اللہ سبحانہ توفیق اتمام دہاد،وتحقق بایں علوم میسر کناد'' پھر اس تحریر کے بازو میں اسی قلم سے لکھا ہے:''تا شعبان ۱۱۶۲ھ تا آخر پیش حضرت مرشد خواندہ شد،اللہ تعالیٰ تحقق میسر کناد'' اور کتاب کے آخر میں لکھا ہے:''تم الكتاب:"الحجة البالغة" بيد الفقير الحقير بندہ کریم:ہر کہ خواند دعا طمع دارم۔زانکہ من بندۂ گنہ گارم در ۱۱۵۹ ہجری المقدس''

یہ نسخہ ۲۷۳ اوراق میں ہے۔اور دو تحریروں میں لکھا گیا ہے ۷۵ اوراق خط نسخ میں ہیں اور باقی خط نستعلیق میں ہیں۔قسم اول کے آخر میں جو تتمہ ہے وہ اس نسخہ میں نہیں ہے۔یہ مضامین شاہ صاحب نے بعد میں بڑھائے ہیں۔کتاب میں کئی جگہ حک و فک ہے بعض عبارتیں قلم زد کردی گئی ہیں۔یہ مخطوطات میں صحیح ترین نسخہ ہے اور کتاب کی تصحیح میں اس سے بڑی مدد ملی ہے۔

(۲) ـــــ مخطوطہ پٹنہ: بانکی پور، عظیم آباد کی خدا بخش لائبریری میں بھی حجۃ اللہ کا ایک مخطوطہ ہے۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائیں میرے دوست جناب مولانا ثناء الہدی ویشالوی زید لطفہٗ (مؤلف تفہیم السنن) کو کہ انھوں نے نہ صرف اس نسخہ کا پتہ چلایا، بلکہ اس کی فلم بھی حاصل کرلی، جس کو فاضل محترم، صدیق مکرم جناب مولانا افتخار حسین صاحب کٹیہاری قاسمی استاذ مدرسہ امینیہ دہلی نے کاغذ پر منتقل کروایا۔اللہ تعالیٰ دونوں دوستوں کو دارین میں ان کی محنت کی جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کو ترقیات سے نوازیں (آمین)

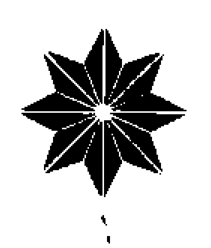
یہ نسخہ ۲۵۷ اوراق میں نہایت خوشخط ہے۔۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا ہے۔کتاب کے آخر میں ہے:''تمت: تمام شد این کتاب بموجب فرمائش جناب منشی محمد حسن صاحب دام اقبالہ بتاریخ دوازدہم ماہ ربیع الثانی سنہ ۲۲ جلوسی مطابق ہجری ۱۲۴۰ فقط''۔صحت میں اس کا دوسرا مقام ہے۔جو مضامین مخطوطہ کراچی میں نہیں ہیں ان کی تصحیح اسی نسخہ سے کی گئی ہے۔

(۳)ـــــ مخطوطہ برلین: جرمنی کے مشہور شہر برلین (Berlin) کی لائبریری میں بھی حجۃ اللہ کا ایک مخطوطہ ہے۔ اس کا فوٹو برادر مکرم ومحترم جناب مولانا اسماعیل صاحب سیدات امام مسجد قبا اسٹافورڈ ہیل لندن کی عنایت سے اور فاضل گرامی حضرت مولانا محمد شمیم صاحب باگیا مقیم لندن کی سعی جمیل سے اور محب محترم، برادر مکرم جناب حافظ عبدالرحیم ملا صاحب (تاجر شہر لندن) کے تعاون سے حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان تینوں دوستوں کو دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائیں (آمین)

یہ نسخہ سب سے زیادہ واضح اور صاف ہے۔ ۵۳۹ صفحات میں ہے۔ مگر بے حد غلط ہے۔ کسی طرح بھی قابل اعتماد نہیں، میں نے دیگر نسخوں کی تائید کے بغیر صرف اس نسخہ سے کتاب میں کوئی تصحیح نہیں کی۔

(۴)ـــــ حجۃ اللہ کا ایک نسخہ محدث محب اللہ صاحب العلم کے کتب خانہ میں ہے یہ ضلع حیدرآباد سندھ کے موضع پیر جھنڈا میں ہے۔ جو ۱۱۸۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب شیخ محمود بن محمد سندھی ہیں۔ یہ نسخہ ۱۴۴ اوراق میں ہے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے تفہیمات کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ''اس کا خط عمدہ ہے، نسخہ تصحیح شدہ ہے، حضرت علامہ سندھی رحمہ اللہ کے مطالعہ میں رہ چکا ہے''۔ غالباً مولانا سندھی رحمہ اللہ کی تقریر میں جو تصحیحات ہیں وہ اس نسخہ سے کی گئی ہیں۔ میں نے یہ نسخہ تلاش کیا مگر وسائل کی کمی اور ملک دوسرا ہونے کی وجہ سے مجھے اب تک کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

علاوہ ازیں حجۃ اللہ البالغہ کے اور بھی متعدد مخطوطے ہیں حضرت مولانا نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی زید مجدہ نے بتلایا کہ حجۃ اللہ البالغہ کے آٹھ قلمی نسخے موجود ہیں۔ جن میں سے ایک حرم مکی کے مکتبہ میں ہے جو حضرت مولانا اسحاق صاحب محدث دہلوی کے مطالعہ میں رہا ہے۔ (مولانا کی بات پوری ہوئی) اور مجھے اس مخطوطہ کی تلاش ہے جس میں قسم اول کے آخر کا تتمہ ہے۔ مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے مطبوعہ صدیقی میں تتمہ کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ صرف ایک مخطوطہ میں تھا جس کی بناء پر اس کو کتاب میں لیا گیا ہے۔ مجھے جو تین مخطوطے حاصل ہوئے ہیں ان تینوں میں یہ تتمہ نہیں ہے۔ اس لئے مجھے ہنوز اس مخطوطہ کی تلاش ہے جس میں یہ تتمہ ہے۔ اگر کوئی قاری اس سلسلہ میں میرا تعاون اور راہ نمائی کرسکتے ہوں تو دریغ نہ کریں۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی فطر الانام علی ملۃ الاسلام والاھتداء وجبلھم
علی الملۃ الحنیفیۃ السمحۃ السھلۃ البیضاء ثم انھم غشیھم الجھل ووقعوا
اسفل السافلین وادرکھم الشقاء فرحمھم ولطف بھم وبعث الیھم
الانبیاء لیخرجھم من الظلمات الی النور ومن الضیق الی الفضاء
وجعل طاعتہ منوطۃ بطاعتھم فیا للفخر والعلاء ثم وفق من اتباعھم
لتحمل علومھم وفھم اسرار شرائعھم من شاء فاصبحوا بتعھد اللہ
حایزین لاسرارھم فایزین بانوارھم وناھیک بہ من علیاء وفضل
الرجل منھم علی الف عابد وسموا فی الملکوت عظماء وصار والبحث
یدعو لھم خلق اللہ حتی الحیتان فی جوف الماء فصل اللھم وسلم
جمع حوت ۱۲
علیھم وعلی ورثتھم مادامت الارض والسماء وخص من بینھم
صیغہ الامر عطف علی صل وسلم ۱۲
سیدنا محمد المؤید بالآیات الواضحۃ الغراء بافضل الصلوات

مخطوطہ کراچی کے پہلے صفحہ کا عکس۔ یہ نسخہ ۱۱۵۹ھ میں لکھا گیا ہے اور شاہ صاحب کے سامنے پڑھا گیا ہے



الحمد لله الذي فطر الانام على فطرة الاسلام والاستسداد وجبلهم على الملة الحنيفة السمحة السهلة البيضاء ثم انهم

تشعبت بهم السبل ووقعوا في سبل الشياطين واذ لم يتفقوا رحمهم ولطف بهم وبعث اليهم الانبياء ليخرجهم من

الظلمات الى النور ومن المضيق الى الفضاء وجعل طاعتهم منوطة بطاعتهم فيا للعز والعلاء ثم وفق من

اتباعهم لحل رموزهم وفهم اسرار شرائعهم من شاء فصاروا بحجة الله حائزين لاسرارهم فائزين بانوار بسمهم

وناهيك بين علياء وفضل الرجل منهم على الف عابد وسموا في الملكوت عظماء وصاروا احباء يدعو لهم

خلق الله حتى الحيتان في جوف الماء فصلى الله وسلم عليهم ورحمهم ما دامت الارض والسماء وخص من

بينهم سيدنا محمدا المؤيد بالآيات الواضحة الغراء بافضل الصلوات واكرم التحيات واصفى الاصطفاء

واسطته آله واصحابه تابعيه رضوانك وجازهم احسن الجزاء وبعد فيقول العبد الفقير الى رحمة الله

الكريم احمد المدعو ولي الله بن عبد الرحيم عاملهما الله تعالى بفضله العظيم وجعل اليها النعيم المقيم ان عمدة

العلوم اليقينية وراسها ومبنى الفنون الدينية واساسها هو علم الحديث الذي يذكر فيه ما صدر

مخطوطہ پٹنہ (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) کے پہلے صفحہ کا عکس، یہ نسخہ ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا ہے

رب يسر بسم الله الرحمن الرحيم وتمم بالخير

الحمد لله الذي فطر الانام على ملة الاسلام والاهتداء، وجبلهم على الملة الحنيفة السمحة السهلة البيضاء، ثم انهم غشيهم الجهل ووقعوا اسفل السافلين وادركهم الشقاء، فرحمهم ولطف بهم وبعث اليهم الانبياء، ليخرجهم من الظلمات الى النور ومن المضيق الى الفضاء، وجعل طاعتهم منوطة بطاعته فيا للفخر والعلاء، ووفق من اتباعهم لتحمل علومهم وفهم اسرار شرائعهم من شاء، فاصبحوا بنعمة الله حائزين لاسرارهم فائزين بانوارهم بخ بخ به من علياء، وفضل رجلا منهم على الف عابد وسموا في الملكوت عظماء، فصار والحيث يدعو لهم خلق الله حتى الحيتان في جوف الماء، فصل اللهم وسلم عليهم وعلى ورثتهم ما دامت الارض والسماء، وخص من بينهم سيدنا محمدا المؤيد بالآيات الواضحة الغراء، بافضل الصلوات واكرم التحيات واصفى الالطاف، وامطر على آله واصحابه شآبيب رضوانك وجازهم احسن الجزاء، اما بعد فيقول العبد الفقير الى رحمة الله الكريم احمد المدعو بولي الله بن عبد الرحيم عاملهما الله تعالى بفضله العظيم وجعل مآلهما النعيم المقيم ان عمدة العلوم اليقينية ورأسها ومبنى الفنون الدينية واساسها هو علم الحديث الذي يذكر فيه ما صدر من افضل المرسلين صلى الله عليه وعلى آله واصحابه اجمعين من قول او فعل او تقرير فهي مصابيح الدجى ومعالم الهدى وبمنزلة البدر المنير من انقاد لها ودعى فقد رشد واهتدى واوتي الخير الكثير ومن اعرض وتولى فقد

مخطوطہ برلین کے پہلے صفحہ کا عکس۔ اس نسخہ پر تاریخ کتابت موجود نہیں ہے

بسم الله الرحمٰن الرحيم

الحمد لله الذي فطر الانام على ملة الاسلام والاهتداء وجبلهم على الملة الحنيفية السمحة السهلة البيضاء ثم انهم
غشيهم الجبل ووقعوا اسفل السافلين وادركهم الشقا فرحمهم ولطف بهم وبعث اليهم الانبياء ليخرجهم من الظلمات
الى النور ومن المضيق الى الفضا وجعل طاعته منوطة بطاعتهم فيا للفخر والعلاء ثم وفق من اتباعهم ليتحمل علومهم و
فهومهم افاضل رشد اليهم من شاء فاصبحوا بنعمة الله حائزين لاسرارهم فائزين بانوارهم وناهيك به من علياء
وفضل الرجل منهم على الف عابد وسموا في الملكوت عظماء وصاروا بحيث يدعو لهم خلق الله حتى الحيتان في جوف
الماء فصل اللهم وسلم عليهم وعلى ورثتهم ما دامت الارض والسماء وخص من بينهم سيدنا محمد المؤيد
بالآيات الواضحة الغراء بافضل الصلوات واكرم التحيات واصفى الاصطفاء وامطر على آله واصحابه شآبيب
رضوانك وجازهم احسن الجزاء **اما بعد** فيقول العبد الفقير الى رحمة الله الكريم احمد المدعو **بولي الله**
بن عبد الرحيم عاملهما الله تعالى بفضله العظيم وجعل مآلهما النعيم المقيم ان عمدة العلوم اليقينية وراسها
ومبنى الفنون الدينية واساسها هو علم الحديث الذي يذكر فيه ما صدر من افضل المرسلين صلى الله عليه
وعلى آله واصحابه اجمعين من قول او فعل او تقرير فهي مصابيح الدجى ومعالم الهدى وبمنزلة البدر المنير
من انقاد لها ووعى فقد رشد واهتدى واوتي الخير الكثير ومن اعرض وتولى فقد غوى وهوى وما زاد
نفسه الا التخسير فانه صلى الله عليه وسلم نهى وامر وانذر وبشر وضرب الامثال وذكر وانها لمثل القرآن او اكثر وان
هذا العلم له طبقات ولاصحابه فيما بينهم درجات وله قشور داخلها [illegible] مدارك وسطها در وقد صنف
العلماء رحمهم الله في اكثر الابواب ما تقتنص به الاوابد وتذلل به ال[illegible] ب القشور الى الظاهر فمن
معرفة الاحاديث صحة وضعفا واستفاضة وغرابة وتصدى له جهابذة [illegible] ان المتقدمين منهم

مطبوعہ صدیقی بریلی کے پہلے صفحہ کا عکس۔ یہ نسخہ ۱۲۸۶ھ میں پہلی بار طبع ہوا ہے

فن حکمت شرعیہ (علم اسرار الدین)

(تعریف، موضوع، غرض وغایت)

اگر چہ یہ باتیں آگے مقدمہ میں ضمناً آرہی ہیں، مگر یہاں مستقلاً ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے کلام سے علم اسرار الدین کی جو تعریف مفہوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے:

حکمت شرعیہ کی تعریف: **هو علمٌ يُبحث فيه عن حِكَمِ الأحكام ولِمِّيَّاتِها، وأسرارِ خواصِّ الأعمال ونِكاتِها** یعنی حکمت شرعیہ وہ فن ہے جس میں احکام شرعیہ کی حکمتوں اور علتوں سے اور اعمال اسلامیہ کی خصوصیات کے رموز ونکات سے بحث کی جاتی ہے۔ حکمت اور علت میں چند وجوہ فرق ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ علم اسرار الدین میں احکام کی علتوں اور حکمتوں کے بارے میں جستجو کی جاتی ہے۔ اور اعمال کی خصوصیات مثلاً نماز قرب الٰہی کا ذریعہ ہے اور روزہ گناہوں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ ان خصوصیات کا راز کیا ہے؟ پہلے عمل کی پہلی خصوصیت اور دوسرے عمل کی دوسری خصوصیت کیوں ہے؟ ان امور سے علم اسرار الدین میں بحث کی جاتی ہے۔

اور حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ صدیقی کے شروع میں تنبیہ کے عنوان سے یہ تعریف بیان کی گئی ہے:

وأما حدُّه: فهو علمٌ يُعرف به حكمةُ وضعِ القوانينِ الدينية، وحفظُ النِّسَبِ الشرعية بأسرها یعنی حکمت شرعیہ: وہ فن ہے جس کے ذریعہ قوانین دینیہ (اصول اسلام) کی وضع کی حکمت معلوم ہوتی ہے، اور تمام احکام شرعیہ کی نگہداشت کا طریقہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ نِسَب: نسبۃ کی جمع ہے۔ حکم شرعی میں موضوع ومحمول کے درمیان جو نسبت حکمیہ ہوتی ہے، وہی دراصل حکم ہوتی ہے۔ اور احکام پانچ ہیں: وجوب، استحباب، اباحت، کراہت اور حرمت۔ یہ پانچوں نسبتیں ہیں۔ غرض دین اسلام دو باتوں کا مجموعہ ہے: اصول اور فروع۔ جو اصول تجویز کئے گئے ہیں ان کی حکمت کیا ہے اور جو فروع مقرر کئے گئے ہیں ان کے مراتب (وجوب وغیرہ) کی نگہداشت کیسے کی جائے کہ مستحب فرض نہ بن جائے اور فرض استحباب کے درجہ میں نہ اتر آئے۔ انہی امور سے فن حکمتِ شرعیہ میں بحث کی جاتی ہے۔

حکمتِ شرعیہ کا موضوع: ہر فن کا موضوع اس کی تعریف سے اخذ کیا جاتا ہے اور اس کو حیثیت کی قید کے ساتھ مقید کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے کلام سے جو تعریف مفہوم ہوتی ہے اس سے یہ موضوع اخذ کیا جائے گا:

موضوعه: الأحكام الشرعية من حيث الحِكَمِ واللِّمِّيَّاتِ، والأعمالُ الأسلامية من حيث الأسرار والخواص یعنی فن حکمت شرعیہ کا موضوع احکام شرعیہ ہیں: حکمتوں اور علتوں کی رُو سے، اور اعمال اسلامیہ ہیں: اسرار وخواص کی جہت سے۔ اس فن میں انہی دو چیزوں کے مذکورہ احوال سے بحث کی جاتی ہے۔

اور مذکورہ دوسری تعریف کی رو سے اس فن کا موضوع درج ذیل ہے:

وأما موضوعُه : فهو النظامُ التشريعي المحمدُي الحنيفي على صاحبه الصلاة والسلام، من حيثُ المصلحة والمفسدة یعنی اس فن کا موضوع نظام تشریعی محمدی حنفی (شریعت اسلامیہ) ہے، مصالح ومفاسد کی رُو سے یعنی مأمورات میں کیا خوبیاں ہیں اور منہیات میں کیا مفاسد ہیں۔ انہی امور سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

فن کی غرض وغایت: تمام فنون دینیہ کی دوغرض وغایت ہیں: ایک عام دوسری خاص:

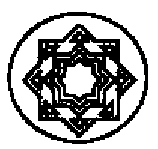
عام غرض وغایت: جو تمام فنون دینیہ کی مشترک غرض وغایت ہے، وہ سعادتِ دارین ہے۔ دینی تعلیم خواہ قرآن کی ہو، حدیث کی ہو یا فقہ وغیرہ کی ہو، دونوں جہاں کی نیک بختی کا ذریعہ ہے۔ مؤمن کو اگر وہ دینی تعلیم سے واقف ہے، دنیا میں بھی چین کی زندگی نصیب ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی سرخ رُوئی حاصل ہوتی ہے۔

خاص غرض وغایت: شریعت مصطفویہ میں بابصیرت ہونا ہے۔ جو مؤمن حکمتِ شرعیہ سے واقف ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتا۔ اس میں انقیاد تام پیدا ہوتا ہے۔ دین پر کمال وثوق اور اطمینان کلی نصیب ہوتا ہے۔ اور وہ شریعت اسلامیہ کی اس طرح نگہداشت کرتا ہے کہ اس کا نفس بالکلیہ اس کی طرف کھچ جاتا ہے۔ اور اس راہ کے خلاف کسی اور راہ کی طرف نفس مائل نہیں ہوتا۔ اور کسی متشکک اور بہکانے والے کا اس پر داؤ نہیں چلتا۔ حجۃ اللہ مطبوعہ صدیقی کے دیباچہ میں ہے:

وأما غايتُه : فهو عدمُ وِجْدانِ الحرج فيما قَضَى الله ورسولُه، والانقيادُ التامُّ للأحكام الإلٰهية، وكمالُ الْوُثوقِ والاطمئنان بها، والمحافظةُ عليها بحيث تَنْجَذِبُ إليها النفسُ بالكلية، ولا تميلُ إلى خلاف مسلكها.

ترجمہ: رہی فن حکمتِ شرعیہ کی غایت: تو وہ تنگی نہ پانا ہے ان باتوں میں جن کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا ہے اور احکام خداوندی کی مکمل فرمانبرداری کرنا ہے۔ اور ان پر کامل اعتماد اور پورا اطمینان کرنا ہے۔ اور ان کی اس طرح نگہداشت کرنا ہے کہ نفس ان احکام کی طرف بالکلیہ کھچ جائے اور ان کی راہ کے برخلاف راستہ کی طرف نفس مائل نہ ہو۔

غرض یہ فن نہایت درجہ سودمند ہے، مگر دقیق بھی اسی قدر ہے۔ اس کے مبادی تمام علوم شرعیہ ہیں۔ آدمی جب تک تمام فنون دینیہ سے واقف نہ ہو یہ فن گرفت میں آنا مشکل ہے۔ نیز ذہن رسا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس فن سے بہرہ ور فرمائیں۔ (آمین)



بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدُ للّٰهِ الذى فَطَرَ الأَنامَ على ملة الإسلام والاهتداء، وجَبَلَهم على الملة الحنيفيَّةِ السَّمْحةِ السَّهْلة البيضاء؛ ثم إنهم غَشِيَهم الجهلُ، ووقعوا أسفلَ السافلين، وأدركهم الشَّقاءُ؛ فرَحِمَهم، ولَطَفَ بهم، وبعث إليهم الأنبياءَ، لِيَخْرُجَ بهم من الظلمات إلى النور، ومن المَضِيقِ إلى الفَضاء؛ وجعل طاعتَه منوطةً بطاعتهم، فيا لَلْفَخْرِ والْعُلَاءِ!

ثم وفَّق من أتباعهم لتحمُّلِ علومهم، وفَهِمِ أسرارِ شرائِعِهم من شآء، فأصبحوا - بنعمة اللّٰه - حائزين لأسرارهم، فائزين بأنوارهم؛ ونَا هِيْكَ به من عُلياءَ! وفضَّل الرجلَ منهم على ألف عابدٍ، وسُمُّوا فى الملكوت عُظَمَاءَ؛ وصاروا بحيث يدعولهم خلقُ اللّٰه، حتى الحيتانُ فى جوف المآء.

فصلِّ - اللّٰهم - وسلِّم عليهم، وعلى وَرَثَتِهِمْ مادامتِ الأرضُ والسماء؛ وخُصَّ من بينهم سيِّدَنا محمدَنِ المؤيَّدَ بالآيات الواضحة الغرَّاء، بأفضلِ الصلواتِ وأكرم التحيَّاتِ، وأصْفَى الاِصْطِفَاءِ، وأَمْطِرْ على آله وأصحابه شآبِيْبَ رضوانك؛ وجازِهم أحسنَ الجزاء.

ترجمہ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مکلّف مخلوق (جن وانس) کو مذہب اسلام اور راہ یابی پر پیدا کیا۔ اور سیدھی، نرم، آسان اور روشن ملت پر ان کی تخلیق فرمائی پھر اُن پر نادانی چھا گئی، اور وہ انتہائی پستی میں جا پڑے۔ اور بدبختی نے ان کو دبوچ لیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی فرمائی، اور ان کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمایا، اور ان کی طرف حضرات انبیاء کو مبعوث فرمایا، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف، اور تنگی سے کشادگی کی طرف نکالیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی فرماں برداری کو انبیاء کی فرماں برداری کے ساتھ معلّق کردیا۔ پس کیا کہنے (انبیاء کی) بزرگی اور بلندی کے!

پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے متبعین میں سے جس کو چاہا ان کے علوم کو اٹھانے کی، اور ان کی شریعتوں کے رموز کو سمجھنے کی توفیق بخشی، چنانچہ وہ بفضلہ تعالیٰ انبیاء کے بھیدوں کو سمیٹنے والے، اور ان کے انوار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اس سے بڑی سربلندی اور کیا ہوسکتی ہے؟! اور اللہ تعالیٰ نے وارثین علوم نبوت میں سے ایک ایک کو ہزار

ہزار عابدوں پر برتری بخشی، اور وہ حضرات فرشتوں کی دنیا میں ''بڑے لوگ'' کہلائے۔ اور وہ حضرات اس قدر بلند رتبہ تک پہنچے کہ تمام خلق خدا، حتی کہ مچھلیاں پانی میں، ان کے لئے دعا گو ہو گئیں۔

پس خدایا! بے پایاں رحمتیں اور سلامتی نازل فرما ان انبیاء پر اور ان کے وارثین پر، جب تک کہ آسمان وزمین قائم رہیں، اور ان میں سے مخصوص فرما ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کو جو روشن اور واضح معجزات کے ساتھ قوی کئے گئے ہیں بہترین درودوں کے ساتھ اور عمدہ سلاموں کے ساتھ اور برگزیدہ مقبولیت کے ساتھ؛ اور برسا آپؐ کے خاندان پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر اپنی خوشنودی کی موسلا دھار بارش اور ان کو بہترین صلہ عطا فرما (آمین)

لغات:

قوله فطر الأنام إلخ فطر (ن ض) **فَطَرَ الأمْرَ** : پیدا کرنا، شروع کرنا **الأنام**: زمین کی تمام مخلوقات **ما ظهر على الأرض من جميع الخلق** (لسان العرب) خاص طور پر جن وانس کو بھی أنام کہا جاتا ہے **أو الجن و الإنس، و به فسّر قولُه تعالى: ﴿وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ﴾ وهما الثقلان** (تاج العروس) کتاب میں یا تو مکلّف مخلوقات (جن وانس) مراد ہیں یا صرف انسان مراد ہیں کیونکہ آگے انسانوں ہی کا تذکرہ ہے..... **ملة** لغت میں روش اور طریقہ کو کہتے ہیں **قال أبو إسحق: الملّة في اللغة: سُنَّتُهُم و طريقتُهم** (لسان العرب)...... **اهتداء** حاصل مصدر بمعنی راہ یابی۔ یہ لفظ اسلام کا ہم معنی ہے **اهتدى اهتداءً**: راہ راست پانا۔

قوله : جبلهم إلخ الحنيفيّة میں یا نسبت کی ہے اور حنیف کے معنی ہیں، تمام باطل چیزوں سے رخ پھیر کر اور کنارہ کشی اختیار کر کے دین حق کی طرف مائل ہونے والا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب بھی ہے ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيفًا﴾ (النحل ۱۲۰) بیشک ابراہیمؑ بڑے مقتدا تھے، اللہ کے فرماں بردار تھے، بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے (تھانویؒ) اور **الملة الحنيفية** : وہ ملت ہے، جس میں باطل کی نہ دائیں طرف سے گنجائش ہو، نہ بائیں طرف سے۔ اس کی برکات مستحکم اور مضبوط ہوں۔ **السمحة** مؤنث **السمح** کا بمعنی نرم اور ملت سہلہ: وہ ملت ہے جس میں عمل کے اعتبار سے آسانیاں ہوں اور ملت سمحہ: وہ ملت ہے جس میں فکری سادگی ہو، اس کی تعلیمات میں کوئی پیچیدگی نہ ہو **البيضاء** مؤنث **الأبيض** بمعنی سفید، روشن اور ملت بیضاء: وہ ملت ہے جس کا ہر معاملہ جلی اور روشن ہو، اس کی تعلیمات قابل فہم ہوں، ان میں سادگی ہو، ہر شخص اس کو بوجھ سکتا ہو۔

تشریح:

ان دو جملوں میں ارشاد نبوی **كل مولود يولد على الفطرة** کی طرف تلمیح (اشارہ) ہے، فطرۃ کے مشہور معنی اسلام کے ہیں **وأشهر الأقوال: أن المراد بالفطرة الإسلام، قال ابن عبد البر: وهو المعروف عند عامة السلف** (فتح

الباری ج۳ص ۲۴۸) یعنی ہر انسان دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے کوئی بچہ کسی باطل دین پر پیدا نہیں ہوتا، پھر ماحول یعنی جن ہاتھوں میں بچہ پلتا بڑھتا ہے: اس کو بگاڑ دیتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہماری یہ دنیا عالم اجساد ہے، انسان اس دنیا میں نیا پیدا نہیں ہوا، بلکہ تمام انسان پہلے عالم ارواح میں پیدا ہو چکے ہیں، وہاں سے مقررہ وقت پر اس عالم میں منتقل ہوتے ہیں۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲ میں اور اس کی تفسیر میں جو احادیث شریفہ وارد ہوئی ہیں ان میں عالم ارواح کے اس واقعہ کا مفصل تذکرہ موجود ہے کہ تخلیق آدم کے بعد ان کی ساری ذریت چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی شکل میں وجود پذیر کی گئی اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا درس دیا پھر امتحان لیا اور پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے بیک زبان اقرار کیا: کیوں نہیں! یعنی آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ غرض عہد الست میں سب انسانوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا ہے اور اسی صلاحیت پر انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے ــ مگر دنیا میں آنے کے بعد بہت سے لوگوں کو ماحول بگاڑ دیتا ہے اور وہ اپنی اس فطری صلاحیت کو برباد کر دیتے ہیں اور اللہ کی معرفت سے اس درجہ جاہل ہو جاتے ہیں کہ جانوروں کو جس درجہ کی معرفت حاصل ہے اتنی بھی انکے پاس باقی نہیں رہتی، اس وقت ان کو بدبختی آ پکڑتی ہے اور وہ أسفل السافلین میں جا پڑتے ہیں۔

غرض ان دونوں جملوں میں اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام پر ان کی حمد و ستائش کی گئی ہے کہ انھوں نے مکلف مخلوقات (جن وانس) پر یہ عظیم احسان فرمایا کہ ان کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے اپنی پہچان کرائی اور درس معرفت دیکر ان کی ہدایت کا سامان کیا فلله الحمد والمنة!

فوائد:

① عربی میں جس طرح مصدرِ معروف اور مصدرِ مجہول میں امتیاز نہیں ہوتا اسی طرح مصدر اور حاصل مصدر میں بھی امتیاز نہیں ہوتا دونوں کے لئے ایک ہی صیغہ مستعمل ہے اور قرائن سے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ مصدر معروف ہے یا مجہول اور مصدر ہے یا حاصل مصدر مثلاً نصر ینصر معروف کے بعد جو نَصْرًا آتا ہے وہ مصدر معروف ہے جس کا ترجمہ ''مدد کرنا'' ہے اور نُصر یُنصر مجہول کے بعد جو نَصْرًا آتا ہے وہ مصدر مجہول ہے اور اس کا ترجمہ ''مدد کیا جانا'' ہے اسی طرح اهتداء مصدر کے معنی ہیں راہ پانا اور اهتداء حاصل مصدر کے معنی ہیں راہ یابی۔ کتاب میں حاصل مصدر استعمال ہوا ہے کیونکہ وہ اسلام یا ملتِ اسلام کے ہم معنی استعمال کیا گیا ہے۔

② شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک خاص عادت شریفہ ہے اس سے واقف رہنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ مترادفات اور ہم معنی الفاظ استعمال کرتے ہیں ایک لفظ کے بدل دوسرا لفظ لاتے ہیں اور جملہ ناقصہ کے ہم معنی دوسرا جملہ ناقصہ لاتے ہیں اور جملہ تامہ کی وضاحت کے لئے دوسرا جملہ تامہ لاتے ہیں جس کے ذریعہ سابقہ مضمون کو بالفاظ دیگر

سمجھاتے ہیں مثلاً ملت اسلام اور اهتداء ہم معنی ہیں اور جملہ فطر إلخ اور جملہ جبل إلخ ایک ہی مضمون ادا کرتے ہیں۔

لغات:

قوله: غشيهم إلخ غَشِيَ يَغْشىٰ غَشْياً وغِشَايَةَ الأمرُ فلانًا: ڈھانکنا، چھاجانا..... شقاءٌ (حاصل مصدر) بدبختی..... خرج به (متعدی بہ حرف جر) نکالنا، فاعل ضمیر مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرح راجع ہے..... المضيق: تنگ جگہ، گھاٹی..... الفضاء: وسیع زمین، میدان، جمع أفضاء ..... منوطة (اسم مفعول) أنا طه بكذا: لٹکانا، معلق کرنا (مادہ ن وط)..... ياللفخر میں یا حرف ندا، لام لام استغاثہ (برائے تخصیص) فخر مع معطوف مستغاث، لفظی ترجمہ: کہاں ہے بزرگی اور بلندی؟

مطلب:

جب لوگ دنیا میں پہنچ کر اپنی فطری صلاحیت کھو بیٹھے اور گمراہی کے دلدل میں پھنس گئے اور پستی کی نہایت کو پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ نبوت ورسالت کا سلسلہ شروع فرمایا، وحی بھیجی، کتابیں نازل فرمائیں اور لوگوں کو دوبارہ اپنی معرفت کا درس دیا اور ان کو اپنی مرضیات سے واقف کیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور رسولوں کا درجہ اس قدر بلند فرمایا کہ خود ہی اعلان فرمایا ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء ۸۰) یعنی جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے رسول کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ حالانکہ بات کا فطری نہج یہ تھا کہ کہا جاتا: جو اللہ تعالیٰ کے اطاعت شعار بندے ہیں وہ اللہ کے فرستادوں کی بھی اطاعت کرتے ہیں اور جو نابکار ہیں وہ روگردانی کرتے ہیں۔ مگر تاکید ومبالغہ کے لئے اور رسولوں کی قدر افزائی کے لئے تعبیر وہ اختیار فرمائی جو اوپر گذری یعنی اللہ کے اطاعت شعار بندے وہی ہیں جو رسولوں کی اطاعت کرتے ہیں، رسولوں کی اطاعت کے بغیر اطاعتِ خداوندی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا پس کیا کہنے انبیاء کی بزرگی، شرف اور سربلندی کے!

لغات:

قوله ثم وفق الخ تحمّله: اٹھانا..... حازَ (ن) حَوْزًا الشيئَ: اکٹھا کرنا، جمع کرنا..... ناهيْ (اسم فاعل) روکنے والا ..... علياء مؤنث الأعلى کا بمعنی بہت بلند، لفظی ترجمہ: روکنے والا ہوں میں آپ کو اس نعمت کے ذریعہ دیگر سربلندیوں سے یعنی تیرے لئے یہ نعمت کافی ہے، تو کسی دوسری سربلندی کے چکر میں مت پڑ یا نــاهيك اسم فعل بمعنی يــكـفيك ہے ..... سُمُوا (فعل ماضی مجہول) نام رکھے گئے وہ..... ملكوت، مَلَك (فرشتہ) سے بنا ہے فرشتوں سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات کو ملکوت کہتے ہیں۔ عالم ملکوت: فرشتوں کی دنیا ... عظماء جمع ہے عظیم کی اور یہ مفعول ثانی ہے۔

قولہ :فضل الرجل إلخ میں تلمیح (اشارہ) ہے مشہور ضعیف حدیث کی طرف کہ ایک فقیہ (دین کا ماہر) شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۷) یعنی فقیہ کو گمراہ کرنا شیطان کے لئے آسان نہیں، اسے ہزار گنا سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے نیز عُبّاد کی عبادت سے وہ اتنا ذلیل نہیں ہوتا جتنا فقیہ کا وجود اس کے لئے سوہان روح ہوتا ہے۔

قولہ : سُموا إلخ میں تلمیح ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُس ارشاد کی طرف جس کو علامہ ابن عبدالبر مالکی قرطبی رحمہ اللہ نے جامع بیان العلم وفضلہ (ص٦ ج٢) میں نقل کیا ہے کہ من عَلِم وعَمِل وعلَّم فذلك يُدعىٰ عظيمًا في ملكوت السماوات یعنی جس نے علم دین حاصل کیا اور اس پر عمل کیا اور وہ علم دوسروں کو سکھلایا تو وہ شخص فرشتوں کی دنیا میں ''بڑا آدمی'' کہلاتا ہے۔

قولہ : يدعو لهم إلخ میں تلمیح ہے مشہور حدیث شریف کی طرف کہ عالم کے لئے وہ تمام مخلوقات دعائے مغفرت کرتی ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور مچھلیاں بھی پانی کے اندر (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۲ کتاب العلم فصل ۲)

مطلب:

دنیا سے انبیاء کی تشریف بری کے بعد ان کے وارثین (علمائے امت) ان کے جانشین ہوتے ہیں وہ نبیوں کے علوم کو حاصل کرتے ہیں، ان کی لائی ہوئی شریعتوں کے اسرار ورموز سمجھتے ہیں اور وہ اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل کرتے ہیں۔علمائے امت کے لئے یہی سربلندی سب سے بڑی چیز ہے ان کا مرتبہ ہزار عابدوں سے بھی برتر ہے۔ وہ حضرات فرشتوں کی دنیا میں ''بڑے لوگ'' کہلاتے ہیں، دنیا میں گو ان کی قدر نہ پہچانی جائے مگر قدر شناس ان کی قدر پہچانتے ہیں اور ساری مخلوقات تا آنکہ سمندر کی مچھلیاں بھی ان کے حق میں دعا گو ہیں۔

قولہ: فصلٌ إلخ خُصَّ فعل امر ہے خَصَّ (ن) خَصًّا فلانًا بالشيء: خاص کرنا...... المؤيد (اسم مفعول) قوی کیا ہوا المؤيد صفت ہے محمد کی اور بالآيات متعلق ہے المؤيد سے اور بالفضل الخ متعلق ہے خُصَّ سے...... شآبيب جمع ہے شُؤْبُوْبٌ کی جس کے معنی ہیں موسلا دھار بارش...... وخُصّ کا عطف صَلِّ وَسَلِّمْ پر ہے۔

قولہ : مادامت إلخ یہ ابدیت کے لئے محاورہ ہے کیونکہ جب ہم طویل سے طویل مدت کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے لحاظ سے بڑی سے بڑی مدت یہی خیال میں آتی ہے چنانچہ ﴿مادامت السماوات والارض﴾ (جب تک آسمان وزمین قائم رہیں) وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بولے جاتے ہیں (فوائد عثمانی سورۂ ہود آیت ۱۰۷) پس طلبہ کو یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی بھی زبان کے محاورات کا لفظی ترجمہ کرنا اور اسی پر اٹک کر رہ جانا اور اسی کو مطلب قرار دینا بنیادی غلطی ہے، محاورات کا ہمیشہ مفہوم اور محل استعمال سمجھا جاتا ہے ان کا لفظی ترجمہ مراد نہیں ہوتا ﴿مادامت السماوات والأرض﴾ بھی زمانۂ جاہلیت سے ایک محاورہ چلا آرہا تھا اس کا مفہوم

دوام اور ابدیت تھا اور یہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسا اردو میں کہا جاتا ہے کہ: ''جب تک شب وروز کا چکر چلتا رہے گا یہی ہوتا رہے گا'' یہاں یہ احتمال کہ شب وروز کا چکر تو بہر حال ایک دن ختم ہونے والا ہے کسی طرح مضر نہیں، اسی طرح ﴿مادامت السماوات والأرض﴾ کے محاورہ کو سمجھنا چاہئے۔

☆ ☆ ☆

[علومُ الحديث ومكانةُ علمِ أسرار الدين منها]

أما بعد: فيقول العبدُ الفقير إلى رحمة الله الكريم، أحمدُ المدعوُّ بولى الله بن عبدِ الرحيم — عاملَهما الله تعالىٰ بفضله العظيم وجعل مآلَهُما النعيمَ المقيمَ ——: إن عمدةَ العلوم اليقينية ورأسَها، ومبنى الفنون الدينية وأساسَها، هو علم الحديث، الذى يُذكر فيه ما صدر من أفضل المرسلين —— صلّى الله عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين — من قول، أو فعل، أ وتقرير؛ فهى مصابيحُ الدُّجىٰ، ومعالمُ الهدى، وبمنزلة البدر المنير؛ من انقادلها ووعىٰ فقد رشد واهتدى، وأوتى الخيرَ الكثير؛ ومن أعرض وتولّٰى فقد غوىٰ وهوىٰ، وما زاد نفسَه الاالتخسير؛ فإنه صلى الله عليه وسلم نهى وأمر، وأنذر وبشّر، وضَرَبَ الأمثال، وذكّر، وإنها لَمِثْلُ القرآن أو أكثرُ.

فنونِ حدیث میں حکمتِ شرعیہ کا مقام ومرتبہ

ترجمہ: حمد وصلوٰۃ کے بعد، خداوند کریم کی رحمت کا محتاج بندہ احمد جو ولی اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، ولد عبدالرحیم، اللہ تعالیٰ دونوں کے ساتھ اپنے بڑے فضل کا معاملہ فرمائیں اور ان کا ٹھکانہ دائمی نعمتوں کو بنائیں..... کہتا ہے کہ علوم یقینیہ (دینیہ) میں قابل اعتماد اور ان کا سردار اور فنون دینیہ کا پایہ اور ان کی بنیاد علم حدیث ہی ہے، جس میں افضل المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین کے ارشادات، آپ کے کئے ہوئے کام اور تائیدات بیان کی جاتی ہیں۔ پس احادیث شریفہ تاریکی میں روشن چراغ اور ہدایت کی واضح علامات اور (تمام علوم میں) بمنزلۂ چودھویں کے چاند کے ہیں۔ جس نے ان کا اتباع کیا اور انھیں محفوظ کیا اس نے رُشد وہدایت کی راہ پائی۔ اور وہ بے حساب بھلائی سے سرفراز کیا گیا۔ اور جس نے اعراض کیا اور روگردانی کی وہ گمراہ ہوا اور گھڑے میں جا گرا، اور خسران ونقصان کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ کیونکہ آنحضور ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے اور امر فرمایا ہے اور ڈرایا ہے اور خوش خبریاں سنائی ہیں اور (مضمون فہمی کے لئے) مثالیں بیان فرمائی ہیں اور نصیحتیں کی ہیں اور ان کی مقدار قرآن کریم کے بقدر ہے یا اس سے بھی فزوں تر!

لغات:

الفقیر إلخ صفت ہے العبد کی..... الی رحمۃ الخ متعلق ہے الفقیر سے..... المدعو: بلایا ہوا، پکارا ہوا مصنف قدس سرہ کا اصل نام احمد ہے اور شہرت ولی اللہ سے ہے، چونکہ ولی اللہ میں تزکیہ کا پہلو تھا جو ارشاد باری ﴿فَلَا تُـزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النجم ۳۲) کے خلاف ہے اس لئے المدعو کی تعبیر اختیار فرمائی..... عامله: معاملہ کرنا..... العمیم: ہر وہ چیز جو کثھی ہو اور کثیر ہو..... العمدۃ: وہ چیز جس پر بھروسہ کیا جائے، جس پر تکیہ کیا جائے..... ماصدر الخ موصول صلہ مل کر یُذکر کا نائب فاعل ہیں۔

تقریر کے معنی ہیں برقرار رکھنا، تائید کرنا اور فن حدیث میں تقریر نبوی کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے روبرو کسی مسلمان نے کوئی کام کیا یا کوئی بات کہی اور آپؐ نے اس کو روکا ٹوکا نہیں یا آپؐ کے زمانہ میں کسی مسلمان نے کوئی کام کیا اور آپؐ نے باوجود علم واطلاع کے نکیر نہیں فرمائی تو وہ تقریر نبوی کہلاتی ہے (تحفۃ الدرر ص ۴۶)

الدجی: شب تار، ابر آلود رات جس میں چاند نظر آئے نہ تارے سَواد اللیل مع غیم، وأن لاترى نجمًا ولاقمرًا (لسان)..... دجا (ن) دَجْوًا اللیلُ: رات کا تاریک ہونا..... معالم جمع ہے مَعْلَم کی جس کے معنی ہیں راستہ کے نشانات..... وعیٰ یَعِيْ وَعْیًا الشیَٔ: جمع کرنا..... وعی الحدیث: یاد کرنا..... الخیر الکثیر مفعول ثانی ہے اُوتی کا اور اس میں تلمیح ہے آیت پاک ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ، وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ کی طرف، کیونکہ حکمت کی مشہور تفسیر السنۃ ہے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کی بھی مشہور تفسیر یہی ہے..... غوىٰ يغوى غَيًّا: گمراہ ہونا..... ھویٰ یَھْوِیْ ھَوِیًّا: اوپر سے نیچے گرنا۔

فوائد:

(۱) ''علوم شرعیہ میں سب سے بلند مرتبہ علم حدیث کا ہے'': اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ سب سے بلند مرتبہ تو علم تفسیر کا ہونا چاہئے کیونکہ فن تفسیر کلام ربانی کی تبیین وتشریح ہے اور قاعدہ ہے کہ کلام الملوكِ ملوكُ الكلام (شاہوں کا کلام، کلام کا شاہ ہوتا ہے) پس اللہ تعالیٰ کے کلام کا مرتبہ بہر حال بلند وبالا ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فن تفسیر تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے (۱) کلام پاک (۲) تشریحات نبوی اور تفسیرات صحابہ وتابعین (۳) مفسرین کرام کی وضاحتیں ــــ ان تین میں سے اول تو کوئی فن نہیں، بلکہ کلام ربانی تو تمام فنون دینیہ کا سرچشمہ ہے اور دین وشریعت کی اصل واساس ہے، اور دوسری چیز فن حدیث میں داخل ہے۔ اب رہ گئی تیسری چیز تو وہ فن حدیث سے برتر تو کیا مساوی بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ مفسرین کا کلام ہے اس لئے شاہ صاحبؒ کا ارشاد بجا ہے کہ علوم شرعیہ میں سب سے بلند مرتبہ فن حدیث کا ہے۔

(۲) قدیم زمانہ سے ایک گمراہی یہ چلی آرہی ہے کہ کچھ لوگ صرف قرآن کریم کو حجت مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول کا کام بس قرآن کو پہنچانا ہے اور قرآنی احکام ہی کی تعمیل ضروری ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز حجت نہیں حتی کہ رسول کا قول وفعل بھی حجت اور واجب الاتباع نہیں۔

یہ فرقہ اپنے آپ کو ''اہل قرآن'' کہتا ہے مگر حقیقت میں یہ ''منکرین حدیث'' ہیں۔ یہ لوگ حدیث شریف کی تاریخی حیثیت کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس گمراہ فرقہ کے وجود کی پیشین گوئی فرمائی ہے۔ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ یہ ارشاد پاک نقل کرتے ہیں:

''ہرگز میں تم میں سے کسی کو اپنے چھپر کھٹ پر ٹیک لگائے ہوئے نہ پاؤں، جسے میرے اوامر میں سے کوئی امر پہنچے، یا نواہی میں سے کوئی نہی پہنچے، پس وہ کہہ دے کہ میں نہیں جانتا، ہم جو احکام قرآن میں پاتے ہیں اس کی پیروی کرتے ہیں'' (مشکوۃ شریف حدیث ۱۶۲ باب الاعتصام فصل ۲)

اور حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے یہ ارشاد پاک مروی ہے کہ:

أَلَا إِنِي أُوْتِيتُ القرآن ومثلَه معه، أَلَا يوشِكُ رجلٌ شَبْعَانُ على أريكته يقول: عليك بهذا القرآن، فما وجدتم فيه من حلال فَأَحِلُّوه، وما وجدتم فيه من حرام فَحَرِّموه، وإن ما حَرَّم رسول الله صلى الله عليه وسلم كماحَرَّم اللهُ (مشکوۃ حدیث ۱۶۳)

سنو! میں قرآن کریم دیا گیا ہوں اور اس کے مانند اس کے ساتھ (دیا گیا ہوں) سنو! ایک شکم سیر آدمی اپنے چھپر کھٹ پر بیٹھا کہے گا کہ تم یہ قرآن مضبوط پکڑو، جو اس میں حلال ہے اس کو حلال سمجھو اور جو اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھو، حالانکہ جو چیزیں اللہ کے رسول نے حرام کی ہیں وہ بھی ویسی ہی حرام ہیں جیسی اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔

اور حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

أيحسب أحدُكم متكئا على أريكته، يَظُنُّ ان اللّه لم يُحَرِّمْ شيئًا إلا ما في هذا القرآن، ألا! إني ــــ والله! ــــ قد أمرتُ ووعظتُ، ونهيت عن أشياءَ، إنها لمثلُ القرآن أو أكثرُ (مشکوۃ حدیث ۱۶۴)

کیا تم میں سے ایک شخص اپنے چھپر کھٹ پر ٹیک لگائے گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بس وہی چیزیں حرام کی ہیں جو اس قرآن میں حرام ہیں؟! سنو! بخدا! میں نے بھی احکامات دیئے ہیں، اور نصیحتیں کی ہیں اور بہت سی باتوں سے روکا ہے بیشک وہ قرآن کے بقدر ہیں یا اس سے بھی زیادہ

دراصل حجیت حدیث کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو رسول کی حیثیت سے واقف نہیں اور اس کا صحیح مقام نہیں پہچانتے۔ قرآن کریم میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حیثیت صرف ایک پیغامبر اور ڈاکیہ کی نہیں ہے بلکہ وہ مُطاع، متبوع، امام، ہادی، قاضی، حاکم اور حَکَم وغیرہ بہت سی صفات کے حامل ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ دین کے سلسلہ

میں رسول اللہ ﷺ کا ہر امر و نہی، ہر حکم و فیصلہ اور ہر قول و عمل ناطق، واجب التسلیم اور لازم ہے۔ شاہ صاحبؒ نے زیر تشریح عبارت میں حجیت حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

چار فنون حدیث[1]

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عرف عام میں فن حدیث روایتِ حدیث کا نام ہے، پھر فن اصول حدیث میں اس کی بہت سی انواع کی گئی ہیں۔ مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ عرف عام سے ہٹ کر فن حدیث کی چار قسمیں کرتے ہیں:

پہلی قسم: فن روایتِ حدیث ہے جس میں احادیث مع سند روایت کر کے ہر حدیث کا درجہ متعین کیا جاتا ہے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف، مشہور ہے یا غریب، مُسند ہے یا مرسل، مرفوع ہے یا موقوف وغیرہ، اس فن میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، تفصیل کے لئے محمد بن جعفر کتانی رحمہ اللہ (۱۲۷۴-۱۳۴۵ھ) کی کتاب **الرسالة المستطرفة** دیکھیں۔

دوسری قسم: فن غریب الحدیث ہے جس میں احادیث کے نامانوس الفاظ کے معانی اور مشتبہ کلمات کا اعراب بیان کیا جاتا ہے، اس فن کی مشہور کتابیں یہ ہیں:

(۱) ابوعبید قاسم بن سلاّم ہروی (۱۵۷-۲۲۴ھ) کی **غریب الحدیث**۔

(۲) علامہ محمود بن عمر زمخشری (۴۶۷-۵۳۸ھ) کی **الفائق فی غریب الحدیث**۔

(۳) ابن الاثیر مجد الدین مبارک جزری (۵۴۴-۶۰۶ھ) کی **النهاية فی غريب الحديث والأثر**۔

(۴) شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجراتی (م ۹۸۶ھ) کی **مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزيل ولطائف الأخبار**۔

تیسری قسم: فقہ السنہ ہے جس میں احادیث شریفہ سے مستنبط ہونے والے مسائل شرعیہ بیان کئے جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی تقریباً تین سو آیات سے جو مسائل شرعیہ مستنبط ہوتے ہیں، اس فن کا نام احکام القرآن ہے اور تقریباً تین ہزار احادیث شریفہ سے جو احکام دینیہ مستنبط ہوتے ہیں، اس فن کا نام فقہ السنہ ہے اور ان دو کے علاوہ جو احکام فقہیہ قرآن و حدیث اور اجماع امت سے بذریعہ قیاس مستنبط کئے جاتے ہیں اس کا نام علم الفقہ ہے۔

بعد میں یہ تینوں فن یکجا کر دیئے گئے اور اب اسی مجموعہ کا نام علم الفقہ ہے، کیونکہ بڑا حصہ اس میں تیسرے علم کا ہے۔

چوتھی قسم: علم اسرار الدین ہے، جس میں اعمال اسلامیہ اور احکام دینیہ کے رموز و اسرار بیان کئے جاتے ہیں، جسے عرف عام میں فن حکمتِ شرعیہ کہتے ہیں۔

---

[1] یہ عنوان اور معنون دونوں آئندہ عبارت کا خلاصہ ہیں اسی طرح آئندہ عربی عبارت سے پہلے اس کی تشریح دی جائے گی ۱۲

پھر شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دقت وافادیت کے لحاظ سے مذکورہ فنون اربعہ میں ترتیب قائم فرمائی ہے کہ آسان ترین علم: فن روایت الحدیث ہے اور اس سے مشکل اور مفید علم: فن غریب الحدیث ہے اور تیسری قسم کو تو عام طور پر احادیث کا خلاصہ، نچوڑ اور مغز سمجھا جاتا ہے، مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک فنون حدیثیہ میں دقیق ترین اور مفید ترین قسم: چوتھی ہے۔

اور شاہ صاحب نے ان انواع میں درجہ بندی ایک مثال کے ذریعہ سمجھائی ہے فرماتے ہیں: پھل کے بالکل اوپر کے چھلکے سے متصل چھلکا، جو نسبۃً کم کار آمد ہوتا ہے، فن روایت حدیث کی مثال ہے، اور اس سے اندر کا چھلکا، جو زیادہ کار آمد ہوتا ہے، کیونکہ وہ کھایا بھی جاتا ہے: فن غریب الحدیث کی مثال ہے۔ اور پھل کا گودا اور مغز، جو اصل مقصود ہوتا ہے: یہ فقہ السنہ کی مثال ہے مگر درحقیقت مغز اور موتی علم اسرار الدین ہے۔

وإن هـذا الـعـلمَ له طبقاتٌ، ولأصحابه فيما بينهم درجاتٌ، وله قشورٌ دَاخِلَهَا لُبٌّ، وأصدافٌ، وَسْطَها دُرٌّ، وقد صنَّف العلماء ــــ رحمهم الله ـــ في أكثر الأبواب ما تُقْتَنَصُ به الأوابدُ، وتُذَلَّل به الصِّعابُ.

وإن أقـربَ الـقشـور إلـى الـظـاهـر فنُّ معرفة الأحاديث، صحةً وَضُعْفًا، واسْتفاضةً وغرابَةً؛ وتصدَّى له جَهَابِذَةُ المحدثين، والحفاظُ من المتقدمين.

ثم يتلوه: فن معاني غريبها،وضبطِ مُشْكِلِهَا؛ وتصدَّى له أئمةُ الفنون الأدبية، والمتقنون من علماء العربية.

ثم يتلوه: فنُّ معانيه الشرعية، واستنباطِ الأحكام الفرعية، والقياسِ على الحكم المنصوص في العبارة،والاستدلالِ بالإيماء والإشارة، ومعرفةِ المنسوخ والمحكم، والمرجوح والْمُبْرَم؛ وهذا بمنزلة اللُّب والدُّرِّ عند عامة العلماء؛ وتصدَّى له المحققون من الفقهاء.

هذا؛ وإن أَدَقَّ الـفـنـونِ الـحـديثية بأسرها عندى، وأعمقَها مَحْتِدًى، وأرفعَها مَنَارًا، وأولى العلوم الشرعية عن آخرها فيما أرى، وأعلاها منزلةً، وأعظمَها مقدارًا، هو علم أسرار الدين الباحثُ عن حِكَمِ الأحكام ولِمِّيَّاتِها، وأسرارِ خواص الأعمال ونِكَاتها.

ترجمہ: اور علم حدیث کے مختلف طبقات ہیں اور حاملین حدیث کے مختلف درجات ہیں۔ اور اس علم کے چھلکے ہیں جن کے اندر مغز ہے اور سیپیاں ہیں جن کے اندر موتی ہیں اور علمائے کرام رحمہم اللہ نے اس کے اکثر ابواب میں تصانیف فرمائی ہیں، جن کے ذریعہ وحشی جانور شکار کئے جاسکتے ہیں اور سرکش سواریوں کو سدھایا جاسکتا ہے۔

اور سب سے اوپر کے چھلکے سے قریب تر چھلکا احادیث کو پہچاننے کا فن ہے کہ وہ صحیح ہیں یا ضعیف، مشہور ہیں یا غریب؟

اوراس فن کی طرف ناقدین حدیث نے اور متقدمین میں سے حفاظ حدیث نے توجہ فرمائی ہے۔

اوراس کے بعد درجہ ہے احادیث کے مشکل الفاظ کے معانی کو پہچاننے کا، اور مشتبہ کلمات کی حرکات وسکنات اوراعراب کوضبط کرنے کا اوراس فن کی طرف ائمہ فنون ادبیہ نے اور علوم عربیہ میں راسخ قدم رکھنے والے علماء نے توجہ دی ہے۔

پھراس کے بعد درجہ ہے حدیث کے معانی شرعیہ کو پہچاننے ، اوراحکام فقہیہ کو مستنبط کرنے ، اور عبارت النص میں مصرّح حکم پر قیاس کرنے ، اور نصوص کے اشارات وایماءات (مفہوم مخالف) سے استدلال کرنے ، اور محکم ومنسوخ اور مرجوح ومبرم کے پہچاننے کا۔ اور اکثر علماء کے نزدیک یہ فن بمنزلۂ مغز وموتی کے ہے۔ اور محققین فقہاء نے اس کی طرف توجہ مبذول فرمائی ہے۔

یہ بات (تو آپ نے جان لی) اور میرے نزدیک تمام فنون حدیث میں دقیق ترین اور گہری جڑیں رکھنے والا اور سب سے زیادہ بلند، منارہ کے اعتبار سے، اور میری رائے میں تمام علوم شرعیہ میں سب سے برتر اور سب سے بلند درجہ اور عظیم المرتبت علم ، علم اسرار الدین ہی ہے جو احکام شرعیہ کی حکمتوں اور علتوں سے اوراعمال اسلامیہ کی خصوصیات کے رموز ونکات سے بحث کرتا ہے۔

لغات:

اصداف ، صَدَف کی جمع ہے، سیپی، سیپ کا خول، سیپ ایک قسم کی دریائی چیز ہے جس کے اندر سے موتی نکلتے ہیں ...... وسط کے بارے میں یہ قاعدہ یاد رکھیں کہ جہاں لفظ وسط کی جگہ لفظ بَیْنَ رکھ سکتے ہوں تو وہ ساکن الاوسط ہوتا ہے ورنہ متحرک الاوسط (مصباح) اور ساکن الاوسط کا ترجمہ ہے درمیان اور متحرک الاوسط کا ترجمہ ہے معتدل جیسے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا...... داخلها اور وَسْطَها منصوب بنزع خافض ہیں ای فی داخلها وفی وسطها...... اقتنص الطير: پرندہ کو شکار کرنا...... الأوابد جمع آبدة کی: وحشی جانور (الوحشي النُفور) أَبَدَ أَبْدًا: جنگلی ہونا...... الصعاب: جمع صَعْب : سرکش سواری...... استفاض الخبر خبر کا پھیلنا بعض حضرات کے نزدیک حدیث مشہور اور مستفیض ایک ہی ہیں اور بعض نے مستفیض میں اتنی قید زائد کی ہے کہ ہر طبقہ میں راویوں کی تعداد یکساں ہو (تحفۃ الدرر ص۱۱)...... تصدی له: در پے ہونا، کسی چیز کے پیچھے پڑنا، متوجہ ہونا...... جهابذة جمع جَهْبذ کی: پرکھنے والا...... المتقن (اسم فاعل) أتقن الامر: مضبوط کرنا...... فی العبارة متعلق ہے المنصوص سے...... مُبْرَمْ مترادف ہے محکم کا بَرَمَ الحبل اور أبرم الحبل کے معنی ہیں رسی کو بٹنا...... هذا مستقل جملہ ہے ای الأمر هذا، یا مضى هذا یا علمت هذا اور یہ أما بعد کی طرح کلام کا رخ بدلنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سورہ صٓ آیت ۵۵ میں اسی مقصد کے لئے هذا آیا ہے وَقال ابن الأثير : هذا في هذا المقام من الفصل الذى هو خير من الوصل، وهي علاقة وكيدة بين الخروج من الكلام إلى كلام آخر (جمل ج۳ ص۵۸۱)



أدق: باریک ترین ...... أعمق: عمیق ترین ...... بأسرھا اورعن آخرھا کے معنی ہیں جمیعاً ...... المَحْتد: اصل، کہا جاتا ہے ھو کریم المحتد: وہ کریم الاصل ہے، مَحْتِدُ الطبع: شریف الطبع، یقال: رجع إلی محتده ای إلی أصله، حتد (س) حَتَدًا: شریف الاصل ہونا فھو حَتِدٌ وھی حَتِدَۃٌ ...... المنار: روشنی کی جگہ، وہ علامت جو راستہ میں راہ نمائی کے لئے لگائی جائے۔ مسجد کا منارہ بھی مسجد کی علامت ہوتا ہے اس لئے وہ منارہ کہلاتا ہے ...... حِکَم جمع حِکْمۃ کی لِمِّیَّات جمع لِمِّیَّۃ کی، اس میں یٰ نسبت کی ہے اور لِمْ کے معنی علت کے ہیں۔

حکمتِ شرعیہ کی تعریف، موضوع اور غرض وغایت

ھو علم یُبْحَثُ فیه عن حِکَمِ الأحکام ولِمِّیَّاتها، وأسرار خواصِّ الأعمال ونکاتها یعنی حکمت شرعیہ وہ فن ہے جس میں احکام شرعیہ کی حکمتوں اور علتوں سے بحث کی جاتی ہے اور اعمال اسلامیہ کی خصوصیات کے رموز ونکات کے سلسلہ میں گفتگو کی جاتی ہے۔

حکمت اور علت: میں بچند وجوہ فرق ہے، مثلاً:

(۱) حکمت کے ساتھ حکم کا طرد وعکس نہیں ہوتا اور علت کے ساتھ ہوتا ہے۔ طَرْد کے معنی ہیں دور کرنا طَـرَدَہٗ مِن بلادہ: جلاوطن کرنا، علت باقی نہ رہنے پر حکم کو ہٹا دینا طَرْد کہلاتا ہے اور جب علت لوٹ آئے تو حکم کو واپس لے آنا عکس کہلاتا ہے۔ مثلاً اشیائے ستہ کی حدیث میں تفاضل اور نسیئہ کی حرمت کی علت قدر مع جنس ہے یعنی مکیلی یا موزونی چیز ہونا اور ہم جنس ہونا پس جس خطے میں کیلا تول کر بیچا جاتا ہے وہاں کیلا بعوض کیلا کم وبیش بیچنا ربوا ہے اور جہاں گن کر فروخت کیا جاتا ہے وہاں کیلا ربوی چیز نہیں۔

اور ڈاڑھی رکھنے کی حکمت اغیار سے امتیاز ہے، یعنی یہ اسلامی یونیفارم ہے۔ پس اگر اغیار بھی بالکل اسلامی طرز کی ڈاڑھی رکھنے لگیں تو یہ حکم ختم نہیں ہوگا، کیونکہ حکمت میں طرد وعکس نہیں ہوتا۔

(۲) علت ایک ہوتی ہے، متعدد نہیں ہوسکتیں —— البتہ مجتہدین میں علت کے استخراج میں اختلاف ہوسکتا ہے مگر یہ علت کا تعدد نہیں —— اور حکمتیں متعدد ہوسکتی ہیں۔

غرض علم اسرار الدین میں ایک تو احکام شرعیہ کی حکمتوں اور علتوں کی جستجو کی جاتی ہے، دوسرے اعمالِ اسلامیہ کی خصوصیات کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ مثلاً نماز قُربِ الٰہی کا ذریعہ ہے، روزہ تقوی یعنی گناہوں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، حج محبت الٰہی پیدا کرتا ہے، زکوۃ غم خواری کا جذبہ ابھارتی ہے اور خود غرضی کی جڑ کاٹتی ہے، ان اعمال اسلامیہ کی ان خصوصیات کا راز کیا ہے؟ یہ مخصوص اعمال مخصوص آثار کیوں پیدا کرتے ہیں؟ فن حکمت شرعیہ میں اس سے بحث کی جاتی ہے۔

فائدہ:

نِکات جمع ہے نُکتہ کی جس کے معنی ہیں: مزےدار اور دلچسپ بات اور نُقاط جمع ہے نُقطہ کی جس کے معنی ہیں بنیادی بات، کسی بحث کا مرکزی مضمون۔

حکمت شرعیہ کا موضوع: ہر فن کا موضوع تعریف سے اخذ کیا جاتا ہے، جیسے علم نحو کی تعریف ہے: علم باصول یُعرف بها أحوالُ أواخر الكَلِمِ الثلاث، من حيث الإعراب والبنآء، وكيفية تركيب بعضها مع بعض (ہدایۃ النحو) اس تعریف سے نحو کا موضوع کلمہ اور کلام متعین کیا گیا ہے۔ پس حکمت شرعیہ کا موضوع احکام شرعیہ اور اعمال اسلامیہ ہیں، انہی دو چیزوں کے احوال سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

بالفاظ دیگر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فن حکمتِ شرعیہ کا موضوع شریعتِ مصطفویہ ہے یعنی آنحضرت ﷺ کا لایا ہوا پورا دین، جو آج ہمارے پاس قرآن وحدیث کی شکل میں موجود ہے، وہی اس فن کا موضوع ہے اور اسی کے احوال سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

غرض وغایت: تمام علوم شرعیہ اور فنون دینیہ کی غرض وغایت ایک ہے یعنی سعادتِ دارین حاصل کرنا۔ دنیا کی سعادت نیک نامی ہے اور آخرت کی سعادت حصول جنت اور رضائے خداوندی ہے۔ اور خصوصی غرض وغایت: دین میں بصیرت حاصل کرنا ہے۔



فن حکمت شرعیہ کے تین فائدے

آگے شاہ صاحب نے فن حکمت شرعیہ کے تین اہم فوائد بیان فرمائے ہیں۔

(۱) یہ فن قاری کو دین وشریعت میں بابصیرت بناتا ہے، جس طرح فن عروض کا ماہر شعراء کے کلام کو، علم منطق کا ماہر حکماء کے دلائل وبراہین کو، علم نحو کا ماہر فصحائے عرب کے کلام کو اور اصول فقہ کا ماہر جزئیاتِ فقہیہ کو بصیرت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے، اسی طرح حکمتِ شرعیہ کا ماہر پورے دین کو علی وجہ البصیرت سمجھ سکتا ہے۔

(۲) علم اسرار الدین سے واقف شخص علمی لغزشوں سے اور اندھا دھند قیاس آرائیوں سے محفوظ رہتا ہے، وہ رات میں سوختہ چُننے والے کی طرح نہیں ہوتا کہ بھلے برے کی تمیز نہ کر سکے، وہ نالے کے پانی میں موتیوں کی تلاش میں غوطہ لگانے والے کی طرح بھی نہیں ہوتا کہ کوڑا کرکٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے اور ساری محنت رائیگاں جائے، نالے میں موتی کہاں رکھے ہیں۔ وہ رتوندی اونٹنی کی طرح ٹامک ٹوئیاں بھی نہیں مارتا، نہ وہ اندھی اونٹنی کی پیٹھ پر سواری کرنے

والے کی طرح ہوتا ہے۔ نہ وہ اس کمپاؤنڈر کی طرح ہوتا ہے، جس نے ڈاکٹر کو دیکھا کہ وہ کسی کو سیب کھانے کا مشورہ دے رہا ہے۔ پس اس نے ایسے ہی دوسرے مریض کو اندرائن کھانے کا مشورہ دیا، کیونکہ سیب اور اندرائن ہم شکل ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ دین کے بارے میں جو بھی بات کہتا ہے پوری بصیرت کے ساتھ کہتا ہے۔

(۳) حکمتِ شرعیہ جاننے سے دین وشریعت کا ایقان بڑھ جاتا ہے یعنی احکام شرعیہ کی حکمتیں اور علتیں جاننے سے مؤمن کا یقین بالائے یقین ہو جاتا ہے، جیسے کسی کو مخبر صادق نے بتایا کہ زہر جاں ستاں ہے، اس نے یہ بات مان لی، پھر فن طب کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زہر میں گرمی اور خشکی غایت درجہ کی ہیں، جو انسان کے مزاج کے بالکل منافی ہیں چنانچہ اس شخص کا مخبر صادق کی بات پر یقین اور پختہ ہو گیا۔

غرض مذکورہ فوائد کی وجہ سے یہ علم اس بات کا حقدار ہے کہ جس میں بھی اس فن کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہو وہ اپنی زندگی کے قیمتی اوقات اس علم میں صرف کرے اور فرائض وواجبات اور سنن مؤکدہ ادا کرنے کے بعد اس علم کی تحصیل کو سعادت سمجھے اور اس کو اپنی آخرت کے لئے زادراہ بنائے اور نفل عبادات پر اس علم کو ترجیح دے۔

فهو — والله! — أحقُّ العلوم بأن يصرف فيه من أطاقه نفائس الأوقات، ويتَّخذه عُدَّةً لمعاده، بعد ما فُرض عليه من الطاعات؛ إذ:

[١] بـه يـصيـر الإنسـانُ على بصيرة فيما جاء به الشرعُ؛ وتكون نسبتُه بتلك الأخبار كنسبة صاحب العروض بدواوين الأشعار، أو صاحبِ المنطق ببراهين الحكماء، أو صاحبِ النحو بكلام العَرَب العَرْباء، أو صاحبِ أصولِ الفقه بتفاريع الفقهاء.

[٢] وبـه يأمَن من أن يكون كحاطب ليل، أو كغائص سَيْلٍ، أو يَخْبِطَ خَبْطَ عشْواءَ، أو يركَبَ متن عمياءَ؛ كمثل رجل سمع الطبيب يأمر بأكل التفاح، فقاس الحنظلة عليه، لمشاكلة الأشباح.

[٣] وبـه يـصيـر مـؤمـنا على بينة من ربه، بمنزلة رجل أخبرهُ صادق: أن السَّم قاتل، فصدَّقه فيما أخبرهُ وبيَّن، ثم عرف بالقرائن: أن حرارته ويبوسته مفرطتان، وأنهما تباينان مزاج الإنسان، فازداد يقينا الى ما أيقن.

ترجمہ: پس علم اسرارالدین — بخدا! — تمام علوم میں سے اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ جو انسان اس کی طاقت (اہلیت) رکھتا ہے وہ اپنے قیمتی اوقات اس فن (کی تحصیل) میں صرف کرے، اور اس علم کو اپنی آخرت کے لئے زادراہ بنائے، ضروری عبادات کی ادائیگی کے بعد، کیونکہ:

(۱) اس علم سے انسان شریعت کی تعلیمات میں بابصیرت ہوتا ہے، اور احادیث سے اس کا تعلق ایسا ہو جاتا ہے

جیسا فن عروض جاننے والے کا شعراء کے دواوین سے، یا منطقی کا فلاسفہ کے دلائل و براہین سے، یا نحوی کا فصحائے عرب کے کلام سے، یا اصول فقہ کے ماہر کا فقہ کی جزئیات سے۔

(۲) اور اس علم سے انسان محفوظ ہو جاتا ہے رات میں لکڑیاں چننے والے کی طرح ہونے سے، یا سیلاب میں غوطہ لگانے والے کی طرح ہونے سے، یا ٹامک ٹوئیاں مارے وہ رتوندی اونٹنی کی طرح، یا اندھی اونٹنی پر سواری کرے، جیسے کسی نے دیکھا کہ حکیم نے کسی کو سیب کھانے کا مشورہ دیا، پس اس نے ہم شکل ہونے کی وجہ سے اندرائن کو سیب پر قیاس کیا (اور اس نہایت کڑوی چیز کو کھانا شروع کر دیا)

(۳) اور اس علم سے انسان پکا مؤمن اور اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوتا ہے، جیسے کسی کو کسی سچے آدمی نے بتایا کہ زہر جاں ستاں ہے، پس اس نے اس مخبر صادق کی بات کی تصدیق کی، پھر قرائن وشواہد سے جانا کہ زہر میں حرارت اور یبوست حد درجہ ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں مزاج انسانی کے برخلاف ہیں، پس اس کا یقین بالائے یقین ہو گیا۔

حل لغات:

قوله: بعد ما فرض الخ أي بعد أداء ما فرض الخ ...... **بان يصرف الخ أحق** سے متعلق ہے اور **من أطاقه** فاعل ہے **يصرف** کا اور **نفائس الخ** مفعول بہ ہے ...... **عدة:** تیاری، ساز وسامان کہا جاتا ہے **كونوا على عدّة:** تیار رہو، یہاں آخرت کے سفر کا سامان اور زاد راہ مراد ہے۔

علم العروض: وہ علم ہے جس میں اشعار کے اوزان بیان کئے جاتے ہیں ...... **العرباء:** خالص عرب مراد فصحائے عرب ...... **يخبط** اور **يركب** کا عطف **يكون** پر ہے ...... **عَشواء:** رتوندی اونٹنی، شب کور، وہ اونٹنی جس کو رات میں نظر نہ آئے ...... **مَتْن** جمع **مُتُون:** پیٹھ۔ فن میں جو کتابیں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتی ہیں وہ بھی متون کہلاتی ہیں ...... **الحنظلة:** اندرائن، ایک جنگلی پھل جو کڑوا ہونے میں ضرب المثل ہے ...... **أشباح** مفرد **شَبْح** وَ **شَبَح:** نظر آنے والی صورت ...... **وبه يصير مؤمناً الخ يصير** فعل ناقص، ضمیر مستتر اس کا اسم جو انسان کی طرف راجع ہے اور **مؤمنا** خبر اول اور **على بينة** خبر ثانی ہے۔

☆ ☆ ☆

فن حکمت شرعیہ کی مضبوط بنیاد ہے، مگر اچھوتا فن ہے

فن حکمت شرعیہ ایک اچھوتا فن ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ سے پہلے کسی نے اس فن میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا مگر بایں ہمہ یہ فن بے اصل نہیں ہے نہ اس کی تدوین بدعت یا خرق اجماع ہے کیونکہ اس کی اصل موجود ہے احادیث نبویہ میں اس فن کی اصولی باتوں کا تذکرہ بھی آیا ہے اور فروعی باتوں کا بھی۔ نیز صحابہ کرام اور تابعین عظام نے

بھی احکام شرعیہ کی حکمتیں کبھی مفصل، کبھی مجمل بیان فرمائی ہیں۔ پھر مجتہدین عالی مقام نے ہر ہر باب میں مصالح وحکم کی تخریج کی ہے اور ان کے نقش قدم پر چل کر ان کے متبعین نے اس فن کے اہم نکات بیان کئے ہیں۔

مگر یہ سب مواد منتشر تھا، کسی ایک کتاب میں مجتمع نہ تھا۔ نہ کسی نے اس کو فنی شکل دی تھی مگر چونکہ مواد سارا موجود تھا اس لئے اگر آج کوئی شخص اس کو مدون کرتا ہے تو وہ خرقِ اجماع نہیں کرتا اس کو نہ تو بدعت کہا جا سکتا ہے نہ بے بصیرتی والا اقدام، وہ حیران کن معاملہ میں کودنا بھی نہیں، بلکہ ایک ممکن الحصول بات کی کوشش کرنا اور واضح نشانات والے راستہ کو طے کرنا ہے۔

اور اب تک یہ فن اس لئے مدون نہیں کیا گیا کہ متقدمین کو تو اس کی حاجت نہیں تھی اور متاخرین میں ہر کوئی اس کو مدون کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ جو شخص شیر پر سوار ہو اس کے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کرسکتا ہے؟! اس فن کو مدون کرنا نہایت دشوار کام تھا، ہر ایک کے بس کا کام نہیں تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

[علمُ أسرارِ الدين ذُوْ أصلٍ أصِيْلٍ ولكنَّهُ أُنفٌ]

وهو وإن أثبت أحاديثُ النبي صلى الله عليه وسلم فروعَه وأصولَهُ، وبيَّن آثارُ الصحابة والتابعين إجمالَه وتفصيله، وانتهى إمعانُ المجتهدين إلى تبيين المصالح المرعية في كل باب من الأبواب الشرعية، وأبرز المحققون من أتباعهم نُكتا جليلةً، وأظهر المدققون من أشياعهم جُملاً جزيلةً، وخرج ـــ بحمد الله ـــ من أن يكون التكلُّم فيه خرقاً لإجماع الأمة،أو اقتحاماً في عَمَهٍ وغُمَّةٍ، ولكن قلَّ من صنف فيه، أوخاض في تأسيس مبانيه، أورتب منه الأصولَ والفروعَ، أو أتى بما يُسمن أو يُغني من جوع؛ وحُقَّ له ذلك، ومن المثل السائر في الورى: ومن الرديفُ وقد ركبت غضنفرًا؟!.

ترجمہ: فن حکمت شرعیہ مضبوط بنیاد رکھتا ہے، مگر یہ اچھوتا فن ہے: اور علم اسرار الدین: اگرچہ احادیث شریفہ نے اس کے اصول وفروع واضح کردیئے ہیں اور صحابہ وتابعین کے ارشادات نے اس کے اجمال وتفصیل کو بیان کردیا ہے اور مجتہدین کا غور وفکر اُن مصالح کی وضاحت تک پہنچ گیا ہے جو ابواب شرعیہ کے ہر ہر باب میں ملحوظ ہیں۔ اور ان کے متبعین میں محققین نے اہم نکتے ظاہر کردیئے ہیں اور انکے پیروؤں میں سے مدققین نے اچھی خاصی مقدار منصۂ شہود پر جلوہ گر کردی ہے۔ اور یہ علم بحمد اللہ اس بات سے تو نکل گیا ہے کہ اس کے سلسلہ میں گفتگو کرنا خرق اجماع ہو، یا بے بصیرتی اور حیرانی کے کام میں چھلانگ لگانا ہو۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے اس علم میں تصنیف کی ہے یا اس کی بنیادیں قائم کرنے کے لئے میدان میں اترے ہیں یا اس فن کے اصول وفروع مرتب کئے ہیں یا کوئی ایسی چیز پیش کی ہے جو فربہ کرے یا کم از کم بھوک

مٹائے۔اور اس فن کے لئے یہی سزاوار ہے اور مخلوق میں چلی ہوئی کہاوتوں میں سے ہے: تو یا میں شیر پر سوار ہوں، تیرے یا میرے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کرسکتا ہے؟!

لغات:

الأنف من الرياض: وہ سرسبز وشاداب کیاری جس کو کسی جانور نے چرا نہ ہو، كاس أنُف: وہ پیالہ جس سے کسی نے پیا نہ ہو ...... وھو کا مرجع علم اسرار الدین ہے حاشیہ میں جو مرجع بتایا ہے وہ صحیح نہیں ...... انتھی الی کذا: پہنچنا ...... محقق (اسم فاعل) مسئلہ کو دلیل سے ثابت کرنے والا، حقّق الأمر: پختہ کرنا ...... مدقق (اسم فاعل) دلیل کو دلیل سے ثابت کرنے والا یعنی دلیل کی بھی دلیل پیش کرنے والا، دقّق الشیٔ: باریک کرنا مدقق کا مرتبہ محقق سے اوپر ہے ...... نُکت جمع ہے نکتۃ کی: مزے دار بات، دلچسپ بات ...... أشياع جمع شيعة کی: پیرو ...... جُمل جمع جملة کی ای مقدارًا كافيًا ...... جزيلةً ای كثيرةً ...... اقتحم الأمر: کسی معاملہ میں زبردستی گھسنا، بے سوچے سمجھے کسی معاملہ میں داخل ہوجانا ...... عَمهٌ بصیرت کا فقدان ...... الغُمَّةُ: حیرت، يقال: هو في غُمّةٍ من أمره: وہ حیرت میں ہے ...... خاض (ن) خوضًا الماءَ: پانی میں داخل ہونا ...... أسّس البيت: بنیاد رکھنا ...... مباني جمع ہے مبنی کی: بنیاد ...... حُقَّ کو معروف ومجہول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، حقّ (ض) حقًّا عليه كذا: واجب ہونا کہا جاتا ہے حَقّ لك أن تفعل كذا: اس کا کرنا آپ کے لائق ہے ...... رکبتُ کو واحد متکلم بھی پڑھ سکتے ہیں، اس صورت میں ترجمہ ہوگا "میں شیر پر سوار ہوں، میرے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کرسکتا ہے؟! اور واحد مذکر حاضر بھی پڑھ سکتے ہیں۔اس صورت میں ترجمہ ہوگا "تو شیر پر سوار ہے، تیرے پیچھے بیٹھنے کی ہمت کون کرسکتا ہے"۔

دقّتِ فن کی مزید وضاحت

آئندہ عبارت میں دقّت فن کی مزید وضاحت ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل فن ہے، ہر شخص کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس کو مدون کرے۔اس فن کی تدوین کے لئے گونا گوں صلاحیتوں اور اعلی قابلیت کی ضرورت ہے، جو مشکل ہی سے کسی میں جمع ہوتی ہیں۔اس فن میں تصنیف کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں:

(۱) تمام علوم شرعیہ میں اعلی درجہ کی مجتہدانہ صلاحیت۔

(۲) علم لَدُنّی کا وافر حصہ۔

(۳) اعلی درجہ کی ذہانت، رسا ذہن، تقریر وتحریر میں مہارت اور بات کہنے کا سلیقہ۔

(۴) اصول وفروع کی تنقیح کا سلیقہ اور قواعد کو مدلل کرنے کا ڈھنگ۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں صدیوں میں کسی میں جمع ہوتی ہیں، اور اسی یگانۂ روزگار ہستی سے کسی محیر العقول کارنامہ کی

امید باندھی جاسکتی ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

كيف؟ ولاتتبين أسرارُه إلا لمن تمكّن في العلوم الشرعية بأسرها، واستبدَّ في الفنون الإلٰهية عن آخرها، ولايصفو مَشْرَبُه إلا لمن شرح الله صدرَه لعلمٍ لَدُنِّيٍّ، ومَلَّأ قلبَه بِسِرٍّ وَهَبِيٍّ؛ وكان مع ذلك وقَّاد الطبيعة، سَيَّالَ القريحة،حاذقًا في التقرير والتحرير، بارعاً في التوجيه والتحبير؛ قد عَرَف كيف يُؤَصَّلُ الأصولَ، ويَبْني عليها الفروعَ، وكيف يُمَهِّدُ القواعدَ، ويأتي لها بشواهد المعقول والمسموع.

ترجمہ: کیسے (ہرکس وناکس اس فن میں گفتگو کرسکتا ہے؟) درانحالیکہ اس علم کے اسرار اسی پر کھلتے ہیں جو تمام علوم شرعیہ میں قدم راسخ اور تمام فنون دینیہ میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو۔ اور اس علم کی گھاٹ اس شخص کے لئے ستھری ہوتی ہے جس کے سینہ کو اللہ تعالیٰ نے علم لدنی کے لئے کھول دیا ہو۔ اور اسرار وہبی سے اسکے قلب کو بھر دیا ہو۔ علاوہ ازیں وہ تیز ذہن، رواں طبیعت، تقریر وتحریر کا ماہر اور توجیہ وتحسینِ کلام میں یگانۂ روزگار ہو۔ اور اچھی طرح جانتا ہو کہ اصول کس طرح بنائے جاتے ہیں اور کس طرح ان پر فروع تعمیر کی جاتی ہیں۔ اور ضوابط کیسے تیار کیے جاتے ہیں اور کس طرح ان کے لئے عقلی اور نقلی دلائل وشواہد پیش کئے جاتے ہیں۔

لغات:

تمكّن من الامر: قادر ہونا...... **استبدَّ بالأمر**: ڈکٹیٹر ہونا، قادر مطلق ہونا (مادہ ب د د)...... **صفا (ن) صفوًا**: صاف ہونا، گدلا نہ ہونا...... **مَشرب**: پانی پینے کی جگہ، گھاٹ جمع **مشارب**...... **لَدُنِّی** کے آخر میں یا نسبت کی ہے، **لَدُنًّا** کی طرف منسوب ہے مراد: وہبی علوم ہیں اور یہ محاورہ **وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا** (الکہف ۶۵) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ہم نے خضر کو اپنے پاس سے خاص طور کا علم سکھایا تھا...... **وقَّاد** (اسم مبالغہ) بہت روشن۔ **وقد (ض) وقدًا**: روشن ہونا...... **سيَّال** (اسم مبالغہ) بہت بہنے والا...... **القريحة**: طبیعت...... **بارع**: فائق **بَرَعَهُ**: علم یا فضیلت یا جمال میں غالب ہونا...... **توجيه**: بات کو قریب الفہم بنا کر پیش کرنا اور اس انداز سے پیش کرنا کہ کوئی اشکال باقی نہ رہے (تفصیل کے لئے دیکھئے العون الکبیر) **حَبَّرَ الكلام**: عمدہ بنانا...... **أصَّلَه**: جڑ والا بنانا، اصل بیان کرنا، اصول وضع کرنا...... **مهَّد الفراش**: بستر بچھانا **مهد الأمر**: درست وہموار کرنا۔

تشریح:

گھاٹ کا ستھرا ہونا کنایہ ہے پسندیدہ کام سے، اگر تالاب یا ندی کا گھاٹ گدلا نہ ہو تو وہاں سے صاف پانی ملے گا،

اور جس گھاٹ کو پانی لینے والوں نے یا پینے والوں نے گدلا کر رکھا ہو وہاں سے گدلا پانی ملے گا۔ علم اسرار الدین کا گھاٹ اسی کے لئے ستھرا ہوتا ہے جس کو قدرت نے علوم وہبی سے وافر حصہ عنایت فرمایا ہو، اور اس کے جسم کا رواں رواں اس علم سے سرشار ہو۔ اور وہبی علوم حاصل کرنا کسی کی مقدرت میں نہیں۔ قسام ازل جسے بخش دے وہی خوش نصیب ہے۔ تقریر کے معنی ہیں مافی الضمیر کو زبان سے یا قلم سے ظاہر کرنا اور تحریر کے معنی ہیں بات کو حشو وزوائد سے پاک کر کے خوبصورت طریقہ پر پیش کرنا۔

☆ ☆ ☆

تقریب تدوین حکمتِ شرعیہ

آگے شاہ صاحب قدس سرہٗ وہ امور ذکر فرماتے ہیں جو تدوین فن اور تصنیفِ کتاب کا باعث بنے۔ طویل عبارت کا خلاصہ چند امور ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حضرت شاہ صاحب کو اس فن کی وافر صلاحیت عطا فرمائی تھی، پس اس کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ ان علوم کو ظاہر کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہئے)

(۲) ایک مکاشفہ ذکر فرمایا ہے کہ آپ ایک دن عصر کی نماز کے بعد اللہ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے تھے کہ یکایک آنحضرت ﷺ کی روح پرفتوح ظاہر ہوئی اور اس نے شاہ صاحب کو کسی چیز سے ڈھانک دیا، جیسے کوئی کپڑا اوڑھا دیا جاتا ہے اور اس مکاشفہ کے دوران ہی شاہ صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ دین کی خاص قسم کی تشریح کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) ایک الہام ذکر فرمایا ہے کہ قلم تقدیر نے شاہ صاحب کے لئے یہ بات لکھ دی ہے کہ آپ اپنی حیات میں کسی وقت کوئی ایسا کارنامہ ضرور انجام دیں گے کہ اس کے ذریعہ اللہ کی زمین نورِ حق سے منور ہو جائے اور دور آخر میں دین پر شباب چھا جائے اور شریعت مصطفوی استدلال کے پیکر میں رونما ہو۔

(۴) ایک خواب ذکر فرمایا ہے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے شاہ صاحب کو ایک قلم یہ کہہ کر عنایت فرمایا کہ: "یہ ہمارے نانا جان کا قلم ہے" اس خواب کی تعبیر واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین کی کوئی قلمی خدمت لیں گے۔

(۵) بار بار دل میں یہ خیال انگڑائیاں لیتا تھا کہ علم اسرار الدین میں کوئی ایسی کتاب لکھنی چاہئے جو خاص وعام کیلئے مفید ہو، مگر کچھ اندیشے مانع بنتے تھے، قلت بضاعت کا خیال اور معاونین کی کمی ارادہ کو تکمیل کا جامہ پہنانے میں سدراہ بنتی تھی۔

(۶) آپ کے ماموں زاد بھائی اور تلمیذ رشید شیخ محمد عاشق پھلتی رحمہ اللہ میں اس فن کو حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور

وہ قابل استاذ کی تلاش میں نکلے اور ناکام ہوکر اور تھک ہار کر شاہ صاحب پر انکی نظر ٹھہر گئی۔ انھوں نے بے حد اصرار کیا کہ شاہ صاحب اس فن میں کتاب لکھیں، کیونکہ عاشق کی نظر میں شاہ صاحب کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جو یہ کارنامہ انجام دے سکے۔

(۷) مولانا محمد عاشق صاحب نے شاہ صاحب کو حدیث الجام یاد دلائی، وہ حدیث شریف یہ ہے:

مَن سُئل عن علم عَلِمه ثم كَتَمه، أُلْجِمْ يوم القيامة بلجام من نار (مشکوۃ ح ۲۲۳)	جس شخص سے کسی ایسے علم کے بارے میں دریافت کیا گیا جسے وہ جانتا تھا پھر اس نے اس کو چھپایا تو وہ بروز قیامت آگ کی لگام دیا جائیگا۔

(۸) مذکورہ حدیث شریف سننے کے بعد شاہ صاحب مجبور ہوگئے۔ آپ کے پاس کوئی بہانہ اور راہ فرار باقی نہ رہی تو استخارہ مسنونہ کر کے کام کا آغاز کردیا۔

[أسباب تصنيف الكتاب وتدوين الفن]

وإن من أَعْظَم نِعَم اللّٰهِ عليَّ: أن آتاني منه حظًّا، وجعل لي منه نصيبًا؛ وما أنفكُّ أعترف بتقصيري وأَبُوْءُ ، وماأبرئ نفسي، إن النفس لأمارة بالسوء!

وبينا أنا جالس ذات يوم بعد صلوٰة العصر متوجها الى الله، إذ ظهرت روحُ النبي صلى الله عليه وسلم، وغَشِيَتْنِيْ من فوقي بشيئ خُيّل إليَّ أنه ثوب أُلقي عليَّ، ونُفث في رُوعي في تلك الحالة: أنه إشارة إلى نوع بيانٍ للدين؛ ووجدت عند ذٰلك في صدري نورًا ، لم يزل يَنْفَسِحُ كلَّ حين.

ثم ألهمني ربي بعد زمانٍ: أنَّ مما كتبه عليَّ بالقلم الْعَلِيِّ: أن أَنْتَهِضَ يومًا لهذا الأمر الْجَلِيِّ؛ وأنه أشرقت الأرض بنور ربها، وانعكستِ الأضواءُ عند مغربها؛ وأن الشريعة المصطفوية أشرقت في هذا الزمان، على أن تَبْرُزَ في قُمُصٍ سابغةٍ من البرهان.

ثم رأيتُ الإمامين الحسنَ والحسينَ في منام —رضي الله عنهما— وأنا يومئذ بمكة، كأنهما أعطياني قلمًا، وقالا: هذا قلم جدِّنا رسولِ الله صلى الله عليه وسلم.

ولَطَالَمَا أحدِّث نفسي: أن أدوِّنَ فيه رسالةً، تكون تبصرةً للمبتدى، وتذكرةً للمنتهي، يستوي فيه الحاضرُ والبادِ، ويتعاورُهُ المجلسُ والنادِ؛ ثم يَعُوْقُني أني لاأجد عندي ولَدَيَّ، ولا أرى من خلفي وبين يَدَيَّ، من أُراجعهُ في المشتَبِهاتِ:من العلماء المنصِفين الثقات، ويُثَبِّطُني قصورُ باعي في العلوم المنقولة مما كان عليه القرونُ المقبولة، ويُفَشِّلُني أني في زمان الجهل والعصبيةِ واتباع الهوى، وإعجاب كل امرئ بآرائه الرديّة، وأن المعاصرة أصلُ المنافرة، وأن

من صنَّف فقد استُهدِف.

فبينا أنا في ذٰلك، أُقدِّم رجلاو أؤخِّر اخرى، وأجرى شوطًا ثم أرجع قَهْقرى،اذ تفطَّن أجلُّ إخواني لديَّ، وأكرم خلّاني عليَّ: محمدُ نِ المعروفُ بالعاشق، لازال محفوظًا من كل طارق وغاسق، بمنزلة هذا العلم وفضائله، وأُلهم أن السعادة لاتَتِمُّ إلا بِتَتَبُّع دقائقه وجلائله، وعرف: أنه لايتيسر له الوصولُ إليه إلا بعد مجاهدة الشكوك والشبهات، ومكابدة الاختلاف والمناقضات؛ ولا يَسْتَتِبُّ له الخوضُ إلا بسعي رجل، يكون أولَ من قرع الباب، وكلما دعا لَبّاهُ الأوابدُ الصِّعابُ؛ فطافَ ما قدرعليه من البلاد، وبحثَ من تَوَسَّمَ فيه الخيرَ من العباد،وتَفَحَّصَ سينَهم وشينَهم، وسبرغثهم وسمينهم،فلم يجد من يتكلم منه بنافعة، أويأتي منه بجذوة ساطعة.

فلما رأى ذلك أَلَحَّ عليَّ ورَزَأنِيْ، ولَبَّبَنِيْ وامسكني، وصار كلما اعتذرتُ ذكَّرني حديثَ الإلجام، فأفحمني أشد الإفحام، حتى أعْيَتْ بي المذاهبُ، وسَالَتْ بمعاذيري المثاعبُ، وأيقنتُ أنها إحْدىَ الكُبَر، وأنها لِما كنتُ أُلهمتُ صورةٌ من الصور، وأنه قد سبق عليَّ الكتابُ، وأنه أمر قد تَوَجَّه من كل باب.

فتوجهتُ إلى الله وَاستَخرتُهُ، ورَغِبتُ إليه واستعنتهُ، وخرجتُ من الحول والقوة بالكلية، وصرتُ كالميت في يد الغسَّال في حركاته القسرية، وشرعتُ فيما نَدَبني إليه، وعطفني عليه، وتضرَّعت الى الله: أن يَّصرف قلبي من الملاهي، وأن يُريَني حقائقَ الأشياء كما هي، ويُسَدِّدَ جنانى، ويُفْصِحَ لِساني، ويَعْصِمَنِيْ فيما اقتحمُه من المقال، ويوفِّقني لصدق اللَّهْجَةِ في كل حال، ويُعِيْنَنِيْ في إبرازما يختلج في صدري، ويُعالجه فكري، إنه قريب مجيب.

ترجمہ: اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس فن میں سے کچھ حصہ یا بڑا حصہ عطا فرمایا اور میرے لئے اس علم میں سے کچھ حصہ یا بڑا حصہ گردانا، اور میں ہمیشہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں اور اپنے نفس کو پاک نہیں گردانتا کیونکہ نفس برائیوں کا بہت زیادہ حکم دینے والا ہے۔ (باقی ترجمہ آگے آرہا ہے)

لغات:

نِعَمٌ جمع ہے نعمۃ کی...... منہ کی ضمیر کا مرجع علم اسرار الدین ہے...... حظا اور نصیبا کی تنوینیں تقلیل کے لئے بھی ہوسکتی ہیں اور تعظیم کے لئے بھی...... بَاءَ (ن) بَوْءً بالحق أو بالذنب: اقرار کرنا۔



تشریح:

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب کو فن حکمت شرعیہ کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا جس پر ان کی یہ کتاب شاہد عدل ہے مگر اس کا اظہار بڑا بول تھا اس لئے وما أنفك الخ سے استدراک کیا ہے کہ میں اپنی کوتاہی اور ہیچ مدانی کا ہمیشہ ہی اقرار کرتا رہا ہوں یعنی مذکورہ بات فخر اور بڑائی کے طور پر میں نے نہیں کہی، بلکہ ضرورت کی وجہ سے کہنی پڑی ہے، پھر فرمایا کہ ہاں اس معذرت خواہی میں بھی نفس کی شرارت ہوسکتی ہے، کیونکہ اس کا تو کام ہی برائیوں پر اکسانا ہے۔

باقی ترجمہ: اور دریں اثنا کہ میں ایک روز عصر کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر بیٹھا تھا: یکا یک آنحضرت ﷺ کی روح (پُرفتوح) ظاہر ہوئی اور اس روح نے مجھے اوپر سے اس طرح کسی چیز سے ڈھانک لیا جیسے کوئی کپڑا مجھ پر ڈال دیا گیا ہو۔ اور اسی حالت میں میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ یہ دین کی خاص قسم کی توضیح وتشریح کی طرف اشارہ ہے۔ اور میں نے اس وقت اپنے سینہ میں ایک نور محسوس کیا جو برابر ہر آن بڑھتا گیا (یعنی اس مکاشفہ کے بعد جوں جوں وقت گذرتا گیا وہ نور دل میں برابر بڑھتا رہا، ماند نہیں پڑا)

لغات:

غَشیت کا فاعل ضمیر مؤنث ہے جو روح کی طرف راجع ہے اور لفظ روح مذکر ومؤنث دونوں طرح مستعمل ہے...... خُیِّلَ الیه: توہم ہونا کہ ایسا ہے...... الرُّوع: دل کا سیاہ نقطہ، اندرون قلب...... انفسح المکانُ: کشادہ ہونا۔ انفسح صدرُہ: کشادہ دل ہونا۔

باقی ترجمہ: پھر کچھ عرصہ بعد میرے پروردگار نے مجھے الہام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو باتیں قلم بالا کے ذریعہ میرے ذمہ لکھ چکے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں کسی نہ کسی دن اس اہم کام کے لئے اٹھوں گا اور یہ کہ زمین اپنے پروردگار کے نور سے منور ہوجائے گی اور روشنیاں بوقت غروب پلٹ جائیں گی، اور یہ کہ شریعت مصطفوی اس زمانہ میں چمک جائے گی اس طرح کہ وہ استدلال کے کامل لباس میں ظاہر ہوگی۔

لغات:

العَلِیُّ: بلند، اعلی، شریف جمع عَلِیُّوْن اور عِلْیَۃٌ کہا جاتا ہے ھم عِلْیَۃُ القوم: وہ قوم کے سردار اور اشراف ہیں ...... انتهض انتهاضًا: کھڑا ہونا، اٹھنا...... الجَلِیُّ: واضح، روشن...... أشرق إشراقًا: چمکنا، روشن ہونا...... انعکس انعکاسًا: پلٹ جانا...... مغربها کی ضمیر شمس کی طرف عائد ہے...... برز بروزًا: ظاہر ہونا۔

تشریح:

بارہویں صدی ہجری میں زمانہ کروٹ لے رہا تھا، عقلیت پسندی کا دور شروع ہو رہا تھا۔ اس لئے ضروری ہوگیا تھا کہ

دین اسلام کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے اس وقت شاہ صاحب قدس سرہ کو یہ بات الہام کی گئی کہ اب زمین اللہ کے نور سے روشن ہونے والی ہے، دین کا بول بالا ہونے والا ہے۔ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نئی شان سے جلوہ گر ہوگی، مسائل شرعیہ دلائل وبراہین کا کامل لباس پہن کر لوگوں کے سامنے آئیں گے اور جس طرح سورج کے غروب ہونے کے بعد روشنی تیز ہوجاتی ہے اسی طرح اس آخری دور میں بھی اسلام نئی شان سے ابھرے گا اور قلم تقدیر یہ بات لکھ چکی ہے کہ یہ کام بہرحال شاہ صاحب قدس سرہ سے لیا جائے گا۔ اسی الہام کی تعبیر یہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے۔

باقی ترجمہ: پھر میں نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا۔ اور یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھا۔ گویا ان دونوں حضرات نے مجھے کوئی قلم عطا فرمایا اور ان دونوں نے فرمایا: ''یہ ہمارے نانا جان حضرت رسول خدا ﷺ کا قلم ہے''

تنبیہ: حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے اسمائے گرامی کے ساتھ لفظ ''امام'' کا استعمال حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے خطبات جمعہ کے خطبۂ ثانیہ میں بھی فرمایا ہے جبکہ ان کی امامت کا عقیدہ شیعوں کا ہے اور یہ عذر کہ شاید لغوی معنی میں استعمال کیا ہو اس لئے درست نہیں کہ خلفائے راشدین کے ناموں کے ساتھ یہ لفظ استعمال نہیں فرمایا جبکہ وہ زیادہ حقدار تھے۔ اسی طرح بہت سے مصنفین کے قلم سے ان بزرگوں کے نام کے ساتھ ''علیہ السلام'' نکل جاتا ہے جو اہل السنہ کے نزدیک کسی طرح بھی درست نہیں کیونکہ بارہ اماموں کی نبوت اور عصمت کا عقیدہ شیعوں کا ہے۔

ریاض سے غیر مقلدین کے اہتمام سے بخاری شریف کا جو نسخہ دارالسلام نے طبع کیا ہے اس میں ص ۷۶۳ پر باب میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کے ساتھ علیہا السلام لکھ دیا ہے جو قطعاً خطا ہے اور بخاری کے ہندی نسخہ میں یہ اضافہ نہیں ہے۔

اسی طرح ابوداؤد شریف کا جو نسخہ شیخ محمد محیی الدین عبدالحمید کی مراجعت اور ضبط وتعلیق سے شائع ہوا ہے اس میں جلد ۴ صفحہ ۳ کتاب الطب کے دوسرے باب میں حدیث شریف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام کے ساتھ علیہ السلام طبع ہوا ہے جبکہ ابوداؤد کے ہندی نسخہ میں یہ لفظ نہیں۔

غرض اس قسم کی چیزیں یا تو الحاقی ہوتی ہیں یا شیعی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں، یا غایت محبت میں بے خبری میں ایسی باتیں قلم سے نکل جاتی ہیں، اس لئے اس معاملہ میں احتیاط ضروری ہے۔

باقی ترجمہ: اور میں عرصۂ دراز سے سوچتا تھا کہ اس فن میں کوئی ایسا رسالہ لکھوں جو مبتدیوں کے لئے راہ نما، اور کاملین کے لئے یادداشت ہو، جس سے شہری اور دیہاتی یکساں طور پر مستفید ہوں اور اہل مجالس ومحافل اس کو دست بہ دست لیں پھر مجھے یہ چیز روکتی تھی کہ میں اپنے پاس اور اپنے قریب نہیں پاتا تھا، اور اپنے پیچھے اور اپنے سامنے نہیں دیکھتا تھا ایسے انصاف پسند ثقہ علماء کو جن کی طرف میں الجھے ہوئے مسائل میں رجوع کروں اور قرون مقبولہ کے لوگوں کو علوم

نقلیہ میں جس قسم کی دسترس حاصل تھی اس کی اپنے اندر کی بھی مجھے باز رکھتی تھی اور یہ باتیں بھی مجھے بہت زیادہ بے ہمت کرتی تھیں کہ میں جہالت، عصبیت، اتباع ہوی اور ہر شخص کے اپنی تھکی رائے پر اترانے کے زمانہ میں پیدا ہوا ہوں اور یہ کہ ہمعصری باہمی نفرت کی جڑ ہے اور یہ کہ جو تصنیف کرتا ہے وہ نشانہ بنایا جاتا ہے۔

لغات:

تبصرة: آنکھیں کھولنے والا، راہ نما...... مبتدی کم سواد بے استعداد...... تذکرة یادداشت، نوٹ بک...... منتھی: کامل، ماہر فن ...... فیہ کی ضمیر رسالۃ کی طرف لوٹتی ہے بتاویل کتاب...... الباد کے آخر سے یا محذوف ہے البادی: دیہاتی...... الناد کے آخر سے بھی یا محذوف ہے النادی: انجمن ...... تعاور یتعاور القومُ الشيْ: دست بہ دست لینا...... عاقهٗ: روکنا، باز رکھنا...... ثبطهٗ (ن) ثبّطاعن الأمر: روکنا، باز رکھنا...... باع: باہ، دونوں ہاتھوں کو پھیلانے کی مقدار۔

باقی ترجمہ: پس دریں اثنا کہ میں انہی حالات میں تھا، ایک قدم بڑھاتا تھا تو دوسرا پیچھے ہٹاتا تھا، اور ایک چکر لگاتا تھا تو پھر الٹے پاؤں لوٹ آتا تھا (یعنی شش و پنج میں مبتلا تھا) کہ اچانک میرے عظیم المرتبت بھائی اور مخلص دوست محمد نے جو عاشق کے نام سے مشہور ہیں، ہمیشہ وہ آفات ناگہانی سے محفوظ رہیں، اس علم کے مرتبہ اور فضائل کو بھانپ لیا اور وہ یہ الہام کیے گئے کہ سعادت (نیک بختی) اس علم کی مشکل باتوں اور اہم پہلوؤں کا تتبع کرنے ہی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے اور ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ شکوک و شبہات سے ٹکر لے کر ہی اور اختلاف و تناقضات کی سختیاں جھیل کر ہی اس علم تک رسائی ممکن ہے اور وہ ایک ایسے شخص کے تعاون ہی سے اس فن میں صحیح طریقہ پر داخل ہو سکتے ہیں جس نے سب سے پہلے اس فن کا دروازہ کھٹکھٹایا ہو، اور (وہ اس شان کا آدمی ہو کہ) جب بھی وہ (مضامین کو) پکارے تو تمام سرکش وحشی جانور لبیک کہیں، چنانچہ وہ حسب مقدرت شہروں میں گھومے اور ان لوگوں کو جانچا جن میں خیر کے آثار محسوس کیے اور ان کے بھلے برے کی تفتیش کی اور ان کے دُبلے موٹے کو آزمایا تو ان کو کوئی بھی ایسا آدمی نہ ملا جو اس فن میں کوئی کارآمد بات کہتا ہو یا اس فن میں کوئی بھڑکتا ہوا شعلہ سامنے لاتا ہو۔

لغات:

خلاّن جمع خلیل: خالص دوست...... طارق: رات میں آنے والا، جمع طُرّاق مراد رات میں آنے والا دشمن...... غاسق رات جبکہ تاریکی بڑھ جائے...... دقائق مفرد دقیقة مذکر دقیق: مشکل معاملہ...... جلائل مفرد جلیلة مذکر جلیل: بڑا معاملہ...... کابد الأمر: مشقتیں برداشت کرنا...... استَتَبَّ الأمر: درست کرنا...... لبّٰی تلبیةً: جواب دینا لبیک کہنا...... توسّم الشيْ: فراست سے معلوم کرنا، پہچاننا، علامت طلب کرنا...... تفحص عنه: کھود کرید کرنا...... نافعة: کارآمد بات۔

تشریح:

یہ جوفرمایا کہ شکوک وشبہات سے ٹکر لے کر ہی اور اختلاف وتناقضات کی سختیاں جھیل کر ہی اس علم تک رسائی ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمت شرعیہ کی گہرائیوں میں وہی شخص پہنچتا ہے جوشکوک وشبہات کی دلدل سے گذرتا ہے یعنی جسے طرح طرح کے اشکالات پیش آتے ہیں اور جسے نصوص میں تعارض وتناقض نظر آتا ہے وہی منزل مقصود تک پہنچتا ہے بشرطیکہ فہم سلیم ہو اور حکمت شرعیہ کو سمجھنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتا ہو اور اسے کوئی صحیح راہ نما بھی مل جائے، ورنہ وہ دلدل ہی میں پھنس کر رہ جائے گا۔

باقی ترجمہ: پس جب میرے بھائی نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھ سے اصرار کیا اور مجھے نچوڑ لیا، اور میرا گریبان پکڑ کر کھینچا اور مجھے تھام لیا اور جب بھی میں معذرت کرتا تو وہ مجھے لگام دینے کی حدیث یاد دلاتا۔ پس اس نے مجھے دلیل سے پوری طرح خاموش کردیا، یہانتک کہ میرے لئے تمام راہیں مسدود ہوگئیں۔ اور میرے تمام بہانے پرنالے بہالے گئے۔ اور میں نے یقین کرلیا کہ وہ بڑی آفتوں میں سے ایک آفت ہے (یعنی آئی بھاری آفت!) اور یہ کہ وہ مجھے پہلے جو الہام کیا گیا تھا اس کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے اور یہ کہ تقدیر الٰہی میں میرے لئے یہ چیز مقدر ہو چکی ہے اور یہ کہ وہ ایک ایسی بات ہے جس نے ہر چہار جانب سے مجھے گھیر لیا ہے۔

لغات:

رَزَأَهُ يَرْزَءُ رُزْءًا: جس قدر بھلائی حاصل کرسکتا ہو کرلینا ای أصاب منه خيرًا مَّا كان (لسان)...... لَبَّبَ فلانًا: گریبان پکڑ کر کھینچنا...... أفحمه: دلیل دیکر خاموش کردینا...... أعي الماشي: چلنے والے کا تھکنا...... مذاهب جمع مذهب کی بمعنی راہ ...... معاذیر جمع مِعْذَار کی بمعنی عذر، بہانہ...... مثاعب جمع مَثْعب کی بمعنی پرنالہ۔

باقی ترجمہ: پس میں اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کی (استخارہ کیا) اور میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کی اور ان سے مدد طلب کی۔ اور میں طاقت وقوت سے پوری طرح نکل گیا۔ اور نہلانے والے کے ہاتھ میں لاش کی طرح ہوگیا، لاش کی غیر اختیاری حرکات میں، اور میں نے وہ کام شروع کیا جس کی اس (بھائی) نے مجھے دعوت دی، اور جس کی طرف میری توجہ موڑی۔ اور میں نے بارگاہ خداوندی میں گڑ گڑا کر دعا کی کہ وہ میرے دل کو لہو ولعب سے پھیر دے اور اشیاء کی حقیقتیں جیسی وہ ہیں مجھ پر واضح کردے اور میرے دل کو درست رکھے۔ اور میری زبان کو گویا کرے اور جس کام کو میں شروع کر رہا ہوں اس میں مجھے لغزشوں سے بچائے۔ اور مجھے ہر حال میں سچی بات کہنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان باتوں کو ظاہر کرنے میں میری مدد فرمائے جو میرے سینہ میں کھٹکتی ہیں اور جن کی میرا سوچ چارہ سازی کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ قریب ہیں اور دعائیں قبول فرمانے والے ہیں۔

لغت: عالجہٗ معالجۃً: تدبیر کرنا، چارہ سازی کرنا، علاج معالجہ کرنا۔

تشریحات:

(۱) لاش کی غیر اختیاری حرکات میں یعنی جس طرح نہلانے والے چاہتے ہیں لاش کو الٹتے پلٹتے ہیں لاش کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا اسی طرح میں دست قدرت کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا کہ وہ جو چاہیں مجھ سے کام لیں۔

(۲) لہو ولعب سے پھیر دے یعنی اوقات ضائع کرنے سے میری حفاظت فرمائے کیونکہ انسان زندگی کا بہت بڑا حصہ بے خبری میں ضائع کر دیتا ہے جس شخص نے وقت کی قدر پہچان لی وہ ضرور کوئی اہم کارنامہ انجام دے گا اور جس کی زندگی کی گھڑیاں یونہی برباد ہوتی رہیں وہ عمر نوح پا کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

(۳) کما ھی (جیسی کہ وہ ہیں) یعنی انسان بہت سی مرتبہ چیزوں کی حقیقتیں صحیح طور پر نہیں سمجھتا، وہ غلط فہمی کا شکار رہتا ہے، ایک چیز ہوتی کچھ ہے اور وہ اس کو سمجھتا کچھ ہے۔ قَالَ: اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ (النمل) والے واقعہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سباء کو اسی حقیقت سے آشنا کیا تھا چنانچہ وہ فوراً مظاہر پرستی سے دست بردار ہو کر اللہ رب العالمین پر ایمان لے آئی اور اپنی سابقہ غفلت والی زندگی پر پشیمان ہوئی۔ غرض حقائق کا داشگاف ہونا بہت بڑا علم ہے۔

(۴) گویا کرے یعنی طاقت گفتار دے، میں جو بات سمجھانا چاہوں اس کو دلنشین طریقہ پر سمجھا سکوں۔

(۵) میرے سینہ میں کھٹکتی ہیں یعنی جو میرے خداداد علوم ہیں۔

(۶) جن کی میرا سوچ چارہ سازی کرتا ہے یعنی جو باتیں میں نے غور وفکر سے سمجھی ہیں۔

☆ ☆ ☆

کتاب کا انداز

آگے شاہ صاحب قدس سرہ خاکساری سے فرماتے ہیں کہ میں زور بیان سے محروم ہوں، مقابلہ کے میدان میں سباقِ غایات ہونے کی مجھ سے امید نہ رکھنی چاہئے۔ میرے پاس مواد بھی کچھ نہیں۔ اور حوالوں کی بھر مار بھی میرے بس کی بات نہیں کیونکہ آپ کا دل تصوف کے مشاغل میں اس درجہ منہمک تھا کہ کتابوں کی بہت زیادہ ورق گردانی کرنے کی آپ کو فرصت نہ تھی۔

نیز فرماتے ہیں کہ اساتذہ سے سنی ہوئی ساری باتیں یاد کرنا، پھر ان کو بیان کر کے لوگوں کا دل لبھانا میرے بس کی بات نہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ چیز ایک طرح کی بناوٹ اور ناپسندیدہ بات تھی اس لئے اس قسم کی باتوں کی بھی قارئین

شاہ صاحب سے امید نہ رکھیں۔

شاہ صاحب کی کتاب میں جو کچھ ہے وہ ان کا اپنا ذاتی سرمایہ ہے۔ انھوں نے اپنے ہی علوم کو اکٹھا کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ نیز وہ علوم نہ مطالعہ کے مرہون منت ہیں نہ اکابر سے سنے ہوئے ہیں، بلکہ وہ آپ کے وارداتِ قلبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ پر کھولا ہے اور آپ کے نصیب میں رکھا ہے اسی کو امت کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

اور آخر میں قارئین کرام سے معذرت کی ہے کہ میں تو اپنے روکھے سوکھے کو غنیمت سمجھنے والا ہوں اگر آپ بھی اس پھیکے دسترخوان پر قناعت کرنا چاہیں تو حَبَّذَ الوِفَاقُ! اور اگر آپ مزے دار دسترخوان کے خواہاں ہیں اور کوئی بڑھیا کتاب کے متلاشی ہیں تو آپ خود مختار ہیں جو چاہیں سو کریں۔

[منهج الكتاب]

وقـدَّمـتُ إليـه أنى سِكّيتُ نادى البيان، ضَالِعُ حَلَبَة الرِّهان، وأنى متعرِّق مِرماةٍ، وذو بضاعةٍ مُزْجاةٍ، وأنـه لايتـأتـى منى الإمعانُ فى تصفُّح الأوراق،لشُغل قلبى بما ليس له فَواق، ولايتيسر لـى التناهى فى حفظ المسموعات، لأ تشدَّق بها عند كل جاءٍ وآتٍ، وإنما أنا المتفرِّدُ بنفسه، الـمتجَمِّع لِرِمْسه، الذى هُوَ ابنُ وقته، وتلميذُ بَخْته، وأسير وارده، ومغتنم باردِه، فمن سرَّه أن يقنع بهذا فليقنع، ومن أحب غير ذلك فأمره بيده، ماشآءَ فَلْيَصْنَع!

ترجمہ: کتاب کا انداز: اور میں نے ان کو (محمد عاشق پھلتی صاحب کو) پہلے یہ بات بتادی کہ میں محفل بیان کا خاموش آدمی (گونگا) ہوں۔ ریس کے گھوڑوں میں لنگڑا گھوڑا ہوں اور یہ کہ میں کھر پر سے گوشت کھرچ کر کھانے والا ہوں اور ردی پونجی والا ہوں اور یہ کہ میرے لئے کتابوں کی بہت زیادہ ورق گردانی کرنا آسان نہیں کیونکہ میرا دل ایک ایسے امر میں مشغول ہے جس سے مجھے ذرا فرصت نہیں اور میرے لئے اساتذہ سے سنی ہوئی باتوں کو یاد رکھنے میں آخری حد تک جانا بھی آسان نہیں تا کہ میں اس کے ذریعہ ہر آنے جانے والے کے سامنے بڑھ بڑھ کر باتیں کروں۔ اور میں تو اپنی ذات کے ساتھ تنہا ہونے والا ہوں، اپنی ہی قبر کی مٹی کو جمع کرنے والا ہوں۔ میں تو اپنے وقت کا بندہ اور اپنے نصیب کا شاگرد ہوں اور اپنی واردات کا پابند اور اپنی ٹھنڈی روٹی کو غنیمت سمجھنے والا ہوں۔ پس جو شخص خوش ہو کہ میری اس ناقص پونجی پر قناعت کرے تو کرے، اور جسے اس کے سوا پسند ہو تو اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے، پس وہ جو چاہے سو کرے!

لغات:

قدَّم إليه: اس کی طرف آگے کیا یعنی اس کو پہلے بتادیا...... سِكّيت (اسم مبالغہ) بہت چپ رہنے والا، خاموش آدمی...... ضَالعٌ (صفت) ضلع (ف) ضَلْعًا الشيءُ: ٹیڑھا ہوجانا...... اَلحَلْبَةُ: گھوڑے جو دوڑانے کے لئے جمع

کئے جائیں جمع حلبات، حلائب ......راھنہ رھانا علی الخیل: گھوڑے دوڑانے کے لئے شرط لگانا......مُتعرِّق (اسم فاعل) ہڈی پرسے دانتوں کے ذریعہ گوشت نوچ کر کھانے والا......مرماۃ: کھر...... بضاعۃ: سرمایہ، پونجی...... مزجاۃ: تھوڑی چیز، ردی چیز مذکر مزجی......تأتّی الامرُ: آسان ہونا...... امعن فی الطلب: ڈھونڈھنے میں بہت مبالغہ کرنا......تصفّح الشیٔ: دیر تک دیکھنا......فواق: اونٹنی کو دو مرتبہ دوہنے کے درمیان کا وقفہ، بہت قلیل وقفہ تناھی: انتہا کو پہنچنا......تشدُّق: بہ تکلف فصاحت ظاہر کرنے کے لئے باچھیں کھولنا......تفرّد بالأمر: بغیر نظیر کے تنہا ہونا، تنہا کام کرنا...... مُتجمّعٌ: جمع کرنے والا، اکٹھا کرنے والا......رمس: قبر کی مٹی......بخت: نصیب، فارسی کلمہ ہے اس کے لئے فصیح لفظ حظ ہے...... مُغتنِم: غنیمت سمجھنے والا۔

نوٹ: ذو بضاعۃ مزجاۃ اصل میں یعنی مطبوعہ صدیقی بریلی میں اور کراچی کے مخطوطہ میں ہے مطبوعہ مصر میں یہ جملہ چھوٹ گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

کتاب کی وجہ تسمیہ



اس کتاب کا نام شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ (کامل برہان الٰہی) رکھا ہے۔ یہ نام سورۃ الانعام آیت ۱۴۹ سے ماخوذ ہے اس لئے وجہ تسمیہ سمجھنے کے لئے پہلے آیات ۱۴۸ و ۱۴۹ کی تفسیر سمجھنی ضروری ہے۔ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے ﴿سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا: لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ﴾ یعنی جو کچھ ہو رہا ہے مشیت ایزدی سے ہو رہا ہے ان کی مرضی کے خلاف پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ ہمارا اور ہمارے اسلاف کا اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور سائبہ، بحیرہ وغیرہ جانوروں کو حرام ٹھہرانا سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے، پس رسول کا یہ مطالبہ کہ ہم شرک چھوڑ دیں اور جانوروں کی تحریم سے توبہ کرلیں کیسے درست ہوسکتا ہے؟ ہم ایسا کرنے پر قادر نہیں مرضی مولیٰ کے خلاف ہم کوئی راہ کیونکر اپنا سکتے ہیں؟

کفار کی یہ لَے یہاں تک بڑھی کہ خود مسئلہ رسالت یعنی اللہ تعالیٰ کا رسولوں کو مبعوث فرمانا اور تکلیف شرعی یعنی لوگوں کو احکام کا مکلف بنانا اور مجازات یعنی اچھے برے اعمال پر جزاء وسزا دینا اور اللہ تعالیٰ کا شریعتوں کو نازل فرمانا اور احکام خداوندی میں مصلحتوں اور حکمتوں کا مضمر ہونا، یہ سب کفار کے خیال میں خام خیالی کے علاوہ کچھ نہیں تھا، ان کے خیال میں جو کچھ ہو رہا تھا اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا تھا اور بندے جو کچھ کر رہے ہیں اس کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرنے پر قادر نہیں۔

اللہ پاک جواباً ارشاد فرماتے ہیں ﴿كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَأْسَنَا﴾ یعنی رسولوں کی تکذیب آج کوئی نئی بات نہیں گذشتہ کفار نے بھی اسی طرح تکذیب کی تھی مگر ان کا انجام کیا ہوا؟ عذاب خداوندی کا کوڑا ان پر برسا اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے پس آج کے مکذبین گذشتہ لوگوں کے انجام سے سبق کیوں نہیں لیتے!

آگے ارشاد ہے ﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا؟﴾ یعنی اگر تمہارے پاس اپنی بات کی کوئی ٹھوس دلیل ہو تو پیش کرو تاکہ دیکھا جائے کہ وہ کہاں تک مدعیٰ ثابت کرتی ہے؟ مگر کہاں سے پیش کریں وہ تو محض خیالی باتوں پر چلتے ہیں اور بالکل اٹکل کے تیر چلاتے ہیں ﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ، وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ﴾

اس کے بعد ارشاد ہے ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (آپ کہئے کہ حجت پوری بس اللہ کی ہے) یعنی مشرکین کے پاس تو کوئی دلیل نہیں مگر اللہ تعالیٰ کے پاس نہایت قوی، مضبوط اور ٹھوس دلیل ہے اس آیت میں جس برہان الٰہی کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مشیت ایزدی سے ہو رہا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسری مخلوقات سے زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔ ان کو کامل عقل، وافر فہم، بینا آنکھیں اور شنوا کان دیئے ہیں۔ ان کو خیر و شر میں انتخاب کرنے کی قدرت بخشی ہے اور ان کو ایک جزوی اور ذیلی اختیار دیا ہے وہ اپنی مرضی سے ایک وقت میں ایک چیز کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو دوسرے وقت میں اس کو چھوڑ دینے کا تہیہ بھی کرتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اینٹ پتھر کی طرح بالکل بے اختیار، بے بس اور مجبور پیدا نہیں کیا۔

غرض انسان کو اسی جزوی اختیار کی بنیاد پر مکلف بنایا گیا ہے اور اسی بنیاد پر اس کو اعمال کا بدلہ دیا جاتا ہے اور اس کی راہ نمائی کے لئے رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا ہے اور اس کو شریعت دی گئی ہے جس کے ذریعہ ایسے مفید کاموں کا اس کو حکم دیا گیا ہے جو دنیا اور آخرت میں اس کے لئے مفید ہیں اور ایسی بری باتوں سے اس کو روکا گیا ہے جو دارین میں اس کے لئے ضرر رساں ہیں۔ امام رازی تفسیر کبیر (ص۲۲۶ ج۱۳) میں تحریر فرماتے ہیں:

قال تعالى: ﴿قل فلله الحجة البالغة﴾ وذلك من وجهين: (الوجه الأول) أنه تعالى أعطاكم عقولاً كاملة، وأفهاماً وافية، وآذانا سامعة، وعيونا باصرة؛ وأَقْدَرَكُم على الخير والشر، وأزال الأعذار والموانع بالكلية، فإن شئتم ذهبتم إلى عمل الخيرات، وإن شئتم إلى عمل المعاصي والمنكرات، وهذه القدرةُ والمُكْنَةُ معلومة الثبوت بالضرورة، وزوال الموانع والعوائق معلوم الثبوت أيضاً بالضرورة؛ وإذا كان الأمر كذلك كان ادِّعاؤكم: أنكم عاجزون عن الإيمان والطاعة، دعوى باطلة، فثبت بما ذكرنا: أنه ليس لكم على الله حجة بالغة، بل لله الحجة البالغة عليكم۔

اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو انسان کو مجبور بھی پیدا کر سکتے تھے کیونکہ وہ با اختیار ہیں اس صورت میں سب انسان راہ یاب ہوتے۔ کوئی گمراہ نہ ہوتا ﴿فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ مگر ان کی حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ انسان کو اشرفِ کائنات بنایا

جائے جس کے لئے امتحان کی گھاٹی سے گذرنا ضروری تھا تاکہ اس کا استحقاق علی رؤس الأشهاد ثابت ہوجائے۔

غرض ارشاد ربانی ﴿فلله الحجة البالغة﴾ میں تکلیف کے راز، مجازات کی حکمت اور احکام شرعیہ کے مبنی بر حکمت ومصالح ہونے کی طرف اشارہ ہے اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس کتاب میں بھی اسی قسم کے مضامین ہیں اس لئے اس کا نام حجۃ اللہ البالغہ (کامل برہان الٰہی) رکھا گیا ہے۔ اور شرح کا نام بھی آیت ۱۴۷ ﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ﴾ سے ماخوذ ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۳: ۲۸)

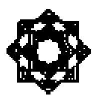
[وجه تسمية الكتاب]

ولما كانت وقعت الإشارة إلى سر التكليف والمُجازاة، وأسرارِ الشرائع المنزَّلَةِ إلى الرحمة المُهْدَاة، بقوله تعالى: ﴿فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ وهذه الرسالة شُعبة منها نابغةٌ، وبدورٌ من أفقها بازغة، حَسُنَ أن تُسَمَّى ﴿حجةَ الله البالغةَ﴾ حسبي الله، ونِعْمَ الوكيلُ، ولاحولَ ولاقوةَ إلا بالله العلي العظيم.

ترجمہ: کتاب کی وجہ تسمیہ: اور چونکہ ارشاد باری ﴿فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (پس حجت پوری اللہ تعالیٰ ہی کی رہی) میں اشارہ آیا ہے مکلّف بنانے کے راز کی طرف، اور اعمال کے اچھے برے بدلہ کی حکمت کی طرف اور ہدیہ کی ہوئی مہربانی (یعنی ذات نبوی) کی طرف نازل کردہ شریعت کے رموز کی طرف اور یہ کتاب اسی سے پھوٹنے والی ایک ٹہنی ہے اور اسی کے افق سے طلوع ہونے والے چاند ہیں تو اس کتاب کا نام حجة الله البالغة (کامل برہان الٰہی) رکھنا مناسب معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ میرے لئے کافی ہیں۔ اور وہ بہترین کارساز ہیں اور اللہ تعالیٰ برتر وبالا کے سوا کوئی طاقت وقوت نہیں ہے!

لغات:

بقوله تعالى متعلق ہے وقعت سے ...... شُعْبَة: ٹہنی جمع شُعَب ...... نابغة از نبع (ف ض ن) نَبغًا ونبوغًا الشيُ: نکلنا، ظاہر ہونا ...... بازغة از بزغت الشمسُ: طلوع ہونا ...... حسن (ک) حُسْنًا: خوبصورت ہونا، اچھا ہونا ...... حجة الله البالغة مفعول ثانی ہے تُسمي کا ...... البالغة اى البينة الواضحة التى بلغتْ غايةَ المتانة والقوة على الإثبات (روح المعانی) یعنی صاف اور واضح دلیل جو نہایت درجہ قوی اور اعلیٰ درجہ کی مثبت مدعیٰ ہو ...... الرحمةُ المهداة سے مراد ذات نبوی ہے آپ حسب ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ رحمت کائنات ہیں ...... مُهداة (اسم مفعول) ہدیہ کی ہوئی چیز، آپ ﷺ کی ذات آپ کی امت کے لئے ایک قیمتی ہدیہ ہے جو بلا استحقاق دیا گیا ہے پس امت کو اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اور آپ کی تعظیم اور پیروی میں ذرا کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔





[من قال: إن الأحكامَ الشرعيةَ غيرُ مُتضمِّنةٍ لِشيْءٍ من المصالح، فقوله باطل]

قد يُظَنُّ أن الأحكامَ الشرعية غيرُ متضمنةٍ لِشيْءٍ من المصالح، وأنه ليس بين الأعمال وبين ما جَعل اللّٰه جزاءً لها مناسبةٌ، وأن مَثَل التكليف بالشرائع كمَثَلِ سيِّدٍ أراد أن يختبر طاعةَ عبده، فأمره برفع حجر، أو لَمْسِ شجرة، مما لافائدةَ فيه غير الإختبار، فلما أطاع أو عَصَى جوزى بعمله؛ وهذا ظَنٌّ فاسدٌ، تُكَذِّبه السنةُ، وإجماعُ القرون المشهود لها بالخير.

ومن عجز أن يعرِفَ:

[١] أن الأعمال مُعْتَبَرَةٌ بالنِّيَّات والهيئاتِ النفسانية التي صدرتْ منها، كما قال النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم: ﴿إنما الأعمال بالنيات﴾ وقال اللّٰه تعالى ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآئُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾

[٢] وأن الصلوةَ شُرِعت لذكر اللّٰه ومناجاته، كما قال اللّٰه تعالى: ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ ولتكون مُعِدَّةً لرؤية اللّٰه تعالى، ومشاهدته في الآخرة، كما قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم ﴿سَتَرَوْنَ ربَّكم كما ترون هذا القمر، لاتَضَامُّوْنَ في رؤيته، فإن استطعتم أن لاتُغلبوا على صلوةٍ قبل طلوع الشمس، وصلوة قبل غروبها، فافعلوا﴾

[٣] وأن الزكوٰةَ شُرِعت دفعًا لرذيلة البخل، وكفايةً لحاجة الفقراء، كما قال اللّٰه تعالى في مانعي الزكوٰة: ﴿وَلَايَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّلَّهُمْ، سَيُطَوَّقُوْنَ مَابَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ وكما قال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿فأَخْبِرْهُمْ أن اللّٰه تعالى قد فرض عليهم صدقةً، تُؤخذ من أغنيائهم، فَتُرَدُّ على فقرائهم﴾

[٤] وأن الصوم شُرِع لِقَهْرِ النفس، كما قال اللّٰه تعالى: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ؛﴾ وكما قال النبيُّ صلى الله عليه وسلم ﴿فإن الصومَ لهُ وِجَآءٌ﴾

[٥] وأن الحج شُرِع لتعظيم شعائر اللّٰه، كما قال اللّٰه تعالى: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ

لِلَّذِيْ﴾ الآية، وقال: ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ﴾

[۶] وأن القصاصَ شُرِع زَاجِرًا عن القتل، كماقال الله تعالى: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الأَلْبَابِ﴾

[۷] وأن الحدودَ والكفاراتِ شُرعت زَوَاجِرَ عن المعاصي، كما قال الله تعالى: ﴿لِيَذُوْقَ وَبَالَ أَمْرِهِ﴾

[۸] وأن الجهادَ شُرِع لإعلاء كلمة الله، وإزالة الفتنة، كما قال الله تعالى: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ﴾

[۹] وأن أحكامَ المعاملاتِ والمناكحاتِ شُرعت لإقامة العدل فيهم.

إلى غير ذلك، مما دلَّت الآياتُ والأحاديثُ عليه، ولَهِجَ به غَيْرُ واحدٍ من العلماء في كل قرن.

فإنه لم يَمَسَّهُ من العلم الا كما يَمَسُّ الإبْرَةَ من الماء، حين تُغْمَسُ في البحر وتُخْرَجُ وهو بأن يُبْكيْ على نفسه أحقُّ من أن يُعْتَدَّ بقوله!

یہ خیال باطل ہے کہ احکام شرعیہ حکمتوں پر مشتمل نہیں

ترجمہ: بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ احکام شرعیہ قطعاً حکمتوں اور مصلحتوں پر مشتمل نہیں ۔ اور اعمال اور ان کی اس جزاء کے درمیان جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے کوئی مناسبت نہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو احکام شرعیہ کا مکلّف بنایا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی آقا نے اپنے غلام کی فرماں برداری کا امتحان کرنے کے لئے اس کو کسی پتھر کے اٹھانے کا حکم دیا ہو جس میں امتحان کے علاوہ کوئی فائدہ نہ ہو۔ پھر جب غلام نے فرماں برداری یا نافرمانی کی تو اس کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا ــــــ یہ خیال سراسر فاسد ہے، احادیث نبویہ اور قرون مشہود لہا بالخیر کا اجماع اس خیال کی تردید کرتا ہے۔

بھلا جو شخص یہ تک نہ سمجھ سکتا ہو کہ:

(۱) اعمال نیتوں اور کیفیات قلبیہ کے ساتھ موازنہ کئے ہوئے ہیں، جن سے وہ اعمال صادر ہوتے ہیں، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' (متفق علیہ مشکوۃ حدیث ۱) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ کو قربانیوں کا گوشت ہرگز نہیں پہنچتا، نہ ان کا خون پہنچتا ہے بلکہ ان کے پاس تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے'' (سورۃ الحج ۳۷)

(۲) اور نماز اللہ تعالیٰ کی یاد کے لئے اور ان کے ساتھ سرگوشی کے لئے مشروع کی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: میری یاد کے لئے نماز قائم کیجئے'' (سورۂ طٰہٰ ۱۴) نیز نماز اس لئے مشروع کی گئی ہے کہ آخرت میں دیدار خداوندی اور

مشاہدۂ حق کی آدمی میں استعداد پیدا ہو، جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے: ''تم عنقریب اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح چاند کو دیکھ رہے ہو کہ اس کے دیکھنے میں دھکا مکی نہیں کرتے، پس اگر تمہارے بس میں یہ بات ہو کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے والی نمازوں میں مغلوب نہ ہو جاؤ، تو ایسا کرو'' (متفق علیہ مشکوۃ شریف حدیث ۵۶۵۵ باب رؤیۃ اللہ تعالیٰ)

(۳) اور زکوۃ رذیلۂ بخل کے ازالہ کے لئے اور غرباء کی حاجت روائی کے لئے مشروع کی گئی ہے، جیسا کہ زکوۃ نہ دینے والوں کے حق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: ''ہرگز خیال نہ کریں وہ لوگ جو ایسی چیز میں بخیلی کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات کچھ ان کے لئے اچھی ہوگی، بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بری ہے، وہ لوگ قیامت میں اس کا طوق پہنائے جائیں گے جس میں انھوں نے بخل کیا ہے'' (آل عمران ۱۸۰) اور جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے کہ: ''پھر آپ (یعنی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ) لوگوں کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو مالداروں سے وصول کی جائے گی اور غرباء پر خرچ کی جائے گی'' (مسلم شریف مصری ص ۲۰۰ ج ۱ مشکوۃ ۱۷۷۲)

(۴) اور روزہ نفس کو مغلوب کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تاکہ تم پرہیزگار بنو'' (البقرہ ۱۸۳) اور جیسا کہ ارشادِ نبوی ہے کہ: ''روزہ جوان آدمی کے لئے آختگی (خصّی ہونا) ہے'' (مشکوۃ ۳۰۸۰)

(۵) اور حج شعائرِ خداوندی کی تعظیم کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: ''یقیناً وہ گھر جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا ہے، البتہ وہ مکان ہے'' آخر آیت تک پڑھیے۔ (آل عمران ۹۶) اور ارشاد فرمایا کہ: ''بیشک صفا اور مروہ منجملۂ یادگار (دین) خداوندی ہیں'' (البقرہ ۱۵۸)

(۶) اور قصاص لوگوں کو قتل سے روکنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ: ''اے فہیم لوگو! قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے'' (البقرہ ۱۷۹)

(۷) اور حدود و کفارات لوگوں کو گناہوں سے جھڑکنے کے لئے مشروع کئے گئے ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تاکہ وہ اپنی حرکت کا وبال چکھے'' (المائدہ ۹۵)

(۸) اور جہاد اللہ تعالیٰ کا بول بالا کرنے کے لئے اور فتنہ کا سدّباب کرنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور تم اُن (کفارِ عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فسادِ عقیدہ (شرک) نہ رہے اور دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے'' (انفال ۳۹)

(۹) اور معاملات یعنی لین دین کے احکام اور شادی بیاہ کے مسائل لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے مشروع کئے گئے ہیں۔

اور دیگر بہت سے امور (یعنی مذکورہ بالا احکام کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام ہیں) جن (کے حکمتوں اور مصلحتوں پر

مشتمل ہونے) پر قرآنی آیات اور احادیث نبویہ دلالت کرتی ہیں۔ اور ہر زمانہ میں متعدد علماء کرام نے ان مصالح کو بیان کرنے میں دلچسپی لی ہے۔

پس (جو شخص ایسی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھ سکتا) اسے علم نے بس اتنا ہی چھویا ہے جتنا سوئی کو پانی چھوتا ہے، جب وہ سمندر میں ڈبو کر نکالی جاتی ہے اور ایسا شخص اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اسکے علم کا ماتم کیا جائے نہ کہ اس کی بات پر کان دھرا جائے۔

لغات:

تَضَمَّنَ الشيْءَ: مشتمل ہونا..... ماجعل الخ میں عائد محذوف ہے ای ماجعله الله اور لها کی ضمیر الاعمال کی طرف لوٹتی ہے مناسبۃ اسم مؤخر ہے لیس کا..... كَذَّبَهُ: جھوٹا بتانا، جھوٹ کی طرف نسبت کرنا..... مُعْتَبرة (اسم مفعول) موازنہ کیا ہوا اعتبر الشيْءَ بالشي ای استدل به عليه..... هيئات جمع هَيْئَة کی بمعنی کیفیت،..... نفسانية ای قلبية، الهيئات النفسانية عام ہے النيّات سے کیونکہ تقوی کیفیات قلبیہ میں سے ہے اور نیت سے مختلف چیز ہے..... مُعدة (اسم فاعل) از اَعَدَّه: تیار کرنا..... لاتضَامُّونَ از تَضَامَّ القومُ ای اِنْضَمَّ بعضُهم الى بعض یعنی بھیڑ کرنا، دھکا مکی کرنا..... غَلَب عليه (معروف) جیتنا اور غُلب عليه (مجہول) ہارنا..... زجره عن كذا: روکنا، ڈانٹنا، چلا کر دھتکارنا..... زواجر جمع زاجرة کی بمعنی ڈانٹنے والی..... لَهِجَ (س) لَهَجًا بالشيْءِ: شیفتہ ہونا، دلدادہ ہونا..... مَسَّ (س ن) مَسًّا الشيْءَ: چھونا، پہنچنا..... اِعْتَدَّ: شمار ہونا، کرنا کہا جاتا ہے هذا شيءٌ لايُعْتَد به: یہ ایسی چیز ہے جس کا شمار نہیں کیا جاتا یعنی اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا۔

تشریح:

مذکورہ متن کا مدعیٰ واضح ہے، کسی تشریح کی حاجت نہیں۔ اس لئے ذیل میں چند متفرق باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) اعمال خواہ نیک ہوں یا بد، ان کی جو جزا مقرر کی گئی ہے وہ اٹکل ٹپ مقرر نہیں کی گئی بلکہ گہری حکمتوں پر مبنی ہے، جس کی تفصیل کتاب میں جا بجا آپ کو ملے گی لہٰذا یہ خیال مہمل ہے کہ اعمال اور ان کے بدلہ کے درمیان کوئی مناسبت نہیں۔

(۲) عمل کا مدار نیت پر ہے یعنی جیسی نیت ویسا عمل، نیت نیک تو عمل نیک، نیت بد تو عمل بد، نیت دینی تو عمل دینی اور نیت دنیوی تو عمل بھی دنیوی —— پھر نیک عمل میں جس درجہ اخلاص ہوگا عمل اسی کے بقدر قیمتی ہوگا۔ یہ بات حدیث شریف کے اگلے جملے میں سمجھائی گئی ہے فرمایا: ﴿إنما لكل امرئٍ مانوى﴾ (ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ ملے گا) مثلاً ہجرت ایک عمل ہے، یہ عمل تین شخص کرتے ہیں اور ان کی نیتیں مختلف ہیں تو ان کا عمل بھی مختلف ہوگا: ایک شخص اس لئے ہجرت کرتا ہے کہ اسلام ابھی ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے ابھی اس کو مسلمانوں کی مدد کی ضرورت ہے اس لئے وہ وطن ترک

کر کے مدینہ کی طرف ہجرت کرتا ہے تا کہ اسلام کا تعاون کرے۔ دوسرا اس لئے ہجرت کرتا ہے کہ مدینہ میں آبادی کے بڑھنے سے کاروبار کا اچھا موقعہ نکل آیا ہے اور تیسرا کسی خاتون سے نکاح کرنے کے لئے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آیا ہے۔ دیکھئے تینوں نے ایک ہی عمل کیا ہے مگر صرف اول شخص کی ہجرت دینی عمل ہے باقی دو کی ہجرت محض دنیوی عمل ہے۔

غرض یہ حدیث اعمال صالحہ یا اعمال مباحہ کے بارے میں ہے معاصی کے بارے میں نہیں کیونکہ زنا چوری وغیرہ معاصی ہمیشہ معاصی ہی رہتے ہیں، گو وہ اچھی نیت سے کئے جائیں۔ اچھی نیت سے وہ نیک عمل نہیں بنتے۔

(۳) تقوی دل کی کیفیت کا نام ہے اور قربانیاں ظاہری اعمال ہیں اور آیت کریمہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ سب لوگوں کی قربانیاں یکساں نہیں ہیں اور تفاوت کا مدار گوشت پوست اور خون پر نہیں بلکہ تقوی پر ہے یعنی کیفیات نفسانیہ کے تفاوت سے قربانیوں کے درجات متفاوت ہوتے ہیں۔ یہی اعمال کا ہیئات نفسانیہ کے ساتھ موازنہ کرنا ہے۔

(۴) نماز کی مشروعیت اللہ کو یاد کرنے کے لئے ہے سورۃ العنکوت آیت ۴۵ میں بھی اس کا تذکرہ ہے، ارشاد ہے: ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ، إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ، وَلَذِكْرُ اللهِ اَكْبَرُ﴾ (نماز کی پابندی کیجئے، نماز بے حیائی اور ناجائز کاموں سے روکتی ہے، اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے) یعنی نماز کا ضمنی اور چھوٹا فائدہ یہ ہے کہ وہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی نماز کی نصیحت نہ سنے، جیسے نا ہنجار بیٹا باپ کی نصیحت نہیں سنتا، اور نماز کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے۔ اکبر کا مفضل منہ خاص یا عام محذوف ہے ای أكبر من الفائدة الأولى يا أكبر من كل شيء أى من الفوائد الأخر أيضا.

(۵) حدیث سترون ربكم الخ میں رویت باری تعالی کی خبر دیتے ہوئے دو نمازوں کے اہتمام کا امر فرمایا ہے۔ اس خاص موقعہ پر اس عمل کی تاکید کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ نماز کا رویت باری میں خاص دخل ہے اور وہ یہ ہے کہ نماز انسان میں دیدار خداوندی کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور فجر اور عصر کی تخصیص اس لئے فرمائی گئی ہے کہ فجر غفلت کا وقت ہے اور عصر مشاغل کا پس جو شخص ان دو نمازوں کا اہتمام کرے گا وہ باقی تین نمازوں کا ضرور اہتمام کرے گا۔ غرض پانچوں نمازیں آدمی میں دیدار خداوندی کی قابلیت پیدا کرتی ہے۔

(۶) بل هو شر لهم سے بخل کا رذیلہ (بری صفت) ہونا ثابت ہوتا ہے اور ما بخلوا به سے مستفاد ہوا کہ زکوۃ رذیلہ بخل کا علاج ہے۔

(۷) لعلكم تتقون اس پر دلالت کرتا ہے کہ روزہ آدمی میں گناہوں سے ٹکر لینے کی قوت پیدا کرتا ہے کیونکہ پرہیز گاری کا حاصل یہی ہے کہ آدمی کے ہاتھ میں نفس کی لگام رہے۔

(۸) شعائر الله میں مجاز بالحذف ہے ای شعائر دين الله (دین کی امتیازی نشانیاں) یعنی وہ تمام چیزیں جن کو دیکھتے ہی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ چیزیں دین اسلام سے تعلق رکھنے والی ہیں جیسے مسجدیں، اذان، قرآن، کعبہ، رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ (شعائر اللہ کا بیان رحمۃ اللہ ۱: ۷۰۴ میں ہے)

(۹) قصاص میں جانوں کا بچاؤ ہے کیونکہ جب قاتل قصاصاً قتل کیا جائے گا تو مقتول کے ورثاء کا دل ٹھنڈا ہوگا اور آگے ناحق قتل کا سلسلہ رک جائے گا۔ ورنہ عرصہ دراز تک باہم قتل کا تبادلہ ہوتا رہے گا اور سینکڑوں آدمی لقمۂ اجل بن جائیں گے۔

(۱۰) احکام معاملات کی مشروعیت عدل وانصاف کو بروئے کار لانے کے لئے ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی معین آیت یا حدیث نہیں، متعدد نصوص سے یہ بات اخذ کی گئی ہے اور ان سب کا یہاں حوالہ موجب طوالت تھا، اس لئے یہ مضمون مدلل نہیں کیا گیا، آگے کتاب میں یہ ابحاث آرہی ہیں۔

(۱۱) لَهِجَ بـه الخ ہر زمانہ میں متعدد علمائے کرام کا احکام کے مصالح وحِکَم کو بیان کرنے میں دلچسپی لینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ احکام شرعیہ مصلحتوں پر مشتمل ہیں۔



[لم يزل النبيُّ صلى الله عليه وسلم، والصحابةُ، ومن بعدَهم يُعَلِّلُوْنَ الأحكام بالمصالح]

ثم إن النبيَّ صلى الله عليه وسلم بَيَّن أسرارَ تعيين الأوقات في بعض المواضع، كما:

[١] قال في أربع قبل الظهر: ﴿إنها ساعةٌ تُفتح فيها أبوابُ السمآء، فَأُحِبُّ أن يصعَدَ لي فيها عملٌ صالحٌ﴾

[٢] ورُوِي عنه صلى الله عليه وسلم في صوم يوم عاشوراءَ: أن سببَ مشروعيته نجاةُ موسى وقومِه من فرعون في هذا اليوم؛ وأن سببَ مشروعيتِه فينا اتباعُ سنةِ موسى عليه السلام.

وبَيَّنَ أسبابَ بعض الأحكام:

[١] فقال في المُسْتَيْقِظ: ﴿فإنه لايدري أين باتَتْ يدُهُ﴾

[٢] وفي الاِسْتِنْثَار: ﴿فإن الشيطانَ يَبِيتُ على خَيْشُوْمه﴾

[٣] وقال في النوم: ﴿فإنه إذا اضْطَجَعَ اسْتَرْخَتْ مَفَاصِلُه﴾

[٤] وقال في رمي الجمار: ﴿إنه لإقامة ذكر الله﴾

[٥] وقال: ﴿إنما جُعل الاستئذان من أجل البصر﴾

[٦] وفي الهرة: ﴿إنها ليست بنجس، إنما هي من الطوافين عليكم أو الطوّافات﴾

وبَيَّنَ في مواضعَ:

[١] أن الحكمةَ فيها دفعُ مفسدة، كالنهي عن الْغِيْلَةِ، إنما هو مخافةُ ضرر الولد.

[٢] أو مخالفةُ فرقةٍ من الكفار، كقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿فإنها تَطْلُعُ بين قَرْنَي الشيطان، وحينئذ يسجد لها الكفار﴾

[٣] أو سَدُّ بابِ التحريف، كقولِ عمر رضى الله عنه لمن أراد أن يَّصِلَ النافلةَ بالفريضةِ: بهذا هلك مَنْ قبلكم: فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: ﴿أصَابَ اللّٰهُ بك يابن الخطاب﴾

[٤] أو وجودُ حرج، كقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿أَوَ لِكُلِّكُمْ ثوبان؟﴾ وكقوله تعالى: ﴿عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَكُمْ، فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ﴾

وبَيَّنَ فى بعض المواضع أسرار الترهيب والترغيب، ورَاجَعَهُ الصحابةُ في المواضع المشْتَبِهَةِ، فكشف شُبْهَتَهُمْ، ورَدَّ الأمر إلى أصله:

[١] قال: ﴿صلوةُ الرجل فى جماعةٍ تَزِيْدُ على صلوته فى بيته، وصلوتِهِ فى سوقه، خمسا وعشرين درجةً؛ وذلك: أن أحدكم إذا توضأ، فأحسنَ الوضوءَ، ثم أتى المسجدَ، لايريدُ إلاَّ الصلوة﴾ الحديثَ.

[٢] وقال: ﴿فى بُضع أحدِكم صدقةٌ﴾ قالوا: يارسولَ اللّٰهِ! أيأتى أحدُنا شهوتَه، ويكون له فيها أجرٌ؟ قال: ﴿أرأيتم لو وَضَعَهَا فى حرام، لكان عليه فيه وِزْرٌ؟ فكذلك إذاوضعها فى حلال، كان له أجر﴾

[٣] وقال: ﴿إذا التقى المسلمان بِسَيْفَيْهِمَا، فالقاتلُ والمقتول كلاهُما فى النار﴾ قالوا: هذا القاتلُ، فما بال المقتول؟ قال: ﴿إنه كان حريصًا على قتل صاحبه﴾

إلى غير ذلك من المواضع التى يَعْسُرُ إحصاؤها.

وبَيَّن ابن عباس رضى اللّٰه عنهما سِرَّ مشروعيةِ غسل الجمعةِ، وزيدُ بن ثابتٍ سببَ النهى عن بيع الثمار قبل أن يَبْدُوَصلاحُها، وبَيَّنَ ابن عمر سِرَّ الاقتصار على استلام ركنين من أركان البيت.

ثم لم يزل التابعون، ثم من بعدِهم العلماءُ المجتهدون يعلّلون الأحكام بالمصالح، ويُفهمون معانِيَهَا، ويُخَرِّجُوْنَ للحُكْم المنصوصِ مَنَاطًامناسِبا، لِدَفْعِ ضُرٍّ، أو جلبِ نَفْعٍ، كما هو مبسوطٌ فى كُتُبِهِمْ ومذاهبهم.

ثم أتى الْغَزَالِيُّ والخَطَّابى وابنُ عبدالسلام وأمثالُهم —— شَكَرَ اللّٰه مساعيَهم —— بِنُكَتٍ لطيفةٍ، وتحقيقاتٍ شريفةٍ.

آنحضرت ﷺ صحابۂ کرام اور بعد کے حضرات ہمیشہ احکام کی مصلحتیں بیان کرتے رہے ہیں

ترجمہ: پھر آنحضرت ﷺ نے بعض مواقع میں تعیین اوقات کے رموز بیان فرمائے، مثلاً:

(۱) ظہر کے فرضوں سے پہلے چار سنتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ''یہ وہ گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اس لئے مجھے یہ بات پسند ہے کہ اس گھڑی میں میرا کوئی نیک عمل اوپر جائے'' (رواہ الترمذی مشکوۃ ۱۱۶۹)

(۲) اور آنحضرت ﷺ سے محرم کی دسویں تاریخ کے روزے کے بارے میں مروی ہے کہ اس کی مشروعیت کی وجہ یہ ہے کہ اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون سے نجات ملی تھی۔ اور ہمارے لئے اس کی مشروعیت کی وجہ سنتِ موسوی کی پیروی ہے۔ (متفق علیہ مشکوۃ حدیث ۲۰۶۷ باب صیام التطوع)

اور آنحضرت ﷺ نے بعض احکام کے اسباب بیان فرمائے (مثلاً)

(۱) نیند سے بیدار ہونے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ''وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے کہاں رات گذاری ہے'' (متفق علیہ مشکوۃ ۳۹۱ باب سنن الوضوء) یعنی نیند کی حالت میں اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا یہ بات اسے معلوم نہیں لہٰذا تین بار ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالے۔

(۲) اور (سوکر اٹھنے کے بعد وضو کرتے وقت) ناک جھاڑنے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ''بیشک شیطان اس کے نتھنوں پر شب باشی کرتا ہے (متفق علیہ مشکوۃ ۳۹۲ باب سابق)

(۳) اور نیند کے (ناقضِ وضوء ہونے کے) بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ''جب آدمی پہلو کے بل لیٹتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں'' (رواہ الترمذی وابوداؤد مشکوۃ ۳۱۸ باب مایوجب الوضوء)

(۴) اور (منیٰ میں حج کے موقعہ پر) رمی جمار کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ''یہ عمل اللہ تعالیٰ کا ذکر برپا کرنے کے لئے ہے'' (رواہ الترمذی والدارمی مشکوۃ ۲۶۲۴ باب رمی الجمار)

(۵) اور ارشاد فرمایا کہ: ''کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت طلب کرنا نگاہ کی وجہ سے ہے (پس اجازت ملنے سے پہلے گھر میں نہیں جھانکنا چاہئے) (متفق علیہ بخاری شریف حدیث ۶۲۴۱ کتاب الاستیذان باب ۱۱ مسلم شریف ج ۱۴ ص ۱۳۶ مصری کتاب الادب باب تحریم النظر فی بیت غیرہ)

(۶) اور بلی کے (جھوٹے کے) بارے میں ارشاد فرمایا کہ: ''وہ ناپاک نہیں کیونکہ بلی ہر وقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں میں سے یا جانوروں میں سے ہے'' (رواہ مالک والترمذی وابوداؤد وغیرہم مشکوۃ ح ۴۸۲ باب المیاہ)

اور متعدد مواقع میں آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا کہ:

(۱) اُن مواقع میں حکمت کسی خرابی کو دور کرنا ہے، جیسے ایامِ رَضاعت میں دودھ پلانے والی عورت سے ہمبستری کی ممانعت بچے کو ضرر پہنچنے کے اندیشہ سے ہے (رواہ ابوداؤد مشکوۃ حدیث نمبر ۳۱۹۶ باب المباشرۃ)

(۲) یا وہ مصلحت کافروں کے کسی گروہ کی مخالفت ہے، جیسے آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے اور اس وقت کفار سورج کو سجدہ کرتے ہیں'' اس لئے اس وقت نماز نہیں پڑھنی چاہئے (رواہ مسلم مشکوۃ حدیث نمبر ۱۰۴۲ باب أوقات النھی)

(۳) یا وہ مصلحت تحریف فی الدین کا سد باب ہے، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس شخص سے کہنا جو فرض نماز کے بعد متصلاً نفل نماز پڑھنا چاہتا تھا کہ: ''اسی وجہ سے پچھلی امتیں ہلاک ہوئی ہیں!'' پس آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اے ابن الخطاب! اللہ آپ کو صائب الرائے بنائے!'' (رواہ ابوداؤد ح ۱۰۰۷ باب فی الرجل یتطوع فی مکانہ)

(۴) یا وہ مصلحت کسی تنگی کا پایا جانا ہے، جیسے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''کیا ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں؟'' (یعنی نہیں ہوتے، پس ایک کپڑے میں بھی نماز درست ہے (متفق علیہ ورواہ مالک فی الموطاص ۱۴۰ ج ۱) اور جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم خیانت کر کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تم پر توجہ فرمائی اور تم سے درگذر کیا'' (البقرہ ۱۸۷)

اور بعض مواقع میں آنحضرت ﷺ نے ترغیب و ترہیب کے اسرار بیان فرمائے، اور اشکال کی جگہوں میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ ﷺ کی طرف رجوع کیا اور آپؐ نے ان کے اشکالات دور فرمائے اور معاملہ کو اس کی اصل کی طرف لوٹایا یعنی صحیح صورت حال سمجھائی (مثلاً):

(۱) ارشاد فرمایا کہ: ''آدمی کی با جماعت نماز گھر کی نماز سے اور دکان کی نماز سے پچیس گنا بڑھ جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص وضوء کرتا ہے پس بہترین وضو کرتا ہے، پھر مسجد میں آتا ہے اور نماز کے علاوہ اس کی کوئی نیت نہیں ہوتی۔ آخر تک حدیث پڑھئے (متفق علیہ مشکوۃ ۷۰۲ باب المساجد)

(۲) اور ارشاد فرمایا کہ: ''بیوی سے مباشرت کرنے میں بھی ثواب ہے'' صحابہ نے دریافت کیا: ''یارسول اللہ! ہم اپنی شہوت بجھائیں اور اس میں بھی اجر و ثواب؟!'' آپ نے ارشاد فرمایا: ''اگر حرام جگہ شہوت رانی کی جاتی تو گناہ ہوتا یا نہیں؟ (ضرور ہوتا) پس اسی طرح جب حلال جگہ اسے صرف کیا تو ضرور ثواب ملے گا'' (رواہ مسلم ج ۷ ص ۹۲)

(۳) اور ارشاد فرمایا کہ: ''جب دو مسلمان تلواریں لے کر باہم بھڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ قاتل کا جہنمی ہونا تو واضح ہے، مقتول کیوں جہنمی ہے؟ (وہ تو مظلوم ہے!) آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''وہ بھی تو اپنے حریف کے قتل کا حریص تھا'' (متفق علیہ مشکوۃ ح ۳۵۳۸ باب قتل اھل الرِّدَّۃ)

اور دیگر بہت سے مواقع جن کا شمار سخت دشوار ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے غسل جمعہ کی مشروعیت کی مصلحت بیان کی (رواہ ابوداؤد و جامع الاصول ج ۸ ص ۲۰۱) اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے پھلوں کو کارآمد ہونے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت کی وجہ بیان کی (رواہ البخاری وابوداؤد، جامع الاصول ج ۱ ص ۳۹۲) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کعبہ شریف کے چار کونوں میں سے صرف دو کو چھونے پر اکتفا کرنے کا بھید واضح کیا (رواہ مسلم وابوداؤد، جامع الاصول ج ۴ ص ۱۲)

پھر تابعین کرام پھر ان کے بعد علمائے مجتہدین برابر احکام کی مصلحتیں بیان کرتے رہے اور احکام کے وجوہ و معانی سمجھاتے رہے اور منصوص حکم کے مناسب علت نکالتے رہے ہیں، کسی ضرر کو ہٹانے کے لئے، یا کسی منفعت کو حاصل کرنے کے لئے، جیسا کہ یہ سب باتیں ان کی کتابوں میں اور ان کے مذاہب میں مفصل موجود ہیں۔

پھر امام غزالی، امام خطابی اور علامہ ابن عبدالسلام اور اُن جیسے حضرات نے دلچسپ نکات اور عمدہ تحقیقات پیش کیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی محنت کا بہترین صلہ عطا فرمائیں (آمین)

لغات:

عَلَّلَ الشيءَ: علت بیان کرنا، دلیل سے ثابت کرنا عَـلَّلَ بالمصالح: مصالح کے ساتھ مدلل کرنا...... الخَيْشُوم: ناک کی جڑ جمع خیاشم...... أن الحكمة فيها میں ضمیر کا مرجع مواضع ہے...... الغِيْلَة اسم ہے الغَيل سے جس کے معنی ہیں ایام رضاعت میں دودھ پلانے والی عورت کے ساتھ شوہر کا ہمبستری کرنا۔ اسی طرح بحالت حمل بچے کو دودھ پلانا بھی غَيل ہے وهو أن يُجامع الرجل زوجته وهي مُرضع؛ وكذلك إذا حملت وهي مرضع (نہایہ) الغيلة کے دوسرے معنی دھوکا، غفلت سے مارڈالنا بھی ہیں، کہا جاتا ہے قَتَـلَـهُ غِيْـلَةً: دھوکے سے مارڈالا، یہاں یہ معنی مراد نہیں...... اصابَ اللّٰهُ بك کے دو ترجمے ہیں (۱) اللہ آپ کو صائب الرائے بنائیں بلغك الله الصواب (۲) اللہ آپ کو خیر کی توفیق دیں أراد اللّٰهُ بك الخير والهداية (بذل المجهود ج ۵ ص ۳۵۲ مصری)...... راجعه في الأمر: دوسرے سے کسی معاملہ میں بات چیت کرنا...... المشتبهة: شبہ کی جگہ، قابل اعتراض موقعہ...... أفهم إفهامًا: سمجھانا...... معانی جمع معنى کی بمعنی وجہ...... شكر (ن) شُكْرًا: شکریہ ادا کرنا۔ بہتر سلوک پر تعریف کرنا اور کہا جاتا ہے شكر الله سعيك: اللہ تمہاری کوشش کی جزائے خیر دیں۔

تشریح:

عبارت کا مدعی تو وہ ہے جس کا تذکرہ پیچھے سے چلا آرہا ہے کہ احکام شرعیہ حکمتوں اور مصلحتوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ خیال غیر واقعی ہے کہ احکام میں مصالح کی رعایت نہیں۔ عبارت واضح ہے کسی تشریح کی محتاج نہیں اس لئے ذیل میں چند متفرق فوائد ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱) تعیین اوقات کے رموز یعنی یہ بات کہ فلاں وقت میں فلاں عمل کیوں تجویز کیا گیا ہے؟ اس میں کیا حکمت اور کیا راز ہے؟ مثلاً ظہر سے پہلے چار سنتیں کیوں ہیں؟ اور اُسے آنحضور ﷺ زوال کے ساتھ ہی کیوں پڑھا کرتے تھے؟ محرم کی دس تاریخ کو روزہ کیوں رکھا جاتا ہے؟ وغیرہ۔

(۲) رمی جمار کا عمل اللہ کا ذکر برپا کرنے کے لئے ہے اس کا مشاہدہ موقعہ پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ تین دن تک منی میں جمرات کے پاس ذکر الٰہی کا وہ زمزمہ بلند ہوتا ہے کہ بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

(۳) من الطوافین علیکم أو الطوافات کی روایت نسائی شریف (ج ا ص ۵۵ مصری) میں أو کے بجائے واو کے ساتھ ہے اس لئے یہ أو تنویع کا بھی ہوسکتا ہے اور ہر وقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں سے مراد خدام، نوکر چاکر اور غلام باندی ہیں۔ اور جانوروں سے مراد سواکن البیوت (گھر میں رہنے والے جانور وغیرہ) ہیں۔

(۴) ایام رضاعت میں ہمبستری کرنے کی ممانعت منسوخ ہے اور ناسخ حضرت خُذامہ بنت وہب رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حَضَرْتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فی أناس، وھو یقول: لقد ھَمَمْتُ أنْ أنھی عن الغیلۃ، فنظرت فی الروم والفارس، فإذاھم یغیلون أولادھم، فلایضر أولادھم ذلک شیئًا (رواہ مسلم مشکوۃ ح ۳۱۸۹ باب المباشرۃ) حضرت خذامہ کہتی ہیں کہ میں چند لوگوں کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی درانحالیکہ آپؐ فرمارہے تھے: ''بخدا! میں نے ایام رضاعت میں شوہر سے ہمبستری کرنے سے منع کرنے کا ارادہ کیا تھا، پھر میں نے روم اور فارس کے احوال پر نظر ڈالی تو وہ ایام رضاعت میں ہمبستری کرتے ہیں اور یہ چیز ان کی اولاد کو ذرہ بھر نقصان نہیں پہنچاتی''— البتہ یہ ہمبستری علوق کا باعث ہوسکتی ہے اور بحالت حمل بچے کو دودھ پلانا مضر ہے مگر حمل کے بالکل ابتدائی دنوں میں مضر نہیں البتہ جب عورت کے دودھ میں تغیر آجائے تو رضاعت موقوف کردینی چاہئے۔

(۵) نماز باجماعت کی فضیلت والی روایت کا باقی حصہ یہ ہے: ''تو وہ جو بھی قدم اٹھاتا ہے اس کی وجہ سے ایک درجہ بڑھتا ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور جب وہ نماز سے فارغ ہوجاتا ہے تو جب تک مسجد میں رہتا ہے برابر فرشتے اس کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں: اے اللہ! اس پر بے پایاں رحمتیں نازل فرما! اے اللہ! اس پر مہربانی فرما! اور (اگر جلدی مسجد میں پہنچ جاتا ہے تو) جب تک وہ نماز کا انتظار کرتا ہے برابر نماز میں رہتا ہے''— غرض مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے والے کو نماز کے علاوہ بھی متعدد فضیلتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ نماز تنہا پڑھی جانے والی نماز سے پچیس گنا بڑھ جاتی ہے۔

(۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے غسل جمعہ کی مشروعیت کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ابتدا میں لوگ اپنے کام خود کرتے تھے، اُون کا لباس پہنتے تھے، پیٹھ پر بوجھ ڈھوتے تھے، مسجد تنگ تھی، چھت نیچی تھی گویا چھونپڑا تھا۔ گرمی کے ایک دن میں آنحضرت ﷺ نماز جمعہ پڑھانے تشریف لائے تو دیکھا کہ پسینہ کی بدبو پھیل رہی ہے اور لوگ اذیت

میں ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ: ''جب یہ دن آئے تو نہاؤ اور گھر میں جو عمدہ تیل خوشبو ہو وہ لگاؤ (پھر نماز کے لئے آؤ) — ابن عباسؓ فرماتے ہیں: پھر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا، لباس بدل گیا، کام کاج نوکر چاکر کرنے لگے اور مسجد بھی کشادہ ہوگئی اور وہ وجہ فی الجملہ ختم ہوگئی جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی تھی (لہٰذا اب جمعہ کے دن غسل لازم نہیں)

(۷) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بُدُوّ صَلاح سے پہلے پھلوں کی فروختگی کی ممانعت کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ دور نبوی میں لوگ کھجور کے باغوں کے سودے کرتے تھے پھر جب کھجوریں اترتیں تو باغ کا مالک رقم طلب کرتا۔ خریدار عذر کرتا کہ پھلوں میں فلاں فلاں بیماریاں آگئی تھیں، باغ والا کہتا کہ میں کیا جانوں؟ پھر فریقین جھگڑا لیکر دربار نبوی میں فیصلہ کے لئے آتے تھے۔ جب اس قسم کے جھگڑے بہت ہونے لگے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''جب تم جھگڑوں سے باز نہیں آتے تو پھل کارآمد ہونے سے پہلے مت بیچو'' یہ ارشاد ایک مشورہ تھا جو آپؐ نے لوگوں کو دیا تھا (کوئی حکم شرعی نہیں تھا)

(۸) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کعبہ کے دو کونوں (رکن اسود اور رکن یمانی) کے استلام پر اکتفا کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہی دو کونے اپنی اصل بنیادوں پر ہیں۔ شام کی طرف کے دو کونے اپنی اصل بنیادوں پر نہیں ہیں کیونکہ حطیم کی جانب سے کعبہ شریف کا کچھ حصہ قریش نے باہر کر دیا ہے۔

(۹) قولہ: لِدَفعِ ضُرٍّ الخ یہ عبارت تمام مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں اسی طرح ہے اور جار مجرور یُخَرِّجون سے متعلق ہیں۔ اور عبارت کا مطلب یہ ہے کہ مجتہدین کرام اور علمائے عظام قرآن وحدیث میں جو مصرَّح احکام ہیں، ان کی دفع مضرت کی غرض سے یا جلب منفعت کے مقصد سے ایسی علتیں نکالتے ہیں، جو نص میں مذکور حکم کے مناسب حال ہوتی ہیں۔

(۱۰) حجۃ الاسلام محمد بن محمد غزالی رحمہ اللہ (ولادت ۴۵۰ھ وفات ۵۰۵ھ) پانچویں صدی کے مشہور عالم ہیں، تقریباً دوسو کتابوں کے مصنف ہیں مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) إحیاءُ علوم الدین (۲) المستصفی من علم الأصول (۳) المنخول من علم الأصول (۴) تہافۃ الفلاسفۃ (۵) مقاصد الفلاسفۃ. اور غزالی زاء کی تشدید کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔ اول صناعۃ الغزل (اون کی کتائی) کی طرف نسبت ہے اور ثانی غزالۃ نامی بستی کی طرف نسبت ہے جو طوس کے علاقہ میں ہے۔

(۱۱) ابوسلیمان حَمد بن محمد خطابی بُستی (ولادت ۳۱۹ھ وفات ۳۸۸ھ) چوتھی صدی کے مشہور محقق محدث ہیں بُست: علاقۂ کابل میں ہے آپ کے جد امجد زید بن خطاب (برادر عمر بن خطاب) ہیں آپ کی مشہور تصنیف معالم السنن شرح ابو داؤد ہے علاوہ ازیں بیان اعجاز القرآن اور اصلاح غلط المحدثین وغیرہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ امام ابو داؤد رحمہ اللہ کے بیک واسطہ شاگرد ہیں۔

(۱۲) علامہ عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام (ولادت ۵۷۷ھ وفات ۶۶۰ھ) ساتویں صدی کے بڑے محقق عالم



ہیں۔سلطان العلماء کے لقب سے ملقب تھے۔دمشق (شام) کے باشندے تھے آپ کی مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) الالمام فی ادلۃ الاحکام (۲) قواعد الشریعۃ (۳) قواعد الاحکام فی اصلاح الانام۔

☆ ☆ ☆

اعمال کا حُسن و قُبح نہ محض عقلی ہے نہ شرعی بلکہ بین بین ہے

لغت میں حُسن کے معنی ہیں: خوبی، اچھائی اور عمدگی — اور قُبح کے معنی ہیں: برائی اور خرابی — اور اصطلاح میں تین معنی ہیں:

(۱) صفتِ کمال اور صفت نقصان — یعنی جن امور میں کمال اور خوبی ہے وہ حَسَن ہیں اور جن میں نقصان اور خرابی ہے وہ قبیح ہیں۔ مثلاً ''سچ'' حسن ہے کیونکہ اس میں خوبی ہے اور ''جھوٹ'' قبیح ہے، کیونکہ اس میں خرابی ہے، حسی مثال گھی اور زہر ہے۔

(۲) دنیوی مقاصد سے ہم آہنگ ہونا نہ ہونا یا کسی چیز کا نفع بخش یا ضرر رساں ہونا — یعنی جو کام دنیوی اغراض سے میل کھاتے ہیں وہ حسن ہیں اور جو ضرر رساں ہیں وہ قبیح ہیں مثلاً ظالم حاکم کی موافقت یعنی اس کی ہاں میں ہاں ملانا، دنیوی فوائد کے لحاظ سے اچھا سمجھا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کو ضرر رساں خیال کیا جاتا ہے اس لئے مفاد پرست اول کو اختیار کرتے ہیں اور ثانی سے بچتے ہیں۔

(۳) ثواب وعقاب کا حقدار بنانا — یعنی جن اعمال سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور آخرت میں ان اعمال پر ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے وہ اعمال حسنہ ہیں اور جن کاموں سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہوتے ہیں اور آخرت میں ان پر سزا ملتی ہے وہ اعمال قبیحہ ہیں۔ مثلاً نماز اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے اور باعث اجر ہے اس لئے فعل حسن ہے اور زنا چوری وغیرہ اللہ کے نزدیک مبغوض اعمال ہیں اور آخرت میں ان پر سزا دی جائے گی اس لئے یہ اعمال قبیحہ ہیں، اسی طرح بکری اور خنزیر کھانے میں فرق ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام اسلامی فرقے متفق ہیں کہ پہلے دو معنی کے اعتبار سے اعمال کا حُسن و قُبح عقلی ہے یعنی عقل بذات خود ان اعمال کی خوبی اور خرابی کا ادراک کرسکتی ہے، نزول شرع پر یہ چیز موقوف نہیں، البتہ تیسرے معنی کے اعتبار سے فِرَقِ اسلامیہ میں اختلاف ہے۔

اشاعرہ: کہتے ہیں کہ اعمال کا حسن و قبح محض شرعی ہے یعنی شریعت نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اعمال حسنہ ہیں اور جن کاموں سے روکا ہے وہ اعمال قبیحہ ہیں اور یہ حسن و قبح شریعت کے امر و نہی سے پیدا ہوا ہے، ورنہ اعمال

فی نفسہ نہ حسن ہیں نہ قبیح۔ مثلاً شارع نے نماز کا امر فرمایا تو نماز حسن ہوگئی اور زنا سے روکا تو وہ فعل قبیح ہوگیا، ورنہ ایجاب وتحریم سے پہلے نماز اور زنا یکساں تھے یعنی نہ ان میں حسن تھا نہ قبح، نہ ان کی وجہ سے ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا تھا نہ عقاب کا۔ اگر بالفرض شریعت بالعکس معاملہ کرتی تو زنا فعل حسن ہوتا اور نماز امر قبیح۔

ماتریدیہ: کہتے ہیں کہ اعمال میں حسن وقبح من وجہ عقلی ہے اور من وجہ شرعی یعنی وُرودِ شرع سے پہلے اعمال میں اپنی وضع کے اعتبار سے حسن وقبح موجود ہوتا ہے مگر وہ فطری حسن وقبح ثواب وعقاب کا حقدار نہیں بناتا، بلکہ نزول شرع کی وجہ سے اعمال موجب ثواب وعقاب بنتے ہیں۔ نزول شرع سے پہلے اگر کوئی ان کاموں کو کرے گا تو نہ ثواب کا حقدار ہوگا نہ عقاب کا، امر ونہی کے ذریعہ ہی استحقاق ثواب وعقاب پیدا ہوتا ہے۔ مگر امر ونہی ان اعمال میں کوئی حسن وقبح پیدا نہیں کرتے بلکہ شریعت نازل ہوکر فطری خوبی وخرابی کو ظاہر کرتی ہے غرض شریعت فطری اور عقلی حسن پر مدار رکھ کر بعض اعمال کا حکم دیتی ہے تو وہ اعمال ثواب اور رضائے خداوندی کا استحقاق پیدا کرتے ہیں، اسی طرح فطری اور عقلی خرابی پر مدار رکھ کر شریعت بعض اعمال سے روکتی ہے تو وہ سزا اور غضب خداوندی کا سزاوار بناتے ہیں اور اس اعتبار سے اعمال کا حسن وقبح شرعی ہے۔

اور یہ ضروری نہیں کہ شریعت تمام اعمال حسنہ کا امر فرمائے اور تمام اعمال قبیحہ کی نہی فرمائے، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں، وہ کسی چیز کے پابند نہیں، جس چیز کے بارے میں چاہتے ہیں امر فرماتے ہیں، اور جس کے بارے میں چاہتے ہیں اس سے روک دیتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ حکم بہر حال انہی کاموں کا دیتے ہیں جو فطری طور پر حسن ہیں اور ممانعت انہی اعمال کی فرماتے ہیں جو اپنی وضع میں قبیح ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ اعمال قبیحہ کا حکم دیدیں یا اعمال حسنہ سے روک دیں جن کاموں کا وہ حکم دیں گے وہ لامحالہ حسن ہوں گے، اور جن باتوں سے وہ روکیں گے وہ قبیح ہونگی۔

معتزلہ، امامیہ اور کرامیہ: کہتے ہیں کہ اعمال میں حسن وقبح محض عقلی ہے، یعنی وُرودِ شرع سے پہلے ہی سے اعمال میں حُسن وقبح موجود ہوتا ہے اور حاکم بدہن! اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ ہر اچھے کام کا حکم دیں اور ہر قبیح امر سے روکیں۔ اور شریعت خواہ نازل ہو یا نہ ہو ایمان، نماز وغیرہ اعمال صالحہ موجب اجر وثواب ہیں اور کفر وزنا وغیرہ اعمال قبیحہ سبب عقاب وموجب دخولِ نار ہیں، شریعت کا کام عقلی حسن وقبح سے پردہ اٹھانا ہے جیسے حکیم طب کی کتاب میں جو خواص ادویہ بیان کرتا ہے وہ اپنے بیان کے ذریعہ اشیاء میں خواص پیدا نہیں کرتا بلکہ فطری خواص کو ظاہر کرتا ہے یہی حال شریعت کا ہے۔ شریعت نازل ہوکر نہ اشیاء میں حسن وقبح پیدا کرتی ہے، نہ ثواب وعقاب کا حقدار بناتی ہے۔ بلکہ اگر شریعت نازل نہ بھی ہو تب بھی عقل احکام ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

علامہ محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) نے مسلّم الثبوت، مقالہ ثانیہ کے شروع میں ص ۱۴۲ میں یہ مذاہب ثلاثہ بہت اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں شائقین وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ معتزلہ کے خیال کی تردید کرتے ہیں کہ ان کا قول قطعاً باطل ہے، شریعت کا نزول بڑا



سبب ہے ثواب وعقاب کا استحقاق پیدا کرنے کے لئے، سارا مدار فطری حسن وقبح پر نہیں۔ اور ان کے قول کے بطلان کی دلیل نقلی دو حدیثیں ہیں۔

پہلی حدیث: تراویح کے معاملہ میں دو دن باجماعت نماز پڑھانے کے بعد، جب آپ ﷺ نے لوگوں کی بڑھتی ہوئی رغبت دیکھی تو تیسرے دن تشریف نہیں لائے اور ارشاد فرمایا کہ: ''مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کردی جائے'' غور کیجئے! اگر تراویح میں حسن ہے اور اس درجہ ہے کہ اس کو فرض کیا جانا چاہئے تو بقول معتزلہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ اس کی فرضیت نازل فرمائیں، خواہ لوگوں میں دلچسپی پائی جائے یا نہ پائی جائے۔ اس صورت میں شریعت اس کو فرض نہ کرے ایسا نہیں ہوسکتا۔ اور اگر تراویح میں اس درجہ کی خوبی نہیں تو شریعت اس کو فرض کر ہی نہیں سکتی، خواہ لوگوں میں کتنی ہی رغبت پائی جائے۔ حالانکہ حدیث شریف سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ شریعت تراویح کی فرضیت نازل کر بھی سکتی ہے اور نہیں بھی کرسکتی، تراویح کا فطری حسن کسی ایک بات کا لازمی تقاضا نہیں کرتا۔

دوسری حدیث: یہ ہے کہ ''مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ مسلمان ہے جو کسی ایسی چیز کے بارے میں دریافت کرے جو حرام نہیں کی گئی، پھر وہ اس کے سوال کرنے کی وجہ سے حرام کردی گئی'' سوچیں! معتزلہ کے مذہب پر یہ بات کیوں کر درست ہوسکتی ہے؟ اگر اس چیز میں اس درجہ خرابی ہے کہ اس کو حرام ہونا چاہئے تو اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ وہ اس کو حرام کریں، خواہ کوئی دریافت کرے یا نہ کرے، اور اگر وہ چیز اس درجہ قبیح نہیں تو سوال سے کیا ہوتا ہے؟! شریعت اس کو حرام نہیں کرسکتی۔ حالانکہ حدیث شریف سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوال کا نزول تحریم میں دخل ہے، معلوم ہوا کہ سارا مدار عقلی حسن وقبح پر نہیں۔

اور معتزلہ کے قول کے بطلان کی دلیل عقلی میں بھی دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔

پہلی بات: شدید گرم موسم میں، ماہ رمضان المبارک میں ایک شخص .A.C میں سفر کرتا ہے اور دوسرا چلچلاتی دھوپ میں کھیت میں ہل چلاتا ہے یا اور کوئی پر مشقت کام کرتا ہے تو عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اول کو روزہ نہ رکھنے کی سہولت نہ ملنی چاہئے کیونکہ سفر میں اسے کوئی پریشانی نہیں اور ثانی کو رخصت ملنی چاہئے، کیونکہ اس کے لئے اس مشقت کے ساتھ روزہ رکھنا سخت دشوار ہے۔ حالانکہ مسئلہ اس کے برعکس ہے، مسافر کے لئے رخصت ہے اور مقیم کے لئے نہیں، خواہ اسے کیسی ہی مشقت لاحق ہو، معلوم ہوا کہ احکام کا مدار محض عقلی حسن وقبح پر نہیں۔

دوسری بات: حدود کو لیجئے، ایک شخص صرف پانچ سو روپے کی چوری کرتا ہے اس کا معاملہ قاضی کے سامنے پہنچ جاتا ہے اور چوری ثابت ہوجاتی ہے تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹا جائے گا، صاحب مال بھی اس کو معاف نہیں کرسکتا کیونکہ یہ حد کا معاملہ ہے اور دوسرا شخص کسی کو عمداً قتل کرتا ہے اور قاضی کے پاس اس کا قتل ثابت ہوجاتا ہے تو بھی مقتول کے ورثاء قصاص معاف کرسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ حد نہیں، جبکہ پانچ سو روپے کی چوری کا معاملہ اتنا سنگین نہیں، جتنا قتل عمد کا معاملہ

سنگین ہے، پس اگر مدار عقل کے فیصلہ پر ہوتا تو چور کی معافی بہ نسبت قاتل کے آسان تھی۔

فائدہ (۱) اشاعرہ کی رائے بھی بالکل صحیح نہیں۔ مگر شاہ صاحب نے اس کی تردید یا تو اس وجہ سے نہیں کی کہ مقصد مسئلہ کی تنقیح نہیں، بلکہ معتزلہ کی تردید ہے یا اس وجہ سے نہیں کی کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مذاہب میں توافق پیدا کیا جاسکتا ہے، یا شاید اس لئے نہیں کی کہ شاہ صاحب خود اشعری ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ (۲) یہ بحث یہاں اس لئے چھیڑی گئی ہے کہ احکام شرعیہ میں جو حکم ومصالح ہیں وہ نزول شرع سے پیدا نہیں ہوتے، بلکہ پہلے ہی سے وہ حکمتیں اور مصلحتیں اعمال میں موجود ہوتی ہیں، مگر محض ان کی وجہ سے ثواب وعقاب کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا، نہ ان پر جزاء وسزا کا مدار ہے، ثواب وعقاب کا مدار نزول شرع پر ہے البتہ شریعت مصالح کا لحاظ کر کے احکام نازل کرتی ہے، بس یونہی الل ٹپ احکام نازل نہیں کرتی۔

[من قال: إن حُسنَ الأعمال وقُبْحَهَا عقليان من كل وجهٍ فقوله باطل كذلك]

نعم، كما أوجبتِ السنّةُ هذه، وانعقد عليها الإجماعُ، فقد أوجبت أيضًا: أن نزولَ القضاء بالإيجاب والتحريم سببٌ عظيم في نفسه —— مع قطع النظر عن تلك المصالح —— لإثابة المطيع وعقاب العاصي؛ وأنه ليس الأمر على ماظُنَّ من أن حُسْنَ الأعمال وقبحها —— بمعنى استحقاق العامل الثوابَ والعذابَ —— عقليان من كل وجهٍ، وأن الشرع وظيفتُه الإخبارُ عن خواصِّ الأعمال على ماهي عليه، دون إنشاءِ الإيجاب والتحريم، بمنزلة طبيبٍ يَصِفُ خواصَّ الأدوية، وأنواعَ المرض: فإنه ظنٌّ فاسد، تَمُجُّهُ السنةُ باديَ الرأي.

كيف؟ وقد قال النبيُّ صلى الله عليه وسلم في قيام رمضان: ﴿حتى خشيتُ أن يُكتب عليكم﴾ وقال: ﴿إن أعظم المسلمين في المسلمين جُرمًا: من سأل عن شيءٍ لم يُحَرَّم على الناس، فُحُرِّمَ من أجل مسئلته﴾ إلى غير ذلك من الأحاديث.

كيف؟ ولو كان ذلك كذلك لَجَازَ إفطار المقيم الذى يَتعانىٰ كَتَعَانِي الْمُسَافر، لمكان الحرج المبنيِّ عليه الرُّخَصُ، ولم يَجُزْ إفطارُ المسافر المترَفِّهِ؛ وكذلك سائر الحدود التى حدَّها الشَّارع.

ترجمہ: یہ خیال بھی باطل ہے کہ اعمال کا حُسن وقُبح بہر حال عقلی ہے: ہاں، جس طرح احادیث نے یہ ثابت کیا ہے (کہ احکام شرعیہ مصالح اور حِکَم پر مبنی ہیں) اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اسی طرح یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ایجاب وتحریم کے فیصلہ کا نزول بذات خود بہت بڑا سبب ہے اُن مصالح وحِکَم سے قطع نظر کرتے ہوئے فرماں بردار کے ثواب کے لئے،

اور نافرمان کے عذاب کے لئے اور یہ (بھی ثابت کیا ہے) کہ صورتِ حال وہ نہیں ہے جو سمجھی گئی ہے کہ اعمال کی خوبی اور خرابی بمعنی عمل کرنے والے کا ثواب یا عذاب کا حقدار ہونا بہر حال عقلی ہے اور شریعت کا کام اعمال کی خصوصیات کے بارے میں، جیسی کہ وہ نفس الامر میں ہیں، خبر دینا ہے۔ ایجاب وتحریم کو پیدا کرنا اس کا کام نہیں مثلاً حکیم دواؤں کی خصوصیات اور بیماریوں کی انواع بیان کرتا ہے (پیدا نہیں کرتا) غرض یہ خیال قطعاً باطل ہے احادیث شریفہ اس کو اول وہلہ ہی میں بالکل مسترد کردیتی ہیں۔

کیونکر (یہ گمان درست ہوسکتا ہے؟) جبکہ آنحضرت ﷺ نے تراویح کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ''یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا اس نماز کے تم پر فرض کئے جانے کا'' (متفق علیہ مشکوۃ ۱۲۹۵ باب قیام شہر رمضان) اور ارشاد فرمایا کہ: ''مسلمانوں میں مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جو لوگوں پر حرام نہیں کی گئی پھر اس کے سوال کی وجہ سے وہ حرام کردی گئی'' (متفق علیہ مشکوۃ ۱۵۴ باب الاعتصام) اور دیگر بہت سی احادیث۔

کیونکر (یہ گمان درست ہوسکتا ہے؟) اگر معاملہ ایسا ہوتا جیسا کہ گمان کیا گیا ہے تو اس مقیم کے لئے رمضان میں روزہ نہ رکھنا جائز ہوتا جو مسافر کی طرح مشقت برداشت کرتا ہے، اس تنگی کی بناء پر جس پر رخصتوں کا مدار ہے اور ٹھاٹ سے سفر کرنے والے مسافر کے لئے افطار جائز نہ ہوتا اور اسی طرح تمام حدود شرعیہ (کا حال ہوتا) جو شارع نے مقرر کی ہیں۔

لغات:

أَوْجَبَ الشيءَ: واجب کرنا، ثابت کرنا...... وظیفة: خاص کام، معین عمل...... مَجَّ الشيءَ: تھوک دینا، منہ سے پھینک دینا، کلی کردینا اور بطور استعارہ کہا جاتا ہے هذا كلامٌ تَمُجُّهُ الأسماعُ: یہ ایسا کلام ہے جس کو کان سننا نہیں چاہتے...... بادي الرأي: سرسری رائے، جس میں زیادہ غور وفکر نہ کیا گیا ہو...... مسئلة حاصل مصدر بمعنی سوال ودرخواست ہے۔

☆ ☆ ☆



احکام پر عمل پیرا ہونا حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا حکمتیں اور مصلحتیں جاننے پر موقوف نہیں، اگرچہ احکام میں حِکَم وعِلَل اور حسن وقبح ملحوظ ہوتا ہے، مگر امتثال اس حسن وقبح کے جاننے پر موقوف نہیں، البتہ اس کی تحقیق ضروری ہے کہ وہ حکم قرآن وحدیث سے صراحۃً یا استنباطاً ثابت ہے یا نہیں؟ سورۃ الفرقان آیت ۶۳ میں ﴿عِبَادُ الرَّحْمٰنِ﴾ (اللہ

کے مخصوص بندوں) کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب ان کو ان کے رب کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے، اس لئے احکام دین کا صرف مطالعہ یا غیر معتبر لوگوں سے سن لینا کافی نہیں، بلکہ پوری تحقیق کر کے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مگر جب حکم کی تحقیق ہو جائے تو اس پر عمل درآمد میں دیر بھی نہیں ہونی چاہئے۔

آج کل یورپ و امریکہ میں عام طور پر اور ہمارے ملک میں انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں خاص طور پر جو ذہنیت بنتی جارہی ہے کہ حکم کی حکمت معلوم ہوگی اور اس پر ذہن مطمئن ہوگا تب عمل کرنے کے لئے سوچیں گے، یہ غیر دینی مزاج ہے، کیونکہ احکام شرعیہ کے علل ومصالح اور ذاتی حسن وقبح ہر انسان نہیں سمجھ سکتا۔ اور اسی وجہ سے ہمیشہ یہ علم (اسرار الدین) نااہلوں کو دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کی گئی ہے اور ہر کس وناکس کے سامنے احکام کی علتیں اور حکمتیں بیان کرنے میں تذبذب ہوتا ہے کہ معلوم نہیں وہ بات سمجھ سکے گا یا نہیں۔

بلکہ یہ علم اتنا دقیق ہے کہ اس کو پڑھانے کے لئے اور اس علم میں کتاب لکھنے کے لئے وہ تمام شرائط ہیں جو علم تفسیر کے لئے ہیں اور وہ علوم ضروری ہیں جو علم تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔ اور جس طرح تفسیر بالرائی حرام ہے اسی طرح اس علم میں دلائل وقرائن کے بغیر اور آثار صحابہ وتابعین کے بغیر غور وفکر کرنا بھی حرام ہے۔

علاوہ ازیں مصالح وحکم کو جان کر عمل کرنا اتنی مضبوط بات نہیں جتنی اللہ ورسول کا حکم سمجھ کر عمل کرنا ہے۔ مؤمن کا اعتماد عقل پر نہیں ہوتا اللہ ورسول کے حکم پر ہوتا ہے۔ عقل تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے اور اللہ کے رسول اللہ کے رسول ہیں، پس جب کوئی حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو گیا تو اب مؤمن کو کسی اور دلیل کی حاجت نہیں۔

[الإمتثالُ لايَتوَقَّفُ على معرفةِ المصالح]

وأوجبتْ أيْضًا: أنه لايَحِلُّ أن يُتَوَقَّفَ في امْتثالِ أحكام الشرع —— إذا صَحَّتْ بِهَا الروايةُ —— على معرفةِ تلك المصالح، لعدم اسْتِقْلالِ عقولِ كثيرٍ من الناس في معرفةِ كثيرٍ من المصالح؛ ولكون النبيِّ صلى الله عليه وسلم أوْثَقَ عندنا من عقولنا؛ ولذلك لم يزل هذا العلمُ مَضْنُوْنًا بِهِ على غير أهلهِ؛ ويُشْترطُ له ما يُشترطُ في تفسير كتاب الله، ويَحْرُمُ الخَوْضُ فيه بالرأيِ الخَالِصِ، غيرِ المُسْتَنَدِ إلى السنن والآثار.

ترجمہ: احکام پر عمل حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں: اور احادیث نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ احکام شرعیہ پر عمل کرنے میں —— جبکہ وہ صحیح روایت سے ثابت ہو جائیں —— ان کی مصلحتوں کے جاننے تک توقف کرنا جائز نہیں، کیونکہ بہت سے انسانوں کی عقلیں بہت سی حکمتوں کو بطور خود نہیں سمجھ سکتیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہمارے

نزدیک ہماری عقلوں سے کہیں زیادہ قابل اعتماد ہے اور اسی وجہ سے ہمیشہ یہ علم (اسرار الدین) نا اہلوں کو دینے میں بخیلی کی گئی اور اس کے لئے وہ شرائط ہیں جو کتاب اللہ کی تفسیر کے لئے ہیں اور اس علم میں محض ایسی رائے سے جو احادیث اور صحابہ وتابعین کے ارشادات سے مؤید نہ ہو، غور وخوض کرنا حرام ہے۔

لغات: استقلَّ برأیه: رائے میں منفرد ہونا، اکیلا ہونا، کسی کو شریک نہ کرنا...... ضَنَّ بالشيْ: بخل کرنا۔ مضنون به (اسم مفعول) وہ چیز جس کے دینے میں بخیلی کی جائے۔

نوٹ: تفسیر کے لئے پندرہ علوم ضروری ہیں۔ جن کا بیان سیوطی رحمہ اللہ کی الاتقان فی علوم القرآن میں ہے۔ اور روح المعانی کے مقدمہ میں بھی ہے اور اس میں بعض چیزوں کے ضروری ہونے پر نقد بھی ہے۔

☆ ☆ ☆



تکلیف شرعی کی صحیح مثال

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو احکام شرعیہ کا مکلّف بنایا ہے معتزلہ نے پہلے اس کی یہ مثال دی ہے کہ ''ایک آقا نے اپنے غلام کی فرماں برداری کا امتحان کرنے کے لئے، اس کو کسی پتھر کے اٹھانے کا حکم دیا، جس میں امتحان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں، پھر جب غلام نے فرماں برداری کی یا نافرمانی کی تو آقا نے اس کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا''

یہ مثال معتزلہ نے اپنے اس دعوے کی دی ہے کہ (۱) احکام شرعیہ میں مصالح ملحوظ نہیں (۲) اور اعمال اور ان کی جزا کے درمیان کچھ بھی مناسبت نہیں —— معتزلہ کی یہ مثال صحیح نہیں، بلکہ تکلیف شرعی کی صحیح مثال یہ ہے کہ ایک آقا کے غلام بیمار پڑے، کسی وبا کا شکار ہو گئے، آقا نے ایک ڈاکٹر مقرر کیا جو ان کی دوا دارو کرے، پس جو غلام ڈاکٹر کی بات مانے گا اور دوا پیئے گا وہ درحقیقت آقا کی بات مانے گا اور شفایاب ہوگا اور آقا اس سے خوش ہوگا اور جو غلام ڈاکٹر کی بات نہیں مانے گا اور دوا پینے سے انکار کرے گا، وہ درحقیقت آقا کی نافرمانی کرے گا اور بیماری میں سڑے گا، اور آقا کی ناراضگی مول لے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیمار انسانوں کے معالجہ کے لئے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ نسخہ شفا بھیجا۔ اب جو لوگ انبیاء کی اطاعت کریں گے اور نسخہ شفا استعمال کریں گے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے اور شفایاب ہوں گے اور ان کا مولیٰ ان سے راضی ہوگا اور دارین میں ان کو بہترین صلہ عطا فرمائے گا، اور جو انبیاء کی نہیں سنے گا وہ دنیا میں بھی تباہ ہوگا اور اس کا مولیٰ اس سے ناخوش ہوگا اور وہ آخرت میں جہنم کا ایندھن بنے گا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ جو احکام بھیجے ہیں وہ بے فائدہ نہیں، بلکہ لوگوں کے لئے ان میں عظیم فوائد ہیں اور معتزلہ کی مثال غلط اس لئے ہے کہ وہ بے دلیل ہے، وہ محض ان کی ذہنی اُپج ہے اور شاہ صاحب نے جو مثال دی ہے

وہ درج ذیل روایات سے مستفاد ہے۔

پہلی روایت: فرشتوں نے آنحضور ﷺ کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص نے ایک شاندار حویلی بنائی اور اس کے افتتاح میں ایک پرتکلف دعوت کا انتظام کیا، پھر لوگوں کو دعوت دینے کے لئے ایک شخص کو بھیجا، پس جو شخص داعی کی بات مان کر دعوت میں آئے گا وہ مزے دار کھانا کھائے گا اور مالک اس سے خوش ہوگا کہ اس نے اس کی خوشی میں شرکت کی۔ اور جو داعی کی بات قبول نہیں کرے گا اور دعوت میں حاضر نہ ہوگا وہ محروم رہے گا اور جب صاحب خانہ کو پتہ چلے گا کہ فلاں شخص نے افتتاح میں شرکت کی دعوت قبول نہیں کی تو اس کی طرف سے اس کا دل میلا ہوگا۔

اسی طرح اللہ پاک نے ایک حویلی بنائی ہے اور وہ جنت ہے اور اس کی نعمتیں خوان یغما ہیں اور داعی رسول اللہ ﷺ ہیں، پس جو آپ کی دعوت قبول کرے گا اور جنت میں پہنچے گا وہ اس کی سدا بہار نعمتوں سے لطف اندوز ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مزید برآں ہوگی۔ اور جو داعی کی بات رد کرے گا اور حویلی میں نہیں پہنچے گا، وہ نہ صرف یہ کہ جنت کی نعمتوں سے محروم رہے گا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی بھی مول لے گا اور اس کی پاداش بھگتے گا۔

اس حدیث میں غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ معتزلہ کی دی ہوئی مثال قطعادرست نہیں، تکلیف شرعی بے فائدہ ہرگز نہیں، بلکہ اس میں انسانوں کے لئے بے شمار فوائد ہیں۔

دوسری روایت: خود آنحضور ﷺ نے اپنی اور اپنے لائے ہوئے دین کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص قوم کو دشمن کے خطرہ کی وارننگ دیتا ہے، پس جو لوگ یہ خبر سن کر اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے وہ بال بال بچ جائیں گے اور جو لوگ اس خبر پر کان نہیں دھریں گے وہ تباہ ہونگے، اسی طرح جو لوگ نبیوں کی بات سنیں گے وہ نجات پائیں گے اور جو جھٹلائیں گے وہ جہنم رسید ہوں گے اس حدیث سے بھی صاف معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کی مثال صحیح ہے اور معتزلہ کا خیال اور ان کی مثال غلط ہے۔

تیسری روایت: آگے باب گیارہ میں تفصیل سے آرہی ہے کہ لوگوں پر دنیا میں جو بلائیں بلائیں، آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "وہ تمہارے اعمال ہیں جو تمہاری طرف پھیرے جاتے ہیں" اس حدیث سے بھی یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اعمال اور ان کے بدلہ کے درمیان گہرا ربط ہے، کیونکہ اعمال سیئہ پر جو سزائیں ملتی ہیں وہ بس یونہی الل ٹپ نہیں ملتیں بلکہ ان میں گہری مناسبت ہوتی ہے۔ یہی حال اعمال صالحہ اور ان کی برکات کا ہے۔

[المثال الصحيح للتكليف الشرعي]

وظهر مـمّا ذكرنا أن الحقَّ في التكليف بالشرائع: أن مَثَلَهُ كَمَثَلِ سيِّدٍ، مَرِضَ عبيدُه، فسلَّط

عليهم رجلا من خاصّته، لِيَسْقِيَهُمْ دواءً؛ فإن أطاعوا له أطاعو السيِّدَ، ورَضِيَ عنهم سيدُهم، وأثابهم خيرًا؛ ونَجوا من المرض؛ وإن عَصَوه عَصَوُا السيِّدَ، وأحاط بهم غضبُه، وجازاهم أسوأَ الجزاءِ، وهلكوا من المرض؛ وإلى ذلك أشار النبيُّ صلى الله عليه وسلم حيث قال راويًا عن الملائكة: ﴿ أنَّ مَثَلَهُ كمثل رجل بَنىٰ دارًا، وجعل فيها مأدُبَةً، وبعث داعيًا، فمن أجاب الداعيَ دخل الدار، وأكل من المأدُبَةِ؛ ومن لم يُجب الداعِيَ لم يَدْخُل الدار، ولم يأكل من المأدُبةِ ﴾

وحيث قال: ﴿ إنما مَثَلِي ومَثَلُ ما بعثني اللّٰهُ به، كمثل رجلٍ أتى قومًا، فقال: ياقوم! إني رأيتُ الجيشَ بعَيْنَيَّ، وإني أنا النذيرُ العريانُ، فالنَّجاءَ! النجاءَ!! فأطاعه طائفة من قومه، فأَدْلَجُوْا، فانطلقوا على مَهَلِهم، فنجَوْا، وكذَّبت طائفة منهم، فأصْبَحُوْا مكانَهم، فصَبَّحَهُمْ الجيشُ، فأهْلَكَهُمْ، واجْتَاحَهُمْ ﴾ وقال راويًا عن رَبِّه: ﴿ إنما هي أعمالُكم تُرَدُّ عليكم ﴾

ترجمہ: تکلیف شرعی کی صحیح مثال: مذکورہ بالا کلام سے یہ امر واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو احکام شرعیہ کا مکلّف بنایا ہے تو اس کی مثال بالکل اس آقا جیسی ہے جس کے بہت سے غلام بیمار پڑے ہوں پس آقا نے ان پر اپنے مخصوص لوگوں میں سے ایک آدمی کو مقرر کیا تا کہ وہ ان کو دوا پلائے، اب اگر غلام اس شخص کی بات مانیں گے تو وہ آقا کے فرماں بردار شمار ہوں گے اور آقا اُن سے خوش ہوگا، اور ان کو اچھا بدلہ دے گا اور وہ بیماری سے نجات پائیں گے۔ اور اگر غلام اُس آدمی کی بات نہیں مانیں گے تو وہ آقا کے نافرمان شمار ہوں گے اور آقا کی ناراضگی ان کو گھیر لے گی اور وہ ان کو سخت سے سخت سزا دے گا اور وہ بیماری سے ہلاک ہو جائیں گے اور اس مثال کی طرف آنحضور ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ آپؐ نے فرشتوں کی بات نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''آپ ﷺ کی مثال اُس آدمی جیسی ہے جس نے کوئی مکان تعمیر کیا اور اس میں ضیافت کا انتظام کیا اور دعوت دینے والے کو بھیجا، پس جس نے داعی کی بات پر لبیک کہا وہ گھر میں آیا اور دستر خوان سے کھایا اور جس نے داعی کی بات پر لبیک نہ کہا وہ نہ گھر میں آیا نہ دستر خوان سے کھایا'' (متفق علیہ، مشکوۃ ح ۱۴۴ باب الاعتصام الخ)

(اور ایک اور ارشاد میں بھی آپؐ نے اس مثال کی طرف اشارہ فرمایا ہے) چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ: ''میری اور اس دین کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اُس شخص جیسی ہے جو کسی قوم کے پاس آیا۔ اور کہا: اے میری قوم! میں نے دشمن کا ایک لشکرِ جرار اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ننگا ڈرانے والا (یعنی بڑے خطرے سے صاف آگاہ کرنے والا) ہوں، پس بچو! بچو! پس قوم میں سے ایک گروہ نے اس کی بات مانی چنانچہ وہ شروع رات ہی میں چل پڑے اور آہستہ آہستہ رات بھر چلتے رہے پس وہ بچ گئے اور ایک گروہ نے اس شخص کی تکذیب کی اور وہ اسی جگہ ٹھہرے رہے پس ان پر دشمن نے شب خون مارا اور ان کو ہلاک کر دیا اور صفحۂ ہستی سے مٹا دیا'' (متفق علیہ، مشکوۃ ح ۱۴۸

باب الاعتصام الخ) اور آپ ﷺ نے اپنے پروردگار سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''وہ (آفات وبلیات اور مظالم) تمہارے اعمال ہی ہیں جو تم پر لوٹائے جارہے ہیں'' (رواہ مسلم ج۶ص۱۳۲مصری أبواب البر والصلة ، یہاں یہ روایت مختصراً اور بالمعنیٰ آئی ہے، آگے باب لصوق الأعمال بالنفس میں مفصل اور بلفظہ آرہی ہے)

لغات:

الحق: سچائی، راستی...... سلّطه عليه: قدرت دینا، قابض بنانا...... الخاصّة: عامّة کی ضد، وہ چیز جس کو کوئی اپنے لئے خاص کرلے، خاصّة الملك: بادشاہ کے مقرب لوگ...... المأدُبة: وہ کھانا جو دعوت کے لئے تیار کیا جائے...... النذير العُريان: ننگا ڈرانے والا، قدیم عربوں میں دستور تھا کہ جب کوئی خطرناک خبر دینی ہوتی تو وارننگ دینے والا بالکل مادرزاد ننگا ہوکر اعلان کرتا۔ اس سے النذير العُريان کا محاورہ بن گیا۔ اب ایسا کرنا ضروری نہیں، اب جو بھی دوٹوک وارننگ دے وہ النذير العريان کہلائے گا...... اَدلج إدلاجًا القومُ: رات بھر چلنا یا آخری رات میں چلنا...... المَهَل: نرمی، آہستگی...... صَبَح: صبح کے وقت آنا، شب خون مارنا یعنی رات کے پچھلے حصہ میں یا صبح سویرے حملہ کرنا...... اجْتَاحه: جڑ سے اکھاڑنا، ہلاک کرنا۔

☆ ☆ ☆

اہل فَترت اور پہاڑوں پر رہنے والوں کا حکم

اہل فترت اور اہل جاہلیت: دونبیوں کے درمیان کے لوگوں کو کہتے ہیں، جب ایک نبی کی دعوت ختم ہوجائے یعنی ان کا لایا ہوا صحیح دین دنیا میں باقی نہ رہے اور اگلا نبی ابھی نہ آیا ہو تو اس درمیانی وقفہ کے لوگوں کو اصحاب فترت اور اہل جاہلیت کہتے ہیں۔

اور سکان شواہق جبال: پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسنے والے لوگوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن تک نبی کی دعوت نہیں پہنچی یعنی وہ کسی ایسے دور دراز خطے میں بستے ہیں کہ اللہ کے دین کے داعی وہاں تک نہیں پہنچ سکے، نہ کسی اور ذریعہ سے اللہ کے دین کی بات ان کے کان میں پڑی۔

مذکورہ دونوں قسم کے لوگوں کا اخروی انجام کیا ہوگا؟ ناجی ہوں گے یا ناری؟ یہ کانٹوں بھرا مسئلہ ہے، کیونکہ ان کے بارے میں دلائل متعارض ہیں:

(۱) سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۵ ﴿وما كنا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ وہ معذب نہ ہوں گے، ناجی ہوں گے، حالانکہ اس آیت میں دنیوی عذاب (سزا) کا ذکر ہے جو حق و باطل کی کشمکش کے

آخر میں، عملی فیصلہ کرنے کے لئے نازل ہوتا ہے، آخرت کے عذاب سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔

(۲) اور ابن ماجہ میں سند صحیح سے حدیث (نمبر ۱۵۷۳) ہے کہ ایک دیہاتی نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میرے ابا صلہ رحمی کرتے تھے اور فلاں فلاں اعمال صالحہ کرتے تھے، اب مرنے کے بعد وہ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دوزخ میں ہے —— اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو یہ بھی حکم دیا کہ ﴿حَيْثُما مَرَرْتَ بقبرِ مشرك فَبَشِّرْه بالنار﴾ (تم جس کافر کی بھی قبر پر گزرو، اس کو جہنم کی خوش خبری دو) اس سائل کا باپ اصحاب فترت میں سے تھا اور وہ اصحاب قبور بھی اہل فترت میں سے تھے پس اس روایت سے ان کا معذب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

الغرض یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے، اس مسئلہ میں درج ذیل آراء پائی جاتی ہیں۔

(۱) شیخ محیی الدین ابن عربی (۵۶۰-۶۳۸ھ) جو ساتویں صدی کے مشہور بزرگ اور صوفی ہیں فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ان لوگوں کی طرف میدان محشر میں نبی مبعوث کئے جائیں گے، جو لوگ ان کی اتباع کریں گے وہ ناجی ہوں گے اور جو ان کا انکار کریں گے وہ ناری ہوں گے — مگر یہ بات بے دلیل ہے اور یوم قیامت دار عمل نہیں، بلکہ دار جزاء ہے۔

(۲) حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی (۹۷۱-۱۰۳۴ھ) جو حضرت شاہ صاحب سے تقریباً ایک صدی پہلے گزرے ہیں، مکتوبات جلد اول مکتوب نمبر ۲۵۹ میں فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کو ان کے برے اعمال کی جو سزا دینی ہے وہ میدان محشر میں دیدی جائے گی، پھر ان کو دیگر حیوانات کی طرح مٹی بنادیا جائے گا اور مجدد صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے یہ رائے تمام انبیاء کی محفل میں پیش کی، تو سب نے میری رائے پسند کی اور اس کو صحیح قرار دیا—— یہ کوئی مکاشفہ ہے اور انبیاء کے علاوہ کسی کا بھی کشف حجت شرعیہ نہیں، وہ محض ظن پیدا کرتا ہے، حکم شرعی ثابت کرنے کے لئے دلیل قطعی کی ضرورت ہے۔

(۳) مفسرین کی ایک رائے یہ ہے کہ وہ لوگ اعراف میں رہیں گے، جو جنت اور جہنم کے بیچ میں ایک مقام ہے — مگر یہ رائے بھی درست نہیں، کیونکہ اعراف ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں، تمام اہل اعراف آخر میں جنت میں منتقل کردئے جائیں گے۔

(۴) اصولیوں کی عام رائے یہ ہے کہ اعمال کا حُسن وقبح من وجہٍ عقلی ہے یعنی اعمال کی وضع ہی میں خوبیاں اور خرابیاں رکھی گئی ہیں مگر یہ فطری حسن وقبح انسان سمجھ نہیں سکتا اس لئے نزول شرع ضروری ہے۔ البتہ اللہ کی معرفت کا حسن اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی برائی انسان نزول شرع کے بغیر بھی اپنی خداداد عقل سے سمجھ سکتا ہے، باقی اعمال کے حسن وقبح کا عقل ادراک نہیں کرسکتی، شریعت نازل ہوکر جب احکام دیتی ہے، تبھی اعمال کا حسن وقبح معلوم ہوتا ہے۔

پس وہ اعمال جن کا حسن وقبح انسان عقل سے نہیں سمجھ سکتا ان پر نزول شرع سے پہلے مؤاخذہ نہ ہوگا اور توحید وشرک پر

جزاؤ سزا مرتب ہوگی، علامہ محب اللہ بہاری رحمہ اللہ نے مسلم الثبوت (ص۱۶) میں امام اعظم رحمہ اللہ سے یہی روایت نقل کی ہے۔انھوں نے لکھا ہے: رُوِی عن أبی حنیفة رحمه الله تعالی: لاعُذْر لأحدٍ في الجهل بخالقه لما یری من الدلائل پھر علامہ نے اس روایت میں ایک قید بڑھائی ہے اور مذکورہ مسئلہ اس روایت پر متفرع کیا ہے، لکھتے ہیں:

أقول: لعل المرادَ بعد مُضِیٍّ مدة التأمل، فإنه بمنزلةِ دعوةِ الرسل فی تنبیه القلب بذلك؛ وتلك المدة مختلفة،فإن العقول متفاوتة، وبما حرَّرنا من المذاهب یتفرع علیه مسألةُ البالغ فی شاهق الجبل الخ

اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور احسان مندی کا حسن اور شرک اور احسان فراموشی کی برائی عقل سے اس لئے سمجھی جاسکتی ہے کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ نے پچھلی زندگی میں سمجھا کر انسان کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ کلُّ مولد یولد علی الفطرة: ہر بچہ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں نیا نہیں پیدا ہوتا، اس دنیا میں صرف انسان کا جسم نیا بنتا ہے کیونکہ یہ عالم اجساد ہے اور اس کی روح اس سے بہت پہلے پیدا کی جاچکی ہے اور تمام روحیں عالم ارواح میں موجود ہیں، وہاں سے وہ روح شکم مادر میں بننے والے جسد خاکی میں منتقل کی جاتی ہے۔سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰی أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ.

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں، تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔

یہ عہد الست اور عالم ذُرّ کا واقعہ ہے۔حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی پشت سے ان کی صلبی اولاد پیدا کی گئی جیسا کہ حدیث میں تفصیل ہے، پھر اولاد کی پشت در پشت سے ان کی اولاد نکالی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اپنے سامنے پھیلا دیا یعنی ان پر اپنی تجلی فرمائی، اپنا جلوہ دکھایا، اس طرح دیدار کرا کر اپنی معرفت اور پہچان کرائی، پھر ان سے پوچھا: ''کیا میں تمہارا رب نہیں؟'' سب نے کہا! کیوں نہیں! ہم سب گواہی دیتے ہیں یعنی اقرار کرتے ہیں۔یہ مضمون مسند احمد ج ۱ ص ۲۷۲ اور مستدرک حاکم ج ۲ ص ۵۴۴ کی روایت میں ہے جس کی سند صحیح ہے۔

پھر وہ روحیں اصلاب میں واپس نہیں کی گئیں بلکہ عالم ارواح میں ان کو خاص ترتیب سے رکھ دیا گیا، بخاری شریف میں روایت ہے الأرواحُ جنودٌ مجنَدة: عالم ارواح میں روحیں خاص ترتیب سے جیسے کہ فوج کی پلٹنیں ہوتی ہیں رکھی ہوئی ہیں پھر شکم مادر میں تیار ہونے والے جسم میں وہیں سے روح لاکر فرشتہ پھونکتا ہے۔

الغرض معرفت خداوندی اور ربوبیت کی گواہی ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اور اس دنیا میں آنے کے بعد انسان گو اس عہد کی تفصیلات بھول گیا ہے مگر اصل استعداد موجود ہے اس لئے ایمان وتوحید اور اس کی ضد شرک وکفر بالکل عقلی مسئلہ ہے، ان کا حسن وقبح انسان اپنی عقل وفطرت سے سمجھ سکتا ہے باقی اعمال حسنہ نماز روزہ زکوۃ وغیرہ کا حسن اور اعمال سیۂ زنا چوری شراب نوشی وغیرہ کا قبح انسان اپنی عقل سے نہیں سمجھ سکتا، نزول شرع کے بعد ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس وجہ سے ایمان وکفر کی وجہ سے اہل فترت اور سکان شواہق جبال کو جزاو سزا ہوگی باقی اعمال کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ نے گذشتہ بحث اچھی طرح سمجھ لی ہے تو اہل جاہلیت کے بارے میں جو متعارض دلائل ہیں ان میں آپ تطبیق دے سکتے ہیں۔ تطبیق کس طرح ہوگی؟ یہ بات حضرت نے تشنہ چھوڑ دی ہے، بظاہر تطبیق یہ ہے کہ جن اعمال کا حسن وقبح عقل وفطرت سے سمجھا جاسکتا ہے ان پر مؤاخذہ ہوگا، باقی اعمال جن کا حسن وقبح انسانی عقل ادراک نہیں کرسکتی، نزول شرع کے بعد ہی اس تک رسائی ہوسکتی ہے ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، کیونکہ اعمال کا حسن وقبح من کل الوجوہ نہ عقلی ہے نہ شرعی، بلکہ من وجہ عقلی ہے اور من وجہ شرعی۔ پس ایمان وکفر میں عقلی پہلو کا اعتبار ہوگا اور باقی اعمال میں شرعی پہلو ملحوظ رکھا جائے گا۔

وبما ذكرنا من أنَّ ههنا أمرًا بين الأمرين، وأن لكل من الأعمال ونزولِ القضاء بالإيجاب والتحريم أثرًا في استحقاقِ الثواب والعقاب، يُجْمَعُ بين الدلائل المتعارِضة في أهل الجاهلية، يُعَذَّبون بما عملوا في الجاهلية أم لا؟.

ترجمہ: اور اُن باتوں سے جو ہم نے ذکر کیں ہیں کہ: ''یہاں معاملہ دو امروں کے درمیان ہے اور یہ کہ اعمال اور ایجاب وتحریم کے فیصلہ کے نزول میں سے ہر ایک کا اثر ہے ثواب وعقاب کا حقدار بنانے میں'' تطبیق دی جاسکتی ہے اہل جاہلیت کے بارے میں متعارض دلائل ہیں کہ وہ ان اعمال کی وجہ سے جن کو انھوں نے ایام جاہلیت میں کیا ہے، عذاب دئے جائیں گے یا نہیں؟

فن حکمت شرعیہ کی تدوین اور اس کے فوائد

بعض حضرات درج ذیل دو باتیں تسلیم کرتے ہیں:

(۱) احکام معلل بالمصالح ہیں یعنی احکام میں علتیں اور حکمتیں ملحوظ ہیں، پس ان کو سمجھ کر نکالا جاسکتا ہے۔

(۲) اور اعمال پر جزا کا ترتب بایں وجہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی نیتوں سے صادر ہوتے ہیں جو نفس کو سنوارتی بھی ہیں اور

بگاڑتی بھی ہیں۔ایک حدیث میں اس کا اشارہ موجود ہے۔ارشاد ہے:

''بدن میں ایک بوٹی ہے، جب وہ سنور جاتی ہےتو ساراجسم سنور جاتا ہے(اوراس سے اعمال صالحہ صادر ہونے لگتے ہیں)اور جب وہ بگڑ جاتی ہےتو ساراجسم بگڑ جاتا ہے(اور ہرعضو سے برے اعمال صادر ہونے لگتے ہیں) سنو!وہ بوٹی دل ہے''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعمال کا صدور اچھی بری کیفیات کے مطابق ہوتا ہے یعنی جیسی نیت ہوگی ویسا عمل صادر ہوگا۔اور جب اعمال اچھے برے ہوئے تو ان کے مطابق جزاؤ سزا کا ہونا ایک معقول امر ہے، پس اعمال اوران کی جزاء کے درمیان مناسبت ہے۔

مگر بایں ہمہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ فن حکمت شرعیہ کی تدوین یعنی اصول طے کرکے اس پر جزئیات متفرع کرنا ناممکن ہےاوروہ لوگ:

دلیل عقلی یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ بہت دقیق فن ہے،اس کے مسائل نہایت باریک ہیں، پس اس فن کی تدوین جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اوردلیل نقلی کی وہ دوطرح تقریر کرتے ہیں:

(۱) یہ فن سلف نے مدون نہیں کیا، حالانکہ ان کا زمانہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے قریب تھا وہ خیر القرون کے لوگ تھےاوران کے پاس شریعت کا علم بھی ہم سے زیادہ تھا، پھر بھی انھوں نے یہ فن مدون نہیں کیا تو گویا قرون مشہود لہا بالخیر کا اس فن کی عدم تدوین پر اجماع ہوگیا، پس اگر آج کوئی شخص اس فن کی تدوین کا بیڑا اٹھاتا ہےتو وہ خرق اجماع کرتا ہے۔

(۲) اس فن کی تدوین میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نہیں، کیونکہ احکام شرعیہ پرعمل کرنا حکمتیں اورمصلحتیں جاننے پر موقوف نہیں، پس اس فن کی تدوین کرنا اوراحکام شرعیہ کے اسرار جاننے کے لئے محنت کرنا بے فائدہ کام ہے؟ اور حدیث شریف میں ہے کہ:

من حُسنِ إسلام المرءِ تَركُهُ مالا يَعْنيهِ(مشکوۃ ح۴۸۳۹) آدمی کے دین کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کام چھوڑ دے

غرض دلائل نقلیہ اورعقلیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ یا تو یہ فن مدون ہی نہیں کیا جاسکتا یا نہیں کرنا چاہئے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ گمان فاسد ہے، یہ فن مدون کیا جاسکتا ہےاوراس میں بے شمار فوائد ہیں، اس لئے مدون کرنا چاہئے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

[تدوين علم أسرار الدين ممكن، وفيه فوائدُ جَمَّة]

ومن الناس من يَعلم في الجملة: أن الأحكام معلَّلَةٌ بالمصالح،وأن الأعمالَ يترتَّب عليها

الجزاءُ من جهةِ كونِهَا صادرةً من هيئاتٍ نفسانيةٍ، تصلحُ بها النفسُ وتفسُد،كما أشار إليه النبيُّ صلى الله عليه وسلم حيث قال:﴿ ألاَ وإن في الجسد مُضغةً، إذا صلُحَتْ صلُح الجسدُ كلُّه،وإذا فسدت فسد الجسدُ كلُّه، ألاَ وهي القلب﴾

لكنه يَظُنُّ أن تدوينَ هذا الفنِّ،وترتيبَ أصوله وفروعِه، ممتنعٌ، إما:

[١] عقلاً، لِخَفَاءِ مسائله، وغُموضِها.

[٢] أوشرعاً، لأن السلف لم يُدَوِّنُوهُ مَعَ قُرْبِ عهدِهم من النبي صلى الله عليه وسلم وَغَزَارَةِ علمهم، فكان كالاتفاق على تركه.

[٣] أو يقولُ: ليس في تدوينه فائدةٌ مُعْتَدَّةٌ بها؛ إذ لايتوقف العملُ بالشرع على معرفة المصالح. وهذه ظنونٌ فاسدةٌ أيضًا.

ترجمہ: فن حکمت شرعیہ کی تدوین ممکن ہے اور اس میں بڑے بڑے فوائد ہیں بعض لوگ کسی درجہ میں یہ بات جانتے ہیں کہ احکام معلل بالمصالح ہیں (پس ان میں سے حکمتیں نکالی جاسکتی ہیں) اور اعمال پر جزا اس اعتبار سے مرتب ہوتی ہے کہ وہ ایسی کیفیات قلبیہ سے صادر ہوتے ہیں، جن سے نفس سنورتا ہے یا بگڑتا ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ:

''سنو! جسم کے اندر ایک ایسا گوشت کا لوتھڑا ہے کہ جب وہ سنور جاتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے، اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، سنو! وہ لوتھڑا دل ہے''

مگر وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اس فن کی تدوین اور اس کے اصول وفروع کو مرتب کرنا، ناممکن ہے، یاتو

(۱) عقلاً ناممکن ہے، کیونکہ اس فن کے مسائل نہایت باریک اور غامض ہیں۔

(۲) یا شرعاً ناممکن ہے، کیونکہ سلف صالحین نے یہ فن مدون نہیں کیا، حالانکہ ان کا زمانہ دورِ نبوی سے قریب تھا اور ان کا علم بھی زیادہ تھا، پس ان کا مدون نہ کرنا گویا اس فن کو مدون نہ کرنے پر اجماع ہے۔

(۳) یا وہ یہ کہتا ہے کہ اس فن کی تدوین میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نہیں ہے، کیونکہ شریعت پر عمل کرنا حکمتوں کے جاننے پر موقوف نہیں۔

اور یہ خیالات بھی (مذکورہ باتوں کی طرح) غلط ہیں۔

لغات:

الجملة: مجموعہ، في الجملة: مجموعہ میں شامل، اور محاورہ میں ترجمہ ہے: کسی درجہ میں، کچھ نہ کچھ...... صلح (ک ف

ن) صَلاحًا: درست ہونا...... فسد(ن ض ک) فسادًا خراب ہونا، بگڑ جانا...... مضغة: گوشت وغیرہ کا ٹکڑا جمع مُضغ...... خفی خفاءً پوشیدہ ہونا...... غمض (ن ک) غُمُوضًا کلام کا دقیق ہونا...... غزُر(ک) غزارۃ الماء وغیرہ: پانی وغیرہ کا کثیر ہونا۔

☆ ☆ ☆

مذکورہ خیال باطل کی تردید

دلیل عقلی کا جواب: یہ ہے کہ فن حکمتِ شرعیہ کے مسائل میں بیشک خفا اور دقت ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس فن کی تدوین ممکن نہیں، درست نہیں، مسائل فن کی پوشیدگی اور باریکی سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا، کیونکہ یہ بات درست نہیں ہے کہ جس فن کے بھی مسائل دقیق اور خفی ہوں اس کو کوئی بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ دیکھئے ایک فن علم اسرار الدین سے بھی زیادہ دقیق ہے اور وہ علم کلام ہے، جس کو علم الذات والصفات اور علم التوحید بھی کہتے ہیں اس فن میں اللہ کی ذات وصفات سے بحث کی جاتی ہے (اور عذاب قبر سے آخر تک جو مسائل ہیں وہ علم کلام کے اصلی مسائل نہیں، بلکہ اس کے متعلقات ہیں یعنی وہ اصولِ اسلام ہیں)

اور علم کلام کے مسائل ادق اس لئے ہیں کہ اس میں ذات باری اور اس کی صفات سے بحث کی جاتی ہے، جو وراء الوراء ہے، عقل اپنی کمند وہاں تک نہیں پھینک سکتی، نہ اس کی تفصیلات کا احاطہ کرسکتی ہے کیونکہ وہ غیر متناہی ذات ہے، مگر جب ضرورت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء پیدا کیے جنہوں نے اس علم کو پوری طرح مدون کردیا اور اس کی تفصیلات اس درجہ بیان کردیں کہ اب اس پر کوئی اضافہ ممکن نہیں، پس جب اتنا دقیق علم مرتب کیا جاسکتا ہے تو فن حکمت شرعیہ جو نسبتًا آسان ہے اس کو کیوں مرتب نہیں کیا جاسکتا؟!

اصل بات یہ ہے کہ ہر فن شروع میں مشکل نظر آتا ہے، اور ایسا خیال گذرتا ہے کہ اس سے بحث کرنا ناممکن ہے اور اس کی تفصیلات کو احاطہ تحریر میں لانا محال ہے مگر جس طرح اَلّوھ بچھڑے کو ہل میں چلنے کے لئے لکڑی لاٹھی اور جُوے کے ذریعہ سدھایا جاتا ہے یا جیسے شیر ہاتھی کو سرکس میں کرتب دکھانے کے لئے اذیت رساں آلات کے ذریعہ ٹرینڈ کرلیا جاتا ہے اسی طرح فن کے مقدمات وآلات کے ذریعہ جب کسی علم کو سدھالیا جائے اور اس فن کی باتوں کو آہستہ آہستہ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ قابو میں آجاتا ہے اور اس کے اصول وضع کرنا اور اس کی جزئیات ومتعلقات کو طے کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

ہاں یہ بات درست ہے کہ یہ علم کسی درجہ میں مشکل ضرور ہے مگر دشوار سے دشوار کام کو بھی کوئی نہ کوئی انجام دینے والا

ضرور پیدا ہوتا ہے اور اسی کارنامہ سے معاصرین پر اس کی برتری ثابت ہوتی ہے، جو شخص خطروں میں بے خطر کود پڑتا ہے وہی مقصد حاصل کرتا ہے، موتیوں کے متلاشی کو سمندر کی غوطہ زنی کرنی ہی پڑتی ہے اور عقل کو مشقت میں ڈال کر اور فہم کو انتہائی درجہ استعمال کر کے ہی علوم وفنون کے کندھوں پر سواری کی جاسکتی ہے۔ غرض ہمتِ مرداں مدد خدا! اگر حوصلہ اور ذوق عمل ہو تو بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ الحاصل مسائل کی باریکی فن کی تدوین کے لئے مانع نہیں۔

[الردُّ على الظن الفاسد]

[۱] قوله: لخَفاء مسائله وغموضها.

[قلنا:] إن أراد بـه أنـه لايُـمكن التدوينُ أصلاً، فَخَفَاء المسائل لايُفيد ذلك، كيف؟ ومسائلُ علم التوحيد والصفات أَعْمَقُ مُدْرَكًا، وَأبعدُ إحاطةً، وقد يَسَّرَه الله لمن شاء؛ وكذلك كلُّ علم يَتَـراءَى بـادِيَ الـرأي: أن البـحـثَ عنه مُستحيلٌ، والإحاطةَ به ممتنعةٌ، ثم إذا ارْتِيْضَ بأَدَواته، وتُدُرِّج في فهم مقدِّماته حصل التمكُّن فيه، وتَيَسَّر تأسيسُ مبانيه، وتفريعُ فروعه، وذَوِيْهِ؛

وإن أراد العُسْرَ في الجملة، فمسلَّم، لكنه بالعسر يظهر فضلُ بعض العلماء على بعض، وأن بُلوغَ الآمالِ في رُكوب المَشَاقِ والأهوالِ، وأنَّ اقْتِعَادَ غاربِ العلوم بتَجَشُّم العقول وإمعان الفُهوم.

ترجمہ: خیالِ باطل کی تردید (۱) قائل کا قول: فن کے مسائل کے پوشیدہ اور غامض ہونے کی وجہ سے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر اس شخص نے مسائل کے خفا اور غموض سے یہ مراد لی ہے کہ اس فن کی تدوین قطعاً ممکن نہیں تو مسائل کی پوشیدگی کا یہ مفاد نہیں ہے، کیسے (یہ مفاد ہوسکتا ہے؟) جبکہ علم التوحید والصفات کے مسائل مأخذ کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ گہرے ہیں، اور احاطہ کے اعتبار سے بعید تر ہیں، باوجود اس کے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہا اس کو آسان کر دیا۔ اسی طرح ہر فن سرسری نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بحث کرنا ناممکن ہے اور اس کا احاطہ کرنا محال ہے مگر جب اس کے اوزاروں کے ذریعہ اس کو سدھالیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی تمہیدی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں جماؤ حاصل ہوجاتا ہے اور اس کی بنیادوں کو قائم کرنا اور اس کی جزئیات ومتعلقات کی تفریع کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

اور اگر اس شخص کی مراد فی الجملہ (کسی درجہ میں) دشواری ہے تو یہ بات بجا ہے، مگر بعض علماء کی بعض پر برتری کام کے مشکل ہونے ہی سے ظاہر ہوتی ہے، اور مشقتوں اور خطروں پر سوار ہو کر ہی آرزؤں تک پہنچا جاسکتا ہے، اور عقل کو مشقت میں ڈال کر اور فہم کو گہرائی میں اتار کر ہی علوم وفنون کے کندھوں پر سواری کی جاسکتی ہے۔

لغات:

مُدرك (اسم ظرف) پانے کی جگہ یعنی مسائل کا مأخذ ادرك إدراكـاً: پانا، جاننا، پہنچنا...... تـراءى: دِکھنا، ظاہر ہونا، کہا جاتا ہے تَـراءَى لی أن الأمر كيتَ و كيتَ: میرے لئے یہ ظاہر ہوا کہ معاملہ ایسا ایسا ہے...... ارْتِيضَ (فعل ماضی مجہول) ارتاض المُهرُ: بچھڑے کا سدھ جانا...... أدوات جمع ہے أداة کی بمعنی آلہ، اوزار...... اسس البيت: بنیاد رکھنا ...... مبانی جمع ہے مَبنی کی بمعنی بنیاد...... ذوی جمع ہے ذواة کی جس کے معنی ہیں خربوزہ یا انگور وغیرہ کا چھلکا، یہاں مراد متعلقات شئ ہیں...... آمال جمع ہے أمل کی بمعنی آرزو...... مَشاق جمع ہے مَشقَّة کی، جس کے معنی ہیں دشواری، محنت ...... أهوال جمع ہے هَول کی بمعنی خوف...... اقتعد الدابّة: چوپایہ کو سواری بنانا...... الغارب: کندھا، ہر چیز کا اعلیٰ حصہ ......تجشم الأمر: مشقت جھیلنا...... أمعن النظر: معاملہ کی گہرائی تک پہنچنا۔

☆ ☆ ☆

دلیل نقلی کی پہلی تقریر کا جواب

اور معترض کی دلیل نقلی کی پہلی تقریر کا جواب یہ ہے کہ اگر معترض کی بات مان لی جائے تو تمام فنون اسلامیہ کی تدوین بدعت قرار پائے گی اور ہر علم شرعی کی تدوین خرق اجماع ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ تمام فنونِ دینیہ: علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ وغیرہ قرون مابعد میں مدون ہوئے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بدعت ہونے نہ ہونے کا مدار اس پر نہیں کہ وہ کام خیر القرون میں ہوا ہے یا نہیں؟ بلکہ اس کا مدار اس پر ہے کہ اس کی اصل خیر القرون میں موجود تھی یا نہیں؟ اگر اصل موجود تھی اور شاخیں بعد میں پھوٹیں اور برگ وبار لائیں تو وہ بدعت ہرگز نہیں، ہاں جس کام کی اس مبارک زمانہ میں اصل ہی موجود نہ ہو، اس کا سارا وجود ہی مابعد زمانہ میں ہوا ہو تو وہ بیشک بدعت ہے۔ حدیث متفق علیہ ہے کہ:

من أحدث في أمرنا هذا ماليس منه فهو رَدٌّ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کی جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے۔ (مشکوۃ ح ۱۴۰)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے جو چھٹی صدی کے مشہور مالکی فقیہ اور محدث ہیں اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی ایسی بات نکالنا جس کی کتاب وسنت سے سند نہ ہو، نہ واضح نہ خفی، نہ مصرح نہ مستنبط کردہ، وہ مردود ہے۔

قال القاضي: المعنى: من أحدث في الإسلام رأيا لم يكن له من الكتاب والسنة سند ظاهر أو خفي، ملفوظ أو مستنبط، فهو مردود عليه (مرقات ۱: ۲۱۵ طبع ملتان)

الغرض غیر دین کو دین میں داخل کرنا بدعت ہے، دین کے کسی امر کی تفصیل و تکمیل کرنا بدعت نہیں، مثلاً میلاد مروّجہ بدعت ہے، کیونکہ اس کا رواج پانچویں صدی میں ملک اربل کے زمانہ سے ہوا ہے، پانچ سو سال تک نہ کسی کا یوم پیدائش منایا جاتا تھا نہ یوم وفات، اسی طرح اب جو برتھ ڈے، برسی، اور عرس کا رواج چل پڑا ہے یہ بھی بدعات و رسوم ہیں۔

اور جس چیز کی اصل قرون ثلاثہ میں موجود ہو، اور اس کی تفصیلات بعد میں طے کی جائیں یا زمانہ کے تقاضے سے اس کی شکل بدل جائے تو وہ امور بدعت نہیں، مثلاً نزول قرآن کے زمانہ سے دین کی تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری ہے، خود رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں تعلیم قرآن داخل ہے، اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے تعلق سے فرمایا ہے وہ ''تفسیر'' ہے اسی طرح صحابۂ کرام نے بھی قرآن پاک کی بہت سی باتوں کی وضاحت کی ہے، وہ بھی ''تفسیر'' ہے۔ بعد میں ''علم تفسیر'' مدون ہوا، پس یہ بدعت اور خرق اجماع نہیں۔

اسی طرح آج کے رائج مدارس کی اصل اصحاب صفّہ کا مدرسہ ہے، گو اب اس کی شکل اور ہیئت بالکل بدل گئی ہے مگر چونکہ اس سلسلہ کی اصل ہے اس لئے مدارس اسلامیہ، ان کے نصاب اور نظام الاوقات وغیرہ کو بدعت کے زمرہ میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسی طرح علم اسرار الدین کا معاملہ ہے، چونکہ اس کی جڑ بنیاد قرون مشہود لہا بالخیر میں موجود تھی، اس لئے بارہویں صدی میں اس کی تدوین نہ بدعت ہے نہ خرق اجماع۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس فن کے اصولوں کی طرف اشارے فرمائے ہیں اور اس کی جزئیات کو صراحۃً بیان فرمایا ہے۔ آپؐ کے بعد فقہائے صحابہ جیسے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ، امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے نقش قدم پر چل کر شریعت کے حِکَم و اسرار سے بحث کی ہے اور اس کے متعدد پہلو ظاہر فرمائے ہیں۔ پھر مابعد زمانہ میں جب کسی حکم شرعی کی حکمت و مصلحت بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو علمائے دین اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس کی حکمت و مصلحت ظاہر فرماتے رہے۔ متکلمین کے ساتھ مختلف مباحثوں میں اس کی نوبت آتی رہتی تھی مگر یہ مواد منتشر تھا۔ اب اس کو کسی ایک کتاب میں مدون کر دینا بدعت نہیں، بلکہ بے حد مفید کام ہے۔

سوال: ٹھیک ہے، آج اس علم کی تدوین بدعت نہیں، مگر جب گیارہ سو سال تک اس فن کی ضرورت نہیں تھی تو اب بارہویں صدی میں اس کی تدوین کیوں ضروری ہوئی؟ اب تک جس طرح امت کی گاڑی بغیر اس فن کے چل رہی تھی آگے بھی چلتی رہے گی، اس فن کے بغیر گاڑی رکنے والی نہیں، پھر اس محنت کا کیا حاصل؟

جواب: ضرورت ایجاد کی ماں ہے، جب کسی چیز کی ضرورت پیش آتی ہے تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ ضرورت کیسے پوری کی جائے؟ اس وقت سمجھ دار لوگ مختلف راہیں نکالتے ہیں اور عام لوگ جو نفع صورت سامنے آتی ہے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ تمام ایجادات اور تمام علوم و فنون کا یہی حال ہے۔ علم اسرار الدین کی بھی

پہلے ضرورت نہیں تھی، اب ضرورت سامنے آئی ہے اس لئے اب اس کی تدوین ضروری ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ متقدمین کو درج ذیل وجوہ سے فن حکمت شرعیہ کی حاجت نہ تھی:

(۱) ان حضرات کے عقائد زمانۂ نبوت کے قرب کی وجہ سے اور صحبت نبوی کی برکت سے صاف ستھرے تھے۔

(۲) ان کے زمانہ تک امت میں اختلافات بھی کم رونما ہوئے تھے۔

(۳) ان کا مزاج منصوص باتوں میں خواہ مخواہ موشگافی کرنے کا نہیں تھا نہ وہ منقول کو معقول کے مطابق کرنے کے چکر میں پڑتے تھے، اس وجہ سے ان کے دلوں کو دولت اطمینان نصیب تھی۔

(۴) اس زمانہ میں قابل اعتماد علماء موجود تھے لوگ دقیق مسائل میں ان کی طرف رجوع کر لیتے تھے۔

مذکورہ بالا وجوہ سے اسلاف کرام کو علم اسرار الدین کی حاجت نہ تھی، جس طرح ان کو فنون حدیث کی حاجت نہ تھی یعنی فن غریب الحدیث، فن اسماء الرجال، مراتب عدالت رواۃ، فن مشکل الحدیث، اصول حدیث، فن مختلف الحدیث، فقہ الحدیث اور صحیح وضعیف اور موضوع وثابت میں امتیاز کرنے والے فن کی حاجت نہ تھی، کیونکہ ان کا زمانہ اگلے عربوں سے قریب تھا، اس وجہ سے ان کو زبان فہمی کی دشواری پیش نہیں آتی تھی، نیز ان کا زمانہ رُواتِ حدیث کے زمانہ سے متصل تھا، وہ راویوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کی باتیں اپنے کانوں سے سنتے تھے اس وجہ سے ان کے احوال سے وہ واقف تھے، نیز وہ ثقہ راویوں سے حدیث لینے پر قادر تھے، ضعفاء سے حدیثیں لینے کی ان کو ضرورت نہ تھی، اور احادیث میں اختلافات بھی رونما نہیں ہوئے تھے اور احادیث گھڑنے کا کاروبار بھی زور وشور سے شروع نہیں ہوا تھا اس لئے تمام فنون حدیث کی ان کو مطلق حاجت نہ تھی۔ مگر بعد میں جب ضرورت کھڑی ہوئی اور دین کی اور مسلمانوں کی خیر خواہی مذکورہ فنون حدیث پر موقوف ہوگئی تو محدثین کرام نے یہ سب فنون مدون کئے، اسی طرح علم اسرار الدین کی بھی پہلے حاجت نہ تھی، مگر اب اس کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اب اس کی تدوین وقت کا اہم تقاضا ہے۔

سوال: فن حکمت شرعیہ کی تدوین اب کیوں ضروری ہے؟

جواب: سلف کا دور گذرنے کے بعد تین نئی باتیں پیدا ہوئیں، جس کی وجہ سے اس فن کی تدوین ضروری ہوئی، وہ تین باتیں یہ ہیں:

ا- فقہاء میں اختلاف کی کثرت ہوئی، اور یہ اختلاف احکام کی علتوں میں اختلاف پر مبنی تھا، مثلاً اشیائے ستہ میں ربوا کی علت احناف کے نزدیک قدر یعنی مکیلی یا موزونی ہونا، اور اس کے ساتھ ہم جنس ہونا شرط ہے اور شوافع کے نزدیک طُعم (کھانے کی چیز ہونا) اور ثمنیت (کرنسی ہونا) ہے اور ہم جنس ہونا شرط ہے اور مالکیہ کے نزدیک اقتیات (کھانے کی چیز ہونا) اور ادخار (قابل ذخیرہ ہونا) ہے اور حنابلہ کے نزدیک قدر یعنی مکیلی یا موزونی ہونا، طعم (کھانے کی چیز ہونے) کے ساتھ علت ہے —— اسی طرح حق شفعہ کی علت احناف کے نزدیک ضرر جوار (پڑوس کی اذیت)

سے بچنا ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ضرر قسمت (بٹوارے کے مصارف) سے بچنا ہے ــــ اور جب علتوں میں اختلاف ہوا تو فروعات میں اختلاف ناگزیر ہے۔ جو بھی شخص فقہائے اربعہ کی فقہی کتابوں میں باب الربوا کا مطالعہ کرے گا اس کے سامنے کثرت اختلاف کی حقیقت واشگاف ہوجائے گی۔

پھر علتوں میں اختلاف کے بعد یہ بحث چل پڑی کہ کس کی سمجھی ہوئی علت ان حکمتوں اور مصلحتوں کے مطابق ہے جن کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے؟ ہر جماعت اپنی بات کو موجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس لئے ضروری ہوگیا کہ حکمتوں اور علتوں پر مستقل کلام کیا جائے۔

۲- بہت سے دینی مسائل میں عقلی دلائل سے استدلال شروع ہوگیا، مثلاً صاحب ہدایہ علی بن ابی بکر مرغینانی رحمہ اللہ (۵۳۰-۵۹۳ھ) جو چھٹی صدی کے مایۂ ناز فقیہ ہیں، معاملات کے بیشتر مسائل میں نقلی دلائل کے ساتھ عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہوگیا کہ نصوص پر دلائل عقلیہ قائم کئے جائیں، اور منقول کی معقول کے ساتھ تطبیق دکھائی جائے، نیز اسلاف سے مروی باتوں کو عقلی باتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔

۳- اصول اعتقادیہ اور عملیہ میں شکوک وشبہات کا سلسلہ چل پڑا تو ضروری ہوا کہ تمام اصول کو موجّہ کردیا جائے اور ان کی مضبوط بنیادوں کو نکھار دیا جائے۔

غرض مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ضروری ہوا کہ فن حکمت شرعیہ مدون کرلیا جائے، اس سے دین کو بڑی مدد ملے گی اور یہ فن مسلمانوں کے انتشار کو ختم کرنے میں بڑا ممد ومعاون ثابت ہوگا۔ اب یہ فن اہم عبادت اور اعلی درجہ کی طاعت ہے۔

[۲]قوله: لأن السلف لم يدونوه.

قلنا: لايَضُرُّ عدمُ تدوينِ السَّلفِ إياه، بعدما مَهَّدَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم أصولَه، وفَرَّعَ فروعَه، واقتفىٰ أَثرَه فقهاءُ الصحابةِ، كأميرَيِ المؤمنين: عمرَ وعليٍ، وكزيدٍ، وابن عباس، وعائشةَ، وغيرهم،رضي الله عنهم: بَحَثُوْا عنه، وأَبْرَزُوْا وجوهًا منه؛

ثم لم يزل علماءُ الدين، وسُلَّاكُ سبيلِ اليقين،يُظْهِرون مايَحْتاجون إليه، مما جمع الله في صدورهم؛ كان الرجلُ منهم اذا ابتُلي بمناظرةِ من يُثِيرُ فتنةَ التشكيك، يُجَرِّدُ سيفَ البحث ويَنْهَضُ، ويُصَمِّمُ العزمَ ويَمْحَضُ، وَيُشَمِّرُ عن ساق الجِدِّ وَيَحْسِرُ، وَيَهْزِمُ جيوشَ المبتدعين ويَكْسِرُ.

ثم رأينا بعدُ: أن تدوينَ كتابٍ، يحتوي على جُمَلٍ صالحةٍ من أصولِ هذا الفن أَجْدىٰ من تفاريقِ العصا،وكلُّ الصيد في جوف الفرَا.

وكان الأوائلُ لصفاء عقائدهم، ببركةِ صحبةِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، وقُرب عهده، وقِلَّةِ وقوع الاختلاف فيهم، واطْمِئْنان قلوبهم، بترك التفتيشِ عما ثبت عنه صلى الله عليه

وسلم،وعدَم التفاتهم إلى تطبيق المنقول بالمعقول، وتَمَكُّنِهِم من مراجعةِ الثقاتِ في كثير من العلوم الغامضةِ، مُستغنين عن تدوين هذا الفن؛

كما أنهم كانوا بسبب قُرب عهدهم من العرب الأُوَل، واتّصالِ زمانِهم برجال الحديث، وكونِهم منهم بمَرْأى ومَسْمَع، وتمكّنِهم من مراجعة الثقات، وقلّةِ وقوعِ الاختلاف والوضع، مُستغنين عن تدوين سائر الفنون الحديثيّة، كشرح غريب الحديث،وأسماء الرجال، ومراتب عدالتهم، ومشكل الحديث، وأصولِ الحديث، ومختلفِ الحديث، وفقه الحديث، وتمييز الضعيف من الصحيح، والموضوع من الثابت.

وكلُّ فنٍّ من هذه لم يُفرَدْ بالتدوين، ولم تُرَتَّبْ اصولُه وفروعُه، إلابعدَ قرونٍ كثيرةٍ، ومُددٍ مُتطاوِلَةٍ، لَمَّا عَنَّتِ الحاجةُ إليه، وتوقَّفَ نُضجُ المسلمين عليه.

ثم إنه كثُر اختلافُ الفقهاء، بناءً على اختلافهم في عِلَلِ الأحكام، وأفضىٰ ذلك إلى أن يَتَباحثُوا عن تلك العللِ من جهة إفضائها إلى المصالح المعتبرة في الشرع، ونشأ التمسكُ بالمعقول في كثير من المباحث الدينيّة،وظهرت تشكيكات في الأصول الاعتقادية والعملية، فآل الأمرُ إلى أن صار الإنتهاضُ لإقامةِ الدلائل العقلية، حسب النصوص النقلية، وتطبيق المنقول بالمعقول، والمسموع بالمفهوم، نصرًا مُؤَزَّرًا للدِّينِ، وسَعْيًا جميلا في جمعِ شمْلِ المسلمين، ومعدودًا من أعظمِ القُرُبَاتِ،ورأسًا لرؤس الطاعات.

ترجمہ:(۲)قائل کا قول:اس لئے کہ سلف نے اس کو مدون نہیں کیا۔

ہم کہتے ہیں:سلف کا اس فن کو مدون نہ کرنا کچھ مضر نہیں،جبکہ آنحضور ﷺ نے اس فن کے اصولوں کی راہ ہموار کردی ہے اور اس کی جزئیات کو مستنبط فرمایا ہے۔اور فقہائے صحابہ نے،جیسے امیر المؤمنین حضرت عمر، امیر المؤمنین حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ وغیرہم رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کی ہے۔ان سب حضرات نے اس علم کے بارے میں کھود کرید کی ہے اور اس کے متعدد پہلو ظاہر کئے ہیں۔

پھر علمائے دین اور سالکین راہ یقین ہر زمانہ میں لوگوں کو جن باتوں کی ضرورت پیش آتی تھی ان کو ظاہر کرتے تھے، ان علوم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سینوں میں جمع کئے تھے،جب ان میں سے کوئی شخص کسی ایسے شخص کے ساتھ مناظرہ میں پھنس جاتا،جو تشکیک کے فتنہ کو ہوا دے رہا ہوتا تھا،تو وہ بحث کی تلوار تان لیتا،اور اٹھ کھڑا ہوتا،اور(مقابلہ کا)عزم صمیم کرلیتا،اور خالص خیر خواہی کرتا،اور کوشش کی پنڈلی سے پائینچا چڑھالیتا اور اس کو کھول لیتا(یعنی محنت تیز کرلیتا)اور گمراہوں کے لشکر کو شکست دیتا،اور ان کو توڑ کر رکھ دیتا۔

پھر بعد ازیں ہماری سمجھ میں آیا، کہ ایک ایسی کتاب کو مدون کرنا جو اس فن کے اصول کی اچھی خاصی مقدار پر مشتمل ہو، لاٹھی کے ٹکڑوں سے بھی زیادہ مفید ہے، اور سارے شکار جنگلی گدھے کے پیٹ میں ہیں۔

اور اگلے لوگ اس فن کی تدوین سے مستغنی تھے، کیونکہ آنحضور ﷺ کی صحبت کی برکت سے ان کے عقائد صاف ستھرے تھے اور وہ عہد رسالت سے قریب تھے، اور ان میں اختلاف بھی بہت کم واقع ہوئے تھے، اور ان کے دل مطمئن تھے، کیونکہ وہ آنحضور ﷺ سے ثابت چیزوں کے بارے میں تفتیش نہیں کرتے تھے اور وہ منقول کو معقول کے ساتھ منطبق کرنے کے چکر میں بھی نہیں پڑتے تھے، اور وہ بہت سے دقیق مسائل میں قابل اعتماد علماء کی طرف رجوع کرنے پر قادر تھے۔

جس طرح وہ اگلے عربوں کے زمانہ سے قریب ہونے کی وجہ سے، اور رواتِ حدیث کے زمانہ کے ساتھ ان کے زمانہ کے متصل ہونے کی وجہ سے، اور اُن رُوات کے اُن کی آنکھوں اور کانوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے، اور قابل اعتماد رُوات حدیث کی طرف مراجعت پر قدرت ہونے کی وجہ سے، اور حدیثوں میں اختلاف اور وضع کا سلسلہ کم واقع ہونے کی وجہ سے، تمام علوم حدیث کی تدوین سے بے نیاز تھے، مثلاً فن غریب الحدیث، فن اسماء الرجال، رُوات کی عدالت کے مراتب کی تعیین کا فن، فن مشکل الحدیث، اصول الحدیث، فن مختلف الحدیث، فقہ الحدیث اور ضعیف حدیثوں کو صحیح حدیثوں سے، اور موضوع روایات کو ثابت روایات سے جدا کرنے کا فن۔ اور ان فنون میں سے ہر فن صدیوں کے بعد اور مدتہائے مدید گذر جانے کے بعد علیحدہ مرتب کیا گیا ہے اور اس کے اصول وفروع تجویز کیے گئے ہیں جب اس کی ضرورت پیش آئی اور مسلمانوں کی خیر خواہی اس پر موقوف ہوگئی۔

پھر فقہاء میں اختلاف کی کثرت ہوئی، اور یہ اختلاف احکام کی علتوں میں اختلاف پر مبنی تھا، اور یہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ حضرات ان علتوں کے بارے میں اس حیثیت سے بحث کرنے لگے کہ کیا وہ اُن مصالح تک پہنچاتی ہیں جن کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے؟ اور بہت سے دینی مسائل میں دلائل عقلیہ سے استدلال شروع ہوگیا، اور اصول اعتقادیہ اور عملیہ میں شکوک وشبہات کا سلسلہ چل پڑا، تو نصوص پر دلائل عقلیہ قائم کرنے کے لئے، اور منقولات کو معقولات کے ساتھ تطبیق دینے کے لئے، اور اسلاف سے مروی باتوں کو عقلی باتوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے، اٹھ کھڑا ہونا، دین کی بڑی مدد اور مسلمانوں کے انتشار کو ختم کرنے کی زبردست محنت، اور بڑی عبادتوں میں سے ایک عبادت اور اہم طاعات میں سے اعلی درجہ کی طاعت شمار ہونے لگا۔

لغات:

سُلّاك جمع ہے سالك کی: راہ رَو ...... مَحَضَ (ف) الوُدَّ أو النُصح: دوستی یا خیر خواہی خالص کرنا ...... أجدی (اسم تفضیل) زیادہ مفید أجدی إجداءً الأمرُ: نفع دینا، کہا جاتا ہے ما يُجدِي عنك هذا: یہ چیز تم کو فائدہ نہیں دے گی

......التفاریق: ٹکڑے، تھوڑا، کہا جاتا ہے: ضَمَّ تفاریق متاعه: اس نے متفرق سامان کو اکٹھا کیا أخذ حقَّه بالتفاریق: اس نے اپنا حق تھوڑا تھوڑا کر کے لیا تفاریق العصا: لاٹھی کے ٹکڑے...... الفرَا: جنگلی گدھا، گورخر، جمع أفراء، اور کہاوت کل الصید الخ بغیر ہمزہ کے ہے یہ کہاوت وہ شخص بولتا ہے جس کی بہت سی حاجتیں ہوں اور ان میں سے بڑی حاجت پوری ہو جائے تو وہ شخص یہ کہاوت بولتا ہے یعنی باقی حاجتوں کے فوت ہونے کی پرواہ نہیں (تاج العروس ۱:۹۶) ......مستغنین خبر ہے کان الأوائل کی......عَنَّ (ن،ض) عنًّا له الشیئُ: سامنے ظاہر ہونا، پیش آنا......أَزَر فلانًا: قوی کرنا...... الشَّمْل: امر مجتمع اور امر متفرق (ضد) کہا جاتا ہے جمع اللّٰه شَمْلَهُمْ: اللہ ان کے متفرق امور کو جمع کر دے فَرَّقَ اللّٰه شَمْلَهُمْ: اللہ ان کے اجتماع کو توڑ دے۔

تشریح:

۱- أجدی من تفاریق العصا (لاٹھی کے ٹکڑوں سے بھی زیادہ کارآمد) ایک کہاوت ہے، کسی چیز کا بے حد نافع ہونا ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ عرب کی ایک دیہاتن غنیّہ نے سب سے پہلے اپنے بیٹے کے حق میں یہ جملہ استعمال کیا تھا، اس کا لڑکا بدخلق، لوگوں کے ساتھ بدمعاملہ، کمزور بدن اور باریک ہڈیوں کا ڈھانچا تھا، قبیلہ کے ایک جوان نے اس پر حملہ کیا اور اس کی ناک کاٹ دی، اس کی ماں نے ناک کی دیت وصول کی جس سے اس کی غریبی دور ہوگئی، پھر کسی اور جوان نے اس پر حملہ کیا اور کان کاٹ دیا، پھر تیسرے نے حملہ کیا اور اس کا ہونٹ کاٹ دیا، ماں ہر جنایت کی دیت لیتی رہی اور خوب ٹھاٹھ کرتی رہی، اس نے بیٹے کے حق میں چند اشعار کہے ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے

أحلِفُ بالمروة حقًّا والصفا إنك خیر من تفاریق العصا

ترجمہ: میں صفا و مروہ کی قسم کھاتی ہوں کہ تو لاٹھی کے ٹکڑوں سے بھی زیادہ نفع بخش ہے۔

لاٹھی کے کیا کیا ٹکڑے ہو سکتے ہیں اور وہ کیا کیا کام آسکتے ہیں، اس کی وضاحت ایک عرب دیہاتی نے کی ہے، قاموس میں اس کا قول نقل کیا گیا ہے، خواہش مند حضرات مراجعت کریں (تاج العروس ۷:۴۴ مادہ ف رق)

۲- کل الصید فی جوف الفرا (تمام شکار گورخر کے پیٹ میں ہیں) یہ بھی ایک کہاوت ہے اس کی صورت یوں سمجھنی چاہئے کہ دو شکاری شکار کے لئے نکلے، ایک نے دن بھر میں پانچ کبوتر، دس گوریا، دس فاختہ، دو خرگوش شکار کئے اور دوسرے نے صرف ایک گورخر مارا، جب دونوں شکاری ملے تو پہلے نے کہا کہ میں نے دن بھر میں ستائیس شکار کئے: تو نے ایک ہی کیا؟! دوسرے نے جواب دیا کہ تیرے سارے شکار میرے گورخر کے پیٹ میں سما جائیں گے، میں نے اتنا بڑا شکار کیا ہے، اس لئے میرے لئے شرم کی کوئی بات نہیں۔

۳- فن حدیث کی اسّی (۸۰) سے زائد انواع کی گئی ہیں، اور ہر نوع میں مصنفین نے تصنیفات کی ہیں مگر بعد میں

بعض کو بعض میں ضم کردیا گیا مثلاً فقہ الحدیث، مشکل الحدیث اور مختلف الحدیث کو شروح حدیث میں لے لیا گیا اور رواۃ کی عدالت کے مراتب کی تعیین کا بیان اسی طرح جرح کے مراتب کی تعیین کا بیان اسمائے رجال میں شامل کرلیا گیا اور صحیح وضعیف اور موضوع وثابت روایات میں امتیاز کرنے کا فن روایتِ حدیث کی کتابوں میں سے لے لیا گیا اور غریب الحدیث اور اصول الحدیث مستقل فن ہیں۔

☆ ☆ ☆



دلیل نقلی کی دوسری تقریر کا جواب اور فن حکمتِ شرعیہ کا پہلا فائدہ

معترض نے دلیل نقلی کی دوسری تقریر یہ کی تھی کہ چونکہ احکام شرعیہ پر عمل کرنا مصالح وحکم کے جاننے پر موقوف نہیں، اس لئے فن حکمت شرعیہ کی تدوین بے فائدہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال بھی واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ اس فن میں بڑے بڑے فائدے ہیں، مثال کے طور پر چند فوائد ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

پہلا فائدہ: فن حکمت شرعیہ کی مدد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک اہم معجزہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور وہ معجزہ آپ کی لائی ہوئی شریعت مطہرہ ہے، اگر آپ کی لائی ہوئی شریعت (مجموعہ قوانین) میں غور کیا جائے تو آپ کا نبیٔ برحق ہونا سمجھ میں آجائے گا کیونکہ کوئی بھی انسان قوانین کا کوئی ایسا مجموعہ پیش نہیں کرسکتا جس میں اس درجہ حکمتوں اور مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہو، جتنی شریعت اسلامیہ میں ملحوظ رکھی گئی ہے، یہ بات انسانوں کی مقدرت سے باہر ہے، یہ خالق کائنات کا کام ہے پس اللہ ہی کی طرف سے یہ مجموعہ قوانین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے جس کو آپؐ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے مگر اس کے ادراک کے لئے فن حکمت شرعیہ سے واقفیت ضروری ہے، اس فن کے بغیر ان حکم ومصالح کو نہیں سمجھا جاسکتا جن پر شریعت مشتمل ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ **مُعْجِزَۃ** صفت ہے آیۃ کی، پھر صفت کو موصوف کے قائم مقام رکھا گیا ہے یعنی موصوف کے معنی بھی صفت میں لے لئے گئے ہیں نیز لفظ مُعجِزَۃ (جیم کے زیر کے ساتھ) اسم فاعل واحد مؤنث ہے اَعْجَزَہ سے جس کے معنی ہیں عاجز کرنا، روک دینا پس معجزہ کے معنی ہیں ''عاجز کرنے والی نشانی'' یعنی وہ نشانی جس کے مانند کو پیش کرنے سے لوگ عاجز ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو سند نبوت کے طور پر بے شمار نشانیاں عطا فرمائی ہیں، ان میں سب سے بڑی نشانی قرآن عظیم ہے قرآن میں لوگوں کو بار بار چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر کسی کو قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہو تو وہ اپنے حمایتیوں کو ساتھ لے کر قرآن جیسی ایک سورت بنا کر دکھادے اور اگر وہ ایسا نہ کرسکے اور ہرگز نہیں کرسکے گا تو اس کو

سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن واقعی کسی انسان کی کاوش نہیں، بلکہ کلام الٰہی ہے، پس اس کو انکار کر کے جہنم کا ایندھن نہیں بننا چاہئے۔سورۃ البقرہ آیات ۲۳و۲۴ میں یہ مضمون آیا ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن معجزہ (عاجز کرنے والا) کیوں ہے؟اس میں وہ کیا سُرخاب کا پر لگ رہا ہے کہ تمام فصحا مل کر بھی ایسا کلام نہیں بنا سکتے؟اس کا جواب یہ ہے کہ اگلے عرب یعنی نزول قرآن کے وقت جو لوگ موجود تھے وہ تو اپنی فطرت اور زبان کی مہارت کی وجہ سے جانتے تھے کہ قرآن میں وہ کیا خوبیاں ہیں مگر بعد میں جب عربی کی استعداد کمزور پڑی نیز اسلام عربوں سے بڑھ کر عجمیوں میں پہنچا تو ضروری ہوا کہ وجوہ اعجاز کی وضاحت کی جائے چنانچہ سب سے پہلے تیسری صدی میں ابوعبداللہ محمد بن زید واسطی (متوفی ۳۰۷ھ) نے اعجاز القرآن نامی کتاب لکھی جس کی شیخ عبدالقاہر جرجانی (متوفی ۴۷۴ھ) نے شرح لکھی، پھر چوتھی صدی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔علامہ حَمد بن محمد خطّابی رحمہ اللہ (۳۱۹-۳۸۸ھ) نے بیان إعجاز القرآن لکھی جو چھپ گئی ہے۔علی بن عیسی ابوالحسن رُمّانی (۲۹۶-۳۸۴ھ) نے النُّکت في إعجاز القرآن لکھی ہے یہ بھی مطبوعہ ہے قاضی ابوبکر محمد بن طیب باقلانی رحمہ اللہ (۳۳۸-۴۰۳ھ) نے إعجاز القرآن لکھی، یہ بھی طبع ہو چکی ہے پھر چھٹی صدی میں امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (۵۴۴-۶۰۶ھ) نے نهاية الإيجاز في دراية الإعجاز لکھی، یہ بھی مطبوعہ ہے۔اور بھی متعدد حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

ان سب حضرات نے وجوہ اعجاز بیان کئے ہیں اور لوگوں کو سمجھایا ہے کہ قرآن کے مثل انسان کیوں نہیں لاسکتا؟اسی طرح آنحضور ﷺ نے جو شریعت لوگوں کے سامنے پیش کی ہے وہ سابقہ تمام شرائع سے کامل تر ہے اور آپ کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے، کیونکہ اس میں ایسی باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مجموعی طور پر ان سب باتوں کا لحاظ وضعی قوانین میں رکھا ہی نہیں جاسکتا۔اور یہ بات دور اول کے لوگ اپنی فطرت سلیمہ، صحبت نبوی کی برکت، استعداد کی پختگی اور علم کی فراوانی سے، خود بخود سمجھتے تھے، اس کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ان کی تقریروں میں اور باہمی گفتگوؤں میں اس کی صاف جھلک ملتی ہے مگر بعد میں یہ صورت حال باقی نہیں رہی اس لئے ضروری ہوا کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت میں جو وجوہ اعجاز ہیں اس کی وضاحت کی جائے۔اسی مقصد کے لئے فن حکمت شرعیہ کی تدوین ضروری ہوئی۔

رہی یہ بات کہ ’’شریعتِ محمدیہ تمام شرائع سابقہ سے کامل تر ہے‘‘: یہ مضمون بہت سی روایات سے ثابت ہے مثلاً امام بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل النبوہ میں حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جو طویل خطاب فرمایا تھا اس میں یہ جملہ معروف ہے کہ خَيْرُ الْمِلَلِ مِلَّةُ إبراهيم تمام شرائع میں بہترین ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہے اور سورۃ النحل آیت ۱۲۳ میں ہے کہ

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا	پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیمؑ کے طریقہ پر چلئے، جو کہ بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے

غرض آپ کی ملت، ملت ابراہیمی کا کامل ومکمل ایڈیشن ہے۔ اور ملت ابراہیمی تمام ملتوں میں بہترین ہے پس ثابت ہوا کہ آپ کی شریعت تمام شرائع سے کامل تر ہے۔

اور آپ ﷺ جیسے امی یعنی لوگوں سے نہ پڑھے ہوئے شخص کا ایسی کامل ومکمل شریعت پیش کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ شریعت آپ کی کاوش کا نتیجہ ہرگز نہیں۔ جب دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسان مل کر بھی ایسا مجموعہ قوانین تیار نہیں کر سکتے، تو ایک امی سے یہ بات کیوں کر متصور ہے؟ یقیناً یہ رب العالمین کا نازل کردہ قانون ہے۔

غرض آپ کی شریعت آپ کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے، مگر اس کا دلیل ہونا اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب آدمی یہ جانے کہ اس شریعت میں کن کن مصلحتوں کی رعایت کی گئی ہے؟ اور یہ بات فن حکمت شرعیہ کے ذریعہ ہی جانی جاسکتی ہے، اس لئے اس فن کی تدوین بے فائدہ نہیں، بلکہ اس میں یہ ایک عظیم فائدہ ہے۔

[۳] قوله: ليس في تدوينه فائدة.

قلنا: ليس الأمرُ كما زعم، بل في ذلك فوائدُ جَلِيْلة:

منها: إيضاحُ معجزةٍ من معجزات نبينا صلى الله عليه وسلم؛ فإنه صلى الله عليه وسلم كما أتى بالقرآن العظيم، فأعجز بُلَغَاءَ زَمَانِه، ولم يستطع أحدٌ منهم أن يأتي بسورة من مِثْله؛ ثم لَمَّا انْقَرَضَ زَمَانُ العرب الأُوَلِ، وخَفِيَ على الناس وجوهُ الإعجاز، قام علماء الأمة، فأوضحوها، لِيُدْرِكَه من لم يبلُغ مبلَغَهم؛ فكذلك أتى من الله تعالى بشريعةٍ هي أكملُ الشرائع، مُتَضَمِّنَةٌ لمصالحَ يَعْجِزُ عن مراعاةِ مِثْلِها البشرُ، وعَرَفَ أهلُ زمانه شرفَ ماجاء به، بِنَحْوٍ من أنحاءِ المعرفةِ، حتى نطقت به ألسنتُهم؛ وتبيَّنَ في خُطَبِهم ومُحاوراتهم؛ فلما انقضى عصرهم، وجب أن يكون في الأمة من يُوْضِحُ وجوهَ هذا النوع من الإعجاز.

والآثارُ الدالةُ على أن شريعته صلى الله عليه وسلم أكملُ الشرائع، وأن إتيانَ مِثْلِه بمثلها معجِزةٌ عظيمةٌ، كثيرةٌ مشهورةٌ لاحاجةَ إلى ذكرها.

ترجمہ: قائل کا قول: اس فن کی تدوین میں کوئی فائدہ نہیں۔

ہم کہتے ہیں: واقعہ ایسا نہیں ہے جیسا قائل نے خیال کیا ہے بلکہ اس فن کی تدوین میں بہت سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔

ان میں سے ایک فائدہ آنحضور ﷺ کے معجزات میں سے ایک بڑے معجزہ کی وضاحت کرنا ہے، کیونکہ آنحضور ﷺ جس طرح قرآن عظیم لائے، اور اس نے آپ کے زمانے کے ارباب بلاغت کو عاجز کر دیا، اور ان میں سے کسی

میں ہمت نہ ہوئی کہ قرآن جیسی کوئی سورت بنالائے۔ پھر جب اگلے عربوں کا زمانہ بیت گیا اور لوگوں پر اعجاز کی وجوہ مخفی ہوگئیں تو علمائے امت اٹھے، اور انھوں نے وجوہ اعجاز کی وضاحت کی، تاکہ وہ لوگ بھی جو اگلے عربوں جیسی استعداد کے مالک نہیں ہیں، قرآن کے اعجاز کو سمجھ سکیں۔ اسی طرح آنحضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شریعت (مجموعہ قوانین) لائے ہیں، جو تمام شریعتوں میں کامل تر ہے، جو ایسی مصلحتوں پر مشتمل ہے کہ اس جیسی حکمتوں کی رعایت کرنے سے انسان قاصر ہیں، اور آپؐ کے زمانہ کے لوگ آپ کی لائی ہوئی شریعت کی برتری کو سمجھتے تھے، سمجھنے کی مختلف صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ، چنانچہ ان کی زبانوں سے وہ حکمتیں ظاہر ہوئی ہیں، اور ان کی تقریروں اور باہمی گفتگوؤں میں وہ واضح ہوئی ہیں۔ پھر جب ان کا زمانہ گذر گیا تو ضروری ہوا کہ امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اعجاز کی اس خاص قسم کی وضاحت کریں۔

اور وہ روایات جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپؐ کی شریعت تمام شریعتوں سے کامل تر ہے اور یہ بات کہ آپؐ جیسے (امی شخص) کا اس جیسی (کامل ترین) شریعت کو پیش کرنا ایک بہت بڑا معجزہ ہے، ایسی روایات بہت ہیں اور مشہور ہیں، ان کو ذکر کرنے کی حاجت نہیں۔

لغات:

أُوَلُ جمع أُولیٰ، مؤنث أَوَّل، العرب بتاویل قبیلہ مؤنث اور معنیً جمع ہے اس لئے صفت أُوَلُ لائی گئی ہے... حَاوَرَ مُحَاوَرَةً وَحِوَارًا: گفتگو کرنا، جواب دینا...... کثیرۃ خبر ہے الآثار مبتدا کی۔

تشریح:

معرفت یعنی بات سمجھنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً پڑھنے کے ذریعہ، مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعہ، صحبت کے ذریعہ، تجربہ کے ذریعہ وغیرہ، دور اول کے حضرات شریعت میں ملحوظ حکمتوں اور مصلحتوں کو خوب سمجھتے تھے اس بات کا اندازہ ہمیں ان کی تقریروں اور باہمی گفتگوؤں سے ہوتا ہے، رہی یہ بات کہ انہوں نے یہ باتیں کیسے سمجھیں تو یہ بات ہم نہیں بتا سکتے۔ بس اتنا ہم جانتے ہیں کہ وہ حضرات یہ باتیں سمجھے ہوئے تھے۔

نوٹ: جليلة مطبوعہ نسخہ میں جَلِيَّة ہے، جس کے معنی ہیں: واضح، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

فنِ حکمت شرعیہ کا دوسرا فائدہ

ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ آنحضور ﷺ جو دین وشریعت لائے ہیں وہ سچا دین اور سچی شریعت ہے، اگر اس

ایمان کے ساتھ مؤمن شریعت کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی جان لے تو اس کو مزید اطمینان قلبی حاصل ہوگا، اور یہ طمانینت شرعاً مطلوب ہے۔ اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں یہ درخواست کی تھی کہ ان کو احیائے موتی کا مشاہدہ کرایا جائے، دریافت کیا گیا کہ: ''کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں؟'' آپ نے جواب دیا: ''کیوں نہیں؟! مگر میں آنکھوں سے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ مزید اطمینان قلبی حاصل ہو'' چنانچہ اللہ پاک نے ان کو احیائے موتی کا مشاہدہ کرایا۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۶۰ میں اس کی تفصیل ہے۔ اسی طرح شریعت کی حقانیت پر یقین کے ساتھ اگر احکام شرعیہ کے رموز واسرار بھی جان لئے جائیں تو اس سے مزید اطمینان قلبی حاصل ہوگا اور یہ اس فن کا نہایت اہم فائدہ ہے۔

اور اسرار ورموز جاننے سے ایمان میں اضافہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح مسئلہ کے ثبوت کے لئے ایک دلیل کافی ہوتی ہے لیکن اگر کسی مسئلہ میں دلائل کا انبار لگ جائے اور مختلف راہوں سے مسئلہ کا علم حاصل ہوجائے تو شرح صدر ہوتا ہے اور دل کا اضطراب دور ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر حکم شرعی کی حکمت، اور اس کا دنیوی یا اخروی فائدہ معلوم ہوجائے تو یہ بات مزید طمانینت کا باعث ہوتی ہے۔

ومنها: أنه يحصُل به الإطمئنانُ الزائدُ على الإيمان، كما قال إبراهيمُ الخليلُ عليه الصلوٰة والسلامُ: ﴿بَلٰى، وَلٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِى﴾ وذلك: أن تظاهُرَ الدلائلِ، وكثرةَ طُرُقِ العلم، يُثْلِجَانِ الصدرَ، ويُزيلانِ اضْطرابَ القلب.

ترجمہ: اور ان (فائدوں) میں سے ایک یہ ہے کہ اس علم کی بدولت ایمان سے زائد اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ: ''کیوں نہیں، مگر اس لئے درخواست کرتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہوجائے'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ (کسی مسئلہ پر) دلائل کا تو بہ توجمع ہونا، اور علم کی راہوں کا زیادہ ہونا سینہ کو ٹھنڈا کرتا ہے اور دل کی بے چینی کو دور کرتا ہے۔

لغت: أَثْلَجَتْ نفسى به: مطمئن ہونا، خوش ہونا۔

فن حکمت شرعیہ کا تیسرا فائدہ

سالک یعنی درجۂ احسان کا طالب نوافل عبادات میں محنت کر کے مطلوب تک پہنچتا ہے، اگر وہ عبادات کے اسرار و رموز جان کر محنت کرے اور عبادتوں کی روح اور ان کے انوار کی نگاہ داشت کرے مثلاً سالک جواذکار کرتا ہے ان کی

خاصیات بھی جان لے اور پوری توجہ سے ذکر کرے اور اس کی خاصیت کی تحصیل کی کوشش کرے تو تھوڑی عبادت بھی بہت زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی اور وہ اندھادھند سفر جاری رکھنے سے محفوظ رہے گا۔ اسی وجہ سے امام غزالی رحمہ اللہ نے سلوک کی کتابوں میں عبادتوں کے اسرار ورموز بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

ومنها: أن طالب الإحسان إذا اجتهد في الطاعات، وهو يعرف وجهَ مشروعيتها، ويُقَيِّدُ نفسَه بالمحافظةِ على أرواحِها وأنوارها، نَفَعَهُ قليلُها، وكان أبعدَ من أن يَخْبِطَ خَبْطَ عشواء؛ ولهذا المعنى: اعتنَى الإمامُ الغزالي في كتب السلوك بتعريف أسرار العبادات.

ترجمہ: اور ان (فائدوں) میں سے ایک یہ ہے کہ احسان (تصوف) کا طالب جب عبادتوں میں محنت کرتا ہے درانحالیکہ وہ ان کی مشروعیت کی وجہ جانتا ہے اور اپنے آپ کو پابند بناتا ہے عبادتوں کی ارواح اور ان کے انوار کی نگاہ داشت کا، تو تھوڑا عمل بھی اس کو نفع پہنچاتا ہے اور وہ رتوندی اونٹنی کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بالکل بچ جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے امام غزالی رحمہ اللہ نے تصوف کی کتابوں میں عبادتوں کے رموز بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

فائدہ: (۱) إحسان باب افعال کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں نکو کردن (عمدہ بنانا) اور ہر چیز کو عمدہ کرنا لازم ہے مسلم شریف میں حدیث ہے:

إن اللّٰه تبارك وتعالى كتب الإحسان على كل شيئ، فإذا قتلتم فأحسنوا القِتْلة، وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح، ولْيُحِدَّ أحدُكم شَفْرَته، ولْيُرِحْ ذبيحَتَه (مشکوۃ حدیث نمبر ۴۰۷۳)

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں عمدہ کرنے کو لازم کیا ہے، لہٰذا جب تم (دشمن کو جہاد میں) قتل کرو تو اچھے انداز پر قتل کرو (یعنی مُثلہ نہ کرو) اور جب تم جانور ذبح کرو تو عمدہ طریقہ پر ذبح کرو، اور (اس کی صورت یہ ہے کہ) تم اپنی چھری خوب تیز کر لو اور ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

اور جب ہر چیز میں احسان (نکو کردن) فرض ہے تو عبادات جو کہ اہم امور میں سے ہیں ان میں تو احسان بدرجۂ اولیٰ مطلوب ہوگا، عبادات کو عمدہ بنانے کا طریقہ حدیث جبرئیل میں یہ آیا ہے:

أن تعبد اللّٰه كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك (مشکوۃ ح ۲)

اس طرح عبادت کرو، کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے، تو وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔

احسان عمل کا پہلا درجہ جو اعلیٰ درجہ ہے وہ تصحیح نیت، استحضار اور نسبت یادداشت کو قوی کر کے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے اور یہ درجہ حاصل کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر فرائض ہیں، پھر نوافل اعمال کا درجہ ہے، مسند احمد (۲۵۶:۶) میں حدیث ہے:

مــاتقـرَّب إليَّ عبــدي بمثل أداء الـفـرائـض وما يزال العبد يتقرب إليَّ بالنوافل حتى أُحِبَّه	بندہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ جتنا قرب حاصل کرتا ہے، وہ اور طریقہ سے حاصل نہیں ہوتا، اور بندہ نوافل عبادات کے ذریعہ برابر قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں

پس جو شخص درجہ احسان حاصل کرنا چاہتا ہے — اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ درجہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں — اسکو فرائض کے بعد نوافل اعمال میں محنت کرنی چاہئے۔ یہی شخص سالک (راہ رَو) کہلاتا ہے اور اسی محنت کا نام تصوف ہے۔

فائدہ (۲) تصوف کے لئے احادیث میں دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں ایک احسان دوسرا زُہد۔ پہلا لفظ تو صرف حدیث جبرئیل میں آیا ہے اور دوسرا لفظ متعدد احادیث میں آیا ہے المعجم المفهرس لألفاظ الحديث الشريف میں زَهَدَ، زَهُدَ، زُهْد اور زَهَادةٌ کی مراجعت کی جائے تو بہت سی حدیثوں کے حوالے مل جائیں گے۔ غرض پہلے لفظ کو رواج عام حاصل نہیں ہوا، دوسرا لفظ ہی اسلامی لٹریچر میں عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا، حدیث کی بنیادی کتابوں میں بھی أبواب الزهد ہی کا عنوان آتا ہے اور الزهد والرقاق کے عنوان سے مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ کی كتاب الزهد والرقاق طبع بھی ہوگئی ہے۔

اور زُہد کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی، اور زاہد چونکہ دنیا کی رعنائیوں سے دور رہتے تھے اور صوف (اونی کپڑے) پہنتے تھے اس لئے ان کے لئے لفظ صوفی (اونی کپڑا پہننے والا) اور فن کے لئے لفظ تصوف چل پڑا اور اب وہی لفظ زبان زد ہے۔ غرض احسان، زہد اور تصوف ایک ہی چیز ہیں اور یہ چیز بے اصل نہیں بلکہ نصوص سے ثابت ہے اور جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

پھر بعد میں تصوف میں عجمی اثرات کی آمیزش ہوگئی اور عبادت کے غیر شرعی طریقے رواج پاگئے تو اکابرین نے جیسے علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم رحمہما اللہ نے عجمی تصوف پر سخت تنقید کی۔ یہ حضرات نفس تصوف کے منکر نہیں تھے، اس کی بگڑی ہوئی صورت پر انکار کرتے تھے۔ جناب مکرم مولانا ملک عبد الحفیظ مکی صاحب نے علامہ ابن تیمیہ وغیرہ سات اکابرین علمائے سلفیہ کی کتابوں سے تصوف کے مضامین علحدہ کرکے ایک کتاب بہ نام موقف أئمة الحركة السَّلفية من التصوُّف والصوفية مرتب کی ہے اور وہ طبع بھی ہوچکی ہے۔ اسی طرح ان کے تلمیذ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے شیخ الاسلام ہروی رحمہ اللہ کی منازل السائرین إلی رب العالمين کی چار جلدوں میں مدارج السالكين کے نام سے شرح لکھی ہے جو مطبوعہ ہے۔

علمائے دیوبند نے تصوف میں سے عجمی تصورات اور غیر شرعی چیزوں کو حتی الامکان نکال دیا ہے یہ حضرات فن کو نکھار کر شریعت کے دائرہ میں لاکر اس پر عمل کرتے ہیں۔

غرض حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اپنی تصانیف میں عام طور پر اور حجۃ اللہ میں خاص طور پر لفظ تصوف استعمال

نہیں کرتے بلکہ اصل اصطلاح احسان استعمال کرتے ہیں۔ جلد ثانی میں بھی أبواب الإحسان کا عنوان قائم کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

فنِ حکمت شرعیہ کا چوتھا فائدہ

فقہائے کرام میں فروعی مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں۔ اور یہ اختلافات علتوں کے اختلاف پر مبنی ہیں، یعنی نص میں مذکور حکم کی علت سمجھنے میں اختلاف ہوا ہے، اس لئے فروعی مسائل میں اختلاف ہوگیا ہے۔

مثلاً اشیائے ستہ کی حدیث میں ربوا کی علت کے استخراج میں اختلاف ہوا ہے تو باب کی جزئیات میں بھی اختلاف ہوگیا ہے اب یہ فیصلہ کرنا کہ کس کی سمجھی ہوئی علت درست ہے، اس کے لئے فن حکمت شرعیہ کی ضرورت ہے۔ اب اس فن میں مذکور حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ فقہاء کی نکالی ہوئی علتوں کا موازنہ کرکے دیکھا جائے گا اور جو علت مصالح وحکم سے ہم آہنگ ہوگی اس کو ترجیح دی جائے۔

و منها: أنه اختلف الفقهاءُ في كثير من الفروع الفقهية، بناءً على اختلافهم في العِلَلِ المخَرَّجَةِ المناسبة؛ وتحقيقُ ما هو الحقُّ هنالك لايَتِمُّ إلابكلام مستقِلٍّ في المصالح.

ترجمہ: اور ان میں سے ایک (فائدہ) یہ ہے کہ بہت سی جزئیات فقہیہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے اور یہ اختلاف علتوں میں اختلاف پر مبنی ہے، جو احکام کے مناسب نکالی گئی ہیں۔ اب اس اختلاف میں صحیح بات کی تحقیق مصالح پر مستقل گفتگو کئے بغیر ممکن نہیں۔

ترکیب: تحقیق: مبتدا ہے اور لایتم إلخ خبر ہے۔

☆ ☆ ☆

فنِ حکمت شرعیہ کا پانچواں فائدہ

گمراہ فرقوں کو شریعت کے بہت سے مسائل میں شک ہے، ان کے خیال میں وہ سب مسائل خلاف عقل ہیں۔ اور جو چیز خلاف عقل ہو اس کو رد کردینا یا تاویل کرنا ضروری ہے مثلاً معتزلہ کو عذاب قبر میں شک ہے، وہ کہتے ہیں کہ عذاب قبر مشاہدہ اور عقل کے خلاف ہے۔ ہم میت کو سالوں سرد خانہ میں رکھے رہتے ہیں، اس پر کوئی عذاب مشاہدہ میں نہیں آتا۔ دفن کے بعد قبر کھود کر دیکھئے وہاں نہ کوئی بچھو ہے نہ سانپ، وہ کہتے ہیں کہ جو مرگیا: مرگیا، اب میت کو تکلیف کیسی؟! ہم بکری ذبح کرکے گوشت پکا کر کھاتے ہیں تو کیا بکری کو تکلیف ہوتی ہے؟

اسی طرح قیامت کے میدان میں حساب وکتاب اور اعمال تولنے کا معاملہ ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ حساب آڈیٹ وہ کرتا ہے جو حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہیں انھیں حساب لینے کی اور اعمال تولنے کی کیا ضرورت ہے؟!

اسی طرح پل صراط کا معاملہ لیجئے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ نامعقول بات ہے کہ پل صراط کی مسافت پانچ سو سال کی بھی ہو اور وہ بال سے زیادہ باریک بھی ہو، یہ تضاد نہیں تو کیا ہے؟!

غرض اس قسم کے مسائل کا اگر وہ احادیث میں مذکور ہوتے ہیں تو معتزلہ انکار کرتے ہیں اور قرآن کریم میں مذکور ہوتے ہیں تو دور دراز کی تاویلیں کرتے ہیں اور بعض فتنہ پرداز تو لوگوں میں شک کا بیج بوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ۲۹ رمضان یا ۳۰ رمضان کا روزہ تو فرض ہو اور یکم شوال کا حرام یہ کیا بات ہے؟ کل اور آج میں کیا فرق پڑ گیا؟! اسی طرح قرآن وحدیث میں جو ترغیبی یا ترہیبی مضامین ہیں گمراہ لوگ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ سب طفلانہ تسلیاں اور خواہ مخواہ کا ڈراوا ہے۔ ان کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں۔ حتی کہ معتزلہ میں سے سب سے زیادہ بدبخت ابوالحسین ابن الراوندی نے تو ایک حدیث گھڑ ڈالی کہ الباذ نجانُ لِمَا أُكِلَ له (بیگن جس مقصد کے لئے کھایا جائے وہ مقصد پورا ہوگا) وہ یہ حدیث بھولے بھالے مسلمانوں میں رائج کر کے چوٹ کرنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں میں نہ تو عقل ہے نہ تمیز، ایک بے گن چیز کو اتنا کارآمد بنا کر پیش کیا جائے کہ وہ آب زمزم کے برابر ہو جائے تو بھی وہ اس بات کو بے تکلف مان لیں گے، کیونکہ وہ حدیث کے نام پر پیش کی گئی ہے۔

اس صورت حال کا سدّ باب کیا ہے؟ بس یہی ہے کہ احکام شرعیہ کے حکم ومصالح بیان کئے جائیں، اور اس مقصد کے لئے قواعد وضوابط منضبط کئے جائیں۔ پھر ان پر متفرع کر کے تمام احکام کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان کر دی جائیں تاکہ شک کرنے والوں کا شک دور ہو جائے اور فتنہ اٹھانے والوں پر روک لگے چنانچہ شاہ صاحب نے اس کتاب کی دو قسمیں کی ہیں پہلی قسم میں قواعد وضوابط منضبط کئے ہیں اور دوسری قسم میں احکام کے اسرار وحکم بیان کئے ہیں۔

غرض جس طرح قرآن میں مذکور فن مخاصمہ کے اصول وقواعد طے کئے گئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ باطل فرقوں سے نمٹا جا سکے اسی طرح فن حکمت شرعیہ کی تدوین بھی ضروری ہے تاکہ اس کی مدد سے فتنوں کا سد باب کیا جا سکے۔

اور اب دور جدید میں تو تشکیک کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور یورپ اور امریکہ میں ہر مسلمان ہر بات پر معلوم کرتا ہے کہ یہ حکم کیوں ہے؟ اس لئے اب ہر عالم کو یہ فن پڑھنا ضروری ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو احکام شرعیہ کے بارے میں مطمئن کر سکے اور فتنہ پردازوں کو ناکامی کا منہ دکھا سکے۔

نوٹ: عربی میں بدعت کہتے ہیں فکری گمراہی کو اور مبتدع کہتے ہیں گمراہ شخص کو جیسے شیعہ معتزلہ وغیرہ اور اردو میں بدعت کہتے ہیں عملی گمراہی کو اور بدعتی کہتے ہیں عملی خرافات میں مبتلا شخص کو۔ کتاب میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ پہلے معنی مراد ہیں۔

ومنها: أن المبتدعين شكّكوا في كثير من المسائل الإسلامية: بأنّها مخالفةٌ للعقل، وكلُّ ما هـو مخالفٌ له يجب ردُّه أو تأويلُه، كقولهم في عذاب القبر: إنه يُكذِّبُهُ الحِسُّ والعقلُ؛ وقالوا في الحساب والصراط والميزان نحوا من ذلك، فَطَفِقُوا يُؤَوِّلُونَ بتأويلاتٍ بعيدةٍ.

وأثـارَتْ طائفةٌ فتنةَ الشك، فقالوا: لِمَ كان صومُ آخرِ يومٍ من رمضان واجبًا، وصومُ أوَّلِ يومٍ من الشوال ممنوعًا عنه؟ ونحوُ ذلك من الكلام؛

واسْتَهْزَأَتْ طائفةٌ بالترغيبات والترهيبات، ظَانِّيْنَ أنّها لِمُجَرَّدِ الحَثِّ والتحريض، لاترجع إلى أصلٍ أصيلٍ، حتى قام أشقى القوم، فوضع حديثَ "باذنجانُ لِمَا أُكِلَ له" يُعَرِّض بأنَّ أضرَّ الأشياء لَايَتَمَيَّزُ عند المسلمين من النافع.

ولاسبيلَ إلى دفع هذه المَفْسَدَةِ إلا بأن تُبَيَّنَ المصالحُ، وتُؤَسَّسَ لها القواعدُ، كما فُعِلَ نَحْوٌ من ذلك في مخاصمات اليهود والنصارى والدَّهْرِيَّة وأمثالهم.

ترجمہ: اوران میں سے ایک (فائدہ) یہ ہے کہ گمراہ لوگوں نے بہت سے اسلامی مسائل میں یہ کہہ کر شکوک وشبہات ابھارے ہیں کہ وہ خلاف عقل ہیں، اور جو بھی چیز خلاف عقل ہواس کو رد کرنا یا اس کی تاویل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً عذاب قبر کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اور عقل عذاب قبر کی تکذیب کرتے ہیں اوران لوگوں نے حساب، پل صراط اور میزان عمل کے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں کہی ہیں۔ اور وہ نصوص میں دور دراز کی تاویلیں کرنے لگے ہیں۔

اورایک فرقہ نے تو تشکیک کے فتنہ کو اس طرح ہوادی ہے کہ آخر اس میں کیا راز ہے کہ رمضان کی آخری تاریخ کا روزہ تو فرض ہو اور شوال کی پہلی تاریخ کا روزہ حرام ہو؟ اوراس قسم کی دیگر ہرزہ سرائیاں!

اورایک جماعت نے ترغیبات اور ترہیبات (کی نصوص) کا مضحکہ اڑایا ہے، یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ چیزیں محض ابھارنے اور جوش دلانے کے لئے ہیں، کسی مستحکم اصول پر ان کی بنیاد قائم نہیں۔ اور یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ معتزلہ میں سے بدبخت ترین شخص (ابن الراوندی) کھڑا ہوا اور اس نے حدیث گھڑ ڈالی کہ "بینگن جس مقصد کے لئے کھایا جائے وہ پورا ہوگا" وہ چوٹ کر رہا ہے کہ مسلمان مضرت رساں اور نفع بخش چیزوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔

اس قسم کے مفاسد کو دفع کرنے کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ مصالح کی وضاحت کی جائے اور ان کے لئے قواعد منضبط کئے جائیں، جیسا کہ یہود ونصاریٰ اور دہریوں وغیرہ باطل فرقوں کے مقابلہ کے لئے ایسا کیا گیا۔

  ☆

فن حکمت شرعیہ کا چھٹا فائدہ

فقہاء نے ایک قاعدہ بنایا ہے کہ ''جو حدیث ہر طرح سے خلاف قیاس ہو اس کو رد کر دینا جائز ہے'' یہ قاعدہ اپنی جگہ صحیح ہے، کیونکہ صریح نص اور صحیح عقل کے درمیان تعارض نہیں ہوسکتا، اگر کسی جگہ نص اور عقل میں تعارض نظر آئے تو یا تو روایت موضوع یا ضعیف ہوگی یا عقل فاسد ہوگی۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے موافقة صريح المعقول بصحيح المنقول یہ کتاب منہاج السنہ کے حاشیہ پر بھی طبع ہوئی ہے اور مستقل بھی چھپ گئی ہے۔

غرض قاعدہ صحیح ہے مگر تمام قواعد کلیہ عُكَّازَةُ الْعُمْيَان (اندھے کی لاٹھی) ہوتے ہیں، اندھے کا عصا صحیح جگہ بھی ٹک سکتا ہے اور غلط جگہ بھی پڑ سکتا ہے اسی طرح قواعد کلیہ کے اجراء میں غلطی بھی ہوجاتی ہے چنانچہ بعض حضرات نے یہ قاعدہ حدیثِ مُصَرَّات کے ساتھ جوڑ دیا کہ یہ روایت ہر طرح سے قیاس کے خلاف ہے اس لئے مردود ہے، اسی طرح بعض نے یہ قاعدہ قلتین کی حدیث سے جوڑ دیا، حالانکہ یہ دونوں حدیثیں مطابق قیاس ہیں، اسی طرح اور حدیثوں کو بھی خواہ مخواہ اس قاعدہ کی لپیٹ میں لایا گیا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ تمام نصوص کی حکمتیں بیان کی جائیں تاکہ اگر کوئی شخص مذکورہ قاعدہ کسی نص کے ساتھ غلط طور پر جوڑ دے تو اس کو سمجھایا جاسکے کہ یہ قاعدہ اس نص میں جاری نہیں ہوتا، اس نص میں مذکور حکم کی حکمت اور مصلحت یہ ہے۔

علاوہ ازیں اس فن کی تدوین میں اور بھی فوائد ہیں، جن کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ اور حدیث مصرات یہ ہے ﴿من اشترى شاةً مُصَرَّاة فهو بالخيار ثلاثة أيام، فإن ردها رد معها صاعًا من طعام، لاسَمْراءَ﴾ (مشکوٰۃ ح ۲۸۴۷) جس نے کوئی ایسی بکری خریدی جس کے تھن میں دودھ روک کر مشتری کو دھوکہ دیا گیا ہو تو اس کو تین دن تک اختیار ہے، پھر اگر وہ بکری واپس کر دے تو اس کے ساتھ ایک صاع (تین کلو ایک سو اڑتالیس گرام بیس پوئنٹ) غلہ بھی دے، گیہوں دینا ضروری نہیں۔

اور حدیث قلتین یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس پانی کے بارے میں دریافت کیا گیا جو چٹیل زمین میں ہوتا ہے اور جس پر چوپائے اور درندے باری باری آکر پانی پیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ﴿إذا كان الماءُ قُلَّتَينِ لم يَحْمِلِ الْخَبَثَ﴾ (مشکوٰۃ ح ۴۷۷) جب پانی دو مٹکے ہوجائے تو وہ گندگی کو (سر پر) نہیں اٹھاتا یعنی ناپاکی بہ کر چلی جاتی ہے۔

نوٹ: حدیث مصرات پر تفصیلی کلام، کتاب کی قسم دوم میں باب البيوع المنهى عنها (رحمۃ اللہ ۴: ۵۷۹) میں آئے گا۔ اور حدیث قلتین پر کلام أبواب الطهارة، باب أحكام المياه (رحمۃ اللہ ۳: ۲۵۷) میں آئے گا

وَمنها: أن جماعةً من الفقهاء زعموا أنه يجوز ردُّ حديثٍ يُخَالِفُ القياسَ من كلِّ وجهٍ فَتطَرَّقَ

الخللُ إلى كثير من الأحاديث الصحيحة، كحديث المُصَرَّاةِ، وحديث القلّتين، فلم يجدْ أهلُ الحديث سبيلاً في إلزامهمُ الحجَّةَ، إلا أن يُبَيِّنُوا أنها تُوافِقُ المصالحَ المعتَبَرَةَ في الشرع.

إلى غير ذلك من الفوائد التي لايَفِيْ بإحصائها الكلامُ

ترجمہ: اوران میں سے ایک (فائدہ) یہ ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ جو حدیث ہر طرح سے قیاس کے خلاف ہو اس کو رد کرنا جائز ہے، چنانچہ بہت سی صحیح حدیثوں کی طرف خرابی نے راہ بنالی، جیسے دودھ روکی ہوئی بکری کی حدیث اور دو مٹکوں والی روایت۔ اب محدثین کے لئے اُن فقہاء پر حجت قائم کرنے کی اس کے علاوہ کوئی راہ نہیں کہ وہ بتائیں کہ یہ حدیثیں ان مصالح کے موافق ہیں جو شریعت میں معتبر ہیں۔

وغیرہ وغیرہ بہت سے فوائد ہیں، جن کا احاطہ کرنے پر کلام قادر نہیں ہے۔

لغات: تطرّق إليه: راستہ تلاش کرنا...... وفَى يَفِيْ وَفاء به: پورا کرنا

☆ ☆ ☆

شاہ صاحبؒ کے تفردات کی وجہ

کتاب میں بعض جگہ قاری کو مصنف علیہ الرحمۃ کے تفردات ملیں گے، یعنی بعض ایسی آراء سامنے آئیں گی جن کے جمہور علمائے کلام قائل نہیں ہیں۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ ہی ان باتوں کے قائل ہیں، مثلاً

(۱) مَعَاد (میدان حشر اور آخرت) میں اللہ تعالیٰ کا مختلف صورتوں میں تجلی فرمانا، جبکہ جمہور علماء اللہ تعالیٰ کو شکل وصورت سے پاک مانتے ہیں۔

(۲) عام طور پر دو ہی عالم مانے جاتے ہیں دنیا اور آخرت، مگر شاہ صاحبؒ ایک تیسرے عالم کے بھی قائل ہیں، جو غیر مادی ہے، جہاں معنویات اور اعمال کو بھی ان کی صفت (حالت) کے لحاظ سے جسم ملتا ہے اور حوادث وواقعات اس عالم میں رونما ہونے سے پہلے اُس عالم میں پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح اس دنیا سے ناپید ہونے کے بعد بھی اُس عالم میں باقی رہتے ہیں، جس کا نام عالم مثال ہے۔

(۳) عام طور پر جزاء وسزا کا سبب اعمال کو سمجھا جاتا ہے، مگر شاہ صاحبؒ کے نزدیک کیفیاتِ قلبیہ مجازات کا اصلی سبب ہیں، جن کے ساتھ اعمال جڑے ہوئے ہوتے ہیں یعنی اعمال ان کے پیکر ہائے محسوس ہوتے ہیں۔

(۴) عام علماء تقدیر کی دو قسمیں کرتے ہیں: تقدیر معلّق اور تقدیر مُبْرَم، مگر شاہ صاحبؒ کے نزدیک تقدیر صرف مُبْرَم اور مُلْزِم ہی ہوتی ہے۔

شاہ صاحب قدس سرہ نے اس قسم کے تفردات بس یونہی سرسری طور پر اختیار نہیں فرمائے، بلکہ گہرے غور وفکر کے بعد جب دیکھا کہ بہت سی آیات واحادیث اور صحابہ وتابعین کے ارشادات اس کی پشت پر ہیں، اور گو عام علماء اس کے قائل نہیں ہیں مگر محققین اور وہ بڑے علماء جن کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی علم عطا فرمایا ہے اس کے قائل رہے ہیں تو شاہ صاحبؒ ان باتوں کے قائل ہوئے ہیں۔

[وجه تَفَرُّدات المصنف]

وستَجدُني إذا غلب عليَّ شِقْشِقَةُ البيان، وأمعنتُ في تمهيد القواعد غايةَ الإمعان، ربما أوجب المقامُ أن أقول بما لم يقل به جُمهور المناظرين من أهل الكلام: كتجلّي اللّٰه تعالىٰ في مواطن المعاد بالصُّوَر والأشكال، وكإثبات عالَم ليس عنصريا، يكون فيه تَجَسُّد المعاني والأعمال بأَشْبَاح مناسِبَة لها في الصفة، وتُخلق فيه الحوادث قبل أن تُخلق في الأرض؛ وارْتباطُ الأعمال بهيئات نفسانية، وكونُ تلك الهيئات في الحقيقة سببا للمجازاة في الحيٰوة الدنيا وبعد الممات، والقولُ بالقدر المُلْزِم، ونحوِ ذلك.

فَاعْلَمْ أني لم أَجْتَرِئْ عليه إلا بعد أن رأيتُ الآياتِ والأحاديثَ وآثارَ الصحابة والتابعين متظاهِرَة فيه، ورأيت جماعاتٍ من خواصِّ أهل السنة، المتميِّزين منهم بالعلم اللَّدُنِّيِّ يقولون به، ويَبْنُوْنَ قواعدَهم عليه.

ترجمہ: اور عنقریب آپ مجھے پائیں گے جب مجھ پر زور بیان غالب آئے گا اور میں قواعد تیار کرنے میں بہت زیادہ گہرائی میں اتروں گا، تو کبھی مقام مقتضی ہوگا کہ میں وہ بات کہوں جو علمائے علم کلام میں سے جمہور مناظرین نے نہیں کہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا شکل وصورت کے ساتھ تجلی فرمانا، آخرت کے مواقع میں، اور جیسے ایک ایسے عالم کو ثابت کرنا جو مادی نہیں ہے، جس میں معنویات اور اعمال جسم اختیار کرتے ہیں، ایسی اشکال کے ساتھ، جو اُن معانی اور اعمال سے حالت میں مشابہت رکھتے ہیں، اور اس میں واقعات پیدا کئے جاتے ہیں، زمین میں پیدا کئے جانے سے پہلے، اور اعمال کا کیفیاتِ قلبیہ (نیتوں) کے ساتھ جُڑا ہوا ہونا اور اُن ہیئات کا درحقیقت جزاء وسزا کا سبب ہونا، دنیا کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی، اور تقدیر مُبْرَم کا قائل ہونا اور اس طرح کے دیگر مسائل۔ پس یہ بات جان لیں کہ میں نے دلیری نہیں کی ہے ان باتوں پر مگر یہ دیکھنے کے بعد کہ آیات واحادیث اور صحابہ وتابعین کے ارشادات اس مسئلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہیں، اور میں نے اہل السنہ کے مخصوص لوگوں میں سے متعدد حضرات کو دیکھا جو ان میں

سے علم لدنی کے ساتھ ممتاز ہیں، وہ ان باتوں کے قائل رہے ہیں اور وہ ان باتوں پر اپنے قواعد کی بنیاد رکھتے ہیں۔

لغات

الشِقْشِقَة: بوقت مستی اونٹ کے منہ کا جھاگ ج شَقاشِق اور فصیح کے لئے کہا کرتے ہیں هَدَرَتْ شِقْشِقَتُہ اس کا فعل ہے شَقْشَقَ الجملُ شَقْشَقَةً: اونٹ کا بلبلانا...... امعن في الأمر: معاملہ کی گہرائی میں پہنچنا امعن في الطلب: ڈھونڈھنے میں بہت مبالغہ کرنا...... أوجب: واجب کرنا......مُناظِر (اسم فاعل) نـاظره مُناظرة: بحث کرنا، ماضی میں علم کلام کے بڑے علماء کو ''مناظر'' کہا جاتا تھا...... مـواطِن کا مفرد مَـوْطِن: وطن، مقام، جگہ...... الـمعـاد: لوٹنے کی جگہ، آخرت جنت...... تـجسَّـد: جسم والا ہونا، تناور ہونا...... أشبـاح کا مفرد الشبْـح والشبَـح: شخص، صورت، پیکر محسوس أشباح المال: نظر آنے والا مال جیسے اونٹ گائے بکری وغیرہ...... مُلْزِمْ (اسم فاعل) ألزم الشيَ: لازم کرنا...... اجترأ: دلیر ہوجانا...... جَرُؤَ (ک) جَرَاءَةً: دلیری کرنا صفت جَرِئٌ...... متظاهِرة (اسم فاعل) تظاهر القومُ: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

☆ ☆ ☆

اہل حق کون لوگ ہیں اور حق کا معیار کیا ہے؟

یہ بحث یہاں دفع دخل مقدر کے طور پر چھیڑی گئی ہے، یہ بحث بہت اہم اور نہایت مفید ہے، طلبہ اس کو غور سے پڑھیں۔ پیچھے بعض مسائل میں شاہ صاحب کے تفردات کا ذکر آیا تھا، اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شاہ صاحب بعض کلامی مسائل میں اہل السنہ والجماعہ سے متفرد ہیں تو آپ اہل حق میں داخل کہاں رہے؟ اس تفرد سے تو آپ اہل بدع یعنی گمراہ لوگوں میں شامل ہوگئے! درج ذیل عبارت میں اس کا جواب ہے کہ علم کلام میں جو مکاتب فکر ہیں ان میں سے کسی معین مکتب فکر کا نام اہل السنہ والجماعہ نہیں ہے کہ جو اس کے عقائد مانے وہ اہل السنہ میں شمار ہو، اور جو کسی بات میں اختلاف کرے وہ اہل حق سے خارج ہو جائے، بلکہ اس کا مدار مسائل پر ہے، بعض منصوص مسائل ہیں، جن کو بلا تاویل ماننا ضروری ہے، ان کا جو انکار کرے گا یا تاویل کرے گا وہ اہل حق میں شامل نہ ہوگا، شاہ صاحب قدس سرہ نے ایسے کسی بھی مسئلہ میں تفرد اختیار نہیں کیا۔

اور بعض مسائل غیر اہم اور غیر منصوص ہیں، وہ اہل حق ہونے کا معیار نہیں ہیں، ان کو ماننے والے اور نہ ماننے والے سب اہل السنہ والجماعہ میں شامل ہیں، شاہ صاحب قدس سرہ نے اس دوسری قسم کے بعض مسائل میں متقدمین سے اختلاف کیا ہے، جو کسی طرح بھی مضر نہیں، کیونکہ ایسا کرنے کا ہر ایک کو حق ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل قبلہ یعنی مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمام ضروریات دین کو بلا تاویل تسلیم کرے، جو شخص ان میں سے کسی بھی بات کو نہیں مانتا یا تاویل کرتا ہے وہ اہل قبلہ میں شامل نہیں ہے، مثلاً کوئی شخص نماز کو بہ ہیئت کذائی فرض نہیں مانتا، یا یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں، بس دعا کرنا فرض ہے تو وہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اسی طرح عقیدۂ ختم نبوت ضروریات دین میں سے ہے، پس جو شخص اس عقیدہ کا قائل نہیں ہے یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر نہیں مانتا یعنی آپ کے بعد ہر قسم کی نبوت کے بند ہونے کا قائل نہیں ہے بلکہ آپ کے بعد بھی نبوت کے جاری رہنے کا قائل ہے یا یہ کہتا ہے کہ ختم کے معنی مہر کرنے کے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النّبیین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مہر یعنی اتباع سے آپ کے بعد بھی نیا نبی آسکتا ہے، تو ایسا شخص کافر، مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

اور ضروریات دین کے معنی ہیں ''دین کی بدیہی باتیں'' یعنی دین اسلام کی وہ موٹی موٹی باتیں جن کو دین سے واقف ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے، جیسے نماز کی ہیئت کذائی، پانچ نمازیں، نمازوں کا فرض ہونا، زکوٰۃ، روزے اور حج کی فرضیت، قرآن کا کتاب اللہ ہونا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری نبی ہونا وغیرہ دین کی بدیہی باتیں ہیں۔ یہ ضروریات دین کہلاتی ہیں۔

غرض جو لوگ تمام ضروریات دین کو مانتے ہیں وہی اہل قبلہ یعنی مسلمان ہیں، پھر اہل قبلہ میں اختلافات ہوئے اور علحدہ علحدہ فرقے اور مختلف جماعتیں بن گئیں۔ ان میں جن مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں وہ دو قسم کے مسائل ہیں۔

پہلی قسم: وہ مسائل ہیں جو قرآن وحدیث سے صراحۃً ثابت ہیں اور سلف صالحین یعنی صحابہ وتابعین ان کے قائل رہے ہیں، مثلاً قبر میں سوال وجواب کا ہونا، قیامت کے دن اعمال کا تلنا، پل صراط پر گذرنا، جنت میں اللہ کا دیدار ہونا، اور اولیائے کرام سے کرامتوں کا ظاہر ہونا۔ یہ سب باتیں قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہیں اور سلف صالحین ان سب باتوں کے قائل رہے ہیں پھر جب خودرائی کا زمانہ آیا اور کچھ لوگوں کے گمان میں مذکورہ مسائل خلاف عقل ثابت ہوئے تو انھوں نے یا تو ان مسائل کا انکار کردیا یا ان میں تاویل شروع کردی۔

اور امت کے سواد اعظم نے قرآن وحدیث کے ظاہر سے جو کچھ سمجھ میں آتا تھا اس کو لے لیا، اور انھوں نے اس کی قطعاً پرواہ نہ کی کہ وہ عقل کے موافق ہیں یا مخالف، اگر انھوں نے کسی مسئلہ میں دلائل عقلیہ سے بحث کی بھی تو وہ یا تو مخالفین پر الزام قائم کرنے کے لئے کی یا ان کو جواب دینے کے لئے یا مزید اطمینان قلبی کے لئے کی، ان سے عقائد کو ثابت کرنے کے لئے گفتگو نہیں کی بلکہ دلائل نقلیہ پر اعتماد کیا اور سلف کے عقائد کو دانتوں سے مضبوط پکڑا، یہی حضرات اہل السنہ یعنی اہل حق ہیں۔

غرض معتزلہ وغیرہ نے جب ان عقائد کو اصول عقلیہ کے خلاف گمان کیا تو تاویل شروع کردی اور نصوص کو ظاہر سے پھیر دیا۔ اور ان لوگوں نے عقائد کو ثابت کرنے کے لئے اور ان کی نفس الامری حالت کو واضح کرنے کے لئے دلائل

عقلیہ سے بحث شروع کردی اور سارا مدار عقل پر رکھ دیا۔

اور کچھ بے بصیرت لوگ اس کے قائل ہوئے کہ یہ باتیں اگرچہ سمجھ میں تونہیں آتیں، نہ عقل ان کی شہادت دیتی ہے پھر بھی ہم بغیر سمجھے ان کو مانتے ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارا ان سب باتوں پر علی وجہ البصیرت ایمان ہے، وہ سب باتیں ہمارے نزدیک عین عقل کے مطابق ہیں (باقی آگے)

[من هم أهل السنَّة؟]

وليست " السنة" اسما في الحقيقة لمذهبٍ خاص من الكلام، ولكن المسائلَ التي اختُلف فيها أهلُ القبلة، وصاروا لأجلها فِرَقًا متفرقة، وأحزابا مُتَحَزِّبة، بعد انقيادهم لضروريات الدين، على قسمين:

[١] قسم نطقت به الآياتُ، وصحَّت به السنةُ، وجرى عليه السلفُ من الصحابة والتابعين: فلما ظهر إعجابُ كلِّ ذي رأيٍ برأيه، وتَشَعَّبَتْ بهم السُّبُلُ، اختار قوم ظاهرَ الكتاب والسنة، وعَضُّوا بنواجذهم على عقائد السلف، ولم يُبَالوا بموافقتها للأصول العقلية، ولا لمخالفتها لها؛ فإن تكلموا بمعقول فلإلزام الخصوم والردِّ عليهم، أو لزيادة الطُّمأنينة، لا لاستفادة العقائد منها، وهم أهل السنة.

وذهب قوم إلى التأويل والصرف عن الظاهر، حيث خالفت الأصولَ العقليةَ بزعمهم، فتكلموا بالمعقول لتحقُّقِ الأمر وتَبَيُّنِهِ على ما هو عليه.

فمن هذا القسم: سؤال القبر، ووزنُ الأعمال، والمرورُ على الصراط، والرؤيةُ، وكراماتُ الأولياء؛ فهذا كلُّه ظهر به الكتابُ والسنة، وجرى عليه السلفُ، ولكن ضاق نِطاقُ المعقولِ عنها بزعم قوم، فأنكروها أو أَوَّلُوْها.

وقال قوم منهم: آمنا بذلك وإن لم نَدْرِ حقيقتَه، ولم يَشْهَدْ له المعقولُ عندنا.

ونحن نقول: آمنا بذلك كلِّه على بينة من ربنا، وشَهِد له المعقولُ عندنا.

ترجمہ: اور ''السنہ'' درحقیقت علم کلام کے کسی خاص مکتب فکر کا نام نہیں ہے، بلکہ جن مسائل میں اہل قبلہ نے اختلاف کیا ہے، اور وہ ان مسائل کی وجہ سے متفرق جماعتیں اور علحدہ علحدہ گروہ بن گئے ہیں، دین کی بدیہی باتوں کی تابعداری کرنے کے بعد، وہ دوقسم کے مسائل ہیں:

(۱) کچھ مسائل وہ ہیں جن کی آیات کریمہ نے صراحت کی ہے، اور ان کے ساتھ احادیث ثابت ہوئی ہیں (یعنی وہ

مسائل صحیح احادیث سے ثابت ہیں) اور ان پر سلف یعنی صحابہ وتابعین چلے ہیں (یعنی وہ ان باتوں کے قائل رہے ہیں) پھر جب ہر صاحب رائے کا اپنی رائے پر اترانا ظاہر ہوا (یعنی خودرائی کا زمانہ آیا) اور راستے لوگوں کو الگ الگ گھاٹیوں میں لے گئے (یعنی وہ مختلف راستوں پر پڑ گئے) تو کچھ لوگوں نے کتاب وسنت کے ظاہر کو اختیار کیا، اور انھوں نے سلف کے عقائد کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑا۔ اور انھوں نے کچھ پرواہ نہ کی ان مسائل کے اصول عقلیہ کے موافق ہونے کی، اور نہ ان کے ان اصول کے خلاف ہونے کی، پھر اگر ان لوگوں نے دلائل عقلیہ سے گفتگو کی تو وہ مقابل پر الزام قائم کرنے کے لئے کی اور ان کو جواب دینے کے لئے کی یا مزید اطمینان قلبی حاصل کرنے کے لئے کی، ان دلائلِ عقلیہ سے عقائد کو حاصل کرنے کے لئے نہیں کی۔ اور یہی حضرات أهل السنَّة ہیں۔

اور ایک قوم تاویل کی طرف اور (نصوص کو) ظاہر سے پھیرنے کی طرف گئی، جہاں بھی وہ عقائد ان کے گمان میں اصول عقلیہ کی خلاف نظر آئے، چنانچہ ان لوگوں نے دلائل عقلیہ سے گفتگو کی معاملہ (عقائد) کا یقین کرنے کے لئے اور ان کی وضاحت کرنے کے لئے اس طور پر جس طور پر وہ عقائد ہیں (یعنی ان لوگوں نے عقائد کے اثبات کے لئے دلائل عقلیہ سے گفتگو کی)

پس اس قسم کے مسائل میں سے ہیں: قبر کا سوال، اعمال کا تلنا، پل صراط پر گذرنا، رویتِ باری تعالی، اور اولیاء کی کرامتیں؛ پس یہ تمام باتیں کتاب وسنت نے واضح طور پر ثابت ہیں اور ان پر سلف چلتے رہے ہیں، مگر ایک قوم کے گمان میں عقل کا پٹکا ان عقائد سے تنگ ہوگیا (یعنی وہ مسائل ان کی عقل کی سمائی میں نہیں آئے) پس ان لوگوں نے ان عقائد کا انکار کیا یا ان کی تاویل کی۔

اور ان میں سے ایک قوم نے کہا کہ ہم ان باتوں کو مانتے ہیں، اگرچہ ہم ان کی حقیقت نہیں سمجھتے اور نہ ان کے لئے ہمارے نزدیک عقل گواہی دیتی ہے۔

اور ہم کہتے ہیں کہ ہم ان سب باتوں پر ہمارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور ان کے لئے ہمارے نزدیک عقل گواہی دیتی ہے (یعنی وہ مسائل دلائل عقلیہ سے بھی ثابت ہیں)

تشریح:

۱- مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہوکر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم ﷺ کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت ووضاحت کے ساتھ مذکور ہے، جس میں مسلمان کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں (معارف القرآن شفیع ج۵ص۲۳۶ کراچی)

۲- پل صراط پر گذرنے کا تذکرہ سورۂ مریم آیت ۷۱ میں اشارۃً اور بے شمار احادیث میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

۳- رویت باری کا تذکرہ بہت سی آیات میں صراحۃً اور اشارۃً آیا ہے مثلاً سورۃ القیامہ آیت ۲۳ اور احادیث میں بھی یہ مضمون بکثرت وارد ہوا ہے۔

۴- متعدد کرامات اولیاء کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے مثلاً پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو لانے کا تذکرہ سورۃ النمل آیات ۳۸-۴۰ میں ہے اور کھجور کے تنہ کو پکڑ کر ہلانے سے خرموں کا جھڑنا سورۂ مریم آیت ۲۵ میں مذکور ہے اور احادیث میں صحابۂ کرام کی بے شمار کرامتوں کا تذکرہ آیا ہے۔

لغات: تَحَقَّق الرجلُ الأمرَ: یقین کرنا...... تَبَیَّنَ الشیئ: واضح کرنا۔

☆ ☆ ☆

دوسری قسم کے مسائل وہ ہیں جو نہ تو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہیں، نہ احادیث مشہورہ سے ثابت ہیں، نہ ان کے سلسلہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے لب کشائی کی ہے، بلکہ وہ مسائل ان کے پیچوں پر لپٹے رکھے تھے، تا آنکہ کچھ اہل علم آئے، جنھوں نے ان مسائل کو چھیڑا، اور ان میں اختلاف ہوا۔ اس قسم کے اجتہادی مسائل کسی کو بھی اہل السنہ سے خارج نہیں کرتے، شاہ صاحب قدس سرہ کا تفرد اسی قسم کے مسائل میں ہے۔

رہی یہ بات کہ جب ان مسائل کو سلف نے نہیں چھیڑا تھا تو متأخرین نے ان کو کیوں چھیڑا؟ تو اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ متأخرین نے وہ مسائل تین وجوہ سے چھیڑے ہیں۔

پہلی وجہ: متأخرین نے وہ مسائل دلائل نقلیہ سے یعنی قرآن وحدیث سے مستنبط کئے ہیں۔ یعنی جب بعد کے علماء نے آیات واحادیث کی تفسیر کی اور تمام محتمل مسائل مستنبط کئے تو وہ مسائل زیر بحث آئے اور ان میں اختلاف ہوگیا، جیسے انبیاء کا ملائکہ سے افضل ہونا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے افضل ہونا۔

دوسری وجہ: علم کلام میں بعض مسائل اہل علم نے اس لئے چھیڑے ہیں کہ ان کو اسلامی مسائل کا موقوف علیہ سمجھ لیا گیا ہے یعنی یہ خیال کیا گیا ہے کہ جب تک وہ مسائل طے نہیں ہوں گے اسلامی مسائل ثابت نہیں ہوں گے، جیسے امور عامہ کے تمام مسائل اور جوہر وعرض کے بعض مسائل، پھر شاہ صاحب نے اس قسم کے مسائل کی چار مثالیں دی ہیں۔

تیسری وجہ: جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ امت کو پہنچی ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے، مگر اس کی تفصیل وتفسیر میں اختلاف ہوا ہے۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں صفاتِ باری تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے تین مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

[۲] وقسم لم يَنطق به الكتابُ، ولم تَسْتَفِضْ به السنةُ، ولم يتكلم فيه الصحابةُ، فهو مَطْوِيٌّ على غِرِّه، فجاء ناس من أهل العلم فتكلموا فيه، واختلفوا؛ وكان خوضُهم فيه:

[الف] إما استنباطا من الدلائل النقلية، كفضل الأنبياء على الملائكة، وفضلِ عائشة على فاطمة رضى الله عنهما.

[ب] وإما لتوقُّف الأصولِ الموافقةِ للسنَّةِ عليه، وتعلُّقها به بزعمهم: كمسائل الأمور العامة، وشيئ من مباحث الجواهر والأعراض؛ فإن القولَ بحدوث العالَم يتوقف على إبطال الْهَيُوْلٰى وإثباتِ الجزءِ الذى لايَتَجَزَّى؛ والقول بخلق الله تعالى العالَم بلا واسطة يتوقف على إبطال القضيةِ القائلةِ بأن الواحد لايصدُر عنه إلَّا الواحدُ؛ والقولَ بالمعجزات يتوقف على إنكار اللزوم العقلى بين الأسباب ومُسَبَّباتها، والقولَ بالمعاد الجسمانى يتوقف على إمكان إعادة المعدوم؛ إلى غير ذلك مما شَحَنُوْا به كُتُبَهُمْ.

[ج] وإما تفصيلا وتفسيرًا لما تَلَقَّوه من الكتاب والسنة، فاختلفوا فى التفصيل والتفسير بعد الاتفاق على الأصل.

كما اتفقوا على إثبات صِفَتَى السمع والبصر، ثم اختلفوا: فقال قوم: هماصفتان راجعتان إلى العلم بالمسموعات والمبصَرات؛ وقال آخرون: هما صفتان على حِدَتِهِمَا؛

وكما اتفقوا على أن الله تعالى حيٌّ، عليم، مُرِيْدٌ، قدير، متكلم، ثم اختلفوا: فقال قوم إنما المقصودُ إثباتُ غاياتِ هذه المعانى من الآثار والأفعال، وأنْ لَّا فرقَ بين هذه السبع وبين الرحمة والغضب والجود فى هذا وأن الفرقَ لم تُثْبته السنةُ؛ وقال قوم: هى أمور موجودة قائمة بذات الواجب.

واتفقوا على إثبات الاستواء على العرش، والوجهِ، والضَّحْكِ، على الجملة، ثم اختلفوا: فقال قوم: إنما المرادُ معانٍ مناسِبَةٌ: فالاستواء، هوالاستيلاء والوجهُ الذاتُ؛ وَطَوَاهَا قوم على غِرِّها، وقالوا: لا ندرى ماذا أريد بهذه الكلمات؟

ترجمہ: اور دوسری قسم: وہ مسائل ہیں جن کی قرآن کریم نے صراحت نہیں کی، نہ ان کے ساتھ حدیثیں مشہور ہوئیں یعنی احادیثِ مشہورہ میں بھی وہ باتیں نہیں آئیں ہیں اور نہ ان کے سلسلہ میں صحابہ نے گفتگو کی ہے، پس وہ باتیں لپٹی رکھی تھیں ان کے پیچ پر، پھر آئے کچھ اہل علم پس انھوں نے ان مسائل میں گفتگو کی، اور ان میں اختلاف ہوا، اور ان کا ان مسائل میں گھسنا تھا:

(الف) یا تو دلائل نقلیہ سے استنباط کرتے ہوئے، جیسے انبیاء کی برتری ملائکہ پر، اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برتری حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر۔

(ب) اور یا اہلِ حق کے موافق اصول کے موقوف ہونے کی وجہ سے ان مسائل پر، اور اُن اصولِ اسلامیہ کے جُزے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان مسائل کے ساتھ، اُن حضرات کے گمان میں، جیسے امورِ عامہ کے مسائل اور جوہر وعرض کے کچھ مباحث، پس بیشک عالم کے حادث ہونے کا قول موقوف ہے ہیولی کے ابطال پر اور جزء لاتجزی کے اثبات پر، اور اللہ تعالیٰ کے عالم کو بلا واسطہ پیدا کرنے کا قول موقوف ہے اس ضابطہ کے توڑنے پر کہ ''واحد سے واحد ہی صادر ہوسکتا ہے'' اور معجزات کا عقیدہ موقوف ہے اسباب اور ان کے مسببات کے درمیان لزوم عقلی نہ ہونے پر، اور معاد جسمانی کا عقیدہ موقوف ہے معدوم کے اعادہ کے ممکن ہونے پر، وغیرہ وغیرہ مسائل، جن سے علماء نے اپنی کتابیں بھردی ہیں۔

(ج) اور یا چھیڑے گئے ہیں وہ مسائل تفصیل وتفسیر کرتے ہوئے، اس کتاب وسنت کی جس کو لوگوں نے حاصل کیا ہے، پس علماء نے اصل باتوں پر اتفاق کرنے کے بعد ان کی تفصیل وتفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ جیسے تمام علماء اللہ تعالیٰ کے لئے صفت سمع اور صفت بصر ثابت کرنے پر متفق ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا، پس کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ دو صفتیں ہیں لوٹنے والی ہیں مسموعات اور مبصرات کو جاننے کی طرف، اور دوسروں نے کہا کہ وہ دو علیحدہ صفتیں ہیں۔

اور جیسے تمام علماء متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہیں، جاننے والے ہیں، ارادہ کرنے والے ہیں، پوری قدرت رکھنے والے ہیں اور کلام فرمانے والے ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا، پس کچھ لوگوں نے کہا کہ مقصود ان صفات کے معانی کے نتائج کو یعنی ان کے آثار وافعال کو ثابت کرنا ہے (یعنی بذاتِ خود یہ صفات ثابت کرنا مقصود نہیں) اور (انھوں نے) یہ بھی کہا کہ ان سات میں اور صفت رحمت وغضب وجود (وغیرہ صفات فعلیہ) میں اس بارے میں کوئی فرق نہیں (یعنی سب سے مقصود غایات کا اثبات ہے) اور یہ بھی کہا کہ اُن کے درمیان احادیث نے کوئی فرق ثابت نہیں کیا۔ اور کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ ساتوں صفات امور موجودہ ہیں، واجب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔

اور جیسے تمام علماء اللہ تعالیٰ کے لئے بالاجمال یعنی بلا تفصیل عرش پر استواء (قرار پکڑنا) اور چہرہ اور ہنسنا ثابت کرنے پر متفق ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا، پس کچھ لوگوں نے کہا کہ مراد اللہ کے شایان شان معانی ہیں، پس استواء بمعنی غلبہ ہے اور چہرہ سے مراد ذات ہے اور کچھ لوگوں نے ان صفات متشابہات کو ان کے پیچ پر لپیٹ دیا، اور کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ ان کلمات سے کیا مراد ہے؟

① انسان افضل ہیں یا ملائکہ؟ سورۃ البقرہ آیات ۳۰-۳۴ میں انسان کی خلافت ارضی کا ذکر آیا ہے، اس موقعہ پر ملائکہ نے خود کو خلافت ارضی کے لئے پیش کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا کہ: ''میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے'' پھر اللہ تعالیٰ نے سب کو معرض امتحان میں کھڑا کیا تھا، ملائکہ اشیائے عالم کی حقیقت نہیں بتا سکے تھے اور حضرت

آدم علیہ السلام نے سب باتیں فرفر بتادی تھیں، پھر حضرت آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا تھا اور مسجود، ساجد سے افضل ہوتا ہے، پس اس واقعہ سے انسان کی یا کم از کم انبیاء کی ملائکہ پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ﴿أُولٰـئِكَ هُـمْ خَيْـرُ الْبَـرِيَّةِ﴾ سے بھی انسان کی فضیلت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۰ میں ارشاد ہے ﴿وَلَقَدْ كَـرَّمْنَـا بَنِـيْٓ آدَمَ﴾ (ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی) اس سے بھی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر استدلال کیا گیا ہے اور چونکہ انبیاء تمام انسانوں سے افضل ہیں اس لئے وہ تمام فرشتوں سے بھی افضل ہوئے۔

مگر پہلی دلیل پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ مسجود ہونے سے فضیلت ثابت نہیں ہوتی، ہاں معبود ہونا فضیلت پر دلالت کرتا ہے، مگر حضرت آدم علیہ السلام کو معبود نہیں بنایا گیا تھا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں، ان کو صرف قبلہ توجہ بنایا گیا تھا اور سجدہ یعنی عبادت درحقیقت اللہ تعالیٰ کے لئے تھی، پس جس طرح کعبہ شریف کو قبلہ توجہ بنا کر انبیائے کرام بھی نماز پڑھتے ہیں، مگر کعبہ شریف (عمارت) انبیاء سے افضل نہیں، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنانے سے ان کا ملائکہ سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔

اور دوسری دلیل کے بارے میں کہا گیا ہے کہ البریۃ سے مراد صرف زمینی مخلوقات ہیں، ملائکہ ان میں شامل نہیں اور لَقَدْ كَرَّمْنَا سے استدلال آخر آیت سے متعارض ہے، کیونکہ عَلٰی كَثِيْرٍ کی قید ملائکہ کو نکالنے کے لئے ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ (الانبیاء ۲۶) وغیرہ آیات ملائکہ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں، جس کی تفصیل کتب تفاسیر میں مذکورہ بالا آیات کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

غرض کسی نے انسان کی اور کسی نے انبیاء کی ملائکہ پر فضیلت آیات سے مستنبط کی ہے، اور کسی نے اس کے برعکس ملائکہ کی فضیلت ثابت کی ہے، اور ہر فریق کے استدلال میں گونہ معقولیت ہے۔ اور اس سلسلہ میں تحقیقی بات یہ ہے کہ:

''عام مؤمنین صالحین جیسے اولیاء اللہ وہ عام فرشتوں سے افضل ہیں۔ اور خواص ملائکہ جیسے حضرت جبرئیل، حضرت مکائیل وغیرہ عام مؤمنین صالحین سے افضل ہیں۔ اور خواص مؤمنین جیسے انبیائے کرام وہ خواص ملائکہ سے بھی افضل ہیں، اور کفار و فجار فرشتوں سے تو کیا افضل ہوتے، وہ تو جانوروں سے بھی اصل مقصد فلاح و نجاح میں افضل نہیں، بلکہ کفار تو چوپایوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں'' (مظہری)

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا؟: یہ کانٹوں بھرا مسئلہ ہے، کیونکہ روایات مختلف وارد ہوئی ہیں، بعض سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، بعض سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی، بعض سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اور بعض سے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) بخاری شریف میں روایت ہے کہ خير نسائها مريم، وخير نسائها خديجة (حضرت مریمؑ اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل ہیں، اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل ہیں) اس حدیث سے حضرت

خدیجہؓ کی حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما پر برتری ثابت کی گئی ہے۔

(۲) بخاری شریف میں روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: فاطمةُ بَضعة منی (فاطمہ میرا ٹکڑا ہے) اور آپؐ افضل کائنات ہیں پس آپ کے جسم کا ٹکڑا بھی یقیناً افضل ہوگا، پس حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمام خواتین سے افضل ہوئیں۔

اور بخاری شریف میں یہ روایت بھی ہے کہ فاطمةُ سيدة نساء أهل الجنة (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں) اس سے بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اور بعض حضرات پہلی حدیث سے صرف آپ کی صاحبزادیوں پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ثابت کرتے ہیں، حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما پر ترجیح نہیں دیتے مگر دوسری حدیث فضیلت کلّی میں صریح ہے۔

(۳) بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام (عائشہؓ کی برتری دوسری عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کی برتری دوسرے تمام کھانوں پر) اس حدیث میں لفظ نساء عام ہے پس حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما پر بھی حضرت عائشہؓ کی برتری ثابت ہوئی۔

مگر یہ بھی احتمال ہے کہ الف لام عہد کا ہو، اور معہود بوقت ارشاد موجودہ ازواج مطہرات ہوں، پس اس حدیث سے حضرت خدیجہ اور حضرت فاطمہ پر برتری ثابت نہ ہوگی۔

(۴) نسائی شریف میں بسند صحیح حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ أفضل نساء أهل الجنة خديجة وفاطمة ومريم وآسية اس روایت میں حضرت عائشہؓ کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں۔

اور علامہ ابن عبدالبر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: سيدة نساء العالمين مريم، ثم فاطمة، ثم خديجة ثم آسية مگر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ الحديث الثاني الدال على الترتيب ليس بثابت وأصله عند أبي داود والحاكم بغير صيغة ترتيب (فتح ۷:۱۳۶)

غرض یہ بہت الجھا ہوا مسئلہ ہے، اس میں کوئی قطعی فیصلہ یا ترجیح ممکن نہیں، اور اس کی ضرورت بھی نہیں اس لئے توقف بہتر ہے والعلم عند الله، وهو أعلم بعباده۔

(۳) **امور عامہ:** وہ مفاہیم ہیں جو موجوداتِ ثلاثہ (واجب، جوہر اور عرض) میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں ہیں، خواہ وہ تینوں اقسام کو شامل ہوں جیسے وجود (پایا جانا) وحدت (اکائی) کیونکہ ہر موجود خواہ وہ کتنا ہی کثیر ہو اس کے لئے کسی نہ کسی اعتبار سے اکائی ہوتی ہے جیسے انسان باوجود کثرت کاثرہ کے سب انسان ہیں۔ یا ان میں سے دو قسموں کو شامل ہوں، جیسے امکانِ خاص، حدوث، وجوب بالغیر، کثرت، معلولیت، یہ سب مفاہیم جوہر و عرض میں مشترک ہیں۔

جوہر: حکماء کے نزدیک وہ ممکن ہے جو بغیر محل کے پایا جاسکے یعنی وہ اپنے وجود میں کسی محل کا محتاج نہ ہو، جیسے تمام

اجسام اور متکلمین کے نزدیک جوہر وہ حادث (نو پید) ہے جو بذات خود متحیز ہو اور متحیز کے معنی ہیں کسی مکان میں ہونا، پس واجب تعالیٰ جوہر نہیں، کیونکہ وہ متمکن ہیں نہ حادث۔

عرض: جوہر کا مقابل ہے، حکماء اس کی تعریف کرتے ہیں: وہ ممکن جو بغیر محل کے نہ پایا جاسکے، یعنی وہ اپنے وجود اور قیام میں کسی محل کا محتاج ہو جیسے تمام صفات اور کیفیات وغیرہ، اور متکلمین کے نزدیک عرض وہ حادث ہے جو بذات خود متحیز نہ ہو سکے، پس اللہ تعالیٰ عرض بھی نہیں۔

فائدہ: یہ علم کلام کی ابحاث کی طرف اشارہ ہے، قاضی عضدالدین اَیجی رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۶ھ) نے جو آٹھویں صدی کے علم کلام کے ماہر عالم ہیں، اپنی کتاب المواقف کے مواقف ستہ میں سے دوسرا موقف امور عامہ میں اور تیسرا موقف عرض کے بیان میں، اور چوتھا موقف جوہر کے بیان میں لکھا ہے۔ علامہ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ (متوفی ۸۱۶ھ) نے اس کی عمدہ شرح لکھی ہے، جو شرح المواقف کے نام سے مشہور ہے اور مطبوعہ ہے، اور علم کلام کی بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ امور عامہ کی یہ تمام ابحاث اور جوہر وعرض کے بعض مسائل علم کلام کی کتابوں میں اس لئے چھیڑے گئے ہیں کہ ان کو مسائل اسلامیہ کا موقوف علیہ سمجھا گیا ہے اور اس سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے چار مثالیں دی ہیں، ان کی وضاحت درج ذیل ہے:

پہلی مثال: فلاسفہ کے نزدیک جزلایتجزی باطل ہے اور ہیولی ثابت ہے اس لئے عالم قدیم ہے اور متکلمین کے نزدیک جز ثابت ہے اور ھیولی باطل ہے اس لئے عالم حادث (نو پید) ہے۔ غرض ھیولی کا ابطال اور جزلایتجزی کا اثبات علم کلام میں اس لئے کیا جاتا ہے کہ حدوثِ عالم کا اثبات اس پر موقوف سمجھا گیا ہے، تفصیل کے لئے معین الفلسفہ دیکھیں۔

دوسری مثال: متکلمین کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے تمام عالم کو بذات خود بلاواسطہ پیدا کیا ہے اور حکماء کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ صرف عقل اول کو پیدا کیا ہے اور باقی عالم کو عقولِ عشرہ کے توسط سے پیدا کیا ہے، ان کے نزدیک عقول عشرہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرح خالق ہیں، اس کی تفصیل بھی معین الفلسفہ میں دیکھیں۔

اور فلاسفہ نے وسائط کا سہارا اس لئے لیا ہے کہ ان کے خیال میں واحد حقیقی سے یعنی اس ذات سے جو بہمہ وجوہ واحد ویگانہ ہے جس میں کسی بھی اعتبار سے کثرت اور دوئی نہیں ہے، اس سے صرف ایک ہی چیز صادر ہو سکتی ہے، اگر اس سے متعدد چیزیں صادر ہونگی تو نسبتوں میں تعدد پیدا ہو جائے گا، جو وحدت پر اثر انداز ہوگا اور وہ ذات واحد حقیقی نہ رہے گی، واحد اعتباری ہو کر رہ جائے گی، جو توحید کی منافی ہے۔

اور اسلامی نقطہ نظر سے خالق صرف اللہ تعالیٰ ہیں، صفت خلق میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں، سارا عالم اللہ تعالیٰ نے بذات خود بلاواسطہ پیدا کیا ہے اور متکلمین کے نزدیک فلاسفہ کا مذکورہ قاعدہ سرے سے باطل ہے، ان کے نزدیک جہتوں اور نسبتوں کا تعدد توحید کے منافی نہیں، جس طرح صفات الٰہیہ کا ثبوت اور تعدد توحید کے منافی نہیں، کیونکہ صفات نہ عین

ذات ہیں نہ غیر ذات، اگر وہ بہمہ وجوہ متغائر ہوتیں تو توحید کے منافی ہوتیں، اسی طرح صفت خلق کی نسبتوں کا تعدد یعنی اللہ تعالیٰ کا آسمانوں کو پیدا کرنا، زمین کو پیدا کرنا، انسان کو پیدا کرنا وغیرہ یہ نسبتوں کا تعدد بھی توحید پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس لئے متکلمین، فلاسفہ کے مذکورہ قاعدہ **الواحد لایصدر عنہ إلا الواحد** کو باطل کرتے ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ کا بلا واسطہ خلاق عالَم ہونا ثابت کیا جاسکے۔

تیسری مثال: یہ دنیا دارالاسباب ہے یعنی یہاں ہر چیز سبب ومسبب کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے، کوئی چیز اس کے دائرہ سے باہر نہیں اور معجزہ اس خرق عادت معاملہ کا نام ہے جس میں بظاہر سبب ومسبب کا سلسلہ نظر نہیں آتا، پس معجزات کا ثبوت اس امر پر موقوف ہے کہ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ اسباب ومسببات کے درمیان عقلاً لزوم نہیں، صرف عادۃً ہے یعنی عام طور پر مسببات، اسباب کے نتائج ہوتے ہیں اور اسباب کے بعد مسببات وجود پذیر ہوتے ہیں مگر عقلاً ایسا ہونا ضروری نہیں، اسباب کے بغیر بھی مسببات وجود پذیر ہوسکتے ہیں، کیونکہ اسباب صرف اسباب ہیں، خدا نہیں جن کے مسببات محتاج ہوں، مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ ہیں، اسی طرح اسباب سے مسببات متخلف بھی ہوسکتے ہیں، جیسے ابراہیم علیہ السلام کو آگ کا نہ جلانا بلکہ بردوسلام بن جانا۔

چوتھی مثال: قیامت کے دن جونشأۃ ثانیہ ہوگی وہ صرف روحانی نہیں ہوگی، بلکہ جسمانی ہوگی یعنی وہی جسم جو پہلی زندگی میں تھا، اس کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا، مشرکانہ، ملحدانہ اور فلسفیانہ ذہن اس کو قبول نہیں کرتا، وہ کہتے ہیں کہ جو چیز معدوم ہوگئی وہ دوبارہ سابق حالت کی طرف کیسے لوٹائی جاسکتی ہے؟ ان کے خیال میں معدوم کا اعادہ محال ہے، پس معاد جسمانی کا اثبات اس پر موقوف ہے کہ اعادۂ معدوم کے استحالہ کو باطل کیا جائے تا کہ معاد جسمانی کا امکان ثابت ہوسکے۔

اور صفات باری تعالیٰ کے تعلق سے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تین مسائل ذکر کئے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

صفت وہ لفظ ہے جو کسی ذات کے بعض احوال پر دلالت کرے، جیسے سرخ، سیاہ، نیک وبد وغیرہ صفات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو اسمائے حسنیٰ (اچھے نام) بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اور احادیث شریفہ میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات کا تذکرہ آیا ہے، ان میں سے سات صفتیں صفات ازلیہ اور صفاتِ حقیقیہ ہیں۔ اور وہ یہ ہیں (۱) حیات (۲) علم (۳) قدرت (۴) ارادہ (۵) سمع (۶) بصر (۷) کلام۔ ان کو صفاتِ ذاتیہ بھی کہتے ہیں یعنی وہ صفات جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کیا جاتا ہے اور ان کی اضداد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف نہیں کیا جاسکتا۔ باقی صفتیں صفاتِ فعلیہ ہیں یعنی ان کے ساتھ بھی اور ان کی اضداد کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کو متصف کیا جاتا ہے، جیسے رضی (خوش ہونا) اور سُخط (ناخوش ہونا) رحمت اور غضب وغیرہ۔ صفاتِ فعلیہ کو صفاتِ اضافیہ بھی کہتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات ایسی بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے مخلوق کے مشابہ ہونے کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ یہ صفات متشابہات یعنی مخلوق سے ملتی جلتی صفات کہلاتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا عرش (تخت) پر استواء یعنی جم کر بیٹھنا، جو قرآن

پاک کی سات سورتوں میں مذکور ہے اور اللہ تعالیٰ کا آسمان دنیا پر نزول (اترنا) جس کا صحیح حدیث میں ذکر ہے اور اللہ کا چہرہ اور ہاتھ وغیرہ ہونا جن کا تذکرہ قرآن میں بھی ہے اور بے شمار احادیث میں بھی۔ یہ سب صفات متشابہات کہلاتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہئے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صفات کے تعلق سے جو تین مسائل بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں:

پہلا مسئلہ: صفت سمع (سننا) اور صفت بصر (دیکھنا) بے شمار آیات واحادیث سے اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں اور تمام مسلمان ان کو مانتے ہیں، پھر ان میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں صفات حقیقیہ ہیں یا اعتباریہ؟ یعنی دونوں مستقل صفتیں ہیں یا صفت علم کی طرف راجع ہیں؟ ابوالحسین بصری، فلاسفہ اور کعبی کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں صفاتِ اعتباریہ ہیں، مسموعات یعنی قابل سماعت چیزوں کے جاننے کا نام صفت سمع ہے اور مبصرات یعنی قابل رویت چیزوں کے جاننے کا نام صفت بصر ہے۔ غرض حقیقی صفت علم ہے اور مخصوص چیزوں کے جاننے کا نام سمع وبصر ہے پس یہ دونوں صفتیں حقیقی نہیں ہیں، محض اعتباری ہیں اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ دونوں بھی صفت علم کی طرح مستقل اور حقیقی صفتیں ہیں۔

دوسرا مسئلہ: بعض صفاتِ اضافیہ کا ان کے حقیقی معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ پر اطلاق درست نہیں، جیسے صفت رحمان اور رحیم، رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت کے معنی رقّتِ قلب (دل کا پسیجنا) اور انعطاف (مائل ہونا) ہیں اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں۔ اس لئے ایسی صفات کا ذات باری پر اطلاق ان کے حقیقی معنی کے اعتبار سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے معانی کی غایات یعنی نتائج وآثار کے اعتبار سے اطلاق کیا جاتا ہے۔ رقت قلب اور انعطاف کا نتیجہ اور اثر انعام واحسان ہے پس اللہ کے رحمان ورحیم ہونے کا مطلب ہے انعام واحسان فرمانے والا۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کے لئے صفت حیات، علم، ارادہ، قدرت اور کلام (اور سمع وبصر) مانتے ہیں، پھر ان میں اختلاف ہوا ہے کہ کیا ان صفات کے حقیقی معنی مراد ہیں یا ان کے معانی کی غایات یعنی نتائج وآثار مراد ہیں؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صفات اضافیہ رحمت وغضب اور جود وسخا کی طرح مذکورہ بالا ساتوں صفات حقیقیہ کے بھی حقیقی معنی مراد نہیں، بلکہ ان کی غایات یعنی آثار وافعال مراد ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان ساتوں صفات کے حقیقی معنی مراد ہیں اور وہ معانی اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، اگر غایات مراد لی جائیں گی تو وہ صفاتِ حقیقیہ نہیں رہیں گی اضافیہ ہوجائیں گی یعنی مخلوق کے ساتھ ان کا تعلق ہوجائے گا جیسے انعام واحسان کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے۔

تیسرا مسئلہ: استواء علی العرش یعنی تخت شاہی پر جم کر بیٹھنا اور چہرہ اور ہنسنا وغیرہ صفات متشابہات کو تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے ہیں، کیونکہ بے شمار نصوص سے یہ صفات اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، پھر علماء میں اختلاف ہوا ہے، بعض لوگوں نے سلف کا طریقہ اختیار کیا اور وہ طریقہ تنزیہ مع التفویض ہے یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا استواء، چہرہ اور ہنسنا مخلوق کی صفات کی طرح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے مانند ہونے سے پاک ہیں، پھر ان صفات کا کیا مطلب ہے؟ تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردی جائے کہ ہم ان کلمات کی حقیقت نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ان کی

یہ صفات کیسی ہیں اوران کلمات کی کیا مراد ہے۔

اور بعض لوگوں نے خلف کا طریقہ اپنایا اور وہ طریقہ تنزیہ مع التاویل ہے یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات مخلوق کی صفات کی طرح نہیں، اور استواء بمعنی استیلاء اور غلبہ ہے یعنی چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے بذات خود ان کا کنٹرول سنبھالا اور چہرہ سے مراد ذات، اور ہاتھ سے مراد قوت ونصرت اور ہنسی سے مراد خوشی اور نزول سے مراد عنایات کا متوجہ ہونا ہے۔

لغات:

استفاض استفاضةَ الخبرُ: پھیلنا، حدیث مستفیض حدیث مشہور کو کہتے ہیں..... الغِرّ (مصدر) کپڑے یا کھال کی شکن، کہا جاتا ہے طویتُ الثوبَ علی غِرِّہ یعنی میں نے کپڑے کو اس کی پہلی سلوٹ پر لپیٹا..... علی حدّہ اور علی حِدَتہ کے معنی ہیں علحدہ حدَ کے معنی ہیں دو چیزوں کے درمیان روک۔

☆ ☆ ☆

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ اس دوسری قسم کے مسائل میں اگر کوئی شخص اختلاف کرتا ہے اور تفرد اختیار کرتا ہے تو وہ اہل السنہ سے خارج نہیں، اس لئے کہ اگر صحیح بات پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ ان مسائل میں سرے سے گفتگو ہی نہ کی جائے۔ جب صحابۂ کرام کا ایمان ان مسائل کو چھیڑے بغیر کامل بلکہ اکمل تھا تو آج ان مسائل میں گفتگو کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر حالات متقاضی ہیں کہ ان مسائل کو چھیڑا جائے تو پانچ باتیں ذہن میں رکھ لی جائیں:

(۱) یہ ضروری نہیں کہ اگلوں نے جو کچھ قرآن وحدیث سے مستنبط کیا ہے وہ صحیح یا راجح ہو، بلکہ بعد کے علماء کے استنباطات بھی صحیح یا راجح ہوسکتے ہیں۔

(۲) متکلمین نے جس مسئلہ کو کسی چیز پر موقوف سمجھا ہو، ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اس پر موقوف ہو، یہ صرف ان کا خیال بھی ہوسکتا ہے۔

(۳) اسی طرح جو بات متکلمین کے نزدیک مردود ہے، ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی مردود ہو، یہ صرف ان کی رائے بھی ہوسکتی ہے۔

(۴) اسی طرح ہر وہ مسئلہ جس میں علماء نے یہ سمجھ کر غور وفکر نہیں کیا کہ وہ بہت مشکل اور لاینحل ہے، ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی مشکل ہو۔ دوسرے حضرات غور وفکر کر کے وہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔

(۵) اسی طرح بعض علماء نے آیات واحادیث کی جو تفصیل وتفسیر کی ہے، ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کی تفصیل وتفسیر سے زیادہ قابل قبول ہو، علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں اور فَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔



فائدہ: چونکہ اہل حق ہونے نہ ہونے کا مدار پہلی قسم کے مسائل پر ہے، دوسری قسم کے مسائل پر نہیں، اس وجہ سے علمائے اہل سنت یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ قسم ثانی کے بہت سے مسائل میں باہم مختلف ہوئے ہیں۔ اور ماہر علماء ہر زمانہ میں ایسے حقائق ودقائق بیان کرتے رہے ہیں جو سنت کے یعنی اہل حق کے عقائد کے خلاف نہیں، چاہے متقدمین ان کے قائل نہ رہے ہوں۔

فائدہ: شاہ صاحبؒ نے دوسری قسم کے مسائل میں، اگر وہ مختلف فیہ ہیں، تو کسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ جادۂ اعتدال اپنایا ہے اور میانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ غرض آپ نے خود اپنی راہ بنائی ہے، کسی کی راہ نہیں لی۔

وهذا القسمُ لستُ أَسْتَصِحُ تَرْفَعُ إحدَى الفِرقتين على صَاحِبَتِها بأنها على السنة؛ كيف؟ وإن أُريد قُحُّ السنةِ فهو تركُ الخوض في هذه المسائل رَأْسًا، كما لم يَخُضْ فيها السلفُ.

ولَمَّا أن مَّسَّتِ الحاجةُ إلى زيادة البيان،فليس كلُّ ما استنبطوه من الكتاب والسنة صحيحًا أو راجحًا، ولاكلُّ ماحسِبَه هؤلاء متوقِّفًا على شيئ مسلَّمُ التوقف، ولا كلُّ ماأوجبوا ردَّه مسلَّمُ الردِّ، ولا كلُّ ماامتنعوا من الخوض فيه اسْتِصْعَابًا له صَعْبًا في الحقيقة، ولاكلُّ ما جاؤا به من التفصيل والتفسير أحَقُّ مما جاء به غيرُ هم.

ولَمَا ذكرنا من أن كونَ الإنسان سُنِّيًّا معتَبَرٌ بالقسم الأول،دون الثاني، ترى علماءَ السنة يختلفون فيما بينهم في كثير من الثاني، كالأشاعرة والماتريدية؛ وترى الحُذَّاقَ من العلماء في كل قَرْن لايَحْتَجِزُوْنَ من كل دقيقة لاتُخالفها السنةُ، وإن لم يقل بها المتقدمون.

وستَجِدُني إذَا تَشَعَّبَتْ بهم السُّبُلُ في الفروع والمذاهبُ، وَتَفَرَّقَتْ بهم الموارِدُ فيها والمشاربُ، لَجَجْتُ بالْجَادَةِ الْجَلِيَّةِ، وَحَقَّقْتُ القارعةَ القويةَ، وصِرْتُ لاأَلْوِي على الأطراف والْحَافَاتِ، وكنتُ في صَمَمٍ من التفاريع والتخريجات.

ترجمہ: اور یہ (دوسری) قسم: نہیں درست سمجھتا میں کہ برتر بنادے دو جماعتوں میں سے ایک کو اس کی سہیلی پر بایں طور کہ وہ سنت پر یعنی حق پر ہے، یہ بات کیسے ہوسکتی ہے؟ اور اگر آپ خالص سنت یعنی بالکل حق بات چاہتے ہیں تو وہ سرے سے ان مسائل میں نہ گھسنا ہے، جیسا کہ سلف ان مسائل میں نہیں گھسے ہیں۔

اور جب مزید وضاحت کی ضرورت پیش آئی (اور یہ مسائل چھیڑے گئے) تو (۱) نہیں ہے ہر وہ بات جو ان لوگوں نے قرآن وحدیث سے مستنبط کی ہے صحیح یا راجح ہو (۲) اور نہ ہر وہ بات جس کو ان لوگوں نے کسی چیز پر موقوف سمجھا اس کا موقوف ہونا مسلّم ہو (۳) اور نہ ہر وہ بات جس کو رد کرنا ان لوگوں کے نزدیک ضروری ہے اس کا مردود ہونا مسلّم ہو (۴)

اور نہ ہر وہ مسئلہ جس میں گھسنے سے وہ لوگ باز رہے ہیں، اس کو دشوار خیال کرتے ہوئے وہ حقیقت میں دشوار ہو (۵) اور نہ ہر وہ تفصیل وتفسیر جو وہ لوگ لائے ہیں، دوسرے لوگوں کی تفصیل وتفسیر سے زیادہ حقدار ہو۔

اور اُس بات کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے کہ آدمی کا سنی یعنی اہل حق ہونا قسم اول کے مسائل کے ساتھ موازنہ کیا ہوا ہے، قسم ثانی کے مسائل کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے اس وجہ سے آپ دیکھیں گے اہل حق کو کہ وہ باہم مختلف ہوئے ہیں دوسری قسم کے مسائل میں سے بہت سے مسائل میں جیسے اشاعرہ اور ماتریدیہ کا باہمی اختلاف، اور آپ دیکھیں گے ہر زمانہ میں ماہر علماء کو کہ وہ باز نہیں رہے ہیں ایسی باریک باتیں بیان کرنے سے جو طریقہ سنت کے خلاف نہیں ہیں، اگرچہ اگلے لوگ ان کے قائل نہ رہے ہوں۔

اور عنقریب آپ مجھ کو پائیں گے جب راہیں اور طریقے لوگوں کو جزئیات میں مختلف کر دیں گے، اور گھاٹیں اور پانی پینے کی جگہیں لوگوں کو فروعات میں متفرق کر دیں گی تو میں واضح راستہ سے چپکا رہونگا اور مضبوط روڈ کے بالکل بیچ میں چلونگا اور بالکل نہیں مڑونگا اطراف اور کناروں کی طرف، اور بہرہ بن جاؤنگا اصول سے نکالی ہوئی جزئیات اور تفریعات سے (یعنی اختلافی مسائل میں میانہ راستہ اختیار کرونگا اور افراط وتفریط سے بچ کر چلونگا اور کسی کی تقلید نہیں کرونگا)

لغات:

اِستَصَحَّ الکلامَ: صحیح پانا ..... أَستَصِحُّ: مضارع واحد متکلم ہے..... ترفعُ: کی ضمیر: القسم کی طرف عائد ہے، اور یہ قسم چونکہ بہت سے مسائل کا مجموعہ ہے، اس لئے فعل مؤنث لایا گیا ہے، بتاویل اقسام..... القُحّ: خالص، کہا جاتا ہے اعرابی قُحٌّ واعرابیۃ قُحّۃٌ: خالص عرب دیہاتی اور دیہاتن..... معتبر اسم مفعول ہے اعتبر به: قیاس کرنا، موازنہ کرنا..... اشاعرة: شیخ ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ (متوفی ۳۲۴ھ) کے متبعین کو کہتے ہیں اور ماتریدیه: شیخ ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ (متوفی ۳۳۳ھ) کے متبعین کو کہتے ہیں، ماترید ایک گاؤں کا نام ہے اور یہ دونوں علم کلام میں اہل حق کے مکاتب فکر ہیں، ان میں باہم قسم ثانی کے چند مسائل میں اختلاف ہے..... اِحْتَجَزَ به: رکنا، باز رہنا..... لِما ذکرنا من أن الخ میں من بیانیہ ما کا بیان ہے..... السبل جمع ہے السبیل کی بمعنی راہ اور المذاهب جمع ہے المذهب کی اس کے معنی بھی ہیں جانے کا راستہ اور المذاهب کا السبل پر عطف ہے..... تشعّب السبلُ: راستوں نے ان کو متفرق کر دیا یعنی لوگ مختلف راہوں پر پڑ گئے..... الموارد جمع ہے المورِد کی جس کے معنی ہیں گھاٹ، پانی کی طرف کا راستہ..... فیها کی ضمیر فروع کی طرف عائد ہے..... لَجَّ به: لازم رہنا..... الجادّة: سڑک کا درمیان ..... الجلیة: واضح ..... حَقُقْت، حاقُّ الطریق سے ہے جس کے معنی ہیں راستہ کا بیچ پس حَقُقْتُ کے معنی ہیں روڈ کے بیچ میں چلنا..... القارعة: عام راستہ القویة صفت ہے القارعة کی..... صِرْتُ فعل ناقص ہے.....لَوی یَلْوِی لَیًّا علیه: مڑنا..... اطراف جمع ہے طَرْف کی

بمعنی کنارہ اور الحافات جمع ہے الحافة کی، اس کے معنی بھی کنارہ کے ہیں حافُ اللسان: طَرَفُه (لسان العرب) ......صَمَّ (س) صَمَمًا: بہرہ ہونا ......تفاریع جمع ہے التفریع کی جس کے معنی ہیں اصول سے متفرع ہونے والا جزئیہ، یہی معنی التخریج کے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ہر فن کی ایک خصوصیت اور ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے

اور

دوسرے فن والوں پر اس فن کی قابل اعتماد بات کی پیروی ضروری ہے۔

جاننا چاہئے کہ ہر فن کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے، جس کا فن میں لحاظ رہنا چاہئے یعنی ہر فن میں وہی باتیں مناسب ہوتی ہیں جو اس فن سے تعلق رکھتی ہیں، ایک فن میں دوسرے فن کی غیر متعلقہ بحثیں چھیڑ دینا مناسب نہیں، کیونکہ ہر بات کا ایک موقعہ ہوتا ہے اور موقعہ ہی پر بات مناسب ہوتی ہے، مثلاً فن غریب الحدیث میں جو شخص کتاب لکھ رہا ہے اس کو حدیث کے مشکل الفاظ کے معانی ہی بیان کرنے چاہئیں، حدیث کی صحت وضعف سے بحث نہیں کرنی چاہئے اور ایک محدث جو فن حدیث میں کتاب لکھ رہا ہے اس کو حدیث کی اسانید اور ان کی صحت وضعف ہی سے بحث کرنی چاہئے، اس کو مسائل فقہیہ اور ان کی ترجیحات سے بحث نہیں کرنی چاہئے۔

اسی طرح جو شخص فن حکمت شرعیہ میں کتاب لکھ رہا ہے اس کو مذکورہ امور میں سے کسی چیز سے بحث نہیں کرنی چاہئے اس کی پوری توجہ ان اسرار ورموز کی طرف رہنی چاہئے جو احادیث میں مذکور احکام میں ملحوظ ہیں، خواہ حدیث میں مذکور حکم معمول بہ ہو یا منسوخ ہو گیا ہو، یا اس حکم کے معارض کوئی دوسری دلیل آگئی ہو جس کی وجہ سے فقیہ کی نظر میں وہ حکم مرجوح قرار پایا ہو، مثلاً مامَسَّتِ النار سے وضو کی روایت منسوخ ہے مگر یہ منسوخ حکم بھی کسی زمانہ میں معمول بہ رہا ہے، اس لئے علم اسرار الدین میں اس حکم کی حکمت بھی بیان کی جائے گی۔

البتہ جب ایک فن والا دوسرے فن سے استفادہ کرے تو ضروری ہے کہ اس فن میں جو بات راجح ہو اس کی پیروی کرے مثلاً ایک مفسر یا فقیہ اپنی کتاب میں کوئی حدیث نقل کرے تو وہی حدیث نقل کرے جو محدثین کے نزدیک قابل استدلال ہے، موضوع یا نہایت ضعیف روایت سے تمسک نہ کرے، اسی طرح فن حکمتِ شرعیہ کے مصنف کو اپنی کتاب میں وہی حدیثیں لانی چاہئیں، اور انہی حدیثوں کے اسرار ورموز بیان کرنے چاہئیں جو محدثین کے نزدیک صحیح یعنی قابل استدلال ہیں، موضوع روایات اور نہایت ضعیف روایات کو نہیں لینا چاہئے۔

رہی یہ بات کہ کونسی روایت کیسی ہے؟ اس سے فن حکمت شرعیہ میں بحث نہیں کرنی چاہئے، اس بارے میں فن حدیث کے ماہرین کی آراء کی پیروی کرنی چاہئے۔ لیکن اگر کہیں ضمناً اس قسم کی کوئی بات آجائے تو اس میں حرج بھی نہیں، اسی طرح اگر کہیں ضمناً مسائل فقہیہ زیر بحث آجائیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ اقرب الی الحق کی تحقیق اہل علم کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں، نہ اس کا مقصود کسی پر طعن ہے۔ آخر میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے پیش نظر حتی الامکان اصلاح ہے، مگر یہ بات توفیق خداوندی کے ذریعہ ہی ممکن ہے اس لئے میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں اور انہیں کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

فائدہ: فن حدیث میں سب سے زیادہ قابل اعتماد وہ کتابیں ہیں جو تدوین حدیث کے تیسرے دور میں تیار ہوئی ہیں، یعنی صحاح ستہ، مسند احمد وغیرہ، کیونکہ یہ کتابیں احادیث کی تنقیح کرکے مرتب کی گئی ہیں یعنی یہ جاننے کے بعد تیار کی گئی ہیں کہ کس روایت کا متابع ہے اور کون حدیث متفرد ہے، کس روایت کے رواۃ زائد ہیں اور کس کے کم، اور کس روایت کے رواۃ قوی ہیں اور کس کے ضعیف یہ تمام باتیں جان کر یہ مجموعے علی وجہ البصیرت مرتب کئے گئے ہیں، اس لئے یہی کتابیں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں، اور انہی کتابوں کی حدیثیں مشکوٰۃ شریف میں سندیں حذف کرکے لی گئی ہیں، اس لئے شاہ صاحب نے زیادہ تر حدیثیں مشکوٰۃ شریف سے لی ہیں۔

[لكل فن خاصةٌ، ولكل مقام مقالٌ، وعلى غيرهم اتباعُ بأحقِّ ماهنالك]

فاعلم أن لكل فن خاصَّةً، ولكل موطِن مقتضىً، فكما أنه ليس لصاحب غريب الحديث أن يبحث عن صحَّة الحديث وضُعْفه، ولا لحافظ الحديث أن يتكلم في الفروع الفقهية، وإيثارِ بعضها على بعض، فكذلك ليس للباحث عن أسرار الحديث أن يتكلم بشيئ من ذلك، إنما غايةُ همته ومطمَحُ بصره هو كشف السر الذى قصده النبي صلى الله عليه وسلم فيما قال، سواءً بقى هذا الحكم محكما، أوصار منسوخا، أو عارضه دليلٌ آخرُ، فوجب في نظر الفقيه كونه مرجوحا.

نعم، لامَحِيْصَ لكل خائض في فن أن يعتصم بأحقِّ ما هنالك بالنسبة إلى ذلك الفن، وإنما الأقرب من الحق باعتبار فن الحديث: ما خَلَص بعد تدوين أحاديث البلاد، وآثار فقهائها، ومعرفة المتابَع عليه من المتفرِّد به، والأكثرِ رواةً والأقوى رواية مما هو دون ذلك.

على أنه إن كان شيئ من هذا النوع استِطْراداً، فليس البحثُ عن المسائل الاجتهادية، وتحقيقُ الأقرب منها للحق، بِدْعًا من أهل العلم، ولا طَعْنًا في أحدمنهم ﴿إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الإِصْلَاحَ، مَااسْتَطَعْتُ، وَمَا تَوْفِيْقِىْ إِلَّا بِاللهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ، وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ﴾

ترجمہ: ہر فن کی ایک خصوصیت اور ہر موقعہ کے مناسب ایک بات ہوتی ہے اور دوسروں پر اس فن میں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد بات ہے اس کی پیروی ضروری ہے: پھر جان لیجئے کہ ہر فن کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور ہر جگہ کا کوئی تقاضا ہوتا ہے، پس جس طرح یہ بات ہے کہ فن غریب الحدیث کے مصنف کے لئے مناسب نہیں کہ وہ حدیث کی صحت وضعف سے بحث کرے، اور نہ ایک محدث کے لئے مناسب ہے کہ وہ مسائل فقہیہ کے بارے میں، اور بعض روایات کو بعض پر ترجیح دینے کے لئے گفتگو کرے، پس اسی طرح حدیث کے اسرار ورموز سے بحث کرنے والے کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کسی بھی چیز کے بارے میں گفتگو کرے، اس کی پوری توجہ اور اس کے پیش نظر اس راز کو کھولنا ہی ہونا چاہئے جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں قصد فرمایا ہے، خواہ وہ حکم محکم (معمول بہ) باقی ہو یا منسوخ ہو گیا ہو، یا اس کے معارض کوئی اور دلیل آگئی ہو جس کی وجہ سے مجتہد کی نظر میں وہ روایت مرجوح قرار پائی ہو۔

ہاں کوئی مفر نہیں کسی بھی فن میں گھسنے والے کے لئے اس بات سے کہ وہ اس چیز کو مضبوط پکڑے جو اس فن میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس فن کی بہ نسبت: اور سب سے زیادہ قابل اعتماد، فن حدیث کے اعتبار سے، وہی روایات ہیں جو چھٹ گئی ہیں علاقوں کی حدیثیں اور ان کے فقہاء کے فتاوی مرتب کرنے کے بعد، اور یہ جاننے کے بعد کہ کس روایت کی متابعت موجود ہے اور کونسی روایت متفرد ہے اور کس کے رُوات زیادہ ہیں اور کونسی روایت کے رواۃ زیادہ قوی ہے، ان سے جو اس سے فروتر ہیں (یعنی کس حدیث کے رواۃ کم ہیں، اور کس کے رُواۃ ضعیف ہیں)

علاوہ ازیں اگر اس نوع کی کوئی بات ضمناً چھڑ جائے تو مسائل اجتہادیہ سے بحث کرنا اور ان میں حق سے زیادہ قریب کی تحقیق کرنا اہل علم کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں ہے، اور نہ وہ ان علماء میں سے کسی پر اعتراض کرنا ہے، میرا ارادہ اصلاح ہی کا ہے، جہاں تک میرے بس میں ہے اور مجھے اس کی توفیق اللہ کی مدد ہی سے ہو سکتی ہے، انہی پر میں بھروسہ کرتا ہوں، اور انہی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

لغات:

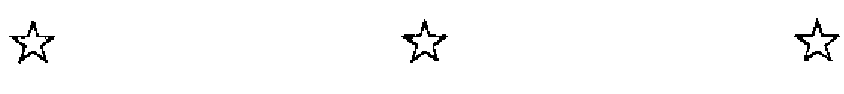
الموطِن: جگہ جمع المواطن...... الهِمّة: قصد، ارادہ، خواہش...... الغاية: آخری حد...... المطمَح: نگاہ پڑنے کی جگہ...... المحيص: بھاگنے کی جگہ، علحدہ ہونے کی جگہ حاص (ن) عن كذا: الگ ہونا، ہٹ جانا...... اعتصم به: ہاتھ سے پکڑنا...... خلص (ن) خُلوصًا: خالص ہونا...... استطراد: کلام کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسرا کلام لازم آئے...... البِدْعُ: انوکھا۔

تشریح:

(۱) کوئی انوکھی بات نہیں یعنی علماء ضمناً دوسری بحثیں کرتے ہی رہتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں۔

(۲) نہ وہ کسی پر اعتراض کرنا ہے مثلاً تسمیہ علی الوضوء کی روایت کے بارے میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس باب میں محدثین کے نزدیک کوئی روایت صحیح نہیں، تو یہ بات وجوب تسمیہ کے قائلین پر اعتراض کرنے کے لئے نہیں لکھی بلکہ اپنی تحقیق پیش کرنا مقصود ہے، اسی طرح کسی روایت کے تحت کوئی فقہی بحث چھڑ جائے اور فقہاء کی آراء میں سے کسی رائے کو شاہ صاحب ترجیح دیں تو وہاں بھی محض اپنی تحقیق پیش کرنا مقصود ہوتا ہے، کسی پر طعن مقصود نہیں ہوتا۔

(۳) علاقوں کی حدیثیں اور ان کے فقہاء کے فتاوی مرتب کرنے کے بعد یعنی پہلے علاقہ وار روایتیں مرتب کی گئی تھیں اور ہر علاقہ کے فقہاء کے فتاوی بھی ان کے ساتھ شامل کر لئے گئے تھے، بعد میں چھان بین کر کے حدیث شریف کے موجودہ مجموعے مرتب کئے گئے ہیں۔



مقدمۃ الکتاب کی آخری بات

دور سے یہ بحث چل رہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے اس کتاب میں جو تفردات اختیار کئے ہیں وہ پہلی قسم کے مسائل میں نہیں ہیں، دوسری قسم کے مسائل میں ہیں، اب فرماتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ پہلی قسم کے مسائل میں کسی آیت کے خلاف، یا معمول بہ حدیث کے خلاف یا قرون ثلاثہ کے اجماع کے خلاف یا اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک کے خلاف کوئی بات قلم سے نکل گئی ہو تو میں اس بات سے براءت ظاہر کرتا ہوں اور جو مجھے خواب غفلت سے بیدار کرے اس کے لئے دعا گو ہوں۔

البتہ متاخرین میں جو آپس میں بحثیں ہوئی ہیں اور ان میں اختلافات ہوئے ہیں تو ہم اس کے پابند نہیں کہ انہی کی لکیر پیٹیں، اور کیوں پیٹیں؟ وہ بھی تو انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں، ان میں کوئی سرخاب کا پر نہیں لگ رہا، دوسری قسم کے مسائل میں ان کی رائے بھی صحیح ہو سکتی ہے اور ہماری رائے بھی۔ کیونکہ معاملہ ہمارے اور ان کے درمیان کنویں کے ڈول کی طرح ہے، کبھی انہوں نے پہلے پانی بھر لیا تو کبھی ہم نے، کسی مسئلہ میں ان کی رائے صحیح ہو سکتی ہے تو کسی میں ہماری، اس لئے دوسری قسم کے مسائل میں ہمارے ذمہ لازم نہیں کہ ہم ہر بات میں ان کی موافقت کریں۔

وهاأنا بريءٌ من كل مقالةٍ صدرتْ مخالفةً لآية من كتاب الله، أو سنةٍ قائمة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، أو إجماع القرون المشهود لها بالخير، أو ما اختاره جمهورُ المجتهدين ومُعْظَم سواد المسلمين؛ فإن وقع شيئ من ذلك، فإنه خطأ؛ رحم الله تعالى من أيقظَنا من سِنَتنا أو نبَّهنا من غفلتنا.

أما هؤلاء الباحثون بالتخريج والاستنباط من كلام الأوائل، المنتحلون مذهبَ المناظرة

والمجادلة، فلايجب علينا أن نوافقهم في كل ما يَتفوَّهون به، فنحن رجال وهم رجال، والأمر بينا وبينهم سجال.

ترجمہ: اورسنو، میں بری ہوں ہراس بات سے جوقلم سے نکل گئی ہے کتاب اللہ کی کسی آیت کے خلاف، یا رسول اللہ ﷺ کی کسی معمول بہ حدیث کے خلاف، یاان قرون کے اجماع کے خلاف جن کیلئے خیریت کی گواہی دی گئی ہے، یااس رائے کے خلاف جس کو جمہور مجتہدین نے اورمسلمانوں کے سواد اعظم نے اختیار کیا ہے؛ پس اگرایسی کوئی بات نکل گئی ہوتو وہ چوک ہے، اللہ اس شخص پر مہربانی فرمائے جوہمیں اونگھ سے بیدار کرے اور ہماری غفلت پر ہمیں متنبہ کرے۔

رہے یہ لوگ جوبحثیں کرنے والے ہیں متقدمین کے کلام سے تخریج واستنباط کے ذریعہ، جومناظرہ اورمجادلہ کی راہ اپنانے والے ہیں، تو ہم پر ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہراس بات میں موافقت کریں جوانھوں نے کہی ہے پس ہم بھی آدمی ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں اور معاملہ ہمارے اور ان کے درمیان کنویں کی طرح ڈول ہے۔

لغات:

ھَا حرف تنبیہ ہے جیسے ﴿هَاأَنتُمْ هٰؤُلاَءِ﴾ (سورۂ محمد آیت ۳۸)...... قائمۃ: کھڑی ہونے والی، برقرار یعنی معمول بہا، غیرمنسوخ ...... المشهود لها بالخير میں متفق علیہ حدیث کی طرف اشارہ ہے یعنی خير أمتي قرني ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم الخ (مشکوٰۃ ح۶۰۰۱)...... مُعْظَم الشيئ: چیز کا بڑا حصہ جمع معاظم...... السواد: بہت تعداد...... انتحل مذهبَ كذا: منسوب ہونا، اختیار کرنا...... المناظرة یہاں بمعنی المجادلة ہے یعنی حق یا ناحق اپنی بات پراڑارہنا...... تفوَّہ بكذا: بولنا۔

تشریح:

پرانے زمانہ میں گاؤں کے کنویں پر ایک دوبالٹیاں رکھی رہتی تھیں جوشخص پہلے کنویں پر پہنچتا وہ پہلے پانی بھرتا اور جو بعد میں آتا وہ انتظار کرتا، اسی طرح کسی مسئلہ میں دوسرے علماء کی رائے صحیح ہوسکتی ہے تو کسی مسئلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے صحیح ہوسکتی ہے۔

☆ ☆ ☆



کتاب کے مضامین کی اجمالی فہرست

بہت قدیم زمانہ میں کتابوں میں فہرست مضامین لکھنے کا طریقہ نہیں تھا، کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابیں فہرست مضامین سے خالی ہوتی تھیں، وہ کتابیں ساری پڑھنی پڑتی تھیں، اور مسائل کا موقع محل یاد رکھنا پڑتا تھا۔ پھر ترقی ہوئی اور مصنفین



مقدمۃ الکتاب لکھنے لگے، جس میں علاوہ دیگر باتوں کے مختصر فہرست مضامین بھی ہوتی تھی، جس سے گونہ سہولت ہوگئی اور مطلوبہ مسئلہ نکالنا آسان ہوگیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی مقدمۃ الکتاب کے آخر میں کتاب کے مشمولات کی اجمالی فہرست دے رہے ہیں۔

پھر اور ترقی ہوئی اور اردو کتابوں کے شروع میں اور عربی کتابوں کے آخر میں مصنفین یا ناشرین مستقل تفصیلی فہرست مضامین شامل کتاب کرنے لگے۔ جس سے بہت سہولت ہوگئی، پھر مزید ترقی ہوئی اور متنوع فہارس مرتب ہونے لگیں جیسے فہرست آیات، فہرست احادیث، فہرست اشعار، فہرست اشخاص، فہرست اماکن اور فہرست مضامین وغیرہ، تا آنکہ فہرستوں کی بھی فہرست ضروری ہوگئی اور بعض عربی کتابوں میں تو مور سے دُم بڑھ گئی، یہ سب انڈکس غیر ضروری ہیں، ان سے خواہ مخواہ کتاب کی قیمت بڑھ جاتی ہے، انکو ڈسک میں رکھ دینا چاہئے، ہاں ضروری فہرستیں ناگزیر ہیں، جیسے تفصیلی فہرست مضامین جو پوری کتاب کا آئینہ ہو، اسی طرح متنوع اور متفرق مضامین والی کتاب میں حروف ابجد سے فہرست مضامین وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عام طور پر مقدمۃ الکتاب میں سادہ انداز میں مجمل فہرست مضامین دی جاتی ہے کہ اس کتاب میں اتنے ابواب، اتنی فصول اور یہ یہ مضامین ہیں، مگر بڑوں کی بات اور ہے، شاہ صاحبؒ فہرست ابواب بھی مدلل بیان کررہے ہیں، اس لئے پہلے سادہ طریقہ پر فہرست مضامین دی جاتی ہیں، پھر شاہ صاحبؒ کی بات پیش کی جائے گی۔

حجۃ اللہ البالغہ مقدمۃ الکتاب کے علاوہ دو قسموں پر مشتمل ہے قسم اول میں قواعد کلیہ ہیں اور قسم ثانی میں احادیث کے اسرار ورموز کا بیان ہے اور قسم اول میں سات مباحث اور ایک تتمہ ہے، جن میں چوراسی ابواب اور مبحث خامس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

مبحث اول: تکلیف ومجازات کے اسباب کے بیان میں ہے یعنی اللہ نے اپنی بے شمار مخلوقات میں سے انسان ہی کو احکام شرعیہ کا مکلّف کیوں بنایا ہے؟ اور انسان ہی کے لئے جزاؤ سزا کیوں ہے؟ اس مبحث میں تیرہ ابواب ہیں۔

مبحث ثانی: دنیا اور آخرت میں مجازات کی کیفیت کے بیان میں ہے یعنی دنیا میں، قبر میں، میدان حشر میں اور آخرت میں جزاؤ سزا کی کیا کیا شکلیں ہوں گی؟ اس مبحث میں چار ابواب ہیں۔

مبحث ثالث: ارتفاقات کے بیان میں ہے یعنی دنیا میں آسائش کے ساتھ رہنے کے لئے کیا کیا تدبیرات نافعہ اور مفید اسکیمیں ہوسکتیں ہیں، اس مبحث میں گیارہ ابواب ہیں۔

مبحث رابع: سعادت (نیک بختی) کے بیان میں ہے یعنی نوع انسانی کی نیک بختی کیا ہے؟ اور اس کے لئے کیا کیا اعمال ضروری ہیں؟ اور شقاوت (بدبختی) کیا ہے؟ اور وہ کن باتوں کا نتیجہ ہوتی ہے؟ اس مبحث میں سات ابواب ہیں۔

مبحث خامس: نیکی اور گناہ کی حقیقت کے بیان میں ہے۔ اس مبحث کے شروع میں ایک مقدمہ ہے اور اس میں

سترہ ابواب ہیں۔(رحمۃ اللہ الواسعہ جلد اول میں انہی پانچ مباحث کی شرح آئی ہے)

مبحث سادس: ملی سیاست کے بیان میں ہے یعنی مذہبی حکومت کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟ وہ لوگوں کو کس کس طرح سنوارے گی؟ اس مبحث میں اکیس ابواب ہیں۔

مبحث سابع: احادیث سے قوانین شرعیہ مستنبط کرنے کے بیان میں ہے، یعنی قانون اسلامی قرآن وحدیث سے کیسے مستنبط کیا جاتا ہے؟ اس کے لئے اصول وضوابط کیا ہیں؟ اور طریقہ کار کیا ہے؟ اس مبحث میں سات ابواب ہیں۔

آخر میں تتمہ ہے، جس میں شاہ صاحبؒ نے اپنا رسالہ الإنصاف فی سبب الاختلاف پورا درج کر دیا ہے یہ رسالہ علحدہ بھی طبع ہو چکا ہے اور بعض مضامین اپنے ایک اور رسالے عِقد الجِید فی الاجتهاد و التقلید سے لئے ہیں اور بعض مضامین نئے ہیں، اس تتمہ میں چار ابواب ہیں۔(رحمۃ اللہ الواسعہ کی جلد دوم میں ان شاء اللہ ان دو مباحث کی شرح آئے گی)

اور قسم ثانی میں احادیث کی شرح کی ہے، مگر یہ شرح رموز واسرار کی حد تک محدود ہے، سب سے پہلے ابواب الایمان کی حدیثوں کی شرح کی ہے، پھر ابواب الاعتصام بالکتاب والسنہ کی، پھر ابواب الطہارہ کی، پھر ابواب الصلاۃ کی، پھر ابواب الزکاۃ کی، پھر ابواب الصوم کی، پھر ابواب الحج کی، پھر ابواب الاحسان یعنی ابواب الزہد (تصوف) کی، پھر ابواب ابتغاء الرزق (ابواب المعاملات) کی، پھر ابواب تدبیر المنزل کی، پھر ابواب سیاسۃ المُدُن کی، پھر ابواب المعشیۃ کی اور آخر میں سیرت نبوی، فتن اور مناقب کی روایات کی شرح کی ہے۔

اب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع کی جاتی ہے: فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب دو قسموں پر تقسیم کی ہے، پہلی قسم میں قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ کا بیان ہے۔ قاعدہ: اس اصل کو کہتے ہیں جو ایک باب کے مضامین اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو اور قاعدہ کلیہ اس اصل کو کہتے ہیں جو مختلف ابواب کے مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو، بالفاظ دیگر: قاعدہ دو چار جزئیات پر مشتمل ہوتا ہے اور قاعدہ کلیہ کے تحت بہت سی جزئیات آتی ہیں۔

غرض قسم اول میں قواعد کلیہ کا بیان ہیں، اگر ان کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو شرائع یعنی قوانین خداوندی میں جو حکمتیں اور مصلحتیں ملحوظ ہیں وہ مرتب شکل میں ذہن نشین ہو جائیں گی اور ان کے اسرار ورموز کو بہت آسانی سے سمجھا جا سکے گا۔

رہی یہ بات کہ ان قواعد کلیہ کا مأخذ کیا ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ ان میں سے بیشتر قواعد تو نزول قرآن کے وقت موجود مذاہب وملل والوں کے درمیان مسلّم تھے، ان کے بارے میں اہل ملل میں کوئی اختلاف نہیں تھا یعنی یہ سب اجماعی قاعدے ہیں، اور اجماع بذات خود ایک مأخذ ہے، اور یہ ضوابط اتنے مشہور تھے کہ صحابہ کو ان کے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی، اس لئے آپ ﷺ نے وہ ضابطے بیان نہیں فرمائے، بلکہ ان ضابطوں کو بنیاد بنا کر ان پر مسائل متفرع فرمائے ہیں۔ البتہ جزئیات بیان کرتے وقت ان اصولوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جیسے بلی کے جھوٹے کا حکم بیان کرتے ہوئے

ارشاد فرمایا: ﴿إنها من الطّوافين عليكم أو الطوافات﴾ (بلی ہروقت گھر میں آنے جانے والے لوگوں میں سے ہے یا فرمایا کہ وہ ہروقت گھر میں آنے جانے والے جانوروں میں سے ہے)

اس ارشاد میں اس ضابطہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ''حرج اور تنگی سے احکام میں سہولت پیدا ہوتی ہے'' (المشقة تجلب التيسير) غرض جزئیات بیان کرتے ہوئے جس طرح طے شدہ ضوابط کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اسی طرح آپ ﷺ بھی اصول کی طرف اشارہ فرماتے تھے اور صحابہ دوسری جزئیات کو اس ضابطہ کی طرف لوٹا دیتے تھے کیونکہ عربوں میں، جو ملت اسماعیلیہ کی طرف منسوب تھے، اور یہود ونصاری اور مجوس میں ان کی نظائر رائج تھیں اور صحابہ ان سے واقف تھے اور ان کو اس کی خوب مشق تھی، اس لئے ان اصول کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی، بس آنحضور ﷺ کا اشارہ کافی تھا۔

آگے فرماتے ہیں کہ جب میں نے غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ قوانین شرعیہ کی حکمتیں سمجھنے کے لئے پہلے دو بنیادی باتیں سمجھنی ضروری ہیں:

ایک: نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ جب تک ان دو باتوں کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئے گی احکام کے اسرار ورموز نہیں سمجھے جاسکتے۔

دوسری: مذہبی حکومت کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں؟ کیونکہ قوانین شرع کا بڑا حصہ اسی سے متعلق ہے۔

اس لئے قسم اول میں یہ دو بحثیں ضروری ہوئیں ایک مبحث البر والاثم، دوم: مبحث سیاست ملیہ۔

پھر میں نے غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے پہلے تین چیزیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اول: مجازات کی بحث یعنی انسانوں ہی کے لئے جزاؤ سزا کیوں ہے؟ کیونکہ جب مجازات کی وجہ سمجھ میں آئے گی تبھی نیکی اور گناہ کا سوال پیدا ہوگا، اگر مجازات نہ ہو تو تمام اعمال یکساں ہوں گے، جیسے جانوروں کے لئے نہ کوئی نیکی ہے نہ کوئی گناہ۔

دوم: ارتفاقات کی بحث یعنی آسائش سے زندگی گذارنے کے لئے مفید تدبیریں کیا ہیں اور مضر باتیں کیا ہیں؟ جو مفید باتیں ہیں وہ نیکی کے دائرہ میں آتی ہیں اور مضرت رساں امور گناہ ٹھہرتے ہیں۔

سوم: سعادت نوعیہ کی بحث یعنی نوع انسانی کی نیک بختی کیا ہے اور بدبختی کیا ہے؟ نیک بختی کن باتوں سے حاصل ہوتی ہے اور بدبختی تک کونسی باتیں پہنچاتی ہیں؟ دارین کی فلاح ونجاح کیسے حاصل کی جائے اور خسران سے کیسے بچا جائے؟ جو باتیں سعادت کا سبب ہیں وہی نیک کام ہیں اور اسباب شقاوت گناہ ہیں۔

پھر میں نے غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ پانچوں مباحث چند ایسے مسائل پر موقوف ہیں جن کو اس فن میں آنکھ بند کر کے مان لینا چاہئے، ان کی علتوں سے بحث نہیں کرنی چاہئے، ورنہ بات بہت دور جا پڑے گی۔ اور ان کو بچند وجوہ

مانا جاسکتا ہے۔ جو درج ذیل ہیں۔

(۱) یا تو وہ باتیں اس لئے مان لی جائیں کہ تمام ملل و مذاہب والے ان پر متفق ہیں، اور اس درجہ متفق ہیں کہ وہ باتیں ''مسلمات مشہورہ'' میں داخل ہوگئی ہیں، پھران کے دلائل وعلل اور لِمَ سے بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۲) یا وہ باتیں اس لئے مان لی جائیں کہ جس معلم نے وہ باتیں ہمیں سکھائی ہیں اس کے ساتھ حسن ظن ہے کہ وہ سچا ہے، وہ غلط بات بیان نہیں کرسکتا یعنی وہ باتیں قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں آئی ہیں، جن کے صدق پر ہمارا ایمان ہے۔

(۳) یا وہ باتیں اس لئے مان لی جائیں کہ وہ ایک دوسرے فن میں، جو اس فن سے اعلیٰ ہے، مدلل ہو چکی ہیں یعنی وہ مسائل فلسفۂ تصوف میں زیر بحث آچکے ہیں اور وہاں وہ مدلل کئے جا چکے ہیں، پس جسے دلائل دیکھنے ہوں وہاں دیکھے، یہاں تو ان کو مسلم باتوں کی طرح ذکر کیا جائے گا۔

غرض اس قسم کے تمام مسائل مبحث اول میں ذکر کئے جائیں گے مگر نفس اور اس کے احوال سے تفصیلی بحث نہیں کی جائے گی، کیونکہ فلسفۂ تصوف میں اس پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے اور دیگر مسائل بھی تفصیل سے ذکر نہیں کئے جائیں گے، صرف وہ باتیں بیان کی جائیں گی جو دوسرے علماء کی کتابوں میں یا تو سرے سے نہیں ہیں یا اس ترتیب سے نہیں ہیں اور وہ تفریعات نہیں ہیں جو شاہ صاحب نے ذکر کی ہیں، اسی طرح مسلم باتوں میں سے بھی صرف وہ باتیں بیان کی جائیں گی جن سے دوسرے علماء نے تعرض نہیں کیا، اسی طرح ان مسائل کے دلائل نقلیہ بیان کرنے کا بھی بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا۔

الغرض یہ مبحث اول کے مسائل ہیں، پھر مبحث دوم میں مجازات کی کیفیت کا بیان ہے اور مبحث سوم میں ارتفاقات کی بحث ہے اور چہارم میں انسان کی نوعی سعادت وشقاوت کا بیان ہے اور پنجم میں نیکی اور گناہ کے اصول ذکر کئے گئے ہیں اور ششم میں سیاست ملی کا بیان ہے اور مبحث ہفتم میں نصوص سے قوانین مستنبط کرنے کا طریقہ ذکر کیا گیا ہے۔

اور قسم دوم میں احادیث کے اسرار ورموز ذکر کئے گئے ہیں، پہلے باب الایمان کی احادیث کی شرح کی گئی ہے، پھر ابواب العلم کی (غالبًا یہ سبقت قلم ہے کیونکہ کتاب میں ابواب العلم کی احادیث کی شرح نہیں ہے بلکہ ابواب الاعتصام کی احادیث کی شرح ہے) پھر ابواب الطہارۃ کی الخ۔

اب مقدمۃ الکتاب کے مضامین پورے ہوئے، آگے کتاب شروع ہوگی۔

ثم إنی جعلتُ الکتاب علی قسمین:
أحدهما: قسم القواعد الکلّیة، التی تنتظِم بها المصالحُ المرعیةُ فی الشرائع؛ وأکثرُها کانت مسلَّمَةً بین المِلَل الموجودة فی عهد النبی صلی الله علیه وسلم، ولم یکن فیها اختلاف بینهم، وکان الحاضرون مستغنین عن سؤالها، فنبَّهَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم علیها، کما یُنَبِّهُ علی الأصول المفروغ عنها عند إفادة الفروع، فتمکّن السامعون من إرجاع الفروع إلیها، لِمَا مارسوا

من نظائرها في العرب المنتسبين إلى الملة الإسماعيلية، واليهودِ والنصارى والمجوس.

ورأيتُ أن تفاصيلَ أسرار الشرائع ترجع إلى أصلين: مبحثِ البِرِّ والإثم، ومبحثِ السياسات الملية.

ثم رأيت البرَّ والإثمَ لاتُكْتَنَهُ حقيقتُهما إلا بأن يُعرف قبلَهما مباحثُ المجازاة والارتفاقات والسعادة النوعية.

ثم رأيت هذه المباحث تتوقّف على مسائل، تُسلَّم في هذا العلم، ولا يُبحث عن لِمِّيَّتِها: فإما أن تُصدَّقَ بها لاتفاق الملل عليها، حتى صارت من المشهورات، أو لحسنِ الظن بالمعلِّم، أو لدلائلَ تُذكر في علم أعلى من هذا العلم.

وأعرضتُ عن الإطالة في إثبات النفس وبقائها، وتنعُّمها وتألُّمِها بعد مفارقة الجسد، لأنه مبحثٌ مفروغٌ عنه في كتب القوم.

وماذكرتُ من هذه المباحث إلا مارأيتُ الكتب التي وقعت إليَّ خاليةً عن الكلام فيه أصلاً، أو عن التفريع والترتيب اللذَيْن وُفِّقت لاستخراجهما؛ ولا من المسلَّمات إلا مارأيتُ القوم لم يتعرضوا له، ولا لإيراد الدلائل السمعية عليه كثيرَ تعرُّضٍ.

فلا جَرَمَ أني أذكر في هذا القسم مسائلَ، يجب أن تُصدَّق بها في هذا الفن من غير تعرُّضٍ لِلِمِّيَّتِهَا، ثم كيفيةَ المجازاة في الحيٰوة وبعد الممات، ثم الارتفاقاتِ التي جُبل عليها بنو آدم، ولم يُهْمِلْها قط عربُهم ولا عجمُهم، من جهة ما أوجبته عقولُهم، ثم بيانَ سعادة الإنسان وشقاوته بحسب النوع، وبحَسَب ما يظهر في الآخرة، ثم أصولَ البر والإثم التي تَوَارَدَ عليها أهلُ الملل، ثم ما يجب عند سياسة الأمة من ضرب الحدود والشرائع، ثم كيفيةَ استنباط الشرائع من كلام النبي صلى الله عليه وسلم، وتَلَقِّيهَا عنه.

والقسم الثاني في شرح أسرار الأحاديث من أبواب الإيمان، ثم من أبواب العلم، ثم من أبواب الطهارة، ثم من أبواب الصلاة، ثم من أبواب الزكاة، ثم من أبواب الصوم، ثم من أبواب الحج، ثم من أبواب الإحسان، ثم من أبواب المعاملات، ثم من أبواب تدبير المنازل ثم من أبواب سياسة الْمُدُن، ثم من أبواب آداب المعيشة، ثم من أبواب شتّٰى؛ وهذا أوانُ الشروع في المقصود، والحمد لله أولاً وآخِرًا.

ترجمہ: پھر بیشک میں نے کتاب کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے:

ان میں سے ایک: ان قواعد کلیہ کی قسم ہے جن کے ذریعہ مرتب ہوجاتی ہیں وہ مصلحتیں جو احکام خداوندی میں ملحوظ ہیں، اوران میں سے بیشتر تسلیم شدہ تھیں اُن مذاہب کے درمیان جو نبی کریم ﷺ کے دور میں موجود تھے۔ اوران میں ان قواعد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا، اور موجودین بے نیاز تھے ان کے بارے میں سوال کرنے سے، پس تنبیہ کی نبی کریم ﷺ نے ان قواعد پر، جس طرح تنبیہ کی جاتی ہے جزئیات بیان کرتے وقت ان اصول پر جن سے بحث ہوچکی ہو۔ پس سننے والے قادر ہوگئے جزئیات کو ان قواعد کی طرف لوٹانے پر، ان میں مہارت پیدا ہوجانے کی وجہ سے ان کے نظائر سے جو ان عربوں میں رائج تھیں جو ملت اسماعیلیہ کی طرف منسوب تھے اور یہود ونصاریٰ اور مجوس میں رائج تھیں۔

اور دیکھا میں نے کہ قوانین شرعیہ کے رموز کی تفصیلات دو بنیادوں کی طرف لوٹتی ہیں ایک نیکی اور گناہ کی بحث دوسری مذہبی سیاست کی بحث۔

پھر دیکھا میں نے کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت نہیں سمجھی جاسکتی مگر اس طرح کہ ان دونوں بحثوں سے پہلے پہچان لی جائے مجازات کی بحث اور ارتفاقات کی بحث اور سعادت نوعیہ کی بحث۔

پھر دیکھا میں نے کہ یہ مباحث موقوف ہیں چند ایسے مسائل پر جو مان لئے جائیں اس علم میں، اور نہ بحث کی جائے ان کی علت سے، پس یا تو یہ کہ ان کو مان لیا جائے مذاہب کے ان پر اتفاق کرنے کی وجہ سے، یہاں تک کہ ہوگئے ہیں وہ مشہور باتوں میں سے، یا معلّم کے ساتھ حسن ظن کی بناء پر، یا ایسے دلائل کی وجہ سے جو ذکر کئے گئے ہیں ایک ایسے علم میں جو اس علم سے برتر ہے۔

اور میں نے اعراض کیا ہے لمبی گفتگو کرنے سے نفس کے اثبات میں، اور جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے باقی رہنے میں اور راحتیں پانے میں اور تکلیفیں اٹھانے میں، اس لئے کہ اس بحث سے نمٹا جاچکا ہے علماء کی کتابوں میں۔

اور نہیں ذکر کیا ہے میں نے ان مباحث میں سے مگر ان باتوں کو کہ دیکھا میں نے ان کتابوں کو جو مجھ تک پہنچی ہیں بالکل خالی ان مسائل میں گفتگو سے، یا اس تفریع وترتیب سے خالی جن کو نکالنے کی مجھے توفیق دی گئی ہے، اور مسلمہ باتوں میں سے نہیں ذکر کیا ہے میں نے مگر ان باتوں کو کہ دیکھا میں نے علماء کو کہ نہیں تعرض کیا ہے انھوں نے ان باتوں سے، اور ان مسائل پر دلائل نقلیہ پیش کرنے سے بھی میں نے بہت زیادہ تعرض نہیں کیا۔

پس البتہ ذکر کرونگا میں اس قسم میں (یعنی مبحث اول میں) ایسے مسائل کو جن کو مان لینا ضروری ہے اس فن میں، ان کی وجہ سے تعرض کئے بغیر، پھر ذکر کرونگا میں دنیوی زندگی میں اور مرنے کے بعد جزاؤ سزا کی کیفیت کو، پھر ان ارتفاقات کو جن پر انسانوں کی تخلیق ہوئی ہے (یعنی وہ انسان کی فطرت میں داخل ہیں) اور کبھی بھی ان مفید اسکیموں کو بے کار نہیں چھوڑا عربوں نے اور نہ عجمیوں نے، اس وجہ سے کہ ان مفید اسکیموں کو ان کی عقلوں نے ثابت کیا ہے، پھر ذکر کروں گا میں انسان کی سعادت وشقاوت کی تفصیل کو، نوع کے اعتبار سے، اور آخرت میں ظاہر ہونے کے اعتبار

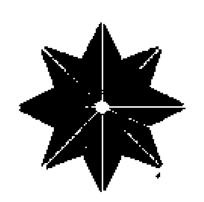
سے، پھر نیکی اور گناہ کے وہ اصول بیان کرونگا جن پر تمام مذاہب متفق ہیں، پھر وہ باتیں بیان کرونگا جو ملک کے نظم وانتظام کے لئے ضروری ہیں یعنی سزائیں اور قوانین مقرر کرنا، پھر حضور اکرم ﷺ کے کلام سے قوانین شرعیہ کو مستنبط کرنے کا طریقہ ذکر کرونگا اور ان قوانین کو حضور سے حاصل کرنے کا طریقہ سمجھاؤں گا۔

اور دوسری قسم ان احادیث کے رموز کی وضاحت میں ہے جو ایمان سے تعلق رکھتی ہیں، پھر ان حدیثوں کی وضاحت ہے جو علم سے تعلق رکھتی ہیں، پھر پاکی سے تعلق رکھنے والی، پھر نماز، پھر زکوۃ، پھر روزہ پھر حج پھر تصوف پھر معاملات پھر گھریلو زندگی پھر شہری سیاست پھر معیشت پھر متفرق مضامین سے تعلق رکھنے والی روایات کی شرح ہے۔

اور یہ مقصود کو شروع کرنے کا وقت آگیا اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ابتداء میں بھی اور انتہاء میں بھی۔

لغات:

اِنتَظَمَ اللؤلؤ: ترتیب وار ہونا انتظم الأمر: منضبط ہونا...... المرعية اسم مفعول ہے، ملحوظ رکھی ہوئی، رعایت کی ہوئی...... مارسَ مِرَاسًا وممارسة الأمر: مشق کرنا، مہارت پیدا کرنا...... اِكْتَنَهَ الشيَ: حقیقت کو پہنچنا...... لا جرمَ اور لاجُرمَ تحقیق کے لئے آتے ہیں بمعنی البتہ، یقیناً، اور کبھی قسم کیلئے ہوتے ہیں...... ساس يسوس سِياسة الدواب: دیکھ بھال رکھنا، سدھانا سَاسَ القومَ: امور کی تدبیر وانتظام کرنا السياسات الملية: مذہبی حکومت، حکومت الٰہیہ۔



پہلی قسم

قواعد کلیہ کے بیان میں

مبحث اول

تکلیف شرعی اور جزاؤ سزا کے بیان میں

مبحث اول

تکلیف شرعی اور جزاء وسزا کے بیان میں

باب (۱) صفتِ ابداع، خلق اور تدبیر کا بیان

باب (۲) عالَم مثال کا بیان

باب (۳) ملأ اعلیٰ (مقرب فرشتوں) کا بیان

باب (۴) سنتِ الٰہی کا بیان

باب (۵) روح کی حقیقت و ماہیت کا بیان

باب (۶) انسان کے مکلّف ہونے کا بیان

باب (۷) انسان کا مکلّف ہونا عالَم کی پلاننگ میں داخل ہے

باب (۸) تکلیف شرعی جزاوسزا کو چاہتی ہے

باب (۹) اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی فطرت مختلف بنائی ہے

باب (۱۰) عمل کا باعث بننے والے خیالات کے اسباب

باب (۱۱) عمل کا نفس سے وابستہ ہونا اور اس کا ریکارڈ کیا جانا

باب (۱۲) اعمال کا ملَکات سے جوڑ

باب (۱۳) مجازات کے اسباب کا بیان

پہلی قسم

قواعد کلیہ کا بیان

پہلے قاعدہ اور قاعدہ کلیہ کا مطلب بیان کیا جاچکا ہے اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ حجۃ اللہ کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم میں وہ قواعد کلیہ بیان کئے گئے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر احکام شرعیہ میں ملحوظ مصلحتوں کو سمجھا جاسکتا ہے اس قسم میں سات مباحث اور ستر باب ہیں۔

سوال: یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے؟ قسم اول میں تو چوراسی ابواب ہیں اور مبحث خامس کے شروع میں ایک مقدمہ اور تتمہ کے آخر میں ایک طویل فصل بھی ہے پس کل چھیاسی ابواب ہوئے؟

جواب: شروع میں شاہ صاحب کا ارادہ اتنے ہی ابواب لکھنے کا ہوگا، بعد میں ابواب بڑھ گئے، علاوہ ازیں تتمہ بعد میں بڑھایا ہے پس اس کے چار ابواب اور ایک فصل اس میں شامل نہیں، مگر پھر بھی اسّی یا اکیاسی ابواب ہوتے ہیں۔ پس اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ بعض فصلوں کو اور بعض ذیلی مضامین کو باب بنادیا گیا ہے اس لئے یہ تعداد بڑھ گئی ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

سوال: ٹھیک ہے بعد میں ابواب بڑھ گئے، مگر پیچھے لکھا ہوا مصنف نے کاٹ کر ٹھیک کیوں نہیں کیا؟

جواب: کہتے ہیں کہ شاہ صاحب قدس سرہ نے کتاب کا مسودہ چھوڑا تھا، مبیضہ تیار کرنے کا آپ کو موقعہ نہیں ملا تھا، اگر تبیض کرتے تو ضرور اصلاح کرتے مگر اس کا موقعہ نہیں ملا، اس لئے پہلے جو لکھ دیا وہی رہ گیا۔

مگر یہ جواب کمزور ہے، کیونکہ یہ بات صحیح نہیں کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے کتاب کا مسودہ چھوڑا تھا اور کتاب کی تبیض کا موقعہ آپ کو نہیں ملا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ کراچی کا مخطوطہ ۱۱۵۹ھ کا مرقومہ ہے، اور طلبہ نے اس کو شاہ صاحب رحمہ اللہ سے پڑھا ہے اور ۱۱۶۲ھ میں درس پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ نیز قسم اول کے آخر میں تتمہ اور کتاب کے آخر میں ابواب شتّی آپ نے بعد میں بڑھائے ہیں۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ شاہ صاحب نے کتاب کا مسودہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ تتمہ کے ابواب تو اس میں شامل نہیں اور کاتب نے یا ناشر نے بعض ذیلی مضامین کو مستقل باب بنادیا اس لئے تعداد بڑھ گئی مثلاً مبحث خامس کا باب (۱۵) مخطوطہ برلین اور پٹنہ میں باب (۱۴) میں داخل ہے اور مطبوعہ نسخہ میں اس کو مستقل باب بنایا گیا ہے۔

مبحث اول

تکلیف شرعی اور جزاؤ سزا کے اسباب کا بیان

اس مبحث میں تیرہ ابواب ہیں اور اس پورے مبحث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔

ایک: انسان کو مکلف کیوں بنایا گیا ہے؟ اس کے اسباب اور وجوہ کیا ہیں؟ اللہ کی بے شمار مخلوقات زمین میں پھیلی ہوئی ہیں، کسی کو مکلف نہیں بنایا، صرف انسانوں کو کیوں مکلف بنایا؟

دوسری: انسان جو بھی کام کرے گا، اچھا یا برا اس کا بدلہ ضرور ملے گا، اچھا کرے گا انعام پائے گا، برا کرے گا سزا پائے گا، یہ مجازات انسان ہی کے لئے کیوں ہے؟ اس کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟

مذکورہ دو باتیں بظاہر دو باتیں ہیں، مگر وہ درحقیقت ایک ہی مسئلہ ہیں، انسان کو کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کچھ کاموں سے روکا گیا ہے، دیگر مخلوقات کو اس طرح کے احکام نہیں دئے گئے، پھر انسان کو بعض کاموں کے کرنے نہ کرنے پر انعام سے نوازا جاتا ہے اور دوسرے بعض کاموں کے کرنے نہ کرنے پر سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس کو مکلف بنایا گیا ہے، دیگر مخلوقات کے لئے جزاؤ سزا نہیں، کیونکہ وہ مکلف نہیں، آخر یہ فرق کیوں ہے؟ اس کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اسی کا اس مبحث میں ذکر ہے، جب اس مبحث کے تمام ابواب مکمل ہو جائیں گے تب یہ بات واضح ہو جائے گی، ایک دو باب پڑھ کر یہ مضمون سمجھ میں نہیں آئے گا۔

باب — ۱

صفتِ ابداع، خلق اور تدبیر کا بیان

اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفتیں اور بے شمار اسمائے حسنیٰ ہیں، اور ہر صفت کا دائرہ کار الگ ہے مثلاً صفتِ غفور کا تعلق مؤمن کے ساتھ ہے، مشرک کے ساتھ نہیں اور منتقم کا تعلق کافر کے ساتھ ہے مؤمن کے ساتھ نہیں اسی طرح اس عالم کے ساتھ تین صفات کا تعلق ہے یعنی یہ عالم انہی تین صفات کی کرشمہ سازی ہے اور ان تین صفات کا کام ترتیب وار ہے۔

پہلی صفت: ابداع ہے، ابداع باب افعال کا مصدر ہے، اس کا مجرد بَدَعَ (ف) بَدْعًا ہے جس کے معنی ہیں گھڑنا،

بغیر نمونہ کے کوئی چیز بنانا، ابتداء کرنا، ایجاد کرنا اور باب کرم سے بَـدُع کے معنی ہیں بے مثال ہونا، انوکھا ہونا پس ابداع کے معنی ہیں عدم محض سے یعنی سابق مادہ کے بغیر کسی چیز کو وجود پذیر کرنا اور یہ اللہ ہی کا کام ہے وہ نیست سے ہست کرتے ہیں، مادہ اور مثال کے بغیر انوکھے طریقے پر پیدا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے ﴿بَـدِيـعُ السَّمٰوَاتِ والأَرْضِ﴾ (البقرہ ۱۱۷) اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے موجد ہیں، انوکھے طریقے پر پیدا کرنے والے ہیں۔

اور بخاری شریف میں حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اہل یمن خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

جئناك لنتفقه في الدين، ولِنَسْأَلك عن أول هذا الأمر، ما كان؟ قال: كان اللّٰه ولم يكن شيئ قبله (۱۱۰۳:۲)

ہم آپؐ کی خدمت میں دین سیکھنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور اس لئے آئے ہیں کہ اس کائنات کے آغاز کے بارے میں دریافت کریں کہ کس طرح ہوا؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ تھے اور ان سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔

یہی روایت کتاب بَدْءِ الخلق کے شروع میں ص ۴۵۳ پر بھی ہے اس کے الفاظ ہیں كان اللّٰه ولم يكن شيئ غيره (اللہ پاک تھے اور ان کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے: فيه دلالة على أنه لم يكن شيئ غيره، لاالماء ولا العرش ولاغيرهما، لأن كلَّ ذلك غيرُ اللّٰه تعالى.

اس روایت سے ثابت ہوا کہ کائنات کی ابتداء میں کچھ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے یہ عالم بغیر مادہ اور مثال کے پیدا کیا ہے اور اس کائنات کی ابتدا صفت ابداع سے ہوئی ہے۔

دوسری صفت: خلق ہے، خَلَقَ (ن) خَـلْقًا کے معنی ہیں پیدا کرنا، عدم سے وجود میں لانا یعنی مادہ سے کوئی چیز بنانا، سابق نمونہ کے مطابق کوئی چیز بنانا، جیسے آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، اور جنات کے جدامجد جانّ کو آگ کے آمیزہ سے بنایا۔

سوال: قرآن کریم میں آسمانوں اور زمین کے تعلق سے جہاں لفظ بدیع استعمال کیا گیا ہے، وہیں خلق السماوات والأرض بھی بار بار آیا ہے اور ان دونوں لفظوں کے معنی الگ الگ ہیں،۔ پس صحیح صورتِ حال کیا ہے؟ آسمان وزمین بغیر مادہ کے پیدا کئے گئے ہیں یا مادۂ سابق سے پیدا کئے گئے ہیں؟

جواب (۱) خلق بمعنی ابداع ہے اور جس طرح ایمان واسلام کی حقیقتیں الگ الگ ہیں مگر نصوص میں ایک کی جگہ دوسرا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اداء اور قضاء کے معنی الگ الگ ہیں اور ایک کی جگہ دوسرا لفظ استعمال ہوتا ہے اسی طرح خلق کا لفظ بمعنی ابداع استعمال کیا گیا ہے اور آسمان وزمین بغیر مادہ اور مثال سابق کے انوکھے طور پر پیدا کئے گئے ہیں۔

(۲) یا یہ کہا جائے کہ آسمان وزمین کا مادہ جو دخان کی صورت میں تھا وہ صفت ابداع کی کرشمہ سازی ہے، پھر اس مادہ سے آسمانوں اور زمین کی ہیئت کذائی بنائی گئی یہ صفت خلق کی مہربانی ہے۔

القسم الأول

فى القواعد الكلية التى تُسْتَنْبَطُ منها المصالحُ المرعيةُ فى الأحكام الشرعية

سبعةُ مباحثَ فى سبعين بابًا

المبحث الأول: فى أسباب التكليف والمجازاة

باب الإبداع والْخَلْقِ والتدبير

اعلم أن لله تعالى بالنسبة إلى إيجاد العالم ثلاث صفاتٍ مترتبةً:

أحدها: الإبداع، وهو إيجاد شيئ لا من شيئ؛ فَيُخْرِج الشيئَ من كتم العدم بغير مادة، وسُئل رسولُ الله صلى الله عليه وسلم عن أول هذا الأمر؟ فقال: ﴿كان الله ولم يكن شيئ قبلَه﴾

والثانية: الخلق، وهو إيجاد الشيئ من شيئ، كما خَلَقَ آدم من التراب﴿وَخَلَقَ الْجَانَّ من مَارِجٍ مِنْ نَارٍ﴾

ترجمہ: پہلی قسم ان قواعد کلیہ کے بیان میں ہے جن کے ذریعہ وہ مصلحتیں نکالی جاسکتی ہیں جو احکام شرعیہ میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔

قسم اول میں سات مباحث ہیں ستر بابوں میں۔

پہلا مبحث: تکلیف شرعی اور جزاوسزا کے اسباب کے بیان میں ہے۔

باب (۱) صفت ابداع، خلق اور تدبیر کے بیان میں ہے۔

جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے عالم کی ایجاد کے تعلق سے تین صفتیں ہیں، ترتیب وار۔

ان میں سے ایک ابداع ہے، اور وہ کسی چیز کو بغیر کسی چیز کے یعنی بغیر مادہ کے پیدا کرنا ہے، پس اللہ تعالیٰ بغیر مادہ کے پردۂ عدم سے چیزوں کو نکالتے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ سے اس کائنات کے آغاز کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تھے اور ان سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی''

اور دوسری صفت خلق ہے، اور وہ کسی چیز سے یعنی مادہ سے کوئی چیز بنانا ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا اور جانّ کو آگ کے آمیزہ سے بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے عالَم کی تشکیل کس طرح فرمائی ہے؟

منطق میں آپ نے پڑھا ہے کہ جنس وہ کلی ہے جو بہت سی ایسی چیزوں پر بولی جائے جن کی حقیقتیں جدا جدا ہوں، جیسے حیوان، جسم نامی وغیرہ اور نوع وہ کلی ہے جو ایسی بہت سی چیزوں پر بولی جائے جن کی حقیقت ایک ہو، جیسے انسان، زید، عمر بکر وغیرہ بہت سے ایسے افراد پر بولا جاتا ہے جن کی حقیقت ایک ہے۔

نیز منطق میں آپ نے یہ بھی پڑھا ہے کہ اجناس کی ترتیب نیچے سے اوپر کی طرف ہے یعنی خصوص سے عموم کی طرف، اور انواع کی ترتیب اوپر سے نیچے کی طرف ہے یعنی عموم سے خصوص کی طرف، کیونکہ نوع اور جنس میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے، نوع خاص ہے اور جنس عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نوع کے مزاج میں خصوصیت ہے اور جنس کے مزاج میں عمومیت، پس اعلیٰ درجہ کی نوع وہ ہے جو اخص ترین ہو، اور اعلیٰ درجہ کی جنس وہ ہے جو اعم ترین ہو، سب سے ادنی نوع کو نوع الانواع کہتے ہیں اور سب سے اعلیٰ جنس کو جنس الاجناس۔ مثلاً سب سے نیچے کی جنس ہے حیوان، اس کے اوپر جسم نامی، اس کے اوپر جسم مطلق، اس کے اوپر جوہر اور آخری جنس وجود ہے۔ پس وجود جنس الاجناس ہے اور انواع میں سب سے نیچے انسان ہے اس کے اوپر حیوان ہے، اس کے اوپر جسم نامی ہے، اس کے اوپر جسم مطلق ہے، اس کے اوپر آخری اضافی نوع جوہر ہے، پس انسان نوع الانواع ہے اور نوع الانواع اور جنس الاجناس کے درمیان جو انواع واجناس ہیں ان کو متوسطات یعنی بین بین کہتے ہیں۔ وہ من وجہٍ جنس ہیں اور من وجہٍ نوع۔

نوٹ: مناطقہ نے وجود کو نہیں لیا انہوں نے آخری جنس جوہر کو قرار دیا ہے، وجود کو حضرت نانوتوی قدس سرہ نے بڑھایا ہے۔ (نوٹ ختم ہوا)

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہاں کو انواع واجناس کی شکل میں پیدا کیا ہے، کچھ چیزوں کو جنس بنایا ہے اور کچھ چیزوں کو نوع، جو عام ہے وہ جنس ہے اور جو خاص ہے وہ نوع ہے، جیسے حیوان، انسان سے عام ہے پس وہ جنس ہے اور انسان حیوان سے خاص ہے پس وہ نوع ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے انواع واجناس کی تشکیل کس طرح فرمائی ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ خصوصیات کے ذریعہ انواع واجناس متعین کی گئی ہیں، نوع کی الگ خصوصیت رکھی ہے اور جنس کی الگ، مثلاً حیوان (جانور، جاندار) کی خصوصیات ہیں: حساس ہونا، متحرک بالارادہ ہونا، جس مخلوق میں یہ خصوصیات پائی جائیں گی وہ حیوان کہلائے گی، پھر حیوان کی انواع بنائیں، اس طرح کہ ان میں خصوصیات در خصوصیات پیدا کیں مثلاً انسان ایک جانور ہے اس میں حیوان کی سبھی خصوصیات موجود ہیں پھر اس میں مزید خصوصیات پیدا کیں کہ وہ عقل وفہم کی بنیاد پر بولتا ہے، سوچ سمجھ کر بات چیت کرتا ہے، اس کی کھال بالوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہوتی، بعض حصے جیسے سر وغیرہ اگرچہ بالوں سے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں، مگر سارا جسم

بالوں سے ڈھکا ہوا نہیں ہوتا، اس کا قد سیدھا ہوتا ہے دوسرے حیوانات کی طرح چار پیروں پر بیل کی طرح پڑا ہوا نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کی باتوں کو سمجھتا ہے۔ یہ سب انسان کی خصوصیات ہیں۔ یہ خصوصیات جس حیوان میں پائی جائیں گی وہ انسان کہلائے گا۔

اسی طرح گھوڑا بھی ایک جاندار ہے، اس میں حیوان کی سبھی خصوصیات موجود ہیں، مزید خصوصیات اس میں یہ ہیں کہ وہ ہنہناتا ہے، اسکی کھال بالوں سے ڈھکی ہوئی ہے، اس کا جسم چار پیروں پر میز کی طرح بچھا ہوا ہے اور وہ باوجود زیرکی کے دوسروں کا مافی الضمیر سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتا، نہ وہ اپنا مافی الضمیر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے، ان خصوصیات زائدہ کی وجہ سے فرس حیوان کی ایک الگ نوع بن گیا۔

اسی طرح زہر کی خصوصیت ہے کہ جو اسے کھائے اس کو وہ ہلاک کردے، سونٹھ کی خاصیت گرمی اور خشکی ہے اور کافور کی خاصیت برودت ہے، یہی حال تمام معدنیات، نباتات اور حیوانات کا ہے جنسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اجناس یعنی دھات، گھاس اور جانور ہیں، پھر نوعی خواص کی وجہ سے وہ مختلف انواع بن جاتے ہیں۔

اب خلاصہ کے طور پر تین باتیں سمجھ لینی چاہئیں:

① اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہ چل رہی ہے کہ اللہ نے جس چیز کی جو خصوصیت پیدا کی ہے، وہ کبھی اس چیز سے جدا نہیں ہوتی، آگ کی خاصیت جلانا ہے پانی کی خاصیت بجھانا اور سیراب کرنا ہے، یہ آگ اور پانی سے کبھی جدا نہیں ہوتی، انسان کی خصوصیات انسان سے اور گھوڑے کی خصوصیات گھوڑے سے کبھی جدا نہیں ہوتیں، وقس علی ہذا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ پاک ان خصوصیات کو جدا نہیں کرسکتے، اللہ پاک سب کچھ کرسکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ سنت اللہ یونہی جاری ہے۔

② جس طرح اجناس میں خصوصیت درخصوصیت پیدا کرنے سے انواع بنتی ہیں، اسی طرح انوع میں خصوصیت درخصوصیت پیدا کرنے سے انواع کے افراد بنتے ہیں، مثلاً زید میں حیوان کی سبھی خصوصیات پائی جاتی ہیں نیز انسان کی بھی سبھی خصوصیات موجود ہیں اور مزید باتیں یہ ہیں کہ اس کا رنگ ایسا ہے، ناک نقشہ ایسا ہے، بولنے کا انداز ایسا ہے وغیرہ وغیرہ مشخصات کی وجہ سے وہ انسان کا ایک فرد بن گیا ہے۔

③ اوپر سے لے کر نیچے تک مرتب انواع واجناس کی خصوصیات بظاہر گڈمڈ ہوتی ہیں، پھر عقل کے ذریعہ ان کا فرق پہچانا جاتا ہے اور ہر خاصہ کو ذی خاصہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مثلاً زید میں جوہر کی، جسم مطلق کی، جسم نامی کی، حیوان کی اور انسان کی سبھی خصوصیات مجتمع ہیں اور ساتھ ہی فرد کی خصوصیات بھی، پھر عقل تعیین کرتی ہے کہ زید جو اپنے قیام میں کسی محل کا محتاج نہیں یہ جوہر کا خاصہ ہے اور اس میں جو ابعاد ثلاثہ (طول عرض اور عمق) پائے جاتے ہیں وہ جسم مطلق کا خاصہ ہیں اور نشو ونما جسم نامی کا خاصہ ہے اور اس کی حساسیت حیوان کا خاصہ ہے اور اس کا ناطق ہونا انسان کا

خاصہ ہے اور اس کا تشخص جو اس کو عمر بکر سے ممتاز کرتا ہے فرد کا خاصہ ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے دلائل عقلیہ اسی کے ساتھ ہیں، یعنی وہ سب باتیں عقل کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں اور اس کے دلائل نقلیہ درج ذیل احادیث ہیں۔

(۱) متفق علیہ حدیث ہے کہ تَـلْبِينَـهْ (بھوسی، دودھ اور شہد کا حریرہ) بیمار کے دل کو راحت پہنچاتا ہے اور کچھ حزن وملال دور کرتا ہے (مشکوۃ کتاب الاطعمہ حدیث ۴۱۷۹)

(۲) متفق علیہ حدیث ہے کہ ''کلونجی میں موت کے علاوہ ہر بیماری کی شفا ہے'' (مشکوۃ کتاب الطب حدیث ۴۵۲۰) کلونجی: ایک کالا دانہ ہے، جو اچار میں بھی ڈالا جاتا ہے۔

(۳) مسند احمد (۱: ۲۹۳) میں روایت ہے کہ اونٹوں کے پیشاب اور دودھ میں ان (عُرَنِيِّين) کے فساد معدہ کا علاج ہے۔

(۴) ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ حضرت اسماء بنت عُمیسؓ نے شُبْرُم کا مسہل لیا (شُبْرُم ایک دانہ ہے چنے کی طرح، بہت گرم، اس کا پانی دوا کے طور پر پیتے ہیں) تو آپؐ نے فرمایا کہ ''وہ گرم انگار ہے'' پھر انھوں نے سَـنَـا کا مسہل لیا تو آپ نے فرمایا کہ: ''اگر کسی چیز میں موت کا علاج ہے تو سنا میں ہے'' (مشکوۃ کتاب الطب حدیث ۴۵۳۷)

مذکورہ بالا روایات میں اور ان کے علاوہ بہت سی روایات میں نبی کریم ﷺ نے بہت سی چیزوں کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں اور آثار کو اشیاء کی طرف منسوب کیا ہے، پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے چیزوں میں خصوصیات رکھی ہیں۔ یہی خصوصیات ان کو دوسری چیزوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

وقد دلَّ العقلُ والنقل على أن الله تعالى خلق العالَم أنواعا وأجناسا، وجعل لكل نوع وجنس خواصَّ؛ فنوع الإنسان -مثلاً- خاصَّتُه: النُّطْقُ، وظُهورُ الْبَشَرَةِ، واسْتِواءُ القامة، وفَهْم الخطاب؛ ونوعُ الفرس خاصتُه: الصَّهِيْلُ، وكونُ بَشَرتِه شَعراءَ، وقامتِه عَوْجاء، وأن لايفهمَ الخطاب؛ وخاصة السُّم: إهلاكُ الإنسان الذى يتناوله؛ وخاصة الزنجبيل: الحرارة واليبوسة؛ وخاصة الكافور: البرودة؛ وعلى هذا القياس جميعُ الأنواع من المعدِن والنبات والْحَيَوان.

وجرت عادةُ الله تعالى أن لاتَنْفَكَّ الخواصُّ عما جُعلت خواصَّ لها؛ وأن تكونَ مُشَخِّصَاتُ الأفراد خصوصًا فى تلك الخواص، وتَعَيُّنًا لبعض مُحْتَمَلا تها؛ فكذلك مُمَيِّزاتُ الأنواع خصوصا فى خواص أجناسها؛ وأن تكون معانى هذه الأسامى المترتبةُ فى العموم والخصوص— كالجسم، والنامى، والحيوان، والإنسان، وهذا الشخص— متمازِجةً متشابِكةً فى الظاهر، ثم يُدرك العقلُ الفرقَ بينها، ويُضيف كلَّ خاصة إلى ما هى خاصةٌ له.

وقد بيَّن النبى صلى الله عليه وسلم خواصَّ كثيرٍ من الأشياء، وأضاف الآثار إليها، كقوله

صلى الله عليه وسلم: ﴿التَّلْبِيْنَةُ مُجِمَّةٌ لفؤاد المريض﴾ وقوله: ﴿في الحبة السوداء شِفاءٌ من كل داء إلا السَّام﴾ وقوله: ﴿في أبوال الإبل وألبانها شفاء لِلذَّرَبَةِ بطونُهم﴾ وقوله في الشُّبْرُم: ﴿حارٌّ جارٌّ﴾

ترجمہ: اور عقل ونقل اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوانواع واجناس کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ اور ہرنوع اور ہرجنس کے لئے خصوصیتیں گردانی ہیں۔ پس نوع انسانی کی خصوصیت - بطور مثال - بامعنی بات بولنا، کھال کا کھلا ہوا ہونا، قد کا سیدھا ہونا اور بات کو سمجھنا ہے۔ اور نوع فرس کی خصوصیت: ہنہنانا، اس کی کھال کا بالوں سے ڈھکا ہوا ہونا، اس کے قد کا ٹیڑھا ہونا ہے اور یہ بات ہے کہ وہ بات کو نہ سمجھے۔ اور زہر کا خاصہ اس شخص کو ہلاک کرنا ہے جو اس کو استعمال کرے۔ اور سونٹھ کا خاصہ گرمی اور خشکی ہے اور کافور ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اور اسی انداز پر معدنیات، نباتات اور حیوانات کی تمام انواع ہیں۔

اور اللہ کی عادت یہ چل رہی ہے کہ:

(۱) خواص جدا نہ ہوں اُس چیز سے جس کے لئے ان کو خواص گردانا گیا ہے۔

(۲) اور یہ کہ افراد کو متعین کرنے والی چیز اُن خصوصیات میں تخصیص ہو (اجناس کے افراد انواع ہوں اور انواع کے افراد ان کی جزئیات۔ پس اجناس وانواع کی خصوصیات میں مزید تخصیص کر کے ان کے افراد متعین کئے جاتے ہیں) اور ان افراد کے بعض محتملات کی تعیین ہو (مثلاً انسان کے ہر فرد میں متعدد احتمال ہیں، وہ زید جیسا بھی ہوسکتا ہے، عَمر و جیسا بھی اور بکر وغیرہ جیسا بھی، ان احتمالات میں سے بعض کی تعیین کرنے سے زید بن جاتا ہے) پس اسی طرح انواع کو جدا کرنے والی چیز ان کی اجناس کی خصوصیات میں مزید تخصیص ہوتی ہے۔

(۳) اور یہ کہ ان ناموں کے معانی (یعنی خصوصیات) جو عموم وخصوص میں ترتیب وار ہیں —— جیسے جسم مطلق، جسم نامی، حیوان، انسان اور یہ فرد —— (ان الفاظ کے معانی) بظاہر گتھے ہوئے اور گڈمڈ ہوں، پھر عقل ان کے درمیان فرق پہچانے اور ہر خاصہ کو اس چیز کی طرف منسوب کرے جس کا وہ خاصہ ہے۔

اور نبی کریم ﷺ نے بہت سی چیزوں کی خصوصیات بیان فرمائی ہیں، اور آثار کو ان چیزوں کی طرف منسوب کیا ہے، جیسے آپ کا ارشاد ہے کہ: ''دودھ کا حریرہ بیمار کے دل کو سکون پہنچاتا ہے'' اور آپؐ کا ارشاد ہے کہ: ''کلونجی میں موت کے علاوہ ہر بیماری کی دوا ہے'' اور آپؐ کا ارشاد ہے کہ: ''اونٹوں کے پیشاب اور دودھ میں ان لوگوں کے معدے کی خرابی کا علاج ہے'' اور شُبْرُم کے بارے میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ ''وہ گرم انگارہ ہے''

لغات:

شخَّص الشیئَ: تعین کرنا، تمیز کرنا، اور اسی سے اَطِبّاء کی اصطلاح تشخیص امراض ہے اور اسی سے مناطقہ کی اصطلاح

تشخص ہے، تشخص: وہ چیزیں ہیں جو کسی چیز کو دوسری ہم جنس چیزوں سے جدا اور ممتاز کرتی ہیں مثلاً زید کو دیگر افراد انسانی سے جو چیزیں جدا کرتی ہیں وہ زید کا تشخص ہیں...... مشخِّص اسم فاعل ہے...... خصوصا مصدر ہے بمعنی خاص کرنا اور یہ تکون کی خبر ہے...... تعیُّنا کا عطف خصوصا پر ہے اور یہ عطف تفسیری ہے، اس کا اور معطوف علیہ کا مطلب ایک ہے...... خصوصًا فی خواص أجناسها سے پہلے تکون مقدر ہے۔ خصوصا اس کی خبر ہے، اور اسم ضمیر ہے جو ممیزات کی طرف راجع ہے...... تَمازجا: باہم ایک دوسرے کا ملنا...... تشابکتِ الأمورُ: باہم مختلط ہونا...... مُجِمَّة: راحت بخش جَمَّ القوم جُمُوْمًا: آرام پانا...... الذَّرَب (مصدر) ذَرِبَ (س) ذَرَبًا المعدةُ: معدے کا بگڑنا...... حَارٌّ کے بعد دوسرا لفظ روایات میں دو طرح آیا ہے ح حطّی کے ساتھ اس صورت میں تکرار برائے تاکید ہے جیسے جاء زید زید اور ترجمہ اسی کا کیا گیا ہے اور جیم کے ساتھ اس صورت میں ترجمہ ہوگا پیٹ کھول دینے والا۔

☆ ☆ ☆

صفت تدبیر کا بیان

اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت، صفت تدبیر ہے دَبَّر تدبیرا کے معنی ہیں انتظام کرنا، اللہ تعالیٰ کائنات پیدا کرنے کے بعد اس کا نظم و انتظام خود ہی فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اسباب میں تاثیر رکھی ہے اس لئے اسباب کی کارفرمائی بھی حقیقت میں اللہ ہی کا کارنامہ ہے۔ سورۃ الرحمان میں ہے ﴿کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ﴾ (وہ ہر وقت کسی اہم کام میں ہوتے ہیں) یعنی ہر لمحہ ان کا الگ کام اور ہر روز ان کی نئی شان ہے، کسی کو مارنا، کسی کو جلانا، کسی کو بیمار کرنا، کسی کو تندرست کرنا، کسی کو بڑھانا، کسی کو گھٹانا، کسی کو دینا، کسی سے لینا ان کے شئون میں داخل ہے۔

اور صفت تدبیر کی کرشمہ سازیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں جو نظام چاہ رہے ہیں، پیش آنے والے واقعات کو اس سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ موالید ثلاثہ (جمادات، نباتات اور حیوانات) کا نظم و انتظام انہی کے دستِ قدرت میں ہے۔ شاہ صاحب نے اس کی چار مثالیں دی ہیں:

① اللہ تعالیٰ بادلوں سے بارش برساتے ہیں، پھر بارش سے سبزہ اگاتے ہیں تاکہ زمین کی پیداوار لوگ کھائیں اور جانور بھی کھائیں اور مقررہ وقت تک یہ کارخانۂ حیات چلتا رہے۔ یہ بارشیں برسانا اللہ کی صفت تدبیر کا کام ہے، اگر وہ بارش نہ برسائیں تو انسان اور دیگر حیوانات کیسے زندہ رہیں؟

② حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں یہ مقدر تھا کہ وہ لمبے عرصہ تک حیات رہیں، ان کی اولاد ہو، اور ان کی اولاد میں نبوت کا سلسلہ چلے، مگر دشمن نے ان کو آگ میں جھونک دیا، تو اللہ نے آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ یہ اللہ کی صفت تدبیر

کا کام ہے۔ اور یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں، روز حوادث میں کسی کو بچالیا جاتا ہے تاکہ امر مقدر بروئے کار آئے۔

(۳) حضرت ایوب علیہ السلام بیمار پڑ گئے، ان کے جسم میں فاسد مادہ پیدا ہو گیا، علاج کی کوئی صورت نہ تھی اور ان کے حق میں مقدر یہ تھا کہ وہ شفایاب ہوں تو اللہ تعالیٰ نے زمین سے ایک چشمہ نکالا، جس میں نہا کر اور پانی پی کر آپ صحت مند ہو گئے۔ یہ سب انتظام باب تدبیر سے تھا۔

(۴) بعثت نبوی کے وقت عالم کی صورت حال وہ تھی جس کا نقشہ سورۃ البینہ کے شروع میں کھینچا گیا ہے سارا عالم گمراہی کی دلدل میں پھنس چکا تھا، چاروں طرف گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی تھی، جو معمولی چراغوں سے چھٹنے والی نہیں تھی، جب تک آفتاب نبوت طلوع نہ ہو کام بننے والا نہیں تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین، محبوب رب العالمین خاتم النبیین ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپؐ کی تعلیمات کے ذریعہ عالم کی اصلاح فرمائی۔ یہ سب اللہ کی صفت تدبیر کی کرشمہ سازی ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے اللہ کی صفت تدبیر کے شؤن سمجھے جاسکتے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے صفت ابداع سے عالم کا مادہ بنایا، پھر صفت خلق سے اس مادہ سے موالید ثلاثہ کو وجود بخشا، پھر صفت تدبیر نے اس کا نظم وانتظام سنبھالا۔

والثالثة: تدبير عالَم المواليد؛ ومرجعُه إلى تصيير حوادثِها موافقةً للنظام الذي ترتضيه حكمتُه، مفضيةً إلى المصلحة التي اقتضاها جودُه؛ كما أنزل من السحاب مطرًا، وأخرج به نبات الأرض، ليأكل منه الناس والأنعام، فيكون سببا لحياتهم إلى أجل معلوم؛ وكما أن إبراهيم — صلوتُ الله عليه — أُلقي في النار، فجعلها برداً وسلامًا، ليبقى حيا؛ وكما أن أيوب — عليه السلامُ — كان اجتمع في بدنه مادةُ المرض، فأنشأ الله تعالى عينا، فيها شفاء مرضه؛ وكما أن الله تعالى نظر إلىٰ أهل الأرض، فَمَقَتَهُمْ: عربَهم وعجمَهم، فأوحى إلى نبيه صلى الله عليه وسلم أن يُنْذِرَهم، ويجاهدهم لِيُخرج من شاء من الظلمات إلى النور.

ترجمہ: اور تیسری صفت عالم موالید کا انتظام کرنا ہے اور اس کا خلاصہ: عالم موالید میں رونما ہونے والے واقعات کو اس نظام سے ہم آہنگ بنانا ہے جس کو اللہ کی حکمت پسند کرتی ہے، اور اس مصلحت تک پہنچانے والا بنانا ہے جس کو اس کا کرم چاہتا ہے، جیسے اللہ نے بادل سے بارش برسائی، اور اس کے ذریعہ زمین کا سبزہ اگایا، تاکہ اس کو لوگ اور چوپایے کھائیں، پس وہ مقررہ وقت تک ان کے زندہ رہنے کا سبب بنے؛ اور جیسے یہ بات ہے کہ حضرت ابراہیم — ان پر اللہ کی بے پایاں مہربانیاں ہوں — آگ میں ڈالے گئے، پس اللہ نے اس آگ کو ٹھنڈی بے گزند بنا دیا تاکہ وہ زندہ رہیں؛ اور جیسے یہ بات ہے کہ حضرت ایوب — ان پر سلامتی ہو — کے بدن میں بیماری کا مادہ اکٹھا ہو گیا، پس اللہ نے ایک

ایسا چشمہ پیدا کیا جس میں ان کی بیماری کی شفا تھی؛ اور جیسے یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین والوں پر نظر ڈالی، پس ان سے سخت ناراض ہوئے، عربوں سے بھی اور عجمیوں سے بھی، پس وحی بھیجی اپنے پیغمبر ﷺ کی طرف کہ وہ ان کو ڈرائیں اور ان پر تن توڑ محنت کریں، تا کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالیں۔

تشریح:

موالید مولود کی جمع ہے اور موالید ثلاثہ معدنیات، نباتات اور حیوانات ہیں، چونکہ یہ تینوں چیزیں عناصر اربعہ سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے ان کو موالید کہا جاتا ہے۔

معدنیات: وہ مرکبات ہیں جن میں احساس اور نشو ونما نہیں ہوتا۔ معدنیات، معدن کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کھان، جس سے دھاتیں نکلتی ہیں۔

نباتات: وہ مرکبات ہیں جن میں نشو ونما ہوتا ہے، مگر احساس اور ارادہ نہیں ہوتا، نباتات، نبات کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں سبزی۔

حیوانات: وہ اجسام ہیں جو بڑھنے والے، احساس کرنے والے اور بالارادہ حرکت کرنے والے ہیں۔

لغات: **المرجِع:** لوٹنے کی جگہ، یہاں بمعنی خلاصہ ہے...... **مَقَتَ (ن) مقتًا:** بہت بغض رکھنا۔



صفت تدبیر کی مزید وضاحت

صفت تدبیر کا خلاصہ یہ بیان کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ عالم موالید میں رونما ہونے والے واقعات کو اس نظام سے ہم آہنگ کرتے ہیں جس کو ان کی حکمت پسند کرتی ہے اور واقعات کو اس انداز پر ڈھالتے ہیں کہ وہ اس مصلحت تک پہنچا دیتے ہیں جس کو ان کا کرم چاہتا ہے۔ اب اس کی تفصیل کر رہے ہیں تفصیل میں جانے سے پہلے دو باتیں سمجھ لی جائیں۔

① یہ عالم موالید جواہر و اعراض کا مجموعہ ہے، کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک یہی اجناس عالیہ ہیں، ان سے اوپر کوئی ایسا عام مفہوم نہیں جو دونوں کو شامل ہو۔ اور جوہر: وہ ممکن ہے جو محل کے بغیر موجود ہو سکے، جیسے کپڑا، کتاب، قلم وغیرہ بے شمار چیزیں جوہری وجود رکھتی ہیں۔ اور عرض: وہ ممکن ہے جو کسی محل میں پایا جائے یعنی وہ پائے جانے میں، باقی رہنے میں، اور متمکن ہونے میں کسی ایسے محل کا محتاج ہو جو اس کو سہارا دے، جیسے کپڑے کی سیاہی سفیدی وغیرہ عرضی وجود رکھتے ہیں۔ پھر جواہر کی تو کچھ خاص اقسام نہیں مگر اعراض کی نو قسمیں ہیں: کم، کیف، اَین، متیٰ، اضافت، مِلک، وضع، فعل اور انفعال۔ ان کی تفصیلات معین الفلسفہ میں دیکھیں۔

یہ جواہر واعراض موالید ثلاثہ میں رکھی ہوئی قدرتی صلاحیتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ صلاحیتیں موالید سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جب ان صلاحیتوں میں باہم کشمکش اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو حکمت خداوندی مختلف انداز واطوار کو پیدا کرتی ہے، ان میں سے بعض جواہر ہوتے ہیں اور بعض اعراض، پھر اعراض کی متعدد اقسام ہیں جیسے جانداروں کے افعال، اخلاق اور ان کے ارادے اور ان کے علاوہ دیگر چیزیں جیسے کسی جگہ میں ہونا (أین) اور کسی زمانہ میں ہونا (متی) ہے۔

④ اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ حکمت اور مصالح عالم کے اقتضاء سے بنایا ہے، اس لئے ہر چیز اپنی ذات میں ایک حُسن رکھتی ہے، کوئی چیز فی نفسہ بری نہیں، سورۂ سجدہ آیت ۷ میں ہے ﴿اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ﴾ (اللہ نے جو بھی چیز بنائی خوب بنائی) اس ارشاد میں تمام جواہر واعراض داخل ہیں، حتی کہ اخلاق سیئہ: غصہ، حرص، شہوت، بخل وغیرہ بھی اپنی ذات سے برے نہیں، برائی ان کو بے اندازہ اور بے محل استعمال کرنے میں ہے۔

غرض جب ہر چیز کو اس کے مقصد تخلیق کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھا جائے تو وہ حَسن ہوگی، کسی بھی چیز میں دو معنی کے اعتبار سے کوئی شر نہیں: ایک: اس اعتبار سے کہ سبب جو کچھ چاہے وہ صادر نہ ہو، دوسرے: اس اعتبار سے کہ سبب جو کچھ چاہے اس کی ضد صادر ہو، جیسے چاقو کا کام کاٹنا اور زہر کا کام مارنا ہے، پس بہترین چاقو وہ ہے جو خوب چلے اور عمدہ زہر وہ ہے جو فوراً کام تمام کردے، اگرچہ اس اعتبار سے کہ ایک انسان مرگیا یہ آثار شر ہیں۔

البتہ دوسرے دو اعتباروں سے شر پایا جاتا ہے ایک: اس اعتبار سے کہ کسی سبب سے وہ چیز پیدا ہو کہ اگر وہ پیدا نہ ہوتی تو بہتر ہوتا دوسرے: کسی سبب سے وہ چیز پیدا نہ ہو جس کے آثار ونتائج اچھے ہیں۔ ان دو اعتباروں سے عالم میں شر پایا جاتا ہے، جیسے ابراہیم خلیل اللہ کو آگ جلا ڈالتی تو وہ آگ کی خوبی ہوتی، کیونکہ آگ کا کام ہی جلانا ہے، وہ اسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، مگر یہ بات مقصد عالم اور مفاد کلی سے ہم آہنگ نہ ہوتی اور اس کے آثار ونتائج بھی اچھے نہ ہوتے اس اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کا جلانا شر ہے۔

اب صفت تدبیر کی کارفرمائی ملاحظہ فرمایئے: جب کسی ایسے واقعہ کے رونما ہونے کے تمام اسباب مہیا ہوجاتے ہیں جس میں آخری دو معنی کے اعتبار سے شر ہوتا ہے یعنی وہ واقعہ نظام کلی کے منافی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت تدبیر اپنا کام کرتی ہے۔ اور چار طرح سے تصرف کر کے اس واقعہ کو ہونے سے روک دیتی ہے، تاکہ نظام عالم متأثر نہ ہو۔ اور وہ چار صورتیں یہ ہیں:

پہلی صورت: اسباب میں رکھی ہوئی تاثیر کو سکیڑ دیا جاتا ہے اور چیزوں کی صلاحیتوں کو سمیٹ لیا جاتا ہے، جیسے دجال ایک مؤمن بندے کو قتل کرے گا، پھر سب لوگوں کے سامنے اس کو زندہ کرے گا۔ اور اس سے اپنی الوہیت کا اقرار لے گا، وہ بندہ اقرار نہیں کرے گا تو پھر دوبارہ دجال اس کو قتل کرنا چاہے گا، مگر اب قتل نہیں کرسکے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قتل پر قدرت نہیں دیں گے، حالانکہ اس کا قتل کرنے کا ارادہ بالکل سچا ہوگا، آلات قتل بھی صحیح سلامت ہوں گے، مگر قتل نہیں

کر سکے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ دجال کی قتل کرنے کی صلاحیت قبض کرلیں گے۔ یہ واقعہ مسلم شریف میں ہے (مشکوۃ باب ذکر الدجال ح ۵۴۷۶)

دوسری صورت: چیزوں کی صلاحیتوں کو بڑھا دینا، قُویٰ میں اضافہ کردینا۔

پہلی مثال: جیسے ایوب علیہ السلام کے ٹھوکر مارنے سے زمین کے سُوتوں کا ٹوٹ جانا اور چشمہ کا پھوٹ نکلنا، حالانکہ ایک بیمار نحیف ونزار آدمی کے ایڑی مارنے سے چشمہ نہیں پھوٹتا، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کی ٹھوکر میں بسط کردیا، اس میں اتنی طاقت پیدا کردی کہ اس نے زمین کا جگر چاک کردیا اور چشمہ بہ پڑا۔

فائدہ: اور یہ جو مشہور ہے کہ زمزم حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایڑیاں رگڑنے سے نمودار ہوا ہے، یہ بے اصل بات ہے۔ بخاری شریف کتاب أحادیث الأنبیاء باب ۹ حدیث ۳۳۶۴ میں صراحت ہے کہ فإذا هي بالملك عند موضع زمزم فَبَحَثَ بعقبه أو قال: بجناحه حتى ظهر الماء (پس اچانک زمزم کی جگہ کے پاس حضرت ہاجرہؓ نے فرشتہ کو دیکھا، پس اس نے اپنی ایڑی سے کریدا یا فرمایا کہ اپنا پر مارا یہاں تک کہ پانی ظاہر ہوا) جس وقت زمزم ظاہر ہوا اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کئی گز کے فاصلہ پر ایک بڑے درخت کے نیچے لیٹے ہوئے تھے، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں صراحت ہے۔

سوال: کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایڑیاں رگڑنے سے زمزم ظاہر نہیں ہوسکتا؟

جواب: ہوسکتا ہے، اور ہزار بار ہوسکتا ہے، جب ایوب علیہ السلام کے ٹھوکر مارنے سے چشمہ نمودار ہوسکتا ہے تو اسماعیل علیہ السلام کے ایڑیاں رگڑنے سے زمزم کیوں نمودار نہیں ہوسکتا؟ مگر بات امکان کی نہیں، وقوع کی ہے کہ کیا ایسا ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اس کا ثبوت نہیں اور ایوب علیہ السلام کے واقعہ کا قرآن کریم میں ذکر ہے (فائدہ تمام ہوا)

دوسری مثال: اللہ کے بعض بندوں نے بعض جنگوں میں وہ کارنامے انجام دیئے ہیں کہ عقل باور نہیں کرتی کہ ایک شخص تو کیا، کئی شخص مل کر بھی وہ کام انجام نہیں دے سکتے، پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟ اس طرح کہ اللہ نے اس بندے کی صلاحیتوں کو بڑھا دیا۔

حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ آپ نے جنگ خیبر میں تن تنہا قلعہ کا دروازہ اکھاڑ دیا تھا، مگر یہ واقعہ چونکہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا، اس لئے شاہ صاحب نے نام نہیں لیا۔

تیسری صورت: چیزوں کی صلاحیتوں میں تبدیلی کردینا، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس آگ میں جھونکا گیا تھا اللہ نے اس آگ کی تاثیر بدل دی اور اس کو بجائے گرم کے ٹھنڈا کردیا اور آگ نے وہ کام کیا جو برف کرتا ہے۔

چوتھی صورت: دل میں خیر کی بات ڈالنا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جو تین کام کئے ہیں وہ الہام خداوندی سے کئے ہیں، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے دریائے نیل میں الہام خداوندی سے ڈالا تھا، اسی طرح

انبیائے کرام پر آسمانی کتابوں اور قوانین کا نزول بھی باب الہام سے ہے، کیونکہ دل میں خیر کی بات ڈالنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ کوئی بھلائی کا مشورہ دیدے، خود سوچنے سے کوئی بھلائی کی بات ذہن میں آجائے، کوئی غیبی آواز سن لے، کوئی اچھا خواب دیکھ لے، وحی تشریعی یا غیر تشریعی نازل ہوکر کوئی بات بتادے یہ سب صورتیں الہام میں شامل ہیں۔

فائدہ: الہام ہمیشہ صاحب معاملہ ہی کو نہیں ہوتا، کبھی صاحب معاملہ کے فائدہ کے لئے دوسرے کو بھی ہوتا ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے فائدہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کو الہام فرمایا۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ کی صفت تدبیر کے مختلف پہلو قرآن کریم میں اتنی تفصیل سے مذکور ہیں کہ ان پر کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا لہٰذا قارئین قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت اس مضمون پر غور کریں۔

وتفصيلُ **ذلك**: أن القُوَى المُوْدَعَةَ في المواليد، التي لاتنفكُّ عنها، لما تزاحمت وتصادمت، اوجبت حكمةُ الله حدوثَ أطوارٍ مختلفةٍ: بعضُها جواهرُ، وبعضها أعراضٌ، والأعراضُ: إما أفعالٌ أو إرادات من ذوات الأنفس، أو غيرُهما.

وتلك الأطوار لاشرفيها بمعنى عدمِ صدورِ ما يقتضيه سببُه، أو صدور ضدِّ ما يقتضيه؛ والشيئ إذا اعتُبر بسببه المقتضي لوجوده كان حَسنًا لامَحالةَ، كالقطع حَسَنٌ من حيث أنه يقتضيه جوهَرُ الحديد، وإن كان قبيحًا من حيث فوتِ بِنْيَةِ إنسانٍ؛ لكن فيها شر بمعنى حدوث شيئٍ غيرُه أو فقٌ بالمصلحة منه، باعتبار الآثار، أو عدمِ حدوث شيئٍ آثارُه محمودةٌ.

وإذا تَهيَّأتْ أسبابُ هذا الشر اقتضتْ رحمةُ الله بعباده، ولطفُه بهم، وعمومُ قدرته على الكل، وشمولُ علمه: أن يتصرف في تلك القوى، والأمورِ الحاملة لها، بالقبض والبسط والإحالة والإلهام، حتى تُفْضِي تلك الجملةُ إلى الأمر المطلوب.

أما القبض: فمثاله ما ورد في الحديث: أن الدجال يريدأن يقتل العبدَ المؤمنَ في المرة الثانية، فلا يُقْدِرُه الله تعالى عليه، مع صِحَّةِ داعيةِ القتل، وسلامةِ أدواته.

وأما البسط: فمثاله: أن الله تعالى أنبع عينا لأيوب —— صلوات الله عليه —— بركضه الأرضَ؛ وليس في العادة أن تُفضيَ الرَّكْضَةُ إلى نُبوع الماء، وأَقْدَرَ بعضَ المخلصين من عباده في الجهاد على مالا يتصوَّرُه العقلُ من مِثْلِ تلك الأبدان، ولامن أضعافها.

وأما الإحالة: فمثالها: جعلُ النارِ هواءً طيبة لإبراهيم عليه الصلوة والسلام.

وأما الإلهام: فمثاله: قصة خرق السفينة، وإقامة الجدار، وقتل الغلام، وإنزال الكتب

والشرائع على الأنبياء عليهم السلام.
والإلهام: تارة يكون للمبتلى ،وتارة يكون لغيره لأجله، والقرآن العظيم بيَّن أنواعَ التدبير بما لامزيد عليه.

ترجمہ: اوراس کی تفصیل یہ ہے کہ موالید میں جوصلاحیتیں امانت رکھی ہوئی ہیں، جوان سے جدانہیں ہوتیں، جب ان میں کشمکش ہوئی اور وہ باہم ٹکرائیں تو اللہ کی حکمت نے مختلف انداز کے پیدا کرنے کو واجب کیا، ان میں سے بعض جواہر ہیں اور بعض اعراض۔ اوراعراض یا تو جانداروں کے افعال ہیں یاارادے ہیں یاان دونوں کے علاوہ ہیں۔

اوران اندازوں میں کوئی برائی نہیں ہے بایں معنی کہ وہ چیز صادر نہ ہوجس کواس کا سبب چاہتا ہے، یااس چیز کی ضد صادر ہوجس کو وہ سبب چاہتا ہے اور کوئی بھی چیز جب موازنہ کی جائے اس کے اس سبب کے ساتھ جواس کے وجود کو چاہتی ہے تو وہ چیز لامحالہ اچھی ہوگی، جیسے (چاقو تلوار کا) کاٹنا اچھا ہے اس اعتبار سے کہ وہ لوہے کی دھات کا مقتضی ہے، اگرچہ یہ چیز بری ہے انسان کے جسم کے برباد ہوجانے کے اعتبار سے، البتہ اُن اطوار میں شر ہے بایں معنی کہ ایسی چیز پیدا ہو، جس کا غیر مصلحت سے زیادہ ہم آہنگ ہواس چیز سے آثار کے اعتبار سے، یا کسی ایسی چیز کا نہ پیدا ہونا جس کے نتائج محمود ہوں۔

اور جب اس شر کے اسباب مہیا ہوجاتے ہیں تو بندوں پر اللہ کی مہربانی، اور بندوں پر اللہ کا لطف، اور اللہ کی قدرت کا ہر چیز کو عام ہونا، اور اللہ کے علم کا ہر چیز کو شامل ہونا چاہتا ہے کہ اللہ ان صلاحیتوں میں اوران اعضاء میں جوان صلاحیتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں تصرف کریں، قبض وبسط اوراحالہ والہام کے ذریعہ، تاکہ یہ سب (یعنی چاروں صورتیں) امر مطلوب تک پہنچادیں۔

رہا قبض: تواس کی مثال وہ ہے جوحدیث میں آئی ہے کہ دجال ایک مؤمن بندے کو دوسری مرتبہ قتل کرنا چاہے گا پس اللہ تعالیٰ اس کواس کی قدرت نہیں دیں گے، قتل کے ارادے کے پکے ہونے اورآلات قتل کے درست ہونے کے باوجود۔

اور رہا بسط: تواس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چشمہ نکالا حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے ــــ اللہ کی بے پایاں رحمتیں ہوں ان پرــــ ان کے زمین پر ٹھوکر مارنے کے ذریعہ، حالانکہ عام طور پر ٹھوکر مارنا پانی پھوٹنے تک نہیں پہنچاتا اور اللہ نے اپنے بعض مخلص بندوں کو جنگ میں ایسے کام کی قدرت دی جو عقل میں نہیں آتی، اس جیسے بدنوں سے، اور نہ اس کے دو چند بدنوں سے۔

اور رہا احالہ: تواس کی مثال: آگ کو عمدہ ہوا بنانا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے۔

اور رہا الہام: تواس کی مثال: کشتی کو پھاڑنے، دیوار کو سیدھا کرنے اور لڑکے کو قتل کرنے کے واقعات ہیں۔ اور کتابوں اور قوانین کو انبیائے کرام پر اتارنا ہے۔

اورالہام: کبھی مبتلا بہ کو ہوتا ہے اور کبھی اس کے فائدے کے لئے اس کے علاوہ کو ہوتا ہے۔ اور قرآن عظیم نے تدبیر خداوندی کی انواع بیان کی ہیں اتنی تفصیل سے کہ ان پر اضافہ ممکن نہیں۔

لغات:

القُوی جمع ہے القوة کی بمعنی طاقت، صلاحیت ...... طَوْر (مصدر) ہیئت، حال، اندازہ جمع أطوار کہا جاتا ہے الناس أطوار یعنی لوگ مختلف قسم کے اور مختلف حالات کے ہیں ...... لامَحالة من الأمر: ضروری، بیشک ...... البِنْية: ڈھانچہ بِنْية الكلمة: صیغہ، مادہ ...... قبض (ن) قَبْضًا الشيئ: سمیٹنا ...... بسط (ن) بَسْطًا: پھیلانا، بڑھانا، کشادہ کرنا ...... أحال إحالةً: ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا ...... أَلْهَمَ إِلْهَامًا: وحی کرنا، سکھانا، توفیق دینا، دل میں ڈالنا۔

باب —— ۲

عالم مثال کا بیان

عالَم کے لغوی معنی ہیں: وہ چیز جس سے کوئی چیز جانی جائے، جیسے خاتَم: وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے اور عرف میں عالَم کہتے ہیں اس چیز کو جس سے اللہ تعالیٰ کو جانا جائے اور ساری مخلوقات کی یہی شان ہے یعنی کائنات کے ذرہ ذرہ سے خالق کو پہچانا جاسکتا ہے۔ اس لئے عالم کا اطلاق مجموعہ کائنات پر بھی ہوتا ہے اور اس کے اجزاء پر بھی بلکہ کائنات کے ہر ہر فرد پر بھی اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، جیسے عالم زید، عالم بکر وغیرہ۔ تفسیر روح المعانی میں ہے والعَالَم كالخاتَم، اسم لما يُعلم به، وغلب فيما يُعلم به الخالقُ تعالى شأنه، وهو كل ما سواه من الجواهر والأعراض، ويطلق على مجموع الأجناس، وهو الشائع، كما يُطلق على واحد منها فصاعدًا (۷۸:۱)

اور اجزائے عالم پر عالَم کا اطلاق مختلف اعتبارات سے کیا جاتا ہے مثلاً:

(۱) کوئی عالم کی دو قسمیں کرتا ہے روحانی اور جسمانی۔

(۲) کوئی عناصر کی دنیا کو عالم سِفلی اور عالم کون وفساد کہتا ہے اور افلاک اور ان کے اندر کی چیزوں کو عالم عُلوی کہتا ہے۔

(۳) کوئی حواس سے محسوس ہونے والی چیزوں کو عالم شہادت اور محسوس نہ ہونے والی چیزوں کو عالم غیب کہتا ہے۔

(۴) کوئی ان چیزوں کو جو غیر متعینہ مدت کے لئے مادہ کے بغیر پیدا کی گئی ہیں، جیسے عقول عشرہ اور نفوس، ان کو عالم امر، عالم ملکوت اور عالم غیب کہتا ہے اور جو چیزیں مادہ سے اجل مقرر کے لئے پیدا کی گئی ہیں، جیسے موالید ثلاثہ ان کو عالم خلق اور عالم شہادت کہتا ہے۔

(۵) کوئی عالم کی دو قسمیں کرتا ہے: عالم ارواح اور عالم اجسام۔

(۶) کوئی عالم کو ظاہر و باطن میں تقسیم کرتا ہے۔

(۷) اور رب العالمین کی تفسیر میں مفسرین ہر جنس کو علحدہ عالم قرار دیتے ہیں، جیسے عالم انس، عالم جن، عالم ملائکہ، عالم طیور، عالم وحوش وغیرہ اور اگر نیچے اتر کر انواع کے اعتبار سے عالم کی تقسیم کی جائے تو بے شمار عالم ہو جائیں گے۔

(۸) اور عرف عام میں عالم کی دو قسمیں کی جاتی ہیں: دنیا اور آخرت۔ اور برزخ جس کا دوسرا نام عالم قبر ہے وہ اسی دنیا کا حصہ ہے، جس میں آخرت کے احکام مترشح ہوتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ ایک نیا عالم ثابت کرتے ہیں اور اس کا نام عالم مثال رکھتے ہیں۔ مثال کے معنی ہیں مانند، ایک جیسی چیز، یہی معنی مِثل کے بھی ہیں ﴿لَیْسَ کَمِثْلِهِ شَیْءٌ﴾ حضرت فرماتے ہیں کہ بہت سی احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ کائنات میں ایک ایسا عالم بھی پایا جاتا ہے جو:

(۱) غیر مادی ہے یعنی عناصر اربعہ سے نہیں بنا۔

(۲) اس عالم میں معانی یعنی حقائق کے لئے بھی جسم ہیں اور یہ اجسام مثالی ہیں ہر معنی کو اس کی حالت کا لحاظ کر کے جسم دیا جاتا ہے مثلاً بزدلی کو خرگوش کا اور دنیا کو ایسی بوڑھی عورت کا جس کے سر کے بال کھچڑی ہو رہے ہوں۔

(۳) اس دنیا میں چیزیں پائے جانے سے پہلے عالم مثال میں پائی جاتی ہیں، وہاں ان کا تحقق مخصوص نوعیت کا ہے۔

(۴) پھر جب وہ چیزیں اس دنیا میں یعنی خارج میں پائی جاتی ہیں تو یہ اور وہ ایک ہوتی ہیں رہی یہ بات کہ اتحاد کی کیا نوعیت ہے؟ تو اس کی تعیین مشکل ہے، اتحاد کی مختلف صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے۔

(۵) اور بہت سی چیزیں وہ ہیں جن کے لئے عوام کے نزدیک جسم نہیں اور وہ عالم مثال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں، اور اترتی چڑھتی ہیں اگرچہ لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔

سوال: یہ عالم کہاں ہے؟

جواب: یہ عالم جس طرح مادی نہیں، مکانی اور زمانی بھی نہیں، اس لئے اس کی جگہ متعین نہیں کی جاسکتی، بس اتنا کہا جائے گا کہ ایسا عالم موجود ہے۔

سوال: اُس عالَم کا نام عالم مثال کیوں تجویز کیا گیا ہے؟

جواب: چونکہ عالم مثال میں دنیا و آخرت کی تمام چیزیں مثالی صورت میں پائی جاتی ہیں اس لئے اس کو عالم مثال نام دیا گیا ہے۔ مثال کے لئے دوسرا لفظ ظِلّ (سایہ) بھی استعمال کر سکتے ہیں یعنی عالم مثال میں تمام دنیوی اور اخروی چیزوں کے اظلال پائے جاتے ہیں، نمونے پائے جاتے ہیں اور صوفیہ کی اصطلاح میں مثال کے معنی عینیت کے ہیں (کشاف اصطلاحات الفنون ۲: ۱۳۴۱) پس عالم مثال کو اس وجہ سے بھی عالم مثال کہا جاتا ہے کہ اس عالم کی چیزیں اور اس

دنیا کی چیزیں بعینہ ایک ہیں۔

﴿باب ذکر عالَم المثال﴾

إعلم أنه دلّت أحاديثُ كثيرةٌ على أن في الوجود عالَما غيرَ عنصريٍّ، تَتَمَثَّلُ فيه المعاني بأجسام مناسِبَةٍ لها في الصفة، وتَتَحَقَّقُ هنالك الأشياءُ قبل وجودها في الأرض، نحوًا من التَّحَقُّقِ؛ فإذا وُجدت كانت هي هي، بمعنىً من معاني هو هو؛ وأن كثيرًا من الأشياء، مما لاجسم لها عند العامّة، تنتقل وتنزل، ولايراها جميعُ الناس.

ترجمہ: عالَم مثال کا تذکرہ: یہ بات جان لیجئے کہ بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ایک ایسا عالَم بھی موجود ہے جو مادی نہیں ہے، معانی اس عالم میں پائے جاتے ہیں ایسے جسموں کے ساتھ جو ان معانی کے ساتھ حالت میں مناسبت رکھنے والے ہیں اور چیزیں وہاں پائی جاتی ہیں، ان کے زمین میں پائے جانے سے پہلے، پائے جانے کی کسی نوعیت سے، پھر جب وہ چیزیں اس دنیا میں پائی جاتی ہیں تو وہ وہی ہوتی ہیں، اتحاد کے معانی میں سے کسی معنی کے اعتبار سے اور (احادیث اس پر بھی دلالت کرتی ہیں) کہ بہت سی چیزیں، ان چیزوں میں سے جن کے لئے عوام کے نزدیک جسم نہیں ہے، منتقل ہوتی ہیں اور اترتی ہیں درانحالیکہ ان کو سب لوگ نہیں دیکھتے۔

تشریح:

(۱) عُنصر عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں اصل۔ اور اصطلاح میں عنصر اس بسیط (غیر مرکب) اصل کو کہتے ہیں جس سے تمام مرکبات ترکیب پاتے ہیں۔ قدیم فلاسفہ کے نزدیک عناصر چار تھے، یعنی آگ، پانی، ہوا اور مٹی، انہی کو ارکان اور اصول کون وفساد بھی کہتے ہیں۔ قدیم فلاسفہ نے استقراء سے یہی چار عناصر دریافت کئے تھے۔ ان کے نزدیک موالید ثلاثہ انہی عناصر اربعہ سے مرکب ہیں جدید نظریہ کے لئے میری کتاب معین الفلسفہ دیکھیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عالم مثال مادی عالم نہیں یعنی وہ عناصر اربعہ سے مرکب نہیں۔

(۲) وجود کی دو قسمیں ہیں: خارجی اور نفس الامری، پس موجود کی بھی دو قسمیں ہیں:

(الف) موجود خارجی: یعنی وہ موجود جس کا ہمارے ذہن سے باہر خارج میں وجود ہے، جیسے زید، عمر، بکر کا وجود۔

(ب) موجود نفس الامری یعنی وہ موجود جس کا واقعی وجود ہے یعنی کسی کے ماننے پر موقوف نہیں، جیسے چار کا جفت ہونا اور پانچ کا طاق ہونا اور طلوع شمس اور وجود نہار کے درمیان تلازم: یہ سب واقعی چیزیں ہیں، خواہ اس کو ماننے والا کوئی ہو یا نہ ہو، اور خواہ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے، وہ ایک حقیقت ہیں، اعتبار معتبر پر موقوف نہیں۔

شاہ صاحب قدس سرہ وجود خارجی کے لئے ''وجود'' کا مادہ استعمال کرتے ہیں، اور وجود نفس الامری کے لئے

تحقُّق اور تمثُّل کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معانی، معنی کی جمع ہے۔ معنی کے لغوی معنی ہیں: مقصود اور مراد، اور اصطلاح میں حقیقت و ماہیت اور عقلی مفہوم کو بھی معنی کہتے ہیں۔ اور حقیقت و ماہیت ما بہ الشئ ھو ھو کو کہتے ہیں جیسے انسان کی ماہیت ہے حیوان ناطق کیونکہ اس سے انسان کا قوام ہے اور حیوان ناطق ایک عقلی مفہوم ہے، خارج میں مستقلاً اس کا وجود نہیں۔ عرف عام میں حقائق ومعانی کو''معنویات'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

غرض عالم مثال میں جس طرح اس دنیا کی مادیات (موجودات خارجیہ) کا مثالی وجود ہے، حقائق ومعانی کا بھی وہاں مثالی وجود ہے ہر حقیقت ومعنی کو اس کی صفت اور حالت کا لحاظ کر کے وہاں مثالی جسم دیا جاتا ہے جیسے موت کو مینڈھے کا جسم اور دنیا کو بوڑھی عورت کی شکل دی گئی ہے۔

(۴) نَحْواً من التحقُّق کا مطلب یہ ہے کہ عالم مثال میں اشیاء کا پایا جانا بالکل اس دنیا میں پائے جانے کی طرح نہیں ہے، البتہ اس کی پوری تفصیل ہم نہیں جانتے، بس اجمالاً اتنا کہیں گے کہ وہاں تحقق ہوتا ہے۔

(۶) مذکر کے لئے ھو ھو، اور مؤنث کے لئے ھی ھی، دو چیزوں میں اتحاد بتانے کے لئے محاورہ ہے ملکہ سباء نے یہ محاورہ استعمال کیا ہے ﴿قَالَتْ: كَأَنَّهُ هُوَ﴾ (النمل ۴۲) اور جنت میں اہل جنت یہ محاورہ استعمال کریں گے ﴿قَالُوْا: هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ (البقرۃ ۲۵) اور دو چیزوں میں اتحاد من کل الوجوہ نہیں ہوسکتا، ورنہ وہ دو کہاں رہیں گی؟ من وجہٍ ہی اتحاد ہوسکتا ہے، شیخ محمد اعلیٰ تھانویؒ نے کشاف اصطلاحات الفنون میں اس اتحاد کی متعدد صورتیں بیان کی ہیں، مثلاً:

(۱) ذاتی اتحاد، یعنی حملِ ایجابی ہو سکے، جیسے زیدٌ اِنسانٌ، پس زید اور انسان ایک ہی چیز ہیں۔

(۲) اتحاد فی المفہوم، جیسے أسد اور غضنفر کا ایک ہی مفہوم ہے، پس یہ دونوں متحد ہیں۔

(۳) متعدد چیزیں کسی خاص اعتبار سے متحد ہوں، جیسے افراد انسانی انسان ہونے کے اعتبار سے متحد ہیں۔

غرض اِس عالم کی چیزیں اور عالم مثال کی چیزیں وجود میں تو متحد نہیں، ورنہ وہ متعدد کیسے ہوں گی؟ پھر اتحاد کی کیا صورت ہے؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اتحاد کی مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے، اس کی تعیین مشکل ہے۔

عالم مثال پر دلالت کرنے والی روایات

اب ذیل میں شاہ صاحب رحمہ اللہ انیس (۱۹) نصوص پیش کرتے ہیں، جو عالم مثال کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، ان کی شرح ترجمہ کے ساتھ کردی جائے گی، اور طریق استدلال شاہ صاحب بعد میں خود ہی ذکر فرمائیں گے۔ یہ تمام

روایات بلفظ نہیں ہیں، بلکہ روایات کا خلاصہ ہیں۔

[الأحاديثُ الدالَّةُ على عالَم المثال]

[١] قال النبی صلی الله علیه وسلم: ﴿لما خلق الله الرَّحم قامت، فقالت: هذا مقام العائذبك من القطيعة﴾

[٢] وقال: ﴿إن البقرة وآل عمران تأتيان يوم القيامة، كأنهما غمامتان، أو غيايتان، أو فِرْقان من طير صوافَّ،تُحاجَّان عن أهلهما﴾

[٣] وقال: ﴿تجيئ الأعمال يوم القيامة: فتجيئ الصلاة، ثم تجيئ الصدقة، ثم يجيئ الصيام﴾ الحديثَ

[٤] وقال: ﴿ إن المعروف والمنكَر لخليقتان ،تُنصَبان للناس يوم القيامة: فأما المعروف فَيُبشر أهلَه، وأما المنكَر فيقول: إليكم! إليكم!، ولا يستطيعون له إلا لزومًا﴾

[٥] وقال: ﴿إن الله يَبْعث الأيَام يوم القيامة كَهيْئَتِها، ويبعث الجمُعة زهراء منيرةً﴾

[٦] وقال: ﴿ يُؤْتى بالدنيا يوم القيامة في صورةِ عجوزٍ شمْطاء، زرْقاءَ، أنْيَابُها بادية مُشوَّه خلْقُها﴾

[٧] وقال: ﴿ هل ترون ما أرى؟ فإنی لأَرى مواقع الفتن خلال بيوتكم كمواقع القطر﴾

[٨] وقال في حديث الإسراء: ﴿فإذا أربعةُ أنهارٍ: نهران باطنان، ونهران ظاهران؛ فقلت: ما هذا ياجبريل؟ قال: أما الباطنان ففی الجنة، وأماالظاهران فالنِّيل والفُرات﴾

[٩] وقال فی حديث صلاة الكسوف: ﴿صوِّرت لی الجنة والنار﴾وفی لفظ: ﴿بينی وبين جدار القبلة﴾ وفيه: ﴿أنه بسط يده ليتناول عُنقودا من الجنة، وأنه تكعكع من النار، ونفخ من حرِّها، ورأى فيها سارق الحجيج، والمرأةَ التی ربطت الهرة حتی ماتت، ورأى فی الجنة امْرأةً مومسة ، سقت الكلب﴾ ومعلوم أن تلك المسافة لاتتسع للجنة والنار ، بأجسادهما المعلومة عندالعامة

[١٠] وقال: ﴿حُفَّت الجنة بالمكاره، وحفت النار بالشهوات، ثم أمر جبريل أن ينظر إليهما﴾

[١١] وقال: ﴿ينزل البلاء فيعالجه الدعاء﴾

[١٢] وقال: ﴿خلق الله العقل ،فقال: أقبل ،فأقبل ،وقال له: أدبر فأدبر﴾

[١٣] وقال : ﴿هذان كتابان من رب العالمين ﴾ الحديثَ.

[١٤] وقال: ﴿يُؤْتى بالموت كأنه كبش، فَيُذبح بين الجنة والنار﴾

[۱۵] وقال تعالى: ﴿فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾

[۱۶] واستفاض فى الحديث:

[الف]أن جبريل كان يظهر للنبى صلى الله عليه وسلم ،ويَتَرَاءَ ى له، فيكلِّمه، ولا يراه سائر الناس.

[ب] وأن القبر يُفسح سبعين ذراعًا فى سبعين، أو يُضَمُّ حتى تختلفَ أضلاعُ المقبور؛

[ج] وأن الملائكة تنزل على المقبور، فتسأله،

[د] وأن عملَه يتمثل له.

[ه] وأن الملائكة تنزل إلى المحتضر، بأيديهم الحرير أو المِسْحُ؛

[د] وأن الملائكة تضرب المقبور بمطرقة من حديد، فيصيح صيحة يسمعها مابين المشرق والمغرب.

[۱۷] وقال النبى صلى الله عليه وسلم: ﴿لَيُسَلَّط على الكافر فى قبره تسعة وتسعون تِنِّيْنًا، تَنْهَسُه وتلدغه حتى تقوم الساعة﴾

[۱۸] وقال: ﴿إذا أدخلَ الميتُ القبر مُثِّلت له الشمس عند غروبها ،فيجلس يمسح عينيه، ويقول: دعونى أصلى﴾

[۱۹] واستفاض فى الحديث:

[الف] أن الله تعالى يتجلى بصور كثيرة لأهل الموقف.

[ب] وأن النبى صلى الله عليه وسلم يَدخُل على ربه، وهو على كرسيه؛

[ج] وأن الله تعالى يكلم ابن آدم شِفاهًا ؛ —— إلى غير ذلك مما لايحصى كثرةً

حدیث (۱) نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے ''ناتے'' کو پیدا کیا،تو وہ کھڑا ہوا،اوراس نے کہا کہ یہ قطع رحمی سے آپ کی پناہ چاہنے والے کی جگہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ جو تجھے کاٹے، میں اس کو اپنے سے کاٹوں،اور جو تجھے جوڑے میں اس کو اپنے سے جوڑوں؟ ناتے نے جواب دیا: ''میں اس پر راضی ہوں'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''جا یہ تیرے لئے ہے'' یعنی میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں (مشکوۃ باب البر والصلہ حدیث ۴۹۱۹)

تشریح: یہ بخاری ومسلم کی روایت ہے۔ رَحِـم (بچہ دانی) یعنی ددھیالی اور ننھیالی رشتہ داری۔رحم نے کھڑے ہوکر رحمان کی کمر میں کولی بھری تھی،رحمان نے پوچھا: کیا بات ہے؟ تب اس نے مذکورہ جملہ کہا تھا،جس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ جس طرح پناہ لینے کے لئے ماں کی کمر میں کولی بھرتا ہے،رحم نے بھی کولی بھری اور قطع رحمی سے پناہ چاہی،جس پر اس

سے مذکورہ وعدہ کیا گیا۔غور کیجئے ،ناتا ایک معنوی چیز ہے اس کا جسم نہیں ہے،مگر حدیث اس کے جسم دار ہونے پر دلالت کرتی ہے، یہ جسم مثالی جسم ہے جو اس کو عالم مثال میں ملا ہے۔

حدیث(۲)اور فرمایا کہ زَهْرا وَين (دو روشن سورتیں) بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو، وہ دونوں قیامت کے دن سفارشی بن کر حاضر ہونگی، گویا وہ دو بادل ہیں یا دو سائبان ہیں یا صف بستہ اڑنے والے پرندوں کی دو قطاریں ہیں، وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گی(یہ روایت مسلم و ترمذی وغیرہ بہت سی کتابوں میں مختلف الفاظ سے مروی ہے، دیکھئے الدر المنثور ۱:۱۸ مشکوۃ شریف فضائل القرآن حدیث ۲۱۲۰)

لغات:الغمام: بادل، اور ایک ٹکڑے کو غمامۃ کہتے ہیں، جمع غَمَائم ... الْغَيَايَة: ہر وہ چیز جو انسان پر سایہ فگن ہو، جیسے سائبان، چھتری، بادل وغیرہ ... الفِرْق: ہر چیز کا ٹکڑا... صواف جمع ہے صافّ (اسم فاعل) کی بمعنی صف بستہ۔

حدیث(۳)اور ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال حاضر ہوں گے، پس (سب سے پہلے) نماز آئے گی، پھر خیرات آئے گی، پھر روزہ آئے گا(آخر تک حدیث پڑھیے) یہ لمبی حدیث ہے، مسند احمد ۲:۳۶۲ مشکوۃ کتاب الرقاق حدیث ۵۲۲۴ دیکھیں۔ یہاں تو صرف اتنی بات سے غرض ہے کہ یہ اعمال جو جسم دار نہیں ہیں، قیامت کے دن اپنے مثالی اجسام کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

حدیث(۴)اور ارشاد فرمایا کہ معروف (اللہ کی مرضی کے موافق قول و فعل) اور منکر (اللہ کی مرضی کے خلاف قول و فعل) دو مخلوق ہیں، قیامت کے دن دونوں لوگوں کے لئے کھڑی کی جائیں گی۔پس معروف اپنے لوگوں کو خوش خبری دے گا اور رہا منکر تو وہ کہے گا:''ہٹو بچو'' مگر لوگ اس سے چپکتے ہی چلے جائیں گے(کنز العمال حدیث ۴۴۰۷)

حدیث(۵)اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام دنوں کو اٹھائیں گے، جیسے وہ ہیں، اور جمعہ کو اٹھائیں گے روشن چمکتا(مستدرک حاکم ۱:۲۷۷ کنز العمال حدیث ۲۰۹۱۰)

حدیث(۶)حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:''دنیا قیامت کے دن لائی جائے گی، ایسی بڑھیا کی شکل میں جس کے سر کے بال کھچڑی ہو رہے ہوں گے، جس کی آنکھیں نیلگوں ہونگی، جو دانت پھاڑ رہی ہوگی جو نہایت بدشکل ہوگی۔ وہ مخلوقات کو جھانک کر دیکھے گی۔لوگوں سے دریافت کیا جائے گا: اسے جانتے ہو؟ لوگ جواب دیں گے: پناہ بخدا! جو ہم اسے جانیں:! انہیں جتلایا جائے گا یہ وہ دنیا ہے جس کی خاطر تم باہم جھگڑتے تھے، رشتوں کو توڑتے تھے، ایک دوسرے پر جلتے تھے اور باہم بغض و نفرت رکھتے تھے اور دھوکے میں رہتے تھے! پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ پکارے گی:''میرے رب! میرے پیرو اور میرے چیلے کہاں ہیں؟'' اللہ عزوجل حکم دیں گے کہ اس کے مریدوں اور چیلوں کو اس کے ساتھ ملا دو!''(احیاء العلوم ۳:۱۸۶)

تشریح: دنیا کوئی حسی اور جسم دار چیز نہیں، وہ اس عالم کی حقیقت ہے، مگر قیامت کے دن وہ بڑھیا کی شکل میں آئے

گی، یہ عالم مثال میں اس کو ملی ہوئی شکل ہے۔

لغات: شَمْطاء مؤنث اَشْمَط کا، شَمِطَ (س) شَمَطًا سر میں کھچڑی بالوں والا ہونا...... زَرْقاءُ مؤنث اَزْرَق کا، جس کے معنی ہیں نیل گوں، آسمانی رنگ جیسا...... اَنْیَاب جمع نَابٌ کی، بمعنی دانت...... مُشَوَّہٌ بدشکل شَوِہَ یَشْوَہُ شَوْھًا: بدشکل ہونا...... خَلْق: بناوٹ۔

حدیث (۷) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ کے قلعوں میں سے کسی قلعہ پر چڑھے اور فرمایا کہ کیا تم وہ چیز دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں! آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہارے گھروں میں بارش کی طرح فتنوں کو گرتے دیکھ رہا ہوں (متفق علیہ، مشکوۃ کتاب الفتن حدیث ۵۳۸۷) فتنے بھی معنوی چیز ہیں اور ان کا بارش کی طرح برسنا مثالی جسم کے ساتھ تھا۔

حدیث (۸) اور معراج کی روایت میں فرمایا ہے کہ اچانک چار نہریں سامنے آئیں، دو باطنی یعنی یہ کر جنت میں جارہی تھیں، اور دو ظاہری یعنی یہ کر باہر آرہی تھیں آنحضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ باطنی دو نہریں جنت کی نہریں ہیں اور ظاہری دو نہریں نیل وفرات ہیں (متفق علیہ، مشکوۃ باب فی المعراج حدیث ۵۸۶۲)

تشریح: دریائے نیل وسطی افریقہ سے نکلتا ہے اور مصر میں داخل ہو کر بحر ابیض متوسط میں گرتا ہے اور فرات عراق میں ہے جو دجلہ میں شامل ہو کر خلیج فارس میں گرتا ہے۔ غرض یہ دونوں زمین کے دریا ہیں مگر حضور نے ان کو عالم بالا میں دیکھا ہے، یہ اُن کی مثالی صورتیں تھیں۔

حدیث (۹) اور سورج گہن کی نماز کی روایت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جنت وجہنم میرے لئے مصور کی گئیں اور ایک روایت میں ہے کہ میرے اور جدار قبلہ کے درمیان میں اور اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آپؐ نے ہاتھ بڑھایا تاکہ جنت سے انگور کا خوشہ لے لیں اور یہ بھی ہے کہ آپ دوزخ کی وجہ سے رک گئے اور گرمی سے پھونک ماری اور آپ نے جہنم میں حاجیوں کا سامان چرانے والے کو دیکھا، اور اس عورت کو دیکھا جس نے بلی کو باندھ کر بھوکے مار دیا تھا۔ اور آپ نے جنت میں ایک بدکار عورت کو دیکھا جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا —— اور یہ بات بدیہی ہے کہ اس مسافت میں (یعنی آپؐ کے اور جدار قبلہ کے درمیان میں) جنت وجہنم کی اس مقدار (طول وعرض) کے ساتھ جو عام لوگ بھی جانتے ہیں سمائی کہاں؟! (یہ مضمون مختلف حدیثوں کا خلاصہ ہے، جو صحاح میں وارد ہوئی ہیں)

حدیث (۱۰) اور ارشاد فرمایا کہ جنت ناگواریوں سے گھیری گئی ہے، اور جہنم خواہشات کے ساتھ گھیری گئی ہے، پھر جبرئیل کو حکم دیا کہ وہ دونوں کو دیکھیں (مشکوۃ کتاب الرقاق حدیث ۵۱۶۰) مکارِہ اور خواہشات بھی معنویات ہیں مگر ان کی باڑ باندھی گئی ہے اور حضرت جبرئیل نے ان کو دیکھا بھی ہے، یہ سب کچھ مثالی اجسام کے ذریعہ ہوا ہے۔

حدیث (۱۱) اور فرمایا کہ بلا اترتی ہے تو اس سے دعا کشتی لڑتی ہے یعنی دونوں میں کشاکشی ہوتی ہے (رواہ البزار والطبرانی

والحاکم،وقال صحیح الاسناد الترغیب والترہیب۲:۴۸۲)

حدیث(۱۲)اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا، پھر اس سے کہا:'' سامنے آ'' تو وہ سامنے آئی اور اس سے فرمایا کہ پیٹھ پھیر،تو اس نے پیٹھ پھیر لی، پھر اللہ نے فرمایا: میری عزت کی قسم! میں نے تجھ سے زیادہ پسندیدہ مخلوق پیدا نہیں کی، تیری وجہ سے میں لونگا اور دونگا اور تیری وجہ سے ثواب ہے اور تجھ پر سزا ہے،رواہ الطبرانی فی الکبیر والأوسط، وفیہ عمر بن ابی صالح ،قال الذهبی: لایُعرف (مجمع الزوائد۸:۲۸)

حدیث(۱۳)اور فرمایا: یہ دو کتابیں (رجسٹر) ہیں رب العالمین کی جانب سے (حدیث آخر تک پڑھیے) امام احمد، نسائی اور ترمذی نے یہ حدیث روایت کی ہے (فتح الباری۱۱:۴۸۸) ایک رجسٹر میں تمام جنتیوں کے نام تھے اور دوسرے میں دوزخیوں کے،اور آخر میں ٹوٹل تھا، جس میں کمی بیشی کا امکان نہیں۔

حدیث(۱۴)اور ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن موت کو مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور جنت و دوزخ کے درمیان اس کو ذبح کردیا جائے گا (متفق علیہ مسلم شریف کتاب الجنۃ ۱۷:۱۸۴ مصری)

آیت(۱۵)اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس ہم نے مریم کے پاس اپنی روح بھیجی، پس وہ ایک درست انسان کی طرح اس کے سامنے ظاہر ہوئی، (سورۂ مریم آیت ۱۷) عام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ روح سے جان مراد لیتے ہیں جو ایک امر ربّ اور معنوی چیز ہے، جس نے درست انسان کی شکل اختیار کی، یہی مثال جسم ہے۔

حدیث:(۱۶)اور بکثرت احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ:

(الف) حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے سامنے ظاہر ہوتے تھے، اور وہ آپ کو نظر آتے تھے، پس آپؐ ان سے باتیں کرتے تھے، اور ان کو دیگر لوگ نہیں دیکھتے تھے۔

(ب) اور یہ کہ قبر کشادہ کی جائے گی ستر در ستر ہاتھ (یعنی طول بھی ستر ہاتھ اور عرض بھی اتنا ہی اور ایک ہاتھ ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے، پس مربع گیارہ ہزار پچیس فٹ ہوگا۔اور یہ کشادگی نیک آدمی کے لئے ہوگی) یا قبر ملائی جائے گی، اتنی کہ میت کی پسلیاں ادھر اُدھر ہوجائیں گی (قبر کا یہ بھینچنا برے شخص کے لئے ہوگا)

(ج) اور یہ کہ فرشتے میت کے پاس آتے ہیں، پس اس سے سوالات کرتے ہیں۔

(د) اور یہ کہ میت کا عمل متشکل ہوکر اس کے سامنے آتا ہے۔

(ہ) اور یہ کہ فرشتے آتے ہیں قریب المرگ کے پاس، ان کے ہاتھوں میں ریشم ہوتا ہے یا ٹاٹ ہوتا ہے۔

(و) اور یہ کہ فرشتے میت کو لوہے کے گرز سے مارتے ہیں، پس وہ ایسی چیخ مارتا ہے جس کو ساری مخلوق سنتی ہے۔

حدیث:(۱۷)اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کافر پر اس کی قبر میں ننانوے اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں،

جو قیامت تک اس کو نوچتے اور ڈستے رہتے ہیں۔

حدیث: (۱۸) اور فرمایا: جب میت قبر میں اتاری جاتی ہے تو سورج اس کے لئے غروب کے وقت کی طرح متمثل ہوتا ہے، پس وہ اٹھ بیٹھتا ہے اور آنکھیں ملتا ہے اور کہتا ہے: ''مجھے چھوڑو، میں نماز پڑھ لوں'' (حدیث نمبر ۱۶ سے یہاں تک جتنی روایات ہیں ان کو سیوطی رحمہ اللہ کی شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور اور اس کی تلخیص بُشری الکئیب بلقاء الحبیب میں دیکھا جا سکتا ہے)

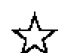
حدیث: (۱۹) اور احادیث میں یہ مضمون بھی بکثرت آیا ہے کہ:

(الف) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میدان محشر میں مختلف صورتوں میں تجلی فرمائیں گے۔

(ب) اور یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ رب العالمین میں تشریف لے جائیں گے، درانحالیکہ اللہ تعالیٰ اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوں گے۔

(ج) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے روبرو کلام فرمائیں گے —— وغیرہ وغیرہ اُن روایات میں سے جن کا شمار بوجہ کثرت ممکن نہیں۔

لغات: صَوَّرہ: تصویر بنانا ...... تَكَعْكَعَ: رک جانا ...... المومِسَة: بدکار وفاجرہ عورت ...... أومَسَتِ المرأة: بدکار ہونا ...... حَفَّ الشيئَ: گھیرنا ...... مَكَارِه جمع مَكْرَهَة کی: ناگوار خاطر بات ...... عَالَجَه: مشق کرنا، علاج کرنا ...... إقبال: سامنے سے آنا ...... إدبار: پیٹھ پھیر کر جانا ...... تَرَاءى دکھنا ...... تختلف: دائیں طرف کی پسلیوں کا ٹوٹ کر بائیں طرف کی پسلیوں میں گھس جانا اور اس کے برعکس ...... مقبور: دفن کیا ہوا یعنی میت ...... المِسْح: ٹاٹ ...... المِطْرقة: ہتوڑا، روئی دُھننے کا ڈنڈا ...... التِّنِّين: زہریلا اژدھا ...... نَهَسَ اللحمَ گوشت کو اگلے دانتوں سے نوچنا۔

مذکورہ روایات میں غور کرنے کے تین طریقے

مذکورہ بالا روایات میں غور کرنے کے تین طریقے ہیں:

① اُن روایات کو ظاہر پر محمول کیا جائے یعنی بظاہر اُن کا جو کچھ مفہوم ہے اس کو مان لیا جائے، اس صورت میں عالم مثال کو ماننا پڑے گا، کیونکہ ان روایات کی توجیہ عالم مثال کو مانے بغیر ممکن نہیں، عالم مثال کو مان کر یہ توجیہ ہوگی کہ مذکورہ بالا روایات میں بیان فرمودہ تمام باتیں واقعی اور نفس الامری ہیں، اور ان کے اجسام ان کے مثالی پیکر ہیں۔ محدثین کرام کا اصول اسی بات کو مقتضی ہے کہ ان روایات کو ان کے ظاہر پر محمول کیا جائے، ان کی کوئی تاویل نہ کی جائے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (متوفی ۹۱۱ھ) نے اس قاعدہ پر تنبیہ کی ہے اور شاہ صاحب کا مزاج بھی یہی ہے۔ چنانچہ آپ نے انہی روایات کی بنیاد پر عالم مثال کو ثابت کیا ہے۔

(۲) ان روایات کی یہ تاویل کی جائے کہ وہ صرف آدمی کا احساس ہے، خارج میں ان میں سے کوئی چیز موجود نہیں، جیسے خواب دیکھنے والا جو امور خواب میں دیکھتا ہے وہ صرف اس کا احساس ہوتا ہے، ان میں سے کوئی چیز خارج میں موجود نہیں ہوتی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی توجیہ درج ذیل آیت میں کی ہے۔ سورۃ الدخان آیت ۱۰ و ۱۱ میں ارشاد ہے۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ، يَغْشَى النَّاسَ، هٰذَا عَذَابٌ أَلِيْمٌ	سو آپ (کفار مکہ کے لئے) اس دن کا انتظار کیجئے جبکہ آسمان ایک واضح دھواں لے آئے، جو ان سب لوگوں پر عام ہو جائے۔ یہ دردناک سزا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: یہ نشانی پائی جاچکی ہے مکہ میں سخت قحط پڑا، لوگوں نے مردار، چمڑے اور ہڈیاں تک کھائیں اور صورت حال یہ ہوگئی کہ جب وہ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو بھوک کی وجہ سے، ان کو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا، آسمان نظر ہی نہیں آتا تھا۔ حالانکہ خارج میں کوئی دھواں نہیں تھا، یہ صرف ان بھوکوں کا احساس تھا۔ یہ روایت الدر المنثور ج۶ ص ۲۸ میں ہے[1]

اور محدث کبیر ابن الماجشون[2] رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جن احادیث میں اللہ تعالیٰ کا میدان حشر میں اترنا اور قیامت کے روز بندوں کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا مروی ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی نگاہوں میں تغیر کر دیں گے، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کو اترتا، تجلی فرماتا، مخلوق سے سرگوشی کرتا اور باتیں کرتا دیکھیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی، نہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسا اس لئے کریں گے تاکہ بندے جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے شرح السنہ (۸:۱۵۴ باب آخر من یخرج من النار) میں عبدالعزیز بن ابی سلمہ الماجشون کا یہ قول ذکر کیا ہے انکے الفاظ ہیں: **إن الله ليس يتغير عظمته، ولكن عيناك يُغَيِّر هما حتى تراه كيف شاء اهـ**

(۳) یا ان روایات کو مضمون فہمی کے لئے پیرایۂ بیان قرار دیا جائے، مثلاً قبر میں پہنچنے والی تکلیف اور راحت کو مختلف

---

[1] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ نشانی ابھی ظاہر نہیں ہوئی، قیامت کے قریب ظاہر ہوگی، واقعی دھواں آسمان کو ڈھک لے گا، اور چالیس دن تک یہ کیفیت رہے گی۔ دیکھئے الدر المنثور آیت مذکورہ کی تفسیر ۱۲

[2] ماجشون: ماہ گوں کا معرب ہے محدث عبدالعزیز بن عبدالملک بن ابوسلمہ کے دادا ابوسلمہ بہت سرخ تھے، اس لئے ان کا یہ لقب ہو گیا تھا پھر یہ پورے خاندان کا لقب ہو گیا ۱۲

انداز سے سمجھایا گیا ہے کہ سوال وجواب ہوں گے، کوئی صحیح جواب دے گا اور کوئی ہاہا کر کے رہ جائے گا، کسی کو قبر بھینچے گی تو کسی کے لئے ۷۰×۷۰ کشادہ کی جائے گی، کسی کے لئے جنت کی طرف دریچہ کھولا جائے گا تو کسی پر فرشتے گرز بجائیں گے اور اس کو سانپ بچھو نوچیں گے اور ڈسیں گے۔ یہ سب قبر میں پیش آنے والے رنج وراحت کو سمجھانے کے لئے پیرایۂ بیان ہے اور بس۔

مگر شاہ صاحب کے نزدیک جو شخص صرف یہ تیسری توجیہ کرتا ہے وہ اہل حق میں سے نہیں، گمراہ ہے۔ باطل فرقے نصوص کی اسی طرح تاویل کیا کرتے ہیں۔

> والناظر في هذه الأحاديث بين إحدى ثلاث:
>
> [۱] إما أن يُقِرَّ بظاهرها، فيضطرَّ إلى إثبات عالَم، ذكرنا شأنَه؛ وهذه هي التي تقتضيها قاعدة أهل الحديث؛ نَبَّهَ على ذلك السُّيوطي ــ رحمه الله تعالى ــ وبهاأقول، وإليها أذهب.
>
> [۲] أو يقول: إن هذه الوقائع تَتَرَاءَ ى لحس الرائي،وتتمثل له في بصره، وإن لم تكن خارجَ حسّه؛وقال بنظير ذلك عبد الله بن مسعود في قوله تعالى: ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ﴾: إنهم أصابهم جَدْبٌ، فكان أحدهم ينظر إلى السماء، فيرى كهيئة الدخان من الجوع؛ ويُذكر عن ابن الماجِشون: أن كل حديث جاء في التنقل والرؤية في المحشر، فمعناه: أنه يغيِّر أبصارَ خلقه، فيرونه نازلاً متجلّيا،ويناجي خلقه ويخاطبهم، وهو غير متغير عن عظمته، ولا منتقل،ليعلموا أن الله على كل شيئ قدير.
>
> [۳] أويجعلها تمثيلا لِتَفهِيمِ معانٍ أخرى؛ ولستُ أرى المقتصِرَ على الثالثة من أهل الحق.

ترجمہ: اور ان حدیثوں میں غور کرنے والا تین صورتوں میں سے کسی ایک کے درمیان ہے:

(۱) یا تو یہ کہ وہ ان احادیث کے ظاہر کا اقرار کرے، تو وہ مجبور ہوگا ایک ایسے عالم کو ثابت کرنے کی طرف جس کا حال ہم نے (باب کے شروع میں) ذکر کیا ہے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس کو محدثین کا قاعدہ چاہتا ہے، سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر تنبیہ کی ہے، اور اسی کا میں قائل ہوں اور اسی کی طرف میں جاتا ہوں۔

(۲) یا وہ یہ کہے کہ یہ واقعات دیکھنے والے کے حواس کو دکھتے ہیں، اور وہ دیکھنے والے کی نگاہ میں متشکل ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے حواس سے باہر وہ واقعات موجود نہیں ہیں اور اسی قسم کی بات حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی ہے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ﴾ کی تفسیر میں کہ ان کو قحط سالی پہنچی، پس ان میں سے ایک شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا، پس وہ بھوک کی وجہ سے دھویں جیسا دیکھتا تھا۔ اور ابن الماجشون (تابعی) سے نقل

کیا جاتا ہے کہ ہر وہ حدیث جو وارد ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کے منتقل ہونے کے بارے میں اور میدان قیامت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے بارے میں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی نگاہوں میں تبدیلی کر دیں گے، پس وہ اللہ تعالیٰ کو اترتا، تجلی فرماتا دیکھیں گے اور اللہ اپنی مخلوق سے سرگوشی فرمائیں گے اور ان سے بات چیت کریں گے درانحالیکہ وہ اپنی عظمت سے نہیں بدلیں گے، نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوں گے۔ تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

(۳) یا ان روایات کو پیرایۂ بیان گردانے، دوسرے معانی کو سمجھانے کے لئے اور میں اس تیسری توجیہ پر اکتفا کرنے والے کو اہل حق میں سے نہیں سمجھتا۔

تصحیح: لتفهيم معانٍ أخرى: مطبوعہ نسخہ میں لِتَفهُّم إلخ تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

امام غزالی رحمہ اللہ کا تائیدی حوالہ

امام غزالی[1] رحمہ اللہ نے إحیاءُ علومِ الدین (۴: ۴۲۷) میں عذابِ قبر کی بحث میں نصوص کی توجیہ کے یہ تینوں طریقے بیان کئے ہیں آپ نے پہلے قبر میں پہنچنے والی رنج وراحت کی روایات لکھی ہیں، پھر ارشاد فرمایا ہے کہ ان روایات کے ظاہری معنی درست ہیں اور ان میں مخفی راز ہیں، جو اہل بصیرت پر واضح ہیں، اس لئے عوام کی سمجھ میں اگر ان کی حقیقتیں نہ آئیں تو بھی ان کے ظاہری معنی کا انکار نہیں کرنا چاہئے، ایمان کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ ان کو مان لیا جائے۔

سوال: یہ روایات ہم کیسے مان لیں، یہ روایات تو مشاہدہ کے خلاف ہیں؟! بعض لاشیں عرصۂ دراز تک کسی مصلحت سے محفوظ رکھی جاتی ہیں، ان کو دفن نہیں کیا جاتا، ممی کر کے ان کو رکھا جاتا ہے، یا سرد خانہ میں پڑی رہتی ہیں، مگر وہاں نہ تو کوئی سانپ ہوتا ہے، نہ بچھو، پھر ہم مشاہدہ کے خلاف عذاب قبر کی یہ روایات کیسے مان لیں؟!

جواب: اس قسم کی روایات کو ماننے کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت: جو زیادہ واضح، زیادہ صحیح اور زیادہ محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ عذاب قبر کی تمام روایات کو ظاہر پر محمول کیا جائے، اور مان لیا جائے کہ یہ تمام معاملات قبر میں پیش آتے ہیں، گو ہمیں نظر نہیں آتے؛ اس لئے کہ ہماری یہ آنکھیں

[1] غزالی میں اختلاف ہے کہ لفظ زاء کی تشدید کے ساتھ غزّالی ہے یا تخفیف کے ساتھ غزَالی ہے؟ اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ سوت کاتنے کی طرف نسبت ہے تو تشدید کے ساتھ ہے، اس صورت میں یہ حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد بن محمد طوسی رحمہ اللہ (۴۵۰-۵۰۵ھ = ۱۰۵۸-۱۱۱۱ء) کا خاندانی لقب ہے۔ خود امام صاحب نے سوت نہیں کاتا اور اگر یہ طوس (ایران) کے قریب غزالہ نامی گاؤں کی طرف نسبت ہے تو زاء کی تخفیف کے ساتھ ہے ۱۲

عالمِ مشاہدہ کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے ہیں، دوسرے عالم کی چیزوں کا یہ آنکھیں مشاہدہ نہیں کرسکتیں، جیسے مجلس ذکر میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں، اور اہل محفل کو گھیر لیتے ہیں، مگر وہ ہمیں نظر نہیں آتے، کیونکہ فرشتے دوسرے عالم کی مخلوق ہیں۔
اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضور ﷺ کے پاس تشریف لاتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کو مانتے تھے، اگرچہ وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو نہیں دیکھتے تھے اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ آنحضور ﷺ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نظر آرہے ہیں۔

اور اگر کوئی اس بات کو جسے صحابہ مانتے تھے، نہیں مانتا تو اس کو اپنے ایمان کی خبر لینی چاہئے، اس کا وحی اور فرشتوں پر ایمان ہی صحیح نہیں، اور جو شخص اسے مانتا ہے اور یہ بات اس کے نزدیک ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ کو وہ چیزیں نظر آئیں جو عام امت کو نظر نہ آئیں تو پھر عذاب قبر میں وہ یہ بات کیوں نہیں مانتا؟! غرض قبر میں جو عذاب ہوتا ہے اور جو راحتیں پہنچتی ہیں، وہ واقعی چیزیں ہیں، مگر وہ دوسری دنیا کی چیزیں ہیں، اس لئے وہ ہمیں نظر نہیں آتیں۔

دوسری صورت: قبر میں پیش آنے والے معاملات اگرچہ خارج میں موجود نہیں ہوتے مگر میت کو وہ محسوس ہوتے ہیں، جیسے خواب کا معاملہ ہے، کوئی خواب میں بادشاہ بنایا جاتا ہے، ٹھاٹھ سے حکومت کرتا ہے اور کوئی جیل میں پہنچایا جاتا ہے، پولیس والے اس پر ڈنڈے بجاتے ہیں، اور وہ بری طرح چلاتا ہے مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ خواب تھا حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔

مگر خواب کا خواب ہونا آنکھ کھلنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے، خواب (نیند) میں تو آدمی پیش آنے والے واقعات کو حقیقت سمجھتا ہے، اسی طرح قبر کا معاملہ ہے مگر قبر میں قیامت تک آنکھ نہیں کھلے گی، اس لئے وہ واقعات حقیقت ہی رہیں گے۔

غرض خواب میں جس طرح خواب دیکھنے والے کے دل ودماغ میں یہ کیفیت پیدا کردی جاتی ہے اور خارج میں اُن چیزوں کا وجود نہیں ہوتا، اسی طرح عذاب قبر کا معاملہ ہے، اور جس طرح خواب دیکھنے والے کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا، اسی طرح زندوں کو میت کے پاس کچھ نظر نہیں آتا، مگر میت کے احساس میں سب کچھ ہوتا ہے۔

تیسری صورت: عذاب قبر کی روایات کو ایک پیرایۂ بیان قرار دیا جائے، ان روایات سے مقصود یہ مضمون سمجھانا ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں میت کس قسم کی تکالیف سے دوچار ہوتی ہے اور مقصود صرف پیرایۂ بیان نہیں، بلکہ وہ حقیقت مقصود ہے جس کو سمجھانے کے لئے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ جیسے سانپ کا کاٹنا اصل مقصود نہیں، بلکہ اس کے کاٹنے سے جو زہر بدن میں سرایت کرتا ہے وہ مقصود ہے۔ بلکہ زہر بھی اصل مقصود نہیں، مقصود وہ تکلیف ہے جو زہر کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے، بعض لوگ اپنے بدن کو مختلف تدابیر سے "زہر پُروف" بنالیتے ہیں، پھر وہ سانپ پالتے ہیں، ان کو اول تو سانپ کاٹتے نہیں، اور کاٹیں تو ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، ان کے حق میں سانپ کا کاٹنا نہ کاٹنا برابر ہوتا ہے۔

اس کے بالمقابل اگر کسی کو زہر کا انجکشن دیدیا جائے اور اس کو سانپ کے کاٹنے جیسی تکلیف ہو، تو یہ انجکشن دینا بھی سانپ کا کاٹنا ہے، اگرچہ اس کو سانپ نے نہیں کاٹا، مگر اس کو سمجھانے کے لئے سانپ کے کاٹنے، اور اژدھوں کے ڈسنے اور نوچنے کا پیرایۂ بیان اختیار کرنا ضروری ہوگا، جیسے ''جماع کی لذت'' سمجھانے کے لئے ''صحبت'' کا پیرایۂ بیان اختیار کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح تمام ''اسباب'' مقصود نہیں ہوتے، مقصود ان کا ''نتیجہ'' ہوتا ہے، جیسے کھانے سے مقصود شکم سیری ہے اور پانی پینے سے مقصود سیرابی ہے اگر کوئی کھائے بغیر شکم سیر ہوجائے یا پانی پیئے بغیر سیراب ہوجائے یا صحبت کئے بغیر اس کو لذت جماع حاصل ہو تو مقصود حاصل ہو گیا، اگرچہ صورت نہیں پائی گئی، صوم وصال کی حدیث میں ارشاد نبوی ہے ﴿إن ربی یُطعمنی ویَسْقِینی﴾ اس میں یہی حقیقت سمجھائی گئی ہے۔ اسی طرح سانپوں کا کاٹنا جو سبب اَلَم ہے وہ مقصود نہیں، مقصود اس کا نتیجہ ہے جو عذاب قبر کی صورت میں موجود ہے، گو صورت موجود نہیں۔

سوال: قبر میں جو رنج وراحت پہنچتی ہے، اس کا راز کیا ہے؟ یعنی اس کا سبب کیا ہے؟

جواب: انسان کی خوبیاں قبر میں راحتوں کی مختلف شکلیں اختیار کرلیتی ہیں، اور بری صفات: تباہ کن اور تکلیف دہ عذاب کی شکلیں اختیار کرلیتی ہیں پس دنیا میں اعمال صالحہ کرکے خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں تاکہ وہ قبر میں راحتوں کا سبب بنیں۔ اور برے اعمال سے بچنا چاہئے تاکہ بری صفات پیدا نہ ہوں جو عذاب قبر کا سبب بن جائیں۔

وقد صوَّر الإمام الغزالی فی عذاب القبر تلك المقاماتِ الثلاث، حیث قال:

أمثالُ هذه الأخبار لها ظواهرُ صحیحةٌ، وأسرارٌ خفیةٌ ،ولکنها عند أرباب البصائر واضحة؛ فمن لم تنکشف له حقائقُها فلاینبغی أن یُنکر ظواهِرَها،بل أقلُّ درجات الإیمان: التسلیمُ والتصدیق.

فإن قلت : فنحن نُشاهد الکافر فی قبره مدة، ونُراقبه، ولانشاهد شیئًا من ذلك ،فما وجه التصدیق علی خلاف المشاهدة؟

فاعلم أن لك ثلاثَ مقاماتٍ فی التصدیق بأمثال هذا:

أحدها — وهو الأظهرو الأصحُّ والأسلم —:أن تُصَدِّق بأنها موجودة، وهی تلدغ المیتَ، ولکنك لاتشاهد ذلك، فإن هذه العین لاتصلح لمشاهدة الأمور الملکوتیة؛ وکلُّ ما یتعلق بالآخرة فهو من عالَم الملکوت، أما تری الصحابة — رضی الله عنهم — کیف کانوا یؤمنون بنزول جبریل علیه السلام وما کانوا یشاهدونه، ویؤمنون بأنه علیه السلام یشاهده؛ فإن کنت لاتؤمن بهذا فتصحیح أصل الإیمان بالملائکة والوحیِ أهَمُّ علیك؛ وإن کنت آمنت به،

وجوَّزْت أن يشاهِدَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم مالا تُشاهدُه الأمة، فكيف لاتجوِّز هذا في الميت؟ وكما أن الملَك لايُشبه الآدميين والحيواناتِ، فالحيَّاتُ والعقارب التي تَلْدغ في القبر ليست من جنس حَيَّاتِ عالَمنا، بل هي جنس آخر، وتُدرَك بحاسة أخرى،

المقام الثاني: أن تَتَذَكَّر أمرَ النائم، وأنه قد يرى في نومه حيةً تلدغه، وهو يتألم بذلك، حتى تراه ربما يصيح ويعرِق جبينُه، وقد ينزعج من مكانه؛ كلَّ ذلك يُدْرِكه من نفسه، ويتأذى به كما يتأذى اليقظان، وهو يشاهده، وأنت ترى ظاهِرَه ساكنا، ولا ترى حَوَالَيْه حيةً ولا عقربا؛ والحيةُ موجودة في حقه، والعذاب حاصل، ولكنه في حقك غير مشاهَد؛ وإذا كان العذاب في ألم اللدغ، فلا فرق بين حية تتخيل أو تُشاهَد.

المقام الثالث: إنك تعلم أن الحية بنفسها لا تُؤْلِم، بل الذي يلقاك منها هو ألم السُّم؛ ثم السم ليس هو الألم، بل عذابُك في الأثر الذي يحصل فيك من السم، فلو حصل مثلُ ذلك الأثر من غيرسُمٍّ، لكان العذاب قد توَفَّر؛ وكان لايمكن تعريف ذلك النوع من العذاب إلا بأن يُضاف إلى السبب الذي يُفْضي إليه في العادة؛ فإنه لو خُلق في الإنسان لذةُ الوقاع — مثلاً — من غير مباشرة صورةِ الوقاع، لم يمكن تعريفها إلا بالإضافة إليه، لتكون الإضافة للتعريف بالسبب؛ وتكون ثمرةُ السبب حاصلةً، وإن لم تَحصَّل صورةُ السبب، والسببُ يُراد لثمرته، لالذاته، وهذه الصفات المهلكات تنقلب مؤذيات ومؤلمات في النفس عند الموت، فيكون آلامها كآلام لدغ الحيات من غير وجودها (انتهى)

ترجمہ: اور امام غزالی رحمہ اللہ نے عذاب قبر کے بیان میں اِن تینوں مواقف کو خوب کھول کر سمجھایا ہے، جہاں وہ فرماتے ہیں:

اس قسم کی روایتوں کے ظاہری صحیح معنی ہیں، اور مخفی راز ہیں مگر وہ ارباب بصیرت پر واضح ہیں، پس جس پر ان روایات کی حقیقت منکشف نہ ہو، اس کے لئے زیبا نہیں کہ وہ ان روایات کے ظاہری معنی کا انکار کرے، بلکہ ایمان کا کم سے کم درجہ تسلیم کرنا اور مان لینا ہے۔

پس اگر آپ پوچھیں کہ ہم ایک کافر کو مدت تک اس کی قبر میں دیکھتے ہیں، اور ہم اس کی نگرانی کرتے ہیں، اور ہم اُن چیزوں میں سے (جن کا روایات میں تذکرہ آیا ہے) کچھ بھی نہیں دیکھتے، پھر مشاہدہ کے خلاف ماننے کی کیا صورت ہے؟

تو آپ جان لیں کہ آپ کے لئے اس قسم کی روایتوں کے ماننے کی تین طریقے ہیں:

ان میں سے ایک — اور وہی واضح تر، صحیح تر، اور محفوظ تر ہے — یہ ہے کہ آپ مان لیں کہ وہ چیزیں موجود ہیں،

اور وہ میت کو ڈس رہی ہیں، مگر آپ کو وہ چیزیں نظر نہیں آرہیں، کیونکہ یہ آنکھیں "ملکوتی امور" کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، اور ہر وہ چیز جو دارِ آخرت[1] سے تعلق رکھتی ہے وہ عالم ملکوت کی چیز ہے[2]۔ کیا آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح ایمان رکھتے تھے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اترنے پر، حالانکہ وہ ان کو نہیں دیکھتے تھے، اور صحابہ یہ بھی مانتے تھے کہ آنحضور ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھتے ہیں۔ پس اگر تیرا اس پر ایمان نہیں ہے تو ملائکہ اور وحی پر ایمان کی بنیاد کو صحیح کرنا تیرے لئے زیادہ اہم ہے (عذاب قبر کی بحث میں الجھنے سے) اور اگر تو اس پر ایمان رکھتا ہے اور اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اُن باتوں کو دیکھیں، جن کو امت نہیں دیکھتی، تو پھر یہ بات میت کے حق میں کیوں جائز نہیں سمجھتا؟ اور جس طرح یہ بات ہے کہ فرشتہ انسان اور حیوان کے مشابہ نہیں، اسی طرح قبر میں جو سانپ اور بچھو ڈستے ہیں وہ بھی ہماری دنیا کے سانپوں کی جنس سے نہیں ہیں، بلکہ وہ اور جنس ہیں، اور ان کا ادراک اور حاسہ سے کیا جاتا ہے (حواس خمسہ سے ان کا ادراک نہیں کیا جاتا)

دوسرا مقام: یہ ہے کہ آپ سونے والے کا معاملہ سوچیں، اور یاد کریں کہ وہ خواب میں کبھی ایسے سانپ دیکھتا ہے جو اس کو ڈستے ہیں، اور وہ اس ڈسنے سے تکلیف اٹھاتا ہے حتی کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ کبھی چلاتا ہے، اس کی پیشانی پسینہ آلود ہو جاتی ہے اور کبھی وہ اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں سونے والا بذات خود محسوس کرتا ہے اور اس سے ویسی ہی تکلیف اٹھاتا ہے جیسی بیدار آدمی اٹھاتا ہے، اور وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے، اور آپ اس کے ظاہر کو پُرسکون دیکھتے ہیں اور آپ کو اس کے اردگرد نہ کوئی سانپ نظر آتا ہے، نہ کوئی بچھو، حالانکہ سانپ اس کے حق میں موجود ہیں، اور اس کو عذاب ہو رہا ہے، مگر وہ آپ کے حق میں مُشاہَد (نظر آنے والا) نہیں ہے۔ اور جب سزا سانپ کے کاٹنے کی تکلیف میں ہے تو پھر خیالی سانپ میں اور نظر آنے والے میں کیا فرق ہے؟!

تیسرا مقام: یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ سانپ بذات خود تکلیف دہ نہیں، بلکہ تکلیف دہ وہ زہر ہے جو سانپ میں سے آپ سے ملاقات کرتا ہے، پھر زہر بھی تکلیف دہ نہیں، بلکہ تیری سزا اس اثر میں ہے جو زہر کی وجہ سے تیرے اندر پیدا ہوتا ہے۔ پس اگر اس قسم کا اثر زہر کے بغیر پایا جائے تو سزا یقیناً کامل و مکمل ہوگی۔

مگر اس قسم کی سزا کو سمجھانا ممکن نہیں، مگر اس سبب کی طرف منسوب کر کے جو عادۃً اس سزا تک پہنچاتا ہے، مثلاً انسان میں جماع کی صورت اختیار کئے بغیر جماع کی لذت پیدا کی جائے تو اس کو سمجھانا ممکن نہیں، مگر جماع کی طرف منسوب

---

[1] آخرت فی الحال موجود ہے اور عام لوگ جو سمجھتے ہیں کہ آخرت، دنیا ختم ہونے کے بعد قائم ہوگی، یہ خیال صحیح نہیں، فی الحال دو دار موجود ہیں، ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ دارِ دنیا ہے اور فرشتے اور جنت وجہنم جس دار میں ہیں، وہ دارِ آخرت ہے

[2] ملکوت: فرشتوں سے تعلق رکھنے والے معاملات کو کہا جاتا ہے اور چونکہ فرشتوں کا تعلق دارِ آخرت سے ہے، اس لئے آخرت سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں ملکوتی کہلاتی ہیں ۱۲

کرنے کے ذریعہ (یعنی تفہیم کے لئے یہ پیرایۂ بیان اختیار کرنا پڑے گا) تا کہ یہ منسوب کرنا سبب کے ذریعہ بات سمجھانے کے لئے ہو اور (اس صورت میں) سبب کا ثمرہ موجود ہوگا، گو سبب کی صورت موجود نہ ہو۔ اور سبب: ثمرہ ہی کے لئے مقصود ہوتا ہے، فی نفسہ مقصود نہیں ہوتا۔

اور یہ تباہ کن صفات، نفس کے لئے موت کے وقت تکلیف دہ اور رنج دہ ہو جاتی ہیں، پس ان صفات کا تکلیف دینا سانپوں کے ڈسنے کی تکلیف رسانی کی طرح ہو جاتا ہے، سانپوں کے وجود کے بغیر (امام غزالی رحمہ اللہ کی بات پوری ہوئی)

خلاصہ یہ ہے کہ عذاب قبر کی روایات کو یا تو ظاہر پر محمول کیا جائے اور یہی سب سے بہتر صورت ہے، یا ان کو رائی یعنی میت کا احساس کہا جائے یا ان کو قبر کی رنج و راحت سمجھانے کا پیرایۂ بیان قرار دیا جائے۔ یہی تین توجیہیں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے باب کے شروع میں مذکور روایات کی کی ہیں۔

نوٹ: امام غزالی رحمہ اللہ کی عبارت میں دو تصحیحیں احیاء العلوم سے کی گئی ہیں: (۱) فلو حصل حجۃ اللہ میں فاذا حصل تھا (۲) تنقلب مؤذیات و مؤلمات حجۃ اللہ میں تنقلب مھلکات مؤذیات و مؤلمات تھا۔

☆ ☆ ☆

باب ــــ۳

مَلأ اعلیٰ (مقرب فرشتوں) کا بیان

مَلأٌ اسم جمع ہے، اس کی جمع أَمْلاَءٌ ہے۔ مَلَأٌ کے لغوی معنی ہیں بھرنا اور اصطلاح میں قوم کے سرداروں کو کہا جاتا ہے، کیونکہ قوم کا سردار جب میر محفل ہوتا ہے تو لوگوں کے دلوں کو ہیبت وعظمت سے، اور آنکھوں کو اپنے حسن و جمال سے بھر دیتا ہے، کسی مجمع میں جب کوئی عام آدمی آتا ہے تو کوئی اس کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مگر جب کوئی اہم آدمی آتا ہے تو سارا مجمع ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا ہے۔

قرآن کریم میں فرعون کے قصہ میں یہ لفظ بار بار آیا ہے اور وہاں ''ارکان دولت'' مراد ہیں، اسی طرح انبیاء کی اقوام کے سرداروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اور چونکہ یہ لفظ اسم جمع ہے اس لئے قوم کی جماعت اور اشراف قوم کے لئے مستعمل ہوتا ہے، ایک فرد کے لئے مستعمل نہیں ہوتا۔

قرآن کریم اور احادیث میں یہ لفظ فرشتوں کے لئے بھی آیا ہے۔ سورۂ ص آیت ۶۹ میں اور ترمذی شریف کی ایک حدیث میں جس کو شاہ صاحب رحمہ اللہ ذکر فرمائیں گے، یہ لفظ عالم بالا کے معزز فرشتوں کے معنی میں آیا ہے، پس ملأ اعلیٰ کے معنی ہیں ''عالم بالا کے معزز فرشتے'' اور ہر فرشتہ معزز ہوتا ہے پس یہ وصف صفت کاشفہ ہے اس کا مقابل ملأ سافل ہے،

اس کے معنی ہیں آسمانوں اور زمین کے چھوٹے درجے کے فرشتے، عالم زیریں کے فرشتے۔ شاہ صاحب آگے بتائیں گے کہ ملائکہ مقربین کے لئے یہ لفظ باہمی اجتماع کی وجہ سے استعمال کیا جاتا ہے جیسے مجلس شوریٰ، اور ایوان بالا وغیرہ۔

ملائکہ کا انسان سے خاص تعلق ہے، فرشتے انسان کی مصلحت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، آگے کتاب میں یہ مضمون تفصیل سے آرہا ہے، یہ دنیا انسان کے فائدہ کے لئے انسان کے وجود سے بہت پہلے پیدا کردی گئی تھی تاکہ جب انسان وجود میں آئے تو اس دنیا سے فائدہ اٹھائے۔ غرض دین کے اسرار و رموز جاننے کے لئے فرشتوں کے احوال سے اور ان کی ذمہ داریوں سے واقفیت ضروری ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ پہلے ایک آیت اور چند احادیث ذکر فرماتے ہیں، جن میں ملائکہ مقربین کے کاموں کا ذکر ہے، پھر ان نصوص کی روشنی میں بات آگے بڑھائیں گے۔

﴿باب: ذکر الملأ الأعلیٰ﴾

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ،وَیُؤْمِنُوْنَ بِهِ، وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا ، رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا،فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ،وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ، رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنِ ٍ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ ،وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیَّاتِهِمْ،إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ،وَقِهِمُ السَّیِّئَاتِ، وَمَنْ تَقِ السَّیِّئَاتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ ، وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾

ترجمہ: ملأ اعلیٰ کا تذکرہ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: جو فرشتے عرش الٰہی اٹھائے ہوئے ہیں، اور جو فرشتے اس کے گرداگرد ہیں (یہی ملأ اعلیٰ ہیں) وہ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان والوں کے لئے استغفار کیا کرتے ہیں (کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! آپ کی رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے (پس اہل ایمان پر بدرجہ اولیٰ رحمت ہوگی) سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنھوں نے توبہ کرلی ہے اور آپ کے راستہ پر چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچالیجئے۔ اے ہمارے پروردگار! اور ان کو ہمیشہ رہنے کے باغات میں داخل کیجئے، جن کا آپ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے۔ اور ان کو بھی جو ان کے ماں باپ، بیبیوں اور اولاد میں سے اس کے لائق ہوں، بیشک آپ زبردست، حکمت والے ہیں۔ اور (قیامت کے دن) ان کو تکالیف سے بچایئے، اور جس کو آپ اس دن تکالیف سے بچالیں تو یقیناً آپ نے اس پر مہربانی فرمائی اور یہی بڑی کامیابی ہے (سورۃ المؤمن ۷-۹)

تفسیر: حاملین عرش فرشتے اب چار ہیں، اور قیامت کے دن آٹھ ہوں گے (الحاقۃ آیت ۱۷) اور عرش کے گرد کتنے فرشتے ہیں، ان کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ ملائکہ اصطلاح میں ''کَرّوبی'' کہے جاتے ہیں یہ سب عالم بالا کے مقرب فرشتے ہیں، اس آیت میں ان کا کام یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ ہر وقت تسبیح وتحمید میں مشغول رہتے ہیں۔ نیز وہ مؤمنین

کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں اور جب ملائکہ کی شان میں یفعلون ما یؤمرون فرمایا گیا ہے تو ثابت ہوا کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر مامور ہیں۔ مُطرِّف بن عبداللہ بن الشِّخِّیر کہتے ہیں کہ اللہ کے بندوں میں سے مؤمنین کے حق میں سب سے زیادہ خیرخواہ فرشتے ہیں (معارف القرآن)

☆ ☆ ☆

آگے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے چھ حدیثیں ذکر فرمائی ہیں، جن سے ملأ اعلیٰ کے وجود اور ان کے کاموں پر روشنی پڑتی ہے پہلے وہ حدیثیں دی جاتی ہیں پھر ترجمہ کے ساتھ ضروری تشریح کردی جائے گی۔

[۱] وقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ﴿إذا قضى اللّٰه الأمرَ فى السماء، ضَرَبتِ الملائكةُ بأَجنحتِهَا خُضعانا لقوله، كأنه صَلْصَة على صفوان؛ فإذا فُزِّع عن قلوبهم، قالوا: ماذا قال ربكم؟ قالوا — لِلذى قال — الحقَّ وهو العلى الكبير﴾

[۲] وفى رواية: ﴿إذا قضى أمرًا سبَّح حَمَلَةُ العرش، ثم يسبح أهل السماء الذين يلونهم، حتى يَبْلُغَ التسبيحُ أهلَ هذه السماء الدنيا، ثم قال الذين يلون حملة العرش لحملة العرش: ماذا قال ربكم؟ فيخبرونهم ماذا قال، قال: فيستخبر بعضُ أهل السماوات بعضًا، حتى يبلغ الخبرُ أهلَ هذه السماء﴾

[۳] وقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ﴿إنى قمتُ من الليل، فتوضأت وصليتُ ما قُدِّر لى، فنَعَسْتُ فى صلاتى حتى استثقلتُ، فإذا أنا بربى تبارك وتعالى فى أحسنِ صورة، فقال: يامحمد! قلت: لبيك ربِّ! قال: فيم يَخْتَصِم الملأُ الأعلى؟ قلت: لاأدرى! قالها ثلاثا قال: فرأيته وضع كَفَّه بين كَتِفَيَّ. حتى وجدت بَرْدَ أنا مله بين ثَدْيَيَّ، فتَجَلَّى لى كلُّ شيئ، وعرفتُ، فقال: يامحمد، قلتُ: لبيك ربِّ! قال فيم يختصم الملأ الأعلى؟ قلتُ: فى الكفارات، قال: وما هن؟ قلتُ: مَشْيُ الأقدام إلى الجماعات، والجلوسُ فى المساجد بعدالصلوت، وإسباغُ الوضوء حين الكَرِيْهات، قال: ثم فيم؟ قال: قلت: فى الدرجات، قال: وما هن؟ قلتُ: إطعامُ الطعام، ولِيْنُ الكلام، والصلاة بالليل والناس نيام﴾

[۴] وقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ﴿إن اللّٰه إذا أَحَبَّ عبدًا دعا جبرئيل، فقال: إنى أُحِبُّ فلانا فَأَحِبَّه، قال: فَيُحِبُّه جبرئيلُ، ثم ينادى فى السماء، فيقول: إن اللّٰه يحب فلانا فأَحِبُّوه، فيُحِبُّه أهل السماء، ثم يوضع له القُبول فى الأرض؛ وإذا أبغض عبدًا دعا جبرئيل،

فیقول: إنی أُبغض فلانا فأَبْغِضْه،قال: فَيُبْغِضه جبرئیل ،ثم ینادی فی أهل السماء: إن اللّٰه يُبغض فلانا فأبغضوه ،قال: فیبغضونه، ثم يوضع له البغضاء في الأرض﴾

[٥] وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ﴿الملائكة يصلون على أحدكم مادام في مجلسه الذی صلّٰی فيه، يقولون: اللّٰهم ارْحمه! اللّٰهم اغْفرله! اللّٰهم تُبْ عليه! مالم يُؤْذ فيه، مالم يُحدث فيه﴾

[٦] وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ﴿ما من يوم يُصبح العباد فيه إلا ومَلَكان ينزلان، فيقول أحدهما: اللّٰهم أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، ويقول الآخر: اللّٰهم أعط مُمْسِكا تَلَفًا﴾

ترجمہ: حدیث (۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی کام کا حکم فرماتے ہیں تو فرشتے اپنے پر مارتے ہیں (یعنی ڈرتے اور کانپتے ہیں) حکم الٰہی کی ہیبت سے، اور اللہ کا وہ حکم گویا زنجیر ہے صاف پتھر پر (یعنی) صاف چکنے پتھر پر کوئی زنجیر کھینچی جائے تو اس کی مسلسل آواز ہوتی ہے، اسی طرح اس حکم الٰہی کی آواز سنائی دیتی ہے) پھر جب ان فرشتوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو وہ (بڑے فرشتوں سے) پوچھتے ہیں: تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیتے ہیں ـــــ اس حکم کے بارے میں جو اللہ نے دیا: ـــــ برحق فرمایا، اور وہ برتر وبالا ہیں! (یعنی حکم الٰہی بتانے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کا حکم برحق ہے اور وہ برتر وبالا ہیں، پس وہ جو چاہیں حکم دیں (یہ حدیث بخاری، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ میں ہے دیکھئے مشکوۃ باب الکہانہ ح ۴۶۰۰)

حدیث (۲) اور ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم فرماتے ہیں تو عرش بردار فرشتے تسبیح پڑھتے ہیں پھر اس آسمان والے فرشتے تسبیح پڑھتے ہیں جو عرش بردار فرشتوں سے متصل ہیں۔ یہاں تک کہ تسبیح کا یہ سلسلہ اس سمائے دنیا تک پہنچتا ہے، پھر عرش بردار فرشتوں سے متصل فرشتے، عرش بردار فرشتوں سے پوچھتے ہیں: تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا؟ پس وہ ان کو بتلاتے ہیں جو اللہ نے فرمایا آنحضور ﷺ نے فرمایا، پھر بعض آسمانوں والے بعض سے دریافت کرتے ہیں یہاں تک کہ اطلاع اس آسمان والوں تک پہنچ جاتی ہے (یہ حدیث ترمذی ۲:۱۵۴ وغیرہ میں ہے)

حدیث (۳) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں رات میں اٹھا، وضو کیا، اور جتنا میرے نصیب میں تھا نماز پڑھی، پھر میں نماز میں اونگھنے لگا حتی کہ میں بوجھل ہوگیا (یعنی اونگھ گہری ہوگئی) پس اچانک میں نے اپنے پروردگار کو بہترین صورت میں دیکھا۔ اللہ نے فرمایا: اے محمد! میں نے عرض کیا: حاضر ہوں، اے میرے رب! اللہ نے دریافت کیا: ملأ اعلیٰ کس معاملہ میں گفتگو کررہے ہیں؟ میں نے عرض کیا: مجھے معلوم نہیں! ـــــ اللہ تعالیٰ نے یہ بات تین بار دریافت کی ـــــ آنحضور ﷺ نے فرمایا: پھر میں نے اللہ پاک کو دیکھا، اللہ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں شانوں کے درمیان (پیٹھ پر) رکھی، یہاں تک کہ میں نے اللہ کے پوروں کی ٹھنڈک اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان محسوس کی، پس میرے لئے ہر چیز واضح ہوگئی (یعنی ملأ اعلیٰ کی پوری گفتگو واضح ہوگئی) اور میں نے جان لیا (کہ ملأ اعلیٰ کس مسئلہ میں گفتگو

کر رہے ہیں) پھر اللہ نے فرمایا: اے محمد! میں نے عرض کیا: حاضر ہوں، اے میرے رب! اللہ نے دریافت کیا، کس بارے میں ملأ اعلیٰ گفتگو کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا: گناہ مٹانے والے کاموں کے بارے میں، اللہ نے دریافت کیا: وہ کام کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا (۱) پیروں سے چل کر جماعت میں شریک ہونا (۲) نمازوں کے بعد مسجد میں بیٹھنا (۳) ناگواریوں کے وقت میں وضوء کامل کرنا، اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا: پھر کن باتوں میں؟ حضور نے فرمایا: میں نے عرض کیا: درجے بلند کرنے والے کاموں میں، اللہ تعالیٰ نے پوچھا: وہ کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا: (۱) (محتاجوں کو) کھانا کھلانا (۲) (لوگوں سے) نرم بات کرنا (۳) اور رات میں (تہجد کی) نماز پڑھنا جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں (یہ حدیث امام احمد، ترمذی، طبرانی، حاکم وغیرہ کی کتابوں میں ہے الدر المنثور ۵: ۱۳۹)

حدیث (۴) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آواز دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں پس آپ بھی اس سے محبت کریں، آنحضور ﷺ نے فرمایا: پس جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر وہ آسمان میں صدا دیتے ہیں، پس کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں، پس تم بھی اس سے محبت کرو، پس اس سے آسمان والے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر رکھی جاتی ہے اس کے لئے قبولیت (محبت) زمین میں (یعنی جن وانس اس سے محبت کرنے لگتے ہیں) اور جب بغض رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی بندے سے تو جبرئیل کو پکارتے ہیں، پس فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے بغض رکھتا ہوں پس آپ بھی اس سے بغض رکھیں۔ حضور نے فرمایا: پس جبرئیل اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر وہ آسمان والوں میں پکارتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے بغض رکھتے ہیں پس تم بھی بغض رکھو، حضور نے فرمایا: پس آسمان والے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لئے عداوت زمین میں رکھی جاتی ہے (یعنی جن وانس اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں رواہ مسلم مشکوٰۃ باب الحب فی اللہ الخ حدیث ۵۰۰۵)

حدیث (۵) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فرشتے تم میں سے ایک کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں، جب تک کہ وہ اپنی اس جگہ میں رہتا ہے، جس میں اس نے نماز پڑھی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے اللہ اس پر مہربانی فرما! اے اللہ! اس کی بخشش فرما! اے اللہ! اس کی طرف نظر عنایت فرما! جب تک وہ اس مجلس میں کسی کو ستاتا نہیں، جب تک وہ اس مجلس میں کوئی نئی بات پیدا نہیں کرتا (یعنی ریح خارج نہیں کرتا مشکوٰۃ باب المساجد حدیث ۷۰۲)

حدیث (۶) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بھی ایسا دن نہیں آتا جس میں بندے صبح کریں مگر (یعنی ہر صبح کو) دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! (تیری راہ میں) خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے: اے اللہ روکنے والے کے مال کو تباہ فرما (متفق علیہ، مشکوٰۃ باب الانفاق الخ حدیث ۱۸۶۰)

☆  

ملأاعلیٰ کے سلسلہ میں سات باتیں

مذکورہ آیت اور احادیث کی روشنی میں جاننا چاہئے کہ اسلامی تعلیمات میں درج ذیل سات باتیں درجۂ شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں:

(۱) اللہ کے کچھ بندے — جو بڑے درجہ کے مقرّب فرشتے ہیں — برابر بھلے لوگوں کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں، اور بُرے لوگوں پر لعنتیں بھیجتے رہتے ہیں۔ اور بھلے لوگ وہ ہیں جو خود کو بھی سنوارتے ہیں اور دوسروں کو بھی سنوارنے کی محنت کرتے ہیں، اور بُرے لوگ وہ ہیں جو اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، اور دنیا میں بگاڑ پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ملائکہ کی دعاؤں سے بھلے لوگوں پر رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں، اور ان کی بددعاؤں کے نتیجہ میں ایک طرف تو ان کے دلوں میں حسرت وندامت پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ تنگ گزران جیتے ہیں اور پریشان رہتے ہیں، دوسری طرح ملأسافل کے دلوں میں خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ وہ اس شخص سے شدید نفرت کریں اور اس کے ساتھ بدمعاملگی کریں، یا تو دنیا کی زندگی میں یا موت کے بعد۔

جتنے بُرے لوگ ہیں: زانی، شرابی، چور، ڈاکو، اگر ان کے دل چیر کر دیکھے جائیں تو ان میں پریشانیوں اور خود سے شدید نفرت کا لاوا بھڑکتا ہوا ملے گا، وہ ہمیشہ اس الجھن میں رہتے ہیں کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گئے، مگر چارۂ کار بھی نہیں ہوتا، وہ ان برائیوں سے نکل نہیں سکتے، یہ سب ملأاعلیٰ کی پھٹکار کا اثر ہے۔

ملأاعلیٰ کی لعنتوں کا دوسرا اثر ملأسافل پر پڑتا ہے، وہ اس شخص سے شدید نفرت کرنے لگتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ بدسلوکی کریں پھر اگر اسباب مانع نہیں ہوتے تو وہ شخص دنیا کی زندگی ہی میں بلاؤں اور آفتوں میں پھنسا دیا جاتا ہے اور اگر اسباب مانع ہوتے ہیں تو موت کے بعد وہ ملأسافل کی نفرتوں کا مزہ چکھتا ہے۔

(۲) مقرب فرشتے اللہ اور بندوں کے درمیان وساطت کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اللہ کے پیغامات بندوں تک پہنچاتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں سے دوبدو کلام کریں یہ بات بندوں کی سکت سے باہر ہے ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ﴾ اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماویں (شوریٰ ۵۱) اس لئے اللہ تعالیٰ جب کوئی بات بندوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ملائکہ مقربین کو سفیر بنا کر بھیجتے ہیں۔

(۳) ملأاعلیٰ لوگوں کے دلوں میں بھلائیاں ڈالتے ہیں، جیسے شیاطین لوگوں کے دلوں میں برائیاں ڈالتے ہیں یعنی ملأاعلیٰ لوگوں کے دلوں میں اچھائیاں پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں؛ رہی یہ بات کہ وہ کیسے سبب بنتے ہیں؟ تو اس کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں کوئی ایک شکل متعین نہیں۔

(۴) مقرب فرشتوں کے باہمی اجتماعات ہوتے ہیں، وہ مل کر باہم مشورہ کرتے ہیں اور اہم امور طے کرتے ہیں، اوپر

فِیمَ یَخْتَصِمُ الملأُ الأعلی والی روایت میں ایسے ہی ایک اجتماع کا ذکر ہے، جس میں کفارات ودرجات طے کئے گئے ہیں۔ اور اسی اجتماع کے اعتبار سے ان کو ملأاعلی (بڑے لوگوں کی جماعت، اکابر کا اجتماع) الرفیق الأعلی (اونچے درجے کے ساتھی بھائی) اور الندی الأعلی (اونچے درجہ کی انجمن) کہا جاتا ہے۔ جیسے مجلس شوری نام ہے مشورہ کے لئے اکٹھا ہونے کے اعتبار سے، اور ایم پی نام ہے پارلیمنٹ میں شرکت کے اعتبار سے۔ رہی یہ بات کہ یہ اجتماع کہاں ہوتا ہے؟ اور کب ہوتا ہے؟ اس کو اللہ پاک ہی بہتر جانتے ہیں، جب اور جہاں وہ چاہتے ہیں مقربین بارگاہ اکٹھا ہوتے ہیں۔

⑤ ملأ اعلی (اکابر کی جماعت) میں صرف فرشتے ہی نہیں، اونچے درجہ کے انسان بھی ہیں جیسے انبیاء اور اولیاء: دنیا سے گذرنے کے بعد اس کے ممبر بن جاتے ہیں ﴿ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ﴾ (پس میرے خاص بندوں میں شامل ہوجا) میں اسی شمولیت کی طرف اشارہ ہے اور آنحضور ﷺ نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالی عنہ کو فرشتوں کے ساتھ اڑتے دیکھا ہے، یہ ملأ اعلی کے ساتھ پرواز ہے۔

⑥ اللہ کا جو فیصلہ زمین میں نازل ہوتا ہے وہ پہلے ملأ اعلی کے پاس پہنچتا ہے، وہاں اس کی تفصیلات طے ہوتی ہیں پھر وہ کام متعلقہ کارکنوں کو سپرد کیا جاتا ہے۔ سورۃ الدخان آیت ۴ میں ہے کہ ایک برکت والی رات میں ہر حکمت بھرا معاملہ اللہ کے حکم سے طے ہوتا ہے۔ یہ حکمت بھرا معاملہ شب قدر میں ملأ اعلی کے اجتماع میں طے ہوتا ہے۔

⑦ مختلف زمانوں میں جو شریعتیں نازل ہوئی ہیں، وہ بھی پہلے ملأ اعلی میں آکر ٹھہرتی ہیں، پھر وہاں سے انبیاء پر نازل ہوتی ہیں، جیسے بجلی گھر سے بجلی آکر پہلے پاور ہاؤس میں جمع ہوتی ہے، پھر وہاں سے سپلائی ہوتی ہے۔ روایات میں ہے کہ پورا قرآن یکبارگی شب قدر میں سمائے دنیا پر اتارا گیا، پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال میں زمین پر اترا۔

اعلم أنه قد استفاض من الشرع:

[١] أن لله تعالى عبادًا هم أفاضل الملائكة، ومُقَرَّبو الحضرة لايزالون يدعون لمن أصلح نفسَه وهذَّبها، وسعى في إصلاح الناس، فيكون دعاؤُهم ذلك سببَ نزولِ البركات عليهم؛ ويلعنون من عصى الله، وسعى في الفساد، فيكون لَعنُهم سببا لوجود حسرة وندامةٍ في نفس العامل، وإلهاماتٍ في صدور الملأ السافل: أن يُبْغِضُوْا هذا المسيئَ، ويُسِيْئُوْا إليه: إما في الدنيا، أو حين يتخفف عنه جِلبابُ بدنه بالموت الطبيعي.

[٢] وأنهم يكونون سُفَراء بين الله وبين عباده.

[٣] وأنهم يُلهِمون في قلوب بني آدم خيرا؛ أي يكونون أسبابا لحدوث خواطرِ الخير فيهم، بوجه من وجوه السببية.

[٤] وأن لهم اجتماعاتٍ، كيف شآء الله، وحيث شآء الله، يُعَبَّرُ عنهم باعتبار ذلك بالرفيق

الأعلى، والنَّدَى الأعلى، والملأ الأعلى.

[٥] وأن لأرواح أفاضل الآدميين دخولاً فيهم، ولحوقا بهم، كما قال الله تعالى: ﴿يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ، وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾ وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿رأيتُ جعفر بن أبي طالب ملَكا يطير في الجنة مع الملائكة بجناحين﴾

[٦] وأن هنالك ينزل القضاء، ويتعين الأمرُ المشارُ إليه بقوله تعالى: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾

[٧] وأن هنالك تتقرر الشرائع بوجه من الوجوه.

ترجمہ: جان لیجئے کہ شریعت میں درجۂ شہرت تک پہنچی ہوئی ہے یہ بات کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کے کچھ مخصوص بندے ہیں — وہ اونچے درجے کے بارگاہ خداوندی میں مقرب فرشتے ہیں — وہ برابر اس شخص کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں جس نے اپنی اصلاح کرلی اور خود کو سنوار لیا اور وہ لوگوں کو سنوارنے کی بھی محنت کرتا ہے، پس ان کی وہ دعائیں اُس پر نزول برکات کا سبب ہوتی ہیں؛ اور لعنت بھیجتے رہتے ہیں اس پر جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اور بگاڑ پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ پس ان کی بددعائیں بدکار کے دل میں حسرت وندامت پیدا ہونے کا سبب بنتی ہیں، اور ملأ سافل کے سینوں میں الہام کا سبب بنتی ہیں کہ وہ اس بدکار سے شدید نفرت کریں اور اس کے ساتھ بُرا برتاؤ کریں۔ خواہ دنیا میں یا جب طبعی موت سے اس سے اس کے بدن کی چادر ہلکی پڑ جائے۔

(۲) اور یہ بات کہ وہ حضرات اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفیر (واسطہ) ہوتے ہیں۔

(۳) اور یہ بات کہ وہ حضرات انسانوں کے دل میں خیر کی بات ڈالتے ہیں، یعنی وہ حضرات لوگوں میں اچھے خیالات کے پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ سیت کی مختلف شکلوں میں سے کسی شکل کے ذریعہ۔

(۴) اور یہ بات کہ ان حضرات کے اجتماعات ہوتے ہیں، جس طرح اللہ چاہتے ہیں اور جہاں اللہ چاہتے ہیں، ان حضرات کو اس اجتماع کے اعتبار سے الرفیق الأعلی (اونچے درجے کے ساتھی بھائی) الندی الأعلی (مجلس بالا) اور الملأ الأعلی (اکابرین کی جماعت) کہا جاتا ہے۔

(۵) اور یہ بات کہ بڑے درجے کے انسانوں کی ارواح کے لئے اُن میں شمولیت ہے، اور اُن کے ساتھ ملنا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کی طرف چل، خوش خوش، اور وہ بھی تجھ سے خوش خوش، پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا“ (الفجر ۲۷-۳۰) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جعفر طیار کو فرشتہ کی شکل میں جنت میں فرشتوں کے ساتھ دو پروں سے اڑتے دیکھا (ترمذی وحاکم وقال: صحیح، فیض القدیر ۴: ۸)



(۶) اور یہ بات کہ وہاں فیصلہ خداوندی اترتا ہے اور وہاں وہ معاملہ طے پاتا ہے جس کی طرف اشارہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے کہ ''اس بابرکت رات (شب قدر) میں ہر حکمت بھرا معاملہ طے کیا جاتا ہے'' (الدخان ۴)

(۷) اور یہ بات کہ وہاں شریعتیں ثابت ہوتی ہیں، تقرر کی صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ۔

تشریح:

''جب ہلکی پڑجاتی ہے اس سے اس کے بدن کی چادر طبعی موت کے ذریعہ'' یعنی انسان مرجاتا ہے۔ موت کے لئے شاہ صاحب یہ تعبیر اختیار فرماتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان درحقیقت روح کا نام ہے، بدن صرف لبادہ ہے جو روح نے اس عالم اجساد میں اوڑھ لیا ہے، ورنہ وہ عالم ارواح میں عہد الست سے اس دنیا میں آنے تک موجود تھا، اور مرنے کے بعد بھی عالم برزخ میں اس جسم کے بغیر موجود رہتا ہے اور اس عالم اجساد میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی حادثہ میں ہاتھ یا پیر کٹ جاتا ہے اور جسم آدھا رہ جاتا ہے تاہم آدمی پورا موجود رہتا ہے اور موت کے بعد لاش رکھی ہوئی ہوتی ہے اور آدمی گذر جاتا ہے، یہ سب اس بات کے واضح قرائن ہیں کہ انسان درحقیقت روح کا نام ہے مگر انسان جب تک عالم اجساد میں ہے، جسم کا لبادہ اوڑھنے کی وجہ سے کچھ احکام مختلف ہوجاتے ہیں۔

اور ''موتِ طبعی'' احتراز ہے مُوْتُوْا قَبْلَ أَنْ تَمُوْتُوْا والی روایت سے یعنی انسان زندہ ہوتے ہوئے نفس کو ماردے۔ یہ موت مرادنہیں، بلکہ حقیقی موت مراد ہے۔ اور موتوا الخ صوفیہ کا کلام ہے، حدیث نہیں (کشف الخفاء ۲: ۳۸۴)

اور ہلکی پڑنے کا مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد روح کا بدن سے بالکلیہ تعلق منقطع نہیں ہوتا نسمہ کے ساتھ تعلق باقی رہتا ہے جس کی تفصیل آگے موت کے بیان میں آئے گی۔

لغات:

استفاض الخبر: پھیلنا فَاضَ (ض) فَيْضًا: کثرت سے ہونا...... قوله: إلهامات کا عطف وجود پر ہے...... النَّدَى ج أَنْدِيَة اور النادى جمع أَنْدِيَة اور نَوَادٍ: مجلس جب تک کہ لوگ اس میں موجود ہیں، نَدَا يَنْدُو نَدْوًا القومُ: جمع ہونا، مجلس میں حاضر ہونا الندوة جماعت، مجلس...... تَقَرَّرَ تَقَرُّرًا: ٹھہرنا۔

☆ ☆ ☆

ملأ اعلی میں تین قسم کے نفوس شامل ہیں

ملأ اعلی تین قسم کے نفوس سے تشکیل پاتا ہے یعنی تین قسم کے نفوس اس میں شامل ہیں:

۱۔ نورانی فرشتے: علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ انسان کی مصلحت ملائکہ کے وجود پر موقوف ہے، چنانچہ انسان کو وجود بخشنے سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو پیدا فرمایا، تاکہ جب انسان پیدا ہو تو ملائکہ کے ذریعہ اس کی مصلحت کی تکمیل ہو،

یہ ملائکہ دو قسم کے ہیں: نوری اور عنصری یا عرشی اور فرشی:

نوری فرشتے: وہ ہیں جن کے اجسام نور سے بنا کر ان میں اعلیٰ درجہ کی ارواح پھونکی گئی ہیں، یہ نورانی نفوس ملأ اعلیٰ ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور گاہے وہ زمین پر بھی اترتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح کوئی بڑا مہمان آنے والا ہوتا ہے تو پہلے سے ساز و سامان اور تیاری کی جاتی ہے، اسی طرح قدرت الٰہی نے انسان کی ضرورت اور حاجت کے لئے ملائکہ کو ہزاروں سال پہلے پیدا کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ زمین میں نظام خیر کے لئے ان فرشتوں کا وجود ضروری ہے اور نورانی اجسام کو شاہ صاحب نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو آگ نظر آئی تھی وہ آگ نہیں تھی، بلکہ تجلی تھی، نور تھا، جو آگ کی صورت میں نظر آیا تھا، یعنی اس نور نے جسم کی شکل اختیار کی تھی جس کی وجہ سے وہ نظر آنے لگا تھا۔

۲- اعلیٰ درجے کے عنصری فرشتے: جن کے اجسام نور سے نہیں، بلکہ عناصر اربعہ کے بخار (بھاپ) سے بنائے گئے ہیں پھر جب عناصر کے لطیف بخار سے وہ اجسام تیار ہوگئے تو ان میں بہترین ارواح پھونکی گئیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح عناصر اربعہ سے مادر شکم میں ہمارے اجسام تیار ہوتے ہیں اور ان میں روح پھونکی جاتی ہے، جس سے انسان موجود ہو جاتا ہے، اسی طرح نوری فرشتوں کے اجسام جب نور سے تیار ہوتے ہیں تو ان میں ارواح پھونکی جاتی ہیں، پس وہ ملائکہ وجود پذیر ہو جاتے ہیں، اسی طرح عناصر اربعہ سے جو بخارات اٹھتے ہیں، جب ان کا آمیزہ تیار ہوتا ہے یعنی ان عناصر کا باہمی تضاد اور تخالف ختم ہو جاتا ہے اور ان میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا نام ''مِزاج'' ہے، تو اللہ اس مزاج میں اعلیٰ درجہ کی روح پھونکتے ہیں، یہی مزاج ان کے اجسام ہوتے ہیں اور یہ عنصری فرشتے کہلاتے ہیں۔ یہ فرشتے بہیمی گندگیوں سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ فرشتوں کی قسم اول میں تو گندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ نورانی نفوس ہیں مگر اس دوسری قسم کے فرشتوں میں اس کا احتمال تھا اس لئے وضاحت کی کہ عناصر کے لطیف بخارات سے پیدا ہونے کے باوجود وہ بہیمی گندگیوں سے پاک ہوتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ انسان عناصر اربعہ سے پیدا ہوا ہے، مگر اس میں خاک کا غلبہ ہے، اس لئے وہ خاکی مخلوق کہلاتا ہے۔ سورۃ المؤمنون آیت ۱۲ میں ہے کہ:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ — ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا ہے

اور جنات بھی عناصر اربعہ سے پیدا کئے گئے ہیں، مگر ان میں آگ کا غلبہ ہے، اس لئے وہ ناری مخلوق کہلاتے ہیں، سورۃ الرحمان آیت ۱۵ میں ہے کہ جانّ (جنات کے جد امجد) کو اللہ نے ایک آمیزہ سے، آگ سے پیدا کیا ہے۔[1]

---

[1] مَرَجَ کے معنی میں اختلاط کا مفہوم ہے۔ آگے آیت ہے مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ اور مَرَجَ الشيئَ بالشيئِ کے معنی ہیں ملانا، پس مِن مَّارِجٍ کے معنی ہیں آمیزہ سے یہ آمیزہ عناصر اربعہ کا ہے اور مِن نَّارٍ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں غالب عنصر آگ کا ہے ۱۲

اورفرشی ملائکہ بھی عناصر اربعہ سے پیدا کئے گئے ہیں، مگر وہ براہ راست عناصر اربعہ سے نہیں پیدا کئے گئے، نہ ان میں کسی خاص عنصر کا غلبہ ہے، بلکہ چاروں عناصر سے جولطیف بخار اٹھتا ہے، باہم ملنے کے بعد جب اتفاقاً ان میں مزاج پیدا ہوجاتا ہے تو ان میں اعلی درجہ کی ارواح پھونک دی جاتی ہے، جوفرشی ملائکہ، ملأسافل اور رجال الغیب کہلاتے ہیں۔ ان کو رجال اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے اجسام عناصر اربعہ کے لطیف بخار سے بنے ہیں، جس طرح انسان کے اجسام براہ راست عناصر اربعہ سے بنتے ہیں، اور غیب اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عام طور پر نظر نہیں آتے، کیونکہ عناصر اربعہ تو نظر آتے ہیں، مگر ان کی بھاپ نظر نہیں آتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جس عبد صالح (خضر) سے ملاقات اور ہمرکابی ہوئی تھی وہ فرشتوں کی اسی قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کوئی انسان نہیں تھے، تفصیل کے لئے میری تفسیر ہدایت القرآن ملاحظہ فرمائیں۔

۳- اعلی درجہ کے انسانی نفوس: یعنی اونچے درجہ کے انسان، جیسے انبیاء اور اولیاء جو دنیا میں صلاحیتوں کے لحاظ سے ملأ اعلی کے لگ بھگ ہوتے ہیں، اور وہ دنیا میں ایسے کام کرتے رہتے ہیں جو آخرت میں نجات بخش اور ملأ اعلی سے ملانے والے ہوتے ہیں، جب وہ اس دنیا سے گذر جاتے ہیں تو ان کی ارواح کو ملأ اعلی میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ میں نے طالب علمی کے زمانہ میں اساتذہ سے ایک خواب سنا ہے۔ کسی نے حضرت شیخ الہند قدس سرہ کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا کہ وہ عرش الٰہی کا پایہ پکڑ کر دعا کر رہے ہیں: ''الٰہی! ہندوستان سے انگریز کو نکال دے'' یہ گو خواب ہے مگر از قبیل مبشرات ہے، اس لئے اس سے مسئلہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

واعلم أن الملأ الأعلى ثلاثةُ أقسام:

[۱] قسمٌ عَلِمَ الحقُّ أن نظام الخير يتوقف عليهم؛ فخلق أجسامًا نورِيَّة، بمنزلة نار موسى، فنفخ فيها نفوسا كريمة.

[۲] وقسمٌ ن اتَّفق حدوثُ مزاجٍ في البخارات اللطيفة من العناصر، اسْتَوْجب فيضانَ نفوسٍ شاهقَةٍ، شديدةِ الرَّفض للألواث البهيمية.

[۳] وقسم هم نفوس إنسانية، قريبةُ المأخذ من الملأ الأعلى؛ ما زالت تعمل أعمالاً مُنْجِيَةً، تُفيد اللحوق بهم، حتى طُرِحت عنها جلابيبُ أبدانها، فانْسَلَكَتْ في سِلكهم، وعُدَّت منهم.

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ ملأ اعلی تین قسموں پر ہیں:

پہلی قسم: حق تعالی نے جانا کہ خیر کا نظام ان (ملأ اعلی) پر موقوف ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے نورانی اجسام پیدا کئے جیسے طور پر موسیٰ علیہ السلام کو نظر آنے والی آگ، پھر اللہ نے ان نورانی اجسام میں اعلی درجہ کی ارواح پھونکیں۔

اور دوسری قسم: عناصر اربعہ کے لطیف بخارات میں اتفاقاً مزاج پیدا ہوگیا، جس نے اونچے درجے کی ارواح کے فیضان کو واجب جانا (یعنی ضروری قرار دیا، لازم سمجھا) جو بہت زیادہ چھوڑنے والی ہیں بہیمی گندگیوں کو۔

اور تیسری قسم: وہ انسانی ارواح ہیں، جو صلاحیتوں کے اعتبار سے ملأ اعلی کے لگ بھگ ہوتی ہیں۔ وہ لوگ برابر ایسے کام کرتے رہتے ہیں کہ جو آخرت میں نجات بخشنے والے اور ملأ اعلی کے ساتھ ملنے کا فائدہ دینے والے ہیں، یہاں تک کہ جب ان نفوس سے ان کے اجسام کی چادریں پھینک دی جاتی ہیں تو وہ ملأ اعلی کی لڑی میں منسلک ہوجاتے ہیں اور ان میں شمار ہونے لگتے ہیں۔

لغات: استوجب الشیئَ: مستحق ہونا، واجب ولازم جاننا...... شَهَقَ (ف ض) شُهُوقًا الجبلُ: بلند ہونا...... المأخذ: لینے کا راستہ یا طریقہ یا وقت یا وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز لی جائے۔ محاورہ میں بمعنی صلاحیت جمع مآخذ...... سِلْك: ہار کا دھاگا۔

تشریح: (۱) شاید عبارت میں عَلیٰ رہ گیا ہے اصل عبارت أن الملأ الأعلی علی ثلاثةِ أقسام ہونی چاہئے مگر علی کے بغیر بھی عبارت صحیح ہے۔

(۲) تُفید إلخ أعمالاً کی صفت ثانیہ ہے۔

(۳) استَوْجب کا مطلب یہ ہے کہ جب عناصر کے لطیف بخارات میں ایک خاص قسم کا مزاج پیدا ہوجاتا ہے تو وہ ایسے نفوس کے فیضان کو واجب کرلیتا ہے یعنی ان کا فیضان ضروری ہوجاتا ہے، جو بلند رتبہ اور حیوانی گندگیوں سے نہایت بیزار ہوں۔

☆ ☆ ☆

ملأ اعلی کے تین کارنامے

ملأ اعلی کے درج ذیل تین کام ہیں:

اول: وہ پوری توجہ سے اللہ پاک کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اور وہ توجہ اتنی گہری ہوتی ہے کہ کسی بھی چیز کی طرف التفات اس توجہ میں خلل نہیں ڈالتا۔ باب کے شروع میں جو آیت ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد ہے کہ حاملین عرش اور جو فرشتے ان کے اردگرد ہیں وہ ہمہ وقت اللہ کی تسبیح وتقدیس میں لگے رہتے ہیں اور اللہ کے یقین میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ زبان سے بالفعل خواہ تسبیح میں مشغول ہوں، یا کسی اور کام میں، ان کی توجہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رہتی ہے وہ ایک لحہ بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔

دوم: زمین میں جو نظام چل رہے ہیں ان میں سے کونسا نظام اللہ کو پسند ہے اور کونسا ناپسند، اس کا علم ملأ اعلیٰ کو اللہ کی طرف سے دیدیا جاتا ہے، جیسے ایمان اور اعمال صالحہ کا نظام اللہ کو پسند ہے ﴿ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ﴾ اور کفر اور کفار کا طریقہ اللہ کو ناپسند ہے ﴿ وَلَا يَرْضَى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ﴾ اور جب ملأ اعلیٰ کو یہ علم حاصل ہوجاتا ہے تو وہ نظام صالح کے لئے دعائیں کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دنیا میں خیرات و برکات اور آخرت میں بخشش کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ یہ نیک دعائیں اللہ کے دریائے کرم کو موجزن کرتی ہیں اور نظام صالح والے نہال ہوجاتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں ﴿يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا﴾ میں اسی کا بیان ہے۔

اسی طرح ملأ اعلیٰ نظام طالح کے لئے بددعائیں کرتے ہیں، ان پر لعنتیں بھیجتے ہیں، جس کے نتیجہ میں وہ دنیا میں یا آخرت میں مصائب و آلام سے دوچار ہوتے ہیں اور ان پر غضب الٰہی نازل ہوتا ہے۔

سوم: ملائکہ میں جو اونچے درجے کے فرشتے ہیں، ان کے انوار اُس روح اعظم کے پاس جمع ہوتے ہیں، جس کے بے شمار منہ ہیں اور وہ بہت سی زبانیں بولتی ہے، ملائکہ کے انوار وہاں جمع ہو کر شئ واحد بن جاتے ہیں جس کا نام حظیرۃ القدس (بارگاہ مقدس) ہے۔

حظیرہ کے معنی ہیں باڑہ، گھر کا صحن، مکان کے آگے کی وہ جگہ جہاں مسافر آتے وقت سامان رکھتا ہے اور قُدس کے معنی ہیں پاکیزہ، پس حظیرۃ القدس کے معنی ہیں پاکیزہ باڑہ۔ اردو میں اسی کو دربار اور بارگاہ عالی کہتے ہیں اور کبھی دربار اور بارگاہ عالی بول کر اللہ کی ذات کو بھی مراد لیتے ہیں۔

مسند احمد (۵: ۲۵۷) میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے، اس کا ایک جزء یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے خوف سے شراب چھوڑ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی عزت کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ وہ ان کو حظیرۃ القدس سے سیراب کریں گے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ حظیرۃ القدس کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ روح اعظم کے پاس جس کے بہت سے منہ اور بہت سی زبانیں ہیں، جب افاضل ملائکہ کے انوار وہاں پہنچ کر اکٹھا ہوتے ہیں اور شئ واحد بن جاتے ہیں تو اس کو حظیرۃ القدس کہتے ہیں۔ مگر یہ روح اعظم والی مرفوع روایت تو مجھے ملی نہیں۔ البتہ الدر المنثور (۴: ۲۰۰) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے، جس کے ستر ہزار (یعنی بہت سے) منہ ہیں، اور ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں، اور ہر زبان ستر ہزار بھاشائیں بولتی ہیں وہ فرشتہ ان تمام زبانوں سے خدا کی تسبیح کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ پیدا کرتے ہیں جو قیامت کے دن تک فرشتوں کے ساتھ اڑتا رہتا ہے۔

مگر روح المعانی (۱۵: ۱۵۲) میں ہے وتُعُقِّبَ هذا بأنه لايصح عن علی كَرَّم الله وجهه، وطَعَنَ الإمامُ فی ذلك بما طعن (اور اس روایت پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں اور امام رازی رحمہ اللہ نے اس پر جو اعتراض کئے ہیں وہ کئے ہیں) امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر (۲۱: ۳۹) میں اس پر تین اعتراض

کئے ہیں۔ اس حدیث کی اسناد کیسی ہے؟ یہ بھی معلوم نہیں، کیونکہ یہ روایت غیر معروف کتابوں میں ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسرائیلات بیان نہیں کرتے تھے، اس لئے اس روایت کو شاہ صاحب نے غالباً حکماً مرفوع مانا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم کو شیعوں نے برباد کر دیا ہے، خود ساختہ روایتیں ان کے نام سے چلا دی ہیں، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہر روایت کی اسناد کی تحقیق ضروری ہے۔

غرض حظیرۃ القدس کی حقیقت جو بھی ہو، کبھی اُس بارگاہ عالی میں یہ طے پاتا ہے کہ دنیا میں لوگوں کو دینی اور دنیوی تباہی سے بچانے کے لئے کوئی تدبیر کرنی چاہئے، چنانچہ اس وقت زمین میں جو لوگ موجود ہوتے ہیں ان میں سے بہترین شخص کو اس کام کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور اس کا آوازہ پھیلایا جاتا ہے اور اس کا معاملہ لوگوں میں چلایا جاتا ہے۔

اور اُس اجماع کی وجہ سے تین باتیں وجود میں آتی ہیں:

(۱) جن لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے ان کے دلوں میں الہام کیا جاتا ہے کہ وہ اُس شخصیت کی پیروی کریں اور اس کے ساتھ مل کر ایک ایسی جماعت بنیں جو لوگوں کے فائدہ کے لئے کام کرے۔

(۲) اس شخصیت کے دل میں وحی سے یا خواب سے یا غیبی آواز سے ایسے علوم متمثل ہوتے ہیں، جن میں قوم کی بھلائی اور راہ نمائی ہوتی ہے اور کبھی ملائکہ اس شخصیت کو نظر بھی آتے ہیں، اور اس سے رُو در رُو بات کرتے ہیں۔

(۳) اس شخصیت کے محبین کی مدد کی جاتی ہے اور ان کو ہر خیر سے قریب کیا جاتا ہے اور جو لوگ راہ خدا سے روکتے ہیں ان پر لعنت کی جاتی ہے اور ان کو ہر تکلیف سے قریب کیا جاتا ہے۔

اور یہ نبوت کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے یعنی نبوت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے پھر اس کا معاملہ بڑھتا جاتا ہے اور حظیرۃ القدس کا اجماع مستمر (مسلسل اتفاق) روح القدس کی تائید کہلاتا ہے اور اس اجماع کی وجہ سے ایسی ایسی برکات وجود میں آتی ہیں جو عام طور پر نہیں پائی جاتیں، یہی برکات معجزات کہلاتی ہیں۔

والملأ الأعلى: شأنُها:

[۱] أنها تتوجَّهُ إلى بارئها توجُّهًا مُمْعِنًا، لايصُدُّها عن ذلك التِفَاتٌ إلى شيئ؛ وهو معنى قوله تعالى: ﴿يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ، وَيُؤْمِنُوْنَ بِهِ﴾

[۲] وتَتَلَقَّى من ربها اسْتِحْسانَ النظام الصالح، واستهجَانَ خلافه، فَيَقْرَعُ ذلك بابًا من أبواب الجُود الإلٰهي؛ وهو معنى قوله تعالى: ﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا﴾

[۳] وأفاضِلُهم تجتمع أنوارهم، وتتداخل فيما بينها، عند الروح الذي وَصَفه النبي صلى الله عليه وسلم بكثر الوجوه والألسنة؛ فتصيرهنالك كشيئ واحد، وتسمى حظيرةَ القدس،

وربما حصل في حظيرة القدس إجماعٌ على إقامة حيلةٍ لنجاة بني آدم من الدَّوَاهي المعاشية

والمعادِيَّة، بتكميل أزكى خلقِ الله يومئذٍ، وتمشِيَةِ أمره في الناس،فيوجب ذلك إلهاماتٍ في قلوب المستعدِّيْن من الناس: أن يَتَّبِعُوه، ويكونوا أمةً أُخرجت للناس؛ ويوجب تَمَثُّلَ علوم — فيها صلاح القوم وهُداهم — في قلبه وحياً، ورُؤْيًا، وهَتَفًا، وأن تتراءى له، فتكلِّمُهُ شِفَاها، ويوجب نَصْرَ أَحِبَّائِهِ، وتقريْبَهُمْ من كل خير، ولعنَ من صدَّ عن سبيل الله، وتقريْبَهُمْ من كل ألم.

وهذا أصلٌ من أصول النبوة؛ويُسمى إجماعُهم المستمِرُّ بتائيدِ روحِ الْقُدُسِ،وتثمرُ هنالك بركاتٌ لم تُعهد في العادة، فتسمى بالمعجزاتِ.

ترجمہ:اور ملأ اعلیٰ کا کام:

(۱) یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف متوجہ رہتے ہیں، ایسی گہری توجہ کے ساتھ کہ کسی بھی چیز کی طرف التفات ملأ اعلیٰ کو اس توجہ سے نہیں روکتا اور یہی مطلب ہے ارشاد باری تعالیٰ ﴿يُسَبِّحُوْنَ﴾ الآية کا۔

(۲) اور وہ اپنے رب کی طرف سے نظام صالح کی پسندیدگی حاصل کرتے ہیں، اور اس کے برخلاف کی ناپسندیدگی (یعنی یہ علم ان کو القاء کیا جاتا ہے) پس یہ القاء جود الٰہی کے دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، اور یہی مطلب ہے ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ کا۔

(۳) اور افاضل ملائکہ کے انوار اکٹھا ہوتے ہیں، اور وہ آپس میں گھل مل جاتے ہیں، اس روح کے پاس جس کو متصف کیا ہے نبی کریم ﷺ نے بہت سے مونہوں اور زبانوں کے ساتھ، پس وہ انوار وہاں شیٔ واحد بن جاتے ہیں، اور وہ انوار حظیرۃ القدس کہلاتے ہیں۔

اور کبھی حظیرۃ القدس میں اجماع (اتفاق) ہوتا ہے انسانوں کو اخروی اور دنیوی تباہیوں سے بچانے کے لئے کسی تدبیر کرنے کے ذریعہ: اس زمانہ میں مخلوق میں جو سب سے زیادہ ستھرا شخص ہوتا ہے اس کی تکمیل کرنے، اور لوگوں میں اس کا معاملہ چلانے کے ذریعہ، پس یہ اجماع باصلاحیت لوگوں کے دلوں میں الہام کو واجب کرتا ہے کہ وہ اس شخصیت کی پیروی کریں اور وہ ایک ایسی جماعت بنیں جو لوگوں کے مفاد کے لئے کام کرے۔

اور وہ اجماع واجب کرتا ہے ایسے علوم کے متمثل ہونے کو — جس میں قوم کی صلاح وفلاح اور ہدایت ہوتی ہے — اس شخصیت کے دل میں: وحی کے ذریعہ، یا خواب کی صورت میں یا غیبی آواز کی شکل میں، اور اس بات کو (بھی) کہ وہ فرشتے اس شخصیت کو نظر آتے ہیں، پس وہ اس سے رُودررُو بات کرتے ہیں۔

اور وہ اجماع واجب کرتا ہے اس شخصیت سے محبت کرنے والوں کی مدد کو، اور ان کو ہر خیر سے قریب کرنے کو، اور ان لوگوں پر لعنت کو جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اور ان کو ہر تکلیف سے نزدیک کرنے کو۔

اور یہ ملأ اعلیٰ کا اجماع نبوت کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے یعنی نبوتوں کا آغاز اسی طرح ہوتا تھا۔ اور ملأ اعلیٰ کا

اجماع مستمر (مسلسل اتفاق اور عزم) روح القدس کی تائید وتقویت کہلاتا ہے اور وہاں (یعنی اجماع ہونے پر) ایسے بابرکات ثمرات پیدا ہوتے ہیں جو عادۃً جانے پہچانے ہوئے نہیں، پس وہ ثمرات معجزات کہلاتے ہیں۔

لغات:

الشان: بڑے بڑے امور واحوال، معاملہ، حالت جمع شُئُون...... شانها میں ملأ اعلیٰ کی طرف مؤنث ضمیر لوٹائی ہے بتاویل جماعت اور طائفہ اور آگے افاضلهم میں مذکر ضمیر استعمال کی ہے ذوی العقول ہونے کی وجہ سے ...... المُمْعِنُ (اسم فاعل) أمْعَنَ فی الأمر: معاملہ کی گہرائی میں پہنچنا......تَلَقَّی الشیئَ: ملنا، استقبال کرنا......استَهْجَنَ فعلَه: قبیح سمجھنا ......تَدَاخَلَهُ: گھل مل جانا......وَصَفَ یَصِفُ وَصْفًا وصفةً: حالت بیان کرنا......الدَّاهیة: مصیبت جمع دَوَاهٍ، دَاهِیَةٌ دَهْیَاءُ: سخت مصیبت دَوَاهِیْ الدَّهر: زمانہ کے حوادث......المعاش: زندگی کا ذریعہ، مراد دنیا...... المعاد: لوٹنا دوبارہ پیدا ہونا، مراد آخرت......تَمَثَّل: پایا جانا۔

تشریح:

''نبوت کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے'' یعنی نبوت کا سلسلہ اس طرح شروع ہوتا ہے اور ملأ اعلیٰ کی جو نصرت نبی کے ساتھ مسلسل رہتی ہے اس کو قرآن میں روح القدس کی تائید کہا گیا ہے، اور اجماع اور تائید کی وجہ سے نبی کے ہاتھ سے ایسے ایسے کام ظاہر ہوتے ہیں جو عام طور پر جانے پہچانے ہوئے نہیں: وہ نبی کے معجزات کہلاتے ہیں۔



ملأ سافل اور ان کے کام

ملأ اعلیٰ سے کم رتبہ ملأ سافل ہیں۔ جب عناصر اربعہ کے لطیف بخارات میں معتدل مزاج پیدا ہوتا ہے تو وہ روح کے فیضان کو چاہتا ہے، جس کی تفصیل ابھی گذر چکی ہے۔ اور جب اس مزاج میں ارواح کریمہ کا فیضان کر دیا جاتا ہے تو ملأ سافل وجود پذیر ہو جاتے ہیں، یہ فرشتے آسمانی فرشتوں سے کم رتبہ ہیں۔ ان کا کمال اور خوبی یہ ہے کہ وہ ہر وقت عالم بالا سے ملنے والے احکامات کا انتظار کرتے ہیں، جونہی قابل کی استعداد اور فاعل کی تاثیر کے مطابق ان پر کوئی حکم مترشح ہوتا ہے، تو وہ اس کی تعمیل کے لئے اس طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس طرح پرندے اور چوپائے فطری جذبات اور طبعی تقاضوں سے کام کرتے ہیں، ان ملائکہ کو تعمیل حکم کے علاوہ کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوتی، وہ کھانے پینے کے جھمیلے نہیں رکھتے، وہ ذاتی تقاضوں سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں، ان کا مطمح نظر بس اُن احکام کی تعمیل ہوتا ہے جو ان کو الہام کئے جاتے ہیں۔

یہ فرشتے انسانوں اور چوپایوں کے دلوں میں اثر ڈالتے ہیں جس سے اُن کے ارادے اور خیالات امر مطلوب کے مطابق ہوجاتے ہیں اور جو کچھ منشأ خداوندی ہوتا ہے وہ بروئے کار آتا ہے۔ اور یہ اثر ڈالنا کئی طرح سے ہوتا ہے، مثلاً:

۱- بعض قدرتی چیزوں میں ملائکہ اثر ڈالتے ہیں، ان کی حرکات وتغیرات کو متأثر کرتے ہیں، جیسے کوئی پتھر لڑھکایا گیا، ملائکہ نے اس میں ایسا اثر پیدا کردیا جس کی وجہ سے وہ اپنی طبعی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہوگیا، ہجرت کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ کا شَاهَتِ الوجوہ! فرما کر مٹھی بھر مٹی پھینکنا اور اس کا ہر ہر کافر کی آنکھ میں پہنچ جانا، اور خطبۂ جمعہ کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یَاسَارِیَ الْجَبَلْ فرمانا اور اس آواز کا نہاوند پہنچ جانا یا حضرت مریم کا کھجور کے تنے کو ہلانا اور کھجوروں کا گرنا اسی قبیل سے ہے۔

۲- ایک شکاری ندی نہر میں جال کانٹا پھینکتا ہے، فرشتوں کی فوجیں آتی ہیں، وہ مچھلیوں کے دلوں میں الہام کرتی ہیں: کچھ مچھلیاں جال میں گھس جاتی ہیں اور کانٹا پکڑ لیتی ہیں اور کچھ بھاگ نکلتی ہیں اور وہ نہیں جانتی کہ وہ یہ کام کیوں کررہی ہیں، بس فرشتوں کے الہام کی اتباع کرتی ہیں، چنانچہ دو شکاری ایک ہی ندی نہر میں ایک ہی قسم کا جال کانٹا ڈالتے ہیں ایک کا جال بھرا ہوا نکلتا ہے اور دوسرے کا خالی، یہ اسی الہام کا نتیجہ ہے۔

۳- دو گروہ باہم بھڑتے ہیں، فرشتے آتے ہیں، ایک گروہ کے دل میں شجاعت اور جوانمردی کے خیالات پیدا کرتے ہیں اور موقعہ کے مناسب ایسی باتیں اور ایسے خیالات دل میں پیدا کرتے ہیں کہ ان میں بہادری کی روح دوڑ جاتی ہے اور یہ فرشتے فتح وظفر کے وسائل اور تدبیریں بھی القاء کرتے ہیں، ان کے تیر وتفنگ اور اسلحہ جات میں قوت بھی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کی کامیابی یقینی ہوجاتی ہے اور دوسرے گروہ کے دل میں اس کے برخلاف جذبات ابھارتے ہیں تاکہ جو کچھ منشأ خداوندی ہوتا ہے وہ پورا ہو۔ جنگ بدر کی پوری تاریخ اس کی واضح مثال ہے۔ سورۃ الانفال کی آیات ۴۱-۴۴ پڑھیں۔

۴- کبھی عالم بالا سے ملأ سافل پر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کسی شخص کو تکلیفیں یا راحتیں پہنچائی جائیں، ملأ سافل اس سلسلہ میں بھی اپنی والی پوری کوشش کرتے ہیں اور ہر ممکن راہ اپناتے ہیں تاکہ عالم بالا کی مراد پوری ہو۔

ودون هؤلاء نفوسٌ استوجب فيضانَها حدوثُ مزاجٍ معتدلٍ في بخارات لطيفة، لم تَبْلُغْ بهم السعادةُ مبلغَ الأولين، فصار كمالُهم أن تكون فارغةً لانتظار ما يترشَّح من فوقها؛ فإذا ترشَّح شيئ بحسب اسْتِعْدَادِ القابل، وتأثير الفاعل، انْبَعَثوا إلى تلك الأمور، كما تَنْبَعِثُ الطيورُ والبهائم بالدواعي الطبيعية، وهم في ذلك قانون عما يرجع إلى أنفسهم، باقون بما ألهموا من فوقهم، فيؤثِّرون في قلوب البشر والبهائم، فتنقلب إراداتُها وأحاديثُ نفوسها إلى ما يناسب الأمْرَ المرادَ.

ويـؤثّـرون في بعض الأشياء الطبيعية في تضاعيف حركاتها وتَحَوُّلاتها، كما يُدَحْرَج حجرٌ، فَأَثَّر فيه مَلَكٌ كريم عند ذلك، فمشى في الأرض أكثر مما يُتَصَوَّر في العادة؛

وربما ألقى الصيَّادُ شَبَكَةً في النهر، فجاء ت أفواجٌ من الملائكة، تُلْهِم في قلب هذه السمكةِ أن تَقْتَحِمَ، وهذه أن تَهْرُب، وتَقْبِضَ حَبْلاً، وتَبْسُطُ أخرى، وهي لاتعلم لِمَ تفعل ذلك؟ ولكن تَتَّبِعُ ما أُلهِمت.

وربما تقاتلت فِئتان، فجاء ت الملائكة تُزَيِّن في قلوب هذه الشجاعةَ والثباتَ بأحاديث وخيالاتٍ يقتضيها المقامُ، وتُلهِمُ حِيَلَ الغلبة، وتؤيد في الرمي وأشباهه، وفي قلوب تلك أضدادَ هذه الخصال، ليقضي اللّٰه أمرًا كان مفعولاً.

وربما كان المترشِّحُ إيلامَ نفسٍ إنسانيةٍ أو تنعيمَهَا، فَسَعَتِ الملائكةُ كُلَّ سَعْيٍ، وذهبتْ كلَّ مذهبٍ ممكن.

ترجمہ: اوران حضرات سے کم درجہ کچھ ایسے نفوس ہیں، جن کے فیضان کولطیف بخارات میں معتدل مزاج کے پیدا ہونے نے واجب جانا ہے، ان کو نیک بختی نے پہلے حضرات کے درجہ تک نہیں پہنچایا، پس ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس چیز کے انتظار کے لئے فارغ رہتے ہیں جو اُن پر اُن کے اوپر سے ٹپکتی ہے، پس جب کوئی چیز قابل کی استعداد اور فاعل کی تاثیر کے مطابق ٹپکتی ہے تو وہ فرشتے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کاموں کی تعمیل کے لئے جیسے پرندے اور چوپایے فطری تقاضوں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ ان کاموں میں (ایسے منہمک ہوجاتے ہیں کہ وہ) فنا ہونے والے ہیں (یعنی بے خبر ہیں) اُن باتوں سے جو ان کی ذات کی طرف لوٹتی ہیں۔ باقی رہنے والے ہیں اُن باتوں کے ساتھ جو وہ عالم بالا سے الہام کی گئی ہیں، پس وہ انسانوں اور چوپایوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، پس ان کے ارادے اور ان کے دلوں کی باتیں (یعنی خیالات) اس چیز کی طرف پلٹ جاتے ہیں جو امر مطلوب کے مناسب ہوتی ہے۔

اور وہ بعض قدرتی اشیاء میں اثر ڈالتے ہیں، ان کی حرکات وتغیرات کے ضمن میں، جیسے کوئی پتھر لڑھکایا جاتا ہے، پس اس کے لڑھکنے میں معزز فرشتہ اثر ڈالتا ہے، پس وہ زمین میں اس سے زیادہ چلتا ہے جو عادۃً متصور ہوتا ہے۔

اور کبھی شکاری نہر میں جال ڈالتا ہے، پس فرشتوں کی فوجیں آتی ہیں، اس مچھلی کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ جال میں گھسے، اور اُس کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ بھاگے۔ اور ایک کے دل میں ڈالتے ہیں کہ کانٹا پکڑے اور دوسری کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ کانٹا چھوڑ دے، اور وہ مچھلیاں نہیں جانتی کہ وہ یہ کام کیوں کررہی ہیں؟ لیکن وہ پیروی کررہی ہیں اس بات کی جو وہ الہام کی گئی ہیں۔

اور کبھی دو گروہ باہم لڑتے ہیں، پس فرشتے آتے ہیں، اس جماعت کے دل میں بہادری اور ثابت قدمی کو مزین

کرتے ہیں ایسی باتوں اور ایسے خیالات کے ذریعہ جن کا موقعہ مقتضی ہوتا ہے، اور غلبہ کی تدبیریں الہام کرتے ہیں اور تیر پھینکنے میں اور اس جیسی چیزوں میں تقویت پہنچاتے ہیں، اور اُس گروہ کے دل میں اِن باتوں کے برخلاف باتیں مزین کرتے ہیں، تا کہ اللہ تعالیٰ طے کردیں اس بات کو جو ہونے والی ہے۔

اور کبھی ٹپکنے والی بات کسی انسان کو تکلیف پہنچانا یا اس کو راحت پہنچانا ہوتا ہے، پس فرشتے اپنی والی ہر کوشش کرتے ہیں اور وہ ہر ممکن راہ پر چلتے ہیں (تا کہ عالم بالا کا مقصود پورا ہو)

تشریح:

قابل کی استعداد اور فاعل کی تاثیر: جیسے پڑھانے والے اساتذہ فاعل ہیں اور پڑھنے والے طلبہ قابل ہیں اور ہر استاذ کا فیض یکساں نہیں ہوتا بلکہ قوت تاثیر کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک استاذ سے پڑھے ہوئے طلبہ بڑے ہونہار ہوتے ہیں اور دوسرے استاذ کے پڑھائے ہوئے اس درجہ ہونہار نہیں ہوتے یہ فاعل کی تاثیر کا فرق ہے۔ اسی طرح ایک استاذ کے طلبہ بھی یکساں نہیں ہوتے یہ قابل کی استعداد کا فرق ہے اسی طرح ملأ اعلی فاعل ہیں اور ملأ سافل قابل، اور فاعل کی تاثیر کی قوت وضعف اور قابل کی استعداد کی قوت وضعف احکام کے ترشح میں اور ان کے اخذ میں تفاوت پیدا کرتے ہیں۔



حزبِ مخالف کا بیان

فرشتوں کے مقابلہ میں ایک اور جماعت ہے یہ شیاطین کی جماعت ہے۔ شیاطین عقل کے اوچھے، طیش کے پتلے اور برے خیالات کا سرچشمہ ہوتے ہیں، خیر اور نیکی سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ جب عناصر اربعہ کے ظلمانی (تاریک) بخارات میں سڑاند اور تعفن پیدا ہوتا ہے تو وہ نفوس کا تقاضا کرتا ہے، چنانچہ اس میں ارواح ڈالدی جاتی ہے پس شیاطین وجود میں آجاتے ہیں، جیسے گندی نالی کی مٹی میں جب سڑاند پیدا ہوتی ہے تو اس میں ارواح ڈالدی جاتی ہیں اور نالی کے کیڑے اور مکھی مچھر پیدا ہوجاتے ہیں۔ شیاطین کی کوششیں ہمیشہ فرشتوں کی کوششوں کے برخلاف ہوتی ہیں، وہ لوگوں کے دلوں میں نافرمانی کے خیالات ابھارتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں انسان کی تباہی کا سامان کرتے ہیں۔

وبإزاء أولئك آخرون أولو خِفَّةٍ وطَيشٍ، وأفكارٍ مضادَّةٍ للخير، أوجب حدوثَهم تعَفُّنُ بخاراتٍ ظلمانية، هم الشياطين، لايزالون يسعون في أضداد ماسَعتِ الملائكةُ فيه، والله أعلم.

ترجمہ: اور ان لوگوں کے مقابلہ میں دوسرے لوگ ہیں، ہلکا پن والے اور اوچھا پن والے، اور خیر کے برخلاف

سوچ وچار والے، ان کے پیدا ہونے کو واجب جاننا ہے تاریک بخارات کی سڑاند نے، یہی شیاطین ہیں، برابر کوشش کرتے ہیں وہ اُن کاموں کے برخلاف کاموں میں جن میں فرشتے کوشش کرتے ہیں واللہ اعلم۔

لغات: الخِفَّة: ہلکا پن، خواہ عقل میں ہو یا جسم میں یا عمل میں، یہاں اول مراد ہے...... طَیْش: ہلکی، او چھا پن۔

نوٹ: اس باب میں شاہ صاحب قدس سرہ نے بعض باتیں وجدانی بیان کی ہیں، یعنی شاہ صاحب ایسا سمجھتے ہیں، نصوص سے ان کے دلائل ملنا مشکل ہیں۔

باب ــــــ ۴

سنّتِ الٰہی کا بیان

سورۃ الاحزاب آیت ۶۲ میں، سورۂ فاطر آیت ۴۳ میں، اور سورۃ الفتح آیت ۲۳ میں ارشاد پاک ہے ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلاً﴾ (اور آپ دستور خداوندی میں ردوبدل نہ پائیں گے) ان آیات میں جس سنت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے[1] وہ کیا ہے؟ اس باب میں اس کی وضاحت کی جارہی ہے۔ خیال رہے کہ اس باب میں صرف ''سنت الٰہیہ'' کا بیان ہے، اس کے غیر متبدل ہونے کا بیان نہیں۔

جاننا چاہئے کہ جہاں میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے کام ہیں، مگر سب کام اللہ تعالیٰ براہ راست نہیں کرتے، اللہ کے کچھ کام اشیائے عالم میں رکھی ہوئی صلاحیتوں پر متفرع ہوتے ہیں یعنی اسباب میں اللہ تعالیٰ نے تاثیرات رکھ دی ہیں، اور انہی تاثیرات سے مسببات وجود میں آتے ہیں، جیسے ہم کھاتے ہیں تو شکم سیر ہوتے ہیں، پیتے ہیں تو سیراب ہوتے ہیں، یہ کھانے پانی میں اللہ کی رکھی ہوئی صلاحیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اشیاء میں رکھی ہوئی صلاحیتوں پر اللہ کے کام کیسے مرتب ہوتے ہیں؟ تو اس کی تفصیل ضروری نہیں، اس کی جو بھی شکل ہو، بہرحال ترتب اسی پر ہوتا ہے۔

یہ اسباب پر متفرع ہونے والے کام بھی حقیقت میں اللہ ہی کے کام ہیں، کھانے کے بعد وہی شکم سیر کرتے ہیں، پینے کے بعد وہی سیراب کرتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے سامنے اللہ رب العالمین کا تعارف اس

---

[1] نص کا جو مقصدی مضمون یا مرکزی نقطہ ہوتا ہے وہ عبارۃ النص کہلاتا ہے۔ ان آیات کا مقصدی مضمون یہ ہے کہ قانون قدرت ہمیشہ یکساں رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور نص کے کسی لفظ کے لغوی معنی سے یا عرفی معنی سے یا لازمی معنی کے طور پر جو بات سمجھی جائے وہ اشارۃ النص کہلاتی ہے چنانچہ ان آیات میں جو ''سنت اللہ'' کا لفظ آیا ہے اس سے یہ مضمون سمجھایا گیا ہے کہ کوئی قانون قدرت بھی ہے، اس کا اس باب میں ذکر ہے ۱۲

طرح کرایا ہے ﴿ وَالَّذِيْ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴾ (اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے) ﴿ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴾ (اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہ مجھ کو شفا دیتا ہے) (سورۃ الشعراء ۷۹و۸۰)

اور مذکورہ بات دلائل عقلیہ اور نقلیہ دونوں سے ثابت ہے:

دلائل نقلیہ: (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی کی ایک ایسی مٹھی سے پیدا کیا ہے جس کو اللہ نے پوری زمین سے بھرا ہے، پس اولاد آدم مٹی کے موافق وجود میں آئی، کوئی ان میں سرخ ہے، کوئی سفید، کوئی سیاہ اور کوئی بیچ بیچ اور کوئی ان میں سے نرم خو ہے اور کوئی سخت خو اور کوئی ناپاک (گندہ) ہے اور کوئی ستھرا (احمد، ترمذی، ابوداؤد، مشکوۃ باب الایمان بالقدر، حدیث ۱۰۰)

اس حدیث میں یہ بیان ہے کہ انسانوں میں رنگ کا ظاہری تفاوت اور اخلاق کا باطنی تفاوت ان کے خمیر میں رکھی ہوئی صلاحیتوں کے تفاوت کی بنیاد پر ہے۔ اللہ نے مٹی میں مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں، جن کی بنیاد پر انسانوں میں ظاہری اور باطنی تفاوت رونما ہوتا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ بچہ کبھی باپ کے مشابہ ہوتا ہے کبھی ماں کے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت کرتا ہے تو مرد مشابہت کھینچ لیتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت کرتا ہے تو عورت مشابہت کھینچ لیتی ہے (بخاری شریف، فضائل الانصار، باب ۵۱ فتح الباری ۷: ۲۷۲، مشکوۃ باب المعجزات، فصل اول حدیث ۵۸۷۰)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ددھیالی اور ننھیالی مشابہت کا مدار مرد وزن کے مادوں کی کیفیت کے غلبہ پر ہے، جس کا مادہ قوی ہوتا ہے اس کی طرف مشابہت کھچ جاتی ہے پس یہ مشابہت بھی مادہ میں رکھی ہوئی صلاحیت پر متفرع ہوتی ہے۔

اور دلیل عقلی یہ ہے کہ مقتول کی موت کو ہر کوئی تلوار کی مار اور بندوق کی گولی کی طرف اور خودکشی کرنے والے کی موت کو زہر کھانے کی طرف منسوب کرتا ہے، حالانکہ مارنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، لوگ یہ نسبت سبب پر مسبب کے ترتُّب کی وجہ سے کرتے ہیں سب جانتے ہیں کہ اللہ نے تلوار، گولی اور زہر میں مار ڈالنے کی صلاحیت رکھی ہے، پس تلوار وغیرہ کا مارنا بھی درحقیقت اللہ کا مارنا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ہر شخص جانتا ہے کہ مادر شکم میں مادہ پہنچنے کے بعد ہی بچہ پیدا ہوتا ہے اور بوائی، پیڑ جمائی اور سینچائی کے بعد ہی غلہ اور درخت پیدا ہوتے ہیں، حالانکہ یہ سب کام اللہ کے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اسباب کے محتاج نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے اشیائے عالم میں تاثیرات رکھ دی ہیں اور کچھ چیزوں کو اسباب ومسببات کی زنجیر میں جکڑ دیا ہے، اس لئے وہ چیزیں اشیائے عالم میں رکھی ہوئی صلاحیتوں پر متفرع ہوتی ہیں اور اسباب ومسببات کے دائرہ میں وجود پذیر ہوتی ہیں۔

یہیں سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ انسان مکلّف کیوں ہے اور دیگر حیوانات مکلّف کیوں نہیں؟ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں مکلّف ہونے کی صلاحیت وقابلیت پیدا کی ہے اور دیگر حیوانات میں یہ صلاحیت نہیں رکھی۔ اس لئے انسان مکلّف ہے اس کو احکامات دیئے گئے ہیں اور اس کو اعمال کا اچھا برا بدلہ دیا جائے گا۔ غرض تکلیف شرعی انسان میں رکھی ہوئی صلاحیت پر متفرع ہے۔

باب ذكرِ "سنة اللّٰه" التي أشير إليها في قوله تعالى: ﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰه تَبْدِيْلاً ﴾

اعلم أن بعضَ أفعالِ اللّٰه تعالى تَتَرَتَّب على القُوى المودَعَةِ في العالم، بوجهٍ من وجوهِ الترتُّب، شهد بذلك النقل والعقل:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿إن الله خلق آدم من قُبْضَةٍ قَبَضَهَا من جميع الأرضِ فجاء بنو آدم على قدر الأرض: منهم الاحمر والأبيض والأسود وبين ذلك، والسَّهْل والحَزْن والخبيثُ والطيِّبُ﴾

وسأله عبد الله بن سَلَامٍ: ما يَنْزِعُ الولدَ إلى أبيه، أو إلى أمه؟ فقال: ﴿إذا سَبَقَ ماءُ الرجل ماءَ المرأة نَزَعَ الولَد، وإذا سبق ماءُ المرأة ماءَ الرجل نزعت﴾

ولا أرى أحدًا يَشُكُّ في أن الإماتَةَ تَسْتَنِد إلى الضرب بالسيف، أو أكل السَّم، وأن خلقَ الولد في الرحم يكون عقيب صَبِّ المنيِّ، وأن خَلْقَ الحبوب والأشجار يكون عقيب البَذْر والغرس والسَّقي؛ ولأجل هذه الاستطاعة جاء التكليفُ وأُمِروا ونُهوا، وجوزوا بماعملوا.

ترجمہ: اس سنت الہیہ کا بیان جس کا ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰه تَبْدِيْلاً﴾ میں تذکرہ آیا ہے۔

جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ کام ان قوتوں (صلاحیتوں) کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں، جو اللہ نے عالم کے اندر ودیعت فرمائی ہیں، ترتب کی شکلوں میں سے کسی شکل کے ذریعہ، اور عقل ونقل دونوں اس کی شہادت دیتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس مٹھی مٹی سے پیدا کیا ہے جو تمام روئے زمین سے لی گئی تھی، چنانچہ انسان مختلف قسم کے پیدا ہوئے: کوئی سرخ، کوئی سفید، کوئی کالا تو کوئی ان کے بیچ کی رنگت کا اور کوئی خوش طبع تو کوئی سراپا حزن وملال، اور کوئی خبیث تو کوئی طیب۔

اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ کونسی چیز بچے کو باپ کی طرف یا ماں کی طرف جذب کرتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جب مرد کا مادہ عورت کے مادہ سے سبقت کرتا ہے تو باپ اپنی طرف جذب کرلیتا ہے اور جب عورت کا مادہ مرد کے مادہ سے سبقت کرتا ہے تو ماں اپنی طرف جذب کرلیتی ہے۔

اور میں کسی کو نہیں پاتا جس کو اس امر میں تردد ہو کہ قتل کی نسبت تلوار کی مار کی طرف ہوتی ہے یا زہر کھانے کی طرف ہوتی ہے اور نہ اس بات میں کسی کو تردد ہے کہ رحم کے اندر بچے کی تخلیق منی ریڑھنے کے بعد ہوتی ہے اور نہ اس بات میں کسی کو شک ہے کہ غلہ اور درختوں کی پیداوار بوائی، پیڑ جمائی اور سینچائی کے بعد ہوتی ہے۔

اور اسی استطاعت (صلاحیت) کی بناء پر تکلیف شرعی آئی ہے اور انسان حکم دیئے گئے ہیں اور روکے گئے ہیں اور نیک و بد کی جزا و سزا دیئے جائیں گے۔

☆ ☆ ☆

کائنات میں چھ مکنون صلاحیتوں کا بیان

قدرت نے کائنات میں جو قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، جن پر افعال الٰہی مرتب ہوتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

اول: عناصر اربعہ میں سے ہر عنصر کی الگ ماہیت اور جدا خاصیت ہے، پس جس مرکب میں جو عناصر ہوں گے، اس میں ان عناصر کے خواص ضرور پائے جائیں گے۔ جیسے مفرد ادویہ میں الگ الگ خواص ہیں، پس معجون مرکب میں مفردات کے خواص مجتمع ہوں گے۔

طبیعت اور ماہیت ما به الشيئ هو هو کو کہتے ہیں یعنی جو چیز آگ کو آگ، پانی کو پانی، انسان کو انسان، اور گھوڑے کو گھوڑا بناتی ہے وہی اس کی ماہیت اور طبیعت ہے اور خاصہ وہ چیز ہے جو ماہیت سے خارج ہو اور وہ ما به الامتياز بنے، جیسے ضَاحِك انسان کا خاصہ ہے۔

آگ کی خصوصیت حرارت اور استعلاء ہے جب بھی آگ جلائی جائے گی وہ بلندی کی طرف جائے گی، الا یہ کہ قسر قاسر سے اسے نیچے موڑ دیا جائے۔ اور پانی کی خصوصیت برودت اور پھیلنا ہے، پانی تا بہ حد امکان پھیلتا ہی چلا جاتا ہے الا یہ کہ آڑ بنا کر روک دیا جائے۔ اور ہوا کا خاصہ یبوست ونفوذ ہے، ہوا ہر خالی جگہ کو بھر دیتی ہے۔ حکماء خلاء کو محال مانتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہر مکان بھرا ہوا ہے، اگر کسی چیز نے نہیں بھرا تو ہوا نے اس کو بھر رکھا ہے۔ اور مٹی کا خاصہ بخل وامساک ہے، زمین میں جو بھی چیز دبا دی جاتی ہے، زمین اس کو روک لیتی ہے، بس قیامت کے دن ہی وہ اپنا بوجھ نکالے گی۔ غرض عناصر کی یہ ماہیات وخواص کائنات میں رکھی ہوئی مکنون صلاحیتیں ہیں، مرکبات میں ان کا پایا جانا ضروری ہے۔

دوم: جسم طبیعی میں ہیولی اور صورت جسمیہ کے علاوہ ایک جوہری جزء اور بھی ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اجسام طبیعیہ نوع

بہ نوع تقسیم ہوتے ہیں، یہی جوہری جزء صورت نوعیہ کہلاتا ہے، جیسے جسم کی انواع: حیوانات، نباتات اور جمادات ہیں پھر ہر ایک کی انواع ہیں، یہ سب تقسیم صورت نوعیہ کا کرشمہ ہے، مثلاً آسمان وزمین اور انسان اور فرس وبقر جس چیز کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں وہ ان کی صورنوعیہ ہیں، اور ہر صورت نوعیہ کے الگ احکام ہیں، جس کی تفصیل آگے باب ذکر شیئ من اسرار الوقائع الحشریہ (رحمۃ اللہ ۱:۳۹۹) میں آرہی ہے۔ یہ صورنوعیہ اوران کے احکام بھی کائنات میں رکھی ہوئی مکنون صلاحیتیں ہیں۔ ہرنوع میں اس کے نوعی احکام ضرور پائے جاتے ہیں، وہ اس سے منفک نہیں ہو سکتے۔

سوم: عالم مثال کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، زمینی وجود سے پہلے اشیا کا عالم مثال میں وجود ہوتا ہے، پھر وہ چیزیں زمین میں موجود ہوتی ہیں، اس لئے اُس عالم کے احوال اور وہاں کے وجود کے خواص بھی قوی (صلاحیتوں) میں داخل ہیں مثلاً یورپ کا کوئی شخص ایشیا میں آئے یا اس کا برعکس ہو، تو سابقہ براعظم کے مخصوص احوال خطہ بدلنے سے ختم نہیں ہوتے، بلکہ کچھ نہ کچھ باقی رہتے ہیں۔

چہارم: ملأ اعلی کی دعائیں بھی مکنون صلاحیتیں ہیں۔ ملأ اعلی نفوس قدسیہ کے لئے اور مصلحین قوم وملت کے لئے نیک دعائیں کرتے ہیں اور جولوگ قوم وملت کی اصلاح کی راہ میں روڑا بنتے ہیں اور دنیا میں شروفساد پھیلاتے ہیں ان کے لئے بددعائیں کرتے ہیں۔ یہ بھلی بری دعائیں بھی مکنون صلاحیتیں ہیں، جیسے کوئی شخص خوش حال ہوتا ہے یا بڑا مرتبہ پاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کے ماں باپ کی یا استاذ کی دعائیں اس کے شامل حال ہیں، اسی طرح ملأ اعلی کی دعائیں بھی اشیائے عالم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

پنجم: مختلف زمانوں میں جو مختلف شریعتیں نازل ہوئی ہیں، جن میں کچھ چیزیں ضروری اور کچھ چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں ان کا بھی جزاوسزا میں دخل ہے مثلاً آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا اور یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدۂ تحیہ درست تھا اس لئے ان پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، اب یہ دونوں کام حرام ہیں، پس وہ باعث عقاب ہیں۔

غرض یہ بھی اعمال میں ودیعت کی ہوئی صلاحیتیں ہیں، پہلے مباح ہونے کی وجہ سے ان اعمال میں سزا کی صلاحیت نہیں تھی اور اب حرام قرار دینے کے بعد ان میں عقاب کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

ششم: دو چیزوں میں تلازم بھی قُوی (صلاحیتوں) میں شمار ہوتا ہے۔ مثلاً طلوع شمس اور وجود نہار میں تلازم ہے، پس جب بھی ملزوم (طلوع شمس) پایا جائے گا تو لازم (نہار) ضرور پایا جائے گا، کیونکہ جب قدرت نے ان دو چیزوں میں لزوم کا تعلق رکھا ہے تو اب اس نظام کو درہم برہم کرنا قرین مصلحت نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کسی سرزمین میں موت کا فیصلہ کرتے ہیں، تو وہاں پہنچنے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کردیتے ہیں (رواہ احمد والترمذی، مشکوۃ باب الایمان بالقدر حدیث ۱۱۰) کیونکہ وہاں مرنے اور وہاں پہنچنے کے درمیان تلازم ہے، پس اس کے تحقق کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا کردی جاتی ہے۔

غرض مذکورہ تمام باتیں دلائل نقلیہ سے ثابت ہیں اور دلائل عقلیہ بھی اس کی پشت پر ہیں۔ بدیہی دلائل سے وہ تمام باتیں ثابت ہیں۔

فتلك القُوى:
منها: خواص العناصر ،وطبائِعُهَا.
ومنها: الأحكام التى أودعها الله فى كل صورة نوعية.
ومنها: أحوال عالَمِ المثال، والوجودِ الْمَقْضِيِّ به هنالك قبلَ الوجود الأرضى.
ومنها :أدعية الـمـلأ الأعـلى بِجُهْدِ هِمَمِهِمْ لمن هذّب نـفسَـه، أو سعى فى إصلاح الناس، وعلى من خالف ذلك.
ومنها : الشـرائـع الـمكتـوبة عـلى بنى آدم، وتَحَقُّقُ الإيجاب والتحريم، فإنها سببُ ثوابِ المطيع وعقابِ العاصى.
ومنها : أن يَـقْـضِـىَ الـلّـه تعالى بَشيئ ،فَيَجُرُّ ذلك الشيئ شيئا آخَرَ، لانه لازِمُه فى سنة الله، وخَرْمُ نـظـام اللزوم غَيْرُ مرضى؛ والأصـل فيه: قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿إذا قضى الله لعبد أن يموت بأرض جعل له إليهاحاجةً﴾
فكل ذلك نطقت به الأخبار، وأوجبته ضرورة العقل.

ترجمہ: پس وہ صلاحتیں (درج ذیل ہیں):
ان میں سے ایک: عناصر کی خصوصیات اور ان کی ماہیات ہیں۔
اوران میں سے ایک: وہ احکام ہیں جو اللہ نے ودیعت رکھے ہیں ہر صورت نوعیہ میں۔
اوران میں سے ایک: عالم مثال کے اور اس وجود (پائے جانے) کے احکام ہیں، جس کا وہاں فیصلہ کیا گیا ہے، وجود ارضی سے پہلے۔
اوران میں سے ایک: ملأ اعلیٰ کی دعائیں ہیں، ان کی پوری توجہ سے (یعنی دل کی گہرائی سے) اس شخص کے لئے جو خود کو سنوار لے یا لوگوں کو سنوارنے کی محنت کرے اور ان لوگوں کے لئے بددعائیں ہیں جو اس کے برخلاف کام کرتے ہیں۔
اوران میں سے ایک: وہ قوانین ہیں جو انسانوں کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اور ایجاب وتحریم کا پایا جانا ہے، کیونکہ یہ چیزیں فرمانبردار کے ثواب کا اور نافرمان کے عقاب کا سبب ہیں۔

اوران میں سے ایک: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرماتے ہیں، پس گھسیٹتی ہے وہ چیز دوسری چیز کو، اس لئے کہ وہ دوسری چیز پہلی چیز کے لئے دستور خداوندی میں لازم ہے، اور لزوم کے نظام میں سوراخ کرنا یعنی درہم برہم کرنا پسندیدہ نہیں اور اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے کسی سرزمین میں موت کا فیصلہ کرتے ہیں، تو اس کے لئے اس زمین کی طرف کوئی ضرورت پیدا کردیتے ہیں''۔

غرض یہ سب باتیں روایات میں وارد ہوئی ہیں اور بداہت عقل نے ان کو ثابت کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

تعارض اسباب اور وجہ ترجیح

جب اُن اسباب میں تعارض ہوتا ہے، جن پر حسب عادت فیصلہ خداوندی مرتب ہوتا ہے یعنی مسببات وجود میں آتے ہیں۔ اور تمام اسباب کے تقاضوں کا یعنی مسببات کا پایا جانا ممکن نہیں ہوتا تو حکمت خداوندی اس سبب کو ترجیح دیتی ہے جو خیر کامل یعنی مفاد عامہ سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے یعنی جس سبب کا پایا جانا قرین مصلحت ہوتا ہے اس کو وجود بخشا جاتا ہے۔

متفق علیہ حدیث ہے کہ اللہ کے ہاتھ میں ترازو ہے، وہ پلڑے کو بلند بھی کرتے ہیں اور جھکاتے بھی ہیں (ترغیب وترہیب ۲: ۴۸ فتح ۸: ۳۵۲) اس میں لفظ میزان سے یہی بات مراد ہے کہ بوقت تعارض اسباب اللہ تعالیٰ نافع تر سبب کو بروئے کار لاتے ہیں اور دیگر اسباب کا عمل موقوف کرتے ہیں، سورۃ الرحمٰن میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتے ہیں، اس کام سے بھی مراد یہ ہے کہ بوقت تعارض اسباب اللہ تعالیٰ بعض اسباب کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں۔

پھر ترجیح مختلف وجوہ سے دی جاتی ہے، کبھی قوت سبب کی بناء پر ترجیح دی جاتی ہے، یعنی متعارض اسباب میں سے جو سبب قوی ہوتا ہے اس کو کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے اور کبھی آثار کو ملحوظ رکھ کر ترجیح دی جاتی ہے یعنی جس سبب کے آثار ونتائج مفید ہوتے ہیں اس کو بروئے کار لایا جاتا ہے اور کبھی صفت تدبیر کا عمل موقوف کر کے صفت خلق کام کرتی ہے مثلاً ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالدیا گیا، آگ کا کام جلانا ہے، اللہ کی صفت تدبیر نے اس میں یہ تاثیر رکھی ہے مگر ملأ اعلیٰ کی دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شامل حال تھیں، ان دعاؤں کا تقاضا تھا کہ آگ نہ جلائے، چنانچہ صفت تدبیر کا عمل موقوف کر کے صفت خلق نے آگ کو خنک بے ضرر بنادیا۔

اس قسم کی اور بھی وجوہ ترجیح ہیں مگر ہمارا علم تمام اسباب کا احاطہ نہیں کرسکتا، نہ ہم بوقت تعارض احق (زیادہ حقدار سبب) کو پہچان سکتے ہیں، البتہ اتنی بات ہم یقین سے جانتے ہیں کہ جو چیز موجود ہوتی ہے وہ موجود ہونے ہی کے لائق ہوتی ہے۔ جو ان باتوں کا پختہ یقین کرلے گا اس کا بہت سے اشکالات سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔

واعلم أنه إذا تعارضتِ الأسبابُ التي يترتَّب عليها القضاء بحسب جَرْيِ العادة، ولم يمكن وجودُ مقتضياتها أجْمَعَ، كانت الحكمة حينئذ مراعاةَ أقربِ الأشياء إلى الخير المطلق؛ وهذا هو المعبَّر عنه بالميزان في قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿بيده الميزانُ، يرفع القِسْطَ ويخفِضُه﴾ وبالشأن في قوله تعالى: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ﴾

ثم الترجيحُ يكون تارةً بحال الأسباب، أيُّها أقوى؟ وتارة بحال الآثار المترتبة، أيها أنفع؟ وبتقديم باب الخلق على باب التدبير؛ ونحو ذلك من الوجوه؛ فنحن وإن قصُر علْمُنا عن إحاطة الأسباب، ومعرفةِ الأحق عند تعارضها، نعلم قطعًا: أنه لايوجد شيئ إلا وهو أحقُّ بأن يوجد؛ ومن أيقن بما ذكرنا استَرَاح عن إشكالات كثيرة.

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ جب ان اسباب میں تعارض ہوجاتا ہے جن پر فیصلۂ خداوندی مرتب ہوتا ہے، عادت جاری ہونے کے اعتبار سے، اور تمام اسباب کے تقاضوں کا پایا جانا ممکن نہیں ہوتا، تو حکمت اس وقت خیر کامل (یعنی مفاد عالم) سے نزدیک تر چیز کی رعایت کرنا ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو میزان سے تعبیر کیا گیا ہے آنحضور ﷺ کے اس ارشاد میں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ترازو ہے، کبھی پلڑا اٹھاتے ہیں اور کبھی جھکاتے ہیں، اور اسی کو "اہم کام" سے تعبیر کیا گیا ہے ارشاد باری ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ﴾ (الرحمٰن آیت ۲۹) میں۔

پھر ترجیح کبھی ہوتی ہے اسباب کی حالت دیکھ کر کہ ان میں سے کون قوی تر ہے؟ اور کبھی اسباب پر مرتب ہونے والے آثار (مسببات) کی حالت دیکھ کر کہ ان میں سے کون مفید تر ہے؟ اور (کبھی) صفت خلق کی کارفرمائی کو صفت تدبیر کی کارفرمائی پر مقدم کر کے۔ اور اس قسم کے دیگر وجوہ ترجیح سے، پس اگرچہ ہمارا علم کوتاہ ہے اسباب کا احاطہ کرنے سے، اور اسباب کے تعارض کے وقت احق (زیادہ حقدار) کو پہچاننے سے (تاہم) یقینی طور پر ہم جانتے ہیں کہ نہیں پائی جاتی کوئی چیز مگر وہ پائے جانے کی زیادہ حقدار ہوتی ہے اور جو شخص مذکورہ باتوں کا یقین کر لے وہ بہت سے اشکالات سے آرام پا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

عُلویات کے سِفلیات پر اثرات

(کواکب کی تاثیر کا بیان)

اوپر یہ بات آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیائے کائنات میں صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں اور اسباب میں تاثیرات

رکھی ہیں، اب اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب دیا جاتا ہے۔

سوال: کیا کواکب کی شکلوں (عقرب، جدی، دَلو، حُوت، میزان، ثریا، سُہیل وغیرہ) میں اللہ تعالیٰ نے سفلیات پر اثر انداز ہونے کی صلاحیتیں رکھی ہیں؟ علم نجوم والے اس کے قائل ہیں، شریعت اس سلسلہ میں کیا کہتی ہے؟

جواب: کواکب کی بعض تاثیرات بدیہی ہیں، مثلاً سورج کے احوال کے اختلاف سے سردی گرمی کے موسموں کا بدلنا اور دن کا چھوٹا بڑا ہونا اور چاند کی کشش کی وجہ سے سمندر میں جُوار بھاٹا اٹھنا وغیرہ۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ (سنت الٰہی یہ ہے کہ) جب ثریا ستارہ طلوع ہوتا ہے تو کھجوروں کی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں (رواہ احمد کنز العمال حدیث نمبر ۲۱۶۱۴ کشف الخفاء ۱:۱۱۰) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ثُریا ستارے کے سفلیات پر اثرات پڑتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ مالداری اور غریبی، خوش حالی اور خشک سالی اور دیگر انسانی واقعات پر کواکب کی حرکتوں کے اثرات پڑتے ہیں یا نہیں؟ تو یہ بات نہ تو بدیہی ہے، نہ دلیل نقلی سے ثابت ہے اور ہمیں اس میں غور کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے حدیث شریف میں ہے کہ ''جس نے علم نجوم کا کوئی حصہ حاصل کیا اس نے اتنا ہی سحر کا حصہ حاصل کیا، اور جس نے زیادہ حاصل کیا اس نے اتنا ہی زیادہ جادو سیکھا'' (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوۃ باب الکہانہ حدیث ۴۵۹۸) یعنی جس طرح سحر سیکھنا حرام ہے علم نجوم سیکھنا بھی حرام ہے اور جو لوگ بارش ہونے کو نچھتروں کی طرف منسوب کرتے ہیں حدیث متفق علیہ میں ان پر سخت نکیر آئی ہے (مشکوۃ باب الکہانہ حدیث ۴۵۹۶)

سوال: تو کیا ہم یہ بات سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ علویات کے اس قسم کے اثرات سفلیات پر نہیں پڑتے؟ اس لئے علم نجوم کی تحصیل سے روکا گیا ہے اور مُطِرْنَا بِنَوْءِ کذا کہنے والوں پر نکیر آئی ہے۔

جواب: نہیں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ شریعت میں کواکب کی اس قسم کی تاثیرات کی صراحۃً نفی آئی ہے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ستاروں میں ایسی خصوصیات رکھی ہوں کہ وہ زمینی واقعات کو متاثر کرتے ہوں، اور اس کی شکل یہ ہوتی ہو کہ ستاروں کے اثرات اولاً ان کے ماحول (اردگرد) پر پڑتے ہوں، پھر رفتہ رفتہ ہوا کے توسط سے یہ اثرات سفلیات تک پہنچتے ہوں اور زمینی واقعات کو متاثر کرتے ہوں، جیسے عطریات اور گندگیاں پہلے اپنے اردگرد کی ہوا کو متاثر کرتی ہیں، پھر وہ اثرات رفتہ رفتہ دور تک پھیل جاتے ہیں۔

سوال: اگر کواکب میں اس قسم کے اثرات ہیں یا ہو سکتے ہیں تو پھر شریعت نے علم نجوم کی تحصیل سے کیوں روکا ہے؟ اس صورت میں تو علم نجوم کی تحصیل جائز ہونی چاہئے تا کہ اس کے ذریعہ جلب منفعت یا دفع مضرت کیا جا سکے، یہ ممانعت تو اس پر صاف دلالت کرتی ہے کہ علویات میں اس قسم کے اثرات نہیں ہیں۔

جواب: ممانعت کی وجوہ تو اور بھی ہو سکتی ہیں، مثلاً:

① شریعت نے کہانت (جنات سے خبریں لے کر بتانے) سے سختی سے روکا ہے، مسلم شریف میں حدیث ہے کہ

حضرت معاویہ بن الحکم رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ہم زمانہ جاہلیت میں چند کام کرتے تھے، ہم کاہنوں کے پاس جاتے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ فلا تأتوا الکھان (اب کاہنوں کے پاس مت جایا کرو) (مشکوۃ باب الکہانہ حدیث ۴۵۹۲)

اور جو کاہن کے پاس جاتا ہے اور اس سے غیب کی باتیں پوچھتا ہے، پھر وہ جو بتاتا ہے اس کو مانتا ہے تو آپؐ نے اس شخص سے بے تعلقی کا اعلان فرمایا ہے (احمد، ابوداؤد، ترمذی مشکوۃ باب الکہانہ حدیث ۴۵۹۹)

مگر جب آپ سے کاہنوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے بتلایا کہ فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں اور آسمانوں میں جو معاملہ طے پاتا ہے اس کا چرچا کرتے ہیں، شیاطین وہاں سے کوئی بات چرالاتے ہیں اور جس کاہن کے تابع ہوتے ہیں اس کو وہ ادھوری بات پہنچادیتے ہیں، کاہن اس میں سو جھوٹ ملا کر بات مکمل کرتا ہے اور پیشین گوئی کرتا ہے، جب وہ ایک بات صحیح نکلتی ہے تو لوگ اس کے گرویدہ ہوجاتے ہیں، مگر نہیں سوچتے کہ اس کی بتائی ہوئی ننانوے باتیں تو جھوٹی نکلیں (رواہ البخاری مشکوۃ باب الکہانہ حدیث ۴۵۹۴ و ۴۶۰۰)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ کاہنوں کی بعض باتیں صحیح ہوتی ہیں، تاہم کہانت سیکھنے سے، اس پر عمل کرنے سے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے منع کیا گیا، حدیث میں ہے کہ جو عرّاف کے پاس گیا اور اس سے کوئی بات معلوم کی تو اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں کی جائے گی (رواہ مسلم مشکوۃ حدیث ۴۵۹۵) پس ممکن ہے کہ کواکب میں بھی تاثیرات ہوں مگر کسی مصلحت سے شریعت نے علم نجوم پڑھنے سے اور کواکب کی طرف نسبت کرنے سے منع کیا ہو۔

(۲) سورۂ آل عمران آیت ۱۵۶ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ منافقین جیسی باتیں نہ کریں۔ منافقین اپنے بھائی بندوں سے کہتے تھے، جبکہ وہ کسی سرزمین میں سفر کرتے تھے، یا جہاد کے لئے نکلتے تھے کہ: "اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے" حالانکہ یہ بات کہنا فی نفسہ ممنوع نہیں، لوگ اس قسم کی بات کہا ہی کرتے ہیں، جب کوئی شخص خطرہ کے کام میں کودتا ہے تو اس کی متعلقین اس کو سمجھاتے ہیں کہ بھئی! یہ سفر مت کر، یہ خطرے کا کام مت کر، مگر جب وہ نہیں مانتا اور لقمۂ اجل بن جاتا ہے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہماری نہیں مانی، اس لئے یہ نوبت آئی۔

غرض اس قسم کی باتیں ممنوع نہیں، مگر منافقین اس قسم کی باتیں اہل ایمان کو جہاد سے روکنے کے لئے اور ان میں بزدلی پیدا کرنے کے لئے کہا کرتے تھے، اس لئے اہل ایمان کو اس قسم کی باتیں کہنے سے منع کیا گیا۔

(۳) اور متفق علیہ حدیث میں ہے کہ کسی کا بھی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائیگا، جو بھی جنت میں جائے گا، فضل باری سے جائے گا (فتح ۱۰: ۱۲۷ مسلم کتاب صفات المنافقین ۱۶۱:۱۷) حالانکہ آدمی اعمال صالحہ حصول جنت ہی کے لئے کرتا ہے اور قرآن کریم بھرا پڑا ہے کہ اعمال صالحہ کی جزاء جنت ہے، پس اس حدیث کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ دخول جنت کا حقیقی سبب فضل الٰہی ہے اور اعمال بس ظاہری سبب ہیں۔

(۴) حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ کے والد نے مہر نبوت دیکھ کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں حکیم ہوں، آپ کے اس

پھوڑے کا علاج کرسکتا ہوں، آپ نے فرمایا: ''تم ہمدرد ہو اور اللہ حکیم ہیں'' (مشکوۃ کتاب القصاص حدیث ۳۴۷۱ مسند احمد ۴: ۱۶۳) حالانکہ دنیا علاج کرنے والے کو حکیم، ڈاکٹر کہا کرتی ہے پس اس حدیث میں جو نفی ہے وہ کسی اور مصلحت سے ہے۔

خلاصہ یہ کہ کبھی ایک امر واقعی سے بر بنائے مصلحت روکا جاتا ہے، پس ممکن ہے کہ علم نجوم حاصل کرنے کی ممانعت بھی اسی قبیل سے ہو، اس ممانعت سے کواکب کی تاثیر کی نفی نہیں ہوتی، واللہ اعلم بالصواب (تفصیل کے لئے رحمۃ اللہ ۵: ۵۳۲ دیکھیں)

أما هَيْآت الكواكب، فمن تأثيرها: مايكون ضروريا، كاختلاف الصيف والشتاء، وطول النهار وقِصَره باختلاف أحوال الشمس، وكاختلاف الجزر والمدّ باختلاف أحوال القمر؛ وجاء في الحديث: ﴿إذا طلع النجمُ ارْتَفَعَتِ العاهةُ﴾ يعني بحسب جرى العادة.

لكن كون الفقر والغنى، والجَدْب والخصب، وسائر حوادث البشر بسبب حركات الكواكب، فمما لم يثبت في الشرع؛ وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن الخوض في ذلك، فقال: ﴿من اقتبس شعبة من النجوم اقتبس شعبةً من السِّحر﴾ وشدّد في قول: "مُطِرْنا بنَوْءِ كذا".

ولا أقول: نَصَّت الشريعة على أن الله تعالى لم يجعل في النجوم خواصَّ، تتولّد منها الحوادثُ، بواسطة تغيُّرِ الهواء الْمُكْتَنَفِ بالناس، ونحوِ ذلك.

وأنت خبير بأن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن الكهانة، وهي الإخبار عن الجن، وبرئ عمن أتى كاهنا وصدّقه، ثم لما سُئل عن حال الكُهّان، أخبر: أن الملائكة تنزل في الْعنان، فتذكر الأمرَ الذى قُضي في السماء، فَتَسْتَرِق الشياطين السمعَ، فَتُوْحِيْهِ إلى الكهان، فيكذبون معه مائة كَذِبَةٍ؛ وأن الله تعالى قال: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْن كَفَرُوْا، وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوْا فِي الْأَرْضِ، أَوْ كَانُوْا غُزًّا: لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَامَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا﴾ وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿لن يُدخِل أحدَكم الجنةَ عملُه﴾؛ وقال: ﴿إنما أنت رفيق، والطبيبُ اللهُ﴾ وبالجملة فالنهى يدور على مصالحَ كثيرة؛ والله أعلم.

ترجمہ: رہی ستاروں کی شکلیں، تو ان کی تاثیرات میں سے بعض وہ ہیں جو بدیہی ہیں، جیسے جاڑے گرمی کا اختلاف، اور دن کا لمبا مختصر ہونا، سورج کے احوال کے اختلاف سے اور جیسے سمندر کے اتار چڑھاؤ کا اختلاف چاند کے احوال کے اختلاف سے اور حدیث میں آیا ہے کہ: ''جب ثریا ستارہ طلوع ہوتا ہے (یعنی صبح صادق کے وقت نظر آتا ہے) تو (کھجور کی) بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں'' یعنی سنت الٰہی اسی طرح چل رہی ہے۔

البتہ غریبی اور مالداری اور خشک سالی اور خوش حالی اور دیگر انسانی واقعات کا ستاروں کی حرکت کی وجہ سے ہونا، پس

یہ ان باتوں میں سے ہے جو شریعت میں ثابت نہیں، اور نبی کریم ﷺ نے اس میں گھسنے سے منع کیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے کہ: ''جس نے علم نجوم کا کوئی حصہ حاصل کیا، اس نے علم سحر کا ایک حصہ حاصل کیا'' اور یہ کہنے پر سخت نکیر کی گئی ہے کہ: ''ہم فلاں پچھتر کی وجہ سے بارش دیئے گئے''

اور میں یہ نہیں کہتا کہ شریعت نے اس کی صراحت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں میں ایسی تاثیرات نہیں رکھیں، جن سے زمینی واقعات پیدا ہوں، اس ہوا میں تغیر واقع ہونے کے ذریعہ جو لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے اور اس قسم کی کسی اور صورت سے۔

اور آپ خوب واقف ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کہانت سے روکا ہے اور کہانت جنات سے باتیں لے کر بتلانا ہے —— اور بے تعلقی ظاہر فرمائی ہے اس شخص سے جو کاہن کے پاس جاتا ہے اور اس کی بات مانتا ہے، پھر جب آپ سے کاہنوں کے احوال دریافت کئے گئے تو بتلایا کہ فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں، پس اس بات کا چرچا کرتے ہیں جو آسمان میں طے پائی ہے، پس شیاطین بات چرا لیتے ہیں، پھر وہ بات کاہنوں کو پہنچا دیتے ہیں، پس وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہوجانا جو کہ کافر ہیں (یعنی دل میں) اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کی نسبت، جبکہ وہ لوگ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں یا وہ لوگ کہیں غازی بنتے ہیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''ہرگز نہیں داخل کرے گا تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل جنت میں'' اور آپؐ نے فرمایا ہے: ''تم نرم برتاؤ کرنے والے (یعنی ہمدرد) ہی ہو۔ اور حکیم تو اللہ پاک ہیں'' اور خلاصہ یہ ہے کہ ممانعت بہت سی مصلحتوں پر گھومتی ہے، واللہ اعلم۔

فوائد

① جہاں اسباب و مسببات کے درمیان تعلق واضح ہو وہاں سبب کی طرف نسبت درست ہے، جیسے یہ کہنا درست ہے کہ فلاں طبیب سے علاج کرایا، اس سے مریض کو شفا ہوگئی۔ اور جہاں تعلق خفی ہو، عام لوگ اس کا ادراک نہ کرسکتے ہوں وہاں شریعت نسبت کی اجازت نہیں دیتی، کیونکہ اس سے شرک کا راستہ کھلتا ہے، پس یہ کہنا درست نہیں کہ فلاں ستارہ طلوع ہوا اس لئے ایسا ہوا فلاں نچھتر لگا اس لئے بارش ہوئی البتہ اگر کسی ستارہ کا اثر عام وخاص جانتے ہوں تو نسبت درست ہے، جیسے یہ کہنا کہ سورج نکلا اس لئے گرمی شروع ہوئی، حدیث میں ثریا کے طلوع کی جو بات کہی گئی ہے وہ اسی قبیل سے ہے۔

اور اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ امور عادیہ میں غیر اللہ سے استعانت درست ہے، کسی سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذرا میرا یہ بوجھ میرے سر پر رکھ دو، کیونکہ اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی، مگر امور غیر عادیہ میں غیر اللہ سے استعانت حرام ہے۔ جیسے کسی پیر ولی سے اولاد مانگنا حرام ہے، کیونکہ اس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے۔

② حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ کے والد پہلی بار حاضر خدمت ہوئے تھے اور ابھی ابھی انہوں نے ایمان قبول کیا تھا،

جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی پشت پر مہر نبوت دیکھی، تو انھوں نے اس کو پھوڑا سمجھا، اور دلسوزی سے علاج کرنے کی اجازت چاہی آنحضور ﷺ نے ان کی ہمدردی کی قدر کی اور یہ فرما کر بات ٹالدی کہ حقیقی معالج اللہ تعالیٰ ہیں۔

باب ــــــ ۵

روح کی حقیقت و ماہیت کا بیان

روح کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے، دفع دخل مقدر کے طور پر، دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

① آیت کریمہ ﴿وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کی حقیقت نہیں سمجھی جاسکتی، کیونکہ ہر مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ذہن کی ایک سطح اور علم کی ایک مقدار ضروری ہے، روح کا مسئلہ نہایت دقیق ہے، اس کو سمجھنے کے لئے جو علمی مستوی چاہئے وہ انسان کو حاصل نہیں آیت کریمہ میں اس کی نفی ہے، پھر یہ بحث کیوں چھیڑی جارہی ہے؟!

جواب یہ ہے کہ آیت میں خطاب یہود سے ہے، جنھوں نے روح کے متعلق سوال کیا تھا، ان کا علمی مستوی اتنا بلند نہیں تھا کہ وہ روح کی حقیقت سمجھ سکتے، اور اس کی دلیل امام سلیمان اَعمش رحمہ اللہ کی قراءت ہے جو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں، ان کی قراءت میں ﴿وَمَا أُوْتُوْا﴾ ہے اور مختلف قراءتیں بمنزلہ مختلف آیات کے ہوتی ہیں اور قرآن قرآن کی تفسیر کرتا ہے، پس ثابت ہوا کہ ﴿وَمَا أُوْتِيْتُمْ﴾ میں بھی خطاب یہود سے ہے، پس اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کی امت کے پاس بھی وہ علمی سطح نہیں کہ وہ روح کی حقیقت سمجھ سکیں۔

فائدہ: مذکورہ قرأت بخاری شریف کتاب العلم باب (۴۷) حدیث ۱۲۵ میں ہے۔ مگر حافظ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ قرأت نہ تو سات قراءتوں میں سے ہے نہ اس کے علاوہ مشہور قراءتوں میں سے ہے (فتح ۱: ۲۲۴) یعنی یہ قرأت شاذہ ہے، جس کا اعتبار نہیں، اور جمہور مفسرین خطاب کو عام مانتے ہیں اور قُرطبی رحمہ اللہ نے ایک مرفوع روایت بیان کی ہے جس میں صراحت ہے کہ آیت میں خطاب عام ہے (تفسیر قرطبی ۱۰: ۳۲۴)

② دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر روح کی حقیقت سمجھی جاسکتی ہے تو قرآن نے سکوت کیوں کیا؟ قرآن کریم کو روح کی حقیقت بیان کرنی چاہئے تھی، یہود نہ سمجھتے: نہ سمجھتے امت محمدیہ تو سمجھتی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم جمہور (عام لوگوں) کی استعداد پیش نظر رکھ کر نازل کیا گیا ہے، قرآن کریم میں ایسے دقیق مضامین نہیں لئے گئے، جو عام لوگوں کے لئے معمہ بن جائیں، اور عام لوگ چونکہ روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے اس لئے قرآن نے سکوت اختیار کیا مگر یہ سکوت اس پر دلالت نہیں کرتا کہ روح کی حقیقت کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

فائدہ: روح کے بارے میں جتنی بات بتلانی ضروری تھی، اور وہ عام لوگوں کی سمجھ میں آسکتی تھی وہ قرآن کریم نے بتلادی ہے اور روح کی تمام حقیقت اس لئے بیان نہیں کی گئی کہ وہ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں،

کوئی دینی کام یا دنیوی معاملہ اس کی حقیقت سمجھنے پر موقوف نہیں۔

روح کے بارے میں آیت کریمہ میں بس اتنا بتلایا گیا ہے کہ وہ ایک چیز ہے، جو اللہ کے حکم سے بدن میں پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے حیوان جی اٹھتا ہے۔ اور جب وہ چیز بدن سے نکل جاتی ہے تو جاندار مرجاتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ سورۃ الاعراف آیت ۵۴ میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿ اَلَا لَـہُ الۡـخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ﴾ (سنو! خلق (پیدا کرنا) اور امر (حکم دینا) دونوں ہی اللہ کے لئے ہیں) اس آیت میں خلق کو امر کے مقابل رکھا گیا ہے۔ خلق: پیدا کرنے یعنی ڈھانچہ بنانے کا نام ہے، پھر حکم ہوتا ہے کہ ''ہوجا'' ﴿ کُنۡ ﴾ پس وہ چیز ہوجاتی ہے۔

اب روح کی حقیقت یہ واضح ہوئی کہ وہ ایک غیر مادی چیز ہے، جس کو ''وجود'' سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں، جب کسی جاندار کا ڈھانچہ بن کر تیار ہوجاتا ہے یعنی تخلیق کا کام مکمل ہوجاتا ہے تو اللہ کا حکم ہوتا ہے، جس سے اس ڈھانچہ میں ایک وجود پیدا ہوجاتا ہے، وہی روح ہے اور جب وہ ''وجود'' اس ڈھانچہ سے نکال لیا جاتا ہے تو اس کا نام موت ہے۔

آیت کریمہ میں ﴿ اَلرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ ﴾ کہہ کر یہی بات مختصر اور واضح انداز میں بیان کی گئی ہے۔ باقی تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے۔

﴿باب حقيقةِ الروح﴾

قال اللّٰه تعالى: ﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ؟ قُلِ: الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ، وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلاً﴾ وقرأ الأعمش من رواية ابن مسعود: ﴿وَمَا أُوْتُوْا مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلاً﴾ويُعلم من هنالك: أن الخطاب لليهود السائلين عن الروح؛ وليست الآية نصًا في أنه لايَعْلم أحد من الأمة المرحومة حقيةَ الروح، كما يُظَنُّ؛ وليس كلُّ ماسكت عنه الشرع لايمكن معرفته ألبتة، بل كثيرًا ما يسكت عنه لأجل أنه معرفة دقيقة، لايصلح لتعاطيها جمهورُ الأمة،وإن أمكن لبعضهم.

ترجمہ: روح کی ماہیت کا بیان: اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ''اور لوگ آپؐ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں؟ آپ جواب دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے (ایک چیز) ہے اور تم کو بس تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے'' اور اعمش رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے پڑھا ہے: ''اور نہیں دیئے گئے وہ (یعنی یہود) علم میں سے مگر تھوڑا'' اور یہاں سے جانا گیا کہ خطاب اُن یہود سے ہے جنھوں نے روح کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اور آیت صریح نہیں ہے اس بارے میں کہ امت مرحومہ میں سے کوئی بھی روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا، جیسا کہ گمان کیا گیا ہے اور یہ بات درست نہیں ہے کہ: ''جس بات سے بھی شریعت خاموشی اختیار کرے اس کا سمجھنا قطعاً ممکن نہیں''، بلکہ بارہا شریعت کسی بات سے خاموشی اس لئے اختیار کرتی ہے کہ وہ ایک باریک علم ہوتا ہے جس کی تحصیل عام امت کے بس کی بات نہیں

ہوتی، اگرچہ اس کی تحصیل کچھ افراد کے لئے ممکن ہوتی ہے۔

لغات:

المرحومة: مہربانی کی ہوئی، یہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مخصوص لقب ہے..... **معرفة** (مصدر): علم، **عَرَف** (ض) **مَعْرِفَة**: پہنچاننا، جاننا..... **تَعاطٰی تَعَاطِیًا الشیئ**: لینا۔

☆ ☆ ☆

روح کیا چیز ہے؟

روح کی حقیقت اول وہلہ میں یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مبدأ حیات یعنی سرچشمہ زندگی کا نام روح ہے، جس کے جسم میں آنے سے حیوان (جاندار) زندہ ہو جاتا ہے، اور جس کے بدن سے جدا ہونے سے جاندار مر جاتا ہے۔ پھر جب مزید غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ روح ایک لطیف بھاپ ہے، جب وہ جسم میں پیدا ہوتی ہے تو جسم زندہ ہو جاتا ہے۔

اب تین سوال پیدا ہوتے ہیں (۱) یہ بھاپ کہاں پیدا ہوتی ہے؟ (۲) کس چیز سے پیدا ہوتی ہے (۳) اور کہاں رہتی ہے؟

جواب:

(۱) یہ بھاپ دل میں پیدا ہوتی ہے۔

(۲) اور اخلاط اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا اور صفرا کے خلاصے (نچوڑ) سے پیدا ہوتی ہے، اور اس میں احساس کرنے کی، بدن کو حرکت دینے کی اور کھائی ہوئی غذا کے نظم وانتظام کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جیسے انجن میں کوئلے اور پانی سے جو اسٹیم تیار ہوتی ہے، اس میں پرزوں کو حرکت دینے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسی طرح دل میں جو اسٹیم تیار ہوتی ہے اس میں مذکورہ بالا تینوں صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اور علم طب میں اسی بھاپ کے احوال سے بحث کی جاتی ہے، کیونکہ عام طور پر جسم بیمار نہیں ہوتا، بلکہ اس بھاپ میں خلل پڑتا ہے، جس کی وجہ سے اعضاء کے افعال بگڑ جاتے ہیں اور جب دواؤں سے بھاپ صحیح ہو جاتی ہے تو سارے اعضاء صحیح کام کرنے لگتے ہیں۔

(۳) یہ بھاپ بدن کے ہر ہر جزء میں ہوتی ہے، جیسے عرق گلاب، گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کے ہر ہر جز میں ہوتا ہے اور آگ انگارے کے ہر ہر جز میں ہوتی ہے۔

اور تجربے سے تین باتیں معلوم ہوئی ہیں:

(۱) اُس اسٹیم کے احوال یعنی پتلا گاڑھا ہونا اور صاف گدلا ہونا، انسان کے قُویٰ اور ان سے سرزد ہونے والے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی لئے شریعت نے اکل حلال پر بہت زور دیا ہے، کیونکہ جب اسٹیم صحیح پیدا ہوگی، جبھی

اعمال درست ہوں گے۔

(۲) اگر بھاپ کے سرچشمہ پر کوئی آفت طاری ہوتی ہے اور بھاپ بننا بند ہوجاتی ہے یا کسی عضو پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے اوراس عضو کی طرف بھاپ کی سپلائی بند ہوجاتی ہے تو انسان یا تو مرجاتا ہے یا وہ عضو بیکار ہوکر رہ جاتا ہے۔

(۳) اس اسٹیم کا بننا زندگی کو، اور اس کا تحلیل ہوجانا موت کو چاہتا ہے۔

غرض سرسری نظر میں یہی بھاپ روح ہے، اور گہری نظر میں یہ روح کا نچلا درجہ ہے، اصل روح اس سے اوپر ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے اوراس روح کو نسمہ، روح ہوائی اور روح حیوانی بھی کہتے ہیں۔

واعلم أن الروح أولُ ما يُدْرك من حقيقتها: أنها مبدأُ الحياة في الحَيَوَان، وأنه يكون حَيًّا بنفخ الروح فيه، ويكون مَيِّتا بمفارقتها منه.

ثم إذا أُمعِن في التأمل يَنْجَلِيْ أن في البدن بُخارا لطيفًا، متولِّدا في القلب من خلاصة الأخلاط، يحمِل القُوى الحسَّاسةَ، والمحرِّكةَ، والمدبِّرَةَ للغذاء، يجري فيه حكمُ الطب.

وتَكْشِف التجربَةُ: أن لكل من أحوال هذا البخار: من رِقَّته، وغِلَظِه، وصفائه، وكُدْرتِه أثرًا خاصًا في القُوى والأفاعيلَ الْمُنْبَجِسَةِ من تلك القوى؛ وأن الآفةَ الطارئة على كل عضو، وعلى توليد البخار المناسِب له، تُفْسِد هذا البخارَ، وتُشَوِّشُ أفاعيلَه؛ ويستلزم تَكَوُّنُه الحياةَ، وتحلُّلُه الموتَ؛

فهو الروح في أول النظر، والطبقةُ السفلى من الروح في النظر الْمُمْعِن؛ ومَثَلُه في البدن كَمَثَلِ ماء الورد في الورد، وكمثل النار في الْفَحْم.

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ روح کی حقیقت کے بارے میں سب سے پہلے جس چیز کا ادراک ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ روح جاندار میں سرچشمۂ حیات ہے، اور یہ کہ جاندار زندہ ہوجاتا ہے اس میں روح پھونکنے سے، اور مردہ ہوجاتا ہے روح کے اس سے جدا ہونے سے۔

پھر جب مزید غور وفکر کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ بدن میں ایک لطیف بھاپ ہے، جو اخلاط کے خلاصہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو احساس کرنے والے، حرکت دینے والے اور غذا کا نظم وانتظام کرنے والے قوی (صلاحیتوں) کی حامل ہے، علم طب کے احکام اسی میں جاری ہوتے ہیں۔

اور تجربہ کھولتا ہے کہ اس بھاپ کے احوال یعنی پتلا ہونے اور گاڑھا ہونے اور صاف ہونے اور گدلا ہونے میں سے ہرایک کے لئے مخصوص اثر ہے قوی میں، اور اُن قوی سے پھوٹنے والے اعمال میں، اور یہ کہ کسی بھی عضو پر اوراس کے مناسب بھاپ کی تولید پر پڑنے والی آفت، اُس بھاپ کو بگاڑ دیتی ہے اوراس کے اعمال کو پراگندہ کردیتی ہے اور

اس کا پیدا ہونا زندگی کو اور اس کا تحلیل ہو جانا موت کو چاہتا ہے۔

پس وہ بھاپ ہی سرسری نظر میں روح ہے، اور گہری نظر میں روح کا نچلا درجہ ہے، اور بدن میں اس کا حال عرق گلاب کی طرح ہے گلاب کے پھول میں، اور آگ کی طرح ہے انگارے میں۔

لغات

أَمْعَنَ فی کے ساتھ بھی مستعمل ہے اور بغیر فی کے بھی یعنی گہرا غور وفکر کیا۔ اسی معنی میں ہے: أَنْعَمَ النظر: اچھی طرح غور کیا...... اِنْجَلی: ظاہر ہونا...... خلاصة: ہر وہ چیز جو دوسری چیز میں سے خالص کر لی جائے۔ خلاصة الكلام: بات کا نچوڑ...... افاعیل جمع الجمع فِعْل کی...... اِنْبَجَسَ الماءُ: پانی جاری ہونا، بہنا...... اِسْتَلْزَمَ الشیئ: لازم سمجھنا، چاہنا۔

اصل روح، روحِ ربانی ہے

مزید غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اصل روح یہ بخار لطیف یعنی نسمہ نہیں ہے، یہ تو اصلی روح کی سواری ہے اور اس کا بدن سے تعلق جوڑتی ہے، جیسے گوند دو چیزوں کو جوڑتا ہے، اسی طرح نسمہ اصلی روح کا جسم سے تعلق جوڑتی ہے۔ اصل روح، روح ربانی ہے، جو روح الٰہی، روح قُدسی روح فوقانی اور نفس ناطقہ بھی کہلاتی ہے، اور یہی روح کا اعلیٰ درجہ ہے۔

اور دلیل یہ ہے کہ جس طرح انسان بدن کا نام نہیں، اسی طرح نسمہ کا نام بھی نہیں، کیونکہ جس طرح بدن میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اسی طرح نسمہ بھی بدلتا رہتا ہے، اور بدلنے والی چیز معین انسان نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ تو غیر متبدل حقیقت ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ زید بدن کا نام نہیں، بدن تو ایک لبادہ ہے جو روح نے اس عالم اجساد میں اوڑھ لیا ہے، کیونکہ بدن ہو یا نہ ہو زید بہر حال موجود رہتا ہے، اسی طرح اس عالم اجساد میں بھی بعض مرتبہ جسم کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے پھر بھی زید بتمامہ موجود رہتا ہے، اسی طرح بچپن سے بوڑھاپے تک بدن میں بے شمار تغیرات ہوتے ہیں پھر بھی زید بحالہ رہتا ہے۔

اسی طرح نسمہ میں بھی بار بار تبدیلیاں آتی ہیں مگر زید بحالہ رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، وہ خواہ بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، چھوٹا ہو یا بڑا، سیاہ ہو یا سفید، عالم ہو یا جاہل، وہ زید ہی رہتا ہے، اور یہ تمام بتدیلیاں بدن اور نسمہ میں آتی ہیں۔ زید میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

اور اگر مختلف ادوار کی تبدیلیوں میں کوئی اشکال ہوتو ہم ایک ہی حال میں مثلاً بچپن میں یہ تبدیلیاں فرض کر سکتے ہیں یا ہم یہ کہیں گے کہ زید کے اوصاف کا ایک حال پر برقرار رہنا یقینی نہیں، اور زید کا ایک حال پر باقی رہنا یقینی ہے، اس لئے زید کے اندر ایک ایسی حقیقت ماننی پڑے گی، جس میں کوئی تبدیلی نہ آئے، اور وہی درحقیقت زید ہو، اسی حقیقت کا نام روح ربانی ہے۔

غرض زید کی ماہیت نسمہ نہیں، نہ بدن اس کی حقیقت ہے، نہ اس کے تشخصات اس کی ماہیت ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں، اور جو اس کو بکر، عمر، خالد سے ممتاز کرتے ہیں، بلکہ اس کی ماہیت یعنی مابه الشئُ هو هو روح ربانی ہے۔

روح ربانی کیا چیز ہے؟: روح ربانی درحقیقت ایک بسیط چیز ہے اور نورانی نقطہ ہے، اس کا انداز نسمہ کے انداز سے بالکل مختلف ہے، نسمہ کے انداز تو باہم متضاد بھی ہیں اور بدلتے بھی رہتے ہیں، ان میں سے بعض جواہر ہیں، بعض اعراض، مگر روح ربانی کی صورت حال یہ نہیں، وہ ہمیشہ یکساں اور ایک حال پر رہتی ہے، انسان خواہ بچہ ہو یا بوڑھا، کالا ہو یا سفید، عالم ہو یا جاہل، روح ربانی ایک ہی حال پر رہتی ہے اور اس کا براہ راست تعلق نسمہ کے ساتھ ہوتا ہے، بدن کے ساتھ نہیں ہوتا، بدن کے ساتھ اس کا تعلق بالواسطہ ہوتا ہے یعنی بدن چونکہ نسمہ کی سواری ہے اور نسمہ روح ربانی کی، اور سواری کی سواری سواری ہوتی ہے اس طرح بدن بھی روح ربانی کی سواری بن جاتا ہے۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ روح ربانی عالم بالا کی طرف سے کھلنے والا ایک روزن (دریچہ، کھڑکی) ہے، اس سوراخ سے انسان پر ہر وہ چیز اترتی ہے جس کی نسمہ میں استعداد ہوتی ہے، جیسے دھوپ، دھوبی کے دھوئے ہوئے کپڑوں کو سفید کرتی ہے، مگر دھوبی دھوپ میں کھڑے کھڑے کالو ہو جاتا ہے، گھر کے صحن میں پڑا ہوا کالا توا دھوپ سے نہیں چمکتا مگر آئینہ جگمگا اٹھتا ہے اور میں جو یہ سبق پڑھا رہا ہوں اس کو بعض طلبہ پوری طرح سمجھ رہے ہیں بعض کچھ کچھ سمجھ رہے ہیں اور بعض کچھ بھی نہیں سمجھ رہے۔ یہ سب استعداد کا فرق ہے، اسی طرح جس نسمہ میں جیسی استعداد ہوتی ہے، ویسا عالم بالا سے اس پر فیض اترتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ زید میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ استعداد ارضی کا نتیجہ ہوتی ہیں، چونکہ اس کا بدن اور نسمہ مٹی سے تیار ہوا ہے، اس لئے اس میں تغیرات ہوتے ہیں اور روح ربانی چونکہ عالم بالا کی چیز ہے، اس لئے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اشکال: روح کی اس بحث پر اشکال یہ ہے کہ نسمہ کے وجود میں آنے سے پہلے بدن میں اخلاط کون تیار کرتا ہے؟ ان کا خلاصہ کون نکالتا ہے؟ دل کو متحرک کون کرتا ہے جس سے بھاپ تیار ہوتی ہے؟ یہ کام تو طبیعت مدبرہ کے ہیں اور وہ ابھی وجود پذیر نہیں ہوئی۔ اسی طرح شاہ صاحب نے روح ربانی صرف انسان میں مانی ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، دیگر حیوانات میں شاہ صاحب صرف نسمہ مانتے ہیں، حالانکہ دلیل دیگر حیوانات میں بھی جاری ہوسکتی ہے، اور حیوان حیوان میں فرق کسی نے نہیں کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ثم إذا أُمعن في النظر أيضًا انْجلى أن هذا الروح مَطِيَّةٌ للروح الحقيقية، ومادة لتعلُّقها؛ وذلك أنا نرى الطفل يَشِبُّ ويشيب، وتتبدَّل أخلاطُ بدنه، والروحُ المتولِّدة من تلك الأخلاط، أكثَرَ من ألف مرة، ويصغُر تارة ويكبُر أخرى، ويسوَدُّ تارة ويَبْيَضُّ أخرى، ويكون جاهلاً مرة وعالمًا أخرى، إلى غير ذلك من الأوصاف المتبدلة والشخص هو هو.

وإن نوقش في بعض ذلك، فلنا أن نفرض تلك التغيرات، والطفل هو هو، أو نقول: لانَجْزِم ببقاء تلك الأوصاف بحالها، ونَجْزِم ببقائه، فهو غيرها.

فالشيئُ الذي هو به هو، ليس هذا الروح، ولا هذا البدن، ولاهذه المشخِّصات التي تُعْرَفُ وتُرى باديَ الرأي؛ بل الروحُ في الحقيقة: حقيقةٌ فَرْدانِيَّةٌ، ونقطةٌ نورانيةٌ، يَجِلُّ طَوْرُهَا عن طور هذه الأطوار المتغيرة المتغايرة، التي بعضها جواهرُ وبعضها أعراضٌ؛ وهي مع الصغير كما هي مع الكبير، ومع الأسود كما هي مع الأبيض، إلى غير ذلك من المتقابلات؛ ولها تعلُّقٌ خاص بالروح الهوائي أولاً، وبالبدن ثانيًا، من حيث أن البدن مَطِيَّةُ النَّسَمَةِ؛ وهي كُوَّةٌ من عالم القُدْس، ينزل منها على النسمة كلُّ ما استعدَّت له؛ فالأمور المتغيرة إنما جاء تغيُّرُ ها من قِبَل الإستعداداتِ الأرضية، بمنزلة حَرِّ الشمس: يُبَيِّضُ الثوبَ، ويُسَوِّدُ القصَّارَ.

ترجمہ: پھر جب مزید گہرا غور وفکر کیا گیا تو واضح ہوا کہ یہ روح (یعنی نسمہ) روح حقیقی کی سواری ہے، اور اس کے (بدن کے ساتھ) جڑنے کا مادہ ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم بچے کو دیکھتے ہیں کہ جوان ہوتا ہے اور بوڑھا ہوتا ہے، اور اس کے بدن کے اخلاط اور اُن اخلاط سے جو روح پیدا ہوتی ہے اس میں تبدیلی آتی ہے، ہزار بار سے زیادہ، اور وہ کبھی چھوٹی ہوتی ہے اور کبھی بڑی، کبھی سیاہ ہوتی ہے اور کبھی سفید، کبھی جاہل ہوتی ہے اور کبھی عالم، وغیرہ وغیرہ بار بار بدلنے والے اوصاف میں سے، درانحالیکہ وہ آدمی وہی رہتا ہے۔

اور اگر جھگڑا کیا جائے اس کے بعض میں، تو ہم ان تغیرات کو فرض کر سکتے ہیں درانحالیکہ بچہ بچہ ہو، یا ہم کہیں گے کہ ہمیں ان اوصاف کے ایک حال پر باقی رہنے کا یقین نہیں ہے اور ہمیں اس شخص کے ایک حال پر باقی رہنے کا یقین ہے، پس وہ شخص ان اوصاف کا غیر ہے۔

پس وہ چیز جس کی وجہ سے وہ چیز وہ چیز ہے، وہ روح (نسمہ) نہیں ہے، اور نہ یہ بدن ہے، اور نہ یہ تشخصات ہیں، جو جانے جاتے ہیں اور اول وہلہ میں دیکھے جاتے ہیں، بلکہ روح حقیقت میں ایک بسیط ماہیت ہے اور نورانی نقطہ ہے، برتر ہے اس کا انداز، اِن بدلنے والے باہم متضاد اوصاف کے انداز سے، جن میں سے بعض جوہر ہیں اور بعض عرض: اور وہ نورانی نقطہ ہے چھوٹے کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسا بڑے کے ساتھ۔ اور کالے کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسا کہ سفید

کے ساتھ، وغیرہ وغیرہ متقابل باتوں میں سے،اور اس نورانی نقطہ کا اولاً (یعنی بالذات) ایک خاص تعلق ہے روح ہوائی کے ساتھ اور بدن کے ساتھ تعلق ہے ثانیاً (یعنی بالواسطہ) اس اعتبار سے کہ بدن نسمہ کی سواری ہے اور وہ نورانی نقطہ عالم بالا کا ایک روزن ہے،اس روزن سے نسمہ پر نازل ہوتی ہیں وہ چیزیں جن کی نسمہ میں استعداد ہوتی ہے۔پس بدلنے والی چیزیں: ان میں تبدیلی استعداد ارضی ہی کی جانب سے آتی ہے، جیسے سورج کی گرمی کپڑے کو سفید کرتی ہے اور دھوبی کو سیاہ کرتی ہے۔

لغات

مَطِيَّةٌ: سواری جمع مَطَايَا و مَطِيٌّ...... شَبَّ (ض) الغلامُ: جوان ہونا...... شَابَ يَشِيبُ: بوڑھا ہونا...... جَلَّ (ض) جَلَالًا: بڑے مرتبہ والا ہونا...... الطَّوْرُ: انداز جمع أَطْوَارٌ ......الكُوَّة: روشن دان جمع كُوًى، كِوَاءٌ...... بَيَّضَه: سفید کرنا۔

☆ ☆ ☆

چند فوائد

روح کی حقیقت کا بیان تمام ہوا،اس کا خلاصہ یہ ہے کہ روح: سرسری نظر میں نسمہ کا نام ہے،اور حقیقت میں روح ربانی کا نام ہے، جو نسمہ پر سوار ہوتی ہے،اور جو عالم بالا کی ایک چیز ہے —— اب باب کے ختم پر شاہ صاحب رحمہ اللہ چند فوائد ذکر فرماتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ: موت سے نسمہ کا تعلق: بدن سے منقطع ہوتا ہے:

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وجدان صحیح سے میرے نزدیک یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ موت وحیات کا تعلق نسمہ سے ہے، روح ربانی سے نہیں یعنی جب تک نسمہ کا تعلق بدن سے جڑا رہتا ہے جاندار زندہ رہتا ہے اور جب لاغر کرنے والے امراض کی وجہ سے بدن میں نسمہ پیدا کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی تو نسمہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کا بدن سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے،اس وقت جاندار مر جاتا ہے۔مگر دونوں حالتوں میں روح ربانی کا تعلق نسمہ سے برقرار رہتا ہے، منقطع نہیں ہوتا۔

سوال: جب نسمہ پیدا کرنے والا کارخانہ ہی درہم برہم ہوگیا تو نسمہ بھی ختم ہوگیا، پھر روح ربانی کا اس کے ساتھ تعلق کیسے برقرار رہتا ہے؟

جواب: مرنے سے نسمہ بالکلیہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اتنی مقدار باقی رہ جاتی ہے جس کے ساتھ روح ربانی کا تعلق قائم رہ سکے،اس کو ایک مثال سے سمجھئے:

ایک بوتل لیجئے، اس میں سے منہ سے ہوا چوسیے، جوں جوں ہوا نکلتی رہے گی، بوتل میں باقی ہوا متخلخل ہو کر بوتل کو بھر دے گی، یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آئے گا جس کے بعد ہوا نہیں چوس سکتے۔ ورنہ بوتل اتنی زور سے ٹوٹے گی جیسے بم پھٹتا ہے اوراس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بوتل ہوا سے خالی ہو جائے اور اندر خلا ہو جائے تو باہر سے جو ٹنوں ہوا کا دباؤ پڑتا ہے وہ بوتل کو توڑ دے گا۔ یہ تو اندر کا ملاء ہے جو باہر کے دباؤ کی مقاومت کرتا ہے۔ جیسے گیہوں سے بھری ہوئی بوری پر دسیوں بوریاں رکھ دیجئے، کچھ اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ اندر کا ملأ باہر کے دباؤ کی مقاومت کر رہا ہے، لیکن اگر بوری میں سے کچھ گیہوں نکال دیئے جائیں تو بوری پچک جائے گی، یہی حال بوتل کا ہے۔

بہر حال بوتل میں ہوا کی جو تھوڑی مقدار باقی رہ گئی ہے، وہ متخلخل ہو کر ساری بوتل کو بھر دیتی ہے، اسی طرح جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا نسمہ تحلیل ہو جاتا ہے مگر اس کی تھوڑی مقدار باقی رہ جاتی ہے، جس میں تخلخل ہوتا ہے اور وہ حسب سابق مکمل نسمہ بن جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ روح ربانی کا تعلق برقرار رہتا ہے۔

وقد تحقَّق عندنا بالوِجدان الصحيح: أن الموتَ انْفِكاكُ النسمةِ عن البدن، لِفَقْدِ اسْتعدادِ البدن لتوليدها، لاانْفِكاكُ الروح القدسي عن النسمة؛ وإذا تحلَّلت النسمةُ في الأمراض الْمُذْنِفَةِ، وجب في حكمة الله: أن يبقى الشيئ من النسمة، بقدر ما يَصِحُّ ارْتِبَاطُ الروح الإلٰهي بها؛ كما أنك إذا مَصَصْت الهواءَ من القارورة،تَخَلْخَلَ الهواءُ، حتى تبلُغ إلى حدٍّ لا تَخلْخُلَ بعده، فلا تستطيع المصَّ، أو تَنْفَقِئَ القارورةُ؛ وماذلك إلا لِسِرٍّ ناشيٍ من طبيعة الهواء؛ فكذلك سِرٌّ في النسمة وحدٌّ لها، لايُجاوِزُ هما الأمْرُ.

ترجمہ: اور ہمارے نزدیک وجدان صحیح سے یہ بات محقق ہو گئی ہے کہ موت نسمہ کا بدن سے جدا ہونا ہے، بدن میں نسمہ کو پیدا کرنے کی استعداد کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے، موت روح قدسی کا نسمہ سے جدا ہونا نہیں ہے۔ اور جب لاغر کرنے والی بیماریوں کی وجہ سے نسمہ تحلیل ہو جاتا ہے تو حکمت خداوندی میں ضروری ہوتا ہے کہ نسمہ کی اتنی مقدار باقی رہ جائے کہ اس کے ساتھ روح الٰہی کا جڑنا درست ہو؛ جیسے جب آپ بوتل سے ہوا چوسیں تو باقی ہوا پھیل جائے گی تا آنکہ ایسی حد آجائے کہ اس کے بعد تخلخل نہ ہو سکے، پس آپ چوس نہ سکیں گے یا بوتل ٹوٹ جائے گی، اور نہیں ہے یہ بات مگر ایک راز کی وجہ سے، جو ہوا کی ماہیت سے پیدا ہوتا ہے، پس اسی طرح نسمہ میں بھی ایک راز ہے اور اس کی تحلیل کے لئے ایک حد ہے، معاملہ ان دونوں سے آگے نہیں بڑھتا۔

لغات:

وِجْدان: (مصدر) پانا اور اصطلاح میں نفس اور باطنی قوت کو کہتے ہیں وجدانی: ہر وہ چیز جس کو انسان اپنے نفس

سے محسوس کرے، جو چیزیں باطنی قوتوں سے محسوس ہوں جمع وجدانیات۔ پھر اگر بے دلیل مفروضہ ہے تو وہ وجدان فاسد ہے اور اگر سمجھی ہوئی بات کسی دلیل پر مبنی ہے تو وہ وجدان صحیح ہے..... اَذْنَفَ المریضُ: قریب المرگ کردیا۔

☆ ☆ ☆

دوسرا فائدہ: موت کے بعد نسمہ کی زندگی:

موت کے بعد نسمہ کو نئی زندگی ملتی ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد روح ربانی نسمہ کی تربیت کرتی ہے اور اس میں جو حس مشترک باقی رہ گئی ہے اس کو عالم مثال سے کمک پہنچاتی ہے، جس سے اس کو نشأت ثانیہ ملتی ہے اور اس میں ایسی قوت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ سننے، دیکھنے اور بات کرنے کے قابل ہوجاتی ہے اور عالم مثال کی کمک سے مراد وہ قوت ہے جو مجرد اور محسوس کے بین بین افلاک میں شئ واحد کی طرح بکھری ہوئی ہے (یعنی وہ قوت نہ بالکلیہ مجرد ہے نہ مادی، بلکہ بین بین ہے)

اور جب نسمہ کو نئی زندگی مل جاتی ہے تو کبھی اس میں جسم دار ہونے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، اس وقت نسمہ کو عالم مثال کی مدد سے نورانی یا ظلمانی مثالی جسم دیدیا جاتا ہے پھر عالم برزخ کے حیرت زا واقعات شروع ہوجاتے ہیں، قبر میں بٹھادیا جاتا ہے، سوال وجواب ہوتے ہیں، عذاب قبر کی مختلف شکلیں رونما ہوتی ہیں اور قبر میں راحتوں کا سامان شروع ہوجاتا ہے۔

تیسرا فائدہ: صور پھونکنے کے بعد کے احوال:

جب پہلی بار صور پھونکا جائے گا تو ہر چیز ختم ہوجائے گی، پھر جب فیصلہ خداوندی ہوگا تو دوبارہ صور پھونکا جائے گا، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فیضان عام ہوگا، جیسا ابتدائے آفرینش کے وقت ہوا تھا، جب اجسام میں روحیں پھونکی گئی تھیں، اور عالم موالید کی بنیاد قائم کی گئی تھی، ویسا ہی فیضان قیامت کے دن بھی ہوگا، جس سے سب لوگوں کو نئی زندگی مل جائے گی۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ روح ربانی کے فیضان سے نسمہ کو خالص مادی یا مادہ اور مثال کے بین بین جسم مل جائے گا اور میدان قیامت کے وہ تمام واقعات شروع ہوجائیں گے جس کی صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔

چوتھا فائدہ: ملکیت وبہیمیت

انسان میں تین چیزیں ہیں، سب سے نیچے جسم ہے، درمیان میں نسمہ، اور اوپر روح ربانی ہے، پس نسمہ کا جو رخ جسم کی طرف ہے اس کا نام بہیمیت ہے، اور اس کا جو رخ روح ربانی کی طرف ہے اس کا نام ملکیت ہے۔ یعنی جسم کے ساتھ تعلق کی وجہ سے جو برے اثرات نسمہ میں پیدا ہوتے ہیں اس کا نام بہیمیت (وحشی پن) ہے اور روح ربانی کے

ساتھ تعلق کی وجہ سے جو اچھے اثرات نسمہ میں پیدا ہوتے ہیں اس کا نام ملکیت (فرشتہ پن) ہے۔

پانچواں فائدہ: روح کی پوری حقیقت بیان نہیں کی گئی:

اس باب میں روح کے تعلق سے جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ صرف تمہیدی باتیں ہیں، اور اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ آپ کتاب علی وجہ البصیرت پڑھیں اور اس پر مسائل کو متفرع کریں، روح کی پوری حقیقت سے پردہ ایک دوسرے علم میں اٹھایا جاسکتا ہے، جو اس علم سے برتر ہے یعنی وہاں اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے، یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے زیادہ مناسب نہیں۔ ورنہ بات دور جا پڑے گی، اور وہ دوسرا علم فلسفہ تصوف ہے، وہاں زیادہ بحث مناسب ہے۔

وإذا مات الإنسان كان للنسمة نشأةٌ أخرى، فَيُنْشِئُ فيضُ الروح الإلٰهي فيها قوةً، فيما بقي من الحسِّ المشترك، تَكْفِي كفايةَ السمع والبصر والكلام بمددٍ من عالم المثال، أعني القوةَ المتوسطةَ بين المجرد والمحسوس، المنبَثَّةَ في الأفلاك كشيئٍ واحد،

وربما تستعد النسمةُ حينئذ لِلِبَاس نوراني أو ظلماني بمدد من عالم المثال؛ ومن هنالك تتولَّد عجائبُ عالَم البرزخ.

ثم إذا نُفِخَ في الصور، أي جاء فيضٌ عامٌ من بارئ الصُّوَر، بمنزلة الفيض الذي كان منه في بَدْءِ الخلق، حين نُفِخت الأرواحُ في الأجساد، وأُسِّسَ عالَمُ المواليد، أوجب فيضُ الروح الإلٰهي: أن يَكْتَسِيَ لباسا جسمانيا، أو لباسًا بين المثال والجسم، فيتحقق جميعُ ما أخبر به الصادقُ المصْدُوق، عليه أفضلُ الصلوات وأيمنُ التحيَّات.

ولما كانت النسمةُ متوسطا بين الروح الإلٰهي والبدنِ الأرضي، وجب أن يكون لها وجهٌ إلى هذا، ووجهٌ إلى ذلك؛ والوجهُ المائل إلى القدس هو الملكية، والوجهُ المائل إلى الأرض هو البهيمية.

ولْنَقْتَصِرْ من حقيقة الروح على هذه المقدّمات، لِتُسَلَّمَ في هذا العلم، وتُفَرَّعَ عليها التفاريعُ، قبل أن ينكشفَ الحجابُ في علم أعلى من هذا العلم؛ والله أعلم.

ترجمہ: اور جب انسان مرجاتا ہے تو نسمہ کو نشأت ثانیہ ملتی ہے، پس روح ربانی کا فیضان اس میں ایک قوت پیدا کرتا ہے، حس مشترک کے باقی ماندہ میں، (پس) وہ (حس مشترک) سننے، دیکھنے اور بات چیت کرنے کا کام کرنے لگتی ہے، عالم مثال کی کمک سے، مراد لیتا ہوں میں اس قوت کو جو مجرد ومحسوس کے بین بین ہے، جو افلاک میں شئ واحد کی

طرف بکھری پڑی ہے۔

اور اس وقت کبھی نسمہ میں نورانی یا ظلمانی لباس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، عالم مثال کے تعاون سے، اور اُس جگہ سے عالم برزخ کے عجائبات شروع ہو جاتے ہیں۔

پھر جب صور پھونکا جائے گا یعنی صورتیں پیدا کرنے والے کی طرف سے فیضان عام ہوگا، اُس فیضان جیسا جو اللہ کی طرف سے ابتدائے آفرینش میں ہوا تھا، جب اجسام میں روحیں پھونکی گئی تھیں، اور عالم موالید کی بنیاد رکھی گئی تھی، تو واجب کیا روح ربانی کے فیضان نے کہ نسمہ جسمانی یا مثال وجسم کے بین بین لباس پہن لے، پس پائی جائیں گی وہ تمام باتیں جن کی اطلاع دی ہے صادق و مصدوق نے، ان پر بہترین درود نازل ہو اور بابرکت سلام!

اور جب نسمہ روح ربانی اور بدن خاکی کے بین بین ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک رخ اِس کی طرف ہو اور ایک رخ اُس کی طرف ہو، اور جو رخ عالم بالا کی طرف مائل ہے وہ ملکیت ہے اور جو رخ زمین کی طرف ہے وہ بہیمیت ہے۔

اور ہمیں روح کی حقیقت کے سلسلہ میں ان تمہیدی باتوں پر اکتفا کرنی چاہئے تاکہ یہ باتیں اس علم میں مان لی جائیں، اور ان پر مسائل متفرع کئے جائیں۔ اس سے پہلے کہ پردہ اٹھے ایک ایسے علم میں جو اس سے برتر ہے واللہ اعلم۔

لغات:

اَنْشَأَہٗ اِنْشَاءً: پرورش کرنا، نیا پیدا کرنا...... کَفَی یکفی کفایۃ الشیئُ: کافی ہونا، تکفی کفایۃ کذا: اس جیسا کام کرنے لگنا...... اِکْتَسٰی: لباس پہننا...... صادق: سچا...... مَصْدُوْق: سچا کیا گیا یعنی جس کی صداقت کو لوگ تسلیم کریں...... قولہ بمدد متعلق ہے ینشیء سے اور دوسرا بمدد متعلق ہے تستعد سے۔

تشریح:

(۱) حس مشترک: وہ باطنی قوت ہے جو حواس ظاہرہ کی حاصل کی ہوئی صورتوں کو قبول کرتی ہے (دیکھئے معین الفلسفہ ص ۱۴۳)

(۲) فلسفۂ تصوف کو علم الحقائق بھی کہتے ہیں، یہ علم تصوف کا نظری حصہ ہے، جس میں ذات وصفات، دقیق واردات وتجلیات، ربط الحادث بالقدیم، وجود اعیان ثابتہ، تنزلات ستہ، روح، عالم مثال، ظاہر الوجود، باطن الوجود اور دیگر حقائق سے بحث کی جاتی ہے۔ اور تصوف کا عملی پہلو جس میں قرب خداوندی حاصل کرنے کا طریقہ اور عبادت وریاضت کی مختلف شکلیں اور واردات کو جذب کرنے کی صورتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ علم سلوک کہلاتا ہے (الطاف القدس مترجم کا حاشیہ ص ۴۲)

باب ـــــــ ۶

انسان مکلّف کیوں بنایا گیا ہے؟

(دلیل نقلی)

اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کو مکلف کیوں بنایا ہے؟ دیگر مخلوقات مکلف کیوں نہیں بنائی گئیں؟ انسان کی تکلیف کا راز، علت اور وجہ کیا ہے؟ یہ سوال بہت سے لوگوں کے ذہن میں انگڑائی لیتا ہے۔ اس باب میں اسی کا بیان ہے۔

مکلف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احکامات دیئے ہیں اور ان کی تعمیل یا عدم تعمیل پر جزاؤ سزا رکھی ہے، ورنہ صرف احکام تو اللہ نے تمام مخلوقات کو دیئے ہیں، اور ہر مخلوق تعمیل حکم میں لگی ہوئی ہے، سورج کو طلوع وغروب ہونے کا حکم ملا ہے، ہواؤں کو چلنے کا، بادلوں کو برسنے کا، چڑیوں کو چہچہانے کا کام سونپا گیا ہے۔ وقس علی ہذا اور کسی مخلوق میں حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کی طاقت نہیں، مگر ان کے لئے تعمیل حکم پر کوئی ثواب نہیں رکھا گیا، اس کے برخلاف انسان کی صورت حال یہ ہے کہ وہ مأمور بھی ہے اور حکم کی تعمیل یا عدم تعمیل کا اختیار بھی رکھتا ہے اور اس کے لئے جزاؤ سزا بھی مقرر کی گئی ہے، اسی کا نام تکلیف شرعی ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ پہلے یہ مسئلہ دلیل نقلی سے سمجھاتے ہیں، پھر دلیل عقلی بیان کریں گے، سورۃ الاحزاب کی بالکل آخری آیات (۷۲و۷۳) میں ہے کہ ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ (الی قولہ تعالی:) وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے سامنے ''امانت'' پیش فرمائی۔ امانت کے معنی ہیں ذمہ داری جیسے مدرس اور ملازم کی ایک ذمہ داری ہوتی ہے، جس کے پاس کوئی چیز برائے حفاظت رکھی جاتی ہے اس کی ایک ذمہ داری ہوتی ہے، ملک کے سربراہ کی ایک ذمہ داری ہے، اسی طرح تکلیف بھی ایک ذمہ داری ہے، جو احکام بجالاتا ہے وہ ذمہ داری پوری کرتا ہے، اور جو تعمیل حکم نہیں کرتا وہ ذمہ داری میں خلل ڈالتا ہے۔

یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے سامنے پیش کی ہے، مگر آیت میں بڑی بڑی تین مخلوقات کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی آسمان، زمین اور پہاڑوں کا، کیونکہ جب آدمی سر اوپر اٹھاتا ہے تو آسمان نظر آتا ہے، ذرا جھکاتا ہے تو پہاڑ سامنے ہوتے ہیں، اور بالکل نگاہ نیچے کر لیتا ہے تو زمین کو دیکھتا ہے، اس لئے انہی تین مخلوقات کا تذکرہ فرمایا ہے، ورنہ ذمہ داری تمام مخلوقات کے سامنے پیش کی گئی تھی، کیونکہ جب وہ بڑی مخلوقات کے سامنے پیش کی گئی تو چھوٹی مخلوقات کے سامنے تو بدرجہ اولی پیش کی گئی۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ہر مخلوق کو دیا گیا تھا، اور صرف فرشتوں کا ذکر اس لئے

کیا گیا ہے کہ اس وقت میں وہی سب سے اشرف مخلوق تھے اور جب اشرف مخلوق مامور ہوئی تو دیگر مخلوقات بدرجۂ اولی مأمور ہونگی، جب کسی کی تعظیم کا حکم وزیر کو دیا جاتا ہے تو خود بخود یہ حکم درباریوں کے لئے بلکہ پورے ملک کے باشندوں کے لئے ہوجاتا ہے۔ اور اس کی دلیل شیطان کا اباء اور اس کا مردود ہونا ہے، یہ بات اسی وقت معقول ہوسکتی ہے جبکہ وہ بھی سجدے کا مأمور ہو (جیسا کہ سورۃ الکہف میں آیا ہے) حالانکہ مأمورین میں صراحۃً جنات کا ذکر نہیں ہے۔ غرض جس طرح تمام مخلوقات سجدہ کرنے کی مأمور تھیں، بارامانت بھی تمام مخلوقات کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

تمام مخلوقات نے بارامانت اٹھانے سے انکار کردیا، وہ بارامانت دیکھ کر گھبرا گئے، یہ پیش کش اور انکار فطری تھا، حسی اور قولی نہیں تھا یعنی جس طرح جانور کے سامنے گھاس چارہ پیش کرتے ہیں اس قبیل سے نہیں تھا، اور نہ مخلوقات نے زبان سے انکار کیا تھا، سورۃ الحج آیت ۱۸ میں صراحت ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوقات اللہ کے سامنے منقاد ہیں بلکہ پیش کرنے کا مطلب ان مخلوقات کی صلاحیتوں کے ساتھ موازنہ (Comparison) کرنا ہے یعنی ان کی صلاحیتوں کے ساتھ برابر کرکے دیکھنا ہے، جیسے مشین کا اسکرو (Screw) ٹوٹ جاتا ہے تو دوکان پر لیجاتے ہیں، دوکاندار دوسرے اسکرؤں سے موازنہ کرکے دیکھتا ہے، کوئی چھوٹا ہوتا ہے، کوئی بڑا، اور کوئی بالکل برابر دوکاندار وہ گاہک کو دیدیتا ہے، اسی طرح مخلوقات کی صلاحیتوں سے امانت کا موازنہ کرکے دیکھا گیا تو مطابقت نظر نہ آئی، یہی عدم مطابقت ان کا انکار ہے اور سہم جانے کا مطلب یہ ہے کہ قطعاً مطابقت نہیں پائی گئی، ان میں بالکل ہی صلاحیت نظر نہ آئی، مخلوق کی استعدادوں میں اور امانت میں کوئی جوڑ ہی نظر نہ آیا۔

اور جب امانت کا انسان کی صلاحیت اور استعداد کے ساتھ موازنہ کیا گیا تو پوری پوری مطابقت نظر آئی، یہی مطلب ہے انسان کے امانت کو اٹھانے کا۔ اور انسان میں وافر صلاحیت کے موجود ہونے کی دلیل اس کا ظلوم وجہول ہونا ہے۔ ظلوم وجہول مبالغہ کے صیغے ہیں اور ظالم وجاہل وہ ہوتا ہے جس میں جاننے اور انصاف کرنے کی صلاحیت ہو، مگر نہ جانے یا انصاف نہ کرے، چنانچہ دیوار، اینٹ، پتھر کو ہم نہ ظالم کہہ سکتے ہیں نہ جاہل، کیونکہ ان میں انصاف کرنے کی اور جاننے کی صلاحیت نہیں۔ اور انسان نہ صرف یہ کہ عالم وعادل ہوسکتا ہے، بلکہ وہ علیم وعدول بھی ہوسکتا ہے، اسی طرح وہ نہ صرف ظالم وجاہل ہوسکتا ہے بلکہ ظلوم وجہول بھی ہوسکتا ہے۔

غرض انسان میں دونوں طرح کی وافر صلاحیتیں موجود ہیں اور انسان کے علاوہ فرشتے ہیں ان میں صرف یک طرفہ صلاحیت ہے، وہ ظلوم وجہول نہیں ہوسکتے، اور بہائم میں عالم وعادل ہونے کی صلاحیت نہیں۔

یہاں سے یہ سوال بھی حل ہوگیا کہ انسان نے کام وہ کیا جو کوئی نہیں کرسکا، اور صلہ یہ ملا کہ وہ ظلوم وجہول ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ ظلوم وجہول صرف صفات ذم نہیں، ان میں صفات مدح بھی مضمر ہیں، یعنی اگر وہ چاہے تو علیم وعدول بھی ہوسکتا ہے، اس میں اس کی بھی وافر صلاحیت موجود ہے اور نہ چاہے تو ظلوم وجہول ہوگا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ انسان نے جو یہ بارامانت اٹھایا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرک مردوزن اور منافق مردوزن سزا پائیں گے، اور اہل ایمان منظورِ نظر بنیں گے، اور ان کی معمولی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے گا۔ لیعذبَ میں لام، لام عاقبت ہے یعنی انجام یہ ہوگا جیسے سورۃ القصص آیت ۸ میں لام عاقبت ہے کہ فرعون کے لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھالیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمن اور غم کا باعث بنیں یعنی ان لوگوں نے اس غرض کے لئے نہیں اٹھایا تھا، بلکہ اٹھانے کا نتیجہ یہ نکلے گا۔

یہ لام، لام علت نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ثواب وعقاب کی غرض سے انسان کو پیدا نہیں کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں، ان کے کاموں میں حکمت تو ضرور ملحوظ ہوتی ہے، مگر ان کے کام مُعلّل بالاغراض نہیں ہوتے یعنی وہ کوئی بھی کام کسی غرض سے نہیں کرتے، کیونکہ کسی غرض کے لئے کام کرنا خودغرضی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہیں۔

یہاں سے یہ سوال بھی حل ہوگیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ثواب وعقاب کے لئے انسانوں کو بارامانت اٹھوایا ہے، تو منشأ خداوندی ضرور پورا ہوگا، پھر بے چارے انسان کا کیا قصور؟ جواب یہ ہے کہ یہ سوال لام علت ہونے کی صورت میں متوجہ ہوگا، لام عاقبت ہونے کی صورت میں سرے سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوگا۔

اور لام عاقبت کی مثال یہ ہے کہ دنیا کے تمام تعلیمی ادارے اعلیٰ تعلیم دینے کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، طلبہ کو فیل کرنے کے لئے کوئی ادارہ قائم نہیں کیا جاتا، مگر نتیجہ بہر حال دونوں طرح کا سامنے آتا ہے، بدشوق طلبہ فیل ہوجاتے ہیں، مگر ادارہ ان کو فیل کرنے کے لئے قائم نہیں کیا گیا۔ اسی طرح سورۃ الملک آیت ۲ میں اور سورۃ الکہف آیت ۷ میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کارخانۂ حیات ان لوگوں کو الگ کرنے کے لئے قائم کیا ہے جو بہترین کام کرتے ہیں گو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ لوگوں سے جہنم بھر دی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں:

(۱) امانت سے مراد تکلیف کی ذمہ داری سنبھالنا، تکلیف کا پٹہ گلے میں ڈالنا اور ثواب وعقاب کے خطرہ کے درپے ہونا ہے۔

(۲) اور عرض (پیش کرنے) سے مراد مخلوقات کی استعدادوں سے موازنہ کرنا ہے۔

(۳) اور اباء (انکار کرنے) سے مراد لیاقت واستعداد کا فقدان ہے۔

(۴) اور حمل (اٹھانے) سے مراد انسان میں لیاقت کا ہونا ہے۔

(۵) اور ظلوم وجہول ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان میں مکلف ہونے کی وافر صلاحیت موجود ہے۔

(۶) اور لِیُعذب میں لام، لام عاقبت ہے، لام علت وغایت نہیں۔

اور سب باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ مکلّف ہونے کی صلاحیت صرف انسان میں ہے، اس لئے اسی کو مکلّف بنایا گیا ہے اور دیگر

مخلوقات کو مکلّف اس لئے نہیں بنایا گیا کہ ان میں تکلیف کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں اور انسان بھی اُس وقت مکلّف ہوتا ہے جب کہ اس میں کامل صلاحیت پائی جائے بچہ بلوغ سے پہلے مکلّف نہیں ہوتا کیونکہ صلاحیت کامل نہیں ہوتی اسی طرح مجنون اور جس کی بے ہوشی طویل ہوجائے: مکلّف نہیں رہتا کیونکہ ان دونوں حالتوں میں صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے۔

﴿باب سِرّ التكليف﴾

قال اللّه تعالى: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوَاتِ والأَرْضِ وَالْجِبَالِ، فَأَبَيْنَ أَن يَّحْمِلْنَهَا، وأَشْفَقْنَ مِنْهَا، وَحَمَلَهَا الإنْسَانُ، إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً، لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ، وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ؛ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾

نبَّه الغزالى والبيضاوى وغيرُهما على أن المراد بالأمانة تقلُّدُ عهدةِ التكليف، بأن تتعرض لخطر الثواب والعقاب ،بالطاعة والمعصية؛ وبِعَرْضِهَا عليهن اعْتِبَارُهَا بالإضافة إلى استعداد هن؛ وبإبائهن الإباءُ الطبيعي، الذى هو عدم اللياقة والاستعداد؛ وبحمل الإنسان قابليتُه واستعداده لها.

أقول: وعلى هذافقوله تعالى: ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً﴾ خرج مخرج التعليل، فإن الظلوم: من لايكون عادلاً، ومن شأنه أن يعدِل، و الجهول: من لايكون عالمًا، ومن شأنه أن يعلم ؛وغَيْرُ الآدمى: إما عالم عادل، لايتطرَّق إليه الظلم والجهل ،كالملائكة؛ وإما ليس بعادل ولا عالم، ولا من شأنه أن يَكْسِبَهُمَا، كالبهائم؛ وإنما يليق بالتكليف، ويستعدُّله: من كان له كمال بالقوّة، لابالفعل؛ واللام فى قوله تعالى: ﴿لِيُعَذِّبَ﴾ لام العاقبة، كأنه قال: عاقبةُ حملِ الأمانة التعذيبُ والتنعيم.

ترجمہ: باب: مکلّف بنانے کا راز: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”بیشک ہم نے یہ امانت آسمان وزمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، سوانھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کردیا، اور وہ اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بیشک وہ بڑا ظالم، بڑا نادان ہے، تاکہ (یعنی انجام یہ ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ منافقین اور منافقات کو اور مشرکین اور مشرکات کو سزادے، اور مؤمنین اور مؤمنات پر توجہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ بے حد مغفرت فرمانے والے، نہایت مہربان ہیں“۔

امام غزالی، قاضی بیضاوی اور ان دونوں کے علاوہ نے اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ امانت سے مراد تکلیف کی ذمہ داری سنبھالنا ہے (تکلیف کا پٹہ گلے میں ڈالنا ہے) بایں طور کہ مخلوقات فرماں برداری کرکے، یا نافرمانی کرکے ثواب وعقاب کے خطرہ کے سامنے آئے (یعنی خطرہ مول لے) اور مخلوقات کے سامنے امانت کو پیش کرنے کا مطلب: امانت کا موازنہ کرنا ہے، مخلوقات کی استعداد کی نسبت سے، اور مخلوقات کے انکار کرنے سے مراد: ان کا فطری انکار ہے، جو لیاقت اور استعداد نہ ہونے کا نام ہے اور انسان کے اٹھانے کا مطلب: اس کا قابل ہونا اور اس میں اس امانت کی استعداد کا ہونا ہے۔

میں کہتا ہوں: اور اس تفسیر میں ارشاد باری تعالیٰ ﴿ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً ﴾ حکم سابق کی علت (دلیل) کے طور پر بیان ہوا ہے اس لئے کہ "ظلوم" وہ شخص ہے جو عادل نہ ہو، اور اس کے حال میں سے یہ ہو کہ وہ انصاف کرے اور "جہول" وہ شخص ہے جو عالم نہ ہو، اور اس کی شان میں سے یہ ہو کہ وہ جانے، اور انسان کے علاوہ: یا تو عالم وعادل ہیں: ظلم وجہالت کا ان تک گزر ہی نہیں، جیسے فرشتے، یا نہ عادل ہیں نہ عالم اور نہ اس کی شان ہے کہ وہ اُن دونوں کو حاصل کرسکیں، جیسے چوپایے۔

اور تکلیف کے لئے سزاوار اور مکلّف ہونے کی استعداد انہی میں ہوتی ہے جس کو کمال بالقوہ حاصل ہو، بالفعل حاصل نہ ہو اور ارشاد باری تعالیٰ: لِیُعَذِّب میں لام، لام عاقبت ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ امانت اٹھانے کا انجام: تعذیب وتنعیم (سزا دینا اور راحت پہنچانا) ہوگا۔

تشریح:

(۱) قوت کے معنی ہیں کسی چیز کا حاصل ہوسکنا اور فعل کے معنی ہیں حاصل ہونا یعنی کسی چیز میں کسی وصف کا موجود ہونا فعل ہے اور محض استعداد اور صلاحیت کا ہونا اور وصف کا متوقع الوجود ہونا قوت ہے، جیسے پیدا ہوتے ہی انسان میں "لکھنے" کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کو بالقوہ سے تعبیر کرتے ہیں، کہتے ہیں: انسان کاتب بالقوہ ہے، پھر جب بڑا ہو کر مشق کرکے کاتب بن جاتا ہے تو اس کو بالفعل سے تعبیر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ زید کاتب بالفعل ہے۔

(۲) "میں کہتا ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ اوپر کی باتیں تو دوسرے حضرات نے بیان کی ہیں، اب آگے مزید دو باتیں شاہ صاحب بڑھاتے ہیں۔

(۳) کتاب کے نسخوں میں اَن یکسبھا ہے یعنی واحد مؤنث کی ضمیر ہے، مگر یہ تصحیف ہے، صحیح تثنیہ کی ضمیر ہے۔ مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ برلین میں تثنیہ کی ضمیر ہے۔

لغات: تَقَلَّدَ تَقَلُّدًا: ہار پہننا ...... تَعَرَّضَ للأمر: درپے ہونا۔

☆ ☆ ☆

انسان مکلّف کیوں بنایا گیا ہے؟

(دلیل عقلی)

پہلے اس بات کی دلیل نقلی بیان کی گئی ہے کہ انسان ہی مکلّف کیوں ہے؟ اب دلیل عقلی بیان کرتے ہیں، مگر پہلے

ملائکہ، بہائم اورانسان کے احوال پر نظر ڈال لینی چاہئے۔

① ملائکہ غیر مادی مخلوق ہیں، وہ عناصر اربعہ سے نہیں بنے یعنی وہ یا تو نور سے بنے ہیں یا عناصر اربعہ کی بھاپ سے بنے ہیں، بلاواسطہ عناصر اربعہ سے ان کی تخلیق نہیں ہوئی، اس لئے اُن میں نہ نسمہ (روح حیوانی) ہے نہ بہیمیت، ان میں صرف ملکیت ہے، اور قوت بہیمی کی کمی سے جو احوال پیدا ہوتے ہیں، مثلاً بھوک، پیاس، ڈر اور غم، اُن سے ملائکہ پاک ہیں، اسی طرح قوت بہیمی کی زیادتی سے جو احوال پیدا ہوتے ہیں، مثلاً جماع کی خواہش، غصہ، اور عُجب (تکبر) ان سے بھی ملائکہ پاک ہیں۔ ان کو تغذیہ، تنمیہ اور ان کے متعلقات کی بھی فکر نہیں ہوتی کیونکہ وہ کھانے پینے کے جھمیلوں سے اور نشو ونما کی فکر سے آزاد ہیں۔ وہ ہر وقت عالم بالا کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور حکم کا انتظار کرتے ہیں، جونہی اوپر سے کوئی حکم ملتا ہے، اس کی تعمیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور اس میں اُن کی اپنی کوئی غرض نہیں ہوتی، بس عالم بالا کا مقصود ان کا مقصود ہوتا ہے۔

② اور چوپائے عناصر سے بنے ہیں اس لئے ان میں نسمہ (روح حیوانی) اور بہیمیت ہوتی ہے روح ربانی ان میں نہیں ہوتی، چنانچہ وہ ہر وقت نکمی حالت میں، اور گندگیوں میں لت پت رہتے ہیں، وہ ہر وقت اپنی طبیعت کے تقاضوں پر شیفتہ اور اسی میں فنا رہتے ہیں، اور ہمیشہ وہی کام کرتے ہیں جس میں ان کا اپنا نفع ہوتا ہے، یا وہ ان کا فطری تقاضا ہوتا ہے۔

③ اور انسان بھی عناصر اربعہ سے بنا ہے، مگر اس میں روح ربانی بھی ہے، اس لئے وہ قوت ملکی اور قوت بہیمی کا سنگم ہے۔ قوت ملکی روح ربانی کا فیض ہے، اور قوت بہیمی روح حیوانی (نسمہ) کا اثر ہے، دونوں قوتوں کی قدرے تفصیل درج ذیل ہے:

قوت ملکی: یہ قوت اس روح کا فیضان ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے، دیگر حیوانات میں وہ روح نہیں ہوتی، یعنی جب روح ربانی کا فیضان اُس نسمہ پر ہوتا ہے جو سارے بدن میں سرایت کرنے والا ہے، اور نسمہ اس فیضان کو قبول بھی کر لیتا ہے اور اس کی تابعداری کرتا ہے تو انسان میں ملکیت پیدا ہو جاتی ہے۔

قوت بہیمی: یہ قوت نسمہ کا اثر ہے، نسمہ تمام حیوانات میں، بشمول انسان، ہوتا ہے، یہ قوت نسمہ کے تمام قُوی کے ساتھ دراز ہوتی ہے، مگر مستقل بالذات ہوتی ہے جب اس کا حکم روح ربانی مان لیتی ہے اور اس کی تابعداری کرتی ہے تو انسان میں قوت بہیمیہ پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد تین باتیں جان لینی چاہئیں:

① ملکیت اور بہیمیت میں ہمیشہ کشمکش رہتی ہے، ملکیت انسان کو بلندی کی طرف کھینچتی ہے، اور بہیمیت پستی کی طرف، اور جب بہیمیت غالب آجاتی ہے تو ملکیت دب جاتی ہے اور بہیمیت کا راج ہوتا ہے، اور جب ملکیت غالب آجاتی ہے تو بہیمیت دُم دبا لیتی ہے اور ملکیت کا حکم چلتا ہے۔

(۲) دنیا کا کوئی نظام ہو، بھلا ہو یا بُرا، اللہ تعالیٰ کی عنایات اس پر مبذول رہتی ہیں، وہ ہر استعداد پر، بھلی ہو یا بری، فطری ہو یا اکتسابی، جودوکرم فرماتے ہیں۔ اگر انسان بہیمی حالت کا اکتساب کرتا ہے تو اس میں تعاون کیا جاتا ہے اور اس کے لئے مناسب سامان مہیا کیا جاتا ہے جس سے وہ کام آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ ملکی حالت کا اکتساب کرتا ہے تو اس میں بھی تعاون کیا جاتا ہے، اور اس کے لئے مناسب سامان مہیا کیا جاتا ہے، جس سے وہ کام آسان ہو جاتا ہے، سورۃ اللیل آیات (۵-۱۰) میں ارشاد ہے کہ ''جس نے راہ خدا میں خرچ کیا اور وہ اللہ سے ڈرا، اور کلمۂ حسنیٰ کی تصدیق کی، تو ہم اس کے لئے آسان چیز کے لئے آسانی کر دیتے ہیں، اور جس نے بخل کیا، اور بے پرواہ بنا، اور کلمۂ حسنیٰ کو جھٹلایا تو ہم اس کے لئے سخت چیز کے لئے آسانی کر دیتے ہیں'' اور سورہ بنی اسرائیل آیت ۲۰ میں ارشاد ہے کہ ''ہم ہر ایک کی، اِن کی بھی اور اُن کی بھی، امداد کرتے ہیں، آپ کے پروردگار کے عطیہ سے''

(۳) ملکی اور بہیمی قوتوں میں سے ہر ایک کو بعض چیزوں میں مزہ آتا ہے اور بعض چیزوں سے کلفت ہوتی ہے، جب کوئی قوت ایسی چیز کا ادراک کرتی ہے، جو اس کے مناسب حال ہوتی ہے، تو اس کو لطف آتا ہے، اور جب ایسی چیز کا ادراک کرتی ہے جو اس کے ناموافق ہوتی ہے تو اس کو رنج پہنچتا ہے، مثلاً ملکیت کو عبادت میں مزہ آتا ہے اور فواحش سے تکلیف ہوتی ہے اور بہیمیت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

رہا یہ سوال کہ انسان میں یہ دو متضاد قوتیں جمع کیسے ہوتی ہیں؟ یہ تو آگ اور پانی کا اجتماع ہے! تو اس کو دو مثالوں سے سمجھئے:

پہلی مثال: جب کوئی چھوٹا آپریشن کیا جاتا ہے تو موقع پر سُن کرنے والی دوا لگادی جاتی ہے، پھر چیر پھاڑ شروع کی جاتی ہے، مریض دیکھتا رہتا ہے اور کام ہوتا رہتا ہے اور مریض کو بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوتی، حالانکہ نفس الامر میں تکلیف ہو رہی ہے، چنانچہ دوا کا اثر ختم ہوتے ہی شدت کا درد اٹھتا ہے، جس پر ڈاکٹر دواؤں کے ذریعہ قابو پاتا ہے۔ پس جس طرح اس مثال میں درد ہو بھی رہا اور نہیں بھی ہو رہا ہے، اسی طرح انسان میں بھی دو متضاد قوتیں جمع ہیں۔

دوسری مثال: اطباء کہتے ہیں کہ گلاب کے پھول میں تین متضاد قوتیں ہیں:

(۱) قوتِ اَرضی: جب گلاب کے پھول کو خوب باریک پیس کر، کسی پھوڑے پھنسی پر لیپ کیا جائے، تو وہ خشک ہونے پر پتھر جیسا ہو جائے گا، یہ عنصر ارض کا اثر ہے۔

(۲) قوتِ مائی: جب گلاب کے پھولوں کو نچوڑ کر پیا جائے، تو وہ بالکل پانی ہوگا، یہ عنصر ماء (پانی) کا اثر ہے۔

(۳) قوتِ ہوائی: جب گلاب کا پھول ناک کے قریب لے جاتے ہیں، تو دور سے ہی خوشبو محسوس ہوتی ہے، یہ عنصر ہوا کا اثر ہے۔

دلیل عقلی: اس طولانی تمہید سے معلوم ہوا کہ مکلّف ہونا انسان کا نوعی اقتضاء ہے وہ اپنی استعداد کی زبان سے بارگاہ خداوندی میں درخواست کرتا ہے کہ اس کی دونوں قوتوں کی رعایت ملحوظ رکھی جائے اور دونوں کا تقاضا پورا کیا جائے یعنی

قوت ملکیہ کے مناسب حال جو چیزیں ہیں، وہ اس پر واجب کی جائیں اوران کی بجا آوری پر صلہ دیا جائے، اورقوت بہیمیہ میں منہمک ہونے کو اس پر حرام کیا جائے، اوراس کی خلاف ورزی پر، اس کو سزا دی جائے، یہی تکلیف شرعی ہے اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آرہی ہے۔

وإن شئتَ أن تَسْتَجْلِيَ حقيقةَ الحال ،فعليك:

[۱] أن تتصوَّرَ حالَ الملائكة في تجرُّدِها، لايُزْعِجُها حالةٌ ناشئة من تفريط القوة البهيمِيَةِ، كالجوع والعطش والخوف والحزن؛ أو إفراطها، كالشَّبَق والغضب والتِّيهِ، ولا يُهِمُّهَا التغذيةُ والتنمية ولواحقُهما، وإنما تبقىٰ فارغةً لِانْتِظَار مايَرِدُ عليها من فوقها، فإذا ترشَّح عليها أمر من فوقها: من إجماعٍ على إقامةِ نظام مطلوب، أورضًا من شيئ، أو بغضِ شيئ، امْتَلأَتْ به، وانقادتْ له، وانبعثتْ إلى مقتضاه، وهي في ذلك فانيةٌ عن مرادِ نفسها، باقيةٌ بمراد مافوقَها.

[۲] ثم تَتَصوَّرَحالَ البهائم في تَلَطُّخِها بالْهَيْآت الخسيسة، لاتزال مشغوفةً بمقتضيات الطبيعة، فانيةً فيها، لاتَنْبَعِثُ إلى شيئ إلا انْبِعَاثًا بهيميا،يرجع إلى نفع جسديٍّ واندفاعٍ إلى ما تعطيه الطبيعةُ فقط.

[۳] ثم تعلمَ أن الله تعالى قد أودَعَ الإنسانَ بحكمته الباهرة قوتين:

[الف] قوةً ملكيةً، تَنْشَعِبُ من فيض الروح المخصُوْصةِ بالإنسان، على الروح الطبيعيةِ السَّارِيةِ في البدن، وقبولِها ذلك الفيضَ، وانْقِهَارِها له.

[ب] وقوةً بهيميَّةً: تنشعب من النفس الحَيَوانية، المشترك فيها كلُّ حيوان، المُتَشَبِّحَةِ بالقُوى القائمة بالروح الطبيعية، واستقلالِها بنفسها، وإذعانِ الروح الإنسانية لها، وقبولِها الحكمَ منها.

ثم تَعْلَمَ:

[۱] أن بين القوتين تزاحُمًا وتَجَاذُبا، فهذه تجذِب إلى الْعُلُوِّ، وتلك إلى السفل؛ وإذا برزَتِ البهيميةُ، وغلبت آثارُها، كَمَنَتِ الملكية، وكذلك العكسُ.

[۲] وأنَّ للبارى جلَّ شأنُه عنايةً بكل نظام، وَجُوْدًا بكل مايسألُه الاستعدادُ الأصلي والكسبيُّ؛فإن كسب هيآتٍ بهيميةً أُمِدَّ فيها، ويُسِّرَله ماينا سبها؛ وإن كسب هيآت ملكيةً أُمِدَّ فيها، ويُسِّرَ له ما يُنَاسبها، كما قال الله تعالى: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ،

فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى، وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى، وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى، فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾ وقال: ﴿كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَآءِ وَهٰؤُلَآءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ، وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾

[۳] وأن لكل قوة لذة وألمًا، فاللذّة: إدراك ملايُلائمها، والألمُ: إدراكُ مايخالفها؛

وما أشْبَهَ حالَ الإنسان بحالِ من استعمل مُخَدِّرًا في بدنه، فلم يجدْ لفحَ النار، حتى إذا ضَعُفَ أثرُه، ورجع إلى ما تعطيه الطبيعةُ، وجد الألمَ اشدَّ ما يكون.

أو بحال الوَرْدِ، على ماذكره الأطباء: أن فيه ثلاث قُوًى: قُوةٌ أرضيةٌ تظهر عندالسَّحق والطِّلاءِ، وقوةٌ مائيةٌ، تظهر عند العَصْرِ والشُّرب، وقوةٌ هوائيةٌ تظهر عند الشَّمِّ.

فتبين أن التكليف من مُقْتَضيات النوع، وأن الإنسان يسأل ربَّه بلسان استعْداده أن يوجب عليه مايُناسب القوةَ الملكية، ثم يُثيبَ على ذلك، وأن يُحَرِّمَ عليه الانهماكَ في البهيمية، ويُعَاقِبَ على ذلك؛ والله أعلم.

ترجمہ: اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ حقیقت حال واضح ہوجائے، تو آپ پر لازم ہے کہ:

(۱) آپ فرشتوں کی اور ان کی مادّہ سے مجرد ہونے کی حالت سوچیں، ان کو برانگیختہ نہیں کرتی قوت بہیمیہ کی کمی سے پیدا ہونے والی حالت، جیسے بھوک، پیاس، ڈر اور غم، اور نہ قوت بہیمیہ کی زیادتی سے پیدا ہونے والی حالت، جیسے مجامعت کی شدید حرص، غصہ اور عُجب وغرور، اور نہ ان کو فکر مند بناتا ہے تغذیہ، تنمیہ اور ان کے متعلقات، وہ بس فارغ رہتے ہیں اُس چیز کے انتظار میں جوان پر اُن کے اوپر سے وارد ہوتی ہیں، پس جب ٹپکتی ہے ان پر کوئی چیز اُن کے اوپر سے، جیسے مطلوب نظام کے برپا کرنے کا پختہ ارادہ، یا کسی چیز سے خوشنودی، یا کسی چیز سے شدید نفرت، تو وہ اس سے لبریز ہوجاتے ہیں اور اس کی تابعداری کرتے ہیں، اور اس کے مقتضی کی طرف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، درانحالیکہ وہ اس بارے میں اپنے نفس کی مراد سے یکسر نکل جانے والے ہوتے ہیں، اور عالم بالا کی مراد کے ساتھ باقی رہنے والے ہوتے ہیں۔

(۲) پھر آپ چوپایوں کی اور ان کی خسیس حالتوں میں ملوث ہونے کی حالت سوچیں، وہ برابر طبیعت کے تقاضوں پر شیفتہ رہتے ہیں اور اسی میں فنا رہتے ہیں، وہ کسی چیز کی طرف نہیں اٹھتے مگر بہیمی انداز کا اٹھنا، جس کا مآل جسمانی نفع ہوتا ہے، یا اس چیز کی طرف بہ جانا ہوتا ہے، جو صرف ان کی طبیعت کی دین ہے۔

(۳) پھر آپ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت غالبہ سے انسان کے اندر دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔

(الف) ملکی قوت: وہ اس روح کے فیضان سے پھوٹتی ہے، جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے (یعنی روح ربانی کے فیضان سے) اور یہ فیضان اس فطری روح پر ہوتا ہے جو تمام بدن میں سرایت کرنے والی ہے (یعنی روح حیوانی پر) اور اس طبعی روح کے اس فیضان کو قبول کرنے کی وجہ سے، اور فطری روح کے تابعدار ہونے کی وجہ سے روح ربانی کے (قوت

ملکیہ پیدا ہوتی ہے)

(ب) اور قوت بہیمیہ: وہ اُس نفس حیوانی (نسمہ) سے پھوٹتی ہے، جس میں تمام حیوان مشترک ہیں، یہ قوت، فطری روح (نسمہ) کے ساتھ قائم قُوی کے ساتھ دراز ہونے والی ہے، اور اس کے مستقل بالذات ہونے کی وجہ سے، اور روح انسانی (یعنی روح ربانی) کے تابعدار ہونے کی وجہ سے نسمہ کے، اور روح ربانی کے اس کا حکم ماننے کی وجہ سے (یہ قوت بہیمیہ پیدا ہوتی ہے)

پھر آپ جان لیں کہ:

(۱) دونوں قوتوں کے درمیان کشمکش اور رسہ کشی رہتی ہے، پس یہ (یعنی ملکیت) کھینچتی ہے بلندی کی طرف، اور وہ (یعنی بہیمیت) پستی کی طرف، اور جب بہیمیت سر ابھارتی ہے اور اس کے آثار کا غلبہ ہوتا ہے تو ملکیت دب جاتی ہے، اور اسی طرح برعکس معاملہ ہے۔

(۲) اور یہ کہ اللہ جل شانہ کی اس دنیا کے ہر نظام پر ایک خاص عنایت ہے، اور وہ جود و کرم فرماتے ہیں ہر وہ چیز عنایت فرما کر جو انسان کی اصلی اور کسبی استعداد مانگتی ہے۔ چنانچہ اگر انسان بہیمی حالتوں کا اکتساب کرتا ہے تو اس میں مدد پہنچائی جاتی ہے، اور اس کے لئے وہ چیزیں آسان کی جاتی ہیں، جو اُن حالتوں کے مناسب ہوتی ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا، اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کی تصدیق کی، تو ہم اس کو آسان چیز کیلئے سامان دیتے ہیں، اور جس نے بخل کیا، اور بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا، تو ہم اس کو سخت چیز کے لئے سامان دیتے ہیں'' اور ارشاد فرمایا: ''ہر ایک کی، اِن کی بھی اور اُن کی بھی، تیرے رب کی بخشائش سے ہم امداد کرتے ہیں''

(۳) اور یہ کہ ہر قوت کے لئے ایک لذت ہے اور ایک رنج ہے، پس لذت: اس چیز کا ادراک ہے جو اس قوت کے مناسب ہے اور اَلَم: اس چیز کا ادراک ہے جو اس کے ناموافق ہے۔

اور انسان کی حالت کس قدر مشابہ ہے اُس شخص کی حالت کے (یعنی یہ کتنی فٹ مثال ہے کہ) جس نے جسم میں کوئی سن کرنے والی دواء استعمال کی ہو، پس وہ نہیں پاتا آگ کی سوزش کو، تا آنکہ جب اس دواء کا اثر کمزور پڑتا ہے اور وہ اپنی طبعی حالت پر لوٹ آتا ہے تو شدت سے تکلیف محسوس کرتا ہے۔ یا کس قدر مشابہ ہے انسان کی حالت گلاب کے پھول کی حالت کے، اطباء کے بیان کے مطابق کہ اس میں تین قوتیں ہیں (۱) قوت ارضی: جو رگڑنے اور لیپ کرنے سے ظاہر ہوتی ہے (۲) اور قوت مائی: جو نچوڑنے اور پینے کے وقت ظاہر ہوتی ہے (۳) اور قوت ہوائی: جو سونگھنے کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔

پس واضح ہوا کہ تکلیف شرعی نوع کے تقاضوں میں سے ہے، اور یہ بھی واضح ہوا کہ انسان اپنے رب سے اپنی استعداد کی زبان سے درخواست کرتا ہے کہ اس پر وہ چیزیں واجب کی جائیں جو قوت ملکیہ کے مناسب ہیں، پھر اس کو ان پر بدلہ دیا جائے، اور اس پر بہیمیت میں انہماک کو اللہ تعالیٰ حرام کریں، اور اس پر سزا دیں واللہ اعلم۔

لغات:

اِسۡتَجۡلَی الشَّیئَ: ظاہر کرنے کو کہنا...... أزْعَجَہ: بے قرار کرنا أزْعَجَہُ إلی المعصیۃ: گناہ پر ابھارنا...... شَبِقَ (س) شَبَقًا: بہت شہوت والا ہونا، صفت شَبِقٌ مؤنث شَبِقَۃٌ...... التِیْہ: ڈینگ، غرور جمع اَتْیَاہٌ...... ھَمَّ (ن) ھَمًّا: فکر مند بنانا، رنجیدہ کرنا أَھَمَّ کے بھی یہی معنی ہیں، پس مجرد اور مزید دونوں سے پڑھ سکتے ہیں...... اِنْدَفَعَ السَّیْلُ: زور سے بہنا...... إنْشَعَبَ أغصانُ الشجرۃ: جڑ سے شاخیں نکلنا...... الانقھار: مطیع ہونا...... تَشَبَّحَ الحرباء علی الشجرۃ: گرگٹ کا دراز ہونا۔

تشریح:

تغذیہ: جب بدن کے بعض اجزاء تحلیل ہوکر زائل ہوجاتے ہیں تو ان کی خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے تغذیہ کی ضرورت پیش آتی ہے غَذّٰی تغذِیَۃً کے معنی ہیں غذا دینا، پرورش کرنا اور قوت غاذیہ چار آلات کے ذریعہ کام کرتی ہے یعنی قوت جاذبہ، قوت ماسکہ، قوت ہاضمہ اور قوت دافعہ کے ذریعہ اپنے افعال انجام دیتی ہے، تفصیل میری کتاب معین الفلسفہ ص ۱۳۹ میں ہے۔

تنمیہ: حصول کمال کے لئے نباتات کی طرح حیوانات میں بھی تنمیہ (بڑھوتری) کی قوت ودیعت کی گئی ہے، جو قوت ہاضمہ کے طاقت ور ہونے کا دوسرا نام ہے، اس کی تفصیل بھی معین الفلسفہ ص ۱۳۹ و ۱۴۰ میں ہے۔

تصحیح: فھذہ تجذِب إلی العُلُوّ، وتلك إلی السفل مطبوعہ نسخہ میں **فھذہ تجذب إلی العلو دون تلك إلی السفل** ہے۔ تصحیح مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۷

انسان کا مکلّف ہونا عالَم کی پلاننگ میں داخل ہے

تقدیر اور قَدَر کے معنی ہیں اندازہ کرنا، اسکیم بنانا، پلاننگ کرنا، جس طرح آدمی حویلی بناتا ہے تو پہلے نقشہ بنواتا ہے پھر اس کے مطابق تعمیر کرتا ہے، یہی تقدیر کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی علم ازلی میں اس عالم کے لئے پلاننگ کی ہے، جس میں انسان کا مکلّف ہونا شامل ہے، پس انسان مکلّف نہ ہو ایسا نہیں ہوسکتا، اسی طرح دیگر مخلوقات کا مکلّف نہ ہونا بھی پلاننگ میں داخل ہے، پس دیگر مخلوقات مکلّف ہوں، یہ بات ممکن نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور کرنے سے

یہ سب باتیں عیاں ہوجاتی ہیں، اور سمجھ میں آجاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو جو مکلّف بنایا ہے وہ ٹھیک ہی بنایا ہے، کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کی شہادت دیتا ہے۔ آپ پہلے نباتات میں غور کریں، پھر حیوانات میں، پھر انسان کے حالات میں، ان تین مخلوقات میں غور کرنے سے اندازہ ہوجائے گا کہ اللہ نے مخلوق کو کامل سے کامل تر پیدا کیا ہے اور ان میں سب سے اکمل انسان ہے۔

نباتات کے احوال میں غور

آپ درختوں کو، ان کے پتوں کو، ان کے شگوفوں کو، اور ان کے پھلوں کو دیکھیں، اور ان میں جو نظر آنے والی، چکھی جانے والی، چھوئی جانے والی، سونگھی جانے والی اور ٹٹولی جانے والی کیفیات ہیں، ان کو بھی ملاحظہ کریں؟ آپ دیکھیں گے کہ قدرت نے ہر نوع کے لئے مخصوص شکل کے پتے، خاص رنگ کے پھول، اور جدا جدا ذائقے دار پھل بنائے ہیں اور انہی چیزوں کے ذریعہ جانا پہچانا جاتا ہے کہ یہ فلاں قسم کا درخت اور پھل ہے۔

اور یہ تمام چیزیں صورت نوعیہ کے تابع اور اس کے ساتھ لپٹی ہوئی ہیں اور جہاں سے صورت نوعیہ آئی ہے، وہیں سے یہ سب چیزیں آئی ہیں۔ اور اللہ کا یہ فیصلہ کہ یہ مادّہ —— مثال کے طور پر —— کھجور کا درخت بنے، اس میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں کہ اس کا پھل ایسا ہو اور اس کے پتے ایسے ہوں۔

اور نوع کی بعض خصوصیتیں ہر سمجھ دار آدمی سمجھ سکتا ہے، اور بعض صرف ذہین اور زیرک ہی سمجھ سکتا ہے، مثلاً یاقوت کی یہ خصوصیت ہے کہ جو اس کو اپنے پاس رکھے گا اس کو فرحت حاصل ہوگی اور وہ بہادر بنے گا مگر کونسا پتھر یاقوت ہے، وہ ہیروں کا ماہر ہی جان سکتا ہے۔

اسی طرح نوع کی بعض خصوصیتیں ہر ہر فرد میں پائی جاتی ہیں، اور بعض مخصوص افراد میں پائی جاتی ہیں، جیسے ہلیلہ کا کوئی دانہ ایسا ہوتا ہے کہ جو اس کو ہاتھ میں پکڑے رکھے اس کا قبض ٹوٹ جاتا ہے، مگر یہ خاصیت ہلیلہ کے ہر دانہ میں نہیں ہوتی، کسی دانہ میں ہوتی ہے اور وہ بہت کمیاب ہے اور اس کو ماہر ہی پہچان سکتا ہے۔

پس یہاں یہ سوال کرنے کا کسی کو حق نہیں کہ کھجور کا درخت ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال سرے سے غلط ہے، کیونکہ ماہیت کے لوازم کا ماہیت کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے، جیسے سورج نکلنے کے لئے وجودِ نہار لازم ہے اور انسان ہونے کے لئے ناطق وضاحک ہونا ضروری ہے، پس ''کیوں؟'' سے سوال باطل ہے۔

﴿باب إنشقاق التكليف من التقدير﴾

إعلم أن للّٰه تعالى آياتٍ في خلقه، يهتدي الناظرُ فيها، إلى أن اللّٰه له الحُجّةُ البالغة في تكليفه لعباده بالشرائع:

فانظر إلى الأشجار وأوراقها وأزهارها وثمراتها، وما في كل ذلك من الكيفيات المُبْصَرة والمذُوْقَة وغيرها؛ فإنه جعل لكل نوع أوراقا بشكل خاص، وأزهارًا بلونٍ خاصٍ، وثمارًا مختصةً بطعوم؛ وبتلك الأمور يُعْرف أن هذا الفرد من نوع كذا وكذا.

وهذه كلها تابعة للصورة النوعية، مُلْتَوِية معها، إنما تجيئ من حيث جاء ت الصورة النوعية؛ وقضاءُ الله تعالى بأن تكون هذه المادّة نَخْلةً — مثلاً — مشتبكٌ مع قضائه التفصيليّ بأن تكونَ ثمرتُها كذا، وخُوصها كذا.

ومن خواص النوع: ما يُدْرِكه كلُّ من له بَالٌ، ومن خواصه: مالايُدرِكه إلا الألمعيُّ الفطِنُ، كتأثير الياقوت في نفس حامِلِه بالتفريح والتشجيع؛ ومن خواصه: مايَعُمُّ كلَّ الأفراد، ومن خواصّه: مالا يوجد إلا في بعضها، حيث تستعدُّ المادةُ، كالإِهْلِيْلَج الذي يُسهل بطنَ من قَبض عليه بيده.

وليس لك أن تقول: لِمَ كانت ثمرةُ النخل على هذه الصفة؟ فإنه سؤال باطل، لأن وجودَ لوازمِ الماهيات معها لايُطلب بـ "لِمَ؟".

ترجمہ: باب: تکلیف شرعی کا تقدیر الٰہی سے نکلنا: جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کائنات میں نشانیاں ہیں، جن میں غور کرنے والا اس بات کی طرف راہ پاتا ہے کہ اللہ نے جو اپنے بندوں (یعنی انسانوں) کو شریعتوں کا مکلّف بنایا ہے تو اس کی خدا کے پاس برہانِ کامل (زبردست دلیل) ہے:

پس آپ درختوں میں اور ان کے پتوں میں اور ان کے پھولوں میں اور ان کے پھلوں میں غور کیجئے، اور ان چیزوں میں غور کیجئے جو ان میں سے ہر ایک میں ہیں: مشاہدہ میں آنے والی اور چکھی جانے والی اور ان کے علاوہ کیفیات میں سے، پس بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کے لئے خاص شکل کے پتے، اور خاص رنگ کے پھول اور مزوں کے ساتھ مختص پھل بنائے ہیں اور انہی چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرد فلاں فلاں قسم کا ہے۔

اور یہ تمام چیزیں صورت نوعیہ کے تابع اور اس کے ساتھ لپٹی (چمٹی) ہوئی ہیں، وہیں سے آئی ہیں جہاں سے صورت نوعیہ آئی ہے۔ اور اللہ کا یہ فیصلہ کہ یہ مادہ — مثال کے طور پر — کھجور کا درخت بنے، اُن کے تفصیلی فیصلے کے ساتھ ملا جلا ہے کہ اس کے پھل ایسے ہوں اور اس کے پتے ایسے ہوں۔

اور نوع کی کچھ خصوصیتیں وہ ہیں جن کو پالیتا ہے ہر وہ شخص جس کے پاس دل ہے، اور اس کی خصوصیتوں میں سے بعض وہ ہیں جن کو نہیں پاتا مگر زیرک ذہین شخص، جیسے یاقوت کی تاثیر، اس کو ساتھ رکھنے والے کے دل میں خوش کرنے اور بہادر بنانے کی۔ اور نوع کی خصوصیات میں سے بعض وہ ہیں جو تمام افراد کو عام ہیں، اور اس کی بعض خصوصیات وہ ہیں جو نہیں پائی جاتیں مگر ان کے بعض میں، جہاں مادہ میں استعداد پیدا ہوتی ہے، جیسے وہ ہلیلہ جو اس شخص کے پیٹ کو نرم

کرتا ہے، جواس کو اپنے ہاتھ میں پکڑے رہتا ہے۔

اور آپ کو حق نہیں کہ آپ پوچھیں کہ کھجور کا پھل ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ یہ سوال ہی غلط ہے، اس لئے کہ ماہیتوں کے لوازم کا پایا جانا ماہیتوں کے ساتھ نہیں طلب کیا جاتا ''کیوں؟'' کے ذریعہ۔

لغات:

إِنْشَقَّ الشيئُ: پھٹنا، انْشَقَّ الفجرُ: فجر کا طلوع ہونا...... إِشْتَبَكَ: مخلط ہونا بعض کا بعض میں داخل ہونا...... الخُوص: کھجور کے پتے، مفرد خُوصة ...... البَال: دل، کہا جاتا ہے ما خطرَ ببالي: میرے دل میں نہیں گزرا...... الأَلْمَعُ والأَلْمَعِيُّ: تیز ذہن، تیز فہم، الأَلْمَعِيَّة: ذکاوت۔

☆ ☆ ☆

حیوانات کے احوال میں غور

اب آپ حیوانات کی مختلف اقسام پر نظر ڈالیں۔ نباتات میں جو جو باتیں پائی جاتی ہیں، وہ سب باتیں آپ کو حیوانات میں ملیں گی، آپ دیکھیں گے کہ ہر نوع کی الگ شکل اور جدا بناوٹ ہے، مزید برآں حیوانات اپنے اختیار سے حرکت کرتے ہیں، اور ان کو فطری الہامات ہوتے ہیں ان کی سرشت میں زندگی گزارنے کی تدبیریں رکھ دی گئی ہیں۔ اور وہ انہی چیزوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔ مثلاً پالتو چوپائے گھاس کھاتے ہیں اور جُگالی کرتے ہیں، گھوڑے، گدھے اور خچر گھاس تو کھاتے ہیں مگر جگالی نہیں کرتے، درندے گوشت کھاتے ہیں۔ پرندے ہوا میں اڑتے ہیں اور مچھلی پانی میں تیرتی ہے، اسی طرح حیوانات کی ہر نوع کی الگ آواز ہے، نر مادہ کے ملنے کا الگ طریقہ ہے، اور اولاد کی پرورش کا الگ ڈھنگ ہے، جس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی ہر نوع کو وہ علوم الہام فرمائے ہیں جو اس کے مزاج کے مناسب ہیں، اور جو اُس نوع کے لئے کار آمد ہیں، اور یہ سب الہامات حیوانات کی انواع پر خالق تعالیٰ کی طرف سے صورت نوعیہ کے روزن سے ہوتے ہیں، جیسے پھولوں کے مختلف ڈیزائن اور پھلوں کے مزے صورت نوعیہ کے ساتھ گڈمڈ ہیں۔

اور حیوانات کی انواع کے بعض احکام تمام افراد کو عام ہوتے ہیں، اور بعض احکام صرف بعض افراد میں پائے جاتے ہیں، جہاں مادہ میں استعداد ہوتی ہے اور اتفاقاً اسباب جمع ہو جاتے ہیں، اگرچہ نفس استعداد سب میں ہوتی ہے، جیسے شہد کی ہر مکھی یَعسُوب (شہد کی مکھیوں کا سردار) نہیں بنتی، کوئی ہی بنتی ہے، اور انسان کی آواز کی نقل ہر پرندہ نہیں کر سکتا، طوطا ہی کرتا ہے۔

ثم انظر إلى أصناف الحَيوان، تجدْ لكل نوعٍ شكلا وخِلْقة، كما تجد في الأشجار، وتجد مع ذلك لها حركاتٍ اختيارية، وإلهاماتٍ طبيعية، وتدبيراتٍ جِبلّيّةً، يمتاز كل نوع بها؛ فبهيمة الأنعام ترْعى الحشيشَ وتَجْترُّ، والفرسُ والحمار والبغل ترعى الحشيش ولاتجتر، والسباعُ تأكل اللحم، والطير يطير في الهواء، والسمك يَسْبح في الماء؛ ولكل نوع من الحيوان صوتٌ غيرُ صوت الآخر، ومسافدة غيرُ مسافَدة الآخر، وحضانة للأولاد غير حِضانة الآخر؛ وشرح هذا يطول.

وما ألهم اللّٰه نوعا من الأنواع إلا علوما تُناسب مزاجه، وإلا مايصلُح به ذلك النوع؛ وكلُّ هذه الإلهاماتِ تترشح عليه من جانب بارئها، من كُوَّةِ الصورة النوعية؛ ومَثلُها كمَثل تَخاطِيط الأزهار وطُعوم الثمرات في تشابُكها مع الصورة النوعية.

ومن احكام النوع: ما يَعُمُّ الأفراد، ومنها: مالايوجد إلا في البعض، حيث تستعدُّ المادةُ، وتَتَّفِقُ الأسبابُ، وإن كان أصل الاستعداد يَعُمُّ الكلَّ، كاليَعْسُوْبِ من بين النَّحْل، والبَبْغاءِ: يتعلَّم محاكاةَ أصواتِ الناس بعد تعليم وتمرين.

ترجمہ: پھر آپ حیوانات کی اقسام کو دیکھیں، آپ ہرنوع کے لئے ایک شکل اور ایک بناوٹ پائیں گے، جیسا آپ نے پایا ہے درختوں میں، اور آپ اس کے ساتھ پائیں گے حیوانات کے لئے اختیاری حرکتیں، فطری الہامات اور جبلی تدبیریں، جن کے ذریعہ ہرنوع ممتاز ہوتی ہے، مثلاً پالتو چوپائے گھاس چرتے ہیں اور جگالی کرتے ہیں اور گھوڑے، گدھے اور خچر گھاس چرتے ہیں اور جگالی نہیں کرتے، اور درندے گوشت کھاتے ہیں، اور پرندے ہوا میں اڑتے ہیں، اور مچھلی پانی میں پیرتی ہے، اور حیوان کی ہر قسم کے لئے ایک آواز ہے دوسرے کی آواز کے مغائر، اور جفتی کا طریقہ ہے دوسرے کی جفتی کے طریقہ کے مغائر، اور اولاد کی پرورش کا طریقہ ہے دوسرے کے طریقہ کے مغائر، اور اس کی تفصیل لمبی ہوجائے گی۔

اور اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی انواع میں سے ہرنوع کو وہی علوم الہام فرمائے ہیں جو اس کے مزاج کے مناسب ہیں، اور جن کے ذریعہ وہ نوع سنور سکتی ہے۔ اور یہ سب الہامات نوع پر ٹپکتے ہیں انواع کو پیدا کرنے والے کی جانب سے، صورت نوعیہ کے سوراخ سے، اور ان علوم کا حال شگوفوں کی لکیروں اور پھلوں کے مزوں جیسا ہے، ان کے مختلط ہونے میں صورت نوعیہ کے ساتھ۔

اور نوع کے احکام میں سے بعض وہ ہیں جو تمام افراد کو عام ہوتے ہیں، اور ان میں سے بعض صرف بعض افراد میں پائے جاتے ہیں، جہاں مادہ میں استعداد پیدا ہوتی ہے اور اتفاقاً اسباب جمع ہوجاتے ہیں، اگرچہ نفس استعداد سب میں ہوتی ہے، جیسے یعسوب (شہد کی مکھیوں کا بادشاہ) شہد کی مکھیوں کے درمیان میں سے، اور طوطا لوگوں کی آوازوں کی نقل کرنا سیکھتا ہے تعلیم وتمرین کے بعد۔

لغات:

اِجْتَرَّ البعيرُ: جگالی کرنا اجْتَرَّ الشيءَ: کھینچنا...... سَافَدَ الذكر أنثاه مُسَافَدَةً: جفتی کرنا...... الحِضَانَة: پرورش ...... قوله: وإلا مايصلح به استثناء دراستثناء ہے...... خَطَّطَ: لکیریں کھینچنا تَخَاطِيط: لکیریں، ڈیزائن، کیونکہ وہ لکیروں سے بنتی ہے...... إسْتَعَدَّ للأمر: تیار ہونا۔

☆ ☆ ☆

انسان کے احوال میں غور

اب آپ نوع انسانی کو دیکھیں، نباتات اور حیوانات میں جو جو باتیں ہیں، وہ سب انسان میں موجود ہیں، انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح کھانستا، انگڑائی لیتا، ڈکار لیتا، فضلات کو دفع کرتا اور پیدا ہوتے ہی پستان چوستا ہے، مزید برآں انسان میں چند ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، مثلاً:

① وہ بات چیت کرتا ہے، دوسروں کا کلام سمجھتا ہے، بدیہی باتیں مرتب کر کے نئے علوم پیدا کرتا ہے، اسی طرح تجربات، جائزے اور زیرکی سے بھی علوم پیدا کرتا ہے۔

② وہ ایسی باتوں کا اہتمام کرتا ہے، جن کو وہ عقل سے اچھا سمجھتا ہے، اگرچہ حواس اور قوت واہمہ سے ان کی خوبی سمجھ میں نہ آئے جیسے نفس کو سنوارنا اور ممالک کو زیر نگیں کرنا۔

اور ان امور کے نوعی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تمام امتیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے بھی، ان کی بنیادی باتوں پر متفق ہیں اور یہ بات بلاوجہ نہیں ہوسکتی، اس میں گہرا راز ہے، جو صورت نوعیہ کی جڑ سے پھوٹتا ہے۔

اور وہ راز یہ ہے کہ مزاج انسانی کا مقتضی یہ ہے کہ عقل دل پر، اور دل نفس پر غالب رہے، اسی لئے وہ نفس کے تقاضوں کو دل کے فیصلہ پر دبا لیتا ہے، اور دل کی چاہتوں کا عقل کے فیصلہ کے سامنے خون کر دیتا ہے۔

ثم انظر إلى نوع الإنسان، تجدْ له ماوجدتَ في الأشجار، وما وجدتَ في أصناف الحيوان، كالسُّعال، والتَّمَطِّيْ، والجُشاء، ودفع الفضلات، ومَصِّ الثَّدْي في أول نشأته؛ وتجدْ مع ذلك فيه خواصَّ، يمتاز بها من سائر الحيوان:

منها: النطق، وفهم الخطاب، وتوليد العلوم الكسبية من ترتيب المقدِّمات البديهية، أو من التجرِبة، والاستقراء، والحدس.

ومنها: الاهتمام بأمور يَسْتَحْسِنُهَا بعقله، ولايجدها بحسِّه ولاوهمه، كتهذيب النفس،

وتسخير الأقاليم تحت حكمه.

ولـذلك يتوارد على أصول هذه الأمور جميعُ الأمم، حتى سكّانَ شواهقِ الجبال؛ وما ذلك إلا لسِرٍّ نا شيءٍ من جذر صورته النوعية؛ وذلك السر: أن مزاج الإنسان يقتضي أن يكون عقلُه قاهرًا على قلبه، وقلبه قاهرًا على نفسه.

ترجمہ: پھر دیکھئے آپ نوعِ انسانی کی طرف، پائیں گے آپ اس میں وہ چیزیں جو آپ نے پائی ہیں درختوں میں، اور جو پائی ہیں آپ نے حیوانات کی اقسام میں، جیسے کھانسنا اور انگڑائی لینا اور ڈکار لینا اور فضلات کو دفع کرنا، اور پستان چوسنا اپنی پیدائش کے آغاز میں، اور آپ پائیں گے اس کے ساتھ انسان میں چند ایسی خصوصیتیں جن کی وجہ سے وہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک: بات چیت کرنا ہے، اور دوسرے کی بات سمجھنا ہے اور بدیہی باتوں کو ترتیب دے کر علوم اکتسابی پیدا کرنا ہے، یا تجربہ سے اور جائزے سے اور زیرکی سے (علوم اکتسابی پیدا کرنا ہے)

اور ان میں سے ایک: ایسی باتوں کا اہتمام کرنا ہے، جن کو وہ اپنی عقل سے اچھا سمجھتا ہے، اور اپنے حواس سے اور اپنے وہم سے ان کی خوبی نہیں سمجھتا، جیسے نفس کو سنوارنا اور ممالک کو اپنے حکم کے تحت مسخر کرنا۔

اور اسی وجہ سے متفق ہیں ان باتوں کی بنیادوں پر، تمام لوگ، حتی کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے بھی، اور نہیں ہے یہ بات مگر ایک ایسے راز کی وجہ سے جو صورت نوعیہ کی جڑ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ راز یہ ہے کہ انسان کا مزاج چاہتا ہے کہ اس کی عقل غالب رہے اس کے دل پر، اور اس کا دل غالب رہے اس کے نفس پر۔

لغات:

الحَدْس: دانائی، زیرکی، اور اصطلاح میں حدس کے معنی ہیں مقدمات کو ترتیب دیئے بغیر نتیجہ تک پہنچ جانا...... وھم: حواس خمسہ باطنہ میں سے ایک حاسہ ہے، اس کا کام محسوس چیزوں کی اُن معنوی باتوں کا ادراک کرنا ہے جو حواس ظاہرہ سے حاصل نہیں ہوسکتیں، جیسے بچہ قابل محبت ہے اور شیر قابل خوف ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے معین الفلسفہ ص ۱۴۳)

تصحیح: دوسرا منها تمام نسخوں میں من ہے، مگر یہ تصحیف ہے، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظم وانتظام کس طرح فرمایا ہے؟

اب تک کیف خلق اللّٰہ الخلق؟ کی تفصیل تھی کہ قدرت نے یہ کارخانہ کس ڈھب سے بنایا ہے، نباتات کی،

حیوانات کی اور انسان کی صورت حال کیا ہے؟ اب کیف دَبَّرَ اللّٰـه الخلق ؟ کا مضمون شروع ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کا کیا انتظام کیا ہے؟ پہلے آپ نباتات اور حیوانات کا انتظام دیکھیں، پھر انسان کی تدبیر کا بیان آئے گا۔

نباتات میں چونکہ حس وحرکت نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو جڑیں دی ہیں، جن سے وہ انرجی (Energy) حاصل کرتی ہیں جڑیں زمین سے مادہ چوستی ہیں اور صورت نوعیہ کی دَین کے مطابق ٹہنیوں، پتوں، پھلوں اور پھولوں کو سپلائی کرتی ہیں، اس طرح تمام نباتات نشو ونما پاتے ہیں۔ اور حیوانات میں چونکہ حس وحرکت ہے، اس لئے ان کو جڑیں نہیں دیں، بلکہ ان کو مکلف کیا کہ وہ گھاس، دانہ اور پانی ان کے ٹھکانوں سے حاصل کریں، نیز ان کو دیگر مرافق زندگی بھی الہام کئے۔

اور جو حیوانات کیڑوں کی طرح پیدا نہیں ہوتے، ان میں افزائش نسل کا یہ انتظام کیا کہ ان کو آلاتِ تناسل دیئے، اور مادہ میں رطوبت پیدا کی، جس سے جنین کی پرورش ہوتی ہے، پھر وہی رطوبت خالص دودھ بن جاتی ہے، اور نوزائیدہ بچے کو الہام کیا کہ وہ پستان چوسے، اور جو دودھ منہ میں آئے اس کو نگل جائے۔

اور مرغی میں بھی رطوبت پیدا کی، جس سے انڈے تیار ہوتے ہیں، پھر جب مرغی تمام انڈے دے چکتی ہے تو اندر ایسی خشکی اور خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو اس کو پاگل سا بنا دیتا ہے اور وہ دوسری مرغیوں سے دور بھاگتی ہے، اور کوئی چیز دبا کر بیٹھنا چاہتی ہے تاکہ اندر کے خلاء کو پُر کرے۔

اور کبوتر کے جوڑے میں الفت رکھی اور انڈوں سے فارغ ہونے کے بعد ان کو سینے کی وجہ وہی ہے جو مرغی میں ہے، پھر جب چوزے نکل آتے ہیں تو بوسیدہ رطوبت بہ تکلف قَے کا سبب بن جاتی ہے، اور اللہ نے کبوتری کے دل میں چوزوں کی محبت رکھی، جو پرانی رطوبت کے ساتھ مل کر قَے کا سبب بنتی ہے، جس سے غلہ پانی نکلتا ہے اور اس کو چوزے کھاتے ہیں، اور باہمی انسیت کی وجہ سے نر بھی مادہ کی نقل کرتا ہے، جس سے چوزوں کو غذا فراہم ہوتی ہے، اور چوزوں میں بھی رطوبت پیدا کی ہے، جو بعد میں پَروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ان سے بچے اڑنے لگتے ہیں اور اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں۔

ثم انظر إلى تدبير الحق لكل نوع، وتربيته إياه، ولطفِه به؛ فلما كان النبات لايُحِسُّ ولايتحرك، جعل له عروقا، تَمُصُّ المادةَ المجتمعة من الماء والهواء ولطيف التراب، ثم يُفَرِّقُها في الأغصان وغيرها، على تقسيمٍ تعطيه الصورةُ النوعية.

ولما كان الحَيَوان حسّاسا، متحركا بالإرادة، لم يجعل له عروقًا، تَمَصُّ المادةَ من الأرض، بل ألهمه طلبَ الحبوب والحشيش والماء من مَظَانِّهَا، وألهمه جميعَ مايحتاج إليه من الارتفاقات.

والنوع الذى لايتكوَّن من الأرض تكوُّنَ الديدان منها، دَبَّر اللّٰه تعالى له، بأن أودع فيه قُوى

التناسل، وخَلَقَ في الأنثى رطوبةً، يصرفها إلى تربية الْجَنِيْن، ثم حوَّلها لبناخالصًا، وألهم المتولدَ مَصَّ الثدى وازْدِ رَادَ اللبن.

وجعل في الدجاجة رطوبة، يصرفها إلى تكوُّن البَيْضِ؛ فإذا باضت أصابها يُبْسٌ وخُلُوُّ جوف، يحملانها على جنون، يستدعي تركَ مخالطة بني نوعها، واستحبابَ حِضانة شيئ، تَسُدُّ به جوفها.

وجعل من طبع الحمامة الأُنسَ بين ذكرها وانثاها، وجعل خُلُوَّ جوفها هو الحامل على حِضانة البَيْض، ثم جعل رطوبتها البالية تتوجّه إلى التهوُّع، وجعل لها رحمة على الفرخ، وجعل رحمتها مع الرطوبة البالية سببا لتهوُّعها، ودفعِ الحبوب والماء إلى جوف فَرْخِها؛ وجعل الذَّكَرَ منها بسبب الأنس يقلّد أنثاها؛ وخلق للفَرَاخ مزاجا رطبا، ثم حوّل رطوبتها ريشا تطير به.

ترجمہ: پھر آپ ہر نوع کے لئے حق تعالیٰ کے نظم وانتظام کو، اوراس کی پرورش کو اوراس پر لطف وکرم کو دیکھئے، پس جب نباتات احساس نہیں رکھتے تھے اور حرکت نہیں کرتے تھے تو ان کے لئے جڑیں بنائیں، جو اس مادہ کو چوستی ہیں جو پانی، ہوا اور مٹی کے لطیف اجزاء سے اکٹھا ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس مادہ کو شاخوں وغیرہ میں بانٹ دیتے ہیں، اس اندازے کے مطابق جو صورت نوعیہ دیتی ہے۔

اور جب حیوان احساس کرنے والا اور بالارادہ حرکت کرنے والا تھا تو اس کے لئے ایسی جڑیں نہیں بنائیں جو زمین سے مادہ کو چوسیں، بلکہ ان کو غلہ، گھاس اور پانی کو ان کے ٹھکانوں سے ڈھونڈھنے کا الہام کیا، اوران کو الہام کیں وہ تدبیرات نافعہ جن کے وہ محتاج ہیں۔

اور حیوانات کی جو قسم مٹی سے پیدا نہیں ہوتی، کیڑوں کے مٹی سے پیدا ہونے کی طرح، ان کا یہ انتظام کیا کہ ان میں نسل بڑھانے والی صلاحیتیں ودیعت فرمائیں، اور مادہ میں ایک رطوبت پیدا کی، جس کو اللہ تعالیٰ پیٹ کے بچے کی پرورش میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کو خالص دودھ میں تبدیل کردیا، اور نوزائیدہ بچے کو پستان چوسنے کا اور دودھ نگلنے کا الہام فرمایا۔

اور اللہ تعالیٰ نے مرغی میں رطوبت پیدا کی، جس کو وہ انڈے بننے میں خرچ کرتے ہیں، پھر جب مرغی انڈے دے چکتی ہے تو اس کو ایسی خشکی اور باطن کا خالی ہونا پہنچتا ہے جو وہ دونوں اس کو ایسے پاگل پن پر ابھارتے ہیں کہ وہ ابنائے نوع سے اختلاط کو ترک کردینا چاہتی ہے۔ اور کسی ایسی چیز کے سینے کو پسند کرتی ہے، جس سے وہ اپنے اندر کے خلاء کو بھرے۔

اور کبوتر کی فطرت میں نر و مادہ میں انسیت رکھی، اوراس کے اندر کے خلاء ہی کو انڈوں کے سینے پر ابھارنے والا بنایا، پھر اس کی بوسیدہ رطوبت کو بہ تکلف قَے کرنے کی طرف متوجہ کردیا اور اللہ نے کبوتری میں چوزے پر مہر رکھی ہے، اور اس کی مہر کو پرانی رطوبت کے ساتھ ملا کر بہ تکلف قَے کا اور غلہ پانی کو چوزے کے پیٹ میں پہنچانے کا سبب بنایا اور اللہ

نے اس کے نرکو ـــــ بوجہ انسیت کے ـــــ اس کی مادہ کا مقلد بنایا، اور چوزوں میں مرطوب مزاج پیدا کیا، پھر ان کی رطوبت کو ایسے پر بنادیا، جس سے وہ اڑنے لگے۔

لغات:

مَظَانُّ جمع ہے مَظَنَّةٌ کی، جس کے معنی ہیں ٹھکانہ یعنی وہ جگہ جہاں کسی چیز کے موجود ہونے کا گمان ہو، جیسے کوئی بازار سرمہ دانی لینے جاتا ہے، تو وہ ہر دوکان پر دریافت نہیں کرتا بلکہ جہاں سرمہ دانی ملنے کا احتمال ہوتا ہے وہیں رکتا ہے۔ یہ لفظ شاہ صاحب آگے بار بار استعمال کریں گے اس لئے اس کا مفہوم یاد رکھیں...... ارتفاقات جمع ہے اِرْتِفَاقٌ کی، اِرْتَفَقَ به کے معنی ہیں نفع اٹھانا، یہ بھی شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے، اس کا مفہوم ہے آرام سے زندگی گزارنے کی تدبیریں، مفید اسکیمیں، اس کی مزید وضاحت مبحث ثالث کے شروع میں آئے گی...... اِزْدَرَدَ اللقمةَ: لقمہ کو جلدی سے نگلنا...... تَهَوَّعَ تَهَوُّعًا: تکلف سے قئ کرنا۔

☆ ☆ ☆



انسان کی تربیت وتدبیر کا بیان

پروردگار عالم نباتات اور حیوانات کی پرورش کس طرح کرتے ہیں؟ قدرت نے ان کا نظم ونسق کس طرح کیا ہے؟ یہ مضمون آپ پڑھ چکے، اب انسان کی تربیت وتدبیر کا بیان شروع ہوتا ہے۔ انسان میں نباتات اور حیوانات کی سب خصوصیتیں موجود ہیں، وہ نشو ونما پاتا ہے، احساس رکھتا ہے، ارادے سے حرکت کرتا ہے، جبلی الہامات قبول کرتا ہے اور اس کو فطری علوم بھی عطا کئے گئے ہیں، مزید برآں اس کو اور خصوصیات سے بھی نوازا گیا ہے، اس کو عقل وافر دی گئی ہے اور وہ اکتسابی علوم پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، اس لئے قدرت نے اس کے لئے سامان زندگی تیار نہیں کیا، بلکہ خود اس کو اسباب حیات پیدا کرنے کا حکم دیا ہے، اس کو کھیتی باڑی، باغبانی، تجارت اور معاملات کا مکلّف کیا ہے تا کہ وہ محنت کر کے اپنے لئے اسباب بقاء فراہم کرے۔

صلاحیتوں کا فرق: پھر تمام انسان ایک درجہ کے نہیں، کوئی فطری طور پر آقا ہے تو کوئی اتفاق سے (ByChance) آقا بن گیا ہے، کوئی فطری طور پر غلام ہے تو کوئی اتفاقاً غلام بن گیا ہے، کوئی بادشاہ ہے تو کوئی رعایا، کوئی دانشمند ہے تو کوئی غبی، اور دانشمند بھی ایسا کہ حکمت الٰہی، علم طبعی، علم ریاضی اور حکمت عملی میں گل افشانی کرتا ہے، اور جو غبی ہے وہ مذکورہ علوم کی طرف کسی کی تقلید کے بغیر راہ نہیں پاتا۔

یہ سب انسان کی فطری باتیں ہیں، چنانچہ تمام انسان، خواہ وہ بادیہ نشیں ہوں یا شہری، ان باتوں میں متفق ہیں۔ اور یہ انسان کی ظاہری خصوصیات اور نظم ونسق کا بیان ہے، جس کا تعلق انسان کی قوت بہیمیہ اور دنیوی تدبیرات نافعہ سے ہے۔

قوت ملکیہ کے تعلق سے انسان کے احوال: اب آپ قوت ملکیہ کے تعلق سے انسان کے احوال میں غور کریں۔ انسان دیگر حیوانات کی طرح نہیں، اس کو حیوانات سے اشرف علم وادراک دیا گیا ہے، اور انسان کے وہ مخصوص علوم جن پر انسان کے تمام افراد متفق ہیں، یہ ہیں:

① وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور کیوں پیدا کیا ہے؟ اور اس کا پیدا کرنے والا اس کی پرورش کیوں کر رہا ہے؟

② وہ جاننا چاہتا ہے کہ کائنات کا نظم وانتظام کون کر رہا ہے؟ جو خود اس شخص کا بھی خالق ورازق ہے۔

③ انسان بصیرت اور پوری توجہ سے اپنے پیدا کرنے والے اور پرورش کرنے والے کی بندگی کرنا چاہتا ہے، اس کے سامنے گڑگڑانا چاہتا ہے، جس طرح وہ اور تمام حیوانات زبان حال سے دائمی طور پر تضرع کُناں ہیں۔

زبان حال سے تضرع: دنیا کی تمام مخلوقات: انسان وحیوانات، اشجار واحجار وغیرہ، اکل وشرب، افزائش نسل اور دیگر مادی ضروریات کی حد تک، سختی کے ساتھ قوانین الٰہی کے پابند ہیں، اور یوں بنیادی طور پر تمام مخلوقات عاجزی کرنے والی ہیں، اور یہی ان کا زبان حال سے تضرع (گڑگڑانا) ہے، البتہ انسان روحانی طور پر بھی مسلمان ہونے کی اہلیت رکھتا ہے، اسلام کے معنی ہیں بغیر خارجی دباؤ کے اللہ کی حاکمیت کے آگے سر جھکانا، انسان پر اس معاملہ میں کوئی جبر نہیں، جو خوشی سے سر جھکاتا ہے، جنت کا حقدار ہوتا ہے۔ اور جو سرتابی کرتا ہے، سزا پاتا ہے، سورۃ الحج آیت ۱۸ میں ارشاد ہے: ”کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سب عاجزی کرتے ہیں، جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن پر (بوجہ منقاد نہ ہونے کے) عذاب ثابت ہوگیا“

کیا نباتات کا ہر جزء اس نفس نباتیہ کے سامنے ہر وقت ہاتھ پسارے ہوئے نہیں، جو درختوں کی تدبیر کرتا ہے؟ کیا درختوں کی ٹہنیاں، پتے، پھول وغیرہ ہر وقت نفس نباتیہ سے فیضان کی بھیک نہیں مانگتے؟ یہ نفس نباتیہ کس نے پیدا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، پس یہی نباتات کی زبان حال سے عاجزی ہے۔ پس اگر نباتات میں کامل عقل ہوتی تو ان کا ہر جزء نفس نباتیہ کی ایسی تعریف کرتا جو دوسرے جزء کی تعریف سے مختلف ہوتی۔ اور اگر ان میں فہم وشعور ہوتا تو اس زبان حال سے ہاتھ پسارنے کا ان کے علم پر اثر پڑتا اور وہ علم وبصیرت اور پوری توجہ سے بھی ہاتھ پسارنے لگتے۔ یہیں سے یہ بات سمجھ لیجئے کہ انسان چونکہ تیز عقل رکھتا ہے اس لئے اس کا دل تکلف حالی کے مطابق تکلف علمی سے بھر گیا ہے اور اس کے نفس میں زبان حال سے دست طلب پھیلانے کی طرح علم وبصیرت سے دست طلب دراز کرنے کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔

انسان کی چند اور خصوصیات: انسان میں دو خصوصیتیں اور بھی ہیں:

پہلی خصوصیت: نوع انسانی میں کچھ ایسے کامل افراد ہوتے ہیں جن کی خالص توجہ علوم عقلیہ کے سرچشمہ کی طرف رہتی ہے، وہ ان علوم کو اس سرچشمہ سے بذریعۂ وحی یا حدس یا خواب حاصل کرتے ہیں، اور کچھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو اس کامل انسان میں رشد و برکت کے آثار محسوس کرتے ہیں، چنانچہ وہ اوامر و نواہی میں اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اول انبیائے کرام ہیں اور دوم ان کی امتیں ہیں اور اگرچہ خواب، رائے، غیبی آواز اور فراست کے ذریعہ غیب کی طرف خالص توجہ کرنے کی نفس صلاحیت سب لوگوں میں ہوتی ہے، مگر سب انسان برابر نہیں ہوتے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص، اور ناقص ہمیشہ کامل کا محتاج رہتا ہے، غرض ہر شخص بذات خود غیب سے علوم حاصل نہیں کرسکتا، عام لوگوں کو اس سلسلہ میں کامل کی پیروی کرنی پڑتی ہے۔

دوسری خصوصیت: انسان کو اللہ تعالیٰ نے چند ایسی صفات سے بہرہ ور کیا ہے، جن کا انداز جانوروں کی صفات کے انداز سے برتر ہے۔ وہ صفات یہ ہیں (۱) خشوع (۲) نظافت (۳) عدالت (۴) سماحت (۵) ملکوت و جبروت کی روشنیوں کا ظاہر ہونا یعنی دعاؤں کا قبول ہونا، کرامتوں کا ظاہر ہونا، اور احوال و مقامات کا پیش آنا۔ جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

ولـما كـان الإنسـانُ مـع إحسـاسـه وتـحَرُّكه، وقبولِه للإلهامات الجبلِّية والعلومِ الطبيعية، ذاعـقـلٍ وتـولـيـدٍ لـلـعلوم الكسبية، أُلْهِمَهُ الزرعَ، والغرسَ، والتجارة، والمعاملة؛ وجعل منهم السيِّدَ بـالـطـبـع والاتفاق، والعبدَ بالطبع والاتفاق، وجعل منهم الملوكَ والرعيةَ، وجعل منهم الـحـكيمَ المتكلِّمَ بالحكمة الإلٰهية، والطبيعية، والرياضية، والعملية، وجعل منهم الغبيَّ الذى لايهتـدى لـذلك إلا بـضـربٍ مـن تقليدٍ؛ ولذلك ترى أُمَمَ الـنـاس مـن أهـل البوادى والحَضَر متواردين على هذه.

وهـذا كـلُّـه شـرحُ الـخـواصِّ والتـدبيـرات الـظـاهـرة، المتعلّقة بقوته البهيمية، وارتفاقاته الـمـعـاشية، ثـم انتَـقِـلْ إلى قوته الملكية واعلم أن الإنسان ليس كسائر أنواع الحيوان، بل له إدراكٌ أشرفُ من إدراكاتهم.

ومن علومه التى يتوارد عليها أكثرُ أفراده، غير من عصت مادَّتُه أحكامَ نوعه:

[۱] التفتيش عن سبب إيجاده وتربيته.

[۲] والتنبيهُ بإثبات مدبر فى العالم، هو أوجده ورزقه.

[۳] والتـضـرعُ بين يَدَىْ بارِئه ومَدَبِّره بهمَّته وعلمه، حسب مايتضرع إليه هو وجميعُ أبناء

جنسه دائما سرمدًا بلسان الحال، وهو قوله تعالى: ﴿ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الأَرْضِ، وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ، وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ، وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ﴾

أليس أن كلَّ جزء من الشجرة: من أغصانها، وأوراقها، وأزهارها، مُتَكَفِّفٌ يدَه إلى النفس النباتية، المدبرةِ في الشجرة دائمًا سرمدًا؟ فلو كان لكل جزء منها عقلٌ، لَحَمِد النفسَ النباتية حمدًا غَيْرَ حمدِ الآخر؛ ولو كان له فَهْمٌ لانطبَعَ التكففُ الحالي في علمه، وصار تَكَفُّفًا بالهمة؛ فَاعْلَمْ من هناك: أن الإنسان لما كان ذا عقل ذَكِيٍّ انطبع في نفسه التكفف العلمي حسب التكفف الحالي.

ومن خواصه أيضا:

[۱] أن يكون في نوع الإنسان من له خلوصٌ إلى منبع العلوم العقلية، يتلقَّاها منه وحيًا، أو حَدْسًا، أو رُؤْيَا؛ وأن يكون آخرون قد تفرَّسوا من هذا الكامل آثارَ الرشد والبركة، فانقادوا له فيما يأمر وينهى.

وليس فردٌ من أفراد الإنسان إلا له قوةُ التخلُّص إلى الغيب، برؤْيَا يراها، أو بِرَأْيٍ يَبْصُره، أو هتيفٍ يسمَعُه، أو حَدْسٍ يَتفطَّن له؛ إلا أن منهم الكاملَ، ومنهم الناقصَ، والناقصُ يحتاج إلى الكامل.

[۲] وله صفاتٌ يَجِلُّ طورُها عن طَورصفات البهائم كالخشوع، والنظافة، والعدالة، والسماحة، وكظهور بوارق الجبروت والملكوت: من استجابةِ الدعاء وسائر الكرامات والأحوال والمقامات.

ترجمہ: اور جب انسان اس کے حساس ہونے اور متحرک ہونے اور جبلی الہامات اور فطری علوم قبول کرنے کے ساتھ، عقل والا اور اکتسابی علوم پیدا کرنے والا تھا تو اس کو کھیتی باڑی، باغبانی، تجارت اور معاملات کا الہام فرمایا۔ اور ان میں سے بعض کو فطری طور پر یا اتفاق سے آقا بنایا، اور بعض کو فطری طور پر یا اتفاق سے غلام بنایا۔ اور بعض کو بادشاہ اور بعض کو رعایا بنایا، اور بعض کو ایسا دانشمند بنایا، جو حکمت الٰہیہ، علم طبیعی، علم ریاضی اور حکمت عملیہ میں گفتگو کرتا ہے اور بعض کو ایسا غبی بنایا جو ان علوم کی راہ نہیں پاتا مگر ایک طرح کی تقلید سے، اور اسی وجہ سے دیکھیں گے آپ لوگوں کے مختلف گروہوں کو، بادیہ نشینوں میں سے اور شہریوں میں سے، ان باتوں پر متفق (باقی ترجمہ آگے آرہا ہے)

تشریح:

(۱) ''فطری طور پر یا اتفاق سے'' یعنی کسی میں آقا بننے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے، وہ باکمال، صاحب ثروت اور فہم وبصیرت کا مالک ہوتا ہے، اور کسی کو ان باتوں میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا مگر اتفاق سے وہ آقا کا لڑکا ہوتا ہے، اس لئے آقا بن جاتا ہے۔

اسی طرح کسی میں فطری طور پر غلام بننے ہی کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ ماتحت ہی بن سکتا ہے، بالا دست نہیں ہوسکتا اور کوئی اتفاق سے یعنی کسی جنگ میں گرفتار ہونے کی وجہ سے یا غلام نژاد ہونے کی وجہ سے غلام بن جاتا ہے۔

(۲) علم الٰہی (الٰہیات) وہ حکمت نظری ہے جس میں ایسے موجودات واقعیہ کے احوال سے بحث کی جاتی ہے، جن کو وجود میں لانا ہمارے بس کی بات نہیں، اور وہ دونوں وجودوں (وجود خارجی اور وجود ذہنی) میں مادہ کے محتاج نہیں ہوتے، جیسے اللہ تعالیٰ، کہ وہ خارج میں بھی بلا مادہ موجود ہیں اور جب ان کا تصور کیا جاتا ہے تو بھی بلا مادہ ہوتا ہے (مزید تفصیل کے لئے معین الفلسفہ ص ۳۵ دیکھیں)

(۳) علم طبیعی: وہ حکمت نظری ہے جس میں ایسے موجودات واقعیہ کے احوال سے بحث کی جاتی ہے، جن کو وجود پذیر کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے اور وہ چیزیں دونوں وجودوں میں مادہ کی محتاج ہوتی ہیں۔ جیسے انسان، کہ اگر خارج میں پایا جائے گا تو گوشت پوست اور ہڈیوں کی مخصوص شکل میں ہوگا، اور اگر اس کا تصور کیا جائے گا تو بھی اسی شکل میں ہوگا، مادہ سے مجرد کرکے ہم انسان کا تصور نہیں کرسکتے۔ یہی حال تمام اشیائے کونیہ اور مرکبات عنصریہ کا ہے (معین الفلسفہ ص ۳۳)

(۴) علم ریاضی: وہ حکمت نظری ہے جس میں ایسے موجودات واقعیہ سے بحث کی جاتی ہے، جن کو موجود کرنا ہماری قدرت واختیار میں نہیں ہے اور وہ چیزیں وجود ذہنی میں تو کسی مخصوص مادہ کی محتاج نہیں، مگر وجود خارجی میں مخصوص مادہ کی محتاج ہیں، جیسے اعداد اور علم ہندسہ کی اشکال، کہ ان کا تصور تو مخصوص مادہ کے بغیر کیا جاسکتا ہے، مگر خارج میں مادہ کے بغیر موجود نہیں ہوسکتیں (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں معین الفلسفہ ص ۳۴)

(۵) حکمت عملیہ: جن موجودات حقیقیہ کو وجود پذیر کرنا ہماری قدرت اور اختیار میں ہے، ان کے واقعی احوال کو اس حیثیت سے جاننا کہ ان پر عمل کرنے سے ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے گی، حکمت عملیہ ہے، جیسے اعمال شرعیہ: نماز، روزہ وغیرہ اور افعال حسنہ اور سیئہ کی معرفت اور ان پر عمل پیرا ہونا۔ پھر حکمت عملیہ کی تین قسمیں ہیں: تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ (تفصیل کے لئے دیکھیں معین الفلسفہ ص ۳۲)

باقی ترجمہ: اور یہ سب تفصیل ان خصوصیات کی اور تدابیر ظاہرہ کی ہے، جس کا تعلق انسان کی قوت بہیمیہ سے اور اس کی دنیوی تدبیراتِ نافعہ سے ہے۔ اور جان لیجئے کہ انسان، حیوانات کی دیگر اقسام کی طرح نہیں، بلکہ اس کو حیوانات کے ادراک سے بہتر ادراک حاصل ہے۔

اور انسان کے اُن علوم میں سے، جن پر اس کے اکثر افراد متفق ہیں، علاوہ اس شخص کے جس کے مادّہ نے اس کی نوع کے احکام کی نافرمانی کی ہے[1] (بعض یہ ہیں:)

(۱) اپنی ایجاد اور تربیت کے سبب کے بارے میں سوال کرنا۔

(۲) مدبر عالم کے ثبوت سے واقف کرنا، جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور روزی پہنچا رہا ہے۔

(۳) اور اپنے پیدا کرنے والے اور تدبیر کرنے والے کے سامنے، پوری توجہ اور علم سے عاجزی کرنا، جس طرح دائمی اور ابدی طور پر زبان حال سے وہ خود بھی اور اس کی جنس کے تمام بیٹے (یعنی تمام حیوانات) عاجزی کرتے رہتے ہیں، اور یہی مطلب ہے اس ارشاد باری تعالیٰ کا کہ:

''کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہیں، جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور سورج اور چاند، اور ستارے اور پہاڑ، اور درخت، اور چوپائے اور بہت سے انسان، اور بہت سوں پر عذاب ثابت ہو گیا۔''

کیا یہ بات نہیں ہے کہ درخت کا ہر جزء، خواہ ٹہنی ہو، یا پتہ، یا پھول: دائمی اور ابدی طور پر، اپنا ہاتھ پسارے ہوئے ہے اس نفس نباتیہ کے سامنے جو درخت کی تدبیر کرتا ہے؟ پس اگر ہوتی درخت کے ہر جزء میں عقل تو وہ نفس نباتیہ کی ایسی تعریف کرتا، جو دوسرے جز کی تعریف سے مختلف ہوتی، اور اگر ہوتا ہر جزء کے لئے فہم تو چھپ جاتا زبان حال سے یہ ہاتھ پسارنا اس کے علم میں، اور وہ تکلفِ حالی پوری توجہ سے ہاتھ پسارنا ہو جاتا۔ پس یہاں سے سمجھ لیجئے کہ انسان جب تیز عقل والا تھا تو اس کا دل بھر گیا تکلفِ علمی سے، تکلفِ حالی کے مطابق۔

اور انسان کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے:

(۱) کہ نوع انسانی میں ایسا شخص ہو، جس کی خالص توجہ علوم عقلیہ کے سرچشمہ (یعنی عالم غیب) کی طرف ہو، وہ علوم کو اس سرچشمہ سے حاصل کرے، وحی سے، یا فراست سے، یا خواب سے۔ اور یہ کہ کچھ دوسرے لوگ ہوں، جو اس کامل میں رشد و برکت کے آثار تاڑ لیں۔ پس وہ اس کے منقاد ہو جائیں اُن باتوں میں جو وہ حکم دے یا روکے۔

اور انسان کے افراد میں کوئی ایسا فرد نہیں مگر وہ صلاحیت رکھتا ہے غیب کی طرف خالص توجہ کرنے کی، کسی ایسے خواب سے جس کو وہ دیکھے، یا کسی ایسے رائے سے جو وہ قائم کرے، یا کسی ایسی غیبی آواز سے جو وہ سنے، یا ایسی فراست سے جس کو وہ تاڑ لے، مگر انسانوں میں سے بعض کامل ہوتے ہیں اور بعض ناقص اور ناقص کامل کا محتاج ہوتا ہے۔

(۲) اور انسان کے لئے کچھ ایسی صفات ہیں جن کا انداز چوپایوں کی صفات کے انداز سے برتر ہے (یعنی یہ صفات چوپایوں میں نہیں پائی جاتی ہیں) جیسے خشوع، نظافت، عدالت، اور سماحت اور جیسے جبروت و ملکوت کی تجلیوں کا

---

[1] موالید کی ہر نوع میں کچھ بے کار افراد ہوتے ہیں یعنی ان میں نوع کی خصوصیات مفقود ہوتی ہے، جیسے ایک بھینس ہے مگر بانجھ ہے، ایک انسان ہے مگر پاگل ہے، ایسے افراد کو نکالنے کے لئے شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ مخصوص تعبیر ہے ۱۲

ظاہر ہونا یعنی دعا کی قبولیت اور دیگر کرامات واحوال ومقامات۔

تشریح:

(۱) خشوع یعنی اللہ کے سامنے نیاز مندی۔ نظافت یعنی پاکی، عدالت یعنی انصاف اور سماحت یعنی عالی ظرفی، یہ چار صفات انسان کی مخصوص صفات ہیں۔ ان کی پوری وضاحت مبحث رابع کے باب رابع (رحمۃ اللہ ۱: ۵۴۰) میں ہے۔

(۲) جبروت: اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلقات رکھنے والے معاملات، ملکوت: فرشتوں سے تعلق رکھنے والے معاملات، ناسوت: ناس یعنی انسان سے تعلق رکھنے والے معاملات۔ مقامات واحوال: احسان (تصوف) کے ثمرات ونتائج، جیسے اللہ کی محبت، اللہ پر اعتماد کلی وغیرہ جن کی تفصیل جلد دوم میں ابواب الاحسان کے تحت المقامات والأحوال کے عنوان سے آرہی ہے (دیکھیں رحمۃ اللہ ۴: ۴۱۲-۵۱۴)

(۳) انسان کی ماہیت حیوان ناطق ہے۔ اس میں حیوان جنس ہے، پس جو مخلوقات حیوانیت میں شریک ہیں وہ سب انسان کی جنس کے بیٹے ہیں۔ اور ناطق فصل ہے، جو نوع بناتی ہے، پس جتنے افراد ناطق ہیں وہ سب انسان کی نوع کے بیٹے ہیں، اول کو ''ابنائے جنس'' اور دوم کو ''ابنائے نوع'' کہتے ہیں۔

لغات:

فَتَشَ وَفَتَّشَ عنه: سوال کرنا، بحث کرنا...... نَبَّهَهُ: واقف کرنا، جتلانا ...... ذَكِيٌّ (صفت) تیز ذَكِي يَذْكى ذَكَاءً: تیز خاطر ہونا...... خَلَصَ (ن) خُلُوْصًا: خالص ہونا تخلَّصَ من كذا إلى كذا: منتقل ہونا...... تفرَّسَ: علامات سے کوئی چیز پہچاننا...... هَتِيْفٌ: فَعِيْلٌ بمعنی فَاعِلٌ، هَاتِفٌ (اسم فاعل) جس کی آواز سنائی دے، اور بولنے والا دکھلائی نہ دے...... فطن (ن س ک) ادراک کرنا، سمجھنا...... جلَّ جَلَالًا: بڑے مرتبہ والا ہونا۔

تصحیح: له قوةُ التخلُّص مطبوعہ نسخہ میں للتخلُّص تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

انسانی امتیازات کا خلاصہ

انسان کی امتیازی صفات، جن کی وجہ سے وہ دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، بہت ہیں، مگر ان کا خلاصہ اور نچوڑ دو باتیں ہیں (۱) قوت عقلیہ کی فراوانی (۲) اور قوت عملیہ کی برتری، پھر ہر ایک کے دو دو پہلو ہیں، تفصیل درج ذیل ہے:

① قوت عقلیہ کی زیادتی: قوت عقلیہ اللہ نے ہر حیوان کو دی ہے، تمام جانور اپنا نفع ونقصان سمجھتے ہیں، بھینس چرتے چرتے کوئی گھاس چھوڑ دیتی ہے، وہ جانتی ہے کہ وہ گھاس اس کے کھانے کی نہیں، مگر انسان کو اللہ تعالیٰ نے قوت عقلیہ وافر مقدار میں بخشی ہے اور یہی اس کا امتیاز ہے پھر انسان کی قوت عقلیہ کے دو پہلو ہیں:

(الف) عقل معاش: یعنی دنیوی عقل، یہ وہ عقل ہے جو دنیا کے گورکھ دھندوں میں لگی رہتی ہے، ہر وقت راحت رسانی کے سامان ایجاد کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہے، اور ارتفاقات کی باریکیاں تلاش کرتی رہتی ہے یعنی نت نئی ایجادات کی دُھن میں لگی رہتی ہے۔

(ب) عقل معاد: یعنی اخروی عقل، یہ وہ عقل ہے جو علوم شرعیہ میں مشغول رہتی ہے۔ یہ علوم اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو اس کی اخروی بھلائی کے لئے بخشے ہیں۔

نوٹ: انسان کا کمال عقل کے دونوں پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلنا ہے، عقل کو صرف دنیا کے پیچھے لگا دینا کسی طرح قرین عقل نہیں۔

(۲) قوت عملیہ کی برتری: اللہ تعالیٰ نے انسان کو حیوانات سے کچھ زائد قوت عمل نہیں دی، ہاتھی، گھوڑے، بیل، جھوٹے انسان سے زائد کام کرتے ہیں، بلکہ انسان کا امتیاز قوت عملی کی برتری، فوقیت اور مزیت ہے۔ قوت عملی کے بھی دو پہلو ہیں:

(الف) انسان کا اختیار وارادہ کے گلے کی راہ سے اعمال کو نگل لینا —— انسان اور جانوروں کے اعمال میں فرق یہ ہے کہ حیوانات اپنے کئے ہوئے اعمال کے اثرات کو قبول نہیں کرتے، ان کے اعمال ان کے نفس کی تھاہ میں نہیں پہنچتے، نہ ان کے نفوس اعمال کی روح سے رنگین ہوتے ہیں۔ اور انسان اپنے کئے ہوئے اعمال کا عرق نچوڑ کر پی لیتا ہے، اس کا دل اس کے اعمال سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جانور ایک ہی غلطی بار بار کرتا ہے، اور انسان ایک بار غلطی کرنے کے بعد سنبھل جاتا ہے مثلاً بھینس بھڑک جاتی ہے اور اپنی جولانی میں کسی کو زخمی کر دیتی ہے یا مار دیتی ہے تو اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، چنانچہ وہ یہی غلطی دوبارہ کر سکتی ہے۔ مگر انسان سے اگر یہ غلطی ہو جائے تو وہ نہایت پشیمان ہوتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ وہ آئندہ کبھی یہ غلطی نہیں کرے گا۔

یہی حال اعمال صالحہ کا ہے، جانور کو کسی بھی عمل صالح سے خوشی نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے دل نے اس عمل کا اثر قبول نہیں کیا، ایک شیر نے ایک صحابی کو اپنی پشت پر بٹھا کر قافلہ تک پہنچا دیا تھا، مگر وہ اپنے اس کارنامہ کی اہمیت سے ناواقف تھا، اگر یہی کارنامہ کوئی انسان انجام دیتا تو پھولا نہ سماتا، بلکہ وہ کارنامہ اس کی سوانح میں لکھا جاتا۔

غرض حیوانات کے اعمال وجود پذیر ہو کر روح ہوائی یعنی نسمہ کے قُویٰ سے چپک جاتے ہیں، پھر فنا ہو جاتے ہیں، اس لئے وہی عمل دوبارہ کرنے میں حیوان کو کوئی باک محسوس نہیں ہوتا۔ اور انسان کے اعمال بھی اگرچہ وجود پذیر ہو کر ختم ہو جاتے ہیں مگر ان کی روح نفس پی لیتا ہے اس لئے اچھے اعمال سے نفس میں نور، اور برے اعمال سے نفس میں تاریکیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد دفع دخل مقدر کے طور پر ایک سوال کا جواب ہے۔

سوال: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حیوانات کے اعمال اور انسان کے اعمال میں جو فرق بیان کیا ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ انسان کو اس کے ہر عمل پر جزاء یا سزا ملے، خواہ اس نے وہ فعل اختیار وارادہ سے کیا ہو یا جبر واکراہ سے، یا بھول چوک سے، کیونکہ اس کے ہر فعل کی روح اور اسپرٹ نفس میں ضرور پہنچتی ہے، اس لئے کہ یہی انسانی اعمال کا امتیاز ہے، حالانکہ روایات میں صراحت ہے کہ بھول سے یا چوک سے یا اکراہ سے جو کام کرایا جاتا ہے اس پر مؤاخذہ نہیں، مؤاخذہ کے لئے شرط ہے کہ انسان نے وہ عمل ارادہ واختیار سے کیا ہو۔

جواب: پہلے دو باتوں میں فرق سمجھ لیں۔ ایک ہے کسی چیز کا فی نفسہ حکم، دوسری ہے اس چیز کا ثمرہ اور نتیجہ، جیسے طعام وشراب کی فی نفسہ خاصیت شکم سیر کرنا اور سیراب کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ کھانے پینے سے کب روزہ ٹوٹے گا اور کب نہیں ٹوٹے گا؟ یہ طعام وشراب کا نتیجہ ہے، شریعت نے روزہ ٹوٹنے کے لئے تعمُّد کو شرط قرار دیا ہے، پس ناسیًا کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر شکم سیر اور سیراب تو اس صورت میں بھی ہو جاتا ہے۔ یعنی جو طعام وشراب کا فی نفسہ حکم ہے وہ تو پایا جائے گا۔

دوسری مثال: اطباء کہتے ہیں کہ زہر جان ستاں ہے اور تریاق نفع بخش ہے یعنی اس سے سانپ کا کاٹا اچھا ہو جاتا ہے، یہ ان دونوں چیزوں کی فی نفسہ تاثیر کا بیان ہے، مگر ان کا ثمرہ ظاہر ہونے کے لئے اُن کا کھانا پینا شرط ہے شیشی میں رکھے ہوئے زہر سے کوئی نہیں مرتا، اور کٹورے میں دھرے تریاق سے کوئی سانپ کا کاٹا شفایاب نہیں ہوتا، مگر زہر کی فی نفسہ زہرناکی اور تریاق کا فی نفسہ نافع ہونا ان کے کھانے پینے پر موقوف نہیں۔

اسی طرح اعمالِ انسانی کی فی نفسہ تاثیرات وہ ہیں جو اوپر بیان کی گئیں۔ رہی یہ بات کہ ان پر کب مؤاخذہ ہوگا اور کب نہیں ہوگا؟ اس کے لئے شریعت نے شرط لگائی ہے کہ جب انسان ان کو ارادہ واختیار سے کرے گا تب مؤاخذہ ہوگا، ورنہ نہیں، مگر اعمال کی اپنی تاثیرات تو مؤاخذہ نہ ہونے کی صورت میں بھی موجود ہونگی، مگر شریعت نے کسی مصلحت سے مؤاخذہ اٹھا دیا۔ (جواب پورا ہوا)

اور اوپر جو حیوانات اور انسان کے اعمال کے درمیان فرق بیان کیا گیا ہے اس کی واضح نشانی یہ ہے کہ ساری دنیا کے لوگ عبادتوں اور ریاضتوں کے قائل ہیں، کیونکہ وہ وجدانی طور پر ان کے انوار محسوس کرتے ہیں، اسی طرح معاصی اور منہیات سے احتراز کے بھی قائل ہیں۔ کیونکہ وہ وجدانی طور پر گناہوں کی سختی دل میں محسوس کرتے ہیں، پس ثابت ہوا کہ اعمالِ انسانی کا اثر درون پر پڑتا ہے، کیونکہ تمام لوگوں کا اتفاق بلاوجہ نہیں ہوسکتا۔

(ب) انسان اپنی قوتِ عملیہ سے جو عبادتیں اور ریاضتیں کرتا ہے، اس سے احوالِ رفیعہ پیدا ہوتے ہیں جیسے اللہ کی محبت، اللہ پر اعتماد کا بڑھنا اور حیوانات کے اعمال سے اس قسم کے مطلق اثرات پیدا نہیں ہوتے۔ یہ انسان کی قوتِ عمل کی برتری ہے۔

والأمورُ التي يمتازُ بها الإنسانُ، من سائر أفرادِ الحيوان، كثيرةٌ جدًّا، لكنَّ جمَاعَ الأمر وملاكه خصلتان:

أحدهما: زيادة القوة العقلية؛ ولها شُعبتان:

[۱] شعبةٌ غائصة في الارتفاقات لمصلحة نظام البشر، واستنباط دقائقها.

[۲] وشعبة مستعدَّة للعلوم الغَيْبِيَّة، الفائضةِ بطريق الوهب.

وثانيهما: براعة القوة العملية؛ ولها أيضاً شعبتان:

[۱] شعبة: هي ابتلاعُها للأعمال من طريق بُلعوم اختيارها وإرادتها؛ فالبهائمُ تفعل أفعالاً بالاختيار، ولا تدخل أفعالُها في جَذْر أنفسها، ولا تتلوَّن أنفُسُهَا بأرواح تلك الأفعال، وإنما تَلْتَصِقُ بالقُوى القائمة بالروح الهوائي فقط، فيسهل عليها صدورُ أمثالِها؛ والإنسان يفعل أفعالاً، فَتفْنَى الأفعال، وتُنزع منها أرواحُها، فَتَبْلَعُهَا النفسُ، فيظهر في النفس: إما نور، وإما ظُلمة.

وقولُ الشرع: شرطُ المؤاخذة على الأفعال: أن يفعلَها بالاختيار بمنزلة قول الطبيب: شرطُ التَّضَرُّر بالسَّمِّ، والانتفاع بالترياق أن يَدْخُلافي الْبُلعوم، وينزلافي الجوف.

وأمارةُ ماقلنا: من أن النفس الإنسانية تَبْلَعُ أرواحَ الأعمال : ما اتفق عليه أُمَمُ بني آدم: من عمل الرياضات والعبادات، ومعرفةِ أنوارِ كلِّ ذلك وِجدانًا، ومن الكفِّ عن المعاصي والمنهيات، ورؤيةِ قَسوةِ كلِّ ذلك وجدانا.

[۲] وشعبةٌ: هي أحوال ومقامات سَنِيَّة، كَمَحبة الله، والتوكلِ عليه، مما ليس في البهائم جنسِهَا.

ترجمہ: اور وہ باتیں جن کی وجہ سے انسان، حیوان کے دیگر افراد سے ممتاز ہوتا ہے، بہت زیادہ ہیں، مگر ان کا خلاصہ اور نچوڑ دو باتیں ہیں:

ان میں سے ایک: قوت عقلیہ کی زیادتی ہے، اور اس کی دو شاخیں ہیں:

ایک شاخ: انسانوں کے نظام کی مصلحت کے لئے تدبیرات نافعہ میں، اور اس کی باریکیاں مستنبط کرنے میں ڈوبنے والی ہے۔

اور دوسری شاخ: ان علوم غیبیہ (علوم دینیہ) کے لئے مستعد ہے، جن کا فیضان بطور بخشش ہوتا ہے۔

اور ان میں سے دوسری: قوت عملیہ کی برتری ہے، اور اس کی بھی دو شاخیں ہیں:

ایک شاخ: قوت عملیہ کا اعمال کو نگلنا ہے، اپنے اختیار اور اپنے ارادے کے گلے کی راہ سے، پس چوپائے اختیار سے

اعمال کرتے ہیں اوران کے اعمال ان کے نفس کی جڑ میں داخل نہیں ہوتے، اوران کے نفوس اُن اعمال کی روح سے رنگین نہیں ہوتے۔ وہ اعمال بس اُن قُوی کے ساتھ چپک جاتے ہیں جوفقط روح ہوائی (نسمہ) کے ساتھ قائم ہیں (حیوانات میں روح ربانی نہیں) چنانچہ اُن سے ان کے مانند افعال کا صادر ہونا آسان ہوجاتا ہے۔ اورانسان بھی اعمال کرتا ہے، پس وہ فنا ہوجاتے ہیں، اوران میں سے اسپرٹ کھینچ لی جاتی ہے، پس اس کونفس نگل لیتا ہے، چنانچہ نفس میں یا تو نور یا تاریکی ظاہر ہوتی ہیں۔

اورشریعت کا ارشاد کہ: ''اعمال پر مواخذہ کے لئے شرط یہ ہے کہ آدمی نے وہ اعمال اختیار سے کئے ہوں'' یہ قول طبیب کے اِس قول جیسا ہے کہ: ''زہر سے نقصان پہنچنے کے لئے، اور تریاق سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں گلے میں داخل ہوں اور پیٹ میں اتریں''

اوراس بات کی نشانی جوہم نے کہی کہ: ''انسان کا نفس اعمال کی روح کونگل لیتا ہے'' وہ ہے جس پر انسانوں کے تمام گروہوں نے اتفاق کیا ہے یعنی ریاضتیں اورعبادتیں کرنا، اور وجدان سے ان میں سے ہرایک کے انوار کو پہچاننا، اور گناہوں اورممنوعات سے رکنا اور وجدان سے ان میں سے ہرایک کی تختی کو دیکھنا۔

اوردوسری شاخ: وہ بلند احوال ومقامات ہیں، جیسے اللہ کی محبت اور اللہ پر بھروسہ، اُن احوال میں سے جو چوپایوں میں مطلق نہیں پائے جاتے۔

لغات:

الجِمَاع (مصدر) جامع، ہرچیز کی جڑ حدیث میں ہے الخَمر جِمَاع الإثم: شراب گناہ کی جڑ بنیاد ہے ...... مِلَاكُ الأمر: سہارا، سرمایہ ...... غَاصَ یغوص غَوْصًا فی الماء: پانی میں غوطہ لگانا ...... بَرَعَ (ن س ک) بَرَاعَة: علم یا فضیلت یا جمال میں کامل ہونا ...... بَلَعَ (ف) بَلْعًا وابتَلَعَ الشیئَ: نگلنا ...... البُلْعُم والبُلْعُوم: حلق جمع بَلَاعِمٌ، بَلْعَمَ اللقمة: نگلنا ...... فَنِیَ وفَنَی یَفْنَی فَنَاءً: معدوم ہونا ...... السَّنِیُّ: عالی مرتبہ مؤنث سَنِیَّةٌ، سَنِیَ (س) سَنَاءً: بلند مرتبہ ہونا ...... ظُلْمَة: تاریکی ...... تَضَرُّرَ: نقصان پہنچنا ...... أمَارَةُ مبتدا ما اتفق خبر ...... جنسها بهائم سے بدل ہے یعنی بهائم میں یہ باتیں مطلق نہیں پائی جاتیں۔

تصحیح: وإما ظلمة مطبوعہ نسخہ میں وإما ظُلَم (جمع) ہے تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے ...... من أن النفس الإنسانية تبلع أرواحَ الأعمال مطبوعہ نسخہ میں أن النفس الإنسانية تبلع من أرواح الأعمال تھا، یہ تصحیح بھی مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

انسان کی تربیت کے لئے شریعت ضروری ہے

کیف خَلَقَ اللهُ الخلق؟ اور کیف دَبَّرَ اللهُ الخلقَ؟ کی تفصیل گزر چکی۔ اب نیا عنوان شروع ہوتا ہے اور وہ ہے الإنسان یَحتاج فی تربیته إلى الشريعة یعنی انسان کی تربیت کے لئے ایک قانون ضروری ہے، کیونکہ انسان کے مزاج میں ایک خاص قسم کا اعتدال ہے، جو دیگر حیوانات کی بہ نسبت اکمل ہے۔ اور یہ مزاج کا اعتدال اس کی صورت نوعیہ کی دَین ہے یعنی انسان کا مزاج غایت درجہ معتدل اس لئے ہے کہ وہ ''انسان'' ہے۔

انسان کے مزاج کا یہ اعتدال چار چیزوں کا مرہون منت ہے یعنی چار باتیں پائی جائیں گی تو اس کا مزاج معتدل رہے گا، ورنہ اعتدال باقی نہ رہ سکے گا۔ وہ چار باتیں یہ ہیں:

(۱) انسان کے لئے کچھ ایسے علوم ضروری ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہوں، جن کو انبیائے کرام نے پوری توجہ سے حاصل کئے ہوں اور وہ دوسروں کو پہنچائے ہوں اور دوسروں نے ان علوم میں انبیاء کی تقلید کی ہو۔

(۲) انسان کے پاس ایسی شریعت اور قانون ہو، جو علوم ربانیہ اور معارف الٰہیہ پر مشتمل ہو، اور اس قانون میں آرام سے زندگی گزارنے کی مفید تدبیریں بھی ہوں۔

(۳) انسان کے لئے ایسے قواعد وضوابط ضروری ہیں، جو اس کے افعال اختیاریہ سے بحث کریں اور ان کو اقسام خمسہ: واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام میں تقسیم کریں، تاکہ انسان واجب، مستحب اور مباح پر درجہ بہ درجہ عمل کرے اور مکروہ اور حرام سے بچے۔

(۴) سلوک کی کچھ ابتدائی تمہیدی باتیں بھی اس کو بتلائی جائیں، جن میں احوال ومقامات کی وضاحت ہو۔

مذکورہ چاروں باتیں انسان کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور پھر اس کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں، انہی امور اربعہ سے انسان کے مزاج میں وہ اعتدال پیدا ہوگا جو اس کی صورت نوعیہ کا مقتضی ہے۔ اس لئے حکمت خداوندی میں ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم ازلی میں انسان کی قوت عقلیہ کی روزی کا سامان کریں۔ اور اس کو بہترین انسان پوری طرح متوجہ ہوکر حاصل کرے اور وہ علوم دوسروں کو پہنچائے، اور دوسرے لوگ ان علوم میں اس کی پیروی کریں یعنی سلسلۂ نبوت کا آغاز کیا جائے اور مذکورہ علوم نازل کئے جائیں تاکہ انسان کی پرورش کا سامان ہو، غرض جس طرح شہد کی مکھیوں کے نظم وانتظام کے لئے یعسوب کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح انسانوں کے لئے نبی کی شخصیت ضروری ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی گھاس خور مخلوق پیدا کریں تو ساتھ ہی ایسی چراگاہ بھی پیدا کرنا ضروری ہے جس میں وافر مقدار میں گھاس موجود ہو ایسی چراگاہ کے بغیر اس حیوان کی تربیت ناممکن ہے، کیونکہ گھاس کے بغیر وہ مخلوق کیسے جیئے گی؟!

غرض چراگاہ کا وجود اس حیوان کی پلاننگ میں داخل ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اور اس کو ایک مخصوص قسم کی صورت نوعیہ دی، جو خاص علوم کی مقتضی ہے تو ضروری ہوا کہ اس کو مذکورہ علوم دئے جائیں، خواہ بلاواسطہ یا بالواسطہ، تاکہ وہ کمالِ مقدر حاصل کر سکے، کیونکہ ان علوم کے بغیر کمال مقدر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ غرض انسان کی پلاننگ میں اُن علوم کا دیا جانا بھی شامل ہے اور ان علوم پر عمل کرنے ہی کا نام ''تکلیف شرعی'' ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان کا مکلف ہونا اس کی پلاننگ کا ایک جزء ہے۔

واعلم أنه لما كان اعتدالُ مزاج الإنسان بحَسب ماتعطيه الصورةُ النوعيةُ، لايَتِمُّ إلا:

[۱] بعلوم يتخلص إليها أزكاهم، ثم يقلِّده الآخرون.

[۲] وبشريعة تشتمل على معارفَ إلٰهيةٍ، وتدبيراتٍ ارتفاقية؛

[۳] وقواعدَ تبحثُ عن الأعمال الاختيارية، وتُقَسِّمُهَا إلى الأقسام الخمسة: من الواجب، والمندوب إليه، والمباح، والمكروه، والحرام.

[٤] ومقدِّماتٍ تُبيِّن مقامات الإحسان.

وجب في حكمة الله تعالى، ورحمته، أن يُهَيِّئَ في غيب قدسه رزقَ قُوَّته العقلية، يخلُص إليه أزكاهم، فيتلقاه من هنالك، وينقاد له سائر الناس، بمنزلة ما ترى في نوع النحل من يعسوبٍ يدبِّر لسائر أفرادها.

لولا هذا التلقِّي بواسطة، ولابواسطة، لم يَكْمَلْ كمالُه المكتوبُ له؛ فكما أن المستبصر إذا رأى نوعا من أنواع الحيوان لايَتَعَيَّش إلا بالحشيش، استَيْقَنَ أن الله دَبَّرَ له مرعىً، فيه حشيش كثير، فكذلك المستبصر في صُنع الله يَستَيْقِنُ أن هنالك طائفةً من العلوم، يَسُدُّبها العقلُ خَلَّته، فيكمل كمالُه المكتوبُ له.

ترجمہ: اور جان لیجئے کہ جب صورت نوعیہ کی دَین کے موافق انسان کے مزاج کا اعتدال تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا تھا مگر:

(۱) ایسے علوم کے ذریعہ جن کی طرف انسانوں میں سے نہایت ستھرا انسان پوری طرح متوجہ ہو، پھر دوسرے اس کی پیروی کریں۔

(۲) اور ایسی شریعت کے ذریعہ جو معارف ربانیہ اور تدبیرات نافعہ پر مشتمل ہو۔

(۳) اور ایسے قوانین کے ذریعہ جو انسان کے اعمال اختیاریہ سے بحث کریں، اور ان کو اقسام خمسہ: واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام کی طرف تقسیم کریں۔

(۴) اور ایسی تمہیدی باتوں کے ذریعہ جو سلوک کے مقامات کی وضاحت کریں۔

تو حکمتِ خداوندی اور مہرالٰہی میں ضروری ہوا کہ وہ اپنی ذات مقدسہ کے علم ازلی میں انسان کی قوت عقلیہ کی روزی کا سامان کریں، جس کی طرف انسانوں میں سے پاکیزہ ترین شخصیت پوری توجہ کرے، پس اس کو وہاں سے حاصل کرے، اور تمام لوگ اس شخصیت کی تابعداری کریں؛ جیسے آپ دیکھتے ہیں شہد کی مکھیوں میں کہ یعسوب کا ہونا ضروری ہے، جو اس کے تمام افراد کا نظم وانتظام کرے۔

اگر نہ ہوتا یہ علوم کا حاصل کرنا، بالواسطہ یا بلاواسطہ، تو نہ پورا ہوتا انسان کا وہ کمال جو اس کے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ پس جس طرح یہ بات ہے کہ جب کوئی غور وفکر کرنے والا، حیوانات کی انواع میں سے کسی نوع کو دیکھتا ہے کہ وہ گھاس کھائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ضرور کسی ایسی چراگاہ کا انتظام کیا ہوگا، جس میں وافر مقدار میں گھاس موجود ہو، پس اسی طرح اللہ تعالیٰ کی کاریگری میں غور وفکر کرنے والا یقین کرتا ہے کہ وہاں (یعنی نفس الامر میں) علوم کا ایک حصہ ہے، جس سے عقل اپنی حاجت روائی کر سکتی ہے، اور اُس کا وہ کمال تکمیل پذیر ہو سکتا ہے جو اس کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

لغات:

حَسَب: اندازہ، کسی چیز کی مقدار یا تعداد جیسے **الأجر بحَسَب العمل**، اور کہا جاتا ہے **هذا بحَسَب ذلك**: یہ اس کے موافق ہے اسی طرح **حَسَبَمَا ذکر** میں بھی یہی لفظ ہے، اردو میں بھی حَسَبِ حال کہتے ہیں، طلبہ کبھی سین پر جزم پڑھ ڈالتے ہیں یہ غلطی ہے...... **تَخلَّص إلى كذا**: منتقل ہونا **خَلَصَ** (ن) **خُلُوْصًا إلى المكان**: پہنچنا...... **سَدَّ** (ن) **سَدًّا الثُلْمَةَ**: رخنہ درست کرنا **سَدَّ الباب**: دروازہ بند کرنا ...... **الخَلَّة** حاجت جمع **خِلاَلٌ** اور **خَلَلٌ**۔

تشریح:

(۱) **بشريعةٍ** کا عطف **بعلوم** پر باعادۂ حرف جر ہے اور **قواعدَ** اور **مقدِّمَاتٍ** کا عطف بھی اسی پر حرف جر کا اعادہ کئے بغیر ہے۔

(۲) **وَجَبَ إلخ لما کان** کی جزاء ہے۔

(۳) بالواسطہ علوم کی تلقی کرنے والے: انبیاء کی امتیں ہیں اور بلاواسطہ تلقّی کرنے والے خود انبیاء کرام ہیں۔ انبیائے کرام خود اپنی شریعتوں پر عمل کرنے کے مکلف ہوتے ہیں۔

(۴) **تُقَسِّمُهَا** میں **هي** ضمیر مستتر قواعد کی طرف، اور **ها** ضمیر **الأعمال** کی طرف راجع ہے۔

تصحیح: مطبوعہ نسخہ میں **تدبیرات إتفاقية** اور **مقامات للإحسان** تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆   ☆

انسان کی تربیت کے لئے پانچ علوم ضروری ہیں

انسان کی تربیت وتکمیل پانچ علوم پر موقوف ہے، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) توحید وصفات کا علم: یعنی یہ جاننا ضروری ہے کہ معبود صرف ایک ہستی ہے، بندگی اسی کا حق ہے، کوئی اور بندگی کا سزاوار نہیں اور اُس معبود میں یہ یہ صفات ہیں یعنی وہ ہستی اِن اِن خوبیوں کی مالک ہے اور وہ ہر طرح کے نقائص سے پاک ہے۔

اور یہ علم اس لئے ضروری ہے کہ انسان مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ خالق ہیں، مخلوق اگر خالق کو نہ پہچانے تو وہ کیا کمال حاصل کرسکتی ہے؟! اور صرف پہچاننا بھی سودمند نہیں، اپنی تمام نیازمندیاں اس کے لئے مخصوص کرنا ضروری ہے، ورنہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے سوا حاصل کیا ہوگا؟ اسی طرح صفات حُسنیٰ کا علم بھی ضروری ہے، کیونکہ انسان کی تربیت کا تعلق صفات سے بھی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو علیم وخبیر مانے گا تبھی خلوت وجلوت میں اس کے احکام کی تعمیل کرے گا۔ وہ اللہ کی رزّاقیت پر مطمئن ہونے کے بعد ہی ناخداؤں سے رشتہ توڑے گا۔ غرض صفات جاننے پر یہ بات موقوف ہے کہ بندوں کو اللہ کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کرنا چاہئے۔

مگر ذات وصفات کا علم دقیق ترین علم ہے کیونکہ انسان معنویات کو بھی محسوسات کے ذریعہ سمجھنے کا عادی ہے اور ذات وصفات وراء الوراء ہیں، محسوسات سے ان کی کوئی مشابہت نہیں، پھر انسان سمجھے تو کیسے سمجھے! مگر بہرحال ان کی معرفت بھی ضروری ہے اور ہر شخص کے لئے ضروری ہے، اس لئے قرآن وحدیث میں یہ مسئلہ نہایت وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔

پہلے دو مختصر جملوں میں ساری بات سمجھا دی ہے، فرمایا سبحان اللہ وبحمدہ (اللہ پاک ہیں اور خوبیوں کے ساتھ متصف ہیں) یعنی ان کی ذات ہر نقص وعیب اور ہر کمی سے پاک ہے، اس میں تمام صفات سلبیہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ اپنی تعریف کے ساتھ ہیں، اور تعریف اس ہستی کی جاتی ہے جو خوبیوں کے ساتھ متصف ہو، پس یہ تمام صفات ثبوتیہ کی طرف اشارہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے وہ صفات ثابت کیں، جو انسانوں میں صفات مدح سمجھی جاتی ہیں مثلاً زندگی، سننا، دیکھنا، قادر ہونا، ارادہ کرنا، بات کرنا، غصہ ہونا، ناراض ہونا، مہربانی کرنا، بادشاہ ہونا، بے نیاز ہونا وغیرہ۔ اور ساتھ ہی یہ ضابطہ سمجھا دیا کہ: ''اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں'' تاکہ اللہ کی صفات کو سمجھنے میں انسان غلطی نہ کرے، پھر اس ''مانند نہ ہونے'' کو بھی کھول کر سمجھایا کہ وہ جانتے بیشک ہیں، مگر ان کا جاننا ہمارے جاننے کی طرح نہیں۔ وہ بارش کے قطروں کی گنتی، بیابان کے ریت کی تعداد، درختوں کے پتوں کا شمار اور حیوانات کے سانسوں کی گنتی بھی جانتے ہیں۔ وہ دیکھتے ضرور

ہیں، مگر ان کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، وہ تاریک رات میں چیونٹی کے رینگنے کو بھی دیکھتے ہیں، وہ سنتے یقیناً ہیں مگر ان کا سننا ہمارے سننے کی طرح نہیں، وہ کواڑ بھڑے ہوئے کمروں میں لحافوں کے نیچے دلوں کی دھڑکن کو بھی سنتے ہیں۔ اسی طرح دیگر صفات میں بھی عدم مماثلت واضح فرمادی تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات جیسا نہ سمجھ بیٹھے۔ شرک کی دلدل یہیں سے شروع ہوتی ہے، مشرکین اللہ کی صفات کا کما حقہ ادراک نہیں رکھتے، اس لئے وہ شرک کی گندگی میں مبتلا ہیں۔

(۲) عبادتوں کا علم: یعنی بندوں کو پروردگار کی بندگی کس طرح کرنی چاہئے؟ اس کی درست صورتیں کیا ہیں؟ اور غلط طریقے کیا ہیں؟ کیونکہ غلط طریقوں سے بندگی کرنے سے، بجائے قرب کے دوری پیدا ہوتی ہے۔

(۳) تدبیرات نافعہ کا علم: انسان کو اللہ کی بندگی اور آخرت کے کاموں کے لئے پیدا کیا گیا ہے، مگر اسے ایک وقت تک دنیا میں رہنا ہے اس لئے ارتفاقات کا علم بھی ضروری ہے، جیسے مدارس عربیہ کے طلبہ کا مقصدِ حیات دین پڑھ کر دین کی خدمت کرنا ہے، مگر ان کو دنیا سے بھی سابقہ پڑتا ہے، اس لئے ضروری دنیوی علوم، بالخصوص رائج زبانوں کا علم ضروری ہے، تاکہ دنیوی زندگی میں ان کو کسی الجھن سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

(۴) استدلال کا علم: یعنی جب کسی اسلامی مسئلہ میں معمولی لوگوں کو شبہات پیش آئیں اور وہ اسلام پر اعتراضات کریں تو ان کی عقدہ کشائی کیسے کی جائے؟ قرآن کریم میں مشرکین، یہود، نصاری اور منافقین کے شکوک وشبہات کا قلع قمع کیا گیا ہے۔ یہ استدلال کا علم بھی انسان کے لئے ضروری ہے۔

(۵) پند وموعظت کا علم: لوہے کی طرح دل بھی زنگ آلود ہوتا ہے، دنیا کی مشغولیتوں سے دل سخت ہوجاتا ہے، اس لئے وقتاً فوقتاً پند وموعظت ضروری ہے، قرآن بھی درمیان درمیان کلام میں یہ کام کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی وقفہ وقفہ سے وعظ کہتے تھے اور پند وموعظت تین قسم کے مضامین سے کی جانی چاہئے:

(۱) انسان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جائیں۔ مشہور مقولہ ہے الإنسان عبد الإحسان یعنی احسان مند ہونا انسان کی خصوصیت ہے اس لئے جب اس کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جائیں گی تو اس میں ضرور شکرگزاری کا جذبہ پیدا ہوگا۔

(۲) وہ واقعات بیان کئے جائیں جو حق وباطل کی کشمکش کے نتیجہ میں پیش آئے ہیں، جن میں اہل حق کو نجات ملی ہے اور اہل باطل تباہ ہوئے ہیں۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا سمندر سے پار ہونا، اور فرعونیوں کے قہر وعذاب سے بچ جانا، اور فرعون کا لاؤ لشکر سمیت غرقاب ہوجانا اور صفحۂ ہستی سے مٹ جانا۔ غرض اس قسم کے واقعات بھی پند وموعظت میں مفید ہیں، کیونکہ انسان کے سامنے جب عواقب اعمال کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں تو اس کا دل پگھل جاتا ہے۔

(۳) مرنے کے بعد قبر میں، پھر قیامت کے میدان میں جو احوال پیش آئیں گے۔ اسی طرح جہنم اور اس کی ہولناکیوں کا تذکرہ کرنے سے بھی دل متأثر ہوتا ہے، اور آدمی میں آخرت کے لئے تیاری کرنے کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

وتلك الطائفة:

منها : علم التوحيد والصفات: ويجب أن يكون مشروحا،بشرح ينالُه العقل الإنسانى بطبيعته، لامُغْلَقا لاينالُه إلا من يَنْدُرُ وجودُ مثلِه؛ فَشَرَح هذا العلمَ بالمعرفة المشارِ إليها بقوله: "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" فأثبت لنفسه صفاتٍ يعرفونها ويستعملونها بينهم: من الحياة والسمع، والبصر، والقدرة، والإرادة، والكلام، والغضب،والسُّخْط، والرحمة، والْمُلك، والْغِنى؛ وأثبت مع ذلك: أنه ليس كمثله شيئ فى هذه الصفات، فهو حَيٌّ لاكحياتنا، بصير لاكبصرنا،قدير لاكقدرتنا، مريد لاكإرادتنا، متكلم لاككلامنا، ونحوُ ذلك؛ ثم فُسِّر عدمُ المماثلة بأمور نَسْتَبْعِدُهَا فى جنسنا، مثلُ أن يقال: يَعلم عددَ قَطْر الأمطار، وعددَ رمل الفيافِيِّ، وعددَ أوراقِ الأشجار، وعددَ أنفاس الحيوانات، ويبصُر دَبِيْبَ النَّمل فى الليلة الظَّلْماء، ويسمع ما يُتَوَسْوَس به تحتَ اللُّحُف،فى البيوت المُغْلَقَةِ عليها أبوابُها،ونحو ذلك.

ومنها: علم العبادات.

ومنها: علم الارتفاقات.

ومنها : علم المخاصمة، أعنى: أن النفوس السِفْلية إذا تولَّدت بينها شُبُهَاتٌ، تُدافِع بها الحقَّ، كيف يُحل تلك العُقَد؟

ومنها: علم التذكير بآلاء اللّٰه، وبأيام اللّٰه، وبوقائع البرزخ والحشر.

ترجمہ:اوروہ مجموعۂ علوم یہ ہیں:

ان میں سے ایک: توحید وصفات کا علم ہے،اورضروری ہے کہ اس کی اس طرح وضاحت کی جائے کہ انسانی عقل اپنی فطری صلاحیت سے سمجھ لے، ایسا مغلق انداز بیان نہ ہو کہ جسے وہ لوگ ہی سمجھ سکیں جن کے مانند کا پایا جانا نادر ہے (یعنی شاذونادر لوگ ہی سمجھ سکیں) چنانچہ اس علم کی تشریح کی اُس معرفت کے ذریعہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے سبحان اللّٰہ وبحمدہ سے، پس اللہ نے اپنے لئے وہ صفات ثابت کیں جن کو لوگ جانتے ہیں، اور جن کو باہم استعمال کرتے ہیں یعنی زندہ ہونا، سننا، دیکھنا، قادر ہونا، ارادہ کرنا، بات کرنا، غصہ ہونا، ناراض ہونا، مہربانی کرنا، بادشاہ ہونا اور بے نیاز ہونا، اوراسی کے ساتھ ثابت کیا کہ اللہ کے مانند ان صفات میں کوئی چیز نہیں۔ پس وہ زندہ ہیں مگر ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں، وہ دیکھنے والے ہیں مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں، وہ قدرت والے ہیں مگر ہماری قدرت کی طرح نہیں، وہ ارادہ کرنے والے ہیں مگر ہمارے ارادہ کرنے کی طرح نہیں، وہ بات کرنے والے ہیں مگر ہمارے بات کرنے کی طرح نہیں، اوراس کے مانند، پھراس ''مانند نہ ہونے'' کی تفسیر کی گئی ایسی چیزوں کے ذریعہ جن کو ہم مستبعد سمجھتے ہیں

ہماری جنس میں (یعنی انسانوں میں) جیسے یہ کہا جائے کہ وہ بارش کے قطروں کی تعداد، جنگل کے ریت کے ذروں کی مقدار، درختوں کے پتوں کا شمار، اور حیوانات کے سانسوں کی گنتی جانتے ہیں۔ اور وہ تاریک رات میں چیونٹی کے رینگنے کو دیکھتے ہیں اور وہ ان باتوں کو سنتے ہیں جن کے وسوسے گزرتے ہیں، لحافوں کے نیچے، ایسے گھروں میں جن کے دروازے بھڑے ہوئے ہیں، اور اس کے مانند تعبیرات۔

اور ان میں سے ایک: عبادتوں کا علم ہے۔

اور ان میں سے ایک: تدبیرات نافعہ کا علم ہے۔

اور ان میں سے ایک: جھگڑا کرنے کا علم ہے، میری مراد یہ ہے کہ معمولی درجہ کے لوگوں کے دلوں میں جب شبہات جنم لیں، جس سے وہ حق کا مقابلہ کریں، تو ان گرہوں کو کیسے کھولا جائے؟

اور ان میں سے ایک: اللہ کی نعمتوں، اللہ کے دنوں اور برزخ اور حشر کے واقعات سے نصیحت کرنے کا علم ہے۔

تصحیح: نستبعدها فی جنسنا مطبوعہ نسخہ میں مستبعدة فی جنسنا تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

علم ازلی میں علوم خمسہ کی تعیین

اوپر جن علوم خمسہ کا ذکر آیا ہے، جو انسانوں کی تربیت کے لئے ضروری ہیں، وہ آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبیین ﷺ تک سبھی امتوں کے لئے ضروری ہیں، ہر زمانہ میں یہی علوم نازل کئے گئے ہیں، البتہ ہر زمانہ کے لوگوں کی استعداد ملحوظ رکھ کر ان کی شرح کی گئی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں چند باتوں پر نظر ڈالی:

ایک: نوع انسانی پر جو آئندہ وجود میں آنے والی ہے۔

دوسری: انسانوں کی اس استعداد پر جو ان میں برابر چلتی رہے گی، اور ایک دوسرے کا وارث ہوتا رہے گا۔

تیسری: انسانوں کی قوت ملکیہ پر، کیونکہ اس کی غذا بھی فراہم کرنی ضروری ہے۔

چوتھی: اس تدبیر پر جو انسانوں کی اصلاح کے لئے ضروری ہے، یعنی مذکورہ علوم خمسہ ضروری ہیں جن کی ہر زمانہ کی استعداد کے مطابق شرح کی گئی ہے۔

مذکورہ چاروں باتوں پر نظر ڈال کر اللہ پاک کی ذات میں مذکورہ علوم خمسہ محدود و متعین ہو کر متمثل ہو گئے یعنی یک گونہ ان کا وجود ہو گیا، علوم خمسہ کا یہی وجود اشاعرہ کی اصطلاح میں ''کلام نفسی'' کہلاتا ہے اور وہ اسی کو قدیم مانتے ہیں اور یہی اللہ کی صفت کلام ہے جو اللہ کی صفات علم و ارادہ اور قدرت کے علاوہ ہے۔

فَنَظَرَ الحقُّ تبارك وتعالى فى الأزل إلى نوع الإنسان، وإلى استِعداده الذى يَتَوَارَثُه أبناءُ النوع، ونَظَرَ إلى قوتّه الملكية، والتدبير الذى يُصْلِحُه من العلوم المشروحة حَسَبَ اسْتعداده، فتمثَّلَتْ تلك العلومُ كُلُّها فى غيب الغيب محدودةً ومُحْصَاةً؛ وهذا التمثل هو الذى يُعبر عنه الأشاعرةُ بالكلام النَّفْسِيِّ؛ وهو غير العلم، وغير الإرادة والقدرة.

ترجمہ: پس حق تبارک وتعالیٰ نے ازل میں دیکھا نوع انسانی کو، اوراس کی اُس استعداد کو جس کے وارث ہوتے رہیں گے ابنائے نوع (یعنی جو استعداد انسانوں میں مسلسل چلتی رہے گی) اوراس کی قوت ملکیہ کو دیکھا، اوراس تدبیر کو دیکھا جو نوع انسانی کی اصلاح کرنے والی ہے یعنی وہ علوم (خمسہ) جن کی (ہر زمانہ میں) انسان کی استعداد کے موافق شرح کی گئی ہے، پس وہ تمام علوم مقرر و متعین ہو کر متمثّل ہوگئے (یعنی یک گونہ موجود ہوگئے) غیب کے غیب میں (یعنی اللہ کے علم ازلی میں) اوراسی تمثّل کو اشاعرہ ''کلام نفسی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور وہ علم کے علاوہ اور ارادہ وقدرت کے علاوہ صفت ہے۔

لغات:

تَوَارَثَ القومُ: ایک دوسرے کا وارث ہونا ...... تَمَثَّلَ له الشيئُ: تصور ہونا ...... مَحْدُوْدٌ: حد کیا ہوا، احاطہ کیا ہوا ...... اَحْصَى الشيئَ: شمار کرنا۔

تشریح:

کلام نفسی وہ معنی ہیں جو متکلم کے دل میں ہوتے ہیں، جن پر الفاظ یا لکھنا یا اشارہ کرنا دلالت کرتا ہے، اخطل کہتا ہے:

إن الكلامَ لفى الفُؤَاد، وإنما جُعل اللسانُ على الفؤاد دليلا

اور اللہ تعالیٰ کی صفت کلام اور قرآن کریم کے قدیم ہونے کی بحث طویل ہے، شائقین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کی کتاب جُهْدُ الْمُقِلِّ فى تنزيهِ الْمُعِزِّ والْمُذِلِّ دیکھیں، یا علم کلام کی بڑی کتابیں دیکھیں، دستور العلماء (۳:۱۵۴) میں بھی مختصر گفتگو ہے۔



علوم خمسہ کا پہلا ظلی روحانی وجود

پھر جب کائنات کا آغاز ہوا، اور ملائکہ کی تخلیق کا وقت آیا، تو حق تعالیٰ کے علم ازلی میں یہ بات تھی کہ افراد انسان کی بہبودی کے لئے ملائکہ کا وجود ضروری ہے۔ ملائکہ کا تعلق انسانوں سے اتنا گہرا ہے جتنا ہمارے قُویٰ عقلیہ کا ہم سے۔ انسان: انسان ہی عقل وفہم سے ہے، عقل نہ رہے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ غرض جتنی اہمیت عقل وفہم کی ہے اتنی

ہی اہمیت انسان کے تعلق سے ملائکہ کی ہے چنانچہ افرادانسانی پر مہربانی فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کوکلمہ ''کن'' سے پیدا فرمایا، اوران کے سینوں میں ان علوم خمسہ کا پرتَو امانت رکھ دیا، جوعلم ازلی میں مقرر ومتعین ہوکر متمثل ہو چکے تھے، اس طرح علوم خمسہ روحانی صورت میں متصور ہوگئے۔ اوران ملائکہ کا ذکر اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الآیۃ میں آیا ہے۔ یہ آیت پہلے ملأ اعلیٰ کے باب میں گزر چکی ہے۔

ثم لما جاء وقتُ خَلْقِ الملائكة، عَلِمَ الحقُّ أن مصلحةَ أفراد الإنسان لاتَتِمُّ إلا بنفوس كريمة، نِسْبَتُهَا إلى نوع الإنسان كنسبةِ القُوى العقلية في الواحدمنا إلى نفسه، فأوجدَهم بكلمة: ﴿كُنْ﴾ بِمَحْضِ العناية بأفراد الإنسان، فأودع في صدورهم ظلاًّ من تلك العلوم المحدودة المُحْصَاةِ في غيب غيبه، فَتَصَوَّرَتْ بصورة رُوحية، وإليهم الإشارة في قوله تبارك وتعالى: ﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ﴾ الآية.

ترجمہ: پھر جب ملائکہ کی تخلیق کا وقت آیا تو حق تعالیٰ نے جانا کہ افرادانسانی کی مصلحت تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی، مگر چند ایسے نفوس کریمہ کے ذریعہ، جن کا تعلق نوع انسانی کے ساتھ ایسا ہے، جیسا ہم میں سے ایک آدمی کے قُویٰ عقلیہ کا تعلق اس کی ذات سے، پس اللہ تعالیٰ نے ان ملائکہ کو پیدا فرمایا کلمہ ''کن'' سے، محض انسان کے افراد پر مہربانی فرماتے ہوئے، پھران کے سینوں میں امانت رکھا ان علوم کے پرتَو کو، جومقرر ومتعین ہو چکے تھے غیب الغیب میں، پس وہ علوم روحانی صورت میں متصور ہوگئے، اورانہی ملائکہ کی طرف اشارہ ہے ارشاد باری تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ إلی آخر الآیۃ میں۔

لغت: تَصَوَّرَ له الشیئ: اس کے ذہن میں صورت آگئی۔

☆  

علوم خمسہ کا دوسرا روحانی وجود

پھر جب وہ ادوار آتے ہیں، جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ملتوں اور حکومتوں میں تبدیلی آئے توان علوم خمسہ کو دوسرا روحانی وجود دیا جاتا ہے اور یہ وجود مفصل ومشرح ہوتا ہے یعنی اُن ادوار کے موافق ان علوم خمسہ کی شرح وتفصیل کردی جاتی ہے، پھر وہاں سے وہ علوم ہر زمانہ کے نبی پر نازل ہوتے ہیں، جیسے خاتم النبیین ﷺ کا دور آیا تو پورا قرآن ایک ساتھ لوح محفوظ سے سمائے دنیا پر، شب قدر میں نازل کیا گیا سورۃ الدخان آیات (۳و۴) میں اس کا تذکرہ ہے یہ شریعت محمدیہ کا دوسرا روحانی وجود ہے، اسی طرح ہر پیغمبر کے زمانہ میں اس نبی کی شریعت کو پہلے دوسرا روحانی وجود بخشا جاتا ہے پھر وہ

شریعت اُس زمانہ کے پیغمبر پر نازل کی جاتی ہے۔

ثم لما جاء بعضُ القِرانَاتِ المقتَضِيَة لتغيير الدُّوَلِ والمِلَلِ، قَضٰى بوجود روحاني آخر لتلك العلوم، فصارت مشروحةً مفصلةً بحَسَب مايليقُ بتلك القِرانَات، وإليها الإشارة في قوله تعالى: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ، إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ، فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾

ترجمہ: پھر جب بعض وہ قرانات (زمانے) آتے ہیں جو ملتوں اور حکومتوں میں تبدیلی کے مقتضی ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن علوم کے ایک دوسرے روحانی وجود کا فیصلہ فرماتے ہیں، پس وہ علوم اُن قرانات کے حسب حال مفصل و مشرح ہوجاتے ہیں۔ اور انہی قرانات کی طرف اشارہ آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہیں کہ: ''بیشک ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر میں) اُتارا ہے، بیشک ہم آگاہ کرنے والے ہیں، اُس رات میں (اس میں اشارہ ہے ادوار کی طرف) ہر حکمت والا معاملہ طے ہوکر طے کیا جاتا ہے۔

تشریح:

(۱) دُوَلٌ اور دِوَلٌ جمعیں ہیں دَوْلَة کی، جس کے معنی ہیں ادلنے بدلنے والی چیز، جو کبھی ایک کے پاس ہوتو کبھی دوسرے کے پاس، جیسے مال اور حکومت وغیرہ۔ یہاں حکومتیں مراد ہیں۔ اور المِلَل جمع ہے المِلّة کی، جس کے معنی ہیں مذہب، شریعت۔

(۲) قِرانات جمع ہے قِرانَة کی علم نجوم کی اصطلاح میں جب دو ستارے ایک برج میں ایک درجہ میں جمع ہوتے ہیں تو اس اجتماع کو قِرانؔ اور نَظَر کہتے ہیں (دستور العلماء ۳: ۴۷۳ مادّہ نظرات الكواكب)

پہلے باب رابع (سنت اللہ کے بیان) میں اس پر مفصل گفتگو گزری ہے کہ علویات کے سفلیات پر اثرات پڑتے ہیں یا نہیں، شاہ صاحب رحمہ اللہ کا رجحان ثبوت کی طرف ہے قرانات کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہئے۔ حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے بھی ﴿فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ﴾ (سورۃ الواقعہ آیات ۷۵ و۷۶) کی تفسیر میں علویات کی سفلیات پر تاثیر مانی ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

''سفلیات را اگر بہر انفعال نہادہ اند، علویات را جلوۂ اِفعال دادہ اند، ہر تغیرے و انقلابے کہ در خاکدانِ زمیں رُوی دہد، منشأ آن در عالم اسباب ہمیں کواکب اند، کہ باطوار مختلفہ می آیند و می روند،

عمدہ تغیرے و مہین انقلابے کہ پس از ''انقلابِ ظہورِ قِدَم بآئینۂ حدوث'' برروئے کار آمد، نزول قرآنی است۔ نظر بریں زائچہ ایں انقلاب از جملہ زائچہا برتر باشد، ونقشۂ این اجمال کہ از اجتماع جملہ نجوم بہیئت مخصوصہ ظہور فرمودہ، از جملہ نقشہائے کہ در حوادث جلوہ گر بہا دارند احسن واعلیٰ باشد۔ بدیں وجہ نقشہ ہو دیگر حوادث کہ مقسم بہ خداوندی گردیدہ

اند، بدیں نقشہ نہ رسد، بدیں سبب موصوف بہ قسم عظیم گردیدہ'' (اسرار قرآنی ص ۴ جواب سوال دوم)

(۳) بعض لوگ ''بابرکت رات'' سے شب براءت (پندرہویں شعبان) مراد لیتے ہیں۔ یہ نہایت ضعیف اور شاذ تفسیر ہے۔ قابل اعتماد نہیں۔

(۴) المقتضية تمام نسخوں میں المقتفية تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

علوم خمسہ کا انبیاء پر نزول

علوم خمسہ کو دوسرا روحانی وجود دینے کے بعد حکمت خداوندی کسی عظیم شخصیت کے پائے جانے کا انتظار کرتی ہے، جس میں وحی قبول کرنے کی استعداد ہو، جس کی رفعت شان کا حظیرۃ القدس میں فیصلہ کیا جا چکا ہو۔ پھر جب ایسی شخصیت موجود ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برگزیدہ کر لیتے ہیں، اور اس کو اپنے کام کے لئے خاص کر لیتے ہیں اور اس پر کتاب نازل فرماتے ہیں اور لوگوں پر اس کی اطاعت ضروری قرار دیتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں سورۂ طٰہٰ آیت (۴۱) میں آیا ہے کہ: ''میں نے تم کو اپنے لئے منتخب کیا'' اور آیت (۱۳) میں فرمایا گیا ہے کہ: ''میں نے تم کو (نبی بنانے کے لئے) منتخب فرمایا ہے، پس (اس وقت) جو کچھ وحی کی جارہی ہے اس کو سن لو'' ان آیات میں یہی مضمون ہے، اور یہی معاملہ ہر نبی کے ساتھ پیش آتا ہے یعنی کارِ نبوت کے لئے اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

> ثم انتظرتْ حكمةُ الله لوجودِ رجلٍ زَكِيٍّ، يستعدُّ للوحي، قد قُضي بعلُوِّ شأنه وارتفاع مكانه، حتى إذا وُجِدَ اصْطَنَعَهُ لنفسه، واتَّخَذَه جارِحةً لإتمام مراده، وأنزل عليه كتابَه، وأوجب طاعتَه على عباده، وهو قوله تعالى لموسى عليه السلام: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾

ترجمہ: پھر حکمت خداوندی انتظار کرتی ہے کسی ایسی اچھی نشوونما پانے والی شخصیت کے وجود کا، جو وحی کے لئے تیار ہو، جس کی بلندیٔ شان اور رفعت مکانی کا فیصلہ ہو چکا ہو، یہاں تک کہ جب ایسی شخصیت پائی جاتی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ اپنے کام کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں، اور اس کو اپنی مراد کی تکمیل کے لئے عضو (وسیلہ) بنا لیتے ہیں اور اس پر اپنی کتاب نازل فرماتے ہیں۔ اور اس کی فرمانبرداری کو اپنے بندوں پر واجب کرتے ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ پاک کا یہی ارشاد ہے کہ: ''میں نے آپ کو منتخب فرمایا ہے''

باب کا خلاصہ

باب کے تفصیلی مضامین کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں مذکورہ علوم خمسہ کی تعیین: نوع انسانی پر مہربانی کی وجہ سے ہوئی ہے (۲) اور ملأ اعلیٰ کی تخلیق کا تقاضا: نوع انسانی کی حاجت وضرورت نے کیا ہے (۳) اور ادوار اور زمانے بدلنے پر نئی شریعتوں کا اصرار نوع انسانی کے احوال نے کیا ہے —— پس انسانوں کو مکلف بنانا بلا وجہ نہیں، ان کا فطری تقاضا ہے۔ اور مخلوق کے فطری تقاضوں کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہی تکلیف شرعی کی مضبوط دلیل ہے۔

اب یہ سوال کہ انسان پر نماز پڑھنا کیوں ضروری ہوا؟ اور رسول کی فرمانبرداری کیوں ضروری ہوئی؟ اور زنا، چوری وغیرہ کیوں حرام ہوئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح چوپایوں پر گھاس کھانا ضروری ہے، اور گوشت کھانا حرام ہے۔ اور درندوں پر گوشت کھانا ضروری ہے اور گھاس کھانا حرام ہے، اور شہد کی مکھیوں پر یعسوب کی اطاعت ضروری ہے، اور یہ سب باتیں فطرت کے تقاضے ہیں، اسی طرح انسان پر مذکورہ باتیں ضروری ہیں۔ وہ سب باتیں بھی انسان کی فطرت کے تقاضے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ حیوانات کارآمد علوم فطری الہامات سے حاصل کرتے ہیں، اور انسان وحی کے ذریعہ یا دوسروں کی پیروی کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، یا غور وفکر سے معلوم کر لیتا ہے۔

فما أوجب تعيينَ تلك العلومِ في غيب الغيب إلا العنايةُ بالنوع، ولا سأل الحقَّ فيضانَ نفوسِ الملأ الأعلى إلا استعدادُ النوع، ولا ألَحَّ عند القِرَانَاتِ بسؤالِ تلك الشريعة الخاصة إلا أحوالُ النوع: فللّٰه الحجةُ البالغةُ!

فإن قيل: من أين وجب على الإنسان أن يُصَلِّيَ؟ ومن أين وجب عليه أن يَنْقَادَ للرسول؟ ومن أين حَرُم عليه الزنا والسرِقَةُ؟

فالجواب: وجب عليه هذا، وحَرُم عليه ذلك، من حيث وجب على البهائم أن تَرْعَى الحشيشَ، وحرم عليه أكلُ اللحم، ووجب على السِّباع أن تأكل اللحم، ولا تَرْعَى الحشيش، ومن حيث وجب على النَّحل أن يَتَّبِع اليعسوبَ؛ إلا أن الحَيَوانَ استَوْجب تَلَقِّيَ علومِها إلهامًا جِبلِّيًّا، واستوجب الإنسانُ تَلَقِّيَ علومِه كَسْبًا ونَظَرًا، أو وحيًا، أو تقليدًا والله أعلم.

ترجمہ: پس نہیں واجب کیا غیب الغیب (یعنی علم باری تعالیٰ) میں ان علوم کی تعیین کو، مگر نوع انسانی پر مہربانی نے۔ اور حق تعالیٰ سے نہیں درخواست کی ملأ اعلیٰ کی ارواح کے فیضان کی، مگر نوع انسانی کی استعداد نے۔ اور باصرار سوال نہیں کیا مختلف ادوار میں خاص شریعتوں کا، مگر نوع انسانی کے احوال نے، پس کامل برہان اللہ ہی کے لئے ہے!

پس اگر سوال کیا جائے کہ کہاں سے انسان پر واجب ہوا کہ وہ نماز پڑھے؟ اور کہاں سے اس پر واجب ہوا کہ وہ رسول کی اطاعت کرے؟ اور کہاں سے اس پر زنا اور چوری حرام ہوئے؟

تو جواب یہ ہے کہ اس پر یہ چیز واجب، اور وہ چیز حرام ہوئی ہے، جہاں سے چوپایوں پر گھاس چرنا واجب ہوا ہے، اور ان پر گوشت کھانا حرام ہوا ہے۔ اور درندوں پر گوشت کھانا واجب ہوا ہے اور یہ بات ضروری ہوئی ہے کہ وہ گھاس نہ چریں، اور جہاں سے شہد کی مکھیوں پر واجب ہوا ہے کہ وہ اپنے سردار کی اتباع کریں۔ البتہ حیوان جبلی الہام سے اپنے علوم کو حاصل کرنے کا مستحق ہوجاتا ہے، اور انسان غور وفکر سے یا وحی سے یا تقلید سے اپنے علوم کو حاصل کرنے کا مستحق ہوتا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

فائدہ: کَسب لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ منطق کی اصطلاح ہے اور نظر کی مترادف ہے۔ اور آخر میں واللّٰہ اعلم مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

باب —— ۸

تکلیف شرعی جزاوسزا کو چاہتی ہے

اور

مجازات کی چار وجوہ ہیں

انسان کو اس کے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ ضرور ملنے والا ہے، جیسی کرنی ویسی بھرنی! اور مُجازات چار وجوہ سے ہوگی:

(۱) مجازات انسان کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے۔
(۲) مجازات ملأاعلیٰ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔
(۳) مجازات نازل کردہ شریعت کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔
(۴) مجازات تعلیماتِ انبیاء کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا مجازات کی وجوہ اربعہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی وجہ: مجازات صورتِ نوعیہ کا تقاضا ہے

انسان چونکہ انسان ہے اس لئے اس کے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ ملنا ضروری ہے، اگر وہ کوئی اور جانور ہوتا تو مجازات

نہ ہوتی، مثلاً چوپایہ اگر گھاس چرے اور درندہ گوشت کھائے تو دونوں تندرست رہتے ہیں کیونکہ یہی ان کی صورت نوعیہ کا مقتضی ہے اور اگر معاملہ برعکس ہو جائے تو دونوں بیمار پڑ جاتے ہیں، اسی طرح انسان اگر ایسے اعمال کرے جن کا نچوڑ، خلاصہ اور روح، اخلاقِ عالیہ اور صفات حسنہ ہوں تو اس کا ملکی مزاج درست رہے گا اور بصورت دیگر اس کا ملکی مزاج بگڑ جائیگا اور جب تک وہ بقید حیات رہے گا اعمال بد کا اثر ظاہر نہ ہوگا، مگر جب علائق جسمانی سے ہلکا ہو جائیگا یعنی وفات پا جائے گا تو اس کو پورا احساس ہوگا کہ اس نے دنیا میں جو کام کیے تھے وہ اس کی ملکیت کے موافق نہیں تھے جس طرح جسم کو سُن کر کے آپریشن کیا جائے تو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، مگر دواء کا اثر زائل ہوتے ہی شدت کا درد اٹھتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی غفلت، احساس نہیں ہونے دیتی، یہ غفلت دور ہوتے ہی احساس شروع ہو جائے گا۔

اور اخلاق عالیہ چار ہیں: (۱) پاکی، اور اس کی ضد ناپاکی (۲) اخبات یعنی بارگاہ خداوندی میں نیازمندی، اور اس کی ضد اللہ اور دین حق کے سامنے اکڑنا (۳) سماحت یعنی سیر چشمی اور عالی ظرفی، اور اس کی ضد شُح یعنی انتہائی درجہ کی بخیلی (۴) انصاف، اور اس کی ضد ناانصافی ـــــــ ان کا مفصل بیان آگے مبحث چہارم کے باب چہارم میں اور ابواب الاحسان کے بالکل شروع میں آئے گا۔

﴿باب اقتضاء التكليفِ المجازاةَ﴾

اعلم: أن الناس مَجْزِيُّوْنَ بأعمالهم: إن خيرًا فخير، وإن شرًا فشر، من أربعة وجوه:

أحدها: مقتضَى الصورة النوعية: فكما أن البهيمة إذا عَلَفت الحشيشَ، والسَّبُعَ إذا علف اللحمَ، صَحَّ مزاجُهما؛ وإذا علفت البهيمةُ اللحمَ، والسبُعُ الحشيشَ، فسد مزاجُهما؛ فكذلك الإنسان إذا باشر أعمالاً: أرواحُها الخشوعُ لجناب الحق، والطهارةُ، والسماحةُ، والعدالةُ: صلُح مزاجُه الملكي؛ وإذا باشر أعمالاً، أرواحُها أضدادُ هذه الخِصَال، فسد مزاجُه الملكي؛ فإذا تَخَفَّف عن ثِقل البدن أَحسَّ بالْمُلاَءَمةِ والمنافرة، شِبْهَ ما يَحُسُّ أحدُنا من ألم الاحتراق.

ترجمہ: باب: تکلیف شرعی کا مجازات کو چاہنا: جان لیجئے کہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ دیا جائے گا، اچھے اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا برا بدلہ، چار وجوہ سے:

ان میں سے ایک: صورت نوعیہ کا تقاضا ہے، پس جس طرح چوپایہ گھاس چرتا ہے اور درندہ گوشت کھاتا ہے تو دونوں کا مزاج درست رہتا ہے اور جب چوپایہ گوشت کھاتا ہے اور درندہ گھاس، تو دونوں کا مزاج بگڑ جاتا ہے، اسی طرح جب انسان ایسے کام کرتا ہے جن کی روح بارگاہ خداوندی میں عاجزی، پاکی، عالی ظرفی اور عدالت ہوتی ہے تو اس کا ملکوتی مزاج درست رہتا ہے اور جب وہ ایسے کام کرتا ہے جن کی روح مذکورہ اعمال کی ضد ہوتی ہے تو اس کا ملکوتی مزاج

بگڑ جاتا ہے۔ پھر جب وہ بدن کے بوجھ سے ہلکا ہو جاتا ہے یعنی مر جاتا ہے تو اس کو مناسب ہونے اور نامناسب ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے، جیسے (سُن کرنے والی دواء کا اثر ختم ہونے کے بعد) ہم میں سے ہر شخص جلنے کی تکلیف محسوس کرنے لگتا ہے۔

تصحیح: لجناب الحق: مطبوعہ نسخوں میں بجناب الحق تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

دوسری وجہ: مجازات ملأ اعلیٰ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے

جس طرح فرمانبردار، خدمت گزار اولاد کی خوش حالی ماں باپ کی دعاؤں کا ثمرہ ہوتی ہے اور نافرمان، ناہنجار اولاد کی تنگ حالی اور پریشان بالی، ماں باپ کی آہوں کا اثر ہوتی ہے، اسی طرح جزاء وسزا کا ایک سبب ملأ اعلیٰ کی دعائیں اور لعنتیں بھی ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملأ اعلیٰ کا تعلق انسانوں سے بالکل ایسا ہے جیسا ہمارے قُوی ادراکیہ (عقل وفہم) کا ہم سے ہے، اگر ہمارا پاؤں چنگاری یا برف کے ٹکڑے پر پڑتا ہے تو دماغ میں امانت رکھے ہوئے قوی ادراکیہ، اس کا فوراً ادراک کر لیتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہمارے اچھے برے اعمال کا ملائکہ فوراً ادراک کر لیتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ کلی طبعی کے بارے میں متأخرین کا مذہب یہ ہے کہ وہ خارج میں نہیں پائی جاتی، نہ مستقلاً اور نہ اپنے افراد کے ضمن میں، خارج میں صرف کلی طبعی کے افراد پائے جاتے ہیں، اور اسی کو مجازاً کلی طبعی کا پایا جانا کہہ دیتے ہیں (دلیل کے لئے مفتاح التہذیب ص ۴۹ دیکھیں)

مگر عالم ملکوت میں تمام انواع پائی جاتی ہیں، نوع انسانی کی صورت بھی وہاں متحقق ہے، جس کو 'انسان اکبر' کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مہربانی نے اس صورت نوعیہ کے لئے خدام پیدا کئے ہیں، اور وہ ملائکہ ہیں، کیونکہ جس طرح انسان قوی ادراکیہ (عقل وفہم) کے بغیر سنور نہیں سکتا، اسی طرح ملائکہ کے بغیر بھی اس کی گاڑی نہیں چل سکتی۔

غرض جب کوئی انسان اچھا کام کرتا ہے تو وہ خدام اس کا ادراک کر لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، اور جب برا کام کرتا ہے تو اس کا بھی ادراک کرتے ہیں اور ناخوش ہوتے ہیں، پھر اس خوشی اور ناخوشی کی لہریں چلتی ہیں اور اس عامل کے دل میں حلول کرتی ہیں، جس سے اس کے دل میں بہجت وسرور یا وحشت ونفرت پیدا ہوتی ہے، یہی اعمال کی جزاؤ سزا ہے، اسی طرح وہ لہریں ملأ سافل کے دلوں میں بھی حلول کرتی ہیں یا بعض لوگوں کے دلوں میں اترتی ہیں اور وہ الہام بن جاتی ہیں کہ وہ حضرات اس عمل کرنے والے سے محبت کریں اور اس کے ساتھ حسن سلوک کریں یا اس سے نفرت وبغض رکھیں

اور اس کے ساتھ برا سلوک کریں۔

اور یہ بات ایک مثال سے سمجھئے: اگر ہمارا پیر کسی چنگاری پر پڑتا ہے تو ہمارے قوی ادراکیہ جلنے کا احساس کرتے ہیں، پھر دماغ سے لہریں اٹھتی ہیں اور دل میں پہنچتی ہیں تو دل ملول ہوتا ہے اور طبیعت میں پہنچتی ہیں تو آدمی فکر مند ہو جاتا ہے اسی طرح فرشتے بھی ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اور ہمارے ادراکات واحساسات کی اثر اندازی کی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی شخص کو کسی تکلیف یا رسوائی کا یقین ہو جاتا ہے تو اس کے شانے کا گوشت کپکپانے لگتا ہے، رنگ پیلا پڑ جاتا ہے، بدن کمزور ہو جاتا ہے اور کبھی آدمی نامرد ہو جاتا ہے، اس کا پیشاب سرخ ہو جاتا ہے اور کبھی وہ پیشاب کر دیتا ہے یا استنجا خطا ہو جاتا ہے، یہ سب قوی ادراکیہ کے طبیعت پر مرتب ہونے والے اثرات ہیں، قوی طبیعت کو وحی کرتے ہیں اور طبیعت اس کی تعمیل کرتی ہے اور قوی طبیعت پر غالب ہوتے ہیں اس لئے طبیعت متأثر ہوتی ہے۔

اسی طرح جو ملائکہ انسان اکبر کی خدمت کے لئے مأمور ہیں، ان کی طرف سے بھی فطری الہامات اور طبعی تغیرات انسانوں پر یا ملأ سافل پر ٹپکتے ہیں، کیونکہ افراد انسان بمنزلہ طبیعت ہیں اور ملائکہ بمنزلہ قوی ادراکیہ کے ہیں اور قوی ادراکیہ کے اثرات طبیعت پر لامحالہ پڑتے ہیں۔

اور جس طرح یہ لہریں نیچے کی طرف اترتی ہیں ان کا ایک رنگ عالم بالا کی طرف بھی چڑھتا ہے اور وہ حظیرۃ القدس میں پہنچ کر رحمت ورضا یا غضب ولعن کا سبب بنتا ہے، جیسے آگ سے پانی کا قرب اس میں گرم ہونے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، اور قیاس میں صغری کبری نتیجہ کو تیار کرتے ہیں اور دعا یعنی خوب گڑگڑا کر اللہ سے مانگنا قبولیت کو تیار کرتا ہے، اس طرح جبروت میں نئی صورت حال پیدا ہوتی ہے مثلاً بندے کے ناجائز کاموں سے خدا ناراض ہوتے ہیں، پھر جب بندہ توبہ کر لیتا ہے تو وہ ناراضگی ختم ہو جاتی ہے اسی طرح بندوں کے اچھے اطوار سے اللہ تعالیٰ مہربان ہوتے ہیں، پھر جب لوگ اپنے احوال بدل لیتے ہیں تو وہ رحمت نقمت سے بدل جاتی ہے سورۃ الرعد آیت ۱۱ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تبدیلی نہیں کرتے جب تک کہ وہ لوگ خود اپنی (اچھی) حالت کو بدل نہیں دیتے۔''

اور مضمون بالا کے دلائل وہ تمام روایات ہیں جن میں آنحضور ﷺ نے اطلاع دی ہے کہ فرشتے انسانوں کے اعمال بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ اور دن کے اعمال رات کے اعمال شروع ہونے سے پہلے ہی بارگاہ خداوندی میں پیش کر دئے جاتے ہیں۔ ان تمام روایات میں آنحضور ﷺ نے یہ مضمون سمجھایا ہے کہ انسانوں کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کی اس تجلی کے درمیان جو حظیرۃ القدس کے بیچ میں قائم ہے، فرشتوں کی ایک قسم کی وساطت پائی جاتی ہے۔

وثانيها: جهةُ الملأ الأعلى: فكما أن الواحد منا، له قُوىً إدراكية، مُوْدَعَةٌ في الدماغ، يُحِسُّ بها ما وقعت عليه قدمُه: من جَمْرَةٍ أو ثَلْجَةٍ، فكذلك لصورة الإنسان المتمثلة في الملكوت خدامٌ من الملائكة، أوجدها عنايةُ الحق بنوع الإنسان، لأن نوعَ الإنسان لايصلُح إلا بهم، كما أن الواحد منا لايصلح إلا بالقُوى الإدراكية.

فكلما فَعَلَ فرد من أفراد الإنسان فعلاً مُنْجيًا، خرجت من تلك الملائكة أشِعَّةُ بَهْجَةٍ وسرور؛ وكلما فعل فعلا مُهْلِكًا، خرجت منها أشعةُ نفرةٍ وبُغْضٍ؛ فَحَلَّت تلك الأشعةُ في نفس هذا الفرد، فأورثت بهجةً أو وحشةً؛ أو في نفوس بعض الملائكة، أو بعض الناس، فانعقد الإلهامُ أن يُحِبُّوه ويُحسنوا إليه، أو يُبْغِضوه ويُسيئوا إليه؛ شِبْهَ ما نرى من أن أحدنا إذا وقعت رِجلُه على جمرةٍ أَحَسَّت قواه الإدراكية بألم الاحتراق، ثم خرجت منها أشِعَّةٌ، تُؤَثِّرُ في القلب فَيَحْزَنُ، وفي الطبع فَيَحُمُّ.

وتأثير أولئك الملائكة فينا يَشْبَهُ بتأثير الإدراكات في أبداننا؛ فكما أن الواحد منا قد يتوقَّع ألَمًا أو ذُلًّا، فَتَرْتَعِدُ فَرَائصُه، ويَصْفَرُّ لونُه، ويَضْعُف جسدُه، وربما تسقط شهوتُه، ويَحْمَرُّ بولُه، وربما بال أو خَرِيَ من شدةِ الخوف؛ فهذا كلُّه تأثير القُوى الإدراكية في الطبيعة، ووَحْيُها إليها، وَقَهْرُها عليها، فكذلك الملائكةُ الموكَّلَةُ ببني آدم، يترشح منها عليهم، وعلى نفوس الملائكة السفلية، إلهاماتٌ جبلية، وإحالات طبيعية؛ وأفرادُ الإنسان كلُّها بمنزلة القوى الطبيعية لهذه الملائكة، وهذه الملائكةُ بمنزلة القوى الإدراكية لهم.

وكما تهبطُ تلك الأَشِعَّةُ إلى السفل، فكذلك يَصْعَدُ إلى حظيرة القدس منها لونٌ، يُعِدُّ لفيضان هيئةٍ، تُسمى بالرحمة والرضا، أو الغضب واللعن، مِثْلُ إعْداد مجاورةِ النارِ الماءَ لِتَسْخِيْنه، وإعدادِ المقدِّمات للنتيجة، وإعدادِ الدعاء للإجابة، فَيَتَحَقَّق التجَدُّدُ في الجبروت من هذا الوجه، فيكون غضبٌ ثم توبة، ويكون رحمةٌ ثم نقمة قال الله تعالى: ﴿إِنَّ اللّٰه لَايُغَيِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾

وقد أخبر النبيُّ صلى الله عليه وسلم في أحاديث كثيرة: أن الملائكة ترفع أعمالَ بني آدم إلى الله تعالى، وأن الله يسألهم: كيف تركتم عبادي؟ وأن عملَ النهار يُرفع إليه قبل عمل الليل؛ يُنَبِّهُ صلى الله عليه وسلم على ضربٍ من تَوَسُّطِ الملائكة بين بني آدم وبين نور الله القائم وَسْطَ حظيرة القُدْس.

ترجمہ: اوران میں سے دوسری وجہ: ملأ اعلیٰ کی جہت ہے، پس جس طرح ہم میں سے ہر شخص کے لئے ادراک کرنے والی صلاحیتیں ہیں، جو دماغ میں امانت رکھی ہوئی ہیں، جن کے ذریعہ آدمی اس چنگاری یا برف کے ٹکڑے کو محسوس کرلیتا ہے جس پر اس کا پیر پڑتا ہے، پس اسی طرح نوع انسانی کی اس صورت کے لئے جو فرشتوں کی دنیا میں پائی جاتی ہے، فرشتوں میں سے خدام ہیں، جن کو نوع انسانی پر اللہ کی مہربانی نے پیدا کیا ہے، کیونکہ نوع انسانی ان کے بغیر سنور نہیں سکتی، جس طرح ہم میں سے کوئی شخص ادراک کرنے والی صلاحیتوں کے بغیر سنور نہیں سکتا۔

پس جب بھی انسان کا کوئی فرد کوئی نجات بخش کام کرتا ہے تو ان فرشتوں سے بہجت وسرور کی لہریں نکلتی ہیں اور جب بھی وہ تباہ کن کام کرتا ہے تو ان سے نفرت وبغض کی شعاعیں نکلتی ہیں، پھر وہ شعاعیں اس فرد کے دل میں اترتی ہیں، پس وہ بہجت یا وحشت پیدا کرتی ہیں یا وہ بعض فرشتوں کے دلوں میں یا بعض لوگوں کے دلوں میں اترتی ہیں پس وہ الہام بن جاتی ہیں کہ وہ اس کے ساتھ محبت کریں اور اس کے ساتھ نیک سلوک کریں یا وہ اس سے بغض رکھیں اور اس کے ساتھ برا سلوک کریں۔ اور یہ بات اس صورت حال کے مانند ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے ایک شخص کا پاؤں جب کسی چنگاری پر پڑتا ہے تو اس کے قوی ادراکیہ جلنے کی تکلیف کا احساس کرتے ہیں، پھر ان قوی سے لہریں نکلتی ہیں جو قلب پر اثر انداز ہوتی ہیں، چنانچہ وہ غمگین ہوجاتا ہے، یا طبیعت پر اثر انداز ہوتی ہیں تو وہ غم میں پڑجاتا ہے۔

اور ان فرشتوں کی ہم میں اثر اندازی مشابہ ہے ہمارے ادراکات کی تاثیر کے ہمارے بدنوں میں، پس جس طرح ہم میں سے کسی شخص کو کسی تکلیف یا رسوائی کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے تو اس کے شانے کا گوشت لرزنے لگتا ہے، اس کا رنگ پیلا پڑجاتا ہے، اس کا جسم کمزور ہوجاتا ہے، اور کبھی وہ نامرد ہوجاتا ہے، اس کا پیشاب لال ہوجاتا ہے، اور کبھی اس کا پیشاب نکل جاتا ہے یا شدت خوف سے استنجاء خطا ہوجاتا ہے، پس یہ تمام طبیعت میں قوی ادراکیہ کی تاثیر ہے اور قوی کی وحی ہے طبیعت کی طرف، اور قوی کا غلبہ ہے طبیعت پر، پس اسی طرح جو فرشتے انسانوں پر مأمور ہیں، اُن سے انسانوں پر یا ملأ سافل پر فطری الہامات اور طبعی تغیرات ٹپکتے ہیں۔ اور انسان کے تمام افراد بمنزلہ قوی طبیعیہ کے ہیں ان فرشتوں کے لئے، اور وہ فرشتے بمنزلہ قوی ادراکیہ کے ہیں انسانوں کے لئے (اور قوی ادراکیہ کے اثرات لامحالہ قوی طبیعیہ پر پڑتے ہیں)

اور وہ شعاعیں جس طرح نیچے کی طرف اترتی ہیں، ان کا ایک رنگ حظیرۃ القدس کی طرف چڑھتا ہے، جو کسی حالت کے فیضان کو تیار کرتا ہے، وہ حالت رحمت وخوشنودی کہلاتی ہے، یا غضب ولعنت کہلاتی ہے، جیسے آگ کا پڑوس پانی کو گرم ہونے کے لئے تیار کرتا ہے اور مقدمات (صغری، کبری) نتیجہ کو تیار کرتے ہیں اور دعا قبولیت کو تیار کرتی ہے، پس اس طور سے جبروت میں تجدد متحقق ہوتا ہے، پس ناراضگی پائی جاتی ہے پھر توبہ اور مہربانی پائی جاتی ہے پھر سزا، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''واقعۃً اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتے، جب تک لوگ خود اپنی حالت نہ بدل لیں''

اور نبی کریم ﷺ نے بہت سی حدیثوں میں خبر دی ہے کہ فرشتے انسانوں کے اعمال بارگاہ خداوندی میں پیش

کرتے ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ اور یہ کہ دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے بارگاہ خداوندی میں پیش کردیا جاتا ہے (ان روایات میں) آنحضور ﷺ ملائکہ کے ایک قسم کے توسط پر تنبیہ فرمارہے ہیں، انسانوں کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے اس نور کے درمیان جو حظیرۃ القدس کے درمیان میں قائم ہے۔

لغات:

الجهة: جانب، وہ گوشہ جس کی جانب توجہ کی جائے، جمع جهات...... حَسَّ (ض) حَسًّا وأحَسَّ الشيئ وبالشيئ: معلوم کرنا...... الشُعاع، آفتاب کی کرن جمع أَشِعَّة وشُعَعٌ وَشِعَاعٌ...... بَهِجَ (س) به: خوش ہونا...... حلَّ (ن ض) حُلولاً: نازل ہونا، اترنا...... حَمَّ الأمرُ فلانًا: غم میں ڈالنا...... تَوَقَّعَ الأمرَ: حاصل ہونے کی امید لگانا أي ينتظر وقوعها، ويعلمه بالوقوع قطعًا...... اِرْتَعدَ: کانپنا، حرکت کرنا...... الفرائص مفرد الفريصة: پہلو اور مونڈھے یا پستان اور مونڈھے کے درمیان کا گوشت، جو خوف کے وقت اُچھلنے لگتا ہے...... خَرِئَ (س) خَرْءًا وخِرَاءَةً: پائخانہ کرنا...... نَقَمَ (ض) وَنَقِمَ (س) نَقْمًا: سزا دینا۔

تشریح:

(۱) فيكون غضب إلخ میں کان تامہ ہے۔ اور قوی ادراکیہ سے مراد عقل وفہم اور نطق وکلام وغیرہ صلاحیتیں ہیں اور قوی طبیعیہ سے مراد احساس، نُما، سمع، بصر وغیرہ ہیں۔ ان قوی کو طبیعت بھی کہتے ہیں۔

(۲) تجدد کے معنی ہیں نیا ہونا، اور تحقق کے معنی ہیں پایا جانا، اس عبارت میں ایک سوال کا جواب ہے:

سوال: رحمت وغضب اللہ تعالیٰ کی قدیم صفات ہیں، ان میں تبدیلی کیسے ہوتی ہے؟ یعنی پہلے رحمت تھی پھر قہمت ہوگئی، پہلے غضب تھا پھر توبہ بن گئی؟ ایک آدمی مرحوم تھا پھر مغضوب ہوگیا، وكذلك العكس، یہ تبدیلی صفاتِ قدیمہ میں کیونکر ہوتی ہے؟

جواب: یہ الوان کی تبدیلی ہے، صفات میں تبدیلی نہیں، بالفاظ دیگر یہ تعلقات میں تجدد ہے۔ صفات تو قدیمہ ہیں جیسے اللہ خالق ورازق ازل سے ہیں، مگر زید کے پیدا ہونے کا جب وقت آئے گا تو اس کے خالق ہوں گے، پھر اس کو روزی پہنچائیں گے تو اس کے لئے رزاق ہوں گے۔ یہ تعلق حادث ہے اور صفات فی نفسہا ازلی ہیں۔

(۳) عرضِ اعمال کی روایات کے لئے دیکھئے مشکوۃ حدیث ۵۰۳۰ و ۲۰۵۶ اور كيف تركتم عبادي؟ کی روایت بخاری شریف کتاب بدء الخلق باب (۵) میں ہے اور يرفع إليه عمل الليل الخ مسلم، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد ۴: ۲۹۵ و ۴۰۱ و ۴۰۵ میں ہے۔

تصحیح: (۱) فكما أن الواحد منا، له قوى إدراكية میں مِنَّا کے بجائے منها تھا (۲) لصورة الإنسان مطبوعہ نسخہ میں بصورة الإنسان تھا (۳) إحالاتٌ مطبوعہ نسخہ میں حالات تھا (۴) وهذه الملائكة بمنزلة القوى الإدراكية ہم کے شروع میں وهذه الملائكة مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے (۵) يَشْبَه بتاثير الإدراكات اصل میں شَبِيْهٌ إلخ تھا (۶) او لغضب واللعن مطبوعہ میں أو کے بجائے واو تھا ــــ یہ تمام اصلاحات مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہیں۔

☆ ☆ ☆

تیسری وجہ: مجازات شریعت منزّلہ کی وجہ سے بھی ہوتی ہے

مختلف شریعتیں جو مختلف زمانوں میں نازل کی گئی ہیں، وہ بھی جزاؤسزا کا ایک سبب ہیں۔ اوراس مضمون کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک مثال پیش ہے آپ کے اس ادارہ میں اس وقت دو قانون ہیں (۱) جو طالب علم پندرہ دن مسلسل غیر حاضر ہے گا اس کا نام کاٹ دیا جائے گا یعنی داخلہ ختم کردیا جائے گا (۲) جس کی پورے سال کسی سبق میں کوئی غیر حاضری نہ وگی، اس کو سوروپے نقد انعام دیا جائے گا۔

یہ دونوں قانون پہلے نہیں تھے، اب حالات کے تقاضے سے یہ قوانین بنائے گئے ہیں، پہلے کوئی بھی طالب علم بغیر مذر کے سبق سے غیر حاضر نہیں رہتا تھا، کیونکہ وہ پڑھنے کے جذبہ سے آتا تھا مگر اب صورت حال وہ نہیں رہی تو ترغیب ترہیب کے لئے مذکورہ قوانین بنائے گئے ہیں، اب جبکہ یہ دونوں قانون بن گئے تو ان کی وجہ سے جزاؤسزا ہوگی، ۱۵ ن کی غیر حاضری پر دفتر تعلیمات داخلہ ختم کرسکتا ہے، کسی کو اعتراض یا احتجاج کا حق نہ ہوگا، اور حاضر باش انعام کا مستحق وگا اور وہ اپنے حق کا مطالبہ بھی کرسکتا ہے۔ اور دور اول میں جبکہ یہ قوانین نہیں تھے، نہ جزاء تھی نہ سزا۔

اسی طرح آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا، کیونکہ اس وقت بہن کے علاوہ کوئی عورت نہیں تھی، بعد کی شریعتوں میں بہن سے نکاح حرام ہوگیا۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدۂ تحیہ جائز تھا، ہماری شریعت میں حرام ہے اور بنی اسرائیل کی شریعت میں غنیمت حلال نہیں تھی، آسمان سے سفید آگ آتی تھی، اوراس کو جلا التی تھی، اب ہماری شریعت میں غنیمت حلال ہے۔

غرض مختلف زمانوں میں، اُن زمانوں کے تقاضوں کے مطابق جو شریعتیں یعنی احکام وقوانین نازل کئے گئے ہیں ن پر عمل درآمد ضروری ہے، اس کی تعمیل باعث اجر اور خلاف ورزی باعث عقاب ہے، اگر یہ بات تسلیم نہ کی جائے تو وانین بے فائدہ ہوکر رہ جائیں گے۔ شرائع منزلہ کے سبب مجازات ہونے کا یہی مطلب ہے۔

رہی یہ بات کہ مختلف زمانوں میں جو مختلف شریعتیں نازل کی جاتی ہیں، اس کی صورت کیا ہوتی ہے؟ شاہ صاحب س کی صورت بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح علویات کے سفلیات پر اثرات پڑتے ہیں یعنی جب ستاروں کی خاص

توجہات ہوتی ہیں تو اُن سے ایک روحانیت یعنی ایک غیر مادی چیز وجود میں آتی ہے، جو مختلف ستاروں کی صلاحیتوں کا آمیزہ ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت اولاً فلک کے کسی حصہ میں متحقق ہوتی ہے، پھر فلک کا ڈاکیہ یعنی چاند اس روحانیت کو زمین کی طرف منتقل کرتا ہے تو عالم زیریں کی چیزیں اس سے متاثر ہوتی ہیں یعنی زمینی مخلوقات کے جذبات اور ارادے اس روحانیت کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔

اسی طرح جو شخص اللہ کے معاملات کا علم رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ جب ایک خاص وقت آتا ہے، جس کو قرآن کریم میں ''مبارک رات'' کہا گیا ہے اور جس میں ہر دانشمندانہ معاملہ طے کیا جاتا ہے، اس رات میں فرشتوں کی دنیا میں ایک خاص روحانیت وجود میں آتی ہے، جو نوع انسانی کے احکام اور اس وقت کے تقاضوں سے مرکب ہوتی ہے، پھر وہ روحانیت الہام بن کر یعنی وحی کے ذریعہ ملکوت سے زمین پر اترتی ہے۔ اُس زمانہ میں جو سب سے زیادہ ذہین اور ستھرا شخص ہوتا ہے اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے توسط سے وہ احکام دوسرے کم درجہ ذہین لوگوں تک پہنچتے ہیں، وہ لوگ سب سے پہلے اس دین وشریعت کو قبول کرتے ہیں، پھر عام طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ وہ اس دین کو پسند کریں اور اس کو قبول کریں۔ پس لوگ فوج در فوج دین میں داخل ہونے لگتے ہیں اور اس دین کے انصار کو قوت پہنچائی جاتی ہے اور مخالفین کو رسوائیوں سے دوچار کیا جاتا ہے، نیز ملأ سافل کو بھی الہام کیا جاتا ہے کہ اس دین کی تابعداری کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور نافرمانوں کے ساتھ برا معاملہ کریں۔ پھر ملأ سافل کے انوار کا ایک رنگ ملأ اعلیٰ کی طرف چڑھتا ہے اور حظیرۃ القدس میں پہنچتا ہے، تو وہاں خوشنودی اور ناراضگی متحقق ہوتی ہے۔ جن سے اللہ پاک خوش ہوتے ہیں ان کو جزائے خیر عطا فرماتے ہیں اور جن کے اعمال سے ناراض ہوتے ہیں ان کو سزا دیتے ہیں۔ اس طرح شرائع منزلہ جزا وسزا کا سبب بن جاتی ہیں۔

وثالثها: مقتضى الشريعةِ المكتوبةِ عليهم: فكما يَعْرِف المنَجِّمُ: أن الكواكب إذا كان لها نَظَرٌ من النظرات، حصلت روحانيةٌ ممتزِجَةٌ من قُواها، متمثِّلةٌ فى جزء من الفلك؛ فإذا نقلَها إلى الأرض ناقلُ أحكام الفلكيات، أعنى القمر، انقلبت خواطِرُهم حسَب تلك الروحانية.

فكذلك يعرف العارف بالله: أنه إذا جاء وقت من الأوقات —— يُسمى فى الشرع بالليلة المباركة، التى فيها يُفْرَقُ كُلُّ أمر حكيم—— حصلت روحانيةٌ فى الملكوت، ممتزجةٌ من أحكام نوع الإنسان، ومقتضى هذا الوقت، يترشح من هنالك إلهاماتٌ على أذكى خلق الله يومئذ، وعلى نفوسٍ تَلِيْهِ فى الذكاء بواسطته، ثم يُلهم سائرُ الناس قبولَ تلك الإلهاماتِ، واستحسانَها، ويُؤَيَّدُ نَاصِرُها، ويُخْذَلُ مُعانِدُها، وتُلْهَمُ الملائكةُ السفليةُ الإحسانَ لِمُطِيْعِهَا، والإساءَةَ إلى عاصيها، ثم يصعَد منها لونٌ إلى الملأ الأعلى وحظيرة القدس، فيحصل هنالك رضًا وسُخْط.

ترجمہ: ان میں سے تیسری وجہ: اُس شریعت کا تقاضا ہے جوان پر فرض کی گئی ہے، پس جس طرح علم نجوم کو جاننے والا جانتا ہے کہ جب ستاروں کے لئے توجہات میں سے کوئی (مخصوص) توجہ ہوتی ہے[1] تو ایک روحانی چیز وجود میں آتی ہے، جوان ستاروں کی صلاحیتوں کا آمیزہ ہوتی ہے، جو فلک کے کسی حصہ میں پائی جاتی ہے، پس جب اس روحانیت کو زمین کی طرف منتقل کرتا ہے فلکیات کے احکام کو منتقل کرنے والا یعنی چاند، تو لوگوں کے ارادے اس روحانیت کے مطابق پلٹ جاتے ہیں۔

پس اسی طرح اللہ کے معاملات کو جاننے والا، جانتا ہے کہ جب اوقات میں سے کوئی خاص وقت آتا ہے ——— جو شریعت کی اصطلاح میں ''شب مبارک'' کہلاتا ہے، جس میں ہر دانشمندانہ معاملہ طے کیا جاتا ہے ——— تو فرشتوں کی دنیا میں ایک روحانی چیز وجود میں آتی ہے، جو نوع انسانی کے احکام کا اور اس وقت کے تقاضے کا آمیزہ ہوتی ہے (یعنی اس میں دونوں باتوں کا لحاظ ہوتا ہے) (پھر) وہاں سے الہامات مترشح ہوتے ہیں، اس زمانہ میں اللہ کی خلقت میں سب سے زیادہ ذہین شخص پر، اور اس کے واسطے سے دوسرے ایسے لوگوں پر جو ذہانت میں اس کے لگ بھگ ہوتے ہیں، پھر دوسرے لوگ الہام کئے جاتے ہیں، ان الہامات کو قبول کرنے کا اور ان کو پسند کرنے کا، اور ان الہامات کا مددگار تائید کیا جاتا ہے اور اس کا مخالف رسوا کیا جاتا ہے، اور نچلے فرشتے الہام کئے جاتے ہیں اُن الہامات کی اطاعت کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا، اور ان کی نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ برا برتاؤ کرنے کا، پھر ان ملائکہ سے ایک رنگ چڑھتا ہے ملأ اعلی اور حظیرۃ القدس کی طرف، پس وہاں خوشنودی اور ناخوشی وجود میں آتی ہے۔

لغات: امتزج به: ملنا...... ذَكِيَ يَذْكَى ذَكَاءً: تیز خاطر ہونا، صفت ذَكِيٌّ جمع أذكياء...... تَمَثَّلَ الشيئُ: تصور ہونا یعنی تصور کے درجہ میں پایا جانا، نفس الامر میں پایا جانا...... قوله: يترشَّح ـ ے پہلے ف مقدر ہے۔

☆　☆　☆



چوتھی وجہ: مجازاتِ تعلیماتِ انبیاء کی وجہ سے بھی ہوتی ہے

یہ مضمون بھی پہلے ایک مثال سے آسان طریقہ پر سمجھ لیں، نصاب میں دو قسم کی کتابیں ہیں:

(۱) **مطالعہ کی کتابیں**: طلبہ ان کتابوں کا اساتذہ کی نگرانی اور راہ نمائی میں مطالعہ کرتے ہیں، با قاعدہ وہ کتابیں پڑھائی نہیں جاتیں۔

(۲) **درس کی کتابیں**: جو باقاعدہ پڑھائی جاتی ہیں، اساتذہ انکے دقائق حل کرتے ہیں اور لفظ لفظ سمجھاتے ہیں۔

[1] نظر اور قران مترادف لفظ ہیں اور یہ علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں، جب دو ستارے کسی ایک برج میں ایک درجہ میں اکٹھا ہوتے ہیں تو اس کو قران اور نظر کہتے ہیں مزید تفصیل دستور العلماء ۳: ۴۷ میں ہے ۱۲

امتحان دونوں قسم کی کتابوں کا ہوتا ہے مگر اول کا پرچہ آسان بنایا جاتا ہے اور جوابات کی جانچ بھی نرم کی جاتی ہے او دوسری قسم کی کتابوں کا پرچہ بھی سخت بنایا جاتا ہے اور جانچ بھی کس کر کی جاتی ہے۔ نیز اول کے نمبرات ترغیبی ہوتے ہیں اور دوم کے بنیادی، ان پر ترقی اور تنزل کا مدار ہوتا ہے، کیونکہ جو طالب علم اتنی محنت اور دلسوزی سے پڑھائی ہوئی کتاب کو بھی یاد نہ کرے اور فیل ہو جائے، اس کی سزا تنزل کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟!

اسی طرح جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی مبذول ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کے ساتھ خیر منظور ہوتی ہے اور اس قوم کی طرف نبی مبعوث کئے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو خیر سے قریب کریں، اور نبی کی اطاعت ان پر فرض کی جاتی ہے تو جو علوم وحی کے ذریعہ اس نبی کو دئے جاتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ نبی قوم کی اصلاح کرے، وہ علوم متشخص و متعین ہو جاتے ہیں، نبی کی توجہ، محنت اور دعائیں ان علوم کے ساتھ مل جاتی ہیں، اللہ کی نصرت کا فیصلہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے پس یہ سب چیزیں مل کر وہ علوم مؤکد و متحقق ہو جاتے ہیں اب جو لوگ ان علوم کو حاصل کرتے ہیں، ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ دونوں جہاں میں کامیاب ہوتے ہیں اور جو اعراض کرتے ہیں وہ اپنی قسمت کو روتے ہیں۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایات کا ہر قسم کا سامان کر دیا، نبی کو بھیجا، اس پر علوم نازل کئے، پھر نبی نے بھی محنت کرنے میں کسر نہ چھوڑی، اب بھی جو لوگ توجہ نہ کریں، اُن ناہنجاروں کو سزا ملنی ہی چاہئے، اس طرح تعلیمات انبیاء بھی مجازات کا سبب بن جاتی ہیں۔

ورابعها: أن النبي إذا بُعث في الناس، وأراد الله تعالى بِبَعْثتِه لُطْفًا بهم، وتقريبًا لهم إلى الخير، وأوجب طاعتَه عليهم، صار العلمُ الذي يُوحى إليه متشخَّصا متمثّلا، وامْتَزَجَ بهمَّةِ هذا النبي ودعائه، وقضاءِ الله تعالى بالنصر له، فتأَكّدَ وتَحَقَّقَ.

ترجمہ: اور ان میں سے چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبر لوگوں میں مبعوث کئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نبی کی بعثت کے ذریعہ لوگوں پر مہربانی کرنا چاہتے ہیں اور ان کو بھلائی سے قریب کرنا چاہتے ہیں اور نبی کی اطاعت لوگوں پر واجب کرتے ہیں تو وہ علم جو نبی کی طرف وحی کیا گیا ہے متشخص ہو کر موجود ہو جاتا ہے اور وہ علم مل جاتا ہے اس نبی کی پوری توجہ کے ساتھ، اس کی دعاؤں کے ساتھ اور اس علم کے لئے اللہ تعالیٰ کی نصرت کے فیصلہ کے ساتھ تو وہ علم مؤکد (پختہ) متحقق ہو جاتا ہے۔

لغات:

متشخَّصا (اسم مفعول) تَشَخَّصَ: متعین ہونا، ممیّز ہونا...... متمثّلا (اسم مفعول) تمثل الشیئُ: تصور ہونا، نفس الامر میں پایا جانا...... هِمَّة: پوری توجہ، یہ شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے...... تأكّدَ (فعل ماضی) تأكّد وتوكّد مضبوط ہونا، ثابت ہونا...... تَحَقَّقَ (فعل ماضی) تحقق الخبرُ: ثابت ہونا۔

مجازات کی چاروں وجوہ کے احکام

اس باب میں زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ مجازات، تکلیف شرعی کا مقتضی ہے یعنی انسان چونکہ احکام شرعیہ کا مکلّف ہے اس لئے جزاؤسزا ضروری ہے۔ اوراوپر جو مجازات کی چاروجوہ بیان کی گئی ہیں، ان میں سے سوم وچہارم کو بیان کرنا اصل مقصود ہے۔ اول ودوم کا بیان تکمیل بحث کے لئے ہے۔ اب ذیل میں چاروں وجوہ کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

مجازات کی پہلی دوصورتوں کے بارے میں چار باتیں یادرکھنی چاہئیں:

① مجازات کی پہلی دوصورتیں فطری ہیں یعنی صورت نوعیہ کے اقتضاء سے، اور ملأ اعلی کی جہت سے، مجازات انسان کی فطرت میں داخل ہے اور فطری امور بدلا نہیں کرتے، اس لئے ان دووجوہ سے جزاؤسزا ضرور ہوگی۔

② پہلی دوصورتوں کی وجہ سے مجازات برّ واثم کی بنیادی اور کلی باتوں میں ہوتی ہے، فروعی باتوں میں اور احکام میں نہیں ہوتی۔ نیکی کیا ہے؟ اور گناہ کیا ہے؟ یہ بحث مبحث خامس کے شروع میں آئے گی اور نیکی کے کاموں میں اصل الاصول چار باتیں ہیں (۱) توحید (۲) صفات الٰہیہ پر ایمان لانا (۳) قضاء وقدر پر ایمان لانا (۴) اس بات پر ایمان لانا کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ یہ تمام باتیں چونکہ فطرت انسانی میں داخل ہیں، اس لئے ان پر جزاؤسزا ضرور ہوگی۔

③ برّ واثم کی فطری باتیں دین کی بنیادی باتیں ہیں، زمانہ کی تبدیلی کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا، تمام انبیاء ان باتوں میں متفق ہیں۔ آدم علیہ السلام سے خاتم النّبیین ﷺ تک ایک ہی دین نازل ہوا ہے۔ سورۃ المؤمنون آیت ۵۲ میں ہے کہ: ''یہ تمہارا طریقہ ہے جو کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے'' یہ بات تمام پیغمبروں کو مخاطب بنا کر ارشاد فرمائی گئی ہے، پس ثابت ہوا کہ دین ہمیشہ اسلام ہی نازل ہوا ہے ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلاَمُ﴾ اختلاف جو کچھ ہے وہ شریعتوں میں ہے یعنی قوانین واحکام میں ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''تمام انبیاء علاتی (باپ شریک) بھائی ہیں، ان کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا باپ ایک ہے (مسلم شریف، کتاب الفضائل باب فضائل عیسیٰ علیہ السلام ج ۱۵ ص ۱۱۹) اس حدیث میں باپ سے مراد دین ہے اور ماؤں سے مراد شریعتیں ہیں۔

④ پہلی دووجوہ سے جزاؤسزا بعثت انبیاء اور بلوغ دعوت پر موقوف نہیں، خواہ نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو، بر واثم کی اصولی باتوں میں، جو فطری باتیں ہیں، جزاؤسزا ضرور ہوگی۔

اور مجازات کی تیسری وجہ کے بارے میں دو باتیں یادرکھنی چاہئیں:

① تیسری وجہ سے جو جزاؤسزا ہوتی ہے، وہ زمانوں کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بہن سے نکاح باعث اجر تھا، اب یہ گناہ کبیرہ ہے۔ جس امت پر تین نمازیں اور تین روزے فرض تھے، ان کی

جزاوسزا اتنی ہی مقدار پر ہوگی اب پانچ نمازوں اور ایک ماہ کے روزوں پر جزاوسزا مرتب ہوگی۔

(۳) زمانوں کا اختلاف ہی مختلف شریعتوں کے نزول کا سبب ہے، ورنہ آغاز انسانیت کے ساتھ ہی ایک مجموعۂ قوانین نازل کردیا جاتا ہے اوراس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی جاتی، تو وہی شریعت قیامت تک چلتی رہتی، مگر ایسا اس لئے نہیں کیا گیا کہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ احکام میں تبدیلی ضروری تھی، چنانچہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ انبیاؤرسل آتے رہے اور اپنی اپنی قوموں کو خواب غفلت سے جھنجھوڑتے رہے، متفق علیہ حدیث میں اس کی طرف اشارہ آیا ہے (مشکوۃ کتاب الایمان، باب الاعتصام حدیث ۱۴۸) یہ حدیث آپ عبارت کے ترجمہ میں پڑھیں گے۔

اور چوتھی وجہ سے جزاوسزا بعثت انبیاء کے بعد ہی ہوتی ہے۔ جب نبی مبعوث ہوکر لوگوں کے شبہات کھول دیتے ہیں، اور دین اچھی طرح ان کو پہنچادیتے ہیں، پھر بھی جولوگ ایمان نہیں لاتے وہ سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔

أما المجازاة بالوجهين الأولين ففطرةٌ فَطَرَ الله الناس عليها، ولن تجد لفطرة الله تبديلاً؛ وليس ذلك إلا في أصول البر والإثم، وكلياتِها دون فروعِها وحدودها؛ وهذه الفطرة هو الدين الذي لايختلف باختلاف الأعصار؛ والأنبياءُ كلُّهم مُجْمِعون عليه، كما قال تبارك وتعالى: ﴿وَإِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ وقال صلى الله عليه وسلم: ﴿الأنبياءُ بنوعَلَّاتٍ: أبوهم واحدٌ، وأمهاتُهم شتى﴾ والمؤاخذة على هذا القدر متحققة قبل بعثة الأنبياء وبعدها سواء.

وأما المجازاة بالوجه الثالث فمختلِفة باختلاف الأعصار؛ وهي الحاملة على بعث الأنبياء والرسل؛ وإليها الإشارة في قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿إنما مَثَلِيْ ومَثَلُ ما بَعَثَنِي الله به، كمثل رجل أتى قوما، فقال: يا قوم! إني رأيتُ الجيشَ بِعَيْنَيَّ، وإني أنا النذيرُ العريانُ، فالنجاءَ! النجاءَ! فأطاعه طائفة من قومه، فَأَدْلَجُوا، فانطلقوا على مَهَلِهم فَنَجَوْا، وكذَّبت طائفة منهم، فاصبحوا امكانَهم، فَصَبَّحَهُمُ الجيشُ، فاهلكهم واجْتَاحَهُمْ، فكذلك مَثَلُ من أطاعني فاتَّبَعَ ماجئتُ به، ومَثَلُ من عصاني وكذَّب ماجئت به من الحق﴾

وأما المجازاة بالوجه الرابع: فلا تكون إلا بعد بعثة الأنبياء، وكشفِ الشبهة، وصحة التبليغ ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ، وَيَحْيىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ والله أعلم.

ترجمہ: رہی پہلی دو وجہوں سے مجازات تو وہ ایک فطری بات ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور آپ فطرتِ خداوندی کو ہرگز بدلتا ہوا نہیں پائیں گے —— اور نہیں ہے وہ یعنی پہلی دو وجہوں سے مجازات مگر برّ واثم کی اصولی اور کلی باتوں میں، نہ کہ ان کی جزئیات واحکام میں —— اور یہ فطرت ہی وہ دین ہے جو زمانوں کے اختلاف سے

مختلف نہیں ہوتا اور تمام انبیاء ان باتوں میں متفق ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''یہ تمہارا یعنی سب انبیاء کا طریقہ ہے، جو کہ وہ ایک ہی طریقہ ہے'' اور آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں، ان کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں'' — اور اتنی مقدار پر مؤاخذہ ضرور رہونے والا ہے، بعثتِ انبیاء سے پہلے بھی اور بعد میں بھی یکساں طور پر۔

اور رہی تیسری وجہ سے مجازات تو وہ زمانوں کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے — اور زمانوں کا یہ اختلاف ہی بعثت انبیاؤرسل کا باعث ہے۔ اور اس اختلاف اعصار کی طرف اشارہ آیا ہے اس ارشاد نبوی میں کہ:

''میری حالت اور اس دین کی حالت جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مبعوث فرمایا ہے، اس شخص جیسی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا۔ پس اس نے کہا: اے میری قوم! میں نے دشمن کا لشکر اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ننگا (کھلم کھلا) ڈرانے والا ہوں، پس بچو! بچو! پس اس کی قوم کی ایک جماعت نے اس کی بات مان لی، سو وہ راتوں رات چلے، پس وہ چلتے رہے آہستہ آہستہ، پس نجات پائی انہوں نے۔ اور ان کی ایک جماعت نے جھٹلایا، پس انھوں نے وہیں صبح کی، پس شب خون مارا ان پر دشمن کے لشکر نے، پس ہلاک کر دیا ان کو اور جڑ مول سے اکھاڑ دیا ان کو، پس یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری فرماں برداری کی پس اس نے پیروی کی اس دین کی جس کو میں لے کر آیا ہوں، اور یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی، اور اس دین حق کو جھٹلایا جس کو میں لیکر آیا ہوں'' (یعنی جب زمانہ بدلا اور ضرورت متقاضی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ لوگوں کو آنے والے خطرہ سے واقف کریں)

اور رہی چوتھی وجہ سے مجازات تو وہ بعثت انبیاء کے بعد اور شبہات کھولنے کے بعد اور اچھی طرح تبلیغ کرنے کے بعد ہی ہوتی ہے: ''تاکہ جس کو برباد ہونا ہے وہ دلیل پہنچنے کے بعد برباد ہو، اور جس کو زندہ (ہدایت یافتہ) ہونا ہے، وہ دلیل پہنچنے کے بعد زندہ ہو (سورۃ الانفال آیت ۴۲)

لغات:

حُدُود الله: احکام شرعیہ...... **هى الحاملة** میں **هى** ضمیر اختلاف کی طرف لوٹتی ہے اختلاف مضاف نے تانیث مضاف الیہ **الأعصار** سے حاصل کی ہے، اس لئے مؤنث ضمیر استعمال کی ہے۔ **إليها** کی ضمیر بھی اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

تشریح:

ابوهم واحدٌ کسی روایت میں نظر سے نہیں گزرا، مسلم شریف کی روایت کے الفاظ یہ ہیں **الأنبيــاء إخوة من علاتٍ، وأمهاتُهم شتّى، ودينُهم واحد**. البتہ **علاّت** کا مفہوم **ابوهم واحد** ہے۔

☆ ☆ ☆

باب — ۹

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی فطرت مختلف بنائی ہے

سب لوگوں کی جبلت اور فطرت یکساں نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے گلہائے رنگ رنگ سے چمن کو مزین کیا ہے اور جبلتوں کے اس اختلاف سے انسانوں کے اعمال واخلاق مختلف ہوگئے ہیں، نیز ان کے کمالات کے مرتبے بھی مختلف ہوگئے ہیں، کوئی عام انسانی مرتبہ پر اٹک کر رہ جاتا ہے، اور کوئی اتنا اونچا اڑتا ہے کہ اس کی نہایت پانا ممکن نہیں ہوتا یعنی کوئی آفاق میں گم ہے تو کسی میں آفاق گم ہے۔

فطرت اور جبلّت کا یہ اختلاف درج ذیل دلائل سے ثابت ہے:

① حدیث شریف میں ہے کہ اگر تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے، تو تم اس خبر کو مان سکتے ہو، (کیونکہ پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا نہ عقلاً ممتنع ہے نہ عادۃً، بلکہ ممکن ہے، تو دے اور پہاڑ کبھی کبھی اپنی جگہ سے سرک جاتے ہیں) اور اگر تم کسی شخص کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی ہے، تو یہ بات مت مانو (کیونکہ فطرت میں تبدیلی گو عقلاً ممتنع نہیں مگر عادۃً تبدیلی نہیں ہوتی) وہ شخص لامحالہ کسی نہ کسی دن اس جبلت کی طرف ضرور لوٹے گا جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے (کیونکہ مشہور ہے کہ جبل گرددجبل نمی گردد! اور فی الحال جو اخلاق بدلے ہوئے نظر آرہے ہیں تو وہ تربیت کا اثر ہے اور تعارض کے وقت فطرت تربیت پر غالب آتی ہے بادشاہ کی بلیوں نے جب چوہیا دیکھی تھی تو وہ موم بتیاں پھینک کر چوہیا پر جھپٹ پڑی تھیں)

② آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "سنو! انسان مختلف المراتب پیدا کیے گئے ہیں (مثلاً:)

(الف) بعض مؤمن جنے جاتے ہیں (یعنی مسلمان والدین کے گھر میں یا اسلامی ماحول میں پیدا ہوتے ہیں) اور وہ مؤمن جیتے ہیں اور مؤمن مرتے ہیں — اور بعض کافر جنے جاتے ہیں، کافر جیتے ہیں، اور کافر مرتے ہیں — اور بعض مومن جنے جاتے ہیں، مؤمن جیتے ہیں اور کافر مرتے ہیں — اور بعض کافر جنے جاتے ہیں، کافر جیتے ہیں اور مؤمن مرتے ہیں۔

(ب) اور آپ ﷺ نے غصہ کے درجات کا ذکر فرمایا کہ بعض کو غصہ جلدی آتا ہے، اور جلدی اتر جاتا ہے، پس ایک کی دوسرے سے تلافی ہوجاتی ہے — اور بعض کو غصہ دیر میں آتا ہے اور دیر میں اترتا ہے، پس ایک کی دوسرے سے تلافی ہوجاتی ہے — اور بہترین شخص وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور جلدی اتر جائے — اور بدترین شخص وہ ہے جس کو غصہ جلدی آئے اور دیر میں اترے۔

(ع) اور آپ ﷺ نے قرض کے تقاضا کرنے کا ذکر فرمایا کہ بعض لوگ قرض کی ادائیگی میں اچھے ہوتے ہیں اور وصولی میں سخت ہوتے ہیں، پس ایک کی دوسرے سے تلافی ہو جاتی ہے ـــــ اور بعض ادائیگی میں برے ہوتے ہیں اور وصولی میں نرم ہوتے ہیں، تو بھی ایک کی دوسرے سے تلافی ہو جاتی ہے ـــــ اور بہترین شخص وہ ہے جو ادائیگی میں بھی اچھا ہو اور وصولی میں بھی نرم ہو ـــــ اور بدترین شخص وہ ہے جو ادائیگی میں برا ہو اور تقاضا کرنے میں بھی سخت ہو۔

یہ سب جبلت وفطرت کے اختلاف کا بیان ہے، اور بری عادت کو سنوارنے کی تعلیم ہے۔

(۳) آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''لوگ سونے چاندی کی کانوں کی طرح ہیں'' یعنی جس طرح سونے چاندی کی سب کانیں یکساں نہیں ہوتیں، لوگوں کی فطری صلاحیتیں بھی یکساں نہیں ہوتیں۔

(۴) اور اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''کہئے کہ ہر شخص اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے'' یعنی ہر شخص کی ایک فطری عادت اور جبلی طبیعت ہوتی ہے، وہ اسی ڈھب پر کام کرتا رہتا ہے۔

ان تمام نصوص سے یہ مدعیٰ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فطرت مختلف بنائی ہے اور وہی اعمال واخلاق کے اختلاف کا سبب ہے اور مراتب کمال کا بھی اسی پر انحصار ہے۔

﴿باب اختلاف الناس في جِبِلَّتهم﴾

المستوجِبِ لاختلاف أخلاقهم، وأعمالهم، ومراتبِ كمالهم

والأصل فيه: ما رُوِى عن النبى صلى الله عليه وسلم، أنه قال: ﴿إذا سمعتُم بجبلٍ زال عن مكانه فصدِّقُوْه، وإذا سمعتم برجلٍ تَغَيَّرَ عن خَلْقِه فلا تصدِّقوا به، فإنه يصير إلى ما جُبل عليه﴾

وقال: ﴿ألا إن بنى آدم خُلقوا على طبقات شتّٰى: فمنهم من يُولَد مؤمنًا﴾ فذكر الحديث بطوله؛ وذكر طبقاتِهم فى الغضب، وتقاضِى الدين.

وقال: ﴿الناس معادنُ كمعادن الذهب والفضة﴾

وقال الله تعالى: ﴿قُلْ: كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ أى طريقته التى جُبل عليها.

ترجمہ: جبلت میں لوگوں کے مختلف ہونے کا بیان، جو ان کے اخلاق، اعمال اور کمال کے مرتبوں کے مختلف ہونے کا سبب ہے: اور بنیاد اس بارے میں وہ روایت ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اس کی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کو مان لو۔ اور جب تم کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی ہے تو اس کو مت مانو، پس بیشک وہ لوٹنے والا ہے اس فطرت کی طرف جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے''[1]

[1] مشکوٰۃ ا:۲۴ باب الایمان بالقدر، فیض القدیر ا:۳۸۱ وهذا حديث منقطع، فإن الزهرى لم يُدرك أبا الدرداء

اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سنو! انسان مختلف طبقات پر پیدا کیے گئے ہیں، پس ان میں سے بعض مؤمن جنے جاتے ہیں'' پھر راوی نے لمبی حدیث ذکر کی اور غصے میں اور قرض کا تقاضا کرنے میں انسانوں کے طبقات کا ذکر کیا (مشکوۃ ۲:۴۳۷ باب الامر بالمعروف)

اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ''لوگ کانیں ہیں، سونے چاندی کی کانوں کی طرح'' (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب العلم حدیث ۲۰۱)

اور اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ''کہیے: ہر کوئی عمل کرتا ہے اپنے انداز پر'' یعنی اس طریقہ پر جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے (بنی اسرائیل آیت ۸۴)

لغات:

شَاكِلة (اسم فاعل) فطری طریقہ اور روش۔ شَکل سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مانند، نظیر، کہا جاتا ہے لَستَ من شَکْلِیْ ولاَ شاكِلَتِي (تو نہ میری طرح ہے، نہ میری روش پر ہے) اس کا مترادف سَجِيَّةٌ ہے جس کے معنی ہیں فطری عادت۔



ملکیت اور بہیمیت کے مختلف انداز

انسانوں میں جو فطری اختلاف پایا جاتا ہے وہ آپ نے دلائل نقلیہ سے سمجھ لیا، اب شاہ صاحب قدس سرہ اپنے انداز پر یہ بات سمجھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں جو دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں یعنی ملکیت اور بہیمیت، وہ دونوں قوتیں تمام انسانوں میں یکساں نہیں ہوتیں، نہ ان کا باہمی اجتماع ایک نہج پر ہوتا ہے، ملکیت کے بھی ہزار انداز ہیں، اور بہیمیت کے بھی، اور ان کا اجتماع بھی بیشمار طریقوں پر ہوتا ہے، اس وجہ سے ہر انسان کی افتادِ طبع مختلف ہوتی ہے اور اعمال و اخلاق اور مراتب کمال میں تفاوت ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قوت ملکیہ دو طرح کی ہوتی ہے۔

۱ــــ ملأ اعلی جیسی ملکیت: جس شخص میں اس طرح کی ملکیت ہوتی ہے وہ ملأ اعلی جیسے کام کرتا ہے۔ ملأ اعلی کے چار احوال ہیں:

(الف) وہ اسمائے حسنی اور صفات باری تعالیٰ کے علوم سے رنگین رہتے ہیں، پس جن لوگوں میں ملأ اعلی جیسی ملکیت ہوتی ہے وہ بھی اسماء وصفات کے علوم سے رنگین ہونے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ان صفات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ب) وہ جبروت کی باریکیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق جو معاملات ہیں وہ جبروت

کہلاتے ہیں اور جبروت کی باریکیاں اسرار الٰہیہ کہلاتی ہیں، پس جن لوگوں میں ملأ اعلیٰ جیسی ملکیت ہوتی ہے وہ بھی اسرار الٰہیہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ج) اللہ تعالیٰ کو زمین میں جو نظام پسند ہے، ملأ اعلیٰ اس کو تفصیل سے سمجھ کر حاصل کرتے ہیں، پس جن لوگوں میں ملأ اعلیٰ جیسی ملکیت ہوتی ہے وہ بھی اللہ کی مرضی اور اللہ کے پسندیدہ نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ کا پسندیدہ نظام دین اسلام اور اعمال صالحہ والا نظام ہے۔

(د) ملأ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نظام کو وجود میں لانے کی طرف پوری توجہ مبذول کئے رہتے ہیں، پس ملأ اعلیٰ جیسی ملکیت رکھنے والے حضرات بھی نظام اسلامی کو بروئے کار لانے کی محنتوں میں لگے رہتے ہیں، ان کی پوری توانائیاں اسی پر خرچ ہوتی ہیں، اور ان کی شب و روز کی محنتیں اسی نقطہ پر مرکوز رہتی ہیں۔

۲ ــــــ ملأ سافل جیسی ملکیت: جن لوگوں میں اس طرح کی ملکیت ہوتی ہے، وہ ملأ سافل والے کام کرتے ہیں۔ ملأ سافل کے تین احوال ہیں:

(الف) ملأ سافل پر عالم بالا سے ایک تقاضا مترشح ہوتا ہے، وہ اس کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مگر وہ اس معاملہ کا پوری طرح احاطہ کئے ہوئے نہیں ہوتے، نہ ان کی پوری توجہ اس پر مجتمع ہوتی ہے، نہ وہ اس کی پوری تفصیلات جانتے ہیں، بس جو حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں، مثلاً حق اور باطل کی جنگ ہورہی ہے، اہل باطل نے اہل حق پر بم پھینکا یا میزائل داغا، ملأ سافل کو حکم ملتا ہے کہ اسے بے اثر کردیں، وہ کوئی ایسی اڑچن کھڑی کردیتے ہیں کہ وہ نشانہ پر لگنے کے بجائے کہیں اور جگہ پر گرتا ہے، اور بے کار ہوجاتا ہے۔ مگر ملأ سافل کو بم اور میزائل رکوانے کے نتائج وعواقب کا پورا علم نہیں ہوتا نہ وہ جنگ کا نتیجہ جانتے ہیں، انہیں جو حکم ملا ہے بس وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں میں ملأ سافل جیسی ملکیت ہوتی ہے، ان کو اکابر کی طرف سے جو دینی کام یا ذکر وعمل بتایا جاتا ہے وہ اس میں لگ جاتے ہیں، مگر وہ معاملہ کا پوری طرح احاطہ کئے ہوئے نہیں ہوتے، نہ ان کی پوری توجہ اس کام پر مجتمع ہوتی ہے، نہ وہ اس کی پوری تفصیلات جانتے ہیں، بس ان کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں۔

(ب) ملأ سافل سراپا نور ہوتے ہیں، پس ملأ سافل جیسی ملکیت رکھنے والے حضرات بھی سراپا نور بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ج) وہ بہیمی آلائشوں سے پاک وصاف ہوتے ہیں، پس ان کے انداز کے لوگ بھی خود کو ایسی آلائشوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور قوت بہیمیہ بھی دو طرح کی ہوتی ہے:

۱ ــــــ نہایت تیز وتند بہیمیت: جیسے اس مست قوی اونٹ کی حالت، جس کی پرورش وافر غذا اور مناسب انداز پر ہوئی ہو، چنانچہ وہ جسیم، مضبوط، بلند آواز، سخت گیر، ارادہ نافذہ رکھنے والا، نہایت متکبر، قوی غیظ وغضب والا اور شدید حسد وکینہ

رکھنے والا، وافر قوت شہوانی رکھنے والا، مقابلہ میں غالب ہونے کا جذبہ رکھنے والا اور بہادر دل والا ہوتا ہے پس جن لوگوں میں اس قسم کی بہیمیت ہوتی ہے ان میں بھی یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

۲ ـــــ نہایت ضعیف بہیمیت: جیسے بدھیا، ناقص الخلقت کی حالت، جس کی پرورش قحط سالی میں نہایت نامناسب انداز پر ہوئی ہو، چنانچہ اس کا جسم معمولی اور کمزور رہ گیا ہو، آواز پتلی، گرفت ڈھیلی، بزدل، بے ہمت اور مقابل پر غالب آنے کا کوئی جذبہ اس میں نہیں ہوتا، جن لوگوں میں ایسی بہیمیت ہوتی ہے وہ بھی بہیمی آلائشوں میں کم گھستے ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ملکیت اور بہیمیت کے یہ دو دو انداز کچھ تو فطری ہوتے ہیں، جن کو آدمی بدل نہیں سکتا، مگر ان کو بنا بگاڑ سکتا ہے اور کچھ اس میں انسان کے اکتساب کا دخل ہوتا ہے، بعض اعمال، ملکیت کو اور اس کے ایک رخ کو تقویت پہنچاتے ہیں اور بعض اعمال بہیمیت کو اور اس کے ایک رخ کو بڑھاوا دیتے ہیں، مثلاً اعمال صالحہ، نیک لوگوں کی معیت، ذکر و اذکار اور اسرار الٰہیہ میں غور و فکر ملکیت کو قوی کرتے ہیں اور اس کو مدد پہنچاتے ہیں اور رفتہ رفتہ آدمی میں اعلیٰ درجہ کی ملکیت پیدا ہو جاتی ہے اور دنیوی غفلتوں، معاصی اور برے اعمال کی صورت حال اس کے برعکس ہے۔

وإن شئتَ أن تَسْتَجْلِيَ مافتح اللّٰه عليَّ في هذا الباب وفهَّمَنِيْ من معاني هذه الأحاديث:

فاعلم: أن القوة الملكية تُخلَقُ في الناس على وجهين:

أحدهما: الوجهُ المناسِبُ بالملأ الأعلى؛ الذين شأنُهم الانصباغُ بعلوم الأسماء والصفات، ومعرفةُ دقائق الجبروت، وتَلَقِّى نظامٍ على وجه الإحاطة به، واجتماعِ الهمة على طلب وجوده.

والثاني: الوجهُ المناسب بالملأ السافل: الذين شأنهم انبعاثٌ بداعية تترشح عليهم من فوقهم، من غير إحاطة، ولا اجتماع الهمة، ولا المعرفة؛ ونورانيةٌ؛ ورفضٌ للألواث البهيمية.

وكذلك القوة البهيمية تُخلق على وجهين:

أحدهما: البهيميةُ الشديدةُ الصَّفِيْقَةُ، كهيئة الفَحْل الفَارِهِ، الذي نشأ في غذاءٍ غزيرٍ وتدبيرٍ مناسبٍ، فكان عظيمَ الجسم، شديدَه، جَهوريَّ الصوت، قويَّ البطش، ذاهمةٍ نافذةٍ، وتِيهٍ عظيم، وغضبٍ وحسدٍ قويَّيْن، وشَبَقٍ وافرٍ، مُنَافِسًا في الغلبة والظهور، شجاعَ القلب.

والثاني: البهيمية الضعيفة المُهَلْهَلَةُ، كهيئة الْخَصِيِّ المُخْدَجِ، الذي نشأ في جذبٍ وتدبيرٍ غير مناسبٍ، فكان حقيرَ الجسم، ضعيفَه، ركيكَ الصوت، ضعيفَ البطش، جَبَانَ القلب، غيرَ ذي همة، ولا منافِسَةٍ في الغلبة والظهور.

والقوتان جميعًا، لهما جبلَّةٌ تُخصِّصُ أحدَ وَجْهَيْها، وكَسْبٌ يُؤَيِّدُه، ويُقوِّيه، ويمدُّه.

ترجمہ: اور اگر آپ وہ بات واضح طور پر جاننا چاہتے ہیں، جو اللہ نے مجھ پر اس باب میں کھولی ہے، اور مجھے ان

حدیثوں کا جو مطلب سمجھایا ہے تو جان لیجئے کہ قوت ملکیہ انسانوں میں دو طرح پر پیدا کی جاتی ہے۔

ان میں سے ایک: ملأ اعلیٰ کے مناسب رخ ہے، وہ ملأ اعلیٰ جن کا حال اسماء وصفات کے علوم سے رنگین ہونا ہے، اور جبروت کی باریکیوں کو پہچاننا ہے اور (عالم زیریں کے) نظام کو (عالم بالا سے) حاصل کرنا ہے، اس کا احاطہ کرنے کے طور پر، اور اس کے پائے جانے کو چاہنے پر پوری توجہ کو اکٹھا کرنا ہے۔

اور دوسرا: ملأ سافل کے مناسب رخ ہے، وہ ملأ سافل جن کا حال: اس داعیہ سے اٹھ کھڑا ہونا ہے، جو ان پر ان کے اوپر سے ٹپکتا ہے، اُن امور کا پوری طرح احاطہ کئے بغیر، اور پوری توجہ جمع کئے بغیر، اور اچھی طرح سے ان کی معرفت حاصل کئے بغیر؛ اور وہ سراپا نور ہیں؛ اور بہیمی آلائشوں کو بالکلیہ چھوڑنے والے ہیں۔

اور اسی طرح قوت بہیمیہ بھی دو طرح پر پیدا کی جاتی ہے:

ان میں سے ایک: سخت مضبوط بہیمیت ہے، جیسے اُس قوی سانڈ کی حالت، جس نے بہت زیادہ غذا اور مناسب تدبیر میں پرورش پائی ہو پس وہ جسیم، مضبوط بدن والا، بلند آواز، سخت گیر، نافذ ارادے والا، نہایت متکبر، تیز غصہ والا بے حد حسد کرنے والا، مجامعت کی بہت زیادہ خواہش رکھنے والا، غالب آنے اور جیتنے کی ریس کرنے والا اور بہادر دل والا ہو۔

اور دوسری: کمزور پتلی بہیمیت ہے، جیسے اُس آختہ جانور کی حالت جو قبل از وقت پیدا ہوگیا ہو، جو قحط سالی اور نامناسب تدبیر میں پلا ہو، پس وہ معمولی اور کمزور جسم والا، پتلی آواز والا، کمزور گرفت والا، بزدل، بے ہمت اور غلبہ اور جیتنے کی بالکل ریس نہ کرنے والا ہو۔

اور دونوں ہی قوتیں: ان کے لئے ایک فطرت ہے، جو اس کے دو رخوں میں سے ایک کو مخصوص کرتی ہے اور اکتسابی اعمال ہیں جو اس ایک رخ کی تائید کرتے ہیں اور اس کو تقویت اور کمک پہنچاتے ہیں۔

لغات:

اِستَجلَى الشيءَ: واضح کرنے کو کہنا...... **فَهَّمه وأفهَمه**: سمجھانا...... **صَفُقَ الثوبُ**: کپڑے کا گف یعنی خوب مضبوط بُنا ہوا ہونا **الصفيق**: نہایت ٹھوس، مضبوط...... **الفارِهُ**: قوی، خوب کھانے والا، خوش عیش **فَرُهَ** (ک) **فَرَاهَةً**: خوش ہونا، سبک ہونا...... **غزير**: بہت زیادہ **مَطَرٌ غزير**: بہت بارش...... **التِّيهُ**: ڈینگ، غرور...... **المُهَلْهَلَة**: باریک، کمزور **هَلْهَلَ النسّاجُ الثوبَ**: کپڑے کو باریک بننا...... **مخدَج**: وہ بچہ جو مدت حمل تمام ہونے سے پہلے پیدا ہوگیا ہو **خَدَجَتِ الناقةُ**: اونٹنی کا قبل از وقت بچہ جننا، **مخدِج** (بکسر الدال) اونٹنی ہے اور **مخدَج** (بفتح الدال) بچہ ہے۔

ترکیب: نورانیة اور رفض کا عطف انبعاث پر ہے۔

ملکیت اور بہیمیت کا اجتماع

اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو متضاد قوتیں ودیعت فرمائی ہیں یعنی ملکیت اور بہیمیت۔ ان دونوں قوتوں کے تقاضے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، پھر یہ دونوں قوتیں انسان میں جمع کیسے ہیں؟ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں متضاد قوتیں انسان میں دو طرح پر جمع ہوتی ہیں: ایک باہمی کشمکش کے ساتھ، دوسرے مصالحت کے ساتھ، اگر دونوں قوتیں اپنے تقاضے کامل طور پر پورا کرنا چاہیں، تو ضرور دونوں میں رسہ کشی ہوگی، اور اگر ہر قوت اپنے کچھ تقاضے چھوڑ دے تو باہم موافقت ہو جائے گی۔

مثلاً دو مختلف طبیعت، مزاج، خواہش اور جذبات رکھنے والے زوجین ایک گھر میں جمع ہوں تو یہ اجتماع دو طرح پر ہوگا۔ اگر دونوں اپنی چلائیں گے تو منازعت ہوگی اور زندگی اجیرن ہو جائے گی اور مصالحت کرلیں گے یعنی ہر شریک حیات اپنے کچھ تقاضے اور مطالبات چھوڑ دے گا اور دوسرے کی موافقت کرلے گا تو زندگی خوش گوار بسر ہوگی اسی طرح ملکیت اور بہیمیت کا اجتماع بھی انسان میں دو طرح پر ہوتا ہے:

۱ ــــ باہمی کشمکش کے ساتھ: ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب ہر قوت اپنے تقاضوں کو کامل طور پر پوار کرنا چاہے، ہر قوت کی نظر اس کی آخری حد کی طرف اٹھی رہے، اور ہر ایک اپنے فطری انداز پر چلنا چاہے تو یقیناً ان میں کھینچا تانی ہوگی۔ ملکیت کا کامل تقاضا اللہ سے ملنا اور ملأ اعلیٰ میں شامل ہونا ہے اور بہیمیت کے پیش نظر مفاد پرستی، خود غرضی، دنیا پر ریجھنا اور حیوانی حالتوں پر شیفتہ رہنا ہے۔ پھر اگر ملکیت غالب آجاتی ہے تو بہیمیت کے اثرات مضمحل ہو جاتے ہیں، اور بہیمیت غالب آتی ہے تو ملکیت کے آثار ماند پڑ جاتے ہیں۔

۲ ــــ مصالحت اور موافقت کے ساتھ: ایسا اس صورت میں ہوتا ہے کہ ملکیت اپنے اعلیٰ تقاضے سے ذرا نیچے اتر آئے، ملکیت کی پرواز وصول الی اللہ اور شمول مع الملأ الاعلیٰ تک ہے، وہ اس مطالبہ سے ذرا نیچے اتر آئے، اور ایسی باتوں پر قناعت کرلے جو خالص مطالبہ کے لگ بھگ ہیں، اور وہ یہ امور ہیں:

(۱) عقل کے مقتضی پر چلنا اور نفس، خواہش اور طبیعت کی پیروی نہ کرنا۔

(۲) سخاوت نفس سے کام لینا۔ سخاوت، شُحّ کی ضد ہے۔ شُحّ کے معنی ہیں خود غرضی، پس سخاوتِ نفس یہ ہے کہ آدمی دوسروں کا بھلا چاہے، حدیث میں ہے کہ: ''دین خیر خواہی کا نام ہے'' پوچھا گیا: کس کی؟ فرمایا: ''اللہ کی، اللہ کی کتاب کی، اللہ کے رسول کی، مسلمانوں کے پیشواؤں کی اور تمام مسلمانوں کی'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۴۹۶۶)

(۳) پاکدامنی اختیار کرنا اور صرف ظاہری پاکدامنی نہیں، بلکہ طبیعت اور مزاج بھی پاک ہو جائے۔

(۴) عام لوگوں کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینا، قرآن کریم میں انصار کی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مہاجرین کو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان کا فاقہ ہی کیوں نہ ہو (سورۃ الحشر آیت ۹)

(۵) آخرت پر نظر رکھنا، صرف دنیا پر نظر نہ روک لینا۔
(۶) تمام امور میں نظافت اور پاکیزگی کا خیال رکھنا۔
مذکورہ تمام امور ملکیت کے اعلیٰ تقاضے تو نہیں ہیں، مگر ہیں بہرحال ملکوتی اعمال، اس لئے ملکیت ان امور کی طرف اتر آئے اور بہیمیت اپنے خالص تقاضوں سے ذرا بلند ہوجائے اور ایسے کام کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے جو مفاد عامہ سے بعید ہوں نہ متضاد، تو دونوں قوتوں میں مصالحت ہوجائے گی، اور ایک ایسا مزاج وجود میں آئے گا جس میں کوئی اختلاف نہ ہوگا۔

واجتماع القوتين فيهم أيضاً يكون على وجهين:
فتارة: تجتمعان بالتجاذب: تكون كلُّ واحدة متوفرةً في طلب مقتَضَيَاتها، طامحةً في أقصى غاياتها، مريدةً سَنَنَها الطبيعيَّ، فلا جرم أن يقع بينهما التجاذبُ؛ فإن غلبت هذه اضْمَحَلَّتْ آثارُ تلك، وكذلك العكس.
وتارة: بالاصطلاح، بأن تنزل الملكيةُ عن طلب حكمها الصُّراح إلى ما يَقْرُبُ منه: من عقلٍ، وسَخَاوَةِ نفس، وعِفَّةِ طبع، وإيثارِ النفع العام على انتفاع نفسه خاصةً، والنظرِ إلى الآجل دون الاقتصار على العاجل، وحُبِّ النظافة في جميع مايتعلّق به؛ وتَتَرَقّى البهيميةُ من طلب حكمها الصُّراح إلى ماليس ببعيد من الرأي الكلي، ولامُضَادٍّ له، فَتَصْطَلِحَانِ، ويحصل مزاجٌ لاتخالُفَ فيه

ترجمہ: اور انسانوں میں دو قوتوں کا اکٹھا ہونا بھی دو طرح پر ہوتا ہے:
پس کبھی: دونوں اکٹھا ہوتی ہیں کشمکش کے ساتھ: ہر ایک اپنے تقاضوں کے مطالبہ میں ہمت صرف کرنے والی ہوتی ہے، اپنی آخری حد کی طرف نظر اٹھانے والی ہوتی ہے، اپنے فطری انداز کو چاہنے والی ہوتی ہے، پس یقیناً ان دونوں کے درمیان رسہ کشی ہوگی، پھر اگر یہ غالب آئے گی تو اُس کے آثار ماند پڑ جائیں گے، اور اسی طرح برعکس۔
اور کبھی: مصالحت کے ساتھ (اکٹھا ہوتی ہیں) بایں طور کہ ملکیت اس کے خالص حکم کے مطالبہ سے اُتر آتی ہے، اُن چیزوں کی طرف جو اس خالص حکم سے نزدیک ہوتی ہیں یعنی عقل، دریا دلی، طبیعت کی پاکیزگی، عام لوگوں کے فائدے کو اپنے ذاتی نفع پر ترجیح دینا، مآل (آخرت) کی طرف نظر رکھنا، دنیا پر نظر روک نہ لینا اور پاکیزگی کو پسند کرنا ان تمام چیزوں میں جو آدمی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور بہیمیت اس کے خالص حکم کے مطالبہ سے اس چیز کی طرف چڑھے جو مفاد عامہ سے دور نہ ہو اور نہ اس کے مخالف ہو، پس دونوں قوتوں میں مصالحت ہوجائے گی اور ایک ایسا مزاج وجود میں آئیگا جس میں کوئی اختلاف نہ ہوگا۔

لغات:
توَفَّر على كذا: ہمت صرف کرنا...... **طَمَحَ بَصَرُهُ إليه**: نگاہ اٹھنا...... **السَّنَن**: طریقہ، بڑا راستہ...... **الصُّراح**:

خالص...... اصْطَلَحَ القوم: رضامند ہونا...... الرأي الكلي: مفاد عامہ: یہ شاہ صاحب کی خاص اصطلاح ہے۔

☆ ☆ ☆

ملکیت و بہیمیت اور ان کے اجتماع کی اقسام

ملکیت کی دو جانبیں ہیں: ایک اعلی دوسری ادنی، اور ایک ان کے بیچ کا نقطہ ہے، پھر بیچ کے نقطہ سے طرف اعلی اور طرف ادنی کی جانب یا بالفاظ دیگر اطراف سے بیچ کے نقطے کی طرف بہت سے نقطے ہوتے ہیں۔

یہی حال بہیمیت کا بھی ہے اور یہی صورت حال دونوں قوتوں کے باہمی اجتماع کی بھی ہے یعنی اعلی درجہ کا اجتماع، ادنی درجہ کا اجتماع، اور بین بین صورت، پھر بین بین صورت اور اعلی درجہ کے درمیان بھی درجے ہیں، اسی طرح بین بین صورت اور ادنی درجہ کے درمیان بھی درجے ہیں

پھر جب ان کو باہم ضرب دیں گے تو بے شمار قسمیں پیدا ہونگی، مگر ان میں سے آٹھ قسمیں بنیادی ہیں، ان کے احکام علحدہ علحدہ ہیں، اگر وہ احکام جان لئے جائیں تو باقی اقسام کے احکام خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔ وہ آٹھ اقسام یہ ہیں:

(۱و۲) ملکیت عالیہ تجاذب کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

(۳و۴) ملکیت سافلہ تجاذب کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

(۵و۶) ملکیت عالیہ مصالحت کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

(۷و۸) ملکیت سافلہ مصالحت کے ساتھ جمع ہو بہیمیت شدیدہ کے ساتھ یا بہیمیت ضعیفہ کے ساتھ

نقشہ یہ ہے

نمبر شمار	کیفیتِ ملکیت	کیفیت بہیمیت	کیفیت اجتماع
۱	عالیہ	شدیدہ	تجاذب
۲	عالیہ	ضعیفہ	تجاذب
۳	سافلہ	شدیدہ	تجاذب
۴	سافلہ	ضعیفہ	تجاذب
۵	عالیہ	شدیدہ	مصالحت
۶	عالیہ	ضعیفہ	مصالحت
۷	سافلہ	شدیدہ	مصالحت
۸	سافلہ	ضعیفہ	مصالحت

ولكل من مرتبَتَي الملكية والبهيمية والاجتماع طرفان ووَسَطٌ، ومايَقْرُبُ من طرف أو وَسَطٍ؛ وكذلك تذهب الأقسامُ إلى غير النهاية؛ إلا أن رء وس الأقسام المنفرِزة بأحكامها، والتي يُعرف غيرُها بمعرفتها، ثمانيةٌ، حاصلةٌ من انقسام الاجتماع بالتجاذب إلى أربعة: ملكية عالية تجتمع مع بهيمية شديدة، أو ضعيفة، أو ملكية سافلة تجتمع مع بهيمية شديدة، أو ضعيفة؛ والاجتماع بالاصطلاح أيضًا إلى أربعة مِثْلِهَا؛ ولكل قسم حكمٌ لايختلفُ؛ من وُفِّقَ لمعرفة أحكامها اسْتَرَاحَ من تشويشات كثيرة.

ترجمہ: اور قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ اور ان دونوں کے اجتماع میں سے ہر ایک مرتبہ کے دو دو اطراف ہیں، اور ایک درمیان ہے اور وہ درجات ہیں جو طرف یا وسط سے نزدیکی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس طرح قسمیں بے شمار حد تک چلی جاتی ہیں، لیکن بڑی اقسام، جو اپنے احکام کے ساتھ جدا ہونے والی ہیں، اور جن کے احکام معلوم ہونے سے دوسری قسموں کے احکام معلوم ہو جاتے ہیں، آٹھ ہیں، جو تجاذب کے ساتھ اجتماع کے چار صورتوں پر منقسم ہونے سے پیدا ہوتی ہیں (یعنی) ملکیت عالیہ اکٹھا ہو بہیمیت شدیدہ یا ضعیفہ کے ساتھ یا ملکیت سافلہ اکٹھا ہو بہیمیت شدیدہ یا ضعیفہ کے ساتھ؛ اور مصالحت کے ساتھ اجتماع بھی ایسی ہی چار قسموں کی طرف منقسم ہوتا ہے، اور ہر قسم کے لئے ایسے احکام ہیں جو مختلف نہیں ہوتے، جس شخص کو ان کے احکام جاننے کی توفیق مل گئی، وہ بہت سی پریشانیوں سے آرام پالے گا۔

لغات: المنفرِزة (اسم فاعل) اِنْفَرَزَ عن الشيئ: جدا ہونا ...... اِسْتَرَاحَ اسْتِرَاحَةً: آرام پانا ...... تشويش: پریشانی شَوَّشَ الأمرَ: بے ترتیب کرنا۔

☆ ☆ ☆

اقسام ثمانیہ کے ضروری احکام

پہلا حکم: ریاضات شاقہ کی سب سے زیادہ ضرورت (۳،۱،۵و۷) کو ہوتی ہے، جن کی بہیمیت بہت سخت ہوتی ہے کیونکہ بہیمیت کی تعدیل، بری حالت کو اچھی حالت سے بدلنا، اخلاق کو سنوارنا: عبادتوں میں محنت کرنے اور حقائق میں غور کرنے ہی سے ہوسکتا ہے، پھر ان میں سے بھی (۱و۳) کو ریاضات کی بہت زیادہ ضرورت رہتی ہے، کیونکہ ان دو قسموں میں ملکیت اور بہیمیت میں باہم کشمکش ہوتی ہے، اس لئے بہیمیت کو لگام دینے کے لئے عبادات وریاضات کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا حکم: کمالات سے حظ وافر وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جن کی ملکیت عالیہ ہوتی ہے یعنی (۱،۲،۵و۶) پھر (۵و۶) جن کی ملکیت اور بہیمیت میں مصالحت ہوتی ہے عمل میں بہتر ہوتے ہیں اور وہ زیادہ سلیقہ مند ہوتے ہیں اور (۱و۲) جن کی

ملکیت اور بہیمیت میں کشمکش ہوتی ہے، جب وہ بہیمیت کے چنگل سے نکل جاتے ہیں تو علم خوب حاصل کرتے ہیں، مگر عمل کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے،

تیسرا حکم: اہم کام جیسے جہاد وغیرہ میں سب سے زیادہ بے رغبت وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی بہیمیت کمزور ہے، یعنی (۲،۴،۶و۸) پھر (۲و۶) جن کی ملکیت عالیہ ہے، سب کام چھوڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور (۴و۸) جن کی ملکیت سافلہ ہے جب وہ بہیمیت کے چنگل سے نکل جاتے ہیں، تو سب کچھ چھوڑ کر آخرت کی تیاری میں لگ جاتے ہیں اور اگر بہیمیت کے چنگل سے نہیں نکل پاتے، تو سستی اور آرام طلبی کے طور پر سب کچھ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

ونحن نذكرههنا من ذلك ما نحتاج إليه في هذا الكتاب:

[۱] فأحوجُ الناس إلى الرياضات الشاقَّة: من كانت بهيميتُه شديدةً، لاسيما صاحبُ التجاذب.

[۲] وأحظاهم بالكمال، من كانت ملكيتُه عاليةً، لكنَّ صاحبَ الإصْطِلاحِ أحسنُهم عملاً، وآدَبُهُمْ؛ وصاحبَ التجاذُب: إذا انْفَلَتَ من أُسْرِ البهيمية أكثَرُهم علمًا، ولايبالي بآداب العمل كثيرَ مُبَالاة.

[۳] وأزهدُهم في الأمور العظام: أضعفهم بهيميةً، لكنَّ صاحبَ العالية يترك الكل تَفَرُّغًا للتوجه إلى الله؛ وصاحبَ السافلة إن انفلتَ يتركه للآخرة، وإلايتركه كَسَلاً ودَعَةً.

ترجمہ: اور ہم یہاں اُن احکام میں سے ان کو ذکر کرتے ہیں جن کی ہمیں اس کتاب میں ضرورت ہے:

(۱) پس لوگوں میں سب سے زیادہ محتاج پر مشقت ریاضتوں کے وہ لوگ ہیں جن کی بہیمیت سخت ہے، بالخصوص کشمکش والے۔

(۲) اور لوگوں میں سب سے زیادہ کمالات حاصل کرنے کی توفیق ان لوگوں کو ملتی ہے جن کی ملکیت عالیہ ہے البتہ مصالحت والے ان میں عمل کے اعتبار سے اچھے ہوتے ہیں اور ان میں زیادہ شائستہ اور مہذب ہوتے ہیں؛ اور کشمکش والے جب بہیمیت کی قید سے نکل جاتے ہیں تو وہ ان میں علم کے اعتبار سے زیادہ ہوتے ہیں اور وہ عمل کے آداب کی کچھ بہت زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔

(۳) اور بڑے کاموں میں سب سے زیادہ بے رغبت وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی بہیمیت سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہے، البتہ ملکیت عالیہ والے سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے فارغ ہونے کے طور پر، اور ملکیت سافلہ والا اگر بہیمیت سے چھوٹ جاتا ہے تو سب کچھ چھوڑ دیتا ہے آخرت (کی تیاری) کے لئے، ورنہ سب

کچھ چھوڑ دیتا ہے، سستی اور آرام طلبی کے طور پر۔

لغات:

ریاضت: پُر مشقت محنت...... أحظى: بڑا رتبہ حاصل کرنے والا حظِيَ (س) حُظوۃ: حصہ پانا...... آدَبُ (اسم تفضیل) بڑا شائستہ أدُب (ک) أدَبًا: صاحب ادب ہونا، مہذب اور شائستہ ہونا...... انفَلَتَ: تخلّص: نجات پانا، چھوٹنا...... دَعَۃٌ: استراحۃ.

☆ ☆ ☆

چوتھا حکم: پُر مشقت کاموں میں وہ لوگ زبردستی گھستے ہیں جن کی بہیمیت سخت ہوتی ہے، یعنی (۱، ۳، ۵ و ۷) پھر

(الف) جن لوگوں کی ملکیت عالیہ ہے یعنی (۱ و ۵) وہ ریاست وحکومت کے کاموں کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔

(ب) اور جن کی ملکیت سافلہ ہے، یعنی (۳ و ۷) وہ جنگ اور بوجھ ڈھونے کے کاموں کے لئے زیادہ موزون ہیں۔

(ج) اور جن کی ملکیت اور بہیمیت میں تجاذب ہے، یعنی (۱ و ۳) وہ جب بہیمیت کی طرف جھکتے ہیں تو صرف دنیوی کاموں کے ہوکر رہ جاتے ہیں، اور جب ملکیت کی طرف ترقی کرتے ہیں تو صرف دینی کاموں میں، نفس کو سنوارنے میں اور اس کو مادے سے مجرد کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

(د) اور جن کی ملکیت اور بہیمیت میں مصالحت ہے، یعنی (۵ و ۷) وہ دین ودنیا کے کاموں میں ایک ساتھ مشغول ہوتے ہیں، اور دونوں باتوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں وہ "درکفے جام شریعت، درکفے سندانِ عشق" پر عمل کرتے ہیں۔

[٤] وأشدُّهم اقتحاما في الأمور العظام: أشدُّهم بهيمية، لكنَّ صاحبَ العالية أقومُهم بالرياسات، ونحوِها مما يناسب الرأيَ الكلي؛ وصاحبَ السافلة أشدُّهم اقتحاما في نحو القتال وحمل الأثقال؛ وصاحبَ التجاذُبِ إذا اندفع إلى الأسفل اشتغل بالأمر الدنيوي فقط، وإذا ترقى إلى الأعلى اشتغل بالأمر الديني وتهذيب النفس وتجريدها فقط؛ وصاحبَ الاصطلاح يشتغل بهما جميعًا، ويقصدهما مرة واحدة.

ترجمہ: (۴) اور ان میں سے بڑے کاموں میں اندھا دُھند گھسنے والا، وہ شخص ہے جس کی بہیمیت ان میں سب سے زیادہ سخت ہے، البتہ ملکیت عالیہ والا حکومتوں اور ان کے مانند کاموں کو جو مفادات عامہ سے تعلق رکھتے ہیں، سرانجام دینے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے؛ اور ملکیت سافلہ والا ان میں زیادہ گھسنے والا ہوتا ہے جنگ اور بار برداری جیسے کاموں میں؛ اور کشمکش والا جب نیچے کی طرف بہتا ہے (یعنی بہیمیت کی طرف جھکتا ہے) تو صرف دنیوی کاموں میں مشغول ہوتا ہے اور

جب برتر کی طرف چڑھتا ہے تو صرف دینی کام میں اور نفس کو سنوارنے میں اور اس کو مادے سے مجرد کرنے میں مشغول ہوتا ہے؛ اور مصالحت والا دونوں ہی کاموں میں مشغول ہوتا ہے، اور دونوں ہی باتوں کا ایک ساتھ ارادہ کرتا ہے۔

لغات: اِقْتَحَم الأمر: کسی معاملہ میں زبردستی داخل ہونا...... قَامَ بالأمر: انتظام کرنا...... اِنْدَفَعَ: بہنا۔

تشریح: زندگی میں نفس مادہ سے مجرد نہیں ہوسکتا، البتہ کأنك تراہ کے درجہ میں اور موتوا قبل أن تموتوا کے انداز پر مجرد ہوسکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

پانچواں حکم: جن لوگوں میں ملکیت عالیہ ہوتی ہے یعنی (۱و۲و۵و۶) اگر ان کی ملکیت بہت ہی بلند ہوتی ہے تو وہ دین ودنیا کی ایک ساتھ سرداری کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، وہ دین کے کاموں کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں اور نظام کلی جیسے خلافت اور ملت کی راہ نمائی کو بروئے کار لانے میں اللہ تعالیٰ کے دست وبازو بن جاتے ہیں۔ یہ حضرات انبیائے کرام، ان کے ورثاء، یگانۂ روزگار شخصیات، سلاطین اسلام اور حکومت کے بڑے ذمہ دار ہیں۔

چھٹا حکم: جن لوگوں میں ملکیت عالیہ ہوتی ہے اور ملکیت وبہیمیت میں اجتماع مصالحت کے ساتھ ہوتا ہے یعنی (۵و۶) ایسے حضرات کی دین میں پیروی واجب ہے۔

ساتواں حکم: جن لوگوں میں ملکیت سافلہ ہوتی ہے اور ملکیت وبہیمیت میں اجتماع مصالحت کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی (۷و۸) ان لوگوں میں مذکورہ بالا حضرات کی پیروی کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ احکام شرعیہ کو ان کی شکلوں اور محسوس پیکر کے ساتھ حاصل کرتے ہیں یعنی ان کو جس طرح حکم دیا جاتا ہے اسی طرح اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

آٹھواں حکم: جن لوگوں کی ملکیت اور بہیمیت میں کشمکش ہوتی ہے وہ لوگ دین سے بہت دور ہوتے ہیں یعنی (۱،۲،۳،۴) کیونکہ یہ لوگ اگر طبیعت کی تاریکیوں میں پھنس جاتے ہیں تو راہ راست بھی چھوڑ دیتے ہیں اور جو لوگ طبیعت پر قابو پالیتے ہیں اگر ان کی ملکیت عالیہ ہوتی ہے یعنی (۱و۲) تو وہ احکام شرعیہ کی روح سے چمٹ جاتے ہیں مگر ظاہری شکلوں کو چھوڑ دیتے ہیں، جیسے مجاذیب اہل اللہ، نہ نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں، حالانکہ احکام کی ظاہری شکلیں بھی مطلوب ہیں، مگر یہ لوگ اس میں تسامح برتتے ہیں اور ان کی توجہ زیادہ تر جبروت کی باریکیاں سمجھنے میں اور اس کے لون سے رنگین ہونے میں رہتی ہیں یعنی وہ ہر وقت معرفت خداوندی میں مستغرق رہتے ہیں۔

اور جن لوگوں کی ملکیت فروتر ہوتی ہے یعنی (۳و۴) وہ ریاضتوں اور اوراد کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور ملکوت کے انوار میں مگن رہتے ہیں یعنی کشف واشراف اور قبولیت دعا وغیرہ ہی کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، وہ لوگ احکام شرعیہ کو دل کی تھاہ سے مضبوط نہیں پکڑتے، صرف طبیعت کو مغلوب کرنے اور انوار کو حاصل کرنے کی تدبیر کے طور پر اعمال اختیار کرتے ہیں۔

یہ آٹھ بنیادی احکام ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو عطا فرمائے ہیں، اگر ان کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اہل اللہ کے احوال، ان کے کمالات کی نہایت، انہوں نے جو اپنے بارے میں اشارے کئے ہیں ان کا مطلب، اور ان کے مراتبِ سلوک کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا۔

[٥] ومن كانت عاليتُه منهم في غاية العُلُوِّ، ينبعث إلى رياسة الدين والدنيا معًا، ويصير باقيًا بمراد الحق، وبمنزلة الجارحة له في إتمام نظام كلي، كالخلافة، وإمامة الملة؛ وأولئك هم الأنبياء ووَرَثَتُهم، وأساطينُ الناس وسلاطينُهم، وأولو الأمر منهم.

[٦] والذين يجب انقيادهم في دين الله أهلُ الإصطلاح، العاليةُ ملكيتُهم.

[٧] وأطوعُهم لأولئك أهلُ الاصطلاح، السافلةُ ملكيتُهم، فإنهم يَتَلَقَّوْن النواميس بأشباحِها وهيئاتها.

[٨] وأَطْرَفُهم منهم: أهل التجاذب، لأنهم إما منهمكون في ظلماتِ الطبيعة، فلايقيمون السنة الراشدة، أوقاهرون عليها: فإن كانوا أهلَ عُلُوٍّ عَضُّوا على أرواح النواميس، وكانت لهم مسامحةٌ في أشباحها، وكان أكثرُ همتهم معرفةَ دقائق الجبروت، والانصباغَ بصبغها؛ وإن كانوا دون ذلك: اهتموا بالرياضات والأوراد، وأُعْجِبُوا ببوارق الملكية: من كشف وإشراف، واستجابةِ دعاء، ونحو ذلك؛ ولم يَعُضُّوا من النواميس بجذر قلوبهم الاعلى حِيَلِ قهرِ الطبيعة، وجَلْبِ الأنوار.

فهذه أصول أعطانيها ربي؛ من أتقنها استجلى أحوالَ أهل الله ومبلغَ كمالهم، ومطمحَ إشاراتهم عن أنفسهم، ومخرَّج مراتبَ سلوكهم و﴿ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ، وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَايَشْكُرُوْنَ﴾

ترجمہ (۵) اور وہ شخص جس کی ملکیت عالیہ ان میں سے بہت ہی اونچی ہوتی ہے، وہ ایک ساتھ دین اور دنیا کی سرداری کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی مراد کے ساتھ باقی رہنے والا ہوتا ہے (یعنی ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں لگا رہتا ہے) اور وہ اللہ تعالیٰ کے لئے بمنزلۂ ہاتھ کے ہوجاتا ہے نظام کلی، جیسے حکومت اسلامیہ اور ملت کی پیشوائی کی تکمیل میں۔ اور یہ لوگ وہ انبیاء، ان کے وارثین، لوگوں کی مرکزی شخصیات، لوگوں کے بادشاہ اور لوگوں میں سے حکومت کے بڑے ذمہ دار ہیں۔

(۶) اور وہ لوگ جن کی تابعداری اللہ کے دین میں واجب ہے، وہ مصالحت والے لوگ ہیں، جن کی قوت ملکیہ

بلند ہوتی ہے۔

(۷) اور اُن لوگوں کی (جن کا تذکرہ نمبر (۲) میں گزرا) زیادہ تابعداری کرنے والے، وہ مصالحت والے لوگ ہیں، جن کی ملکیت سافلہ ہوتی ہے، کیونکہ یہ لوگ احکام شرعیہ کو ان کے پیکر محسوس اور ان کی شکلوں کے ساتھ حاصل کرتے ہیں۔

(۸) اور لوگوں میں سب سے زیادہ (راہ راست سے) دور کشمکش والے لوگ ہیں، کیونکہ وہ یا تو طبیعت کی تاریکی میں منہمک ہوتے ہیں تو وہ راہ راست بھی نہیں اپناتے، یا وہ طبیعت پر غالب ہوتے ہیں، تو اگر وہ ملکیت عالیہ والے ہوتے ہیں تو وہ احکام شرعیہ کی روح کو دانتوں سے مضبوط پکڑتے ہیں اور وہ احکام کے پیکر ہائے محسوس میں چشم پوشی برتتے ہیں، اور ان کی زیادہ تر توجہ جبروت کی باریکیاں پہچاننے کی طرف، اور ان کے رنگ میں رنگین ہونے کی طرف رہتی ہے —— اور اگر وہ ملکیت عالیہ والوں سے فروتر ہوتے ہیں تو وہ ریاضتوں اور اوراد کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ مگن رہتے ہیں ملکوت کی تجلیوں پر یعنی کشف واشراف اور دعاء کی قبولیت اور ان کے مانند چیزوں پر، اور وہ لوگ احکام شرعیہ کو اپنے دلوں کی جڑ سے مضبوط نہیں پکڑتے، مگر طبیعت کو مغلوب کرنے اور انوار کو حاصل کرنے کی تدبیر کے طور پر۔

پس یہ بنیادی باتیں ہیں، جو میرے رب نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ جو شخص ان کو مضبوط کرلے گا وہ اہل اللہ کے احوال، ان کے کمال کی پہنچ اور انہوں نے جو اپنے بارے میں اشارے کئے ہیں ان کا مطلب، واضح طور پر جان لے گا۔ اور وہ ان کے سلوک کے مرتبوں کی توجیہ کرلے گا۔ اور یہ ہم پر اور تمام لوگوں پر فضل خداوندی ہے، مگر بیشتر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔

لغات:

الجَارِحة: عضو انسانی، خصوصاً ہاتھ جمع جَوَارِح...... إِتمَام: پورا کرنا۔ یہ لفظ کتاب میں تَمَام تھا تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے...... اَسَاطِین: مفرد اُسطُوانة ستون، مجازاً: یکتا، کہا جاتا ہے هم أساطين الزمان: وہ لوگ زمانے کے یکتا ہیں...... نَوَامِیس: مفرد الناموس: اصلی معنی رازدار، اصطلاحی معنی: احکام شرعیہ، دستور العلماء (۳:۴۵۶) میں ہے هو في الشرع: الذى شرعه الله تعالى، أعني الإسلام اھ ناموس اکبر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کہتے ہیں...... أطْوَفُ (اسم تفضیل) بہت زیادہ دور طَرَفَه عنه: باز رکھنا، واپس کرنا...... السنة الراشدة: سیدھا راستہ، شرعی راستہ...... بوارق: مفرد البارقة: بجلی والا بادل...... الکشفُ: لغوی معنی کھولنا، پردہ اٹھانا، تصوف کی اصطلاح میں مغیبات پر اطلاع پانا...... الإشراف مترادف ہے کشف کا یعنی مغیبات کو جھانک کر دیکھ لینا أشرَفَ علیه: اوپر سے جھانکنا...... خَرَّجَ المسئلة: مسئلہ کی توجیہ کرنا۔

باب ـــــ ۱۰

عمل کا باعث بننے والے خیالات کے اسباب

انسان کے دماغ میں اچھے برے خیالات بارش کی طرح برستے رہتے ہیں، جب وہ وافر مقدار میں جمع ہوجاتے ہیں تو ارادۂ عمل جنم لیتا ہے، پھر اچھا یا برا عمل وجود میں آتا ہے۔ ان خیالات کے بھی اسباب ہیں، کیونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے، اس عالم میں سنت الٰہی یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے سبب ہو۔ اس باب میں خیالات کے اسباب کا بیان ہے۔ اور یہ اسباب جاننے اس لئے ضروری ہیں کہ انسان اچھے اسباب اختیار کرے تاکہ اچھے خیالات پیدا ہوں اور نیک عمل کا جذبہ ابھرے اور برے خیالات کے اسباب سے اجتناب کرے تاکہ برے خیالات پیدا نہ ہوں اور آدمی برے کام نہ کرے۔

غور وفکر اور تجربہ سے خیالات کے چند اسباب سمجھ میں آتے ہیں۔

پہلا سبب: جو سب سے بڑا سبب ہے، وہ انسان کی جبلت وفطرت ہے جبلّت وہ اصلی حالت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، ہر انسان کی الگ انداز پر تخلیق عمل میں آئی ہے، پہلے یہ مضمون حدیث شریف میں آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی ایک جبلت بنائی ہے جو کبھی بدلتی نہیں، اگر کوئی خبر دے کہ فلاں کی فطرت بدل گئی تو اس کی تصدیق نہ کرو، پس جس کی جیسی جبلت ہوگی ویسے خیالات آئیں گے۔ اچھی فطرت ہوگی تو اچھے خیالات دل میں پیدا ہوں گے اور آدمی اچھے اعمال کرے گا، اور فطرت بد ہوگی تو برے خیالات جنم لیں گے اور آدمی برے اعمال کرے گا۔

نوٹ: فطرت کو بنانا یا بدلنا تو انسان کے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ نے جس کی جیسی طبیعت بنادی، بن گئی، مگر جبلّت کو سنوارنا اور بگاڑنا آدمی کے اختیار میں ہے، جیسا کہ ایمان وکفر، غصہ اور قرض کی وصولی کے درجات والی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

دوسرا سبب: انسان کا مادی مزاج ہے۔ یہ مزاج لوگوں میں مختلف ہوتا ہے اور اس کو مختلف کیا بھی جاسکتا ہے، کیونکہ یہ مزاج کھانے پینے کی چیزوں سے اور دوسری تدبیروں سے جو انسان کو گھیرے رہتی ہیں، وجود میں آتا ہے۔ آدمی جس قسم کی چیزیں کھاتا پیتا ہے، یا جو کچھ پڑھتا ہے یا جن لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے، ان کی وجہ سے یہ مزاج مختلف ہوتا ہے اسی وجہ سے شریعت نے حلال وطیب لقمہ کھانے پر، اچھی صحبت اختیار کرنے پر اور برے اشعار سے جوف کو محفوظ رکھنے پر زور دیا ہے۔

اور مادی مزاج خیالات کا سبب کیسے بنتا ہے؟ اس کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) بھوکا کھانا تلاش کرتا ہے، اس سے پوچھو کہ دو اور دو کتنے ہوئے؟ تو وہ جواب دے گا: چار روٹیاں!

(۲) پیاسا پانی ڈھونڈھتا ہے، اس کو سراب (چمکتی ریت) بھی پانی دکھائی دیتی ہے۔



(۳) شہوت پرست کو عورتوں کے خیالات آتے ہیں یہ لوگ ایسی غذا استعمال کرتے ہیں جو قوت باہ کو بڑھاتی ہیں، وہ لوگ عورتوں کو تاکتے جھانکتے رہتے ہیں، دل ہر وقت عورتوں سے تعلق رکھنے والے خیالات سے بھرا رہتا ہے، اوران کی طبیعت میں شہوانی افعال کے لئے ہیجان بپا رہتا ہے۔

(۴) کچھ لوگ سخت غذا استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں اوران میں قتل وخوں ریزی کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے اوران کو بہت سی ایسی جگہوں میں غصہ آجاتا ہے، جہاں دوسرے آدمی غصہ نہیں کرتے۔

مگر یہ دو شخص یعنی نمبر ۳و۴ اگر نماز روزے کی ریاضت کے ذریعہ نفس کی اصلاح کرلیں، یا بڈھے کھوسٹ ہو جائیں، یا کسی نڈھال کرنے والی بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو ان کے بیشتر احوال بدل جاتے ہیں، دل نرم پڑ جاتا ہے اور نفس پاکیزہ ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے بوڑھوں اور جوانوں کے احکام میں فرق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بوڑھے کو روزے کی حالت میں بیوی کے ساتھ لیٹنے کی اجازت دی ہے اور جوان کو نہیں دی (رواہ ابوداؤد مشکوۃ کتاب الصوم باب تنزیہ الصوم حدیث نمبر ۲۰۰۶)

تیسرا سبب: عادت و مالوف ہے، جس شخص کو جس چیز کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہوتا ہے اس کو اس چیز سے تعلق رکھنے والی باتوں کا خیال آتا ہے، کیونکہ وہ چیز اس کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے، پس اس کا بار بار خیال آنا ایک لازمی امر ہے مثلاً: جس کو چائے کی عادت ہے اس کو چائے کا خیال آئے گا، جو بیڑی، سگریٹ یا پان تمباکو کا عادی ہے، اس کو ان چیزوں کا خیال آئے گا، جس کو شراب کی لت پڑی ہوئی ہے اس کو شراب کا خیال آئے گا، جو نماز کا پابند ہے اس کا دل ہمیشہ مسجد میں اٹکا رہے گا، اوراس کو بار بار نماز کا خیال آئے گا، مألوف کے معنی ہیں دل پسند چیز، آدمی کو جس چیز سے الفت ہو۔ عادت و مألوف تقریباً مترادف الفاظ ہیں۔

چوتھا اور پانچواں سبب: بعض اتفاقات اچھے یا برے خیالات کا سبب بن جاتے ہیں۔ مثلاً: ایک جیب کترا کسی دینی اجتماع میں اپنے مقصد سے گیا، وہاں اس نے کسی مقرر سے کوئی بھلی بات سنی، جو اس کے دل میں اتر گئی اور وہ اس کے لئے باعث اُنس بن گئی یا اس کی ساری زندگی بدل گئی، یا کوئی چور کسی بزرگ کے گھر میں چوری کرنے گھسا، وہاں اس نے بزرگ کی عبادت دیکھی، جس سے اس کی کایا پلٹ گئی، ڈاکوؤں کے سردار نے حضرت جیلانی قدس سرہ کے سچ سے متأثر ہو کر توبہ کرلی تھی۔ اسی طرح ایک نیک آدمی بروں کی صحبت میں جا بیٹھا ان لوگوں نے اس کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اس کی ساری زندگی تباہ ہوگئی۔ غرض اس قسم کے اتفاقات بھی اچھے برے خیالات کا سبب بنتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اس مضمون کو اپنے انداز پر سمجھاتے ہیں کہ انسان کا نفس ناطقہ کبھی بہیمیت کے پھندے سے نکل جاتا ہے، تو وہ اچانک ملأ اعلی کی جگہ سے، حسب استعداد، نورانی صورتیں جھپٹ لاتا ہے، جو اس کے لئے سکون قلب کا سبب بنتی ہیں یا اس کی زندگی بدل دیتی ہیں، وہ اچھے اعمال شروع کردیتا ہے اور ولی اللہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح بعض نفوس شیاطین سے متأثر ہوجاتے ہیں، خواہ وہ شیاطین الانس ہوں یا شیاطین الجن، ان شیاطین کا رنگ اس پر چڑھ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے برے خیالات آنے لگتے ہیں اور وہ برے اعمال شروع کردیتا ہے۔

فائدہ: خوابوں کا معاملہ خیالات جیسا ہے یعنی جو خیالات کے اسباب ہیں وہی خوابوں کے بھی ہیں، اچھے اسباب پیدا ہوتے ہیں تو اچھے خواب نظر آتے ہیں اور برے اسباب جمع ہوتے ہیں تو برے خواب نظر آتے ہیں۔ البتہ خیالات اور خوابوں میں فرق یہ ہے کہ خیالات میں چیزیں متشکل نہیں ہوتیں اور خواب میں جو خیالات دل میں گزرتے ہیں وہ دل کی آنکھوں کے سامنے متشکل ہوتے ہیں۔

اور یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ بحالت بیداری جب آدمی کچھ خیال کرتا ہے تو دماغ اس میں مستغرق ہوکر نہیں سوچتا۔ کیونکہ بیداری کی حالت میں آنکھ کچھ دیکھ رہی ہے، کان کچھ سن رہا ہے، منہ میں کوئی چیز ہے جس کا مزہ زبان لے رہی ہے، ناک کوئی خوشبو یا بدبو سونگھ رہا ہے اور جسم سے جو چیز مس کررہی ہے اس کا بھی ادراک ہورہا ہے اور یہ تمام ادراکات دماغ کررہا ہے۔ اس وجہ سے دماغ پوری طرح خیال کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مگر جب آدمی سوجاتا ہے تو اس وقت بھی خیالات کا سلسلہ برابر چلتا رہتا ہے، البتہ جب تک نیند گہری ہوتی ہے، خواب یاد نہیں رہتے، پھر جب نیند ہلکی پڑتی ہے تو دل میں جو خیالات گزرتے ہیں، دماغ ان میں پوری طرح مستغرق ہوکر سوچتا ہے، اس لئے وہ خیالات دل کی نگاہوں کے سامنے متشکل ہوکر نظر آتے ہیں۔

اور یہ تمام خوابوں کی حقیقت کا بیان نہیں، صرف ان خوابوں کا بیان ہے جو خیالات ہوتے ہیں، رہے ڈراؤنے خواب اور مبشرات تو ان کی حقیقت جدا ہے، ڈراؤنے خواب شیطان کا تماشا ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے اپنا خواب سنایا کہ گویا ان کا سر قلم کردیا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ: ''جب شیطان تم میں سے کسی کے ساتھ نیند میں کھیل کرے تو اس کو لوگوں میں بیان نہ کیا کرو'' (رواہ مسلم مشکوۃ کتاب الرؤیا حدیث نمبر ۴۶۱۶)

اور مبشرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دکھائے جاتے ہیں۔ خواب کی یہ تین قسمیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں آئی ہیں۔ دیکھئے سنن دارمی ۲: ۱۲۵ ترمذی شریف ابواب الرؤیا اور ابن سیرین رحمہ اللہ جو بڑے تابعی ہیں، ان سے بھی مروی ہیں (خوابوں کی تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۵: ۵۳۵-۵۳۸)

﴿باب فی أسباب الخواطر الباعثةِ علی الأعمال﴾

اعلم: أن الخواطر التی یَجِدُها الإنسانُ فی نفسه، وتبعثه علی العمل بموجَبِها، لاجرم أن لها أسبابا، کسنةِ اللّٰه تعالی فی سائر الحوادث. والنَّظَرُ والتجْرِبَةُ یُظهران أنّ:

منها: —وهو أعظمها— جِبلَّةُ الإنسان التی خُلق علیها، کما نَبَّهَ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم

في الحديث الذي رويناه من قبلُ.

ومنها: مزاجه الطبيعيُّ، المتغيِّرُ بسبب التدبير المحيط به: من الأكل والشرب ونحو ذلك، كالجائع يطلب الطعام، والظمآن يطلب الماء، والمغتلِم يطلب النساء، ورب إنسان يأكل غذاءً يُقَوِّي الباءَةَ فيميل إلى النساء، ويُحَدِّث نفسَه بأحاديثَ تتعلق بهن، وتصير هذه مُهَيِّجَةً له على كثير من الأفعال؛ ورب إنسان يغتذى غذاءً شديدًا فيَقْسُو قلبُه، ويَجْتَرِئ على القتل، ويغضب في كثير مما لايغضب فيه غيره؛ ثم إذا ارْتاضَ هذان أنفسَهما بالصيام والقيام، أوشابا وكَبِرَا، أو مرضا مَرَضًا مُدْنِفًا، تغيَّرَ أكثَرُ ماكانا عليه، ورقَّت قلوبهما، وعفَّت نفوسُهما، ولذلك ترى الاختلاف بين الشيوخ والشبَّان، ورخَّص النبي صلى الله عليه وسلم للشيخ في القُبلة وهو صائم، ولم يرخِّص للشاب.

ومنها: العادات والمألوفات؛ فإن من أكثر ملابسةَ شيئ، وتمكّن من لوح نفسه ماىناسبه من الهيئآت والأشكال، مَالَ إليه كثير من خواطره.

ومنها: أن النفس الناطقة في بعض الأوقات، تنفلت من أَسْرِ البهيمية، فتَخْتطف من حيِّز الملأ الأعلى مايُيَسَّرُ لها من هيئة نورانية، فتكون تارة من باب الأُنس والطُّمأنينة، وتارة من باب العزم على الفعل.

ومنها: أن بعض النفوس الخسيسة تتأثر من الشياطين، وتنصبغ ببعض صِبْغهم، وربما اقتضت تلك الهيئة خواطِرَ وأفعالاً.

واعلم أن المنامات أَمْرُها كأمر الخواطر، غير أنها تَتَجَرَّدُ لها النفسُ، فَتَتَشَبَّحُ لها صورُها وهيئاتُها؛ وقال محمد بن سيرين: الرؤيا ثلاث: حديثُ النفس، وتخويفُ الشيطان، وبُشْرى من الله.

ترجمہ: ان خیالات کے اسباب کا بیان جو اعمال کا باعث ہوتے ہیں: جان لیجئے کہ وہ خیالات جن کو انسان اپنے دل میں پاتا ہے اور جو اس کو اپنے تقاضے کے مطابق عمل کرنے پر ابھارتے ہیں، یقیناً ان کے لئے بھی اسباب ہیں، جیسا کہ اللہ کی سنت ہے دیگر حوادث (نئے پیدا ہونے والے واقعات) میں۔ اور غور وفکر اور تجربہ ظاہر کرتے ہیں کہ:

ان میں سے ایک: —— اور وہ ان اسباب میں سب سے بڑا سبب ہے —— انسان کی وہ فطرت ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے تنبیہ فرمائی ہے، اس حدیث میں جس کو ہم نے پہلے (باب ۹) میں روایت کیا ہے۔

اور ان میں سے ایک: انسان کا مادی مزاج ہے، جو اس تدبیر کی وجہ سے بدلتا رہتا ہے جو انسان کو گھیرے ہوئے

ہے یعنی کھانا پینا اور اس کے مانند، جیسے بھوکا کھانا چاہتا ہے، پیاسا پانی ڈھونڈھتا ہے، شہوت پرست عورتوں کو چاہتا ہے اور کچھ انسان ایسی غذا کھاتے ہیں جو قوت باہ کو قوی کرتی ہے، پس وہ شخص عورتوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور اپنے دل سے ایسی باتیں کرتا ہے جو عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ باتیں اس کو بہت سے کاموں پر برانگیختہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ اور کچھ انسان سخت غذا کھاتے ہیں، پس اس کا دل سخت ہوجاتا ہے اور وہ قتل پر جری ہوجاتا ہے اور وہ بہت سی ایسی جگہوں میں غصہ کرتا ہے، جہاں دوسرے کو غصہ نہیں آتا۔ پھر جب یہ دونوں اپنے نفس کو سِدھا لیتے ہیں (نفل) روزوں اور نفل نمازوں سے یا بوڑھے ہوجاتے ہیں اور بہت بوڑھے ہوجاتے ہیں، یا نڈھال کرنے والی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو ان باتوں میں سے بیشتر باتیں بدل جاتی ہیں جو ان میں تھیں اور ان کے دل پتلے ہوجاتے ہیں اور ان کے نفس پاکدامن ہوجاتے ہیں، اور اسی وجہ سے آپ بوڑھوں اور جوانوں کے درمیان (احکام میں) فرق پاتے ہیں اور اجازت دی نبی کریم ﷺ نے بوڑھے کو بوسہ لینے کی، روزے کی حالت میں، اور جوان کو اجازت نہ دی (أخرجه مالك في الموطا، جامع الأصول ۷:۱۹۷)

اور ان میں سے ایک: عادات اور مألوفات ہیں، پس بیشک جس شخص کا کسی چیز کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے اور اس کے دل کی تختی میں اس چیز سے مناسبت رکھنے والی ہیئتیں اور شکلیں جم جاتی ہیں تو اس کی طرف اس کے بہت سے خیالات مائل ہوجاتے ہیں۔

اور ان میں سے ایک: یہ ہے کہ نفس ناطقہ بعض اوقات میں بہیمیت کی قید سے چھوٹ جاتا ہے، پس وہ ملأ اعلیٰ کی جگہ سے جھپٹ لیتا ہے وہ نورانی ہیئتیں جو اس کے لئے آسان کی جاتی ہیں، پس کبھی وہ انس وطمانینت کے قبیل سے بن جاتی ہیں اور کبھی کام کا پختہ ارادہ کرنے کے قبیل سے ہوجاتی ہیں۔

اور ان میں سے ایک: یہ ہے کہ بعض نکمے نفوس شیاطین سے متأثر ہوجاتے ہیں اور ان کے کچھ رنگ میں رنگین ہوجاتے ہیں، اور کبھی یہ حالت خیالات اور اعمال کا تقاضا کرتی ہے۔

(فائدہ) اور جان لیجئے کہ خوابوں کا معاملہ خیالات کے معاملہ کی طرح ہے، البتہ خوابوں کے لئے نفس تنہا ہوجاتا ہے، پس خوابوں کی صورتیں اور ہیئتیں متشکل ہوتی ہیں۔ فرمایا حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہ خواب تین ہیں: دل کی باتیں (یعنی خیالات) اور شیطان کا ڈرانا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری (حدیث متفق علیہ، مشکوۃ کتاب الرؤیا حدیث نمبر ۴۶۱۴)

لغات:

الخواطر مفرد الخاطر: وہ امر یا تدبیر یا خیال جو دل میں گزرے اور کبھی دل اور نفس پر بھی مجازاً اطلاق کیا جاتا ہے......

مُوجِب: (مصدر میمی) چاہنا، لازم ہونا، ثابت ہونا موجَب (اسم مفعول): حکم، تقاضا...... جبلّت: فطرت، طبیعت جبله (ض ن) جَبْلاً: پیدا کرنا...... لاجرمَ اور لاجُرْمَ: یقیناً، ضروری...... نظر: منطق کی اصطلاح ہے بمعنی غور وفکر...... مُغْتَلِمْ (صفت) اغتلَم: شہوت پرست ہونا...... البَاءةُ والبِيئَةُ والمَبْوأُ والمَبَاءةُ: منزل، گھر، مجازی معنی: قوت باہ، کیونکہ گھر بسانے کے لئے یہ قوت ضروری ہے...... هيَّج تهيِيْجا الشيئَ: برانگیختہ کرنا، بھڑکانا...... ارتاض المُهْرُ: بچھیرے کا سدھ جانا...... شاب يشيب شيبًا: بوڑھا ہونا...... كَبِرَ (س) كِبَرًا في السن: عمر رسیدہ ہونا...... أدنَفَهُ المرضُ: بیماری نے اس کو لاغر کر دیا دَنِفَ (س) المريضُ دَنَفا: بیماری کا بڑھ جانا اور قریب المرگ ہونا...... عَفَّ (ض) عَفًّا: پاک دامن ہونا...... حَيِّز: مکان، جگہ جمع أحْيَاز...... تَجَرَّد: ننگا ہونا، تمام کاموں سے فارغ ہو کر مشغول ہونا۔

نوٹ: مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ برلین میں یہ باب فصل کے عنوان سے ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۱۱

عمل کا نفس سے وابستہ ہونا اور اس کا ریکارڈ کیا جانا

انسان اور دیگر حیوانات میں فرق یہ ہے کہ انسان جب اپنے اختیار سے کوئی کام کرتا ہے، تو وہ عمل وجود میں آ کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے نفس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے یعنی دل میں اس کا اثر باقی رہتا ہے اور دیگر حیوانات کے اعمال وجود پذیر ہو کر ختم ہو جاتے ہیں، ان کے دلوں میں اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ مثلاً ایک جانور بھاگتا ہے اور اپنی جولان گاہ میں کسی کو زخمی کرتا ہے یا مار ڈالتا ہے تو اس کے دل کو اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی برا کام کیا۔ وہ بار بار نقصان پہنچاتا ہے، اور اس کے نفس کا حال یکساں رہتا ہے۔ مگر انسان کی صورت حال جانوروں سے مختلف ہے۔ جب اس سے کوئی زیادتی ہو جاتی ہے تو اول وہلہ ہی میں وہ اپنے عمل سے متأثر ہوتا ہے، وہ نادم ہوتا ہے، اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ وہ دوبارہ یہ غلطی نہ دُہرائے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا کیا ہوا کام اس کے نفس کے ساتھ چپک گیا ہے ـــــ اعمال صالحہ کا معاملہ بھی یہی ہے جانور اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اسے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی اور انسان کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے، وہ پھولا نہیں سماتا، اس کے تن بدن میں شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ تمنا کرتا ہے کہ آئندہ بھی وہ ایسے اچھے کام کرتا رہے (رحمۃ اللہ ۲:۲۷۲ پر یہ مضمون گذر چکا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل خواہ نیک ہو یا بد، نفس کے دامن سے چمٹ جاتا ہے اور وابستہ ہونے کے علاوہ اس کو باقاعدہ ریکارڈ بھی کر لیا جاتا ہے۔ یہ سارا ریکارڈ محفوظ ہے، کل قیامت کے دن اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ سورۃ

الاسراء آیت ۱۳ میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ''اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار بنا کر رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا نامۂ اعمال اس کے سامنے کر دیں گے، جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا: پڑھ تو اپنا نامۂ اعمال، آج تو خود ہی اپنا حساب لگانے کے لئے کافی ہے''

اس آیت میں جو فرمایا گیا ہے کہ: ''ہم نے ہر انسان کی گردن میں اس کا نامۂ اعمال چپکا یا ہے'' یہ قرآنی تعبیر ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اسی کو نفس کے دامن سے چپکنا کہا ہے۔ اور قیامت کے دن جو نامۂ اعمال کھلی کتاب کی صورت میں اس کے سامنے رکھا جائے گا یہ وہی ریکارڈ ہے جو انسانی اعمال کا برابر تیار کیا جا رہا ہے۔

اور حدیث قدسی میں ہے کہ تم پر جو ال ائیں بلائیں اور خیرات و برکات نازل ہوتی ہیں: ''وہ تمہارے اعمال ہی ہیں، جو میں نے تمہارے لئے سینت کر رکھے ہیں، پھر میں وہ اعمال تم کو پورے پورے چکاؤں گا، پس جو شخص خیر پائے وہ اللہ کی تعریف کرے اور جو دوسری طرح کے احوال پائے وہ اپنے نفس ہی کو کوسے'' کیونکہ وہ برے حالات تمہارے برے اعمال کا نتیجہ ہیں — اس حدیث سے واضح ہوا کہ اعمال سینت کر رکھے گئے ہیں، یہی اعمال کا ریکارڈ کیا جانا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''نفس آرزو کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق و تکذیب کرتی ہے'' اس حدیث سے واضح ہوا کہ اعضاء کے زنا کی خواہش اور تمنا دل کرتا ہے، معلوم ہوا کہ اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال کا تعلق دل سے ہے یہی اعمال کا نفس سے صادر ہونا ہے۔

﴿باب لُصوقِ الأعمال بالنفس، وإحصائها عليها﴾

قال الله تعالى: ﴿وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ، وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا، يَلْقَاهُ مَنْشُورًا، اِقْرَأْ كِتَابَكَ، كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾ وقال النبي صلى الله عليه وسلم، راويًا عن ربه تبارك وتعالى: ﴿إنما هي أعمالُكم، أُحْصِيها عليكم، ثم أُوَفِّيكم إياها، فمن وجد خيرًا فليحمَد الله، ومن وجد غير ذلك فلايلومَنَّ إلا نفسَه﴾ وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿النفسُ تتمنّى وتَشْتَهِي، والفرج يصدِّق ذلك ويكذِّبه﴾

ترجمہ: نفس کے ساتھ اعمال کے چپکنے کا اور نفس کے خلاف ان کے ریکارڈ کئے جانے کا بیان: اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ''اور ہر انسان پر اس کی گردن میں اس کا پرندہ (اڑنے والا نامۂ اعمال) ہم نے چپکا یا ہے، اور نکالیں گے ہم اس کے لئے قیامت کے دن ایک نوشتہ، ملاقات کرے گا وہ اس سے کھلے ہوئے ہونے کی حالت میں، (کہا جائے گا) پڑھ تو تیرا نوشتہ، کافی ہے تو خود ہی آج تیرے خلاف حساب کرنے کے لئے'' — اور فرمایا نبی کریم ﷺ نے اپنے پروردگار تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے: ''وہ (آفات و بلیات اور رحمت و برکات) تمہارے اعمال ہی ہیں،

سینت کر رکھ رہا ہوں میں ان کو تمہارے خلاف، پھر پورا پورا چکاؤں گا میں تم کو وہ اعمال، پس جو شخص خیر پائے (یعنی اس کو اچھے احوال پہنچیں) پس وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے، اور جو شخص اس کے علاوہ پائے (یعنی الائیں بلائیں اس کو پہنچیں) تو وہ ہرگز ملامت نہ کرے مگر اپنی ذات کو (رواہ مسلم ۱۶: ۱۳۳ مصری، مشکوۃ کتاب الدعوات باب الاستغفار حدیث نمبر ۲۳۲۶)

اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''نفس آرزو کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی تکذیب کرتی ہے'' یعنی اگر شرمگاہ نے زنا کیا تو اس نے نفس کی خواہش پر صاد کر دیا اور اگر نہ کیا تو اس نے نفس کی خواہش کو جھٹلا دیا اور اس کی اطاعت نہ کی (حدیث متفق علیہ، مشکوۃ کتاب الایمان باب الایمان بالقدر حدیث نمبر ۸۶)

لغات:

طائر: اڑنے والا پرندہ، مراد نامہ اعمال، کیونکہ نامہ اعمال قیامت کے دن اڑائے جائیں گے...... **حدیث قدسی** وہ حدیث ہے جس کا مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہو، اور اس کو الفاظ کا جامہ آنحضور ﷺ نے پہنایا ہو یعنی آپ نے اس مضمون کو اپنے الفاظ میں تعبیر فرمایا ہو...... **اَحْصَى الشيئَ** شمار کرنا، گننا...... **وَفّٰی تَوْفِيَةً** اور **اَوْفٰی اِيفَاءً**: پورا حق دینا۔

☆ ☆ ☆

چار باتیں

اس باب میں شاہ صاحب چار باتیں بیان فرما رہے ہیں:

(۱) اعمال و اخلاق کا نفس کی تھاہ سے پھوٹنا — انسان جو کام پوری سنجیدگی اور قصد و ارادہ سے کرتا ہے، اسی طرح اخلاق و صفات راسخہ فی النفس، نفس ناطقہ کی جڑ سے پھوٹتے ہیں۔

(۲) اعمال و اخلاق وجود پذیر ہو کر ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ نفس کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۳) اختیاری اعمال و اخلاق نفس کی طرف لوٹ کر، نفس کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں یعنی وابستہ ہو جاتے ہیں۔

(۴) انسانی اعمال و اخلاق ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔ ان کو سینت کر رکھ دیا جاتا ہے۔

۱ — اعمال و اخلاق کا نفس کی جڑ سے اٹھنا

انسان جو کام پکے ارادے سے کرتا ہے، اسی طرح ملکاتِ راسخہ فی النفس، جیسے بہادری و بزدلی اور سخاوت و بخیلی وغیرہ، یہ سب نفس ناطقہ کی تھاہ سے اٹھتے ہیں۔ اوپر حدیث آئی ہے کہ زنا کی آرزو نفس کرتا ہے، اعضاء اس کی مطاوعت کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ زنا جو ایک برا عمل ہے نفس ناطقہ کی جڑ سے ابھرتا ہے۔ یہی حال تمام نیک و بد اعمال کا ہے اور یہی معاملہ تمام اخلاق راسخہ فی النفس کا ہے۔

انسان جو عمل بھول، چوک، لغزش یا اکراہ کی وجہ سے کرتا ہے وہ بس سرسری اعمال ہوتے ہیں نفس ناطقہ کی تھاہ سے نہیں اٹھتے اسی طرح صفات عارضہ، جیسے کوئی خوش خبری سنی تو چہرہ دمک گیا یا کوئی رنج کی بات سنی تو تھوڑی دیر کے لئے چہرہ اتر گیا: یہ اعمال واخلاق بھی نفس ناطقہ کی جڑ سے نہیں پھوٹتے۔

اور مذکورہ دعوی کی دلیل یہ ہے کہ آپ باب (۹) میں ملکیت اور بہیمیت اور ان کے باہمی اجتماع کی قسمیں پڑھ چکے ہیں اور ہر قسم کا حکم بھی معلوم کر چکے ہیں۔ نیز باب (۱۰) میں خیالات کے اسباب سے بھی واقف ہو چکے ہیں کہ مادی مزاج کا غلبہ، ملائکہ یا شیاطین کا رنگ پکڑنا اور دیگر اسباب انسان کی جبلت اور فطری مناسبت کے مطابق عمل کرتے ہیں، پس ثابت ہوا کہ تمام اعمال واخلاق کی لوٹنے کی جگہ نفس ہے خواہ بلا واسطہ لوٹیں یا بالواسطہ، اگر اسباب کا لحاظ نہیں کریں گے تو تمام اعمال واخلاق بلا واسطہ نفس کی طرف لوٹیں گے، اور اگر اسباب کا لحاظ کریں گے تو بالواسطہ (بواسطہ اسباب) لوٹیں گے۔

نباتات کا ماہر، پودا دیکھ کر ہی سمجھ جاتا ہے کہ آگے چل کر یہ کیسا درخت بنے گا۔ مثل ہے: ''ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات'' یعنی جس پودے کے پتے خوب چکنے ہوں وہ آگے چل کر شاندار درخت بنتا ہے۔

ہجڑے کا بچپن ہی سے پتلا مزاج ہوتا ہے اور سمجھ دار لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ اگر بچہ کا یہ مزاج جوان ہونے تک باقی رہا تو ضرور وہ عورتوں کی سی عادات اختیار کرے گا، ان کا سا پوشاک پہنے گا اور ان کی عادتیں اپنائے گا۔

ایک طبیب پہچان لیتا ہے کہ اگر فلاں بچہ اپنے فطری مزاج پر جوان ہوا اور کوئی ناگہانی آفت پیش نہ آئی تو وہ یا تو جوان رعنا ہوگا یا نحیف ونزار ہوگا۔

یہ سب باتیں پہلے سے اس لئے معلوم ہو جاتی ہیں کہ درخت کی پوری صورت حال پودے اور بیج سے نمودار ہوتی ہے، آدمی کی زندگی بھر کے احوال اس کی فطرت اور بچپن کے آثار ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اعمال واخلاق کا منبع بھی نفس ہے، تمام اعمال واخلاق نفس کی جڑ ہی سے ابھرتے ہیں۔

اعلم: أن الأعمال التي يقصُدها الإنسانُ قصدًا مؤكدًا، والأخلاقَ التي هي راسخةٌ فيه: تنبعث من أصل النفس الناطقة، ثم تعود إليها، ثم تَتَشَبَّثُ بذيلها، وتُحْصٰى عليها.

أما الانبعاث منها: فلِما عرفتَ: أن للملكية والبهيمية واجتماعهما أقسامًا، ولكل قسم حكمًا؛ وغلبةُ المزاج الطبيعي، والانصباغُ من الملائكة والشياطين، ونحوُ ذلك من الأسباب، لاتكون إلا حسبَ ماتعطيه الجبلةُ، وتحصُل فيه المناسبة، فلذلك كان المرجِعُ إلى أصل النفس، بوسْط أوبغير وسط.

ألستَ ترى المخنَّث: يُخلق في أول أمره على مزاج ركيك، فيستدل به العارفُ على أنه إن شَبَّ

علی مزاجه،وجب أن يعتاد بعادات النساء، ويتزيّا بزيّهن، وينتحل رسومهن و كذلك يُدرك الطبيب أن الطفل إن شبّ على مزاجه، ولم يفجأْه عارضٌ ، كان قويا فارها، أو ضعيفا ضارعًا.

ترجمہ: یہ بات جان لیں کہ جو اعمال انسان اپنے پختہ ارادے سے کرتا ہے اور جو اخلاق آدمی میں راسخ ہوتے ہیں، ان کا ظہور نفس ناطقہ کی جڑ سے ہوتا ہے، پھر وہ نفس کی طرف لوٹتے ہیں، پھر وہ نفس کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں اور نفس کے خلاف بینت کرر کھے جاتے ہیں۔

رہا نفس سے ظہور: تو اس کی دلیل وہ باتیں ہیں جو آپ جان چکے ہیں کہ قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ اور ان کے اجتماع کی مختلف قسمیں ہیں: اور ہر قسم کا حکم جدا ہے۔ اور (آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ) مادی مزاج کا غلبہ اور ملائکہ اور شیاطین سے رنگ پکڑنا، نیز اس قسم کے دیگر اسباب نہیں ہوتے (یعنی عمل نہیں کرتے) مگر جبلت کے دینے اور آدمی میں مناسبت پیدا ہونے کے موافق، لہذا بالواسطہ یا بلا واسطہ نفس کی جڑ ہی مرجع (لوٹنے کی جگہ) ہے۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہجڑا شروع ہی سے کمزور مزاج پر پیدا کیا جاتا ہے، پس واقف کار اس مزاج سے اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ اگر وہ اپنے مزاج پر جوان ہوا (اور اس کا کوئی علاج نہ ہوا) تو ضروری ہے کہ وہ عورتوں کی سی عادتیں اپنائے، اور ان کی سی پوشاک پہنے، اور ان کے طور طریقوں کی طرف منسوب ہو۔

اور اسی طرح طبیب سمجھ جاتا ہے کہ (فلاں) بچہ اگر اپنے مزاج پر جوان ہوا اور اچانک کوئی عارض پیش نہ آیا تو وہ توانا قوی ہوگا یا کمزور لاغر ہوگا۔

لغات وترکیب:

قصدا مؤکدا مرکب توصیفی، مفعول مطلق ہے...... **شبث شَبْثًا وَتَشَبَّثَ بکذا**: چمٹنا، متعلق ہونا..... **غلبة المزاج إلخ** مبتدا ہے اور **لاتكون إلخ** خبر ہے...... **ماتعطيه** میں **ما** مصدر یہ ہے اور **تحصل** کا **تعطيه** پر عطف ہے......
ركيك: کمزور، ڈھیلا ڈھالا جمع **ركاك، وركَكَة**...... **تَزَىَّ**: آراستہ ہونا، **تَزَيَّا بِزِيِّ القوم**: قوم کا لباس پہننا **الزِّيّ**: ہیئت، شکل، پوشش، کہا جاتا ہے **أَقْبل بزيّ العرب**: وہ عرب کے لباس میں آیا...... **انتحل**: منسوب ہونا دوسرے کی چیز اپنی طرف منسوب کرنا...... **الفاره**: خوب کھانے والا...... **ضَرَعَ** (ف، س، ک) کمزور ہونا۔

۲ — اعمال واخلاق کا نفس کی طرف لوٹنا

جب انسان کوئی کام بار بار کرتا ہے تو اس کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر وہ کام بسہولت ہونے لگتا ہے۔ اب اس کام کو کرنے کے لئے نہ بہت زیادہ غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے نہ ارادہ کو زحمت دینی پڑتی ہے، خود بخود آسانی سے وہ کام

ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کام وجود میں آ کر بار بار نفس کی طرف لوٹتا ہے اور نفس اس کو قبول کرتا ہے تو نفس پر اس کا رنگ چڑھتا ہے اور رفتہ رفتہ نفس اس کام کے اثر سے رنگین ہو جاتا ہے، اس کو مشاق ہونا اور عادی ہونا بھی کہتے ہیں مثلاً ایک شخص نے آج قلم پکڑا ہے اور دوسرا شخص چھ ماہ سے کتابت سیکھ رہا ہے۔ آپ دونوں کو چار سطریں کتابت کے لئے دیں، پہلا شخص آدھ گھنٹے میں کتابت کرے گا اور دوسرا پانچ منٹ میں لکھ دے گا اور اول سے بہتر لکھے گا، کیونکہ اس نے چھ ماہ تک جو کتابت کا فعل کیا ہے، وہ بار بار اس کے نفس کی طرف لوٹتا رہا ہے اور نفس اس سے متأثر ہوا ہے، اس وجہ سے اس کو کتابت کی مشق ہو گئی ہے۔

غرض ہم جنس اعمال کا نفس کی اثر پذیری میں دخل ہوتا ہے اگرچہ یہ دخل بوجہ مخفی ہونے کے محسوس نہ ہو، اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ فتنے دلوں پر اس طرح پیش کئے جاتے ہیں، جس طرح چٹائی بننے والا تنکا تنکا اٹھا کر رکھتا ہے اور تین چار گھنٹے میں چٹائی تیار ہو جاتی ہے، اسی طرح سارے فتنے دل پر ایک ساتھ ہجوم نہیں کرتے، ایک ایک کر کے فتنے دل کو متأثر کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ دل مفتون ہو جاتا ہے۔

و أما العود إليها: فلأن الإنسان إذا عمل عملاً، فأكثر منه، اعتادته النفسُ، وسَهُل صدورُه منها، ولم يَحْتَجْ إلى رَوِيَّةٍ وتَجَشُّمِ داعية؛ فلاجَرَمَ أن النفس تأثرت منه، وقبلت لونه؛ ولاجرم أن لكل عملٍ من تلك الأعمال المتجانسة مدخلا في ذلك التأثُّر، وإن دَقَّ وخَفِيَ مكانُه، وإليه الإشارة في قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ تُعرض الفتنُ على القلوب كالحصير عودًا عودًا، فأيُّ قلب أُشْرِبَهَا نُكتت فيه نكتة سوداءُ، وأيُّ قلب أنكرها نُكتت فيه نكتة بيضاءُ، حتى تصير على قلبين: أبيضَ مثلَ الصفا، فلا تضره فتنة مادامت السماوات والأرض؛ والآخَرَ أسودُ مُرْبَادًّا كالكوز مُجَخِّيًا، لايعرف معروفًا، ولايُنكر منكرًا، إلا ما أُشرب من هواه﴾

ترجمہ: اور رہا (اعمال کا) نفس کی طرف لوٹنا: تو اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان جب کوئی کام کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو نفس اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اس عمل کا نفس سے صادر ہونا آسان ہو جاتا ہے اور غور وفکر اور ارادہ کو تکلیف دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، پس لامحالہ یہ بات ہے کہ نفس اس عمل سے متأثر ہوا ہے۔ اور نفس نے اس عمل کا رنگ قبول کر لیا ہے اور یقیناً یہ بات ہے کہ ان ایک جیسے اعمال میں سے ہر عمل کا اس اثر پذیری میں دخل ہے، اگرچہ وہ دخل باریک ہے اور اس کی جگہ پوشیدہ ہے (یعنی اس کا سمجھنا دشوار ہے) اور اسی دخل کی طرف اشارہ ہے اس ارشاد نبوی میں کہ: ”فتنے دلوں پر پیش کئے جاتے ہیں، چٹائی کی طرح تنکا تنکا کر کے، پس جو دل بھی فتنے پلا دیا گیا ہے (یعنی فتنے اس میں پیوست ہو گئے ہیں فتنوں سے اس دل کو دلچسپی ہو گئی ہے) اس دل میں ایک سیاہ دھبہ لگا دیا جاتا ہے۔ اور جو دل فتنوں کو ناپسند کرتا ہے اس

میں ایک سفید نقطہ لگایا جاتا ہے، یہاں تک کہ دل دوطرح کے ہوجاتے ہیں (ایک) سنگ سفید کی طرح سفید، پس اس کو کوئی فتنہ ضرر نہیں پہنچا تا جب تک آسمان وزمین برقرار ہیں (یعنی تا ابد) اور دوسرا سیاہ مٹیالا، اوندھی صراحی کی طرح وہ نہ کسی نیکی کو پہچانتا ہے اور نہ کسی برائی کو جانتا ہے، مگر وہی خواہش جو وہ پلایا گیا ہے یعنی اس کی محبت میں اس کا دل گرفتار رہتا ہے۔
(رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الفتن حدیث نمبر ۵۳۸۰)

لغات:

الرؤیۃ: امور میں غور وفکر ...... تَجَشَّم الأمرَ: مشقت سے کام کرنا ...... عُوذا عوذا: بوریے میں تنکے ایک کے پیچھے ایک لگائے جاتے ہیں، اسی طرح سے دلوں پر فتنے وارد ہوتے ہیں ...... اِرْبَدَّ اِرْبِدادًا وارْبادّ ارْبِیْدادًا: خاکستری رنگ والا ہونا ...... مُجَخِّيًا (اسم مفعول) مُجَخِّيًا (اسم فاعل) سرنگوں تَجَخَّى الكوزُ: سرنگوں ہونا، اوندھا ہونا، اوندھی کی ہوئی صراحی میں کچھ بھی نہیں بھرا جاسکتا، جو کچھ اس میں ڈالا جائے گا، وہ فوراً نکل جائے گا، اسی طرح اس دل میں بھی کوئی خیر کی بات نہیں ڈالی جاسکتی۔

۳ — اعمال واخلاق کا نفس کے دامن سے چمٹنا

اس مضمون کو سمجھنے کے لئے پہلے دو باتیں سمجھنی ضروری ہیں:

(۱) بچے کا نفس شروع میں ہَیُولانی ہوتا ہے — جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو آغاز میں اس کا نفس ہیولی جیسی کیفیت میں ہوتا ہے، جس طرح ہیولی میں کوئی صورت نہیں ہوتی مگر اس میں ہر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسی طرح بچے کے ذہن میں بھی کوئی صورت نہیں ہوتی مگر اس میں ہر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، یا جیسے کوری تختی ہر نقش سے خالی ہوتی ہے مگر اس میں ہر نقش کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس پر جو چاہیں لکھ سکتے ہیں، اسی طرح ابتدائے آفرینش میں بچہ کا ذہن کورا، ہر نقش سے خالی ہوتا ہے مگر اس میں ہر نقش کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر بچہ جوں جوں بڑھتا ہے اس کے نفس میں صورتیں جمنی شروع ہوجاتی ہیں یہی نفس کا تدریجاً قوت سے فعل کی طرف نکلنا ہے۔

نوٹ: ہیولی یونانی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنی اصل اور مادہ کے ہیں اور اصطلاح میں ہیولی: اجسام طبیعیہ کا وہ جوہری جزء ہے جو اتصال وانفصال کو قبول کرتا ہے۔ اور خود اس کی نہ کوئی خاص شکل ہوتی ہے نہ کوئی معین صورت، البتہ وہ ہر شکل اور ہر صورت کو قبول کرنے کی استعداد رکھتا ہے، جیسے موم، اس کی کوئی خاص صورت نہیں، مگر اس میں ہر صورت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ موم جب بھی پایا جائے گا کسی نہ کسی صورت میں پایا جائے گا، وہ گول ڈلی ہوگا، لمبوترا ہوگا، چوکور ہوگا یا کسی اور صورت میں ہوگا، موم کسی معین صورت کے بغیر خارج میں نہیں پایا جاسکتا مگر وہ خاص صورت کا محتاج نہیں، یہی حال ہیولی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالم مادی کی تمام چیزیں ہیولی سے بنائی ہیں وہ جسم کے دونوں جوہری اجزاء:

صورت جسمیہ اور صورت نوعیہ کا محل ہے، مزید تفصیل کے لئے معین الفلسفہ دیکھیں۔

(۲) اعمال واخلاق سلسلۂ مُعِدّات ہیں ـــــ مُعِد (اسم فاعل) کے لغوی معنی ہیں تیار کرنے والا، اور اصطلاحی معنی ہیں: ''وہ چیز جو موجود ہو کر ختم ہو جائے، تب دوسری چیز وجود میں آئے'' یہ علت ناقصہ کی ایک قسم ہے، جیسے اعداد سلسلہ معدات ہیں، جب ایک عدد موجود ہو کر ختم ہو جاتا ہے تو اگلا عدد وجود میں آتا ہے، مثلاً پانچ اس وقت چھ بنتا ہے جب اس میں ایک شامل ہو جائے اور جب ایک شامل ہو گیا تو پانچ باقی نہیں رہا۔

اسی طرح چلنے والے کے قدم سلسلہ مُعدات ہیں، کیونکہ جب پیر اٹھتا ہے، اور موجودہ قدم ختم ہوتا ہے، تب اگلا قدم وجود میں آتا ہے۔

اور معدات کے تمام افراد سلسلہ وار مرتب ہوتے ہیں، ان کا ہر فرد اپنی جگہ پر رہتا ہے، نہ مقدم مؤخر ہو سکتا ہے نہ مؤخر مقدم، زمانہ کے اعتبار سے ان میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوتی اور ہر مابعد فرد میں ماسبق افراد کا حکم موجود رہتا ہے، چھ میں پانچ موجود ہیں، اسی طرح کسی جگہ تک بیس قدموں میں پہنچا جاتا ہے تو ہر مؤخر قدم میں پہلے والے اقدام کا حکم موجود ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کو دوسرا، تیسرا، چوتھا قدم کہتے ہیں، اگر سابق افراد کا حکم موجود نہ ہوتا تو ہر قدم کو صرف قدم کہتے فلاں نمبر کا قدم نہ کہتے۔

غرض انسان کے اختیاری اعمال اور صفات وملکات راسخہ بھی سلسلہ مُعدات ہیں، ہر مابعد عمل میں اور ہر مابعد حالت میں سابق تمام افراد واحوال کا حکم موجود ہوتا ہے۔ فی الوقت کاتب جو کچھ لکھ رہا ہے یا فی الحال آدمی میں جو اچھی بری صفت موجود ہے، اس میں گذشتہ زمانہ میں جو کچھ لکھا ہے یا جو جو احوال پیش آئے ہیں ان سب کا اثر موجود ہے، اگرچہ موجودہ عمل میں اور موجودہ حالت میں مشغول ہونے کی وجہ سے ماسبق معدات کے اثرات کے موجود ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ چھ میں پانچ کے موجود ہونے کا احساس کس کو ہوتا ہے؟ مگر چھ میں پانچ بہر حال موجود ہیں۔ یہی مطلب ہے اعمال واخلاق کے نفس کے ساتھ چمٹنے کا، کیونکہ موجودہ عمل وجود میں آ کر نفس کی طرف لوٹتا ہے اور اس میں سابق تمام افراد کے اثرات موجود ہیں، پس تمام اعمال نفس سے چمٹے ہوئے ہیں، یہی صورت حال صفات کی ہے، موجودہ صفت کے بنانے میں سابقہ تمام احوال کا دخل ہے، آج آدمی جو بہادر ہے تو وہ گذشتہ تمام کارناموں کا نتیجہ ہے۔

مگر یہ اعمال واخلاق جو نفس کے دامن سے وابستہ ہیں، کبھی چھوٹ بھی جاتے ہیں اور ایسا دو صورتوں میں ہوتا ہے:

(الف) جب آدمی میں وہ قوت باقی نہ رہے جس سے برائی صادر ہوتی ہے۔ آدمی بوڑھا ہو جائے یا نڈھال کرنے والی بیماری میں مبتلا ہو جائے اور گناہ کرنے کی سکت باقی نہ رہے تو گذشتہ اعمال بد کے اثرات ختم ہو جائیں گے، آدمی میں بار بار گناہ کرنے سے جو ''لت'' پڑ جاتی ہے، جو گناہ کے لئے گدگداتی رہتی ہے اور جس میں گناہ کے سابقہ تمام افراد کے اثرات موجود ہوتے ہیں وہ ''لت'' ختم ہو جاتی ہے مگر ان کا جو ریکارڈ تیار ہوا ہے وہ باقی رہتا ہے وہ ختم نہیں ہوتا۔

(ب) تقدیر الٰہی سے اچانک کوئی اچھی یا بری حالت پیش آجائے جو احوال کو بدل کر رکھ دے، جیسے کوئی ایسی نیکی کرنے کی توفیق مل گئی: اسلام قبول کرلیا، یا حج کی توفیق مل گئی، جن سے سابقہ گناہ مٹ گئے جیسا کہ قرآن میں ضابطہ آیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں اور حدیث میں ہے کہ توبہ کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں یعنی سارا ریکارڈ دُھل جاتا ہے اور مؤمن شرک میں مبتلا ہوجائے تو اس کے سابقہ تمام اعمال صالحہ اکارت ہوجاتے ہیں۔

غرض مذکورہ دو صورتیں مستثنیٰ کر کے قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال واخلاق نفس کے دامن سے وابستہ رہتے ہیں، وہ موجود ہوکر ختم نہیں ہوجاتے۔

وأما التشبث بذيلها: فلأن النفس في أول أمرها تُخلق هَيُولانيةً، فارغةً عن جميع ما تنصبغ به، ثم لاتزال تخرج من القوَّة إلى الفعل يوما فيومًا؛ وكلُّ حالة متأخرةٍ لها مُعِدٌّ من قبلها؛ والمعدَّاتُ كلُّها سلسلةٌ مترتِّبَةٌ، لايتقدَّم متأخرُها على متقدِّم، مُسْتَصْحِبٌ في هيئة النفس الموجودةِ اليومَ حكمَ كلِّ مُعِدٍّ قبلها، وإن خفي عليها بسبب اشتغالها بما هو خارج منها؛ اللهم إلا أن يفنىٰ حاملُ القوة، المنبعثة تلك الأعمالُ منها، كما ذكرنا في الشيخ والمريض، أو تَهَجَّم عليها هيئةٌ من فوقها، تُغَيِّرُ نظامها كالتغير المذكور، كما قال الله تعالى: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ وقال: ﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾

ترجمہ: اور رہا نفس کے دامن کے ساتھ چمٹنا: تو اس کی دلیل یہ ہے کہ نفس ابتدائے آفرینش میں ہیولیٰ جیسی حالت میں پیدا کیا جاتا ہے، درانحالیکہ وہ ان تمام چیزوں سے خالی ہوتا ہے جن کے ساتھ (آئندہ) وہ رنگین ہوتا ہے، پھر دن بہ دن نفس قوت (ہوسکنے) سے فعل (ہونے) کی طرف نکلتا رہتا ہے اور ہر پچھلی حالت کے لئے ایک تیار کرنے والا ہے اس کے پہلے سے (یعنی معد کے تیار کرنے سے پچھلی حالت موجود ہوتی ہے) اور معدات تمام کے تمام سلسلہ وار، مرتب ہوتے ہیں، ان کا پچھلا پہلے پر مقدم نہیں ہوسکتا، نفس کی آج موجودہ حالت ساتھ لینے والی ہے اس سے پہلے کے ہر معد کے حکم کو، اگرچہ نفس پر یہ بات پوشیدہ ہوتی ہے، اس کے اس عمل میں مشغول ہونے کی وجہ سے جو اس سے (فی الحال) صادر ہورہا ہے۔ اے اللہ! مگر یہ کہ اس قوت کا حامل ہی ختم ہوجائے جس سے وہ اعمال ابھرنے والے ہیں، جیسا کہ ہم نے بوڑھے اور بیمار کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ یا نفس پر اوپر سے کوئی ایسی حالت آدھمکے جو اس کے نظام کو تبدیل کردے مذکورہ (شیخ اور مریض کی حالت کی) تبدیلی کی طرح، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بیشک نیک کام (نامۂ اعمال سے) برے کاموں کو مٹادیتے ہیں'' (ہود ۱۱۴) اور ارشاد فرمایا: ''(اے عام مخاطب!) اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا سب غارت ہوجائے گا'' (الزمر ۶۵)

لغات: شَبِثَ بكذا: چمٹنا، متعلق ہونا...... اِسْتَصْحَبَه: ساتھ لینا...... تَهَجَّمَ على الشيئ: کسی چیز پر اچانک آپڑنا...... هيئة النفس أى صورتها الحاصلة من أرواح الأعمال.

ترکیب:

كُلُّ حالةٍ متأخرة مبتدا ہے، اور جملہ لها مُعِدٌّ خبر ہے۔ لَها خبر مقدم ہے اور مُعِدٌّ مبتدا مؤخر ہے...... المعدات كلُّها مبتدا ہے، سلسلة إلخ پہلی خبر ہے، مترتبة پہلی صفت ہے خبر کی اور جملہ لا يتقدم دوسری صفت ہے۔ مُسْتَصْحِبٌ (اسم فاعل) دوسری خبر ہے۔ مستصحِب (اسم فاعل) کا فاعل هو ضمیر مستتر ہے جو معد کی طرف راجع ہے الموجودةُ صفت ہے هيئة کی اور اليومَ صفت کا ظرف ہے، حكمَ إلخ مفعول بہ ہے مستصحب کا۔ ترجمہ: اور ہر پچھلی حالت اس کے لئے ایک مُعِدّ (تیار کرنے والا) ہے اس کے ماقبل سے، اور تمام معدات ایک ترتیب وار سلسلہ ہیں، اس سلسلہ کا پچھلا متقدم نہیں ہوتا پہلے والے پر، ساتھ لینے والا ہے وہ معدّ آج نفس میں پائی جانے والی صورت حاصلہ میں ماسبق ہر معد کے حکم کو یعنی چھ ماہ کتابت سیکھنے کے بعد آج جو استعداد نفس میں پائی جاتی ہے اس میں چھ ماہ تک مسلسل لکھنے کا حکم موجود ہے...... المنبعثة صفت ہے القوة کی اور تلك الأعمال فاعل ہے المنبعثة کا۔

۴ — اعمال واخلاق کا ریکارڈ کیا جانا

واقعہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اختیاری اعمال اور تمام ملکات راسخہ ریکارڈ کئے جاتے ہیں، هَبَاءً مَنْثُوْرًا نہیں ہوجاتے۔ نصوص میں اس کی طرف اشارے آئے ہیں۔ مثلاً یہ ارشاد کہ: ''انسان کوئی لفظ منہ سے نکالنے نہیں پاتا مگر اس کے پاس ایک تاک لگانے والا تیار ہے'' (ق ۱۸) اور یہ ارشاد کہ ''قیامت کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے'' (یٰس ۶۵) اور سورۃ الزلزال کی تفسیر میں ترمذی شریف میں صحیح حدیث مروی ہے کہ قیامت کے دن بنی آدم نے جو برے بھلے کام زمین پر کئے ہیں، زمین سب کو ظاہر کردے گی، مثلاً کہے گی: فلاں نے مجھ پر نماز پڑھی تھی، فلاں نے چوری کی تھی، فلاں نے خون ناحق کیا تھا، وغیرذلک۔ گویا آج کل کی زبان میں یوں کہیں کہ جس قدر اعمال زمین پر کئے جاتے ہیں، زمین میں ان سب کے ریکارڈ موجود رہتے ہیں، قیامت میں وہ پروردگار کے حکم سے کھول دئے جائیں گے (فوائد عثمانی)

اب رہی یہ بات کہ ریکارڈ کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے؟ تو نصوص میں اس کی وضاحت نہیں آئی۔ اور انسان کے لئے یہ بات چنداں اہمیت کی حامل بھی نہیں، کائنات کے تمام اسرار ورموز انسان کو سمجھانا ضروری نہیں۔ انسان کے لئے تو بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کو ہوشیار کردیا جائے کہ تیرا ہر عمل ریکارڈ ہو رہا ہے تاکہ وہ سنبھل کر زندگی گزارے، اور یہ بات بار بار مختلف پیرایوں میں قرآن وحدیث میں بیان کی گئی ہے۔

مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ کتاب چونکہ اسرار ورموز سمجھانے کے لئے ہے، اس لئے آپ اپنے ذوق ووجدان سے اس کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ عالم بالا میں وہاں کے نظام کے مطابق ہر انسان کا ایک مثنی (Duplicat) ہے، عہد الست میں انسانوں سے جو عہد و پیان لیا گیا ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے یعنی وہ عہد و پیان انسانوں کے مثنی سے لیا گیا تھا۔ پھر جب انسان اپنے وقت میں دنیا میں وجود پذیر ہوتا ہے تو وہ عالم بالا والا انسان ہی ہوتا ہے یعنی اُس کی صورتِ اس پر منطبق ہوتی ہے اور وہ اور یہ ایک ہوتے ہیں۔

غرض انسان کا یہ مثنی ٹیپ ریکارڈ ہے۔ دنیا میں جب بھی کوئی انسان کوئی اچھا یا برا عمل کرتا ہے تو فطری طور پر بے اختیار وہ مثنی منشرح یا منقبض ہوتا ہے، گویا انسان کے اعمال کی اُس بالائی صورت میں ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔

یہی ریکارڈنگ میدان قیامت میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوگی، کبھی تو ایسا ظاہر ہوگا کہ سب کچھ عالم بالا میں محفوظ کر لیا گیا ہے چنانچہ نامۂ اعمال تقسیم کئے جائیں گے، لوگ ان کو پڑھیں گے اور کبھی ایسا محسوس ہوگا کہ اعمال انسان کے اعضاء کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، چنانچہ میدان قیامت میں انسان کے ہاتھ پیر بولیں گے اور اعمال کی گواہی دیں گے۔

فائدہ: ہر عمل خود بخود بتلا دیتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں اس کی جزاء کیا ہے؟ امتحان میں پرچہ لکھنے کے بعد طالب عالم خود فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ کامیاب ہوگا یا فیل؟ چنانچہ فرشتے نامۂ اعمال میں عمل کے ساتھ ساتھ اس کی جزا بھی لکھتے جاتے ہیں، مگر بعض اعمال کی جزاء فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آتی تو ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ بس عمل لکھ لو اور بدلہ کا خانہ خالی چھوڑ دو، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بذات خود اس کا بدلہ ظاہر فرمائیں گے، حدیث قدسی میں ہے کہ: ''بندے نے روزہ میرے لئے رکھا ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دونگا'' یعنی فرشتے ہر شخص کے روزے کے ثواب کو نہیں سمجھ پاتے وہ صرف روزوں کو لکھ لیتے ہیں، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کا ثواب بذات خود ظاہر فرمائیں گے اور اتنا ثواب دیں گے کہ بندہ خوش خوش ہو جائے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ: ''روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک بوقت افطار دوسری اللہ سے ملاقات کے وقت (جب اس کو روزوں کا ثواب دیا جائے گا) (فائدہ ختم ہوا)

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اعمال کے ریکارڈ ہونے کی جو صورت بیان کی ہے، اس کی تائید میں امام غزالی رحمہ اللہ کی ایک عبارت لائے ہیں۔ امام غزالیؒ نے ایک دوسرے مسئلہ میں اسی طرح کی بات کہی ہے جس طرح کی بات شاہ صاحب نے احصائے اعمال کے سلسلہ میں فرمائی ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ جمیع ما کان و ما یکون لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ لوح کیا ہے؟ اور اس میں کس طرح لکھا ہوا ہے؟ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوح محفوظ اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے اور جمیع ما کان و ما یکون اس مخلوق کے دماغ میں محفوظ ہے، اس مخلوق کو قرآن میں کہیں لوح (تختی) کہیں کتاب مبین (واضح نوشتہ) اور کہیں امام مبین (واضح رجسٹر) کہا گیا ہے اور جو باتیں لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں وہ آنکھ سے نظر نہیں آسکتیں، کیونکہ وہ تختی لکڑی کی یا لوہے کی یا ہڈی کی بنی ہوئی نہیں ہے اور وہ کتاب کاغذ

یا پتوں کی نہیں ہے، اس کو اس طرح سمجھئے کہ جس طرح اللہ کی ذات وصفات مخلوق کی ذات وصفات کے مشابہ نہیں، اسی طرح اللہ کی تختی مخلوق کی تختی کے مشابہ نہیں اور اللہ کی کتاب مخلوق کی کتاب کے مشابہ نہیں۔ پھر وہ کس طرح کی کتاب ہے؟ اور اس میں کس طرح لکھا ہوا ہے؟ امام غزالی رحمہ اللہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ جس طرح حافظ قرآن کے دل ودماغ میں قرآن کے کلمات وحروف محفوظ ہوتے ہیں، اسی طرح ساری باتیں لوح محفوظ کے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ حافظ قرآن کے دماغ میں سارا قرآن لکھا ہوا ہوتا ہے، جب حافظ پڑھتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ قرآن میں دیکھ کر پڑھ رہا ہے، لیکن اگر آپ حافظ قرآن کے دماغ کے ایک ایک جزء کا جائزہ لیں تو آپ کو کہیں کوئی حرف لکھا ہوا نہیں ملے گا۔ اسی انداز پر لوح محفوظ کو سمجھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے جو باتیں طے فرمادی ہیں، اور جن باتوں کے فیصلے ہو چکے ہیں وہ ساری باتیں لوح محفوظ میں بھری ہوئی ہیں (امام غزالی کی بات پوری ہوئی)

اسی طرح انسان کا عمل بھی اُس کی اُس صورت میں جو عالم بالا میں پائی جاتی ہے ریکارڈ ہوتا رہتا ہے، مگر یہ ریکارڈنگ دنیا کی ریکارڈنگ کی طرح نہیں، بلکہ اس صورت کی قوت خیالیہ میں سب باتیں محفوظ ہوتی رہتی ہیں۔

اعمال کے ریکارڈ ہونے کی ایک اور دلیل: آدمی جو بھی اچھا برا عمل کرتا ہے وہ اس کو بھولتا نہیں، بار بار یاد کرتا ہے، اور اس کے اچھے برے بدلے کی توقع رکھتا ہے، یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا عمل ختم نہیں ہوا، بلکہ محفوظ ہے واللہ اعلم

وأما الإحصاء عليها: فسرُّه على ما وجدتُه بالذوق: أن في الحَيِّز الشاهق تَظْهر صورةٌ لكل إنسان بما يعطيه النظامُ الفوقاني —— والتي ظهرت في قصة الميثاق شعبة منها —— فإذا وُجد هذا الشخصُ انطبقت الصورةُ عليه، واتحدت معه؛ فإذا عمل عملاً انشرحت هذه الصورة بذلك العمل انشراحا طبيعيا، بلا اختيار منه، فربماتظهر في المعاد: أن أعمالها مُحْصَاةٌ عليهامن فوقها؛ ومنه: قراءة الصُّحُف؛ وربما تظهر أن أعمالَها فيها؛ ومتشبثة بأعضائها، ومنه: نُطق الأيدي والأرجل.

ثم كل صورةِ عملٍ مُفْصِحَةٌ عن ثمرته في الدنيا والآخرة؛ وربما تتوقف الملائكة في تصويره، فيقول الله تعالى: ﴿اكتبوا العمل كما هو﴾

قال الغزالي: كلُّ ما قدَّره الله تعالى من ابتداء خلق العالم إلى آخره مسطورٌ ومُثْبَتٌ في خلقٍ، خلَقه الله تعالى، يُعبر عنه تارة باللوح، وتارة بالكتاب المبين، وتارة بإمام مبين، كما ورد في القرآن؛ فجميع ما جرى في العالم وماسيجرى مكتوب فيه، ومنقوش عليه نقشًا لايُشاهَد بهذه العين.

ولاتظنَّ أن ذلك اللوح من خشب أو حديد أو عظم، وأن الكتاب من كاغذ أو ورق؛ بل ينبغي أن تَفْهَمَ قطعًا: أن لوح الله لايُشبِه لوحَ الخلق، وكتابَ الله تعالى لايُشْبِهُ كتابَ الخلق، كما أن ذاته وصفاته لاتُشبه ذات الخلق وصفاتِهِمْ.

بل إن كنت تطلب له مثالاً يُقَرِّبُه إلى فهمك فاعلم أن ثبوت المقادير في اللوح المحفوظ يُضاهي ثبوتَ كلماتِ القرآن وحروفِه في دماغ حافظ القرآن وقلبه، فإنه مسطور فيه، حتى كأنه حيث يقرأ ينظر إليه؛ ولو فَتَّشْت دماغَه جزءًا جزءًا، لم تُشاهد من ذلك الخط حرفًا؛ فمن هذا النمط ينبغي أن تفهم كونَ اللوح منقوشا بجميع ما قدَّره الله تعالى وقضاه (انتهى)

ثم كثيرًا ما تتذكر النفسُ ما عملته من خير أو شر، وتتوقع جزاءَهُ، فيكون ذلك وجها آخر من وجوه استقرار عمله، والله أعلم.

ترجمہ: اور رہا نفس کے خلاف ریکارڈ کرنا: تو اس کا راز اس طور پر جس کو میں نے ذوق سے پایا ہے یہ ہے کہ عالم بالا میں ہر انسان کی ایک صورت ظاہر ہوتی ہے، نظام فوقانی کی دَین کے مطابق —— اور وہ صورت جو میثاق کے واقعہ میں ظاہر ہوئی تھی وہ اسی کی ایک شاخ تھی —— پھر جب یہ شخص پایا جاتا ہے تو وہ صورت اس پر منطبق ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ پھر جب یہ شخص کوئی (نیک) عمل کرتا ہے تو یہ (فوقانی) صورت اس عمل کی وجہ سے منشرح ہوتی ہے، فطری طور پر منشرح ہونا، اس کے اختیار کے بغیر، پس کبھی قیامت میں ظاہر ہوگا کہ اس صورت کے اعمال اس کے خلاف اس کے اوپر سے ریکارڈ کئے گئے ہیں اور نامۂ اعمال کا پڑھنا اسی قبیل سے ہے، اور کبھی ظاہر ہوگا کہ اس کے اعمال اسی (نامۂ اعمال) میں ہیں، اور اس کے اعضاء کے ساتھ چمٹنے والے ہیں۔ اور ہاتھوں اور پیروں کا بولنا اسی قبیل سے ہے۔

پھر عمل کی ہر صورت واضح کرنے والی ہے دنیا و آخرت میں عمل کے ثمرہ کو، اور کبھی ملائکہ ہچکچاتے ہیں عمل کی تصویر کشی میں (یعنی ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کتنا ثواب لکھیں) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''عمل کو جیسا وہ ہے لکھ لو'' (رواہ احمد، ترغیب منذری ۲: ۴۴۲)

امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ تمام باتیں جو اللہ تعالیٰ نے طے فرمادی ہیں، عالم کی پیدائش کے آغاز سے اس کے آخر تک، سب لکھی ہوئی اور ثابت کی ہوئی ہیں ایک ایسی مخلوق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے (اسی غرض سے) پیدا کیا ہے، جس کو کبھی لوح سے، کبھی کتاب مبین سے، اور کبھی امام مبین سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے، پس تمام وہ باتیں جو عالم میں ہو چکی ہیں اور جو آئندہ ہوں گی، اس مخلوق میں لکھی ہوئی ہیں اور اس مخلوق پر منقش ہیں ایسے نقوش سے جو اس آنکھ سے نہیں دیکھے جا سکتے۔

اورآپ ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ تختی لکڑی کی یا لوہے کی یا ہڈی کی ہے اور یہ کہ کتاب کاغذ کی یا پتوں کی ہے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ آپ قطعی طور پر اس طرح سمجھیں کہ اللہ کی تختی مخلوق کی تختی کے مشابہ نہیں ہے۔ اور اللہ کی کتاب مخلوق کی کتاب کے مشابہ نہیں ہے، جیسا کہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات مخلوق کی ذات اور ان کی صفات کے مشابہ نہیں ہیں۔

بلکہ اگر آپ لوح محفوظ کی کوئی ایسی مثال چاہتے ہیں جو اس کو آپ کے ذہن سے قریب کرے تو جان لیں کہ طے کردہ باتوں کا ثبوت لوح محفوظ میں مشابہ ہے کلمات قرآن اور اس کے حروف کے ثبوت کے، حافظ قرآن کے دل ودماغ میں، پس یقیناً قرآن لکھا ہوا ہے حافظ کے دماغ میں، یہاں تک کہ گویا حافظ پڑھتا ہے درانحالیکہ وہ دیکھ رہا ہے، اس لکھے ہوئے کو۔ اور اگر آپ اس کے دماغ کے ایک ایک جز کی تلاشی لیں تو آپ اس تحریر میں سے ایک حرف کو بھی نہیں دیکھیں گے۔ پس اسی انداز سے مناسب ہے کہ آپ سمجھیں لوح محفوظ میں ان تمام چیزوں کے لکھے ہوئے ہونے کو، جو اللہ تعالیٰ نے طے کی ہیں اور جن کا فیصلہ کیا ہے (تمام شد)

پھر بارہا نفس یاد کرتا ہے اُن بھلی بری باتوں کو جو اس نے کی ہیں، اور امید لگاتا ہے وہ اس کے بدلہ کی، پس ہوتی ہے وہ ایک دوسری وجہ اس کے عمل کے ثبوت کی وجوہ میں سے، واللہ اعلم۔

لغات:

ذَوْق: کے لغوی معنی ہیں طبیعت کا اندازہ اور شاہ صاحب کی اصطلاح میں ایک مخصوص وہبی علم کا نام ذوق ہے التفہیمات جلد دوم تفہیم ۱۲۲ میں ہے الذوق: وهو منصب الحكيم، وحدُّه: العلم الذى ينزل عليه من حيث ينزل عليه سرُّ وجوده. مولانا سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اعلم أن اصطلاح المصنفؒ أن رؤية الشيئ بالنور الحاصل من حظيرة القدس ومعرفته به يقال له: الذوق اھ ...... بمايعطيه میں ما مصدر یہ ہے...... مفصِحة (اسم فاعل) اَفْصَحَ عن الشيئ: ظاہر کرنا، بیان کرنا...... قوله: مفصحة أى مظهرة، قال العلامة: تكتب الحفظة الأعمالَ بصورتها حتى يظهر من رؤيتها أن هذا الرجل ناج أوهالك، مثلاً زنى رجل بامرأة، فيكتبون صورة الرجل والمرأة فى حال زناهما، فيظهر منها أنهما معذبان؛ وهذه القاعدة كانت رائجة فى الناس فى الزمان الماضى، فمثلاً يصورون مجيئ زيد فى صورة زيد، وبابٍ، حتى يُعلم أنه جاء، وكذلك كانوا يكتبون جميع حاجاته.

قوله: فى تصويره: قال العلامة: كانت قاعدة الكتابة فى الزمان الماضى بالتصوير، فربما لايمكن التصوير، مثلاً قال رجل: اللهم لك الحمد عدد أقطار الأمطار، فيقال لهم: اكتبوا العمل كما هو اھ ......
قوله: من ورق: پہلے پتوں پر بھی کتابیں لکھی جاتی تھیں۔

باب ــــــ ۱۲

اعمال کا ملکات سے جوڑ

ملکات جمع ہے مَلَکَۃٌ کی، جس کے معنی ہیں: وہ صفت جو نفس کے اندر راسخ ہو جائے، اور جب تک راسخ نہ ہوا سے ''حال'' کہتے ہیں۔ گذشتہ باب میں جو بیان کیا گیا تھا کہ انسان کے اختیاری اعمال نفس کی طرف لوٹتے ہیں اور اس کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ یہ اعمال نفس میں رفتہ رفتہ ایک حالت پیدا کرتے ہیں، جب تک وہ حالت عارضی رہتی ہے ''حال'' کہلاتی ہیں اور جب وہ راسخ ہو جاتی ہے تو اس کو ''ملکہ'' کہتے ہیں اخلاق حسنہ اور سیہ بھی اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے ان ملکات کو ھیئات نفسانیہ کہا ہے۔ ھیئت کے معنی ہیں حالت، کیفیت، اس کی جمع ھیئات ہے اور نفسانی کے معنی ہیں اندرونی، قلبی، پس ھیئات نفسانیہ کے معنی ہیں کیفیات قلبیہ، مگر عارضی نہیں، بلکہ راسخ کیفیات مراد ہیں۔

ملکات اور اعمال کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ملکات اور اخلاق کے مطابق اعمال وجود میں آتے ہیں ارشاد ہے إنما الأعمال بالنیات اور ملکات واخلاق اعمال کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً مسلسل مشق کر کے ایک شخص فن کتابت میں مہارت پیدا کرتا ہے، تو یہ ملکہ مسلسل لکھنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسی ملکہ سے خوشنویس عمدہ تحریر لکھتا ہے۔ غرض اعمال وملکات میں گہرا ربط ہے۔ اس باب میں اسی ارتباط کا بیان ہے، اگرچہ عرف عام میں دونوں کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے یعنی عام لوگ ملکات کو اعمال ہی سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے روح اور بدن دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں ارتباط ہے مگر عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کرتے۔ وہ روح کو بھی بدن ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح عام لوگ ملکہ کا بھی ادراک نہیں کرتے وہ اعمال ہی کو اصل بلکہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔

اس باب میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دو باتیں بیان کی ہیں:

(۱) اعمال، ہیئاتِ نفسانیہ کے پیکر ہائے محسوس اور ان کی تشریحات ہیں یعنی ملکات ایک مخفی چیز ہیں، ایک ماہر خوشنویس بھی عام انسان کی طرح ہوتا ہے، مگر جب وہ قلم پکڑتا ہے تو اس کی مہارت اور عبقریت ظاہر ہوتی ہے، اس کی تحریر ہی اس کی مہارتِ فن کی نظر آنے والی صورت ہوتی ہے، اور وہی اس کی مہارت کی ترجمانی اور تشریح کرتی ہے۔

(۲) اعمال ایک جال ہیں، ملکات واخلاق کو ان کے ذریعہ شکار کیا جاتا ہے، یعنی کوئی ملکہ اور مہارت پیدا کرنی ہو تو مسلسل عمل کر کے ہی پیدا کی جاسکتی ہے۔

اور یہ دونوں باتیں فطری اور صورت نوعیہ کی دین ہیں، انسان میں انسان ہونے کی وجہ سے یہ دونوں باتیں پائی

جاتی ہیں، دیگر حیوانات میں یہ صورت حال نہیں پائی جاتی۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب آدمی میں کسی کام کا داعیہ (تقاضا) پیدا ہوتا ہے اور نفس اس کی مطاوعت (فرماں برداری) کرتا ہے تو داعیہ کو انشراح ہوتا ہے۔ اور نفس مطاوعت نہیں کرتا تو داعیہ کو انقباض ہوتا ہے، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ عمل کے پیچھے کوئی کیفیت نفسانیہ ہے، جس کی مطاوعت اور عدم مطاوعت کا داعیہ اور اس کے واسطہ سے عمل پر اثر پڑتا ہے۔

پھر جب آدمی عمل کر چکتا ہے تو اس کا عمل جس قوت سے تعلق رکھتا ہے وہ قوت طاقت ور ہو جاتی ہے اور مقابل قوت دب جاتی ہے اور کمزور ہو جاتی ہے، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اچھے برے اعمال باطن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حدیث میں اس طرف اشارہ ہے، فرمایا: ''نفس گناہ کی آرزو اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے'' یعنی داعیہ کا پیکر محسوس شرمگاہ کا عمل ہے۔ اگر یہ عمل پایا جائے تو داعیہ واقعی ہے ورنہ بس وسوسہ ہے۔ لیکن اگر پیکر محسوس کسی مجبوری کی وجہ سے نہ پایا جائے تو وہ کلا ھما فی النار کا مصداق ہے۔ یعنی وہ داعیہ واقعی ہے اور اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ متفق علیہ روایت ہے کہ ''جب دو مسلمان تلواریں لے کر بھڑتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جاتے ہیں'' راوی نے دریافت کیا کہ قاتل کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آیا، مقتول جہنم میں کیوں گیا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''وہ اپنے ساتھی کے قتل کا حریص تھا'' یعنی وہ قتل کا عزم مصمم لے کر نکلا تھا، مگر اتفاق کہ وہ مار نہ سکا، مارا گیا، پس وہ بھی جہنم رسید ہوگا (مشکوۃ کتاب القصاص باب قتل اہل الردۃ حدیث نمبر ۳۵۳۸)

غرض ہر خُلق اور ہر ملکہ کے لئے کچھ اعمال اور ظاہری صورتیں ہیں، جن کے ذریعہ اس ملکہ اور اس صفت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور اس ملکہ اور صفت کو ان کے ذریعہ تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ پیکر ہائے محسوس اس ملکہ اور صفت کو سمجھاتے ہیں۔ مثلاً آپ کہیں کہ فلاں آدمی بہادر یا سخی ہے اور کوئی دلیل پوچھے تو آپ اس کے بہادرانہ کارناموں کو اور داد و دہش کو بیان کریں گے، اسی طرح کوئی شخص بہادری اور سخاوت کو سمجھنا چاہے تو وہ بھی اعمال اور پیکر ہائے محسوس کا سہارا لے گا، جیسے ایک شخص نے کسی مولوی صاحب سے پوچھا کہ پرہیز گاری کیا ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا: فرض کرو تم جوان رعنا ہو اور کوئی عورت بھی جواں مہ جبیں ہو، تم دونوں کو ایک رات، ایک مکان میں تنہائی میسر آئے، مگر تمہارے دل میں برائی کا کوئی خیال تک پیدا نہ ہو تو یہ پرہیز گاری ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب نے پرہیز گاری کو جو ایک ملکہ ہے، اس کے پیکر محسوس کے ذریعہ سمجھایا ہے۔

لطیفہ: پھر مولوی صاحب نے اس شخص سے پوچھا کہ سمجھے، تقوی کیا ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! سمجھ گیا، تقوی ہجڑا ہونے کا دوسرا نام ہے!

سوال: کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص بہادر یا سخی ہو اور زندگی بھر کوئی بہادرانہ کارنامہ انجام نہ دے، نہ ایک پیسہ

خرچ کرے؟

جواب: ایسا ہوسکتا ہے، جب کوئی اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت کو بدل ڈالے البتہ عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے اندر کوئی ایسا ملکہ یا صفت پیدا کرنا چاہے، جو اس میں نہیں، مثلاً بہادری نہیں ہے، اور وہ بہادر بننا چاہتا ہے، یا سخاوت کی صفت نہیں ہے اور وہ سخی بننا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ بہادری اور سخاوت کے مواقع کا متلاشی رہے، اور جب بھی موقع ملے بہ تکلف بہادری والے کام کرے اور زیادہ سے زیادہ سخاوت کرے تو رفتہ رفتہ بہادر اور سخی بن جائے گا یہی مطلب ہے اعمال کے جال سے ملکات کو شکار کرنے کا، اسی طرح اس لائن کے جو اکابر گزرے ہیں ان کے واقعات کو پڑھنے یا سننے سے بھی اس صفت کو پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اگر چہ اعمال و ملکات دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور اصل ملکات ہیں، اعمال صرف مظاہر ہیں، مگر شریعت میں بحث اعمال سے اور ان کی ظاہری شکلوں سے کی جاتی ہے اور انہی کے احکام مقرر کئے جاتے ہیں، ان کے پیچھے جو ملکات ہیں ان سے شریعت کچھ زیادہ بحث نہیں کرتی، ان کے متعلق چند موٹی باتیں بتلادی گئی ہیں اور ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً:

(۱) إنّما الأعمالُ بالنيّات إلخ میں ملکات کی طرف اشارہ ہے اور یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ثواب کی کمی زیادتی اور اعمال کی قبولیت وعدم قبولیت کا انہی پر مدار ہے۔

(۲) سورۃ الحج آیت ۳۷ میں ہے ﴿لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا، وَلَا دِمَآؤُهَا، وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ یعنی حج کی قربانیوں کا گوشت اور خون اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچتا بلکہ ان کو تمہارا تقوی پہنچتا ہے یعنی تم نے کیسی خوش دلی اور جوش محبت سے ایک قیمتی اور نفیس چیز، اس کی اجازت سے، اس کے نام پر، اس کے گھر کے پاس لے جا کر قربان کی ہے، گویا اس قربانی کے ذریعہ سے تم نے ظاہر کردیا ہے کہ ہم خود بھی اللہ کی راہ میں اسی طرح قربان ہونے کے لئے تیار ہیں، یہی وہ تقوی (دل کا ادب) ہے جس کی بدولت خدا کا عاشق اپنے محبوب حقیقی سے خوشنودی حاصل کرتا ہے۔ اس آیت میں جس کیفیت کو تقوی کہا گیا ہے اسی کو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ہیئت نفسانی اور ملکہ سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) مسلم شریف کی روایت ہے انَّ اللّٰـه لَايَنْظُرُ إلى صُوَرِكُمْ، ولا أموالكم، ولكن ينظر إلى قلوبكم وأعمالكم یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں (مشکوۃ کتاب الرقاق، باب الریاء حدیث نمبر ۵۳۱۴) اس حدیث میں اعمال کے ساتھ ملکات کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اور شریعت میں عام طور پر اعمال سے بحث اس لئے کی جاتی ہے کہ اعمال ہی منضبط کئے جاسکتے ہیں، انہی کے لئے قواعد وضوابط مقرر کئے جاسکتے ہیں، انہی کے اوقات وحدود متعین کئے جاسکتے ہیں، وہی نظر آتے ہیں اور دِکھتے ہیں، نقل بھی انہی کو کیا جاسکتا ہے، وہی قابل حکایت ہیں اور انسان کی قدرت واختیار کے ماتحت بھی وہی آتے ہیں اور انہی کے

ذریعہ اورانہی پر مؤاخذہ کیا جاسکتا ہے مثلاً نماز کا عمل ہے، قربانی ہے، روزہ وزکات ہیں، انہی اعمال ظاہرہ کو منضبط کیا جاسکتا ہے اورانہی کے حدود کی تعیین کی جاسکتی ہے ان کے پیچھے جو ملکات ہیں ان کی کوئی تحدید وتوقیت نہیں کی جاسکتی، کیونکہ وہ مخفی امور ہیں۔

﴿باب ارتباط الأعمال بالهيئات النفسانية﴾

اعلم: أن الأعمال مظاهرُ الهيئات النفسانية، وشروحٌ لها، وشَرَكاتٌ لِاقْتِنَاصِها، ومتحدةٌ معها في العرف الطبيعي، أي: يتفق جمهور الناس على التعبير بها عنها؛ بسبب طبيعي تعطيه الصورةُ النوعية.

وذلك: لأن الداعية إذا انبعثت إلى عمل، فطاوعت لها نفسُه انبسطت وانشرحت؛ وإن امتنعت انقبضت وتقلّصت؛ فإذا باشر العملَ استبدَّ منبعُه من ملكية أو بهيمية وقَوِيَ، وانْحَرَف مقابِلُه وضَعُفَ؛ وإلى هذا الإشارةُ في قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿النفس تتمنى وتشتهي، والفرج يصدِّق ذلك، ويكذبه﴾

ولن ترى خُلُقا إلاوله أعمالٌ وهيئاتٌ ، يُشار بها إليه، ويُعبَّر بها عنه، وتَتَمَثَّلُ صورتُها مِكشافًا له؛ فلو أن إنسانا وصف إنسانا آخر بالشجاعة، واستُفسر، فَبَيَّن، لم يُبَيِّن إلا معالَجاتِه الشديدةَ؛ أو بالسخاوة لم يبين إلا دراهمَ ودنانير يَبْذُلُها ، ولو أن إنسانا أراد أن يستحضر صورةَ الشجاعة والسخاوة، اضطر إلى صورتلك الأعمال؛ ـــــ اللهم! إلا أن يكون قد غَيَّر فطرةَ الله التي فطَرَ الناس عليها ـــــ ولو أن واحدًا أراد أن يُحَصِّل خُلُقا ليس فيه، فلا سبيل له إلى ذلك إلاالوقوعُ في مظانّه، وتجشُّمُ الأعمال المتعلقة به، وتَذَكُّرُ وقائع الأقوياء من أهله.

ثم الأعمال هي الأمور المضبوطة، التي تُقصد بالتوقيت، وتُرى وتُبصر، وتُحْكَى وتُؤْثَرُ، وتَدخل تحت القدرة والاختيار، ويُمكن أن يُؤاخَذبها وعليها.

ترجمہ: باب (۱۲) اعمال کا قلبی کیفیات سے جوڑ: جان لیں کہ اعمال، کیفیات قلبیہ کے پیکر ہائے محسوس اور ان کی تشریحات (وضاحتیں) ہیں، اور ان کو شکار کرنے کے دام ہیں اور فطری عرف میں اعمال: کیفیات قلبیہ کے ساتھ متحد ہیں یعنی عام لوگوں کا اعمال کے ذریعہ کیفیات قلبیہ کو تعبیر کرنے پر اتفاق ہے (اور یہ بات) ایک ایسے فطری سبب سے ہے جو صورت نوعیہ کی دَین ہے۔

اور وہ بات اس لئے ہے کہ داعیہ (طبیعت کا تقاضا) جب کسی کام کے لئے اٹھتا ہے، پس آدمی کا نفس اس داعیہ کی

اطاعت کرتا ہے تو داعیہ خوش ہوتا ہے اور منشرح ہوتا ہے اور اگر مخالفت کرتا ہے تو داعیہ منقبض ہوتا ہے اور سکڑ تا ہے پھر جب آدمی عمل کر چکتا ہے تو ملکیت یا بہیمیت میں سے اس عمل کا سرچشمہ ڈکٹیٹر اور قوی ہو جاتا ہے اور اس کا مد مقابل منحرف اور کمزور ہو جاتا ہے اور حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ: ''نفس تمنا کرتا ہے اور خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی تکذیب کرتی ہے'' (مشکوۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۶)

اور آپ ہرگز کوئی خُلق نہیں دیکھیں گے مگر اس کے لئے اعمال اور شکلیں ہوں گی، جن کے ذریعہ اس خُلق کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور جن کے ذریعہ اس خُلق کو تعبیر کیا جاتا ہے، اور جن کی صورتیں اس خُلق کے لئے آلۂ انکشاف بن کر پائی جاتی ہیں، پس اگر کوئی شخص کسی دوسرے انسان کو بہادری کے ساتھ متصف کرے، اور اس سے اس کی وضاحت پوچھی جائے، پس وہ بیان کرے، تو نہیں بیان کرے گا وہ مگر اس کے سخت معرکوں کو؛ یا کوئی شخص کسی کو سخاوت کے ساتھ متصف کرے تو نہیں بیان کرے گا وہ مگر ان دراہم ودنانیر کو جن کو وہ خرچ کرتا ہے: اور اگر کوئی انسان چاہے کہ حاضر کرے بہادری اور سخاوت کی صفت کو (یعنی اس کو سمجھنا چاہے) تو مجبور ہوگا وہ اُن اعمال کی شکلوں کی طرف —— اے اللہ! مگر یہ کہ اس نے اس فطرت کو بدل دیا ہو، جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے —— اور اگر کوئی شخص چاہے کہ کسی ایسے خلق کو اپنے اندر پیدا کرے جو اس میں نہیں ہے، تو اس کی کوئی راہ نہیں مگر پہنچنا اس خلق کے مواقع میں، اور ان اعمال کو بہ تکلف کرنا جو اُس خلق سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ اور اس خُلق والوں میں سے قوی لوگوں کے واقعات کو یاد کرنا۔

پھر اعمال ہی وہ چیزیں ہیں جو ضبط کی ہوئی ہیں، جو اوقات کی تعیین کے ساتھ ارادہ کی گئی ہیں اور نظر آتی ہیں اور دِکھتی ہیں اور حکایت کی جاتی ہیں اور نقل کی جاتی ہیں اور قدرت وارادہ کے تحت آتی ہیں، اور ان کے ذریعہ اور ان پر پکڑ کی جاسکتی ہے۔

لغات وترکیب:

مَظْهر: ظاہر ہونے کی جگہ...... شَرْحٌ: وضاحت...... قَنَصَ واقتنص الطير: شکار کرنا...... قوله: شركات لاقتناصها أى شبكة لاصطياد الهيئات يعني يكون في بعض الناس ملكة الأعمال راسخةً في القلب، فيعمل الأعمال الموافقة لها، فتكون الأعمال حينئذ مظاهرَ الملكات وشروحًا لها، وأما إذا لم تكن ملكةُ أعمالٍ مخصوصة في رجل، فهو يعمل أعمالاً مخصوصة مرارًا كثيرة حتى تثبت ملكة تلك الأفعال في نفسه، فحينئذ تكون الأعمال شبكة لاصطياد الملكة (سندی)...... بسبب طبيعي كاتعلق مظاهر وشركات ہونے کے ساتھ ہے تَجَسَّم العمل: بہ تکلف کرنا...... قوله: في المعرف الطبيعي أى في العرف الذى تقتضيه طبيعة الإنسان قوله: أن يؤاخذ بها أى على فعلها إذا كانت شراً، وعليها أى على تركها إذا كانت حسنة مأمورة بها (سندی)



کسی کے ملکات زیادہ ریکارڈ کیے جاتے ہیں اور کسی کے اعمال

انسان کے اعمال وملکات (کیفیاتِ قلبیہ) دونوں ریکارڈ کئے جاتے ہیں، مگر احصاء میں لوگوں کے احوال مختلف ہیں، جو قوی استعداد کے لوگ ہیں۔ جیسے انبیائے کرام، ان میں اعمال سے زیادہ ملکات پائے جاتے ہیں اور کمزور استعداد کے لوگ ظاہری اعمال ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، تفصیل درج ذیل ہے:

① قوی استعداد والوں میں اعمال سے ملکات زیادہ پائے جاتے ہیں، ان کا اصل کمال اخلاق وملکات ہوتے ہیں مگر وہ اعمال بھی کرتے ہیں، کیونکہ اعمال، ملکات کے سانچے اور شکلیں ہیں اور اخلاق سانچوں میں ڈھلتے ہیں اور ظاہری شکلوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے یہ حضرات ظاہری اعمال سے بھی صرف نظر نہیں کرتے۔ ان حضرات کے اصل ملکات ریکارڈ کئے جاتے ہیں اور اعمال بھی ریکارڈ کئے جاتے ہیں مگر ان کا احصاء ضعیف ہوتا ہے، کیونکہ مقصود ملکات ہیں، اعمال تو مظاہر ہیں، مگر ضروری وہ بھی ہیں، جیسے خواب کی ظاہری شکل مقصود نہیں ہوتی اس کا ایک مطلب ہوتا ہے اور وہی مقصود ہوتا ہے، مگر وہ مطلب ظاہری شکل ہی سے سمجھا جاتا ہے، اس طرح وہ ظاہری شکل بھی مطلوب ہوجاتی ہے، مثلاً ایک شخص نے خواب دیکھا کہ وہ لوگوں کی مونہوں اور شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے، اس نے تعبیر کے امام حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ (۳۳-۱۱۰ھ) سے تعبیر معلوم کی۔ آپ نے فرمایا: تم مؤذن ہو اور (رمضان میں) وقت سے پہلے فجر کی اذان دیتے ہو (جسے سن کر لوگ سحری موقوف کردیتے ہیں) اس خواب کی جو ظاہری شکل ہے وہ مراد نہیں، مراد وہ تعبیر ہے جو محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے دی، مگر وہ تعبیر مستفاد خواب کی ظاہری شکل ہی سے ہے۔

اور ملکات کے اقوی اور اعمال کے اضعف ہونے کی مثال یہ ہے کہ امتی، نبی سے اعمال کی مقدار میں تو بڑھ سکتا ہے، مگر امتی کی زندگی بھر کی نمازیں نبی کے دوگانہ کے ہم پلہ نہیں ہوسکتیں، کیونکہ امتی کا ملکہ نبی کے ملکہ کے ہم پلہ نہیں ہوسکتا، اور عمل میں وزن نیت وکیفیت قلبی (ملکہ) سے پیدا ہوتا ہے۔

② اور ضعیف استعداد کے لوگ ظاہری اعمال ہی کو عین کمال سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے اعمال کے پیچھے جو ملکات ہیں وہ اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ عام لوگ ان کا ادراک بھی نہیں کرسکتے۔ ایک عام مسلمان سے پوچھو تو اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے عمل کے پیچھے کوئی ملکہ بھی ہے، وہ بس عمل کرتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے، ایسے لوگوں کے اعمال اصالۃً ریکارڈ کئے جاتے ہیں اور ملکات کا احصاء بس برائے نام ہوتا ہے۔

اور دنیا میں اسی قسم کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، اس لئے ان لوگوں کی خاطر اعمال کی تعیین وتحدید ضروری ہے، تاکہ وہ صحیح طور پر اعمال کو انجام دے سکیں، چنانچہ شرائع الٰہیہ میں ہمیشہ اصل زور اعمال پر دیا گیا ہے اور انہی کی اہمیت نمایاں کی گئی ہے اور انہی کی مکمل تفصیلات مرتب کی گئی ہیں۔

ثم النفوس ليست سواءً في إحصاء الأعمال والملكات عليها:

فمنها: نفوس قوية تتمثل عندها الملكاتُ أكثرَ من الأعمال، فلا يُعَدُّ من كمالها بالإصالة إلا الأخلاقُ؛ ولكن تتمثل الأعمالُ لها، لأنها قوالِبُها وصورُها، فيُحصي عليها الأعمالُ إحصاءً أضعفَ من إحصاء الأخلاق، بمنزلة مايتمثل في الرؤيا من أشباح المعنى المرادِ، كالختم على الأفواه والفروج.

ومنها: نفوس ضعيفة، تحسِب أعمالَها عين كمالها، لعدم استقلال الهيئات النفسانية، فلا تتمثل إلا مضمحلةً في الأعمال، فيُحصي عليها أنفسُ الأعمال؛ وهم أكثر الناس، وهم المحتاجون جدًا إلى التوقيت البالغ؛ ولهذه المعاني عظُم الاعتناءُ بالأعمال في النواميس الإلٰهية.

ترجمہ: پھر نفوس یکساں نہیں، ان کے اعمال وملکات ریکارڈ کئے جانے میں:

پس ان میں سے بعض: قوی نفوس ہیں، ان میں ملکات، اعمال سے زیادہ پائے جاتے ہیں، پس ان کے کمالات میں سے اصالۃً نہیں شمار کئے جاتے مگر اخلاق، لیکن ان اخلاق کے لئے اعمال بھی پائے جاتے ہیں، کیونکہ اعمال، اخلاق کے سانچے اور شکلیں ہیں، پس ان کے اعمال ریکارڈ کئے جاتے ہیں ایسا ریکارڈ کیا جانا جو اخلاق کی ریکارڈنگ سے کمزور تر ہوتا ہے، جیسے وہ بات جو خواب میں پائی جاتی ہے، معنی مرادی کی شکلوں میں سے، جیسے مونہوں اور شرمگاہوں پر مہر لگانا۔(قوله: أكثر اى تمثلا أكثر)

اوران میں سے بعض: کمزور نفوس ہیں، وہ اپنے اعمال ہی کو اپنا بعینہٖ کمال سمجھتے ہیں۔ ہیئات نفسانیہ (ملکات) کے مستقل بالذات نہ ہونے کی وجہ سے، پس نہیں پائی جاتیں وہ ہیئات مگر اعمال میں مضمحل ہوکر، پس ان کے اعمال ہی ریکارڈ کئے جاتے ہیں۔ اور زیادہ تر یہی لوگ ہیں اور یہ لوگ بہت زیادہ محتاج ہیں مفصل توقیت کے، اور اسی وجہ سے شرائع الٰہیہ میں اعمال کے ساتھ بہت زیادہ اعتناء کیا گیا ہے۔

بہت سے اعمال بذاتِ خود مقصود ہوتے ہیں

ملکات کی اہمیت کے باوجود بہت سے اعمال بذاتِ خود مقصود ومؤثر ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز کی ظاہری شکل مقصود ہے، اگر کوئی کہے کہ ''اللہ کی یاد'' مطلوب ہے، نماز کی ظاہری شکل مطلوب نہیں، تو وہ شخص گمراہ بلکہ کافر ہے، اسی طرح زنا، چوری کی ظاہری شکلوں سے بچنا ضروری ہے، اچھی نیت سے گناہ جائز نہیں ہوجاتا، پس اگر کوئی کہے کہ ''تقویٰ'' مقصود ہے، اگر کوئی شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور کسی اچھی نیت سے زنا یا چوری کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں، ایسا شخص مردود وملعون ہے۔

اور اعمال ہی مطلوب ومقصود اس وجہ سے ہوجاتے ہیں کہ وہ ملأ اعلیٰ میں پہنچ کر وہاں ثابت ہوجاتے ہیں اور ملکات

سے قطع نظر کر کے وہ اعمال ہی بالذات ملأ اعلی کو پسند یا ناپسند ہوتے ہیں،ایسی صورت میں اچھے کام کرنا گویا ملأ اعلی کے الہام کی وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ یہ اعمال صالحہ کر کے ہماری نزدیکی حاصل کرو، ہم جیسے بنو اور ہمارے انوار کو حاصل کرو اور اعمال سیئہ کا حال اس کے برعکس ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ مدارس میں رات گیارہ بجے تک مطالعہ اور تکرار کے لئے بیٹھنا لازم ہے اور اس کا مقصد آموختہ یاد کرنا ہے۔اب اگر کوئی طالب علم کہے کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، مجھے مطالعہ اور تکرار کے بغیر ہی سبق یاد ہوجاتا ہے، تو اس کی یہ بات قابل سماعت نہیں، اسے بھی حسب دستور بیٹھنا ہوگا، کیونکہ ارباب مدارس کے نزدیک یہ بات ٹھہر چکی ہے کہ خواندہ یاد کرنے کے لئے یہ ظاہری شکل ضروری ہے۔ پس جو طالب عالم اس کا اہتمام کرے گا وہ نگران کے نزدیک پسندیدہ ہوگا اور جو غیر حاضر رہے گا، مہتمم کے نزدیک ناپسندیدہ ہوگا اور سزا کا مستحق ہوگا۔

اور ملأ اعلی میں اعمال کا ٹھہراؤ بچند وجوہ ہوتا ہے:

(۱) اللہ تعالی کی طرف سے ملأ اعلی کو یہ علم ہوتا ہے کہ انسانوں کا نظام فلاں فلاں کاموں کو انجام دینے کے ذریعے اور فلاں فلاں برائیوں سے بچنے کے ذریعہ سنور سکتا ہے۔اس طرح وہ اعمال ملأ اعلی کے پاس متمثل ہوجاتے ہیں، پھر وہاں سے شرائع الٰہیہ میں ان کے احکام نازل ہوتے ہیں۔

(۲) لوگ اچھے برے اعمال کر کے جب عالم بالا میں پہنچتے ہیں تو ملأ اعلی کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ان اعمال کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور جب ان پر عرصہ دراز گزر جاتا ہے تو وہ اعمال ملأ اعلی میں ٹھہر جاتے ہیں اور ان کی اہمیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جیسے مدرسہ میں بعض طلبہ تقریر کی مشق کرتے ہیں، بعض مضمون نگاری کی، ان کا یہ عمل مہتمم مدرسہ کے علم میں مسلسل آتا رہتا ہے تو ایک عرصہ کے بعد مہتمم کے دل میں اس کی اہمیت پیدا ہوتی ہے اور وہ مدرسہ کی طرف سے طلبہ کے لئے تقریر وتحریر کا انتظام کرتا ہے یہی صورت حال برائیوں کی ہے، جب بار بار برائیاں وجود میں آتی ہیں تو وہ اخراج کا قانون بنانے کا باعث بنتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جب اعمال ملأ اعلی میں ٹھہر جاتے ہیں تو ان کو اسی طرح کرنا ضروری ہے۔اب ملکات پر مدار نہیں رہتا بلکہ وہ اعمال بذات خود مقصود ومؤثر ہوجاتے ہیں۔ جیسے متقدمین سے جو منتر مروی ہیں، ان کو اسی طرح کرنا ضروری ہے جس طرح وہ مروی ہیں۔ ہیئت بدل جائے گی تو تاثیر باقی نہیں رہے گی۔ مثلاً ڈاڑھ وغیرہ میں درد ہو تو یہ رقیہ مروی ہے کہ کوئی تختی لیکر اس پر ریت یا مٹی پھیلائی جائے، پھر اس پر ابجد ھوز حطی لکھا جائے، خواہ ملا کر یا مفرد حروف، پھر مریض یا کوئی اور شخص درد کی جگہ کو پکڑلے اور عامل کیل یا چاقو سے پہلا حرف دبائے اور سورہ فاتحہ پڑھے اور اس حرف کو چھوڑ دے، پھر دوسرا حرف دبائے اور سورہ فاتحہ پڑھے۔ دسویں حرف تک پہنچنے سے پہلے ان شاء اللہ درد ختم ہوجائے گا۔ یہ عمل اسی طرح کرنا ضروری ہے۔ صرف دس بار فاتحہ پڑھنے سے فائدہ نہ ہوگا۔

ثم إن كثيرًا من الأعمال تستقر في الملأ الأعلى، ويتوجّهُ إليها استحسانُهم أو استهجانُهم بالإصالة،مع قطع النظر عن الهيئات النفسانية التي تصدر عنها، فيكون أداءُ الصالح منها بمنزلة قبول إلهامِ من الملأ الأعلى، في التقرُّب منهم، والتشبُّه بهم، واكتسابِ أنوارهم؛ ويكون اقترافُ السيئة منها خلافَ ذلك.

وهذا الاستقرار يكون بوجوه:

منها : أنهم يتلَقَّون من بارئهم أن نظام البشر لايصلُح إلا بأداء أعمال،والكفِّ عن أعمال، فتمثَّلُ تلك الأعمالُ عندهم، ثم تنزل في الشرائع من هنالك.

ومنها : أن نفوس البشر التي مارستْ ولازمتِ الأعمالَ، إذا انتقلت إلى الملأ الأعلى، وتوجَّهَ إليها استحسانُهم واستهجانُهم، ومضى على ذلك القُرونُ والدهور، استَقَرَّتْ صُوَرُ الأعمال عندهم.

وبالجملة: فتؤثِّر الأعمالُ حينئذ تاثيرَ العزائم والرُّقَى الماثورة عن السلف بهيئتها وصفتها، والله أعلم.

ترجمہ: پھر بہت سے اعمال ملأ اعلیٰ میں ٹھہر جاتے ہیں اوران کی طرف ملأ اعلیٰ کی پسندیدگی یا ناپسندیگی بالذات متوجہ ہوتی ہے،ان ھیئات نفسانیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جن سے وہ اعمال صادر ہوتے ہیں۔پس ان میں سے نیک کاموں کا کرنا ملأ اعلیٰ کے الہام کو قبول کرنے جیسا ہوجاتا ہے۔ ملأ اعلیٰ سے نزدیک ہونے میں ،اوران کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے میں اوران کے انوار حاصل کرنے میں،اوران میں سے برے اعمال کاارتکاب کرنااس کے برخلاف ہوتا ہے۔

اور یہ ٹھہرنا چند وجوہ ہوتا ہے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ ملأ اعلیٰ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف سے (یہ بات) حاصل کرتے ہیں کہ انسانوں کا نظام سنور نہیں سکتا مگر کچھ کاموں کے کرنے سے اور کچھ اعمال سے باز رہنے سے،پس وہ اعمال ملأ اعلیٰ کے پاس موجود ہوجاتے ہیں، پھر وہاں سے شرائع میں نازل ہوتے ہیں۔

اوران میں سے ایک: یہ ہے کہ انسان کے وہ نفوس جو اعمال کی ہمیشگی کرتے رہے ہیں اوران کے ساتھ چپکے رہے ہیں، جب وہ نفوس ملأ اعلیٰ کی طرف منتقل ہوتے ہیں اوران نفوس کی طرف ملأ اعلیٰ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی متوجہ ہوتی ہے اوراس پر زمانے اور صدیاں گزر جاتی ہیں تو ان اعمال کی صورتیں ملأ اعلیٰ کے پاس ٹھہر جاتی ہیں۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت اعمال اثر کرنے لگتے ہیں اُن منتروں اورافسونوں کے اثر کرنے کی طرح، جو متقدمین سے منقول ہیں،ان کی شکلوں اور صفتوں کے ساتھ۔ واللہ اعلم

لغات وترکیب:

فی التقرب إلخ إلهام (مصدر) سے متعلق ہے ...... تمثل میں ایک ت محذوف ہے ...... مارس الأمر: ہمیشگی کرنا ...... العزیمة: منتر (یہ فارسی معنی ہیں) عربی میں معنی ہیں: پختہ ارادہ ...... رُقْیة: منتر ...... بھیئتھا إلخ متعلق ہے تأثیر (مصدر) سے ...... دوسرے منہا میں استحسان واستہجان کے درمیان واو بمعنی او ہے، کیونکہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی جمع نہیں ہوتیں۔ واللہ اعلم۔

باب —— ۱۳

مُجازات کے اسباب کا بیان

مبحث اول میں تکلیف شرعی اور مجازات زیر بحث ہیں۔ اب تک انسان کے مکلّف ہونے کا بیان تھا، ضمناً مجازات کا بیان بھی آتا رہا ہے، کیونکہ وہ تکلیف کی ماہیت میں داخل ہے، البتہ اس کے اسباب اور اس کی شکلوں کا بیان نہیں آیا، اس آخری باب میں اسی کا بیان ہے —— اور مجازات عام ہے، خواہ دنیا میں ہو یا قبر میں یا حشر میں یا اس کے بعد۔ اور مجازات کے اسباب بہت ہیں مگر ان کا خلاصہ دو اصول (سبب) ہیں:

پہلی اصل: نفس کا احساس سبب مجازات ہے —— جب کسی قوی نفس والے آدمی سے کوئی نامناسب حرکت سرزد ہوتی ہے یا اس میں کوئی بری خصلت ہوتی ہے، تو قوت ملکیہ کی برکت سے اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا یہ عمل یا اس کی یہ خصلت نامناسب ہے۔ اس احساس سے اسکے دل میں ندامت، حسرت اور رنج پیدا ہوتا ہے، جو درج ذیل شکلیں اختیار کرتا ہے۔

(۱) نیند میں یا بیداری میں یا قبر میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو تکلیف دہ، توہین آمیز اور دھمکی پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(۲) اگر نفس بہت ہی قوی ہوتا ہے اور اس میں استعداد ہوتی ہے کہ فرشتوں کے ذریعہ اس کو تنبیہ کی جائے، تو فرشتے ظاہر ہوتے ہیں اور لطیف طریقہ سے اس کو تنبیہ کرتے ہیں، جیسے ایک طرح کے اعجاب (خود پسندی) پر فرشتوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبیہ کی تھی، تاکہ وہ متنبہ ہوکر اپنی کوتاہی کا تدارک کریں، چنانچہ تدارک کیا اور خوب کیا۔ سورۂ ص آیات ۲۱-۲۵ میں یہ واقعہ مذکور ہے اور ان آیات کی صحیح تفسیر مستدرک حاکم (۴۳۳:۲) میں بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے تفصیل کے لئے ''فوائد عثمانی'' دیکھیں اور اوریا کی بیوی کا قصہ اسرائیلی اور جھوٹا ہے۔

فائدہ: تمام علوم کا یہی حال ہے، جب کسی شخص میں کسی علم کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو نیند میں، بلکہ بعض مرتبہ بیداری میں فرشتے ظاہر ہوکر الجھے ہوئے معاملہ میں راہ نمائی کرتے ہیں (فائدہ تمام ہوا)

اور اس اصل کا قرآن کریم میں اشارۃً تذکرہ آیا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۸۱ میں ہے: ''ہاں! جس نے قصداً برا کام کیا اور اس کے قصور نے اس کا احاطہ کرلیا تو وہ دوزخ والے ہیں، سدا اس میں رہیں گے'' —— قصور کے احاطہ کرنے کا

مطلب اس کی جزاء کا احاطہ کرنا ہے۔علامہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قولہ: وأحاطت به خطيئته الآية، اى جزاؤها في الدنيا من ندامة وحسرة وألم وتمثل واقعاتِ إيلام وإهانة وتهديد في المنام أو اليقظة اھ

مگر آیت کی صحیح تفسیر وہ ہے جو جمہور نے کی ہے کہ قصور کے احاطہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ اُس پر ایسا غلبہ کرلے کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو حتی کہ دل میں ایمان وتصدیق باقی ہوگی تو بھی احاطہ مذکور متحقق نہ ہوگا۔تو اب کافر ہی پر یہ صورت صادق آسکتی ہے (فوائد شیخ الہند)

غرض اس آیت میں تو صحیح تفسیر کے مطابق اس اصل کی طرف اشارہ نہیں،مگر سورۃ الزمر آیت ۵۶ میں یہ اصل صراحۃً مذکور ہے ارشاد ہے ﴿أَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ، وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ﴾ (کہیں کوئی شخص کہنے لگے کہ افسوس میری اس کوتاہی پر، جو میں نے خدا کی جناب میں روا رکھی،اور میں تو (احکام خداوندی پر) ہنستا ہی رہا) یہ حسرت بوقت مرگ بھی ہوسکتی ہے اوراس سے پہلے بھی ہوسکتی ہے اوراس کے بعد قبر اور میدان قیامت میں بھی ہوسکتی ہے۔یہ احساس برے عمل کا بدلہ ہے۔

دوسری اصل: حظیرۃ القدس کی توجہ یعنی فیصلہ خداوندی بھی سبب مجازات ہے ——— اس کی تفصیل یہ ہے کہ ملأ اعلی کو انسانوں کی کچھ کیفیات نفسانیہ، کچھ اعمال واخلاق پسند ہیں اور کچھ ناپسند ہیں، ملأ اعلی اپنے رب سے اصرار کے ساتھ درخواست کرتے ہیں کہ اچھے لوگوں کو راحتیں پہنچائی جائیں اور برے لوگوں کو سزا دی جائے۔ان کی یہ دعائیں بارگاہ خداوندی میں مقبول ہوتی ہیں،اسی طرح ملأ اعلی کی توجہات بھی انسانوں کو گھیر لیتی ہیں،ان دونوں باتوں کے نتیجہ میں لوگوں پر خوشنودی اور لعنت کی شکلیں ٹپکتی ہیں،جس طرح دیگر علوم ٹپکتے ہیں اور مجازات کی درج ذیل صورتیں متحقق ہوتی ہیں:

(۱) تکلیف دہ یا راحت رساں واقعات رونما ہوتے ہیں اور فرشتے اس حال میں نظر آتے ہیں جیسے دھمکا رہے ہوں یا ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہوں،قریب المرگ کے پاس اور قبر میں منکر ونکیر اسی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔

(۲) نفس کبھی ملأ اعلی کی ناراضگی سے متأثر ہوتا ہے تو بے ہوشی یا بیماری جیسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔قبل نبوت جب بنائے کعبہ کے موقعہ پر آپ ﷺ نے پتھر اٹھانے کے لئے کپڑا کھول کر کندھے پر رکھنے کا ارادہ کیا تھا تو فوراً بیہوشی طاری ہوگئی تھی۔اسی طرح سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ ہے کہ نبوت سے پہلے آپ ﷺ قریش کی کسی شادی وغیرہ کی تقریب میں مجبوراً تشریف لے گئے تو وہاں پہنچتے ہی نیند طاری ہوگئی اور آنکھ اس وقت کھلی جب کھیل تمام ہوگیا تھا (دیکھئے البدایہ والنہایہ ۲:۲۸۷)

(۳) کبھی ملأ اعلی کی نہایت قوی توجہ کمزور باتوں مثلاً خیالات وغیرہ پر پڑتی ہے تو وہ ملأ سافل یا انسانوں کے لئے الہام بن جاتی ہے کہ وہ اس اچھے یا برے عمل کرنے والے کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کریں۔یہ مضمون پہلے بار بار گزر چکا ہے، ثم يوضع له القبول في الأرض اور ثم يوضع له البغضاء في الأرض والی روایت باب ذكر الملأ الأعلى

کے شروع میں گزرچکی ہے وہ روایت اس کی دلیل ہے۔

(۴) کبھی آدمی کے متعلقات میں سے کوئی چیز سنور جاتی ہے یا بگڑ جاتی ہے اور راحتوں اور تکلیفوں کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں، کوئی مرجاتا ہے یا کوئی بھاری مالی نقصان ہوجاتا ہے یا بیمار شفایاب ہوجاتا ہے یا معمولی مال میں خوب برکت ہوتی ہے، جس سے رنج وراحت پہنچتی ہے، یہ بھی مجازات کی صورتیں ہیں۔ پہلے باب (۱۱) میں مسلم شریف کی روایت گزری ہے کہ لوگوں کو جو الائیں بلائیں اور خیرات وبرکات پہنچتی ہیں وہ لوگوں کے اعمال کا ثمرہ ہیں یعنی جزاء وسزا کی شکلیں ہیں۔

اور یہ سب باتیں ملأ اعلی کی دعاؤں کا لاگ رکھ کر کہی گئی ہیں، بالکل بے لاگ بات یہ ہے کہ تخلیق ارض وسماء کے وقت ہی، اللہ تعالیٰ کی عنایت نے یہ بات طے کردی تھی کہ انسان کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا جائے گا، اس کا اعمال پر مؤاخذہ کیا جائے گا یہ فیصلہ خداوندی مجازات کا اصل سبب ہے مگر چونکہ اس بات کا سمجھنا دشوار تھا اس لئے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرشتوں کی دعاؤں کو عنوان بنایا ہے۔ اور اس پیرایۂ بیان میں مجازات کو سمجھایا ہے واللہ اعلم

اور اس اصل دوم کی طرف قرآن کریم میں اشارہ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت (۱۶۱و۱۶۲) میں ہے: ''بیشک جن لوگوں نے انکار کیا (یعنی اسلام نہیں لائے) اور وہ اسی حالت کفر پر مر گئے، تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، نہ اُن سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی'' اللہ کی یہ لعنت مجازات کی اصل ہے۔

﴿باب: أسباب المجازاة﴾

اعلم: أن أسباب المجازاة، وإن كثُرت، ترجع إلى أصلين:

أحدهما: أن تُحِسَّ النفسُ، من حيث قوتها الملكية، بعملٍ أو خُلُق اكتسبته: أنه غير ملائم لها. فتتشبَّحُ فيها ندامة وحسرة وألم: ربما أوجب ذلك تَمَثُّلَ واقعاتٍ في المنام أو اليقظة، تشتمل على إيلام وإهانة وتهديد.

ورب نفس استعدت لإلهام المخالفة، فخوطبت على ألسنة الملائكة: بأن تتراءى له كسائر ما تستعدُّله من العلوم.

وإلى هذا الأصل وقعت الإشارة في قوله تعالى: ﴿بَلىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيْئَتُهُ، فَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

والثاني: توجُّهُ حَظيرة القدس إلى بني آدم؛ فعند الملأ الأعلى هيئاتٌ وأعمال وأخلاق، مرضيةٌ ومسخوطة، فتطلب من ربها طلبا قويا تنعيمَ أهلِ هذه، وتعذيبَ أهلِ تلك، فيُستجاب دعاؤهم، وتُحيط ببني آدم هِمَمُهم، وتترشح عليهم صورةُ الرضا واللعنة، كما تترشح سائرُ

العلوم: فتتشبَّحُ واقعاتٌ إيلامية أو إنعامية، وتتراءَ ى الملأُ الأعلى مُهَدِّدةً لهم، أو منبسِطَةً إليهم.
وربما تأثرت النفسُ من سُخطها، فعرض لها كهيئة الغَشْيِ، أو كهيئة المرض.
وربما ترشَّحُ ما عندهم من الهمةِ المتأكِّدَة على الحوادث الضعيفة، كالخواطر ونحوِها، فأُلهمت الملائكةُ أوبنو آدم أن يُحْسنوا أو يُسيئوا إليه.
وربما أُحيل أمر من ملابَساته إلى صلاح أو فساد، وظهرت تقريبات لتنعيمه أو تعذيبه.
بل الحق الصُّراح: أن لله تبارك وتعالى عنايةً بالناس، يومَ خلق السماوات والأرضَ، توجب أن لايُهمِل أفرادَ الإنسان سُدىً، وأن يؤاخذهم على مايفعلونه، لكن لدقة مُدْرَكِها جعلنا دعوةَ الملائكةِ عنوانا لها، والله أعلم.
وإلى هذا الأصل وقعت الإشارة في قوله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ، أُوْلٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلاَئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، لاَيُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ، وَلاَهُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾

ترجمہ: مجازات کے اسباب کے بیان میں: جان لیں کہ مجازات کے اسباب، اگرچہ بہت ہیں (مگر) وہ لوٹتے ہیں دواصلوں کی طرف:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ نفس قوت ملکیہ کی وجہ سے احساس کرے، کسی ایسے عمل یا اخلاق کے بارے میں جس کو اس نے اپنے اختیار سے کیا ہے کہ وہ (عمل یا خلق) نفس کے لئے نامناسب ہے، چنانچہ نفس میں ندامت، حسرت اور تکلیف پیدا ہو۔ وہ کبھی واجب کرے نیند میں یا بیداری میں ایسے واقعات کے پائے جانے کو جو تکلیف دینے، توہین کرنے اور دھمکانے پر مشتمل ہوں۔

اور بعض نفوس میں مخالفت کے الہام کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے تو وہ نفوس گفتگو کیے جاتے ہیں ملائکہ کی زبانی، اس طور پر کہ دیکھتے ہیں فرشتے ان کو جیسے دوسرے وہ علوم جن کی نفس میں استعداد پیدا ہوتی ہے۔

اور اس اصل کی طرف اشارہ آیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں: ''ہاں، جس نے اختیار سے کوئی برائی کی، اور اس کو اس کی برائی نے گھیر لیا، تو وہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اور دوسری اصل: انسانوں کی طرف حظیرۃ القدس کی توجہ ہے ——— پس ملائکہ کے نزدیک پسندیدہ اور ناپسندیدہ ھیئات نفسانیہ اور اعمال واخلاق ہیں، پس وہ درخواست کرتے ہیں اپنے رب سے قوی درخواست کرنا، ان لوگوں کو راحت پہنچانے کی، اور ان لوگوں کو تکلیف پہنچانے کی، پس ان کی دعا قبول کرلی جاتی ہے اور انسانوں کو ملأ اعلیٰ کی گہری توجہات گھیر لیتی ہیں اور لوگوں پر خوشنودی اور پھٹکار کی صورت ٹپکتی ہے، جس طرح دیگر علوم ٹپکتے ہیں: پس پائے جاتے ہیں تکلیف دہ اور راحت رساں واقعات اور نظر آتے ہیں فرشتے اس حال میں کہ وہ ان کو دھمکانے والے ہیں یا

ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے بات چیت کرنے والے ہیں۔

اور کبھی نفس ملأ اعلیٰ کی ناراضگی سے متأثر ہوتا ہے، پس نفس کو بے ہوشی جیسی حالت یا بیماری جیسی حالت پیش آتی ہے۔

اور کبھی وہ گہری توجہ جو ملأ اعلیٰ کے پاس ہے مترشح ہوتی ہے، کمزور باتوں پر، جیسے خیالات وغیرہ پر تو ملأ سافل یا انسان الہام کئے جاتے ہیں کہ وہ اس شخص سے اچھا معاملہ کریں یا برا معاملہ کریں۔

اور کبھی آدمی کے متعلقات میں سے کوئی چیز صلاح کی طرف یا فساد کی طرف بدل دی جاتی ہے۔ اور راحت رسانی یا تکلیف دہی کی تقریبات ظاہر ہوتی ہیں۔

بلکہ خالص حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لوگوں پر مہربانی ہے، جس دن اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، جو واجب کرتی ہے اس بات کو کہ نہ مہمل (بے مقصد) چھوڑیں وہ انسانوں کو، اور اس بات کو کہ پکڑ کریں ان کی اُن کاموں پر جو وہ کریں۔ لیکن اس بات کو سمجھنے کی باریکی کی وجہ سے ہم نے ملائکہ کی دعاؤں کو مجازات کے لئے عنوان بنایا ہے، واللہ اعلم

اور اس اصل کی طرف اشارہ آیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں کہ: ''بیشک جن لوگوں نے انکار کیا اور مرے وہ بحالت انکار، تو ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی پھٹکار ہے، ہمیشہ رہیں گے وہ اس لعنت میں نہیں ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب، اور نہ وہ مہلت دئے جائیں گے''۔

لغات:

اَحَسَّ يُحِسُّ اِحْسَاسًا: احساس کرنا...... تَشَبَّحَ تَشَبُّحًا: پایا جانا...... تَمَثَّلَ میں ایک ت محذوف ہے..... مخالفت یعنی عمل یا خلق کا ملکیت کے موافق نہ ہونا...... خُو طبت مجہول ہے، خَاطَبَه: باہم گفتگو کرنا...... حظيرة القدس سے ذات پاک مراد ہے...... هَدَّدَهُ: دھمکانا، ڈرانا...... اِنْبَسَطَ: پھیلنا، بے تکلف ہونا...... تَرَشَّح میں ایک ت محذوف ہے...... المأكدة (اسم مفعول) پختہ کی ہوئی...... الحوادث الضعيفة: کمزور واقعات یعنی وہ باتیں جن میں تبدیلی ہو سکتی ہے...... اَحَالَ اِحَالَة: تبدیلی کرنا...... مَلَابِس جمع ہے مَلْبَس اور مِلْبَس کی جس کے معنی ہیں لباس، یہاں مراد متعلقہ چیزیں ہیں...... تقريب: لغوی معنی نزدیک کرنا، عرفی معنی کوئی موقعہ نکالنا...... مُدْرَك (مصدر میمی) بمعنی ادراک ہے۔

تشریح:

قوله: من حيث الملكية أى بوسيلة القوة الملكية (سندى) قوله: ملابساته أى متعلقاته من المال والأولاد وغيرها فَتَتَنَعَّم أو تَتَعَذَّب بصلاحهم أو فسادهم، بخلاف الجزاء الأول، لأنه كان راجعا إلى نفسه، بدون واسطة، ويمكن أن يقال فى تفسير أُحِيل إلخ أى غُيِّر أمر من الأمور المتعلقة به إلى صلاح إن عمل صالحًا، كما غيرت النار الملابِسة بابراهيم بالريح الطيبة، أو إلى فساد إن عمل سيئة، كما يكون عند رجل دراهمُ أو دنانير فصارت رماداً؛ وهذا التفسير يُفهم من الباب الآتى (سندى)

مجازات کی کونسی اصل کہاں کام کرتی ہے؟

مجازات کی اوپر جو دو اصلیں بیان کی گئی ہیں یعنی نفس کا احساس اور فیصلہ خداوندی، یہ دونوں اصلیں الگ الگ بھی کام کرتی ہیں اور دونوں جمع بھی ہوتی ہیں یعنی کسی جگہ مجازات دونوں بنیادوں کی وجہ سے ہو، ایسا ہوسکتا ہے۔ پھر ترکیب کے بھی مختلف درجات ہوسکتے ہیں، اس طرح کہ کونسی اصل زیادہ موثر ہے، پس اجتماع کی بہت سی صورتیں پیدا ہوں گی۔ علاوہ ازیں مجازات کے سلسلہ میں نفس کی استعداد کے بھی مختلف درجات ہیں اسی طرح اعمال کی نوعیت بھی اچھے برے ہونے میں مختلف ہوتی ہے، پس جب دونوں اصلوں کے اجتماع کے مختلف درجات کو استعداد وعمل کے مختلف درجات میں ضرب دیں گے تو بے شمار عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوں گی، جن کے تفصیلی احکام کہ کہاں کونسی اصل کام کرے گی، بہت مشکل امر ہے، البتہ بالاجمال قاعدہ سمجھ لیں:

اصل اول اُن اعمال واخلاق میں کام کرتی ہے جن کا اثر خود عمل کرنے والے تک مقصور رہتا ہے، دوسروں تک متعدی نہیں ہوتا، جیسے کسی نے نماز نہیں پڑھی تو اس کا نقصان وہی بھگتے گا، دوسروں تک کوئی اہم ضرر نہیں پہنچے گا۔

اور جو لوگ نیک صالح اور قوی النفس ہوتے ہیں وہ اس اصل کا اثر جلد قبول کرتے ہیں، ان سے اگر برائی سرزد ہوجاتی ہے تو وہ فوراً بے چین ہوجاتے ہیں۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۳۵ میں اس کا تذکرہ ہے کہ: ''متقین وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جو بے حیائی کا ہو یا وہ اپنی ذوات پر زیادتی کرتے ہیں تو (فوراً) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے! اور وہ لوگ اپنے کئے پر اَڑتے نہیں درانحالیکہ وہ جانتے ہوں'' ﴿ وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ﴾ الآية.

اور اصل دوم اُن اعمال واخلاق میں زیادہ موثر ہے جو مفاد عامہ کے خلاف ہیں، یعنی خود عمل کرنے والے تک اس کا ضرر منحصر نہیں رہتا، بلکہ دوسروں تک اس کا ضرر متعدی ہوتا ہے اور انسانوں کے نظام کی صلاح سے جن چیزوں کا تعلق ہے وہ کام اس کے برخلاف ہے، جیسے زنا، چوری، سودخوری، ظلم وستم، اتہام طرازی اور سابقہ کتب میں جو نبی آخر الزماں کی صفات ہیں ان کو چھپانا وغیرہ۔

جو لوگ دینی اعتبار سے کمزور اور بدکردار ہوتے ہیں وہ اس اصل کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں۔ وہ جلدی موردِ عتاب بنتے ہیں اور غضب خداوندی ان پر جلد نازل ہوتا ہے۔ سودخور کا خبطی ہونا سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵ میں مذکور ہے اور آنحضور ﷺ کی صفات کو چھپانے والوں کا ملعون ہونا سورۃ البقرہ آیت ۱۵۹ میں مذکور ہے اور پاک دامن عورتوں پر اتہام طرازی کرنے والوں کا دنیا وآخرت میں ملعون ہونا سورۃ النور آیت ۲۳ میں مذکور ہے۔

ويتركب الأصلان، فيحدُث من تركُّبهما، بحسب استعداد النفس والعمل، صور كثيرة عجيبة،

لكنَّ الأولَ أقوى في أعمال وأخلاق تُصْلِحُ النفسَ أو تُفسدها؛ وأكثرُ النفوس له قبولاً أزكاها وأقواها؛ والثاني أقوى في أعمال وأخلاق مناقِضةٍ للمصالح الكلية،منافِرَةٍ لما يرجع إلى صلاح نظام بني آدم؛ وأكثرُ النفوس له قبولاً أضعفُها وأسمَجُها.

ترجمہ: اور دونوں اصلیں مرکب ہوتی ہیں تو ان کے مرکب ہونے سے اور عمل اور نفس کی استعداد کے موافق بہت سی عجیب عجیب صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اصل اول اُن اعمال واخلاق میں زیادہ مؤثر ہے جو نفس کو سنوارتے یا بگاڑتے ہیں اور لوگوں میں اس اصل کو زیادہ قبول کرنے والے زیادہ ستھرے اور زیادہ مضبوط نفوس ہیں۔

اور دوسری اصل اُن اعمال واخلاق میں زیادہ مؤثر ہے جو مصالح کلیہ (مفاد عامہ) سے متضاد ہیں۔ اور جو ان باتوں کے برخلاف ہیں جن کا تعلق انسانوں کے نظام کی صلاح سے ہے۔ اور لوگوں میں اس اصل کو زیادہ قبول کرنے والے کمزور ترین اور بدترین نفوس ہیں۔

لغات:

مناقِضة (اسم فاعل) نَاقَضَ مناقضةً: مخالف ہونا.....منافرة (اسم فاعل) نافَرَه: خاصَمه: جھگڑا کرنا یہاں بمعنی مخالفة ہے...... أزكى (اسم تفضیل) زیادہ نیک وصالح زَكَا يزكو زُكاءً: نیک وصالح ہونا...... أسْمَج (اسم تفضیل) زیادہ قبیح سَمُجَ (ک) سماجَة: قبیح ہونا......قوله: الثاني أقوى يعني: القسم الثاني تأثيره أقوى في أعمال وأخلاق مخالفة لمصلحة عامة الناس، وفسادُها يرجع إلى نظام عامة الناس، كما إذا كان الرجل تفرّق بين المسلمين، أو يغصب حق عامة الناس، ونحو ذلك اهـ (سندیؒ)

اسبابِ مجازات کے لئے موانع

مجازات کے دونوں سببوں کے لئے کچھ موانع ہیں، جو ایک خاص وقت تک ان اسباب کے احکام کو روک دیتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت نے زنا کیا اور وہ زنا سے حاملہ ہے تو وضع حمل تک حد جاری نہیں ہوگی۔ اور موانع کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلے سبب کے لئے مانع: ملکیت کا کمزور ہونا اور بہیمیت کا زورآور ہونا ہے ــــــ جب ایسی صورت حال ہوتی ہے تو نفس سراپا بہیمیت بن جاتا ہے، اس میں ملکیت کا کوئی شمہ باقی نہیں رہتا اور ملکیت کو جن چیزوں سے تکلیف پہنچتی ہے ان کا نفس کو کوئی احساس نہیں ہوتا ــــــ ایسا شخص جب بہیمی چادر یعنی بدن سے ہلکا ہوجاتا ہے یعنی مرجاتا ہے اور موت کے بعد بہیمیت کی کمک کم ہوجاتی ہے، غذا وغیرہ سے اس کو مدد پہنچنی بند ہوجاتی ہے اور ملکیت کی بجلیاں اس پر چمکتی ہیں تو اعمال واخلاق کی ملائمت اور منافرت کا احساس ہونے لگتا ہے، اور آہستہ آہستہ انعام وعذاب شروع ہوتا ہے۔

اور دوسرے سبب کے لئے مانع: مخالف اسباب کا توبہ تو جمع ہونا ہے ــــــ یعنی بہت سے دوسرے اسباب، سبب

ثانی کے حکم کے خلاف جمع ہوجاتے ہیں تو سبب دوم کا اثر رک جاتا ہے، مگر جب اس کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو جزاؤ سزا موسلا دھار برسنے لگتی ہے، سورۂ یونس آیت ۴۹ میں ہے کہ: ''ہر امت کے لئے مقررہ وقت ہے، جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں''

ولكل من السببين مانعٌ، يَصُدُّه عن حكمه إلى حينٍ:

فالأول: يَصُدُّ عنه ضعفُ الملكية وقوةُ البهيمية، حتى تصير كأنها نفس بهيمية فقط، لاتتالم من آلام الملكية، فإذا تخففت النفسُ عن الجلباب البهيمي، وقَلَّ مددُه، وَبَرِقَتْ بوارقُ الملكية، عُذِّبت أو نُعِّمت شيئًا فشيئًا.

والثاني: يَصُدُّ عنه تطابقُ الأسباب على مايُخالف حكمَه، حتى إذا جاء أجَلُه الذى قدَّره الله، ثَجَّ عند ذلك الجزاءُ ثجًّا، وهو قوله تبارك وتعالى: ﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ، إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾

ترجمہ: اور دونوں سببوں میں سے ہر ایک کیلئے مانع ہے، جو اس کو اس کے حکم سے ایک وقت تک روک دیتا ہے:

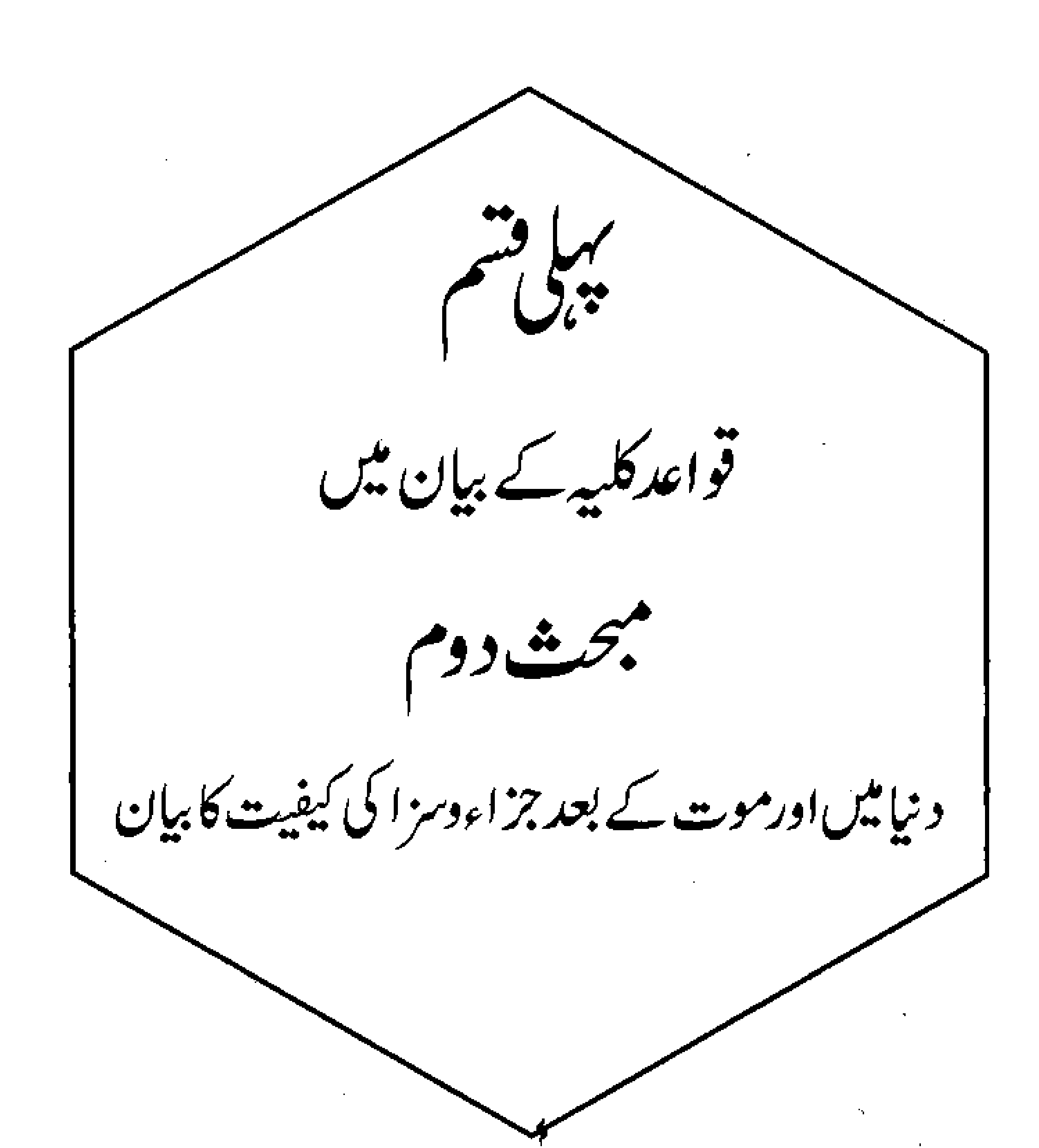
پس پہلا سبب: ملکیت کا کمزور ہونا اور بہیمیت کا قوی ہونا اسکو اسکے حکم سے روک دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ نفس ہوجاتا ہے گویا وہ صرف بہیمی نفس ہے، وہ ملکیت کی تکلیفوں سے تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ پھر جب نفس بہیمی چادر سے ہلکا ہوجاتا ہے اور اس کی کمک کم ہوجاتی ہے اور ملکیت کی بجلیاں کوندتی ہیں، تو آہستہ آہستہ وہ سزا دیا جاتا ہے یا راحت پہنچایا جاتا ہے۔

اور دوسرا سبب: اس کو روک دیتا ہے اسباب کا اتفاق کرنا اس بات پر جو اس دوسرے سبب کے حکم کے خلاف ہے، یہاں تک کہ جب اس کا وہ مقررہ وقت آجاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے تو اس وقت جزا موسلا دھار برسنے لگتی ہے اور یہی ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''ہر امت کے لئے ایک مقررہ وقت ہے، جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں''

لغات:

تَالَّمَ: دُکھی ہونا...... آلام، اَلَم کی جمع بمعنی تکلیف...... تَطَابَقَ القومُ: اتفاق کرلینا...... ثَجَّ الماءُ: بہنا مَطَرٌ ثَجَاجٌ: بہت برسنے والی بارش...... فالأول يصد عنه اصل میں يصده عنه تھا ضمیر کے ساتھ، تصحیح علامہ سندھیؒ نے کی ہے۔ اور تینوں مخطوطوں میں بھی اسی طرح ہے۔

اللہ کے فضل سے ۲۸ رصفر ۱۴۲۰ھ کو مبحث اول کی شرح تمام ہوئی


پہلی قسم
قواعد کلیہ کے بیان میں
مبحث دوم
دنیا میں اور موت کے بعد جزاء وسزا کی کیفیت کا بیان

مبحث دوم

دنیا میں اور موت کے بعد جزاء وسزا کی کیفیت کا بیان

مبحث دوم

دنیا میں اور موت کے بعد جزاؤ سزا کی کیفیت کا بیان

باب ـــــ ۱

دنیا میں جزائے اعمال کا بیان

(نقلی دلائل)

مبحث اول میں تکلیف شرعی اور جزائے اعمال کی بحث تفصیل سے گزر چکی ہے۔اب اس دوسرے مبحث میں، دنیوی زندگی میں اور مرنے کے بعد جزاؤ سزا کی کیفیت کا بیان ہے کہ یہ مجازات کس طرح ہوتی ہے؟ یعنی اسکی کیا صورتیں ہوتی ہیں؟

مجازات: دنیوی زندگی میں، اور مرنے کے بعد قبر میں، میدان حشر میں، آخرت کے راستہ میں پل صراط پر، اور بالآخر آخرت میں جنت وجہنم کی صورت میں ہوتی ہے۔اور یہ جزاؤ سزا تدریجا ہوتی ہے یعنی دنیا میں بس برائے نام، بطور نمونہ از خروارے، قبر میں اس سے سخت اور آگے اور سخت ہوتی جاتی ہے اور دنیا میں تمام اعمال کی جزاؤ سزا نہیں دی جاتی، بعض ہی اعمال کا بدلہ دیا جاتا ہے، مگر اس سلسلہ میں کوئی ضابطہ نہیں بتلایا گیا کہ کن اعمال پر دنیا میں مجازات ہوتی ہے۔مثال کے طور پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا بدلہ دنیا میں ضرور ملتا ہے، اسی طرح زنا پھیل جانے کی، ماں باپ کی نافرمانی کی، ناپ تول میں کمی کرنے کی اور سود کھانے کی سزا بھی دنیا میں ضرور ملتی ہے۔

اور دنیا میں اعمال صالحہ کی جو جزائے خیر ملتی ہے، وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے، عمل کا بدلہ نہیں ہوتا اور ضروری نہیں کہ وہ رحمت سب کو پہنچے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں یہ رحمت پہنچاتے ہیں۔سورۂ یوسف آیت (۵۶، ۵۷) میں ہے کہ: ''ہم جس پر چاہتے ہیں اپنی عنایت مبذول کرتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے، اور آخرت کا اجر کہیں بڑھ کر ہے، ایمان اور تقوی والوں کے لئے'' ﴿ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ ﴾ الآیتین۔

اور مؤمن کو جو دنیا میں اعمال سیئہ کی سزا ملتی ہے، وہ گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اور آگے معاملہ صاف ہو جاتا

ہے بلکہ جن لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے، ان کو دنیا میں طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کر کے گناہوں سے پاک صاف کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ حدیثوں میں یہ مضمون آیا ہے۔

اور کافر کو جو دنیا میں مجازات ہوتی ہے تو اس میں ابتلاء (امتحان) کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ سورۃ الاعراف آیات (۹۴و۹۵) میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر وہاں کے باشندوں کو ہم نے محتاجی اور بیماری میں پکڑا، تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جاویں، پھر ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی، یہاں تک کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے اسلاف کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھی! تو ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا درانحالیکہ ان کو خبر تک نہ تھی''

شاہ صاحب قدس سرہ سب سے پہلے وہ دلائل نقلیہ لکھتے ہیں جن سے دنیا میں مجازات ثابت ہوتی ہے، پھر اپنی بات کہیں گے، ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں سے درگزر فرما دیتے ہیں'' (سورۃ الشوریٰ آیت ۳۰) اس آیت میں دنیوی مجازات کا بیان ہے۔

(۲) اور ارشاد فرمایا: ''اور اگر یہ لوگ (اہل کتاب) توریت کی، اور انجیل کی، اور اس کتاب کی جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن کی) پوری پابندی کرتے تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے (یعنی ہر طرف سے) خوب فراغت سے کھاتے'' (سورۃ المائدہ آیت ۶۶) اس میں بھی دنیوی برکات کا ذکر ہے۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یمن کے شہر صنعاء کے قریب ایک باغ تھا، اس کا اصل مالک پیداوار سے اللہ کا حق دیا کرتا تھا، لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں نے بخل کی وجہ سے اللہ کا حق دینا بند کر دیا، تو اس باغ پر کوئی ناگہانی آفت نازل ہوئی اور وہ باغ بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ سورۃ القلم آیات (۱۷-۳۳) میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

''اور اللہ تعالیٰ نے ایک باغ والوں کی آزمائش کی، جبکہ انہوں نے قسم کھائی کہ وہ ضرور اس کا پھل صبح چل کر توڑ لیں گے، اور انھوں نے ان شاء اللہ بھی نہ کہا، سو اس باغ پر تیرے رب کی طرف سے ایک پھرنے والا عذاب پھر گیا، اور وہ سو رہے تھے پھر صبح کو وہ باغ ایسا رہ گیا، جیسے کٹا ہوا کھیت۔ پس صبح کے وقت وہ ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو، اگر تم کو پھل توڑنا ہے۔ پھر وہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے چلے کہ آج تم تک کوئی محتاج نہ آنے پائے، اور اپنے کو محتاج کے نہ دینے پر قادر سمجھ کر چلے، پھر جب اس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ بیشک ہم راستہ بھول گئے، بلکہ ہماری قسمت پھوٹ گئی۔ ان میں جو اچھا آدمی تھا، کہنے لگا کہ کیوں میں نے تم سے کہا نہ تھا! اب تسبیح کیوں نہیں کرتے!! سب کہنے لگے کہ ہمارا رب پاک ہے، بیشک ہم قصوروار ہیں، پھر ایک دوسرے کو مخاطب بنا کر، باہم الزام دینے لگے، بیشک ہم حد سے نکلنے والے تھے! شاید ہمارا پروردگار ہم کو اس سے اچھا باغ اس کے بدلے میں دیدے۔ ہم اپنے رب کی

طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس طرح (دنیا کا) عذاب ہوا کرتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی سخت ہے، کاش وہ لوگ جانتے!''

(۴) ترمذی شریف (۲:۱۲۴) میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد باری تعالیٰ: وَإِنْ تُبْدُوْا إلخ (اور اگر ظاہر کرو تم ان باتوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں یا پوشیدہ رکھو، اللہ تعالیٰ تم سے ان کے بارے میں حساب لیں گے) اور ارشاد باری تعالیٰ: من يعمل إلخ (جو شخص کوئی برا کام کرے گا، وہ اس کے بدلے میں سزا دیا جائے گا) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

''یہ (محاسبہ اور جزاء) اللہ تعالیٰ کا بندے پر عتاب ہے، بخار اور رنج سے جو اس کو پہنچتے ہیں، یہاں تک کہ پونجی، جس کو وہ کرتے کے جیب میں رکھتا ہے، پس وہ گم ہو جاتی ہے تو وہ اس کی وجہ سے غمگین ہوتا ہے، (تو اس سے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں) یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے نکل جاتا ہے، جس طرح سرخ سونا بھٹی سے (صاف ہو کر) نکلتا ہے'' (مشکوۃ کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض، حدیث نمبر ۱۵۵۷)

مذکورہ آیات واحادیث اس باب میں صریح ہیں کہ مجازات اس دنیا میں بھی ہوتی ہے۔

المبحث الثاني

مبحثُ كيفية المجازاة في الحياة وبعد الممات

باب الجزاء على الأعمال في الدنيا

قال الله تعالى: ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِن مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ ،وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيرٍ﴾ وقال: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوْا التَّوْرَاةَ وَالإِنْجِيْلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ، لَأَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ﴾ وقال الله تعالى في قصة أصحاب الجنة، حين منعوا الصدقة ماقال. وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم في قوله تعالى: ﴿وَإِنْ تُبْدُوْا مَافِيْ أَنْفُسِكُمْ، أَوْتُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ وقوله تعالى: ﴿مَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا يُجْزَ بِهِ﴾: "هذه معاتبَةُ اللهِ العبدَ بما يصيبُه من الحمّٰى والنَّكْبة، حتى البِضاعةِ يَضَعُهَا في يد قميصه، فَيَفْقِدُها، فيفْزَع لها، حتى إن العبدَ ليَخْرُج من ذنوبه، كما يخرج التِبر الأحمر من الكِيْر"

ترجمہ: مبحث دوم: دنیا میں اور مرنے کے بعد مجازات کی کیفیت کی بحث: دنیا میں اعمال پر جزاء کا بیان: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سی باتوں سے درگذر فرماتے ہیں'' اور ارشاد فرمایا: ''اور اگر وہ (اہل کتاب) تورات وانجیل اور اس قرآن پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے

جوان کی طرف نازل کیا گیا ہے، تو ضرور کھاتے وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے'' اور اللہ تعالیٰ نے باغ والوں کے واقعہ میں ارشاد فرمایا، جب انھوں نے خیرات روک دی، وہ جو ارشاد فرمایا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد باری ﴿وَإِنْ تُبْدُوْا﴾ الخ (البقرہ ۲۸۴) اور ارشاد باری ﴿من یعمل﴾ الخ (النساء ۱۲۳) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ: ''یہ اللہ تعالیٰ کا سرزنش فرمانا ہے بندے کی اس چیز کے ذریعہ جو اس کو پہنچتی ہے بخار اور مصیبت میں سے، یہاں تک کہ پونجی، جسے رکھتا ہے بندہ اپنی قمیص کے ہاتھ میں (پہلے جیب آستین میں بنتی تھی) پس اس پونجی کو گم کرتا ہے، پس اس کی وجہ سے گھبرا جاتا ہے (تو اس سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں) یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے نکل جاتا ہے، جیسا سرخ سونا، سنار کی بھٹی سے (صاف ہوکر) نکلتا ہے۔

نوٹ: کتاب میں معاقبة تھا۔ اصل مطبوعہ صدیقی، ترمذی شریف، اور مشکوۃ شریف سے تصحیح کی گئی ہے۔ مخطوطہ کراچی میں بھی اسی طرح ہے۔

☆ ☆ ☆

دنیا میں جزائے اعمال کا بیان

(عقلی دلیل)

دنیا میں جزائے اعمال کی عقلی وجہ سمجھنے کے لئے پہلے تین باتیں سمجھ لیں:

پہلی بات: انسان میں اللہ تعالیٰ نے ملکیت اور بہیمیت کی دونوں قوتیں یکساں پیدا کی ہیں ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (پھر اللہ تعالیٰ نے نفس کو اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری الہام کی) مگر خارجی اثرات کی وجہ سے ایک دوسری پر غالب آتی ہے۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے عام طور پر ملکیت بہیمیت کے اثرات میں دبی رہتی ہے، کیونکہ بہیمیت کو کھانے وغیرہ سے مدد پہنچتی رہتی ہے مگر ملکیت کا بھی موقعہ آتا ہے۔ ایک دن وہ بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا دو صورتوں میں ہوتا ہے۔

(۱) جب آدمی طبعی موت مرجاتا ہے تو بہیمیت کو غذا وغیرہ سے جو کمک پہنچتی رہتی ہے وہ بند ہوجاتی ہے۔ اور پہلے سے موجود مادہ تحلیل ہوتا رہتا ہے اور اس کو بدل ما یتحلل میسر نہیں آتا۔ نیز اب بھوک، شکم سیری اور غصہ وغیرہ عوارض، نفس کو اکساتے بھی نہیں، تو اس وقت ملکیت پر عالم بالا سے ایک رنگ مترشح ہوتا ہے۔ اور جب ملکیت کو کمک پہنچنی شروع ہوجاتی ہے تو وہ قوی ہوجاتی ہے۔

(۲) جب آدمی ریاضتوں کے ذریعہ اور عالم بالا کی طرف مسلسل توجہ رکھنے کے ذریعہ نفس کشی کرلیتا ہے، جیسا کہ صوفیاء فرماتے ہیں: مُوتوا قبلَ أن تموتوا (موت سے پہلے نفس کشی کرلو) جب آدمی یہ مرتبہ حاصل کرلیتا ہے تو نفس

پر ملکوت سے بجلیاں کوندنی شروع ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے ملکیت قوی ہو جاتی ہے۔

دوسری بات: ملکیت اور بہیمیت میں سے ہر قوت کو ان اعمال وکیفیاتِ نفسانیہ سے انشراح وانبساط حاصل ہوتا ہے جو اس کے مناسب حال ہیں، اور ہر قوت منقبض ہوتی ہے اور سکڑتی ہے ان اعمال وکیفیات کی وجہ سے جو اسکے مناسب حال نہیں ہوتے۔ چنانچہ بھلے آدمی کو نیکیوں سے خوشی اور برائیوں سے شدید الجھن ہوتی ہے اور برے آدمی کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے۔

تیسری بات: ہر تکلیف اور ہر لذت کا ایک پیکر محسوس ہے، جیسے جسم میں کہیں تکلیف دہ خِلط جمع ہو جاتی ہے تو چبھن ہونے لگتی ہے، جسم میں صفراء کی گرمی بڑھ جاتی ہے تو دل میں بے چینی اور تنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور خواب میں آگ اور شعلے نظر آتے ہیں اور بلغم کی زیادتی ہو جاتی ہے تو سردی لگتی ہے اور خواب میں پانی اور برف نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہر تکلیف کا اور ہر لذت کا ایک پیکر محسوس ہے۔

اب عقلی وجہ سمجھئے: جب ملکیت کو سر ابھارنے کا موقعہ ملتا ہے تو بیداری میں یا نیند میں انسیت اور سرور کی شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس نے نظافت، طہارت، خشوع اور اخبات کی صفتیں پیدا کی ہیں تو یہ صفات مہر ومحبت کی صورتوں میں نمودار ہوتی ہیں اور یہی ان اعمالِ صالحہ کی جزاء ہے۔ اور اگر مذکورہ صفات کی اضداد اپنے اندر پیدا کی ہیں تو وہ غیر معتدل کیفیات کی صورتوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں نیند یا بیداری میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو توہین آمیز اور دھمکی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ غصہ کاٹنے والے درندے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور بخل ڈسنے والے سانپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اعلم:

[۱] أن للملكية بُروزًا بعد كُمونها فى البهيمية، وانفكاكًا بعد اشتباكها بها.

فتارة بالموت الطبيعى، فإنه حينئذ لايأتى مددُها من الغذاء، وتتحلَّل موادُّها لاإلى بدل، ولا تُهَيِّجُ النفسَ أحوالٌ طارئةٌ: كجوع وشَبَع وغضب، فيترشح لونُ عالم القدس عليها.

وتارة بالموت الاختيارى: فلايزال يكسِر بهيميتَه برياضة، واستدامةِ توجهٍ إلى عالم القدس، فيَبْرَق عليه بعضُ بوارق الملكية.

[۲] وأن لكل شيئ انشراحا وانبساطا بما يلائمه من الأعمال والهيئات، والقِباضًا وتقلُّصا بما يخالفه منها.

[۳] وأن لكل ألم ولذةٍ شَبَحًا يَتَشَبَّح به؛ فَشَبَحُ الخِلْطِ اللَّذّاعِ النَخْسُ؛ وشَبَحُ التأذِّى من حرارة الصفراء الكَرَبُ والضَّجَر، وأن يرى فى مناه، النيران والشُّعَلَ؛ وشبح التأذى من البلغم مقاساةُ البرد، وأن يرى فى المنام المياهَ والثلج.

فإذا برزت الملكية ظهر فى اليقظة أو المنام أشباحُ الأنس والسرور، إن كان اكتسبَ

النظافة، والخشوع، وسائر ما يناسب الملكية؛ ويتشبح أضدادُها في صورة كيفيات مضادّة للاعتدال؛ وواقعاتٌ تشتمل على إهانة وتهديد، ويظهر الغضب في صورة سَبُعٍ يَنْهَشُ، والبخلُ في صورة حية تلدغ.

ترجمہ: جان لیں:

(۱) کہ ملکیت کے لئے بہیمیت میں چھپنے کے بعد نمودار ہونا ہے، اور بہیمیت کے ساتھ اسکے گتھنے کے بعد جدا ہونا ہے:
پس کبھی فطری موت سے ہوتا ہے، پس بیشک شان یہ ہے کہ اس وقت نہیں آتی بہیمیت کی کمک غذا سے، اور تحلیل ہو جاتا ہے اس کا (سابق) مواد، بدل ما یتحلل کے بغیر، اور نہیں اُکساتے نفس کو پیش آنے والے حالات، جیسے بھوک، شکم سیری اور غصہ، پس عالم پاک (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف) سے ایک رنگ اس پر ٹپکتا ہے۔
اور کبھی اختیاری موت سے ہوتا ہے، پس آدمی برابر اپنی بہیمیت کو توڑتا رہتا ہے ریاضت اور عالم پاک کی طرف مسلسل متوجہ رہنے کے ذریعہ، پس اس پر ملکیت کی کچھ بجلیاں چمکتی ہیں۔

(۲) اور یہ کہ (ملکیت وبہیمیت میں سے) ہر چیز کو انشراح اور انبساط ہوتا ہے اُن اعمال وملکات کی وجہ سے جو اس قوت کے مناسب ہیں اور انقباض اور سکڑنا ہے اُن اعمال وملکات کی وجہ سے جو اس قوت کے برخلاف ہیں۔

(۳) اور یہ کہ ہر تکلیف اور ہر لذت کا ایک پیکر محسوس ہے، جس کے ساتھ وہ تکلیف یا لذت متشکل ہوتی ہے۔ پس نہایت تکلیف دہ خلط کا پیکر محسوس چبھن ہے، اور صفراء کی گرمی سے تکلیف اٹھانے کا پیکر بے چینی اور تنگ دلی ہے اور یہ بات ہے کہ وہ خواب میں آگ اور شعلے دیکھے۔ اور بلغم کی تکلیف اٹھانے کا پیکر، سردی کی تکلیف برداشت کرنا ہے اور یہ بات ہے کہ وہ خواب میں پانی اور برف دیکھے۔

پس جب ملکیت نمودار ہوتی ہے تو بیداری میں یا خواب میں انسیت اور خوشی کی شکلیں ظاہر ہوتی ہیں، اگر اس نے نظافت، خشوع اور دیگر وہ صفات جو ملکیت کے مناسب ہیں حاصل کی ہیں۔ اور اُن صفات کی اضداد متشکل ہوتی ہیں اعتدال کے برخلاف کیفیات کی شکلوں میں اور ایسے واقعات نمودار ہوتے ہیں جو اہانت اور دھمکی پر مشتمل ہوتے ہیں اور غصہ ظاہر ہوتا ہے ایسے درندے کی شکل میں جو کاٹ رہا ہو، اور بخل ظاہر ہوتا ہے ایسے سانپ کی شکل میں، جو ڈس رہا ہو۔

لغات وترکیب:

بَرَزَ بُرُوْزًا: میدان کی طرف نکلنا...... کَمَنَ (ن س) کُمُوْنًا: چھپنا...... اِشْتَبَكَ: مختلط ہونا، بعض کا بعض میں داخل ہونا...... هَيَّجَه: برانگیختہ کرنا، بھڑکانا، اکسانا...... تَقَلَّصَ: سکڑنا...... نَخَسَ الدابة: جانور کے پہلو یا پچھلے حصہ پر لکڑی وغیرہ چبھو کر اکسانا...... اللَّذَّاع (اسم مبالغہ) بہت تکلیف دہ لَذَعَ فلانا بلسانه: زبان سے تکلیف پہنچانا......

ضَجِرَ (س) ضَجَرًا : تنگ دل ہونا، زِچ ہونا...... نَهَسَ (ف س) نَهْسًا اللحمَ گوشت کو اگلے دانتوں سے نوچنا...... أخلاطُ الجسد: خون، بلغم، سودا، صفراء...... واقعاتٌ کا عطف أشباح پر ہے...... يَنْهَسُ کتاب میں ينهر تھا، مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ کراچی سے تصحیح کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆



خارجی جزاؤسزا کا ضابطہ

اعمال کی جزاؤسزا ایک تو اندرونی ہوتی ہے، جیسے نیک اعمال کی وجہ سے دل میں خوشی کا پیدا ہونا اور برے اعمال کی وجہ سے دل میں ندامت وحسرت کا پیدا ہونا، اس مجازات کا نظام عالم سے کوئی تعارض نہیں ہوتا، اس لئے یہ جزاؤسزا تو بہر حال ہوتی ہے، اس میں نظام عالم کے تقاضوں کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

دوسری بیرونی مجازات ہے، جیسے نیک اعمال کی وجہ سے جان ومال میں برکت ہونا، عزت وراحت ملنا وغیرہ اور برے اعمال کی وجہ سے خوف اور فاقہ پیش آنا، جان ومال اور ثمرات کا گھٹ جانا وغیرہ۔ اس مجازات کا کبھی نظام عالم کے تقاضوں سے تعارض ہوتا ہے اس لئے یہ بیرونی مجازات نظام عالم کے اسباب کی رعایت کے ساتھ ہوتی ہے تاکہ نظام عالم میں خلل نہ پڑے۔

پس جو شخص نظام عالم کے اسباب کا احاطہ کرلے اور اس نظام کو پیش نظر رکھے جو اسباب سے رونما (پیدا) ہوتا ہے[1] تو وہ یہ بات قطعی طور پر جان لے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی گنہ گار کو دنیا میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتے، مگر یہ سزا نظام عالم کی مصلحتوں کی رعایت کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کی چار صورتیں ہوتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

① جب نظام عالم کے اسباب پُر سکون ہوں یعنی ان کا کوئی تقاضا نہ ہو، تو آدمی کے اپنے اعمال کام کرتے ہیں یعنی ان کے مطابق جزاؤسزا ہوتی ہے۔

② نظام عالم کے اسباب چاہتے ہیں کہ:

(۱) زید کو تکلیف پہنچے، اور وہ نیک آدمی ہوتا ہے، اور اس کی نیکی کے مقابل نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لینا نامناسب نہیں ہوتا یعنی اس میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ تو نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لیا جاتا ہے اور زید کے نیک اعمال کو کام کرنے دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کے اعمال صالحہ آنے والی بلاؤں کو ختم کرتے ہیں یا ان کو ہلکا کردیتے ہیں۔

(۲) نظام عالم کے اسباب چاہتے ہیں کہ زید کو راحتیں پہنچیں، اور وہ بدکار ہوتا ہے، اور اس کی بدکاری کے مقابل

---

[1] یہ بات تفصیل سے سمجھنا تو ممکن نہیں، رموز کائنات، خالق کائنات ہی جانتے ہیں، مگر ایک مؤمن بالاجمال اس بات کا ادراک کرسکتا ہے ۱۲

نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لینا نامناسب نہیں ہوتا تو نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لیا جاتا ہے، اور زید کے برے اعمال کو کام کرنے دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کی بدکاریاں نعمتوں کو روک دیتی ہیں یا کم کر دیتی ہیں۔ اور ان دونوں صورتوں میں گو بظاہر اعمال کا نظام عالم کے اسباب سے تعارض ہوتا ہے مگر حقیقی تعارض نہیں ہوتا اس لئے کہ نظام عالم کے اسباب کو سکیڑ لینا نامناسب نہیں ہوتا۔

(۳) اسباب کا تقاضا ہوتا ہے کہ زید کو تکلیف یا راحت پہنچے اور زید نیک یا بد ہوتا ہے یعنی نظام عالم کے اسباب کا تقاضا بھی وہی ہوتا ہے جو آدمی کے اپنے اعمال کا تقاضا ہوتا ہے تو شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے یعنی جزا و سزا تیز تر ہو جاتی ہے، اس کو خوب راحتیں میسر آتی ہیں یا سخت سزا ملتی ہے نتیجۂ نیک آدمی اچھے کام اور زیادہ کرنے لگتا ہے اور برا آدمی برائیوں میں اور بڑھ جاتا ہے۔

③ نظام عالم کے اسباب قوی ہوں اور ان کے تقاضوں کا پایا جانا زیادہ ضروری ہو، اور آدمی کے اپنے اعمال کے حکم کا پایا جانا اتنا ضروری نہ ہو، تو نظام عالم کے اسباب کی رعایت کی جاتی ہے اور آدمی کے اعمال کے تقاضوں کو روک دیا جاتا ہے۔ اور بدکار کو ڈھیل دیدی جاتی ہے اور نیکوکار کو بظاہر تنگی پیش آتی ہے اور اس کی یہ تنگی اس کے نفس کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کو یہ حقیقت سمجھا دی جاتی ہے، جیسے مریض کڑوی دوا رغبت سے پیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس میں اس کی شفاء ہے، اسی طرح نیک آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میری پریشانیاں میری ترقی کا سبب ہیں اور میری نیکیوں کا صلہ محفوظ ہے۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ مؤمن کا حال تر و تازہ کھیتی جیسا ہے، ہوا کے ذرا سے جھونکے بھی اس کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں، اسی طرح مؤمن پر پوری زندگی احوال آتے رہتے ہیں اور وہ کفارۂ سیئات اور رفع درجات کا سبب بنتے ہیں، جیسا کہ دوسری متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ مؤمن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے اس سے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

④ بعض علاقوں پر شیطان کی اطاعت غالب آجاتی ہے، جیسے تمام کافر ممالک، بالخصوص یورپ اور امریکہ، اور وہاں کے باشندے سراپا بہیمیت بن جاتے ہیں، تو ایک مدت تک بطور ابتلا ان لوگوں کی سزا روک دی جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف آیات (۹۴-۹۶) میں اس کا تذکرہ ہے کہ نبی کی بعثت کے بعد لوگوں کو سختیوں سے دوچار کیا جاتا ہے تا کہ وہ ڈھیلے پڑیں، اگر وہ ڈھیلے نہیں پڑتے تو ان کو برکتوں سے نوازا جاتا ہے کہ شاید شکرگزار ہوں، اور جب اس کا بھی کوئی ثمرہ سامنے نہیں آتا تو دفعۃً ان کو پکڑ لیا جاتا ہے اور یہ برکتیں آزمائش کے لئے ہوتی ہیں، حقیقی نعمتیں اور برکتیں وہ ہیں جو ایمان اور اعمال صالحہ کے صلہ میں ملتی ہیں، مگر جب لوگ تکذیب پر تلے رہتے ہیں تو پاداش عمل کا قانون روبعمل آتا ہے اس کی مثال لوط علیہ السلام کی بستیاں ہیں کہ عرصہ تک وہ خوش حال رہیں مگر بالآخر وہ تباہ کر دی گئیں۔

اس آخری صورت کی مثال ایسی ہے کہ ایک آقا کے غلام شرارت پر اترے ہوئے ہیں، مگر کسی وجہ سے آقا کو سزا دینے کی فرصت نہیں، اس وجہ سے گدھے اصطبل میں لاتیں چلا رہے ہیں، مگر جونہی آقا فارغ ہوتا ہے تو ایسی سزا دیتا ہے کہ

سب کھایا پیا نکل جاتا ہے اسی طرح جب قیامت کا دن آئے گا تو ان لوگوں کو سزا ملے گی، گویا اب اللہ تعالیٰ کو سزا دینے کی فرصت ملی۔سورۃ الرحمٰن آیت ۳۱ میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہوجاتے ہیں'' یعنی حساب وکتاب لینے والے ہیں۔اوراس کو مجازاً فارغ ہونا فرمایا ہے۔اس آیت میں کسی مصلحت سے ایک وقت تک جزاء کے مؤخر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

والضابطة في المجازاة الخارجية: أنها تكون في تضاعيفِ أسبابٍ؛ فمن أحاط بتلك الأسباب، وتمثَّل عنده النظامُ المنبعثُ منها، عَلِمَ قطعاً أن الحق لايَدَعُ عاصياً إلا يُجازيه في الدنيا، مع رعاية ذلك النظام:

فيكون إذا هَدَأَتِ الأسبابُ عن تنعيمه وتعذيبه، نُعِّمَ بسبب الأعمال الصالحة، أو عُذِّب بسبب الأعمال الفاجرة.

ويكون إذا أَجْمعتِ الأسباب على إيلامه، وكان صالحاً، وكان قَبْضُهَا لمعارضةِ صلاحِهِ غَيْرَ قَبيحٍ صُرِفَتْ أعمالُه إلى رفع البلاء أو تخفيفه؛ أو على إنعامه، وكان فاسقا، صُرفت إلى إزالة نعمتِه، وكان كالمُعَارِض لأسبابها؛ أو أَجْمعت على مناسبة أعماله أُمِدَّ في ذلك إمدادًا بيِّنًا.

وربما كان حكمُ النظام أَوْجَبَ من حكم الأعمال، فَيُسْتدرج بالفاجر، ويُضَيَّق على الصالح في الظاهر، ويُصرف التضييقُ إلى كسر بهيميته، ويُفَهَّمُ ذلك فيرضى، كالذي يشرب الدواء الْمُرَّ راغبا فيه؛ وهذا معنى قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿مَثَلُ المؤمن كمثل الخَامَةِ من الزرع، تُفَيِّئُهَا الرياحُ: تصرعها مرة، وتعدِلُها أخرى،حتى يأتيه أجلُه، ومَثَلُ المنافق كمثل الْأَرْزَةِ الْمُجْذِيَةِ، التي لايُصيبها شيئ، حتى يكونَ انْجِعَافُها مرة واحدة﴾ وقولِه صلى الله عليه وسلم: ﴿مامن مسلمٍ يصيبه أذى من مرض فما سواه، إلا حَطَّ الله به سيئاتِه، كما تَحُطُّ الشجرةُ ورقَهَا﴾

وَرُبَّ إقليم غلبت عليه طاعةُ الشيطان، وصار أهلُه كمثل النفوس البهيمية، فَتَقَلَّصَ عنه بعضُ المجازاة إلى أجل؛ وذلك قوله تعالى: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ؛ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ، حَتّٰى عَفَوْا وَقَالُوْا قَدْ مَسَّ آبَاءَ نَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَايَشْعُرُوْنَ؛ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرٰى آمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ، وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

وبالجملة: فالأمر ههنا يُشْبِهُ بحالِ سيِّدٍ لايَتفرَّغ للجزاء، فإذا كان يومُ القيامة صار كأنه تفرَّغ؛ وإليه الإشارة في قوله تعالى: ﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَا الثَّقَلَانِ﴾

ترجمہ: اور بیرونی مجازات کے سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ وہ مجازات نظام عالم کے اسباب کے ضمن میں ہوتی ہے، پس جو شخص ان اسباب کا احاطہ کرلے اور اس کی نگاہوں کے سامنے وہ نظام موجود ہو جو ان اسباب سے اٹھتا ہے تو وہ بالیقین جان لے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی گنہ گار کو دنیا میں سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتے، نظام عالم کی رعایت کے ساتھ۔

پس (کبھی) ہوتا ہے: جب نظام عالم کے اسباب آدمی کی تنعیم وتعذیب سے تھم جاتے ہیں: تو وہ اعمال صالحہ کی وجہ سے راحتیں پہنچایا جاتا ہے یا اعمال سیئہ کی وجہ سے تکلیف پہنچایا جاتا ہے۔

اور (کبھی) ہوتا ہے جب نظام عالم کے اسباب اس کو تکلیف پہنچانے پر مجتمع ہوجاتے ہیں، اور وہ نیک آدمی ہوتا ہے، اور اس کی نیکی کے مقابلہ میں نظام عالم کے اسباب کو سکیڑنا غیر قبیح ہوتا ہے (یعنی ان کو سکیڑا جاسکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا) تو اس کے اعمال کو بلاؤں کے ختم کرنے کی طرف یا ان کو ہلکا کرنے کی طرف پھیر دیا جاتا ہے —— یا اسباب مجتمع ہوتے ہیں اس کی راحت رسانی پر، اور وہ بدکار رہتا ہے، تو اس کے اعمال اس کی نعمتوں کو ختم کرنے کی طرف پھیر دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ بدکاری نظام عالم کے اسباب کے معارض جیسی ہوجاتی ہے —— یا اسباب اکٹھا ہوتے ہیں اس کے اعمال کے حسب حال، تو ان اعمال میں مدد پہنچائی جاتی ہے واضح طور پر مدد پہنچانا۔

اور کبھی نظام عالم کے اسباب کا حکم آدمی کے اعمال کے حکم سے زیادہ مؤکد ہوتا ہے، تو بدکار کو ڈھیل دی جاتی ہے، اور نیکوکار پر بظاہر تنگی کی جاتی ہے اور اس تنگی کو اس کی بہیمیت کے توڑنے کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ اور وہ شخص سمجھا دیا جاتا ہے (یا سمجھ جاتا ہے) پس وہ راضی ہوتا ہے، اس شخص کی طرح جو کڑوی دواء پیتا ہے، اس میں رغبت کرتے ہوئے۔ اور یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا کہ:

''مؤمن کا حال ترو تازہ کھیتی جیسا ہے، جس کو ہوائیں ہلاتی ہیں، کبھی اس کو پچھاڑتی ہیں اور کبھی اس کو سیدھا کھڑا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ مؤمن کی موت آجاتی ہے (یعنی چھوٹے بڑے حادثات اس پر آتے ہی رہتے ہیں جو کفارۂ سیئات بنتے رہتے ہیں)

اور منافق کا حال سیدھے کھڑے ہوئے درخت صنوبر جیسا ہے، جس کو کوئی چیز نہیں پہنچتی (یعنی وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا) یہاں تک کہ اس کا یکبارگی اکھڑنا ہوتا ہے (یعنی منافق پر حالات بہت ہی کم آتے ہیں اور وہ کفارۂ سیئات بھی نہیں بنتے) (مشکوۃ کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض حدیث نمبر ۱۵۴۱)

اور یہی معنی اس ارشاد نبوی کے ہیں کہ:

''جس کسی مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہے بیماری کی یا اس کے علاوہ تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی برائیوں کو جھاڑتے ہیں، جیسا درخت (پت جھڑ کے موسم میں) پتے جھاڑتا ہے (مشکوۃ حدیث نمبر ۱۵۳۸ کتاب الجنائز)

اور بعض علاقوں پر شیطان کی فرمانبرداری غالب آجاتی ہے، اور وہاں کے باشندے سراپا بہیمی نفوس جیسے ہوجاتے

ہیں، تو اس خطہ سے کچھ مجازات ایک مقررہ وقت تک سکڑ جاتی ہے، اور اسی کا تذکرہ اس ارشاد باری میں ہے:

''اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی مگر پکڑا ہم نے اس کے باشندوں کو محتاجی اور بیماری میں، تاکہ وہ گڑگڑائیں، پھر ہم نے اس بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا، یہاں تک کہ خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ: ہمارے آباؤ اجداد کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھی (پس یہ کوئی قابل فکر بات نہیں) تو ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا اور ان کو خبر بھی نہ تھی اور اگر اُن بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتیں کھول دیتے، لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال بد کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا'' (سورۃ الاعراف ۹۴-۹۶)

خلاصہ: پس معاملہ یہاں اس آقا کے مشابہ ہے جو سزا دینے کے لئے فارغ نہ ہو، پس جب قیامت کا دن ہوگا تو صورت حال یہ ہوگی کہ گویا اللہ تعالیٰ فارغ ہو گئے، اور اس کی طرف اشارہ ہے اِس ارشاد باری تعالیٰ میں کہ: ''اب ہم تمہارے لئے فارغ ہوتے ہیں، اے جن وانس!

لغات:

الضابط والضابطة: وہ قاعدہ کلیہ جو اپنی ساری جزئیات پر منطبق ہو...... تضاعیفُ الشیئ: ما ضُعِّف منه (دو چند کیا ہوا) یعنی انسان کے اعمال کو بھی اسباب نظام عالم میں شامل کر لیا جاتا ہے اور ان کو دو چند کر کے پھر سب کی رعایت کر کے مجازات ہوتی ہے...... اَحَاطَ کے صلہ میں جب باء آتی ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اچھی طرح سمجھ لینا، قرآن کریم میں ہے ﴿وَلَمْ يُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا﴾ (یونس ۳۹) (اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے)...... هَدَأَ (ف) هَدْءً اً وهُدُوْءً: پرسکون ہونا...... أَوْجَبُ (اسم تفضیل) بمعنی آکَدُ...... استدرجه إلى كذا: آہستہ آہستہ قریب کرنا...... يُفَهِّم تفهيمًا: سمجھانا اس کو يَفْهَم مجرد سے بھی پڑھ سکتے ہیں یعنی وہ سمجھ جاتا ہے...... الخَامَة: تروتازہ گھاس، جمع خَامٌ وخَامَاتٌ...... فَيْأَتِ الرياحُ الغصونَ: ہوا کا ٹہنیوں کو ہلانا...... أُرْزَةٌ: درخت صنوبر...... المُجْذِيَة: اچھی طرح سے کھڑا ہوا جَذَا (ن) جَذْوًا الشجرة على الأرض: اچھی طرح کھڑا ہونا یعنی مضبوط کھڑا ہونا...... اِنْجَعَفَتِ الشجرة: جڑ سے اکھڑ جانا...... تَقَلَّصَ: سکڑ جانا۔

ترکیب:

فیکون أی فیکون تارة کذا...... نُعِّم إلخ جملہ جزائیہ ہے...... لمعارضة صلاحه میں لام اجلیہ ہے...... قوله: وكان كالمعارض يعني فكأنهما أي الصالح والفاسق لم يُجازا (سندی)...... إذا كان يومُ القيامة میں کان تامہ ہے اور جملہ صار إلخ جملہ جزائیہ ہے...... قوله: الضابطة في المجازاة الخارجية أي يُجازى الإنسان لامحالة على أعماله بالمجازاة الداخلية من الندامة والحسرة، والرؤيا، وانبساطِ قلبٍ وانقباضه كما

تقدم، بلا نظر إلى الأسباب الموافقة للنظام الكلي أو المخالفة له، وأما المجازاة الخارجية فمبنى على موافقة أسباب المجازاة لنظام العالم يعني يُجازى الإنسان على أعمالٍ حسنةٍ أو سيئةٍ في الدنيا لامحالة،لكن بحيث لا يتطرق الخلل في نظام العالم، لأن المجازاة لإقامة نظام العالم(سندی)

تصحیح: الضابطة اصل میں الضابط تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

مجازات کی پانچ صورتیں

دنیا میں مجازات کی پانچ شکلیں ہوتی ہیں:

(۱) روحانی مجازات، اس کو مجازات داخلیہ بھی کہتے ہیں ـــ یعنی اعمال صالحہ کی وجہ سے دل میں خوشی اور اطمینان کا پیدا ہونا، اور اعمال سیئہ کی وجہ سے دل میں انقباض اور گھبراہٹ کا پیدا ہونا۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۴ میں ہے کہ:''جو شخص میری نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا'' حضرت تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:''دنیا میں تنگی باعتبار قلب کے ہے کہ ہر وقت دنیا کی حرص میں، ترقی کی فکر میں، کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتا ہے، گو کوئی کافر بے فکر بھی ہو، لیکن اکثر کی حالت یہی ہے'' (فوائد ترجمہ) اور نیک ایماندار کا حال اس کے برعکس ہے۔

(۲) جسمانی مجازات ـــ جیسے نیک کام کرنے کی وجہ سے بیماری کا دور ہونا، صدقہ کی وجہ سے بیماریوں اور آفتوں کا ٹلنا اور برے کاموں سے بیمار پڑ جانا، غم کا چھا جانا اور خوف کا طاری ہونا وغیرہ۔ نبوت سے پہلے جب کعبہ کی تعمیر کی جارہی تھی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عم محترم حضرت عباس رضی اللہ عنہ پتھر اٹھا کر لارہے تھے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا کہ لنگی اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لیجئے (چنانچہ آپ نے ایسا کرنا چاہا) تو فوراً زمین پر گر پڑے اور آسمان کی طرف ٹکٹکی بندھ گئی، پھر آپ نے فرمایا کہ میری لنگی مجھے دیدو، پھر آپ نے اس کو باندھ لیا (بخاری شریف کتاب الحج باب فضل مکۃ، حدیث نمبر ۱۵۸۲) یہ واقعہ جسمانی مجازات کے قبیل سے ہے۔

(۳) متعلقات میں مجازات ـــ جیسے اعمال صالحہ کی وجہ سے جان و مال اور اہل و عیال میں برکت کا ہونا اور بداعمالیوں کی وجہ سے نقصانات کا ہونا۔

(۴) آفاقی مجازات ـــ یعنی نیک لوگوں سے ملأ سافل کا اور عام لوگوں کا اور زمینی مخلوقات کا محبت کرنا اور حسن سلوک کرنا اور برے لوگوں کے درپئے آزار ہونا۔

(۵) اعمال میں مجازات ـــ یعنی نیک کام کرنے کی وجہ سے مزید نیکیوں کی توفیق کا ملنا اور برے کاموں کی وجہ

سے توفیق کا سلب ہونا اور مزید برائیوں میں پھنستے چلے جانا حتی کہ دل پر مہر لگ جانا غرض خیر وشر سے نزدیک کیا جانا بھی مجازات ہے۔ اور اس مجازات کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ مزید نیک کاموں کا اس کو الہام کیا جاتا ہے یا شیاطین کے وسوسے بڑھ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آدمی کے احوال میں تبدیلی کر دی جاتی ہے یعنی ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ آدمی نیک کاموں میں ترقی کرتا ہے یا برائیوں میں پیر پسارتا ہے۔

فائدہ: جو شخص مذکورہ بالا مضامین کو اچھی طرح سمجھ لے، اور ہر بات کو اس کے موقعہ پر رکھے، تو وہ بہت سے اشکالات سے نجات پالے گا مثلاً:

(۱) ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی سے روزی بڑھتی ہے اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگوں کو آخرت میں اجر ملے گا اور دنیا میں بلائیں نیک لوگوں کو زیادہ پہنچتی ہیں۔

(۲) ایک حدیث کہتی ہے کہ بدی سے روزی گھٹتی ہے اور دوسری حدیث میں ہے کہ بدکاروں کو ان کی نیکیاں دنیا میں کھلا دی جاتی ہیں۔

تو اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ فی نفسہ نیکی سے روزی بڑھتی ہے اور بدی سے گھٹتی ہے لیکن نظام عالم کے اسباب کی وجہ سے نیک لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے اور ان کی مصلحت کے لئے ان کی نیکیوں کا اجر آخرت میں محفوظ کیا جاتا ہے اور کافروں کے لئے چونکہ آخرت میں کچھ نہیں اس لئے ان کی نیکیوں کا صلہ دنیا ہی میں دیدیا جاتا ہے، تاکہ آخرت میں ان کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہے۔ اور کبھی آزمائش کے لئے ان کی روزی گھٹا دی جاتی ہے۔ واللہ اعلم

ثم المجازاة:

تارة: تكون في نفس العبد بإفاضةِ البَسْط والطُّمأنِينَة، أو القبض والفزَع.

وتارة: في بدنه، بمنزلة الأمراض الطارئة: من هجوم غَمٍّ أو خوف؛ ومنه وقوعُ النبي صلى الله عليه وسلم مَغْشيا عليه قبل نبوته، حين كشف عورتَه.

وتارة: في ماله وأهله.

وربما: أُلهم الناسُ والملائكة والبهائم: أن يُحسنوا إليه أو يُسيئوا.

وربما: قُرِّبَ إلى خير أو شر، بالهامات أو إحالاتٍ.

ومن فهم ما ذكرناه ووضع كلَّ شيئ في موضعه، استراح من إشكالات كثيرة: كمعارضة الأحاديث الدالّة على أن البِرَّ سببُ زيادة الرزق، والفجورَ سببُ نقصانه؛ والأحاديثِ الدالّة على أن الفجار يُعَجَّل لهم الحسناتُ في الدنيا، وأن أكثر الناس بلاءً الأمثَلُ فالأمثل، ونحو ذلك، والله أعلم.

ترجمہ: پھر جزاؤ سزا:
کبھی: بندے کے دل میں ہوتی ہے، کشادگی اور اطمینان یا انقباض وگھبراہٹ کے فیضان کے ذریعہ۔
اور کبھی: بندے کے بدن میں ہوتی ہے، جیسے بے چینی یا خوف کے ہجوم سے پیش آنے والی بیماریاں، اور اسی قبیل سے ہے: نبی کریم ﷺ کا نبوت سے پہلے بے ہوش ہوکر گر پڑنا، جب آپ نے اپنا ستر کھولا۔
اور کبھی: بندے کے مال میں اور اہل وعیال میں ہوتی ہے۔
اور کبھی: لوگ، فرشتے اور چوپایے الہام کئے جاتے ہیں کہ وہ اس بندے سے اچھا سلوک کریں یا برا سلوک کریں۔
اور کبھی: بندہ نزدیک کیا جاتا ہے خیر سے یا شر سے، الہامات کے ذریعہ یا تغیرات کے ذریعہ۔
فائدہ: اور جو شخص وہ باتیں سمجھ لے جو ہم نے ذکر کیں، اور ہر چیز کو اس کی جگہ میں رکھے (یعنی ہر روایت کا صحیح مطلب سمجھے) تو وہ شخص بہت سے اشکالات سے آرام پالے گا۔ جیسے اُن روایات کا تعارض جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نیک اعمال رزق کی فراخی کا سبب ہیں، اور برے اعمال رزق کی تنگی کا سبب ہیں، اور وہ روایات جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گنہ گاروں کو ان کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں جلدی دیدیا جاتا ہے، اور جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سب سے زیادہ آزمائش بڑے لوگوں کی ہوتی ہے، پھر درجہ بدرجہ اور اس قسم کی دیگر روایات واللہ اعلم

لغات:

بَسط (ن) بَسْطًا الثوبَ: پھیلانا۔ بَسَطَ الرجلَ: دل بڑھانا۔ بَسَطَ الیدَ: ہاتھ کشادہ کرنا یہاں مراد دل کی کشادگی، بشاشت اور خوشی ہے .... **الطُّمَأْنِينة: الاطمینان** ...... **إحالة:** تبدیلی تغیر ...... **الأمثل** (اسم تفضیل): **الأفضل جمع أماثِلُ ومُثل مؤنث مُثلی** فعل مَثُلَ (ک) مَثَالَةً: افضل ہونا ...... **فالأمثل** میں ف ترتیب کے لئے ہے۔
تصحیح: ماذکرناہ اصل میں ماذکرنا بغیر ضمیر کے تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

باب ـــــ ۲

موت کی حقیقت کا بیان

گذشتہ باب میں دنیوی مجازات کا ذکر تھا، آئندہ باب میں برزخی مجازات کی تفصیلات آرہی ہیں درمیان میں موت کی حقیقت کا بیان ہے۔ کیونکہ موت ایک پل ہے، اس سے گزر کر ہی قبر کی زندگی تک پہنچا جاسکتا ہے، اس لئے پہلے موت کی حقیقت سمجھنا ضروری ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے:

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے کہ روح مرتی نہیں مرگ بدن سے

یعنی اشاعرہ کے امام، حضرت ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ نے یہ بات واضح کی ہے کہ مرتا بدن ہے، روح نہیں مرتی۔ روح سے مراد روح انسانی ہے جس کو نفس ناطقہ کہتے ہیں اور یہ انسانوں کی مخصوص روح ہے، دیگر حیوانات میں یہ روح نہیں ہوتی، ان میں صرف نسمہ ہوتا ہے جس کو روح ہوائی اور روح حیوانی کہتے ہیں، یہ نسمہ انسان میں بھی ہوتا ہے اور نفس ناطقہ یعنی روح کا تعلق بدن انسانی سے اسی نسمہ کے واسطہ سے ہوتا ہے جس کی تفصیل مبحث اول، باب پنجم میں گزر چکی ہے۔

موت کے وقت نسمہ کا بدن سے حقیقی تعلق ختم ہوجاتا ہے البتہ وہمی (خیالی) تعلق باقی رہتا ہے، اور روح ربانی کا نسمہ سے تعلق بحالہ قائم رہتا ہے، بلکہ روح ربانی کے فیضان سے اور عالم مثال کی امداد سے نسمہ پہلے سے زیادہ قوی ہوجاتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ماہر کاتب ہو، کسی وجہ سے اس کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں تو بھی کتابت کا ملکہ ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ بحالہ قائم رہتا ہے، اسی طرح کوئی شخص چلنے کا ڈھنی ہو، ہر وقت چلتا رہتا ہو، اگر اس کے دونوں پیر کٹ جائیں یا کوئی سمیع وبصیر ہو، پھر وہ بہرہ اندھا ہوجائے تو بھی اصل ملکہ اس میں بحالہ باقی رہے گا۔ اسی طرح روح ربانی کا تعلق بدن سے منقطع ہوجاتا ہے تو بھی نسمہ سے اس کا تحقیقی تعلق باقی رہتا ہے اور بدن سے وہمی تعلق برقرار رہتا ہے۔ اور یہ سمجھنا بالکل ہی خام خیالی ہے کہ موت کے وقت روح ربانی کا بدن سے بالکلیہ تعلق منقطع ہوجاتا ہے۔

اور اس وہمی تعلق کو ٹیلیفون کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے P.C.O. کا تعلق مقامی بستی کے ہر فون سے ہوتا ہے S.T.D. کا تعلق پورے ملک کے ہر فون سے ہوتا ہے اور I.S.D کا تعلق پوری دنیا کے فونوں سے ہوتا ہے، یہ تعلق وہمی ہے اور شہر کی مرکز مواصلات کی مشین سے تحقیقی تعلق ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے موت کی یہ حقیقت سمجھانے کے لئے لمبی تمہید قائم کی ہے، اس تمہید کو بھی سمجھنے کے لئے تمہید ضروری ہے اس لئے درج ذیل معلومات پہلے ذہن نشین کرلیں، پھر شاہ صاحب کی بات پیش کی جائے گی۔

عنصر کے معنی ہیں اصل، اور اصطلاح میں عنصر اس بسیط (غیر مرکب) اصل کو کہتے ہیں جس سے تمام مرکبات ترکیب پاتے ہیں۔ عناصر چار ہیں: آگ، پانی، ہوا، مٹی۔ ان کو ارکان اور اصول کون وفساد بھی کہتے ہیں۔

مرکب: وہ چیز ہے جو مختلف ماہیت رکھنے والے اجسام (عناصر اربعہ) سے بنی ہو۔ مرکب کی دو قسمیں ہیں: مرکب تام اور مرکب ناقص:

مرکب تام: چاروں عناصر یا ان میں سے بعض جب اس طرح پر جمع ہوجائیں کہ ہر ایک کی کیفیت دوسرے کی مخالفانہ کیفیت کی تیزی کو توڑ دے، اور ایک نئی اعتدالی کیفیت (مزاج) پیدا ہوجائے، اور ان بسائط کا ہیولی اپنی صور

نوعیہ کو چھوڑ کر مبدأ فیاض سے ایک نئی صورت ترکیبی کے فیضان کے قابل ہو جائے، اور وہ نئی صورت نوعیہ آ کر اس مرکب کی کافی عرصہ تک حفاظت کرے اور اس کو باقی رکھے تو وہ مرکب تام کہلاتا ہے ـــــ استقراء سے مرکب تام کی تعداد تین تک دریافت ہوئی ہے یعنی معدنیات، نباتات اور حیوانات مرکب تام میں اگر نمو اور حرکت ارادیہ نہ ہو تو وہ معدنیات ہیں۔ اور اگر نمو تو ہو مگر حرکت ارادیہ متحقق نہ ہو تو وہ نباتات ہیں۔ اور اگر نمو اور حرکت ارادیہ دونوں متحقق ہوں تو وہ حیوانات ہیں۔

مرکب ناقص: بسائط عنصریہ اگر اس طور سے جمع ہو جائیں کہ مرکب میں بھی بسائط کی صور نوعیہ بدستور باقی رہیں، جیسے گارا: مٹی اور پانی کا مرکب ہے، اور ترکیب کے بعد بھی مٹی اور پانی کی صورتیں باقی ہیں، نئی صورت نوعیہ جلوہ گر نہیں ہوئی، یا نئی صورت ترکیبی پیدا تو ہو مگر وہ مرکب کی کافی عرصہ تک حفاظت نہ کرے، بلکہ اس کا وجود وقتی اور عارضی ہو، جیسے شہاب (ٹوٹا ہوا تارہ): مادّہ کونیہ اور آگ کا مرکب ہے، اور ترکیب کے بعد نئی صورت کا فیضان بھی ہوا ہے، مگر وہ تھوڑی دیر کے لئے ہے، اسی طرح کہرا اور شبنم وغیرہ یہ سب مرکب غیر تام ہیں (معین الفلسفہ ص ۱۴۲)

دو عناصر کے مرکبات: بخار (بھاپ): پانی اور آگ سے مرکب ہے، غبار: مٹی اور ہوا سے مرکب ہے۔ دخان: (دھواں) آگ اور ہوا سے مرکب ہے۔ ثَرٰی (نمناک مٹی): پانی اور مٹی سے مرکب ہے۔ ارض مُثارۃ (جوتی ہوئی زمین): مٹی اور ہوا سے مرکب ہے۔ جوتنے سے زمین میں تخلخل ہوتا ہے اور ہوا اندر گھستی ہے تو زمین ابھر جاتی ہے۔ جَمرۃ (چنگاری): مٹی اور آگ سے مرکب ہے سُعفہ (آگ کی لپٹ): آگ اور ہوا سے مرکب ہے شعلہ: آگ اور ہوا سے مرکب ہے (سُعفہ اور شعلہ ایک ہی چیز ہیں)

تین عناصر کے مرکبات: طین مُخمّر (سڑا ہوا گارا): پانی، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے اور اس میں ہوا کے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس میں سے بدبو اٹھتی ہے۔ طَحلَب (کائی): پانی، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے۔

چار عناصر کے مرکبات: تمام نباتات اور حیوانات (بشمول انسان) ہیں۔

فلکیات، کائنات الجو اور موالید: زمین سے انتہائی بلندی پر جو اجسام پائے جاتے ہیں وہ علویات اور فلکیات کہلاتے ہیں، جیسے آسمان (افلاک) ستارے اور سیارے، اور جو چیزیں زمین و آسمان کے بیچ میں پیدا ہوتی ہیں وہ کائنات الجو (فضائی مخلوقات) کہلاتی ہیں، جیسے بادل، بارش، برف وغیرہ، ان میں مزاج متحقق نہیں ہوتا اس لئے یہ جلد ختم ہو جاتی ہیں اور ان کو مرکب غیر تام کہتے ہیں۔ اور جو چیزیں زمین میں پیدا ہوتی ہیں وہ موالید کہلاتی ہیں، ان میں مزاج متحقق ہوتا ہے، اس لئے وہ عرصہ تک قائم رہتی ہیں اور مرکب تام کہلاتی ہیں۔ موالید تین ہیں معدنیات، نباتات اور حیوانات۔ معدنیات مختلف طرح کی ہوتی ہیں بعض دو عناصر سے مرکب ہوتی ہیں، بعض تین سے اور بعض چاروں عناصر سے اور تمام نباتات اور حیوانات عناصر اربعہ کے مرکبات ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی تمہید ملاحظہ فرمائیں:

معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسان سب عناصر اربعہ سے بنی ہوئی مخلوقات ہیں۔ اس لئے سب کی صورت حال بہ ظاہر یکساں نظر آتی ہے، مگر حقیقت حال مختلف ہے، ہر ایک کی صورت نوعیہ کا فیضان الگ الگ مادوں پر ہوتا ہے، جس مادہ میں سونا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس پر سونے کی صورت نوعیہ سوار ہوتی ہے اور جس مادہ میں چاندی بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس پر چاندی کی صورت نوعیہ طاری ہوتی ہے یہی حال تمام معدنیات، نباتات اور حیوانات کا ہے، مادے میں جو صلاحیت پیدا ہوتی ہے وہی صورت فائض ہوتی ہے۔ ہر صورت کی سواری الگ الگ ہونے کا یہی مطلب ہے۔

اسی طرح ہر صورتِ نوعیہ کا یعنی ہر نوع کا کمال اوّلی الگ ہے، یعنی مبدأ فیاض سے ہر نوع کو جو کمال فطری طور پر ملتا ہے وہ الگ الگ ہوتا ہے، جیسے شہد کی مکھی کو الگ کمال ملتا ہے، گائے بھینس کو دوسرا کمال ملتا ہے، اونٹ کو الگ اور بیل کو جدا کمال ملتا ہے اور مخلوقات اکتساب یعنی اپنی محنت سے جو کمال حاصل کرتی ہیں وہ کمال ثانوی کہلاتا ہے، جیسے انسان لکھ پڑھ کر کمالات حاصل کرتا ہے یہ سب ثانوی کمالات ہیں اور انسان کو بحیثیت انسان جو صلاحیتیں ملی ہیں وہ اس کا کمال اولی ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عناصر جب مُہین اور باریک ہوتے ہیں، اور قلت وکثرت کے اعتبار سے مختلف طرح پر باہم ملتے ہیں تو دوعناصر والی مخلوقات، تین عناصر والی مخلوقات، اور چار عناصر والی مخلوقات وجود میں آتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی خصوصیت الگ ہوتی ہے اور وہ اس کے اجزاء کی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے، ان کے علاوہ کوئی نئی چیز ان میں نہیں ہوتی۔ اس کی مثال طبیبوں کا معجون ہے جو مفرد ادویہ سے مرکب ہوتا ہے۔ اور اس معجون میں جو خاصیت پیدا ہوتی ہے، وہ مفردات کے خواص کا مجموعہ ہی ہوتی ہے، ان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ پھر مفردات کی مقدار کی کمی بیشی سے بھی معجون کے خواص میں فرق پڑتا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان تمام مرکبات کو کائنات الجو کا نام دیا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض کائنات الجو ہیں اور بعض موالید یعنی زمینی مخلوقات ہیں۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ عناصر کے باہم ملنے کے بعد جب کسی دھات کا مثلاً سونے کا یا چاندی کا مزاج پیدا ہوتا ہے تو اس کی صورت معدنیہ آکر اس مزاج پر سوار ہوجاتی ہے اور سونا یا چاندی موجود ہوجاتے ہیں، اور اس مادے میں سونے کی، یا چاندی کی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں اور وہ صورت معدنیہ ایک عرصہ تک اس مزاج کی حفاظت کرتی ہے اس لئے وہ سونا یا چاندی ہی رہتا ہے، کسی دوسری دھات وغیرہ میں بدل نہیں جاتا۔

اسی طرح جب کسی نبات کا مثلاً آم کا یا امرود کا مزاج پیدا ہوتا ہے تو اس نوع کی صورت نامیہ آکر اس جسم کو جو محفوظ المزاج ہے سواری بنالیتی ہے۔ اور وہ صورت نوعیہ ایک ایسی طاقت بن جاتی ہے جو عناصر اور فضاء کے اجزاء کو اپنے ہم

مزاج بدلتی رہتی ہے، تاکہ اس نبات کے لئے جو کمال متوقع ہے اس کو وہ بالفعل حاصل کرلے، یعنی جتنا بڑا درخت بننا مقدر ہے اور جس قدر پھل دینا تقدیر الٰہی میں طے ہے وہ دیدے۔

اسی طرح جب کسی جسم میں روح ہوائی (نسمہ) تیار ہوتی ہے، جو تغذیہ اور تنمیہ کی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے، تو صورت حیوانیہ آکر اس روح ہوائی پر سوار ہوجاتی ہے، اور حیوانات کی وہ نوع وجود میں آجاتی ہے۔ اور صورت حیوانیہ اس روح ہوائی کے اطراف میں تصرف شروع کرتی ہے، ان میں حس وحرکت اور ارادہ پیدا کرتی ہے، تاکہ وہ حیوان، مطلوب کی طرف اٹھے، گھاس دانہ وغیرہ خوراک تلاش کرے اور مہروب سے پیچھے ہٹے یعنی جو چیزیں اس کو ضرر پہنچانے والی ہیں ان سے بچے۔

اسی طرح جب بدن انسانی میں نسمہ تیار ہوجاتا ہے تو صورت انسانیہ آکر اس نسمہ کو سواری بنالیتی ہے جو بدن میں متصرف ہے، اس طرح انسان کا ایک فرد موجود ہوجاتا ہے، پھر صورت انسانیہ ان اخلاق وملکات کو سنوارتی ہے اور ان کی بہترین تدبیر کرتی ہے جو اقدام واحجام کی بنیاد ہیں، اور ان اخلاق کو ان علوم کے لئے اسٹیج بنالیتی ہے جن کو وہ عالم بالا سے حاصل کرتی ہے۔

غرض موالید کی تمام انواع کا معاملہ اگرچہ سرسری نظر میں ملتا جلتا نظر آتا ہے، مگر گہری نظر ہر صورت نوعیہ کے آثار واحکام کو اس کے سرچشمہ کے ساتھ ملحق کرتی ہے اور ہر صورت کو اس کی سواری کے ساتھ علحدہ کردیتی ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام صور نوعیہ کے قیام وبقاء کے لئے کوئی مادہ ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ صورت نوعیہ عرض ہے، وہ کسی جوہر کے ساتھ ہی قائم ہوسکتی ہے۔ اور ہر صورت کے لئے مادہ وہی چیز بن سکتی ہے جو اس کے مناسب ہو، غرض مادہ کے بغیر صورت نوعیہ نہیں پائی جاسکتی۔ جیسے موم گھر (Wax House) میں موم کی تمثالیں بنی ہوئی ہوتی ہیں، یہ صورتیں موم کے بغیر قائم نہیں ہوسکتیں یا بچوں کے کھلونوں کی صورتیں، میٹریل کے بغیر موجود نہیں ہوسکتیں، اسی طرح ہر صورت نوعیہ کو مادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ نفس ناطقہ یعنی روح ربانی جو انسان کی مخصوص روح ہے، موت کے وقت مادہ سے بالکلیہ جدا ہوجاتی ہے: ان کا یہ قول اٹکل پچو کا تیر ہے۔ کیونکہ مادہ سے الگ ہوکر وہ قائم نہیں رہ سکتی، کپڑے کی سفیدی یا سیاہی مادہ سے الگ ہوکر کیسے برقرار رہ سکتی ہے! اور موت کے بعد روح کا بقاء اسلامی عقیدہ ہے، جیسا کہ اشعریؒ نے فرمایا ہے۔

ہاں مادہ دو طرح کا ہوتا ہے: ایک بالذات دوسرا بالعرض۔ انسان کی صورت نوعیہ (روح ربانی) کا بالذات مادہ نسمہ ہے، جس کے ساتھ وہ براہ راست متعلق ہوتی ہے اور جسد خاکی بالعرض مادہ ہے، کیونکہ اس کے ساتھ صورت نوعیہ نسمہ کے توسط سے متعلق ہوتی ہے۔

پس موت کے وقت روح ربانی جسد خاکی سے جدا ہوجاتی ہے، مگر اس جدا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ وہ

نسمہ میں حسب سابق حلول کئے ہوئے ہوتی ہے، جیسے کسی ماہر خوش نویس کے — جو خود اپنے فن پر فریفتہ ہو — دونوں ہاتھ کٹ جائیں، یا کسی مٹر گشت کے دونوں پیر کٹ جائیں یا کوئی شنوا، بینا، بہرہ اندھا ہو جائے تو بھی اصل ملکہ بدستور باقی رہتا ہے، اگر سرجری کر کے مصنوعی ہاتھ پیر لگا دئے جائیں تو ان سے وہ لکھنے اور گھومنے لگے گا، اسی طرح آپریشن کر کے یا آلہ لگا کر آدمی کو سنتا دیکھتا کر سکتے ہیں۔

اسی طرح جسد خاکی سے نفس ناطقہ کے تحقیقی تعلق کے ختم ہونے کے بعد بھی وہمی (خیالی) تعلق باقی رہتا ہے اور نسمہ سے تو حقیقی تعلق برقرار رہتا ہے، جو اس کے بقاؤ قیام کے لئے کافی سامان ہے۔

﴿باب ذكر حقيقة الموت﴾

اعلم أن لكل صورة من المعدنية، والنامویة، والحيوانية، والإنسانية مَطِيَّةً غيرَ مطيةِ الأخرى، ولها كمالاً أوّليا غيرَ كَمَالِ الأخرى، وإن اشتبه الأمر في الظاهر.

فالأركانُ إذا تَصَغَّرَت وامتزجت بأوضاع مختلفة، كثرةً وقلةً، حدثت ثُنَائِيَّاتٌ: كالبخار، والغبار، والدخان، والثرى، والأرضِ المُثارة، والجَمرة، والسُّعفة، والشُّعلة؛ وثلاثيات: كالطين المخمَّر، والطُّحْلَب؛ ورباعيات: نظائرُ ماذكرنا؛ وتلك الأشياء لها خواصُّ مركبةٌ من خواص أجزائها، ليس فيها شيئ غيرَ ذلك؛ وتُسمى بكائنات الجوّ.

فتأتي المعدنيةُ، فتقتعدُ غاربَ ذلك المزاج، وتتخذه مطيةً، وتصير ذات خواصَّ نوعيةٍ، وتحفظ المزاج.

ثم تأتي النامویة، فتتخذ الجسمَ المحفوظَ المزاج مطيةً، وتصير قوةً محوِّلَةً لأجزاء الأركان والكائناتِ الجوية إلى مزاج نفسه، لتخرُج إلى الكمال المتوقع لها بالفعل.

ثم تأتي الحيوانية، فتتخذ الروحَ الهوائية الحاملةَ لقُوى التغذية والتنمية مطيةً، وتُنفِّذ التصرفَ في أطرافها بالحس والإرادة، انبعاثا للمطلوب، وانخناسًا عن المهروب.

ثم تأتي الإنسانية، فتتخذ النسمةَ المتصرفةَ في البدن مطيةً، وتقصُد إلى الأخلاق التي هي أمهات الانبعاثات والانخناسات، فَتُقَنِّيهَا، وتُحْسِنُ سياستَها، وتأخذُها مَنَصَّةً لما تتلقاه من فوقها.

فالأمر وإن كان مشتبها بادى الراى، لكن النظر المُمْعِن يُلحق كلَّ آثار بمنبعها، ويُفرز كلَّ صورة بمطيتها.

وكل صورة لابدلها من ماده تقوم بها؛ وإنما تكون المادة ما يناسبها؛ وإنما مَثَلُ الصورة كمثل

خَلقة الإنسان القائمةِ بالشمعة في التمثال؛ ولا يمكن أن توجد الخَلقة إلا بالشمعة؛ فمن قال بأن النفس النُطقية، المخصوصةَ بالإنسان، عند الموت تَرْفُضُ المادة مطلقا،فقد خرص.

نعم، لها مادة بالذات وهي النسمة، ومادةٌ بالعرض وهو الجسم الأرضي؛ فإذا مات الإنسان لم يَضُرَّ نفسَه زوالُ المادة الأرضية، وبقيت حالّةً بمادة النسمة، ويكون كالكاتب المُجيد، المشغوفِ بكتابته؛ إذا قُطعت يداه وملكةُ الكتابة بحالها؛ والمُسْتَهْتِرِ بالمشي: إذا قطعت رجلاه؛ والسميع والبصير: إذا جُعل أصَمَّ وأعمى.

ترجمہ: موت کی حقیقت کا بیان۔ جان لیجئے کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں میں سے ہر صورت کے لئے ایک سواری ہے دوسری کی سواری کے علاوہ، اور ہر صورت کے لئے کمال اولی ہے دوسری کے کمال اولی کے علاوہ، اگرچہ معاملہ بظاہر متشابہ (یکساں، ہم شکل) ہے۔

پس جب عناصر اربعہ چھوٹے چھوٹے ہوجاتے ہیں اور باہم مختلف انداز سے ملتے ہیں، زیادہ ہونے اور کم ہونے کے اعتبار سے، تو دوعناصر والی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے بھاپ، غبار، دھواں، نمناک مٹی، جوتی ہوئی زمین، چنگاری، آگ کی لپٹ اور شعلہ ـــــ اور تین عناصر والی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے خمیر اٹھی ہوئی مٹی (سڑا ہوا گارا) اور کائی (وہ سبزی جو اکثر بند پانی کے اوپر یا برسات میں چونے کی دیواروں پر جم جاتی ہے) اور چار عناصر والی چیزیں (پیدا ہوتی ہیں) ان چیزوں کی طرح جو ہم نے ذکر کیں۔ اور ان چیزوں کے لئے خصوصیات ہیں، جو ان کے اجزاء کی خصوصیات سے مرکب ہیں، ان میں کوئی چیز ان خصوصیات کے علاوہ نہیں، اور وہ ''فضائی چیزیں'' کہلاتی ہیں۔

پس صورت معدنیہ آتی ہے، اور اُس مزاج کی گردن پر بیٹھ جاتی ہے، اور اُس کو سواری بنالیتی ہے اور وہ صورت: نوعی خصوصیات رکھنے والی بن جاتی ہے اور مزاج کی نگہداشت کرتی ہے۔

پھر صورت نباتیہ آتی ہے، پس وہ اس جسم کو سواری بناتی ہے جو محفوظ المزاج ہے اور وہ صورت ایک قوت (پاور) بن جاتی ہے، جو تبدیل کرنے والی ہوتی ہے عناصر اربعہ کے اجزاء کو اور فضائی کائنات (ہوا وغیرہ) کے اجزاء کو، اس کے اپنے مزاج کی طرف تاکہ وہ بالفعل نکلے اس کمال کی طرف جس کی اس کے لئے امید باندھی گئی ہے۔

پھر آتی ہے صورت حیوانیہ، پس وہ اُس روح ہوائی کو سواری بناتی ہے، جو تغذیہ اور تنمیہ کی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اور وہ احساس اور ارادہ کے ذریعہ روح ہوائی کے اطراف میں آرڈر چلاتی ہے، تاکہ وہ مطلوب کی طرف اٹھے، اور بھاگنے کی چیز سے دور ہٹے۔

پھر آتی ہے صورت انسانیہ، پس وہ اس نسمہ کو سواری بناتی ہے، جو بدن میں تصرف کرنے والا ہے، اور وہ اُن اخلاق کا ارادہ کرتی ہے جو مطلوب کی طرف اٹھ کھڑے ہونے اور مہروب سے پیچھے ہٹ جانے کی بنیادیں ہیں، پس وہ صورت ان

ملکات کی پرورش کرتی ہے، اوران کی بہترین تدبیر کرتی ہے، اوران کو جلوہ گاہ بنالیتی ہے اُن باتوں کے لئے جن کو وہ اپنے اوپر سے حاصل کرتی ہے۔

پس معاملہ اگرچہ سرسری نظر میں یکساں دِکھتا ہے، مگر گہری نظر تمام آثار کوان کے سرچشموں کے ساتھ ملاتی ہے، اور ہرصورت کواس کی سواری کے ساتھ جدا کرتی ہے۔

اور ہرصورت کے لئے ایک مادہ ضروری ہے، جس کے ساتھ وہ قائم ہو، اور مادہ وہی چیز ہوسکتی ہے جو اس کے مناسب ہو۔ اور صورت نوعیہ کا حال تو بس انسان کی اس شکل جیسا ہے جو مجسمہ میں موم کے ساتھ قائم ہے، اور حلیہ پایا ہی نہیں جاسکتا مگر موم کے ساتھ، پس جو شخص کہتا ہے کہ: ”نفس ناطقہ، جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے، بوقت مرگ بالکلیہ مادہ کو چھوڑ دیتا ہے“ تو اس نے اٹکل پچو ہانکا!

ہاں صورت نوعیہ کے لئے ایک مادہ بالذات ہے، اور وہ نسمہ ہے اور ایک مادہ بالعرض ہے، اور وہ جسد خاکی ہے۔ پس جب انسان مرجاتا ہے تو اس کو ضرر نہیں پہنچتا تا زمینی مادہ کا زائل ہونا۔ اور باقی رہتی ہے صورت نوعیہ، نسمہ کے مادہ کے ساتھ حلول کئے ہوئے، اور ہوتا ہے اس ماہر کاتب کی طرح، جو اپنی کتابت کا دلدادہ ہو، جب اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، درانحالیکہ کتابت کا ملکہ بحالہ باقی رہتا ہے اور چلنے کا دُھنی، جب اس کے دونوں پیر کاٹ دیئے جائیں اور سننے والا اور دیکھنے والا جب بہرہ اندھا ہو جائے۔

نوٹ: اس بحث میں نفس ناطقہ اور انسان کی صورت نوعیہ: روح ربانی کے معنی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

لغات:

نامویہ اور نباتیہ مترادف الفاظ ہیں...... اَوْضاع جمع ہے وَضْع کی، بمعنی حالت، یہ مقولات عرض میں سے ایک مقولہ ہے (دیکھئے معین الفلسفہ ص ۸۲)...... ثُمَّ بار بار ترتیب ذکری کے لئے آیا ہے، جیسے سورۃ البلد آیت ۱۷ میں ثُمَّ اسی معنی میں آیا ہے...... المحفوظ المزاج احتراز ہے مرکب غیر تام کے عارضی مزاج سے، جو تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتا ہے...... اقتنی المال: حاصل کرنا۔ اقتنی الحیوان: پالنا، پرورش کرنا...... مُجید (اسم فاعل) اَجاد اِجادَۃ: عمدہ کرنا ...... اِسْتَهْتَرَ الرجلُ بکذا: بہت فریفتہ ہونا۔

تصحیح: فَتَقْتَنِیْهَا اصل میں فَتُقَیِّنُهَا تھا، جس کے معنی ہیں مزین کرنا۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

لوگوں کی مختلف انواع

موت کے بعد عالم برزخ میں جو مجازات ہوگی، اس کو سمجھنے کے لئے باب کے آخر میں شاہ صاحب رحمہ اللہ بطور تمہید تین باتیں بیان فرماتے ہیں:

پہلی بات: مختلف اعتبارات سے لوگ مختلف طرح کے ہوتے ہیں، مثلاً:

(۱) کوئی دل کے تقاضے سے اعمال کرتا ہے اور ملکات کو اپناتا ہے اور کوئی برادری کی موافقت میں، یا کسی خارجی دباؤ سے اعمال کرتا ہے، بشرطے کہ وہ عارض عادت ثانیہ نہ بن گیا ہو، ورنہ وہ عارض نہیں رہے گا، بلکہ دل کا داعیہ بن جائے گا۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو اپنا حال لکھا تھا کہ: ''عبادت عادت بن گئی ہے'' یعنی دل کا تقاضا بن گئی ہے، عبادت کے لئے نہ تو تکلف کرنا پڑتا ہے، نہ دل کو آمادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس پر حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے مبارک باد دی تھی۔

پہلی قسم کے لوگوں کو یعنی جو دل کے تقاضے سے اعمال کرتے ہیں اور ملکات کو اپناتے ہیں ان کو نگرانی کی ضرورت نہیں ہوتی، اگر ان کو مخلّی بالطبع چھوڑ دیا جائے تب بھی وہ اعمال کرتے رہیں گے اور وضع قطع اور اخلاق کو سنبھالے رکھیں گے، اور دوسری قسم کے لوگ یعنی جو برادری کی موافقت میں یا کسی عارض سے اعمال کرتے ہیں، وہ جب تک عارض رہتا ہے اعمال کرتے ہیں اور اخلاق برتتے ہیں اور جب عارض ہٹ جاتا ہے تو اعمال میں سست پڑ جاتے ہیں اور اخلاق کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

جیسے بعض طلبہ فطری طور پر نیک طبع اور سلامت روی کا مزاج رکھتے ہیں۔ وہ قلبی رغبت سے نیک لوگوں کی شکل وصورت، وضع قطع، اعمال صالحہ اور اخلاق حمیدہ اپناتے ہیں۔ مدرسہ میں ان کی نگرانی نہ بھی کی جائے تب بھی ان کی حالت درست رہتی ہے اور گھر لوٹنے کے بعد بھی ان کی وہی شکل وصورت برقرار رہتی ہے اور اعمال واخلاق محفوظ رہتے ہیں۔ اور بعض طلبہ فطری طور پر لاأبالی، اوباش ہوتے ہیں، وہ اعمال صالحہ اور نیک لوگوں کی شکل وصورت میں بے رغبت ہوتے ہیں مگر مدرسہ کی زندگی میں ان کو مجبوراً ماحول کی موافقت کرنی پڑتی ہے، ایسے طلبہ کی اگر پوری نگرانی نہ کی جائے یا جب وہ وطن لوٹ جاتے ہیں تو ان کے اعمال میں، اخلاق میں، شکل وصورت میں، حتی کہ وضع قطع میں بھی فرق پڑ جاتا ہے (شاہ صاحب رحمہ اللہ کی دی ہوئی مثال کتاب میں آئے گی)

(۲) کچھ لوگ فطری طور پر بیدار طبیعت ہوتے ہیں، اور کچھ خوابیدہ طبیعت۔ پہلی قسم کے حضرات متعدد چیزوں کے درمیان جو امر جامع ہوتا ہے اس کو سمجھ لیتے ہیں، ان کا دل معلولات میں الجھنے کے بجائے علت کو ڈھونڈھتا ہے۔ وہ اعمال سے زیادہ ملکات کو اہمیت دیتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کی صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے، وہ کثرت (متفرق چیزوں) میں الجھے رہتے ہیں، ان کی رسائی وحدت (امر جامع) تک نہیں ہوتی۔ وہ ملکات سے صرف نظر کر کے اعمال میں، اور اعمال کی بھی اسپرٹ کو نظر انداز کر کے ان کی ظاہری شکلوں میں مشغول رہتے ہیں۔

مثلاً ایک مدرسہ میں چند دن میں، طلبہ میں، بے راہ روی کے مختلف واقعات رونما ہوئے، کسی نے چوری کی، کوئی سینما بینی میں پکڑا گیا، کوئی جھگڑا کر بیٹھا اور کچھ آوارہ گردی کرنے لگے تو سمجھدار مہتمم ان متفرق واقعات کو اہمیت دینے کے بجائے ان کا اصل سبب تلاش کرے گا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ طلبہ میں بے راہ روی کی وجہ تربیت کا فقدان ہے، وہ فوراً تربیت

کا نظام مضبوط کرے گا تو واقعات خود بخود رک جائیں گے اور سادہ مہتمم واقعات میں الجھا رہے گا، وہ کسی کا کھانا بند کرے گا، کسی کی پٹائی کرے گا، کسی کا اخراج کرے گا اور مرض بڑھتا رہے گا اور واقعات کا تسلسل جاری رہے گا۔

واعلم أن من الأعمال والهيئات مايباشرها الإنسانُ بداعية من قلبه، فلو خُلّي ونفسه لَانْساق إلى ذلك، ولامتنع من مخالفه؛ ومنها مايباشره لموافقة الإخوان، أو لعارضٍ خارجي: من جوع وعطش ونحوهما، إذا لم يصر عادةً لايستطيع الإقلاعَ عنها، فإذا انْفَقَأ العارضُ انْحلّت الداعيةُ؛ فرب مستَهْتِرٍ بعشق إنسان،أو بالشعر،أو بشيئ آخر، يضطر إلى موافقة قومه في اللباس والزِّيِّ،فلو خُلي ونفسه، وتبدَّل زِيُّه، لم يجد في قلبه بأسًا؛ ورب إنسان يحب الزِّيَّ بالذات، فلو خلي ونفسه، لما سَمَحَ بتركه.

وأن من الإنسان اليقظانَ بالطبع، يتفطَّن بالأمر الجامع بين الكثرات، ويُمسك قلبُه بالعلة، دون المعلولاتِ، والمَلكةِ دون الأفاعيلِ؛ ومنه الوَسْنانُ بالطبع، يبقى مشغولاً بالكثرة عن الوَحدة، وبالأفاعيل عن الملكات، وبالأشباح عن الأرواح.

ترجمہ: اور جان لیں کہ بعض کام اور بعض ملکات وہ ہیں جن کو انسان داعیۂ قلب سے کرتا ہے، پس اگر وہ اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ ان کی طرف ہانکا جائے گا یعنی وہ ان کاموں کی طرف مائل رہے گا۔ اور اس کے برخلاف سے باز رہے گا۔ اور بعض اعمال وملکات وہ ہیں جن کو آدمی اختیار کرتا ہے برادری کی موافقت میں یا کسی بیرونی عارض (دباؤ) کی وجہ سے، جیسے بھوک، پیاس اور ان کے مانند، جب وہ عارض ایسی عادت نہ بن جائے، جس کو چھوڑنا بس میں نہ رہے، پس جب عارض پھوٹ جاتا ہے تو داعیہ کھل جاتا ہے یعنی جب وہ عارض ختم ہو جاتا ہے تو داعیہ بھی باقی نہیں رہتا ـــــ مثلاً بعض لوگ جو کسی کے عشق میں یا فن شاعری پر یا کسی دوسری چیز پر وارفتہ ہوتے ہیں (تاہم) وہ لباس اور پوشاک میں اپنی قوم کی موافقت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر اگر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کی پوشاک بدل جائے تو وہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرے گا ـــــ اور بعض لوگ کسی پوشاک کو بالذات پسند کرتے ہیں، پس اگر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ اس پوشاک کو چھوڑنے کا روادار نہیں ہوگا۔

اور یہ (بات بھی جان لیں) کہ بعض لوگ فطری طور پر بیدار (مغز) ہوتے ہیں، وہ اس امر جامع کو فوراً پالیتے ہیں جو بہت سی چیزوں میں (مشترک) ہوتا ہے، اور اس کا دل معلولات (نتائج وآثار) کو چھوڑ کر، علت (اور سبب) کو پکڑتا ہے اور اعمال کو چھوڑ کر، ملکہ کو پکڑتا ہے ـــــ اور بعض انسان فطری طور پر خوابیدہ (طبیعت) ہوتے ہیں، وہ وحدت (اکائی) کو چھوڑ کر کثرت میں، اور ملکات کو چھوڑ کر اعمال میں، اور ارواح کو چھوڑ کر اشکال میں مشغول ہوتے ہیں۔

لغات: باشر الأمر: کسی کام کوخود کرنا...... اِنساق: ہانکا جانا...... اَقلَعَ عن کذا: چھوڑنا...... اِنفقأ: پھوٹنا...... اِنحلّ: کھل جانا...... الوَسنان (صفت مذکر) اونگھنے والا۔ وَسِنَ وَسَنًا: اونگھنا۔

☆ ☆ ☆

موت کے بعد اللہ تعالیٰ کا یقین اور اعمال کا احساس ہونے لگتا ہے

دوسری بات: جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا کالبُدِ خاکی گل سڑ کر ختم ہوجاتا ہے، مگر روحِ ربانی (نفس ناطقہ) کا روح حیوانی (نسمہ) کے ساتھ تعلق برقرار رہتا ہے۔ اور اب نفس ناطقہ پوری طرح فارغ البال ہوجاتا ہے اور ان تمام چیزوں سے دامن جھاڑ لیتا ہے جو دنیوی زندگی کی ضرورت سے تھیں، اور خود اس کے جوہر اصلی میں جو چیزیں محفوظ ہوتی ہیں ان میں مشغول ہوجاتا ہے اس وقت ملکیت سر ابھارتی ہے اور بہیمیت کمزور پڑتی ہے، اور انسان کو اللہ تعالیٰ کا یقین ہونے لگتا ہے اور ان اعمال کا بھی یقین آنے لگتا ہے جو عالم بالا میں ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ یہی احساس جزا و سزا بن جاتا ہے۔ راحت بخش احساسات جزائے خیر بنتے ہیں اور تکلیف دہ احساسات باعث رنج والم ہوتے ہیں۔

واعلم أن الإنسان إذا مات انفسخ جسدُه الأرضي، وبقيت نفسُه النُطقية متعلقة بالنسمة، متفرغةً إلى ماعندها، وطرحَتْ عنها ماكان لضرورة الحياة الدنيا، من غير داعية قلبية، وبقي فيها ماكانت تُمسكُه في جَذر جوهرها؛ وحينئذ تبْرُز الملكيةُ، وتضْعُف البهيمية، ويترشح عليها من فوقها يقينٌ بحظيرة القدس، وبما أُحصي عليها هنالك، وحينئذ تتألم الملكية أو تتنعَّم.

ترجمہ: اور جان لیں کہ انسان جب مرجاتا ہے تو اس کا جسد خاکی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے یعنی گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے اور اس کا نفس ناطقہ نسمہ کے ساتھ جڑا رہتا ہے، فارغ البال ہوکر اس چیز کے لئے جو اس کے پاس ہے، اور پھینک دیتا ہے اپنے سے وہ چیزیں جو قلبی داعیہ کے بغیر دنیوی زندگی کی ضرورت سے تھیں۔ اور باقی رہتی ہیں اس میں وہ چیزیں جن کو وہ اپنے جوہر (ذات) کی جڑ میں روکے ہوئے تھا۔ اور اس وقت ملکیت نمودار ہوتی ہے اور بہیمیت کمزور پڑتی ہے اور اس پر اس کے اوپر سے حظیرۃ القدس (اللہ تعالیٰ) کا یقین ٹپکتا ہے اور ان اعمال کا (بھی) یقین ٹپکتا ہے، جو وہاں اس کے خلاف ریکارڈ کیے گئے ہیں اور اس وقت ملکیت رنجیدہ ہوتی ہے یا نعمت کی زندگی بسر کرتی ہے۔

ملکیت کے لئے مفید اور مضر چیزیں

تیسری بات: انسان میں قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ ایک ساتھ جمع ہیں، پس یہ تو ممکن نہیں کہ ایک پر دوسرے کا اثر

نہ پڑے۔ پھر بہیمیت کا ملکیت سے متاثر ہونا تو خیر محض ہے، البتہ ملکیت کا بہیمیت سے متاثر ہونا مضر ہے، مگر تھوڑی مقدار میں اثر قبول کرنے میں کچھ حرج بھی نہیں، ہاں سخت نقصان دہ بات یہ ہے کہ ملکیت میں غایت درجہ ناموافق کیفیات پیدا ہو جائیں، اور نہایت مفید بات یہ ہے کہ اس میں غایت درجہ موافق ومناسب کیفیات جلوہ گر ہوں۔

ناموافق کیفیات درج ذیل ہیں:

(۱) مال اور اہل وعیال کی محبت میں آدمی یہاں تک گرفتار ہو جائے کہ اس کو ان چیزوں کے سوا، زندگی کا اور کوئی مقصد نظر نہ آئے اور یہ خسیس ھیئات اس کے نفس کی تھاہ میں جم جائیں، اور اس قسم کی دوسری چیزیں جو اس کو سماحت سے دور کر دیں۔ اور سماحت کے معنی ہیں: نفس کا ایسا ہو جانا کہ وہ قوت بہیمی کی خواہشات کی اطاعت نہ کرے۔

(۲) آدمی ہر وقت نجاستوں میں لت پت رہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے متکبر ہو جائے، نہ تو کبھی اس کو جاننے کی کوشش کرے، اور نہ کبھی اس کے سامنے عجز وانکساری کرے، اور اس قسم کی دوسری باتیں جو اس کو احسان سے دور کر دیں۔ اور احسان (نکوکردن) کے معنی ہیں: ہر کام اخلاص سے کرنا یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کرنا۔

(۳) آدمی کا رویہ اعانت حق کے سلسلہ میں، امر الٰہی کی تعظیم کے بارے میں، بعثت انبیاء کے معاملہ میں، اور پسندیدہ نظام کے قیام کے سلسلہ میں مرضیٔ خداوندی کے خلاف ہو جائے، یعنی بجائے اس کے کہ حق کی اعانت کرے، اس سے عداوت رکھنے لگے، اور بجائے اس کے کہ اوامر الٰہی کی تعظیم وتوقیر کرے اور ان کو بجالائے، ان کی تحقیر ومخالفت کرنے لگے اور ان کے خلاف عمل کرنے لگے، اور بجائے اس کے کہ انبیاء کے کاز کو تقویت پہنچائے، لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور بجائے اس کے کہ نظام اسلامی کو دنیا میں پھیلائے، اس کے راستہ کا روڑا بن جائے، جس کی وجہ سے ملأ اعلیٰ کی نفرتیں اور لعنتیں اس پر برسنے لگیں۔

اور موافق کیفیات درج ذیل ہیں:

(۱) آدمی ایسے کام کرنے لگے جن سے طہارت اور حضور خداوندی میں عجز وانکساری پیدا ہو، ملائکہ کے حالات یاد آئیں اور ایسے عقائد کی راہ ملے، جن کی وجہ سے انسان حیات دنیوی پر مطمئن نہ ہو بیٹھے۔

(۲) آدمی نرم دل ہو جائے، سخت گیری سے کام نہ لے، کیونکہ نرمی سے کام سنورتے ہیں، اور سختی سے کام بگڑتے ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ: ''تم زمین والوں پر مہربانی کرو، تم پر آسمان والا مہربانی کرے گا'' اور حدیث میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نرم برتاؤ کرنے والے ہیں اور نرم برتاؤ کو پسند کرتے ہیں اور نرم برتاؤ پر وہ چیز عطا فرماتے ہیں جو نہ تو سخت برتاؤ پر عطا فرماتے ہیں، نہ کسی اور چیز پر'' (رواہ مسلم، مشکوۃ صفحہ ۴۳۱ باب الرفق والحیاء)

(۳) آدمی ایسا پاکباز بن جائے کہ ملأ اعلیٰ کی دعائیں اور ان کی خاص توجہات، جو نظام خیر کے لئے مخصوص ہیں، اس کو نصیب ہوں۔

واعلم أن الملكية عند غوصها في البهيمية، وامتزاجها بها، لابد أن تُذْعِن لها إذعانا ما،وتتأثرَ منها أثرًا ما؛ لكن الضَّار كلَّ الضرر أن تتشبح فيها هيئاتٌ منافرةٌ في الغاية، والنافع كلَّ النفع أن تتشبح فيها هيئات مناسِبة في الغاية.

فمن المنافرات: أن يكون قويَّ التعلق بالمال والأهل، لايستيقن أن وراء هما مطلوبا، قويَّ الإمساك للهيئات الدنية في جَذر جوهرها، ونَحْوُ ذلك مما يجمَعُه أنه على الطرف المقابل للسماحة، وأن يكون متلبسا بالنجاسات،مكتبرًا على الله، لم يعرفه، ولم يخضع له يومًا، ونحوُ ذلك مما يجمعه أنه على الطرف المقابل للإحسان، وأن يكون ناقِضَ توجُّه حظيرةِ القدس في نصر الحق، وتنويه أمره، وبعثة الأنبياء، وإقامة النظام المرضي، فأُصيب منهم بالبغضاء واللعن.

ومن المناسبات :مباشرةُ أعمالٍ تُحاكي الطهارة والخضوع للباري، وتذكُّرُ حالَ الملائكة، وعقائدُ تنزعها من الاطمئنان بالحياة الدنيا، وأن يكون سمحًا سهلاً، وأن يعْطف عليه أدعيةُ الملأ الأعلى، وتوجهاتُهم للنظام المرضي، والله اعلم.

ترجمہ: اور جان لیں کہ جب ملکیت، بہیمیت میں غوطہ لگاتی ہے اور اس کے ساتھ رل مل جاتی ہے، تو ضروری ہے کہ وہ بہیمیت کی کچھ نہ کچھ تابعداری کرے، اور اس سے کچھ نہ کچھ متاثر ہو (لیکن اتنی مقدار میں اثر قبول کرنا مضر نہیں) البتہ نہایت ضرر رساں امر یہ ہے کہ ملکیت میں ایسی ہیئتیں متشکل ہوں، جو غایت درجہ اس سے بے جوڑ ہوں، اور نہایت نافع امر یہ ہے کہ اس میں ایسی ہیئتیں متشکل ہوں جو غایت درجہ اس سے ہم آہنگ ہوں۔

پس ناموافق ہیئتوں میں سے یہ بات ہے کہ (۱) آدمی کا مال اور آل سے اس قدر مضبوط تعلق ہو جائے کہ اس کو یقین ہی نہ رہے کہ ان دونوں کے سوا کوئی اور مقصود بھی ہے، وہ مضبوطی سے تھامنے والا ہو اپنی ذات کی جڑ میں رذیل ہیئتوں کو، اور اس قسم کی دوسری چیزیں اُن چیزوں میں سے جو انسان کو اکٹھا کرتی ہیں کہ وہ ساحت کی مقابل جانب پر ہے (۲) اور یہ کہ وہ نجاستوں میں ملوث ہونے والا، اللہ تعالیٰ کے سامنے اکڑنے والا ہو، وہ نہ اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہو، اور نہ اس نے کسی دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں عجز وانکساری کی ہو، اور اس کے مانند دوسری چیزیں اُن چیزوں میں سے جو اس کو اکٹھا کرتی ہیں کہ وہ احسان کی مقابل جانب پر ہے (۳) اور یہ کہ وہ دین حق کی مدد میں، دین حق کے معاملہ کو مہتم بالشان بنانے میں، انبیاء کی بعثت میں اور پسندیدہ نظام (نظام اسلامی) کو برپا کرنے میں حظیرۃ القدس کی توجہ کو توڑنے والا ہو، پس وہ ملأاعلیٰ کی طرف سے نفرت اور لعنت پہنچایا گیا ہو۔

اور موافق ہیئتوں میں سے: (۱) ایسے کاموں کا کرنا ہے جو پاکی اور اللہ تعالیٰ کے لئے انکساری کے مشابہ ہوں، اور وہ ملائکہ کی حالت کو یاد دلانے والے ہوں (۲) اور ایسے عقائد ہیں، جو اس کو دنیوی زندگی پر مطمئن ہونے سے ہٹائیں (۳) اور یہ کہ وہ نرم خو، نرم مزاج ہو (۴) اور یہ کہ ملأ اعلیٰ کی دعائیں اور ان کی پسندیدہ نظام کے لئے مخصوص توجہات اس پر مُڑیں، واللہ اعلم

لغات وترکیب:

غاص يغوص غوصًا: پانی میں غوطہ لگانا...... **امتزَجَ به**: ملنا...... **أذْعَنَ له**: مطیع وفرمانبردار ہونا، فروتنی کرنا، **أذْعَنَ بالحق**: اقرار کرنا...... **نَوَّهَ تَنْوِيْهًا الشيئَ**: بلند کرنا...... **حاكى محاكاةً**: مشابہ ہونا...... **تذکر** کا عطف **تحاكى** پر ہے...... **عقائد** کا عطف **مباشرة** پر ہے۔

باب ——— ۳

برزخی مجازات میں لوگوں کے مختلف احوال

لغت میں برزخ کے معنی ہیں: دو چیزوں کے درمیان کی روک، سورۃ الرحمٰن آیت ۲۰ اور سورۃ الفرقان آیت ۵۳ میں شیریں اور شور دریاؤں کے درمیان کے حجاب کو برزخ کہا گیا ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں برزخ کے معنی ہیں: مرنے کے وقت سے دوبارہ اٹھنے تک کا زمانہ، سورۃ المؤمنون آیت ۱۰۰ میں برزخ کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

عالم برزخ کو عالم قبر اور قبر کی زندگی بھی کہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں قبر صرف مٹی کے گھڑے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک پوری دنیا (زندگی) ہے، اور جو بھی مرتا ہے وہ عالم قبر میں پہنچ جاتا ہے، خواہ وہ مٹی کے گھڑے میں دفن کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ کیونکہ مر کر انسان ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ اس کا انتقال ہوجاتا ہے یعنی وہ اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوجاتا ہے۔ اور لاش (جسم) جو رہ جاتی ہے، وہ لاشیَٔ (کچھ بھی نہیں) ہوتا ہے۔ پس انسان یہاں سے جو اعمال کر کے لے گیا ہے، اسی کو برزخ کی زندگی میں بھگتتا ہے۔ اور اس دنیا میں اعمال کے اعتبار سے لوگوں کے احوال اس قدر مختلف ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا، پس عالم برزخ میں مجازات بھی مختلف طرح سے ہوگی، بلکہ جتنے انسان ہیں، مجازات کی بھی اتنی ہی صورتیں ہوں گی۔ مگر مختلف چیزوں کو بھی بعض اعتبارات سے سمیٹا جاسکتا ہے، دارالعلوم دیوبند میں تین ہزار طلبہ ہیں، ان کو جماعتوں کے اعتبار سے یا صوبوں کے لحاظ سے سمیٹا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں اعمال کے اعتبار سے جو انسانوں کی بے شمار قسمیں ہیں، ان کو اگر سمیٹا جائے تو ان کی بڑی قسمیں چار بنتی ہیں، پس برزخ میں ان کو مجازات بھی چار طرح سے ہوگی، تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی قسم

بیدار قلب لوگوں کی مجازات

جو لوگ اس دنیا میں بیدار قلب ہیں، ان کو برزخ میں موافق وناموافق کیفیات کی وجہ سے مجازات ہوگی جو انھوں نے اس دنیا میں کمائی ہیں جن کی تفصیل گزشتہ باب کے آخر میں گزر چکی ہے یعنی مرنے کے بعد ان کو نیک وبد اعمال کا شدت سے احساس ہوگا۔ نیک اعمال کا تصور راحت پہنچائے گا، اور برے اعمال کے تصور سے سخت پریشانی لاحق ہوگی۔ یہی ان کی مجازات ہے۔ مثلاً دنیا میں آدمی اچھے کام کرتا ہے تو اس کو خوشی محسوس ہوتی ہے، طالب عالم جماعت میں اول نمبر آتا ہے تو پھولا نہیں سماتا، یہی شادمانی اس کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اور آدمی سے کوئی بری حرکت ہوجاتی ہے تو پشیمانی اس کو گھیر لیتی ہے، امتحان میں ناکام ہوتا ہے اور بے حس نہیں ہوتا تو ڈوب مرتا ہے۔ یہی تحسُّر اس کی سب سے بڑی سزا ہے۔ سورۃ الزمر آیت ۵۶ میں اس مجازات کی طرف اشارہ آیا ہے۔ ارشاد ہے: ''کبھی (مرنے کے بعد) کوئی شخص کہنے لگے کہ افسوس میری اُس کوتاہی پر جو میں نے خدا کی جناب میں روا رکھی، اور میں تو (احکام خداوندی پر) ہنستا ہی رہا'' —— جناب باری تعالیٰ میں کوتاہی پر یہ تحسُّر ایک طرح کی سزا ہے۔

اور سورۃ الاعراف آیت ۴۳ میں نیک لوگوں کا یہ قول مذکور ہے: ''اور وہ لوگ کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے، جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا، اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے، واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے'' ﴿وَقَالُوْا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا﴾ الآیۃ ایمان واعمال صالحہ کی توفیق ملنے پر نیک لوگوں کی یہ شادمانی ایک طرح کا انعام ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب قدس سرہ نے اپنا ایک مکاشفہ ذکر فرمایا ہے۔ آپ نے بعض اہل اللہ کی ارواح کو موت کے بعد دیکھا کہ وہ سراپا نور بنی ہوئی تھیں، جیسے کسی کھڈے میں پانی بھرا ہوا ہو۔ اور پانی ایسا پرسکون ہو کہ ہوا بھی اس میں لہریں پیدا نہ کر رہی ہو، جب دوپہر میں اس پر آفتاب کی شعائیں پڑتی ہیں تو کھڈا بقعۂ نور بن جاتا ہے، اسی طرح ان اولیائے کرام کی ارواح سراپا نور بنی ہوئی تھیں، اور یہی ان کے اعمال صالحہ کی مجازات ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ نور کس چیز کا تھا؟ تو اس میں تین احتمال ہیں:

(الف) وہ اعمال صالحہ کا نور ہوسکتا ہے یعنی ان لوگوں نے زندگی بھر جو نیک اعمال کئے ہیں، ان سے یہ نور پیدا ہوا ہو۔

(ب) یہ نسبت یادداشت کا نور بھی ہوسکتا ہے۔ یادداشت کے معنی ہیں: ہمہ وقت خدا کی طرف دھیان لگائے رکھنا

(تذکُّر الباری عَزَّ اسمُه دائما سرمدًا اھ سندی) یعنی آدمی کوئی بھی کام کرے، کسی بھی حال میں رہے، خدا کی یاد دل سے نہ جائے، ہمیشہ خدا اور اس کے احکام کو مدنظر رکھے اور زبان سے، یا پاس انفاس سے اللہ کو یاد کرتا رہے۔

اور اگر کوئی یہ سوال کرے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی بہ یک وقت دو کام کرے۔ دنیوی کام بھی انجام دے اور ساتھ ہی خدا کی یاد بھی دل میں قائم رکھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل ممکن ہے، عاشق کے دل میں ہر حال میں معشوق بسا رہتا ہے اور حسی مثال یہ ہے کہ سائیکل چلانے والا جب چلتے چلتے کسی سے باتیں کرتا ہے تو وہ باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے اور سائیکل کا توازن قائم رکھنے کی طرف بھی اس کا دھیان رہتا ہے — یہ بات اگرچہ شروع شروع میں کچھ مشکل نظر آتی ہے مگر بعد میں جب عادت ثانیہ بن جاتی ہے تو سوتے ہوئے بھی ذکر جاری رہتا ہے۔

(ج) یہ رحمت خداوندی کا نور بھی ہوسکتا ہے یعنی اعمال صالحہ کرنے پر، بندے کی طرف جو رحمت خداوندی متوجہ ہوتی ہے اس کا نور بھی ہوسکتا ہے

نوٹ: بیدار قلب اور موافق و ناموافق کیفیات کا بیان گذشتہ باب میں گزر چکا ہے۔

﴿باب اختلاف أحوال الناس فی البرزخ﴾

اعلم أن الناس فی هذا العالَم علی طبقات شتّٰی، لایُرجی إحصاؤها، لکنَّ روسَ الأصناف أربعة:

[۱] صنفٌ هم أهل الیقظة؛ وأولئك یُعذَّبون وینعَّمون بأنفُسِ تلك المنافرات والمناسِبات؛ وإلی حال هذا الصنف وقعت الإشارة فی قوله تعالی: ﴿أَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَافَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰهِ، وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ﴾

ورأیتُ طائفةً من أهل اللّٰه صارت نفوسُهم بمنزلة الجوابی الممتلئةِ ماءً راکدًا، لاتُهَیِّجُهُ الریاحُ، فضربها ضوءُ الشمس فی الهاجرة، فصارت بمنزلة قطعة من النور؛ وذلك النور: إما نور الأعمال المرضیة، أو نورُ الیاد داشتِ؛ أو نورُ الرحمة.

ترجمہ: برزخ میں (بسلسلۂ مجازات) لوگوں کے احوال کے مختلف ہونے کا بیان: جان لیں کہ اس دنیا میں لوگ (باعتبار اعمال) اس قدر مختلف درجات میں ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ بڑی قسمیں چار ہیں:

(۱) ایک قسم: وہ بیداری والے ہیں؛ اور یہ لوگ سزا دیئے جائیں گے، اور راحتیں پہنچائے جائیں گے، اُنہی ناموافق وموافق کیفیات کی وجہ سے (جن کا بیان گذشتہ باب کے آخر میں آیا ہے) اور اس قسم کی طرف اشارہ آیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ میں کہ مرنے کے بعد: ''کہیں کوئی شخص کہنے لگے کہ ہائے افسوس! اُس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے پہلو میں روا رکھی، اور بیشک میں ٹھٹھا کرنے والوں میں سے تھا!''

اور میں نے اہل اللہ کی ایک جماعت کو (کشف میں) دیکھا، اُن کی ارواح اُن گھڑوں جیسی ہوگئی ہیں جو ٹھہرے ہوئے پانی سے لبالب بھرے ہوئے ہوں، جن میں ہوائیں بھی ہیجان نہ پیدا کررہی ہوں، جب دوپہر میں ان پر سورج کی کرنیں پڑیں، تو وہ گھڑے نور کے ایک ٹکڑے کی طرح ہوجائیں ——— اور وہ نور یا تو پسندیدہ اعمال کا نور ہے، یا نسبت یادداشت کا نور ہے، یا رحمت خداوندی کا نور ہے۔

دوسری قسم

خوابیدہ طبیعت لوگوں کی مجازات

جو لوگ صلاحیتوں کے اعتبار سے تو پہلی قسم کے لوگوں کے لگ بھگ ہوتے ہیں، مگر وہ فطری طور پر خوابیدہ طبیعت ہوتے ہیں (جس کی تفصیل گذشتہ باب کے آخر میں گزر چکی ہے) ان لوگوں کو عالم برزخ میں مجازات بصورت ''خواب'' ہوتی ہے، مثلاً درندہ صفت آدمی عالم برزخ میں دیکھتا ہے کہ اس کو درندہ پھاڑ رہا ہے، اور بخیل آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو سانپ بچھو ڈس رہے ہیں اور بالائی علوم کا نزول ایسے دو فرشتوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو اس سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور آنحضور ﷺ کی زیارت کرا کر دریافت کرتے ہیں کہ اس ہستی کے بارے تو کیا کہتا ہے؟

غرض یہ لوگ بصورت خواب معذب ہوتے ہیں، مگر عالم برزخ میں ان کو جو خواب نظر آتا ہے، وہ صرف خواب کی صورت ہوتی ہے، حقیقۃً خواب نہیں ہوتا، بلکہ عالم خارجی میں مجازات ہوتی ہے، کیونکہ خواب کی حقیقت اس دنیا میں یہ ہے کہ ہماری قوت خیالیہ میں جو معلومات جمع ہوتی ہیں وہی نیند کی حالت میں نظروں کے سامنے آتی ہیں اور متشکل ہوکر نظر آتی ہیں، جب تک ہوائی جہاز کی ایجاد نہیں ہوئی تھی کسی نے خواب میں ہوائی جہاز اڑتے نہیں دیکھا تھا، کیونکہ اس وقت لوگوں کے خزانۂ معلومات میں اس کی صورت نہیں تھی۔

غرض خواب: خیالات (حدیث النفس) ہیں۔ اور یہ خیالات بیداری میں بھی آتے ہیں، مگر بیداری کی حالت میں چونکہ حواس خمسہ ظاہرہ اپنے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں: کان کچھ سنتے ہیں، آنکھیں کچھ دیکھتی ہیں، وقس علی ہذا اور ان سب چیزوں کا ادراک حس مشترک کرتی ہے، اسی طرح قوت متصرفہ کی کرشمہ سازی سے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں ان کا ادراک بھی حس مشترک کرتی ہے، اس وجہ سے حس مشترک ان خیالات میں پوری طرح سے مستغرق نہیں ہوتی، نیز بیداری میں یہ خیال بھی مستحضر رہتا ہے کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں وہ محض خیالات ہیں، اس وجہ سے وہ خیالات بیداری کی حالت میں متشکل ہوکر نگاہوں کے سامنے نہیں آتے، مگر جب آدمی سو جاتا ہے تو حواس اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اور قوت متصرفہ جو خیالات پکاتی

ہے، حس مشترک اس میں پوری طرح مستغرق ہوجاتی ہے اس لئے وہ خیالات متشکل ہوکر نظر آنے لگتے ہیں اور آدمی کو قطعا اس بات میں شک نہیں رہتا کہ مجھے جو کچھ نظر آرہا ہے وہ حقیقت ہے، خیالات نہیں۔

بعض مرتبہ بیداری کی حالت میں بھی جب آدمی مراقبہ کرتا ہے یا خیالات میں کھوجاتا ہے تو تصورات متشکل ہوکر نظر آنے لگتے ہیں، اور بہت سوں کو اس سے دھوکہ بھی ہوجاتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے بیداری کی حالت میں فلاں متوفی سے ملاقات کی، حالانکہ وہ محض خیالات ہوتے ہیں جو بیداری میں متشکل ہوتے ہیں۔

خیالات کے علاوہ مخصوص مزاجی کیفیت کی وجہ سے بھی بعض خاص قسم کے خواب نظر آتے ہیں مثلاً صفراوی مزاج آدمی خواب میں آگ اور گرمی دیکھتا ہے اور بلغمی مزاج آدمی پانی اور سردی دیکھتا ہے اور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوتا ہے کہ قوت خیالیہ میں جو کچھ واقعات اور معلومات جمع ہیں وہ خواب میں ایسی دردانگیز یا راحت افزا شکلیں اختیار کرتے ہیں، جو ان معلومات سے بھی ہم آہنگ ہوتی ہیں اور خواب دیکھنے والے کی مخصوص ذہنی کیفیات سے بھی مناسبت رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک چرواہا یہ خواب دیکھے گا کہ دوسرے چرواہے اکٹھا ہوکر اس پر ڈنڈا بجارہے ہیں یا وہ جنگلی پھل کھارہا ہے اور خوش ہورہا ہے۔ وہ یہ خواب نہیں دیکھے گا کہ کسی نے اس کو گولی مارکر ہلاک کردیا، یا وہ کسی مرصع دسترخوان پر چنیدہ میوے کھارہا ہے۔ ایسا خواب ایک شہری دیکھے گا۔

اور خواب دیکھنے والے کو اس بات کا ادراک کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے، خواب ہے اس وقت ہوتا ہے، جب وہ بیدار ہوتا ہے، بحالت خواب تو وہ اس کو حقیقت ہی سمجھتا ہے، اگر اس کی آنکھ نہ کھلے تو وہ کبھی بھی اس راز سے واقف نہیں ہوسکتا، اور عالم برزخ میں جو مجازات بصورت خواب ہوگی، اس خواب سے آدمی قیامت کی صبح تک بیدار نہیں ہوگا، اس لئے اس کو خواب کہنے کے بجائے عالم خارجی میں مجازات کہنا قرین صواب اور حقیقت حال کو زیادہ بہتر واشگاف کرنے والا ہے۔

[۲] وصنفٌ قريبُ المأخذ منهم، لكنهم أهل النوم الطبيعي، فأولئك تُصيبهم رؤيا؛ والرؤيا فينا حضورُ علومٍ مخزونةٍ في الحس المشترك؛ كانت مَسَكَةُ اليقظة تمنع عن الاستغراق فيها، والذهولِ عن كونها خيالاتٍ، فلما نام لم يَشُكَّ أنها عينُ ما هي صُوَرُها.

وربما يرى الصفراوي أنه في غِيْضَةٍ يابسة، في يوم صائف وسَموم، فبينما هو كذلك إذ فاجَأَتْهُ النارُ من كل جانب، فجعل يهرَب ولايجد مهربًا، ثم إنه لفحتْه، فقاسى ألما شديدًا؛ ويرى البلغمي أنه في ليلة شاتية، ونهرٍ باردٍ، وريح زمهريرية، فهاجت بسفينته الأمواجُ، فصار يهرب ولا يجد مهربا، ثم إنه غرق، فقاسى ألما شديداً؛ وإن أنت استقريت الناسَ لم تجد أحدًا إلا وقد جرّب من نفسه تَشَبُّحَ الحوادثِ المُجْمَعَةِ بتنعُّمات وتوجُّعات، مناسبة لها وللنفس الرائية جميعًا.

فهذا المبتلي في الرؤيا، غيرَ أنها رؤيا لايقظةَ منها إلى يوم القيامة، وصاحبُ الرؤيا لايعرف

فـي رؤيـاه: أنهـا لـم تكن أشياءَ خارجيةً،وأن التوجُّع والتنعُّم لم يكن في العالم الخارجي؛ ولولا يـقـظـةٌ لـم يتـنبـه لهـذا السر؛ فعسى أن يكون تسميةُ هذا العالم عالما خارجيا أحقَّ وأفصح من تسميته بالرؤيا، فربما يرى صاحب السَبُعية أنه يَخْدِشه سَبُع، وصاحبُ البخل أنه تنهشه حياتٌ وعقارب، ويتشبح نزول العلوم الفوقانية بملكين يسألانه: من ربك؟ وما دينك؟ وما قولك في النبي صلى الله عليه وسلم؟

ترجمہ: (۲)اور ایک (اور) قسم، جو صلاحیت میں پہلی قسم کے لوگوں کے قریب قریب ہیں، لیکن وہ فطری نیند والے ہیں، پس ان لوگوں کو خواب دکھائی دیتے ہیں ــــ اور خواب کی حقیقت ہمارے اندر حس مشترک میں بھرے ہوئے علوم کا ہمارے سامنے حاضر ہونا ہے، بیداری کی بندش اُن علوم میں مستغرق ہونے سے، اور ان کے خیالات ہونے سے بے ہوش (بے خبر) ہونے سے مانع بنی ہوئی تھی، پھر جب آدمی سو جاتا ہے تو اس کو اس میں کوئی تردد نہیں رہتا کہ نظر آنے والی وہ صورتیں حقیقۃً وہیں امور ہیں جن کی وہ صورتیں ہیں۔

اور صفراوی مزاج کبھی (خواب میں) دیکھتا ہے کہ وہ گرمی اور بادِ سموم کے دن میں کسی خشک بیابان میں ہے، پھر دریں اثنا کہ وہ اسی طرح ہوتا ہے، اچانک ہر چہار طرف سے اس کو آگ گھیر لیتی ہے، پس وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگتا ہے، مگر اسے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی، پھر آگ اس کو جلا ڈالتی ہے اور وہ اس سے سخت ترین تکلیف محسوس کرتا ہے ــــ اور بلغمی مزاج آدمی کبھی (خواب میں) دیکھتا ہے کہ وہ موسم سرما کی رات میں ٹھنڈی ندی میں سخت سرد ہوا میں ہے، پس موجیں اس کی کشتی کو مضطرب کرتی ہیں، پس وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگتا ہے، مگر اُسے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی، پھر وہ ڈوب جاتا ہے اور وہ اس سے سخت ترین تکلیف محسوس کرتا ہے ــــ اور اگر آپ لوگوں کا جائزہ لیں تو آپ کسی کو بھی نہیں پائیں گے مگر اس حال میں کہ اس نے ذاتی تجربہ کیا ہوگا، نفس میں اکٹھا ہونے والے واقعات کے متشکل ہونے کا، ایسی راحت انگیز اور دردناک صورتوں میں، جو ان واقعات سے اور خواب دیکھنے والے شخص سے، دونوں ہی سے مناسبت رکھنے والی ہیں۔

پس یہ شخص خواب میں معذَّب ہے، علاوہ ازیں کہ وہ ایسا خواب ہے، جس سے وہ شخص قیامت تک بیدار نہیں ہوگا، اور (دنیا میں) خواب دیکھنے والا دورانِ خواب یہ نہیں جانتا کہ وہ چیزیں جو وہ دیکھ رہا ہے ان کا خارج میں وجود نہیں اور نہ وہ یہ جانتا ہے کہ یہ تکلیف و راحت عالمِ خارجی میں موجود نہیں۔ اور اگر وہ شخص بیدار نہ ہو تو وہ اس راز سے کبھی بھی واقف نہ ہوگا، پس شاید عالمِ برزخ (کے خواب) کو عالمِ خارجی نام دینا زیادہ قابلِ قبول ہو، اس کو خواب کہنے سے، اور زیادہ اچھی طرح سے مراد کو ظاہر کرنے والا ہو ــــ پس درندہ خصلت آدمی کبھی (عالمِ برزخ میں) دیکھتا ہے کہ اس کو کوئی درندہ نوچ رہا ہے، اور بخیل آدمی دیکھتا ہے کہ اس کو سانپ بچھو ڈس رہے ہیں۔ اور بالائی علوم کا نزول ایسے دو فرشتوں کی شکل

میں متمثل ہوتا ہے جو اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ اور تیرا دین کیا ہے؟ اور نبی کریم ﷺ کی شان میں تو کیا کہتا ہے؟

لغات:

المَسَكَة: پانی روکنے کا بند، بندش، جمع مَسَكٌ، مُسُكٌ (ک) مَسَاكَة السِّقَاء: مشکیزہ کا پانی کو گرنے نہ دینا...... ذهِل (س) ذُهولاً: ہوش میں نہ رہنا...... الغَيْضة: جھاڑی، جنگل...... نَفَحَت (ف) النارُ: جھلس دینا...... خَدَشَه (ض) خَدْشًا: خراش لگانا...... نَهَشَه (ف، ض) نَهْشًا: اگلے دانتوں سے کاٹنا، دانت سے کاٹ کر نشان لگانا۔

تشریح:

(۱) معلومات حس مشترک کے خزانہ میں یعنی خیال میں بھری ہوئی ہوتی ہیں، حس مشترک کا کام حواس ظاہرہ کی حاصل کی ہوئی صورتوں کو قبول کرنا ہے، پھر جب محسوسات حواس ظاہرہ کے سامنے سے غائب ہوجاتے ہیں تو حس مشترک ان کی صورتوں کو اپنے خزانہ میں جمع کر دیتا ہے، تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں اور حس مشترک کے خزانہ کا نام ''خیال'' ہے۔ مزید تفصیل معین الفلسفہ ص۱۴۳ میں دیکھیں۔

(۲) عينُ ماهي صُوَرُها یعنی خیالات ان چیزوں کا عین ہیں جن کی وہ صورتیں ہیں۔ مثلاً خواب میں اپنی بھینسوں کا خیال آتا ہے تو وہ خیال متشکل ہوکر سامنے آتا ہے اور آدمی خواب میں ان کو خیالات نہیں سمجھتا بلکہ اپنی واقعی بھینسیں سمجھتا ہے۔

(۳) صفراء مؤنث اَصْفر کا: پتہ جو ایک خِلط ہے، جس کی زیادتی سے یرقان ہوتا ہے۔

(۴) المجمَعة اسم مفعول ہے، بمعنی خیال میں اکٹھا حوادث۔

(۵) هذا المبتلى فى الرؤيا مبتدا خبر ہیں، جیسے هذا المال لزيد۔ فى الرؤيا متعلق عام كائنٌ یا ثابتٌ سے متعلق ہوکر خبر ہے یہ ترکیب مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے، اور اسی ترکیب کو پیش نظر رکھ کر او پر مطلب بیان کیا گیا ہے۔

(۶) أشياءَ خارجية تمام نسخوں میں اسماءَ خارجية ہے، مگر یہ تصحیف ہے، صحیح لفظ أشياءَ ہے۔ یہ تصحیح بھی مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اور تینوں مخطوطوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

(۷) نزول العلوم تمام نسخوں میں زوال العلوم ہے، مگر یہ بھی تصحیف ہے صحیح لفظ نزول ہے اور یہ تصحیح بھی حضرت علامہ عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے اور اتنی اہم تصحیح ہے کہ شاید کوئی دوسرا شخص نہ کر سکے اور مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ پٹنہ میں بھی یہی ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

نزول العلوم کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے آسمان سے دین نازل کیا ہے اور علوم دینیہ کا فیضان کیا ہے

تاکہ لوگ اس کے ذریعہ عالم بالا کا یقین کریں اس لئے عالم برزخ میں پہنچتے ہی امتحان داخلہ ہوتا ہے اور تین بنیادی باتیں دریافت کی جاتی ہیں، جن پر نجات کا مدار ہے یہ سوالات یہ جاننے کے لئے کئے جاتے ہیں کہ میت ان بنیادی باتوں کا علم دنیا سے لے کر آئی ہے یا خالی ہاتھ آئی ہے۔ کیونکہ بعد میں تو یہ سب علوم عالم بالا سے نازل ہونے والے ہی ہیں، مگر ان کی وجہ سے نجات نہیں ہوسکتی۔ سورۂ یونس آیت ۹۱ میں فرعون کے قصہ میں ہے ﴿آلْــئٰـنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ، وَكُنْتَ مِنَ الْـمُـفْسِـدِيْنَ﴾ ترجمہ: اب ایمان لاتا ہے اور (معائنۂ آخرت سے) پہلے سرکشی کرتا رہا، اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے!) یہ بات کیسے ممکن ہے!

تیسری قسم

کمزور قوتِ ملکیہ اور بہیمیہ والوں کی مجازات

جن لوگوں کی قوت بہیمیہ اور قوت ملکیہ دونوں کمزور ہوتی ہیں، وہ اگر نیک لوگ ہوتے ہیں تو مرنے کے بعد ملائکہ سافلہ کے ساتھ مل جاتے ہیں، اور اس ملنے پر جو خوشی ہوتی ہے، وہی ان کے اعمال صالحہ کی جزاء ہے۔ ارشاد ربانی ہے ﴿فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ﴾ پس تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہوجا (یہ بھی نعمت روحانی ہے) اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو آنحضور ﷺ نے ایک لمبی دعا سکھلائی ہے، اس کا ایک جزء ہے إنك أنـت وَلِيِّـى فـى الدنيـا والآخـرة، توفنى مسلمًا وأَلْـحِقْنِىْ بالصالحين (مسند احمد ۵:۱۹۱) ترجمہ: بیشک آپ ہی میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، مجھے بحالت ایمان واطاعت موت دیجئے اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دیجئے —— اس دعا میں بھی اُس الحاق کی طرف اشارہ ہے۔

اور اگر وہ برے لوگ ہوتے ہیں تو مرنے کے بعد شیاطین کے ساتھ مل جاتے ہیں، اور اس ملنے پر جو گھٹن اور غم وغصہ ہوتا ہے وہی ان کے اعمال سیئہ کی سزا ہے۔ سورۃ النساء آیت ۳۸ میں ہے ﴿وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطَانُ لَهٗ قَرِيْناً فَسَآءَ قَرِيْناً﴾ (اور شیطان جس کا مصاحب ہوا، اس کا وہ برا مصاحب ہے) یہ مصاحبت عام ہے دنیا میں بھی ہوتی ہے اور موت کے بعد بھی۔ اور یہ ملنا فطری اسباب سے بھی ہوتا ہے، اور اکتسابی اسباب سے بھی، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ملائکہ سے ملانے والے فطری اسباب: قوت ملکیہ کا قوت بہیمیہ میں کم سے کم ڈوبنا، اس کی تابعداری نہ کرنا اور اس سے متاثر نہ ہونا۔

ملائکہ سے ملانے والے اکتسابی اسباب: تبعی تقاضے سے پاکیزگی کے ساتھ متصف رہنا، اور اعمال واذکار کے ذریعہ نفس میں ملکوتی الہامات اور انوار کی قابلیت پیدا کرنا۔

شیاطین سے ملانے والے فطری اسباب: مزاج کا ایسا بگڑ جانا کہ وہ ایسی باتوں کو چاہے جو حق کے برخلاف اور مفادِ کلی سے متضاد ہوں اور مکارمِ اخلاق سے کوسوں دور ہوں۔

شیاطین سے ملانے والے اکتسابی اسباب: خسیس ہیئتوں اور فاسد خیالات کے ساتھ متلبس رہنا، شیاطین کے وسوسوں کی تابعداری کرنا اور لعنت کا ان کو گھیر لینا۔

مثال سے وضاحت: کبھی انسان لڑکے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے مگر اس کے مزاج میں ہیجڑا پن اور زنانی حرکات کی طرف میلان ہوتا ہے مگر بچپن میں زنانی اور مردانی خواہشات ممتاز نہیں ہوتیں، کیونکہ اس وقت کھیل کود اور کھانے پینے سے فرصت نہیں ہوتی، اُس بچہ کو جس روش پر چلنے کا حکم دیا جاتا ہے چلتا رہتا ہے، مگر جب وہ جوان ہوتا ہے اور وہ اپنی لااُبالی فطرت کی طرف لوٹتا ہے تو وہ زنانہ لباس پہن لیتا ہے اور عورتوں کی سی عادتیں اپنا لیتا ہے اور اس میں مفعولیت کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ مردوں کے زمرے سے نکل کر عورتوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح انسان جب تک زندہ رہتا ہے دنیوی زندگی کے جھمیلوں میں گھرا رہتا ہے، مگر اس میں صلاحیتیں ملأ سافل جیسی ہوتی ہیں، وہ ان کی طرف بہت زیادہ کشش رکھتا ہے یا وہ شیطان صفت ہوتا ہے، اس کو شیاطین سے بے حد مناسبت ہوتی ہے اس لئے جب وہ مرجاتا ہے اور موانع مرتفع ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی فطرت کی طرف لوٹ جاتا ہے، اگر وہ نیک ہوتا ہے تو فرشتوں کے ساتھ مل جاتا ہے اور اس کو ملائکہ جیسے الہامات ہونے لگتے ہیں اور وہ ان کاموں میں لگ جاتا ہے جو فرشتے کرتے ہیں اور بدکردار ہوتا ہے تو شیاطین کے ساتھ مل جاتا ہے۔ حدیث شریف میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا جنت میں فرشتوں کے ساتھ اڑنا مروی ہے۔ یہ حدیث ترمذی طبرانی اور حاکم وغیرہ نے روایت کی ہے اور مشکوٰۃ شریف باب مناقب اہل بیت، فصل ثانی حدیث نمبر ۶۱۵۳ پر مذکور ہے۔ یہ روایت حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ملأ اعلیٰ کے ساتھ ملنے کی طرف مشیر ہے۔ اور تقابل سے دوسری قسم کے لوگوں کا شیاطین کے ساتھ ملنا مفہوم ہوتا ہے۔

ملائکہ سے ملنے والوں کے بعض احوال:

(۱) کبھی وہ لوگ اعلائے کلمۃ اللہ میں، اور حزب اللہ کی مدد کرنے میں مشغول ہوتے ہیں، مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی رحمہ اللہ نے نعمۃ اللہ السابغہ ترجمہ حجۃ اللہ البالغہ (ص ۱۱۱) میں لکھا ہے کہ جب روم اور روس میں سپاسٹوں کے قلعہ پر لڑائی ہوئی تو بہت سے اہل اللہ نے تہجد کے وقت مسجد نبوی میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو تیر مارتے دیکھا، چنانچہ اسی روز صبح کو لشکر اسلام غالب آیا۔

(۲) کبھی وہ کسی انسان کو کچھ خیر پہنچاتے ہیں، بہت سے واقعات مروی ہیں کہ آڑے وقت میں کوئی نیک بندہ جو دنیا سے گزر چکا ہے، ظاہر ہوتا ہے اور مدد کرتا ہے۔

(۳) کبھی ان میں سے کوئی بندہ صورتِ جسمانی کا بے حد مشتاق ہوتا ہے اور یہ اشتیاق فطری ہوتا ہے پس عالم

مثال کی مدد سے اس کو نورانی جسم ملتا ہے۔

(۴) کبھی ان میں سے کسی کو کھانے وغیرہ کی خواہش ہوتی ہے تو ان کا یہ شوق بھی پورا کیا جاتا ہے۔ سورۃ آل عمران آیات ۱۶۹ و ۱۷۰ میں شہدا کے بارے میں ہے کہ وہ ان کے پروردگار کے پاس روزی دیئے جاتے ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو ان کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرماتے ہیں اور مسلم شریف میں اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ شہدا کی روحیں ہرے پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں، وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں چرتی چگتی ہیں اور وہ عرش سے بندھی ہوئی فانوسوں میں بسیرا کرتی ہیں (مشکوۃ کتاب الجہاد حدیث نمبر ۳۸۰۴)

شیاطین سے ملنے والوں کے بعض احوال:

(۱) وہ ظلمانی (تاریک، سیاہ) لباس پہنائے جاتے ہیں۔

(۲) ان کے لئے ایسی چیزیں متشکل کی جاتی ہیں جن سے وہ خسیس لذتوں میں سے بعض حاجات پوری کرتے ہیں جیسے جہنمیوں کو زقوم پیپ اور لہو کھانے کو دیا جائے گا اور حمیم پینے کو، اسی طرح عالم برزخ میں بھی انکی حاجت روائی کی جاتی ہے۔

[۳] وصنفٌ بهيميتُهم وملكيتُهم ضعيفتان، يَلحقون بالملائكة السافلة، لأسباب جبليةٍ: بأن كانت ملكيتهم قليلةَ الا نغماس في البهيمية، غيرَ مذعنةٍ لها، ولا متأثرة منها، وكَسْبيَّةٍ: بأن لابستِ الطهاراتِ بداعية قلبية، ومكّنت من نفسها لإلهاماتٍ وبوارقَ ملكيةٍ.

فكما أن الإنسان ربما يُخلق في صورة الذُّكران، وفي مزاجه خُنُوثة وميلٌ إلى هيئات الإناث، لكنه لايتميز شهواتُ الأنوثة من شهوات الذكورة في الصِّبا؛ إنما المُهِمُّ حينئذ شهوةُ الطعام والشراب وحب اللعِب، فيجرى حسبما يؤمر به من التوسُّم بِسَمْتِ الرجال، ويمتنعُ عمايُنهي عنه من اختيار زِيِّ النساء، حتى إذا شَبَّ ورجع إلى طبيعته الماجنة، اسْتَبَدَّ باختيار زِيِّهِنَّ، والتعوُّد بعاداتهن، وغلبت عليه شهوةُ الأُبْنَة، وفعلَ مايفعله النساءُ، وتكلم بكلامهن، وسمى نفسَه تسميةَ الأنثى؛ فعند ذلك خرج من حَيِّز الرجال بالكلية.

فكذلك الإنسان قد يكون في حياته الدنيا مشغولاً بشهوة الطعام والشراب والغُلْمة وغيرها من مقتضَيات الطبيعة والرسم، لكنه قريبُ المأخذ من الملأ السافل، قويُّ الانجذاب إليهم؛ فإذا مات انقطعت العلاقاتُ، ورجع إلى مزاجه، فلحق بالملائكة وصار منهم، وأُلهم كإلهامهم، وسعى فيما يسعون فيه؛ وفي الحديث: ﴿رأيتُ جعفر بن أبي طالب ملَكًا يطير في الجنة مع الملائكة بجناحين﴾

وربما اشتغل هؤلاء بإعلاء كلمة الله، ونصرِ حزب الله؛ وربما كان لهم لَمَّةُ خيرٍ بابن آدم؛

وربـمـا اشتـاق بعضُهم إلى صورة جسدية اشتياقا شديدا، ناشئًامن أصلِ جبلته، فقَرَعَ ذلك بابًا مـن الـمثال، واختلطت قوة مـنـه بـالـنسـمة الهوائية، وصار كالجسد النوراني؛ وربما اشتاق بعـضهـم إلـى مـطـعوم ونحوه، فأُمِدَّ فيـمـا اشتهـى، قـضـاءً لشـوقـه؛ وإليـه الإشارة في قولـه تـعالى: ﴿وَلَاتَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا، بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ، فَرِحِيْنَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ الآية.

وبازاء هؤلاء قوم قريب المأخذ من الشياطين جبلةً: بأن كان مزاجهم فاسدًا يستوجب آراءً مـنـاقـضـةً لـلـحـق، مـنـافرةً للرأى الكلي، على طرف شاسع من محاسن الأخلاق؛ وكَسْبًا: بأن لابست هيئاتٍ خسيسةً، وأفكارًا فاسدةً، وانقادت لوسوسة الشياطين، وأحاط بهم اللعنُ؛ فإذا ما توا لَحِقوا بالشياطين، وأُلبسوا لباسًا ظلمانيًا، وصُوِّر لهم مايقضون به بعضَ وطرهم من المَلَاذِّ الخسيسة.

والأول ينـعَّـم بـحـدوث ابتهـاج فـي نـفسه، والثاني يعذَّب بضيق وغم، كالمخنث يعلم أن الخُنوثة أسوأحالاتِ الإنسان، ولكن لايستطيع الإقلاع عنها.

ترجمہ: (۳) اور ایک (اور) قسم جن کی قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ دونوں کمزور ہوتی ہیں، وہ لوگ (اگر نیک ہوتے ہیں تو) ملائکہ سافلہ کے ساتھ مل جاتے ہیں، فطری اسباب کی بناء پر: بایں طور کہ ان کی قوت ملکیہ، قوت بہیمیہ میں کم ڈوبنے والی ہو، بہیمیت کی تابعداری کرنے والی نہ ہو، نہ اس سے متاثر ہونے والی ہو —— اور اکتسابی اسباب کی بناء پر، بایں طور کہ نفس کا قلبی تقاضے سے پاکیزگی کے ساتھ تعلق رہا ہو، اور آدمی نے اپنے نفس کو الہامات اور ملکی انوار کے قابل بنایا ہو۔

پس جس طرح یہ بات ہے کہ کبھی انسان مردانی صورت میں پیدا کیا جاتا ہے، اور اس کے مزاج میں ہیجڑاپن اور عورتوں کے اطوار کی طرف میلان ہوتا ہے، مگر بچپن میں زنانی خواہشات، مردانی خواہشات سے ممتاز نہیں ہوتیں، اس وقت اہم چیز کھانے پینے کی خواہش اور کھیل کود کی محبت ہوتی ہے، اس لئے وہ بچہ جس طرح مردوں کی روش اپنانے کا حکم دیا جاتا ہے، چلتا رہتا ہے، اور اس کو زنانہ پوشاک اختیار کرنے سے روکا جاتا ہے تو وہ باز رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ جوان ہو جاتا ہے اور وہ اپنی لااُبالی طبیعت کی طرف لوٹ جاتا ہے تو وہ عورتوں کی پوشاک اختیار کرنے میں، اور ان کی عادتیں اپنانے میں خودمختار ہو جاتا ہے، اور اس پر مفعولیت کی خواہش غالب آجاتی ہے اور وہ عورتوں جیسے کام کرنے لگتا ہے، اور ان کے انداز پر بولنے لگتا ہے، اور اپنا نام عورتوں جیسا رکھ لیتا ہے، پس اس وقت وہ مردوں کے زمرہ سے بالکل نکل جاتا ہے۔

پس اسی طرح انسان کبھی اپنی دنیوی زندگی میں، کھانے پینے اور شہوت وغیرہ، فطرت وعادت کے تقاضوں میں

مشغول رہتا ہے مگر وہ صلاحیت کے اعتبار سے ملأ سافل کے لگ بھگ ہوتا ہے، اور وہ ان کی طرف بہت زیادہ کشش رکھتا ہے، پس جب وہ مرجاتا ہے تو موانعات مرتفع ہوجاتے ہیں، اور وہ اپنے مزاج کی طرف لوٹ جاتا ہے تو فرشتوں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اور انہیں میں سے ہوجاتا ہے اور انہی جیسے الہامات کیا جاتا ہے، اور ان کاموں میں لگ جاتا ہے جو وہ فرشتے کرتے ہیں، اور حدیث میں آیا ہے کہ میں نے جعفر رضی اللہ عنہ کو بصورت فرشتہ، جنت میں فرشتوں کے ساتھ دو پروں سے اڑتے دیکھا ہے۔

اور کبھی یہ لوگ اعلائے کلمۃ اللہ میں اور حزب اللہ (اللہ کی جماعت) کی مدد کرنے میں مشغول ہوتے ہیں، اور کبھی وہ حضرات کسی انسان کو کچھ خیر پہنچاتے ہیں، اور کبھی ان میں سے کوئی صورت جسمانی کا بے حد مشتاق ہوتا ہے، جو ان کی فطرت کی جڑ سے پیدا ہونے والا ہوتا ہے تو وہ اشتیاق عالم مثال کا ایک دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، اور عالم مثال کی ایک قوت روح ہوائی (نسمہ) کے ساتھ مل جاتی ہے، اور وہ نورانی جسم سی بن جاتی ہے۔ اور کبھی ان میں سے کوئی کھانے وغیرہ کی خواہش کرتا ہے، پس اس کے شوق کو پورا کرنے کے لئے اس کی خواہش میں کمک پہنچائی جاتی ہے، اور اس کی طرف اس ارشاد باری میں اشارہ آیا ہے: ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو، بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں، ان کے پروردگار کے پاس، روزی دیئے جاتے ہیں، وہ خوش ہوتے ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے'' (آخر آیت تک پڑھیے)

اور ان لوگوں کے بالمقابل ایک اور قسم کے لوگ ہیں، جو صلاحیت کے اعتبار سے شیاطین سے لگ بھگ ہوتے ہیں، فطری طور پر: اس طرح کہ ان کا مزاج ایسا فاسد ہوتا ہے، جو ایسی باتیں لازم جانتا ہے جو حق کے برخلاف ہوں، جو مفاد کلی سے متضاد ہوں، جو مکارم اخلاق سے کوسوں دور ہوں —— اور اکتسابی طور پر: اس طرح کہ وہ خسیس حالتوں سے اور فاسد خیالات سے تعلق رکھتے ہوں اور شیاطین کے وسوسوں کی تابعداری کرتے ہوں اور لعنت نے ان کو گھیر لیا ہو پس جب وہ مرجاتے ہیں تو شیاطین کے ساتھ مل جاتے ہیں اور وہ ظلمانی (تاریک) لباس پہنائے جاتے ہیں، اور ان کے لئے بعض وہ چیزیں متصور کی جاتی ہیں جن کے ذریعہ وہ خسیس لذتوں میں سے اپنی کچھ حاجات پوری کرتے ہیں۔

اور قسم اول کے لوگ ان کے دل میں خوشی پیدا کرنے کے ذریعہ راحتیں پہنچائے جاتے ہیں، اور قسم دوم کے لوگ گھٹن اور غصہ کے ذریعہ تکلیف پہنچائے جاتے ہیں، جیسے ہیجڑا جانتا ہے کہ ہیجڑا پن انسان کی بدترین حالت ہے، مگر وہ اس سے باز نہیں آسکتا۔

لغات:

مکَّن من الشیئ: قدرت دینا، جمنے دینا، جماؤ دینا...... تَوَسَّم بہ: علامت بنانا، پہچان بنانا...... السمت: راستہ اور اہل خیر وصلاح کی ہیئت، جیسے مَا أَحْسَنَ سَمْتُ فلانٍ: فلاں کی حالت کس قدر اچھی ہے...... مَجَنَ (ن) مُجُوْنًا:

مخول کرنا، بے حیا ہونا صفت مَــاجِــنٌ...... الأبــنة کے اصل معنیٰ ہیں نیزہ کی لکڑی میں گانٹھ، یعنی عیب، یہاں مراد مفعولیت کی بری عادت ہے...... الغُلمة: شہوت غَلِمَ (س) غَـلَـمًا و غُلمة و اغتلم: شہوت پرست ہونا...... اللَّمَّة: کچھ اثر، جیسے اصابَتهُ لَمّة من الجن یعنی اس کو جنات کا کچھ اثر پہنچا...... مَلاذّ جمع مَلَذّ کی بمعنی لذتیں۔

تصحیح: یمتنع عما یُنهی اصل میں یتمنَّع عما یُنهی تھا تَمنَّع عن الشیئ کے معنی ہیں رکنا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی وپٹنہ سے کی گئی ہے۔

تشریح:

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ: آنحضور ﷺ کے چچازاد بھائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی ہیں اور ان سے دس سال بڑے ہیں، قدیم الاسلام ہیں، چھبیسویں نمبر پر اسلام قبول کیا ہے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی آپ ہی کے دست مبارک پر حبشہ کے بادشاہ نجاشی رحمہ اللہ نے اسلام قبول کیا تھا، فتح خیبر کے موقعہ پر مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے بعد افضل الناس حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ہیں۔ جمادی الاولی ۸ھ میں ملک شام میں غزوۂ موتہ میں چالیس سال کی عمر میں، اسی سے زیادہ زخم کھا کر شہادت پائی۔ جنگ میں آپ کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض میں دو پر عنایت فرمائے، جن سے جہاں چاہیں اڑ کر تشریف لے جاتے ہیں، اس لئے جعفر طیار کہلاتے ہیں غریبوں کے بہت ہمدرد تھے، حضور ان کو ابوالمساکین کہا کرتے تھے، آنحضور ﷺ سے اخلاق اور حلیہ میں بہت زیادہ مشابہ تھے۔

چوتھی قسم

قوی بہیمیت اور ضعیف ملکیت والوں کی مجازات

جن لوگوں کی قوت بہیمیہ قوی اور قوت ملکیہ ضعیف ہوتی ہے، اور دونوں قوتوں میں باہم مصالحت وموافقت ہوتی ہے ـــــ اور دنیا میں بیشتر لوگ اسی قسم کے ہیں ـــــ ان کے اکثر معاملات اس دنیا میں نسمہ (روح حیوانی) کے تابع ہوتے ہیں۔ نسمہ کا جسم پر راج ہے، بدن سے اس کا تدبیری تعلق ہے، وہ بدن میں ہر قسم کا تصرف کرتا ہے، اور بدن کے روئیں روئیں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کا جسم سے اس قدر قوی تعلق ہے کہ موت کے وقت بھی وہ تعلق بالکلیہ ختم نہیں ہوتا، صرف تدبیری طور پر ختم ہوتا ہے۔ اور وہمی اور خیالی تعلق باقی رہتا ہے۔

یہ لوگ جب مرجاتے ہیں تو ان پر دوسری دنیا کی ہلکی سی روشنی چمکتی ہے، اور معمولی سے خیالات آنے لگتے ہیں، اور

عالم قبر میں مجازات کی شکلیں کبھی خیالی صورتوں میں اور کبھی مثالی صورتوں میں متحقق ہونی شروع ہوتی ہیں، اگر دنیا میں ان کا ملکوتی اعمال سے تعلق رہا ہے تو وہ ملکیت کے موافق اعمال بوقت نزع یا قبر میں ایسے خوبصورت فرشتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں ریشم ہوتا ہے، وہ نرم لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، وہ ایسے خوبصورت ہوتے ہیں کہ ان کی دید ہی ہزار نعمتیں ہوتی ہے، وہ جنت کی طرف ایک دروازہ وا کردیتے ہیں، جس سے جنت کی خوشبوئیں آنے لگتی ہیں ـــــ اور اگر ان لوگوں کا تعلق ملکیت کے برخلاف کاموں سے رہا ہوتا ہے، یا وہ موجب لعنت کام کرتے رہے ہیں تو یہ ملکیت کے ناموافق اعمال بوقت نزع یا قبر میں ایسے بدنما، سیاہ فرشتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں جن کے ہاتھوں میں بدبودار ٹاٹ ہوتا ہے، وہ درشت لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، اور ان کی صورت ایسی مکروہ ہوتی ہے کہ ان کی دید ہی بذات خود ایک عذاب ہوتی ہے ـــ الغرض کچھ ملائکہ اسی کام کے لئے ہیں۔ ان کی فطری صلاحیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو ایسے مواقع پر مقرر کیا جائے، اور وہ سزا دہی یا راحت رسانی کا فریضہ انجام دیں۔ ان ملائکہ کو اہل قبور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، گو وہ دنیا والوں کو نظر نہ آئیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ روح ہوائی (نسمہ) کا بدن سے تدبیری تعلق ہوتا ہے، جیسے بادشاہ کا ملک سے تدبیری تعلق ہے۔ اور روح حیوانی (نسمہ) کی وجہ سے بدن کو تین امتناعات حاصل ہوتے ہیں، یعنی امتناع تخریب، امتناع توریث اور امتناع تزویج، جب تک نسمہ کا بدن سے تدبیری تعلق باقی رہتا ہے، اس کا بدن گلتا سڑتا نہیں، خواہ کتنا ہی عرصہ آدمی بے ہوش رہے، بدن صحیح سلامت رہتا ہے، اور اس کے مال کے مالک ورثاء نہیں ہوتے، مال بدستور اس کی ملکیت میں رہتا ہے۔ اور اس کی ازواج سے کوئی نکاح نہیں کرسکتا، وہ بدستور اس کے نکاح میں رہتی ہیں۔ اور جب روح حیوانی بدن سے جدا ہوجاتی ہے تو یہ تینوں امتناعات ختم ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ مدبر بدن باقی نہیں رہا، بدن سڑنے لگتا ہے، مال کے ورثاء مالک ہوجاتے ہیں اور بیوی عدت کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کرسکتی ہے۔ جیسے بادشاہ جب تک موجود ہوتا ہے، ملک پُر اَمن رہتا ہے اور اگر بادشاہ مرجائے اور کوئی اس کا قائم مقام نہ ہو، تو ملک کا امن وامان درہم برہم ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے بادشاہ کی وفات کے بعد پہلے قائم مقام کا اعلان کیا جاتا ہے، پھر بادشاہ کی موت کا اعلان کیا جاتا ہے۔

غرض موت سے نسمہ کا بدن سے تدبیری تعلق ختم ہوجاتا ہے، مگر وہمی یعنی خیالی تعلق باقی رہتا ہے، جیسے ٹیلیفون کا بے شمار نمبروں سے بیک وقت تعلق ہوتا ہے۔ یہ وہمی تعلق کی مثال ہے، جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

اس چوتھی قسم کے لوگوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ روح اور جسم کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں اگر جسم کو روندا جائے یا کاٹا جائے تو وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ معاملہ روح کے ساتھ کیا گیا، بلکہ وہ جسم کو اصل سمجھتے ہیں اور روح کو بدن کا عین سمجھتے ہیں جیسے معتزلہ صفات باری کو عین باری تعالیٰ سمجھتے ہیں، یا روح کو ایک عارضی چیز سمجھتے ہیں، جیسے خوشی، غمی انسان کو عارض ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ روح کو بھی ایک عرض خیال کرتے ہیں، جو اجسام پر طاری ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ زبان سے اساتذہ

کی تقلید میں یا معاشرہ کی ریت اور قوم کے مسلمات کے پیش نظر اس کے خلاف کہیں، یعنی یہ کہیں کہ انسان درحقیقت روح کا نام ہے، اور بدن تو محض روح کی سواری ہے، مگر ان کے دل کی تھاہ میں وہی عقیدہ ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان درحقیقت روح کا نام ہے، اور بدن اس روح کی سواری ہے، بعض مرتبہ حوادث میں جسم کا کافی حصہ ضائع ہوجاتا ہے، مگر آدمی بدستور باقی رہتا ہے، اسی طرح جب آدمی مرجاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ گزر گیا، حالانکہ جسم گھر میں موجود ہے، جب آدمی کا انتقال ہوگیا یعنی دوسری جگہ منتقل ہوگیا تو یہ جسم کیا ہے؟ لوگ اس کو لاش کہتے ہیں یہ لفظ لَاشَیْءٌ کا مخفف ہے یعنی یہ جسم کچھ بھی نہیں۔

غرض حقیقت حال تو یہ ہے مگر عام لوگ روح اور بدن میں فرق نہیں کرتے، وہ دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، یہ سب چوتھی قسم کے لوگ ہیں، اور انہی کی مجازات کا بیان چل رہا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عالم (جہاں) دو ہیں، ایک ہمارا یہ جہاں، جہاں ہم اس وقت ہیں، دوسرا وہ جہاں، جہاں ہم قیامت کے بعد منتقل ہوں گے، جہاں جنت اور جہنم ہیں، یہ دونوں جہاں فی الحال موجود ہیں۔ اور ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، اور جب دو مکان ہوتے ہیں تو ان کے درمیان حد فاصل بھی ہوتی ہے۔ جس کا نام عالم برزخ اور عالم قبر ہے۔ یہ حد فاصل طرفین کے احکام کا مجموعہ ہوتی ہے، جیسے دھوپ اور سایہ کے درمیان ایک نقطۂ اشتراک ہے، جس میں سایہ کے بھی احکام ہوتے ہیں، اور دھوپ کے بھی —— نیز حد فاصل کوئی مستقل چیز نہیں ہوتی، طرفین کا مجموعہ ہوتی ہے، البتہ طرفین میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ عالم برزخ کا بھی ہماری اس دنیا سے قریبی تعلق ہے، وہ اسی دنیا کا بقیہ اور ضمیمہ ہے، اس لئے وہاں عالم آخرت کے احکام بہت خفیف ظاہر ہوتے ہیں، جیسے شکم مادر کی زندگی عالم ارواح اور ہمارے اس عالم اجساد کے درمیان ایک برزخی زندگی ہے، مگر شکم مادر کی یہ زندگی عالم ارواح کا بقیہ (آخری حصہ) نہیں ہے، بلکہ ہمارے اس عالم اجساد کا ابتدائی حصہ ہے، اس وجہ سے عالم ارواح کے احکام وہاں بس برائے نام ظاہر ہوتے ہیں، وہاں پورے احکام ہماری اس دنیا کے ظاہر ہوتے ہیں، ماں جو کچھ کھاتی پیتی ہے، اوڑھتی پہنتی ہے، پڑھتی سوچتی ہے، اس سب کے اچھے برے اثرات جنین پر پڑتے ہیں۔ البتہ یہاں کے پورے احکام وہاں ظاہر نہیں ہوتے، بچہ براہ راست غذا نہیں لے سکتا —— اسی طرح عالم برزخ بھی دو جہانوں کے درمیان کی آڑ ہے اور وہ اس دنیا کا بقیہ یعنی ضمیمہ ہے اس لئے عالم آخرت کے احکام وہاں ہلکے ظاہر ہوتے ہیں، اسی کو روایات میں جنت وجہنم کی طرف دریچے کھولنے سے تعبیر کیا ہے اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اسی کو ''پردہ کے پیچھے سے علوم ٹپکنے'' سے تعبیر کیا ہے۔

عالم برزخ اور عالم آخرت میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جس طرح ہماری اس دنیا میں انفرادی احکام —— جو ہر ہر فرد کے ساتھ مختص ہیں —— ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح عالم برزخ میں بھی انفرادی احکام ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ عالم اسی عالم کا بقیہ ہے اور قیامت کے دن اور اس کے بعد نوعی احکام ظاہر ہوں گے۔ سورۃ یٰس آیت ۵۹ میں ہے ﴿وَامْتَازُوا

﴿الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (اور اے مجرمو! آج (اہل ایمان سے) الگ ہو جاؤ) کیونکہ اہل ایمان کو جنت میں بھیجنا ہے اور مجرموں کو دوزخ میں۔ سورۂ مریم آیت ۸۵ میں ہے ﴿یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا﴾ (جس دن ہم متقیوں کو رحمان کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے) اور سورۃ الزمر آیت ۷۱ میں ہے: ''جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جائیں گے''۔ اور آیت ۷۳ میں ہے: ''جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے، وہ گروہ گروہ بنا کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے'' ـــــــ ان آیات میں اشارہ ہے کہ قیامت میں اور اس کے بعد مجموعی احکام ظاہر ہوں گے، انفرادی احکام باقی نہیں رہیں گے، جیسے امتحان ہر طالب عالم کا الگ الگ لیا جاتا ہے، جوابات بھی الگ الگ جانچے جاتے ہیں، نمبرات بھی الگ الگ دیئے جاتے ہیں، مگر جب نتیجہ امتحان کا فیصد نکالا جاتا ہے تو مجموعہ کا لحاظ کر کے کہا کرتے ہیں کہ اتنے فیصد کامیاب ہوئے اور اتنے فیصد ناکام۔ اس کی مزید تفصیل اگلے باب میں آرہی ہے۔

[٤] وصنفٌ هم أهل الاصطلاح: قويةٌ بهيميتُهم، ضعيفةٌ ملكيتهم؛ وهم أكثر الناس وجودًا، يكون غالبُ أمورهم تابعًا للصورة الحيوانية، المجبولةِ على التصرف في البدن، والانغماس فيه، فلايكون الموتُ انفكاكا لنفوسهم عن البدن بالكلية، بل تَنْفكُّ تدبيرًا، ولاتنفك وهمًا، فتعلم علمًا مؤكَّدًا ـــــ بحيث لايخطر عندها إمكان مخالفه ـــــ أنها عينُ الجسد، حتى لو وُطئ الجسدُ، أو قُطع، لأيقنت أنه فُعل ذلك بها؛ وعلامتُهم: أنهم يقولون من جذر قلوبهم: أن أرواحهم عينُ أجسادهم، أو عرضٌ طارٍ عليها، وإن نطقت ألسنتُهم لتقليد أو رسم خلافَ ذلك.

فأولئك إذا ماتوا برق عليهم بارقٌ ضعيف، وتراءى لهم خيالٌ طفيف، مثلُ مايكون هنا للمرتاضين، وتتشبح الأمور في صُوَرٍ خيالية تارة، ومثاليةٍ خارجية أخرى، كما قد تتشبح للمرتاضين؛ فإن كان لابس أعمالاً ملكيةً دُسَّ علمُ الملايمة في أشباح ملائكةٍ حسان الوجوه، بأيديهم الحريرُ، ومخاطباتٍ وهيئاتٍ لطيفة، وفُتح بابٌ إلى الجنة، تأتي منه روائحها؛ وإن كان لابس أعمالاً منافرة للملكية، أو جالبةً لِلَّعْنِ، دُسَّ علمُ ذلك في أشباح ملائكةٍ سُود الوجوه، ومخاطباتٍ وهيئات عنيفةٍ، كما قد يُدَسُّ الغضبُ في صورة السباع، والجبنُ في صورة الأرنب.

وهنالك نفوس ملكية استوجبَ استعدادُهم أن يُوَكَّلُوا بمثل هذه المواطن، ويُؤمروا بالتعذيب أو التنعيم، فيراهم المبتلى عيانا، وإن كان أهل الدنيا لايرونهم عيانا.

واعلم أنه ليس عالم القبر إلا من بقايا هذا العالم، وإنما يترشح هنالك العلوم من وراء حجاب؛

وإنـمـا تـظهـر أحـكامُ النفوس المختصةُ بفرد دون فرد بخلاف الحوادث الحشرية، فإنها تظهر عليها، وهى فانية عن أحكامها الخاصة بفرد فرد، باقيةٌ بأحكام الصورة الإنسانية، والله اعلم.

ترجمہ: (۴) اورایک (اور) قسم ہے، وہ مصالحت والے لوگ ہیں: جن کی قوت بہیمیہ قوی اور قوت ملکیہ ضعیف ہے، اور وہ بیشتر لوگ ہیں پائے جانے کے اعتبار سے۔ اُن کے اکثر امور (دنیا میں) اُس روح حیوانی کے تابع ہیں، جو بدن میں تصرف کرنے کے لئے اور بدن میں ڈوبنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پس موت کے وقت ان کی ارواح ان کے جسموں سے بالکلیہ جدا نہیں ہوتیں، بلکہ تدبیری طور پر جدا ہوتی ہیں، اور خیالی طور پر جدا نہیں ہوتیں۔ پس وہ نفوس پختہ طور پر جانتے ہیں ـــــ اس طرح کے اُس کے برخلاف کا امکان تک ان کے دل میں نہیں گزرتا ـــــ کہ وہ ارواح بعینہٖ جسم ہیں، حتی کہ اگر جسم روندا جاتا ہے یا کاٹا جاتا ہے، تو وہ لوگ یقین کرتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کی ارواح کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور ان لوگوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی تھاہ سے کہتے ہیں کہ ان کی روحیں بعینہٖ ان کے اجسام ہیں، یا (وہ ارواح) اعراض ہیں جو اجسام پر طاری ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ لوگ زبان سے تقلید کے طور پر یا ریت رواج کی بنا پر اس کے برخلاف کہیں۔

پس جب یہ لوگ مرجاتے ہیں تو اُن پر خفیف سی روشنی چمکتی ہے، اور ہلکے سے خیالات ان کو نظر آتے ہیں، جیسا کہ بعض ریاضت کرنے والوں کو یہاں نظر آیا کرتا ہے۔ اور (عالم برزخ میں مجازات کے لئے) چیزیں کبھی خیالی صورتوں میں اور کبھی مثالی صورتوں میں متشکل ہوتی ہیں، جیسا کہ بعض ریاضت کرنے والوں کے لئے کبھی متشکل ہوتی ہیں ـــــ پس اگر اس شخص کا ملکوتی اعمال سے تعلق رہا ہوتا ہے تو موافقت کا علم ایسے خوبصورت فرشتوں کی شکل میں چُھپایا جاتا ہے، جن کے ہاتھوں میں ریشم ہوتا ہے، جو نرم لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، اور اچھی ہیئت میں نظر آتے ہیں، اور جنت کی طرف ایک دروازہ وا کیا جاتا ہے، جس سے جنت کی خوشبوئیں آتی ہیں ـــــ اور اگر اس شخص کا ملکیت کے برخلاف کاموں سے یا لعنت کو کھینچنے والے کاموں سے تعلق رہا ہوتا ہے تو اس علم کو سیاہ چہرے والے فرشتوں کی شکل میں چھپایا جاتا ہے، جو درشت لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، اور مکروہ ہیئتوں میں نظر آتے ہیں، جیسا کہ کبھی (خواب میں) غصہ درندوں کی شکل میں، اور بزدلی خرگوش کی صورت میں چھپائی جاتی ہے۔

اور وہاں (یعنی نفس الامر میں) ایسے ملکی نفوس ہیں، جن کی استعداد لازم جانتی ہے کہ ان کو اس جیسے مواقع میں مقرر کیا جائے۔ اور ان کو سزا دینے کا یا راحتیں پہنچانے کا حکم دیا جائے، پس معذب آدمی اُن کو آنکھوں سے دیکھتا ہے، اگرچہ دنیا والے ان کو سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

اور جان لیں کہ عالم قبر اسی عالم کا بقیہ ہے۔ اور وہاں علوم (اور احکام) پردہ کے پیچھے سے ٹپکتے ہیں۔ اور نفوس کے صرف وہ احکام ظاہر ہوتے ہیں جو ہر ہر فرد کے ساتھ مختص ہیں، قیامت کے واقعات کے برخلاف، پس وہ واقعات

نفوس پر ظاہر ہوں گے درانحالیکہ وہ فنا ہونے والے ہوں گے اپنے ان احکام سے جو ہر ہر فرد کے ساتھ خاص ہیں، باقی رہنے والے ہوں گے نوع انسانی کی صورت کے احکام کے ساتھ، باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

تشریح:

(۱) عرض: وہ ممکن ہے جو کسی محل میں پایا جائے یعنی وہ پائے جانے میں، باقی رہنے میں اور متمکن ہونے میں کسی محل کا محتاج ہو، جیسے کپڑے کی سیاہی اور سفیدی وغیرہ۔ اعراض نو ہیں، جن کی تفصیل معین الفلسفہ ص ۷۹ میں ہے —— شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ چوتھی قسم کے لوگ ارواح کو جوہر نہیں مانتے، بلکہ عرض مانتے ہیں۔ جو قیام اور بقاء میں جسم کی محتاج ہوتی ہیں۔

(۲) مرتاض: وہ حضرات ہیں جو عبادات میں سخت محنت اور حقائق ایمانی میں غور وفکر کرتے ہیں، ان پر خفیف سی روشنی کس طرح چمکتی ہے؟ اور ان کو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے بارے میں ہلکے سے خیالات کیا آتے ہیں؟ اور عالم آخرت کے امور ان کے سامنے کس طرح متشکل ہوتے ہیں؟ یہ سب واردات ہیں، راہ خدا کے سالک کے علاوہ کے لئے ان کو سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہے، ایسی چیز مثال میں نہیں پیش کرنی چاہئے جو خود مسئلہ ہو، مثال تو مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہوتی ہے، اس لئے میں نے یہ مثال نہیں چھیڑی۔

(۳) خیالی صورتیں: جیسے بیداری یا خواب کے تصورات جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا، اور مثالی خارجی (صورتیں) جیسے کوئی شخص سامنے آیا اور کچھ کہہ کر یا مدد کر کے ایک دم غائب ہو گیا، یہ مثالی صورت ہے اور وہ خارج میں پائی جاتی ہے مگر چونکہ وہ مادی نہیں، اس لئے غائب ہو جاتی ہے۔

(۴) دَسَّ (ن) الشیئ تحت التراب: دھنسانا، چھپانا —— یہاں مراد یہ ہے کہ آدمی نے دنیا میں جو اعمال کئے ہیں، وہ ملکیت کے شایان شان ہیں یا اس سے متضاد ہیں، یہ موافقت یا ناموافقت کا علم آدمی کو عالم برزخ میں ملائکہ کی شکلوں کے ذریعہ ہوتا ہے، ان کی صورتوں میں یہ علم چھپا دیا جاتا ہے، ان کو دیکھتے ہی آدمی سمجھ جاتا ہے کہ میں کس قسم کے کام کر کے آیا ہوں اور یہ اشارہ ہے بہت سی حدیثوں کے مضمون کی طرف کہ مؤمن کی روح قبض کرنے کے لئے فرشتے کس حال میں آتے ہیں اور کافر کے ساتھ بوقت مرگ فرشتے کیا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ حدیثیں مشکوۃ شریف کتاب الجنائز، باب مایقال عند من حضرہ الموت میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۵) اس عبارت میں چند تصحیحات کی گئی ہیں: (الف) فتعلم علمًا مؤکدًا: اصل میں فتعلم علمًا من کذا تھا (ب) إمکان مخالفہ: اصل میں إمکان مخالفۃ تھا (ج) طارٍ: مطبوعہ میں طاری تھا (د) عنیفۃ: مطبوعہ میں عنفیۃ تھا (ہ) عن أحکامھا سے پہلے واو تھا: یہ سب تصحیحات مخطوطہ کراچی سے ہیں۔

باب ــــــ ۴

قیامت اوراس کے بعد کے واقعات کے اسرار ورموز

حَشَر (ن ض) حَشْرًا کے لغوی معنی ہیں جمع کرنا۔ اوراصطلاح میں یوم الحشر قیامت کے دن کو کہتے ہیں، کیونکہ اس دن میں اولین وآخرین جمع کئے جائیں گے۔ اس دنیامیں لوگ أَرْسَالاً (گروہ گروہ) آرہے ہیں۔ جب اس دنیا کا آخری دن (الیوم الآخر) آئے گا تو پہلے تمام مخلوقات ختم کردی جائیں گی۔ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا پس تمام مخلوقات دوبارہ زندہ ہوکر میدان حشر میں جمع ہوجائیں گی۔ مَحْشَر (شین کے زبر اور زیر کے ساتھ) لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ــــــ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حشر کا لفظ عام استعمال کیا ہے۔ دوبارہ زندہ ہونے سے لے کر جنت وجہنم کی ابدی زندگی تک سب کو لفظ حشر سے تعبیر کیا ہے ــــــ اس باب میں بھی تمہید ہے۔ پہلے پانچ باتیں بیان کی ہیں، پھر اصل مدعیٰ شروع کریں گے۔

پہلی بات

موت کے بعد انفرادی احکام ختم ہوجاتے ہیں، صرف نوعی احکام باقی رہتے ہیں

مرنے کے بعد روحوں کا ایک مرکز ہے، جس کی طرف تمام روحیں سمٹ جاتی ہیں، جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے، وہ مرکز بھی روحوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، وہ مرکز حظیرۃ القدس (بارگاہ مقدس) ہے۔ وہاں نوع انسانی کی صورت پائی جاتی ہے، جس کے بہت سے منہ اور زبانیں ہیں، وہ مختلف بولیاں بولتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے (دیکھئے مبحث اول باب (۳) ملأ اعلیٰ کا بیان) اس صورت کا نام ''انسان اکبر'' ہے اور ''روح اعظم'' بھی، اور روح اعظم کا یہ تمثل (پایا جانا) یا تو عالم مثال میں ہے یا ذکر یعنی لوح محفوظ میں، آپ جو چاہیں تعبیر اختیار کریں۔ جب روحیں اجسام کی چادروں سے مجرد ہوجاتی ہیں تو وہ روح اعظم کے پاس پہنچ جاتی ہیں، وہاں پہنچنے کے بعد انفرادی خصوصیات ختم ہوجاتی ہیں، صرف نوعی خصوصیات یا نوعی خصوصیات جیسی خصوصیات باقی رہ جاتی ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی میں دوقسم کی چیزیں ہیں: انفرادی خصوصیات اور اجتماعی خصوصیات:

انفرادی خصوصیات: وہ ہیں جن کی وجہ سے بعض افراد بعض سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کو تشخصات بھی کہتے ہیں، مثلاً ہر فرد کا ناک نقشہ، خدوخال، قد وقامت اور انداز مختلف ہوتا ہے، جو اس کو دوسرے افراد سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ سب انفرادی خصوصیات ہیں، جو مرنے کے بعد ختم ہوجاتی ہیں۔



اجتماعی خصوصیات: وہ ہیں جو تمام افراد میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی چیزیں نوع کی وجہ ہی سے ہوسکتی ہیں۔ حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ: ''ہر بچہ فطرت (اسلامی) پر پیدا ہوتا ہے'' یہ نوعی حکم کا بیان ہے، جو تمام افراد میں پایا جاتا ہے، کوئی فرد اس سے خالی نہیں (یہ حدیث بخاری شریف کتاب الجنائز میں ہے فتح الباری ۳: ۲۴۶)

اور نوعی چیزیں دو قسم کی ہیں: ظاہری اور باطنی:

ظاہری چیزیں: جیسے ہر نوع کی بناوٹ مختلف ہے، رنگ، شکل اور جسم کی مقدار متفاوت ہے، اسی طرح ہر نوع کی آواز بھی علحدہ ہے۔ یہ تمام امور نوع کے ظاہری احکام ہیں یعنی نوع کا جو بھی فرد، نوع کی عطا کردہ ہیئت پر پایا جائے گا اس میں یہ باتیں ضرور ہوں گی، کوئی فرد ان باتوں سے خالی نہ ہوگا۔ البتہ اگر مادّہ کے نقص کی وجہ سے کوئی فرد ناقص الخلقت پیدا ہو تو وہ دوسری بات ہے۔ مثلاً انسان کا قد سیدھا ہوگا یعنی وہ دو پیروں پر کھڑا ہوگا، وہ ناطق ہوگا یعنی الفاظ کے ذریعہ مافی الضمیر سمجھے گا اور سمجھائے گا، اور اس کی جلد بالوں سے صاف ہوگی یعنی بھیڑ بکری کی طرح اس کا پورا بدن بالوں سے ڈھکا ہوا نہ ہوگا اور گھوڑا کج قامت ہوگا یعنی اس کا جسم بیل کی طرح چار پیروں پر بچھا ہوا ہوگا، وہ ہنہنانے والا اور بال دار کھال والا ہوگا اور اسی طرح کی دوسری وہ چیزیں جو نوع کے افراد سے، مزاج کی درستگی کے وقت جدا نہیں ہوتیں۔

باطنی چیزیں: جیسے ہر نوع کا ادراک (سمجھنا) مختلف ہوتا ہے، معاش (زندگی گزارنے) کے طریقے جدا ہوتے ہیں اور اچانک پیش آنے والے واقعات سے نمٹنے کی شکلیں الگ الگ ہوتی ہیں، کوئی سینگ مارتا ہے تو کوئی لات مارتا ہے، کوئی کاٹتا ہے تو کوئی ڈنک مارتا ہے، غرض ہر نوع اپنا طریقۂ مدافعت جانتی ہے اور وہ طریقہ ہر نوع کا مختلف ہے۔ شہد کی مکھیوں کے احوال میں غور کیجئے یا چڑیوں کے احوال پر نظر ڈالیے تو آپ کو احوال کا یہ اختلاف عیاں نظر آئے گا۔ یہ تمام امور صورت نوعیہ کے تقاضے سے ہیں اور نوعی احکام ہیں۔

غرض موت کے بعد جب روحیں اپنی بارگاہ کی طرف سمٹ جاتی ہیں تو انفرادی احکام، جیسے ہر فرد کے تشخصات، وہاں پہنچ کر ختم ہوجاتے ہیں۔ اور نوعی احکام خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، وہاں پہنچنے کے بعد باقی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ احکام جن پر نوع کی جانب غالب ہوتی ہے یعنی گو وہ نوعی احکام نہیں ہوتے، مگر عموم ولزوم کی وجہ سے نوعی احکام جیسے ہوجاتے ہیں، جیسے مؤمنین کا ایمان اور کفار کا کفر اور منافقین کا نفاق، یہ نوعی احکام جیسے ہیں، یہ بھی باقی رہتے ہیں۔

نوٹ: روح اعظم کی طرف ارواح کا سمٹنا جگہ کے اعتبار سے نہیں ہوتا، جیسا کہ تیسری بات کے ضمن میں تفصیل سے آرہا ہے۔

﴿باب ذكر شيئ من أسرار الوقائع الحشرية﴾

اعلم أن للأرواح البشرية حضرةً تنجَذِب إليها انجذابَ الحديد إلى المَغْناطِيس؛ وتلك الحضرةُ هي حظيرة القُدْس: محلُّ اجتماع النفوس المتجرِّدة عن جلابيب الأبدان، بالروح

الأعظم الذى وصَفه النبى صلى الله عليه وسلم بكثرة الوجوه والألْسُنِ واللغات؛ وإنما هو تشبحٌ لصورة نوع الإنسان؛ فى عالم المثال،أو فى الذكر — أيّامًا شئت فقل — ومحلُّ فنائها عن المتأكد من أحكامها الناشئة من الخصوصية الفردية، وبقائها بأحكامها الناشئة من النوع، أو الغالب عليها جانبُ النوع.

وتفصيلُه: أن أفراد الإنسان لها أحكام يمتاز بها بعضُها من بعض، ولها أحكام تشترك فيها جُملَتُها، وتتوارد عليها جميعُها، ولاجرم أنها من النوع، وإليه الإشارة فى قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿كل مولود يولد على الفطرة﴾ الحديث.

وكل نوع يختص به نوعان من الأحكام:

أحدهما: الظاهرةُ،كالخِلقة، أى اللون والشكل والمقدار، وكالصوت، أىُّ فرد وُجد منه على هيئة يُعطيها النوعُ، ولم يكن مُخْدَجًا من قِبَلِ عصيان المادة، فإنه لابد يتحقق بها، ويتوارد عليها؛ فالإنسانُ مستوى القامة، ناطق، بادى البَشَرَة؛ والفرسُ مُعْوَجُّ القامة، صاهِلٌ، أَشْعَرُ، إلى غير ذلك مما لاينفك عن الأفراد عند سلامة مزاجها.

وثانيهما: الأحكام الباطنة، كالإدراك والاهتداء للمعاش، والاستعداد لما يَهْجُمُ عليها من الوقائع؛ فلكل نوع شريعة: ألا ترى النحلَ كيف أوحى الله تعالى إليها أن يَتَتَبَّعَ الأشجارَ،فتأكل من ثمراتها،ثم كيف تتخذ بيتًا يجتمع فيه بنونوعها، ثم كيف تجمع العسل هنالك؟ وأوحى إلى العصفور أن يرغَب الذكر فى الأنثى، ثم يتخذا عُشًا، ثم يَحْضُنَا الْبَيْضَ، ثم يَزِقَّا الفراخَ، ثم إذا نهضت الفراخُ عَلّمها أين الماء؟ وأين الحبوب؟ وعلّمها ناصِحَها من عدوها،وعلّمها كيف تفرمن السنور والصياد؟ وكيف تنازع بنى نوعها عند جلب نفع أو دفع ضُر؟وهل تَظُنُّ الطبيعةُ السليمة بتلك الأحكام أنها لاترجع إلى اقتضاء الصورة النوعية؟

ترجمہ: واقعاتِ حشر کے کچھ اسرار ورموز کا بیان: جان لیں کہ انسانی روحوں کے لئے ایک ایسی بارگاہ ہے، جس کی طرف روحیں کھچ جاتی ہیں۔ مقناطیس کی طرف لوہے کے کھنچنے کی طرح، اور وہ بارگاہ، وہ حظیرۃ القدس ہے: جو بدن کی چادروں سے متجرد (ننگا) ہونے کے بعد روحوں کے اکٹھا ہونے کی جگہ ہے، اس روحِ اعظم کے ساتھ جس کو متصف کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے بہت سے مونہوں، زبانوں اور بولیوں کے ساتھ۔ اور وہ روحِ اعظم نوعِ انسانی کی صورت کا تمثّل (پایا جانا) ہے، عالمِ مثال میں، یا ذکر یعنی لوحِ محفوظ میں — جو چاہیں آپ تعبیر اختیار کریں — اور وہ (حظیرۃ القدس) انفرادی خصوصیت سے پیدا ہونے والے احکام میں سے مؤکد (پختہ) احکام کے فنا ہونے کی جگہ ہے، اور نوع

کی وجہ سے پیدا ہونے احکام، یا جن احکام پر نوع کی جہت غالب ہے، ان احکام کے ساتھ باقی رہنے کی جگہ ہے۔

اور اس کی (یعنی انفرادی اور نوعی احکام کی) تفصیل یہ ہے کہ انسانی افراد کے لئے کچھ احکام تو وہ ہیں جن کی وجہ سے بعض افراد بعض سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے کچھ احکام وہ ہیں جن میں ان کے سارے افراد شریک ہوتے ہیں، اور ان احکام پر سارے افرادِ انسانی متفق ہوتے ہیں۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ وہ احکام نوع کی وجہ سے ہیں۔ اور اس کی طرف رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں اشارہ ہے کہ: ''ہر بچہ فطرتِ (اسلامی) پر پیدا ہوتا ہے'' حدیث آخر تک پڑھئے۔

اور ہر نوع کے ساتھ دو قسم کے احکام مخصوص ہوتے ہیں.

ان میں سے ایک: ظاہری احکام ہیں، جیسے بناوٹ یعنی رنگ، شکل اور مقدار، اور جیسے آواز: نوع کا جو بھی فرد، نوع کی عطا کردہ ہیئت پر پایا جائے گا، اور وہ مادّہ کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے ناقص نہ ہوگا، تو وہ ضرور احکامِ ظاہرہ کے ساتھ پایا جائے گا، اور اُن احکام پر متفق ہوگا، پس انسان سیدھے قد والا، ناطق اور کھلی کھال والا ہوگا۔ اور گھوڑا کج قامت، ہنہنانے والا اور بال دار کھال والا ہوگا، وغیرہ وغیرہ وہ باتیں جو نوع کے افراد سے، مزاج کی درستگی کے وقت، جدا نہیں ہوتیں۔

اور ان میں سے دوسرے: باطنی احکام ہیں، جیسے ادراک (سمجھنا) اور معاش (زندگی گزرانے) کی راہ پانا اور ان واقعات کے لئے تیار ہونا جو اس پر اچانک آپڑتے ہیں۔ پس ہر نوع کے لئے ایک قانون ہے، کیا آپ شہد کی مکھیوں کو نہیں دیکھتے، کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی ہے کہ وہ درختوں کو تلاش کریں پھر ان کے پھلوں میں سے کھائیں، پھر وہ کیسے بنائیں چھتا، جس میں اس کی نوع کے افراد اکٹھا ہوں، پھر کیسے جمع کریں اس میں شہد؟ ــــــ اور وحی کی اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کی طرف کہ نر، مادہ کی طرف راغب ہو، پھر دونوں آشیانہ بنائیں، پھر دونوں انڈے سَیئیں، پھر دونوں چوزوں کو چگائیں، پھر جب چوزہ اٹھ کھڑا ہو تو وہ اس کو سکھائیں کہ پانی کہاں ہے؟ اور غلہ کہاں ہے؟ اور وہ اس کو سکھلائیں کہ خیر خواہ کون ہے اور دشمن کون ہے؟ اور وہ اس کو سکھلائیں کہ وہ بلی اور شکاری سے کس طرح بھاگے؟ اور جلبِ منفعت کے وقت یا دفعِ مضرت کے وقت وہ اپنی نوع کے افراد سے کیسے لڑے؟ اور کیا فطرتِ سلیمہ ان احکام کے بارے میں گمان کرتی ہے کہ وہ صورتِ نوعیہ کے چاہنے کی طرف نہیں لوٹتے؟

لغات:

جَذَبه إليه: کھینچنا، اِنْجَذَبَ: کھنچ جانا...... الجُملة مجموعہ...... زَقَّ(ن) الطائر فَرْخه: چوزے کو چگانا...... حَضَنَ(ن) حَضْنًا وَحِضَانَةً الطير بَيْضَه: انڈے سینا (یائے مجہول)

ترکیب: محلُّ فنائها کا محلُّ اجتماع پر عطف ہے...... بقائها کا فنائها پر عطف ہے...... کل نوع مبتدا اور جملہ یختص خبر ہے۔

دوسری بات

نوع کے افراد میں نوعی احکام کا پایا جانا کمال ہے

کسی بھی نوع کے افراد کی نیک بختی (کمال) یہ ہے کہ اس میں نوعی احکام پورے پورے پائے جائیں افراد کا مادّہ نوع کے احکام کی نافرمانی نہ کرے، مثلاً عمدہ بھینس وہ ہے جو خوب دودھ دے، اچھا گھوڑا وہ ہے جس میں گھوڑے کی تمام خوبیاں پائی جائیں، اعلیٰ درجہ کی چھری تلوار وہ ہیں جو بہترین کاٹ کریں، اور کامل انسان وہ ہے جس میں کمال عبودیت ہو۔ غرض جس فرد میں جس قدر نوعی احکام پائے جائیں گے، وہ فرد اسی قدر کامل ہوگا۔ اور اگر کوئی فرد نوعی احکام سے خالی ہو، تو وہ بے کار فرد ہے۔ اور نوعی احکام میں کمی ہو تو اسی قدر ناقص ہے جیسے بھینس اگر بچہ اور دودھ نہ دے تو وہ کمیلا کے قابل ہے، گھوڑے میں اس کی خوبیاں نہ پائی جائیں تو وہ گدھا ہے، چھری تلوار کاٹ نہ کریں تو ان کی جگہ ردی کی ٹوکری ہے اور انسان میں اگر عبودیت نہ ہو تو وہ جہنم کا ایندھن ہوگا۔

اسی طرح نوع کے افراد جب تک نوع کے اقتضا پر باقی رہتے ہیں، ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، نہ ان کو کوئی سزا دی جاتی ہے، مگر بعض مرتبہ عارضی اسباب کی وجہ سے افراد کی فطرت متغیر ہو جاتی ہے۔ اس وقت پریشانی کھڑی ہوتی ہے، جیسے جسم میں کہیں سوجن آجاتی ہے، تو جسم بدنما ہو جاتا ہے اور تکلیف بھی ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں اس عارضی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے فرمایا: ''ہر بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ (یعنی ماحول جس میں وہ بچہ پلتا ہے) اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی (آتش پرست) بنا دیتے ہیں'' یعنی عوارض فطرت کو بدل دیتے ہیں۔

> **واعلم أن سعادة الأفراد: أن تُمكِّن منها أحكامَ النوع وافرةً كاملةً، وأن لاتعصِيَ مادَّتُها عليه، ولذلك يختلف أفراد الأنواع فيما يُعَدُّ لها من سعادتها أو شقاوتها، ومهما بقيت على ما يعطيه النوعُ لم يكن لها ألمٌ، لكنها قد تُغيِّرُ فطرتُها بأسباب طارئة، بمنزلة الورم، وإليه وقعت الإشارة بقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ثم أبواه يُهَوِّدَانِه، أو يُنَصِّرَانه، أو يُمَجِّسَانه﴾**

ترجمہ: اور جان لیں کہ (کسی بھی نوع کے) افراد کی نیک بختی یہ ہے کہ قدرت دیں افراد اپنے اندر نوع کے احکام کو پورے پورے طور پر (یعنی ان افراد میں نوع کے احکام پورے پورے پائے جائیں) اور یہ بات ہے کہ افراد کا مادہ نوع کی نافرمانی نہ کرے۔ اور اسی وجہ سے نوع کے افراد مختلف ہوتے ہیں اُن باتوں میں جو افراد کی نیک بختی اور بدبختی میں سے شمار کی جاتی ہیں ـــــ اور جب تک افراد نوع کی دَین پر باقی رہتے ہیں، ان کے لئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی، مگر کبھی عارضی اسباب کی وجہ سے افراد کی فطرت متغیر ہو جاتی ہے، جیسے سوجن، اور اسی (تبدیلی) کی طرف اشارہ

فرمایا ہے، آپؐ نے اپنے اس ارشاد میں کہ: ''پھر اس بچہ کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں''

تیسری بات

ارواح کا بارگاہ عالی کی طرف سمٹنا

حظیرۃ القدس کی طرف ارواح انسانی کا سمٹنا دو طرح پر ہوتا ہے:

اول: بصیرت وہمت یعنی ایمان اور ذکر وفکر کے ذریعہ: جو بھی شخص بہیمیت کی آلودگیوں سے پاک صاف ہوتا ہے، اس کی روح بارگاہ عالی میں پہنچ جاتی ہے، اور اس بارگاہ کی کچھ باتیں اس پر منکشف ہوتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی پروردگار کے پاس بحث ہوئی (رواہ مسلم، مشکوۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۱) اس حدیث میں اسی انجذاب کی طرف اشارہ ہے، دونوں حضرات کی ارواح بارگاہ عالی میں پہنچیں اور وہاں آپس میں گفتگو ہوئی۔ اور متعدد اسانید سے یہ مضمون صراحۃً مروی ہے کہ نیک لوگوں کی روحیں روح اعظم کے پاس اکٹھی ہوتی ہیں اور روح اعظم حظیرۃ القدس میں ہے، پس صراحۃً یہ بات ثابت ہوئی کہ کچھ ارواح حقیقۃً اس بارگاہ کی طرف سمٹ جاتی ہیں۔

دوم: تعلق قائم ہونے کے ذریعہ سمٹنا: موت کے بعد بارگاہ عالی کا ارواح کے ساتھ تکلیف دہی یا راحت رسانی کا تعلق قائم ہوتا ہے، یعنی حظیرۃ القدس کے آثار اُن ارواح میں نمودار ہوتے ہیں، یہ تعلق قائم ہونا بھی حکماً انجذاب (سمٹنا) ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قیامت کے دن جسموں کو جو دوبارہ بنایا جائے گا، اور ان میں ارواح کو لوٹایا جائے گا، تو وہ نئی زندگی نہ ہوگی، نہ جسم نئے ہوں گے، نہ روحیں نئی ہوں گی، بلکہ وہ زندگی پہلی زندگی کا تتمہ ہوگی، روحیں بھی وہی ہوں گی، اور اجسام بھی وہی ہوں گے۔ روحیں تو موت سے فنا نہیں ہوتیں، بعینہٖ باقی رہتی ہیں۔ اور اجسام جو گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوگئے ہیں ان کی نشأۃ ثانیہ ہوگی، یعنی جسم کے سابقہ اجزاء ہی سے تعمیر نو ہوگی، اس میں مٹی کے نئے اجزاء شامل نہیں ہوں گے۔ رہا یہ سوال کہ قیامت میں تو بہت لمبے چوڑے اجسام ہوں گے، ہر شخص کا قد سو ہاتھ کا ہوگا، سابقہ اجزاء سے اتنا بڑا جسم کیسے تیار ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح گوندھے ہوئے آٹے کو کچھ دیر گرمی میں رکھ کر یا کسی تُرش چیز سے پھلا لیا جاتا ہے، تو آٹے میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی۔ اور تخمہ (بدہضمی) میں جو وافر مقدار میں فضلات خارج ہوتے: وہ سابقہ فضلات ہی ہوتے ہیں، اس میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح قیامت میں اجسام کے سابقہ اجزاء ہی سے عالم مثال کی مدد سے لمبے چوڑے اجسام تیار ہوجائیں گے، ان میں ذرا بھی نئی مٹی شامل نہ ہوگی۔

اوراس کی دلیل یہ ہے کہ اگر قیامت میں نئی مٹی سے اجسام تیار ہوں، اوران کو جزاؤ سزا ہوتو یہ بات ولا تــزر وازرة وزر أخرى کے خلاف ہوگی۔ بھلا یہ بات کیسے ممکن ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی، اطاعت میں جن اجسام نے مشقت جھیلی، ان کوتو ثواب ملانہیں، دوسرے اجسام لطف اندوز ہونے لگے! اسی طرح جن اجسام نے معاصی کئے ان کوتو کوئی سزا ملی نہیں، دوسرے اجسام ناکردہ گناہ میں پکڑے گئے، بھلا ایسی ناانصافی اللہ کی بارگاہ میں کیونکر ممکن ہے۔

اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ بارگاہ عالی کا تعلق ارواح کے ساتھ اور اجسام کے بوسیدہ ذرات کے ساتھ بدستور قائم ہو۔ یہ تعلق کا بقاء بھی حکماً انجذاب ہے۔

واعلم أن الأرواح البشرية تنجذب إلى هذه الحضرة: تارةً من جهة البصيرة والهمة، وتارة من جهة تشبُّح آثارِها فيها، إيلامًا أو إنعاما:

أما الانجذاب بالبصيرة: فليس أحد يتخفف عن ألواث البهيمية إلا وتلحق نفسُه بها، وينكشف عليها شيئ منها، وهو المشار إليه في قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ اجتمع آدم وموسى عند ربهما﴾؛ وروى عنه صلى الله عليه وسلم من طرق شتّى: أن أرواح الصالحين تجتمع عند الروح الأعظم.

وأما الانجذاب الآخَر: فاعلم أن حشر الأجساد، وإعادةَ الأرواح إليها، ليست حياةً مستأنفةً، إنما هي تتمة النشأة المتقدمة، بمنزلة التُخمة لكثرة الأكل؛ كيف؟ ولولا ذلك لكانوا غيرَ الأولين، ولَمَا أُخذوا بما فعلوا.

ترجمہ: اور جان لیں کہ انسانی ارواح اس بارگاہ کی طرف کبھی بصیرت وتوجہ کی جہت سے کھنچتی ہیں، اور کبھی ارواح میں تکلیف دہی یا راحت رسانی کے آثار متمثل ہونے (پائے جانے) کی جہت سے کھنچتی ہے۔

رہا بصیرت کے ساتھ کھنچنا: پس جو بھی شخص بہیمیت کی آلودگیوں سے ہلکا (پاک) ہوتا ہے، اس کی روح اس بارگاہ کے ساتھ مل جاتی ہے، اور اس پر اس بارگاہ کی کچھ باتیں منکشف ہوتی ہیں۔ اور یہ (لحوق) ہی مشار الیہ ہے اس ارشاد نبوی میں کہ: ''آدم اور موسیٰ علیہما السلام ان کے پروردگار کے پاس اکٹھا ہوئے[1]'' اور متعدد اسانید سے آپ ﷺ سے مروی ہے کہ نیک لوگوں کی ارواح، روح اعظم کے پاس اکٹھا ہوتی ہیں۔

اور رہا دوسرا کھنچنا: تو جان لیں کہ جسموں کا دوبارہ زندہ ہونا، اور روحوں کا ان کی طرف لوٹانا، نئی زندگی نہیں ہے، وہ پہلی زندگی کا تتمہ ہی ہے، جیسے زیادہ کھانے کی وجہ سے بدہضمی (اور وہ) نئی زندگی کیسے ہوسکتی ہے؟ اگر وہ پہلے والے لوگ

[1] اجتمع کا لفظ تو کسی روایت میں یاد نہیں پڑتا۔ حدیث میں اِحتَجّ (بحث کی) آیا ہے، مگر اجتماع اس سے مفہوم ہوتا ہے ۱۲

نہ ہوں تو ان کے علاوہ ہوں گے اور البتہ نہیں پکڑے جائیں گے وہ ان کاموں کی وجہ سے جو اگلوں نے کئے ہیں۔

چوتھی بات

قیامت میں واقعات تمثیلی رنگ میں ظاہر ہوں گے

جس طرح خواب میں معنویات تمثیلی پیرایہ میں دکھائی جاتی ہیں، جیسے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے خواب دیکھا تھا کہ آپ خانۂ کعبہ پر کھڑے ہیں، اور آپ سے نہریں نکل کر چاروں طرف بہ رہی ہیں، اور معبر نے تعبیر دی تھی کہ آپ سے علم کا فیض جاری ہوگا، اسی طرح خارج میں بھی بعض مرتبہ معنویات تمثیلی رنگ میں ظاہر ہوتی ہیں، مثلاً:

(۱) حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک کوتاہی فرشتوں کے مقدمہ کی شکل میں سامنے آئی تھی۔ یہ کوتاہی ''خود پسندی'' تھی (من عُجْبٍ عَجِبَ به من نفسه، قاله ابن عباس رضی الله عنه) یہی اس آیت کی صحیح تفسیر ہے، جو مستدرک حاکم (۴۳۳:۲) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے مروی ہے، اور اس کی تفصیل فوائد عثمانیہ میں سورۃ ص کی تفسیر میں ہے —— اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جو تفسیر کی ہے وہ ایک دوسری روایت کے پیش نظر ہے، مگر وہ روایت صحیح نہیں، ابن کثیر رحمہ اللہ اس کی نسبت لکھتے ہیں قد ذكر المفسرون ههنا قصةً، أكثرها مأخوذ من الإسرائيليات، ولم يَثْبُتْ فيها عن المعصوم حديث يجب اتباعه اھ—— مگر مثال پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کوتاہی خواہ یہ ہو یا وہ، بہر حال وہ ایک معنوی چیز ہے، جو فریقین کے مقدمہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔

(۲) شب معراج میں فطرت (اسلام) اور شہوت کو دودھ اور شراب کی شکل میں آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے دونوں کو دیکھا، پھر دودھ کو لے لیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: الحمد لله الذي هداك للفطرة، لو أخذتَ الخمرَ غَوَتْ أُمتك (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر آپ شراب کو لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی) یہ روایت بخاری شریف میں، سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں ہے۔ اس میں ہدایت اور ضلالت کو، جو معنوی چیزیں ہیں، دودھ اور شراب کے محسوس پیکر میں پیش کیا گیا ہے —— اور امت کے صالح افراد ہدایت کو قبول کریں گے، یہ بات دودھ کے انتخاب کی صورت میں ظاہر کی گئی ہے۔

(۳) بخاری شریف، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: لو كنتُ متخذًا خليلا میں حدیث نمبر ۳۶۷۴ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ اَرِیس نامی کنویں کی مینڈھ پر، پیر اندر لٹکا کر تشریف فرما تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور آپ کی دائیں جانب، کنویں میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئے، پھر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے وہ بائیں جانب، اسی طرح بیٹھ گئے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آنحضور ﷺ کے پاس مینڈھ پر جگہ نہیں تھی اس لئے وہ مقابل جانب میں اکیلے بیٹھ گئے۔ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے، جو جلیل القدر تابعی ہیں، یہ روایت بیان کر کے ارشاد فرمایا فَأَوَّلْتُهَا قبورَهم (میں نے اس کا مطلب ان حضرات کی قبریں لیا ہے) یعنی ان چاروں حضرات کی وفات کے بعد جس طرح ان کی قبریں بنیں، یہ واقعہ اس کا پیکر محسوس ہے کہ اول تین حضرات کی قبریں ایک ساتھ ہیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر علحدہ بقیع میں ہے۔

اسی طرح قیامت میں جو واقعات پیش آئیں گے وہ بھی تمثیلی رنگ میں ہوں گے، مثلاً آنحضور ﷺ جو ہدایت لے کر تشریف لائے ہیں وہ میدان محشر میں حوض کوثر کی صورت میں نمودار ہوگی۔ اور صراط مستقیم پل صراط کی شکل اختیار کرے گی۔

واعلم أن كثيرا من الأشياء المتحققة في الخارج، تكون بمنزلة الرؤيا، في تشبح المعاني بأجسام مناسبة لها، كما ظهرت الملائكة لداود عليه السلام في صورة خصمَيْنِ، ورُفعت إليه القضيةَ، فعرف أنه تشبُّح لِما فَرَطَ منه في امرأة أُوْرِيا، فاستغفر وأناب؛ وكما كان عَرْضُ قَدَحَيِ الخمر واللبن عليه صلى الله عليه وسلم، واختيارُه اللبنَ تشبُّحا لعرض الفطرة والشهوات على أمته، واختيارِ الراشدين منهم الفطرةَ؛ وكما كان جلوسُ النبي صلى الله عليه وسلم، وأبي بكر، وعمر، مجتمعِيْن على قُفِّ البئر، وجلوسُ عثمان منفردًا منهم، تشبُّحا لما قدَّر الله تعالى من حال قبورهم ومدافنهم، على ما أوَّله سعيد بن المسيِّب، وناهيك به! وأكثر الوقائع الحشرية من هذا القبيل.

ترجمہ: اور جان لیں کہ بہت سی چیزیں جو خارج میں پائی جاتی ہیں، وہ خواب کی طرح ہوتی ہیں، معنویات کے پائے جانے میں ان سے مناسبت رکھنے والے اجسام کے ساتھ، جیسے فرشتے داؤد علیہ السلام کے سامنے ظاہر ہوئے فریقین کی صورت میں۔ اور انھوں نے آپ کے سامنے قضیہ پیش کیا، پس داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ اُس کوتاہی کی تمثیل ہے، جو ان سے اُوریا کی بیوی کے معاملہ میں ہو چکی ہے، پس انھوں نے معافی طلب کی اور وہ رجوع ہوئے —— اور جس طرح شراب اور دودھ کے دو پیالوں کا آپ ﷺ کے سامنے پیش کرنا اور آپ کا دودھ کو پسند کرنا، فطرت اور شہوت کو آپ کی امت کے سامنے پیش کرنے اور امت کے نیک لوگوں کا فطرت کو پسند کرنے کی تمثیل تھا —— اور جیسے نبی کریم ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا کنویں کی مَن پر اکٹھا بیٹھنا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ان سے علحدہ بیٹھنا اُس بات کی تمثیل تھا، جو اللہ تعالیٰ نے ان کی قبروں اور ان کے دفن کی جگہوں کے بارے میں مقدر فرمائی تھی، جیسا

کہ اس روایت کا مطلب بیان کیا ہے حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے، اور کافی ہیں تجھ کو حضرت سعید (یعنی ان کا بیان کیا ہوا مطلب تیرے لئے کافی ہے، کسی اور سے اس کا مطلب دریافت کرنے کی ضرورت نہیں) اور قیامت کے بعد کے اکثر واقعات اسی قبیل سے ہیں۔

پانچویں بات

فوقانی علوم آسانی سے حاصل نہیں ہوسکتے

علوم دو طرح کے ہیں: حسی علوم اور معنوی علوم:

حسی علوم: وہ ہیں جو حواس خمسہ ظاہرہ کی گرفت میں آتے ہیں، آنکھ سے دیکھ کر، کان سے سن کر، ناک سے سونگھ کر، زبان سے چکھ کر یا جسم سے ٹٹول کر ان کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ علوم نسبۃً آسان ہوتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں عام طور پر یہی حسی (مادی) علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

معنوی علوم: وہ ہیں جو حواس خمسہ باطنہ یا عقل سے جانے جاتے ہیں، وہ حواس ظاہرہ کے دائرہ سے خارج ہیں۔ مدارس اسلامیہ میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ اکثر از قبیل معنویات ہیں —— پھر علوم معنوی دو طرح کے ہیں ایک وہ جن سے انسان کو کچھ نہ کچھ مناسبت ہوتی ہے۔ یہ وہ علوم ہیں جو خود انسان سے یا کائنات سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ عبادات کے اسرار ورموز۔ اسی طرح کونسا معاملہ مبنی برانصاف ہے اور کونسا مبنی برظلم؟ یہ سب علوم معنوی ہیں مگر انسان کو اس سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہے —— دوسرے وہ علوم ہیں جن سے انسان کو بالکل مناسبت نہیں، یہ ذات وصفات کے علوم ہیں، اسی طرح آخرت کے معاملات اور ان کے اسرار ورموز کے علوم بھی غیر مانوس ہیں۔

دونوں قسم کے معنوی علوم نہایت مشکل علوم ہیں، آسانی سے ان کو نہیں سمجھا جاسکتا جیسے مادرزاد اندھا رنگ اور روشنی کو خیال میں نہیں لاسکتا۔ ان کی پوری حقیقت مدت دراز گزرنے کے بعد واقعات اور تمثیلات کے ضمن میں اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی وجہ سے مدارس اسلامیہ میں ایک ہی فن کی کتابیں ہر سال پڑھائی جاتی ہیں، فقہ کی مثال لیجئے: تعلیم الاسلام سے شروع کرکے ہدایہ تک پڑھایا جاتا ہے، پھر بھی جب قرآن وحدیث کا نمبر آتا ہے تو بہت سے طلبہ مسائل فقہیہ سے نابلد نظر آتے ہیں، پھر طالب علم افتاء کی تعلیم حاصل کرتا ہے، مگر اب بھی مسائل کا کما حقہ ادراک نہیں کرسکتا، پھر ایک لمبی زندگی فتوی نویسی کرتا ہے اور مطالعہ جاری رکھتا ہے، تب کہیں جاکر فقہ کی کچھ شُد بُد ہوتی ہے —— اور علوم معنوی کی دوسری قسم کا معاملہ تو اس سے بھی اہم ہے۔ اس لئے قیامت اور اس کے بعد کے واقعات کے جو اسرار ورموز آگے بیان کئے جارہے ہیں، ان کو ابھی بس سرسری طور پر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ جب وہ واقعات رونما ہوں گے اور اعمال

کے پیکر ہائے محسوس سامنے آئیں گے، تب رفتہ رفتہ ان کی حقیقت واشگاف ہوگی۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حقائق فہمی کے لئے نفس ناطقہ کا التفات ضروری ہے، اور جس قدر التفات زیادہ ہوگا، بات اتنی جلدی سمجھ میں آئے گی۔ تجربہ ہے کہ جو طالب علم پڑھنے کا شوق رکھتا ہے اور سبق کی طرف متوجہ ہوتا ہے، وہ جلدی مسئلہ سمجھ جاتا ہے، اور جس کا ذہن کھیل کود میں لگا رہتا ہے، سبق کی طرف ملتفت نہیں ہوتا وہ کورا رہ جاتا ہے۔ اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے نفس ناطقہ کا تعلق نسمہ کے ساتھ نہایت پختہ ہوتا ہے، اور نسمہ مادہ کی پیداوار ہے، اس وجہ سے ان کا التفات مادیات کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور وہ مادی علوم آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اور علوم فوقانی کی طرف چونکہ پورا التفات نہیں ہوتا، اس لئے وہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ انسان معنویات کو بھی مادیات کے سہارے سمجھنے کا عادی ہے، اور علوم معنوی کی پہلی قسم کے لئے چونکہ سہارا موجود ہے، اس لئے وہ ان کو کسی نہ کسی صورت سے سمجھ لیتا ہے، مگر علوم معنوی کی دوسری قسم چونکہ مادیات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی اس لئے اس کو خالص عقل سے سمجھنا ہوتا ہے، اور وہ مشکل ہے۔ ﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ کی تنبیہ بھی اس لئے کرنی پڑی ہے کہ انسان ذات وصفات کو مادیات کے ساتھ موازنہ کرکے سمجھنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ وہ جہل مرکب کا شکار ہوکر رہ جائے گا۔

واعلم أن تعلق النفس الناطقة بالنسمة أكِيْدٌ شديدٌ في حق أكثر الناس، وإنما مَثَلُها بالنسبة إلى العلوم البعيدة من مالوفها، كَمَثَلِ الأكمه: لايتخيل الألوانَ والأضواءَ أصلاً؛ ولامطمعَ لها في خصول ذلك إلا بعدأحقابٍ كثيرة ومُدَدٍ متطاولة، في ضمن تشبُّحات وتمثلات.

ترجمہ: اور جان لیں کہ اکثر لوگوں کی بہ نسبت نفس ناطقہ (روح ربانی) کا تعلق نسمہ (روح حیوانی) کے ساتھ تعلق نہایت ہی پختہ ہے۔ اور نفس ناطقہ کا حال اُن علوم کی بہ نسبت جن سے اس کو بالکل ہی مناسبت نہیں، مادرزاد اندھے کے حال جیسا ہے جو رنگوں اور روشنیوں کو بالکل خیال میں نہیں لاسکتا —— اور نفوس کے لئے اُن نامانوس علوم کے حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں ہے، مگر قرون کثیرہ اور مدتہائے دراز کے بعد، واقعات وتمثیلات کے ضمن میں۔

☆ ☆ ☆

قیامت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا بیان

مجازات کا سلسلہ دنیا سے شروع ہوتا ہے اور جنت وجہنم پر منتہی ہوتا ہے۔ بعض اعمال کا اچھا برا بدلہ دنیا ہی میں دیدیا جاتا ہے، کفار کو ان کی نیکیاں دنیا ہی میں کھلا دی جاتی ہیں اور مؤمنین کے لئے بھی بعض پریشانیوں کو کفارۂ سیئات بنا دیا



جاتا ہے۔ پھر عذاب قبر اور قبر کی راحتوں کی صورت میں مجازات ہوگی، پھر میدان حشر میں، پھر جنت وجہنم کے راستہ میں، اور آخر میں جنت وجہنم کی صورت میں مجازات ہوگی۔

جن لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے ان کو جلد سزا دیکر قصہ نمٹا دیا جاتا ہے۔ نیک لوگوں کو ان کی کوتاہیوں پر، دنیا ہی میں ابتلا میں ڈال کر، پاک صاف کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو زیادہ تر سزا قبر میں دیدی جاتی ہے، قیامت میں جب وہ اٹھیں گے تو گناہوں سے پاک صاف ہوں گے۔

پھر قیامت کے لمبے دن میں، پھر جنت وجہنم کے راستہ میں مختلف لوگوں کو مختلف طرح سے بدلہ دیا جائے گا۔ کسی کا آسان حساب لیا جائے گا، کسی کی سخت داروگیر کی جائے گی۔ کوئی پل صراط پر سے بچ کر پار ہو جائے گا، تو کسی کو آنکڑے زخمی کر کے جہنم میں کھینچ لیں گے۔ کچھ لوگوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے راہ نماؤں کے پیچھے ہولیں، پھر وہ راہ نمایا تو ان کو جنت میں لے جائیں گے یا جہنم میں پہنچائیں گے۔ کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے۔ دائیں والے اور بائیں والے اپنے اپنے نامۂ اعمال پڑھیں گے۔ جس نے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہوگی، اس کا وہ مال سامنے آئے گا، اور اس کو اس مال کے ذریعہ مختلف طرح سے سزا دی جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ یہ سب واقعات ان اعمال کے پیکر ہائے محسوس ہیں، جو لوگ دنیا سے کما کر لے گئے ہیں اور صورت نوعیہ کی ذین کے مطابق جو تمثیل جس کے لئے مناسب ہوگی، وہ اس کے حق میں ظاہر ہوگی۔

اور دوسری زندگی میں کچھ چیزیں ایسی بھی پائی جائیں گی جن کا سب لوگ یکساں طور پر مشاہدہ کریں گے مثلاً ہدایت حوض کوثر کی صورت اختیار کرے گی، نامۂ اعمال، وزن اعمال کی شکل میں سامنے آئیں گے اور جنت کی نعمتیں لذیذ کھانوں، خوشگوار مشروبات، پسندیدہ ازواج، چمکدار لباس اور خوبصورت مکانوں کے روپ میں متمثل ہوں گی۔

اور جو مؤمنین گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے وہ وہاں سے تدریجاً نکلیں گے۔ مسلم شریف میں اس آدمی کا قصہ مروی ہے جو جہنم میں سے سب سے آخر میں نکلے گا، اس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح آہستہ آہستہ نکلنا ہوگا۔ یہ روایت مشکوۃ شریف کتاب احوال القیامہ، باب الحوض والشفاعۃ۔ حدیث نمبر ۵۵۸۲ پر مذکور ہے۔

اور جنتیوں کی بعض خواہشات عام ہونگی، کیونکہ وہ نوعی تقاضا ہوں گی، جنت کی عام نعمتیں انہی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہوں گی، اور یہی جنت کی اصل نعمتیں ہیں۔ اور بعض خواہشات انفرادی ہونگی، یہ اول سے کم تر ہیں۔ مگر جنتیوں کے لئے یہ بھی مہیا کی جائیں گی۔ کنز العمال (۱۱:۶۶۰) فضائل جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر ۳۳۱۸۶ پر روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں جہاں سب حوریں (گوری عورتیں) ہیں، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی پسند کی گندمی، سیاہی مائل سرخ ہونٹوں والی لڑکی پیدا کی ہے۔ اور مشکوۃ شریف، کتاب احوال القیامہ، باب صفۃ الجنۃ، حدیث نمبر ۵۶۴۲ پر بحوالہ ترمذی شریف روایت ہے کہ جو شخص جنت میں گھوڑ سواری کرنا چاہے گا، اس کے لئے اس کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اور مشکوۃ شریف

کے مذکورہ کتاب اور باب میں حدیث نمبر ۵۶۵۳ پر بحوالہ بخاری شریف روایت ہے کہ اگر کوئی جنت میں کھیتی کرنا چاہے گا تو اس کا بھی انتظام کر دیا جائے گا۔

پھر آخر میں پروردگار عالم کا دیدار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی تجلی ظاہر ہوگی، اور جنتی مشک کے ٹیلوں پر بیٹھ کر جمال انور سے لطف اندوز ہوں گے، پھر اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے اس کا تذکرہ مناسب نہیں، کیونکہ شارع علیہ السلام نے سکوت فرمایا ہے، پھر دوسرا کیسے لب کشائی کر سکتا ہے۔

والنفوس أولَ ما تُبعث تُجازىٰ بالحساب اليسير، أو العسير أو بالمرور على الصراط ناجيًا ومخدوشا، أو بأن يتّبع كلُّ أحدٍ متبوعَه فينجوَ أو يهلك، أو بنُطق الأيدى والأرجل، وقراءة الصُّحُف، أو بظهور ما بخل به، وحمله على ظهره، أو الكيِّ به؛ وبالجملة فتشبُّحاتٌ وتمثُّلات لما عندها، بما تعطيه أحكام الصورة النوعية.

وأيما رجل كان أوثق نفسًا، وأوسعَ نسمةً، فالتشبحات الحشرية فى حقه أتمُّ وأوفرُ؛ ولذلك أخبر النبى صلى الله عليه وسلم: أن أكثر عذابِ أمته فى قبورهم.

وهنالك أمور متمثِّلة تتساوى النفوس فى مشاهدتها، كالهداية المبسوطة ببعثة النبى صلى الله عليه وسلم تتشبَّحُ حوضًا؛ وتتشبح أعمالُها المحصاة عليها وزنًا، إلى غير ذلك؛ وتتشبح النَّعمة بمطعم هَنِيئٍ، ومشرب مَرِئٍ، ومَنكح شَهِيٍّ، ومَلبسٍ وَضِيءٍ، ومسكن بَهِيٍّ.

وللخروج من ظلمات التخليط إلى النعمة تدريجات عجيبة، كما بينه النبى صلى الله عليه وسلم فى حديث الرجل الذى هو آخِرُ أهلِ النار خروجًا منها؛وإن للنفوس شهواتٍ تتوارد عليها من تلقاء نوعها، تتمثل بها النعمةُ ؛وشهواتٍ دون ذلك، يتميز بها بعضها من بعض، وهو قول النبى صلى الله عليه وسلم: ﴿دخلتُ الجنةَ فإذا جارية أَدْمَاءُ، لَعْسَاءُ: فقلتُ: ماهذه يا جبريل؟ فقال: إن الله تعالى عرف شهوةَ جعفر بن أبى طالب لِلأُدْمِ اللُّعْسِ، فخلق له هذه﴾ وقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ إن الله أدخلك الجنة، فلا تشاء أن تُحمل فيها على فرس من ياقوتةٍ حمراءَ، يطير بك فى الجنة حيث شئتَ، إلا فعلتَ﴾وقوله:﴿ إن رجلاً من أهل الجنة استأذن ربَّه فى الزرع، فقال له: ألستَ فيما شئتَ؟ قال:بلى! ولكنى أُحب أن أزرعَ؛ فَبَذَرَ، فبادر الطرفَ نباتُه واستواؤه واستحصادُه، فكان أمثالَ الجبال، فيقول الله تعالى : دونك يا ابنَ آدم! فإنه لايُشبعك شيئٌ﴾

ثم آخِرُ ذلك رؤيةُ رب العالمين، وظهورُ سلطان التجليات فى جَنَّةِ الكثيب، ثم كائنٌ بعدَ ذلك ما أسكتُ عنه، ولاأذكره، اقتداءً بالشارع صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: اور لوگ دوبارہ زندہ کئے جانے کے بعد، سب سے پہلے آسان حساب یا سخت حساب کے ذریعہ بدلہ دیئے جائیں گے یا پل صراط پر گزرنے کے ذریعہ، بچ جانے کے طور پر یا زخمی ہوجانے کے طور پر، یا بایں طور کہ ہر کوئی اپنے متبوع کی پیروی کرے، پھر وہ نجات پائے یا ہلاک ہو، یا ہاتھوں اور پیروں کے بولنے کے ذریعہ اور نامہ اعمال پڑھنے کے ذریعہ، یا اس مال کے سامنے آنے کے ذریعہ جس میں آدمی نے بخیلی کی ہے (یعنی زکوٰۃ ادا نہیں کی) اور اس کو پیٹھ پر لادنے کے ذریعہ، یا اس سے داغ دینے کے ذریعہ — اور جامع بات یہ ہے کہ یہ تمام واقعات ان اعمال کی تمثیلات اور پیکر ہائے محسوس ہیں جو نفوس کے پاس ہیں، بصورت نوعیہ کے احکام کی ذین کے مطابق۔

اور جو بھی شخص مضبوط نفس والا اور کشادہ نسمہ والا ہے، قیامت میں تمثیلات اس کے حق میں زیادہ کامل اور زیادہ مکمل ہونگی، اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ آپ ﷺ کی امت کی سزا عام طور پر ان کی قبروں میں ہوگی (رواہ مسلم ۱۷: ۲۰۲)

اور وہاں (یعنی قیامت کے بعد) کچھ چیزیں ایسی پائی جائیں گی، جن کا سبھی لوگ یکساں مشاہدہ کریں گے، جیسے وہ ہدایت جو نبی ﷺ کی بعثت کے ذریعہ (عالم میں) پھیلائی گئی ہے، وہ حوض کوثر کی صورت میں متمثل ہوگی۔ اور وہ اعمال جو نفوس کے خلاف ریکارڈ کئے گئے ہیں، وہ وزن اعمال وغیرہ کی شکل میں متمثل ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں مزے دار کھانوں، خوش گوار مشروبات، پسندیدہ بیویوں، روشن پوشاک اور خوبصورت مکانوں کے روپ میں متمثل ہوں گی۔

اور نیکیوں کے ساتھ گناہوں کو ملانے کی تاریکیوں سے نعمت خداوندی کی طرف نکلنے میں بھی حیرت انگیز آہنگی ہوگی، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کو بیان فرمایا ہے، اُس آدمی کے قصہ میں جو جہنمیوں میں آخری شخص ہوگا جہنم سے نکلنے کے اعتبار سے۔

اور بیشک نفوس کی کچھ خواہشات تو ایسی ہیں، جن پر وہ متفق ہیں، ان کی نوع کی جانب سے (یعنی نوعی تقاضا ہونے کی وجہ سے) اللہ کی نعمتیں ان خواہشات کے ساتھ متمثل ہوں گی —— اور کچھ خواہشات اُن کے ورے ہیں (یعنی کم درجہ کی ہیں) جن کے ساتھ بعض افراد بعض سے ممتاز ہوتے ہیں (یعنی وہ خواہش کسی کسی کی ہوگی) —— وہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے (یعنی اس حدیث میں اُسی انفرادی خواہش کا تذکرہ ہے) کہ میں جنت میں گیا، تو اچانک میں نے ایک گندم گوں، سیاہی مائل سرخ ہونٹوں والی لڑکی دیکھی، پس میں نے پوچھا: جبرئیل! یہ کیا؟ تو انھوں نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو گندمی رنگ، سیاہی مائل سرخ ہونٹوں والی عورتیں پسند ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ لڑکی ان کے لئے پیدا کی ہے" — اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو جنت میں داخل کریں گے، پھر اگر تو جنت میں پہنچ کر چاہے گا کہ سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر جنت میں جہاں چاہے اڑتا پھرے، تو یہ بات بھی تجھ کو وہاں حاصل ہوگی —— اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ایک جنتی نے اپنے رب سے کھیتی کرنے کی اجازت

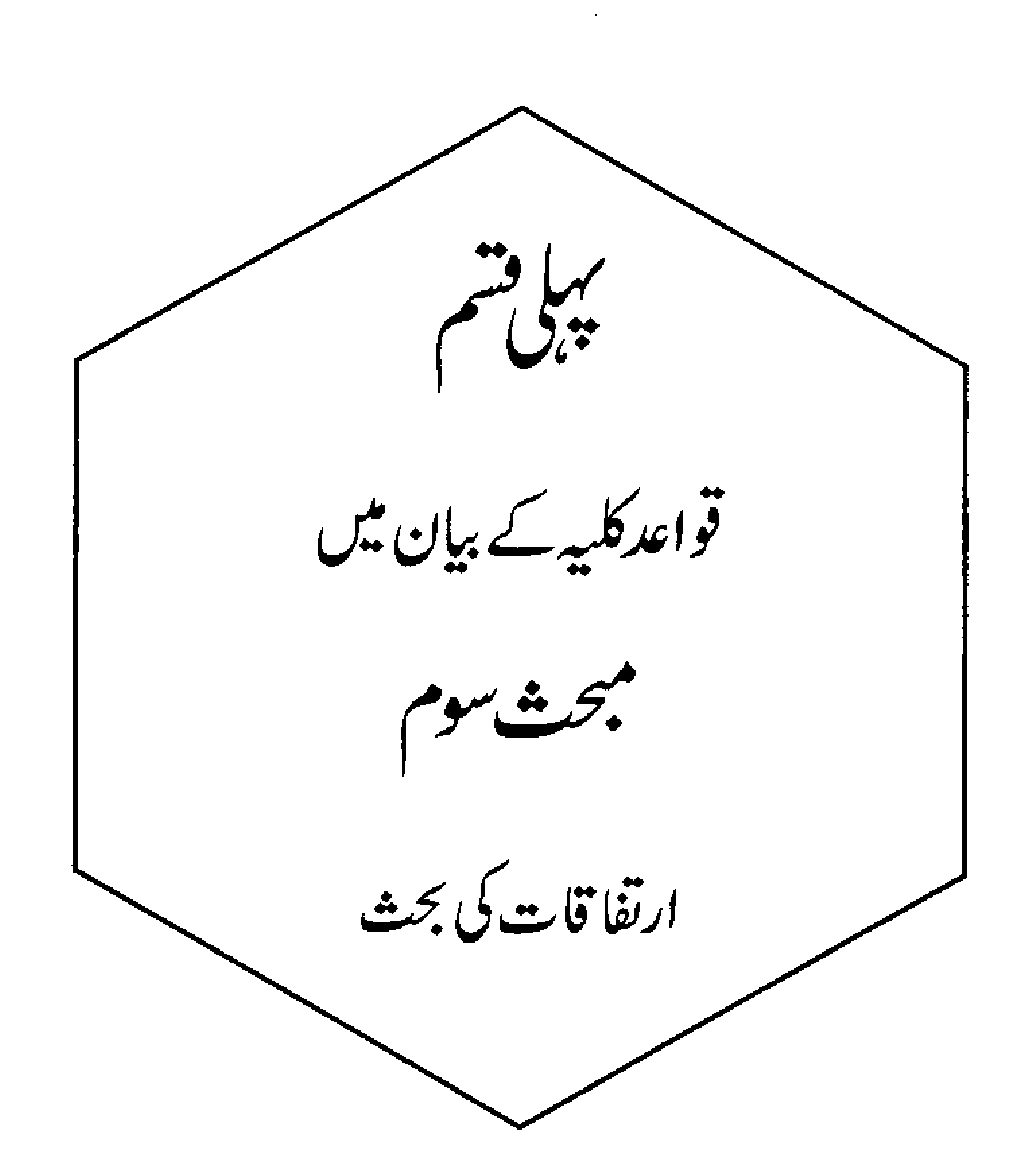
چاہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا: کیا تجھ کو ہر نعمت میسر نہیں؟ اس نے جواب دیا: کیوں نہیں! مگر میں کھیتی کرنا پسند کرتا ہوں۔ پس وہ بیج بوئے گا، تو کھیتی دیکھتے دیکھتے اُگ آئے گی، سیدھی کھڑی ہو جائے گی اور کٹ جائے گی، پس اناج کا پہاڑ جیسا ڈھیر لگ جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "لے! اے ابن آدم! تیرا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرتا"

پھر ان سب چیزوں کے بعد پروردگار عالم کا دیدار ہوگا اور اللہ کی سب سے بڑی تجلی ظاہر ہوگی، مُشک کے ٹیلوں والے باغ میں، پھر اس کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے، اس کے بارے میں، میں سکوت اختیار کرتا ہوں، اور میں اس کا تذکرہ نہیں کرتا۔ شارع علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے۔

لغات:

خَدَشَه (ض) خراش لگانا...... کَوىٰ يَكْوِىْ كَيًّا: لوہے وغیرہ سے داغ دینا..... اَوْثَق نفسًا: جس کا نفس ناطقہ (روح ربانی) مضبوط ہو..... اَوْسَــع نَســمَۃً: جس کا نسمہ (روح حیوانی) زیادہ کشادہ ہو یعنی زیادہ مضبوط ہو ایسی مضبوط نفس اور جسم والی گذشتہ امتیں ہیں، میدان قیامت کے واقعات ان کے حق میں زیادہ ظاہر ہوں گے۔ امت محمدیہ کمزور جسم والی امت ہے اس لئے ان کا عذاب زیادہ تر قبر میں ہوگا مولانا سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قوله: أيما رجل كان أوثقَ نفسًا يعني كل رجل وامرأة كان عظيمَ النفس، واسع النسمة، جسيم البدن، كالأمم الماضية، فالتشبحات الحشرية في حقهم، أتمُّ وأعظم يعني حَيَّاتهم وعقاربهم وغيرهما أتم وأوفر بالنسبة إلى أمة سيدنا محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولذا أخبر إلخ اھ...... اَلْهَنِیْءُ: خوش گوار هَنأَ (ض، ف، ک) الطعامُ: خوش گوار ہونا..... اَلْمَرِیْءُ: خوش گوار مَرَأَ الطعامُ: خوش گوار ہونا...... مَنْكَحٌ: نکاح کی جگہ یعنی عورت...... اَلشَّهِیُّ: مرغوب جیسے شيئٌ شهِيٌّ: لذیذ چیز...... اَلْوَضِیْءُ: پاکیزہ وخوبصورت جمع وِضَاءٌ...... اَلْبَهِیُّ: حسین وخوبصورت، مؤنث بَهِيَّة، بَها (ن، س، ک) بَهَاءً: حسین وخوبصورت ہونا...... توارد: متفق ہونا...... آدم: گندم گوں، مؤنث اَدْمَاءُ جمع اُدْمٌ...... لَعِسَ (س) لَعَسًا: سیاہی مائل سرخ ہونٹ والا ہونا صفت اَلْعَسُ مؤنث لَعْسَاءُ جمع لُعْسٌ.

(بفضلہ تعالیٰ جمعہ ۲ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء کو مبحث دوم کی شرح مکمل ہوئی)


پہلی قسم
قواعد کلیہ کے بیان میں
مبحث سوم
ارتفاقات کی بحث

مبحث سوم

ارتفاقات کی بحث

باب (۱) ارتفاقات کو مستنبط کرنے کا طریقہ
باب (۲) ارتفاق اول میں شامل چیزیں
باب (۳) فن آداب معاش کا بیان
باب (۴) فن تدبیر منزل (خانگی انتظام) کا بیان
باب (۵) فن معاملات کا بیان
باب (۶) نظام حکومت کا بیان
باب (۷) سربراہ مملکت کے لئے ضروری اوصاف
باب (۸) سرکاری عملہ کے نظم وانتظام کا بیان
باب (۹) خلافِ کبری کا بیان
باب (۱۰) ارتفاقات کی بنیادی باتیں متفق علیہ ہیں
باب (۱۱) لوگوں میں رائج طور وطریق کا بیان

مبحث سوم

ارتفاقات کی بحث

ارتفاق: شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ شاہ صاحب اپنی تصنیفات میں یہ اصطلاح کثرت سے استعمال فرماتے ہیں، اس لئے اس کا مفہوم ذہن نشیں کرلینا چاہئے۔

اِرْتَفَقَ به کے معنی ہیں نفع اٹھانا۔ اس کا مادہ ہے رفق (ن،س،ک) رِفقًا به وله وعليه: مہربانی کا برتاؤ کرنا ـــــ اور شاہ صاحب کے اصطلاحی معنی ہیں: آسائش سے زندگی بسر کرنے کی مفید تدبیریں۔ تدبیرات نافعہ، زندگی کی سہولتیں اور مفید اسکیمیں بھی اس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت علامہ سندھی رحمہ اللہ وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں: ''جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیدا کی ہیں، وہ انسان کے ساتھ خشونت سے پیش آتی ہیں، اور فائدہ دینے سے اِباء کرتی ہیں، انسان اُن چیزوں کو نہایت نرمی سے تسخیر کرلیتا ہے، جیسے درخت کو آہستہ آہستہ نرمی سے کلہاڑی سے کاٹتا ہے'' (حاشیہ تقریر) اسی طرح زمین کو آہستہ آہستہ کھود کر اس میں سے مکنون پانی نکال لیتا ہے، بچھڑے کو نرمی سے سدھالیتا ہے، ہاتھی کو رام کرلیتا ہے، گھوڑے کو لگام دیدیتا ہے، شیر کو شکنجہ میں کس لیتا ہے، وقس علی ہذا۔ انسان کا اسی قسم کا طریق کار اور یہی کاری گری ارتفاق کہلاتی ہے۔

باب ـــــ ۱

ارتفاقات کو مستنبط کرنے کا طریقہ

ارتفاقات (تدبیرات نافعہ) فطری بھی ہوتے ہیں اور اکتسابی بھی۔ انتفاع کے فطری طریقے قدرت نے تمام حیوانات کو الہام فرمائے ہیں۔ انسان بھی اس سے محروم نہیں۔ ان فطری طریقوں کو رائیگاں نہیں چھوڑنا چاہئے، استعمال کرنا چاہئے۔ اور اکتسابی ارتفاقات وہ ہیں جو انسان اپنی عقل سے مستنبط کرتا ہے۔ یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے دیگر حیوانات کو نہیں دی، صرف انسان کو بخشی ہے۔ انسان نے خدا کی بخشی ہوئی اس صلاحیت سے کام لے کر تمدن کو زمین سے آسماں تک پہنچادیا ہے!

علامہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قوله: الارتفاقات: جمع ارتفاق بمعنی الانتفاع برفق، والمراد طُرق

الانتفاع، فالمعنى: هذا باب في كيفية إيجادِ طرقِ الانتفاع من الأشياء، واستعمالِها إن كانت موجودةً، ومعرفتِها واستعمالها إن كانت جبلية اهـ

آسائش سے زندگی بسر کرنے کے لئے ارتفاقات ضروری ہیں

انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح بہت سی حاجتیں رکھتا ہے، وہ کھانے پینے کا، مباشرت کرنے کا، دھوپ اور بارش سے بچاؤ کرنے کا، سردی میں آگ یا کپڑوں سے گرمی حاصل کرنے کا، اوران کے علاوہ بہت سی چیزوں کا محتاج ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو فطری طور پر سمجھادیا ہے کہ وہ ان حاجات کو رفع کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرے؟ اور جب یہ امور فطری ہیں تو ضروری ہے کہ تمام انسان اس سلسلہ میں برابر ہوں۔ ہاں اگر انسان کا کوئی فرد ناقص ہو، مثلاً نامرد ہو، تو اس کو نہ مباشرت کی حاجت ہوگی نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کرنے کی ضرورت۔

اوران فطری امور کا الہام صرف انسان کو نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کو ان کی ضروریات سمجھادی ہیں۔ شہد کی مکھیوں اور چڑیوں کے احوال پر نظر ڈالنے سے یہ بات بخوبی آشکارہ ہوجاتی ہے۔ البتہ انسان کو چونکہ تمام انواع سے برتر صورت نوعیہ عطا فرمائی گئی ہے یعنی وہ اشرف المخلوقات ہے، اس لئے وہ مذکورہ بالا فطری الہامات کے ساتھ تین چیزیں مزید ملاتا ہے۔

اول: عقلی فائدے کے لئے کام کرنا: حیوانات ہمیشہ طبیعت کے تقاضے سے کام کرتے ہیں، جیسے بھوک، پیاس اور شہوت وغیرہ حاجات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، ان کو گھاس پانی نظر آتا ہے، یا خیال ہوتا ہے کہ فلاں جگہ یہ چیزیں ملیں گی تو وہ فطری داعیہ سے اس کی طرف چل پڑتے ہیں ــــــ مگر انسان ہمیشہ طبیعت کا تقاضا ہی پیش نظر نہیں رکھتا، بلکہ وہ عقلی فائدے کے لئے بھی کام کرتا ہے۔ مثلاً ملک میں صالح نظام برپا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، اپنے اخلاق کی تکمیل اور نفس کو سنوارنے کے لئے کوششیں کرتا ہے، عذاب آخرت سے رستگاری کا سامان کرتا ہے۔ اور لوگوں میں اپنا سکہ بٹھانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے، اوراسی قسم کے دوسرے کام کرتا ہے جن کا فائدہ عقل سے معلوم ہوسکتا ہے۔

دوم: حاجت روائی کے ساتھ نفاست کا خیال رکھنا: حیوانات صرف حاجت برآری چاہتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ اور انسان چاہتا ہے کہ اسکی حاجتیں عمدہ طریقہ پر پوری ہوں۔ وہ تکمیل حاجت کے ساتھ آنکھ کی ٹھنڈک اور نفس کی لذت بھی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ خوبصورت بیوی، لذیذ پکوان، عمدہ لباس اور شاندار کوٹھی کا خواشمند ہوتا ہے۔

سوم: اُن میں عقل مندوں کا پایا جانا: انسانوں میں ایسے عقل منداور بابصیرت لوگ پائے جاتے ہیں، جوضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے بہترین اسکیمیں وجود میں لاسکتے ہیں، اور دوسرے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو ضرورتوں کا

احساس تو ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے وہ مفید تدبیریں نکال نہیں سکتے، مگر جب عقل مندوں کی نکالی ہوئی تدبیریں ان کے سامنے آتی ہیں تو وہ اس کو دل سے قبول کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ ان کے دل کی خواہش کے مطابق ہوتی ہیں۔

مثال سے وضاحت: فرض کیجئے، ایک شخص تمدن کے بالکل ابتدائی زمانہ میں ہے۔ اسے بھوک پیاس لگتی ہے، مگر وہ کوئی چیز کھانے پینے کے لئے نہیں پاتا، وہ بہت پریشان ہوتا ہے اور حاجت برآری کی شکلیں سوچتا ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا، پھر اس کی کسی دانشمند سے ملاقات ہوتی ہے، جو اس کی طرح ان تکالیف سے دوچار ہو چکا ہے، چنانچہ اس نے کھانے کے لئے غلہ دریافت کر لیا ہے اور اس کو بونے کاٹنے، گاہنے برسانے اور وقت حاجت کے لئے محفوظ کرنے کا طریقہ جان لیا ہے اور جو زمینیں نہروں اور چشموں سے دور ہیں ان کی آبپاشی کے لئے کنویں کھودنے کا طریقہ اور مٹکے مشکیں اور رہٹ کے پیالے بنانے کا طریقہ مستنبط کر لیا ہے پس وہ شخص اس دانشمند کے تمام طریقوں کو اپنا لیتا ہے۔ یہ ارتفاقات (تدبیرات نافعہ) کا ایک باب ہے۔

پھر اس شخص نے غلہ تو اگا لیا، مگر استعمال کا طریقہ نہیں جانتا، یونہی کچا چباتا ہے، اور سبزی ترکاری اور پھلوں کو کچا کھاتا ہے، اس لئے وہ ہضم نہیں ہوتے، اور پیٹ میں شکایت پیدا ہوتی ہے، اس لئے وہ کوئی مناسب تدبیر سوچتا ہے، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا اچانک کسی دانشمند سے اس کی ملاقات ہوئی، جس نے پکانے بھننے، پیسنے اور روٹی بنانے کا طریقہ جان لیا ہے، تو وہ شخص ان چیزوں کو بھی فوراً اپنا لیتا ہے، اور یہ ارتفاقات کا دوسرا باب ہو جاتا ہے۔

یوں نئی نئی اسکیمیں وجود میں آتی رہتی ہیں اور تمدن ترقی کرتا رہتا ہے۔ دنیا کے احوال پر غور کریں، آج دنیا جہاں تک پہنچی ہوئی ہے، یک بارگی وہاں تک نہیں پہنچ گئی، مثلاً آگ پہلے صرف پتھر (چق ماق) میں تھی یا بعض درختوں میں تھی، پھر انسان نے گندھک دریافت کر لی جس سے ماچس بننے لگی، پھر مزید کھوج لگائی، تو برق (بجلی) ہاتھ آ گئی جس کی وجہ سے تمدنی ترقیات آسمان کو چھونے لگیں۔

غرض ارتفاقات رفتہ رفتہ وجود میں آتے ہیں۔ پھر صدیوں تک لوگ ان کو اپنائے رہتے ہیں۔ اس طرح علوم الہامیہ کی اچھی خاصی مقدار جمع ہو جاتی ہے۔ تجربات اس کی افادیت پر صاد کرتے ہیں اور لوگ ان ارتفاقات کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں اور انہی پر ان کا مرنا جینا ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہاں دو چیزیں ہیں ایک فطری الہامات، دوسری مذکورہ تین چیزیں جو انسان کی امتیازی چیزیں ہیں ان دونوں کا حال سانس جیسا ہے۔ حیات انسانی کے لئے سانس ضروری ہے، جیسے نبض کی حرکت ضروری ہے، چنانچہ انسان کو فطری طور پر سانس لینے کا الہام کیا گیا ہے۔ قدرت نے اس کا علم انسان کی صورت نوعیہ میں سمو دیا ہے مگر سانس کو چھوٹا بڑا کرنا انسان کے اختیار میں ہے، اسی طرح فطری علوم کو سنوارنا انسان کے اختیار میں ہے اور ان علوم کو سنوار کر ہی انسان آسائش کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

المبحث الثالث: مبحث الارتفاقات

باب كيفية استنباط الارتفاقات

اعلم أن الإنسان يُوافق أبناءَ جنسه في الحاجة إلى الأكل والشُرب، والجماع، والاستظلال من الشمس، والمطر، والاستدفاءِ في الشتاء وغيرها.

وكان من عناية الله تعالى به أن ألهمه: كيف يرتفق بإزاء هذه الحاجات إلهاماً طبيعيا من مقتضى صورته النوعية، فلا جرم يتساوَى الأفراد في ذلك، إلا كلُّ مُخْدَج عصت مادتُه؛ كما ألهم النحلَ: كيف تأكل الثمرات؟ ثم كيف تتخذ بيتا يجتمع فيه أشخاصٌ من بني نوعها؟ ثم كيف تنقاد ليعْسُوبها؟ ثم كيف تعسِّل؟ وكما ألهم العصفور: كيف يبتغي الحبوبَ الغاذية؟ وكيف يرد الماءَ؟ وكيف يفرعن السنَّور والصياد؟ وكيف يقاتل من صدَّه عمايحتاج إليه؟ وكيف يسافد ذكرُه الأنثى عند الشَبق، ثم يتخذان عُشًا عند الجبل؟ ثم كيف يتعاونان في حضانة البَيْضِ؟ ثم كيف يزِقَّان الفِراخ؟ وكذلك لكل نوع شريعةٌ تُنْفَثُ في صدور أفراده من طريْق الصورة النوعية.

وكذلك ألهم الإنسانَ: كيف يرتفق من هذه الضرورات؟ غيرَ أنه انْضَمَّ له مع هذا ثلاثةُ أشياءَ، لمقتضى صورته النوعية الرابية على كل نوع:

أحدها: الانبعاث إلى شيئ من رأى كلي: فالبهيمة إنما تنبعث إلى غرض محسوس أو متوَّهم، من داعية ناشئة من طبيعتها، كالجوع والعطش والشبق، والإنسان ربما ينبعث إلى نفع معقول، ليس له داعية من طبيعته، فيقصدُ أن يُحَصِّل نظاما صالحًا في المدينة، أو يُكَمِّلَ خُلُقَه ويهذِّبَ نفسه، أو يَتَفَصَّى من عذاب الآخرة، أو يُمَكِّنَ جاهَه في صدور الناس.

والثاني: أنه يَضُمُّ مع الارتفاق الظرافةَ: فالبهيمة إنما تبتغي ما تَسُدُّ به خَلَّتَها، وتدفع حاجتها فقط، والإنسان ربما يريد أن تقرَّ عينُه، وتَلَذَّ نفسُه زيادةً على الحاجة، فيطلب زوجة جميلة، وطعاما لذيذًا، وملبسا فاخِرًا ومسكنا شامخًا.

والثالث: أنه يوجَد منهم أهلُ عقل ودراية يستنبطون الارتفاقاتِ الصالحةَ، ويوجد منهم من يختلج في صدره ما اختلج في صدورِ أولئك، ولكن لايستطيع الاستنباطَ، فإذا رأى من الحكماء وسمع ما استنبطوه، تلقَّاه بقلبه، وعَضَّ عليه بنواجذه، لِمَا وجدَه موافقا لعلمه الإجمالي.

فرب إنسان يجوع ويظمأ، فلايجد الطعام والشراب، فيقاسي ألمًا شديدًا. حتى يجدهما،

فيحاول ارتفاقا بإزاء هذه الحاجة، ولايهتدى سبيلا، ثم يتفق أن يَلْقى حكيما، أصابه ما أصاب ذلك، فتعرَّف الحبوبَ الغاذية، واستنبط بَذْرَها وحَصادها ودِياسَها وتذريتها، وحفظَها إلى وقت الحاجة، واستنبط حَفْرَ الآبار للبعيد من العيون والأنهار، واصطناعَ القِلالِ والقِرَبِ والقِصَاع، فيتخذ ذلك بابا من الارتفاق.

ثم إنه يَقْضِمُ الحبوب كماهي، فلا تنهضم في معدته، ويَرْتَع الفواكه نِيْئَةً فلا تنهضم، فيحاول شيئا بإزاء هذه، فلا يهتدى سبيلا فيلقى حكيما استنبط الطبخ والقَلْيَ والطحن والخَبْزَ، فيتخذ ذلك بابا آخر؛ وقس على ذلك حاجاتِه كُلَّها.

والمستبصر يشهد عنده لِمَا ذكرنا حدوثُ كثير من المرافق في البلدان بعد مالم تكن فمضى على ذلك قرون، ولم يزالوا يفعلون ذلك، حتى اجتمعت جملة صالحة من العلوم الإلهامية المؤيَّدة بالمكتسبة، ويَبَسَتْ عليها نفوسهم، وعليها كان محياهم ومماتهم.

وبالجملة: فحال الإلهامات الضرورية مع هذه الأشياء الثلاثة، كَمَثَلِ النَفَسِ: أصلُه ضروري بمنزلة حركة النبض، وقد انضمَّ معه الاختيارُ في صِغَرِ الأنفاس وكِبَرِها.

ترجمہ: مبحث سوم: ارتفاقات کی بحث: باب: ارتفاقات کو مستنبط کرنے (نکالنے، وجود میں لانے) کا طریقہ:
جان لیں کہ انسان اس کے ابنائے جنس کی طرح ہے، کھانے پینے، مباشرت کرنے، دھوپ اور بارش سے بچاؤ کرنے، سردی میں گرم ہونے اور ان کے علاوہ دیگر حاجات میں۔

اور انسان پر اللہ تعالیٰ کی عنایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو، اس کی صورت نوعیہ کے اقتضاء سے، فطری طور پر الہام فرمایا کہ وہ ان حاجات کو رفع کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرے۔ پس یہ امر یقینی ہے کہ ان امور میں تمام افراد انسانی برابر ہوں گے، ہاں ناقص الخلقت انسان مستثنیٰ ہے، جس کے مادہ نے نافرمانی کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کو الہام فرمایا کہ وہ پھل کیسے کھائے؟ پھر وہ مُہال کیسے بنائے جس میں اس کی نوع کے افراد اکٹھا ہوں؟ پھر وہ اپنے سردار کی اطاعت کس طرح کرے؟ پھر وہ شہد کیسے بنائے؟ — اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کو الہام فرمایا ہے کہ وہ کھانا دانا کس طرح تلاش کرے؟ اور کس طرح وہ پانی پر پہنچے؟ اور کس طرح وہ بلی اور شکاری سے بھاگے؟ اور کس طرح وہ لڑے اس سے جو اس کو اس کی ضروریات سے روکے؟ اور بوقت شہوت اس کا نر مادہ سے کس طرح جفتی کرے، پھر دونوں مل کر پہاڑ کے قریب (کس طرح) آشیانہ بنائیں؟ پھر انڈے سینے میں کس طرح ایک دوسرے کی معاونت کریں؟ پھر کس طرح دونوں چوزوں کو چگائیں؟ اور اسی طرح (حیوانات کی) ہر نوع کے لئے ایک قانون ہے، جو صورت نوعیہ کی راہ سے اس نوع کے افراد کے سینوں میں پھونکا گیا ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہام فرمایا کہ وہ ان ضروریات کی تکمیل کے لئے کیا مفید تدابیر اختیار کرے؟ مگر انسان کے لئے اس عام الہام کے ساتھ، تمام انواع پر اس کی برتر صورت نوعیہ کے تقاضے سے، تین چیزیں ملائی گئی ہیں:

ان میں سے ایک: رائے کلی سے کسی چیز کے لئے اٹھ کھڑا ہونا — پس چوپائے اپنی طبیعت سے پیدا ہونے والے داعیہ سے کسی محسوس یا وہمی مقصد ہی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جیسے بھوک پیاس اور شہوت۔ اور انسان کبھی عقلی فائدے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس کام کے لئے اس کی طبیعت کا کوئی تقاضا نہیں ہوتا، پس وہ ملک میں صالح نظام قائم کرنے کا ارادہ کرتا ہے یا اپنے اخلاق کی تکمیل اور اپنے نفس کی تہذیب کرتا ہے، یا عذاب آخرت سے رستگاری کی فکر کرتا ہے، یا لوگوں کے سینوں میں اپنا دبدبہ جماتا ہے۔

اور دوسری چیز: یہ ہے کہ انسان حاجت پوری کرنے کے ساتھ نفاست کو ملاتا ہے — پس چوپایہ صرف وہ چیز چاہتا ہے جس سے وہ اپنی حاجت برآری کرے، اور صرف اپنی ضرورت کو ہٹائے۔ اور انسان کبھی چاہتا ہے کہ حاجت برآری کے علاوہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور اس کا نفس لطف اندوز ہو، اس لئے وہ خوبصورت بیوی، مزے دار کھانا، لباس فاخرہ، اور بلند مکان ڈھونڈھتا ہے۔

اور تیسری چیز: یہ ہے کہ انسانوں میں ایسے صاحب عقل وبصیرت پائے جاتے ہیں جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے مفید تدبیریں وجود میں لاسکتے ہیں۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے سینوں میں وہ بات کھٹکتی ہے جو ان لوگوں کے سینوں میں کھٹکتی ہے، مگر وہ مفید تدبیریں وجود میں نہیں لاسکتا۔ پھر جب وہ عقل مندوں کو دیکھتا ہے، اور ان مفید تدابیر کے بارے میں سنتا ہے، جو انھوں نے نکال رکھی ہیں، تو وہ اس کو دل سے قبول کر لیتا ہے اور اس کو اپنی ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑ لیتا ہے، اس۔ لئے کہ اس نے ان تدبیرات کو اپنے علم اجمالی کے موافق پایا ہے۔

مثلاً ایک شخص بھوکا پیاسا ہوتا ہے، پس وہ کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں پاتا، پس وہ انتہائی تکلیف برداشت کرتا رہتا ہے تا آنکہ اُن دونوں چیزوں کو پالے، پس وہ اپنی اس حاجت کو رفع کرنے کے لئے مفید تدبیریں سوچتا رہتا ہے، اور وہ اس کی کوئی راہ نہیں پایا، پھر اتفاقاً اس کی کسی دانشمند سے ملاقات ہوتی ہے، جو اسی کی طرح ان تکالیف سے دوچار ہو چکا ہے، پس اس نے کھانے کے لئے غلے کو دریافت کر لیا ہے، اور اس نے اس غلہ کو بونے کاٹنے، گاہنے برسانے اور وقت حاجت کے لئے محفوظ رکھنے کا طریقہ نکال لیا ہے۔ اور چشموں اور نہروں سے دور مقامات کے لئے کنویں کھودنے اور مٹکے مشکیزے اور (رہٹ کے) پیالے بنانے کا طریقہ مستنبط کر لیا ہے۔ پس وہ شخص اس کو تدبیرات نافعہ کا ایک باب بنالیتا ہے۔

پھر بیشک وہ غلہ کو یونہی کچا چباتا ہے، پس وہ اس کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا، اور وہ کچے ہی پھل کھاتا ہے، پس وہ ہضم نہیں ہوتے، پس وہ اس سلسلہ میں کوئی اچھی تدبیر چاہتا ہے اور وہ اس کی کوئی راہ نہیں پاتا، پس وہ کسی ایسے دانشمند سے ملتا ہے جس نے پکانے بھننے، پیسنے اور روٹی بنانے کا طریقہ مستنبط کر لیا ہے پس وہ اس کو ایک (دوسرا) باب بنالیتا ہے

اوراسی پر انسان کی تمام حاجات کو قیاس کر لیجئے۔

اور عقل مند آدمی کے سامنے، ان باتوں کے لئے جو ہم نے ذکر کیں گواہی دیتا ہے ممالک میں بہت سی تدبیرات نافعہ کا نیا پیدا ہونا جو پہلے نہیں تھیں، پس اس پر صدیاں گزر گئیں، اور لوگ برابر وہ کام کرتے رہے یہاں تک کہ علوم الہامیہ کی ایسی اچھی خاصی مقدار جمع ہوگئی جو تجربات سے تائید یافتہ ہے۔ اور ان علوم پر لوگوں کے نفوس خشک ہو گئے (یعنی لوگوں کی محنتیں ان علوم پر ہوتی رہیں) اور اسی پر وہ مرتے جیتے رہے۔

اور خلاصہ یہ کہ ان تین چیزوں کے ساتھ ضروری الہامات کا حال ایسا ہے جیسے سانس کا معاملہ کہ اس کی اصل ضروری ہے جیسے نبض کی حرکت اور تحقیق اس کے ساتھ ملایا گیا ہے سانسوں کو چھوٹا بڑا کرنے کا اختیار۔

لغات:

اِستَظَلَّ من الشیئ: سایہ لینا...... اِستَدفَأ: گرم ہونا، گرم کپڑا پہننا...... الیَعسُوب: شہد کی نر مکھی، شہد کی مکھیوں کا بادشاہ...... سَافَدَ مُسافَدَۃ: جفتی کرنا...... الشَبَق: وفور شہوت شبِق (س) شَبَقا: بہت شہوت والا ہونا...... الرَابِیَۃ: برتر، ابھرنے والی رَبَا یَربُو رِبَاءً: زیادہ ہونا، بڑھنا...... حَصَّل الشیئ: حاصل کرنا...... تَفَصّٰی تَفَصِّیًا: رہائی پانا...... سَدَّ (ن) سَدًّا: بند کرنا...... الخَلَّۃ: حاجت...... خَبَزَ (ض) خَبزًا: روٹی پکانا...... حَاوَلَ مُحاوَلۃ: قصد کرنا...... رَتَعَ (ف) رَتعًا: آسودہ زندگی بسر کرنا، یہاں پھل کھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پھل آسودہ لوگ کھاتے ہیں...... قَلٰی یَقلِی قَلْیًا: گوشت وغیرہ بھوننا...... الغاذیۃ (اسم فاعل، واحد مؤنث) خوراک، غَذَا یَغذُو غَذْوًا الرجلَ بالطعام: خوراک دینا۔

تصحیح: یَبِسَتْ اصل میں نَشِبَتْ تھا جس کے معنی ہیں لازم ہونا یعنی ان علوم کے ساتھ لوگوں کے نفوس چمٹے رہے۔ تصحیح مخطوطات سے کی گئی ہے، تینوں مخطوطوں میں یَبِسَتْ ہے۔

تشریح:

(۱) انسان کی حد تام ہے حیوانٌ ناطقٌ اس میں حیوان جنس ہے اور ناطق فصل۔ پس حیوان انسان کی جنس ہے، اور اس جنس کے جتنے افراد ہیں یعنی تمام حیوانات، وہ انسان کے ابنائے جنس ہیں — اور انسان خود حیوان کی ایک نوع ہے اس نوع کے جتنے افراد ہیں، وہ سب انسان کے ابنائے نوع ہیں۔

(۲) رائے کلی: یہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کا مقابل رائے جزئی ہے۔ مولانا سندھی رحمہ اللہ نے رائے کلی کا مفہوم عقل تام اور فکر کامل بیان کیا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ مفاد عامہ کے لئے کام کرنا رائے کلی ہے پس ذاتی اور شخصی غرض کے لئے کام کرنا رائے جزئی ہے۔

☆ ☆ ☆

ارتفاقات مستنبط کرنے کا طریقہ

انسان کے جو تین امتیازی اوصاف ہیں یعنی رائے کلی کے پیش نظر اقدام کرنا، ضروریات کی تکمیل میں نفاست کا خیال رکھنا اور بعض لوگوں کا تدبیرات نافعہ مستنبط کرنا اور دوسروں کا ان میں پیروی کرنا، ان تین باتوں میں تمام انسان برابر نہیں۔ لوگوں کے مزاج اور عقلیں متفاوت ہیں اور ان تین باتوں کا تعلق مزاج اور عقل سے ہے۔ نیز تمام لوگ ان تین باتوں میں غور وفکر کے لئے فارغ بھی نہیں، نہ سب لوگ عمرانیات (Sociology) کا پورا علم رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ارتفاقات کے دو درجے ہوگئے:

پہلا درجہ: تمدن کا معمولی درجہ ہے، جیسے خانہ بدوش لوگوں کی تہذیب، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسنے والوں کا تمدن اور زمین کے غیر آباد کناروں میں سکونت پذیر لوگوں کی معاشرت — تمدن کا یہ درجہ ارتفاق اول یعنی تمدن کا ابتدائی درجہ (دیہی تمدن) کہلاتا ہے۔

دوسرا درجہ: ترقی یافتہ تمدن، جیسے شہری لوگوں کا رہن سہن اور قابل رہائش خطوں کی آباد بستیوں کا تمدن —— ایسے اجتماعات میں ضروری ہوتا ہے کہ دانشمند لوگ اور اخلاق فاضلہ کے حاملین پیدا ہوں۔ گنجان آبادی، ضرورتوں کی زیادتی اور تجربات کی فراوانی معیشت کے اعلیٰ طریقے مستنبط کرنے کا باعث ہوتی ہے اور لوگ ان طریقوں کو اپنا بھی لیتے ہیں۔ تمدن کا یہ درجہ ارتفاق ثانی یعنی ترقی یافتہ تمدن یا شہری تمدن کہلاتا ہے پھر شہری تمدن کا بھی اعلیٰ درجہ شاہوں کی معیشت ہے، ان کے دربار میں دنیا بھر کے دانشمند جمع ہوتے ہیں، اس لئے شاہ صاحبان ان سے معیشت کے بہترین طریقے اخذ کرتے ہیں اور ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

پھر جب ترقی یافتہ تمدن وجود پذیر ہو جاتا ہے تو تین وجوہ سے نظام حکومت ضروری ہوتا ہے:

(۱) جب لوگوں میں باہم معاملات ہوتے ہیں، تو ان میں کبھی حرص وحسد، حق نادہندگی اور جانتے ہوئے بھی حق کے انکار کی برائیاں درآتی ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں میں اختلافات اور نزاعات جنم لیتے ہیں ان سے نمٹنے کے لئے نظام حکومت ضروری ہے۔

(۲) ہر بڑے اجتماع میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر ردی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے، یا ان میں فطری طور پر قتل وغارت گری کی جرأت ہوتی ہے اور وہ بے باک ہوتے ہیں، ایسے لوگ معاشرہ کے لئے دردسر بن جاتے ہیں ان سے نمٹنے کے لئے نظام حکومت ضروری ہے۔

(۳) ترقی یافتہ تمدن میں کچھ ایسی مفید اسکیمیں ہوتی ہیں جن کا نفع عام ہوتا ہے، جیسے سڑکیں اور پل بنانا، ریل کا سلسلہ پھیلانا، پانی بجلی کا انتظام کرنا وغیرہ۔ یہ کام کوئی ایک شخص نہیں کرسکتا، یا کرسکتا ہے مگر آسان نہیں ہوتا یا وہ اس کے

لئے آمادہ نہیں ہوتا تو نظام حکومت ضروری ہے، جو ایسے کاموں کو انجام دے۔

غرض مذکورہ بالا تین ضرورتوں سے لوگ مجبور ہوئے کہ نظام حکومت قائم کریں، تاکہ سرکار لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرے، قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے، بے باک لوگوں کو لگام دے اور لوگوں سے محصول وصول کرکے اس کے مصارف میں خرچ کرے یعنی نفع عام کے کام کرے — نظام حکومت کا نام ارتفاق ثالث یعنی ترقی یافتہ تمدن پر کنٹرول کرنے والا نظام ہے۔

پھر جب علاقہ واری حکومتیں قائم ہوجاتی ہیں تو ایک مرکزی حکومت کا قیام ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ جب بہت سی حکومتیں قائم ہوجاتی ہیں اور ہر مملکت کے پاس خزانہ اور فوج جمع ہوجاتی ہے تو کبھی ان شاہوں میں خودغرضی اور حرص وکینہ درآتا ہے اور ان میں باہم اختلاف ہوجاتا ہے اور جنگ شروع ہوجاتی ہے، اس لئے خلیفہ (شہنشاہ) کا انتخاب ضروری ہوجاتا ہے یا پھر تمام بادشاہ کسی ایسی شخصیت یا حکومت کی اطاعت پر متفق ہوجائیں جو ان پر خلیفہ کی طرح مسلط ہو، جو سب شاہوں کو ان کے دائرہ میں رکھے، کسی کو کسی پر زیادتی نہ کرنے دے، جیسے اس زمانہ میں سپر پاور (طاقت بالا) یہ فریضہ انجام دیتا ہے —— اس مرکزی نظام حکومت کا یا کسی بڑی حکومت کے بلاک میں شامل ہونے کا نام ارتفاق رابع یعنی مختلف ممالک پر کنٹرول کرنے والا نظام ہے۔

فوائد

(۱) خلیفہ سے مراد وہ شخص ہے جس کو اس درجہ شوکت ودبدبہ حاصل ہو کہ کوئی شخص اس کا ملک چھین نہ سکے، عادۃً یہ بات ناممکن نظر آتی ہو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور فیصلہ سے سب کچھ ہوسکتا ہے ﴿كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرہ:۲۴۹) (بارہا ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہے) اسی طرح بھاری فوج اور ڈھیروں مال خرچ کرکے بھی اس کو ہرایا جاسکتا ہے، مگر اس پر مدتہائے دراز میں کوئی ہی قادر ہوتا ہے۔

(۲) بادشاہ (حکومت) اور خلیفہ (مرکزی حکومت) کی ضرورت اشخاص وعادات کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے۔ جو اقوام سخت جنگجو اور تیز طبیعت ہوتی ہیں وہ بادشاہوں اور خلفاء کی زیادہ محتاج ہوتی ہیں ان اقوام سے جو حسد وعداوت میں فروتر ہوتی ہے۔

نوٹ: آئندہ ابواب میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے ارتفاقات کے اصول اور ان کے ابواب کے مسائل کی صرف فہرست بیان کی ہے، تفصیل نہیں کی، کیونکہ تفصیل طولانی ہے۔ اور یہ وہ اصول ومسائل ہیں جن کو اخلاق فاضلہ کی حامل امتوں نے مان لیا ہے اور ان کو مسلمہ طریقہ بنالیا ہے، ان میں کسی کا بھی اختلاف نہیں، نہ قریب کے لوگوں کا نہ دور کے لوگوں کا یہ سب باتیں اجماعی اور متفق علیہ ہیں، لہٰذا آئندہ ابواب میں ان باتوں کو غور سے پڑھا جائے۔

شاہ صاحب کی اصطلاح میں بدوی معاشرت یعنی صحرائی رہن سہن ارتفاق اول ہے اور ترقی یافتہ تمدن یعنی شہری معاشرت ارتفاق ثانی ہے اور نظام حکومت ارتفاق ثالث ہے اور مرکزی نظام حکومت یعنی خلافت کبری ارتفاق رابع ہے۔

ولما كانت هذه الثلاثة لاتوجد في جميع الناس سواءً، لاختلاف أمزجة الناس وعقولهم، الموجِبَة للانبعاث من رأى كلي، ولحُب الظرافة، ولاستنباط الارتفاقات والاقتداء فيها؛ ولاختلافهم في التفرُّغ للنظر، ونحو ذلك من الأسباب: كان للارتفاقات حدَّان:

الأول: هو الذى لايمكن أن ينفك عنه أهلُ الاجتماعات القاصرة، كأهل البَدْو وسُكَّان شواهق الجبال، والنواحي البعيدة من الأقاليم الصالحة؛ وهو الذى نُسميه بالارتفاق الأول.

والثاني: ماعليه أهل الحضر والقُرَى العامرةِ من الأقاليم الصالحة، المستوجبةِ أن يَنْشأ فيها أهلُ الأخلاق الفاضلة والحكماءُ، فإنه كثُر هنالك الاجتماعات، وازدحمت الحاجاتُ، وكثرت التجاربُ، فاستُنْبطت سُننٌ جزيلة، وعَضُّوا عليها بالنواجذ؛ والطرف الأعلى من هذا الحد: ما يتعامله الملوكُ أهلُ الرفاهية الكاملة، الذين يَرِدُ عليهم حكماءُ الأمم، فينتحلون منهم سُننا صالحة؛ وهو الذى نسميه بالارتفاق الثاني.

ولما كَمُل الارتفاق الثاني أوجب ارتفاقاً ثالثًا، وذلك: أنهم لما دارت بينهم المعاملاتُ، وداخَلَها الشُّحُ والحسد والمَطَلُ والتجاحد، نشأت بينهم اختلافاتٌ ومنازعات؛ وأنهم نشأ فيهم من تَغْلِبُ عليه الشهواتُ الرديئة، أو يُجْبَلُ على الجرأة فى القتل والنهب، وأنهم كانت لهم ارتفاقاتٌ مشتركةُ النفع، لايطيق واحد منهم إقامتَها، أولا تسهَل عليه، أولا تسمَح نفسُه بها: فاضطروا إلى إقامة مَلِكٍ يقضي بينهم بالعدل، ويزجُر عاصيَهم، ويقاوم جريئَهم، ويَجْبِي منهم الخَراجَ، ويصرفه في مصرفه.

وأوجب الارتفاق الثالث ارتفاقا رابعًا، وذلك: أنه لما انفرز كلُّ مَلِكٍ بمدينته، وجُبِى إليه الأموالُ، وانضَمَّ إليه الأبطالُ، وداخَلَهم الشحُ والحرص والحِقد، تشاجروا فيما بينهم وتقاتلوا، فاضطروا إلى إقامة الخليفة، أو الانقياد لمن تسلَّط عليهم تسلُّطَ الخلافة الكبرى.

وأعنى بالخليفة: من يحصل له من الشوكة ما يُرى معه كالممتنع أن يسلُبَه رجلٌ آخرُ ملكه؛ اللهم إلا بعد اجتماعات كثيرة، وبذلِ أموال خطيرة، لايتمكن منها إلا واحدٌ فى القرون المتطاولة.

ويختلف الخليفة باختلاف الأشخاص والعادات، وأيُّ أُمةٍ طبائعُها أشدُّ أحدُّ، فهي أحوجُ

إلى الملوك والخلفاء ممن هي دونها في الشح والشَّحْناء.
ونحن نريد أن نُنَبِّهَك على أصول هذه الارتفاقات، وفهارسِ أبوابها، كما أوجبه عقولُ الأمم الصالحة ذوي الأخلاق الفاضلة، واتخذوه سنةً مسلمةً، لايختلف فيها أقاصيهم ولا أدانيهم، فاستمع لما يُتلٰى عليك.

ترجمہ: اور جب یہ تین چیزیں تمام انسانوں میں برابر درجہ میں نہیں پائی جاتیں، لوگوں کے مزاجوں اور عقلوں کے متفاوت ہونے کی وجہ سے، جو واجب کرنے والے ہیں رائے کلی سے اقدام کرنے کو اور نفاست پسندی کو اور تدبیرات نافعہ کے نکالنے کو اور ان میں پیروی کرنے کو، اور غور وفکر کرنے کے لئے فارغ ہونے میں لوگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے، اور اس قسم کے دوسرے اسباب کی وجہ سے، تو ارتفاقات کی دو حدیں ہوگئیں:

پہلی حد: وہ ہے جس سے جدا رہ ہی نہیں سکتے، ادنی درجہ کے تمدن والے (بھی) جیسے خانہ بدوش، پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسنے والے اور قابل رہائش علاقوں سے دور کناروں کے باشندے۔ اور یہی وہ حد ہے جس کو ہم ارتفاق اول کہتے ہیں

دوسری حد: وہ ہے جس پر شہروں کے باشندے اور قابل رہائش خطوں کی آباد بستیوں کے بسنے والے ہیں، جن خطوں کے لئے لازم ہے کہ ان میں دانشمند اور اخلاق فاضلہ والے لوگ پیدا ہوں، اس لئے کہ ایسی جگہوں میں لوگوں کا بڑا بھاری اجتماع رہتا ہے، اور ضرورتوں کی بھیڑ ہوتی ہے اور تجربات کی کثرت ہوتی ہے، اس لئے وہاں اعلی درجہ کے طریقے نکالے جاتے ہیں، اور لوگ ان کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑتے ہیں ـــــ اور اس حد کا اعلی درجہ وہ ہے جس کو کامل ٹھاٹھ کرنے والے بادشاہ برتتے ہیں، جن کے پاس اقوام کے حکماء جمع ہوتے ہیں، پس وہ ان سے مفید طریقے اخذ کرتے ہیں ـــــ اور یہی وہ حد ہے جس کو ہم ارتفاق ثانی کہتے ہیں:

اور جب ارتفاق ثانی مکمل ہو جاتا ہے تو وہ ارتفاق ثالث کو واجب کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جب لوگوں میں باہمی معاملات ہوتے ہیں اور اُن میں خودغرضی، حسد، ٹال مٹول اور حق کا انکار کرنا در آتا ہے تو لوگوں میں جھگڑے اور اختلافات پیدا ہوتے ہیں؛ اور اس طرح کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن پر نفسانی خواہشات غالب ہوتی ہیں، یا وہ قتل وغارت گری کی جرأت پر پیدا کئے جاتے ہیں؛ اور اس طرح کہ ان لوگوں کی کچھ ایسی مفید اسکیمیں ہوتی ہیں جن کا نفع عام ہوتا ہے، اور ان میں سے ایک شخص ان کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا، یا ایک شخص کے لئے وہ آسان نہیں ہوتیں یا ایک شخص ان کی فیاضی نہیں کرتا، تو لوگ مجبور ہوتے ہیں ایسے بادشاہ کو مقرر کرنے کی طرف جو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرے، اور ان کے نافرمان کو جھڑکے، اور ان کے بے باک کا مقابلہ کرے اور ان سے محصول وصول کرے، اور اس کو اس کے مصرف میں خرچ کرے۔

اور ارتفاق ثالث ارتفاق رابع کو واجب کرتا ہے، اور وہ اس طرح کہ جب ہر بادشاہ اپنی مملکت کے ساتھ جدا ہو جاتا

ہے، اور اس کے پاس مال جمع کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ بہادر لوگ مل جاتے ہیں، اور ان میں خود غرضی، حرص اور کینہ در آتا ہے، تو ان میں باہم اختلاف ہو جاتا ہے اور وہ آپس میں لڑتے ہیں، پس وہ مجبور ہوتے ہیں خلیفہ منتخب کرنے کی طرف، یا ایسے شخص کی اطاعت کرنے کی طرف جوان پر خلافتِ کبریٰ کے مسلط ہونے کی طرح مسلط ہو۔

اور میں خلیفہ سے مراد لیتا ہوں ایسے شخص کو جس کو اس درجہ دبدبہ حاصل ہو کہ اس کے ساتھ محال جیسا نظر آتا ہو کہ کوئی دوسرا شخص اس کے ملک کو چھین لے۔ اے اللہ! مگر بھاری اجتماع اور ڈھیر سارا مال خرچ کرنے کے بعد، مگر اس پر مدتہائے دراز میں کوئی ایک ہی کامیاب ہوتا ہے۔

اور خلیفہ کی ضرورت اشخاص وعادات کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے۔ اور جن اقوام کی طبیعتیں سخت اور تیز ہوتی ہیں وہ بادشاہوں اور خلفاء کی زیادہ محتاج ہوتی ہیں، ان اقوام سے جو خود غرضی اور عداوت میں فروتر ہوتی ہے۔

اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان ارتفاقات کے اصولوں اور ان کے ابواب کی فہارس سے آگاہ کریں، جس طرح اُن کو اخلاق فاضلہ رکھنے والی صالح امتوں کی عقلوں نے ثابت کیا ہے، اور ان کو مسلمہ طریقہ بنالیا ہے، نہ ان میں قریب کے لوگوں کا اختلاف ہے نہ دور کے لوگوں کا۔ پس آپ وہ باتیں سماعت فرمائیں جو آپ کے سامنے (آئندہ ابواب میں) پیش کی جاتی ہیں۔

لغات:

اِنْتَحَلَ کذا: اپنی طرف منسوب کرنا ...... قَاوَمَ مقاومۃ: مخالفت کرنا، مقابلہ کرنا ...... جَبَا (ن) جَبًا و جَبًی (ض) جِبَایَۃً: جمع کرنا ...... کان للارتفاقات جزاء ہے لما کانت ھذہ الثلاثۃ إلخ کی ...... أنھم نشأفیھم اور أنھم کانت لھم کا عطف أنھم لما دارت پر ہے ...... الشح (مثلثۃ الشین) انتہائی درجہ کا بخل، خود غرضی ...... اَقَاصِیْ اور اَقَاصٍ جمع ہیں الأقصی (اسم تفضیل) کی، جس کے معنی ہیں بہت دور ...... اَدَانِیْ اور اَدَانٍ جمع ہیں الأدنی (اسم تفضیل) کی جس کے معنی ہیں نزدیک ...... فَهَارِس جمع ہے فِهْرِس کی اور یہ معرب ہے فہرست کا جو فارسی کلمہ ہے۔

تشریح:

اقالیم صالحہ یعنی وہ علاقہ جو بود وباش کے لئے اچھا ہے۔ یہ خط جَدی اور خط سرطان کے درمیان کا علاقہ ہے۔ اس خطہ میں موسم نہ بہت زیادہ گرم ہوتا ہے، نہ بہت زیادہ سرد اور شب وروز میں تفاوت بھی بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ بات بجلی (Electricity) اور بھاپ (Steam) کی دریافت سے پہلے کی ہے۔ اب لوگ مصنوعی زندگی (Artificial Life) گزارنے لگے ہیں، اس لئے پورا کرۂ ارض بود وباش کے اعتبار سے یکساں ہو گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ــــــ ۲

ارتفاق اول میں شامل چیزیں

ارتفاق اول یعنی دیہی تمدن میں بھی کم از کم گیارہ چیزیں ضرور پائی جاتی ہیں:

۱ ـــــ زبان یعنی بولی ـــــ انسانی معاشرہ خواہ کتنا ہی فروتر یعنی ابتدائی مرحلہ میں ہو، وہ کوئی نہ کوئی زبان ضرور بولتا ہے کیونکہ انسان حیوان ناطق ہے۔ ناطق کے معنی ہیں وہ جاندار جو الفاظ کی مدد سے اپنا مافی الضمیر سمجھاتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے، اس لئے کوئی انسانی معاشرہ بے زبان نہیں ہوسکتا ـــــ پھر زبان کی دو قسمیں ہیں اصلی اور فرعی۔ اصلی یعنی اُم الألسنہ وہ زبان ہے جو بذات خود وجود میں آتی ہے اور فرعی زبان وہ ہے جو دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر بنائی جاتی ہے مثلاً اردو اور انگریزی فرعی زبانیں ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت وغیرہ زبانوں سے الفاظ لے کر اردو بنی ہے اور انگریزی بہت سی یورپین زبانوں کا مجموعہ ہے اس میں عربی کے الفاظ بھی ہیں۔

اصلی زبانیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ اس بارے میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تین بنیادی باتیں بیان کی ہیں:

اول: جب کوئی جسم یا کوئی فعل یا کوئی حالت، مجاورت یا سببیت یا کسی اور طرح سے کسی آواز سے ملتے ہیں، تو اس آواز کو بعینہٖ زبان میں نقل کرلیا جاتا ہے جیسے ٹھوس جسم، جسم سے ملتا ہے تو ''کھٹ'' کی آواز، اور بار بار ملتا ہے تو ''کھٹ کھٹ'' کی آواز، اور تلواریں متواتر چلتی ہیں تو ''چکا چک'' کی آواز پیدا ہوتی ہے اسی طرح کورے کپڑے پہن کر چلنے سے ''سرسر'' کی آواز، اور تیز ہوا کے چلنے سے ''سائیں سائیں'' کی آواز پیدا ہوتی ہے، اسی طرح صدمہ اور سخت افسوس کے وقت جو منہ سے تیز سانس نکلتا ہے اس سے ''آہ'' کی آواز پیدا ہوتی ہے، ان آوازوں کو زبان میں نقل کرلیا جاتا ہے یعنی یہی آوازیں الفاظ بن گئی ہیں۔ پھر مختلف معانی کے لئے اشتقاق کے ذریعہ مختلف الفاظ بنالئے گئے ہیں، جیسے کھٹکا، کھٹکانا، کھٹکنا، کھٹکا لگا رہنا، کھٹکا لگنا، کھٹکا گزرنا، کھٹکا مٹنا، کُھٹکا (کھڑکا) کھٹکا ہونا وغیرہ۔ اسی طرح سرسر، سائیں سائیں، چکا چک اور آہ سے بھی مختلف الفاظ بنائے گئے ہیں۔

دوم: نگاہ کو متاثر کرنے والی چیز کو، اور نفس میں کوئی وجدانی کیفیت پیدا کرنے والی چیز کو قسم اول کے مانند قرار دے کر اس کے لئے بھی کوئی آواز بہ تکلف بنالی جاتی ہے، جیسے سورج کی طرف مسلسل دیکھنے سے نگاہ پر جو اثر پڑتا ہے اس کے لئے ''چکا چوندھ'' اور روشنی کے بار بار جلنے بجھنے سے جو وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے لئے ''جھپ جھپ'' کی آواز بنالی گئی، پھر اس میں اشتقاق کرکے بہت سے الفاظ بنالئے گئے۔

سوم: علاقۂ مشابہت یا مجاورت کی وجہ سے لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے یا کسی مناسبت سے لفظ کو کسی

دوسرے معنی میں نقل کیا جاتا ہے جیسے بے تمیز کے لئے ''گدھا'' اور بے وقوف کے لئے ''بیل'' اور موچی کے پاس بیٹھنے کی وجہ سے خالد حذّاء (موچی) مجازاً کہا جاتا ہے (خالد حذاء حدیث شریف کے ایک راوی ہیں) اور لفظ صلاۃ کو جس کے اصلی معنی دعا کے ہیں، نماز کے لئے نقل کرلیا گیا ہے۔ کیونکہ نماز بھی دعا پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں زبان کے سلسلہ میں دیگر اصول بھی ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''ان کو آپ ہمارے کلام میں کہیں کہیں پائیں گے'' مگر حجۃ اللہ البالغہ میں تو کہیں ان کا تذکرہ نہیں آیا اور دیگر کتابوں میں بھی یاد نہیں پڑتا۔

اور یہ خیال بے دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام زبانیں سکھلادی تھیں اور اس سلسلہ میں ﴿وعلّم آدم الأسماء كلّها﴾ (سورۃ البقرہ ۳۱) سے استدلال اس لئے درست نہیں کہ مفسرین نے اسماء کی اتنی تفسیریں کی ہیں کہ آیت متشابہ بن گئی ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اسماء سے مسمیات (چیزیں) مراد لی ہیں وہ فرماتے ہیں المراد بالأسماء صفات الأشياء ونعوتها وخواصها، لأنها علامات دالة على ماهياتها فجاز أن يعبر عنها بالأسماء (روح المعانی ۱:۲۲۴)

۲ — دیہی تمدن میں بھی لوگ کھیتی باڑی، باغبانی، کنویں کھودنے، کھانا پکانے اور لاون بنانے کا طریقہ جانتے ہیں۔

۳ — ظروف سازی اور چمڑے کی مشکیں بنانے کے طریقے بھی لوگ جانتے ہیں۔

۴ — چوپایوں کو سدھانے اور پالنے کا بھی ان میں رواج ہوتا ہے تاکہ ان پر سواری کریں، ان کا گوشت استعمال کریں، ان کی کھالوں، بالوں اور اون سے کام لیں اور ان کے دودھ اور نسل سے متمتع ہوں۔

۵ — مکان بنانے کے طریقے بھی وہ لوگ جانتے ہیں، تاکہ گرمی سردی میں ان میں ٹھکانہ حاصل کریں، خواہ وہ پہاڑوں کی غاریں یا پھونس کے جھونپڑے ہی کیوں نہ ہوں۔

۶ — لباس جو انسان کے لئے زینت ہے اس سے بھی لوگ واقف ہوتے ہیں، خواہ وہ چوپایوں کے چمڑے کا ہو، یا درختوں کے پتوں کا ہو یا انسانی مصنوعات کا۔

۷ — ان میں نکاح کا طریقہ بھی رائج ہوتا ہے یعنی عقد کے ذریعہ وہ زن منکوحہ کی تعیین کرتے ہیں، تاکہ کوئی دوسرا اس میں مزاحمت نہ کرے، جس سے وہ اپنی خواہش پوری کرے، نسل بڑھائے، خانگی ضرورتوں میں اس سے مدد لے اور اولاد کی تربیت اور پرورش میں اس سے اعانت حاصل کرے۔

اور انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں جوڑا محض اتفاق سے متعین ہوتا ہے یعنی اتفاقیہ طور پر نر و مادہ ساتھ ہوجاتے ہیں اور ساتھ ساتھ رہنے لگتے ہیں یا ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں یا انڈوں سے نکلتے ہیں اور بڑے ہونے تک ساتھ ساتھ رہتے ہیں تو بلوغ کے بعد ان کا جوڑا بن جاتا ہے اور اسی قسم کے دیگر اسباب کی وجہ سے ان کا جوڑا قائم ہوتا ہے۔

۸ — دیہی تمدن میں بھی لوگ وہ کاریگریاں جانتے ہیں، جن کے بغیر کھیتی باڑی، باغبانی، کنوؤں کی کھدائی اور مویشیوں کی تسخیر نہیں ہوسکتی۔ جیسے پھاوڑا، کدال، ڈول، رسی، ہل کا پھار وغیرہ چیزیں بنانا وہ جانتے ہیں۔

۹ــــ تبادلۂ اشیاء کے طریقے اور بعض اہم کاموں میں تعاون باہمی کی شکلیں بھی ان میں رائج ہوتی ہیں۔تبادلۂ اشیاء کی تفصیل اسی مبحث کے باب پنجم (معاملات کے بیان) میں آرہی ہے۔

۱۰ ــــ ان میں قبائلی حکومت بھی ہوتی ہے۔وہ شخص جوان میں سب سے زیادہ صائب الرائے اور مضبوط گرفت والا ہوتا ہے،وہ دوسروں کو مسخر کرکے سردار بن جاتا ہے اور کسی نہ کسی نہج سے ٹیکس وصول کرکے حکومت کا نظام چلاتا ہے۔

۱۱ ــــ ان میں ایسے مسلمہ قوانین بھی ہوتے ہیں جن سے باہمی نزاعات میں فیصلہ کیا جاتا ہے،ظالموں پر روک لگائی جاسکتی ہے اور جوان سے برسر پیکار ہواس سے نمٹا جاسکتا ہے۔

فائدہ: ہرقوم میں چار قسم کے لوگ ضرور ہوتے ہیں:

(۱) وہ لوگ جو اہم کاموں میں مفید اسکیمیں بناسکیں،تاکہ دوسرے لوگ ان کی پیروی کریں اور ان کی اسکیم پر کار بند ہوں۔

(۲) وہ لوگ جو کسی بھی طرح لطافت پسند،آسودگی کے خواہاں اور آرام طلب ہوں۔

(۳) وہ لوگ جو اپنے کمالات پر فخر کریں،جیسے بہادری،فیاضی،فصاحت اور زیرکی وغیرہ کمالات پر فخر کریں۔

(۴) وہ لوگ جو شہرت کے خواہاں ہوں اور اپنی عظمت ودبدبہ کو بلند کرنا چاہتے ہوں۔

فائدہ: قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا تذکرہ فرمایا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ارتفاق اول میں پائی جانے والی باتوں کا الہام فرمایا ہے۔شہری تمدن میں پائی جانے والی باتوں کا اور شاہوں اور امیروں کو جو نعمتیں بخشی ہیں ان کا تذکرہ نہیں فرمایا۔کیونکہ اللہ پاک جانتے ہیں کہ قرآن کریم اور اس کی ہدایت تمام انسانوں کے لئے ہے اور تمام لوگوں میں پائی جانے والی نعمتیں یہی ارتفاق اول کی نعمتیں ہیں،اس لئے سب لوگ انہی کو سمجھ سکتے ہیں واللہ اعلم

نوٹ: ارتفاق اول کے لئے بس یہی ایک باب ہے۔

﴿باب الارتفاق الأول﴾

منه : اللغة المعبِّرةُ عما في ضمير الإنسان؛ والأصل في ذلك : أفعال وهيئات وأجسامٌ تُلابِس صوتاً،بالمجاورة أو التسبب أو غيرهما، فيُحكَى ذلك الصوتُ كما هو، ثم يُتَصرف فيه باشتقاق الصِّيَغ ، بإزاء اختلاف المعاني،ويُشَبَّه أمورٌ مؤثِّرة في الأبصار، أو مُحدِثَةٌ لهيئاتٍ وجدانية في النفس بالقسم الأول، ويُتكلَّف له صوتٌ كمِثْله، ثم اتَّسعت اللغاتُ بالتجوُّز، لمشابهة أو مجاورة، والنقلِ لعلاقةٍ ما؛ وهنالك أصول أخرى ستجدها في بعض كلامنا.

ومنه: الزرع والغَرْس وحفر الآبار، وكيفية الطبخ والائتدام.

ومنه: اصطناع الأواني والقِرَب.

ومنه: تسخير البهائم واقتناؤُها، لِيُسْتعان بظهورها ولحومها وجلودها، وأشعارها، وأوبارها، وألبانها، وأولادها.

ومنه: مسكن يُؤويه من الحرِّ والبرد، من الغِيْرَان والعُشوش ونحوها.

ومنه: لباس يقوم مقام الريش، من جلود البهائم، أو أوراق الأشجار، أو مما عملت أيديهم.

ومنه: أنِ اهتدى لتعيين منكوحة لايزاحمه فيها أحد، يدفع بها شَبَقه، ويذرأ بها نسله، ويستعين بها في حوائجه المنزلية، وفي حِضانة الأولاد وتربيتها؛ وغيرُ الإنسان لايُعَيِّنها إلا بنحو من الاتفاق، أو بكونهما توأمَيْن أدركا على المرافقة، ونحو ذلك.

ومنه: أنِ اهتدى لصناعات لايتم الزرعُ والغرس والحفر، وتسخيرُ البهائم وغيرُ ذلك إلا بها، كالمِعْوَل والدلو والسِّكّة والحبال ونحوها.

ومنه: أنِ اهتدى لمبادلات ومعاونات في بعض الأمر.

ومنه: أن يقوم أسدُّهم رأيا، وأشدُّهم بطشا، فيسخِّر الآخرين، ويَرْأس ويرْبَع، ولو بوجهٍ من الوجوه.

ومنه: أن تكون فيهم سنةٌ مسلمةٌ لفصل خصوماتهم، وكَبْح ظالمهم، ودفع من يريد أن يغزوهم.

ولابد أن يكون في كل قوم من يستنبط طرق الارتفاق فيما يَهُمُّهم شأنُه، فيقتدي به سائر الناس؛ وأن يكون فيهم من يحب الجمال والرَّفاهية والدَّعَة، ولو بوجهٍ من الوجوه؛ ومن يباهي بأخلاقه: من الشجاعة والسماحة والفصاحة والكَيْس وغيرها؛ ومن يُحب أن يطير صِيتُه، ويرتفعَ جاهُه.

وقد مَنَّ الله تعالى في كتابه العظيم على عباده بإلهام شُعَبِ هذا الارتفاق، لعلمه بأن التكليف بالقرآن يَعُمُّ أصنافَ الناس، وأنه لايشملُهم جميعا إلا هذا النوع من الارتفاق؛ والله أعلم.

ترجمہ: ارتفاق اول کا بیان: اور اس میں سے وہ بولی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے مافی الضمیر کو تعبیر کرتا ہے۔ اور زبان کی اصل: وہ افعال، کیفیات اور اجسام ہیں جو مجاورت یا سببیت یا ان کے علاوہ کسی اور طرح سے، کسی بھی آواز سے ملتے ہیں، پس وہ آواز بعینہ نقل کر لی جاتی ہے۔ پھر مختلف معانی کے مقابل صیغے بنانے کا تصرف کیا جاتا ہے ——— اور نگاہوں کو متاثر کرنے والی چیزوں کو، یا نفس میں وجدانی کیفیت پیدا کرنے والی چیزوں کو پہلی قسم کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، اور بہ تکلف اس کے لئے کوئی آواز بنالی جاتی ہے ——— پھر علاقۂ مشابہت یا علاقہ مجاورت کی وجہ سے مجازی معنی لینے

سے اور کسی اور تعلق کی وجہ سے (لفظ کو ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف) نقل کرنے سے زبانیں پھیلتی ہیں — اور زبان کے بارے میں کچھ اور اصول بھی ہیں، جن کو آپ ہمارے کلام میں کہیں کہیں پائیں گے۔

اور اس میں سے: کھیتی باڑی، باغبانی، کنویں کھودنا اور پکانے اور لاون بنانے کا طریقہ ہے۔

اور اس میں سے: ظروف سازی اور مشکیں بنانا ہے۔

اور اس میں سے: چوپایوں کو سدھانا اور ان کو پالنا ہے، تاکہ ان کی پیٹھ، گوشت، کھال، بال، اون، دودھ اور نسل سے کام لیا جائے۔

اور اس میں سے: مکان ہے، جس میں انسان گرمی سردی میں ٹھکانا حاصل کرے، خواہ وہ غاریں ہوں یا جھونپڑے یا اس قسم کی کوئی اور چیز۔

اور اس میں سے: لباس ہے، جو (زینت میں) پرندوں کے پروں کے قائم مقام ہوتا ہے۔ خواہ وہ چوپایوں کی کھالوں کا ہو یا درخت کے پتوں کا یا انسانی مصنوعات کا۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ دیہی تمدن والوں نے (بھی) ایسی زن منکوحہ کی تعیین کی راہ پالی ہے، جس میں کوئی دوسرا اس سے مزاحمت نہ کرے، جس سے وہ اپنی خواہش پوری کرے، اور جس کے ذریعہ وہ اپنی نسل بڑھائے اور جس سے وہ اپنی خانگی ضرورتوں میں اور اولاد کی تربیت اور پرورش میں اعانت حاصل کرے ——— اور انسان کے علاوہ دیگر حیوانات اپنے جوڑے کو متعین نہیں کرتے مگر اتفاقیہ طور پر، یا دونوں کے ایسے جڑواں ہونے کی وجہ سے جو ساتھ ساتھ بلوغ تک پہنچے ہیں یا اس کے علاوہ دیگر اسباب کی وجہ سے (ان کا جوڑا قائم ہوتا ہے)

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ انسان نے ایسی کاریگریوں کی راہ پالی ہے جن کے بغیر کھیتی باڑی، باغبانی، کنوؤں کی کھدائی اور مویشیوں کو سدھانا وغیرہ کام تکمیل پذیر نہیں ہوسکتے، جیسے پھاوڑا، ڈول، ہل کا پھار، رسیاں اور ان جیسی چیزیں۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ اس نے (یعنی دیہی تمدن والوں نے) تبادلۂ اشیاء کی اور بعض کاموں میں تعاون باہمی کی راہ پالی ہے۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ وہ شخص اٹھے جو ان میں سب سے زیادہ صائب الرائے ہو، اور مضبوط پکڑ والا ہو، جو دوسروں کو مسخر کرے، اور سردار بنے اور کسی نہ کسی نہج سے ٹیکس وصول کرے۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ ان میں باہمی نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لئے، ظالم کو لگام دینے کے لئے اور جو شخص ان سے برسرِ پیکار ہو اس سے نمٹنے کے لئے کوئی مسلمہ طریقہ ہو۔

اور ضروری ہے کہ ہر قوم میں ایسے لوگ ہوں جو ان امور میں جن کا معاملہ لوگوں کو فکر مند بنائے ہوئے ہو، مفید اسکیمیں بنا سکیں، پس دوسرے لوگ اس کی پیروی کریں اور یہ کہ ان میں ایسے لوگ ہوں جو کسی نہ کسی نہج پر لطافت پسند،

آسودگی کے خواہاں اور آرام طلب ہوں اور ایسے لوگ ہوں جو اپنے کمالات پر فخر کریں، جیسے بہادری، فیاضی، فصاحت اور زیرکی وغیرہ اور ایسے لوگ ہوں جو چاہتے ہوں کہ ان کی شہرت پھیلے اور ان کا دبدبہ بلند ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عظیم میں ارتفاق اول کے مشمولات کو الہام کرنے کے ذریعہ، اپنے بندوں پر احسان جتلایا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے ذریعہ احکام شرعیہ کا حکم ہر قسم کے لوگوں کو عام ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ تمام لوگوں کو ارتفاق کی یہی قسم شامل ہے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

رَبَعَ (ف) القوم: چوتھائی آمدنی لینا۔ عرب میں اسلام سے پہلے قبائلی سردار آمدنی کا چوتھائی حصہ ٹیکس میں وصول کرتے تھے اس لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اب مطلق ٹیکس لینے کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، خواہ چوتھائی لیا جائے یا کم وبیش...... اِئتَدَم: سالن سے یا لاون سے روٹی کھانا...... اِدَامٌ: سالن اور لاون، لاون وہ چیز ہے جس سے روٹی لگا کر کھائیں جیسے چٹنی اچار سرکہ اور جام وغیرہ...... قِرَبٌ: مشکیں، مفرد قِربَة...... الوَبَر: اونٹ اور خرگوش وغیرہ کے بال أهلُ الوبر: دیہاتی لوگ...... الغِيران: پہاڑ میں کھوہ، مفرد غار...... العُشوش: گھونسلہ، آشیانہ، جھونپڑا، مفرد عَشٌّ اور عُشٌّ...... تَوءَم جوڑواں بچہ...... أدرك الولد: لڑکا بالغ ہوا...... المِعْوَل: پھاوڑا...... السكّة: ہل کا پھار...... رَأَس (ض) رِئاسة القومَ: سردار قوم ہونا...... كَبَحَ: چوپائے کو لگام کھینچ کر ٹھہرانا، باز رکھنا...... هَمَّ (ن) هَمًّا: فکرمند ہونا...... رَفاهية: زندگی کا خوشگوار اور آسودہ ہونا...... دَعَةٌ: سکون، راحت، تن آسانی...... باهاه في الحسن: حسن وخوبی میں مقابلہ پر فخر کرنا...... كَيْس (مصدر) عقل، دانائی، زیرکی الكَيِّس: دانا، سمجھدار۔

ترکیب: من الغيران إلخ كائن محذوف سے متعلق ہوکر مسکن کی صفت ہے، یہی ترکیب من جلود البهائم إلخ کی ہے، وہ لباس کی صفت ہے...... أنِ اهتدى میں أنْ مخففہ من المثقلہ ہے۔ اس کی اصل أنه ہے۔

باب ـــــ ۳

فن آداب معاش کا بیان

یہاں سے ارتفاق ثانی یعنی شہری تمدن کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے تین باب ہیں۔ آداب کے معنی ہیں قوانین۔ اور معاش بمعنی معاشرت ہے یعنی مل جل کر زندگی بسر کرنا۔ اور اصطلاح میں فن آداب معاش: حکمت عملیہ کی وہ قسم ہے جس میں شہری زندگی یا ترقی یافتہ تمدن کی ضروریات سے بحث کی جاتی ہے ـــ باب اول میں ارتفاق کے دو درجے بیان کئے گئے ہیں۔ ارتفاق کا پہلا درجہ وہ ہے جو دیہی تمدن میں پایا جاتا ہے اور دوسرا درجہ وہ ہے جو ترقی یافتہ تمدن میں پایا

جاتا ہے اور ارتفاق کے دونوں درجوں میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں، اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔غرض ارتفاق کے دوسرے درجے یعنی شہری تمدن کی جو ضروریات باب اول میں بیان کی گئی ہیں ان کے لئے تدبیرات نافعہ کیا ہوسکتی ہیں؟ اس سے جس فن میں بحث کی جاتی ہے وہ فن آداب معاش ہے۔

اس فن میں بنیادی نقطہ یہ ہے کہ شہری تمدن کوئی مستقل تمدن نہیں، بلکہ دیہی تمدن کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور وہ اس طرح ترقی کرتا ہے کہ ارتفاق اول میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان کو تین معیاروں پر پرکھا جاتا ہے، جو باتیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں وہ لے لی جاتی ہیں اور جو باتیں اس معیار کے مطابق نہیں ہوتیں ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور شہری زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لئے باقی مفید اسکیمیں بڑھادی جاتی ہیں، اس طرح شہری تمدن کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ اور وہ تین معیار یہ ہیں:

(۱) ارتفاق اول میں رائج تدبیرات نافعہ کو صحیح تجربات کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے، یعنی ان کا تجربہ کر کے دیکھا جاتا ہے، اگر وہ باتیں ضرر سے بعید اور نفع سے قریب ہوں تو ان کو لے لیا جاتا ہے، ورنہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۲) ارتفاق اول میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں اُن کا کامل مزاج رکھنے والوں کے اخلاق عالیہ سے موازنہ کیا جاتا ہے، اگر وہ باتیں اس مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو ان کو اختیار کرلیا جاتا ہے، ورنہ ترک کردیا جاتا ہے۔ مثلاً عقد کے ذریعہ زنِ منکوحہ کی تعیین اخلاق فاضلہ کا بھی تقاضا ہے، مگر صحرائی تمدن میں اس کی جو شکلیں رائج ہیں، ضروری نہیں کہ وہ بلند اخلاق کے معیار پر بھی پوری اتریں۔

(۳) حسن معاشرت، بہترین جماعتی زندگی اور اس قسم کی دوسری باتیں جو عقل تام سے پیدا ہوتی ہیں، اُن کے ساتھ ارتفاق اول میں رائج امور کو ملا کر دیکھا جاتا ہے، جو باتیں مناسب ہوتی ہیں وہ لے لی جاتی ہیں، اور جو نامناسب ہوتی ہیں وہ چھوڑ دی جاتی ہیں۔

اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں: ۱-: کھانے کے آداب ۲-: پینے کے ضابطے ۳-: چلنے کے طریقے ۴-: بیٹھنے کے آداب ۵-: سونے کے طریقے ۶-: سفر کرنے کے مسائل ۷-: چھوٹا بڑا استنجاء کرنے کے آداب ۸-: بیوی سے مقاربت کے قواعد ۹-: لباس کے مسائل ۱۰-: رہنے سہنے کے آداب ۱۱-: نظافت اور پاکیزگی کے طریقے ۱۲-: زیب وزینت کے مسائل ۱۳-: باہمی گفتگو کا سلیقہ ۱۴-: آفتوں اور بیماریوں میں دواؤں اور جھاڑ پھونک کے استعمال کے مسائل ۱۵-: اجتماعی حوادث کو پہلے سے جان لینے کی شکلیں، مثلاً مانسون، دریائی طوفان، دریا میں باڑ آنے کا پہلے سے اندازہ کرلینا ۱۶-: خوشی کے مواقع میں جیسے بچہ کی ولادت، شادی، عید، مسافر کی حج وغیرہ کے سفر سے واپسی اور اس کے علاوہ دیگر مواقع میں دعوت کرنے کا بیان ۱۷-: بوقت مصائب ماتم کرنے کے طریقے ۱۸-: بیمار پرسی کرنے کے آداب ۱۹-: مردوں کو دفن کرنے کے مسائل (ان مسائل میں سے ہر مسئلہ ایک باب کا عنوان ہے، اس لئے شاہ

صاحب رحمہ اللہ نے اس باب میں ان مسائل کو 'باب' سے تعبیر کیا ہے)

دس اجمالی باتیں

آباد خطوں میں بسنے والے اور صحیح مزاج رکھنے والے، قابل لحاظ حضرات دس باتوں پر متفق ہیں:

۱-: گندہ کھانا نہ کھایا جائے، جیسے اپنی موت مرا ہوا جانور، گلا سڑا کھانا، اور وہ جانور جن کے مزاج میں اعتدال اور جن کے اخلاق میں باقاعدگی نہ ہو۔

۲-: کھاتے وقت کھانا برتنوں میں رکھا جائے اور برتن دسترخوان پر رکھے جائیں۔

۳-: کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھو لئے جائیں اور کھاتے وقت حماقت اور حرص کی شکلوں سے اور ایسی باتوں سے بچا جائے جو ساتھیوں کے دلوں میں تکدر پیدا کرتی ہیں۔

۴-: بدبودار پانی نہ پیا جائے، نہ پانی کے برتن (مشک، مٹکے اور جگ وغیرہ) میں منہ لگا کر پیا جائے، نہ جانوروں کی طرح سانس لئے بغیر گٹ گٹ پیا جائے۔

۵-: نظافت، پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام کیا جائے یعنی بدن، کپڑوں اور مکان کو دو چیزوں سے پاک صاف رکھا جائے ایک گھناؤنی بدبودار ناپاکیوں سے جیسے پیشاب، پاخانہ اور غلاظت وغیرہ کو دھو کر صاف کیا جائے دوسرے جسم میں طبعی طور پر پیدا ہونے والے میل کچیل سے، جیسے گندہ دہنی: اس کو مسواک سے دور کیا جائے اور بغل اور زیر ناف کے بال: ان کی صفائی کی جائے اور کپڑوں کا میلا ہونا: ان کو دھو کر صاف کیا جائے اور مکان کا کوڑے کرکٹ سے بھر جانا: اس کو جھاڑ و دیکر صاف کیا جائے۔

۶-: آدمی کو لوگوں کے درمیان نمایاں حالت میں رہنا چاہئے مثلاً لباس درست ہو، سر اور ڈاڑھی میں کنگھی کر رکھی ہو، اور منکوحہ عورت خضاب اور زیور سے آراستہ پیراستہ ہو۔

۷-: برہنگی معیوب حالت ہے اور لباس زینت ہے اور سبیلین کا کھلنا عار کی بات ہے۔

۸-: کامل لباس وہ ہے جو سارے جسم کو چھپائے اور شرمگاہ کو چھپانے والا کپڑا (پاجامہ) باقی بدن کو چھپانے والے کپڑے سے علحدہ ہونا چاہئے، تاکہ اگر اتفاقاً اوپر کا کپڑا کھل جائے تو بے پردگی نہ ہو۔

۹-: کسی بھی طرح سے حوادث کی پیش بینی کر لینی چاہئے، مثلاً خواب سے یا علم نجوم سے یا فال سے یا شگون، کہانت اور رمل وغیرہ سے۔ پیش بینی کے یہ مختلف طریقے لوگوں میں قدیم زمانہ سے رائج تھے۔ اب رصدگاہوں، پیمائش کے مختلف میٹروں اور راڈروں کے ذریعہ آنے والے حالات کا پہلے سے اندازہ کر لیا جاتا ہے۔

۱۰-: فصیح گفتگو کرنی چاہئے یعنی الفاظ ثقیل اور غیر مانوس نہ ہوں، ترکیب عمدہ، مضبوط اور چست ہو اور اسلوب بیان

مرغوب، جاذب اور دلکش ہو۔ اور ایسا ہی شخص فصاحت کا معیار ہوتا ہے۔

اسی طرح مسائل باب کی مذکورہ فہرست کے ہر باب میں اجماعی اور مسلمہ مسائل ہیں۔ جن پر دنیا کے تمام لوگ متفق ہیں، البتہ قواعد وضوابط کی ترتیب وتفصیل لوگ اپنے اپنے انداز پر کرتے ہیں۔ مثلاً ماہر طبیعیات طب کے قواعد پیش نظر رکھتا ہے، نجومی ستاروں کے خواص کو ملحوظ رکھتا ہے اور مسلمان ماہر دینیات احسان (اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی) کی بنیاد پر قواعد تیار کرتا ہے، اور آپ کو یہ تمام باتیں ان کی کتابوں میں تفصیل سے مل جائیں گی۔ اور یہ اختلاف ایسا ہے جیسے ہر قوم کی پوشاک اور طور وطریق علحدہ ہوتے ہیں اور وہی ان کی پہچان ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف قوموں کے مزاج اور عادتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی طرح فن آداب معاش کی تفصیلات کا اختلاف بھی سمجھ لینا چاہئے۔

﴿باب فن آداب المعاش﴾

وهى الحكمة الباحثة عن كيفية الارتفاق: من الحاجات المُبيَّنَةِ من قبلُ، على الحدِّ الثاني؛

والأصل فيه: أن يُعْرَضَ الارتفاقُ الأول على التجربة الصحيحة في كل باب، فَتُختار الهيئاتُ البعيدةُ من الضرر، القريبةُ من النفع، ويُترك ماسوى ذلك؛وعلى الأخلاق الفاضلة التي يُجبل عليها أهلُ الأمزجة الكاملةِ، فيُختار ما توجبه وتقتضيه، ويُترك ماسوى ذلك؛ وعلى حسن الصحبة بين الناس وحسنِ المشاركة معهم، ونحوِ ذلك من المقاصد الناشئة من الرأى الكلى.

ومعظم مسائله: آداب الأكل، والشرب، والمشي، والقعود، والنوم، والسفر، والخَلاء، والجماع، واللباس، والمسكن، والنظافة، والزينة، ومراجَعَة الكلام،والتمسك بالأدوية والرُّقَى في العاهات، وتَقْدِمَةِ المعرفة في الحوادث المُجْمَعَة، والولائمِ عند عروض فَرَح: من ولادة، ونكاح، وعيد، وقدوم مسافر، وغيرها،والمأتَم عند المصائب، وعيادةِ المرضى، ودفن الموتى.

فإنه أجمع من يُعتد به من أهل الأمزِجة الصحيحة: سُكّان البلدان المعمورة، على أن لايؤكل الطعامُ الخبيث، كالميت حَتْفَ أنفه، والمتعفِّن، والحيوان البعيد من اعتدال المزاج وانتظامِ الأخلاق، ويستحبون أن يوضع الطعامُ في الأواني، وتوضع هي على السُّفَر ونحوها،وأن يُنظَّف الوجهُ واليدان عند إرادة الأكل، ويُحترزَ عن هيئات الطَّيْش، والشَّرَهِ،والتي تورث الضغائنَ في قلوب المشاركين، وأن لايُشرب الماءُ الآجِنُ وأن يُحترز من الكَرْع والعَبِّ.

وأجمعوا على استحباب النظافة: نظافةِ البدن والثوب والمكان عن شيئين: عن النجاسات

المُنْتنة المتقذِّرة، وعن الأوساخ النابتة على نهج طبيعي، كالبَخَر يُزال بالسِّواك، وكشعر الإبْطِ والعانة،وكتوسخ الثياب، واعشيشاب البيت؛ وعلى استحباب أن يكون الرجل شامةً بين الناس: قد سوّى لباسه، وسرَّح رأسه ولحيته؛ والمرأةُ إذا كانت تحت رجل تتزيَّن بخضاب وحُلِيّ ونحو ذلك؛ وعلى أن العُرْىَ شَينٌ ،واللباس زين، وظهورَ السوأتين عار، وأن أتم اللباس ما ستر عامة البدن،وكان ساترُ العورة غيرُ ساتر البدن؛ وعلى تقدمة المعرفة بشيئ من الأشياء: إما بالرؤيا، أوبالنجوم، أو الطِيَرة، أو العيافة والكهانة والرمل ، ونحو ذلك.

وكل من خُلق على مزاج صحيح وذوق سليم يختار لامحالة في كلامه من الألفاظ كلَّ لفظ غير وحشي، ولا ثقيل على اللسان؛ ومن التراكيب كلَّ تركيب متين جيِّد؛ ومن الأساليب كلَّ أسلوب يميل إليه السمعُ، ويركَن إليه القلب، وهذا الرجل هو ميزان الفصاحة.

وبالجملة ففي كل باب مسائلُ إجماعيةٌ مسلَّمةٌ بين أهل البلدان، وإن تباعدت، والناس بعدها في تمهيد قواعد الآداب مختلفون: فالطبيعيُّ يمهِّدُها على استحسانات الطب، والمنجِّمُ على خواص النجوم، والإلٰهيُّ على الإحسان، كما تجدها في كتبهم مفصلة؛ ولكل قوم زِيٌّ وآدابٌ يتميزون بها، يوجبها اختلافُ الأمزجة والعادات،ونحو ذلك.

ترجمہ:فنِ آدابِ معاش کا بیان: فنِ آدابِ معاش وہ حکمت ہے جو حدِ ثانی پر پہلے بیان کردہ ضروریات کی تدبیرات نافعہ سے بحث کرتی ہے۔اور بنیادی بات اس فن میں یہ ہے کہ ارتفاقِ اول کو (فنِ آدابِ معاش کے) ہر باب میں صحیح تجربہ پر پیش کیا جائے، پھر وہ ہیئتیں اختیار کی جائیں جو ضرر سے بعید اور نفع سے قریب ہوں اور ان کے علاوہ کو چھوڑ دیا جائے ــ اور اُن اخلاقِ فاضلہ پر پیش کیا جائے جن پر کامل مزاج رکھنے والے لوگ پیدا کئے جاتے ہیں۔پھر وہ باتیں لے لی جائیں جن کو اخلاقِ عالیہ ثابت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں، اور ان کے علاوہ کو چھوڑ دیا جائے ــــ اور حسنِ معاشرت اور بہترین جماعتی زندگی پر اور اس قسم کے دیگر مقاصد پر جو رائے کلی سے پیدا ہوتے ہیں، پیش کیا جائے۔

اور اس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں: کھانے، پینے، سونے، سفر کرنے، استنجاء کرنے، صحبت کرنے، کپڑا پہننے، رہنے سہنے، نظافت، زینت، باہمی گفتگو کرنے، آفتوں میں دواؤں اور منتروں کو استعمال کرنے، حوادثِ اجتماعیہ کو پہلے سے پہچاننے، اور خوشی پیش آنے پر، جیسے بچہ کی ولادت، شادی، عید، مسافر کی واپسی وغیرہ کے موقعہ پر دعوت کرنے، مصائب کے وقت ماتم کرنے، بیمار پرسی کرنے اور مُردوں کو دفن کرنے کے آداب۔

پس بیشک آباد خطوں میں بسنے والے، صحیح مزاج رکھنے والے، قابلِ لحاظ لوگ:

۱-:اس پر متفق ہیں کہ گندہ کھانا نہ کھایا جائے، جیسے اپنی موت مرا ہوا جانور، اور سڑا ہوا کھانا (گوشت وغیرہ) اور وہ جانور جن کا مزاج اعتدال سے دور ہے اور جن کے اخلاق میں باقاعدگی نہیں ہے۔

۲-:اور وہ پسند کرتے ہیں کہ کھانا برتنوں میں رکھا جائے، اور برتن دسترخوان وغیرہ (جیسے میز) پر رکھے جائیں۔

۳-:اور یہ بات کہ کھانے سے پہلے دونوں ہاتھ اور منہ دھولیا جائے، اور حماقت اور حرص کی شکلوں سے اور ایسی باتوں سے بچا جائے جو ساتھیوں کے دلوں میں تکدر پیدا کریں۔

۴-:اور یہ بات کہ بدبودار پانی نہ پیا جائے اور پانی کے برتن میں منہ لگا کر اور جانوروں کی طرح گھٹ گھٹ نہ پیا جائے۔

۵-:اور وہ لوگ نظافت کی پسندیدگی پر متفق ہیں یعنی بدن، کپڑوں اور مکان کو دو چیزوں سے پاک رکھا جائے (ایک) گھناؤنی بدبودار ناپاکیوں سے، (دوسرے) طبعی طور پر پیدا ہونے والے میل کچیل سے، جیسے گندہ دہنی کہ اس کو مسواک سے دور کیا جائے، اور جیسے بغل اور زیر ناف کے بال، اور جیسے کپڑوں کا میلا ہونا، اور گھر کا کوڑے سے بھر جانا۔

۶-:اور اس بات کی پسندیدگی پر کہ آدمی لوگوں کے درمیان نمایاں رہے: اس نے لباس درست کر رکھا ہو اور سر اور ڈاڑھی میں کنگھی کر رکھی ہو اور عورت جب کسی کے عقد میں ہو تو خضاب (منہدی) اور زیور وغیرہ سے آراستہ ہو۔

۷-:اور اس بات پر کہ برہنگی عیب ہے اور لباس زینت ہے اور دو شرمگاہوں کا کھلنا عار کی بات ہے۔

۸-:اور یہ کہ کامل لباس وہ ہے جو سارے جسم کو چھپائے۔اور شرمگاہ کو چھپانے والا کپڑا، باقی بدن کو چھپانے والے کپڑے کے علاوہ ہو۔

۹-:اور کسی طرح سے پیش بینی کرنے پر، یا خواب سے یا ستاروں سے، یا فال سے، یا شگون سے اور کہانت سے اور رَمَل سے اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے۔

۱۰-:اور ہر وہ شخص جو صحیح مزاج اور سلیم ذوق پر پیدا کیا گیا ہے، لامحالہ اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو غیر مانوس اور ثقیل نہ ہوں اور ایسی ترکیبیں استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو عمدہ اور مضبوط ہوں، اور ایسا اسلوب بیان استعمال کرنا پسند کرتا ہے جس کی طرف کان مائل ہوں اور دل جھکیں، اور یہی شخص فصاحت کی میزان ہے۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ ہر باب میں ایسے مسائل ہیں جو مختلف ممالک کے لوگوں کے درمیان اجماعی اور مسلم ہیں، اگرچہ وہ علاقے ایک دوسرے سے کتنے ہی فاصلہ پر ہوں — اور لوگ اس کے بعد آداب کے قواعد تیار کرنے میں مختلف ہیں: علم طبیعی کا ماہر علم طب کے مستحسنات (پسندیدہ باتوں) پر، اور علم نجوم کا ماہر ستاروں کے خواص (خصوصیات) پر، اور فن الٰہیات کا ماہر احسان (اللہ کی پسندیدگی) پر قواعد تیار کرتا ہے، جیسا کہ آپ ان تمام باتوں کو ان کی کتابوں میں مفصل طور پر پائیں گے۔اور ہر قوم کی پوشاک اور طور وطریق ہے، جن کی وجہ سے وہ ممتاز ہوتے ہیں، جس کو مزاجوں اور عادتوں

وغیرہ کا اختلاف ثابت کرتا ہے۔

لغات:

صَحِب (س) صُحبَۃً: ایک ساتھ زندگی بسر کرنا...... شارکہ: باہم شریک ہونا المشارك: ساجھی، حصہ دار...... راجعہ الکلامَ: دوبارہ گفتگو کرنا، مراجعۃ الکلام: باہم گفتگو کرنا...... رُقی، رُقْیَۃ کی جمع ہے بمعنی منتر تعویذ...... قدّم تقدِمۃً: آگے کرنا...... الحَتف: موت، حَتف أنفہ: اس کی ناک کی موت یعنی اپنی موت مرنا۔ جاہلیت میں عربوں کا خیال تھا کہ جو میدان کارزار میں مارا جاتا ہے اس کی روح تو منہ کے راستہ سے نکلتی ہے، اور جو بزدل چارپائی پر مرتا ہے، اس کی روح کو نکلنے کے لئے منہ راستہ نہیں دیتا، اس لئے وہ ناک کے راستہ سے نکلتی ہے۔ پھر یہ اپنی موت مرنے کے لئے محاورہ ہو گیا۔ اس کا مقابل مذبوحہ جانور ہے...... سُفَر جمع ہے سُفرَۃ کی بمعنی دسترخوان...... طَاشَ یَطِیشُ طَیشًا: اوچھا ہونا، عقل زائل ہونا...... شَرِہَ (س) شَرَھًا إلی الطعام: بہت حریص ہونا...... الضغائن جمع ہے الضغینۃ کی بمعنی کینہ ضَغِن (س) ضَغنًا: کینہ رکھنا...... کرع (ف، س) کَرْعًا: پانی یا برتن میں منھ لگا کر پینا...... عَبَّ (ن) عَبًّا الماءَ: جانوروں کی طرح منہ لگا کر پانی پینا، (کَرْع کا مترادف) عَبَّتِ الدلوُ: ڈول کا بھرتے وقت گڑگڑانا، عَبَّ الماءَ: سانس لئے بغیر جلدی جلدی گٹ گٹ پینا...... شامۃ کے اصل معنی ہیں تل، خال، چونکہ تل نمایاں ہوتا ہے اس لئے مجازاً بمعنی نمایاں آتا ہے...... الطِیَرَۃ: شگون (اچھا یا برا) عرب پرندوں کو اڑا کر شگون لیتے تھے اس لئے طَیْرٌ سے یہ لفظ بنایا گیا ہے الطِیرۃُ: مایتفاءَ ل بہ، أو یتشاءَ م منہ...... العِیَافۃ: پرندہ اڑا کر اس کے نام، آواز اور کس طرف جاتا ہے، اس سے اچھا برا شگون لینا العِیَافۃ: زجر الطیر، والتفاؤل باسمائھا وأصواتھا وممرھا (المعجم الوسیط)...... الکھانۃ: غیب کی باتیں بتلانا...... الرمل: ایک علم کا نام ہے جس میں ہندسوں اور خطوط وغیرہ کے ذریعہ غیب کی باتیں دریافت کرتے ہیں (فیروز اللغات)

ترکیب:

ھی الحکمۃ میں ھی ضمیر حکمت عملیہ کی طرف لوٹتی ہے علی الحد الثانی متعلق ہے المبینۃ سے...... علی الأخلاق الفاضلۃ إلخ اور علی حسن الصحبۃ إلخ کا عطف علی التجربۃ پر ہے...... علی أن العری إلخ اور علی تقدمۃ المعرفۃ إلخ کا عطف علی استحباب أن یکون الرجل پر ہے۔

نوٹ: کماتجدھا اصل میں کماتجدھم تھا، جو تصحیف ہے، مخطوطہ کراچی سے تصحیح کی ہے۔

باب ـــــ ۴

خانگی انتظام کا بیان

فن تدبیر منزل: وہ علم ہے جو ترقی یافتہ تمدن میں، خاندانی تعلقات کی نگہداشت سے بحث کرتا ہے یعنی اس فن میں اُن مصلحتوں کو بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق ایک گھر میں بسنے والے افراد کی اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے، تدبیر کے معنی ہیں انتظام کرنا، اور وجہ تسمیہ ظاہر ہے: اس علم سے گھر کا نظام سنورتا ہے۔ اس فن کا خلاصہ چار مسائل ہیں:۱- : نکاح (شادی بیاہ) ۲-: ولادت (اولاد کے مسائل) ۳-: ملکیت یعنی غلام اور آقا کے معاملات ۴-: تعاون باہمی کی ضرورت اور اس کی شکلیں، تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا مسئلہ: شادی بیاہ

ہم بستری کی ضرورت نے مرد وزن میں ربط ورفاقت پیدا کی ہے، پھر اولاد پر شفقت ومہربانی نے ان کی پرورش میں تعاون باہمی کی ضرورت ثابت کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ خوبیاں مرد میں ہوتی ہیں اور کچھ عورت میں، اسی طرح کچھ توڑا مرد میں ہوتا ہے، اور کچھ عورت میں، اس لئے نکاح ضروری ہوا تاکہ مرد کی خوبیوں سے عورت متمتع ہو اور اپنے نقصان کی تلافی کرے اور عورت کی خوبیوں سے مرد فائدہ اٹھائے اور اپنی کمی کو دور کرے، اور دونوں مل کر آسائش کی زندگی بسر کریں۔

عورت مرد کی بہ نسبت اولاد کی پرورش کے طریقے بہتر جانتی ہے۔ وہ حیادار ہوتی ہے، خانہ نشینی کی زندگی بسر کرسکتی ہے، گھریلو ہلکے پھلکے کاموں میں ماہر ہوتی ہے، فطری طور پر اس میں تابعداری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے مگر اس کی عقل خفیف، بدن ناتواں اور عزم وحوصلہ کمزور ہوتا ہے اور وہ محنت کے کاموں سے جی چراتی ہے۔

اور مرد نسبۃً صائب الرائے ہوتا ہے، وہ حرم کی پوری طرح حفاظت کرسکتا ہے، محنت ومشقت کے کام خوب انجام دے سکتا ہے، اس میں غرور، تسلط، مناقشہ کی صلاحیت اور غیرت کامل ہوتی ہے اور بارہا ان صفات کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اس میں اولاد کی پرورش کا سلیقہ نہیں ہوتا، نہ وہ ہر وقت گھر میں بیٹھا رہ سکتا ہے، معمولی کاموں سے اس کا جی اکتاتا ہے اور تابعداری کی پوری صلاحیت بھی اس کی فطرت میں نہیں۔ اس لئے عورت کی زندگی مرد کے بغیر ناتمام رہتی ہے اور مرد کی عورت کے بغیر، اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے نکاح ضروری ہوا۔

اور عورتوں کے معاملہ میں مردوں میں رقابت اور غیرت کا جذبہ پایا جاتا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ گواہوں کے سامنے مرد کا کسی عورت کے ساتھ اختصاص صحیح طور پر طے ہوجائے۔ اور مرد کی عورت میں رغبت ہے یا نہیں؟ یہ بات جاننے

کے لئے منگنی اور مہر کی ضرورت ہوئی۔ اور عورت ولی کو عزیز ہوتی ہے اور وہ اس سے ہر دست درازی کو ہٹاتا ہے، اس لئے نکاح میں ولی کی رضامندی بھی ضروری ہوئی۔

اور محارم سے نکاح اس لئے حرام ہوا کہ اس سے عورتوں کو بڑا ضرر پہنچ سکتا ہے، مثلاً:

۱-: عورت جس مرد سے نکاح کرنا چاہتی ہے، ولی (باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ) نہیں کرنے دے گا۔ خود کرنا چاہے گا، جس سے عورت کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔

۲-: اگر شوہر عورت کے حقوق ادا نہیں کرتا، تو عورت کی طرف سے اولیاء حقوق زوجیت کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے۔ وہ خود جھگڑا نہیں کرسکتی، اس لئے عورت اس کی محتاج ہے کہ ایسے نازک وقت میں اولیاء اس کی دست گیری کریں۔ مگر جب ولی خود شوہر بن جائے گا، اور عورت کی حق تلفی کرے گا تو عورت کی طرف سے حقوق زوجیت کا مطالبہ کون کرے گا؟ کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں ہوگا، جس سے عورت کو ضرر عظیم پہنچے گا۔

۳-: اگر ولی کے نکاح میں بہن، بیٹی کے علاوہ کوئی اور عورت بھی ہوگی تو جب سوکنوں میں جھگڑا ہوگا، اور شوہر دوسری عورت کا ہوکر رہ جائے گا تو قطع رحمی ہوگی۔

۴-: سلیم المزاج لوگوں کی رغبت بیٹے، بیٹی اور بھائی بہن کی طرف نہیں ہوتی، اور بے رغبت نکاح بے فائدہ ہوتا ہے۔

نکاح کی عمر: جب لڑکا لڑکی بالغ ہوجائیں اور وہ صحبت کی ضرورت محسوس کریں تو نکاح کردینا چاہئے۔ اور چونکہ ہم بستری کی خواہش کا اظہار بے شرمی کی بات ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بلوغ کے ضمن میں چھپادیا ہے، کیونکہ بلوغ ہی بچے کے نشو ونما کا درجہ کمال ہے۔ اس کو بلوغ تک ضرور پہنچنا ہے۔ اور بلوغ کی علامتیں (مرد میں ڈاڑھی اور عورت میں چھاتی) ایسی واضح رکھی ہیں کہ ان کو چھپایا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ علامات دیکھتے ہی والدین پر اولاد کے نکاح کی فکر سوار ہوجاتی ہے۔

تقریب ولیمہ: جب عقد نکاح ہوجائے اور شوہر کا بیوی پر قبضہ تام بھی ہوجائے یعنی وہ بیوی سے متمتع بھی ہوچکے، تو اس کی لطیف انداز پر اور عمدہ طریقے سے تشہیر کرنے کے لئے تقریب ولیمہ ہونی چاہئے، جس میں لوگوں کو مدعو کیا جائے، صرف اہل خانہ مل کر نہ کھالیں، ورنہ مقصد حاصل نہ ہوگا ــــ اور ولیمہ کے موقعہ پر کچھ چہل پہل، کچھ شور، کچھ دھینگا مشتی ہونی چاہئے، مگر اس میں حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

دُف: (عربی میں دال کے پیش کے ساتھ اور اردو میں زبر کے ساتھ) ڈفلی کو کہتے ہیں۔ یہ ایک ہاتھ سے بجانے کا تھالی نما ایک باجا ہے عرب میں شادی کے موقعہ پر اسکو بجانے کا رواج تھا۔ اسکے قائم مقام روشنی، جھنڈیاں وغیرہ بھی ہوسکتی ہیں۔ مگر یہ سب ولیمہ کے دن لڑکے کے گھر ہونا چاہئے۔ لڑکی کے باپ کے گھر عقد نکاح کے دن ان امور کا ثبوت نہیں۔

نکاح میں دس باتوں کا لحاظ: غرض مذکورہ بالا وجوہ سے، اور ان کے علاوہ بہت سی وجوہ سے، جن کا تذکرہ نہیں کیا گیا،

اذکیاء ان کو خود سمجھ لیں گے۔ معروف طریقہ پر نکاح ایک لازمی طریقہ، مسلمہ سنت اور فطری امر ہو گیا ہے، عرب وعجم میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور معروف طریقہ سے مراد یہ ہے کہ نکاح میں دس باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے:

۱-: غیر محارم سے نکاح کیا جائے، محارم سے نکاح کی حرمت ابھی اوپر گزر چکی ہے۔

۲-: نکاح علی الاعلان ہونا چاہئے، مخفی طور پر نہیں ہونا چاہئے، نبی کریم ﷺ کو چپکے سے نکاح کرنا (نکاح السِّر) ناپسند تھا (مسند احمد ۴:۷۸) نیز حدیث شریف میں ہے کہ: ''نکاح میں حلال وحرام کے درمیان امتیاز شور اور ڈفلی سے ہوتا ہے'' (مشکوۃ، کتاب النکاح، باب اعلان النکاح۔ حدیث نمبر ۳۱۵۳)

۳-: نکاح میں مہر ضروری ہے۔ مہر عورت کا گراں قدر ہونا ظاہر کرتا ہے، بے قیمت چیز بے قدر ہوتی ہے، ہدایہ میں ہے ثم المَهر واجب شرعًا إبانَةً (أي إظهارًا) لشرف المحل اھ (کتاب النکاح، باب المہر) نیز مَہر (میم کے زبر کے ساتھ) مِہر (میم کے زیر کے ساتھ بمعنی محبت) بھی پیدا کرتا ہے، نیز مہر کی رقم ناگہانی مصارف میں بھی کام آتی ہے۔ شوہر کا اچانک انتقال ہو جائے اور ترکہ نہ ہو تو عدت میں اور نکاح ثانی تک مہر کی رقم سے کام چل سکتا ہے، پس مہر معتد بہ رقم ہونی چاہئے۔

۴-: شادی سے پہلے سگائی ہونی چاہئے یعنی لڑکے کی طرف سے لڑکی کو مانگنا چاہئے، اس سے بھی طلب اور عورت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ــــ لڑکی کی طرف سے منگنی کا رواج عربوں میں نہیں تھا اور حدیث میں ہے کہ لايَخْطُب الرجلُ على خِطْبة أخيه حتى يَنْكِحَ أو يَتْرُكَ (مشکوۃ کتاب النکاح) یعنی کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی منگنی پر منگنی نہ بھیجے (بلکہ انتظار کرے) تا آنکہ وہ نکاح کرے یا چھوڑ دے، اس میں اشارہ ہے کہ منگنی لڑکے کی طرف سے جانی چاہئے۔

۵-: نکاح میں کفاءت (مساوات، برابری) کا لحاظ رہنا چاہئے، تاکہ نکاح پائندہ ہو اور کفاءت میں ہر زمانہ میں اور ہر علاقہ میں رائج اقدار میں برابری دیکھنی چاہئے جن اقوام میں ذات برادری یا پیشوں کی اہمیت ہے وہاں اس کا بھی لحاظ رہنا چاہئے۔

۶-: نکاح ولی کی رضامندی سے ہونا چاہئے، عورتیں اپنی مرضی سے نکاح کرلیں یہ نہایت معیوب بات ہے۔ حدیث میں ہے لانكاحَ إلا بولي یعنی ولی کی مرضی کے بغیر نکاح زیبا نہیں۔

۷-: زفاف کے بعد دعوت ولیمہ ہونی چاہئے۔ اور اس کی وجہ ابھی مذکور ہوئی۔

۸-: نکاح کے بعد مرد، عورت کا قَوَّام رہے یعنی گھریلو زندگی میں مرد کی بالا دستی ہونی چاہئے، اگر اس کا برعکس ہوگا یا دونوں آزاد ہوں گے، کسی کی کسی پر بالا دستی نہ ہوگی تو اس گھر کا خدا حافظ!

۹-: نکاح کے بعد مرد عورت کی معیشت کا کفیل ہو، یعنی عورت کا نان ونفقہ مرد کے ذمہ ہونا چاہئے۔ قرآن کریم میں مرد کی قوّامیت کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے ﴿وَبِمَا أَنْفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ (النساء ۳۴) اور اس سبب سے کہ مردوں

نے اپنے مال (مہر نفقہ وغیرہ) خرچ کیے ہیں۔ یورپ و امریکہ میں جہاں مرد، عورت کی معیشت کا کفیل نہیں ہوتا، بلکہ عورت خود کفیل ہوتی ہے، وہاں عورتیں مردوں کے بالکل زیر اثر نہیں ہوتیں، اور ان کی فیملی لائف مہر و محبت سے بالکل خالی ہوتی ہے، بلکہ رشتہ ازدواج کچے دھاگے کی مثال ہوتا ہے، صبح یا شام کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔

۱۰-: نکاح کے بعد عورت شوہر کی خدمت گزار، اطاعت شعار ہو اور وہ اولاد کی پرورش کو اپنی ذمہ داری سمجھے۔

نکاح دائمی ہو: یعنی زوجین ایک دوسرے کو شریک حیات بنا کر ہمیشہ ساتھ رہنے کا عہد کریں۔ اس جذبہ کے بغیر تعاونِ باہمی کا مقصد پروان نہیں چڑھ سکتا اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے، جب ہر ایک دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا نفع ونقصان سمجھے، اور یہ تصور نکاح میں ہیشگی کے جذبہ کے بغیر ممکن نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ چکھنے والوں کو اور چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتے'' (کنز العمال، کتاب الطلاق حدیث نمبر ۲۷۸۷۵)

طلاق کی ضرورت: جب زوجین میں موافقت اور باہمی رضامندی نہ رہے تو رستگاری کی راہ بھی ضروری ہے، گو وہ جائز کاموں میں کتنی ہی ناپسندیدہ ہو، اس لئے شرائط وقیود کے ساتھ اور عدت کی پابندی کے ساتھ طلاق مشروع ہوئی۔

عدت کی ضرورت: طلاق کے بعد اور شوہر کی وفات کے بعد، بچند وجوہ عدت ضروری ہے:

۱-: عدت سے نکاح کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ عورت آج ایک کے ساتھ تھی، کل دوسرے کے یہاں چلی گئی، تو رشتہ ازدواج کی حیثیت کیا رہ گئی!

۲-: عدت کی صورت میں عورت شریک حیات کا کسی درجہ میں حق ادا کرتی ہے۔

۳-: عدت کے ذریعہ رفاقت کے عہد و پیمان کو کسی درجہ میں پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۴-: عدت میں سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ نسب خلط ملط ہونے سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ عورت بوقت طلاق یا وفات حاملہ ہوسکتی ہے، اور چند روز کا حمل ہونے کی وجہ سے اس کا پتہ نہ چل سکا ہو ایسا ہوسکتا ہے۔ پس اگر طلاق کے بعد یا شوہر کی وفات کے بعد عورت فوراً دوسرا نکاح کرلے گی، تو کسی کا بچہ کسی کی طرف منسوب ہوجائے گا۔

نوٹ: اور مرد پر عام حالات میں[1] عدت اس لئے نہیں کہ وہ مرد کے موضوع کے خلاف ہے اور اس کے مشاغل میں حارج ہے نیز عدت کی بنیادی غرض (استبراءِ رحم) اس میں نہیں پائی جاتی واللہ اعلم۔

---

[1] عام حالات میں اس لئے کہا کہ ایک صورت میں مرد پر بھی عدت (انتظار) لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی نے بیوی کو طلاق دی اور اب وہ اس بیوی کی بہن سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو مطلقہ کی عدت پوری ہونے کے بعد ہی نکاح کرسکتا ہے اسی طرح کسی کے نکاح میں چار عورتیں تھیں اور وہ ایک کو طلاق دیدے تو اب کسی عورت سے نکاح اس مطلقہ کی عدت گزرنے کے بعد ہی کرسکتا ہے، ورنہ پہلی صورت میں جمع بین الاختین اور دوسری صورت میں پانچ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا لازم آئے گا، جو کہ حرام ہے۔ اور یہ بات بایں وجہ لازم آئے گی کہ معتدہ کی عدت کے زمانہ تک نکاح فی الجملہ باقی رہتا ہے ۱۲

﴿باب تدبير المنزل﴾

وهو الحكمة الباحثة عن كيفيةِ حفظِ الربط الواقعِ بين أهل المنزل،على الحدّ الثانى من الارتفاق؛ وفيه أربعُ جُمَلٍ:الزَواج، والوِلاد،والمَلْكة، والصحبة:

والأصل في ذلك: أن حاجة الجماع أوجبت ارْتباطا واصْطِحابا بين الرجل والمرأة، ثم الشفقةُ على المولود أوجبت تعاونا منهما فى حِضانته؛ وكانت المرأةُ أهدَ هما للحضانة بالطبع، وأخَفَّهما عقلا، وأكثرَهما انْحِجَامًا من المشاق، وأتَمَّهما حياءً ولزوما للبيت، وأحذقَهما سعيا فى محقَّرات الأمور، وأوفرَهما انْقِيَادًا؛ وكان الرجلُ أسدَّهما عقلا، وأشدّهما ذَبًّا عن الذِمار، وأجراهما على الاقتحام فى المشاق، وأتَمْهما تِيْهًا وتسلُّطا ومناقشة وغيرةً؛ فكان معاشُ هذه لاتتم إلا بذاك،وذاك يحتاج إلى هذه.

وأوجبت مزاحماتُ الرجال على النساء، وغيرتُهم عليهن، أن لايصلح أَمْرُهم إلا بتصحيح اختصاص الرجل بزوجته على رؤس الأشهاد.

وأوجبت رغبةُ الرجل فى المرأة ، وكرامتُها على وليها، وذبُّه عنها : أن يكون مَهْرٌ، وخِطْبة، وتَصَدٍّ من الولى.

وكان لوفُتح رغبةُ الأولياء فى المحارم أفضى ذلك إلى ضرر عظيم عليها: من عَضْلها عمن ترغب فيه، وأن لايكون لها من يطالب عنها بحقوق الزوجية ،مع شدة احتياجها إلى ذلك، وتكديرِ الرَّحِم بمنازعات الضَّرَّات ونحوها؛ مع ماتقتضيه سلامةُ المزاج من قلة الرغبة فى الذى نشأمنها، أو نشأت منه، أو كانا كَغُصْنَىْ دَوْحَةٍ.

وأوجب الحياءُ عن ذكر الحاجةِ إلى الجماع: أن تُجعل مدسوسةً فى ضمن عروجٍ يُتَوَقَّع لهما، كأنه الغايةُ التى وُجدالها.

وأوجب التلطفُ فى التشهير، وجعلُ المَلاكِ المنزلى عروجًا: أن تُجْعَلَ وليمةٌ، يدعى الناسُ إليها، ودُفٌّ وطَرَبٌ.

وبالجملة : فلوجوهٍ جَمَّةٍ مما ذكرنا ومما حذفنا ـــ اعتمادًاعلى ذهن الأذكياء ـــ كان النكاح بالهيئة المعتادة ـــ أعنى نكاحَ غير المحارم، بمحضَر من الناس. مع تقديم مهر وخِطبة، وملاحظة كَفاءةٍ، وتصدٍّ من الأولياء،ووليمة،وكونِ الرجال قوّامين على النساء، متكفلين

معاشهن، و كونهن خادماتٍ، حاضنات، مطيعات ـــ سنةً لازمةً، وأمرًا مسلَّما عندالكافة، وفطرةَ فطر الله الناس عليها، لايختلف في ذلك عربُهم ولاعجمُهم.

ولـمـا لـم يكـن بـذلُ الـجُهد منهما في التعاون، بحيث يجعلُ كلُّ واحد ضررَ الآخر ونفعَه كـالـراجع إلى نفسه، إلا بأن يُوَطِّنا أنفسَهما على إدامة النكاح؛ ولابد من إبقاء طريقٍ للخلاص إذا لـم يُطـاوِعا ولم يتراضَيا؛ وإن كان من أبغض المباحات؛ وجب في الطلاق ملاحظةُ قيودٍ، وعدةٍ، وكـذا فـي وفاته عنها، تعظيمًا لأمر النكاح في النفوس، وأداءً لبعض حق الإدامة، ووفاءً لعهد الصحبة، ولئلا تشتبه الأنسابُ.

ترجمہ: خانگی تدابیر کا بیان: اور تدبیر منزل: وہ حکمت (عملیہ) ہے جو ارتفاق کی حد ثانی پر ایک گھر کے باشندوں میں پائے جانے والے ربط وتعلق کی نگہداشت کی کیفیت سے بحث کرنے والی ہے۔ اور اس فن میں چار جملے ہیں: ازدواج، ولادت، ملکیت اور رفاقت۔

اور بنیادی بات اس (ازدواج) میں یہ ہے کہ جماع کی ضرورت نے مرد اور عورت کے درمیان باہمی تعلق اور رفاقت ثابت کی ہے، پھر اولاد پر شفقت نے اس کی پرورش میں تعاون باہمی کو ثابت کیا ہے۔ اور عورت فطری طور پر اولاد کی پرورش میں دونوں میں زیادہ راہ یاب تھی اور عقل کے اعتبار سے ہلکی تھی، اور محنت ومشقت کے کاموں سے زیادہ باز رہنے والی تھی، اور شرم اور خانہ نشینی کے اعتبار سے کامل تر تھی اور معمولی کاموں کو انجام دینے میں زیادہ ماہر تھی اور تابعداری میں زیادہ مکمل تھی ـــــ اور مرد دونوں میں زیادہ درست رائے والا تھا، اور عار کی باتوں کو ہٹانے میں زیادہ مضبوط تھا، اور محنت ومشقت کے کاموں میں گھسنے میں زیادہ دلیر تھا۔ اور غرور، قبضہ، جھگڑا کرنے اور غیرت میں کامل تر تھا، اس لئے عورت کی زندگی مرد کے بغیر ناتمام تھی، اور مرد کو عورت کی احتیاج تھی۔

اور عورتوں پر مردوں کی مزاحمت (تعرض) اور غیرت نے ثابت کیا کہ مردوں کا معاملہ اسی وقت سنور سکتا ہے، جب گواہوں کے سامنے مرد کا اس کی بیوی کے ساتھ اختصاص (خاص ہونا) صحیح طور پر طے کر دیا جائے۔

اور عورت میں مرد کی رغبت نے، اور ولی کی نظر میں عورت کی عزت نے، اور عورت سے ولی کی مدافعت نے ثابت کیا کہ مہر، منگنی اور ولی کی طرف سے آمادگی ہو۔

اور اگر محارم میں اولیاء کی رغبت کا دروازہ کھول دیا جاتا تو یہ چیز عورتوں کے حق میں ضررِ عظیم کا باعث بنتی: یعنی عورت کو اس شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے روکنا، جس میں عورت رغبت رکھتی ہے اور یہ کہ عورت کے لئے کوئی ایسا شخص نہ رہے جو اس کی طرف سے زوجیت کے حقوق کا مطالبہ کرے، حالانکہ عورت اس چیز کی بہت زیادہ محتاج ہے، اور سوکنوں کے جھگڑوں سے خاندانی رشتہ داری کا مزہ کرکرا کر دینا، اور اس قسم کے اور ضرر، اس امر کے ساتھ جس کو مزاج کی سلامتی چاہتی

ہے یعنی اس مرد میں رغبت نہ ہونا جوخود اس عورت سے پیدا ہوا ہو (یعنی بیٹے میں) اور وہ اس مرد سے پیدا ہوئی ہو (یعنی بیٹی میں) یا دونوں ایک بڑے درخت کی دو شاخوں کی طرح ہوں (یعنی بھائی بہن ہوں)

اور جماع کی ضرورت کے تذکرہ سے شرم نے ثابت کیا کہ وہ ضرورت ایسے عروج (بلوغ) کے ضمن میں چھپادی جائے، جس کی ان دونوں (لڑکے، لڑکی) کے لئے امید باندھی گئی ہو، گویا وہ وہ آخری حد ہے جس تک پہنچنے کے لئے وہ دونوں پیدا کئے گئے ہیں۔

اور تشہیر میں لطیف انداز اختیار کرنے نے، اور گھریلو قبضہ کے بام عروج تک پہنچ جانے نے ثابت کیا کہ ایسا ولیمہ کیا جائے جس میں لوگوں کو دعوت دی جائے اور ڈفلی اور خوشی ہو۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ وجوہ کثیرہ کی وجہ سے —— جن میں سے بعض کو ہم نے ذکر کیا، اور بعض کا تذکرہ اذکیاء کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے چھوڑ دیا —— معروف طریقہ پر نکاح —— یعنی غیر محارم سے نکاح، لوگوں کی موجودگی میں، مہر اور منگنی کی پیش کش کے ساتھ، اور کفاءت کا لحاظ رکھ کر، اور اولیاء کی آمادگی (رضامندی) سے، اور ولیمہ کے ساتھ، اور عورتوں پر مردوں کی بالادستی کے ساتھ اور مردوں کے عورتوں کی معیشت کا کفیل ہونے کے ساتھ اور عورتوں کے خدمت گزار، اطاعت شعار اور اولاد کی پرورش کرنے والیاں ہونے کے ساتھ —— سب لوگوں کے نزدیک ایک لازمی طریقہ، مسلم امر اور ایسی فطری بات ہو گیا جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ جس میں نہ عربوں کا اختلاف ہے، نہ عجمیوں کا۔

اور جب دونوں کا تعاون باہمی کی کوشش کرنا —— اس طرح کہ ہر ایک دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنی ذات کی طرف لوٹنے والے نفع وضرر کی طرح سمجھ لے —— ممکن نہیں تھا مگر اس طرح کہ دونوں خود کو نکاح ہمیشہ رکھنے پر آمادہ کرلیں (اس لئے نکاح میں دوام ضروری ہوا) اور جب دونوں میں موافقت اور باہمی رضامندی نہ رہے تو رستگاری کی کوئی راہ باقی رکھنی بھی ضروری تھی، اگرچہ وہ راہ جائز کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، تو طلاق میں قیود کا لحاظ اور عدت ضروری ہوئی۔ اور اسی طرح عدت ضروری ہے جب مرد عورت کو چھوڑ کر وفات پاجائے: دلوں میں نکاح کے معاملہ کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اور ہمیشگی کا کچھ حق ادا کرنے کے لئے اور رفاقت کے عہد کو نباہنے کے لئے، اور تاکہ نسب میں اشتباہ پیدا نہ ہو۔

لغات:

اِصْطَحَبُوْا: ایک دوسرے کے ساتھ ہونا...... اِنْحَجَمَ: باز رہنا حَجَمَ (ن) فلانا عن الأمر: کفّہ وصرفہ...... جُمَل جمع ہے جُمْلَة کی اور یہ وہی لفظ ہے جو بالجملة میں ہے یعنی باب کا ماحصل چار باتیں ہیں...... مَشَاق جمع ہے مَشَقَّة کی، بمعنی دشواری، محنت...... الذِمار: حرم، ہر وہ چیز جس کی حمایت وحفاظت ضروری ہو...... التِیهُ غرور تَاهَ (ض) تِیهًا: تکبر کرنا...... مناقشة: جھگڑا کرنا...... مَلاك: اقتدار، قبضہ الملاك المنزلی صحبت سے کنایہ ہے

...... وَحَثّ علی الأمر: آمادہ کرنا، برانگیختہ کرنا۔

ترکیب: علی الحد الثانی متعلق ہے الواقع سے۔

تصحیح: الذی نشأمنہا اصل میں اور تمام مخطوطات میں التی نشأمنہا ہے۔ یہ سبقت قلم ہے یا تصحیف ہے، دلیل نشأ مذکر کا صیغہ ہے۔

دوسرا مسئلہ: اولاد کے احوال

اولاد کے سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے دو باتیں بیان کی ہیں:

اول: اولاد ابتداء میں ماں باپ کی محتاج ہوتی ہے، ان کی دیکھ بھال سے ہی پروان چڑھتی ہے نیز ماں باپ فطری طور پر اولاد پر مہربان ہوتے ہیں، اس لئے باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کی ایسی تربیت کرے جو آئندہ ان کے حق میں مفید ہو، پہلے اس کو دین کا ضروری علم سکھائے، کیونکہ دنیا وآخرت کی کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ پھر بچہ کی صلاحیت اور رغبت دینی یا دنیوی تعلیم کی طرف ہو تو اعلی تعلیم دلائے۔ صنعت وحرفت یا کاروبار کی طرف ہو تو اس راہ پر لگائے، مگر دینی تربیت کی طرف سے کبھی غفلت نہ برتے۔

دوم: تین وجہ سے ضروری ہے کہ اولاد ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے:

(۱) ماں باپ بہر حال اولاد سے بڑے ہوتے ہیں، اولاد خواہ کتنی ہی عمر رسیدہ ہو جائے، ماں باپ ان سے کم از کم پندرہ بیس سال بڑے ہوتے ہیں، اس لئے عقل کی فراوانی اور تجربات کی زیادتی کی دولت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ اور بڑوں کی عزت کرنا حسن سلوک کا ایک حصہ ہے۔

(۲) اخلاق عالیہ کا تقاضا یہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دیا جائے جب ماں باپ نے اولاد کے ساتھ ہر طرح سے بھلائی کی ہے تو ضروری ہے کہ اولاد بھی اس کا بدلہ بھلائی سے دے۔

(۳) ماں باپ نے اولاد کی پرورش میں جو تکالیف برداشت کی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں، پس جب ماں باپ پیری میں اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں تو ضروری ہے کہ اولاد ہر طرح سے ان کی خدمت کرے۔

تیسرا مسئلہ: ملکیت (نوکری اور غلامی)

ملکیت یعنی مالک ہونا دو طرح کا ہوتا ہے ایک ملکیت بمعنی ملازمت (نوکری) دوسرے ملکیت بمعنی غلامی۔ دونوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

① تمام انسان یکساں استعداد کے مالک نہیں ہوتے، اس لئے کوئی فطری طور پر آقا (سیٹھ) ہے تو کوئی نوکر۔ جو

شخص کاروباری ذہن رکھتا ہے مستقل معیشت (کاروبار) کا مالک ہے، فطری طور پر اس میں نظم وانتظام کی صلاحیت ہے، جو آسودہ حال ہے اور خوش گوار زندگی گزارتا ہے وہ آقا ہے، اور جو کاروبار میں بے وقوف ہے یا سرمایہ نہیں رکھتا اور اس میں تابعداری کا پورا جوہر موجود ہے اس طرح کہ اس کو جدھر کھینچا جائے کھنچتا ہے۔ ایسا شخص دوسرے کے یہاں ملازمت کرتا ہے۔ غرض سیٹھ ملازموں کا محتاج ہے، ان کے تعاون کے بغیر اس کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اور ملازمین سیٹھ کے محتاج ہیں، آقا سے ان کی روزی روٹی کا مسئلہ وابستہ ہے۔ اس طرح ملکیت بمعنی ملازمت وجود میں آئی، اور آج ساری دنیا میں یہ ملکیت رائج ہے۔ بڑی بڑی ڈگریوں کے مالک ملازمت کے ذریعہ پیٹ بھرتے ہیں اور کوئی بڑا کاروبار ملازموں کے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس رشتہ کو پاکیزہ بنایا جائے۔ سیٹھ خود کو ملازموں کا کفیل سمجھے، تنہا دولت کا مالک نہ بن جائے۔ اور ملازمین ہر طرح سے آقا کے اور اس کے کاروبار کے خیر خواہ رہیں۔ جبھی خوشی اور ناخوشی میں باہمی تعاون ممکن ہے۔

(۲) ملکیت بمعنی غلامی جنگوں کا پیدا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ جب دو فریق لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کے آدمیوں کو قید کرتے ہیں اور قیدیوں کا کوئی مناسب حل نہیں نکلتا تو قدیم زمانہ سے ساری دنیا میں اس کا یہ حل چلا آرہا تھا کہ ان قیدیوں کو غلام بنالیا جائے اس طرح ملکیت بمعنی غلامی وجود میں آئی۔ غلامی کا مسئلہ اسلام کا پیدا کیا ہوا نہیں نہ اسلام کو اس پر اصرار ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کا مسئلہ مختلف طرح سے حل کیا جاسکتا ہے۔ یا تو قیدیوں کو تہ تیغ کردیا جائے یا قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ کیا جائے۔ یا مفت چھوڑ دیا جائے یا جنگ کا حرجانہ (فدیہ) لے کر چھوڑا جائے یا جیل میں رکھ کر زندگی بھر کھلایا جائے۔ اگر یہ سب حل ممکن نہ ہوں یا مناسب نہ ہوں تو آخری حل یہ ہے کہ ان کو فوج میں تقسیم کردیا جائے۔ اور ہر فوجی اپنے غلام کو اپنے گھر بھیج دے، وہاں وہ کام کرے اور کھائے۔

اسلام نے مسئلہ کے اس حل کو جو پہلے سے چلا آرہا تھا اور ساری دنیا میں رائج تھا: باقی رکھا ہے۔ اس میں قیدیوں کا یہ فائدہ ہے کہ جب وہ اسلامی معاشرہ میں پہنچیں گے تو اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوں گے اور دیر سویر ان کے سینے نور ایمان سے منور ہوجائیں گے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اس کی بہترین مثال ہے ــــ اور اسلام نے غلاموں کے لئے ایسے قواعد وضوابط بنادیئے ہیں جن سے ظلم وستم کا سد باب ہوجاتا ہے، نیز غلامی سے نکلنے کی بہت سی راہیں بھی تجویز کردی ہیں، تاکہ غلامی کا طوق ہمیشہ کے لئے گردن میں نہ پڑ جائے۔

پھر غلامی کا مسئلہ دنیا سے ختم نہیں ہوا۔ آج بھی مختلف ممالک میں، خاص طور پر یورپ وامریکہ میں عورتوں اور بچوں کی خرید وفروخت جاری ہے، مگر چونکہ یہ غیر قانونی کاروبار ہے اس لئے ان بے چاروں کے لئے نہ کوئی قانون ہے، نہ رستگاری کی کوئی راہ!

وأوجبت حاجةُ الأولاد إلى الآباء، وحَدَبُهم عليهم بالطبع: أن يكون تمرينُ الأولاد على ما ينفعهم فطرةً؛ وأوجب تقدُّمُ الآباء عليهم، فلم يكْبَرُوا إلا والآباءُ أكثر عقلاً وتجربة، مع مايوجبه صحةُ الأخلاق من مقابلة الإحسان بالإحسان،وقد قاسوا في تربيتهم مالاحاجة إلى شرحه: أن يكون بِرُّ الوالدين سنةً لازمةً.

وأوجب اختلافُ استعدادِ بني آدم: أن يكون فيهم السيِّدُ بالطبع، وهو الأكيس المستقل بمعيشته، ذوسياسة ورَفاهية جبليتين، والعبدُبالطبع، وهو الأخرق التابع، ينقاد كما يُقاد؛ وكان معاش كل واحد لايتم إلا بالآخر، ولايمكن التعاون في المَنْشَط والمَكْرَه إلا بان يُوطِّنا أنفسَهما على إدامة هذا الربط.

ثم أوجبت إتفاقات أُخرُ: أن يأسر بعضُهم بعضًا، فوقع ذلك منهم بموقع، وانتظمتِ المَلْكة؛ ولابد من سنة يؤاخِذ كلُّ واحد نفسَه عليها، ويُلام على تركها؛ ولابد من إبقاء طريق الخلاص في الجملة بمال أو بدنه.

ترجمہ: اور آباء کی طرف اولاد کی احتیاج نے، اور اولاد پر آباء کی فطری مہربانی نے واجب کیا کہ اولاد کو ایسے امور کی تربیت دی جائے جو اولاد کے حق میں مفید ہو۔ اور اولاد سے آباء کے پہلے ہونے نے، پس نہیں بڑی ہوتی اولاد مگر اس حال میں کہ آباء کی عقل اور تجربہ زیادہ ہوتا ہے، اس چیز کے ساتھ جس کو اخلاق کی درستگی واجب کرتی ہے یعنی احسان کے مقابلہ میں احسان کرنا۔ اور تحقیق آباء نے اولاد کی پرورش میں جو تکلیفیں برداشت کی ہیں ان کی تفصیل کی حاجت نہیں (ان وجوہ ثلاثہ نے واجب کیا) کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک ایک لازمی امر ہو۔

اور انسانوں کی استعداد کے اختلاف نے واجب کیا کہ ان میں (کچھ لوگ) فطری طور پر آقا (سیٹھ) ہوں —— اور وہ نہایت ذہین، اپنی مستقل معیشت رکھنے والا، فطری طور پر سیاست (بہترین نظم وانتظام جاننے) والا، آسودہ زندگی گزارنے والا شخص ہے —— اور (کچھ لوگ) فطری طور پر غلام (نوکر) ہوں —— اور وہ بے وقوف فرمانبردار ہے، جو کھچتا ہے جس طرح کھینچا جائے —— اور ہر ایک کی معاش (گذر بسر کا سامان) دوسرے کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی۔ اور خوشی اور ناخوشی میں ایک دوسرے کا تعاون ممکن نہیں مگر اس طرح کہ دونوں اپنے آپ کو اس تعلق کو ہمیشہ رکھنے پر آمادہ کرلیں۔

پھر کچھ دوسرے اتفاقات نے واجب کیا کہ بعض بعض کو قید کریں۔ پس یہ بات (یعنی ملکیت بمعنی غلامی) ان کو بہت ہی پسند آئی (یعنی قیدیوں کا ان کو یہ بہترین حل نظر آیا) اور ملکیت منظم ہوگئی (یعنی اس کا سلسلہ شروع ہوگیا) اور کوئی

ایسا طریقہ ہونا ضروری ہے جس کا ہر شخص خود کو پابند بنائے۔ اور وہ اس کے ترک پر ملامت کیا جائے۔ اور کسی نہ کسی طرح رستگاری کی راہ باقی رکھنی ضروری ہے۔ خواہ مال کے ذریعہ ہو یا بغیر مال کے (کسی اور طرح سے ہو، جیسے کفاروں میں غلاموں کو آزاد کرنا وغیرہ)

لغات:

حَدَبَ علیه: مہربان ہونا حدِب (س) حدَبًا: کبڑا ہونا...... الأکیَس (اسم تفضیل) نہایت ذہین...... رَفاهِیة: آسودگی خوش گوار زندگی...... الأخرَق (اسم تفضیل) نہایت بے وقوف خَرِق (س) خَرَاقَة: بے وقوف ہونا...... المَنشَط: خوش دلی...... المَکرَه: ناراضی...... وَطَّن علیه: آمادہ کرنا، برانگیختہ کرنا۔

چوتھا مسئلہ: صحبت (رفاقت)

صحبت کے معنی ہیں ساتھی ہونا، ایک ساتھ زندگی بسر کرنا۔ انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اس کی فطرت میں مل جل کر رہنے کا جذبہ ہے اس لئے صحبت و رفاقت کا مسئلہ پیدا ہوا یعنی آپس میں رشتہ الفت و مودت قائم کرنا، اور اس کو ہمیشہ باقی رکھنا ضروری ہوا کیونکہ بارہا ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ حاجتیں اور آفتیں آدمی پر ٹوٹ پڑتی ہیں، کوئی سخت بیماری آگھیرتی ہے یا ایسے حقوق لازم ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کے تعاون کے بغیر ان سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اور ایسی افتاد ہر کسی پر پڑسکتی ہے، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں، اس لئے تعاون باہمی کی شکلیں ترقی یافتہ معاشرہ کی بنیادی ضرورت بن گئیں۔

اسی طرح مدد خواہوں کی مدد کے لئے اور مظلوموں کی اعانت کے لئے ایسے طریقے ہونے بھی ضروری ہیں جن کا ہر کسی سے مطالبہ کیا جاسکے، اور جو پیچھے ہٹے اس کو ملامت کی جاسکے۔

دو طرح کی حاجتیں: پھر انسانی حاجتیں دو طرح کی ہیں:

① نہایت اہم اور لمبی حاجتیں، جیسے بیوی کا نان ونفقہ، اولاد پر خرچ کرنا اور ان کی خبر گیری کرنا، ماں باپ پر خرچ کرنا اور ان کی خدمت گذاری۔ یہ حاجتیں اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جب چار باتیں پائی جائیں۔

(۱) جب محتاج اور محتاج الیہ میں سے ہر ایک دوسرے کے نفع وضرر کو اپنا نفع وضرر سمجھے۔

(۲) جب ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے میں انتہائی طاقت صرف کرے۔

(۳) جب ہر ایک دوسرے پر خرچ کرنے کو واجب جانے۔

(۴) جب ہر ایک دوسرے کا وارث بنے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی کچھ حاجتیں نہایت اہم ہوتی ہیں اور وہ وقتی نہیں ہوتیں، بلکہ لمبے عرصہ تک ان حاجتوں میں تعاون ضروری ہوتا ہے، جیسے بیوی اس کی محتاج ہے کہ شوہر اس پر پوری زندگی خرچ کرے، شوہر اس کا محتاج

ہے کہ بیوی اس کی اولاد کی، پروان چڑھنے تک پرورش کرے اور تازندگی اس کا گھر سنبھالے۔ اولاد اس کی محتاج ہے کہ پورے بچپن کے زمانہ میں ماں باپ ان کی دیکھ بھال کریں اور ان پر خرچ کریں۔ ماں باپ اس کے محتاج ہیں کہ پیری کے پورے زمانہ میں اولاد ان کا سہارا بنی رہے اور محتاجگی کی صورت میں ان پر خرچ بھی کرے۔

یہ حاجتیں اہم ہونے کے ساتھ چونکہ لمبی ہیں اس لئے ان کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ محتاج اور محتاج الیہ میں سے ہر ایک دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا نفع ونقصان سمجھے۔ جب یہ تصور ہوگا تو جس طرح آدمی اپنی ذات پر لمبے عرصہ تک خرچ کرتا ہے، دوسروں پر بھی کرے گا، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے میں انتہائی طاقت صرف کرے، کیونکہ اس کے بغیر دوسرے کی لمبے عرصہ تک حاجت روائی ممکن نہیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس حاجت روائی کو شرعاً واجب سمجھے، کیونکہ لزوم شرعی کے تصور کے بغیر عمل دشوار ہوتا ہے۔ نیز توارث یعنی ایک دوسرے کا وارث ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ جب آج خرچ کیا ہے تو کل اس کا عوض بھی ملنا چاہئے۔ یہ کسی طرح قرین عقل نہیں کہ خرچ تو کوئی کرے اور مال کوئی لے اُڑے۔ حدیث شریف میں ضابطہ کلیہ آیا ہے کہ **الغُنْم بالغُرْم** یعنی نفع بعوض تاوان ہے پس جس نے زندگی بھر خرچ کیا ہے اور ہر طرح دیکھ بھال اور خدمت کی ہے، میراث کا بھی وہی زیادہ حقدار ہے علاوہ ازیں انسان بامیدِ نفع کام کرنے کا عادی ہے۔ پس وہ میراث کی لالچ میں حاجت روائی کے لئے تیار رہے گا ﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ (البقرة ۲۳۳) میں اس طرف اشارہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس پہلی قسم کی حاجتیں ایسی چیزوں ہی سے تکمیل پذیر ہوسکتی ہیں جو جانبین سے لازم ہوں۔ اور اس درجہ کے اقرباء زیادہ سزاوار ہیں یعنی انہی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی یہ حاجتیں پوری کریں، کیونکہ ان کا ایک دوسرے سے محبت کرنا اور ان کی باہمی صحبت ورفاقت فطری امر کی طرح ہے، اس لئے وہ لمبے عرصہ تک ایک دوسرے کی حاجتیں خوش دلی کے ساتھ پوری کرسکتے ہیں، دوسرے لوگوں کے لئے یہ بات دشوار ہے۔

(۲) ہلکی اور وقتی حاجتیں: یہ ہر کوئی پوری کرسکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ لوگوں میں اہل مصائب کی ہمدردی کے لئے کوئی مسلّمہ طریقہ ہو، امداد باہمی کے ادارے ہوں، جو یہ کام انجام دیں۔

اور بوقت تعارض صلہ رحمی زیادہ مؤکد اور مقدم ہے مثلاً ایک شخص کے پاس سو روپے ہیں، جس کی اس کو بال بچوں کے خرچ کے لئے ضرورت ہے اب ایک حاجت مند تعاون کا طالب ہوتا ہے، تو حاجت مند سے مؤکد اور مقدم اولاد ہے۔

وكان يتفق كثيرًا أن تقع على الإنسان حاجاتٌ وعاهات: من مرض، وزَمَانَةٍ، وتوجُّهِ حق عليه، وحوائجَ يضعُف عن إصلاح أمره معها إلا بمعاونة بني جنسه، وكان الناس فيها سَوَاسِيَةً، فاحتاجوا إلى إقامة ألفة بينهم وإدامتها، وأن تكون لإغاثة المستغيث، وإعانة الملهوف سنةٌ بينهم، يطالَبون بها، ويلامون عليها.

ولما كانت الحاجات على حدَّين:

حدٌّ لايتم إلا بأن يعُدَّ كلُّ واحد ضررَ الآخر ونفعَه راجعًا إلى نفسه، ولايتم إلا ببذل كل واحد الطاقةَ في موالاة الآخر، ووجوبِ الإنفاق عليه، والتوارثِ؛ وبالجملة: فبامور تلزمهم من الجانبين، ليكون الغُنْم بالغُرم؛ وكان أليقَ الناس بهذا الحد الأقاربُ،لأن تحابُبَهُمْ واصطحابَهُم كالأمر الطبيعي.

وحد يتأتى بأقل من ذلك، فوجب أن تكون مواساةُ أهل العاهات سنةً مسلّمة بين الناس، وأن تكون صلةُ الرحِم أوكدَ واشدَّ من ذلك كلّه.

ترجمہ: اور بار ہا ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ انسان پر حاجتیں اور آفتیں آن پڑتی ہیں، جیسے بیماری، لنجا پن یا کسی ایسے حق یا حاجتوں کا اس کی طرف متوجہ ہونا کہ وہ شخص اُن حقوق وحاجات کے ساتھ، دوسروں کی دستگیری کے بغیر، اپنے معاملہ کو سنوارنے میں کمزور پڑ جائے۔ اور لوگ حاجات میں یکساں تھے، پس لوگوں کو آپس میں رشتۂ الفت قائم کرنے کی، اور اس کو ہمیشہ باقی رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ بھی ضروری ہوا کہ مدد خواہوں کی امداد کے لئے اور مظلوم کی اعانت کے لئے لوگوں میں کوئی ایسا طریقہ ہو، جس کا ہر ایک سے مطالبہ کیا جائے۔ اور اس کے ترک پر وہ شخص ملامت کیا جائے۔

اور جب انسانی ضرورتوں کے دو درجے تھے:

ایک درجہ: وہ ہے جس کی تکمیل بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہر انسان دوسرے کے نفع وضرر کو اپنا نفع ونقصان تصور کرے۔ اور یہ بات بدوں اس کے مکمل نہیں ہو سکتی کہ ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرے، اور دوسرے پر خرچ کرنے کو اور ایک دوسرے کے وارث ہونے کو واجب جانے۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ اس درجہ کی تکمیل ایسی چیزوں ہی سے ہو سکتی ہے جو لوگوں پر جانبین سے لازم ہوں تا کہ نفع بعوض نقصان ہو جائے۔ اور اس درجہ کے زیادہ سزاوار رشتہ دار ہیں، اس لئے کہ ان کا ایک دوسرے سے محبت کرنا اور ان کی باہم رفاقت فطری چیز جیسی ہے۔

اور دوسرا درجہ: وہ ہے جو اس سے کم میں بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہوا کہ لوگوں میں اہل مصائب کی ہمدردی ایک مسلمہ طریقہ ہو۔ اور یہ (بھی ضروری ہوا) کہ صلہ رحمی ان سب سے زیادہ مؤکد اور زیادہ مضبوط ہو۔

لغات:

الزَمَانَة: آفت، لنجا پن...... بني جنسه سے مراد بنی نوع ہیں یعنی انسان مراد ہیں، حیوانات مراد نہیں ہیں...... اغاثه إغاثةً: مدد کرنا المستغيث: مدد طلب کرنے والا...... المَلْهوف: مظلوم، غمگین لهِف (س) لَهفًا على مافات: غمگین ہونا لُهِف لهفًا: ظلم کیا جانا...... والى مُوالاة الرجلَ: مدد کرنا...... فبامور متعلق ہے لايتم سے...... الغُنم:

غنیمت، فائدہ...... الغُرم: تاوان، وہ مال جس کا ادا کرنا ضروری ہو۔

فن کے مسائل

اس فن کے بڑے مسائل بیس ہیں جو عبارت کے ترجمہ سے سمجھ میں آ جائیں گے۔ ان میں سے ہر مسئلہ ایک پورا باب ہے۔ اوران ابواب کی بنیادی باتوں کو دنیا کی تمام اقوام تسلیم کرتی ہے، اوران کو روبعمل لانے کی کوشش کرتی ہیں، خواہ ان کا کوئی بھی مذہب ہو اور خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں۔

ومُعْظم مسائل هذا الفن: معرفةُ الأسباب المقتضِية للزواج وتركِه، وسنةُ الزواج، وصفة الزوج والزوجة، وماعلى الزوج: من حسن المعاشرة وصيانة الحرم عن الفواحش والعار، وما على المرأة: من التعفف وطاعة الزوج وبذل الطاقة في مصالح المنزل؛ وكيفيةُ صلح المتناشِزَيْن، وسنةُ الطلاق، وإحدادُ المتوفَّى عنها زوجها، وحِضانةُ الأولاد، وبرُّ الوالدين، وسياسةُ المماليك والإحسانُ إليهم، وقيامُ المماليك بخدمة المولى، وسنةُ الإعتاق، وصلةُ الأرحام والجيران، والقيامُ بمواساة فقراءِ البلد، والتعاونُ في دفع عاهات طارئة عليهم، وأدبُ نقيب القبيلة، وتَعَهُّدُه حالَهم، وقسمةُ التركات بين الوَرَثة، والمحافظةُ على الأنساب والأحساب.

فلن تجد أمةً من الناس إلا وهم يعتقدون أصولَ هذه الأبواب، ويجتهدون في إقامتها على اختلاف أديانهم، وتباعدِ بُلدانهم، والله أعلم.

ترجمہ: اوراس فن کے بڑے مسائل یہ ہیں: ۱-: ان اسباب کو جاننا جو ازدواجی تعلق کو قائم کرنے یا ترک کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں ۲-: نکاح کا طریقہ ۳-: زوجین کے اوصاف یعنی شوہر کیسا ہونا چاہئے اور بیوی کیسی ہونی چاہئے؟ ۴-: شوہر کے فرائض جیسے حسن معاشرت، بیوی کی فواحش اور ننگ وعار کی باتوں سے حفاظت ۵-: عورت کے فرائض، جیسے پاکدامنی، شوہر کی فرماں برداری اور گھر کے مفادات میں پوری کوشش خرچ کرنا ۶-: زوجین میں کشیدگی کی صورت میں مصالحت کا طریقہ ۷-: طلاق دینے کا طریقہ ۸-: خاوند کے مرنے کے بعد بیوی کا سوگ کرنا ۹-: اولاد کی پرورش ۱۰-: ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک ۱۱-: غلاموں اور ماتحتوں (نوکروں) کا نظم وانتظام اوران کے ساتھ حسن سلوک ۱۲-: غلاموں کا اپنے آقا کی خدمت کے لئے آمادہ رہنا ۱۳-: غلاموں کو آزاد کرنے کا طریقہ ۱۴-: رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا ۱۵-: شہر کے غریبوں کی غم خواری کے لئے آمادگی ۱۶-: لوگوں پر

ٹوٹ پڑنے والے مصائب کو ہٹانے کے لئے تعاون باہمی ۱۷-: قبیلہ کے سردار کا احترام ۱۸-: سردار قبیلہ کا لوگوں کی خبر گیری کرنا ۱۹-: ورثاء کے درمیان ترکہ کی تقسیم ۲۰-: حسب (خاندانی خوبیوں) اور نسب کی حفاظت۔

پس لوگوں میں کوئی قوم آپ کو ایسی نہیں ملے گی، مگر وہ ان ابواب کی بنیادی باتوں کو مانتی ہوگی، اور ان کو روبعمل لانے کی کوشش کرتی ہوگی، ان کے مذاہب کے اختلاف اور ان کی آبادیوں کے دور دراز ہونے کے باوجود۔ باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

باب —— ۵

فن معاملات کا بیان

یہ ارتفاق ثانی کا تیسرا اور آخری باب ہے۔ فن معاملات حکمت عملیہ کی ایک قسم ہے۔ فن معاملات: وہ علم ہے جس میں ترقی یافتہ تمدن میں تبادلہ اشیاء، تعاون باہمی اور ذرائع معاش کو وجود پذیر کرنے کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ ذیل میں ان تینوں باتوں کی تفصیل ہے، پہلے تبادلہ اشیاء کا بیان ہے، پھر ذرائع معاش کا، پھر تعاون باہمی کی شکلوں کا۔

پہلی بات: تبادلۂ اشیاء

مبادلہ: یعنی چیزوں کو چیزوں سے بدلنے کا رواج کیسے ہوا؟ اس کا رواج اس طرح ہوا کہ جب تمدن نے ترقی کی تو بے شمار ضرورتیں پیدا ہوئیں اور ہر ضرورت کی خاطر خواہ تکمیل بھی مطلوب ہوئی۔ مگر تنہا ایک شخص اپنی تمام ضرورتیں بہتر طریقے سے پوری نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ کسی کے پاس کھانے کا ذخیرہ موجود تھا تو پانی نہیں تھا، اور دوسرے کی صورت حال اس کے برعکس تھی۔ اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس کو وہ چیز میسر آئے جو دوسرے کے پاس ہے۔ مگر اس کی کوئی صورت مبادلہ کے علاوہ نہیں تھی۔ اس طرح لوگوں میں تبادلۂ اشیاء کا رواج چل پڑا۔ اور لوگوں نے طے کرلیا کہ ہر شخص کوئی ایک کام پکڑے، اور اس کو شاندار سے شاندار طریقہ پر انجام دے، اور اپنی باقی ضرورتیں مبادلہ کے ذریعہ پوری کرے۔

کرنسی کا رواج کیسے پڑا؟: اس کا رواج اس طرح چلا کہ جب ہر شخص نے ایک دھندا پکڑلیا، اور اس نے اپنی مصنوعات تیار کیں۔ مثلاً کپڑا تیار کیا، مگر جب اس نے کپڑے کا اشیائے خوردنی سے تبادلہ کرنا چاہا، تو غلہ والا تیار نہیں ہوا، کیونکہ اس کو فی الحال کپڑے کی ضرورت نہیں، مکان بنانے کے لئے اینٹوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح غلہ والے نے گیہوں کا کپڑے سے تبادلہ کرنا چاہا، مگر کپڑے والا تیار نہیں ہوا، کیونکہ اس کو فی الحال گیہوں کی حاجت نہیں۔ اس دشواری کو حل کرنے کے لئے لوگوں نے سوچا کہ مبادلہ (چیزوں کو چیزوں سے بدلنے) میں کوئی واسطہ رکھا جائے، جس سے یہ دشواری حل ہوجائے، اسی واسطہ کا نام کرنسی ہے اب کپڑے والا اپنا مال کرنسی میں فروخت کرتا ہے اور کرنسی وقت

ضرورت کے لئے محفوظ رکھ لیتا ہے۔ پھر جب بھی اس کو غلہ ترکاری کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس کرنسی سے اپنی حاجت پوری کر لیتا ہے۔ اسی طرح غلہ والا بھی اپنا اناج کرنسی میں بیچ دیتا ہے اور اس سے تمام حاجتیں پوری کرتا ہے۔

کرنسی کس چیز کی ہونی چاہئے؟: سونا چاندی تو ''ثمن خلقی'' ہیں اور دوسری چیزیں لوگوں کے اتفاق سے یا حکومتوں کے چلن دینے سے کرنسی بنتی ہیں۔ سونے چاندی میں چار خوبیاں ہیں:

۱-: وہ وزنی دھاتیں ہیں۔ سونا ہم مقدار پانی سے ۱۹ گنا بھاری ہے، اور چاندی دس گنا۔ اس لئے ان کو رکھنے میں سہولت ہے، وہ جگہ کم گھیرتے ہیں، اور پلاٹینم اگرچہ ۲۲ گنا بھاری ہے مگر وہ بہت ہی کمیاب دھات ہے۔

۲-: سونے چاندی کے افراد یکساں ہوتے ہیں یعنی ان میں بہت زیادہ تفاوت نہیں ہوتا۔ تفاوت اس وقت ہوتا ہے جب ان میں کھوٹ (دوسری دھات) ملتا ہے۔ اس لئے سونے چاندی کو کرنسی بنانے میں دھوکہ کم ہے۔

۳-: سونا چاندی کھائے جاتے ہیں۔ زرکوب ان کو کوٹ کر ورق بناتے ہیں، جو حلویات اور مقویات میں پڑتے ہیں۔ اس لئے اگر کرنسی پڑی بھی رہی تو کھالی جائے گی۔

۴-: سونے چاندی کے زیورات بنتے ہیں۔ اور یہ بھی ان کا نہایت اہم استعمال ہے۔

علاوہ ازیں سونے چاندی کا ملمع بھی خوب ہوتا ہے، ان کو زنگ بھی نہیں لگتا۔ یہ بہت سخت بھی نہیں، ان کا مزاج نرمی اور سختی میں معتدل ہے، اس وجہ سے ان پر ٹھپہ خوب پڑتا ہے اور یہ اُجلی اور اصیل دھاتیں ہیں اور باقی رذیل دھاتیں ہیں، اس لئے یہ فطری طور پر ثمن قرار پائیں یعنی گویا قدرت نے ان کو پیدا ہی کرنسی بننے کے لئے کیا ہے۔ آج بنک نوٹ کے زمانہ میں بھی ان کی اہمیت نہیں گھٹی، کاغذی کرنسی کا معیار سونا چاندی ہی ہیں۔ اور باقی چیزیں جیسے تانبا، پیتل اور کاغذ وغیرہ مصنوعی کرنسی ہیں، جب تک چلن ہے کرنسی ہیں اور جب چلن بند ہو جائے تو ان کی حیثیت ٹھپ ہو جاتی ہے۔

﴿باب فن المعاملات﴾

وهو الحكمة الباحثة عن كيفية إقامة المبادَلات، والمعاونات، والأكساب على الارتفاق الثاني. والأصل في ذلك: أنه لما ازدحمت الحاجاتُ، وطُلِبَ الإتقانُ فيها. وأن تكون على وجهٍ تَقِرُّ به الأعْيُنُ، وتَلَذُّ به الأنفسُ: تعذَّر إقامتُها من كل واحد؛ وكان بعضُهم وجدَ طعاما فاضلاً عن حاجته ولم يجد ماءً، وبعضُهم ماءً فاضلاً ولم يجد طعاماً، فرغب كلُّ واحد فيما عند الآخر، فلم يجدوا سبيلاً إلا المبادلةَ، فوقعت تلك المبادلةُ بموقعٍ من حاجتهم، فاصطلحوا بالضرورة على أن يُقْبِلَ كلُّ واحد على إقامةِ حاجة واحدة، وإتقانِها، والسعيِ في جميع أدواتها، ويجعلَها ذريعةً إلى سائر الحوائج بواسطة المبادَلات، وصارت تلك سنةً مسلمةً عندهم.

ولما كان كثير من الناس يرغَب في شيئ، وعن شيئ، فلايجد من يُعامله في تلك الحالة: اضطروا إلى تَقْدِمَةٍ وتَهيئةٍ، واندفعوا إلى الاصطلاح على جواهرَ معدِنيةٍ تبقى زمانا طويلا: أن تكون المعاملةُ بها أمرًا مسلما عندهم.

وكان الأليقَ من بينها الذهبُ والفضة، لِصِغَرِ حَجْمِهِمَا، وتماثلِ أفرادهما، وعِظَم نفعهما في بدن الإنسان، ولِتَأتِّي التجملِ بهما،فكانا نقدين بالطبع،وكان غيرُهما نقدًا بالاصطلاح.

ترجمہ: فن معاملات کا بیان: فن معاملات: وہ حکمت ہے جو ارتفاق ثانی (شہری زندگی) میں تبادلہ اشیاء، تعاون باہمی، اور ذرائع معاش کو برپا کرنے کے طریقوں سے بحث کرتی ہے۔ اور اس بارے میں (یعنی تینوں چیزوں کے بارے میں) اصل یہ ہے کہ جب ضروریات کی کثرت ہوئی، اور ان میں پختگی مطلوب ہوئی۔ اور یہ (بھی مطلوب ہوا) کہ اُن کی تحصیل اس طرح ہو کہ اس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور دل مسرور ہوں، تو ہر ایک کے لئے تنہا اُن کی انجام دہی مشکل نظر آئی۔ اور بعض کے پاس ضرورت سے زائد کھانا تھا، مگر پانی نہیں تھا۔ اور بعض کے پاس زائد پانی تھا، مگر کھانا نہیں تھا، تو ہر ایک کی خواہش ہوئی کہ دوسرے کے پاس جو چیز موجود ہے، وہ اُسے بھی ملے، پس لوگوں کو تبادلہ کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ پس یہ تبادلہ اُن کو رفع حاجت کے لئے بہت ہی پسند آیا۔ پس ضرورت کی وجہ سے لوگوں نے اتفاق کر لیا کہ ہر شخص ایک حاجت کے سرانجام دینے کی طرف، اور اس کو خوب مستحکم کرنے کی طرف، اور اس کے تمام وسائل مہیا کرنے کی طرف متوجہ ہو، اور اس کو بواسطہ مبادلہ اپنی تمام حاجات کی تکمیل کا ذریعہ بنائے۔ اور یہ چیز لوگوں کی نظر میں ایک ''مسلمہ طریقہ'' بن گئی۔

اور جب بہت سے لوگوں کو ایک چیز پسند تھی (یعنی اس کی ضرورت تھی) اور دوسری چیز ناپسند تھی (یعنی اس کی ضرورت نہیں تھی) پس اس کو ایسا کوئی شخص نہیں ملتا تھا جو اس سے اس حالت میں معاملہ کرے، تو لوگ پیش بندی اور پہلے سے تیار کرنے کی طرف مجبور ہوئے۔ اور ایسی دھاتوں پر اتفاق کرنے کی طرف چل پڑے جو مدت طویلہ تک باقی رہتی ہوں، کہ ان دھاتوں سے معاملہ کرنا ان کے نزدیک ایک مسلمہ چیز ہو جائے۔

اور ان دھاتوں میں سے زیادہ موزون سونا اور چاندی تھے، کیونکہ ان کا حجم چھوٹا اور افراد یکساں تھے اور وہ بدن انسانی کے لئے بے حد نافع ہیں، اور اس لئے کہ ان سے زینت حاصل ہوتی ہے، پس یہ دونوں دھاتیں خلقی ثمن قرار پائیں، اور ان کے علاوہ دھاتیں اتفاق کرنے سے ثمن ہوئیں۔

لغات:

قَدَّم تقدمة: آگے کرنا، پہلے کرنا..... هَيَّأَهُ تَهيئةً: تیار کرنا، پیش کرنا، درست کرنا یعنی مبادلہ کے لئے تیاری کر لی جائے

اور کوئی چیز آگے کردی جائے تاکہ بوقت ضرورت اس کے ذریعہ مبادلہ کیا جاسکے، اسی کو ہم نے ''واسطہ'' سے تعبیر کیا ہے۔......

رَغِب فیه: رغبت کرنا۔ خواہش کرنا۔ رَغِبَ عنه: اعراض کرنا...... اِندَفَع إلیه: بہ جانا، چل پڑنا۔

ترکیب: اضطروا اجزاء ہے لما کان کثیر کی...... أن تکون المعاملة بدل ہے جو اھو سے۔

دوسری بات: ذرائع معاش

ذرائع معاش دو طرح کے ہیں: اصلی اور فرعی۔ اصلی ذرائع معاش چار ہیں:

(۱) کاشتکاری (باغبانی اس میں شامل ہے)

(۲) گلہ بانی یعنی مویشی: اونٹ، گائے، بھینیس اور بھیڑ بکریاں پالنا، اور ان کے دودھ اور نسل سے فائدہ اٹھانا۔

(۳) خشکی اور تری میں سے مباح اموال جمع کرنا اور خود ان سے یا ان کو فروخت کرکے ان کی قیمت سے فائدہ اٹھانا، خواہ وہ اموال از قبیل معدنیات ہوں، یا نباتات یا حیوانات۔

(۴) کاریگریاں، جیسے بڑھئی کا پیشہ، لوہاری، پارچہ بافی اور ان کے علاوہ وہ پیشے جو دھاتوں کو ایسا بنادیتے ہیں کہ ان سے مطلوبہ منفعت حاصل ہوتی ہے، جیسے سناری ظروف سازی وغیرہ۔

اور فروعی پیشے بے شمار ہیں، چند درج ذیل ہیں:

(۱) تجارت۔ حدیث شریف میں سچے دیانتدار تاجر کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

(۲) ملکی مصالح کی انجام دہی یعنی سرکاری ملازمتیں۔

(۳) انسانی ضروریات میں سے کسی بھی ضرورت کی تکمیل کو ذریعۂ معاش بنانا۔

(۴) جب لوگوں میں نزاکت آتی ہے اور وہ عیش پسند اور آسودگی کے طالب ہوتے ہیں تو طرح طرح کے ذرائع معاش وجود میں آتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ کس کے لئے کونسا پیشہ مناسب ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ ہر شخص دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کے پیش نظر کسی پیشے کے ساتھ خاص کیا جاتا ہے۔ وہ دو چیزیں یہ ہیں:

(۱) صلاحیتوں کے لحاظ سے کام سونپنا چاہئے جیسے بہادر آدمی جنگ اور فوج کے لئے موزون ہے۔ ذہین مضبوط حافظہ کا آدمی حساب (Account) کے لئے مناسب ہے۔ طاقت ور آدمی بار برداری اور مشقت کے کاموں کے لئے بہتر ہے۔

(۲) جس کو جس پیشہ کا موقع مل جائے وہی اس کے لئے مناسب ہے۔ مثلاً لوہار کے لڑکے اور ہمسایے کے لئے لوہاری کا پیشہ جس قدر آسان ہے دوسرا کوئی پیشہ آسان نہیں، اور ان دونوں کے علاوہ کے لئے لوہاری کا پیشہ بہت مشکل

پیشہ ہے۔اسی طرح ساحل سمندر کے باشندوں کے لئے مچھلیاں شکار کرنا آسان ہے،کوئی دوسرا کام ان کے لئے آسان نہیں۔اور ساحل سے دور رہنے والوں کے لئے ماہی گیری کا پیشہ مشکل پیشہ ہے ان کا پانی میں اترتے ہی دَم ہوا ہو جاتا ہے۔

مضر پیشے: کچھ لوگوں کو پیٹ پالنے کے لئے کوئی اچھا پیشہ نہیں ملتا، وہ لوگ ملک کو نقصان پہنچانے والے پیشے اختیار کرتے ہیں، جیسے چوری، جوا اور بھیک مانگنا۔

نوٹ: مبادلہ اگر چیز کا چیز کے ساتھ ہو تو اس کا نام بیع (خرید و فروخت) ہے، اور اگر چیز کا منفعت کے ساتھ ہو تو اس کا نام اجارہ (مزدوری) ہے۔

وأصول المكاسب: الـزرع، والرَّعْيُ، والتقاطُ الأموالِ المباحة من البر والبحر: من المعدِن والنبات والحيوانِ، والصناعاتُ: من نِجَارة، وحِدادة، وحِياكة ،وغيرها، مما هو من جعل الجواهر الطبيعية بحيث يتأتى منها الارتفاق المطلوب؛ ثم صارت التجارة كَسْبا؛ ثم صار القيام بمصالح المدينة كسبا؛ ثم صار الإقبال على كل مايحتاج الناس إليه كسبًا؛ وكلما رَقَّتِ النفوسُ،وأَمْعَنَتْ في حبِّ اللذة والرَّفاهية، تفَرَّعَتْ حواشي المكاسب.

واختَصَّ كلُّ رجلٍ بكسب لأحدِ شيئين:

[۱] مناسبة القُوى: فالرجل الشجاع يناسب الغَزْوَ، والكَيِّسُ الحافظ يناسب الحسابَ، وقَوِيُّ البطش يناسب حملَ الأثقال وشاقَّ الأعمال.

[۲] واتفاقات توجد: فولدُ الحدَّاد وجارُه يتيسر له من صناعة الحِدادة مالايتيسر له من غيرها، ولا لغيره منها؛ وقاطنُ ساحلِ البحر يتأتى منه صيدُ الحيتان، دون غيرِه، ودون غيرِها؛ وبقيت نفوسٌ أَعْيَتْ بهم المذاهبُ الصالحة، فانحدروا إلى أكسابٍ ضارَّةٍ بالمدينة، كالسرقةِ والقمار، والتَّكَدِّي.

والمبادلة:إما عين بعين، وهو البيع، أوعين بمنفعة، وهي الإجارة.

ترجمہ:اور بنیادی پیشے ہیں: کھیتی باڑی، گلہ بانی، خشکی اور تری سے مباح اموال چننا (جمع کرنا) خواہ وہ معدنیات میں سے ہوں یا نباتات، یا حیوانات میں سے، اور کاریگریاں، جیسے بڑھئی کا پیشہ، آہنگری، پارچہ بافی، اور ان کے علاوہ ان پیشوں میں سے جو مادی دھاتوں کو ایسا بناتے ہیں کہ ان سے مطلوبہ منفعت حاصل ہوتی ہے ــــــ پھر تجارت پیشہ بن گئی، پھر ملکی مصالح کی انجام دہی پیشہ بن گئی، پھر حوائج انسانی میں سے کسی بھی چیز کی طرف متوجہ ہونا پیشہ بن گیا۔ اور

جوں جوں نفوس پتلے ہوتے ہیں (یعنی نزاکت آتی ہے) اور نفوس لذت اور آسودگی کی محبت میں گہرے اترتے ہیں تو پیشوں کے متعلقات پھوٹتے ہیں (اور قسم قسم کے ذیلی پیشے وجود میں آتے ہیں)

اور ہر آدمی دو چیزوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے کسی پیشے کے ساتھ خاص کیا جاتا ہے:

۱-:صلاحیتوں کے لحاظ سے: جیسے بہادر آدمی جنگ کے لئے موزون ہے، اور ذہین مضبوط حافظہ کا آدمی حساب کے لئے مناسب ہے، اور طاقت ور آدمی بار برداری اور مشقت کے کاموں کے لئے موزون ہے۔

۲-:اور اتفاق ہونا (یعنی موقع ملنا) جیسے لوہار کے لڑکے اور اس کے ہمسایے کے لئے لوہاری کا پیشہ جس قدر آسان ہے، دوسرا کوئی پیشہ اتنا آسان نہیں، اور اس کے علاوہ کے لئے لوہاری آسان نہیں۔ اور ساحل سمندر کا باشندہ مچھلیاں شکار کر سکتا ہے، اس کے علاوہ کوئی یہ کام نہیں کر سکتا، اور وہ اس کام کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔

اور رہ گئے کچھ لوگ جن کو اچھی راہوں نے تھکا دیا (یعنی وہ کمائی کی اچھی راہیں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئے) پس وہ ملک کو نقصان پہنچانے والے پیشوں کی طرف اتر پڑے، جیسے چوری، جوا، بھیک مانگنا۔

اور تبادلہ یا تو چیز کا چیز سے ہوگا اور وہ بیع ہے، یا چیز کا منفعت (نفع) سے ہوگا، اور وہ اجارہ ہے۔

لغات:

المکاسب جمع ہے المَکسب کی، بمعنی کمائی، پیشہ..... من البر متعلق ہے التقاط سے اور من المعدن محذوف سے متعلق ہو کر الأموال کی صفت ہے..... جملہ توجد صفت کاشفہ ہے اتفاقات کی..... اِنْحَدَرَ: پستی کی طرف اترنا ..... دون غیرہ کی ضمیر قاطن کی طرف لوٹتی ہے یعنی جو ساحل سمندر پر نہیں رہتا وہ ماہی گیری کا کام نہیں کر سکتا..... دون غیرھا کی ضمیر صید (مصدر بمعنی شکار کرنا) کی طرف لوٹتی ہے یعنی ساحل سمندر کا باشندہ ماہی گیری کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتا اور صید الحِیتان بتاویل صَنَاعَۃٌ ہے اس لئے مؤنث کی ضمیر لوٹائی ہے یا مضاف نے مضاف الیہ سے تانیث کا استفادہ کیا ہے واللہ اعلم۔

تیسری بات: تعاون باہمی

شہر (یعنی معاشرہ) کی درستگی کے لئے شہریوں میں الفت و مودت ضروری ہے۔ اور مودت بلا معاوضہ دینے پر مجبور کرتی ہے، یا موقوف ہوتی ہے۔ موطا مالک وغیرہ میں حدیث ہے کہ تَهَادَوْا تَحَابُّوا، وتَذْهَبُ الشَّحْنَاءُ: ایک دوسرے کو ہدیہ دو، آپس میں محبت کرنے لگو گے اور بغض و کینہ ختم ہو جائے گا (ترغیب ۳:۴۳۴) اس طرح ہبہ اور عاریت (برتنے کے لئے کوئی چیز دینے) کی شکلیں نکل آئیں ـــــ نیز الفت و مودت کے لئے غریبوں کی غم خواری بھی ضروری ہے اس لئے صدقہ و خیرات کا رواج ہو گیا۔

اورتمام انسان یکساں نہیں ہوتے: کوئی احمق ہوتا ہے، کوئی کارگزار، کوئی مفلس ہوتا ہے کوئی تونگر، کوئی ردی کاموں سے باز رہنے والا ہوتا ہے کوئی عارنہ کرنے والا، جیسے کمانا یعنی ٹٹی صاف کرنا، کوئی مشاغل میں دبا ہوا ہوتا ہے کوئی فارغ البال، اس لئے ہر ایک کا کاروبار دوسرے کی معاونت کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا۔ اور باہمی تعاون کے لئے معاملہ کرنا، دفعات طے کرنا اور کسی طریقہ پر اتفاق کرنا ضروری ہے، اس طرح مزارعت، مضاربت، اجارہ، شرکت اور وکالت کی صورتیں پیدا ہوئیں اور بعض ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں کہ قرض لینے کی اور امانت رکھنے کی نوبت آتی ہے اور تجربہ سے لوگوں میں خیانت، حق کا انکار، اور نادہندگی ثابت ہے اس لئے معاملات میں گواہ بنانا، دستاویزات لکھنا، گروی رکھنا، ضامن لینا اور حوالہ کرنا ضروری ہوا۔

اور جوں جوں لوگوں میں خوش حالی آتی ہے، تعاون باہمی کی نئی نئی شکلیں وجود میں آتی ہیں اور مذکورہ تمام معاملات پر ساری دنیا کے لوگ متفق ہیں، لوگوں کی تمام جماعتیں ان پر عمل پیرا ہیں اور عدل وانصاف کیا ہے اور ظلم وستم کیا ہے، اس کو بھی لوگ جانتے ہیں باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

ولما كان انتظامُ المدينة لايتم إلا بإنشاء ألفةٍ ومحبة بينهم، وكانت الألفةُ كثيرًا ماتُفضى إلى بذل المحتاج إليه بلابدل، أو تتوقف عليه: انشعبت الهبة، والعارية؛ ولايتم أيضا إلا بمواساة الفقراء: انشعبت الصدقة.

وأوجبت **المُعِدَّاتُ**: أن يكون منهم الأخرق، والكافى، والمُمْلِق، والمُثْرِى، والمستنكف من الأعمال الخسيسة، وغيرُ المستنكف، والذى ازدحمت عليه الحاجات، والمتفرغ: فكان معاش كل واحد لايتم إلا بمعاونةِ آخَرَ، ولا معاونةَ إلا بعقد، وشروطٍ، واصطلاح على سنة: فانشعبت المزارعة، والمضاربة، والإجارة، والشركة، والتوكيل؛ ووقعت حاجات تسوق إلى مُدَايَنَةٍ، ووديعةٍ، وجَرَّبوا الخيانةَ، والجحودَ، والمطلَ، فاضطروا إلى إشهادٍ وكتابةِ وثائقَ، ورهنٍ، وكفالةٍ، وحوالةٍ؛ وكلما ترفَّهتِ النفوسُ انْشَعَبَتْ أنواعُ المعاوَنات؛ ولن تجد أمةمن الناس إلا ويباشرون هذه المعاملاتِ، ويعرفون العدلَ من الظلم، والله أعلم.

ترجمہ: اور جب شہر کی درستگی شہریوں میں الفت ومحبت پیدا کئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اور بار ہا الفت ضرورت کی چیزیں بلا معاوضہ خرچ کرنے تک پہنچاتی ہے، یا الفت بلا معاوضہ دینے پر موقوف ہوتی ہے، تو ہبہ اور عاریت پھوٹ نکلے، نیز الفت غرباء کی غم خواری کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی تو صدقہ وخیرات نکل آئے۔

اور گذشتہ اسباب نے واجب کیا کہ لوگوں میں احمق، کارگزار، مفلس، تونگر، ردی کاموں سے باز رہنے والا، اور عار

نہ کرنے والا اور وہ جس پر ضرورتوں کا ہجوم ہے اور فارغ البال ہوں، پس ہر ایک کی معیشت دوسرے کی معاونت کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی تھی، اور معاونت کے لئے عقد، شرطیں اور کسی طریقہ پر اتفاق ضروری تھا تو مزارعت، مضاربت، اجارہ، شرکت اور توکیل (وکیل بنانے) کی صورتیں پیدا ہوئیں —— اور کچھ ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں جو قرض لینے اور امانت رکھنے کی طرف ہانکتی ہیں۔ اور لوگوں نے خیانت، حق کا انکار، ٹال مٹول کا تجربہ کیا تو لوگ گواہ بنانے، دستاویزات لکھنے، گروی رکھنے، ضامن بنانے اور حوالہ کرنے کی طرف مجبور ہوئے —— اور جوں جوں لوگ خوش حال ہوتے ہیں، تعاون باہمی کی نئی نئی شکلیں نکلتی ہیں —— اور آپ لوگوں میں سے کسی گروہ کو نہیں پائیں گے مگر وہ ان معاملات پر عمل پیرا ہوں گے، اور وہ عدل کیا ہے اور ظلم کیا ہے اس کو جانتے ہوں گے، واللہ اعلم۔

لغات: اِنْتَظَمَ الأمرُ: درست ہونا...... المحتاج إليه: وہ چیز جس کی احتیاج ہے یعنی ضرورت...... المُعِدَّات کی تشریح مبحث اول باب (۱۱) میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔ یہاں مراد گذشتہ اسباب ہیں جو موجودہ حالت کا باعث بنے ہیں۔

باب —— ۶

نظام حکومت کا بیان

یہاں سے ارتفاق ثالث (نظام حکومت) کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ اور یہ بیان بھی تین بابوں میں ہے۔ سیاسۃ المدینہ: (نظام حکومت) وہ فن ہے جس میں ایک شہر یا ایک ملک کے لوگوں کے درمیان پائے جانے والے ربط و تعلق کو محفوظ رکھنے کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ سَاسَ الأمْرَ کے معنی ہیں انتظام کرنا اور سَاسَ القومَ کے معنی ہیں لوگوں کے امور کی تدبیر کرنا۔ اور مدینہ (شہر) سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں تعلقات پائے جاتے ہوں، جن میں باہم معاملات ہوتے ہوں اور جو جدا جدا مکانوں میں بود و باش رکھتے ہوں، خواہ ایک شہر اور ایک بستی میں رہتے ہوں یا مختلف بستیوں میں۔ پس ارتفاق ثالث نظام بلدیہ اور نظام مملکت دونوں کو شامل ہے۔

سربراہ مملکت کی ضرورت

دو وجہ سے مملکت کے لئے سربراہ ضروری ہے:

(۱) مملکت کو اختلال سے بچانے کے لئے، اس کے امراض کا علاج کرنے کے لئے اور اس کی تندرستی کی حفاظت کرنے کے لئے سربراہ ضروری ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مملکت کے لوگوں میں باہم ارتباط ہوتا ہے، اس لئے وہ ایک شخص حکمی (Legal Person) ہے، جو چند اجزاء اور ایک ہیئت ترکیبی سے مرکب ہے۔ اور ہر مرکب کے مادہ میں یا صورت میں خلل واقع ہوسکتا ہے، نیز

اس کو صحت بھی لاحق ہوسکتی ہے اور بیماری بھی۔ مثلاً زید شخص حقیقی ہے، اور مرکب ہے، بسیط نہیں[1] اس کے حقیقی اجزاء عناصرِ اربعہ ہیں اور مجازی اجزاء ہاتھ پاؤں، سر، سینہ وغیرہ ہیں اور ایک اس کی مجموعی ہیئت ہے۔ پس اس کے حقیقی اجزاء میں اختلال پیدا ہوسکتا ہے، اور اس وقت اس کا صحیح مزاج باقی نہیں رہے گا، اور اسی کا نام بیماری ہے، اور صحیح مزاج کا نام تندرستی ہے، اسی طرح زید کی ہیئت کذائی میں بھی خلل پڑسکتا ہے، ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے، ہاتھ شل ہوسکتا ہے اور کچھ بھی نقصان ہوسکتا ہے۔ اسی طرح مملکت کا معاملہ سمجھنا چاہئے۔ اہل مملکت میں پائے جانے والے روابط کی وجہ سے پورا ملک ایک وحدت (اکائی) ہے، جو چند اجزاء سے مرکب ہے۔ اور ہر مرکب کے مادہ میں یا صورت میں خلل واقع ہوسکتا ہے، یا اسے مرض لاحق ہوسکتا ہے اور مرض سے مراد یہ ہے کہ مملکت کے لئے کوئی ایسی حالت رونما ہوجائے، جو باعتبار نوع کے[2] اس کے لئے مناسب وموزون نہ ہو اور مملکت کی تندرستی ایسی حالت ہے جو اس کو شاندار اور خوبصورت بنائے۔

(۲) لوگوں کو انصاف کی راہ پر قائم رکھنے کے لئے بھی سربراہ کی ضرورت ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شہر اور مملکت میں لوگوں کا اجتماعِ عظیم ہوتا ہے، اس لئے یہ بات ممکن نہیں کہ سب لوگ ''انصاف کی راہ'' پر قائم رہیں، اور ''ناانصافی کی راہ'' اپنانے والوں پر نکیر کرنے کے لئے منصب کی ضرورت ہے۔ منصب کے بغیر روک ٹوک کرنے سے بڑے جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں، اس لئے شہر اور ملک کا معاملہ ایسے شخص کے بغیر منظم نہیں ہوسکتا، جس کو اہلِ حل وعقد نے متفق ہوکر چنا ہو اور اس کے پاس ملک کو سنبھالنے کے لئے عملہ بھی ہو اور شان وشوکت اور دبدبہ بھی ہو۔

فائدہ: اور اسی مبحث کے باب اول کے آخر میں فائدہ (۲) میں یہ مضمون گذر چکا ہے کہ جو لوگ زیادہ خودغرض، بہت تیز مزاج اور خون ریزی میں دلیر اور غصہ میں آپے سے نکل جانے والے ہوتے ہیں ان کو سربراہ کی اور سیاست کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

﴿باب سياسة المدينة﴾

وهي الحكمة الباحثة عن كيفيةِ حفظِ الربطِ الواقع بين أهل المدينة؛ وأعني بالمدينة جماعةً متقاربةً تجري بينهم المعاملاتُ، ويكونون أهلَ منازلَ شتّى.

والأصل في ذلك: أن المدينة شخص واحد من جهة ذلك الربط، مركبٌ من أجزاء وهيئةٍ اجتماعية؛ وكلُّ مركب يمكن أن يلحقَه خللٌ في مادته أو صورته، ويلحقَه مرضٌ ـــ أعني حالةً

[1] بسیط میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۱۲ [2] مثلاً زید کا غیر معمولی موٹا ہوجانا، باعتبار نوعِ انسان کے مناسب نہیں گو ہاتھی اور گینڈے کے تقابل سے ٹھیک ہے ۱۲

غيرها أليقُ به باعتبار نوعه ـــ وصحةً، أى حالةً تُحسِّنُه وتُجمِّلُه.

ولما كانت المدينةُ ذاتَ اجتماع عظيم، لايمكن أن يتفقَ رأيُهم جميعا على حفظ السنة العادلة، ولاأن يُنكر بعضُهم على بعض من غير أن يُمتاز بمنصب، إذ يُفضي ذلك إلى مقاتَلات عريضة: لم ينتظم أمرُها إلا برجل اصطلح على طاعته جمهورُ أهلِ الحل والعقد، له أعوان وشوكة، وكل من كان أشحَّ وأحدَّ وأجرأ على القتل والغصب، فهو أشدُّ حاجةً إلى السياسة.

ترجمہ: ملکی سیاست کا بیان: اور سیاست مدنیہ: وہ علم ہے جو شہر والوں کے درمیان پائے جانے والے ربط وتعلق کی حفاظت کے طریقوں سے بحث کرنے والا ہے۔ اور ''شہر'' سے میری مراد وہ جماعت ہے جن میں باہمی تعلقات ہوں، جن میں معاملات چلتے ہوں اور جو جدا جدا مکانوں میں بود و باش رکھتے ہوں۔

اور اس بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ ''شہر'' باہمی ربط کی جہت سے ایک شخص (حکمی) ہے، جو چند اجزاء اور مجموعی ہیئت سے مرکب ہے۔ اور ہر مرکب کے لئے ممکن ہے کہ اس کے مادے میں یا صورت میں کوئی خلل پیدا ہو، یا اُسے کسی قسم کا مرض لاحق ہو ـــ اور مرض سے میری مراد ایسی حالت ہے جس کے علاوہ حالت، باعتبار نوع کے، اس کے لئے زیادہ موزون ہو ـــ اور تندرستی لاحق ہو، یعنی وہ حالت جو اس کو شاندار اور خوبصورت بنادے۔

اور جب ''شہر'' میں ایک اجتماع عظیم پایا جاتا ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس کے تمام باشندے ''انصاف کی راہ'' کی حفاظت پر متفق ہو جائیں اور نہ یہ بات ممکن ہے کہ بعض بعض پر نکیر کرے، بغیر اس کے کہ وہ کسی منصب کے ساتھ ممتاز کیا جائے، کیونکہ یہ چیز لمبے چوڑے جھگڑوں تک پہنچادے گی (پس) شہر کا معاملہ ایسے شخص کے بغیر منظم نہیں ہوسکتا، جس کی اطاعت پر جمہور اہل حل وعقد متفق ہو جائیں، جس کے پاس عملہ اور دبدبہ ہو۔

اور جو بھی شخص بہت زیادہ خود غرض، بہت تیز مزاج اور خوں ریزی اور غصہ کرنے میں بہت زیادہ دلیر ہوتا ہے، وہ سیاست کا سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

نظام مملکت میں خلل ڈالنے والی چیزیں

ابھی گذرا کہ مملکت ایک شخصِ مرکب ہے، اس کے احوال میں کسی بھی وقت اختلال پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے سربراہ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر وقت احوال پر نظر رکھے۔ اور کوئی خلل نظر آئے تو اصلاح کی کوشش کرے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ایسی آٹھ چیزیں بیان فرمائی ہیں جو حکومت کے نظام کو درہم برہم کرتی ہیں:

(۱) کبھی کچھ شریر لوگ، جن کو قوت وشوکت حاصل ہو جاتی ہے من مانی کرنے کا اور انصاف کے جادہ کو چھوڑ دینے کا

فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اور وہ یہ فیصلہ چند مقاصد سے کرتے ہیں (الف) لوگوں کے مال کی لالچ میں۔ یہ لوگ راہ زنی کرتے ہیں (ب) کسی عداوت کی بناء پر لوگوں کے درپے آزار ہوجاتے ہیں۔ اور طرح طرح سے لوگوں و نقصان پہنچاتے ہیں (ج) حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس لئے فساد پھیلاتے ہیں اور شرانگیزی کرتے ہیں —— **اس کا علاج یہ ہے** کہ فوج کے ذریعہ ان سے نمٹا جائے۔ اور ان کا فتنہ فرو کیا جائے۔

(۲) کبھی کوئی ظالم کسی کو ظلماً قتل کرتا ہے یا زخمی کرتا ہے یا مارتا ہے یا اس کی فیملی میں دست درازی کرتا ہے مثلاً اس کی بیوی میں مزاحمت کرتا ہے یا اس کی بہن بیٹی کی ناحق طمع کرتا ہے یا مال میں ہاتھ ڈالتا ہے، مثلاً ڈکیتی ڈالتا ہے یا خفیہ چوری کرتا ہے یا آبرو کے درپے ہوتا ہے یعنی اس پر کوئی تہمت لگاتا ہے یا اس کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتا ہے —— ایسے لچّوں اور غنڈوں کا علاج یہ ہے کہ ان کو سخت سزا دی جائے تاکہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آئیں۔

(۳) بعض کام در پردہ مملکت کو نقصان پہنچاتے ہیں، جیسے جادو، اشیائے خوردنی میں زہریلی چیزوں کی آمیزش، لوگوں کو دنگا فساد کی تعلیم دینا، پبلک کو حکومت کے خلاف، نوکروں کو آقا کے خلاف، اولاد کو باپ کے خلاف اور بیوی کو شوہر کے خلاف ورغلانا —— اس قسم کے اعمال بھی مملکت کے لئے تباہ کن ہیں۔ سربراہ مملکت کو ایسی چیزوں پر کڑی نظر رکھنی چاہئے۔

(۴) بری عادتیں بھی نظام مملکت میں خلل ڈالتی ہیں۔ یہ بری عادتیں کئی طرح کی ہوتی ہیں (الف) بعض میں تدبیراتِ نافعہ کی طرف سے لاپرواہی برتی جاتی ہے، جیسے اغلام (لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کرنا) سحاقت (عورت کی عورت کے ساتھ مباشرت) چوپایوں سے بدفعلی، مشت زنی وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں نکاح سے روک دیتی ہیں (ب) بعض میں آدمی فطرت سلیمہ سے نکل جاتا ہے، جیسے مرد کا ہیجڑا بن جانا اور عورت کا مرد بن جانا (ج) بعض خصال بدلبے چوڑے جھگڑوں کا باعث بنتی ہیں، جیسے کسی منکوحہ کے معاملہ میں، اس کے ساتھ کسی اختصاص کے بغیر، شوہر وغیرہ سے مزاحمت کرنا اور جیسے ہر وقت شراب کے نشے میں چور رہنا —— ان بری عادتوں کی روک تھام بھی ضروری ہے، اور اس کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہئے۔

(۵) بعض معاملات بھی مملکت کو نقصان پہنچاتے ہیں، جیسے جوا، چندر چند بڑھا ہوا سود —— اور ہر سود چندر چند بڑھتا رہتا ہے —— رشوت ستانی، ناپ تول میں کمی کرنا، مال تجارت کے عیب کو چھپانا تجارتی قافلہ سے ملاقات کرنا (یعنی جو مال ایک شہر سے دوسرے شہر میں فروخت کے لئے لے جایا جارہا ہے، اس کو شہر سے باہر ہی تاجروں سے خرید لینا تاکہ اونچے نرخ سے اس کو بیچ سکے) ذخیرہ اندوزی، خریداری کے ارادے کے بغیر، دوسرے کو پھنسانے کے لئے مبیع کے دام زیادہ لگانا —— ایسے ضرر رساں معاملات کی بھی روک تھام ضروری ہے۔

(۶) ایسے الجھے ہوئے نزاعات جن میں ہر فریق بوگس (Bogus) دلیل رکھتا ہے۔ اور اصل حقیقت واضح نہیں ایسے

جھگڑے بھی خلل کا باعث بنتے ہیں ___ ایسے نزاعات میں گواہوں سے، قسموں سے، دستاویزات (Documents) سے، قرائنِ احوال وغیرہ سے تمسک کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور مقدمہ کو مسلمہ طریقوں کی طرف لوٹانے کی ضرورت ہوتی ہے اور فیصلہ میں وجہ ترجیح ظاہر کرنی پڑتی ہے اور فیصلہ کرنے والے کو فریقین کی چالوں سے واقف رہنا ضروری ہوتا ہے۔

(۷) اگر شہر کے باشندے بادیہ نشینی اختیار کرلیں اور دیہی تمدن پر قناعت کرلیں یا ایک شہر کے سارے باشندے کسی دوسرے شہر میں جا بسیں یا پیشوں کے اختیار کرنے میں ملکی مصالح کا خیال نہ رکھیں مثلاً ملک کی اکثر آبادی تجارت کی طرف متوجہ ہوجائے اور زراعت چھوڑ دے یا اکثر لوگ فوج میں ملازمت کو ذریعۂ معاش بنالیں اور دوسرے ضروری کام کرنے والے نہ رہیں تو بھی ملک کا نظام مختل ہوجائے گا ___ یہاں اربابِ حکومت کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسان بمنزلہ غذا ہیں اور کاریگر، تاجر اور ملک کے محافظین بمنزلہ نمک ہیں جس سے غذا کی اصلاح ہوتی ہے، اس لئے حکومت کی پوری توجہ زراعت کو فروغ دینے کی طرف ہونی چاہئے۔

(۸) اگر حملہ آور درندوں کی کثرت ہوجائے یا موذی حشرات پھیل پڑیں تو اس سے بھی لوگ پریشان ہوجائیں گے۔ پس حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو نابود کرنے کی کوشش کرے

ومن الخلل: أن تجتمع أنفسٌ شريرة، لهم مَنَعَةٌ وشوكة، على اتباع الهوى، ورفضِ السنة العادلة: إما طمعافي أموال الناس ___ وهم قُطَّاع الطريق ___ أو إضرارًا لهم بغضب، أو حِقد، أو رغبةٍ في الملك؛ فَيُحتاج في ذلك إلى جمع رجال، ونصب قتال.

ومنه: إصابةُ ظالمٍ إنسانا بقتل، أو جرح، أو ضرب، أو في أهله: بأن يُزاحم على زوجته،أو يطمع في بناته وأخواته بغير حق؛ أو في ماله: من غصبِ جَهْرةً، أو سرقةٍ خفيةً ؛ أو في عِرضه: من نسبته إلى أمر قبيح يُلام به، أو إغلاظِ القول عليه.

ومنه: أعمال ضارّة بالمدينة ضررًا خفيًا، كالسِّحر، ودَس السم، وتعليمِ الناس الفسادَ، وتَخْبِيْبِ الرعيةِ على المَلِك، والعبدِ على مولاه، والزوجةِ على زوجها.

ومنه: عادات فاسدة، فيها إهمالٌ للارتفاقات الواجبة، كاللواطة، والسَّحاقة، وإتيانِ البهائم؛ فإنها تَصُدُّ عن النكاح؛ أو انسلاخٌ عن الفطرة السليمة، كالرجل يُؤَنَّثُ، والمرأةِ تُذَكَّرُ؛ أو حدوثٌ لمنازعات عريضة كالمزاحمة على الموطوءة من غير اختصاص بها، وكإدمان الخمر.

ومنه: معاملاتٌ ضارة بالمدينة، كالقِمار والربا أضعافا مضاعفة، والرشوةِ وتطفيف الكيل والوزن، والتدليس في السِّلَع، وتَلَقِّي الجَلَب، والاحتكار، والنَّجَش.

ومنه: خصومات مشكِلَة، يتمسك فيها كلٌّ بشبهة، ولاتنكشف جَلِيَّةُ الحالِ، فَيُحْتاج إلى التمسك بالبينات، والأيمان، والوثائق، وقرائن الحال، ونحوها، وردِّها إلى سنة مسلَّمة، وإبداءِ وجهِ الترجيح، ومعرفةِ مكايد المتخاصمين، ونحو ذلك.

ومنه: أن يَبْدُوَ أهلُ المدينة، ويكتفوا بالارتفاق الأول، أو يتمدَّنوا في غير هذه المدينة، أو يكون توزُّعهم في الإقبال على الأكساب بحيث يَضُرُّ بالمدينة: مثلُ أن يُقبل أكثرُهم على التجارة، ويَدَعوا الزراعة، أو يَتَكَسَّب أكثرُهم بالغزو ونحوه؛ وإنما ينبغي أن يكون الزُرَّاع بمنزلة الطعام والصُنَّاعُ والتُجَّار والحَفَظَة بمنزلة الملح المصلِح له.

ومنه: انتشار السباع الضَارِيَة، والهوامِّ المؤذية، فيجب السعي في إفنائها.

ترجمہ: اورخلل (پیدا کرنے والی چیزوں) میں سے یہ بات ہے کہ کچھ شریرلوگ، جن کوقوت ودبدبہ حاصل ہوگیا ہو، خواہشات کی پیروی کرنے پر اورانصاف کی راہ چھوڑنے پر متفق ہوجائیں: یاتو لوگوں کے اموال کی لالچ میں — اور یہ لوگ راہ زن ہیں — یا کسی غصہ یا کینہ کی وجہ سے لوگوں کونقصان پہنچانے پر یا ملک کی طمع میں۔ پس اس صورت میں لوگوں کو اکٹھا کرنے کی اور جنگ شروع کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ (اور لوگوں کو اکٹھا کرنے کے دومطلب ہوسکتے ہیں (۱) رائے عامہ کو ہموار کرکے جنگ شروع کی جائے (۲) جنگ کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا جائے۔ اور یہ بات اس زمانہ کی ہے جب حکومتوں کے پاس باقاعدہ فوج نہیں ہوتی تھی)

اورمنجملہ ازاں: کسی ظالم کا کسی انسان کو قتل کرنا، یازخمی کرنا، یا پٹائی کرنا، یا اس کی فیملی میں ہاتھ ڈالنا ہے: بایں طور کہ اس کی بیوی کے معاملہ میں مزاحمت کرے یا اس کی بہن بیٹی کی ناحق طمع کرے؛ یا اس کے مال میں دست درازی ہے: علانیہ چھین کر؛ یا چپکے سے چرا کر یا اس کی آبرو میں ہاتھ ڈالنا ہے، یعنی اس کو کسی ایسی بات کی طرف منسوب کرنا ہے جس کے ذریعہ وہ ملامت کیا جائے، یا اس کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آنا۔

اورمنجملہ ازاں: ایسے اعمال ہیں جو پوشیدہ طور پر شہر کو نقصان پہنچانے والے ہیں، جیسے جادو، زہر کی آمیزش، لوگوں کو فساد کی تعلیم دینا، پبلک کو بادشاہ کے خلاف، غلام کو آقا کے خلاف، اور بیوی کو شوہر کے خلاف ورغلانا۔

اورمنجملہ ازاں: وہ بری عادتیں ہیں جن میں ضروری تدبیرات نافعہ کو رائگاں کرنا ہے، جیسے اغلام، چپٹی، چوپایوں سے بدفعلی، پس بیشک یہ سب امورنکاح سے روک دیتے ہیں۔ یا ان (بری عادتوں) میں فطرت سلیمہ سے نکل جانا ہے، جیسے مرد کا ہیجڑا بن جانا، یا عورت کا مرد بن جانا۔ یا ان میں لمبے چوڑے جھگڑوں کا پیدا ہونا ہے، جیسے کسی منکوحہ پر مزاحمت کرنا، اس کے ساتھ کسی اختصاص کے بغیر، اور جیسے ہر وقت شراب کے نشہ میں چور رہنا۔

اورمنجملہ ازاں: شہر کو نقصان پہنچانے والے معاملات ہیں، جیسے جوا، چند در چند بڑھایا ہوا سود، رشوت ستانی، ناپ

تول میں کمی کرنا، مال تجارت کے عیب کو چھپانا، تجارتی قافلہ سے ملاقات کرنا، ذخیرہ اندوزی، گاہک کو پھنسانے کے لئے زیادہ دام لگانا۔

اور منجملہ ازاں: الجھے ہوئے جھگڑے ہیں، جن میں ہر فریق کسی بوگس دلیل سے استدلال کرتا ہے، اور اصل حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ پس گواہوں سے، قسموں سے، دستاویزات سے، صورت حال کے قرائن سے، اور اس طرح کی چیزوں سے تمسک کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور مقدمہ کو مسلمہ طریقہ کی طرف لوٹانے کی، اور وجہ ترجیح ظاہر کرنے کی، اور فریقین کی چالیں جاننے کی اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی (حاجت ہوتی ہے)

اور منجملہ ازاں: یہ بات ہے کہ شہر کے باشندے بادیہ نشینی اختیار کرلیں، اور ارتفاق اول پر اکتفا کرلیں، یا وہ اپنے شہر کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں جابسیں، یا ان کا پیشوں پر متوجہ ہونے میں منقسم ہونا اس طرح پر ہو کہ وہ شہر کے لئے ضرر رساں ہو، جیسے اکثر لوگ تجارت کی طرف متوجہ ہوجائیں اور زراعت کو چھوڑ دیں۔ یا اکثر لوگ جہاد وغیرہ سے کمائی کرنے لگیں۔ اور مناسب یہ ہے کہ کاشتکاروں کو بمنزلہ غذا کے قرار دیا جائے۔ اور کاریگروں، تاجروں اور محافظوں کو بمنزلہ نمک کے جس سے غذا کی اصلاح ہوتی ہے۔

اور منجملہ ازاں: حملہ آور درندوں کا، اور موذی حشرات الارض کا پھیلنا ہے، پس ان کو نابود کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

لغات: دَسَّ الشيئَ تحت التراب، وفيه: چھپانا ...... خَبَّبَه: خراب کرنا، کہا جاتا ہے خَبَّبَ على فلان صديقَه: اس نے فلاں کے دوست کو بگاڑ دیا ...... أَنُثَ (ک) مخنث ہونا، أَنَّثَهُ: مؤنث بنانا مخنث بنانا ...... بَدَا (ن) بَدَاوة: بادیہ میں اقامت اختیار کرنا ...... وَزَّعَ المالَ عليهم: تقسیم کرنا ...... الضارية: شکاری جانور ضَرِيَ يَضْرىٰ ضَرَاوةً الكلبُ بالصيد: شکار کا خوگر ہونا یعنی مع گوشت وخون کے چٹ کر جانا۔

☆ ☆ ☆

ملک کی حفاظت کے لئے انتظامات

ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی مختلف انتظامات سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے چار قسم کے انتظامات کا تذکرہ فرمایا ہے:

① ایسی عمارتیں بنائی جائیں جن سے عام لوگ فائدہ اٹھائیں، جیسے شہر پناہیں (فصیلیں، شہر کی چاردیواریں) سرحدی چوکیاں (وہ جگہ جہاں لشکر حفاظتِ سرحد کے لئے قیام کرے) قلعے (وہ محفوظ اور سنگین عمارتیں جن میں بادشاہ کی فیملی یا فوج رہے، جیسے لال قلعہ وغیرہ) سرحدیں (کنٹرول لائن) مارکیٹ اور پل وغیرہ۔

(۲) پینے اور آب پاشی کے لئے کنویں کھودے جائیں اور چشمے نکالے جائیں، اسی طرح پانی کے تالاب (Reservoir) اور ڈیم باندھے جائیں اور دریاؤں (بڑی ندیوں) پر کشتیاں تیار رکھی جائیں جو باڑ آنے پر لوگوں کی مدد کریں اور عام حالات میں لوگوں کو دریا پار کرنے میں مدد دیں۔

(۳) (الف) ملک کی بنیادی ضرورت غلہ اور اشیائے خوردنی ہیں، اگر ملک اس سلسلہ میں خود کفیل نہ ہو تو ملکی یا غیر ملکی تاجروں کو غلہ کی درآمد پر آمادہ کیا جائے، ملکی تاجروں کو سہولیات فراہم کی جائیں اور غیر ملکی تاجروں کو مانوس کیا جائے اور ان کی دلداری کی جائے۔ اور ملک کے باشندوں کو تاکید کی جائے کہ وہ ان پردیسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں، اس سے غیر ملکی سوداگروں کی آمد و رفت بڑھے گی اور ملک کو ضرورت کی چیزیں فراہم ہوں گی۔

(ب) نیز کاشتکاروں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کوئی زمین بے کار نہ چھوڑیں، زیادہ سے زیادہ کاشت کریں، تاکہ نہ صرف یہ کہ مملکت کی ضرورت پوری ہو، بلکہ مملکت غلہ برآمد کرنے کی پوزیشن میں آجائے۔

(ج) دستکاری اور صنعت و حرفت کو نہ صرف یہ کہ فروغ دیا جائے بلکہ متعلقہ لوگوں کو اس پر بھی آمادہ کیا جائے کہ وہ چیزوں کو عمدہ اور مضبوط بنائیں، تاکہ مارکیٹ میں ملک کی مصنوعات کو مقام حاصل ہو۔

(د) شہر کے باشندوں کو فضائل و کمالات کی تحصیل پر آمادہ کیا جائے، جیسے خوش نویسی، حساب و کتاب، فن تاریخ، علم طب، اور پیش بینی کے صحیح طریقوں میں مہارت پیدا کرنے کی ترغیب دی جائے اور اس کے لئے ممکنہ وسائل فراہم کئے جائیں۔

(۴) شہر کے احوال کا تفقد کیا جائے تاکہ مفسد اور مملکت کے لئے خیر خواہ کا پتہ چلتا رہے، اول سے بچا جائے، اور اس کی ریشہ دوانیوں پر نظر رکھی جائے۔ اور ثانی کو شریک کار بنایا جائے یا اس کی دلداری کی جائے۔ دوستوں کی دلداری بھی ضروری ہے۔

اسی طرح تفقدِ احوال سے محتاجوں کا پتہ چلے گا اور ان کی مدد کی جاسکے گی، اور عمدہ صنعت کاروں کا بھی پتہ چلے گا، اور ملک ان سے استفادہ کرے گا۔

ومن باب كمال الحفظ: بناءُ الأبنية التي يشتركون في الانتفاع بها، كالأسوار، والرُّبُط، والحصون، والثُّغور، والأسواق، والقناطر.

ومنه: حفر الآبار واستنباط العيون، وتهيئةُ السُّفُن على سواحل الأنهار.

ومنه: حملُ التجّار على المِيْرة، بتأنيسهم وتأليفهم، وتوصيةِ أهل البلد أن يُحسنوا المعاملةَ مع الغرباء، فإن ذلك يفتح بابَ كثرةِ ورودهم؛ وحملُ الزُّرّاع على أن لايتركوا أرضًا مهمَلَة؛ والصُّنّاع على أن يُحسنوا الصّناعاتِ، ويُتقِنوها؛ وأهلِ البلد على اكتساب الفضائل، كالخط،

والحساب، والتاريخ، والطب، والوجوه الصحيحة من تقدمة المعرفة.

ومنه: معرفةُ أخبار البلد، ليتميز الدّاعر من الناصح، وليُعلم المحتاجُ فيُعَانُ، وصاحبُ صنعةٍ مرغوبةٍ، فيستعانُ به.

ترجمہ: اور مملکت کی کامل حفاظت کے باب سے ایسی عمارتیں بنانا ہے جن سے فائدہ اٹھانے میں سب لوگ شریک ہوں، جیسے شہر پناہیں، سرائیں، قلعے، سرحدیں، بازار اور پل۔

اور از اں جملہ: کنویں کھودنا، چشمے نکالنا اور دریاؤں کے کناروں پر کشتیوں کو تیار رکھنا ہے۔

اور از اں جملہ: تاجروں کو غلہ لانے پر آمادہ کرنا ہے، ان کو مانوس کر کے اور ان کی دلداری کر کے، اور اہل شہر کو تاکید کرنا ہے کہ وہ پردیسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ پس یہ چیز سوداگروں کی آمد ورفت کا دروازہ کھولے گی —— اور کاشتکاروں کو آمادہ کرنا ہے اس پر کہ وہ کوئی زمین بے کار نہ چھوڑیں —— اور دستکاروں کو آمادہ کرنا ہے اس پر کہ وہ چیزوں کو عمدہ اور مضبوط بنائیں —— اور شہر والوں کو فضائل کی تحصیل پر آمادہ کرنا ہے جیسے لکھنا، حساب، تاریخ، طب اور پیش بینی کے صحیح طریقے۔

اور از اں جملہ: شہر کے احوال کا جاننا ہے تاکہ مفسد، خیر خواہ سے ممتاز ہو جائے۔ اور تاکہ محتاج کا پتہ چلے، پس اس کی مدد کی جائے، اور کارآمد صنعت والے کا پتہ چلے تاکہ اس سے مدد لی جائے۔

لغات: السُّوْر: شہر پناہ جمع أَسْوَارٌ وسِيْرَانٌ...... الرِبَاط: قلعہ یا وہ جگہ جہاں لشکر حفاظت سرحد کے لئے قیام کرے جمع رُبُط اور جو رِبَاط بمعنی سرائے ہے اس کی جمع رِبَاطَاتٌ ہے...... المِيْرة: خوراک جس کو ذخیرہ کر کے رکھا جائے جمع مِيَرٌ...... الغريب: مسافر، اجنبی، وطن سے دور...... الدّاعِر: شریر خبیث جمع دُعّار۔

☆ ☆ ☆

ملک کی ویرانی کے بڑے اسباب

بارہویں صدی ہجری میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں مملکت کی ویرانی کے بڑے اسباب دو ہیں:

① سرکاری خزانے کا غیر ضروری مصارف کے بوجھ تلے دب جانا —— جیسے اس زمانہ میں جنگ لڑنے والے بیت المال ہی کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔ علمائے دین بیت المال میں اپنا حق سمجھتے ہیں۔ بزرگوں اور شاعروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا بادشاہوں کی عادت ہے، اسی طرح اور لوگ بھی بادشاہوں سے مختلف طرح سے بھیک مانگتے ہیں۔ اور ان

سب لوگوں کا مقصد محض پیٹ پالنا ہے، وہ مملکت کی کوئی مصلحت پوری نہیں کرتے۔ یہ لوگ بار بار بادشاہوں کے پاس آتے ہیں، اوران کی زندگی مکدر کئے رہتے ہیں اس طرح کہ ایک بادشاہ کے پاس سے نکلتا بھی نہیں کہ دوسرا پہنچ جاتا ہے، اسی طرح بعض بعض کو تنگ کرتے ہیں اور مملکت پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔

(۲) کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگانا بھی ملک کی بربادی کا سبب ہے۔ اس سے خیرخواہوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے اور رفتہ رفتہ فرمانبردار ختم ہوجاتے ہیں۔ اور سخت جنگ جو لوگ قوت پکڑ لیتے ہیں اور وہ بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

سب لوگوں کو یہ اہم نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ مملکت ہلکے ٹیکسوں اور بقدر ضرورت عملہ ہی سے سنور سکتی ہے۔

وغالبِ سببِ خَراب البُلدان في هذا الزمان شيئان:

أحدهما: تضييقُهم على بيت المال، بأن يعتادوا التكسُّب بالأخذ منه، على أنهم من الغُزاة، أو من العلماء الذين لهم حق فيه، أو من الذين جرت عادة الملوك بصِلتهم، كالزُّهّاد، والشعراء، أو بوجهٍ من وجوه التكدى؛ ويكون العمدة عندهم هو التكسبُ، دون القيام بالمصلحة؛ فيدخل قوم على قوم، فيُنَغِّصُوْنَ عليهم، ويصيرون كَلًّا على المدينة.

والثاني: ضرب الضرائب الثقيلة على الزُّراع والتجار والمتحرِّفة، والتشديدُ عليهم، حتى يُفضي إلى إجحاف المطاوعين، واستئصالهم، وإلى تَمَنُّع أولى بأس شديد، وبَغْيِهم؛ وإنما تصلُحُ المدينة بالجباية اليسيرة، وإقامةِ الحفظة بقدر الضرورة؛ فليتنبه أهلُ الزمان لهذه النكتة، والله أعلم.

ترجمہ: اوراس زمانہ میں ملک کی ویرانی کے بڑے اسباب دو ہیں:

ان میں سے ایک: لوگوں کا بیت المال پر بوجھ بننا ہے، اس طرح کہ لوگ بیت المال سے لینے کے ذریعہ کمائی کرنے کے عادی بن گئے ہیں، اس بنیاد پر کہ وہ غازیوں میں سے ہیں۔ یا اُن علماء میں سے ہیں جن کا بیت المال میں حق ہے۔ یا اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے ساتھ سلوک کرنا بادشاہوں کی عادت ہے، جیسے بزرگ لوگ اور شعراء، یا بھیک مانگنے کی صورتوں میں سے کسی اور صورت کے ذریعہ، اوران لوگوں کا مقصد محض اپنا پیٹ پالنا ہے، بغیر اس کے کہ ان سے ملک کی کوئی مصلحت تکمیل پذیر ہو، پس ایک قوم دوسری قوم پر داخل ہوتی ہے (یعنی یہ تعاون کے خواہاں بادشاہوں کے پاس آتے ہیں) پس وہ اُن (بادشاہوں) کی زندگی مکدر کئے رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ مملکت پر بار بن جاتے ہیں۔

اور دوسری: کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگانا ہے، اوران پر سختی کرنا ہے، تا آنکہ یہ چیز

فرمانبرداروں کو بہالے جاتی ہے اوران کو جڑ سے مٹا دیتی ہے۔اور سخت جنگ جو لوگ قوت پکڑ لیتے ہیں، اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور مملکت ہلکے ٹیکسوں سے اور بقدر ضرورت محافظین (سرکاری عملہ، پولیس وغیرہ) مقرر کرنے ہی سے سنور سکتی ہے، اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہو جانا چاہئے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

تَكَسَّبَ مالاً: کمائی کرنا...... **نَغَّصَ العيشَ**: زندگی مکدر کردینا...... **اَجْحَفَ السيلُ**: بہالے جانا **اَجْحَفَ الدهرُ**: ہلاک کرنا، جڑ سے مٹانا...... **اِسْتَأْصَلَ الشيئَ**: جڑ سے اکھیڑنا...... **تَمَنَّعَ بقومه**: قوت پکڑنا...... **الجِبَايَة**: خراج ٹیکس **جَبَا** (ن) **جَبًا و جَبْيٌ** (ض) **جِبَايَةً**: جمع کرنا۔

باب ——— ۷

سربراہ مملکت کے لئے ضروری اوصاف

سربراہ مملکت میں درج ذیل چودہ اوصاف ضروری ہیں:

۱-: پسندیدہ اخلاق ——— اگر بادشاہ میں اخلاق حسنہ نہیں ہوں گے تو وہ مملکت پر بار ہو جائے گا۔

۲-: بہادری ——— اگر بادشاہ میں شجاعت نہیں ہوگی تو وہ برسر پیکار لوگوں سے مقابلہ نہیں کرسکے گا، اور رعایا بھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھے گی۔

۳-: بردباری ——— بادشاہ اگر حلیم نہیں ہوگا تو اپنے قہر وغضب سے لوگوں کو تباہ کردے گا۔

۴-: دانشمندی ———دانشمند بادشاہ ہی ملک کے لئے تدبیرات نافعہ نکال سکتا ہے۔

۵-: بادشاہ عاقل ہو، پاگل نہ ہو۔

۶-: بادشاہ بالغ ہو، بچہ نہ ہو۔

۷-: بادشاہ آزاد ہو، غلام نہ ہو۔

۸-: بادشاہ مرد ہو، عورت نہ ہو، کیونکہ حکومت ایک بھاری ذمہ داری (Heavy Duty) ہے، جو عورت کے ناتواں کاندھوں پر نہیں رکھی جاسکتی۔ نیز عورت اپنی وضع باقی رکھتے ہوئے بڑی حکومت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ بھی نہیں ہوسکتی۔

۹-: بادشاہ ذی رائے ہو، بے وقوف نہ ہو۔

۱۰-: بادشاہ شنوا ہو، بہرہ نہ ہو۔

۱۱-: بادشاہ بینا ہو، اندھا نہ ہو۔

۱۲-: بادشاہ گویا ہو، گونگا نہ ہو۔

۱۳-: بادشاہ کی پشت (Back) مضبوط ہو یعنی لوگوں نے اس کی اور اس کی قوم کی بزرگی تسلیم کر رکھی ہو، اور اس کے اور اس کے اسلاف کے اچھے کارنامے دیکھ چکے ہوں۔

۱۴-: بادشاہ کو لوگوں کا اعتماد حاصل ہو یعنی لوگ اس کے بارے میں یقین رکھتے ہوں کہ وہ مملکت کی اصلاح میں ذرا کوتاہی نہیں کرے گا۔

مذکورہ تمام اوصاف کی ضرورت کو عقل تسلیم کرتی ہے اور دنیا کے تمام لوگ بھی اس پر متفق ہیں، حالانکہ ان کے ملک ایک دوسرے سے دور ہیں اور ان کے مذاہب مختلف ہیں۔ اور اس اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ سب لوگوں کو احساس ہے کہ بادشاہ مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے وہ مذکورہ اوصاف کے بغیر ممکن الحصول نہیں۔ چنانچہ اگر لوگ مذکورہ باتوں میں سے کسی بات کی بادشاہ میں کمی دیکھتے ہیں تو اس بادشاہ کو نامناسب تصور کرتے ہیں، اور اس کو ان کے دل ناپسند کرتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تو ناراضگی کے ساتھ خاموش رہتے ہیں۔

نوٹ: اسلام نے خلیفہ کے لئے جو مسلمان مجتہد اور قرشی ہونے کی شرطیں بڑھائی ہیں۔ ان کا بیان جلد ثانی (رحمۃ اللہ ۵:۲۲۰) میں الخلافۃ کے عنوان کے تحت آرہا ہے۔

﴿باب سيرة الملوك﴾

يجب أن يكون الملِكُ مُتَّصفا بالأخلاق المرضية، وإلا كان كَلًّا على المدينة؛ فإن لم يكن شُجاعا ضَعُف عن مقاومة المحاربين، ولم تنظُر إليه الرعيةُ إلا بعينِ الهَوَان؛ وإن لم يكن حليمًا، كاد يُهلكهم بسَطْوَته؛ وإن لم يكن حكيمًا، لم يستنبطِ التدبيرَ المُصْلِحَ؛ وأن يكون عاقلاً، بالغا، حُرًّا، ذَكَرًا، ذارأيٍ، وسَمْعٍ، وبَصَرٍ، ونُطق، ممن سلَّم الناسُ شرفَه وشرفَ قومه، ورأوا منه ومن آبائه المآثرَ الحميدةَ، وعرفوا أنه لايألُوا جُهدا في إصلاح المدينة.

هذا كلُّه يدل عليه العقلُ، وأجمعت عليه أمم بني آدم، على تباعُدِ بُلدانهم واختلاف أديانهم لِمَا أحسُّوا من أن المصلحةَ المقصودةَ من نصب الملِك لاتتم إلا به؛ فإن وقع شيئ من إهماله رأوه خلافَ ما ينبغي، وكرِهَتْه قلوبُهم، ولو سكتوا سكتوا على غيظ.

ترجمہ: سیرت بادشاہاں کا بیان: بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ پسندیدہ اخلاق سے متصف ہو، اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ شہر (مملکت) پر بوجھ ہوجائے گا۔ پھر اگر وہ بہادر نہیں ہے، تو وہ برسرپیکار لوگوں سے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے

گا۔ اور رعایا اس کو حقارت کی نظر ہی سے دیکھے گی۔ اور اگر وہ بردبار نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے قہر سے لوگوں کو ہلاک کر ڈالے۔ اور اگر وہ دانشمند نہیں ہے تو تدبیرات نافعہ نہیں نکال سکے گا۔ اور بادشاہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عقل مند، بالغ، آزاد، مرد، ذی رائے، شنوا، بینا، گویا ہو۔ (اور) ان لوگوں میں سے ہو جس کی اور جس کی قوم کی بزرگی لوگوں نے تسلیم کر رکھی ہو۔ اور اس کے اور اس کے اسلاف کے اچھے کارنامے لوگ دیکھ چکے ہوں اور لوگ جانتے ہوں کہ بادشاہ ملک کی اصلاح میں ذرا کوتاہی نہیں کرے گا۔

ان سب باتوں کے ضروری ہونے پر عقل دلالت کرتی ہے۔ اور اس پر انسانوں کے تمام گروہوں نے اتفاق کیا ہے، ان کے ملکوں کے ایک دوسرے سے دور ہونے، اور ان کے مذاہب کے مختلف ہونے کے باوجود، بایں وجہ کہ دنیا کی تمام اقوام کو اس کا احساس ہے کہ بادشاہ مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے، وہ ان امور کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ پس اگر بادشاہ (ان امور میں) کوئی فروگذاشت کرے گا تو لوگ اس کو نامناسب سمجھیں گے۔ اور اس بادشاہ کو ان کے دل ناپسند کریں گے۔ اور اگر وہ خاموش رہیں گے تو ناراضگی کے ساتھ خاموش رہیں گے۔

بادشاہ کے لئے حشمت کی ضرورت

بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ رعایا کے دلوں میں حشمت و عظمت اور دبدبہ پیدا کرے، پھر اس کی نگاہ داشت کرے۔ اور حشمت کو نقصان پہنچانے والی کوئی بات پیش آئے تو مناسب تدبیر سے اس کی اصلاح کرے، اور کسی طرح حشمت و عظمت کو لوگوں کے دلوں سے زائل نہ ہونے دے۔

اور عظمت و حشمت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بادشاہ خود کو ایسے اخلاق عالیہ سے مزین کرے جو ریاست کے شایان شان ہوں۔ مثلاً بہادری، دانشمندی، فیاضی، مخالفوں سے درگذر کرنا، مفاد عامہ کے لئے کام کرنا وغیرہ۔ اور بادشاہ لوگوں کو رام کرنے کے لئے وہ انداز اختیار کرے جو شکاری جنگلی جانوروں کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ جب کوئی شکاری ہرنوں کے شکار کے لئے نکلتا ہے۔ اور جنگل میں اس کو ہرن نظر پڑتے ہیں تو وہ ان کے حسب حال ہیئت بنا لیتا ہے۔ ہاتھ زمین پر ٹیک کر چار پیروں سے، یا جھک کر جانوروں کی طرح چلتا ہے۔ اور دور سے ان کے سامنے نمودار ہوتا ہے، اور ان کی آنکھوں اور کانوں پر نظر جمائے رکھتا ہے۔ پھر جب بھی محسوس کرتا ہے کہ ہرنوں کو بھنک پڑ گئی، تو ساکت وصامت کھڑا ہو جاتا ہے، گویا وہ کوئی بے جان چیز ہے، ذرا حرکت نہیں کرتا۔ اور جب ان کو غافل پاتا ہے تو ان کی طرف رینگنے لگتا ہے، اور کبھی نغموں سے ان کو خوش کرتا ہے تو کبھی ان کے سامنے وہ چارہ ڈالتا ہے جو ان کو مرغوب ہوتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ طبعی طور پر صاحب کرم ہے اس لئے چارہ کھلا رہا ہے، اس کا مقصد ان کو شکار کرنا نہیں ا احسان: محسن کی محبت پیدا کرتا ہے اور محبت کی بیٹریاں لوہے کی بیڑیوں سے مضبوط ہوتی ہیں، چنانچہ ہرن شکاری کی جا

میں پھنس جاتے ہیں۔

اسی طرح جو شخص پبلک لائف میں آنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسی حالت اختیار کرے جو لوگوں کو پسند ہو، پوشاک، بات چیت کا انداز اور سلیقہ ایسا اختیار کرے جو لوگوں کو مرغوب ہو، پھر ہَولے ہَولے لوگوں سے قریب ہو، اور خیر خواہی اور محبت کا مظاہرہ کرے، مگر بات اٹکل پچو نہ ہو، اور نہ کوئی ایسا قرینہ ظاہر ہونے دے جس سے پتہ چلے کہ وہ بس ''ووٹ'' کا خواہاں ہے۔ پھر وہ لوگوں کو یہ بات باور کرائے کہ اُس جیسی شخصیت لوگوں کو ملنا مشکل ہے۔ اور یہ طرزِ عمل اس وقت تک جاری رکھے کہ اس کو اطمینان ہو جائے کہ لوگوں کے دل اس کی فضیلت و برتری سے مطمئن ہو گئے ہیں۔ اور ان کے سینے اس کی عظمت و محبت سے لبریز ہو گئے ہیں اور ان کے اعضاء اس کے سامنے خاکساری اور نیاز مندی کے عادی ہو چکے ہیں۔ پھر بادشاہ اپنے اس دبدبہ کی حفاظت کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی آڑ لے کر لوگ اس کی مخالفت پر اتر آئیں۔ اور خدانخواستہ بادشاہ سے کوئی کوتاہی اور لغزش سرزد ہو جائے تو لطف و احسان سے اس کا تدارک کرے اور لوگوں کو یہ بات سمجھائے کہ مصلحت کا تقاضا وہ تھا جو اس نے کیا۔ اور اس عمل سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا، ضرر نہیں پہنچے گا۔

ولابد للملك من إنشاء الجاه في قلوب رعيته، ثم حفظِه، وتدارُكِ الخادشات له بتدبيرات مناسبة.

ومن قصدَ الجاهَ فعليه أن يتحلّى بالأخلاق الفاضلة مما يناسب رياستَه، كالشجاعة، والحكمة، والسخاوة، والعفو عمن ظلم، وإرادةِ نفع العامة.

ويفعل بالناس مايفعل الصياد بالوَحْشِ: فكما أن الصياد يذهب إلى الغَيْضَة، فينظر إلى الظباء، ويتأملُ الهيئةَ المناسِبةَ لطبائعها وعاداتها، فَيَتَهَيَّأُ بتلك الهيئة، ثم يَبْرُز لها من بعيد، ويُقَصِّرُ النظرَ على عيونها وآذانها، فمهما عرف منها تيقُّظا أقام بمكانه، كأنه جَماد، ليس به حِرَاكٌ، ومهما عرف منها غفلةً دَبَّ إليها دبيبًا، وربما أَطْرَبَهَا بالنَّغم، وألقى إليها أطيبَ ما ترومُه من العلف، على أنه صاحبُ كرم بالطبع، وأنه لم يقصد بذلك صيدها؛ والنِّعَمُ تورث حبَّ المُنعم، وقيدُ المحبة أوثقُ من قيد الحديد.

فكذلك الرجل الذي يبرز إلى الناس ينبغي أن يؤثِر هيئة ترغَب فيها النفوسُ، من زِيٍّ، ومنطقٍ، وأدب، ثم يتقرَّب منهم هَوْنًا، ويُظهر إليهم النُّصحَ والمحبة، من غير مُجازفة ولاظهورِ قرينةٍ تدل على أن ذلك لصيدهم، ثم يُعْلِمُهم أن نظيره كالممتَنِع في حقهم، حتى يرى أن نفوسهم قد اطمأنت بفضله وتقدُّمه، وصدورَهم قد امتلأت مودةً وتعظيمًا، وجوارحَهم تَدَأَّبَتْ خشوعًا وإخباتًا، ثم لِيَحْفَظْ ذلك فيهم، فلا يكن منه ما يختلفون به عليه، فإن فرط شيئٌ من

ذلك فليتداركه بلطف وإحسان، وإظهارِ أن المصلحة حكمتْ بمافعل، وأنه لهم، لا عليهم.

ترجمہ: اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی رعایا کے دلوں میں دبدبہ پیدا کرے، پھر اس کی حفاظت کرے، پھر اس کو نقصان پہنچانے والی چیزوں کا مناسب تدبیروں سے تدارک کرے۔ اور جو شخص حشمت ودبدبہ چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ خود کو ایسے اخلاق عالیہ سے مزین کرے جو اس کی ریاست کے مناسب ہوں، جیسے بہادری، دانشمندی، فیاضی، گنہ گار سے درگذر کرنا، اور عوام کا فائدہ چاہنا۔

اور وہ لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسا شکاری وحشی جانوروں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ پس جس طرح شکاری جھاڑی میں جاتا ہے، پس وہ ہرنوں کو دیکھتا ہے، اور ان کی طبیعتوں اور عادتوں کے مناسب ہیئت کو سوچتا ہے، اور ان کی ہیئت کے مطابق اپنی ہیئت بنالیتا ہے، پھر وہ دور سے ان کے سامنے آتا ہے۔ اور ان کی آنکھوں اور کانوں کی طرف اپنی نگاہ جمائے رکھتا ہے، پس جب جب وہ محسوس کرتا ہے کہ ہرن چوکنا ہو گئے ہیں تو وہ اسی جگہ ٹھہر جاتا ہے، گویا وہ کوئی بے جان چیز ہے، اس میں ذرا حرکت نہیں ہوتی۔ اور جب جب ان کو غافل پاتا ہے، تو ان کی طرف آہستہ آہستہ رینگتا ہے۔ اور کبھی ان کو نغموں (خوش کن آواز) سے خوش کرتا ہے، اور ان کے سامنے وہ چارہ ڈالتا ہے جو ان کو مرغوب ہوتا ہے، گویا وہ فطری طور پر صاحب جودوکرم ہے، اور وہ اس ذریعہ سے ان کو شکار کرنا نہیں چاہتا۔ اور انعامات منعم کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ اور محبت کی بیڑی لوہے کی بیڑی سے زیادہ مضبوط ہے۔

پس اسی طرح جو شخص لوگوں کے سامنے نمودار ہونا چاہتا ہے، مناسب یہ ہے کہ وہ پوشاک، بات چیت اور ادب وسلیقہ کی ایسی حالت اختیار کرے جو لوگوں کو مرغوب ہو، پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب ہو، اور ان کے سامنے خیر خواہی اور محبت کا اظہار کرے، لاف وگزاف سے بچتے ہوئے، اور کوئی ایسا قرینہ ظاہر نہ ہونے دے جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ وہ خیر خواہی کی باتیں ان کو شکار کرنے کے لئے ہیں۔ پھر ان کو بتلائے کہ اس جیسا شخص ان کے حق میں ناممکن ہے، یہاں تک کہ دیکھ لے کہ لوگوں کے دل اس کی فضیلت اور برتری پر مطمئن ہو گئے ہیں، اور ان کے سینے محبت وعظمت سے بھر گئے ہیں، اور ان کے اعضاء انکساری اور نیازمندی کے عادی ہو چکے ہیں۔ پھر وہ ان سب باتوں کی لوگوں میں حفاظت کرے، کوئی کام اس سے ایسا سرزد نہ ہونے پائے جس کی آڑ لیکر لوگ اس کی مخالفت پر اتر آئیں، پھر اگر اس معاملہ میں بادشاہ سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو بادشاہ کو چاہئے کہ مہربانی اور نیک سلوک سے اور یہ بات ظاہر کر کے اس کا تدارک کرے کہ مصلحت کا تقاضا وہ تھا جو اس نے کیا۔ اور یہ بات سمجھائے کہ وہ کام ان کے مفاد میں ہے، ان کے لئے مضر نہیں ہے۔

لغات: خَدَشَه (ض) خَدْشًا خراش لگانا، عیب لگانا...... الغَيْضَة: جھاڑی، پانی کی جگہ میں بہت درخت جمع غِيَاض وغَيْضَات...... الحَرَاك: حرکت حَرُكَ (ک) حَرَكًا وحَرَكَة: ہلنا...... دَبَّ (ض) دَبًّا ودَبِيْبًا: رینگنا، ہاتھوں اور پیروں کے بل چلنا...... رَامَ (ن) رَوْمًا الشيئَ: ارادہ کرنا...... القَيْدُ: بیڑی، جانور کے پاؤں باندھنے کی رسی وغیرہ

قَيَّدَه: بیڑی ڈالنا، روکنا...... المجازفة: اٹکل پچو، بے تکی باتیں کرنا جَازَفَه مجازفة: اٹکل سے خرید و فروخت کرنا......
تَدَ أُبَ: باب تفعُّل کے معنی ہیں عادی ہونا۔ مادّہ: دَأْبٌ ہے جس کے معنی ہیں حالت، عادت۔ یہ لفظ مخطوطہ کراچی میں اعراب کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور بین السطور میں اس کا ترجمہ اعتادت بھی لکھا ہوا ہے۔ مطبوعہ میں یہ لفظ بگڑ گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

سربراہ مملکت کے لئے سات ضروری باتیں

سربراہ مملکت کے لئے درج ذیل سات باتیں ضروری ہیں:

① اپنی فرمانبرداری ثابت کرنے کے لئے بادشاہ کو چاہئے کہ بہترین کارکنوں کی ہمت افزائی کرے، اور ناکارہ افراد کی ہمت شکنی کرے اور جو اس کی نافرمانی کرے اس کی سرزنش کرے مثلاً بادشاہ کسی شخص کی کسی جنگ میں یا خراج کی تحصیل میں یا مملکت کے نظم و انتظام میں اچھی کارکردگی دیکھے تو بطور انعام اس کی تنخواہ میں اضافہ کرے، اس کا منصب بلند کرے اور اس سے خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور اگر خیانت دیکھے یا دیکھے کہ وہ کام میں پیچھے رہتا ہے یا کھسک جاتا ہے تو بطور سرزنش اس کی تنخواہ گھٹا دے، اس کا منصب پست کر دے اور اس سے روگردانی کرے۔

② بادشاہ کو دوسروں سے زیادہ دولت مند ہونا چاہئے۔ مگر اس کی مالداری ایسی چیزوں کے ذریعہ ہونی چاہئے جو پبلک کے لئے تنگی کا باعث نہ ہوں۔ مثلاً ویران زمین کی آبادکاری کرنا یا کسی دور افتادہ علاقہ کو حِمیٰ (Reserve Area) بنانا اور اس کی آمدنی سے فائدہ اٹھانا۔

③ بادشاہ کسی پر سخت گیری اس وقت کرے جب پہلے وہ ارکان دولت اور اکابر مملکت کی ذہن سازی کر لے۔ وہ پہلے ان کے سامنے یہ بات ثابت کرے کہ وہ شخص سزا کا مستحق ہے اور ملکی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی گوشمالی کی جائے۔ اس ذہن سازی کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر بادشاہ کے اقدام سزا کے بعد لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوں گی تو ملک کا یہ عالی دماغ طبقہ اس کو سنبھال لے گا، ورنہ یہ لوگ خود اس میں حصہ دار بن جائیں گے اور ملک میں خلفشار ہوگا۔

④ بادشاہ میں فراست اور قیافہ شناسی ضروری ہے، تاکہ وہ لوگوں کے دلوں کی مخفی باتوں کو تاڑ لے۔

⑤ بادشاہ نہایت زیرک ہونا چاہئے کہ اگر وہ کسی کے بارے میں اٹکل باندھے تو گویا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور کانوں سے سنا ہے۔

⑥ بادشاہ ضروری کاموں کو التوا میں نہ ڈالے، تاخیر سے بعض مرتبہ نقصان ہوتا ہے اور کاموں کا ہجوم بھی ہو جاتا ہے۔

⑦ اگر کوئی شخص دل میں بادشاہ سے عداوت رکھتا ہے تو بادشاہ اس کے معاملہ میں غفلت نہ برتے، بلکہ جب تک اس کے پروگرام کو تہس نہس نہ کردے اور اس کے زور کو توڑ نہ دے چین سے نہ بیٹھے۔

والملك مع ذلك يحتاج إلى إيجاب طاعته بالانتقام ممن عصاه، فمهما اسْتَشْعَرَ من رجل كفاية في حرب، أو جباية، أو تدبير، فليُضاعف عطاءَه، وليرفع قدرَه، وليبسط له بشره؛ ومهما استشعر منه خيانة، وتخلُّفا، وانسلالاً، فلينقُص من عطائه، وليخفض من قدره، وليَطْوِ عنه بشره؛ وإلى يسار أكملَ من يسار الناس؛ وليكن مما لا يُضيِّق عليهم، كَمَوَاتٍ يُحْيِيه، وناحيةٍ بعيدة يَحْمِيها، ونحوِ ذلك؛ وإلى أن لايَبْطِش بأحدٍ، إلا بعد أن يُصَحِّح على أهل الحل والعقد: أنه يستحقه، وأن المصلحة الكلية حاكمة به؛ ولابد للملك من فِراسة يتعرف بها ما أضمرت نفوسُهم، ويكون اَلْمَعِيَّا يَظُنُّ بك الظنَّ كَأَنْ قد رأى وقد سمع؛ ويجب عليه أن لايؤخر مالابد منه إلى غدٍ؛ ولايَصْبِرُ إن رأى منهم أحدًا يُضمر عداوته دون فَكِّ نظامه، وإضعافِ قوته، والله أعلم.

ترجمہ: اور بادشاہ ان (گذشتہ) باتوں کے ساتھ (مستزاد) اپنی فرمانبرداری ثابت کرنے کے لئے اس بات کا محتاج ہے کہ وہ اس شخص سے بدلہ لے (یعنی سرزنش کرے) جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ پس جب جب بادشاہ کسی شخص کی کسی جنگ میں یا خراج کی تحصیل میں یا مملکت کی تدبیر میں کوئی اچھی کارکردگی محسوس کرے تو اس کی تنخواہ بڑھادے، اور اس کا منصب بلند کرے، اور اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے، اور جب جب اس سے خیانت، پیچھے ہٹنا اور کھسک جانا دیکھے تو اس کی تنخواہ کم کردے، اور اس کا منصب گھٹادے، اور اس سے روگردانی کرے —— اور بادشاہ ایسی مالداری کا بھی محتاج ہے جو عام لوگوں کی مالداری سے کامل تر ہو، اور چاہئے کہ وہ مالداری ان چیزوں کے ذریعہ ہو جو لوگوں پر تنگی نہ کریں، جیسے کوئی غیر آباد زمین جس کی آبادکاری کرے اور دور افتادہ علاقہ، جس کو حمی (محفوظ علاقہ) قرار دے، اور اس طرح کی دوسری چیزیں —— اور بادشاہ اس کا بھی محتاج ہے کہ وہ کسی پر سخت گیری نہ کرے مگر ارباب حل وعقد کے سامنے یہ بات ثابت کرنے کے بعد کہ وہ شخص سزا کا مستحق ہے اور یہ کہ مصلحت کا مقتضی دار وگیر ہے —— اور بادشاہ میں ایسی فراست ضروری ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی باتیں جان لے —— اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اَلْـمَعِـيّ (نہایت زیرک) ہو، جو تیرے بارے میں اگر کوئی اٹکل باندھے تو گویا اس نے اپنی آنکھوں اور کانوں سے دیکھا اور سنا ہے۔ —— اور بادشاہ پر واجب ہے کہ وہ ضروری کاموں کو آئندہ پر نہ ٹالے —— اور اگر بادشاہ کسی کو دیکھے کہ وہ دل میں بادشاہ سے عداوت پوشیدہ رکھتا ہے تو اس کے نظام کو درہم برہم کئے بغیر، اور اس کی

قوت کو کمزور کئے بغیر چین سے نہ بیٹھے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

اِسۡتَشۡعَرَ منه: محسوس کرنا، بھنک پڑنا...... کَفٰی یَکۡفِیۡ کِفَایَةً: کافی ہونا۔ یہاں کفایة کے معنی کارنامہ کے ہیں ...... تَخَلَّفَ عنه: پیچھے رہنا...... اِنۡسَلَّ منه: چپکے سے کھسک جانا...... طَوٰی یَطۡوِیۡ طَیًّا: لپیٹنا...... أحۡیَاهُ: زندہ کرنا أحۡیَا الأرض: سرسبز بنانا...... حَمٰی (ض) حَمۡیًا الشیئَ من الناس: روکنا، بچانا الحِمٰی: وہ چراگاہ جس میں دوسروں کو جانور چرانے کی ممانعت ہو۔

باب ــــــ ۸

سرکاری عملہ کے نظم وانتظام کا بیان

یہ ارتفاق ثالث کا تیسرا اور آخری باب ہے۔ اس باب میں سرکاری عملہ کے احوال مذکور ہیں:

عملہ کی ضرورت، شرائط اور برتاؤ: بادشاہ چونکہ بذات خود حکومت کے تمام کام سرانجام نہیں دے سکتا، اس لئے حکومت کے ہر کام کے لئے علحدہ علحدہ عملہ ہونا ضروری ہے۔ اور ملازمین کے لئے چار شرطیں تو لازمی ہیں، اور ایک شرط مستزاد ہے یا یہ کہیں کہ چار شرطیں مثبت ہیں اور پانچویں شرط منفی ہے:

۱-: ایمان داری، فرض شناسی اور احساس ذمہ داری۔ کیونکہ اس کے بغیر کام بہ خوبی انجام نہیں پاسکتے۔

۲-: جو کام کسی کے سپرد کیا جائے، اس کی انجام دہی کی اس میں پوری صلاحیت ہونی چاہئے۔ نا اہل نہ صرف یہ کہ ناکام رہتا ہے بلکہ وہ سارا معاملہ بگاڑ دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے إذا وُسِّد الأمر إلی غیر أهله فانتظرِ السَّاعة (بخاری کتاب العلم۔ باب دوم حدیث نمبر ۵۹) ترجمہ: جب کام نا اہل کو سونپا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ قیامت کے دن تمام چیزیں نابود ہو جائیں گی۔ اسی طرح اب انتظار کرو کہ کب کام درہم برہم ہوتا ہے۔

۳-: ملازمین میں بادشاہ کی معروف کاموں میں فرماں برداری ضروری ہے۔ اطاعت ہی سے نظم وضبط (Discipline) پیدا ہوتا ہے اور کام سنورتے ہیں۔

۴-: اور ملازمین میں ظاہراً اور باطناً بادشاہ اور مملکت کی خیر خواہی ضروری ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ خیر خواہی کا نام ہی دین ہے (الدین النصیحة) پوچھا گیا: یا رسول اللہ! کس کی؟ ارشاد فرمایا: ''اللہ کی، اللہ کی کتاب کی، اللہ کے رسول کی، مسلمانوں کے پیشواؤں کی اور عام مسلمانوں کی'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ کتاب الآداب، باب الشفقة إلخ، حدیث نمبر ۴۹۶۶)

پس جس ملازم میں ان میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے، وہ برطرفی کا مستحق ہے۔ بادشاہ کو چاہئے کہ اس کو فوراً معزول

کردے، ورنہ مملکت کے ساتھ خیانت ہوگی اور بادشاہ اپنے حق میں کانٹے بوئے گا۔

۵- اور مناسب یہ ہے کہ اس شخص کو ملازم نہ رکھا جائے جس کو بوقت ضرورت معزول کرنے میں دشواری پیش آئے۔ وہ خاندانی اثر ورسوخ رکھتا ہو یا اس کا بادشاہ پر رشتہ داری وغیرہ کا حق ہو، پس اگر اس کو برطرف کیا جائے گا تو لوگ برا سمجھیں گے اور ہوسکتا ہے کہ کوئی فتنہ کھڑا ہو۔

مخلص اور غیر مخلص میں امتیاز: بادشاہ کو چاہئے کہ وہ اپنے محبت کرنے والوں میں امتیاز کرے کہ کون کس وجہ سے محبت کرتا ہے؟ کیونکہ بعض لوگ امید وبیم کی وجہ سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کو اپنا تو نہیں سمجھنا چاہئے، مگر ان کی دلداری اور کسی نہ کسی طرح ان کے ساتھ نباہ کرنا ضروری ہے، ایسے لوگوں سے بھی بگاڑ اچھا نہیں۔ شہد چاہئے تو مُہال کو لات نہیں مارنی چاہئے —— اور بعض لوگ بے غرض محبت کرتے ہیں، وہ بادشاہ کے نفع وضرر کو اپنا نفع وضرر سمجھتے ہیں، یہی مخلص دوست، واقعی بہی خواہ اور سچے ہمدرد ہیں، ان کی قدر کرنی چاہئے اور ہر طرح ان کی ہمت افزائی کرنی چاہئے۔

سوال: پہلی قسم کے لوگوں کی دلداری کیوں ضروری ہے؟ وہ تو خودغرض ہیں!

جواب: خودغرضی ان کی فطرت ہے، وہ بدل نہیں سکتی۔ لہٰذا بادشاہ کو ان سے زائد از فطرت بات کی خواہش نہیں کرنی چاہئے، بادشاہ کو اپنا مقصد جو کچھ ان کے پاس ہے، اسی سے نکال لینا چاہئے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہئے کہ وہ مخالف نہیں ہیں۔

عملہ کی اقسام اور ان کا مقام: سرکاری ملازمین تین طرح کے ہوتے ہیں:

۱- دشمن کے شر سے ملک کی اور بادشاہ کی حفاظت کرنے والے، جیسے فوج، پولس اور بادشاہ کے باڈی گارڈ۔ ان لوگوں کا مقام وہ ہے جو جسم انسانی میں ہاتھوں کا ہے، جو ہتھیار اٹھاتے ہیں، اگر ہاتھ نہ ہوں تو آدمی اپنی مدافعت نہیں کرسکتا۔

۲- ملک کا نظم وانتظام کرنے والا عملہ، جیسے انتظامیہ اور عدلیہ وغیرہ۔ یہ لوگ انسان کے فطری قویٰ کی طرح ہیں، جن کے بغیر انسان کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ پس ان لوگوں کی اہمیت قسم اول سے زائد ہے۔

۳- مشیران مملکت، جیسے وزراء اور مقننہ وغیرہ۔ یہ حضرات بمنزلۂ عقل وحواس کے ہیں، جن کے بغیر انسان، انسان نہیں، پاگل ہے یا ناقص انسان (اندھا، بہرہ، گونگا) ہے، کامل نہیں، پس ان کی حیثیت سب سے بڑھی ہوئی ہے۔

فائدہ: بادشاہ کے لئے عملہ کے احوال سے باخبر رہنا ضروری ہے، تاکہ اصلاحی یا تخریبی باتوں کا پتہ چلتا رہے اور بروقت مداوا کیا جاسکے۔

﴿باب سياسة الأعوان﴾

لما كان الملِك لايستطيع إقامةَ هذه المصالح كلِّها بنفسه، وجب أن يكون له بإزاء كلِّ حاجةٍ أعوانٌ؛ ومن شرط الأعوان: الأمانة، والقدرة على إقامةِ ما أُمروا به، وانقيادُ الملك،

والنصحُ له ظاهرًا وباطنًا؛ وكلُّ من خالف هذه الشريطة فقد استحقَّ العزلَ؛ فإن أهمل الملِك عزلَه فقد خان المدينة، وأفسد على نفسه أمْرَهُ.

وينبغي أن لايتخذ الأعوانَ ممن يتعذر عزلُه، أو ممن له حقٌّ على الملك: من قرابة، أو نحوها، فَيَقْبُحُ عزلُه؛ ولْيُمَيِّزِ الملكُ بين محبيه: فمنهم من يحبه لرهبته أو لرغبته، فَلْيَجُرَّه إليه بحيلة، ومنهم من يحبه لذاته، ويكون نفعُه نفعا له، وضررُه ضررًا عليه، فذلك المحبُّ الناصح؛ ولكل إنسان جبلةٌ جُبل عليها، وعادةٌ اعتادها، ولاينبغي للملك أن يرجُوَ من أحد أكثرَ مماعنده.

والأعوان: إما حفَظةٌ من شر المخالفين، بمنزلة اليدين الحاملتين للسِّلاح من بدن الإنسان؛ وإما مدبِّرُون للمدينة، بمنزلة القُوى الطبيعية من الإنسان؛ أو المشاورون للملك، بمنزلة العقل والحواس للإنسان؛ ويجب على الملك أن يسأل كلَّ يوم ما فيهم من الأخبار، ويعلمَ ما وقع من الإصلاح، وضدِّه.

ترجمہ: اہل کاروں کے ساتھ برتاؤ کا بیان: جب بادشاہ بذات خود حکومت کے تمام کاموں کو سرانجام نہیں دے سکتا، تو ضروری ہے کہ بادشاہ کے لئے ہر کام کے مقابل مددگار (اہل کار) ہوں۔ اور معاونین کے لئے شرط ہے: امانت داری اور اس کام کی انجام وہی کی قدرت جس کا ان کو حکم دیا گیا ہے اور بادشاہ کی فرمانبرداری اور ظاہر و باطن میں بادشاہ کی خیر خواہی ـــــ اور ہر وہ کارکن جس میں یہ شرط نہ پائی جائے وہ یقیناً برطرفی کا مستحق ہے۔ پس اگر بادشاہ نے اس کو معزول نہ کیا تو اس نے مملکت کے ساتھ خیانت کی، اور خود اپنی ذات کے لئے خرابی پیدا کی۔

اور مناسب یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے ملازم نہ رکھے، جس کا معزول کرنا دشوار ہو، یا جس کا بادشاہ پر حق ہو، رشتہ داری کی وجہ سے، یا اس طرح کی کسی اور چیز کی وجہ سے، پس برا ہوگا اس کا برطرف کرنا ـــــ اور چاہئے کہ بادشاہ اپنے محبین میں امتیاز کرے، کیونکہ بعض لوگ بادشاہ سے محبت کرتے ہیں اس کے خوف کی وجہ سے، یا اس سے کسی امید کی وجہ سے، پس چاہئے کہ بادشاہ اس کو کسی تدبیر سے اپنی طرف کھینچے۔ اور بعض لوگ بادشاہ سے اس کی ذات کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ لوگ بادشاہ کا نفع اپنا نفع اور بادشاہ کا نقصان اپنا نقصان سمجھتے ہیں، پس یہی شخص "مخلص دوست" ہے ـــــ اور ہر انسان کی ایک فطرت ہوتی ہے، جس پر وہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اور ایک عادت ہوتی ہے جس کا وہ عادی ہوتا ہے اور بادشاہ کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی سے اس چیز سے زائد کی امید رکھے جو اس کے پاس ہے (یہ سوال مقدر کا جواب ہے)

اور عملہ یا تو مخالفین کے شر سے محفوظ رکھنے والے لوگ ہیں۔ اور یہ لوگ بدن انسانی میں اُن ہاتھوں کی طرح ہیں جو ہتھیار اٹھانے والے ہیں ـــــ یا وہ شہر کا انتظام کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ انسان کے فطری قُویٰ کی طرح ہیں ـــــ یا بادشاہ کے مشیر ہیں۔ یہ لوگ انسان کی عقل اور حواس کی طرح ہیں ـــــ اور بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ روزانہ وہ خبریں معلوم

کرتا ہے جوان کارکنوں کی ہیں اوران باتوں کو جانتا ہے جو اصلاح کے قبیل سے یا اس کی ضد کے قبیل سے پیش آتی ہیں۔

لغات: العَون (مصدر) مدد کرنا، مددگار، خادم اہل کار، ملازم، سرکاری عملہ کا آدمی (واحد وجمع، مذکر ومؤنث سب کے لئے مستعمل ہے) جمع اَعْوَانٌ...... الشريطة: الشرط...... قَبُح باب کرم: براہونا...... جرّ (ن) کھینچنا، گھسیٹنا...... بحيلة أي يُظهر رُغبه لمن يحب رهبةً، ويرغَب لمن يحبه رغبةً، ويُحسن إليه اه سندی.

☆ ☆ ☆

سرکاری عملہ کی تنخواہ گورنمنٹ کے ذمہ ہے اور سرکاری خزانہ کی فراہمی کا طریقہ

بادشاہ اوراس کے معاونین (سرکاری کارکن) مملکت کے لئے مفید کاموں میں مشغول رہتے ہیں اس لئے ان کی تنخواہ مملکت کے ذمہ ہے۔ عقل کا بھی تقاضا ہے اور شریعت کا بھی اصول ہے کہ جو شخص کسی کے حق میں محبوس ہو، اس کے مصارف کا ذمہ دار حابس (روکنے والا) ہوتا ہے، جیسے بیوی بحق شوہر محبوس ہوتی ہے اور قیدیوں کو حکومت جیل میں ڈالتی ہے، اس لئے ان کا خرچ شوہر اور حکومت کے ذمہ ہے۔

اور سرکاری خزانہ کی فراہمی کے لئے منصفانہ طریقہ ہونا چاہئے جو رعایا کے حق میں ضرر رساں نہ ہو اور مملکت کی ضروریات بھی پوری کردے۔ یعنی ٹیکس اور لگان مقرر کرنے میں دونوں باتوں کا لحاظ رہنا چاہئے۔ پبلک پر بہت زیادہ بار بھی نہ پڑے اور ملک کی ضرورت بھی پوری ہوجائے۔ پس ہر ہر شخص پر اور ہر قسم کے مال پر ٹیکس لگانا مناسب نہیں، آخر کوئی تو وجہ ہے کہ مشرق ومغرب کے سلاطین متفق ہیں کہ محصول اہل ثروت (دولتمندوں) سے اور لگے ہوئے ڈھیروں (بڑی جمع شدہ دولت) سے اور اموال نامیہ (بڑھنے والے مالوں) سے لیا جائے۔

اموال نامیہ: جیسے افزائش نسل کے لئے پالے ہوئے چوپایے، کاشتکاری، باغبانی، تجارت وغیرہ ـــــ اور اگر اتنے لگان سے مملکت کی ضرورت پوری نہ ہو تو پھر برسرروزگار لوگوں پر ٹیکس لگایا جائے۔ ان کی آمدنیوں میں سے ایک حصہ لیا جائے، بے روزگار لوگوں کو جن کی کوئی معقول آمدنی نہ ہو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے۔

ولـمـا كان الملكُ وأعوانُه عاملين للمدينة عملاً نافعًا، وجب أن يكون رزقُهم عليها؛ ولا بد أن يكون لجباية العشور والخراج سنةٌ عادلةٌ، لاتَضُرُّ بهم، وقد كَفَتِ الحاجةَ؛ ولاينبغي أن يُضرب على كل أحد، وفي كل مالٍ؛ ولأمرٍمَّا أجمعت ملوكُ الأمم من مشارق الأرض ومغاربها: أن تكون الجباية من أهل الدثور، والقناطير المقنطرة، ومن الأموال النامية، كماشيةٍ متناسلة، وزِراعة، وتجارة؛ فإن احتيج إلى أكثر من ذلك فعلى رؤس الكاسبين.

ترجمہ: اور جب بادشاہ اور اس کے معاونین مملکت کے لئے مفید خدمات انجام دیتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کا روزینہ مملکت کے ذمہ ہو۔ اور ضروری ہے کہ عشر وخراج کی وصولی کے لئے کوئی منصفانہ طریقہ ہو، جو رعایا کے حق میں ضرر رساں نہ ہو، اور ضروریات مملکت کے لئے کافی ہو جائے۔ اور یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ہر ہر شخص پر، اور ہر قسم کے مال پر لگان مقرر کیا جائے، اور کوئی توجہ ہے کہ مشرق ومغرب کے بادشاہوں نے اتفاق کیا ہے کہ محصول اہل ثروت سے، اور لگے ہوئے ڈھیروں سے، اور بڑھنے والے اموال سے، جیسے افزائش نسل کے لئے پالے ہوئے مویشی، کھیتی باڑی اور تجارت میں سے وصول کیا جائے — پھر اگر اس سے زیادہ مال کی ضرورت پیش آئے تو بارو زگار لوگوں پر ٹیکس لگایا جائے۔

ترکیب: سنةٌ عادلةٌ: اسم ہے أن یکون کا، اور خبر کا فصل آگیا ہے اس لئے یکون مذکر ہے۔

☆ ☆ ☆

عسکری تنظیم کی ضرورت

پہلے بادشاہ خود" سالار افواج" ہوتا تھا، اس لئے بادشاہ کے لئے اپنے لشکر کی تنظیم ضروری ہے۔ اور لشکر کی تنظیم کا طریقہ وہی ہے جو اُلیل بچھیرے کو سدھانے کا ہے۔ اس فن کا ماہر گھوڑے کی چالوں کو خوب جانتا ہے یعنی رہوار، ڈلکی، پویہ، سرپٹ وغیرہ اور گھوڑوں کی بری عادتوں سے بھی واقف ہوتا ہے یعنی اَڑنا وغیرہ اور وہ طریقے بھی جانتا ہے جس سے گھوڑے کو خوب تنبیہ ہوتی ہے یعنی ڈانٹنا، لکڑی وغیرہ چبھونا اور کوڑا استعمال کرنا۔ پھر جب وہ بچھیرے کو سدھانے کے لئے لے چلتا ہے تو اس پر برابر نظر رکھتا ہے۔ جب بھی گھوڑا کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو ناپسندیدہ ہوتی ہے یا وہ کسی پسندیدہ بات کو چھوڑتا ہے تو وہ شخص گھوڑے کو سخت تنبیہ کرتا ہے۔

اس طرح بار بار تنبیہ کرنے سے گھوڑے کی طبیعت مطیع ہو جاتی ہے اور اس کی تیزی ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسرے سرکش جانور ہاتھی، شیر وغیرہ بھی اسی طرح مطیع بنائے جاتے ہیں اور ان کو مختلف کاموں کے لئے ٹرینڈ کیا جاتا ہے۔

اور ٹریننگ دینے والے کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ گھوڑے کو کوئی ایسی تنبیہ نہ کرے، جس سے گھوڑے کا دل پراگندہ ہو جائے اور وہ سمجھ نہ سکے کہ اس کو کیوں مارا؟ جو بھی تنبیہ کرے اس سے گھوڑے کی سمجھ میں آنا چاہئے کہ اس کو فلاں غلطی پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور یہ بات اس کے دل میں بیٹھ جانی چاہئے کہ وہ جب بھی یہ غلطی کرتا ہے تو اس کو سزا ملتی ہے۔ اور سزا کا خوف اس کے دل میں مستقل رہنا چاہئے —— پھر تمرین مکمل ہونے کے بعد بھی اس وقت تک ریہرسل (Rehearsal) جاری رہنی چاہئے کہ سکھلائی ہوئی باتیں اس میں ملکہ راسخہ اور عادت ثانیہ بن جائیں۔ اور صورت حال ایسی ہو جائے کہ اگر گھوڑے کو تنبیہ نہ بھی کی جائے تب بھی وہ سکھلائے ہوئے طریقہ کے خلاف ورزی نہ کرے۔

اسی طرح عسکری تنظیم کرنے والے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ فوج کو کیا کام کرنے چاہئیں اور کیا کام نہیں

کرنے چاہئیں، اور وہ ان طریقوں کو بھی جانتا ہو جن سے فوج کو تنبیہ ہوتی ہے۔ نیز سالار افواج کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ برابر فوج سے ریہرسل کراتا رہے، کسی وقت بھی ان کو بے کار نہ چھوڑے۔

ولابد للملِك من سياسة جنوده؛ وطريقُ السياسة مايفعلُه الرائضُ الماهر بفرسه، حيث يتعَرَّف أصناف الجَرْي: من إرقالٍ، وهَرْولة، وعَدْوٍ، وغيرها؛ والعاداتِ الذميمةَ: من حَرُونةٍ، ونحوها؛ والأمورَ التى تُنَبِّهُ الفرس تنبيها بليغا كالنَّخس، والزَّجْر، والسوط، ثم يراقبه، فكلما فعل ما لايرتضيه، أو ترك ما يرتضيه يُنَبِّهُه بما ينقاد له طبعُه، وتنكسر به سَورته؛ وليقْصُد فى ذلك أن لايتشوَّش خاطِرُه، فلا يتفطَّن لماذا ضربه؟ ولتكن صورةُ الأمر الذى يُلقيه إليه متمثلةً فى صدره، منعقدةً فى قلبه، والخوفُ من المجازاة مقيما فى خاطره؛ ثم إذا حصل فعلُ المطلوب، والكفُّ عن المهروب، لاينبغى أن يَترك الرياضة، حتى يرى أن الطريقة المطلوبة صارت خُلُقا له ودَيْدَنا، وصار بحيث لولا الزجرُ لَمارَكن إلى خلافها؛ فكذلك يجب على رائض الجنود أن يعرف الطريقة المطلوبة فِعْلاً وكَفًّا، والأمورَ التى يقع بها تَنْبِيْهُهُمْ، وليكُنْ من شأنه أن لايُهمل شيئًا من ذلك أبدًا.

ترجمہ: اور بادشاہ کے لئے اپنے لشکر کی تنظیم ضروری ہے۔ اور تنظیم کا طریقہ وہ ہے جو چھیرے کو سدھانے کا ماہر اپنے گھوڑے کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ خوب پہچانتا ہے چال کی قسمیں یعنی پویہ (دُلکی) تیز روی (رہوار) سرپٹ وغیرہ، اور (جانتا ہے گھوڑوں کی) بری عادتیں یعنی اڑنا اور اس کے مانند، اور ان باتوں کو جو گھوڑے کو خوب تنبیہ کرتی ہیں، جیسے (لکڑی وغیرہ) چبھونا، جھڑکنا اور کوڑا۔ پھر وہ گھوڑے کی نگرانی رکھتا ہے۔ پس جب بھی گھوڑا کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو اس کو ناپسند ہوتی ہے یا کوئی ایسی بات چھوڑتا ہے جو اس کو پسند ہوتی ہے تو وہ گھوڑے کو ایسی سخت تنبیہ کرتا ہے کہ گھوڑے کی طبیعت اس کی مطیع ہو جاتی ہے اور اس کی تیزی ٹوٹ جاتی ہے — اور چاہئے کہ ٹریننگ دینے والا جو بھی تنبیہ کرے اس میں اس بات کا خیال رکھے کہ گھوڑے کا دل مشوش نہ ہو جائے کہ وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ سدھانے والے نے اس کو کیوں مارا؟ اور چاہئے کہ اس امر کی صورت جس کو وہ گھوڑے کی طرف ڈال رہا ہے (یعنی جس غلطی پر تنبیہ کر رہا ہے اس کی صورت) اس کے سینہ میں موجود ہو، اس کے دل میں بیٹھنے والی ہو (یعنی وہ خوب سمجھ رہا ہو کہ اسے فلاں غلطی پر مارا گیا) اور سزا کا خوف اس کے دل میں بیٹھا رہنا چاہئے (کہ وہ جب بھی یہ غلطی کرے گا پیٹا جائے گا) — پھر جب مطلوبہ کام کا کرنا اور جس بات سے بھاگا (بچا) جا رہا ہے اس سے رکنا حاصل ہو جائے تو مناسب نہیں ہے کہ ریہرسل چھوڑ دے (بلکہ تمرین جاری رکھے) تا آنکہ دیکھ لے کہ مطلوبہ طریقہ گھوڑے میں ملکہ راسخہ اور اس کا وطیرہ بن گیا ہے۔ اور گھوڑا ایسا

ہو چکا ہے کہ اگر جھڑ کا نہ بھی جائے تب بھی وہ اس کے (سکھلائے ہوئے طریقہ کے) خلاف کی طرف مائل نہ ہوگا ـــــ پس اسی طرح عسکری تنظیم کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کرنے اور نہ کرنے کے مطلوبہ طریقوں کو جانے اور ان امور کو بھی جانے جن کے ذریعہ فوج کو تنبیہ ہوتی ہے اور چاہئے کہ سالار افواج کی یہ حالت ہو کہ وہ ان باتوں میں سے کسی کو بھی کبھی نہ چھوڑے۔

لغات: رَاضَ یَرُوْضُ رَوْضًا و رِیَاضَةً المُهْرَ: بچھیرے کو سدھانا، صفت رَائِضٌ...... اَرْقَلَ: پویہ چلنا، گھوڑے کا درمیانی چال چلنا، جس میں ایک وقت میں تین پیر اٹھتے ہیں...... هَرْوَلَةٌ: تیز چلنا...... حَرَنَ (ن،ک) حُرُوْنًا البغلُ: اڑ جانا، اڑیل ٹٹو...... نَخَسَ الدابةَ: جانور کے پہلو یا پچھلے حصہ پر لکڑی یا مہمیز چبھو کر اکسانا...... الـذَیـدَن: الـعادة: ...... فِعْلًا وَ كَفًّا تمیز ہیں المطلوبة کی۔

☆ ☆ ☆

سرکاری عملہ کی تعداد

سرکاری عملہ کی تعداد کسی عدد میں محدود نہیں، مملکت کی ضرورت پر اس کا دارومدار ہے۔ کبھی ایک کام کے لئے دو آدمی ضروری ہوتے ہیں۔ اور کبھی دو کام ایک ہی آدمی سے نکل سکتے ہیں۔ البتہ سرکاری ملازمین کے بڑے صیغے پانچ ہیں:

① قاضی: (عدلیہ) اور قاضی میں یہ صفات ضروری ہیں ۱-: آزاد ہو، غلام نہ ہو ۲-: مرد ہو، عورت نہ ہو ۳-: بالغ ہو بچہ نہ ہو ۴-: عاقل ہو، پاگل نہ ہو ۵-: منصب کی ذمہ داری ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، نااہل نہ ہو ۶-: لوگوں میں ہونے والے معاملات کے طریقوں کو جانتا ہو، اور مقدمات میں فریقین کی چالوں کو سمجھ سکتا ہو، بے بصیرت نہ ہو ۷ و ۸-: مضبوط آدمی ہو، دھمکیوں سے ڈرنے والا نہ ہو، مگر ساتھ ہی بردبار بھی ہو، بھڑک جانے والا نہ ہو۔

اور قاضی (Judge) کو مقدمات میں دو باتوں پر غور کرنا چاہئے۔

اول: مقدمہ کی حقیقتِ حال کیا ہے؟ کیا وہ کوئی عقد ہے، جیسے خرید وفروخت، ہبہ، نکاح وغیرہ، یا وہ کوئی ظلم وزیادتی کا معاملہ ہے، جیسے قتل، چوری، تہمت، حق تلفی وغیرہ، یا فریقین میں کسی معاملہ میں ریس (Race) ہے کہ دیکھیں کون جیتتا ہے؟

دوم: قاضی یہ جانے کہ فریقین میں سے ہر شخص اپنے مقابل سے کیا چاہتا ہے، اور کس کی خواہش برحق اور لائق ترجیح ہے؟

اور قاضی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مقدمہ کی مسل اچھی طرح پڑھے، اور دلائل کے وزن کا اندازہ کرے۔ کیونکہ بعض دلائل صاف اور کھرے ہوتے ہیں۔ ان میں ادنی شک کی گنجائش نہیں ہوتی، وہ دوٹوک فیصلہ چاہتے ہیں۔ اور بعض دلائل ایسے نہیں ہوتے۔ ان میں دوٹوک فیصلہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے قاضی کو خوب غور کرکے حسب دلائل فیصلہ کرنا چاہئے۔

(۲) سالارِ افواج: (وزیر دفاع، چیف آف آرمی، کرنل، میجر، کپتان وغیرہ) اس میں یہ صفات ضروری ہیں ۱-: جنگی ساز وسامان کی واقفیت ۲-: فوج کے جوانمردوں اور بہادروں کی تالیف قلب کے طریقوں سے باخبر ہونا ۳-: کون فوجی کس درجہ کار آمد ہے اس کی واقفیت ۴-: میدان جنگ میں لشکر کی ترتیب وتنظیم کے طریقے جاننا ۵-: دشمن کے مکر وفریب کو جاننے کے لئے مخبر (Reporter) اور جاسوس (Spy) مقرر کرنے کی مہارت۔

(۳) منتظم مملکت: وزیر داخلہ، رئیس بلدیہ (Mayor) قصبہ کا چیئرمین۔ اور ان میں یہ صفات ضروری ہیں: ۱-: مملکت اور شہر کو سنوارنے اور بگاڑنے والی چیزوں کی واقفیت ۲-: مضبوط ہونا ۳-: بردبار ہونا ۴-: ایسی قوم کا فرد ہونا جو ناپسندیدہ باتوں کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتے ہوں۔

اور منتظم مملکت کا طریقہ کار یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر قوم پر انہی میں سے ایک نگراں (چَوْدھری، مکھیا) مقرر کرے جو ان لوگوں کے احوال سے باخبر ہو۔ وہ اس چودھری کے ذریعہ لوگوں کے معاملات پر کنٹرول کرے۔ اور اگر اس قوم میں کوئی شر وفساد پیدا ہو تو اس نگران سے باز پرس کرے۔

(۴) عامل: (وزیر مالیات، تحصیلدار وغیرہ) اور وہ ایسا شخص ہونا چاہئے جو ٹیکس اور محصول جمع کرنے کی شکلوں سے اور مستحقین میں اس کو تقسیم کرنے کے طریقوں سے واقف ہو۔

(۵) وکیل (وہ شخص جس کو بادشاہ اپنے ذاتی کام سپرد کرے، پرائیویٹ سکریٹری) یہ شخص بادشاہ کے معاشی امور سرانجام دے گا۔ کیونکہ بادشاہ مملکت کے کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے اپنی ضروریات کا انتظام نہیں کرسکتا۔

وليس للأعوان حصر في عدد، لكنه يدور على دوران حاجاتِ المدينة، فربما تقع الحاجةُ إلى اتخاذ عونَيْنِ في حاجةٍ، وربما كفى عونٌ لحاجتين، غير أن رؤس الأعوان خمسة:

[۱] القاضي: وليكن حرًا، ذكرًا، بالغا، عاقلاً ،كافيا، عارفا بسنة المعاملات، وبمكايد الخصوم في اختصامهم، وليكن صُلْبًا، حليما، جامعًا للأمرين؛ ولينظر في مقامين: أحدهما: معرفةُ جَلِيَّة الحال، وهي: إما عقد، أو مظلمة، أو مسابقة بينهما؛ وثانيهما: ما يريد كلُّ واحد من صاحبه: أيُّ الإرادتين أصوبُ وأرجح؟ ولْيَنْظُرْ في وجه المعرفة: فهنالك حجةٌ لايريب فيها الناس، تقتضي الحكمَ الصُّراحَ، وحجةٌ ليست بذاك ،تقتضي حكمًا دون الحكم الأول.

[۲] وأمير الغزاة: ولْيَكُنْ من شانه معرفةُ عُدَّةِ الحرب، وتأليفِ الأبطال والشجعان، ومعرفةُ مبلغ كل رجل في النفع، وكيفيةِ تَعْبِئَةِ الجيوش، ونصبِ الجواسيسِ والخَبَرَةِ بمكايد الخصوم.

[۳] وسائس المدينة: ولْيَكُنْ مجرَّبا، قد عرف وجوهَ صلاح المدينة وفسادها، صُلْبا، حليما، وليكن من قوم لايسكتون إذا رأوا خلافَ مايرتضونه؛ وليتخِذْ لكل قوم نقيبا منهم،

عارفا بأخبارهم، ينتظم به أمرهم، ويؤاخذه بما عندهم.

[٤] والعامل: وليكن عارفا بكيفية جِباية الأموال، وتفريقِها على المستحقين.

[٥] والوكيل: المتكفِّلُ بمعايش الملك، فإنه مع ما به من الأشغال لايمكن أن يتفرغ للنظر إلى إصلاح معاشه.

ترجمہ: اور معاونین کی تعداد کسی عدد میں محدود نہیں ہے، بلکہ وہ مملکت کی ضرورتوں کے گھومنے کے ساتھ گھومتی ہے۔ پس کبھی ایک کام کے لئے دو ملازم رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کبھی دو کاموں کے لئے ایک ملازم کافی ہو جاتا ہے۔ البتہ معاونین کے بڑے شعبے پانچ ہیں:

۱-: قاضی: اور چاہئے کہ وہ آزاد، مرد، بالغ، عاقل، منصب کی ذمہ داری پوری کرنے کی صلاحیت رکھنے والا، معاملات کے طریقہ کو اور لوگوں کے مقدمات میں فریقین کی چالوں کو جاننے والا ہو۔ اور چاہئے کہ وہ مضبوط اور بردبار، دونوں باتوں کا جامع ہو — اور چاہئے کہ وہ مقدمات میں دو باتوں میں غور کرے اول: حقیقت حال سمجھے کہ کوئی عقد ہے یا زیادتی ہے یا کوئی دوڑ ہے۔ دوم: ہر شخص اپنے مقابل سے جو چاہتا ہے (اس کو سمجھے، نیز یہ جانے کہ) دونوں میں سے کس کا چاہنا برحق اور قابل ترجیح ہے — اور چاہئے کہ پہچاننے کی صورت میں غور کرے: پس وہاں کوئی حجت تو ایسی ہوتی ہے جس میں لوگوں کو کچھ شک نہیں ہوتا، جو خالص حکم چاہتی ہے اور دوسری دلیل ایسی نہیں ہوتی، وہ پہلے حکم سے فروتر حکم چاہتی ہے۔

۲-: اور سالار افواج: اور چاہئے کہ اس کے حال میں سے ہو جنگی ساز و سامان کو پہچاننا، اور جوانمردوں اور بہادروں کی تالیف کے طریقوں کو جاننا۔ اور یہ جاننا کہ کس آدمی سے کس قدر نفع متوقع ہے۔ اور میدان جنگ میں لشکر کو مرتب کرنے کا طریقہ جاننا، اور دشمن کی فریب کاریوں کی خبر دینے والوں کو اور جاسوسوں کو مقرر کرنے کا طریقہ جاننا۔

۳-: اور منتظم شہر: اور چاہئے کہ وہ تجربہ کار ہو۔ شہر کی صلاح وفساد کی شکلوں کو خوب جانتا ہو، مضبوط اور بردبار ہو، اور چاہئے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہو جو خاموش نہ رہ سکتے ہوں، جب وہ کوئی ایسی بات دیکھیں جو ان باتوں کے خلاف ہو، جو ان کو پسند ہیں (یعنی وہ ناپسندیدہ باتوں کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکتے ہوں) اور چاہئے کہ وہ ہر قوم پر انہی میں سے ایک نگراں مقرر کرے، جو ان لوگوں کے احوال سے باخبر ہو، جس کے ذریعہ ان لوگوں کے معاملات منظم ہوں۔ اور اس سے ان باتوں کا مؤاخذہ کرے جو اس قوم میں پیش آئیں۔

۴-: اور عامل: اور چاہئے کہ وہ اموال کا محصول جمع کرنے کے طریقوں کو، اور اس کو مستحقین میں تقسیم کرنے کی صورتوں کو جاننے والا ہو۔

۵-: اور وکیل: جو بادشاہ کے معاشی امور کا ذمہ دار ہو۔ پس بیشک بادشاہ کے لئے اپنے مشاغل کے ساتھ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کی اصلاح میں غور و فکر کرنے کے لئے وقت نکال سکے۔

لغات: الجَلِيّ: واضح مؤنث جَلِيَّة، جَلِيَّةُ الأمر: کھلا ہوا معاملہ..... عَبَأَ تَعۡبِئَةً وتَعۡبِيۡنًا الجيش للحرب: میدان جنگ میں لشکر کو مرتب کرنا۔

نوٹ: مُسَابَقَة اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں سَابِقَة ہے جو تصحیف ہے۔ یہ تصحیح مولانا سندھی رحمہ اللہ کی تقریر سے کی گئی ہے۔

باب ــــ ۹

خلافت کبری کا بیان

ارتفاق رابع کے لئے صرف یہی ایک باب ہے۔ اور ارتفاق رابع سے مراد خلافت کبری (مرکزی حکومت) کا انظام ہے۔ یہ بھی حکمت عملیہ کی ایک قسم ہے۔ اور یہ وہ فن ہے جو مختلف ممالک کے حکام اور فرمانرواؤں کے ساتھ برتاؤ، اور مختلف علاقوں (ممالک) کے درمیان پائے جانے والے روابط کی نگہداشت کے طریقوں سے بحث کرتا ہے۔

خلیفہ کی ضرورت: جب متعدد بادشاہ مستقل فرماں رواں بن جاتے ہیں اور ان کے پاس خزانہ جمع ہوجاتا ہے اور فوج اکٹھا ہوجاتی ہے تو ان میں خرخشے شروع ہوجاتے ہیں۔ سب کی طبیعتیں اور استعدادیں یکساں نہیں ہوتیں، اس لئے ظلم وزیادتی شروع ہوجاتی ہے۔ اور وہ راہ راست چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض، بعض کی مملکت کی آرزو کرنے لگتا ہے اور ایک دوسرے پر حسد شروع ہوجاتا ہے اور ذاتی مفادات کے لئے جنگ چھڑ جاتی ہے، جیسے غنیمت کی لالچ، ملک گیری کی ہوس، جلن، کینہ وغیرہ۔ جب اس قسم کی باتیں بادشاہوں میں بہت زیادہ ہوگئیں تو لوگوں نے خلیفہ کی ضرورت محسوس کی اور مرکزی حکومت کا قیام ضروری ہوگیا۔

اور خلیفہ سے مراد: وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا لاؤ لشکر اور فوجی ساز وسامان ہو کہ دوسرا کوئی شخص اس کا ملک چھین لے یہ بات بظاہر محال نظر آتی ہو، گو یہ بات فی نفسہ ممکن ہے، مگر عام شورش، بھاری کوشش، زبردست فوج اور اربوں کھربوں دولت خرچ کرکے ہی ممکن ہوتی ہے، جس کی ہمت کون کرسکتا ہے؟ عادۃً یہ بات ناممکن ہے۔

﴿باب الارتفاق الرابع﴾

وهي الحكمة الباحثة عن سياسة حُكام المُدُن وملوكِها، وكيفيةِ حفظِ الربطِ الواقع بين أهل الأقاليم؛ وذلك: أنه لما انفرز كلُّ ملِكٍ بمدينته، وجُبِي إليه الأموالُ، وانْضَمَّ إليه الأبطالُ، اوجب اختلافُ أمزجتهم، وتشتُّتُ استعدادِهم: أن يكون فيهم الجَوْرُ، وتركُ السنة الراشدة، وأن يطمع بعضُهم في مدينة الآخر، وأن يتحاسدوا، ويتقاتلوا بآراء جزئية: من نحوِ

رغبةٍ في الأمول والأراضي، أو حسد وحِقد؛ فلما كثر ذلك في الملوك اضطروا إلى الخليفة؛ وهو: من حصل له من العساكر والعُدَد ما يُرى كالممتنع أن يَسْلُب رجلٌ آخرُ مُلْكَه؛ فإنه إنما يَتصور بعد بلاء عام، وجُهد كبير، واجتماعات كثيرة، وبذلِ أموالٍ خطيرة، تتقاصر الأنفسُ دونها، وتُحيله العادة.

ترجمہ: ارتفاق رابع کا بیان: اور ارتفاق رابع وہ فن ہے جو مختلف شہروں کے حکام اور فرماں رواؤں کے ساتھ برتاؤ، اور مختلف ممالک کے درمیان پائے جانے والے روابط کی نگہداشت کے طریقوں سے بحث کرنے والا ہے۔اور وہ (یعنی خلیفہ کی ضرورت) اس لئے ہے کہ جب ہر بادشاہ اپنی مملکت کے ساتھ علحدہ ہوگیا۔اور اس کے پاس اموال جمع کئے گئے، اور اس کے ساتھ بہادر مل گئے، تو ان کے مزاجوں کے اختلاف نے اور ان کی استعدادوں کے تفاوت نے واجب کیا کہ ان میں ظلم اور راہ راست کا چھوڑنا پایا جائے۔اور یہ کہ بعض بعض کی مملکت کی آرزو کریں، اور یہ کہ وہ ایک دوسرے پر حسد کریں اور ذاتی اغراض سے باہم لڑیں: جیسے اموال وآراضی کی خواہش یا جلن اور کینہ جیسی چیزیں۔پس جب یہ چیزیں بادشاہوں میں بہت زیادہ ہوگئیں تو وہ خلیفہ مقرر کرنے کی طرف مجبور ہوئے۔

اور خلیفہ وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا لشکر اور ساز وسامان ہو کہ محال جیسا نظر آتا ہو کہ کوئی دوسرا شخص اس کا ملک چھین لے۔پس بیشک یہ بات عام آزمائش اور بھاری کوشش اور بڑے اجتماع اور ڈھیر سا مال خرچ کرنے کے بعد ہی متصور ہے، جس کے ورے نفوس کوتاہ رہ جاتے ہیں، اور جس کو عادت محال سمجھتی ہے۔

لغات: المُدُن (دال کے پیش اور سکون کے ساتھ) المدینة کی جمع ہے ...... **ذلك کا مشار الیہ الارتفاق الرابع** ہے ...... **العُدَّة**: سامانِ حرب وغیرہ جمع **عُدَدٌ** ...... البلاء: آزمائش، فتنہ، شورش ...... **فإنه إنما يتصور** میں **ضمیر سَلْب** کی طرف لوٹتی ہے، جو يسلب سے مفہوم ہے اور إنما مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے ...... **هی الحكمة** میں **ضمیر هی**، **الارتفاق الرابع** کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ اس سے مراد خلافت ہے۔

☆ ☆ ☆

خلافت کا فائدہ

خلافت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس کے زیر سایہ خدا کے بندے اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔بیہقی کی شعب الایمان میں حدیث ہے إن السلطانَ ظِلُّ اللّٰه في الأرض يَأْوِيْ إليه كلُّ مظلوم من عباده (مشکوۃ کتاب الإمارة حدیث نمبر ۳۷۱۸) ترجمہ: بادشاہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے۔اللہ کے بندوں میں جو بھی مظلوم ہوتا ہے وہ اس سایہ میں ٹھکانہ لیتا ہے۔اور متفق علیہ روایت ہے کہ إنما الإمامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ من ورائه، ويُتَّقٰى به (مشکوۃ، کتاب الإمارہ حدیث نمبر ۳۶۶۱)

ترجمہ: امام ڈھال ہے، اس کی آڑ میں لڑا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ بچاؤ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے جب خلیفہ پایا جاتا ہے اور وہ زمین میں اچھے انداز پر کام کرتا ہے اور سرکش لوگ اس کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں اور دوسرے بادشاہ اس کے فرمانبردار ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نعمت کامل ہوجاتی ہے۔

جنگ کی دو بنیادیں

خلیفہ کو دو وجہ سے جنگ چھیڑنی پڑتی ہے:

① دفاع کے لئے: جب درندہ صفت لوگ حملے کرتے ہیں، لوگوں کے اموال لوٹتے ہیں، ان کے اہل وعیال کو قید کرکے لے جاتے ہیں، ان کی عزت کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور لوگوں کا ناک میں دم کردیتے ہیں تو خلیفہ کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ لوگوں سے ضرر ہٹانے کے لئے تلوار اٹھائے اور دشمنوں کا منہ کیل دے، ہاتھ توڑ دے اور پاؤں اکھاڑ دے۔ بنی اسرائیل جب اس قسم کے حالات سے دوچار ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں (سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۶)

② اقدامی طور پر: جب خواہش پرست اور درندہ صفت لوگ بدراہی اختیار کرتے ہیں، زمین میں اُدھم مچاتے ہیں اور اللہ کی زمین کو فتنہ سے بھر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انبیاء کے توسط سے یا براہ راست خلیفہ کو الہام فرماتے ہیں کہ وہ ان شرپسندوں کی شوکت کو توڑ دے اور ان لوگوں کو تہ تیغ کردے جن کی اصلاح کی قطعاً کوئی امید نہیں، جو انسانوں میں سڑا گلے ہوئے عضو کی طرح ہیں، جس کو کاٹ کر پھینک دینا ہی مصلحت ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۵۱ میں ہے ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ﴾ (اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعضے آدمیوں کو بعضوں کے ذریعہ سے دفع کرتے ہیں تو زمین فساد سے پُر ہوجاتی، مگر اللہ تعالیٰ جہاں والوں پر بڑے فضل والے ہیں) اور سورۃ الحج آیت ۴۰ میں ہے: ''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو، بعض کو بعض کے ذریعہ دفع کرتے ہیں، تو (اپنے اپنے زمانہ میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے، اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم کردیئے جاتے بیشک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبہ والا ہے'' اور سورۃ البقرہ آیت ۱۹۳ میں ہے: ''ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد نہ رہے'' یہی مضمون سورۃ الانفال آیت ۳۹ میں بھی ہے ان تمام آیات میں جنگ کے اسی سبب کی طرف اشارہ ہے۔ غرض جب دین اور دعوت کی راہ میں دشمن رکاوٹ ڈالیں اور اسلام کی راہ میں اڑچن کھڑی کریں اور مسلمانوں کا جینا دوبھر کردیں تو خلیفہ کے لئے جنگ چھیڑنا ضروری ہوجاتا ہے۔

وإذا وُجد الخليفة، وأحسن السيرةَ في الأرض، وخضعت له الجبابرة، وانقاد له الملوكُ: تَمَّت النعمةُ، واطمأنَّت البلاد والعباد.

واضطر الخليفة إلى إقامة القتال:

[١] دفعًا للضرر اللاحق لهم من أنفسٍ سَبُعية: تَنْهَب أموالَهم، وتَسْبِيْ ذراريَهم، وتَهْتِكُ حُرَمَهم؛ وهذه الحاجة هي التي دعت بني إسرائيل إلى أن ﴿قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَهُمُ: ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

[٢] وابتداءً، إذا أساءت أنفسٌ شهوية أو سَبعية السيرةَ، وأفسدوا في الأرض، فألهم الله سبحانه — إما بلاواسطة، أوبواسطة الأنبياء —: أن يَسْلِبَ شوكَتَهم، ويقتل منهم من لاسبيل له إلى الإصلاح أصلاً، وهم في نوع الإنسان بمنزلة العُضْوِ الْمَؤُفِ بالآكِلَةِ؛ وهذه الحاجة هي المشارُ إليها بقوله تعالى: ﴿وَلَوْلاَ دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ﴾ الآية،وقوله تعالى: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لاَتَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾

ترجمہ: اور جب خلیفہ پایا جاتا ہے، اور وہ زمین میں اچھی طرح کام کرتا ہے اور سرکش لوگ اس کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں، اور تمام بادشاہ اس کے فرمانبردار ہوجاتے ہیں تو اللہ کی نعمت کامل ہوجاتی ہے۔ اور شہر اور بندے اطمینان کا سانس لیتے ہیں ——اور خلیفہ جنگ چھیڑنے کے لئے مجبور ہوتا ہے:

۱-: اس ضرر کو ہٹانے کے لئے جو لوگوں کو لاحق ہوتا ہے درندہ خوانسانوں کی طرف سے: جو لوگوں کے اموال لوٹتے ہیں۔ اور ان کے عیال کو گرفتار کرتے ہیں، اور ان کے ناموس کی پردہ دری کرتے ہیں۔ اور یہی وہ ضرورت ہے جس نے بنی اسرائیل کو اس بات کی طرف بلایا کہ: ''انھوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی کہ ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کردیجئے کہ ہم راہ خدا میں لڑیں''

۲-: اور ابتداءً، جب خواہش پرست اور درندہ صفت لوگ بدراہی اختیار کرتے ہیں اور زمین میں بگاڑ پھیلاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ (خلیفہ کو) الہام فرماتے ہیں —— یا تو بلاواسطہ یا انبیاء کے واسطہ سے ——کہ وہ اُن شریروں کی شوکت چھین لے، اور ان میں سے ان لوگوں کو قتل کردے، جن کی اصلاح کی قطعاً کوئی امید نہیں رہی اور وہ نوع انسانی میں سڑا لگے ہوئے ماؤف عضو کی طرح ہیں۔ اور یہی ضرورت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مشار الیہ ہے: ''اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو، بعض کو بعض کے ذریعہ ہٹایا نہ کرتے تو خلوت خانے اور عبادت خانے ڈھادیئے جاتے'' آخر آیت تک پڑھیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ: ''لڑو ان سے تا آنکہ فتنہ ختم ہوجائے''۔

لغات: الحُرْمة: مالايَحِلُّ انتهاكُه من ذِمَّة، أوحقٍّ، أوصحبةٍ، أو نحوذلك، والجمع حُرَمٌ (المعجم الوسيط)

خلیفہ اور جنگ

مختلف وجوہ سے خلیفہ کو جنگ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں آٹھ باتیں یاد رکھنی چاہئیں:

① سرکش فرمانرواؤں سے نبرد آزمائی، اور ان کی شان وشوکت کی پامالی، بھاری خزانے اور عظیم افواج کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے خلیفہ کو ان دونوں چیزوں کی فراہمی کی طرف خاص طور پر متوجہ رہنا چاہئے۔

② دشمن سے کب جنگ مناسب ہے اور کب صلح اور کب ان کو زیر نگیں کر کے خراج وجزیہ مقرر کرنا بہتر ہے؟ ان تینوں چیزوں کے اسباب کا جاننا خلیفہ کے لئے ضروری ہے ـــــ جب کوئی ملک فتح کر کے اس کے باشندوں کو زمینوں پر برقرار رکھا جاتا ہے تو زمین کا جو محصول ان سے لیا جاتا ہے، وہ ''خراج'' کہلاتا ہے۔ اور خود ان غیر مسلموں سے جو سالانہ رقم وصول کی جاتی ہے وہ ''جزیہ'' کہلاتی ہے۔ نوشیرواں کے وقت میں فوجی خدمات سے بچنے والوں سے یہ جزیہ لیا جاتا تھا۔ اور عہد اسلام میں صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، کیونکہ ان کو بھی فوجی خدمات سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اور اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے، جو فوج اور پولس کے ذریعہ انجام دی جاتی ہے، اس لئے جزیہ کی رقم کا ایک حصہ اس مد میں خرچ کیا جاتا ہے۔

③ جنگ چھیڑنے سے پہلے جنگ کا مقصد متعین کر لینا چاہئے تاکہ مقصد برآری پر اکتفا کیا جائے اور مقصد سے تجاوز نہ کیا جائے، ورنہ ظلم وزیادتی ہوگی مثال کے طور پر جنگ کے چار مقاصد ہوسکتے ہیں:

(۱) کسی ظلم کے دفعیہ کے لئے جنگ چھیڑی گئی ہے، تو جب ظالم ظلم سے باز آجائے اور اس کا اطمینان ہوجائے تو جنگ بند کر دینی چاہئے۔

(۲) اگر جنگ کا مقصد خبیث فطرت، درندہ خولوگوں کا قلع قمع ہے، جن کی اصلاح کی قطعاً کوئی امید نہیں تو ان کو بہر حال قتل کرنا چاہئے اس سے پہلے جنگ نہیں روکنی چاہئے۔

(۳) اگر کم تر درجہ کے خبیث لوگوں کی شوکت وسطوت کا خاتمہ کر کے ان کو پچھاڑنا مقصود ہے تو اسی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

(۴) اگر زمین میں شر وفساد پھیلانے والوں کو نیست ونابود کرنا مقصود ہے تو ان کے ان سرداروں کو قتل کرنا چاہئے جو ان کے لئے پلاننگ کرتے ہیں، یا ان کو پابہ زنجیر کر دینا چاہئے یا ان کے مال ومتاع اور آراضی کی قُرقی کر لینی چاہئے یا رعایا کا رخ ان سے پھیر دینا چاہئے تاکہ وہ بے حیثیت ہو کر رہ جائیں۔

④ جنگ کوئی کھیل نہیں۔ جنگ سے زمین ویراں، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا معمولی مقاصد کے لئے مثلاً مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ چھیڑنا مناسب نہیں، ہم نواؤں کی معتد بہ جماعت کو دنیا کی چند کوڑیوں کے لئے فنا کر دینا کسی طرح بھی قرین صواب نہیں۔

⑤ خلیفہ کو یہ کام ضرور کرنے چاہئیں: (الف) پبلک کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا (ب) رعیت میں کون شخص کس درجہ کارآمد ہے، اس کو پہچاننا، تاکہ خلیفہ کسی سے اس کی حیثیت سے زیادہ توقعات وابستہ نہ کرے (ج) سرداروں اور زیرک وذہین لوگوں کی قدر ومنزلت بڑھانا (د) ترغیب وترہیب کے ذریعہ لوگوں کو جنگ پر ابھارنا۔

⑥ جنگ میں خلیفہ کی اولین نگاہ مخالفین کی جمعیت منتشر کرنے کی طرف، ان کی دھار کو کند کرنے کی طرف اور ان کے دلوں کو خوفزدہ کرنے کی طرف رہنی چاہئے تا آنکہ دشمن خلیفہ کے سامنے دست بستہ حاضر ہوجائیں۔

⑦ جب جنگ میں خلیفہ ظفریاب ہوجائے تو دشمن کے معاملہ میں جنگ سے پہلے اس نے جو خیال قائم کیا ہے اس کو روبعمل لائے۔ سب کو معاف کر کے معاملہ رفع دفع نہ کردے ورنہ ملک کا ذہین عنصر یہ خیال کرے گا کہ خلیفہ نے خواہ مخواہ جنگ لڑی ہے۔

⑧ اگر اندیشہ ہو کہ دشمن دوبارہ شر وفساد پر اتر آئے گا تو ان پر کمر توڑ خراج اور نابود کرنے والا جزیہ مقرر کرے۔ ان کی گڑھیوں کو ڈھادے اور ان کو ایسا کر کے رکھ دے کہ وہ پھر سر نہ ابھار سکیں۔

ولایُتصور للخليفة مقاتلةُ الملوك الجبابرة، وإزالةُ شوكتهم، إلا بأموال وجمع رجال؛ ولابد في ذلك من معرفة الأسباب المقتضية لكل واحد من القتال، والهُدْنَة، وضربِ الخَراج، والجِزية؛ وأن يتامل أولاً مايَقْصُد بالمقاتلة: من دفع مظلمة، أو إزهاقِ أنفسٍ سَبُعِيةٍ خبيثة، لايُرجى صلاحُها، أو كبتِ أنفسٍ دونها في الخبث بإزالة شوكتها، أو كبتِ قوم مفسدين في الأرض: بقتل رء وسهم المدَبِّرين لهم، أو حبسِهم، أو حِيَازةِ أموالهم وأراضيهم، أو صرفِ وجوه الرعية عنهم.

ولاينبغي لخليفة أن يقتحم لتحصيل مقصد فيما هو أشدُّ منه، فلا يقصد حِيَازةَ الأموال بإفناءِ جماعةٍ صالحةٍ من الموافقين؛ ولابد من استمالة قلوب القوم، ومعرفةِ مبلَغ نفعِ كلِّ واحد، فلايعتمد على أحد أكثر مما هو فيه، والتَّنْوِيْهِ بشأن السُّرَاةِ والدُّهاة، والتحريضِ على القتال ترغيبا وترهيبا، ولْيكن أولُ نظره إلى تفريق جمعهم وتكليل حدِّهم، وإخافةِ قلوبهم، حتى يتمثلوا بين يديه، لايستطيعون لأنفسهم شيئا؛ فإذا ظفر بذلك فَلْيَتَحقَّق فيهم ظنَّه الذي زَوَّرَه قبل الحرب؛ فإن خاف منهم أن يُفسدوا تارةً أخرى ألزمهم خَراجا مُنْهِكًا، وجزيةً مستأصلةً، وهَدَمَ صَيَاصِيَهُمْ، وجعلَهم بحيث لايمكن لهم أن يفعلوا فعلَهم ذلك.

ترجمہ: اور خلیفہ کے لئے سرکش بادشاہوں سے جنگ کرنے کا اور ان کے دبدبہ کو توڑنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا مگر

خزانہ اور فوج اکٹھا کرنے کے ذریعہ ـــــ اور جنگ کے سلسلہ میں ضروری ہے اُن اسباب کو جاننا جو جنگ ومصالحت اورخراج وجزیہ کی تقرری میں سے ہرایک کو چاہنے والے ہیں ـــ اور یہ ضروری ہے کہ خلیفہ پہلے سوچ لے کہ جنگ سے کیا مقصد ہے؟ یعنی کسی ظلم کا دفعیہ یا ایسے خبیث درندہ صفت لوگوں کو نیست ونابود کرنا، جن کی اصلاح کی امید نہ رہی ہو، یا ان سے کم تر درجہ کے خبیث لوگوں کی شوکت کا خاتمہ کرکے ان کو ذلیل کرنا، یا زمین میں شر وفساد پھیلانے والے لوگوں کو توڑنا: ان کے اُن سرداروں کو قتل کرکے جو ان کے لئے اسکیمیں بناتے ہیں، یا ان کو قید کرکے، یا اُن کے مال اور آراضی کی ضبطی کرکے یا رعایا کا رخ ان سے پھیر کرکے۔

اور خلیفہ کے لئے سزاوار نہیں کہ وہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایسے کام میں گھسے جو اس سے زیادہ سخت ہے، پس وہ دولت سمیٹنے کا ارادہ نہ کرے ہم نوا لوگوں کی اچھی خاصی جماعت کو برباد کرکے ـــ اور خلیفہ کے لئے ضروری ہے رعایا کے دلوں کو اپنی طرف جھکانا اور (پبلک میں سے) ہرایک کے نفع کی مقدار کو پہچاننا، تاکہ کسی سے اس کی حیثیت سے زیادہ توقعات وابستہ نہ کرے اور سرداروں اور ذہین وچالاک لوگوں کی قدر ومنزلت بلند کرنا، اور ترغیب وترہیب کے ذریعہ جنگ پر لوگوں کو ابھارنا ـــــ اور چاہئے کہ خلیفہ کی اولین نگاہ مخالفین کی جمعیت کو منتشر کرنے کی طرف، ان کی دھار کو کُھٹل کرنے کی طرف اور ان کے دلوں کو خوف زدہ کرنے کی طرف ہو، یہاں تک کہ وہ لوگ خلیفہ کے سامنے آموجود ہوں، اس حال میں کہ وہ اپنے لئے کسی بات کی استطاعت نہ رکھتے ہوں ـــــ پھر جب خلیفہ ان باتوں میں کامیاب ہوجائے تو ان لوگوں میں اپنا وہ گمان ثابت کرے جو اس نے جنگ سے پہلے قائم کیا ہے ـــ پھر اگر ان سے دوبارہ شر وفساد کا اندیشہ ہو تو ان پر بھاری خراج اور فنا کرنے والا جزیہ مقرر کرے، اور ان کی گڑھیوں کو ڈھادے اور ان کو ایسا کردے کہ ان کے لئے ممکن نہ رہے کہ وہ اپنی یہ حرکت پھر کریں۔

لغات:

اَزْهَقَ الباطلَ: باطل کو نیست ونابود کرنا...... کَبَتَهٗ: پچھاڑنا، توڑنا، رسوا کرنا...... اِسْتَمَالَ استمالة: جھکانا، مائل کرنا، مہربان بنانا...... نَوَّهَ تَنْوِيْهًا الشيئَ: بلند کرنا...... السَّرِيُّ: شریف سخی سردار، جمع سُرَاة وسَرَاة وسُرىً...... الداهية: چالاک وہوشیار مرد، اس میں تاء مبالغہ کی ہے...... كَلَّلَ السيفَ: تلوار کو کند کرنا، کُھٹل کرنا...... تَحَقَّقَ الخبرُ: ثابت ہونا تحقق الأمرَ: ثابت کرنا أى إن ظهر الخليفةُ عليهم، واطمأن، فَلْيُثْبِتْ فيهم المقصدَ الذى هَيَّأَه وعَيَّنَه قبل الحرب، وقاتل لأجله، حتى لايظن رؤساء الملك أنا قاتلناهم بلافائدة (سندى)...... زَوَّرَه: آراستہ کرنا أى هيأه ورتبه (سندی)...... مُنهِكا أى ثقيلا أَنْهَكَه: سخت سزا دینا...... اِسْتَأْصَلَ الشيئَ: جڑ سے اکھیڑنا...... الصِيْصَة والصِيْصِيَة: قلعہ، گڑھی، ہر پناہ لینے کی جگہ جمع صَيَاصِى۔

خلافت کے لئے ضروری چیزیں

خلیفہ کے لئے ضروری کام درج ذیل ہیں:

اول: چونکہ خلیفہ ایک بڑے ملک کا حاکم ہوتا ہے، اس کے ماتحت بے حد مختلف مزاج رکھنے والے حکمران ہوتے ہیں۔ اور وہ ان سب کا محافظ ہوتا ہے، اس لئے خلیفہ کا بیدار مغز، عالی دماغ اور ہوشیار ہونا ضروری ہے تا کہ وہ ماتحت ممالک کے نظام کو خلل سے بچا سکے اور ان ممالک کے حکمرانوں اور رعایا میں جو نزاعات پیدا ہوں ان کا مناسب حل نکال سکے، ورنہ خود خلیفہ کی حکومت متزلزل ہوجائے گی۔ اور خلیفہ مملکت میں ہر جانب جاسوس پھیلا دے اور مملکت کے احوال سے پوری طرح باخبر رہے اور جو خبریں اس کو پہنچیں ان میں فراست کاملہ اور قیافہ شناسی سے کام لے، دھوکہ نہ کھائے۔

دوم: اگر خلیفہ اپنی افواج میں بغاوت کے جراثیم محسوس کرے اور دیکھے کہ اس کی افواج میں کوئی جماعت اس کے خلاف بن رہی ہے تو وہ فوراً اس کے مقابلہ میں ایک اور ایسی ہی جماعت بنائے جو برگشتہ جماعت کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ اور خلیفہ یہ دوسری جماعت ایسے لوگوں کی بنائے جن کا عادۃً پہلی جماعت کے ساتھ موافقت کرنا ممکن نہ ہو۔

سوم: اگر خلیفہ محسوس کرے کہ کوئی دوسرا شخص خلافت کا خواہاں ہے، اور وہ اس کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے تو اس کو قرار واقعی سزا دے، اس کی شوکت وسطوت کو توڑ دے اور اس کی قوت کو پامال کردے، جب تک خلیفہ یہ کام نہ کرلے چین سے نہ بیٹھے۔

چہارم: خلیفہ اپنی اطاعت اور خیر خواہی کو لوگوں پر لازم کرے اور اس سلسلہ میں محض زبانی قبول کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اس قبولیت کے لئے کوئی ظاہری علامت مقرر کرے، جس سے لوگوں کی اطاعت کا پتہ چلے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں رعایا سے داروگیر کرے، مثلاً جمعہ وعیدین کے خطبوں میں خلیفہ کے لئے دعا کرنا اور بڑے اجتماعات میں خلیفہ کی رفعتِ شان کا اظہار کرنا۔

پنجم: خلافت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی خاص ہیئت کا لوگوں کو خوگر بنائے۔ مثلاً سرکاری زبان کا نمود (Show) اور کرنسی، پاسپورٹ وغیرہ پر اتفاق کرنا وغیرہ۔

ولما كان الخليفة حافظا لصحةِ مزاج حاصلٍ من أخلاطٍ متشاكسةٍ جدا، وجب أن يكون متيقظا، ويبعث عيونا في كل ناحية، ويستعمل فِراسة نافذةً؛ وإذا رأى اجتماعا منعقدا من عساكره فلا صَبْرَ دون أن ينصب اجتماعا آخر مثلَه ممن تُحيل العادةُ مُوَاطَأَتَهم معهم؛ وإذا رأى من رجل التماسَ خلافةٍ فلا صَبْرَ دون إيفاءِ جزائِه، وإزالةِ شوكته، وإضعافِ قوته؛ ولابد أن يجعل قبولَ أمره، والاتفاقَ على مناصحته سنةً مسلمةً عندهم. ولايكفي في ذلك مجردُ القبول، بل لابد من أمارة ظاهرة للقبول، بهايؤاخذ الرعيةَ، كالدعاء له، والتنويهِ بشأنه في الاجتماعات

العظيمة، وأن يوطّنوا أنفسهم على زِيٍّ وهيئةٍ أمر بها الخليفةُ، كالاصطلاح على الدنانير المنقوشة باسم الخليفة في زماننا، والله أعلم.

ترجمہ: اور جب خلیفہ ایسے مزاج کی درستگی کا محافظ ہے جو بہت ہی زیادہ متضاد عناصر سے مرکب ہے تو ضروری ہے کہ وہ بیدار مغز ہو، اور ملک کے ہر کونے میں جاسوس بھیجے اور فراست کاملہ استعمال کرے —— اور جب دیکھے کہ اس کی افواج ہی سے کوئی جماعت اس کے خلاف بن رہی ہے، تو اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھے جب تک کہ اس کے مقابلہ میں ایک اور ایسی جماعت نہ بنالے، ان لوگوں میں سے جن کا عادۃً مخالفین کے ساتھ اتفاق کر لینا محال ہو —— اور جب خلیفہ دیکھے کہ کوئی دوسرا شخص خلافت کا خواہاں ہے تو چین سے نہ بیٹھے جب تک اس کو قرار واقعی سزا نہ دے لے، اور اس کا دبدبہ توڑ نہ دے اور اس کی قوت کو کمزور نہ کردے —— اور ضروری ہے کہ خلیفہ اپنے حکم کے قبول کرنے کو اور اپنی خیر خواہی پر لوگوں کے اتفاق کرنے کو، لوگوں کے نزدیک ''لازمی طریقہ'' بنائے۔ اور اس سلسلہ میں محض زبانی قبول کرنا کافی نہیں، بلکہ قبولیت کی کوئی ظاہری علامت بھی ضروری ہے، جس کے ذریعہ رعایا کی دار و گیر کرسکے۔ جیسے خلیفہ کے لئے دعا کرنا اور بڑے اجتماعات میں اس کی شان کی بلندی کا اظہار کرنا —— اور یہ (بھی ضروری ہے) کہ لوگ خود کو کسی ایسی شکل اور ہیئت کا خوگر بنائیں، جس کا خلیفہ نے حکم دیا ہے، جیسے ہمارے زمانہ میں لوگوں کا ان اشرفیوں پر اتفاق کرنا جن پر خلیفہ کا نام کندہ ہوتا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

مُتَشَاكِسَة أي متخالفة . تَشَاكَسَ القومُ: باہم مخالفت کرنا، کہا جاتا ہے الليلُ والنهار يَتشاكسان: دن اور رات ایک دوسرے کی ضد ہیں...... واطَاعُوا طَاعَةً: موافقت کرنا...... إيفَاءٌ: پورا دینا...... سنةٌ مسلمةٌ: مفعول ثانی ہے يجعل کا...... الزِيُّ یہاں هيئة کا مترادف ہے، بمعنی پوشاک نہیں ہے۔

باب —— ۱۰

ارتفاقات کی بنیادی باتیں متفق علیہ ہیں

ارتفاقات اربعہ کا بیان مکمل ہو چکا۔ اب دو عام باب ہیں، جن کا تعلق چاروں ارتفاقات سے ہے۔ اس پہلے باب میں یہ مضمون ہے کہ ارتفاقات کی بنیادی باتیں متفق علیہ ہیں، گو فروعات اور رسوم میں اختلاف ہے۔ اور اس اتفاق کی وجہ بیان کی ہے کہ یہ ارتفاقات فطری امور ہیں اس لئے ان میں اختلاف نہیں۔ اور اس دعوی پر جو اشکالات وارد ہوسکتے ہیں، ان کا جواب دیا ہے۔

پہلے اصول اور رسوم میں فرق سمجھ لینا چاہئے: اصول از قبیل معنویات ہیں اور رسوم (اصول پر عمل کی صورتیں) ان کے پیکر ہائے محسوس ہیں یعنی رسوم افعالِ ظاہرہ ہیں جو معنویات پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً ''نکاح'' ارتفاق کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے اور معنوی چیز ہے اور اس کا طریقہ یعنی ایجاب وقبول، گواہ، لوگوں کا اجتماع اور دعوت ولیمہ وغیرہ رسوم (ریت رواج) ہیں جو نکاح پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح مُردوں کی عفونت کا ازالہ اور ان کے ستر کا چھپانا ارتفاق کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے اور دفن کرنا یا جلانا رسوم ہیں، وقس علی ہذا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ کوئی بھی انسانی معاشرہ ارتفاقات سے خالی نہیں ہوسکتا۔ آباد دنیا کی ہر بستی میں اور معتدل مزاج اور اخلاقِ فاضلہ کی حامل ہر امت میں ارتفاقات کا وجود ضروری ہے۔ عہد آدم سے قیام قیامت تک یہی صورت چلی آرہی ہے اور چلتی رہے گی۔ فرض کرو ایک انسان کسی ایسے بیابان میں پیدا ہوتا ہے اور پلتا بڑھتا ہے جو انسانی آبادی سے بہت دور ہے اور اس نے کسی سے زندگی کی کوئی ریت نہیں سیکھی۔ اس کو بھی یقیناً کچھ ضرورتیں پیش آئیں گی، جیسے بھوک، پیاس اور خواہش نفس وغیرہ۔ اور وہ ضرور کسی عورت کا مشتاق ہوگا۔ اور جب مرد وزن صحیح المزاج ہوں گے تو ان کے یہاں اولاد بھی ہوگی۔ اور رفتہ رفتہ بہت سے گھر آباد ہوجائیں گے، پھر ان میں باہمی معاملات ہوں گے تو ارتفاق اول اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ منظم ہوجائے گا۔ پھر جب لوگوں کی کثرت ہوگی تو ضروری ہوگا کہ ان میں ایسے اخلاق فاضلہ رکھنے والے لوگ پیدا ہوں جن میں مختلف قسم کے واقعات رونما ہوں جن کی وجہ سے بقیہ تمام ارتفاقات بھی معرض وجود میں آجائیں گے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ارتفاقات کی اصولی اور بنیادی باتیں ہمیشہ مسلم اور متفق علیہ رہی ہیں۔ کبھی ان میں اختلاف نہیں ہوا۔ جمہور ہمیشہ ان لوگوں پر سخت نکیر کرتے رہے ہیں جو ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں مثلاً نکاح نہیں کرتے، مُردوں کی لاشوں کو چھپاتے نہیں، کھانا پکا کر نہیں کھاتے، بس یونہی کچا پکا نگلتے ہیں وغیرہ اور لوگ ارتفاقات کو نہایت شہرت کی وجہ سے بدیہی امور سمجھتے ہیں، جو دلائل کے محتاج نہیں، صرف تنبیہ کافی ہوتی ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ارتفاقات کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ دنیا جہاں کے لوگ خواہ مخواہ، بلا کسی وجہ کے ان باتوں پر متفق ہوگئے ہیں، ایسا ہے جیسا مشرق ومغرب کے تمام لوگ ایک غذا پر متفق ہوجائیں اور کوئی کہہ دے کہ یہ اتفاق خواہ مخواہ بلا وجہ ہے۔ بھلا اس سے بڑا مغالطہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ بغیر کسی وجہ کے یہ بات ممکن نہیں کہ دنیا کے سب لوگ ایک غذا پر متفق ہوجائیں۔ اسی طرح ارتفاقات پر اتفاق بھی بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔ مزاجوں کے تنوع، ممالک کے بُعد اور مذاہب کے اختلاف کے ساتھ ارتفاقات پر کسی وجہ ہی سے اتفاق ہوسکتا ہے۔ یہی فطرت سلیمہ کا فیصلہ ہے۔

اور ارتفاقات پر لوگوں کا اتفاق تین وجوہ سے ہوتا ہے:

اول: ارتفاقات انسان کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہیں۔ لوگوں کو ان سے فطری مناسبت ہے، کیونکہ اعمال وافعال

صورت نوعیہ میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر وہ افراد میں آتے ہیں، پھر وہ خارج میں پائے جاتے ہیں اور نوع کے تمام افراد کی فطرت ایک ہوتی ہے، اس وجہ سے امورارتفاقیہ پرلوگوں کا اتفاق ہوگیا ہے۔

دوم: ارتفاقات کی بنیاد ایسی بہ کثرت پیش آنے والی حاجتیں ہیں جن پر نوع انسانی کے افراد متفق ہیں یعنی کوئی فرد ان حاجتوں سے خالی نہیں، جیسے کھانا، پینا وغیرہ۔ اور جب حاجتیں عام ہیں تو ان کی تکمیل کی تدبیرات بھی عام ہوں گی۔ اسی وجہ سے لوگ ارتفاقات پر متفق ہیں۔

سوم: ارتفاقات کی بنیاد ایسے اخلاق وملکات ہیں جن کو نوعی درستی افراد کے مزاج میں ثابت کرتی ہے یعنی جب نوع کے افراد کے قُوی: عقل وغیرہ درست ہوں تو وہ افراد میں کچھ اخلاق وملکات پیدا کرتے ہیں، جن سے اعمال صادر ہوتے ہیں، جو ارتفاقات کی بنیاد بنتے ہیں اور نوعی اخلاق ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں، اس لئے ان سے پھوٹنے والے اعمال میں بھی یکسانیت ہوتی ہے۔ اور یہی اعمال ارتفاق کی اساس (Base) ہیں، اس وجہ سے لوگ ارتفاقات پر اتفاق رکھتے ہیں۔

سوال: (۱) ارتفاقات میں لوگوں کا اتفاق کہاں ہے؟ کوئی مردوں کو دفن کرنا پسند کرتا ہے، کوئی آگ میں جلانا، کوئی نکاح میں گواہوں کو اور ایجاب وقبول کو ضروری قرار دیتا ہے، کوئی ڈھول باجا، گانا، سجاوٹ اور آرائش کو کافی سمجھتا ہے، کوئی زانی کو رجم کرتا ہے اور چور کا ہاتھ کاٹتا ہے اور کوئی دردناک مار، سخت قید اور بھاری جرمانے کو کافی سمجھتا ہے؟

جواب: یہ ارتفاقات کے اصول (بنیادی باتیں) نہیں ہیں، بلکہ رسوم (شکلیں، صورتیں اور ریت رواج) ہیں۔

اصول: مُردوں کی بدبو کو دور کرنا اور ان کا ستر چھپانا، نکاح کی تشہیر کرنا اور برملا اس کو زنا سے ممتاز کرنا اور زانیوں اور چوروں کی سزا کا ضروری ہونا ہیں۔ اور ان پر سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ ارتفاقات کی شکلوں میں اور جزئیات میں ہے اور ہم نے دعوی اصول میں اتفاق کا کیا ہے، رسوم میں نہیں!

سوال: (۲) ارتفاقات میں لوگوں کا اتفاق کہاں ہے؟ احمق لوگ کسی طریقہ کی پابندی نہیں کرتے، یہی حال فسّاق وفُجّار کا ہے، پھر سب کا اتفاق کہاں؟

جواب: حُمقاء تو حیوانات کی مثل ہیں۔ سب کے نزدیک ان کا مزاج ناقص اور ان کی عقلیں ناکارہ ہیں۔ اور ان کی حماقت کی دلیل یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ارتفاقات کا پابند نہیں سمجھتے — رہے بدکار لوگ تو اگر ان کے دل ٹٹولے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ارتفاقات کے معتقد ہیں۔ مگر ان پر خواہش نفس غالب آجاتی ہے، اس وجہ سے وہ ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، مگر وہ اپنے دل کی تھاہ میں ان کاموں کو بدکاری سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ اوروں کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ بدکاری کرتے ہیں، لیکن اگر ان کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ یہ حرکت کی جائے تو وہ غیظ وغضب سے پھٹ پڑتے ہیں، حالانکہ وہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس جرم کے ارتکاب سے جو صدمہ اور رنج انہیں ہوا ہے، وہ دوسروں کو بھی

ہوتا ہے۔ نیز وہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کی بدکاریوں سے نظام مملکت درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مگر خواہش ان کو اندھا کر دیتی ہے یہی حال چوری، غصب وغیرہ برائیوں کا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ ارتفاقات سے متفق ہیں مگر ان پر عمل پیرا نہیں۔

نوٹ: اس باب کی تقریر، ترتیب بدل کر کی گئی ہے، قارئین کرام عبارت سے تطبیق کے وقت اس کا خیال رکھیں۔

﴿باب اتفاق الناس على أصول الارتفاقات﴾

اعلم أن الارتفاقاتِ لاتخلو عنها مدينةٌ من الأقاليم المعمورة، ولا أمةٌ من الأمم أهلِ الأمزجة المعتدلة والأخلاقِ الفاضلة، من لَدُنْ آدمَ عليه السلامُ إلى يوم القيامة؛ وأصولُها مسلَّمةٌ عند الكل، قرنًا بعد قرنٍ، وطبقةً بعد طبقةٍ، لم يزالوا يُنكرون على من عصاها أشدَّ نكير، ويرونها أمورًا بديهيةً من شدة شهرتها.

ولايَصُدَّنَّك عما ذكرنا اختلافُهم في صُوَرِ الارتفاقات وفروعها، فاتفقوا ــــ مثلا ــــ على إزالة نَتْنِ الموتى وسَتْرِ سوآتهم، ثم اختلفوا في الصور: فاختار بعضُهم الدفنَ في الأرض، وبعضُهم الحرقَ بالنار؛ واتفقوا على تشهير أمر النكاح، وتمييزه عن السِّفاح على رء وس الأشهاد، ثم اختلفوا في الصور: فاختار بعضهم الشهودَ، والإيجابَ والقبول والوليمةَ، وبعضُهم الدُّفَّ والغناء، ولُبْسَ ثيابٍ فاخرة، لاتُلبس إلا في الولائم الكبيرة؛ واتفقوا على زجر الزُّناة والسُّرَّاقِ، ثم اختلفوا: فاختار بعضهم الرجمَ، وقطعَ اليد، وبعضُهم الضربَ الأليم، والحبسَ الوجيعَ، والغراماتِ المُنْهِكَةَ.

ولايَصُدَّنك أيضا مخالفةُ طائفين:

أحدُهما: البُلْهُ، الملتحقون بالبهائم، ممن لايشك الجمهورُ أن أمزجتهم ناقصة، وعقولَهم مُخْدَجَةٌ؛ وصاروا يستدلون على بلاهتهم بما يرون من عدم تقييدهم أنفسَهم بتلك القيود.

والثانية: الفجّارُ، الذين لو نُقِّحَ ما في قلوبهم ظهر أنهم يعتقدون الارتفاقاتِ، لكن تَغْلِب عليهم الشهواتُ، فيعصونها شاهدين على أنفسهم بالفجور، ويزنون ببنات الناس وأخواتهم، ولو زُنِيَ ببناتهم وأخواتهم كادوا يتميزون من الغيظ، ويعلمون قطعًا أن الناس يصيبهم ما أصاب أولاءِ، وأنَّ إصابةَ هذه الأمور مُخِلَّةٌ بانتظام المدينة، لكن يُعميهم الهوى؛ وكذلك الكلام في السرقة، والغصب، وغيرهما.

ولاينبغي أن يُظن أنهم اتفقوا على ذلك من غير شيئ، بمنزلة الاتفاق على أن يَتَغَذَّى بطعام واحدٍ

أهلُ المشارق والمغارب كلُّهم،وهل سفسطةٌ أشدُّ من ذلك؟ بل الفطرة السليمة حاكمة بأن الناس لم يتفقوا عليها، مع اختلاف أمزجتهم ، وتباعد بلدانهم، وتشتت مذاهبهم وأديانهم، إلا لمناسبةٍ فطرية منشعبةٍ من الصورة النوعية، ومن حاجات كثيرة الوقوع، يتواردُ عليها أفرادُ النوع، ومن أخلاقٍ توجبها الصحةُ النوعية في أمزجة الأفراد.

ولو أن إنسانا نشأ ببادية نائية عن البلدان، ولم يتعلم من أحد رسما، كان له لاجرم حاجاتٌ من الجوع، والعطش،والغُلمة، واشتاق لامحالة إلى امرأة، ولابد عند صحة مزاجهما أن يتولّد بينهما أولادٌ، وينْضَمَّ أهلُ أبيات، وينشأفيهم معاملاتٌ، فينتظم الارتفاق الأول عن آخره، ثم إذا كثُروا لابد أن يكون فيهم أهلُ أخلاق فاضلة، تقع فيهم وقائعُ، تُوجب سائر الارتفاقات، والله أعلم.

ترجمہ: ارتفاقات کے اصولوں پر لوگوں کے اتفاق کا بیان: جان لیں کہ ارتفاقات سے خالی نہیں، آباد علاقوں کا کوئی شہر، اور نہ معتدل مزاج اور اخلاق عالیہ رکھنے والی امتوں میں سے کوئی امت، آدم علیہ السلام کے وقت سے قیامت کے دن تک۔ اور ارتفاقات کی بنیادی باتیں قرناً بعد قرنٍ اور طبقہً بعد طبقۃٍ سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہیں۔ لوگ برابر سخت نکیر کرتے رہتے ہیں ان لوگوں پر جو ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اور لوگ ارتفاقات کو ان کے نہایت مشہور ہونے کی وجہ سے، بدیہی چیزیں سمجھتے ہیں۔

اور ہرگز نہ روکے آپ کو اُن باتوں کے تسلیم کرنے سے جو ہم نے ذکر کیں، لوگوں کا ارتفاقات کی شکلوں اور جزئیات میں اختلاف کرنا۔ پس لوگ متفق ہیں مثلاً مردوں کی عفونت دور کرنے پر اور ان کے ستر کو چھپانے پر، پھر اس کی شکلوں میں لوگوں میں اختلاف ہے، بعض زمین میں دفن کرنا پسند کرتے ہیں، اور بعض آگ میں جلانا پسند کرتے ہیں۔ اور لوگ نکاح کے معاملہ کی تشہیر کرنے پر، اور گواہوں کے روبرو نکاح کو زنا سے ممتاز کرنے پر متفق ہیں۔ پھر اس کی شکلوں میں اختلاف ہے بعض لوگ گواہوں کو، ایجاب وقبول کو اور دعوت ولیمہ کو پسند کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ دُف (ڈفلی) اور گانے کو اور ایسے لباس فاخرہ کو پسند کرتے ہیں جو بڑی تقریبات ہی میں پہنا جاتا ہے اور لوگ زانیوں اور چوروں کو سزا دینے پر متفق ہیں، پھر ان میں اختلاف ہے، بعض سنگسار کرنے کو اور ہاتھ کاٹنے کو پسند کرتے ہیں، اور بعض دردناک مار، اور قید بامشقت اور کمر توڑ جرمانوں کو پسند کرتے ہیں۔

اور نیز ہرگز نہ روکے آپ کو دو جماعتوں کی مخالفت:

اول: احمق لوگ، جو جانوروں کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہیں کہ عام لوگوں کو اس میں ذرا شک نہیں کہ ان کے مزاج ناقص اور ان کی عقلیں ادھوری ہیں۔ اور عام لوگ ان کی بے وقوفی پر اُس بات سے استدلال

کرتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں، یعنی ان کا خود کو اُن قیود (ارتفاقات اور ان کے طریقوں) کا پابند نہ کرنا۔

اور دوم: بدکار لوگ، جن کے دلوں کی اگر تنقیح و تفتیش کی جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ ارتفاقات کے قائل ہیں، مگر ان پر شہوت غالب آجاتی ہے، پس وہ ارتفاقات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، درانحالیکہ وہ اپنے اوپر بدکاری کا اقرار کررہے ہیں (یعنی وہ ان کاموں کو بدکاری سمجھتے ہوئے کرتے ہیں) اور وہ لوگوں کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ زنا کرتے ہیں اور اگر ان کی بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ زنا کیا جائے تو وہ قریب ہیں کہ غصہ سے پھٹ پڑیں۔ اور وہ خوب جانتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو بھی وہ صدمہ پہنچتا ہے جو ان کو پہنچتا ہے، اور وہ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ ان کاموں کا کرنا نظام مملکت کو درہم برہم کرتا ہے، مگر خواہش ان کو اندھا کردیتی ہے۔ اور اسی طرح چوری اور غصب اور ان کے علاوہ جرائم میں گفتگو ہے۔

اور مناسب نہیں ہے کہ گمان کیا جائے کہ لوگ اس بات (ارتفاقات) پر بغیر کسی سبب کے متفق ہوگئے ہیں، جیسے مشرق و مغرب کے تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق کرنا کہ وہ کوئی ایک غذا استعمال کریں۔ اور کیا اس سے بڑا بھی کوئی مغالطہ ہوسکتا ہے؟ بلکہ فطرت سلیمہ فیصلہ کرتی ہے کہ لوگ اس چیز (ارتفاقات) پر متفق نہیں ہوئے، ان کے مزاجوں کے اختلاف کے ساتھ، اور ان کے ممالک کے دور دراز ہونے کے ساتھ، اور ان کے مسالک و مذاہب کے مختلف ہونے کے ساتھ، مگر ۱:- کسی فطری مناسبت کی وجہ سے جو صورت نوعیہ سے پھوٹنے والی ہے ۲:- اور ایسی کثیر الوقوع ضروریات کی وجہ سے جن پر نوع انسانی کے افراد متفق ہیں ۳:- اور ایسے اخلاق و ملکات کی وجہ سے جن کو نوعی درستی افراد کے مزاج میں ثابت کرتی ہے۔

اور اگر یہ بات ہو کہ کوئی انسان کسی ایسے بیابان میں پروان چڑھا ہو، جو شہروں سے دور ہو، اور اس نے کسی سے کوئی ریت نہ سیکھی ہو، تو اس کے لئے بھی یقینی بات ہے کہ کچھ ضرورتیں ہوں گی، جیسے بھوک، پیاس اور شہوت۔ اور وہ لامحالہ کسی عورت کا مشتاق ہوگا۔ اور مرد و زن کے مزاج کی درستی کی صورت میں ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان اولاد ہو۔ اور متعدد گھرانے باہم ملیں، اور ان میں معاملات وجود میں آئیں، پس ارتفاق اول اس کے سارے اجزاء کے ساتھ منظم ہوجائے گا۔ پھر جب لوگ زیادہ ہوجائیں گے تو ضروری ہے کہ ان میں ایسے اخلاق فاضلہ والے لوگ پائے جائیں جن میں (مختلف قسم کے) واقعات رونما ہوں، جو باقی (تینوں) ارتفاقات کو ثابت کریں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

البُلْهُ: بے وقوف، ضعیف العقل، مفرد الأَبْلَهُ، مؤنث بَلْهَاء فعل بَلِهَ (س) بَلَهًا وَبَلَاهَةً: ضعیف العقل ہونا...... السَفْسَطَةُ: وہ استدلال و قیاس جس کی بنیاد مغالطہ پر ہو..... النَائِیْ: دور مؤنث نَائِیَة فعل نَأَی یَنْأَی نَأْيًا: دور ہونا...... عن آخره بمعنی جمیعًا ہے یعنی ارتفاق اول مع اس کی تمام جزئیات کے۔

باب ــــــ ۱۱

لوگوں میں رائج طور وطریق کا بیان

رُسُوم: رَسْم کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: طور وطریق ریت رواج اور عام معاملات، خواہ اچھے ہوں یا برے۔ اردو میں برے رواجوں کو رسوم کہتے ہیں۔ مگر عربی میں یہ لفظ عام ہے اس باب میں بھی عام معنی مراد ہیں۔

ارتفاقات ایک معنوی چیز ہیں، خارج میں ان کا وجود نہیں۔ خارج میں ''رسوم'' پائی جاتی ہیں۔ وہی ارتفاقات کے پیکر ہائے محسوس ہیں یعنی لوگوں میں جو طور وطریق رائج ہیں وہی ارتفاقات (مفید تدبیریں) ہیں۔ اس لئے اس آخری باب میں رسوم کی تفصیلات بیان کی جارہی ہیں۔

رسوم کی اہمیت: لوگوں میں جو طور وطریق رائج ہوتے ہیں، ارتفاقات میں ان کی حیثیت وہی ہے جو بدن انسانی میں دل کی ہے، دل پر زندگی کا مدار ہے، دل سنورتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور دل بگڑتا ہے تو سارا جسم اور اس کے تمام احوال بگڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح رسوم ہی ارتفاقات کی بنیاد ہیں۔ معاشرہ میں رائج طور وطریق ہی سے ارتفاقات کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اور اچھے طور وطریق سے معاشرہ شاندار بنتا ہے اور طور وطریق بگڑ جائیں تو معاشرہ بدنما ہوجاتا ہے۔ اللہ کی شریعتیں بھی اولاً اور بالذات رسوم ہی کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ انبیائے کرام انہی کی اصلاح وتعدیل کرتے ہیں۔ قوانین شرعیہ میں بھی انہی سے بحث ہوتی ہے اور نصوص میں بھی انہی کی طرف اشارے آئے ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل مبحث سادس باب (۱۱) میں آئے گی۔

رسوم کے اسباب: لوگوں میں رائج رسوم چند اسباب سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً:

(۱) وہ ریت دانشمندوں نے چلائی ہے، جیسے دیت کے اونٹ دس سے سو حضرت عبدالمطلب نے کئے تھے اور قَسامہ کا طریقہ ابوطالب نے چلایا تھا، ان دونوں طریقوں کو شریعت نے برقرار رکھا (مبحث ۶ باب ۱۱)

(۲) وہ ریت اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے دل میں الہام کی ہے، جیسے ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد، اس زمانہ کے اہل اللہ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا کہ: ''چندے کے مدرسے'' قائم کئے جائیں، اسی سے دین کی حفاظت ہوگی۔ چنانچہ شدہ شدہ لاکھوں مدارس ومکاتیب اور جامعات ودارالعلوم قائم ہوگئے اور ملک اسپین اور روس کی مثال بننے سے بچ گیا۔

اور چند اسباب کی وجہ سے رسوم لوگوں میں پھیلتی ہیں، مثلاً:

(۱) وہ ریت کسی ایسے بڑے بادشاہ کی چلائی ہوئی ہوتی ہے جس کی عظمت وسطوت کے سامنے لوگوں کی گردنیں

جھکی ہوئی ہوتی ہیں، اس لئے لوگ تیزی سے وہ طریقہ اپنا لیتے ہیں، جیسے عشر وخراج کا طریقہ نوشیرواں عادل نے چلایا تھا۔ اسلام نے کچھ ترمیم کے ساتھ اس کو باقی رکھا ہے۔ (مبحث ۶ باب ۱۱)

(۲) لوگ اپنے دلوں میں اجمالاً ایک ضرورت محسوس کرتے ہیں، پھر کوئی ایسا طریقہ نکل آتا ہے جو اس اجمال کی تفصیل ہوتا ہے تو لوگوں کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ ''اچھا طریقہ'' ہے، اس لئے لوگ اس کو قلبی شہادت سے قبول کر لیتے ہیں اور وہ طریقہ چل پڑتا ہے، جیسے قلم سے لکھنے اور کپڑے سینے کا طریقہ حضرت ادریس علیہ السلام سے چلا ہے۔ لوگ پہلے سے ضرورت محسوس کرتے تھے کہ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہئے کہ بولے بغیر مافی الضمیر سمجھایا جا سکے، اور موجودین کے علاوہ غیر موجودین تک بھی بات پہنچائی جا سکے، اور چادریں پہننے کے بجائے کپڑوں کو بدن کے مطابق سی کر پہنا جائے، مگر کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا تھا، جب حضرت ادریس علیہ السلام نے یہ دونوں طریقے رائج کئے تو لوگوں نے ان کو اچھا سمجھ کر فوراً اپنا لیا اور وہ طریقے لوگوں میں رائج ہو گئے (فتح الباری ۱۳: ۲۲۶ بحوالہ لغات القرآن ۱: ۵۴)

اور کچھ اسباب کی وجہ سے لوگ رسوم کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑتے ہیں، مثلاً:

(۱) لوگوں کو بار بار تجربہ ہوتا ہے کہ جب کوئی ریت جان بوجھ کر یا بھول کر چھوڑ دی جاتی ہے تو قدرت کی طرف سے سزا ملتی ہے، اس لئے لوگ سزا سے بچنے کے لئے وہ ریت ضرور پوری کرتے ہیں۔ مثلاً بھوگ (دیوتاؤں کا چڑھاوا) دینے کی بنیاد یہی ہے۔ مصریوں کو بار بار کا تجربہ ہوا کہ سال کی معین تاریخ میں ایک دوشیزہ دریائے نیل میں نہیں ڈالی جاتی تھی تو دریا کی سطح گھٹ جاتی تھی اور نہریں خشک ہو جاتی تھیں، جس سے فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں، چنانچہ وہ یہ رسم پابندی سے پوری کرتے تھے۔ طلوع اسلام کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے نامہ مبارک بنام دریائے نیل سے یہ شیطانی حرکت موقوف ہوئی۔

یا جیسے بعض جاہلوں کو بار بار کا تجربہ ہوتا ہے کہ اگر وہ ''میلاد مروجہ'' نہیں کراتے تو جان یا مال میں نقصان ہو جاتا ہے، یا کسی ولی کی قبر پر حاضری نہیں دیتے تو نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چنانچہ وہ یہ بدعات وخرافات ضرور کرتے ہیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ بھی شیطانی حرکات اور قدرت کی طرف سے آزمائش ہے۔ اور دین وہ ہے جو اللہ نے بھیجا ہے، جو آج ہمارے پاس قرآن وحدیث کی شکل میں موجود ہے، باقی سب بکواس ہے۔

(۲) کسی ریت سے غفلت برتنے پر کسی بگاڑ کا پیدا ہونا۔ جیسے نکاح کا معروف طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو بڑا بگاڑ پیدا ہوگا اس لئے لوگ شادی بیاہ کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔

(۳) وہ ریت ایسی ہے جس کے ترک پر سمجھدار لوگوں نے یعنی انبیاء اور علماء نے سخت ملامت کی ہے۔ اس لئے لوگ اس کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں، جیسے تمام اسلامی طریقے انبیاء کے چلائے ہوئے ہیں اور شرعاً ان کے ترک کی گنجائش نہیں، اس لئے دیندار لوگ وہ سنتیں مضبوط پکڑے رہتے ہیں۔

اور مفکر ومبصر آدمی مذکورہ باتوں کی ان کی نظائر سے تصدیق کرے گا، یعنی مختلف ملکوں میں جو طریقے وجود میں آتے رہتے ہیں اور مٹتے رہتے ہیں وہ مذکورہ رسوم کی نظائر ہیں۔ ان پر نظر ڈال کر سمجھ دار آدمی شاہ صاحب رحمہ اللہ کی باتوں کی تصدیق کرسکتا ہے۔

﴿باب الرسوم السائرة في الناس﴾

اعلم أن الرسوم من الارتفاقات هي بمنزلة القلب من جسد الإنسان، وإياها قصدت الشرائعُ أولاً وبالذات، وعنها البحثُ في النواميس الإلٰهية، وإليها الإشاراتُ؛ ولها:

أسبابٌ: تَنْشَأُ منها، كاستنباط الحكماء وكإلهام الحق في قلوب المؤيَّدين بالنور الملَكي.

وأسباب: تَنْتشر بها في الناس، مثلُ كونها سنةَ مَلِكٍ كبيرٍ، دانت له الرقابُ، أو كونها تفصيلاً لما يجده الناس في صدورهم، فيتلقَّونها بشهادة قلوبهم.

وأسباب: يَعَضُّون عليها بالنواجذ لأجْلها: من تجربةِ مجازاةٍ غَيْبيَّةٍ على إهمالها، أو وقوعِ فسادٍ في إغفالها، وكإقامة أهل الآراء الراشدة اللائمةَ على تركها، ونحوِ ذلك.

والمُسْتَبْصِرُ ربما يُوَفَّق لتصديق ذلك، من إحياءِ سُنَنٍ وإماتتِها في كثير من البلدان، بنظائر ماذكرنا.

ترجمہ: جان لیں کہ رسوم کو ارتفاقات میں وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ اور انہی کا اللہ کی شریعتیں اولاً اور بالذات ارادہ کرتی ہیں۔ اور انہی سے قوانین شرعیہ میں بحث کی جاتی ہے، اور انہی کی طرف اشارے ہیں —— اور ان کے لئے:

کچھ اسباب ہیں جن سے وہ پیدا ہوتی ہیں، جیسے دانشمندوں کا نکالنا۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کا الہام فرمانا اُن لوگوں کے دلوں میں جو نور ملکی سے مؤید ہیں۔

اور کچھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے وہ لوگوں میں پھیلتی ہیں، جیسے ان کا کسی بڑے بادشاہ کا طریقہ ہونا، جس کے سامنے گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ یا ان کا تفصیل ہونا اُس بات کی جس کو لوگ (بالاجمال) اپنے سینوں میں پاتے ہیں، پس لوگ ان کو دلی شہادت سے قبول کرلیتے ہیں۔

اور کچھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے لوگ ان کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑتے ہیں، جیسے ان کو جان بوجھ کر یا بھولے سے چھوڑنے پر کسی غیبی سزا کا تجربہ، یا ان سے غفلت برتنے کی صورت میں کسی فساد (بگاڑ) کا پیدا ہونا۔ اور جیسے نیک سمجھ رکھنے والوں کا ملامت کو قائم کرنا ان کو ترک کرنے پر، اور اس کے مانند۔

اور غور وفکر کرنے والا کبھی توفیق دیا جاتا ہے اُن باتوں کی تصدیق کرنے کی مختلف ملکوں میں سنتوں (طور وطریق) کو زندہ کرنے اور ان کو مارنے کے ذریعہ، ان باتوں کی نظائر سے جو ہم نے ذکر کیں۔

ترکیب:

اللائمۃ: مصدر بمعنی الملامۃ ہے اور إقامۃ کا مفعول بہ ہے..... من إحیاء إلخ: اور بنظائر إلخ دونوں ظرف تصدیق سے علی سبیل البدلیت متعلق ہیں یعنی دونوں ظرفوں کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں جو نئے نئے طریقے نکلتے رہتے ہیں اور پرانے طریقے مٹتے رہتے ہیں، جو ہماری ذکر کردہ باتوں کی نظریں ہیں، ان میں غور وفکر کرکے فہیم آدمی ہماری باتوں کی تصدیق کرسکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اچھی رسمیں ضروری ہیں

لوگوں میں رائج طور وطریق فی نفسہ اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان سے ارتفاقات صالحہ (مفید اسکیموں) کی حفاظت ہوتی ہے، وہ انسانوں کو علم وعمل میں کمال تک پہنچاتے ہیں۔ مثلاً بارگاہ خداوندی میں نیازمندی (إخبات) اور ذکر الٰہی ارتفاقات صالحہ میں سے ہیں اور معنوی چیزیں ہیں۔ ان کا پیکر محسوس نماز وغیرہ عبادات کی مختلف شکلیں ہیں اور یہ رسوم ہی خارج میں پائی جاتی ہیں، جن سے ارتفاق صالح (اخبات وذکر) کی حفاظت ہوتی ہے اور انسان علم (ذکر وفکر) اور عمل میں درجۂ کمال تک پہنچتا ہے۔

اگر رسوم یعنی مسلمہ طور وطریق نہ ہوں تو اکثر لوگوں کی زندگیاں چوپایوں جیسی ہوکر رہ جائیں مثلاً لوگ شریعت کے مطلوبہ طریقوں کے مطابق نکاح ومعاملات کرتے ہیں، یہی رسوم انسان کو انسانیت کے دائرہ میں رکھتی ہیں۔ اگرچہ اکثر لوگ ان کی افادیت اور ضرورت سے واقف نہیں ہوتے۔ اگر آپ لوگوں سے پوچھیں کہ تم نکاح وطلاق اور دیگر معاملات کی قیود کی پابندی کیوں کرتے ہو؟ تو وہ اس کا بجز اس کے کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ یہ ہمارا قومی طریقہ ہے۔ مگر لوگ رسوم کی افادیت اجمالاً ضرور جانتے ہیں، گو وہ زبان سے اس کو نہ سمجھا سکیں۔ اور جب وہ زبان سے رسوم کی افادیت سمجھانے پر قادر نہیں تو وہ اس کی بنیادیں کیسے سمجھا سکتے ہیں؟ مگر بہرحال رسوم کی پابندی ایسے لوگوں کے لئے بھی ضروری ہے ورنہ ان کا حال چوپایوں جیسا ہوکر رہ جائے گا۔

بری رسمیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟

لوگوں میں رائج رسوم (طور وطریق) فی نفسہ اچھی ہوتی ہیں۔ مگر کبھی ان کے ساتھ غلط چیزیں مل جاتی ہیں تو وہ معاملہ

کو مشتبہ کر دیتی ہیں۔ جیسے غیر اسلامی معاشرہ میں ہونے والے معاملات میں سود کا اتنا عمل دخل ہو گیا ہے کہ بعض لوگ سود کی حرمت کے معاملہ میں تذبذب میں پڑ گئے ہیں، وہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں، مثلاً مہاجنی سود حرام ہے، تجارتی نہیں اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً حرام ہے، ورنہ نہیں، غریبوں سے لینا حرام ہے، کیونکہ یہ حاجتمندوں کا خون چوسنا ہے۔ بنکوں کا سود حرام نہیں، کیونکہ بنک تو غریبوں کو خون سپلائی کرتے ہیں، ان کی معمولی بچتوں کا ان کو منافع دیتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس لئے کہی جاتی ہیں کہ ان لوگوں کی سمجھ ہی میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ سود کے بغیر بھی کاروبار چل سکتا ہے۔

اور رائج طور وطریق میں باطل چیزیں اس طرح ملتی ہیں کہ ایسے سرغنے، لیڈر اور سردار پیدا ہوتے ہیں، جن پر شخصی اور ذاتی مفاد کا غلبہ ہوتا ہے، وہ اپنا ہی فائدہ چاہتے ہیں، چاہے دنیا تباہ ہو کر رہ جائے۔ مفاد عامہ کا انہیں بالکل خیال نہیں آتا، وہ اپنے فائدہ کے لئے مختلف برے طریقے اختیار کرتے ہیں، مثلاً:

۱:- وہ درندگی والے کام کرنے لگتے ہیں، جیسے راہ زنی، چوری، غصب، قتل وغیرہ۔

۲:- وہ شہوانی بداعمالیاں شروع کرتے ہیں، جیسے اغلام، ہیجڑاپن وغیرہ۔

۳:- وہ ایسے کام کرتے ہیں جو ذرائع معاش کو نقصان پہنچاتے ہیں، جیسے سودخوری اور ناپ تول میں کمی کرنا۔

۴:- وہ رہن سہن، کھانے پینے، لباس اور تقریبات میں فضول خرچی شروع کرتے ہیں اور اتنی دولت اڑاتے ہیں جس کے لئے رات دن کمائی کرنی پڑتی ہے یا قرض لینا پڑتا ہے۔

۵:- وہ عیش وعشرت، رنگ رلیوں اور سامان تفریح کی طرف اتنے مائل ہو جاتے ہیں کہ دنیا وآخرت کے سارے کام چھوڑ بیٹھتے ہیں، جیسے ریڈیو، ہائے فائے، ٹی وی، ویڈیو، گانے باجے، بانسریاں، پتے، شطرنج، شکار، کبوتر بازی وغیرہ لغویات۔

۶:- وہ دوسرے ملکوں کے واردین پر کمر توڑ ٹیکس لگاتے ہیں اور اپنی رعایا سے تباہ کن لگان وصول کرتے ہیں۔

۷:- ان میں باہم حرص وطمع اور بغض وعناد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

یہ تمام کام وہ ہیں جو وہ رؤساء دوسروں کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں، مگر وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ یہ حرکتیں ان کے ساتھ کی جائیں۔ اور جب ان کی جاہ وحشمت کی وجہ سے کوئی شخص ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا تو باقی لوگ تین طرح کے ہو جاتے ہیں:

۱:- جو لوگ بدکار ہوتے ہیں وہ ان سرغنوں کی پیروی کرتے ہیں، ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، ان کی نصرت واعانت کرتے ہیں اور وہ ان برائیوں کی خوب اشاعت کرتے ہیں۔

۲:- وہ لوگ جن کے دلوں میں نہ تو اعمال صالحہ کی قوی رغبت ہوتی ہے، نہ اعمال طالحہ کی، وہ النَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ کے قاعدے سے ان رؤساء کے نقش قدم پر چل پڑتے ہیں۔ اور کبھی وہ کمائی کرنے کے برے طریقے اس لئے

اختیار کرتے ہیں کہ اچھی راہیں ان کو تھکا دیتی ہیں یعنی کمائی کی اچھی راہیں ان کے ہاتھ نہیں آتیں، اس لئے وہ غلط راہوں پر پڑ جاتے ہیں۔

۳:- وہ لوگ جن کی فطرت میں سلامتی ہے، وہ غصہ بھرے خاموش رہتے ہیں، وہ ان کی ہمنوائی نہیں کرتے، مگر بے ہمتی سے ہونٹ بھی سی لیتے ہیں۔ اور جب کوئی بھی غلط طور وطریق پر نکیر کرنے والا نہیں رہتا، تو برے طریقے وجود پذیر ہوکر پختہ اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اور لوگوں کو ان سے ہٹانا ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔

والسنن السائرة وإن كانت من الحق في أصل أمرها، لكونها حافظةً على الارتفاقات الصالحة، ومُفْضِيَةً بأفراد الإنسان إلى كمالها النظري والعملي؛ ولولاها لالتحق أكثر الناس بالبهائم، فكم من رجل يباشر النكاحَ والمعاملاتِ على الوجه المطلوب، وإذا سُئل عن سبب تقيُّده بتلك القيود، لم يجد جوابا إلا موافقةَ القوم، وغايةُ جهدِه علمٌ إجمالي، لايُعْرِب عنه لسانُه، فضلاً عن تمهيد ارتفاقِه،فهٰذا لولم يلتزم سنةً كاديلتحق بالبهائم.

لكنها قد ينضم معها باطلٌ، فَيُلَبِّسُ على الناس سنَّتَهم، وذلك بأن يَترأَّس قومٌ يغلب عليهم الآراءُ الجزئيةُ، دون المصالحِ الكليةِ، فيخرجون إلى أعمالٍ سَبُعية، كقطع الطريق والغصب؛ أو شَهَوِيَّة، كاللِّواطة، وتأنُّثِ الرجال؛ أو أكساب ضارَّة، كالربا، وتطفيف الكيل والوزن؛ أو عاداتٍ في الزِّيِّ والولائم تميل إلى الإسراف، وتحتاج إلى تعمق بليغ في الأكساب؛ أو الإكثار من المُسْلِيَاتِ، بحيث يُفْضي إلى إهمال أمر المعاش والمعاد، كالمزامير، والشطرنج، والصيد، واقتناء الحَمَام، ونحوِها؛ أوجباياتٍ مُنْهِكَةٍ لأبناء السبيل، وخراجٍ مستأصلٍ للرعية؛ أو التشاحُحِ والتشاحُنِ فيما بينهم فيستحسنون أن يفعلوها مع الناس، ولايستحسنون أن يُفعل ذلك معهم،فلايُنكر عليهم أحدٌ لجاههم وصَوْلتهم، فَيَجِيئُ فَجَرَةُ القوم فيقتدون بهم، وينصرونهم، ويبذلون السعي في إشاعةِ ذلك؛ ويجيئ قوم لم يُخلق في قلوبهم ميلٌ قوي إلى الأعمال الصالحة، ولاإلى أضدادها،فيحملهم ما يرون من الرؤساء على التمسك بذلك، وربما أعيت بهم المذاهبُ الصالحة؛ ويبقى قومٌ فطرتُهم سَوِيَّةٌ في أُخْرَيَاتِ القوم، لايخالطونهم، ويسكتون على غيظٍ، فتنعقد سنةٌ سيئة وتتأكد.

ترجمہ: اور رائج طور وطریق: اگرچہ اپنی اصلیت کے لحاظ سے برحق ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ارتفاقات صالحہ کے محافظ اور انسان کے افراد کو ان کے کمال علمی اور عملی تک پہنچانے والے ہیں۔ اگر ریت رواج نہ ہوں تو اکثر لوگوں کی

زندگیاں چوپایوں جیسی ہوکر رہ جائیں۔ پس بہت سے لوگ مطلوبہ شکل میں نکاح ومعاملات کرتے ہیں، اور جب ان سے ان قیود کی پابندی کی وجہ دریافت کی جائے تو وہ قوم کی موافقت کے علاوہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور ان کی انتہائی کوشش ایک اجمالی علم ہے (یعنی وہ بہت کوشش کریں تو صرف اجمالاً جان سکتے ہیں) جس کو ان کی زبانیں تعبیر نہیں کرسکتیں۔ چہ جائے کہ وہ اس ارتفاق کی تمہید بیان کریں۔ پس یہ شخص اگر کسی طریقہ کی پابندی نہیں کرے گا تو وہ چوپایوں کے ساتھ مل جائے گا۔

مگر کبھی رسوم کے ساتھ باطل چیزیں مل جاتی ہیں، پس وہ باطل، لوگوں پر ان کے (صحیح) طریقہ کو مشتبہ کردیتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ کچھ ایسے لوگ سرغنہ بن جاتے ہیں جن پر ذاتی مفادات کا غلبہ ہوتا ہے، وہ مصالح کلیہ (مفادات عامہ) ملحوظ نہیں رکھتے، پس وہ نکلتے ہیں ۱:- درندگی والے کاموں کی طرف، جیسے راہ زنی اور غصب ۲:- یا شہوانی کاموں کی طرف، جیسے اغلام اور ہیجڑا پن ۳:- یا ضرررساں کمائیوں کی طرف، جیسے سود اور ناپ تول میں کمی کرنا ۴:- یا پوشاک اور تقریبات میں ایسی عادتوں کی طرف جو فضول خرچی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اور جن کے لئے کمائیوں کا بہت زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے ۵-: یا سامان تفریح بہت زیادہ کرنے کی طرف، اس طرح کہ وہ دنیا وآخرت کے کاموں کو چھوڑنے کی طرف پہنچا دیتا ہے، جیسے بانسریاں، شطرنج، شکار، کبوتر پالنا، اور اس جیسی چیزیں ۶:- یا مسافروں پر کمرتوڑ ٹیکسوں کی طرف اور رعایا پر تباہ کن محصول مقرر کرنے کی طرف ۷:- یا باہمی حرص وطمع اور بغض وعناد کی طرف ـــــ پس وہ اچھا سمجھتے ہیں کہ یہ کام لوگوں کے ساتھ کریں۔ اور اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ یہ کام ان کے ساتھ کئے جائیں، پس ان کی جاہ وحشمت کی وجہ سے ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا ـــــ پھر قوم کے بدکار لوگ آتے ہیں، پس وہ اُن (سرغنوں) کی اقتدا کرتے ہیں، اور ان کی اعانت کرتے ہیں۔ اور ان برائیوں کی اشاعت کی کوشش کرتے ہیں ـــــ اور کچھ اور لوگ آتے ہیں جن کے دلوں میں نہ تو اعمال صالحہ کی طرف قوی میلان پیدا کیا گیا ہے اور نہ ان کی اضداد کی طرف، پس ان کو اُن برائیوں کے پکڑنے پر وہ چیز ابھارتی ہے جو وہ اپنے سرداروں سے دیکھتے ہیں۔ اور کبھی ان کو (کمائی کی) نیک راہیں تھکا دیتی ہیں ـــــ اور قوم کی آخری صفوں میں وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کی فطرت درست ہوتی ہے وہ ان کے ساتھ نہیں ملتے، اور غصہ میں بھرے ہوئے خاموشی اختیار کرتے ہیں، پس برے طریقے وجود میں آتے ہیں اور مستحکم ہوجاتے ہیں۔

لغات:

لکنها: استدراک ہے وإن كانت من الحق سے ..... يَتَرَأَّسُ: باب تفعُّل سے ہے بمعنی أن يجعلَ نفسَه رئيسا ..... المُسْلِيَةُ: سامان تفریح جو غم کو بھلادے أَسْلَى إسلاءً عن هَمِّه بے غم کردینا ..... التشاحن: ایک دوسرے سے کینہ رکھنا۔

رسوم و بدعات کی اصلاح کرنا بہترین عمل ہے

جو لوگ ملت کے مفادات کے لئے کام کرتے ہیں اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ حق کی اشاعت و ترویج کے لئے اور باطل کو مٹانے اور روکنے کے لئے انتہائی جدوجہد کریں۔ اور یاد رکھیں کہ بدعات ورسوم جب کسی قوم میں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو ان کو اکھاڑنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ کبھی جھگڑوں اور لڑائیوں تک کی نوبت آجاتی ہے مگر مصلحین کو اس سے گھبرانا نہیں چاہئے، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور سپر نہیں ڈالی، پھر ان کے وارث کیوں پیچھے ہٹیں! یہ سب جھگڑے نیکی کے بہترین کاموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ البتہ اپنی طرف سے کوشش یہ ہونی چاہئے کہ کوئی دنگا فساد نہ ہو، لوگوں کو پیار و محبت سے سنت کا راستہ بتایا جائے اور بدعات ورسوم کی قباحت سمجھائی جائے۔ لیکن اگر مفسدین دنگے فساد پر اتر آئیں، تو اس کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا جائے یہ بھی ایک طرح کا جہاد ہے۔

صحیح طریقہ چھوڑ کر غلط طریقہ کون اختیار کرتا ہے؟

جب کوئی اچھا طریقہ وجود پذیر ہو جاتا ہے، جیسے معہود طریقہ پر نکاح کرنا اور محارم سے نکاح نہ کرنا اسلامی طریقہ ہے۔ مسلمان ہر زمانہ میں اس کو مانتے رہے ہیں، اسی طریقہ پر مرتے جیتے رہے ہیں یعنی زندگیاں گزر گئیں اس طریقہ پر اور لوگوں کے نفوس و علوم اس پر خشک ہو گئے ہیں یعنی مسلمان ہمیشہ دل سے اس طریقہ کی حقانیت کے قائل رہے ہیں اور ان کے علماء دلائل و براہین سے اس طریقہ کی افادیت اور اس کی خلاف ورزی کی قباحت سمجھاتے رہے ہیں اور لوگ وجوداً اور عدماً اس طریقہ کو اصول ارتفاقات کے ساتھ لازم و ملزوم سمجھنے لگے ہیں یعنی اگر یہ طریقہ ہے تو ارتفاقات کی بنیادی باتیں حاصل ہیں، ورنہ نہیں۔ جب صورت حال ایسی ہو جائے تو اس سے نکلنے کا اور اس کی خلاف ورزی کرنے کا ارادہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نفس نہایت گندہ ہو، عقل اوچھی ہو، شہوت زور پر ہو اور اس کی گردن پر خواہش سوار ہو، پھر جب وہ صحیح طریقہ چھوڑ کر غلط طریقہ اختیار کر لیتا ہے، نکاح کے بجائے پرائیویٹ معاملہ کرتا ہے، بیٹی یا بہن سے نکاح کرتا ہے یا دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرتا ہے تو اس کا دل اقراری ہوتا ہے کہ وہ بدکاری کر رہا ہے اور اس کے اور مصلحت کلیہ کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ مصلحت کلیہ والا کام جو پوری سوسائٹی کے لئے مفید ہے چھوڑ کر، خواہش نفس کی تکمیل کرتا ہے، اور وہ ایسا کرنے میں بہت زیادہ قباحت محسوس نہیں کرتا، کیونکہ اس کے دل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ اور جب وہ غلط روش پر پڑ جاتا ہے اور سمجھانے سے بھی باز نہیں آتا تو اس کا یہ عمل اس کے نفسانی مرض کا پیکر محسوس بن جاتا ہے اور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ بس نام کا مسلمان تھا۔ حقیقت میں دل ایمان سے خالی تھا۔ اور اس کا یہ عمل اس کے دین

میں دراڑ ڈال دیتا ہے یعنی رہی سہی پونجی بھی برباد ہوجاتی ہے اور وہ بے دین، بلکہ بد دین ہوکر رہ جاتا ہے۔

صحیح اور غلط طریقہ اپنانے والوں کا انجام

جب لوگ صحیح طریقہ کے ساتھ مضبوطی سے چمٹے رہتے ہیں یا ڈھٹائی سے اس کو چھوڑ کر غلط طریقہ اپنا لیتے ہیں تو اول کے حق میں اور ثانی کے خلاف ملأ اعلی کی دعائیں اور التجائیں بلند ہوتی ہیں۔ اور وہ بارگاہ خداوندی میں پہنچتی ہیں اور وہاں اول کے حق میں خوشنودی اور ثانی کے حق میں ناراضگی وجود میں آتی ہے اور وہ مرحوم ومغفور ہوتے ہیں یا ملعون ومبغوض بنتے ہیں۔

سنتیں فطرت کب بنتی ہیں؟

جب سنت راشدہ لوگوں میں رائج ہوجاتی ہیں اور عصراً بعد عصرٍ لوگ اس کو تسلیم کر لیتے ہیں، اور اسی پر لوگ مرتے جیتے رہتے ہیں، اور لوگوں کے نفوس اور علوم اس پر خشک ہوجاتے ہیں اور اس سنت میں اور اصول ارتفاقات میں چولی دامن کا ساتھ ہوجاتا ہے تو وہ سنت فطرت بن جاتی ہے یعنی وہ لوگوں کی طبیعت میں رچ بس جاتی ہے۔ حدیث شریف میں جو دس چیزوں کو امور فطرت میں شمار کیا گیا ہے (دیکھئے مشکوۃ، باب السواک، حدیث نمبر ۳۷۹) وہ انبیائے کرام کے چلائے ہوئے ایسے ہی طریقے ہیں جو قرناً قرن سے لوگوں میں مسلّم چلے آرہے ہیں۔

ويجب بذلُ الجهد على أهل الآراء الكليةِ في إشاعة الحق، وتَمْشِيَتِهِ، وإخمالِ الباطل وصَدِّه، فربما لم يمكن ذلك إلا بمخاصمات، أو مقاتلات، فَيُعَدُّ كلُّ ذلك من أفضلِ أعمال البر.

وإذا انعقدت سنةٌ راشدة، فسلَّمها القومُ، عصرًا بعد عصرٍ، وعليها كان محياهم ومماتهم، ويَبِسَتْ عليها نفوسُهم وعلومهم، فظَنُّوها متلازمةً للأصول وجوداً وعدما، لم تكن إرادة الخروج عنها وعصيانِها إلا ممن سَمُجَت نفسُه، وطاش عقلُه، وقويت شهوتُه، واقتعد غاربَه الهوى؛ فإذا باشر الخروجَ أَضْمَرَ في قلبه شهادةً على فجوره، وسُدِل حجابٌ بينه وبين المصلحة الكلية؛ فإذا كَمُلَ فعلُه صار ذلك شرْحًا لمرضه النفساني، وكان ثُلمةً في دينه.

فإذا تقرر ذلك تقررًا بينا ارتفعت أدعيةُ الملأ الأعلى، وتضرعاتٌ منهم، لمن وافق تلك السنة، وعلى من خالفها، وانعقد في حظيرة القدس رِضًا وسُخطٌ عمن باشرها، أو عليه.

وإذا كانت السننُ كذلك عُدَّت من الفطرة التي فطر الله الناس عليها، والله أعلم.

ترجمہ: اور واجب ہے مفادات عامہ کے لئے محنت کرنے والوں پر انتہائی کوشش خرچ کرنا حق کی اشاعت میں اور

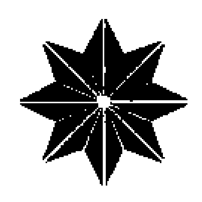
اس کو چلانے میں، اور باطل کو گمنام کرنے میں اور اس کو روکنے میں۔ پس کبھی یہ بات ممکن نہیں ہوتی مگر جھگڑوں اور لڑائیوں کے ذریعہ۔ پس شمار کی جاتی ہیں یہ سب چیزیں (یعنی لڑائی، جھگڑے) نیکی کے بہترین کاموں میں۔

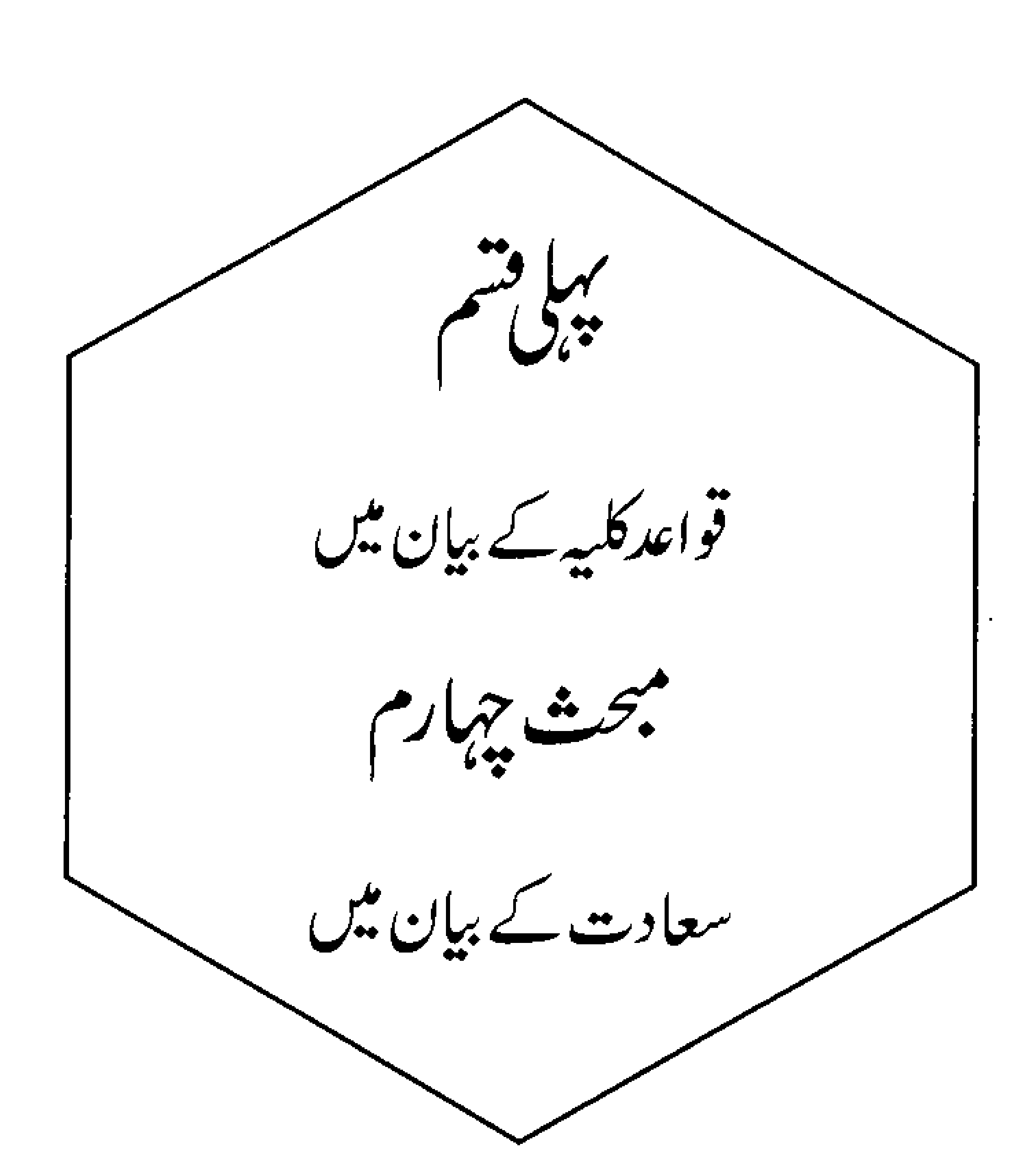
اور جب سنت راشدہ وجود میں آجاتی ہے۔ پس اس کو لوگ عصراً بعد عصر مان لیتے ہیں، اور اسی پر ان کا مرنا جینا ہوتا ہے۔ اور اس پر ان کی ارواح اور علوم خشک ہوجاتے ہیں۔ پس لوگ اس اچھے طریقے کو وجوداً وعدماً اصول ارتفاقات کے ساتھ متلازم گمان کرنے لگتے ہیں۔ تو اس طریقہ سے نکلنے کا اور اس کی خلاف ورزی کرنے کا ارادہ وہی شخص کرتا ہے جس کا نفس قبیح ہوتا ہے اور جس کی عقل اوچھی ہوتی ہے اور جس کی شہوت قوی ہوتی ہے اور جس کی گردن پر خواہش سوار ہوتی ہے۔ پس جب وہ اس طریقہ سے نکلنے کا عمل اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے دل میں اپنی بدکاری کا اقرار چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور اس کے اور مصلحت کلی کے درمیان پردہ لٹکا دیا جاتا ہے۔ پس جب اس کا (خروج کا) عمل مکمل ہوجاتا ہے تو وہ اس کے نفسانی مرض کا پیکر محسوس بن جاتا ہے اور وہ اس کے دین میں دراڑ ہوتا ہے۔

پھر جب یہ چیز واضح طور پر ثابت ہوجاتی ہے تو ملأ اعلی کی دعائیں اور گڑگڑاہٹیں بلند ہوتی ہیں، ان لوگوں کے حق میں جو اس سنت کی موافقت کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے خلاف جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور بارگاہ مقدس میں خوشنودی اور ناراضگی وجود میں آتی ہے ان لوگوں سے جو اس طریقہ پر عمل کرتے ہیں یا ان لوگوں کے برخلاف جو اس طریقہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

اور جب طریقے ایسے ہوجاتے ہیں تو وہ اس فطرت میں شمار ہونے لگتے ہیں، جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

(بفضلہ تعالیٰ آج ۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۹۹۹ء بروز منگل مبحث سوم کی شرح مکمل ہوئی)




پہلی قسم
قواعد کلیہ کے بیان میں
مبحث چہارم
سعادت کے بیان میں

مبحث چہارم

سعادت کے بیان میں

باب (۱) سعادت (نیک بختی) کی حقیقت کیا ہے؟

باب (۲) نیک بختی میں اختلاف درجات

باب (۳) تحصیل سعادت کے مختلف طریقے

باب (۴) وہ اصول جو سعادت حاصل کرنے کے طریق ثانی کی تحصیل کا مرجع ہیں

باب (۵) خصال اربعہ کی تحصیل، تکمیل اور تلافیٔ مافات کا طریقہ

باب (۶) ظہور فطرت کے حجابات

باب (۷) حجاباتِ مذکورہ کو دور کرنے کا طریقہ

مبحث چہارم

سعادت کے بیان میں

باب ـــــــ ۱

سعادت کی حقیقت کیا ہے؟

اب تک تمہیدی مباحث تھے۔اب اصل مقصود شروع ہوتا ہے۔حیات انسانی کا بنیادی مقصد ''سعادت دارین'' حاصل کرنا ہے۔یہ نعمت میسر آجائے تو زہے قسمت! ورنہ کفِ افسوس ملنے کے سوا چارہ نہیں!

انسان میں انسانیت کے علاوہ حیوانیت، نباتیت اور جمادیت بھی پائی جاتی ہے یعنی ان کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، حیوان کی خصوصیت ہے حساس اور متحرک بالارادہ ہونا، نباتات کی خصوصیت ہے پلنا بڑھنا اور نشو ونما پانا اور جمادات کی خصوصیت ہے قابل ابعاد ثلاثہ ہونا۔یہ تینوں باتیں انسان میں بھی پائی جاتی ہیں۔اس لئے انسان دو قسم کے کمالات کا مجموعہ ہے:

(۱) نوعی کمالات: یعنی وہ خوبیاں جو انسان میں انسان ہونے کی وجہ سے پائی جاتی ہیں، جیسے عمدہ اخلاق والا ہونا، تدبیرات نافعہ کے سہارے آسائش کی زندگی بسر کرنا، اعلیٰ صنعتیں وجود میں لانا اور عظیم دبدبہ کا مالک ہونا۔یہ تمام خوبیاں وہ ہیں جو انسان میں اس کی صورت نوعیہ کے اقتضاء سے پائی جاتی ہیں یعنی انسان چونکہ انسان ہے، اس لئے اس میں یہ خوبیاں ہیں۔یہی انسان کے امتیازی اور انفرادی کمالات ہیں۔کسی بھی اور مخلوق میں یہ باتیں نہیں پائی جاتیں۔

(۲) جنسی کمالات: یعنی حیوانیت، نباتیت اور جمادیت والے کمالات، جمادات کی خوبیاں مثال کے طور پر قد کی درازی اور جسم کی بڑائی ہیں۔نباتات کی خوبیاں مناسب نشو ونما، بہترین ڈیزائن یعنی خوبصورتی اور تروتازگی وغیرہ ہیں، حیوانات کی خوبیاں مضبوط باڈی، آواز کی کرختگی، شہوت کی فراوانی، کھانے پینے کی زیادتی اور حسد وغصہ کی تیزی ہیں۔یہ سب خوبیاں انسان میں بھی پائی جاتی ہیں اور کمالات شمار ہوتی ہیں۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ انسان کے اصل اور قابل لحاظ کمالات کیا ہیں؟ بدیہی بات ہے کہ وہ نوعی کمالات ہیں،

انہی کا فقدان انسان کو ضرر پہنچاتا ہے اور دنیا کے تمام عقلاء انہی کی تحصیل کا اہتمام کرتے ہیں۔ جنسی کمالات کو سمجھ دار لوگ کوئی کمال ہی نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ان خوبیوں میں انسان حیوانات، نباتات اور جمادات سے بازی جیت نہیں سکتا۔ زمین وآسمان اور پہاڑ وغیرہ انسان سے کہیں بڑی قد وقامت رکھتے ہیں۔ لالہ وگلاب، نسرین ویاسمین، ہزارہ ونرگس کا خوبصورتی میں جواب نہیں، گینڈا اور گدھا انسان سے کہیں زیادہ زور آور اور شہوت پرست ہیں۔ پس یہ باتیں اگر انسان میں پائی جاتی ہیں تو وہ کوئی قابل تعریف خوبیاں نہیں۔

اب پھر غور طلب بات یہ ہے کہ انسان کے نوعی کمالات: اخلاق مہذبہ اور ارتفاقات وغیرہ بذات خود کمالات ہیں یا کسی اور وجہ سے کمالات بنے ہیں؟ کیونکہ ان کی اصل حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے۔ گوریا ایسا گھونسلا بناتی ہے کہ انسان دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے، مُحال چھتہ میں ایسا مسدس گھر بناتی ہے کہ پُرکار سے بھی شاید ہی بنایا جاسکے۔ بلکہ بعض کاریگریاں حیوانات کی فطرت میں ایسی پائی جاتی ہیں کہ انسان باوجود کوشش کے ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح بہادری کی اصل چار باتیں ہیں یعنی غصہ، انتقام کا جذبہ، مشکلات میں ڈٹ جانا اور خطرات میں بے خطر کود پڑنا۔ یہ سب باتیں حیوانات میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مگر وہ بہادر نہیں کہلاتے۔ اور انسان صنعت کار اور بہادر کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں نفس ناطقہ (روح ربانی) نے ان باتوں کو ایسا سنوار دیا ہے کہ وہ مصلحت کلی کے تابع اور اقتضائے عقل کے مطابق ہوگئی ہیں۔ انسان کو غصہ موقع پر ہی آتا ہے اور جس سے جتنا انتقام لینا روا ہوتا ہے اسی قدر انتقام لیتا ہے۔ جن مشکلات میں ثابت قدمی مصلحت ہوتی ہے یا جن خطرات میں کودنا عقل کا تقاضا ہوتا ہے وہیں انسان اقدام کرتا ہے، اس لئے وہ ''بہادر'' کہلاتا ہے، جانوروں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ معلوم ہوا کہ یہ تمام چیزیں بالذات کمالات نہیں، بلکہ بالعرض کمالات ہیں یعنی کوئی اور چیز ہے جو ان کمالات کو کمالات بناتی ہے اور وہ چیز ہے نفس ناطقہ کا اُن کمالات کو سنوارنا اور ان کو مصلحت کلی کے مطابق بنانا۔ پس سعادت حقیقیہ یہ ہے کہ:

بہیمیت نفس ناطقہ کی مطیع ہوجائے، خواہش عقل کی فرمانبرداری قبول کرلے اور نفس ناطقہ بہیمیت پر اور عقل خواہش پر غالب آجائے —— ان کے علاوہ تمام باتیں نظر انداز کی ہوئی ہیں۔

﴿المبحث الرابع: مبحث السعادة﴾

باب حقيقة السعادة

اعلم أن للإنسان كمالاً تقتضيه الصورةُ النوعية، وكمالاً يقتضيه موضوعُ النوع: من الجنس القريب والبعيد، وسعادتُه التي يَضُرُّه فقدُها، ويقصدُها أهلُ العقول المستقيمة قصدًا مؤكدًا هو الأول.

وذلك: أنه قد يُمدح في العادة: بصفاتٍ يشارك فيها الأجسامَ المَعْدِنِيةَ، كالطول، وعِظَمِ القامة، فإن كانت السعادة هذه فالجبالُ أتمُّ سعادةً؛وصفاتٍ يشارك فيها النباتَ، كالنُّمو المناسب،والخروج إلى تخاطيطَ جميلةٍ وهيئاتٍ ناضرةٍ، فإن كانت السعادة هذه فالشقائق والأوراد أتمُّ سعادة؛ وصفاتٍ يشارك فيها الحيوانُ، كشدة البطش، وجَهْوَرِيَّةِ الصوتِ، وزيادة الشبق، وكثرة الأكل والشرب، ووفور الغضب والحسد، فإن كانت السعادة هذه فالحمار أتمُّ سعادةً؛ وصفاتٍ يختص بها الإنسانُ، كالاخلاق المهذَّبة، والارتفاقات الصالحة، والصنائع الرفيعة، والجاه العظيم، فبادى الرأى: أنها سعادةُ الإنسان، ولذلك ترى كلَّ أمة من أمم الناس، يستحب أتمُّها عقلا، وأسدُّها رأيًا: أن يكتسب هذه، ويجعل ماسواها كانها ليست صفاتَ مدح.

ولكنَّ الأمرَ إلى الآن غيرُ منقَّح، لأن أصلَ هذه موجود في أفراد الحيوان ، فالشجاعةُ أصلُها الغضب، وحب الانتقام، والثباتُ في الشدائد، والإقدام على المهالك، وهذه كلُّها مُوَفَّرةٌ في الفحول من البهائم، لكنْ لاتُسمى شَجَاعَةً إلا بعد ما يُهَذِّبها فيضُ النفس النُّطقية، فتصير منقادةً للمصلحة الكلية، منبعثةً من داعية معقولة؛ وكذلك أصل الصناعات موجود في الحيوان كالعصفور الذى يَنْسِجُ العُشَّ، بل رب صنعة يصنعها الحيوانُ بطبيعته لايتمكن منها الإنسان بتجشُّم.

كلا، بل الحق أن هذه سعادةٌ بالعرض، وأن السعادةَ الحقيقةَ هي: انقياد البهيمية للنفس النطقية، واتباعُ الهوى للعقل، وكونُ النفس الناطقة قاهرةً على البهيمية، والعقلِ غالباً على الهوى؛ وسائرُ الخصوصيات مُلْغَاةٌ.

ترجمہ: مبحث چہارم: نیک بختی کے بیان میں: نیک بختی کی حقیقت کیا ہے؟ جان لیں کہ انسان کے کچھ کمالات ایسے ہیں جن کو صورت نوعیہ چاہتی ہے اور کچھ کمالات ایسے ہیں جن کو نوع کا موضوع یعنی جنس قریب وبعید چاہتے ہیں۔ اور انسان کی وہ سعادت جس کا فقدان مضر ہے، اور جس (کی تحصیل) کا درست عقل رکھنے والے لوگ نہایت ہی اہتمام سے ارادہ کرتے ہیں وہ قسم اول کے کمالات ہیں۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ عادۃً انسان کی تعریف (بچند وجوہ) کی جاتی ہے:ا:- ایسی خوبیوں کی وجہ سے جن میں وہ اجسام معدنیہ (جمادات) کے ساتھ شریک ہوتا ہے، جیسے قد کی درازی، جسم کی بڑائی، پس اگر نیک بختی اِن چیزوں کا نام ہے تو پہاڑ انسان سے زیادہ نیک بخت ہیں ۲:- اور ایسی خوبیوں کی وجہ سے جن میں وہ نباتات کے ساتھ شریک ہوتا ہے، جیسے مناسب نشوونما اور خوبصورت ڈیزائن اور تروتازگی کی طرف نکلنا، پس اگر نیک بختی ان چیزوں کا نام ہے تو گل لالہ اور

گل گلاب انسان سے زیادہ نیک بخت ہیں۳:- اور ایسی خوبیوں کی وجہ سے جن میں وہ حیوانات کے ساتھ شریک ہوتا ہے، جیسے سخت گرفت یعنی مضبوط باڈی، کرخت آواز، شہوت کی زیادتی، بہت زیادہ کھانا پینا اور غصہ اور حسد کی فراوانی، پس اگر نیک بختی ان چیزوں کا نام ہے تو گدھا انسان سے زیادہ نیک بخت ہے۴:- اور ایسی خوبیوں کی وجہ سے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے مہذب اخلاق، ارتفاقات صالحہ، اعلیٰ قسم کی صنعتیں اور عظیم دبدبہ۔ پس سرسری نظر میں انہی چیزوں کا نام ''سعادت انسانی'' ہے۔ اور اسی وجہ سے آپ دنیا کی تمام اقوام کو دیکھتے ہیں کہ ان میں سے جو عقل میں کامل اور رائے میں درست ہے وہ انہی امور کی تحصیل کو پسند کرتا ہے۔ اور ان کے ماسوا خوبیوں کو ایسا سمجھتا ہے کہ گویا وہ قابل تعریف خوبیاں ہی نہیں۔

مگر معاملہ ابھی تک منقح نہیں ہوا، کیونکہ ان صفات کی اصل تو دیگر حیوانات میں بھی موجود ہے۔ مثلاً بہادری کی اصل غصہ، انتقام کی خواہش، مشکلات میں ثابت قدمی اور خطرات میں پیش قدمی ہے۔ اور یہ تمام باتیں نر چوپایوں میں بھی پوری طرح موجود ہیں، مگر وہ ''بہادر'' نہیں کہلاتے، جب تک نفس ناطقہ کا فیضان ان کو ایسا نہ سنوار دے کہ وہ سراسر مصلحت کلی کے تابع ہو جائیں، اور اقتضائے عقل کے ماتحت وہ معرض وجود میں آئیں۔ اور اسی طرح کاریگریوں کی اصل حیوانات کے اندر موجود ہے، جیسے وہ چڑیا جو آشیانہ بُنتی ہے۔ بلکہ بعض کاریگریاں ایسی ہیں جن کو حیوانات اپنی فطرت سے کرتے ہیں، انسان اُن کو اپنی پوری کوشش سے بھی انجام نہیں دے سکتا۔

ہرگز نہیں (یعنی یہ چیزیں بذات خود کمالات نہیں) بلکہ حق بات یہ ہے کہ یہ سب چیزیں بالعرض سعادت ہیں۔ اور سعادت حقیقیہ (بالذات سعادت) یہ ہے کہ بہیمیت نفس ناطقہ کی مطیع ہو جائے۔ اور خواہش عقل کی فرمانبرداری قبول کر لے۔ اور نفس ناطقہ بہیمیت پر اور عقل خواہش پر غالب آ جائے۔ اور باقی خوبیاں نظر انداز کی ہوئی ہیں۔

تشریحات:

(۱) ''نوع'' اور ''نوع کا موضوع'' علم منطق کی اصطلاحات ہیں، جب فصلوں کے ذریعہ جنس کی تقسیم کی جاتی ہے تو پیدا ہونے والی اقسام اس جنس کی ''انواع'' کہلاتی ہیں۔ اور ہر نوع کی تعریف (حد و رسم) موضوع و محمول سے مرکب ہوتی ہے، جیسے انسان کی تعریف ہے حیوانٌ ناطقٌ۔ اس میں حیوان موضوع ہے۔ اور ناطق محمول۔ پھر محمول اگر کلی ذاتی ہے تو وہ تعریف ''حد'' کہلاتی ہے۔ اور اگر محمول کلی عرضی ہے تو وہ تعریف ''رسم'' کہلاتی ہے۔ اسی طرح موضوع اگر جنس قریب ہے تو اس کو حد تام اور رسم تام کہتے ہیں اور اگر موضوع جنس بعید یا بعید تر ہے تو اس کو حد ناقص اور رسم ناقص کہتے ہیں۔ پس انسان کی حد تام ہے حیوان ناطق اور حد ناقص نَبَاتٌ (جسم نامی) ناطق اور جَمَادٌ (جسم مطلق) ناطق۔ پس حیوان، نبات اور جماد نوع انسان کے موضوع ہیں اول جنس قریب ہے، دوم اور سوم جنس بعید ہیں۔

(۲) تـخـاطـيـط، خط (لکیر) سے ہے۔ڈیزائن چونکہ لکیروں کا مجموعہ ہوتی ہے۔اس لئے شکل، صورت اور ڈیزائن کو تخاطیط کہتے ہیں۔

(۳) تین جگہ يُشَارِكُ آیا ہے۔اس کا فاعل ضمیر مستتر ہے، جو انسان کی طرف راجع ہے۔

لغات: شَـقَـائِقُ النُّعمان: گلہائے لالہ، واحد شقيقة النعمان گل لالہ: ایک قسم کا سرخ پھول، جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے...... وَرْدٌ: گلاب کا پھول...... مُلْغَاة (اسم مفعول) أَلْغَى الشيئ: باطل کرنا۔

حقیقی نیک بختی حاصل کرنے کا طریقہ

سعادت حقیقیہ کیسے حاصل کی جائے؟ یعنی بہیمیت کو روح ربانی کے تابع کیسے کیا جائے؟ خواہش نفس پر عقل کی حکمرانی کیسے قائم کی جائے؟ اس سلسلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ کی لمبی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں انسان کو دو طرح کے کام ایک ساتھ کرنے ہوتے ہیں:

① امور معاش یعنی دنیوی مشاغل۔ یہ کام سعادت حقیقیہ کے لئے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں، بلکہ بعض مرتبہ نقصان پہنچاتے ہیں۔اس لئے ان امور میں بقدر ضرورت ہی مشغول ہونا چاہئے۔

② عبادات و ریاضات جو بہیمیت کو ملکیت کے ماتحت کرتے ہیں۔ یہ کام حقیقی نیک بختی حاصل کرنے میں مدد معاون ہیں۔اس لئے اس قسم کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے۔ان شاء اللہ سعادت حقیقیہ حاصل ہوگی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کو چونکہ دنیا میں رہ کر آخرت کی تیاری کرنی ہوتی ہے اس لئے دنیا کے جھمیلوں سے اس کو مفر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ پیدا ہی ایسا کیا ہے کہ اس کو آخرت کی تیاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سامان بھی کرنا پڑتا ہے۔اس لئے انسان کو دنیا میں دو طرح کے کام کرنے ہوتے ہیں:

① اپنی روزی روٹی کا انتظام کرنا۔لیکن اگر انسان ان کاموں میں پوری طرح مشغول ہو جائے تو وہ حقیقی نیک بختی حاصل نہیں کر سکے گا۔ دنیا اپنی ظاہری کشش کی وجہ سے سد راہ بن جائے گی خاص طور پر ناقص انسان کے لئے جو ذاتی مفادات کے لئے دنیوی کاموں میں مشغول ہوتا ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے، اسی طریقہ سے وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے، مثلاً آدمی بہادر اس وقت بنتا ہے جب مقابلوں کی نوبت آئے۔غصہ بھڑکا کر اور کشتی مار کر کوئی شخص بہادر نہیں بن سکتا، اسی طرح آدمی فصیح و بلیغ اس وقت بنتا ہے جب زبان و قلم کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملے۔ اساتذۂ سخن کا کلام اور شعلہ بیان مقرروں کی تقریریں، یاد کر کے کوئی شخص فصاحت و بلاغت میں کمال پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح دانشمند تدبیرات نافعہ اس وقت نکالتا ہے جب ضرورت پیش آتی ہے، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اور صنعت و حرفت آلات (Tools) اور مادہ کی

محتاج ہے، ان کے بغیر صنعت کار کچھ نہیں کر سکتا۔

اسی طرح حقیقی نیکی بختی حاصل کرنے کا بھی ایک طریقہ ہے، اسی ذریعہ سے نیک بختی حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہوئے کو یہ دولت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دنیا کے مشاغل دنیوی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم ہو جانے والے ہیں، وہ آخرت میں کیا کام آسکتے ہیں؟

پھر یہ ناقص انسان اگر دنیا کے جھمیل ہی میں چل بسا اور وہ فیاض و سخی تھا یعنی دنیا کی چیزوں میں اس کا دل اٹکا ہوا نہیں تھا تو وہ آخرت میں صرف نیک بختی سے عاری رہ جائے گا، اور کچھ نقصان نہ ہوگا۔ اور اگر دنیا اس کے دل میں گھر کئے ہوئے تھی تو آخرت میں اس کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا (اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آرہی ہے)

(۲) عبادتیں اور ریاضتیں کرنا یعنی فرائض و نوافل اعمال میں خوب کوشش کرنا۔ یہ کام بھی انسان کو دنیوی مشاغل کے ساتھ کرنے پڑتے ہیں یہ اعمال اس اعتبار سے ''عبادت'' کہلاتے ہیں کہ یہ ملکیت کا اقتضاء ہیں۔ عبادت کے معنی ہیں بندگی یعنی وہ اعمال جن کے ذریعہ بندہ اپنے بندہ ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے اور یہی اعمال اس اعتبار سے ''ریاضت'' کہلاتے ہیں کہ یہ بہیمیت کو رام کرتے ہیں۔ ریاضت کے معنی ہیں نفس کُشی یعنی ایسے کام کرنا جن کا ست، جوہر اور خلاصہ دو چیزیں ہوں (الف) بہیمیت کی تابعداری یعنی بہیمیت، ملکیت کے اشاروں پر عمل پیرا ہو اور بہیمیت پر ملکیت کا پوری طرح رنگ چڑھ جائے (ب) ملکیت، بہیمیت سے بری اور بیزار ہو جائے یعنی اس کا نکما رنگ ملکیت قبول نہ کرے اور جس طرح موم پر انگوٹھی کے نقوش ابھرتے ہیں ملکیت میں بہیمیت کے ردی نقوش نہ چھپیں۔

اور بہیمیت کو رام کرنے کا طریقہ: یہ ہے کہ ملکیت پوری سنجیدگی سے کوئی چیز چاہے، اور اس کی بہیمیت کی طرف وحی کرے۔ اور اس سے مطالبہ کرے اور بہیمیت اس کی تابعداری کرے، نہ سرکشی کرے نہ تعمیل حکم سے باز رہے۔ پھر اسی طرح بار بار ملکیت، بہیمیت کے سامنے اپنی خواہشات پیش کرتی رہے اور بہیمیت اس کو مانتی رہے، تا آنکہ بہیمیت اطاعت کی عادی، مشاق اور خوگر ہو جائے۔

اور بہیمیت کو سدھانے کے لئے ضروری ہے کہ ملکیت اس سے دو طرح کے کام کرائے (الف) وہ کام کرائے جن سے ملکیت کو انشراح اور بہیمیت کو انقباض اور تنگی لاحق ہو۔ اس قسم کے کام وہ ہیں جن سے عالم ملکوت کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اور عالم جبروت کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ یہ کام ملکیت کا خاصہ ہیں اور بہیمیت ان سے کوسوں دور ہے۔ پس جب ملکیت بہیمیت سے اس قسم کے کام کرائے گی تو ملکیت کو انشراح، سرور اور انبساط حاصل ہوگا۔ اور بہیمیت کو انقباض، دل گرفتگی اور تنگی لاحق ہوگی (ب) بہیمیت جو کام چاہتی ہے، جن سے وہ لذت اندوز ہوتی ہے اور نشاط جوانی میں ان کی مشتاق ہوتی ہے یعنی شہوت بطن اور شہوت فرج والے کام: ملکیت وہ کام بالکل چھوڑ دے، ان کو کرنے کی قطعاً روادار نہ ہو تو رفتہ رفتہ بہیمیت رام ہو جائے گی۔

خلاصہ: یہ ہے کہ حقیقی نیک بختی عبادتوں اور ریاضتوں کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور اگر حاصل شدہ کمال ہاتھ سے نکل جائے تو اس کو بھی دوبارہ اعمال ہی کے ذریعہ پکڑا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے مصلحت کلی بہ بانگ دُہل انسانوں کو پکارتی ہے اور تاکید کرتی ہے کہ وہ اپنے ثانوی درجہ کے کمالات میں یعنی ارتفاقات صالحہ اور صنائع عجیبہ میں بقدر ضرورت ہی مشغول ہوں اور اپنی اصل توجہ نفس کو سنوارنے کی طرف رکھیں اور وہ کام اختیار کریں جو ان کو ملأ اعلیٰ جیسا کردیں۔ اور ان میں جبروت وملکوت کے انوار کے نزول کی استعداد پیدا ہوجائے اور بہیمیت، ملکیت کے ماتحت اور فرمانبردار بن جائے۔ اور ملکیت کے تقاضے بہیمیت کے اسٹیج سے ظاہر ہونے لگیں۔

واعلم: أن الأمور التی تشتبك بالسعادة الحقيقية علی قسمين:

قسم: هو من باب ظهورِ فيض النفسِ النُّطْقِيَّةِ فی المعاش بحكم الجبلّة، ولايمكن أن يُحَصِّلَ الخُلُقَ المطلوبُ بهذا القسم، بل ربما يكون الغوصُ فی تلك الأفعال بزينتها — لاسيما بفكر جزءیٍ، كما هو شأن الناقص — ضِدَّ الكمالِ المطلوبِ، كالذی يقصد تحصيلَ الشَّجاعةِ بإثارة الغضب والمصارعة، ونحو ذلك؛ أو الفصاحةِ بمعرفة أشعار العرب وخُطَبِهم؛ والأخلاقُ لاتظهَر إلا عند مزاحماتٍ من بنی النوع؛ والارتفاقاتُ لاتُقْتَنَصُ إلا بحاجاتٍ طارئَةٍ؛ والصنائعُ لاتتم إلا بآلآتٍ ومادةٍ؛ وهذه كلُّها منقَضِية بانقضاء الحياة الدنيا؛ فإن مات الناقص فی تلك الحالة، وكان سَمَحًا، بقی عاريا عن الكمال وإن لَزِقَ بنفسه صُوَرُ هذه العَلاَقات كان الضررُ عليه أشدَّ من النفع.

وقسم: إنما روحُه هيئةُ إذعانِ البهيميةِ للملكية: بأن تَتَصَرَّف حسبَ وحيِها، وتنصبغَ بِصِبْغِهَا؛ وتَمَنُّعُ الملكيةِ منها: بأن لاتقبل ألوانَها الدنِيَّة، ولاتنطبع فيها نقوشُها الخسيسةُ، كما تنطبع نقوشُ الخاتَم فی الشمعة.

ولاسبيل إلی ذلك إلا أن تقتضی الملكيةُ شيئًا من ذاتها، وتُوحيه إلی البهيمية، وتقترحُه عليها، فتنقاد لها، ولاتبغی عليها، ولاتَتَمَنَّعُ منها، ثم تَقتضی أيضًا فتنقادُ هذه أيضًا، ثم وثم. حتی تعتادَ ذلك وتتمرَّنَ.

وهذه الأشياء التی تقتضيها هذه من ذاتها، وتُقْسَرُ عليها تلك، علی رغم أنفها، إنما يكون من جنس مافيه انشراح لهذه، وانقباض لتلك؛ وذلك كالتشبُّه بالملكوت، والتَّطَلُّع للجبروت، فإنهاخاصة الملكية، بعيدةٌ عنها البهيميةُ غايةَ البُعْد، أو يَترُكَ ماتقتضيه البهيمية، وتستلذُّه، وتشتاق إليه فی غَلَوائها؛

وهـذا القسم يسمى بالعبادات والرياضات، وهي شَرَكَاتُ تحصيلِ الفائت من الخُلُق المطلوب؛ فآل تحقيقُ المقام إلى أن السعادة الحقيقية لاتُقتنص إلا بالعبادات؛ ولذلك كانت المصلحة الكلية تُنادِي أفرادَ الإنسان من كُوَّةِ الصورة النوعية، وتأمُرُها أمرًا مؤكدا: أن تجعلَ إصلاحَ الصفات التي هي كمالٌ ثانٍ بقدر الضرورة، وأن تجعلَ غايةَ همتها ومطمحَ بصرها تهذيبَ النفس، وتَحْلِيَتَها بهيئاتٍ تجعلُها شبيهةً بما فوقها من الملأ الأعلى، مستعدَّةً لنزول ألوان الجبروت والملكوت عليها، وأن تجعلَ البهيميةَ مُذْعِنَةً للملكية، مطيعةً لها، مَنَصَّةً لظهور أحكامها.

ترجمہ: اور جان لیں کہ جو چیزیں سعادت حقیقیہ کے ساتھ خلط ملط ہیں۔ وہ دو قسم کی چیزیں ہیں:

پہلی قسم کے اعمال وہ ہیں جو فطرت کے تقاضے سے معاش میں نفس ناطقہ کے فیضان کے ظہور کے قبیل سے ہیں اور ممکن نہیں کہ مطلوبہ خلق (سعادت حقیقیہ) اس قسم (کے کاموں) کے ذریعہ حاصل کی جاسکے۔ بلکہ کبھی ان کاموں میں مشغول ہونا، ان کی ظاہری کشش کی وجہ سے —— خاص طور پر جزئی فکر یعنی ذاتی غرض سے، جیسا کہ وہ ناقص انسان کا حال ہے —— کمال مطلوب (سعادت حقیقیہ) کے منافی ہوتا ہے۔ جیسے وہ شخص جو ''بہادری'' کی تحصیل کا ارادہ کرتا ہے غصہ بھڑکا کر اور کشتی مار کر، اور اس طرح کے کاموں سے۔ یا فصاحت حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے عربوں کے اشعار اور ان کی تقریروں کے جاننے کے ذریعہ۔ اور اخلاق نہیں ظاہر ہوتے مگر ابنائے نوع کے ساتھ مزاحمتوں کے وقت۔ اور ارتفاقات شکار نہیں کئے جاتے مگر پیش آنے والی ضرورتوں کے ذریعہ۔ اور صنعتوں کی تکمیل نہیں ہوتی مگر آلات اور مادہ کے ذریعہ۔ اور یہ تمام چیزیں دنیوی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم ہوجانے والی ہیں۔ پس اگر ناقص انسان اس حال میں مر گیا اور وہ فیاض تھا تو وہ کمال سے عاری رہ جاتا ہے۔ اور اگر دنیوی تعلقات کی صورتیں اس کے نفس کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں تو نفع سے زیادہ اس کو ضرر پہنچے گا۔

اور دوسری قسم کے اعمال وہ ہیں جن کی روح (الف) بہیمیت کی ملکیت کے لئے فرمانبرداری کی شکل ہی ہے: بایں طور کہ بہیمیت، ملکیت کے اشاروں کے مطابق کام کرے۔ اور بہیمیت اس کے رنگ میں رنگ جائے (ب) اور جس کی روح ملکیت کا بہیمیت سے باز رہنا ہے بایں طور کہ ملکیت بہیمیت کا ذلیل رنگ قبول نہ کرے، اور ملکیت میں بہیمیت کے ردی نقوش نہ چھپیں، جس طرح مُہر کے نقوش موم میں چھپتے ہیں۔

اور اس کی (یعنی بہیمیت کو تابع کرنے کی) بجز اس کے کوئی راہ نہیں ہے کہ ملکیت اپنی طرف سے کچھ چاہے، اور اس کی بہیمیت کی طرف وحی کرے، اور بہیمیت سے اس کا مطالبہ کرے، پس بہیمیت، ملکیت کی تابعداری کرے، اور اس کے خلاف سرکشی نہ کرے اور اس کا حکم ماننے سے انکار نہ کرے۔ پھر ملکیت کوئی اور چیز چاہے، پس اس میں بھی بہیمیت تابعداری کرے، پھر اور پھر (یعنی وقتاً فوقتاً ملکیت اپنی چاہت بہیمیت کے سامنے پیش کرتی رہے، اور بہیمیت اس کو مانتی رہے)

یہاں تک کہ وہ اس کی (یعنی اطاعت کی) عادی ہو جائے اور مشاق ہو جائے (یعنی خوگر ہو جائے)

اور یہ چیزیں جن کو ملکیت اپنی ذات سے چاہتی ہے، اور وہ بہیمیت ان چیزوں پر مجبور کی جاتی ہے اس کی مرضی کے خلاف (الف) انہی چیزوں کے قبیل سے ہونی چاہئیں جن میں ملکیت کا انشراح ہو اور بہیمیت کا انقباض ہو، جیسے عالم ملکوت سے مشابہت پیدا کرنا اور جبروت کی طرف جھانکنا۔ پس بیشک یہ کام ملکیت کا خاصہ ہیں، بہیمیت ان سے بہت ہی دور ہے (ب) یا وہ چیزیں چھوڑ دی جائیں جن کو بہیمیت چاہتی ہے۔ اور ان سے لذت اندوز ہوتی ہے، اور جن کی اپنی نشاطِ جوانی میں مشتاق ہوتی ہے۔

اور یہ قسم عبادتیں اور ریاضتیں کہلاتی ہیں۔ اور وہ جال ہیں مطلوبہ اخلاق میں سے ہاتھ سے نکل جانے والے کو حاصل کرنے کے لئے، پس مقام (یعنی مسئلہ) کی تحقیق اس طرف لوٹی (یعنی گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا) کہ: "سعادت حقیقیہ عبادتوں کے ذریعہ ہی شکار کی جاسکتی ہے"۔ اور اسی وجہ سے مصلحت کلی (یعنی نوع انسانی کا مفاد) انسان کے افراد کو صورت نوعیہ کے روزن (سوراخ) سے پکارتی ہے، اور انہیں بے حد تاکید سے حکم دیتی ہے کہ وہ ان کمالات کی اصلاح کو جو کہ وہ ثانوی درجہ کے کمالات ہیں بقدر ضرورت گردانے۔ اور یہ کہ وہ گردانے اپنی توجہ کی آخری حد، اپنی نگاہ کے گرنے کی جگہ، نفس کے سنوارنے کو، اور اس کے مزین کرنے کو ایسی شکلوں سے جو اس کو بالائی مخلوق ملأ اعلی سے مشابہ کردیں، اس پر جبروت اور ملکوت کے رنگوں کے نزول کے لئے تیار کردیں۔ اور یہ کہ بہیمیت کو ملکیت کی فرمانبرداری، اور اس کی اطاعت شعاری اور اس کے احکام کے ظاہر ہونے کا اسٹیج بنادیں۔

ترکیب: ضِدَّ الکمال الخ یکون کی خبر ہے...... الفصاحة کا عطف الشَّجاعة پر ہے...... تَمَنَّعُ میں ایک ت محذوف ہے هذه الأشياء اور إنما یکون خبر ہے

تصحیح: سَمَحًا (صفت) مطبوعہ میں سَمْجًا (جیم کے ساتھ) ہے۔ اور حاشیہ میں اس کا ترجمہ زشت (برا) کیا ہے۔ مگر یہ تصحیف ہے تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے...... ألوان الجبروت اصل میں اکوان الجبروت ہے یہ بھی تصحیف ہے اور یہ تصحیح بھی مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

لغات: الغُلَواء: حد سے گزرنا، آغاز جوانی، نشاطِ جوانی...... کُوَّة: روزن، روشن دان، سوراخ...... المَنَصَّة: اسٹیج، اصل میں معنی ہیں: دلہن کے لئے آراستہ کیا ہوا کمرہ، شادی کے وقت میاں بیوی کے بیٹھنے کے لئے سنوارا ہوا چبوترہ۔

سعادت حقیقیہ انسان کا فطری تقاضا ہے

ہر انسان سعادت حقیقیہ کا مشتاق ہے۔ وہ اس کی طرف ایسا کھچتا ہے جیسا لوہا مقناطیس کی طرف کھچتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو نوعی تندرستی حاصل ہو یعنی اس میں کامل انسانیت پائی جاتی ہو، اور اس کا مادہ نوعی احکام کو کامل و مکمل ظاہر ہونے کا

موقع دے۔ یہ سعادت وہ اخلاق ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کی تخلیق فرمائی ہے۔ اور یہی انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ چنانچہ معتدل امتوں میں ایسے لوگ ضرور پائے جاتے ہیں جو یہ حقیقی نیک بختی حاصل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کو آخری اقبال مندی تصور کرتے ہیں۔ اور بادشاہ اور حکماء سے لے کر نیچے تک سب لوگ ان کو ''بزرگ'' تسلیم کرتے ہیں یعنی ان کو ایک ایسی نعمت حاصل کرنے میں کامیاب سمجھتے ہیں جو دنیا کی تمام سعادتوں سے بالاتر ہے، ان کو فرشتوں کے ساتھ ملنے والا اور ان کی لڑی میں پرویا ہوا تصور کرتے ہیں۔ ان سے برکتوں کے طالب ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھ پیر چومتے ہیں۔ تو کیا عرب وعجم عادتوں اور مذہبوں کے اختلاف، اور علاقوں کے دور دراز ہونے کے باوجود، کسی فطری مناسبت کے بغیر ایک چیز پر متفق ہو گئے ہیں؟ اور اتفاق بھی کیسا، فطری باتوں جیسا؟ یہ بات ناممکن ہے، اس کا ضرور کوئی فطری سبب ہے۔

علاوہ ازیں فطرت انسانی میں ملکیت موجود ہے اور مبحث اول (باب ۹) میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ جن حضرات میں ملکیت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے وہی اکابر اور بڑے مرتبہ والے ہیں۔ اور سعادت حقیقیہ ملکیت کو بلند سے بلند تر کرنے ہی کا نام ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال سعادت حقیقیہ کی تحصیل ہے۔ واللہ اعلم۔

وأفراد الإنسان عند الصحة النوعية، وتمكين المادة لظهور أحكام النوع كاملةً وافرةً: تشتاقُ إلى هذه السعادة، وتنجذب إليها انجذابَ الحديد إلى الْمَغْنَاطِيس، وذلك خُلُقٌ خلقَ الله الناس عليه، وفطرةٌ فطرهم عليها.

ولهذا ما كانت في بني آدم أمة من أهل المزاج المعتدل إلا فيها قوم من عُظمائهم يهتمُّون بتكميل هذا الخُلُق، ويرونه السعادة القصوى، ويراهم الملوكُ والحكماء فمن دونَهم فائزين بما يَجِلُّ عن سعادات الدنيا كلِّها، ملتحقين بالملائكة، مُنْخَرِطِيْنَ في سِلكهم، حتى صاروا يتبركون بهم، ويقبِّلون أيديَهم وأرجلهم؛ فهل يمكن أن يتفق عربُ الناس وعجمُهم، على اختلاف عاداتهم وأديانهم، وتباعُدِ مساكنهم وبلدانهم، على شيئ واحد، وحدةً نوعيةً، إلا لمناسبةٍ فطرية؟ كيف لا، وقد عرفتَ أن الملكية موجودة في أصل فطرة الإنسان، وعرفتَ أفاضل الناس وأساطينهم من هم؟ والله أعلم.

ترجمہ: اور انسان کے افراد نوعی تندرستی کے وقت اور مادہ کے قدرت دینے کی صورت میں نوع کے احکام کو کامل ومکمل طور پر ظاہر ہونے کی، اس نیک بختی کی طرف مشتاق ہوتے ہیں۔ اور اس کی طرف کھنچتے ہیں جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے اور یہ وہ اخلاق (خوبی) ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بندوں کی تخلیق فرمائی ہے اور یہ وہ فطرت (بناوٹ)

ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

اور اسی وجہ سے (یعنی فطری امر ہونے کی وجہ سے) انسانوں میں معتدل مزاج لوگوں کا کوئی گروہ نہیں ہے، مگر ان میں ان کے بڑوں میں سے کچھ لوگ اس اخلاق کی تکمیل کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کو سعادت کی آخری منزل تصور کرتے ہیں۔ اور بادشاہ اور دانشمند اور ان سے فروتر لوگ، اُن حضرات کو ایسی نعمت حاصل کرنے میں، جو دنیا کی تمام سعادتوں سے برتر ہے کامیاب، ملائکہ کے ساتھ ملنے والا، اور ان کی لڑی میں پرویا ہوا سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان سے برکتیں حاصل کرنے لگے ہیں، اور ان کے ہاتھ پیر چومنے لگے ہیں۔ تو کیا یہ بات ممکن ہے کہ عرب کے لوگ اور عجم کے باشندے ان کی عادتوں اور مذاہب کے اختلاف، اور ان کے مکانات اور علاقوں کے دور دراز ہونے کے باوجود ایک چیز پر، نوعی اتحاد کی طرح متفق ہو گئے ہوں بغیر کسی فطری مناسبت کے؟ فطری مناسبت کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے، درانحالیکہ آپ جان چکے ہیں کہ ملکیت انسان کی اصل فطرت میں موجود ہے اور آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ افاضل واکابر کون لوگ ہیں؟ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تصحیح: إلا لمناسبة فطرية میں إلا مخطوطہ کراچی سے بڑھایا گیا ہے۔

باب —— ۲

نیک بختی میں اختلاف درجات

اخلاق خواہ عالیہ ہوں یا سافلہ، تمام انسان اُن میں یکساں نہیں ہوتے۔ سخاوت، شجاعت امانت وغیرہ، اسی طرح بخیلی، بزدلی اور خیانت وغیرہ صفات میں لوگ متفاوت ہوتے ہیں۔ اسی طرح سعادت کے معاملہ میں بھی اختلافِ درجات پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مثال کے طور پر وصف شجاعت میں لوگوں کے چار مختلف درجات بیان فرمائے ہیں:

① بعض لوگ شجاعت سے بالکل کورے ہوتے ہیں، اور ان میں اس وصف کی قابلیت ہی نہیں ہوتی، کیونکہ ان کی فطرت میں شجاعت کے برعکس کیفیت موجود ہوتی ہے یعنی ان کے خمیر میں بزدلی شامل ہوتی ہے اور ضدین کا اجتماع ہو نہیں سکتا، پھر ان میں بہادری کیونکر پائی جائے گی، جیسے ہیجڑا اور نہایت درجہ بزدل آدمی بہادری کے جوہر سے خالی ہوتے ہیں اور یہ وصف ان کے لئے متوقع بھی نہیں ہوتا۔

② بعض لوگوں میں فی الوقت تو شجاعت موجود نہیں ہوتی، مگر محنت کر کے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر وہ بہادرانہ اقوال وافعال واحوال کی مشق وتمرین کریں، بہادروں سے یہ وصف حاصل کریں۔ بڑے بڑے بہادروں کے واقعات پڑھیں یا سنیں اور گذشتہ بہادران قوم پر جو احوال بیتے ہیں اور جس طرح وہ سختیوں میں ثابت قدم رہے ہیں اور خطرات

میں انھوں نے اقدامات کیے ہیں ان سب باتوں کو وہ یاد کریں تو رفتہ رفتہ بہادر بن سکتے ہیں۔

(۳) بعض لوگ فطری طور پر بہادر ہوتے ہیں۔ ان کا جوش اور جذبہ بار بار ابھرتا رہتا ہے۔ اگر ان کو جوانمردی کے کاموں سے روکا جائے تو ان پر بہت شاق ہوتا ہے اور وہ غصہ کے ساتھ خاموش رہتے ہیں۔ اور اگر بہادری کے کام کرنے کے لئے کہا جائے تو ان کی مثال اس بارود کی سی ہوتی ہے جس کو آگ دکھائی جائے، تو بھڑکنے میں دیر نہیں لگتی۔

(۴) بعض لوگوں میں بہادری کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس وصف کے تقاضوں کی طرف خود بخود چل پڑتے ہیں۔ اگر ان کو نہایت سختی سے کم ہمتی کے کاموں کی طرف بلایا جائے تو وہ قبول نہیں کرتے۔ بہادرانہ کارنامے انجام دینا اور اس کے مناسب حال شکلیں پیدا کرنا ان کے لئے آسان ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی ریت رواج کے محتاج ہوتے ہیں نہ ان کو جوش دلانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی لوگ بہادری کے وصف میں امام ہیں۔ ان کو کسی دوسرے امام کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اور جو لوگ بہادری میں ان سے فروتر ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان بہادروں کے طریقہ کو مضبوطی سے تھامیں، اور ان کی ریت کو دانتوں سے پکڑیں، ان کے طریقوں کی بے تکلف نقل کریں اور ان کے واقعات کو پڑھیں یا سنیں، تاکہ جتنا مقدر میں ہو بہادری کا وصف ان کو بھی حاصل ہو۔

اسی طرح نیک بختی کے تعلق سے بھی لوگوں کے چار مختلف درجات ہیں:

(۱) بعض لوگ سعادت کے وصف سے کورے ہوتے ہیں اور اس وصف کے سنورنے کی بھی ان کے لئے امید نہیں ہوتی، جیسے وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے مار ڈالا تھا، اس کی سرشت ہی میں کفر تھا۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۸ میں جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ''وہ منافقین بہرے، گونگے، اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے'' اس میں اسی قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) بعض لوگوں میں فی الحال تو وصف سعادت نہیں ہوتا، مگر کوشش کر کے وہ لوگ نیک بخت بن سکتے ہیں۔ اگر وہ سخت ریاضتیں کریں، مسلسل اعمال صالحہ کا خود کو پابند رکھیں تو وہ فائز المرام ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پر جوش دعوت اور ان سے منقول طریقوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ دنیا میں پائے جانے والے بیشتر لوگ اسی قبیل سے ہیں اور انبیا کی بعثت سے اولاً اور بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔ انہی لوگوں کی اصلاح کے لئے سلسلہ نبوت جاری کیا گیا ہے۔

(۳) بعض لوگ فطری طور پر نیک ہوتے ہیں۔ ان کے خمیر میں نیک بختی شامل ہوتی ہے۔ ان میں نیک بختی کی ترنگیں ابھرتی رہتی ہیں۔ بار بار ان میں نیک کاموں کا ولولہ اٹھتا رہتا ہے۔ مگر وہ نیک بختی کے کاموں کی تفصیلات میں کسی امام کی راہ نمائی کے محتاج ہوتے ہیں۔ نیک بختی کے بہت سے کاموں میں، ان کے مناسب شکلوں کی تشکیل میں ان لوگوں کو امام کی ضرورت پڑتی ہے۔ سورۃ النور آیت ۳۵ میں نور ہدایت کی جو مثال آئی ہے کہ ''ایک طاق میں ایک چراغ رکھا

ہے، وہ چراغ ایک قندیل میں ہے، وہ قندیل ایسا ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ، وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت کے تیل سے روشن کیا گیا ہے یعنی زیتون کا درخت، جو نہ پورب رُخ ہے نہ پچھم رُخ۔ اس کا تیل (اس قدر صاف اور سُلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ نہ بھی چھوئے تب بھی وہ خود بخود جل اٹھتا ہے'' یہ مثال اسی قسم کے لوگوں کی ہے۔ یہی لوگ اقبال مندی میں سب سے آگے بڑھنے والے ہیں۔

④ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذواتِ قدسیہ ہیں۔ اُن کے لئے وصف سعادت کے کمال تک پہنچنا اور اس کی مناسب حال شکلیں اختیار کرنا آسان ہے۔ وہ فوت شدہ کی تحصیل کا طریقہ اور موجود کو باقی رکھنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ان کو ناقص کی تکمیل کا ڈھنگ بھی معلوم ہے۔ اور وہ ان سب باتوں میں نہ کسی راہ نما کے محتاج ہیں، نہ ان کو کسی دعوت کی حاجت ہے۔ یہ حضرات اپنی فطرت کے مقتضی پر چلتے رہتے ہیں اور اس سے وہ سنتیں منظم ومتشکل ہوجاتی ہیں، جن کو لوگ یاد کرتے ہیں اور دستورِ زندگی بناتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کے معمولی کام لوہاری، زرگری، سوداگری وغیرہ تقلید (پیروی) کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتے۔ عام لوگوں کے لئے ان میں اسلاف سے منقول طریقوں کی پیروی ضروری ہوتی ہے، پھر دین اور نیک بختی کا وصف، جو باتوفیق لوگوں ہی کے حصہ میں آتا ہے، تقلید انبیاء کے بغیر کیسے ہمدست ہوسکتا ہے؟ اور یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شدید ضرورت کیوں ہے؟ اور ان کی سنتوں کی پیروی اور ان کی باتوں سے اشتغال رکھنا ضروری کیوں ہے؟ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں!

﴿باب اختلاف الناس فی السعادة﴾

اعلم أن الشَّجاعة وسائِرَ الأخلاق كما يختلف أفرادُ الإنسان فيها:

فمنهم: الفاقد الذى لايُرجى له حصولُها أبدًا، لقيام هيئةٍ مضادَّةٍ فى أصلِ جبلَّته، كالمخنَّث، وضعيفِ القلب جدًا بالسنة إلى الشجاعة.

ومنهم: الفاقد الذى يُرجى له ذلك بعد ممارسةِ أفعالٍ، وأقوالٍ، وهيئاتٍ تناسبها، وتَلَقِّىْ ذلك من أهلها، وتذكُّرِ أحاديثِ أئمتِها، وماجرى عليهم من الحوادث فى الأيام، فثبتوا فى الشدائد، وأقدموا على المهالك.

ومنهم: الذى خُلِقَ فيه أصلُ الخُلُقِ، ولاتزال تَنْبَجِسُ فيه فَلَتَاتٌ كلَّ حين، فإن أُمر بحبس نفسه عنها ضاق عليه الأمر، وسكت على غَيْظٍ، وإن أُمر بما يناسب جبلَّته كان كالكبريت يتصل به النار، فلا يتراخى احتراقُه.

ومنهم: الذى خُلق فيه الخُلُق كاملاً وافرًا، ويندفع إلى مقتضياته ضرورةً، وإن دُعى إلى

الجُبن — مثلاً— أشدَّ دعوةٍ لم يقبل، ويتيسر له الخروج إلى أفعال هذا الخُلُق والهيئات المناسبة له بالطبع، من غير رسم ولا دعوة؛ وهذا هو الإمام فى هذا الخُلُق، لايحتاج إلى إمام أصلاً، ويجب على الذين هم دونه فى الخُلُق أن يتمسكوا بسنَّته، ويَعَضُّوا بنواجذهم على رسومه، ويتكلفوا فى محاكاةِ هيئاته، ويتذكَّروا وقائعه، ليخرجوا إلى الكمال المتوقع لهم من الخُلُق، بحسب ما قدِّر لهم.

فكذلك يختلفون فى هذا الخُلُق الذى عليه مدارُ سعادتهم:

فمنهم: الفاقد الذى لايرجى صلاحُه، كالذى قتله الخضِرُ، طُبع كافرًا، وإليه الإشارة فى قوله تعالى: ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَايَرْجِعُوْنَ﴾

ومنهم: الفاقد الذى يُرجى له ذلك بعدرياضاتٍ شاقَّةٍ، وأعمالٍ دِيْمَةٍ، يؤاخذ بها نفسَه، ويحتاج إلى دعوة حثيثة من الأنبياء، وسُننٍ مأثورة منهم؛ وهؤلاء أكثر الناس وجودًا، وهم المقصودون فى البعثة أولاً وبالذات.

ومنهم: الذى رُكِّب فيه الخُلُق إجمالاً، وينبجس منه فلتاتُه، إلا أنه يحتاج فى التفصيل وتمهيد الهيئات على مايناسب الخُلُقَ فى كثير مما ينبغى، إلى إمام، وفيه قوله تعالى: ﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْئُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ النَّارُ﴾ وهم السُّبَّاق.

ومنهم: الأنبياء، يتأتى لهم الخروج إلى كمالِ هذاالخُلُقِ، واختيارِ هيئاتٍ مناسبة له، وكيفيةِ تحصيل الفائت منه، وإبقاءِ الحاضر، وإتمام الناقص من غير إمام ولادعوةٍ، فينتظم من جَريانهم فى مقتضى جبلتهم سُنَنٌ، يتذكرها الناسُ، ويتخذونها دستورًا؛ كيف، ولما كانت الحِدادةُ، والتجارة، وأمثالهما، لاتتأتى من جمهور الناس، إلا بسنن مأثورة عن أسلافهم، فما ظنك بهذه المطالب الشريفة التى لايهتدى إليها إلا الموفَّقون؟ ومن هذا الباب ينبغى أن يُعلم شدةُ الحاجة إلى الأنبياء عليهم السلام، ووجوبُ اتباع سننهم، والاشتغالُ بأحاديثهم، والله أعلم.

ترجمہ: نیک بختی میں اختلاف درجات کا بیان: جاننا چاہئے کہ بہادری اور دیگر اخلاق میں جس طرح افراد انسانی مختلف ہوتے ہیں:

پس منجملہ ازاں: (وصف شجاعت کو) ایسا گم کرنے والا ہے، جس کے لئے اس کے حصول کی کبھی امید نہیں کی جاتی، اس کی اصل فطرت میں شجاعت کے برعکس کیفیت (بزدلی) کے موجود ہونے کی وجہ سے، جیسے ہیجڑا اور وہ شخص جو بہادری کے وصف کے تعلق سے نہایت ہی کمزوردل ہے۔

اور منجملہ ازاں: (وصف شجاعت کو) ایسا گم کرنے والا ہے، جس کے لئے اس وصف کی امید ہوتی ہے۔ ایسے افعال واقوال واحوال کی ممارست (مشق) کے بعد جو وصف شجاعت کے مناسب ہوں۔ اور یہ وصف بہادروں سے حاصل کرنے کے بعد، اور بہادری کے پیشواؤں کے واقعات یاد کرنے کے بعد، اور وہ باتیں یاد کرنے کے بعد جوان حضرات پر گزشتہ زمانہ میں گزری ہیں، پس وہ سختیوں میں ثابت قدم رہے اور خطرات میں انہوں نے اقدامات کئے۔

اور منجملہ ازاں: وہ شخص ہے جس میں اصل ملکہ شجاعت پیدا کیا گیا ہے اور برابر ہر لحظہ اس کے اندر شجاعت کی ترنگیں ابھرتی رہتی ہیں پس اگر وہ حکم دیا جائے کہ وہ خود کو جوانمردی کے کاموں سے روکے تو اس پر یہ بات نہایت شاق گذرتی ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوا خاموش رہتا ہے۔ اور اگر اس کو اس کی جبلت کے مناسب حال حکم دیا جائے تو وہ اس گندھک کی طرح ہوتا ہے جس کو آگ لگتی ہے، تو اس کے بھڑکنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔

اور منجملہ ازاں: وہ شخص ہے جس میں وصف شجاعت وافر و کامل پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ اس وصف کے تقاضوں کی طرف خود بخود چلتا ہے اور اگر وہ —بطور مثال— بزدلی کی طرف نہاست سختی سے بلایا جائے تو وہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ اور اس کے لئے بغیر کسی ریت اور دعوت کے فطری طور پر آسان ہے اُس وصف (شجاعت) کے کاموں کی طرف، اور اس کے مناسب حال شکلوں کی طرف نکلنا۔ اور یہی شخص اس وصف میں ''پیشوا'' ہے اُسے قطعاً کسی دوسرے پیشوا کی ضرورت نہیں۔ اور ان لوگوں پر جو اس وصف میں اس سے فروتر ہیں واجب ہے کہ وہ اس کے طریقہ کو مضبوط تھامیں، اور اس کی ریت کو دانتوں سے پکڑیں۔ اور اس کی ہیئتوں کی بہ تکلف نقل کریں، اور اس کے واقعات کو یاد کریں، تاکہ وہ اس کمال کی طرف نکلیں جس کی ان کے لئے امید باندھی گئی ہیں، بہادری میں سے، جتنی ان کے لئے مقدر کی گئی ہے۔

پس اسی طرح لوگ مختلف ہیں اس اخلاق میں (یعنی بہیمیت کو نفس ناطقہ کا مطیع بنانے میں، اور خواہش پر عقل کی فرماں روائی قائم کرنے میں) جس پر لوگوں کی سعادت (نیک بختی) کا مدار ہے:

پس منجملہ ازاں: (وصف سعادت کو) ایسا گم کرنے والا ہے، جس کے لئے اس وصف کے سنورنے کی (یعنی حاصل ہونے کی) امید نہیں، جیسے وہ لڑکا جس کو خضرؑ نے قتل کیا تھا، وہ کافر پیدا کیا گیا تھا، اور اس قسم کی طرف اس ارشاد باری میں اشارہ ہے کہ: ''بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں لوٹیں گے''

اور منجملہ ازاں: (وصف سعادت کو) ایسا گم کرنے والا ہے جس کے لئے اس وصف کی امید ہے سخت ریاضتوں کے بعد، اور مسلسل ایسے اعمال کرنے کے بعد، جن سے وہ اپنے نفس کی داروگیر کرتا رہے۔ اور یہ شخص انبیاء کی پر جوش دعوت اور ان سے منقول سنتوں کا محتاج ہے۔ اور دنیا میں پائے جانے والے بیشتر لوگ اسی قبیل سے ہیں۔ اور بعثت انبیاء سے اولاً اور بالذات یہی لوگ مقصود ہیں۔

اور منجملہ ازاں: وہ شخص ہے جس میں اجمالاً یہ وصف ترکیب دیا گیا ہے۔ اور اس سے اس وصف کی ترنگیں ابھرتی رہتی

ہیں، مگر وہ اس وصف کی تفصیلات میں، اور اس کی شکلوں کو تیار کرنے میں اس انداز پر جو اس وصف کے مناسب ہیں، بہت سی باتوں میں جو اس وصف کے مناسب ہیں، کسی امام کا محتاج ہے، اور اسی کے حق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''اس کا تیل قریب ہے کہ روشن ہو جائے، اگرچہ اس کو آگ نے نہ چھویا ہو'' اور یہی لوگ سباق غایات ہیں۔

اور منجملہ ازاں: انبیاء ہیں۔ ان کے لئے آسان ہے (۱) اس اخلاق کے کمال کی طرف نکلنا اور اس کے مناسب حال شکلوں کو اختیار کرنا (۲) اور اس وصف میں سے جو فوت ہو جائے اس کو دوبارہ حاصل کرنے کا طریقہ نکالنا (۳) اور موجود کو باقی رکھنا (۴) اور ناقص کی تکمیل کا طریقہ اختیار کرنا۔ کسی پیشوا اور کسی دعوت کے بغیر۔ پس ان حضرات کے اپنی فطرت کے مقتضی پر چلتے رہنے سے متشکل ہوتی ہیں وہ سنتیں جن کو لوگ یاد کرتے ہیں اور جن کو دستور زندگی بناتے ہیں۔ اور لوگ ان کو دستور زندگی کیوں نہ بنائیں جبکہ لوہاری، سوداگری اور ان کے مانند کام، عام لوگوں سے حاصل نہیں ہوتے مگر ان کے اسلاف سے منقول طریقوں (کی پیروی) سے، پس آپ کا کیا خیال ہے ان شریف (نہایت اعلیٰ) مقاصد کے بارے میں، جن کی راہ باتوفیق لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں پاتا؟ اور اسی باب سے مناسب ہے کہ جان لی جائے انبیاء کی شدید ضرورت، اور ان کی سنتوں کی پیروی اور ان کی باتوں میں مشغول ہونے کا وجوب، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

الـخَلق و الخُلُق: طبعی خصلت، عادت جمع أخلاق...... **اِنْبَجَسَ الماءُ**: پانی جاری ہونا، بہنا...... **اَلْفَلْتَةُ**: غور وفکر کے بغیر کیا ہوا کام، ترنگ، جوش، ولولہ...... **الدِيْمَةُ**: مسلسل عمل، اصل معنی ہیں مسلسل بارش جس میں چمک وگرج نہ ہو...... **الحَثِيثَةُ**: تیز برانگیختہ کرنے والی **حَثَّهُ علي الأمر**: اکسانا، برانگیختہ کرنا۔

باب ــــــ ۳

تحصیل سعادت کے مختلف طریقے

بہیمیت کو روح ربانی کے تابع کرنا، خواہش نفس پر عقل کی حکمرانی قائم کرنا اور بہیمیت پر نفس ناطقہ کو اور خواہشات پر عقل کو غالب کرنا حقیقی نیک بختی ہے۔ یہ نیک بختی دو طریقوں سے حاصل کی جاسکتی ہے:

اول: نفس کشی کے ذریعہ یہ سعادت حاصل کی جائے۔ مگر یہ نہایت مشکل طریقہ ہے، نفس کو کچلنا آسان نہیں۔ اور اس طریقہ میں کامیابی کا تناسب بھی ایک فی صد سے زیادہ نہیں۔ اشراقی حکماء، مجذوب صوفیاء، سادھو سنت اور عیسائی رُہبان یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اور بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔

دوم: نفس کی اصلاح کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔ یہ ایک بے خطر راہ ہے اور اس طریقہ میں کامیابی بھی صد فی صد ہے۔ اور یہ راہ ہر کسی کے لئے آسان ہے، اس لئے انبیاء کے ذریعہ یہی طریقہ لوگوں کو سکھلایا گیا ہے، اور پہلے طریقہ کی طرف صرف اشارے کئے گئے ہیں ـــــ یہ اس باب کا خلاصہ ہے۔ اب تفصیل پیش کی جاتی ہے:

حقیقی نیک بختی دو طریقوں سے حاصل کی جاسکتی ہے:

پہلا طریقہ: آدمی بہیمیت سے بالکل جدا ہو جائے۔ خواہشات نفس کو کچل دے۔ زاہدانہ زندگی اختیار کرے۔ اور نفس بہیمی کی چاہتوں پر پانی پھیر دے تو نیک بختی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور نفس کو کچلنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی تدبیریں اختیار کرے جن سے بہیمیت کے احکام وتقاضے رُک جائیں، نفس کی تیزی ٹوٹ جائے اور اس کے علوم وحالات کی لپٹیں بجھ جائیں۔ اور جبروت یعنی ذات باری کی طرف، جو ماورائے جہات ہستی ہے، توجہ مرکوز کردے۔ اور نفس کو ایسے علوم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرے جو زمان ومکان کی قید کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ زمان ومکان کا دائرہ ہمارے اس مادی عالم تک ہے۔ پس آدمی دنیوی علوم سے دست بردار ہو کر لَاھُوْتِی (ذات وصفات کے) علوم میں پوری طرح مشغول ہو جائے اور ایسی لذتوں میں دلچسپی لینے لگے جو لذائذِ نفسانی کے قبیل سے نہیں ہیں، بلکہ روحانی لذتیں ہیں۔ اور لوگوں سے قطعاً میل جول چھوڑ دے، حتی کہ اہل وعیال کے خرخشوں سے بھی آزاد ہو جائے۔ اور انسانی مرغوبات سے بے رغبت ہو جائے اور ملکوتی رغبتوں کو اپنی رغبتیں بنالے۔ اور فقر و بیماری اور بے عزتی و بے وقاری کے جو اندیشے لوگوں کو گھیرے رہتے ہیں اُن سے بالاتر ہو جائے۔ اور انسانوں کی بستی چھوڑ کر جنگل باسی اور سنیاسی بن جائے، غرض نفس میں نفسانیت کی خو بو بھی باقی نہ چھوڑے۔ اور مرنے سے پہلے مر کر رہ جائے۔

سعادت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اشراقی حکماء اور مجذوب صوفیاء اختیار کرتے ہیں۔ اور بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ تو آخری منزل کے اشتیاق ہی میں مرجاتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں زندگی بھر آخری حد کی طرف اٹھی رہتی ہیں اور وہ یہ نمائش کرتے ہیں کہ گویا وہ آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں، حالانکہ دلّی ہنوز دوراست!

دوسرا طریقہ: آدمی بہیمیت کو باقی رکھتے ہوئے، اس کو سنوار لے اور اس کی کجی کو دور کر کے اس کو سیدھا کرلے تو نیک بختی حاصل ہوسکتی ہے۔ اور بہیمیت کو سنوارنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح گونگا آدمی اپنے اشاروں سے لوگوں کی باتوں کی نقل کرتا ہے اور جس طرح ایک مصور اپنی تصویر کے ذریعہ وجدانی کیفیات: خوف وشرمندگی وغیرہ کی منظر کشی کرتا ہے اور جس طرح مرنے والی بچے کی ماں پرسوز کلمات اور گلوگیر آواز سے اپنی دردمندی کا ایسا اظہار کرتی ہے کہ جو سنتا ہے غمگین ہو جاتا ہے۔ اور اس کی نگاہوں کے سامنے اس عورت کی مصیبت زدگی کا نقشہ گھوم جاتا ہے۔ اسی طرح قوت بہیمی سے ایسے کام کرائے جائیں جن سے نفس ناطقہ کے احوال کی ترجمانی ہوتی رہے۔ نفس ناطقہ کے احوال: پاکیزگی، نیک روی، سیر چشمی، فیاضی، بارگاہ خداوندی میں انکساری اور نیازمندی، صدق وامانت اور عدالت وغیرہ ہیں۔ پس بہیمیت سے ایسے

کام کرائے جائیں، اس کو ایسی شکلیں اختیار کرنے کا مکلف کیا جائے اور ایسے اذکار کا پابند بنایا جائے جن سے نفس ناطقہ کی مذکورہ کیفیات کی ترجمانی ہوتی رہے۔ اور ظاہر چونکہ باطن پر اثر انداز ہوتا ہے اس لئے رفتہ رفتہ نفس سنور جائے گا اور اس کی کجی دور ہو جائے گی اور وہ روح ربانی کی اطاعت قبول کرلے گا، اور یہی حقیقی نیک بختی ہے۔

﴿باب توزُّع الناس في كيفية تحصيل هذه السعادة﴾

اعلم أن هذه السعادةَ تُحَصَّلُ بوجهين:

أحدهما: ماهو كالانسلاخ عن الطبيعة البهيمية، وذلك: أن يَتمسَّكَ بالحِيَل الجالبة لركود أحكام الطبيعة، وخمود سَورتها، وانطفاء لَهَب علومها وحالاتِها، ويُقْبِلَ على التوجه التام إلى ماوراءَ الجهات من الجبروت، وقبولِ النفس لعلوم مفارقة عن الزمان والمكان بالكلية، ولذّاتٍ مباينةٍ لِلّذّاتِ المألوفةِ من كل وجهٍ، حتى يصير لايخالطُ الناسَ، ولايرغب فيما يرغبون، ولايرهب ممايرهبون، ويكون منهم على طرف شاسع، وصَقْع بعيد.

وهذا هو الذي يَرُومه المتألّهون من الحكماء، والمجذوبون من الصوفية، فوصل بعضُهم غايةَ مُداها، وقليل ماهم! وبقي آخرون مشتاقين لها، طامحين أبصارَهم إليها، متكلفين لمحاكاة هيئاتها.

وثانيهما: ما هو كالإصلاح للبهيمية، والإقامةِ لِعِوَجِهَا، مع بقاء أصلها؛ وذلك: أن يُسعى في محاكاة البهيمية ماعند النفس النُّطقية، بأفعال، وهيئات، وأذكار، ونحوها، كَمَثَلِ ما يُحاكي الأخرسُ أقوالَ الناس بإشاراته؛ والمصوِّرُ أحوالاً نفسانيةً: من الوَجَل والخَجَل بهيئات مُبْصَرَةٍ، يوجدها متعانقةً متشابكة مع تلك الأحوال؛ والثَّكْلى تَفَجُّعَهَا بكلمات وترجيعات، لايسمعها أحد إلا حَزِن، وتمثَّل عنده صورةُ التفجُّع.

ترجمہ: اِس سعادت کی تحصیل کی کیفیت میں لوگوں کے اختلاف کا بیان: جان لیں کہ یہ سعادت دو طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے:

ان میں سے ایک: وہ ہے جو گویا طبیعت بہیمیہ سے نکل جانے کی طرح ہے۔ اور وہ اس طرح کہ ایسی تدبیریں مضبوط پکڑے جو طبیعت کے احکام (تقاضوں) کے ٹھہرنے کو اور اس کی تیزی کے ختم کرنے کو، اور اس کے علوم اور اس کے حالات کی لپٹوں کے بجھنے کو کھینچنے والی ہوں۔ اور پوری طرح سے متوجہ ہو، جہات سے ماوراء ہستی یعنی جبروت کی طرف، اور نفس کے قبول کرنے کی طرف ایسے علوم کو جو زمان ومکان سے بالکلیہ جدا ہیں، اور ایسی لذتوں کی طرف جو ہر

اعتبار سے مالوف (پیاری) لذتوں سے مبائن ہیں، حتی کہ وہ لوگوں سے اختلاط قطعاً ترک کردے۔ اور اُن چیزوں کی رغبت نہ کرے جن کی لوگ رغبت کرتے ہیں۔ اور ان چیزوں سے نہ ڈرے جن سے لوگ ڈرتے ہیں۔ اور ہوجائے وہ لوگوں سے دور کنارے میں اور بعید جگہ میں۔

اور یہی وہ طریقہ ہے جس کا قصد کرتے ہیں حکماء میں سے اللہ والے بننے والے لوگ، اور صوفیاء میں سے مجذوب لوگ۔ پس ان میں سے کچھ لوگ اس طریقہ کی آخری حد کو پہنچے، اور وہ بہت کم ہیں، اور رہ گئے باقی لوگ منزل کی آخری حد کے اشتیاق میں، نگاہیں اٹھائے ہوئے آخری حد کی طرف، بہ تکلف نقل کرتے ہوئے آخری حد کی شکلوں کی۔

اور ان میں سے دوسرا طریقہ: وہ ہے جو بہیمیت کو سنوارنے اور اس کی کجی کو سیدھا کرنے کی طرح ہے۔ بہیمیت کی اصل باقی رہتے ہوئے۔ اور وہ اس طرح کہ بہیمیت سے نقل کرانے کی کوشش کی جائے اُن احوال کی جو نفس ناطقہ (روح ربانی) کے پاس ہیں، افعال واشکال واذکار وغیرہ کے ذریعہ، گونگے آدمی کے نقل کرنے کی طرح لوگوں کی باتوں کی اپنے اشاروں سے۔ اور تصویر کشی کرنے والے کے نقل کرنے کی طرح نفسانی (وجدانی) احوال کی یعنی خوف وشرمندگی کی، نظر آنے والی شکلوں کے ذریعہ، مصور ان تصویروں کو بناتا ہے اُن احوال کے ساتھ ملا جلا، خلط ملط اور بچہ فوت کرنے والی عورت کے نقل کرنے کی طرح اپنی دردمندی کو ایسے کلمات اور حلق میں آواز گھمانے کے ذریعہ کہ جو بھی اس کو سنتا ہے غمگین ہوجاتا ہے۔ اور دردمندی کا نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

لغات:

تَوَزُّع: اختلاف، اصل معنی پراگندہ ہونا...... حَصَّل الشیئَ: حاصل کرنا...... اِنْسَلَخَ عنه: نکل جانا اِنْسَلَخَ الحَیَّةُ عن قِشرِها: سانپ کا کینچلی سے نکل جانا...... الحِیَل: مفرد الحِیْلَة: تدبیر...... جَلَبَه: ہانک کر لانا، کھینچنا...... رَکَد (ن) رُکُوْدًا: ٹھہرنا...... سَوْرَة: تیزی، جوش...... شَاسِعٌ: بعید...... صَقْع: کنارہ...... تَألَّهَ: باخدا ہونا...... مَجْذوب (اسم مفعول) جَذَبَه (ض) جَذْبًا: کھینچنا الجَذب: کشش، کھچاوٹ، وہ حالات جو مجذوب فقیروں کے لئے مخصوص ہیں...... الغایة: آخری حد...... المَدیٰ: غایت، انتہا...... تَفَجُّع: اظہار درد...... رَامَ الشیئَ (ن) رَوْمًا ومَرَامًا: قصد کرنا...... ثَکِلَ (س) ثُکْلاً وثَکَلاً ابنَه: گم کرنا...... رَجَّع فی صوته: حلق میں آواز کو گھمانا، مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنا۔ اس صورت میں ترجیعات اور کلمات میں عام خاص مطلق کی نسبت ہوگی۔

تصحیح: مع بقاء اصل میں مع تعلق ہے، جو تصحیف ہے مخطوطہ کراچی سے تصحیح کی ہے...... یوجدها اصل میں اور تینوں مخطوطوں میں یجدها ہے۔ یہ تصحیح حضرت مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے...... طامحین اصل میں طامحةً تھا یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

ترکیب. من الجبروت بیان ہے ما موصولہ کا...... مشتاقین، طامحین، متکلفین احوال ہیں...... بأفعال إلخ محاکاۃ سے متعلق ہے...... مَا یُحَاکی میں ما مصدریہ ہے۔

تشریحات: (۱) جہت اشارہ حسیہ کی آخری حد کو یا حرکت مستقیمہ کی آخری حد کو کہتے ہیں۔ جہتیں چھ ہیں، دو حقیقی اور چار اضافی (تفصیل معین الفلسفہ ص ۱۲۴ میں ہے) عالم جہات اِس مادی عالم کو کہتے ہیں اور ماورائے جہات: عالم طبیعی سے آگے کی دنیا کو کہتے ہیں۔

(۲) المتألِّہ: وہ شخص جو انتہائی جدوجہد کرے اور پوری توجہ کرے اور سخت ریاضتیں کرے تاکہ اس کے باطن میں جلا، صفائی اور چمک پیدا ہو۔ اس کو اشراقی بھی کہتے ہیں۔ اشراق کے معنی ہیں چمکنا۔ ریاضتیں کرنے سے باطن روشن ہوتا ہے اس لئے اس کو اشراقی کہتے ہیں۔ یہاں فلاسفہ میں سے تارک الدنیا، تجرد کی زندگی اختیار کرنے والے لوگ مراد ہیں۔

(۳) جذب اور مجذوب کے معنی شاہ صاحب رحمہ اللہ نے التفہیمات جلد دوم تفہیم ۴۸ میں بیان کئے ہیں دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کی مراجعت کریں۔



نیک بختی حاصل کرنے کے لئے کونسا طریقہ بہتر ہے؟

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ نیک بختی حاصل کرنے کے مذکورہ دونوں طریقوں میں سے بہتر طریقہ دوسرا ہے، کیونکہ خداوند عالم نے اس عالم کے نظم وانتظام میں تین باتوں کا لحاظ رکھا ہے:

① نظام عالم کے لئے جو بہتر سے بہتر اور آسان سے آسان طریقہ ہوتا ہے وہ اختیار کیا جاتا ہے۔

② اصلاح کا وہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو عام انسانوں کے لئے مفید ہوتا ہے، اکادکا لوگوں کے لئے جو طریقہ مفید ہوتا ہے وہ نہیں اپنایا جاتا۔

③ دونوں عالم کی مصلحتیں ایک ساتھ ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا جس سے دنیا کا یا آخرت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

مذکورہ تینوں باتیں صرف دوسرے طریقے میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف ومہر سے رسولوں کو اولاً اور بالذات دوسرے طریقہ کو قائم کرنے کے لئے اور اس کی دعوت دینے کے لئے اور اس پر ابھارنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور پہلا طریقہ صرف اشارۃً بیان فرمایا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ طریقہ نہیں۔ سورۃ الحدید آیت ۲۷ میں ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا، مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ، فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

عیسائیوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کیا تھا، ہم نے اُن پر اس کو واجب نہ کیا تھا، لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا۔ سوانھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔

یعنی جس غرض سے رہبانیت ان لوگوں نے اختیار کی تھی، وہ غرض طلب رضائے حق تھی، مگر ان لوگوں نے اس کا اہتمام نہ کیا، گو وہ صورۃً راہب (تارک الدنیا) بنے رہے مگر در پردہ سب کچھ کرتے رہے اسی لئے اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ زبان زد جملہ ہے: لَارَهْبَانِيَّةَ فِي الإِسْلَامِ اسلام کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ، سرحدوں کی حفاظت، حج کرنا اور مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھنا ہے۔

پہلے طریقہ کے نقائص: نیک بختی حاصل کرنے کا پہلا طریقہ پانچ وجوہ سے موزوں نہیں:

۱- پہلے طریقے پر ہر کوئی عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ صرف لاہوتی کشش رکھنے والے حضرات ہی اس طریقہ کو اپنا سکتے ہیں اور وہ ہیں کتنے؟!

۲- پہلے طریقہ میں سخت ریاضتوں کی اور کامل یکسوئی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ایسا کرنے والے بھی بہت کم لوگ ہیں۔

۳- پہلے طریقہ سے درجۂ کمال تک وہی لوگ پہنچتے ہیں، جن کو اپنی معاش کی کچھ نہیں پڑی، نہ ان کو دنیا کی کوئی رغبت ہے اور یہ بات انسانی فطرت کے مطابق نہیں۔

۴- پہلے طریقہ کے لئے دوسرے طریقہ کی اچھی خاصی مقدار کو مقدم کرنا ضروری ہے یعنی جب دوسرے طریقے پر ریاضتیں کر کے بہیمیت کو کمزور کرلے گا تبھی اس سے پیچھا چھٹ سکے گا۔ شروع ہی سے پہلا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا، پس ایسا طریقہ اختیار کرنے میں کیا فائدہ جو خود دوسرے طریقہ کا محتاج ہو۔

۵- پہلے طریقہ میں دو مفید باتوں میں سے ایک کو ضرور چھوڑنا پڑے گا۔ یا تو ارتفاقات کو بالائے طاق رکھنا ہوگا، یا نفس کو آخرت کے لئے سنوارنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اگر اکثر لوگ پہلے طریقہ کو اپنالیں تو دنیا ویران ہوجائے اور سب لوگوں کو پہلے طریقہ کا مکلف بنانا تکلیف بالمحال کے قبیل سے ہے۔ اس لئے کہ ارتفاقات امور فطریہ جیسے ہوگئے ہیں۔ اور فطری چیزیں چھوڑی نہیں جاسکتیں۔ اور ارتفاقات کی رعایت کے ساتھ پہلے طریقے کو اپنانا ممکن نہیں ہے۔

دوسرے طریقے کی خوبیاں: اور دوسرے طریقہ سے درجۂ کمال تک خداداد فہم والے اور وہ لوگ پہنچتے ہیں جن کی ملکیت اور بہیمیت میں مصالحت ہوتی ہے۔ اور وہ خداداد فہم والے آٹھ حضرات ہیں، یعنی کامل، حکیم، خلیفہ، مؤیَّد بروح القدس۔ مُزکّی، امام، مُنذِر اور نبی (تفصیل مبحث سادس باب دوم میں ہے) یہی حضرات دین و دنیا کی ایک ساتھ قیادت

کرتے ہیں، انہیں کی آواز سنی جاتی ہے، انہی کا طریقہ قابل اتباع ہے، سابقین واصحاب یمین میں سے مصالحت والوں کا کمال اسی طریقہ میں منحصر ہے، دنیا میں انہی حضرات کی تعداد زیادہ ہے۔ اس دوسرے طریقے پر ہر کوئی ذکی وغبی، مشغول وفارغ عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ اس طریقہ میں کسی قسم کی تنگی نہیں ہے۔ یہ طریقہ نفس کی اصلاح اور اس کی کجی کو دور کرنے کے لئے کافی ہے اور آخرت کی متوقع تکالیف کو ہٹانے کے لئے بھی وافی ہے۔ کیونکہ آخرت میں ہر شخص کو ملکوتی اعمال کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ہوں گے تو نفس کو راحت پہنچے گی اور وہ مفقود ہوں گے تو نفس رنج ومحن سے دوچار ہوگا۔

ولما كان مبنى التدبير الإلٰهي في العالَم على اختيار الأقرب فالأقرب، والأسهل فالأسهل، والنظرِ إلى إصلاحِ مايجرى مجرى جملةِ أفراد النوع، دون الشاذَّة والفاذَّة، وإقامة مصالح الدارين، من غير أن يَّنْخَرِمَ نظامُ شيئ منهما: اقتضى لطفُ الله ورحمتُه أن يبعث الرسل أولاً وبالذات لإقامة الطريقة الثانية، والدعوةِ إليها، والحثِّ عليها، ويدلَّ على الأولى بإشاراتٍ التزاميةٍ، وتلويحات تضمنية، لاغيرَ، ولله الحجة البالغة.

وتفصيل ذلك: أن الأُولى إنما تتأتى من قوم ذوى تَجاذُبٍ، وقليل ماهم، وبرياضاتٍ شاقَّةٍ، وتَفَرُّغِ قوىً، وقليلٌ من يفعلها، وإنما أئمتُها قومٌ أهملوا معاشهم، ولا دعوة لهم في الدنيا، ولاتتم إلابتقديم جملةٍ صالحةٍ من الثانية، ولا يخلو من إهمال أحدى السعادتين: إصلاحِ الارتفاقات في الدنيا، وإصلاح النفس للآخرة، فلو أخذبها أكثرُ الناس خَرِبت الدنيا، ولو كُلِّفوا بها كان كالتكليف بالمحال، لأن الارتفاقاتِ صارت كالجبلة.

والثانية: إنما أئمتُها المُفَهَّمون، وذَوُو اصطلاح، وهم القائمون برياسة الدين والدنيا معاً، ودعوتُهم هي المقبولة، وسنتُهم هي المتَّبَعَة، وينحصر فيها كمالُ المصطلحين من السابقين، وأصحابِ اليمين، وهم أكثر الناس وجودًا، ويتمكن منها الذكيُّ والغبي، والمشتغل والفارغ، ولاحرج فيها، وتكفي العبدَ في استقامة نفسِه، ودفع اعوجاجها، ودفع الآلام المتوقَّعَةِ في المعاد عنها؛ إذ لكل نفسٍ أفعالٌ ملكية تتنعم بوجودها، وتتألم بفقدها.

ترجمہ: اور جب اس جہاں میں تدبیر الٰہی کا مدار قریب سے قریب تر اور آسان سے آسان تر کو اختیار کرنے پر ہے۔ اور اس چیز کو سنوارنے کی طرف نظر رکھنے پر ہے جو نوع انسانی کے تمام افراد کے لئے یکساں ہیں، نہ کہ شاذ ونادر کی اصلاح کی طرف نظر رکھنے پر، اور دارین کی مصلحتوں کو قائم کرنے پر ہے، اس کے بغیر کہ دارین میں سے کسی چیز کا نظام متاثر ہو، تو لطف الٰہی اور مہرِ خداوندی نے چاہا کہ وہ رسولوں کو اولاً اور بالذات دوسرے طریقہ کو قائم کرنے کے لئے، اور

اس کی طرف دعوت دینے کے لئے، اور اس پر ابھارنے کے لئے مبعوث فرمائیں۔ اور پہلے طریقہ کی طرف صرف التزامی اشارات اور ضمنی ایماءات سے راہ نمائی فرمائیں اور برہان کامل اللہ ہی کے لئے ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا طریقہ اُن لوگوں سے بن پڑتا ہے جو لاہوتی کشش والے ہیں، اور وہ بہت تھوڑے ہیں، اور سخت ریاضتوں اور کامل ترین یکسوئی کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اور ایسا کرنے والے بہت کم ہیں۔ اور پہلے طریقہ کے پیشوا وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی معاش کو رائیگاں کردیا ہے۔ اور ان کے لئے دنیا میں کوئی رغبت نہیں ہے اور پہلا طریقہ، دوسرے طریقے کی اچھی خاصی مقدار کو مقدم کئے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا۔ اور پہلا طریقہ دو نیک بختیوں میں سے ایک کو رائیگاں کرنے سے خالی نہیں: (۱) دنیا میں ارتفاقات کو سنوارنا (۲) اور نفس کو آخرت کے لئے سنوارنا۔۔۔ پس اگر بیشتر لوگ پہلے طریقہ کو اپنالیں تو دنیا ویران ہوجائے۔ اور اگر لوگوں کو پہلے طریقہ کا مکلّف گردانا جائے تو وہ تکلیف بالمحال کی طرح ہوگا۔ کیونکہ ارتفاقات امور فطریہ کی طرح ہوگئے ہیں۔

اور دوسرے طریقہ کے پیشوا خداداد فہم والے اور مصالحت والے حضرات ہیں۔ اور وہی دین و دنیا کی ایک ساتھ سرداری کرنے والے ہیں اور انہی کا پیغام مقبول ہے اور انہیں کا طریقہ قابل اتباع ہے، اور اسی میں سابقین اور اصحاب یمین میں سے مصالحت والے لوگوں کا کمال منحصر ہے اور دنیا میں یہی لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور اسی طریقہ پر ذکی وغبی اور مشغول و فارغ عمل پیرا ہوسکتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی تنگی نہیں۔ اور یہ طریقہ آدمی کے لئے کافی ہے، اپنے نفس کی اصلاح کے لئے اور اس کی کجی کو دور کرنے کے لئے اور نفس سے اُن تکالیف کو ہٹانے کے لئے جن کا آخرت میں اندیشہ ہے، کیونکہ ہر نفس کے لئے (آخرت میں) ایسے ملکوتی کام ہیں جن کے موجود ہونے سے نفس راحتیں پاتا ہے، اور جن کے مفقود ہونے سے نفس تکلیفیں اٹھاتا ہے۔

لغات:

مَجْرٰی: نالی، جگہ۔۔۔ الفَذّ: اکیلا، نَفْسٌ فَاذَّۃٌ: اکیلا شخص۔۔۔ اِنْخَرَمَ: پھٹ جانا، شگاف پڑ جانا۔۔۔ لَوَّحَ تَلْوِیْحًا: دور سے اشارہ کرنا۔۔۔ لَاغَیْرُ یعنی فقط۔۔۔ المُفَهَّم (اسم مفعول) فَهَّمَه: سمجھانا یہ اصطلاح ہے، مراد وہ حضرات ہیں جن کو اللہ نے دین کا خصوصی فہم عطا فرمایا ہے۔۔۔ ذُوْ: صاحب، والا، جمع ذَوُوْنَ اضافت کی وجہ سے ن گر گیا ہے۔

تشریح:

لفظ کی معنی موضوع لہ کے جز پر دلالت تضمنی کہلاتی ہے، جیسے انسان کی صرف حیوان پر دلالت۔۔۔ اور لفظ کی کسی ایسے معنی پر دلالت جو معنی موضوع لہ سے علحدہ ہوں، مگر معنی موضوع لہ سے خصوصی تعلق رکھتے ہوں، التزامی کہلاتی ہے، جیسے حاتم کی دلالت سخاوت پر۔

روحانی علوم کی تحصیل کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہے گا

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے نیک بختی حاصل کرنے کے دوسرے طریقہ کو ترجیح دی ہے، اس پر یہ شبہ پیش آسکتا ہے کہ جب آدمی دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلے گا تو خالص روحانی علوم سے کیونکر بہرہ ور ہوگا؟ روحانی احوال و مقامات اور غیر مادی علوم و معارف دنیا کی طرف التفات کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ زندگی بس یہی زندگی نہیں ہے، اس کے بعد بھی زندگیاں ہیں، قبر کی زندگی میں اور حشر کی زندگی میں جہاں دنیا کا کوئی شغل نہیں رہے گا، روحانی علوم اور تجرد کے احکام خود بخود فطری طور پر حاصل ہوں گے، اور پتہ بھی نہیں چلے گا، جیسے بچہ جوں جوں پروان چڑھتا ہے، فطری طور پر مادی علوم حاصل کرتا رہتا ہے، اگرچہ وہ کسی تعلیم گاہ میں نہ گیا ہو، اسی طرح آئندہ زندگیاں غیر شعوری طور پر روحانی علوم و معارف سے بہرہ ور کردیں گی۔ شاعر کہتا ہے:

ابھی زمانہ تیرے سامنے وہ باتیں لے آئے گا جو تو نہیں جانتا
اور تجھے وہ شخص خبریں پہنچائے گا جس کے لئے تو نے توشہ تیار نہیں کیا

خلاصہ جواب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں عام لوگوں کے لئے تمام کمالات کا حاصل کرلینا ممکن نہیں ہے۔ بہت سے کمالات اور خیر و خوبی کی بہت سی شکلیں منتظر ہوتی ہیں، وہ آئندہ حاصل ہوں گی، کیونکہ روحانی علوم و کمالات کی تحصیل کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہے گا، کبھی ختم نہ ہوگا۔

اور جہل بسیط (غیر مرکب) جس میں جہل کا ادراک ہوتا ہے، مضر نہیں، جیسے عربی اول و دوم کا طالب عالم جانتا ہے کہ میں ابھی قرآن و حدیث اور فقہ کو نہیں جانتا، آئندہ جانونگا، پس یہ نہ جاننا مضر نہیں۔ مضر جہل مرکب ہے یعنی نہیں جانتا اور نہ جاننے کو بھی نہیں جانتا۔ بلکہ اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ جہالت میں مبتلا رہتا ہے۔

غرض جہل اور جہل بسیط ایک ہیں۔ دستور العلماء میں ہے الجهل: عدمُ العلم عما من شأنه أن يكون عالماً وهو الجهل البسيط اھ غرض جب ہم دنیا میں جانتے ہیں کہ ہم بہت سے روحانی علوم نہیں جانتے، آئندہ زندگیوں میں جانیں گے تو یہ نہ جاننا مضر نہیں۔ کیونکہ یہ جہل بسیط ہے، مرکب نہیں ہے۔

أما أحكام التجرد، فَسَيُلْقِيْ إليها نَشْئَاتُ القبر، والحشر، من حيث لايدرى، بجبلتها، ولو بعدَ حينٍ، شِعْرٌ:

سَتُبدى لك الأيامُ ماكنتَ جاهلاً ويأتيك بالأخبار من لم تُزَوِّدِ

وبالجملة: فالإحاطة واستقصاءُ وجوهِ الخيرِ، كالمحال فى حق الأكثرينَ، والجهلُ البسيط غير ضارٍّ، والله أعلم.

ترجمہ: رہے مجرد ہونے کے احکام (یعنی علوم) تو ابھی قبر اور حشر کی زندگیاں (ان علوم کو) نفس کی طرف ڈالیں گی، ایسے طور سے کہ اس کو پتہ بھی نہیں چلے گا نفس کی فطرت کے تقاضے سے، گو کچھ وقت کے بعد ہو: شعر

عنقریب ظاہر کرے گا تیرے لئے زمانہ وہ باتیں جو تو نہیں جانتا

اور تیرے پاس وہ شخص خبریں لائے گا جس کے لئے تو نے توشہ تیار نہیں کیا

اور حاصل کلام یہ ہے کہ خیر کی شکلوں کا احاطہ اور استقصاء، اکثر لوگوں کے حق میں محال جیسا ہے اور جہل بسیط مضر نہیں، واللہ اعلم

لغات: تَجَرُّد: ننگا ہوا۔ یہاں مراد نفس کا حقیقۃً یا حکماً مادہ سے مجرد ہونا ہے...... النَّشْأَۃُ: زندگی، پیدائش۔ سورۃ الواقعہ آیت ۶۲ میں ہے وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولٰى...... اِسْتَقْصَى المسالۃَ: مسئلہ کی تہ کو پہنچنا۔

تشریح:

(۱) کچھ علوم وہ ہیں جو مادہ کے ساتھ آلودگی کی حالت میں حاصل نہیں ہو سکتے، جب آدمی حقیقۃً یا حکماً مادہ سے جدا ہوتا ہے اسی وقت وہ علوم حاصل ہوتے ہیں۔ یہ علوم: روحانی علوم، ملکوتی علوم، اخروی علوم، ربانی علوم، غیبی علوم وغیرہ کہلاتے ہیں، احکام التجرد سے یہی علوم مراد ہیں۔

(۲) ہر زندگی کی ایک فطرت ہے، اُس زندگی میں فطری طور پر اس کے علوم حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً بچپن اور جوانی الگ الگ زندگیاں ہیں، صغر سنی میں جوانی کے علوم حاصل نہیں ہو سکتے اور بالغ ہوتے ہی اس زندگی کے علوم واحکام آدمی کو حاصل ہو جاتے ہیں، اس طرح کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے جوانی کے علوم حاصل ہو گئے۔ اسی طرح آنے والی زندگیوں کی بھی ایک فطرت ہے، جب آدمی مرکر ان زندگیوں میں پہنچے گا تو روحانی علوم جو ان زندگیوں کے مخصوص علوم ہیں، خود بخود حاصل ہو جائیں گے اور آدمی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کب اور کیسے وہ علوم حاصل ہو گئے۔ واللہ اعلم

باب ــــــ ۴

وہ اصول جو سعادت حاصل کرنے کے طریق ثانی کی تحصیل کا مرجع ہیں

گذشتہ باب میں سعادت حقیقیہ حاصل کرنے کے دو طریقے بیان کئے گئے ہیں، ایک: نفس کشی کر کے نیک بختی حاصل کرنا۔ دوسرا: بہیمیت کو سنوار کر کے نیک بختی حاصل کرنا۔ پہلا طریقہ مشکل اور کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں ہے اور دوسرا طریقہ آسان اور پسندیدہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دوسرے طریقہ کی تعلیم دینے کے لئے مبعوث فرمایا ہے، وہ لوگوں کو اسی طریقہ کی ترغیب دیتے ہیں۔

اب اس باب میں یہ بیان ہے کہ دوسرے طریقہ سے سعادت حاصل کرنے کی راہیں اور شکلیں تو بہت ہیں سابقہ

شرائع اور قرآن وحدیث اس کی تفصیلات سے بھرے پڑے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب رحمہ اللہ کو اپنے خاص فضل سے یہ بات سمجھادی ہے کہ اس بے پناہ تفصیلات کا مرجع اور خلاصہ چار باتیں ہیں:

۱-طہارت (پاکی) ۲-اِخبات (نیازمندی) ۳-سماحت (فیاضی) ۴-عدالت (انصاف)

یہ چاروں باتیں درحقیقت نفس کی کیفیات ہیں، اور ان کے پیکر ہائے محسوس اعمال ہیں یعنی ہم جن چیزوں کو پاکی، فیاضی اور انصاف وغیرہ کہتے ہیں وہ دراصل ان کے اسباب وموجبات اور مظاہر وپیکر ہیں۔ اور شریعت انہی پر احکام جاری کرتی ہے اور انہی سے بحث کرتی ہے۔

یہ کیفیات کیسے پیدا ہوتی ہیں؟ جب روح ربانی بہیمیت کو زیردست کرلیتی ہے۔ اور خواہی نخواہی اس سے خصال مذکورہ کے مناسب حال اعمال کراتی ہے تو رفتہ رفتہ انسانی نفس (نسمہ) ان کیفیات کے ساتھ متصف ہوجاتا ہے، دیگر ملکات کا بھی یہی حال ہے مثلاً کتابت کی مہارت مسلسل لکھتے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح مذکورہ کیفیات بھی اعمال کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔

ان کیفیات کا فائدہ: یہ کیفیات ملائکہ کے احوال سے بے حد مشابہ ہیں۔ جب یہ کیفیات پیدا ہوتی ہیں تو آدمی ملکوتی صفات کا حامل ہوجاتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ لاحق ہوجاتا ہے اور ان کے سلسلہ میں منسلک ہوجاتا ہے۔

پہلی صفت: طہارت (پاکی)

پہلی صفت: طہارت ہے۔ طہارت کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ نماز وغیرہ عبادات کے لئے چابی اور لازمی شرط ہے، بلکہ وہ بذات خود بھی مطلوب ہے مسلم شریف کی حدیث میں پاکی کو آدھا ایمان قرار دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں متعدد جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب پاک وصاف رہنے والے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔

طہارت کی حقیقت: اور طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ سلیم الفطرت اور صحیح المزاج آدمی، جس کا دل ایسے سفلی تقاضوں سے فارغ ہو، جو غور وفکر میں مانع بنتے ہیں، جب نجاستوں میں آلودہ ہوتا ہے یا اس کو پیشاب پاخانہ کا سخت تقاضا ہوتا ہے یا وہ مباشرت اور اس کے مقدمات سے ابھی ابھی فارغ ہوا ہوتا ہے، تو وہ دل میں انقباض، تنگی اور گھٹن محسوس کرتا ہے اور خود کو بھاری بوجھ تلے دبا ہوا پاتا ہے۔ پھر جب وہ پاک وصاف ہوجاتا ہے یعنی ناپاکی دھوڈالتا ہے، بول وبراز سے فارغ ہوجاتا ہے، نہا دھوکر اچھے کپڑے پہن لیتا ہے اور خوشبو لگالیتا ہے تو وہ انقباض دور ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ انشراح اور سرور وانبساط محسوس کرتا ہے۔ پہلی کیفیت حدث (ناپاکی) اور دوسری طہارت (پاکی) کہلاتی ہے۔ مگر طہارت کی یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی نے اعمال طہارت روح ربانی کے تقاضے اور حکم سے کیے ہوں، محض دکھاوے کے لئے یا ریت رواج کی تقلید میں نہ کیے ہوں، کیونکہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ عبادت کی

نیت کرنے ہی سے مذکورہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

طہارت وحدث میں فرق: ہر وہ شخص جو سمجھ دار ہے اور فطرت سلیمہ رکھتا ہے اور اس کا وجدان بھی صحیح ہے، وہ طہارت وحدث کی ان دونوں کیفیتوں کے فرق کو واضح طور پر محسوس کرتا ہے اور اپنی فطرت کے تقاضے سے حدث کی حالت کو ناپسند ،اور طہارت کی حالت کو پسند کرتا ہے۔اور کم فہم آدمی جب بہیمیت کو کچھ کمزور کر لیتا ہے اور پاکی اختیار کرتا ہے اور یکسوئی سے دونوں حالتوں میں غور کرتا ہے تو وہ بھی دونوں حالتوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔

طہارت کا فائدہ: طہارت کی یہ حالت ملأ اعلی کی حالت سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ ملائکہ کے احوال میں سے یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بہیمی آلودگیوں سے پاک وصاف اور اپنی نورانی کیفیات پر شاداں وفرحاں رہتے ہیں۔ اس وجہ سے طہارت، نفس انسانی کو عملی کمال کے ساتھ متصف کرتی ہے۔

حدث کا نقصان: جب انسان ناپاکی کا خوگر ہو جاتا ہے اور ہمہ وقت گندگیوں میں لت پت رہتا ہے تو اس میں شیاطین کے وساوس قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حس باطنی سے شیاطین کو دیکھنے لگتا ہے، اس کو وحشتناک خواب نظر آتے ہیں اور اس کی روح کو ظلمت گھیر لیتی ہے اور ملعون وکمینے حیوانات اس کے سامنے متمثل ہوتے ہیں۔

طہارت کے آثار: اور جب طہارت ملکہ بن جاتی ہے، آدمی پوری طرح پاکی کا اہتمام کرنے لگتا ہے اور وہ طہارت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے تو اس میں ملائکہ کے الہامات کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، کبھی اس کو فرشتے نظر بھی آتے ہیں، اس کو اچھے اچھے خواب نظر آتے ہیں اور اس پر ملکوتی انوار ظاہر ہوتے ہیں اور پاکیزہ اور مبارک چیزیں اس کے سامنے متمثل ہوتی ہیں۔

نوٹ: طہارت وحدث کی مزید تفصیل مبحث خامس باب (۸) میں اور قسم ثانی کے ابواب الطہارت اور ابواب الاحسان کے شروع میں آئے گی۔

﴿باب الأصول التی یرجع إلیها تحصیلُ الطریقة الثانیة﴾

اعلم: أن طُرُقَ تحصیلِ السعادة علی الوجه الثانی کثیرةٌ جدًا، غیر أنی فَهَّمنی اللّٰه تعالی بفضله: أن مرجِعَها إلی خِصال أربع، تتلَبَّسُ بها البهیمیةُ متی غَطَّتْها النفسُ النطقیة، وقَسَرَتْها علی ما یناسبها، وهی أشبهُ حالات الإنسان بصفة الملأ الأعلی، مُعِدَّةٌ لِلُحوقه بهم، وانْخِراطِه فی سلکهم، وفَهَّمنی أنه إنما بُعِثَ الأنبیاء للدعوة إلیها، والحث علیها، وأن الشرائع تفصیل لها،وراجعة إلیها:

أحدها: الطهارةُ، وحقیقتُها: أن الإنسان عند سلامة فطرته،وصحةِ مزاجه، وَتَفَرُّغ قلبه من الأحوال السِّفْلیة الشاغلةِ له عن التَّدبُّر، إذا تَلَطَّخ بالنجاسات، وکان حاقبًا حاقنًا، قریبَ العهد

من الجماع ودواعيه، انقبضت نفسه، وأصابه ضِيقٌ وحُزن، ووجد نفسه في غاشية عظيمة، ثم إذا تخفف عن الأخبثين، ودلك بدنه واغتسل، ولبس أحسن ثيابه وتطيَّب، اندفع عنه ذلك الإنقباضُ، ووجد مكانه انشراحًا وسرورًا وانبساطًا، كلُّ ذلك لالِمْراءِ الناس، والحفظ على رسومهم ،بل لحكم النفس النطقية فقط؛ فالحالةُ الأولى تسمى "حدثا" والثانية: " طهارة"

والذكي من الناس، والذى يُرى منه سلامةُ أحكام النوع، وتمكينُ المادة لأحكام الصورة النوعية: يَعْرِف الحالتين متميزةً، كلّ واحدة من الأخرى،ويحب أحدهما، ويُبغض الأخرى بطبيعته؛والغبى منهم إذا أضعف شيئًا من البهيمية، ولَجّ بالطهارات والتبتّل، وتفرّغ لمعرفتهما: لابد يعرفهما، ويميز كلَّ واحدة من الأخرى.

والطهارة أشبه الصفات النسمية بحالات الملأ الأعلى، في تجرُّدها عن الألواث البهيمية، وابتهاجها بما عندها من النور، ولذلك كانت مُعِدَّةً لتلبُّس النفس بكمالها بحسب القوة العملية.

والحدث إذا تمكّن من الإنسان، وأحاط به من بين يديه ومن خلفه، أورث له استعدادا لقبول وساوس الشياطين، ورؤيتهم بحاسّة الحس المشترك، ولمناماتٍ موحشةٍ،ولظهور الظلمة عليه فيما يلي النفسَ النطقية، وتمثُّلِ الحيوانات الملعونة اللئيمة.

وإذا تمكنت الطهارةُ منه، وأحاطت به، وتَنَبَّهَ لها، وركن إليها: أورثت استعداداً لقبول إلهامات الملائكة ورؤيتها، ولمناماتٍ صالحة، ولظهور الأنوار، وتمثلِ الطيبات، والأشياء المباركة المعظّمة.

ترجمہ: اُن اصول (بنیادی باتوں) کا بیان جن کی طرف طریق ثانی کی تحصیل لوٹتی ہے (یعنی جو طریق ثانی کی تحصیل کی تفصیلات کے بنیادی نقاط ہیں) جان لیں کہ یہ طریق ثانی نیک بختی حاصل کرنے کی بہت سی راہیں ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے یہ حقیقت سمجھادی ہے کہ ان راہوں کا مرجع (یعنی بنیاد) چار باتیں ہیں۔ بہیمیت ان کے ساتھ متصف ہوتی ہے جب اس کو نفس ناطقہ مغلوب کر لیتا ہے۔اور اس کو ایسے کاموں پر مجبور کرتا ہے جو خصال اربعہ کے مناسب حال ہوتے ہیں۔اور وہ (یعنی خصال اربعہ کے ساتھ اتصاف کی) حالت آدمی کے تمام احوال میں ملأ اعلیٰ کی حالت کے ساتھ زیادہ مشابہ ہے وہ انسان کو تیار کرنے والی ہے ملأ اعلیٰ کے ساتھ ملنے کے لئے اور ان کی لڑی میں پروئے جانے کے لئے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بات بھی سمجھادی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو انہی باتوں کی طرف دعوت دینے کے لئے ،اور اُن پر ابھارنے کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔اور یہ بات بھی سمجھادی ہے کہ (منزل من السماء) شریعتیں انہی خصال اربعہ کی تفصیل ہیں اور انہیں کی طرف لوٹتی ہیں۔

پہلی صفت: طہارت ہے۔اور طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی سلیم الفطرت اور صحیح المزاج ہو،اور اس کا دل



اُن سفلی تقاضوں (جماع اور مقدمات جماع وغیرہ) سے فارغ ہو، جو اس کو (اللہ کے معاملات میں) غور وفکر کرنے سے غافل کرنے والے ہیں، جب وہ نجاستوں میں آلودہ ہوتا ہے اور اس کو پیشاب پاخانہ کا سخت تقاضا ہوتا ہے اور وہ مباشرت اور اس کے مقدمات سے ابھی ابھی فارغ ہوا ہوتا ہے تو اس کا نفس منقبض ہوتا ہے اور اس کو تنگی اور گھٹن پہنچتی ہے اور وہ خود کو بھاری مصیبت میں پاتا ہے۔ پھر جب وہ بول وبراز سے فارغ ہو جاتا ہے اور اپنا بدن رگڑتا ہے اور نہاتا ہے اور اچھے کپڑے پہن لیتا ہے اور خوشبو لگا لیتا ہے تو اس کا وہ انقباض دور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ میں وہ انشراح، سرور اور انبساط پاتا ہے، یہ سب باتیں لوگوں کو دکھانے کے لئے اور ریت رواج کی پابندی کی بناء پر نہ ہوں، بلکہ صرف نفس ناطقہ (روح ربانی) کے حکم کی اطاعت کی وجہ سے ہوں۔ پس پہلی کیفیت حدث اور دوسری طہارت کہلاتی ہے۔

اور ذہین آدمی اور وہ شخص جس سے نوعی احکام کی درستی اور مادہ کا صورت نوعیہ کے احکام کو موقع دینا محسوس کیا جاتا ہے، وہ دونوں حالتوں میں تمیز کر لیتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے سے جدا کر لیتا ہے اور وہ فطری طور پر ان میں سے ایک کو پسند کرتا ہے اور دوسری کو ناپسند کرتا ہے۔ اور کم فہم آدمی جب بہیمیت کو کچھ کمزور کرلے اور پاکیوں اور دنیا سے بے تعلقی کی مداومت کرے اور دونوں حالتوں کو پہچاننے کے لئے فارغ ہو جائے تو وہ ضرور ان کو پہچان لیتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے سے متمیز کر لیتا ہے۔

اور طہارت بشری صفات میں ملأ اعلی کے حالات سے بہت زیادہ مشابہ ہے، ان کے مجرد ہونے میں بہیمی آلودگیوں سے، اور شاداں وفرحاں رہنے میں ان نورانی کیفیات پر جو ان کو حاصل ہیں۔ اور اسی وجہ سے طہارت تیار کرنے والی ہے نفس کے متصف ہونے کو اس کے کمال کے ساتھ، قوت عملیہ کے اعتبار سے۔

اور ناپاکی (حدث) جب آدمی میں جم جاتی ہے اور وہ اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے، تو وہ اس کے اندر استعداد پیدا کرتی ہے شیطانی وساوس کو قبول کرنے کی، اور ان کو حس باطنی سے دیکھنے کی، اور وحشتناک خوابوں کی اور اس پر ظلمت ظاہر ہونے کی اس چیز میں جو نفس ناطقہ سے متصل ہے، اور ملعون اور کمینے حیوانات کے متمثل ہونے کی۔

اور طہارت جب آدمی میں جم جاتی ہے اور وہ اس کا احاطہ کر لیتی ہے، اور وہ طہارت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے تو وہ اس میں استعداد پیدا کرتی ہے ملائکہ کے الہامات کو قبول کرنے کی، اور ان کو دیکھنے کی، اور اچھے اچھے خواب دیکھنے کی، اور انوار ظاہر ہونے کی، اور پاکیزہ، مبارک اور محترم چیزوں کے متمثل ہونے کی۔

لغات:

المرجع: لوٹنے کی جگہ، بنیادی نقطہ جس کی طرف تفصیلات لوٹتی ہے...... تَلَبَّسَ به: تعلق ہونا، متصف ہونا...... غطى يغطي: ڈھانکنا...... الحَاقِبُ: وہ شخص جس کو پاخانہ کا سخت تقاضا ہو...... الحَاقِنُ: پیشاب روکنے والا...... الدَّاعِيَة: سبب جمع الدَّوَاعِي...... الغاشية: پردہ، دل کا پردہ، مصیبت جمع غَوَاشٍ...... رَاءَيْتُه مُرَاءَاةً: خلاف حقیقت دکھانا...... لَجَّ به: لازم رہنا...... التبتُّل سے عام معنی مراد ہیں یعنی انقطاع عن العلائق، خاص نساء سے بے تعلقی مراد

نہیں......فیمایلی النفس النطقیۃ یعنی ظلمت روح کو گھیرتی ہے۔

ترکیب:

عنوان میں تحصیل سے پہلے مضاف طُرق یا تفاصیل محذوف ہے...... یناسبھا کی ضمیر کا مرجع خصال اربعۃ ہیں......معدۃ کا عطف أشبہ پر اور انخراطکا لحوق پر ہے...... والذی یُری منہ إلخ عطف تفسیری ہے، یعنی ذکی یہی شخص ہے...... فی تجردھا کا تعلق أشبہ سے ہے یعنی مشابہت، ملائکہ کے اُن احوال میں ہے......اور ھا ضمیر کا مرجع الملأ الأعلی ہیں......اور النور سے مراد طہارت کی وجہ سے حاصل ہونے والا نور ہے۔

تصحیح: عن التدبُّر اصل میں عن التدبیر تھا اور علی رسومھم اصل میں علی رسومہ تھا۔ یہ تصحیفات ہیں تصحیح مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے۔

تشریحات:

(۱) حس مشترک وہ دماغی قوت ہے جو حواس ظاہرہ کی حاصل کی ہوئی صورتوں کو قبول کرتی ہے (مزید تفصیل معین الفلسفہ ص۱۴۳ میں ہے) یہاں باطنی حس مراد ہے جو تمام باطنی حواس کو شامل ہے یعنی شیاطین سر کی آنکھوں سے تو نظر نہیں آتے، مگر حواس باطنہ ان کا ادراک کرتے ہیں۔ آدمی کے خیالات شیطانی ہوجاتے ہیں۔

(۲) کمالات کی دو قسمیں ہیں: علمی اور عملی، طہارت از قبیل کمال عملی ہے جیسا کہ اخبات (اللہ کی طرف جھکاؤ) از قبیل کمال علمی ہے پس طہارت کے اہتمام سے نفس: کمال عملی کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور اخبات: کمال علمی کے ساتھ متصف کرتا ہے۔

دوسری صفت: اِخبات (نیازمندی)

دوسری بنیادی صفت اللہ تعالیٰ کے حضور میں عاجزی، فروتنی اور انکساری کرنا اور نیازمندی اور بندگی ظاہر کرنا ہے۔ یہ بھی ایک قلبی کیفیت ہے اور اس کے مظاہر ایمان لانا، اطاعت کرنا، نماز گزارنا اور ذکر وفکر میں مشغول رہنا ہیں۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ سلیم المزاج اور فارغ البال آدمی کو جب اللہ کی آیات وصفات یاد دلائی جاتی ہیں اور وہ اچھی طرح ان میں غور وفکر کرتا ہے تو روح بیدار ہوجاتی ہے، حواس وبدن اس کے سامنے منکسر ہوجاتے ہیں اور نفس ناطقہ حیرت زدہ اور درماندہ سا ہوکر رہ جاتا ہے اور اس میں عالَم قدس کی طرف میلان پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی کیفیت اخبات کہلاتی ہے، جیسے ایک عام آدمی جب دربار شاہی میں پہنچتا ہے اور بادشاہ کا جاہ وجلال دیکھتا ہے کہ خَدَم وحَشَم پَرا باندھے کھڑے ہیں، مجلس پر سناٹا چھایا ہوا ہے اور خود بادشاہ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے، تو یہ منظر دیکھ کر عام لوگوں پر ایک دہشت اور مرعوبیت طاری ہوجاتی ہے، آدمی خود کو بالکل عاجز سمجھنے لگتا ہے اور بادشاہ کو اخذ وعطا میں مختارِ کل خیال کرتا ہے۔ اخبات بھی اسی طرح کی کیفیت ہے، جو بندے میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیدا ہوتی ہے۔

اور یہ حالت بشری احوال میں سے ملائکہ کی حالت سے بہت قریب اور بے حد مشابہ ہے کیونکہ ملائکہ ہمہ وقت اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور اللہ کی عظمت کے سامنے حیران وسرگشتہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تقدس میں مستغرق رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ حالت انسان کو کمال علمی کے ساتھ متصف کرتی ہے یعنی اس میں معرفت الٰہیہ پیدا ہوتی ہے، اس کے ذہن میں علوم ربانی مرتسم ہوتے ہیں اور اس کو ''اللہ کا وصل'' نصیب ہوتا ہے اگرچہ اس کی کیفیت کے بیان سے زبان وقلم قاصر ہیں۔

نوٹ: اخبات کی انواع: زہد، قناعت، جود، تواضع وغیرہ کا بیان قسم ثانی میں ابواب الاحسان میں آئے گا۔

والثانية: الإخباتُ للّٰه تعالى، وحقيقته: أن الإنسان عند سلامته وتفرُّغه، إذا ذُكِّر بآيات اللّٰه تعالى وصفاته، وأمعن في التذكُّر: تَنَبَّهت النفس النطقية، وخضعت الحواس والجسدُ لها، وصارت كالحائرة الكليلة، ووجد ميلاً إلى جانب القدس، وكان كمثل الحالة التي تعترى السُّوقةَ بحضرة الملوك، وملاحظةِ عَجْزِ أنفسهم، واستبدادِ أولئك بالمنع والعطاء.

وهذه الحالةُ أقربُ الحالات النسمية وأشْبَهُها بحال الملأ الأعلى في توجهها إلى بارئها، وهَيَمانها في جلاله، واستغراقِها في تقديسه، ولذلك كانت معدَّةً لخروج النفس إلى كمالها العلمي، أعني؛ انتقاشَ المعرفة الإلٰهية في لوح ذهنها، واللحوقَ بتلك الحضرة، بوجه من الوجوه، وإن كانت العبارةُ تَقْصُرُ عنه.

ترجمہ: اور دوسری صفت: اللہ تعالیٰ کے سامنے نیازمندی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب سلیم وفارغ ہو، اور اس کو اللہ کی آیات وصفات یاد دلائی جائیں اور وہ خوب اچھی طرح سے ان کو یاد کرے تو نفس ناطقہ بیدار ہوجاتا ہے اور حواس وبدن اس کے سامنے فروتنی کرتے ہیں اور نفس ناطقہ حیرت زدہ، تھکا ہوا سا ہوجاتا ہے اور وہ عالَم قدس (ذات باری) کی طرف میلان پاتا ہے۔ اور آدمی ایسا ہوجاتا ہے جیسے عوام کو مرعوبیت پیش آتی ہے جب وہ بادشاہوں کے دربار میں پہنچتے ہیں اور خود کو بالکل عاجز دیکھنے لگتے ہیں اور ان کو اخذ وعطا میں مختار دیکھتے ہیں۔

اور یہ حالت بشری احوال میں ملأ اعلیٰ کی حالت سے قریب تر اور بہت زیادہ مشابہ ہے، ان کے متوجہ ہونے میں اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی عظمت میں ان کے حیران وسرگشتہ ہونے میں اور اللہ کی تقدیس وپاکی میں ان کے مستغرق ہونے میں۔ اور اسی وجہ سے یہ حالت تیار کرنے والی ہے نفس کے نکلنے کو اس کے کمال علمی کی طرف (یعنی یہ حالت آدمی میں کمال علمی کی صلاحیت پیدا کرتی ہے) میری مراد: معرفت الٰہیہ کے نقوش کا اس کے ذہن کی تختی پر مرتسم ہونا ہے۔ اور اُس بارگاہ (خداوندی) کے ساتھ کسی نہ کسی طرح الحاق ہوجانا ہے، اگرچہ اس کے بیان سے زبان وقلم قاصر ہیں۔

لغات:

خَبِــت کے معنی ہیں پست زمین اور اخبات کے لغوی معنی ہیں پست زمین کا قصد کرنا یا اس میں اترنا۔ پھر اخبات نرمی اور انکساری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ تین جگہ آیا ہے۔ سورۂ ہود آیت ۲۳ میں ہے﴿ وَأَخْبَتُــوْا اِلَـى رَبِّهِمْ﴾ (اور وہ دل سے اپنے رب کی طرف جھکے) اور سورۃ الحج آیت ۳۴ میں ہے﴿ وَبَشِّرِ الْـمُخْبِتِيْنَ﴾ (اور آپ گردن جھکا دینے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے) اور آیت ۵۴ میں ہے﴿ فَتُـخْبِتَ لَهُ قُلُوْبُهُمْ﴾ (پھر اس کی طرف ان کے دل جھک جاتے ہیں) غرض سب جگہ عاجزی کرنے اور جھکنے کے معنی ہیں۔ اخبات کے لئے قرآن کریم میں دو تعبیریں اور بھی آئی ہیں (۱)﴿ لَايَسْتَـكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ﴾ (الاعراف ۲۰۶) وہ اللہ کی بندگی سے گھمنڈ نہیں کرتے (۲)﴿يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ الـلّٰهِ﴾ (البقرۃ ۷۴) بعضے پتھر خدا کے خوف سے نیچے لڑک آتے ہیں۔ اور اخبات کا شرعی مفہوم وہ ہے جو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے...... الحَائر (اسم فاعل) حَارَ (س) حَيْرَةً وَحَيْرَانًا في الأمر: حیران ہونا...... كَلَّ (ض) كَلَالًا: تھکنا، کند ہونا، صفت كَـلِيْــلٌ...... السُوْقَة: رعیت، عوام، معمولی لوگ (واحد جمع مذکر و مؤنث کے لئے یکساں ہے)...... الهَيَمَان: محبت کی وجہ سے شیفتہ و سرگرداں آدمی هَامَ يَهِيْمُ هَيْمًا وَهَيَمَانًا بكذا: محبت کرنا۔

☆ ☆ ☆

تیسری صفت: سماحت (حوصلہ مندی اور فیاضی)

تیسری بنیادی صفت سماحت ہے، جس کی طرف نیک بختی حاصل کرنے کے طریق ثانی کی تفصیلات لوٹتی ہیں۔ سماحت کے لغوی معنی سخاوت اور فیاضی کے ہیں اور اس کی ضد بخیلی اور تنگ نظری ہے۔ یہ بھی ایک نفسانی کیفیت ہے۔ اور داد و دہش، خیر خواہی وغیرہ اعمال اس کے مظاہر ہیں۔ اور اصطلاح میں سماحت یہ ہے کہ آدمی کا نفس ایسا عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہو جائے کہ وہ بہیمیت کے تقاضوں کی پرواہ نہ کرے، نہ بہیمیت کے نقوش اس میں ابھریں، نہ بہیمیت کا میل کچیل نفس سے ملنے پائے، اس کیفیت کا نام سماحت ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آدمی دنیا کے کاموں میں مشغول ہوتا ہے، اس میں جنسی خواہشات ابھرتی ہیں، وہ عام لذتوں کے پیچھے پڑتا ہے یا کسی خاص کھانے کا مشتاق ہوتا ہے اور اس کی تحصیل میں سعی بلیغ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اُن چیزوں سے اپنی حاجت پوری کر لیتا ہے تو ضروری ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ اُن معاملات میں اس طرح مشغول ہو جائے کہ کوئی دوسری چیز قطعاً اس کے پیشِ نظر نہ رہے۔ یہی حال اس وقت ہوتا ہے جب غصہ چڑھتا ہے یا آدمی کسی چیز کی لالچ میں پھنستا ہے ـــــ پھر جب وہ حالت ختم ہو جاتی ہے تو دو صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) اگر آدمی کا نفس فیاض اور حوصلہ مند ہوتا ہے تو وہ ان معاملات سے اس طرح نکل جاتا ہے جیسے کبھی ان میں

مشغول ہوا ہی نہیں تھا وہ ان تنگ گھاٹیوں سے صاف بچ نکلتا ہے، کیونکہ دنیا اس کے دل میں بسی ہوئی نہیں ہوتی۔

(۲) اور اگر نفس فیاض نہیں ہوتا بلکہ لالچی ہوتا ہے تو دنیوی معاملات نفس کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور اس کے نقوش دل میں اس طرح ابھر آتے ہیں جس طرح موم پر مہر کے نقوش ابھر آتے ہیں۔ اس لئے وہ شخص ہر وقت انہی خیالات میں گم رہتا ہے۔ سوتے جاگتے حتی کہ نماز میں بھی اس کو وہی خیالات آتے رہتے ہیں۔

پھر جب پہلا شخص دنیا سے گذر جاتا ہے، اس کی روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے، دنیا کے تہ بہ تہ ظلمانی تعلقات سے وہ ہلکا ہو جاتا ہے اور اپنے احوال کی طرف لوٹتا ہے تو چونکہ نفس فیاض تھا اس لئے ملکیت کے برخلاف کیفیات میں سے کچھ بھی نہیں پاتا، دنیا کے جھمیل دنیا ہی میں رہ جاتے ہیں، پس اس کو انسیت محسوس ہوتی ہے اور نہایت خوش گوار زندگی حاصل ہوتی ہے۔

اور دوسرا شخص جو دنیا کا لالچی تھا مر کر بھی ظلمانی علائق سے نجات نہیں پاتا، ملکیت کے برخلاف کیفیات مرنے کے بعد بھی اس میں ابھری رہتی ہیں اس لئے اس کو وحشت محسوس ہوتی ہے اور وہ نہایت تنگی کا جینا جیتا ہے۔ مثلاً بعض لوگوں کا کوئی عمدہ مال چوری ہو جاتا ہے، پس اگر وہ سخی ہوتا ہے تو اس کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اور خسیس ہوتا ہے تو غم میں پاگل ہو جاتا ہے اور چوری شدہ مال ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔

مختلف القاب: متعلقات کے اعتبار سے سماحت اور اس کی ضد کے مختلف القاب ہیں۔ جب یہ دونوں مال سے متعلق ہوتے ہیں تو سخاوت اور شُح (حرص) کہلاتے ہیں۔ اور جب شہوت بطن اور شہوت فرج سے متعلق ہوتے ہیں تو عفت (پاکدامنی) اور شرَہ (بدنفسی) کہلاتے ہیں اور جب آسودگی، آرام طلبی اور محنت کے کاموں سے جی چرانے کے ساتھ ان کا تعلق ہوتا ہے تو صبر اور ھَلَعْ (گھبراہٹ) کہلاتے ہیں اور جب معاصی کے ساتھ ان کا تعلق ہوتا ہے تو تقوی اور فجور کہلاتے ہیں۔ باقی القاب کا بیان قسم ثانی میں ابواب الاحسان میں آئے گا۔

سماحت کا فائدہ: جب آدمی میں صفت سماحت راسخ ہو جاتی ہے یعنی ملکہ بن جاتی ہے تو نفس دنیوی خواہشات سے خالی ہو جاتا ہے، اس کو کسی چیز سے غیر معمولی دلچسپی نہیں رہتی، اس کا تعلق دنیا سے بس ضابطہ کا رہ جاتا ہے اور اس میں اعلی روحانی لذتیں حاصل کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے نیز کمالات علمی اور عملی کی اضداد کو آدمی میں پیدا ہونے سے بھی سماحت روکتی ہے، یعنی جہالت اور بے عملی سے انسان کی حفاظت کرتی ہے۔

والثالثة : السماحةُ، وحقيقتها: كونُ النفس بحيث لاتنقاد لدواعي القوة البهيمية، ولايتشبح فيها نقوشُها، ولا يلحق بها وضَرُ لونها؛ وذلك لأن النفس إذا تصرفت في أمر معاشها، وتَاقَتْ للنساء، وعافست اللذاتِ، أو قَرِمَتْ لطعام، فاجتهدت في تحصيله، حتى استوفَتْ منه حاجتَها، وكذلك إذا غَضِبَتْ، أو شَحَّتْ بشيئ، فإنها لابد في تلك الحالة تستغرق

ساعةً في هذه الكيفية، لاترفع إلى ماوراء ها النظرَ ألبتة؛ ثم إذا زالت تلك الحالةُ: فإن كانت سمحةً خرجت من تلك المضايق، كأن لم تكن فيها قطُّ، وإن كانت غير ذلك، فإنهاتشتبك معها تلك الكيفياتُ، وتتشبح كما تتشبح نقوشُ الخاتم في الشَمْعَةِ؛ فإذا فارقت الجسدَ، وتخففتْ عن العلائق الظلمانية المتراكمة، ورجعت إلى ماعندها،لم تجد شيئًا مما كان في الدنيا من مخالفاتِ الملكية، فحصل لها الأنسُ وصارت في أرغدِ عيش؛ والشحيحةُ تتمثل نقوشُها عندها كما ترى بعضَ الناس،يُسرَق منه مالٌ نفيسٌ: فإن كان سخيا لم يجد له بالاً، وإن كان ركيكَ النفس صار كالمجنون،وتمثّلتْ عنده.

والسماحة وضدُّها لهما ألقاب كثيرة، بحسب مايكونان فيه:فما كان منهما في المال يسمي سخاوة وشُحًّا،وماكان في داعية شَهوة الفرج أو البطنِ يسمي عِفَّةً وشِرَّة، وما كان في داعية الرَّفاهية والنُّبُوّ عن المشاقِ يسمي صبرًا وهَلَعًا، وماكان في داعية المعاصي الممنوعة عنها في الشرع يسمي تقوى وفجورًا.

وإذا تمكنت السماحةُ من الإنسان بقيت نفسُه عُرْيَةً عن شهوات الدنيا، واستعدت لِلَّذا ت العليّة المجردة؛ والسماحة:هيئةٌ تمنع الإنسانَ من أن يتمكن منه ضدُّ الكمال المطلوب علما وعملاً.

ترجمہ: اور تیسری صفت: سماحت ہے۔اور سماحت کی حقیقت: نفس کا ایسا ہونا ہے کہ وہ قوت بہیمی کے تقاضوں کی اطاعت نہ کرے۔اور اس میں بہیمیت کے نقوش نہ پائے جائیں۔اور اس کے ساتھ بہیمیت کے رنگ کا میل نہ ملے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نفس اپنے دنیوی معاملات میں تصرف کرتا ہے اور عورتوں کی خواہش کرتا ہے اور لذتوں کی مزاولت کرتا ہے یا کسی کھانے کا مشتاق ہوتا ہے، پھر وہ اس کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے اپنی حاجت پوری وصول کر لیتا ہے، اور اسی طرح جب نفس غضبناک ہوتا ہے یا کسی چیز کی لالچ کرتا ہے تو اس حالت میں ضروری ہے کہ نفس ایک گھڑی کیلئے اس کیفیت میں ڈوب جائے، وہ اس چیز کی طرف قطعاً نظر نہ اٹھائے جو اس کیفیت سے بلند ہے —— پھر جب وہ کیفیت زائل ہو جاتی ہے تو اگر نفس فیاض ہوتا ہے تو وہ ان تنگ گھاٹیوں سے اس طرح نکل جاتا ہے کہ وہ گویا اس میں کبھی تھا ہی نہیں —— اور اگر نفس اس کے علاوہ ہوتا ہے (یعنی دنیا کا لالچی ہوتا ہے) تو وہ دنیوی کیفیات نفس کے ساتھ گتھ جاتی ہیں۔اور وہ کیفیات پائی جاتی ہیں جیسے مہر کے نقوش موم میں پائے جاتے ہیں —— پھر جب نفس جسم سے جدا ہوتا ہے اور تہ بہ تہ تاریک تعلقات سے ہلکا ہوتا ہے اور اس چیز کی طرف لوٹتا ہے جو اس کے پاس ہے، تو وہ ملکیت کے برخلاف چیزوں میں سے جو دنیا میں تھیں کوئی چیز نہیں پاتا ہے۔پس اس کو انسیت حاصل ہوتی ہے اور اس کو نہایت خوش گوار زندگی حاصل ہو جاتی ہے —— اور دنیا کے لالچی نفس کے پاس ملکیت

کے برخلاف چیزوں کے نقوش پائے جاتے ہیں، جیسا کہ آپ بعض لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ اس کا کوئی قیمتی مال چرایا جاتا ہے، پس اگر وہ سخی ہوتا ہے تو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اور اگر وہ نفس کا کمزور ہوتا ہے تو وہ پاگل جیسا ہوجاتا ہے اور چرائی ہوئی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی ہیں۔

اور سماحت اور اس کی ضد کے لئے بہت سے القاب ہیں اُس چیز کے اعتبار سے جس میں وہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ پس جو ان میں سے مال میں پائے جاتے ہیں وہ سخاوت اور شُح کہلاتے ہیں۔ اور جو شہوت فرج اور شہوت بطن کے تقاضوں میں پائے جاتے ہیں، وہ عِفّت اور شِرَۃ (بدنفسی، حدت، تندی)) کہلاتے ہیں۔ اور جو آسودگی اور بھاری کاموں سے جی چرانے میں پائے جاتے ہیں، وہ صبر اور ھَلَع (کم ہمتی) کہلاتے ہیں۔ اور جو شریعت میں ممنوع معاصی کے تقاضوں میں پائے جاتے ہیں، وہ تقوی (پرہیزگاری) اور فجور (بدکاری) کہلاتے ہیں۔

اور سماحت جب انسان میں جم جاتی ہے تو آدمی کا نفس دنیا کی خواہشات سے خالی رہ جاتا ہے اور وہ مجرد (روحانی) اعلی لذتوں کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ اور سماحت ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کو روکتی ہے اس بات سے کہ اس میں علم اور عمل کے اعتبار سے کمال کی ضد جگہ پائے۔

لغات:

سَمُحَ (ک) سَمَاحًا وسَمَاحَۃً: فیاض وسخی ہونا...... الوَضَر: چکناہٹ کی وجہ سے میل کچیل...... تَاقَ (ن) إلیه: مشتاق ہونا...... عَافَسَهٗ: مزاولت کرنا، کسی کام کو ہمیشہ کرنا...... قَرِمَ (س) إلی اللحم: خواہشمند ہونا...... المَضِیق: تنگ جگہ، مشکل کام، گھاٹی جمع مَضَایِق...... تَرَاکَمَ الشیئُ: ڈھیر لگنا...... أرْغَدُ (اسم تفضیل) رَغِدَ (س) رَغَدًا عیشُه: آسودہ وخوش حال ہونا...... رَكُّ (ض) رِکَاکَۃً: ضعیف وکمزور ہونا الرکیك: کمزور عقل یا کمزور رائے والا، ڈھیلا ڈھالا، کم عقل کم ہمت...... نَبَا یَنْبُوْ نُبُوًّا الطبعُ عن الشیئ: نفرت کرنا...... المَشَقَّۃ: دشواری، محنت جمع مَشَاقّ...... عَرِیَ یَعْرِیْ عُرْیَۃً: ننگا ہونا، خالی ہونا۔

ترکیب: من مخالِفات الملکیۃ بیان ہے ماکان فی الدنیا میں ما کا...... والنُّبُوُّ عطف تفسیری ہے یعنی رفاہیت اور مشقتوں سے جی چرانا ایک ہی چیز ہیں...... علمًا اور عملاً، المطلوبُ سے تمیز ہیں۔

تصحیح: ثم إذا زالت اصل میں زایلت تھا۔ یہ تصحیح مولانا سندھی نے کی ہے...... تَخففت اصل میں تخفف تھا یعنی مذکر کا صیغہ تھا۔ صحیح صیغہ واحد مؤنث ہے اور ضمیر نفس کی طرف لوٹتی ہے یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

چوتھی صفت: عدالت (انصاف)

چوتھی بنیادی صفت عدالت ہے، جس کی طرف شریعت کی تفاصیل لوٹتی ہیں۔ عدالت کے معنی مساوات اور برابری

کے ہیں۔ کہا جاتا ہے عَدَلَ فلانًا بفلانٍ: فلاں کو فلاں کے برابر کیا۔ جانور کی پیٹھ پر ایک طرف کا بوجھ عِدْل کہلاتا ہے، کیونکہ وہ دوسری جانب کے بوجھ کے برابر ہوتا ہے۔ اور اِنْصَاف باب افعال کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں آدھا لینا یعنی مشترک چیز کو تقسیم کرکے اپنا آدھا حصہ لینا ــــ اور شریعت کی اصطلاح میں عدل وانصاف کے معنی ہیں إعطاءُ کلِّ ذی حقٍ حقَّــه: ہر حقدار کو اس کا حق دینا۔ اس کی ضد جَوْر (ظلم) ہے، جس کے معنی ہیں وَضْعُ الشیئِ فی غیرِ مَحَلِّـه: چیز کو بے محل رکھنا۔ غرض عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات اور جذبات وغیرہ میں ہر حقدار کو اس کا حق دینا عدل وانصاف ہے اور اس کی حق تلفی کرنا ظلم وجور ہے۔ مثلاً شرک کو سورۂ لقمان آیت ۱۳ میں بھاری ظلم کہا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ یگانہ اور بے ہمہ ہیں، ان کا کوئی ساجھی اور برابری کا نہیں، پس مخلوق کو اللہ کے برابر ٹھہرانا جو خالق ومالک ہیں کتنی بڑی ناانصافی ہے! عدل وانصاف کی بات یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کو معبود مانا جائے اور معاملات کی مثال یہ ہے کہ بعض ممتحن دریا دلی سے مستحق، غیر مستحق سب طلبہ کو پاس کردیتے ہیں، یہ ناانصافی ہے اور بعض سختی برتتے ہیں، وہ کامیابی کے مستحق کو بھی فیل کردیتے ہیں یہ بھی ظلم ہے اور بعض پرچہ دیکھے بغیر سب کو یکساں نمبر دیدیتے ہیں یہ بھی ناانصافی ہے۔ یہ گھوڑوں کو گدھوں کے برابر کرنا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ ہر طالب علم کو واجبی نمبر دیئے جائیں، اسی میں فریقین کی بھلائی ہے، بے جا رعایت طالب علم کو خود فریبی میں مبتلا کردیتی ہے اور ظلم حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ جادۂ مستقیم انصاف کی راہ ہے اسی طرح دیگر اعمال، اخلاق اور معاملات وغیرہ کو سمجھ لیں۔

اور یہ سب عدالت کی شکلیں اور اس کے مظاہر ہیں۔ اصل عدالت ایک کیفیت نفس ہے۔ جب کسی شخص میں یہ وصف پیدا ہوجاتا ہے تو اس سے ایسے اعمال صادر ہونے لگتے ہیں، جن سے گھر، خاندان، محلّہ، بستی، قبیلہ اور ملک کا نظام استوار ہوتا ہے۔ یہ ملکہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس کے مَظَانّ (مواقع) شاہ صاحب رحمہ اللہ نے کتاب کی دوسری قسم میں بـقية أبـواب الإحســان کے عنوان کے تحت بیان کئے ہیں۔ وہاں دیکھ لئے جائیں۔ وہیں عدل کی مثالیں بھی ہیں۔ غرض جب آدمی میں یہ ملکہ پیدا ہوجاتا ہے تو اس کے لئے انصاف والے کام کرنا فطری امر جیسا ہوجاتا ہے۔ اب وہ بے تکلف عدل وانصاف کرنے لگتا ہے۔

اور ملکہ بن جانے کے بعد عدالت فطری امر جیسی اس لئے ہوجاتی ہے کہ عدالت ارواح مجردہ کی جبلت اور فطرت ہے۔ اس لئے جب نفس (روح) کا مادہ (جسم) کے ساتھ اقتران ہوتا ہے، اس وقت بھی انصاف کرنا فطری نہیں، تو فطری امر جیسا ضرور ہوتا ہے۔ فطرت کا اثر اس حالت میں بھی کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے مثلاً جس شخص کی گھٹی میں بہادری اور سخاوت پڑی ہوئی ہو، جب اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو اس میں بزدلی اور بخیلی پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ اپنے کسی نواسے کو گود میں لئے ہوئے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا إنکم لَتُبَخِّلُوْنَ وتُجَبِّنُوْنَ وتُجَهِّلُوْنَ وإنکم لمن رَیْحَانِ اللہ (یقیناً تم بخیل اور بزدل بناتے اور جھگڑا کراتے ہو مگر ہو تم اللہ کا پھول!)

مگر اس حالت میں بھی فطری بہادری اور دریا دلی کچھ نہ کچھ باقی رہتی ہے، بالکلیہ زائل نہیں ہوتی۔ اسی طرح ارواح کی فطرت میں جو عدالت رچی بسی ہے، وہ جسم کے ساتھ ملنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، ختم نہیں ہوجاتی۔ البتہ کمزور پڑ جاتی ہے اس لئے فطری امر جیسی ہوتی ہے بالکل فطری نہیں رہتی۔

اور عدالت ارواح مجردہ کی جبلت اس لئے ہے کہ ملائکۃ اللہ میں جو کہ ہر طرح سے ارواح مجردہ ہیں اور اُن بشری ارواح میں جو جسمانی تعلقات سے جدا ہوگئی ہیں، اور ملائکہ کے زمرہ میں شامل ہوگئی ہیں، جیسے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ارواح، ان حضرات میں وہ باتیں مرتسم اور منقش ہوتی ہیں جو نظام عالم کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، فطری علوم کی طرح یہ باتیں ان پر ٹپکتی ہیں۔ اور نظام عالم کی صلاح وفلاح عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ خود اللہ پاک کی ایک صفت العَدْل ہے یعنی بڑے انصاف کرنے والے یعنی اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو جو اس کا حق ہے عطا فرماتے ہیں کسی کی ادنیٰ حق تلفی نہیں کرتے۔ پھر جب ''انصاف کی باتیں'' اُن حضرات پر مترشح ہوتی ہیں تو ان کی مرضیات (پسندیدگیاں) اُن کاموں کی طرف پلٹ جاتی ہیں۔ اور وہ دل سے ان باتوں کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح نظام عالم کو سنوارنے والی چیزیں یعنی عدل وانصاف کی باتیں ارواح مجردہ کی جبلت وفطرت ہوجاتی ہیں۔

اور عدالت کا فائدہ: موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ جب ارواح اجسام سے الگ ہوتی ہیں اور لوگ دنیا سے گذر جاتے ہیں، تو جن میں وصف عدالت کسی درجہ میں موجود ہوتا ہے، ان کو نہایت درجہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ان لوگوں کو ایسی روحانی لذت نصیب ہوتی ہے جو خسیس لذتوں سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ اور اگر نفس عدل وانصاف سے نہ صرف یہ کہ تہی دست ہوتا ہے، بلکہ اس کی ضد ظلم وجور اس میں جگہ پکڑے ہوئے ہوتے ہیں تو مرنے کے بعد اس پر تنگی کی جاتی ہے، وہ متوحش ہوتا ہے اور وہ دکھ اور تکلیف سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً جو لوگ متعلقین میں عدل وانصاف کرتے ہیں وہ آخرت میں عرش کے سایے میں ہوں گے اور ظلم وجور کرنے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہوں گے۔

عدالت کی اعانت ومخالفت کا ثمرہ: جب اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کو مبعوث فرماتے ہیں تاکہ وہ دین کو قائم کرے اور لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں لائے اور لوگ انصاف پر کار بند ہوں تو جو لوگ اس نور کی اشاعت کرتے ہیں، عدل وانصاف کو پھیلاتے ہیں اور اس کے لئے لوگوں میں راہ ہموار کرتے ہیں، وہ مورِد الطاف خداوندی بنتے ہیں۔ اور جو لوگ انصاف کو پھیرنے کی یعنی رد کرنے کی اور اس کو گمنام اور بے قدر کرنے کی فکر کرتے ہیں وہ ملعون ومردود ہوتے ہیں۔

عدالت کی برکت: جب آدمی انصاف پرور ہوجاتا ہے اور عدل وانصاف اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے تو اس کے درمیان اور حاملین عرش ملائکہ کے درمیان ایک نقطۂ اشتراک پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس کے درمیان اور مقربین بارگاہ خداوندی یعنی حظیرۃ القدس کے فرشتوں کے درمیان بھی اشتراک ہوجاتا ہے۔ اور ان کے درمیان فیضان کا دروازہ وا ہوجاتا ہے اور ملائکہ کے انوار کے نزول کی اس میں استعداد پیدا ہوجاتی ہے، جیسے نفس میں ملائکہ کے الہام کی اور ان

کے حکم کی تعمیل کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی طرح نزول انوار و برکات کی بھی استعداد پیدا ہوتی ہے۔اس کی نظیر یہ ہے کہ جب طالب علم ''معین مدرس'' بن جاتا ہے تو اس میں اور دیگر اساتذہ میں ایک نقطۂ اشتراک پیدا ہو جاتا ہے۔وہ بھی من وجہ مدرس شمار ہونے لگتا ہے اور اساتذہ سے کسب علم کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ بڑے اساتذہ کے الطاف کا، بہ نسبت طلباء کے زیادہ حقدار ہو جاتا ہے۔

صفات اربعہ کی اہمیت: اگر آپ مذکورہ صفات اربعہ کے تعلق سے یہ باتیں سمجھ گئے ہوں تو آپ کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۹ میں اسی کو حکمت کہا گیا ہے اور آپ کو ''دین کا فہم'' نصیب ہو گیا، جو انہی بندوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے ساتھ اللہ کو خیر منظور ہوتی ہے۔یہ مضمون حدیث متفق علیہ میں آیا ہے اور وہ چار باتیں یہ ہیں:

۱-صفات اربعہ کی حقیقت و ماہیت کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا۔

۲-صفات اربعہ کمالات علمی اور عملی کو کس طرح چاہتی ہیں، اس کو جان لینا۔

۳-صفات اربعہ کے ساتھ اتصاف آدمی کو کس طرح ملائکہ کی لڑی میں پروتا ہے، اس سے واقف ہو جانا۔

۴-ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق صفات اربعہ سے شرائع الٰہیہ کس طرح پھوٹتی ہیں اس کو سمجھ لینا۔

فطرت صفات اربعہ کا آمیزہ ہے: مذکورہ صفات اربعہ سے مرکب حالت ''فطرت'' کہلاتی ہے، اس لئے آگے صفات اربعہ کے بجائے لفظ ''فطرت'' استعمال کیا جائے گا۔اب اس مبحث کے تین مضامین باقی رہ گئے ہیں جو اگلے تین ابواب میں بیان کئے جائیں گے:

پہلے باب میں تحصیل فطرت کے اسباب بیان کئے جائیں گے ان میں سے بعض اسباب علمی ہیں اور بعض عملی۔

دوسرے باب میں وہ حجابات (پردے) ذکر کئے جائیں گے جو تحصیل فطرت میں مانع بنتے ہیں۔

تیسرے باب میں وہ تدبیریں مذکور ہیں جو اُن حجابات کو توڑتی ہیں۔

ان تین ابواب پر یہ مبحث ختم ہو جائے گا۔آپ آئندہ ابواب خوب غور سے پڑھیں، وہی اس مبحث کا نچوڑ ہیں۔

والرابعة: العدالةُ، وهي ملكة في النفس، تصدر عنها الأفعالُ التي يُقام بها نظامُ المدينة والحَيِّ بسهولة، وتكون النفسُ كالمجبول على تلك الأفاعيل؛ والسِّرُّ في ذلك: ان الملائكة والنفوس المجردة عن العلائق الجسمانية، ينطبع فيها ما أراد الله في خلق العالم من إصلاح النظام ونحوِه، فتنقلب مرضياتُها إلى ما يناسب ذلك النظامَ، فهذه طبيعة الروح المجردة؛ فإن فارقت جسدها وفيها شيئ من هذه الصفة؛ ابتهجت كلَّ الابتهاج، ووجدت سبيلاً إلى اللذة المفارقة عن اللذات الخسيسة؛ وإن فارقت وفيها ضدُّ هذه الخصلة: ضاق عليها الحالُ، وتوحَّشت وتألَّمت، فإذا بعث الله نبيا لإقامة الدين، وليُخرج الناسَ من الظلمات

إلى النور، ويقوم الناسُ بالعدل: فمن سعى في إشاعة هذا النور، ووَطَّأله في الناس كان مرحوماً، ومن سعى لردِّها وإخمالها كان ملعونامرجومًا.

وإذا تمكنت العدالةُ من الإنسان: وقع اشتراكٌ بينه وبين حَمَلَةِ العرش ومُقَرَّبِي الحضرة من الملائكة الذين هم وسائطُ نزول الجودوالبركات، وكان ذلك بابامفتوحًا بينه وبينهم، ومُعِدًّا لنزولِ ألوانهم وصِبْغِهم، بمنزلة تمكينِ النفس من إلهام الملائكة، والانبعاثِ حَسَبَهَا.

فهذه الخصال الأربع إن تَحَقَّقْتَ حقيقتَها، وفَهِمْتَ كيفيةَ اقتضائِها للكمال العلمي والعملي، وإعدادِها للانسلاك في سِلك الملائكة، وفطِنتَ كيفيةَ انشعابِ الشرائع الإلٰهية بحسَب كل عصر منها، أوتيت الخيرَ الكثير، وكنت فقيها في الدين ممن أراد الله به خيراً.

والحالة المركبة منها تسمى بالفطرة؛ وللفطرة أسبابٌ تُحَصَّلُ بها، بعضُها علمية، وبعضُها عملية، وحُجُبٌ تَصُدُّ الإنسانَ عنها، وحِيَلٌ تَكْسِرُ الحُجُبَ، ونحن نريد أن نُنَبِّهَكَ على هذه الأمور،فاستمع لما يُتْلٰى عليك، بتوفيق الله تعالى،والله أعلم.

ترجمہ: اور چوتھی صفت: عدالت ہے۔ اور عدالت نفس میں راسخ ایک کیفیت ہے، اس سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں جن سے قبیلہ اور مملکت کا نظام بہ سہولت قائم ہوتا ہے۔ اور نفس گویا ان کاموں کے کرنے پر پیدا کیا ہوا ہوتا ہے یعنی اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہوتا ہے۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ ملائکہ میں اور جسمانی تعلقات سے جدا شدہ لوگوں میں وہ باتیں چھپتی ہیں جو اللہ تعالیٰ عالَم کی تخلیق میں چاہتے ہیں یعنی نظام عالَم کی اصلاح اور اس کے مانند چیزیں۔ پس ان حضرات کی مرضیات پلٹ جاتی ہے اُن چیزوں کی طرف جو اس نظام کے مناسب ہوتی ہیں۔ پس یہ روح مجرد کی فطرت ہے —— پھر اگر روح اس کے جسم سے جدا ہوتی ہے اس حال میں کہ اس روح میں اس صفت (عدالت) میں سے کچھ ہوتا ہے تو اس کو نہایت درجہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اس لذت کی طرف راہ پالیتا ہے جو خسیس لذتوں سے جداگانہ ہے —— اور اگر نفس اس حال میں جدا ہوتا ہے کہ اس میں اس صفت کی ضد ہوتی ہے تو اس پر حالت تنگ ہوتی ہے اور وہ متوحش ہوتا ہے اور وہ دُکھی ہوتا ہے —— پھر جب اللہ تعالیٰ دین کو برپا کرنے کے لئے پیغمبر کو بھیجتے ہیں، اور تا کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے، اور لوگ انصاف پر کاربند ہوں۔ تو جو شخص اس نور کی اشاعت میں کوشش کرتا ہے، اور اس کے لئے لوگوں میں راہ ہموار کرتا ہے تو وہ مہربانی کیا ہوا ہوتا ہے۔ اور جو اس کو پھیرنے کی اور اس کو گمنام کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ملعون ومردود ہوتا ہے۔

اور جب عدالت آدمی میں راسخ ہو جاتی ہے تو اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اس میں اور حاملین عرش ملائکہ میں، اور اُن مقربین بارگاہ ملائکہ میں جو جود و برکات کے نزول میں واسطہ ہیں۔ اور یہ صفت ایک دروازہ کھول دیتی ہے اس کے اور ملائکہ کے درمیان میں، اور یہ صفت ملائکہ کے انوار والوان کے نزول کو تیار کرنے والی ہو جاتی ہے، جیسے نفس کا موقعہ دینا

ملائکہ کے الہام کو اور ان الہامات کے موافق تعمیل حکم کے لئے اٹھ کھڑا ہونا۔

پس اگر آپ ان چاروں صفتوں کی حقیقت خوب سمجھ گئے ہوں، اور ان کے کمال علمی اور عملی کو چاہنے کی کیفیت کو بھی سمجھ گئے ہوں اور ان کے ملائکہ کی لڑی میں پیروئے جانے کو تیار کرنے کی کیفیت کو بھی سمجھ گئے ہوں اور ہر زمانہ کے تقاضے کے موافق ان خصال اربعہ سے شرائع الہیہ کے نکلنے کی کیفیت کا بھی آپ نے ادراک کرلیا ہو تو آپ کو بڑی خوبی حاصل ہوگئی، اور آپ کو دین کی سمجھ مل گئی، جو انہی لوگوں کو ملتی ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے۔

اور چاروں صفتوں سے مرکب حالت ''فطرت'' کہلاتی ہے۔ اور فطرت کے لئے کچھ اسباب ہیں۔ جن کے ذریعہ اس کو حاصل کیا جاتا ہے، ان میں سے بعض علمی ہیں اور بعض عملی۔ اور کچھ حجابات ہیں جو انسان کو فطرت سے روکتے ہیں۔ اور کچھ تدبیریں ہیں جو حجابات کو توڑتی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان باتوں سے آگاہ کریں۔ پس آپ وہ باتیں سنئے جو آپ کے سامنے بہ توفیق الٰہی بیان کی جاتی ہیں واللہ اعلم

باب ـــــ ۵

خصال اربعہ کی تحصیل تکمیل، اور تلافیٔ مافات کا طریقہ

گذشتہ باب میں جن خصال اربعہ: طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت کا تذکرہ آیا ہے، اگر کسی شخص میں یہ اچھی صفات نہ پائی جاتی ہوں یا بعض نہ پائی جاتی ہوں اور وہ ان کو حاصل کرنا چاہے، یا نا تمام ہوں اور وہ ان کی تکمیل کرنا چاہے، یا وہ تھیں تو، مگر کسی وجہ سے ہاتھ سے نکل گئیں اور وہ تلافیٔ مافات کرنا چاہے تو اسکا طریقہ کیا ہے؟ اس باب میں اسی کا بیان ہے۔ یاد رہے کہ جو تحصیل کا طریقہ ہے وہی تکمیل وتلافی کا بھی ہے ـــ یہ خصال اربعہ دو تدبیروں سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ایک تدبیر علمی، دوسری تدبیر عملی۔ دونوں تدبیروں کو ایک ساتھ عمل میں لانا ضروری ہے۔ کسی ایک پر اکتفا کرنا درست نہیں۔

پہلی تدبیر علمی ہے اور تدبیر علمی کی ضرورت اس لئے ہے کہ طبیعت قُویٰ علمیہ (دل ودماغ) کی مطیع ہوتی ہے، چنانچہ خطرات کے وقت جبکہ نفس کو شرم یا خوف لاحق ہوتا ہے تو اسکی جماع اور مباشرت کی خواہش بالکل ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اسی طرح جب دل ودماغ فطرت کے مناسب حال علوم سے لبریز ہوجاتے ہیں تو خصال اربعہ نفس میں ایک امر واقعی بن جاتے ہیں۔

تدبیرِ علمی کا بیان

تدبیر علمی: اللہ تعالیٰ پر اور ان کی صفات ایجابیہ اور سلبیہ پر جزم ویقین اور اس کا استحضار ہے یعنی یہ اعتقاد رکھے کہ اس کا رب بشری کمزوریوں سے منزہ ہے۔ وہ ضعف وناتوانی، بے بسی وبے کسی اور نادانی وبے خبری سے پاک ہے۔ اس کا علم ایسا محیط ہے کہ زمین وآسمان میں ذرہ برابر چیز اس کے علم سے غائب نہیں ہوسکتی۔ تین آدمی سرگوشی کرتے ہیں تو چوتھا وہ ہوتا

ہےاور پانچ آدمی سرگوشی کرتے ہیں تو چھٹا وہ ہوتا ہے۔ وہ قادر ایسا ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ اس کے فیصلہ کو نہ کوئی روکنے والا ہے نہ کوئی پھیرنے والا۔ وہ انعام واکرام فرمانے والا ہے۔ اس نے ہمیں وجود بخشا ہے۔ اگر وہ ہمیں نیست سے ہست نہ کرتا تو کونسی طاقت تھی جو ہمیں جامہ وجود پہناتی ؟! اس نے ہمیں جسمانی اور روحانی نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اور اشرف المخلوقات بنایا۔ وہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دینے والا ہے: اگر اچھے اعمال کئے ہیں تو اچھا بدلہ دے گا۔ اور برے کرتوت کئے ہیں تو وہ ان کی سزا بھگتے گا۔ یہ مضمون ایک متفق علیہ حدیث قدسی میں آیا ہے۔ مسلم شریف بـاب قبول التوبة من الذنوب ، وإن تكررت الذنوب والتوبة ، كتاب التوبة (۷:۱۷ء۶) کی روایت اس طرح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے، ان باتوں میں جو آپ اپنے پروردگار عز اسمہ وجل جلالہ سے نقل کرتے ہیں، روایت کیا ہے کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ”میرے بندے نے ایک گناہ کیا، پس (اس نے توبہ کی اور) کہا: اے اللہ! میرا گناہ بخش دے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے نے ایک گناہ کیا پس اس نے جانا کہ اس کا ایک ایسا رب ہے جو گناہ کو معاف کرتا ہے اور گناہ پر پکڑتا ہے۔ پھر وہ لوٹا اور (دوسرا) گناہ کیا۔ پھر اس نے توبہ کی تو اللہ نے مذکورہ بات ارشاد فرمائی۔ پھر اس نے تیسری بار گناہ کیا، پھر توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرا بندہ بار بار گناہ کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا ایک ایسا رب ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور گناہ پر پکڑتا بھی ہے، تو جو چاہے کر، میں نے تیرا گناہ بخش دیا“ یعنی بندہ گناہ کے بعد سچی توبہ کرے تو پروردگار عالم بار بار گناہ بخشتے ہیں، ان کی بارگاہ، رحمت کی بارگاہ ہے، ناامیدی کی بارگاہ نہیں ہے، وہ صرف غفور ورحیم ہی نہیں ہے بلکہ اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے۔ وہ انتقام لینے والا بھی ہے۔ اس لئے ایک ساتھ دونوں باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو اللہ کی غفاریت پر تکیہ کر لیتا ہے وہ بے عملی کا شکار ہوجاتا ہے اور جو قہّاریت کا تصور جمالیتا ہے۔ وہ قُنوطیت سے دوچار ہوتا ہے اسی لئے سورۃ الحِجر (آیات ۴۹ و ۵۰) میں دونوں صفتوں کی ایک ساتھ خبر دی گئی ہے۔ ﴿نَبِّیءْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ، وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾ (آپ میرے بندوں کو اطلاع دے دیجئے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا ہوں اور میری سزا دردناک سزا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ ایسا پختہ اعتقاد ہو جو دل میں رب کی ہیبت اور غایت درجہ عظمت پیدا کرے۔ اور مچھر کے پر کے برابر بھی غیر اللہ کی نیازمندی اور خوف باقی نہ چھوڑے اور آدمی یہ اعتقاد رکھے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ پروردگار کی طرف متوجہ رہے اور اس کی بندگی کرتا رہے اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ بہترین بشری حالت فرشتوں سے مشابہت پیدا کرنا اور ان سے نزدیک ہونا ہے اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ یہ عقائد واعمال پروردگار سے قریب کرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کی یہ چیزیں پسند ہیں۔ اور یہ چیزیں بندوں پر اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا حق ہیں جس کا ایفاء ضروری ہے بات کا لب لباب یہ ہے کہ یہ جزم ویقیں ہو کہ نیک بختی خصال اربعہ کی تحصیل پر موقوف ہے اور بدبختی ان کے ترک میں ہے

چابک کی ضرورت: چابک سوار ہاتھ میں ہنٹر (Hunter) لئے رہتا ہے، جو گھوڑے کے لئے ہوّا ہوتا ہے اور بوقت

ضرورت اس سے گھوڑے کو تنبیہ بھی کی جاتی ہے، اسی طرح تدبیر علمی کے لئے بھی ایک "کوڑا" ضروری ہے۔ جو بہیمیت کو نہایت مؤثر تنبیہ کرے اور اس کو سخت ڈانٹے۔ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی راہیں اس سلسلہ میں مختلف رہی ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس سلسلہ میں بہترین چیز تذکیر بآیات اللہ نازل فرمائی گئی تھی یعنی اللہ تعالیٰ کی آیات باہرہ، صفاتِ کاملہ اور آفاقی اور انفسی نعمتوں کی یاددہانی کے ذریعہ بندوں کو نصیحت کرنا، تاکہ لوگ خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کے لائق ہیں کہ ان کے لئے دلچسپیوں کو اور مزوں کو خیرباد کہہ دیا جائے، ان کے ذکر کو ہر چیز پر ترجیح دی جائے، ان سے بے حد محبت کی جائے اور اپنی پوری کوشش سے ان کی بندگی کی جائے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تذکیر بآیات اللہ کے ساتھ تذکیر بایام اللہ کا اضافہ فرمایا گیا، اور ایامُ اللہ (اللہ کے دنوں) سے مراد جزاؤ سزا کے دن ہیں یعنی مختلف زمانوں میں فرمانبردار بندوں کو اور نافرمان لوگوں کو دنیا میں کس طرح جزاؤ سزا ملی؟ اس کو بیان کر کے لوگوں کو سمجھایا جائے تاکہ لوگ نافرمانی سے باز آئیں اور اطاعت شعاری اختیار کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کا نعمت کو نقمت سے اور نقمت کو نعمت سے بدلنا بیان کیا جائے تاکہ لوگوں کو تنبیہ ہو، دلوں میں معاصی کا خوف بیٹھ جائے اور اطاعت کا شوق پیدا ہو، مثلاً کس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرقاب کیا، اور وہ باغات، چشمے، کھیتیاں، عمدہ مکانات اور آرام کے سامان چھوڑ کر چل دیئے جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کا ان لوگوں کو وارث بنادیا جو زمین میں بالکل کمزور شمار کیے جاتے تھے اور ان کو زمین کے پورب پچھم کا مالک بنادیا؟! پھر اس قوم کو بھی جس کو سارے جہاں پر فضیلت بخشی تھی، جتلادیا کہ تم زمین میں دومرتبہ فساد پھیلاؤ گے اور بڑا زور چلانے لگو گے تو اس وقت ہم تمہاری سرکوبی کریں گے، چنانچہ ایسا ہوا اور ان کو سخت سزا دی گئی۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں یہ واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے لئے ان دو امور کے ساتھ تذکیر بالموت وما بعدہ کو ملایا یعنی قبر، حشر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کے ذریعہ لوگوں کو سمجھانا اور نیکیوں اور گناہوں کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کرنا۔ کیونکہ آدمی نفع ونقصان سوچنے کا عادی ہے۔ جب اس کو نیکی کی بھلائی اور گناہ کی خرابی معلوم ہوگی تو وہ ضرور نیکی کی طرف جھکے گا اور گناہ سے باز آئے گا۔

فائدہ: (۱) آلاء اللہ، ایام اللہ اور موت اور اس کے بعد کے واقعات کا محض جاننا کافی نہیں۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ان باتوں کو بار بار دُہرایا جائے اور مکرر سہ کرران باتوں کی یاددہانی کی جائے ہر لحظہ ان کو ملاحظہ کیا جائے، اور ہمہ وقت ان کو پیش نظر رکھا جائے، حتی کہ دل ودماغ ان مضامین سے لبریز ہوجائیں اور اعضاء ان کے مطیع ہوجائیں اسی لئے قرآن کریم میں یہ مضامین بار بار بیان کیے گئے ہیں اور ہمیشہ تلاوت کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فائدہ: (۲) مذکورہ بالا تذکیرات ثلاثہ اور دوسرے دو مضامین: علم الاحکام اور علم المخاصمہ کو ملا کر کل پانچ علوم ہوتے

ہیں جو قرآن کریم کے عمودی (مرکزی) مضامین ہیں۔

﴿باب طريقِ اكتساب هذه الخصال، وتكميلِ ناقِصِها، وردِّفائتِها﴾

اعلم: أن اكتسابَ هذه الخصالِ يكون بتدبيرين: تدبيرٍ علمي، وتدبير عملي:

أما التدبير العلمي: فإنما احْتِيجَ له، لأن الطبيعة منقادةٌ للقُوى العلمية، ولذلك ترى سقوطَ الشهوة والشبقِ عند خطور مايورث في النفس كيفيةَ الحياء أو الخوف، فمتى امتلأ علمُه بما يناسب الفطرةَ جَرَّ ذلك إلى تَحَقُّقِهَا في النفس.

وذلك: أن يعتقد أن له ربا منزَّها عن الأدناس البشرية، لايعزُب عنه مثقالُ ذرةٍ في الأرض ولافي السماء، مايكون من نجوى ثلاثة إلا هو رابعهم، ولاخمسة إلا هو سادسهم، يفعل مايشاء ويحكم مايريد، لارادَّ لقضائه، ولامانع لحكمه، مُنْعِمٌ بأصل الوجود وتوابعه من النِّعَم الجسمانية والنفسانية، مجازٍ على أعماله: إن خيرًا فخير، وإن شرًا فشر، وهو قوله تعالى: ﴿أذنب عبدى ذنبًا، فعلِم أنه له ربا يغفر الذنب، ويأخذ بالذنب: قد غفرتُ لعبدى﴾

وبالجملة: فيعتقد اعتقاداً: مؤكَّدًا مايفيد الهيبةَ وغايةَ التعظيم، وما لايُبقى ولايَذَرُ في قلبه جَنَاحَ بَعوضةٍ من إخباتِ غيره ورهبته، ويعتقد أن كمالَ الإنسان أن يتوجَّه إلى ربه ويعبُدَه، وأن أحسن حالات البشر أن يتشبه بالملائكة ويَدْنُوَ منهم، وأن هذه الأمورَ مُقَرِّبةٌ له من ربه، وأن الله تعالى ارتضى منهم ذلك، وأنه حق الله عليه لابد له من تَوْفِيَتِه؛ وبالجملة فيعلم علما لايحتمل النقيض: أن سعادته في اكتساب هذه، وأن شقاوتَه في إهمالها.

ولابد له من سوط ينبِّهُ البهيمية تنبيها قويا، ويُزْعِجُها أزعاجاً شديدا؛ واختلفت مسالك الأنبياء في ذلك: فكان عمدةُ ما أنزل الله تعالى على إبراهيم عليه السلام التذكِيْرَ بآيات الله الباهرة، وصفاتِه العُلياء، ونِعَمِهِ الآفاقية والنفسانية. حتى يصحِّح بما لامزيد عليه: أنه حقيق أن يبذلوا له الملاذَّ، وأن يُؤْثِرُوْا ذِكْرَهُ على ما سواه، وأن يحبوه حباشديدا ويعبدوه بأقصى مجهودهم؛ وضَمَّ الله معه لموسى عليه السلام التذكِيْرَ بأيام اللهِ، وهو بيان مجازاة الله تعالى للمطيعين والعصاةِ في الدنيا، وتقليبِه النعمَ والنِّقَم، حتى يتمثل في صدورهم الخوفُ عن المعاصي، ورغبةٌ قوية في الطاعات؛ وضَمَّ معهما لنبينا صلى الله عليه وسلم الإنذارَ والتبشيرَ بحوادث القبر ومابعدَه، وبيانَ خواص البر والإثم.

ولايفيد أصلُ العلم بهذه الأمور، بل لابد من تكرارها وتردادها، وملاحظتِها كلَّ حين، وجَعْلِهَا بين عينيه، حتى تمتلئ القوى العلمية بها، فتنقادُ الجوارح لها.

وهذه الثلاثةُ مع اثنين آخرين: أحدهما: بيانُ الأحكام من الواجب والحرام وغيرهما، وثانيهما: مخاصمة الكفار: فنونٌ خمسةٌ،هي عمدةُ علوم القرآن العظيم.

ترجمہ: ان صفات کو حاصل کرنے اور ان کے ناقص کی تکمیل کرنے اور ان کے فوت شدہ کو واپس لانے کے طریقہ کا بیان: جان لیں کہ ان خصلتوں کا حاصل کرنا دو تدبیروں سے ہوتا ہے: ایک تدبیر علمی اور دوسری تدبیر عملی:

رہی تدبیر علمی تو اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ طبیعت قوائے علمیہ کی مطیع ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ شہوت اور جماع کی شدید خواہش ختم ہو جاتی ہے جب کوئی ایسی بات پیش آتی ہے جو نفس میں حیا یا خوف کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ پس جب اس کا علم لبریز ہو جاتا ہے اس چیز سے جو فطرت (خصال اربعہ) کے مناسب حال ہوتی ہے تو وہ چیز کھینچتی ہے نفس میں فطرت کے امر واقعی بن جانے کی طرف۔

اور وہ (یعنی تدبیر علمی) یہ ہے کہ آدمی اعتقاد رکھے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو بشری میل کچیل سے پاک ہے۔ اس کے علم سے کوئی ذرہ برابر چیز غائب نہیں ہوتی، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو، اور نہ پانچ کی جس میں چھٹا وہ نہ ہو۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ اس کے فیصلہ کو کوئی پھیرنے والا نہیں اور اس کے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اصل وجود کے ذریعہ اور جسمانی اور روحانی نعمتوں میں سے جو نعمتیں وجود کے تابع ہیں، ان کے ذریعہ انعام فرمانے والا ہے۔ وہ آدمی کے اعمال پر بدلہ دینے والا ہے: اگر اچھے اعمال ہیں تو اچھا بدلہ دے گا، اور اگر برے اعمال ہیں تو برا بدلہ (سزا) دے گا۔ اور یہی اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''میرے بندے نے ایک گناہ کیا، پس اس نے جانا کہ اس کا ایک ایسا پروردگار ہے جو گناہ کو معاف بھی کرتا ہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے: میں نے یقیناً اپنے بندے کو بخش دیا'' (بخاری ۸: ۱۹۹ مصری)

اور حاصل کلام یہ ہے کہ وہ ایسا پختہ اعتقاد رکھے جو ہیبت اور غایت درجہ تعظیم پیدا کرے۔ اور اس کے دل میں مچھر کے پر کے برابر غیر اللہ کی نیاز مندی اور ڈر باقی نہ چھوڑے۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو، اور اس کی بندگی کرے اور یہ اعتقاد رکھے کہ بشری احوال میں بہترین حالت یہ ہے کہ وہ فرشتوں کے مشابہ بنے اور ان سے قریب ہو، اور یہ اعتقاد رکھے کہ یہ چیزیں اس کو اس کے پروردگار سے نزدیک کرنے والی ہیں۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کی یہ چیزیں پسند ہیں۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک ایسا حق ہے جس کو پورا پورا ادا کرنا ضروری ہے۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایسا جانے جس میں نقیض کا احتمال نہ ہو کہ آدمی کی نیک بختی ان صفات اربعہ کے حاصل کرنے میں ہے، اور اس کی بدبختی ان صفات کو چھوڑنے میں ہے۔

اور تدبیر علمی کے لئے کوئی ''کوڑا'' ہونا بھی ضروری ہے، جو بہیمیت کو نہایت مؤثر تنبیہ کرے، اور اس کو سخت دھتکارے۔ اور انبیاء کی راہیں اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ اور ان تعلیمات میں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام

پر نازل فرمائیں، بہترین چیز اللہ تعالیٰ کی آیات باہرہ، صفات عالیہ اور داخلی اور خارجی نعمتوں کے ذریعہ سمجھانا ہے تا کہ آدمی اس طرح تصحیح کرلے (یعنی اچھی طرح جان لے) جس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کے سزاوار ہیں کہ انسان ان کے لئے لذتوں کو خرچ کرے۔ اور یہ کہ لوگ اللہ کے ذکر کو دوسری چیزوں پر ترجیح دیں، اور یہ کہ وہ اس سے بے حد محبت کریں اور اس کی غایت درجہ کی کوشش سے بندگی کریں۔ اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس چیز کے ساتھ ایام اللہ سے سمجھانے کو ملایا۔ اور ایام اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے بدلہ دینے کا بیان ہے دنیا میں اطاعت شعاروں کو اور نافرمانوں کو۔ اور اللہ تعالیٰ کا نعمتوں اور سزاؤں کو تبدیل کرتے رہنا ہے، تا کہ لوگوں کے دلوں میں معاصی کا خوف جاگزیں ہوجائے اور طاعات کی مضبوط رغبت پیدا ہوجائے۔ اور ہمارے نبی ﷺ کے لئے ان دونوں چیزوں کے ساتھ، قبر اور اس کے بعد کے واقعات کے ذریعہ ڈرانا اور خوش خبری دینا، اور نیکی اور گناہ کی خصوصیات کی تفصیل کو ملایا۔

اور ان چیزوں کا محض جاننا مفید نہیں، بلکہ ان مضامین کو دُہرانا اور بار بار بیان کرنا، اور ان کو ہر وقت دیکھنا اور ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تا کہ قوی علمیہ ان مضامین سے بھر جائیں۔ پس جوارح قوی علمیہ کے مطیع ہوجائیں۔

اور یہ تین مضامین، دوسرے دو مضامین کے ساتھ — ایک واجب، حرام وغیرہ احکام کا بیان، دوسرے منکرین کے ساتھ مباحثہ — وہ علوم خمسہ ہیں جو علوم قرآنی کا نچوڑ ہیں۔

لغات:

تَحقُّق الخبر: ثابت ہونا، امر واقعی بننا ...... أصلُ الوجود یعنی وجود بذات خود ...... توابع الوجود یعنی وہ نعمتیں جو وجود پذیر ہونے کے بعد ملتی ہیں۔ جسمانی نعمتیں جیسے ماکولات، مشروبات، تندرستی، حسن وجمال وغیرہ اور نفسانی نعمتیں جیسے عقل وفہم، علم وادراک اور ایمان وتوفیق عمل وغیرہ۔ اور آسمان وزمین اور دیگر کائناتی نعمتیں وہ ہیں جو انسان کے وجود میں آنے سے پہلے، اس کے لئے مہیا کی گئی ہیں ...... بَهَرَهُ (ف) بَهْرًا: غالب ہونا، فضیلت میں بڑھ جانا الباهرة (اسم فاعل مؤنث) ...... أَزْعَجَ: ہٹانا، دھتکارنا ...... يُصَحِّحُ: أي يُثبِتُ حقَّ الثبوت ان الله تعالى حقيق بأن يَبذل له الملاذُ أي يتركون لذاته اللذاتِ اھ (سندی) ...... اَلْمَلَذَّة: شہوت وخواہش جمع مَلَاذّ۔

تصحیح وترکیب: ازعاجًا مفعول مطلق، اصل میں انزعاجًا (باب انفعال سے) ہے، یہ تصحیف ہے تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے ...... اس عبارت میں تین جگہ حتی بیانِ علت کے لئے ہے، غایت کے لئے نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

تدبیر عملی کا بیان

تحصیل فطرت کی تدبیر عملی یہ ہے کہ آدمی ایسی شکلیں، ایسے اعمال اور ایسی چیزیں اختیار کرے جو نفس کو مطلوبہ صفت

یاد دلاتی رہیں، اور چوکنا کرتی رہیں۔ اور مطلوبہ صفت کی تحصیل پر نفس کو برانگیختہ کرتی رہیں، اور ابھارتی رہیں۔ اس وجہ سے کہ امورِ مذکورہ میں اور صفت مطلوبہ میں ''تلازم عادی'' ہے یعنی جب بھی امورِ مذکورہ انجام دیئے جاتے ہیں تو صفت مطلوبہ حاصل ہوجاتی ہے۔ یا کسی فطری مناسبت کی وجہ سے امورِ مذکورہ، صفت مطلوبہ کے ملنے کی جگہ ہیں یعنی ظن غالب یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ کام کرنے سے صفت مطلوبہ حاصل ہوگی، جیسے:

① جب کوئی شخص اپنے اندر غیظ وغضب کی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس گالی گلوچ کو یاد کرتا ہے جو اس کے مخالف نے دی ہے، نیز اس سے جو عار اور ذلت اس کو پہنچی ہے اس کو یاد کرتا ہے تو غصہ بھڑک اٹھتا ہے، کیونکہ ان کے درمیان تلازم عادی ہے یعنی عادۃً یہ چیزیں یاد کرنے سے غصہ آجاتا ہے۔

② ماتم کرنے والی عورت جب اپنی مصیبت زدگی کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہے تو میت کے محاسن کو یاد کرتی ہے اور خیالات کے گھڑ سوار اور پیادے یعنی ہر طرح کے خیالات میت کی خوبیوں کی طرف بھیجتی ہے اور سوچ سوچ کر اس کے گُن یاد کرتی ہے تو رو پڑتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں چیزوں میں تلازم عادی ہے۔

③ جو شخص جماع کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مباشرت کے مقدمات اور دواعی کو اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ دواعی فطرت کے تقاضے سے جماع کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، اگر کوئی ان کو جمع کرنا چاہے تو بہ سہولت کرسکتا ہے، اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اس لئے ہم انہی تین مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ وہ اَشکال واعمال اور وہ اسباب کیا ہیں جن کے ذریعہ اُن صفات اربعہ کو حاصل کیا جاسکتا ہے؟ تو اس سلسلہ میں ذوقِ سلیم رکھنے والے لوگوں کے مذاق پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے جو اسباب تجویز کئے ہیں ان کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ذیل میں وہ اسباب بیان کئے جاتے ہیں، طہارت کے اسباب تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اسباب ہی نہیں، موانعات بھی مفصل بیان کئے ہیں کیونکہ تحلیہ، تخلیہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ اور باقی تین صفات کے صرف اسباب بیان کئے ہیں، موانعات کا تذکرہ نہیں کیا۔ ان پر سیر حاصل گفتگو کتاب کی قسم دوم میں بقیة مباحث الإحسان کے عنوان سے آرہی ہے۔

حدث کے اسباب ۱:- دل کا سفلی احوال سے بھر جانا جیسے صحبت سے یا ہم خوابی سے لطف اندوز ہونا ۲:- حق کی مخالفت دل میں رکھنا جس کی وجہ سے ملأ اعلیٰ کی لعنت احاطہ کرلیتی ہے ۳:- بول وبراز کا شدید تقاضا ۴:- پیشاب پاخانہ یا ریح خارج کرکے فارغ ہونا۔ یہ تینوں معدہ کے فضلات ہیں ۵:- بدن کا چرکیں ہونا ۶:- گندہ دہنی ۷- رینٹ کا ناک میں جمع ہونا ۸:- زیر ناف یا بغل میں بالوں کا بڑھنا ۹:- غلیظ نجاستوں سے بدن اور کپڑوں کا ملوث ہونا ۱۰:- ایسی صور واشکال سے حواس کا بھر جانا جو نفس کو سفلی حالت یاد دلائیں۔ جیسے گندگیاں، اپنی یا بیوی کی شرمگاہ کو دیکھنا، چوپایوں کی جفتی کو دلچسپی سے

دیکھنا اور گہری نظر سے جماع کرنا یعنی گدھوں کی طرح ننگا ہوجانا اور ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھنا اور صحبت کرنا ۱۱:- ملا ئکہ اللہ اور اللہ کے نیک بندوں پر طعن وتشنیع کرنا ۱۲:- لوگوں کو ستانا اور ان کو تکلیف پہنچانا۔

پاکی کے اسباب: ۱- مذکورہ رذائل کو دور کرنا اوران کی اضداد کو حاصل کرنا ۲- ایسے کام کرنا جن کا عادۃً نظافت بالغہ ہونا ثابت ہو چکا ہے جیسے وضوء، غسل، جو اچھے کپڑے میسر ہوں وہ پہننا اور خوشبو لگانا۔ ان چیزوں کا استعمال طہارت کے طریقوں کی طرف نفس کو منعطف کرتا ہے۔

اخبات کے اسباب: بارگاہ خداوندی میں نیازمندی اور عجز وانکساری پیدا کرنے کے لئے ایسے اعمال اختیار کرنا اور نفس کو ان کے کرنے پر مجبور کرنا جو اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کے لئے سب سے زیادہ موزون ہوں، مثلاً سرنگوں ہوکر کھڑا ہونا، سجدہ کرنا، ایسے کلمات کا ورد کرنا جو خشوع وخضوع، عجز وانکساری اور مناجات پر دلالت کرتے ہوں، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنا۔ یہ سب کام اعلیٰ درجہ کی نیازمندی اور غایت درجہ کا خشوع وخضوع پیدا کرتے ہیں۔

فیاضی کے اسباب: سخاوت، انفاق اور خطاوار سے درگذر کی عادت ڈالنا۔ اور ناگواریوں میں صبر کرنے پر نفس کو مجبور کرنا وغیرہ۔

انصاف کے اسباب: سنت راشدہ (انصاف کی راہ) کی مع اس کی تفصیلات کے نگہداشت کرنا یعنی زندگی کے ہر معاملہ میں اسلام کی بتائی ہوئی انصاف کی راہ پر مضبوط رہنا۔

أما التدبير العملي: فالعمدةُ فيه: التلبس بهيئات وأفعال وأشياءَ تُذَكِّرُ النفسَ الخصلةَ المطلوبةَ، وتُنَبِّهُهَا لها، وتُهَيِّجُها إليها، وَتَحُثُّهَا عليها، إما لتلازم عادى بينها وبين تلك الخصلة، أو لكونها مَظِنَّةً لها بحكم المناسبة الجبلّية؛ فكما أن الإنسان إذا أراد أن ينبّه نفسَه للغضب، ويُحضِرَه بين عينيه، يتخَيَّل الشتمَ الذى تَفَوَّهَ به المغضوبُ عليه، والذى يلحقُه من العار، ونحو ذلك؛ والنائحة إذا أرادت أن تجدِّد عهدَها بالفَجْع تذَكِّرُ نفسَها محاسنَ الميتِ، وتتخَيَّلُها، وتبعث من خواطرها الخيلَ والرَّجِلَ إليها؛ والذى يريد الجماع يتمسك بدواعيه؛ ونظائر هذا الباب كثيرة جدًا، لاتَعصى على من يريد الإحاطة بجوانب الكلام؛ فكذلك لكل واحد من هذه الخصال أسباب تُكتَسب بها؛ والاعتمادُ فى معرفة تلك الأمور على ذوق أهل الأذواق السليمة:

فأسباب الحدث: امتلاءُ القلب بحالةٍ سِفلية، كقضاء الشهوة من النساء جماعاً ومباشرةً، وإضمارُه مخالفةَ الحق، وإحاطةُ لعنِ الملأ الأعلى به، وكونُه حاقبا حاقنا، وقُرْبُ العهدبالبول والغائط والريح، وهذه الثلاثة فُضول المعدة، وتوسُّخ البدن، والْبَخْرُ، واجتماع المُخَاطِ، ونباتُ الشعر على العانة والإبط، وتلطُّخ الثوب والبدن بالنجاسات المستقذرة، وامتلاءُ الحواس

بصورةٍ تُذكِّرُ الحالةَ السّفلية، كالقاذورات،والنظرِ إلى الفرج ومسافدةِ الحيوانات، والنظرُ الممعن في الجماع، والطعنُ في الملائكة والصالحين،والسّعْيُ في إيذاء الناس.

وأسباب الطهارة: إزالة هذه الأشياء ،واكتساب أضدادها، واستعمالُ ما تقرر في العادات كونه نظافةً بالغةً، كالغسل والوضوء، ولُبْسِ أحسنِ ثيابه، واستعمال الطيب، فإن استعمال هذه الأشياء تُنَبِّهُ النفسَ على صفة الطهارة.

وأسباب الإخبات: مؤاخذة نفسه بما هو أعلى حالات التعظيم عنده:من القيام مُطْرِقًا، والسجود، والنطقِ بألفاظ دالة على المناجات، والتذلل لديه، ورفع الحاجات إليه، فإن هذه الأمورَ تُنَبِّهُ النفسَ تنبيها قويا على صفة الخضوع والإخبات.

وأسباب السماحة: التمرُّن على السخاوة،والبذلِ،والعفوِ عمن ظَلَمَ، ومؤاخَذَةُ نفسه بالصبر عند المكاره، ونحوُ ذلك.

وأسباب العدالة: المحافظةُ على السنة الراشدة بتفاصيلها؛ والله أعلم.

ترجمہ: رہی تدبیر عملی تو اس سلسلہ میں بہترین طریقہ ایسی شکلوں، افعال اور چیزوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا ہے جو نفس کو مطلوبہ صفت یاد دلائیں اور وہ چیزیں نفس کو مطلوبہ صفت سے خبردار کریں اور وہ نفس کو مطلوبہ صفت (کے حاصل کرنے) پر برانگیختہ کریں اور نفس کو مطلوبہ صفت پر ابھاریں یا تو ان چیزوں کے درمیان اور اس صفت کے درمیان عادۃً تلازم ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ کسی فطری مناسبت کے باعث وہ چیزیں اس صفت کے ''ملنے کی جگہ'' ہیں۔ پس جس طرح یہ بات ہے کہ انسان جب چاہتا ہے کہ وہ نفس کو غصہ سے خبردار کرے اور وہ اس غصہ کو اپنی دونوں آنکھوں کے سامنے حاضر کرے تو وہ اس گالی کا تصور کرتا ہے جو مغضوب علیہ نے بکی ہے اور اس عار اور اس کے مانند چیزوں کو یاد کرتا ہے جو اس کو (گالی کی وجہ سے) لاحق ہوئی ہیں۔ اور بَین کرنے والی عورت جب چاہتی ہے کہ اپنے دکھ درد کا زمانہ تازہ کرے تو وہ اپنے نفس کو میت کی خوبیاں یاد دلاتی ہے اور ان کو سوچتی ہے اور اپنے خیالات کے سوار اور پیادہ ان خوبیوں کی طرف بھیجتی ہے۔ اور جو شخص جماع کا ارادہ کرتا ہے وہ مباشرت کے دواعی کو اختیار کرتا ہے۔ اور اس باب کی نظائر بہت زیادہ ہیں، جو شخص کلام کے گوشوں کا احاطہ کرنا چاہتا ہے وہ نظائر اس شخص سے بھاگ نہیں سکتیں (بلکہ بہ سہولت قابو میں آجاتی ہیں) پس اسی طرح ان صفات اربعہ میں سے ہر ایک کے لئے ایسے اسباب ہیں جن کے ذریعہ اس صفت کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور ان چیزوں کے پہچاننے میں ذوق سلیم رکھنے والے لوگوں کے مذاق پر اعتماد ہے۔

پس حدث کے اسباب: دل کا سفلی حالت سے لبریز ہوجانا ہے، جیسے عورتوں سے جماع اور ساتھ لٹا کر خواہش پوری کرنا۔ اور آدمی کا دل میں حق کی مخالفت کو چھپانا اور ملأ اعلیٰ کی لعنت کا اس کو گھیر لینا اور اس کو پیشاب پاخانہ کا شدید

تقاضا ہونا اور ابھی ابھی پیشاب پاخانہ کرکے اور ریح خارج کرکے فارغ ہونا، اور یہ تینوں چیزیں معدہ کے فضلات ہیں، اور بدن کا میلا ہونا، اور منہ کا بدبودار ہونا، اور رینٹ کا ناک میں اکٹھا ہونا اور زیر ناف اور بغل میں بالوں کا اُگنا اور غلیظ نجاستوں کے ساتھ بدن اور کپڑوں کا لت پت ہونا اور حواس کا ایسی صورتوں سے بھر جانا جو نفس کو سفلی حالت یاد دلائیں، جیسے گندگیاں اور شرمگاہ کی طرف دیکھنا اور جانوروں کی جفتی دیکھنا اور جماع میں گہری نظر کرنا اور ملائکہ اور صالحین پر طعن کرنا اور لوگوں کو ستانے کے درپے ہونا۔

اور پاکی کے اسباب: اِن (مذکورہ بالا) چیزوں کو دور کرنا، اور ان کی اضداد کو حاصل کرنا ہے۔ اور ان چیزوں کو استعمال کرنا ہے جن کا عادۃً نظافت بالغہ (اعلیٰ درجہ کی پاکی) ہونا ثابت ہو چکا ہے، جیسے غسل اور وضو اور اپنے بہترین کپڑے پہننا اور خوشبو استعمال کرنا۔ کیونکہ ان چیزوں کا استعمال نفس کو طہارت کی صفت سے خبردار کرتا ہے۔

اور نیازمندی کے اسباب: اپنے نفس کا مواخذہ کرنا ہے (یعنی اس کو مجبور کرنا ہے) ایسے کاموں پر جو اس کے نزدیک تعظیم کے حالات میں سب سے اعلیٰ ہیں یعنی سر جھکا کر کھڑا ہونا اور سجدہ کرنا اور ایسے الفاظ بولنا جو مناجات (سرگوشی) پر دلالت کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے روبرو خاکساری اور فروتنی کرنا، اور اس کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنا۔ پس بیشک یہ چیزیں نفس کو نہایت خوب خبردار کرتی ہیں عاجزی اور نیازمندی کی صفات سے۔

اور فیاضی کے اسباب: سخاوت کی اور خرچ کرنے کی اور ظلم کرنے والے سے درگذر کرنے کی عادت ڈالنا ہے۔ اور ناگواریوں کے وقت صبر کے ساتھ اپنے نفس کو پکڑنا ہے اور اس قسم کے اور کام۔

اور انصاف کے اسباب: سنت راشدہ (ہدایت کے راستہ) کی اس کی تفصیلات کے ساتھ (یعنی ہر ہر معاملہ میں) نگہداشت کرنا ہے (یعنی عمل کرنا ہے) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب ـــــ ٦

ظہورِ فطرت کے حجابات

صفات اربعہ یعنی طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت کی مرکب حالت کا نام ''فطرت'' ہے۔ اس فطرت کے ظہور و نمود کو چند چیزیں روکتی ہیں۔ یعنی یہ موانع آدمی میں خصال فطرت کو پیدا نہیں ہونے دیتے۔ یہ موانع تین ہیں: نفس، دنیا اور بدعقیدگی۔ کبھی نفسانی تقاضے حصولِ کمال کی راہ میں روڑا بن جاتے ہیں، کبھی دنیا طلبی سدراہ ہو جاتی ہے، اور کبھی بدعقیدگی آڑ بن جاتی ہے کیونکہ عقیدے کی درستی کے بغیر عمل بے فائدہ ہے، بلکہ کبھی مضر ہوتا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

① حجابِ نفس کا بیان: اللہ تعالیٰ نے انسان میں کھانے پینے اور نکاح وغیرہ کے تقاضے رکھے ہیں۔ اور اس کا دل ہمیشہ طبعی احوال: حزن وملال، فرحت ونشاط، غیظ وغضب اور خوف وہراس کی سواری بنا رہتا ہے۔ انسان ہر وقت ان

حالات میں گھرا رہتا ہے۔ اور انسان کو جو بھی حالت پیش آتی ہے اس کے تین مرحلے ہوتے ہیں ایک حالت پیش آنے سے پہلے کا مرحلہ، دوسرا عین حالت پیش آنے کا مرحلہ، اور تیسرا وہ حالت ہٹنے کے بعد کا مرحلہ۔ مثلاً بھوک، پیاس، رنج وغم، محبت یا عشق کی حالت پیش آتی ہے تو پہلے مرحلہ میں نفس اس حالت کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس حالت کے مناسب چیزیں آدمی کے دل ودماغ اور حواس پر حاوی ہوجاتی ہیں۔ مثلاً محبت یکدم پیدا نہیں ہوتی، پہلے نفس اسبابِ محبت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نگاہ حسن وجمال دیکھتی ہے۔ کان دلکش آواز سنتے ہیں۔ ہاتھ گداز جسم کو چھوتا ہے، دماغ اس کی خوبیوں کو سوچتا ہے۔ پھر جب دل ودماغ ''پسند'' سے بھر جاتے ہیں۔ نگاہ کو صورت کی خوبی، لامسہ کو جسم کی گدازی اور سامعہ کو آواز کی دلکشی بھا جاتی ہے اور قوت خیالیہ اور قوت ادراکیہ بھی ان کی ہمنوائی کرتے ہیں تو دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور نفس محبت میں پھنس جاتا ہے اور وہ اس حالت میں ایسا مستغرق ہوجاتا ہے کہ اس کو اور چیزوں کی کچھ خبر نہیں رہتی۔ دل برابر محبوب میں کھویا رہتا ہے۔ خواہ محبوب سامنے ہو یا نہ ہو یا کوئی دوسری حالت بھوک پیاس وغیرہ پیش آجائے تب بھی دل محبوب سے نہیں ہٹتا، پھر تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے یعنی جب وہ حالت چلی جاتی ہے تب بھی وہ اپنا رنگ اور میل چھوڑ جاتی ہے اور دل میں محبت کی کسک باقی رہتی ہے۔ محبوب تصور سے نہیں نکلتا۔ اسی طرح اس کے دن رات گزرتے رہتے ہیں اور اس کو تحصیل کمال کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر کچھ لوگ تو عرصۂ دراز کے بعد اس حالت سے نکل جاتے ہیں۔ اور کچھ مدت العمر اسی میں پھنسے رہتے ہیں، اور کچھ عشق ومحبت میں دیوانے ہوجاتے ہیں، وہ نہ ریت رواج کی پرواہ کرتے ہیں، نہ عقل کی سنتے ہیں۔ ان کو نصیحت یا ملامت کی جائے تو وہ بھی کارگر نہیں ہوتی۔ یہ حالت ''حجابِ نفس'' کہلاتی ہے۔ کیونکہ جب نفس اُس حالت کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے تبھی وہ حالت پیش آتی ہے اور اسی کو ''حجابِ طبیعت'' بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ حجاب طبیعت کے تقاضے سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) حجابِ دنیا کا بیان: حجابِ نفس کا شکار تو کم عقل والے ہوتے ہیں۔ مگر حجابِ دنیا میں بڑے بڑے عقل مند پھنستے ہیں۔ کیونکہ جن کو کامل عقل ملی ہے اور تیقُّظ وبیداری میں سے بھی ان کو وافر حصہ ملا ہے۔ وہ ہر وقت طبیعت کے تقاضوں میں تو مبتلا نہیں رہتے۔ وہ فرصت کے کچھ ایسے لمحات نکال لیتے ہیں کہ جن میں نفس کے تقاضے تھم جاتے ہیں۔ اور ان کے دل میں نفسانی تقاضوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ ان کے دل میں قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کے مناسب حال علوم وکمالات کی تحصیل کا شوق بھی انگڑائیاں لیتا ہے اور وہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر جب یہ لوگ بصیرت کی آنکھ کھولتے اور ہوش سنبھالتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی نگاہ ماحول پر پڑتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے پاس شاندار کوٹھیاں ہیں۔ بہترین کاروبار ہیں۔ خوبصورت بیویاں اور خوش گل اولاد ہے، شاندار لباس وپوشاک ہے، عیش وعشرت کی زندگی گذارتے ہیں اور فصاحتوں میں اور صنعت وحرفت میں مقابلہ بازیاں کرتے ہیں تو یہ چیزیں ان کو بے حد پسند آجاتی ہیں۔ وہ ان کے دلدادہ ہوجاتے ہیں اور عزم وہمت اور کامل توجہ سے وہ دنیا کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور اپنی قوم کے

ساتھ دنیا کی دوڑ میں شریک ہوجاتے ہیں۔اوران میں جو تحصیل کمالات کا جذبہ ابھراتھاوہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا۔ یہ ''حجاب رسم'' کہلاتا ہے۔کیونکہ قوم کی ریت رواج اور رائج اقدار نے اس شخص کو فطری کمالات کی تحصیل سے روک دیا ہے۔اور یہی ''حجاب دنیا'' کہلاتا ہے۔کیونکہ یہ تمام امور جن میں آدمی مشغول ہوا ہے دنیوی چیزیں ہیں،اور فطری کمالات سے فروتر ہیں۔اور گووہ مفید ہیں مگر دنیا کی حدتک مفید ہیں۔آخرت میں یہ چیزیں کچھ کام آنے والی نہیں۔

(۳) حجاب سوئے فہم کا بیان: اور جو دانا موت تک دنیا میں پھنسے رہتے ہیں، وہ جب مرجاتے ہیں تو تمام تر دنیوی فضائل وکمالات سے تہی دست رہ جاتے ہیں۔کیونکہ دنیوی کمالات جسم واعضاء کے محتاج ہیں۔اور وہ اب رہے نہیں،اس لئے نفس دنیوی خوبیوں سے خالی ہوجاتا ہے،اور دنیا کا کوئی کمال ان کے پاس باقی نہیں رہتا اوران کا حال اُس باغ والے جیسا ہوکررہ جاتا ہے جس کو کوئی بگولا آکر خاکستر کردے یاان کا حال اس راکھ جیسا ہوجاتا ہے جس کو موسم گرما کی تیز وتند آندھی اڑالے جائے یعنی ان کی ساری پونجی برباد ہوجائے اور وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں۔

لیکن اگروہ دانا، بینا بھی ہوتا ہے اور وہ عقل مند نہایت چوکنا اور بے حد سمجھ دار ہوتا ہے تو وہ دلیل برہانی سے یا دلیل خطابی سے یا شریعت کی تقلید کے ذریعہ رب کا یقین پیدا کرلیتا ہے۔وہ کائنات میں پھیلی ہوئی ہر سوخدا کے وجوداور قدرت کی نشانیوں میں غور کرتا ہے یا کسی واعظ کی دلنشیں اور موثر تقریر سنتا ہے یا کسی مذہب کو مانتا ہے اوراس مذہب کی رو سے وہ مان لیتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو بندوں پر غالب ہے، جو بندوں کے تمام کاموں کا نظم وانتظام کرتا ہے اور جو بندوں کو ہمہ قسم کی نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے۔جب دل میں یہ یقین جاگزیں ہوجاتا ہے تو اس میں پروردگار کی طرف میلان اور اس کی محبت پیدا ہوتی ہے اور وہ قرب خداوندی کا طالب ہوتا ہے،اپنی تمام تر حاجتیں اس کے سامنے پیش کرتا ہے اوراپنے تمام اختیارات اس کے حوالہ کردیتا ہے —— ان لوگوں میں سے بعض برحق ہوتے ہیں اور بعض گمراہ۔

اور گمراہی کے بڑے اسباب دو ہیں:

پہلا سبب: اللہ تعالیٰ میں مخلوق کی صفات مان لینا۔

دوسرا سبب: مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی صفات مان لینا۔

پہلی گمراہی تشبیہ (مانند ٹھہرانا) کہلاتی ہے اور دوسری اشراک (شریک ٹھہرانا) اور پہلی گمراہی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ غائب (اللہ تعالیٰ) کو حاضر (مخلوق) پر قیاس کیا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو بھی مخلوقات جیسا سمجھ لیا جاتا ہے اس لئے مخلوقات کی کمزوریاں اللہ تعالیٰ میں بھی مان لی جاتی ہیں۔اور دوسری گمراہی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ بعض مخلوقات سے خارق عادت کام دیکھنے میں آتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ان کے اپنے کام ہیں یعنی وہ خود ان کاموں کے خالق ہیں اور یہ خلق (پیدا کرنا) ان کی ذاتی صفت ہے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا گارے سے پرندہ بنانا اور اس میں پھونک مارنے سے پرندہ کا زندہ ہوجانا اور مادرزاد اندھوں کو اور برص کے بیماروں کو اچھا کرنا اور مردوں کو قبروں سے زندہ کرکے نکالنا وغیرہ۔

یہ اور اس کے علاوہ دوسری چھوٹی موٹی بدعقیدگیاں ''سوئے فہم کا حجاب'' اور ''جہالت کا حجاب'' کہلاتی ہیں۔ یہ بھی تحصیل کمالات کی راہ سے بے راہ کرتی ہیں۔ کیونکہ ادنی شرک وتشبیہ کے ساتھ بھی کوئی عبادت قبول نہیں کی جاتی۔ قرآن وحدیث اس مضمون سے بھرے پڑے ہیں۔

حاصل کلام: یہ ہے کہ اگر آپ لوگوں کا جائزہ لیں تو آپ کو وہ سب باتیں بلاکم وکاست لوگوں میں مل جائیں گی جو ہم نے بیان کی ہیں۔ آپ ان باتوں میں ادنی تفاوت نہیں پائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر انسان خواہ وہ کسی مذہب کو مانتا ہو:

بعض اوقات میں کم وبیش حجابِ نفس میں ڈوبا رہتا ہے۔ اگرچہ وہ اس حالت میں بھی رسمی کام (Routine Work) کرتا رہتا ہے۔

اور بعض اوقات میں وہ ریت رواج کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ اس وقت اس پر بس یہی فکر سوار رہتی ہے کہ وہ قوم کے عقل مندوں کی موافقت کرے۔ ان کی طرح بات چیت کرے، ان کے جیسا لباس وپوشاک پہنے، انہیں جیسے اخلاق وعادات اپنائے اور انہیں جیسا رہن سہن اختیار کرے۔

اور بعض اوقات میں وہ شرک وتشبیہ اور دوسری بدعقیدگیوں کی اُن باتوں کی طرف سر جھکائے رہتا ہے جو وہ آباء واجداد سے سنتا آیا ہے اور جبروت کی باتوں پر کان نہیں دھرتا یعنی اللہ تعالیٰ کو اس طرح پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا جس طرح اس کو پہچاننے کا حق ہے۔ اسی طرح عالم میں جو قدرت کا غیبی نظام ہے، اس کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کرتا یعنی یہ جاننے کی زحمت نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کے ہاتھ سے کیوں خارق عادت امور ظاہر فرماتے ہیں اور اس میں کیا حکمت ملحوظ ہوتی ہے؟ مثلاً انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھوں پر معجزات اس لئے ظاہر کئے جاتے ہیں کہ نبوت ورسالت خود ایک خرق عادت امر ہے، جو اللہ کی قدرت میں ہے۔ یہ بات ظاہر کرنے کے لئے نبی کے دست مبارک سے دیگر خرق عادت امور ظاہر کرائے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لئے دلیل اور نظیر بنیں کہ جس طرح یہ خرق عادت امور ممکن ہیں، نبوت ورسالت اور وحی ونزول کتاب بھی ایک ممکن امر ہے، پھر اس کا انکار کیوں کیا جائے!

﴿باب الحُجُبِ المانعة عن ظهور الفطرة﴾

اعلم: أن مُعظَمَ الحجب ثلاثة: حجاب الطبع، وحجاب الرسم، وحجاب سُوء المعرفة:

وذلك: لأنه رُكِّبَ في الإنسان دواعي الأكل والشرب، والنكاح، وجُعل قلبُه مطيةً للأحوال الطبيعية، كالحزن والنشاط والغضب والوَجَل وغيرها، فلايزال مشغولاً بها، إذ كُلُّ حالةٍ يتقدمها توجهُ النفس إلى أسبابها، وانقيادُ القوى العلمية لمايناسبها، ويجتمع معها استغراقُ النفس فيها، وذهولُها عما سواها، ويتخلّف عنها بقيةُ ظِلِّها ووَضَرُ لونها، فتمر الأيام والليالي وهو على ذلك،

لايتفرغ لتحصيل غيرها من الكمال؛ وربَّ إنسان ارتطَمَتْ قدماه في هذا الوَحَل، فلم يخرج منه طولَ عمره؛ ورب إنسان غلب عليه حكم الطبع، فخلع رقبتَه عن رِبقة الرسم والعقل، ولم ينزجر بالملامة؛ وهذا الحجاب يسمى بالنفس.

لكن من تَمَّ عقلُه، وتوفَّر تيقظُه، يختطف من أوقاته فُرَصًا يركُد فيها أحوالُه الطبيعيةُ، ويتسع نفسه لهذه الأحوال وغيرها، ويستوجب لفيضان علوم أخرى غيرَ استيفاءِ مقتضياتِ الطبع، ويشتاق إلى الكمال النوعي بحسب القوتين: العاقلةِ والعاملةِ، فإذا فتح حَدَقَة بصيرته أبصر في أول الأمر قومَه في ارتفاقات، وزِيٍّ، ومباهات، وفضائلَ من الفصاحات والصناعات، فوقعت من قلبه بموقع عظيم، واستقبلها بعزيمة كاملة، وهمةٍ قوية؛ وهذا حجاب الرسم، ويسمى بالدنيا.

ومن الناس من لايزال مستغرقا في ذلك إلى أن يأتيَه الموتُ، فتزول تلك الفضائلُ بأسرها، لأنها لاتتم إلا بالبدن والآلاتِ، فَتَبْقَى النفسُ عَارِيَةً ليس بها شيئ وصار مَثَلُه كمثل ذى جَنَّةٍ أصابها إعصار، أوكرماد اشتدت به الريح في يوم عاصف، فإن كان شديدَ التنبُّه، عظيمَ الفِطْنة، استيقن بدليل برهاني، أو خَطابي، أو بتقليد الشرع: أن له رَبًّا قاهرًا فوق عباده، مدبرًا أمورَهم، منعما عليهم جميعَ النعم، ثم خُلق في قلبه ميلٌ إليه، ومَحبة به، وأراد التقرب منه، ورفعَ الحاجاتِ إليه، واطَّرَحَ لديه، فمن مصيب في هذا القصد ومخطيٍ.

ومُعْظَمُ الخطأ شيئان:

[١] أن يُعتقد في الواجب صفاتُ المخلوق.

[٢] أو يُعتقد في المخلوق صفاتُ الواجب.

فالأول: هو التشبيه، ومنشؤُه قياس الغائب على الشاهد؛ والثاني: هو الإشراك، ومنشؤه رؤيةُ الآثارِ الخارقة من المخلوقين، فَيُظَنُّ أنها مضافةٌ إليهم بمعنى الخلق، وأنها ذاتيةٌ لهم.

وينبغي لك أن تستقرئ أفرادَ الإنسان، هل ترى من تفاوتٍ فيما أخبرتك؟ لا أظنك تجد ذلك! بل كلُّ إنسان، وإن كان في تشريع مَّا، لابدله من أوقات يستغرق في حجاب الطبع، قلّت أو كثُرت، وإن لم يزل مباشِرًا للأعمال الرسمية، ومن أوقاتٍ يستغرق في حجاب الرسم، ويهمه حينئذ التشبهُ بعاقلِيْ قومه كلامًا وزِيًّا وخُلُقا ومعاشرة، وأوقاتٍ يُصغى فيها إلى ما كان يسمع، ولايُصغى من أحاديث الجبروت والتدبير الغيبي في العالم، والله أعلم.

ترجمہ: ان حجابات کا بیان جو فطرت کو ظاہر ہونے سے روکنے والے ہیں: جان لیں کہ بڑے حجابات تین ہیں:

طبیعت (نفس) کا حجاب، ریت رواج (دنیا) کا حجاب اور بدفہمی (جہالت) کا حجاب:

اور وہ اس لئے ہے کہ انسان میں کھانے پینے اور نکاح کے تقاضے مرکب کئے گئے ہیں۔ اور اس کا دل فطری احوال کی سواری بنایا گیا ہے جیسے غم، ہشاش بشاش ہونا، غصہ اور خوف وغیرہ۔ پس انسان برابر ان احوال میں مشغول رہتا ہے۔ کیونکہ ہر حالت سے پہلے نفس اس کے اسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور قوی علمیہ اس چیز کے مطیع ہوتے ہیں جو اس حالت کے مناسب حال ہوتی ہے۔ اور اکٹھا ہوتا ہے اس حالت کے ساتھ نفس کا اس میں مستغرق ہونا، اور اس حالت کے ماسواء سے بے خبر ہونا۔ اور اس حالت سے پیچھے رہ جاتا ہے اس کا باقی سایہ اور اس کے رنگ کا میل۔ پس دن رات گزرتے رہتے ہیں اور وہ اسی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کمال کی تحصیل کے لئے فارغ نہیں ہوتا۔ اور بعض لوگوں کے پاؤں اس کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں، پس وہ اس سے زندگی بھر نہیں نکلتا۔ اور بعض لوگوں پر طبیعت کا تقاضا غالب آجاتا ہے۔ پس وہ ریت رواج اور عقل کے حلقہ سے اپنی گردن نکال لیتے ہیں۔ اور وہ ملامت کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اور یہ ''حجاب نفس'' کہلاتا ہے۔

لیکن جس کی عقل تام ہوتی ہے اور بیداری سے اس کو وافر حصہ ملا ہوتا ہے، وہ اپنے اوقات میں سے کچھ لمحات جھپٹ لیتا ہے جس میں اس کے طبعی احوال تھم جاتے ہیں۔ اور اس کے نفس میں اُن احوال کے لئے اور ان کے علاوہ دیگر امور کے لئے گنجائش نکل آتی ہے۔ اور وہ طبیعت کے تقاضوں کی تحصیل کے علاوہ دیگر علوم کے فیضان کو واجب ولازم جانتا ہے۔ اور وہ قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کے اعتبار سے کمال نوعی کا مشتاق ہوتا ہے۔ پس جب وہ اپنی بصیرت کی آنکھ کھولتا ہے تو وہ اول امر میں اپنی قوم کو دیکھتا ہے۔ تدبیرات نافعہ، اور پوشاک اور فخر اور فصاحت وکاریگریوں کے کمالات میں۔ پس یہ چیزیں اس کو بہت ہی پسند آجاتی ہیں۔ اور وہ عزیمت کاملہ اور پوری توجہ سے ان چیزوں کا استقبال کرتا ہے۔ اور یہ ریت رواج کا پردہ ہے جو ''دنیا'' کہلاتی ہے۔

اور بعض لوگ برابر اُن (دنیوی) حالات میں مستغرق رہتے ہیں تا آنکہ ان کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ پس وہ (دنیوی) کمالات بالکلیہ زائل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ فضائل بدن اور آلات (اعضاء) کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوتے۔ پس نفس عاری رہ جاتا ہے اس میں کوئی کمال نہیں ہوتا۔ اور اس کا حال اس باغ والے کے حال جیسا ہوجاتا ہے، جس کو کوئی بگولا پہنچے پس اس کو خاکستر کردے (دیکھئے سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۶) یا اس راکھ جیسا ہوجاتا ہے جس کو سخت آندھی کے دن میں ہوا اڑا دے (دیکھئے سورۂ ابراہیم آیت ۱۸) پس اگر وہ شخص نہایت ہی چوکنا ہے اور بہت زیادہ سمجھ دار ہے تو وہ دلیل برہانی یا دلیل خطابی یا تقلید شرع سے اس بات کا یقین کرلیتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو اپنے بندوں پر غالب ہے، جو ان کے کاموں کا انصرام کرنے والا ہے جو ان پر ہمہ قسم کی نعمتیں مبذول کرنے والا ہے۔ پھر اس کے دل میں اس رب کی طرف میلان اور اس کے ساتھ محبت پیدا کی جاتی ہے۔ اور وہ اس رب سے نزدیک ہونا چاہتا ہے اور اس کے

سامنے حاجتیں پیش کرنا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ پس کوئی تو اس مقصد میں مصیب ہوتا ہے اور کوئی غلط راہ اپنانے والا:

اور بڑی غلطیاں دو ہیں:

ایک یہ کہ واجب تعالیٰ میں مخلوق کی صفات مان لی جائیں۔

دوسری: یا مخلوق میں واجب تعالیٰ کی صفات مان لی جائیں۔

پس اول ''تشبیہ'' ہے اور اس کے پیدا ہونے کی جگہ: غائب کو حاضر پر قیاس کرنا ہے اور دوسری اشراک (شریک ٹھہرانا) ہے اور اس کے پیدا ہونے کی جگہ: مخلوق سے خارق عادت آثار کو دیکھنا ہے۔ پس وہ گمان کرتا ہے کہ یہ کام ان لوگوں کی طرف منسوب ہیں خلق (پیدا کرنے) کے معنی کے اعتبار سے، اور یہ کہ وہ ان لوگوں کے ذاتی کام ہیں۔

اور آپ کے لئے مناسب یہ ہے کہ آپ انسانوں کے افراد کا جائزہ لیں، کیا آپ کوئی تفاوت پاتے ہیں اُن باتوں میں جو میں نے آپ کو بتلائیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے آپ کوئی تفاوت نہیں پائیں گے! بلکہ ہر انسان، خواہ وہ کسی مذہب کو مانتا ہو، اس کے لئے کچھ اوقات ایسے ضرور ہوتے ہیں جن میں وہ طبیعت کے حجاب میں ڈوبا رہے، خواہ وہ لمحات کم ہوں یا زیادہ، اگرچہ وہ قوم میں رائج اعمال کو برابر کرتا رہے ـــــ اور کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ریت رواج کے حجاب میں ڈوب جائے۔ اور اس وقت اس کو صرف یہ فکر ہوتی ہے کہ اپنی قوم کے عقل مندوں کی مشابہت اختیار کرے، بات چیت میں، لباس و پوشاک میں، اخلاق و عادات میں اور رہن سہن میں ـــــ اور کچھ اوقات ایسے ضروری ہیں کہ وہ ان باتوں کی طرف کان دھرے جن کو وہ (آباء واجداد سے) سنتا آیا ہے۔ اور جبروت کی باتوں کی طرف اور عالم میں تدبیر غیبی کی طرف کان نہ جھکائے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: **مُعْظم الشیئ**: چیز کا بڑا حصہ، جمع **مَعَاظم**...... **اِرْتَطَمَ**: کیچڑ میں گرنا...... **رَبْقَۃ** اور **رِبْقَۃ**: رسی کا پھندا ...... **الفِطْنۃ**: سمجھ جمع **فِطَنٌ**...... **اِطَّرَحَہُ**: ڈال دینا، پھینک دینا یعنی وہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ڈال دیتا ہے...... **أَھَمَّہُ**: فکر مند کرنا، غم میں ڈالنا۔

باب ـــــ ۷

حجابات مذکورہ کو دور کرنے کا طریقہ

پچھلے باب میں تحصیل فطرت کی راہ کے تین حجابات ذکر کئے گئے ہیں۔ ۱-نفس کا حجاب ۲-دنیا کا حجاب ۳-بدفہمی یعنی اللہ کے معاملات کو صحیح نہ جاننے کا حجاب۔ اب اِس باب میں اُن حجابات کو دور کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

① حجاب نفس کے ازالہ کا طریقہ

سرکش نفس کو دو طرح سے رام کیا جاسکتا ہے ایک عبادتوں اور ریاضتوں کے ذریعہ دوسرے جرائم پر سزائیں مقرر کرنے کے ذریعہ، پہلے طریقہ کا صرف حکم دیا جائے گا یعنی ترغیب کے ذریعہ عبادتوں اور ریاضتوں پر ابھارا جائے گا۔ اور دوسرا طریقہ اوپر سے مسلط کیا جائے گا یعنی تعزیرات مقرر کی جائیں گی۔ خواہ لوگ ان پر راضی ہوں یا نہ ہوں اور گناہوں پر داروگیر کی جائے گی۔

پہلا طریقہ: نفس کو لگام دینے کے لئے ایسی ریاضتیں اور بھاری عبادتیں کرنی ضروری ہیں جو بہیمیت کو کمزور کریں۔ مثلاً مسلسل روزے رکھنا اور شب بیداری کرنا یعنی رات بھر جاگنا اور نفلیں پڑھنا یا ذکر وفکر کرنا۔

بعض جاہل صوفیاء ریاضتوں کے سلسلہ میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ انھوں نے ''اللہ کی تخلیق'' کو بگاڑنا شروع کر دیا۔ آلاتِ تناسل کو کاٹ ڈالا اور بہترین اور کار آمد اعضاء ہاتھ پاؤں کو سوکھا لیا۔ یہ تسویل شیطانی ہے۔ سورۃ النساء آیت ۱۱۹ میں اس کا تذکرہ ہے اور حدیث شریف میں تبتل یعنی دنیا سے بے تعلق ہوکر خدا کی طرف متوجہ ہونے کی ممانعت وارد ہوئی ہے (متفق علیہ، مشکوۃ، شروع کتاب النکاح) کیونکہ بہترین راہ میانہ روی کی راہ ہے۔ نفس کو نہ تو بالکل بے لگام چھوڑ دینا مناسب ہے، نہ اس کی خواہشات کو ہر طرح سے پامال کر دینا، بلکہ جائز خواہشات پورا کرنے کے مواقع فراہم کرنا ضروری ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سخت ریاضتیں: مسلسل روزہ اور شب بیداری وغیرہ زہریلی دواؤں کی طرح ہیں۔ اس لئے ان کا بقدر ضرورت ہی استعمال ہونا چاہئے۔ حدیث شریف میں سَرْدِ صوم (مسلسل روزہ رکھنے) کو ناپسند کیا گیا ہے (رواہ مسلم مشکوۃ حدیث نمبر ۲۰۴۴ باب صیام التطوع) اور رات بھر عبادت کے لئے جاگنے پر نکیر فرمائی گئی ہے کہ آخر جسم اور آنکھوں کا بھی تو حق ہے (رواہ البخاری، کتاب الصوم)

دوسرا طریقہ: جو شخص نفس پرستی کا شکار ہو جائے اور سنت راشدہ کی خلاف ورزی کرے، اس پر سخت نکیر کی جائے اور اس کو سزا دی جائے۔ سزا کا خوف آدمی کو بے راہ روی سے روکتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ہر نفسانی غلبہ سے رستگاری کا طریقہ بیان کیا جائے اور صحیح راستہ بتلایا جائے تاکہ لوگ اس کو اپنائیں۔ مثلاً شہوت ایک فطری امر ہے۔ اس کی برائیوں اور بگاڑ سے بچنے کا طریقہ نکاح ہے اور نکاح کے اسباب مہیا نہ ہوں تو مسلسل روزے رکھ کر نفس کی تیزی توڑی جائے، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوانوں سے خطاب فرمایا کہ تم میں سے جو بھی گھر بسانے کی استطاعت رکھتا ہے وہ نکاح کرلے، کیونکہ نکاح نگاہ کو بہت زیادہ نیچے والا اور شرمگاہ کی خوب حفاظت کرنے والا ہے اور جس میں نکاح کی استطاعت نہ ہو، وہ روزوں کو لازم پکڑے، کیونکہ روزے بھی آختگی ہیں (متفق علیہ، مشکوۃ کتاب النکاح)

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ معمولی معمولی باتوں پر نکیر کرنا اور سزائیں دینا لوگوں کو تنگی میں مبتلا کر دے گا،

جو مناسب نہیں اورسنگین جرائم پر محض زبانی نکیر کافی نہیں ۔ بلکہ دردناک ماراور کمر توڑ جرمانہ کرنا ضروری ہے اور ایسی سخت سزائیں ان جرائم کے لئے مناسب ہیں جن کا ضرر متعدی ہے جیسے زنا اور قتل۔ ایسے سنگین جرائم پر ہلکی سزائیں دینا جرائم روکنے میں ناکافی ہے۔

﴿باب طريقِ رفع هذه الحُجُب﴾

اعـلـم: أن تـدبيـر حجابِ الطبع شيئان أحدهما يُؤمر به، ويرغَّب فيه، ويُحَثُّ عليه؛ والثاني يُضرب عليه من فوقه، ويُؤاخذ به، أشَاءَ أم أبىٰ:

فالأول: رياضاتٌ تُضْعِفُ البهيميةَ، كالصوم، والسَّهَر، ومن الناس من أفرط، واختار تغييرَ خَلْقِ اللّٰهِ، مثلُ قطع آلات التناسل، وتجفيفِ عُضوٍ شريف، كاليد، والرِّجل؛ وأولئك جهّال الْعُبَّادِ، وخير الأمور وَسَطُها، وإنما الصوم والسهر بمنزلة دواءٍ سَمِّيٍّ، يجب أن يُتَقَدر بقدرٍ ضروري.

والثاني: إقامة الإنكار على من اتَّبَعَ الطبيعةَ، فخالف السنَّةَ الراشدةَ، وبيانُ طريق التفصي من كل غلبةٍ طبيعيةٍ، وضرب سنةٍ له؛ ولاينبغي أن يُضَيَّقَ على الناس كلَّ الضَّيْقِ؛ ولايكفي في الكل الإنكارُ القولي، بل لابد من ضربٍ وجِيْعٍ، وغرامةٍ مُنْهِكَةٍ في بعض الأمور؛ والأليقُ بذلك إفراطاتٌ فيها ضررٌ مُتَعَدٍّ، كالزنا، والقتل.

ترجمہ: اِن پردوں کو اٹھانے کے طریقہ کا بیان: جان لیں کہ حجاب طبیعت کی تدبیر دو چیزیں ہیں۔ ان میں سے ایک کا حکم دیا جائے گا اور اس کی ترغیب دی جائے گی اور اس پر ابھارا جائے گا۔ اور دوسری اس پر مسلط کی جائے گی اس کے اوپر سے اور اس کے ذریعہ داروگیر کی جائے گی۔ خواہ وہ چاہے یا انکار کرے۔

پس پہلی چیز: ایسی ریاضتیں ہیں جو بہیمیت کو کمزور کریں، جیسے روزہ اور شب بیداری۔ اور بعض لوگ (ریاضتوں میں) حد سے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے اللہ کی بناوٹ کو بدلنا پسند کیا، جیسے آلاتِ تناسل کا کاٹنا اور کسی کارآمد عضو کو خشک کرنا، جیسے ہاتھ اور پیر اور یہ لوگ بڑے ہی جاہل عبادت گزار ہیں۔ اور بہترین راہ میانہ راہ ہے۔ اور روزہ اور شب بیداری زہریلی دواء جیسے ہی ہیں۔ ضروری ہے کہ ضروری مقدار کے ساتھ وہ اندازہ کی جائے۔

اور دوسری چیز: اس شخص پر نکیر کرنا ہے جو نفس کی پیروی کرتا ہے اور سنت راشدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے اور ہر نفسانی غلبہ سے چھٹکارے کا طریقہ بیان کرنا ہے اور اس کے لئے ایک طریقہ مقرر کرنا ہے۔ اور یہ بات نامناسب ہے کہ لوگوں پر ہر طرح سے تنگی کی جائے۔ اور تمام جرائم میں محض زبانی نکیر کافی نہیں۔ بلکہ بعض امور میں دردناک ماراور کمر توڑ جرمانہ ضروری ہے اور اس سزا کی زیادہ سزاوار وہ زیادتیاں ہیں جن کا نقصان دوسروں تک پہنچتا ہے، جیسے زنا اور قتل۔

لغات: سَهِرَ (س) سَهَرًا: ساری رات بیدار رہنا...... وَسَط: میانہ، معتدل اور وَسْط: درمیان...... تَفَصَّی تَفَصِّیًا: رہائی پانا...... أَشَاءَ میں ہمزہ استفہام کا ہے اور أم اس کا معادل ہے اور بغیر ہمزہ کے بھی درست ہے۔

۲ حجاب دنیا کے ازالہ کا طریقہ

حجاب دنیا کے ازالہ کی بھی دو ترکیبیں ہیں:

پہلی ترکیب: تمام دنیوی معاملات کے ساتھ ذکر الٰہی شامل کر دیا جائے۔ یا تو با قاعدہ دعائیں یاد کرائی جائیں کہ صبح وشام میں، کھانے سے پہلے اور بعد میں، بیت الخلاء جاتے اور نکلتے وقت، گھر میں داخل ہوتے وقت اور باہر نکلتے وقت اور سوتے اور جاگتے وقت یہ دعائیں پڑھی جائیں۔ یا معاملات کے لئے شرعی حدود و قیود مقرر کی جائیں کہ اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے اور اس طرح کرنا ناجائز ہے۔ اس طرح کرنے سے دنیا کی ہر چیز عبادت بن جائے گی اور آدمی کسی بھی وقت اللہ کو نہیں بھولے گا اور دنیا میں انہماک کی برائیوں سے محفوظ رہے گا۔

دوسری ترکیب: کچھ عبادتوں کو رواج عام دیا جائے یعنی سب لوگوں کے لئے وہ عبادتیں ضروری قرار دی جائیں، جیسے پانچ فرض نمازیں، رمضان کے روزے وغیرہ۔ ان عبادتوں کی پابندی لوگوں پر لازم کی جائے، خواہ لوگ رضامند ہوں یا نہ ہوں۔ اور ان عبادتوں کے ترک پر ملامت کی جائے۔ اور اگر کوئی شخص اِن طاعات کو فوت کر دے تو بطور سزا اس کی مرغوبات (مثلاً طلبہ کا کھانا اور امراء کا عہدہ) سے اس کو محروم کر دیا جائے۔

ان دو تدبیروں سے ریت رواج کی خرابیاں یعنی دنیا کے جھمیل کی برائیاں دفع ہو جائیں گی۔ اور دنیا، دنیا نہیں رہے گی، بلکہ دین بن جائے گی اور عبادات غیروں کو متاثر کریں گی۔ اور ان کے دل میں اسلام کے حق میں لحۂ فکر پیدا کریں گی۔

وتدبير حجاب الرسم: شيئان

أحدهما: أن يُضَمَّ مع كل ارتفاقٍ ذِكْرُ اللهِ تعالى، تارةً بحفظِ ألفاظٍ يؤمَر بها، وتارة بمراعاة حدود وقيود لاتُراعَى إلا لله.

والثاني: أن يُجعلَ أنواعٌ من الطاعات رسمًا فاشيًا، ويُسَجَّلَ على المحافظة عليها، أشاء أم أبى، ويُلامَ على تركها، ويُكَبَّحَ عن المرغوبات من الجاه وغيره، جزاءً لتفويتها.

فبهذين التدبيرين تندفع غوائلُ الرسم، وتصير مؤيِّدَةً لعبادة الله تعالى، وتصير الْسنَةُ تدعو إلى الحق.

ترجمہ: اور حجاب رسم (دنیا) کی تدبیر دو چیزیں ہیں:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ ہر تدبیر نافع کے ساتھ اللہ کا ذکر ملایا جائے۔ کبھی ایسے الفاظ یاد کرنے کے ذریعہ جس کے پڑھنے کا آدمی کو حکم دیا جائے اور کبھی ایسی حدود وقیود کی رعایت کرنے کے ذریعہ، جن کی رعایت اللہ ہی کے لئے کی جاتی ہے (یعنی اس کو امر شرعی سمجھ کر اس کی پابندی کرے)

اور دوسری: یہ ہے کہ کچھ عبادتوں کو رواج عام دیا جائے اور ان عبادات کی نگہداشت کا فیصلہ کیا جائے۔ خواہ وہ چاہے یا انکار کرے اور ان طاعات کے ترک پر ملامت کی جائے۔ اور مرغوبات یعنی جاہ وغیرہ سے وہ شخص باز رکھا جائے اُن طاعات کو فوت کرنے کی سزا کے طور پر۔

پس ان دو تدبیروں سے رواج کی برائی دور ہو جاتی ہے اور ریت رواج اللہ کی عبادت کی تائید کرنے والی ہو جاتی ہیں اور وہ عبادات ایسی زبانیں بن جاتی ہیں جو دین حق کی طرف دعوت دینے والی ہوتی ہیں۔

لغات: سَجَّلَ القاضی علیه: فیصلہ کرنا...... کَبَحَ (ف) کَبْحًا عن الحاجة: باز رکھنا...... الغَائِلَة: برائی، مصیبت ......لاتراعی إلا لله اصل میں لایرعی إلا الله ہے، یہ تصحیف ہے تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

③ حجاب بدعقیدگی کو زائل کرنے کا طریقہ

بدعقیدگی کی دونوں قسمیں یعنی تشبیہ واشراک دو سببوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے علاج بھی دو ہیں:

پہلا سبب اور اس کا علاج: اللہ کی ذات والا صفات بشری صفات سے برتر وبالا ہے۔ وہ محسوسات اور نو پید چیزوں کے مانند ہونے سے پاک ہے۔ اس لئے کچھ لوگ حق تعالیٰ کو کما حقہ پہچان نہیں سکتے اور تشبیہ یا اشراک کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

گمراہی کے اس سبب کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کو صفات باری کے بارے میں صرف اتنی بات بتائی جائے جس کی ان کے ذہنوں میں سمائی ہو، زائد باتیں نہ بتائی جائیں، ورنہ وہ گمراہی کا باعث ہوں گی۔ مثلاً لوگوں سے صرف یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں، مگر ان کا موجود ہونا ہمارے موجود ہونے کی طرح نہیں ہے، بلکہ ان کے شایان شان ہے۔ اور وہ زندہ ہیں، مگر ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہیں ان کی زندگی ان کے شایان شان ہے، ہم اس کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

صفات باری کو سمجھا جا سکتا ہے: انسان دوسری چیزوں کی طرح اللہ پاک کی ذات کو اور ان کی صفات کو بھی سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر موجود ومعدوم کو اور ہر مکانی اور غیر مکانی (مجرد) چیز کو جان سکتا ہے۔ اور جاننے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) معلوم کی صورت ذہن میں لا کر اس کو جاننا۔ تمام محسوسات جو نظر کے سامنے ہوتی ہیں اسی طرح جانی جاتی ہیں۔

(۲) معلوم کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر یا کسی چیز پر قیاس کر کے جاننا۔ تمام معنویات اور وہ محسوسات جو نظر کے سامنے موجود نہیں ہیں اسی طرح جانی جاتی ہیں۔

غرض انسان ہر چیز کو جان سکتا ہے۔ وہ عدم (نہ) کو بھی جان سکتا ہے اور عدم مطلق اور معدوم مطلق اور مجہول مطلق کو بھی جان سکتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ''نہ'' کو جو کہ ایک مفہوم عدمی ہے، وجود (ہونے) کی جہت سے جانا جائے یعنی ہونے کے ساتھ متصف نہ ہونے کا نام عدم (نہ) ہے اسی طرح جہل علم کے ساتھ متصف نہ ہونے کا نام ہے۔ پھر فعل مجہول عُدِمَ (س) عَدَمًا اور جُهِلَ (س) جَهْلاً سے صیغۂ اسم مفعول معدوم اور مجہول کو جانا جائے۔ پھر مطلق کا مطلب سمجھا جائے۔ مطلق کے معنی ہیں کامل، عام، بے قید، محض، ہر طرح سے۔ پھر تینوں باتوں کو ذہن میں ملا لیا جائے تو جو مرکب مفہوم حاصل ہوگا وہ معدوم محض اور مجہول مطلق کا مفہوم ہے۔ جس کا نہ خارج میں وجود ہے نہ ذہن میں، وہ صرف ایک اعتباری مفہوم ہے ـــــــ اس کی نظیر یہ ہے کہ جب کوئی کسی نظری چیز کو جاننا چاہتا ہے تو تلاش کر کے اس کی جنس وفصل لاتا ہے، پھر ان کو جوڑ کر نظری کو حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا مفاہیم ثلاثہ کو جوڑ کر معدوم محض اور مجہول مطلق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کو اور ان کی صفات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے یعنی ان کو مخلوق پر قیاس کر کے سمجھا جائے اور اس سے جو ''مخلوق کے مانند'' ہونے کا وہم پیدا ہو اس کی تلافی یہ کہہ کر کی جائے کہ وہ ''ہم جیسے'' نہیں ہیں بلکہ ان کی ذات وصفات ان کے شایان شان ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے لئے کونسی صفات ثابت کی جائیں: اللہ تعالیٰ کے لئے صفات مدحیہ ثابت کی جائیں یعنی مخلوق میں جو خوبیاں ہیں اور جن کی وجہ سے مخلوق کی تعریف کی جاتی ہے، وہ خوبیاں اللہ کے لئے ثابت کی جائیں۔ اور جو صفات خود مخلوق کے لئے عیب اور برائی ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور پاکی بیان کی جائے اور تشبیہ کے ایہام کو یہ کہہ کر دفع کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ''ہم جیسے'' نہیں ہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ ۱۱) کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہ سمیع وبصیر ہیں۔ یعنی قاعدہ کلیہ کے مطابق ان کا سننا اور دیکھنا بھی مخلوقات کے سننے اور دیکھنے کے مانند نہیں ہے۔

صفت مدح کو جاننے کا طریقہ: رہی یہ بات کہ یہ کیسے جانا جائے کہ صفت مدح کونسی ہے اور صفت ذم کونسی؟ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی صفت کو تین مادوں میں پھیر کر دیکھا جائے، پتہ چل جائے گا کہ وہ خوبی ہے یا خرابی؟ وہ تین مادے یہ ہیں:

پہلا مادہ: جس میں وہ صفت پائی جاتی ہو۔ اور اس صفت کے آثار بھی اس مادہ میں نمایاں ہوں۔

دوسرا مادہ: جس میں نہ وہ صفت پائی جاتی ہو، نہ اس میں اس صفت کی صلاحیت ہو۔

تیسرا مادہ: جس میں بالفعل تو وہ صفت نہ پائی جاتی ہو، مگر اس میں اس صفت کی صلاحیت ہو۔

مثلاً صفت حیات کو ان تین مادوں میں پھیر کر دیکھئے حَيّ (زندہ) میں یہ صفت پائی جاتی ہے اور جاندار میں اس کے آثار بھی نمایاں ہیں جَماد (بے جان چیز) میں نہ یہ صفت پائی جاتی ہے، نہ اس میں اس کا کوئی امکان ہے اور مَيِّت

(مردہ) میں بالفعل تو یہ صفت نہیں پائی جاتی مگر اس میں اس صفت کے پائے جانے کا امکان ہے۔ مردے پہلے بھی معجزہ سے زندہ ہوئے ہیں اور آئندہ قیامت میں بھی زندہ ہوں گے۔

اب غور کیجئے موالید میں برتر مخلوق ''جاندار'' سمجھی جاتی ہے، جماد کا کوئی مقام نہیں اور میت کا یک گونہ احترام ضروری ہے اسی لئے جنازہ لے کر دوڑنا مکروہ ہے اور شامی میں کراہیت کی وجہ میت کی بے توقیری بیان کی گئی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حیات صفاتِ مدحیہ میں سے ہے، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کیا جائے۔ اسی طرح آپ صفت عدل کو ان تین مادوں میں پھیر کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ بھی صفت مدح ہے اور بُکاء (رونا) کو ان مادوں میں پھیر کر دیکھیں یا ظلم کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ صفتیں تو خود مخلوق میں عیب ہیں پس ان صفات سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ضروری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صفت مادحہ (خوبی) کو اللہ تعالیٰ کے لئے اس دلیل سے ثابت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ میں اس صفت کے آثار پائے جاتے ہیں، جیسے زندہ میں زندگی کے آثار محسوس ہوتے ہیں اس لئے ہم اس کو زندہ کہتے ہیں۔ عادل میں عدل کے آثار پائے جاتے ہیں۔ ظالم میں ظلم کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جن صفات کے آثار اللہ تعالیٰ میں پائے جاتے ہیں وہ صفات ثابت کی جائیں اور جن کے آثار نہیں پائے جاتے ان کی نفی کی جائے۔ اور تشبیہ کے ایہام کو یہ کہہ کر دفع کیا جائے کہ وہ ''ہم جیسے'' نہیں ہیں۔

دوسرا سبب اور اس کا علاج: اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ دنیا کے خرخشوں میں اس بری طرح پھنسے رہتے ہیں کہ ان کو معرفت خداوندی حاصل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ دنیا اپنی زیبائش کے ساتھ اور لذتیں اپنی رعنائیوں کے ساتھ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے موجود رہتی ہیں۔ اور قوی علمیہ: دل و دماغ اور حواس ظاہرہ اور باطنہ ہمیشہ حسی صورتوں سے بھرے رہتے ہیں۔ اس لئے آدمی کا دل دنیا کی چیزوں میں الجھا رہتا ہے۔ اور اس کو حق تعالیٰ کی طرف خالص توجہ کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔

اس حجاب کا علاج یہ ہے کہ دنیا کو دل و دماغ سے نکالا جائے اور دنیا کی مشغولیت کم کی جائے۔ اور اس کے لئے تین کام کئے جائیں:

۱- ایسی ریاضتیں اور ایسے اعمال اختیار کئے جائیں جن سے آدمی میں تجلیات ربانی کی صلاحیت پیدا ہو۔ تجلیات ربانی کا دیدار تو آخرت میں ہوگا، مگر اس کی قابلیت یہاں پیدا کرنی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص آخرت میں دیدار خداوندی کا متمنی ہے وہ فجر اور عصر کی نماز میں غفلت نہ برتے (متفق علیہ، مشکوۃ، باب رؤیۃ اللہ، کتاب احوال القیامہ، حدیث نمبر ۵۶۵۵) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز وغیرہ عبادتیں آدمی میں تجلیات ربانی کی زیارت کی استعداد پیدا کرتی ہیں۔

۲- خلوت نشینی اختیار کی جائے یعنی کچھ وقت کے لئے دنیا کے دھندوں سے دامن جھاڑ کر گوشہ نشینی اختیار کی جائے یا مسجد میں اعتکاف کیا جائے۔ جہاں اللہ کا ذکر و فکر کیا جائے، صحیح اسلامی عقائد سیکھے جائیں، معتبر علماء کی کتابوں کا مطالعہ کیا

جائے یا اہل علم کے بیانات سنے جائیں۔ ایسا کرنے سے جہالت دور ہوگی اور صحیح معرفت حاصل ہوگی۔

۳- اللہ تعالیٰ سے اور آخرت سے غافل کرنے والی چیزوں سے حتی الامکان کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ سورۂ لقمان آیت ٦ میں ان لوگوں کی مذمت آئی ہے جو ایسی چیزیں اختیار کرتے ہیں جو اللہ سے غافل کرنے والی ہیں۔ اور بخاری شریف (کتاب الادب حدیث نمبر ٦١٠٩) میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے منقش پردے کو پھاڑ دیا تھا اور بخاری شریف (کتاب الصلوٰۃ حدیث نمبر ٣٧٣) میں یہ روایت بھی ہے کہ آپ ﷺ نے وہ چادر اتار دی تھی جس میں پھول بوٹے تھے۔ اب سوچیں وہ لوگ جو بغل میں ریڈیو، تھیلے میں اور میز پر ناول، افسانے، اور گھر میں ٹی، وی، ویڈیو، وی، سی آر اور ہائے فائے رکھتے ہیں اور پھر جنت کے بلند درجوں کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں، کیا ان لغویات میں مصروفیات کے ساتھ وہ لازوال دولت میسر آسکتی ہے؟!

وسوء المعرفة بكلا قسميه ينشأ من سببين:

أحدهما: أن لايستطيع أن يعرف ربَّه حقَّ معرفته، لتعاليه عن صفات البشر جدًا، وتَنَزُّهه عن سِمَةِ المُحْدَثات والمحسوسات؛ وتدبيرُه: أن لايُخاطَبوا إلا بما تَسَعُه أذهانُهم.

والأصل في ذلك: أنه ما من موجود أو معدوم، مُتَحَيِّز أو مُجَرَّدٍ، إلا يتعلق علمُ الإنسان به: إما بحضور صورته، أو بنحوٍ من التشبيه والمقايسةِ، حتى المَعْدُوْم المطلقِ والمجهول المطلقِ، فَيُعْلَمُ العدمُ من جهة معرفةِ الوجود، وملاحظةِ عدم الاتّصافِ به، ويُعْلَمُ مفهومُ المشتق على صيغة المفعول، ويُعْلَمُ مفهومُ المطلق، فَيُجْمَعُ هذه الأشياءُ، ويُضَمُّ بعضُها إلى بعض، فينتظم صورةٌ تركيبيةٌ، هي مِكشافُ البسيط المقصودِ تصورُه، الذي لاوجود له في الخارج ولا في الأذهان؛ كما أنه ربما يَتَوَجَّهُ إلى مفهوم نظري، فَيَعْمِدُ إلى ما يحسبه جنسا، وإلى ما يحسبه فصلا، فيركّبهما، فيحصلُ صورةٌ مركبةٌ، هي مِكشاف المطلوبِ تصورُه، فيخاطَبوا — مثلاً — بأن الله تعالى موجود لاكوجودنا، وبأنه حي لاكحياتنا،

وبالجملة: فَيُعْمَدُ إلى صفاتٍ هو موردُ المدح في الشاهد، ويُلاحَظُ ثلاثةُ مفاهيمَ فيما نشاهد: شيئٌ فيه هذه الصفات، وقد صدرت منه آثارُها، وشيئٌ ليست فيه، وليست من شأنه، وشيئٌ ليست فيه، ومن شأنه أن تكون فيه، كالحي، والجماد، والميتِ، فَيُثْبَتُ هذه بثبوت آثارها، ويُجْبَرُ هذه التشبيه بأنه ليس كمثلنا.

والثاني: تمثلُ الصورةِ المحسوسة بزينتها، واللذاتِ بجمالها، وامتلاءُ القُوى العلمية بالصور الحسية، فينقادُ قلبه لذلك، ولايصفو للتوجهِ إلى الحق؛ وتدبيرُ هذا: رياضاتٌ وأعمال يستعد بها

الإنسانُ للتجليات الشامخة، ولو في المعاد، واعتكافاتٌ، وإزالةٌ للشاغل بقدر الإمكان، كما هتك رسولُ الله صلى الله عليه وسلم القِرَامَ المصوَّرَ، ونزع خميصةً فيها أعلامٌ، والله أعلم.

ترجمہ: اور بدعقیدگی اس کی دونوں قسموں کے ساتھ دو سببوں سے پیدا ہوتی ہے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو پہچان نہ سکے جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے اس کے بشری صفات سے برتر ہونے کی وجہ سے اور حادث و محسوس چیزوں کی علامت سے پاک ہونے کی وجہ سے —— اور اس کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کو صرف وہی باتیں بتلائی جائیں جو ان کے اذہان میں سما سکیں۔

اور بنیادی بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہر موجود یا معدوم، متحیز (مکانی) یا مجرد (غیر متحیز و غیر مکانی) کے ساتھ علم انسانی متعلق ہوسکتا ہے (یعنی ہر چیز کو جانا جا سکتا ہے) یا تو اس کی صورت حاضر کرنے کے ذریعہ یا ایک طرح کی تشبیہ اور دوسرے پر قیاس کرنے کے ذریعہ، حتی کہ معدوم مطلق (محض) اور مجہول مطلق (یعنی ہر طرح سے مجہول کو بھی جانا جا سکتا ہے) پس عَـــدَمْ (نہ ہونے) کو جانا جائے وجود کو جاننے کی جہت سے، اور وجود کے ساتھ متصف نہ ہونے کو پیش نظر لانے کی جہت سے۔ اور مـفـعـول کے وزن پر آنے والے اسم مشتق کا مفہوم سمجھا جائے۔ اور ''مطلق'' کا مطلب سمجھا جائے۔ پھر یہ چیزیں اکٹھا کی جائیں۔ اور ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا جائے تو ایک مرکب صورت منتظم ہوگی۔ یہ مرکب صورت اُس بسیط (معدوم مطلق اور مجہول مطلق) کے مفہوم کو کھولنے (سمجھنے) کا آلہ (ذریعہ) ہے، جس کا تصور مقصود ہے (یعنی جس کو ہم سمجھنا چاہتے ہیں) جس کا نہ خارج میں وجود ہے، نہ ذہنوں میں —— جس طرح یہ بات ہے کہ آدمی کبھی ایک نظری مفہوم کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پس وہ اس چیز کا قصد کرتا ہے جس کو وہ جنس گمان کرتا ہے۔ اور اس چیز کا قصد کرتا ہے، جس کو وہ فصل گمان کرتا ہے، پھر وہ دونوں کو جوڑتا ہے تو ایک مرکب صورت پیدا ہوتی ہے، جو اُس چیز کو کھولنے کا آلہ ہے جس کا تصور (سمجھنا) مطلوب ہے پس لوگوں سے —— مثال کے طور پر —— کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں، مگر ہمارے موجود ہونے کی طرح نہیں۔ اور یہ کہا جائے کہ وہ زندہ ہیں مگر ہماری زندگی کی طرح نہیں۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ ایسی صفات کا قصد کیا جائے جو موجود میں مدح کے وارد ہونے کی جگہ ہیں (یعنی جس کی بناء پر موجود کی تعریف کی جاتی ہے) اور جو مخلوقات ہمارے مشاہدہ میں آتی ہیں ان کے تین مفہوم (مثالیں، مادے) پیش نظر لائے جائیں: ایک: وہ چیز جس میں یہ صفتیں ہیں اور اس مخلوق سے اس صفت کے آثار بھی ظاہر ہوتے ہیں اور دوسری: وہ چیز جس میں یہ صفات نہیں ہیں۔ اور نہ ان کی شان میں سے یہ صفات ہیں۔ اور تیسری: وہ چیز جس میں یہ صفات (فی الحال) نہیں ہیں۔ اور اس کی شان سے یہ بات ہے کہ اس میں یہ صفات ہوں، جیسے زندہ، بے جان چیز اور مردہ —— پس یہ صفتیں ثابت کی جائیں ان کے آثار کے ثبوت کے ذریعہ۔ اور اس تشبیہ کی تلافی کی جائے بایں طور کہ وہ ''ہمارے جیسے'' نہیں ہیں۔

اور بدعقیدگی کا دوسرا سبب: محسوس صورتوں کا ان کی زیبائش کے ساتھ، اور لذتوں کا ان کی رعنائیوں کے ساتھ

متشکل ہوتا ہے۔اورقوی علمیہ کاحسی صورتوں سے لبریز ہوتا ہے۔پس آدمی کا دل ان چیزوں کا مطیع ہوتا ہے۔اورحق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے خالص نہیں رہتا ——— اوراس کاعلاج ایسی ریاضتیں اوراعمال ہیں جن سے آدمی میں بلند تجلیات کی استعداد پیدا ہو، گووہ آخرت میں ہو، اورگوشہ نشینیاں ہیں۔اورحتی الامکان مشغول کرنے والی چیزوں کا ازالہ ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے منقش پردے کو پھاڑ دیا تھا، اور وہ کمبل اتار دیا تھا جس میں پھول بوٹے تھے۔باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

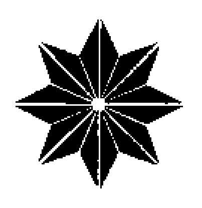
تَعَالٰی تَعَالِيًا: بلند ہونا...... وَسَمَهُ يَسِمُهُ وَسْمًا وَسِمَةً: داغ لگانا السِّمَةُ: ماوُسم به البعير من ضُروب الصُّور (لسان) یہاں مطلق علامت کے معنی ہیں...... اِعْتَكَفَ في المكان: بندرہنا...... القِرَام: سرخ پردہ یاباریک کپڑا......الخَمِيْصَة: کالا یا سرخ کپڑا جس میں پھول بوٹے ہوں (المعجم الوسيط)...... العَلَم: کپڑے کانقش، جھنڈا قوم کاسردار جمع اَعْلَامٌ

ترکیب:

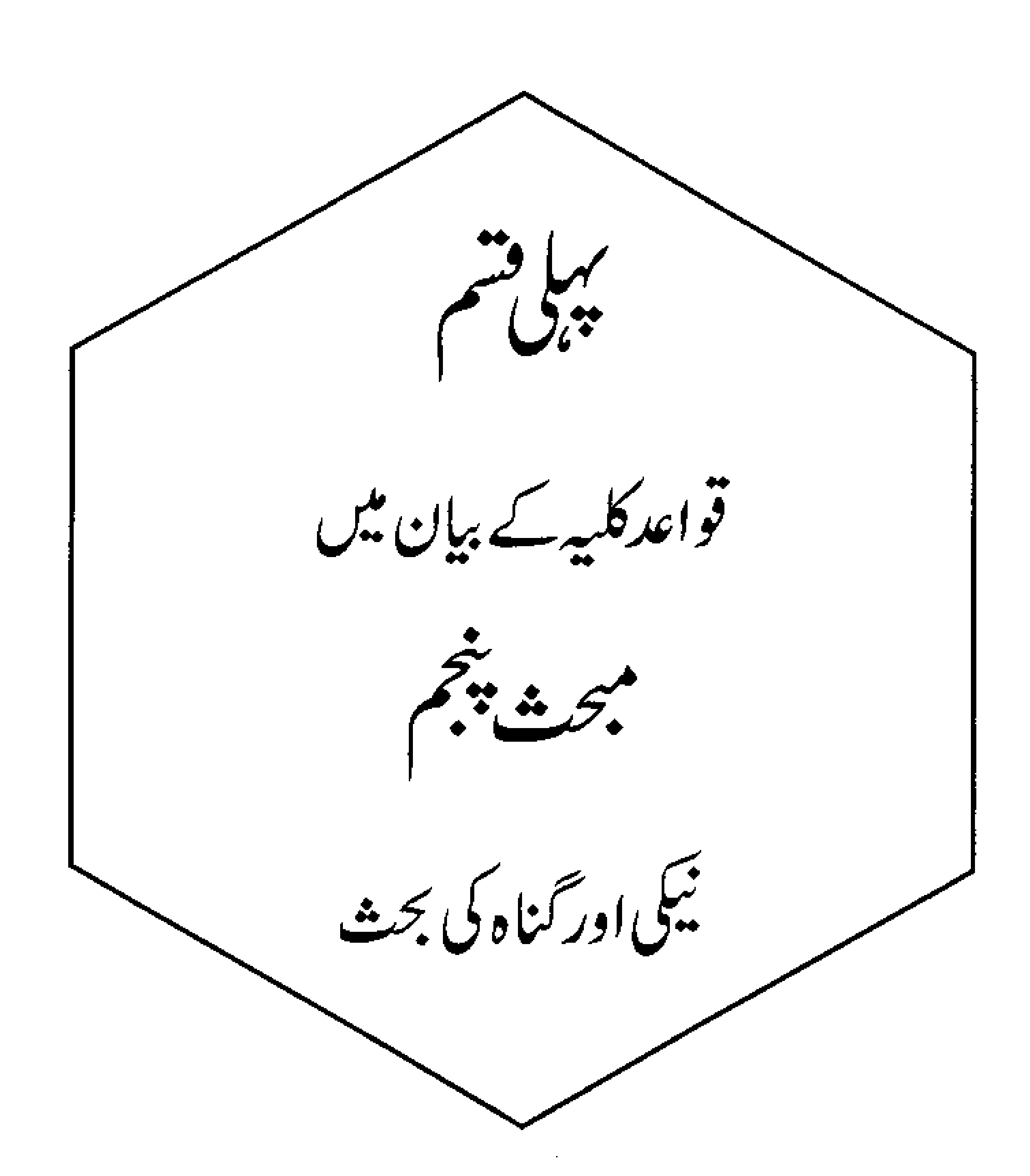
مِکشاف البسيطِ المقصودِ تصورُه إلخ میں تصوره مرکب اضافی المقصود (اسم مفعول) کانائب فاعل ہے، اور المقصود صفت ہے البسیط کی اور الذی لاوجود إلخ دوسری صفت ہے......فيخاطبوا مثلاً إلخ کا معنوی تعلق أن لايخاطبوا إلا بما إلخ سے ہے، اس لئے تقریر میں یہ ٹکڑا وہاں لیا گیا ہے۔

تصحیح: حتى المعدوم المطلق اصل میں حتى العدم المطلق تھا۔یہ تصحیف ہے اور تصحیح مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے فجزاه الله تعالى خيرًا

بفضلہ تعالیٰ آج ۱۳ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۹۹ء بروز بدھ مبحث چہارم کی شرح تکمیل پذیر ہوئی فالحمد لله على ذلك






پہلی قسم
قواعد کلیہ کے بیان میں
مبحث پنجم
نیکی اور گناہ کی بحث

مبحث پنجم

نیکی اور گناہ کی بحث

مبحث پنجم

نیکی اور گناہ کی بحث

تمہید

نیکی اور گناہ کی حقیقت کا بیان

کتاب کے آغاز میں، مقدمہ کے آخر میں، جہاں فہرست مضامین دی گئی ہے، حضرت شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''میں نے دیکھا کہ اسرار شریعت کی تفصیلات دو بنیادوں کی طرف لوٹتی ہیں: ایک نیکی اور گناہ کی بحث، دوسری سیاست ملیہ (مذہبی حکومت) کی بحث، پھر میں نے دیکھا کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ پہلے مجازات، ارتفاقات اور سعادت نوعیہ کی ابحاث جان لی جائیں''

اب شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ جب مبحث اول و دوم میں جزاو سزا کی اِنّی و لِمّی، ہر طرح کی دلیلیں ذکر کی جاچکیں، پھر مبحث سوم میں ارتفاقات یعنی تدبیرات نافعہ کو بیان کردیا گیا، جو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، چنانچہ وہ انسانوں میں مسلسل چلی آرہی ہیں، کبھی بھی انسانی معاشرہ ان سے خالی نہیں رہا، پھر مبحث چہارم میں تحصیل سعادت کی راہ بیان کردی گئی تو اب وقت آگیا کہ ہم نیکی اور گناہ کی حقیقت بیان کریں۔

نیکی: چار قسم کے کام ہیں:

۱- وہ کام جو ملأ اعلیٰ کی اطاعت کے تقاضے سے اور الہام الٰہی کو قبول کرنے اور مرضیات خداوندی میں فنا ہونے کی وجہ سے انجام دئے جائیں یعنی کمالِ عبودیت واطاعت کے تقاضے سے جو کام کئے جائیں وہ نیکی کے کام ہیں۔

۲- جن کاموں پر دنیا میں یا آخرت میں اچھا بدلہ ملے وہ نیکی کے کام ہیں۔

۳- جو کام ارتفاقات کو سنوارنے والے ہیں، جن پر انسانی معاشرہ کا مدار ہے، وہ نیکی کے کام ہیں۔

۴- جو کام اطاعت خداوندی کی حالت پیدا کریں اور حجابات کو دور کریں تاکہ قرب وحضور میسر آئے وہ سب نیکی

کے کام ہیں۔

اور گناہ بھی چار طرح کے کام ہیں:

۱- جو کام شیطان کی اطاعت کے تقاضے سے اور اس کی مرضیات میں فنا ہونے کی وجہ سے کئے جائیں وہ گناہ کے کام ہیں۔

۲- جن کاموں پر دنیا میں یا آخرت میں سزا ملے وہ گناہ کے کام ہیں۔

۳- ارتفاقات کو بگاڑنے والے کام بھی گناہ کے کام ہیں۔

۴- جو کام خدا کی نافرمانی کی حالت پیدا کریں اور حجابات کو پختہ کریں وہ سب گناہ کے کام ہیں۔

سُنَنِ برّ کی تشکیل: جس طرح سمجھ دار لوگ آسائش کی زندگی بسر کرنے کے لئے مفید تدبیریں وجود میں لاتے ہیں، اور لوگ ان کو مفید سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ عام ہو جاتی ہیں، اسی طرح ''نیکی کے طریقے'' اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو الہام فرماتے ہیں جو ملکوتی انوار سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اور جن پر امور فطرت (طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت) کا غلبہ ہوتا ہے یعنی انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو وہ طریقے اس طرح الہام کئے جاتے ہیں، جس طرح مُہال کے دل میں وہ باتیں ڈالی جاتی ہیں جن سے ان کا طریقۂ زندگی سنورتا ہے۔ انبیاء اُن طریقوں کو اپنا لیتے ہیں، اور دوسروں کو ان کی دعوت و ترغیب دیتے ہیں۔ پس لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ نیکی کے وہ طریقے عام ہو جاتے ہیں۔ اب تمام لوگ ان سُنَنِ برّ پر متفق ہیں، خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں، اور خواہ ان کا کوئی مذہب ہو۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ کسی فطری مناسبت اور نوعی تقاضے کی وجہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ خواہ مخواہ یا اتفاقاً نہیں ہو سکتی، پس ثابت ہوا کہ ''سُنَنِ برّ'' فطری امور ہیں۔

سوال: برّ و اثم کا تصور تو تمام اقوام و مِلَل میں پایا جاتا ہے، مگر ہر قوم میں اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ مثلاً کوئی صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے اور اسی کو نیکی سمجھتا ہے اور کوئی شرک کا بھی روادار ہے اور اس کو بھی نیکی گردانتا ہے۔ پھر ''سُنَنِ برّ'' پر ارباب ملل کا اتفاق کہاں رہا؟ اسی طرح کچھ لوگ نیکی کے کاموں سے کوسوں دور ہوتے ہیں، وہ زنا، چوری اور سود خوری جیسے اعمال بد اختیار کئے ہوئے ہوتے ہیں، پھر ''سُنَنِ برّ'' فطری امور کیسے ہوئے؟

جواب: نیکی کی شکلوں کا اختلاف مضر نہیں یعنی اس سے اعتراض درست نہیں، کیونکہ اصول پر سب کا اتفاق ہے اور وہ کافی ہے، مثلاً بندگی کی ضرورت کے سب قائل ہیں، اگرچہ اس کی صورتوں میں اختلاف ہے۔ اور جو لوگ سنن بر سے روگردانی کرتے ہیں وہ انسانوں کا ناقص گروہ ہیں۔ اہل بصیرت ان کے احوال میں غور کریں گے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ وہ خلاف فطرت طریقۂ زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور انسانوں میں ان کی حیثیت اس زائد عضو کی سی ہے، جس کو کاٹ پھینکنا، باقی رکھنے سے زیادہ بہتر ہے، پس ان کے اطوار سے اعتراض بھی درست نہیں۔

باراحسان: جس طرح سنن بر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم سے لوگوں کو نصیب ہوئی ہیں، ان کی اشاعت کی تدبیریں بھی انہیں حضرات نے بتلائی ہیں۔ پس ان کا دنیا جہاں کی گردنوں پر عظیم باراحسان ہے۔ (ان اسباب وتدبیرات کا بیان مبحث سادس میں آئے گا)

آئندہ ابواب کے مضامین: اس مبحث کے آئندہ ابواب میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں:

① سنن برّ کی بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں یعنی نیکی کے اہم کاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جیسے توحید (اللہ کو ایک ماننا) صفات پر ایمان، تقدیر پر ایمان وغیرہ نیکی کے تمام کاموں کو بیان نہیں کیا گیا، کیونکہ اس میں طول ہے۔ اور یہ اصول بروہ ہیں جن پر اقلیم ہائے صالحہ کی بڑی بڑی اقوام متفق ہیں۔ ان اقوام میں ایسے ایسے لوگ اٹھے ہیں جو اللہ والے، سلاطین اور صائب الرائے دانشمند تھے، عرب وعجم، یہود وہنود، اور مجوس سبھی اقوام میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور وہ سب ان اصول بر پر متفق ہیں۔

② جب قوت بہیمیہ، قوت ملکیہ کی مطیع ہوجاتی ہے تو نیکی کے کام کس طرح وجود میں آتے ہیں؟ اس کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

③ سنن بر کے بعض وہ فوائد بیان کئے گئے ہیں جو تجربہ سے معلوم ہوئے ہیں اور جنہیں عقل سلیم تسلیم کرتی ہے۔

المبحث الخامس: مبحث البِرِّ والإثم

مقدِّمة: فى بيان حقيقة البر والإثم

إذ قد ذكرنا لِـمِّيَّةَ المجازاة وإِنِّيَّتَهَا، ثم ذكرنا الارتفاقاتِ التى جُبل عليها البشر، فهى مستمرة فيهم، لاتنفك عنهم، ثم ذكرنا السعادةَ وطريقَ اكتسابِهَا، حان أن نشتغل بتحقيق معنى البر والإثم.

فالبر: كل عمل يفعَلُه الإنسانُ قضيةً لانقياده للملأ الأعلى، واضمحلاله فى تلقى الإلهام من الله، وصير ورتِه فانياًفى مراد الحق، وكلُّ عمل يُجازى عليه خيرًا فى الدنيا أو الآخرة، وكلُّ عمل يُصلح الارتفاقاتِ التى بُنى عليها نظامُ الإنسان، وكلُّ عمل يفيد حالةَ الانقياد، ويدفع الْحُجُبَ.

والإثم: كـلُّ عمل يفعله الإنسان قضيةً لانقياده للشيطان، وصير ورتِه فانيًا فى مراده، وكلُّ عـمل يُجازى عليه شرًا فى الدنيا أو الآخرة، وكلُّ عمل يُفسد الارتفاقاتِ، وكُلُّ عمل يفيد هيئةً مضادَّةً للانقياد، ويؤكِّدُ الْحُجُبَ.

وكما أن الارتفاقاتِ استنبطها أولو الخُبرة، فاقتدى بهم الناس بشهادة قلوبهم، واتفق عليها أهـل الأرض، أو مـن يُـعتـدُّ بـه مـنهم، فكذلك للبر سُنَنٌ، ألهمها الله تعالى فى قلوب المؤيَّدِيْن

بالنور المَلَكيِّ، الغالبِ عليهم خُلُقُ الفطرة، بمنزلةِ ما أُلهم في قلوب النحل مايصلح به معاشُها، فجَرَوْا عليها، وأخذوا بها، وأرشدوا إليها. وحثُّوا عليها، فاقتدى بهم الناس، واتفق عليها أهلُ الملل جميعًا في أقطار الأرض، على تباعُدِ بلدانهم، واختلاف أديانهم، بحكم مناسبة فطرية، واقتضاءٍ نوعي.

ولايَضُرُّ ذلك اختلافُ صورِ تلك السنن بعد الاتفاق على أصولها، ولاصدودُ طائفةٍ مُخْدَجَةٍ، لو تأمل فيهم أصحابُ البصائر، لم يشكُّوا أن مادَّتهم عصت الصورةَ النوعية، ولم تمكِّنْ لأحكامها، وهم في الإنسان كالعضو الزائد من الجسد، زوالُه أجملُ له من بقائه.

ولشيوع هذه السنن أسباب جليلة، وتدبيرات محكمة، أحكمها المؤيَّدون بالوحي، صلوات الله عليهم، فأثبتوا لهم مِنَنًا عظيمةً في رقاب الناس.

ونحن نريد أن ننبهك على أصول هذه السنن، مما أجمع عليه جمهورُ أهل الأقاليم الصالحة، من الأمم العظيمة التي يَجْمَع كلُّ واحد أقوامًا من المتألِّهين، والملوكِ، والحكماءِ ذوي الرأيِ الثاقبِ، من عربهم، وعجمهم، ويهودهم، ومجوسهم، وهنودهم؛ ونشْرَحُ كيفيةَ توليدِها من انقياد البهيمية للقوة الملكية، وبعضَ فوائدها، حَسْبَمَا جربنا على أنفسنا غير مرة، وأدى إليه العقلُ السليم. والله أعلم.

ترجمہ: مبحث پنجم: نیکی اور گناہ کی بحث۔ تمہید: نیکی اور گناہ کی حقیقت کا بیان: جب ہم مجازات کے لِمّی اور اِنّی دلائل بیان کر چکے، پھر ہم نے وہ مفید تدبیریں بیان کیں، جن پر لوگ پیدا کئے گئے ہیں، پس وہ انسانوں میں مسلسل چلی آرہی ہیں، وہ ان سے جدا نہیں ہوتیں پھر ہم نے نیک بختی اور اس کو حاصل کرنے کی راہ ذکر کر دی تو اب وقت آگیا کہ ہم نیکی اور گناہ کے معنی کی تحقیق میں مشغول ہوں۔

پس نیکی ہر وہ عمل ہے جس کو انسان کرتا ہے ملأاعلیٰ کی اطاعت کے اقتضاء سے، اور اس کے پاش پاش ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام حاصل کرنے میں، اور اس کے فنا ہونے کی وجہ سے مرضیات خداوندی میں —— اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا میں یا آخرت میں اچھا بدلہ دیا جاتا ہے —— اور ہر وہ عمل ہے جو اُن ارتفاقات کو سنوارتا ہے جن پر نظام انسانی کا مدار ہے —— اور ہر وہ عمل ہے جس سے تابعداری کی حالت پیدا ہوتی ہے اور حجابات دور ہوتے ہیں۔

اور گناہ ہر وہ عمل ہے جس کو انسان کرتا ہے شیطان کی اطاعت کے اقتضاء سے، اور اُس کے شیطان کی مرادوں میں فنا ہونے کی وجہ سے —— اور ہر وہ عمل ہے جس پر دنیا میں یا آخرت میں برا بدلہ دیا جاتا ہے —— اور ہر وہ عمل ہے جو ارتفاقات کو بگاڑتا ہے —— اور ہر وہ عمل ہے جس سے تابعداری کے برخلاف حالت پیدا ہوتی ہے اور جو حجابات کو پختہ کرتا ہے۔

اور جس طرح یہ بات ہے کہ سمجھ دار لوگوں نے ''مفید تدبیریں'' نکالی ہیں، پس دل کی گواہی سے لوگوں نے ان کی پیروی کی ہے، اور ان پر زمین کے تمام باشندوں نے، یا ان میں سے قابل لحاظ لوگوں نے اتفاق کرلیا ہے، پس اسی طرح نیکی کے لئے بھی ''طریقے'' ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں الہام فرمائے ہیں جو ملکوتی انوار سے تائید یافتہ ہیں۔ اور جن پر فطرت کی باتیں چھائی ہوئی ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کے دلوں میں وہ باتیں ڈالی ہیں جن سے ان کا طریقۂ زندگی سنورتا ہے۔ پس وہ مُلہَم حضرات ان سُنَن پر چلے، اور انھوں نے اُن طریقوں کو پکڑا اور انھوں نے (لوگوں) کو ان طریقوں کی راہ دکھائی اور ان پر ابھارا، پس لوگوں نے ان کی پیروی کی، اور ان پر تمام اہل مِلَل نے اتفاق کیا، چار دانگ عالم میں، ان کے علاقوں کے دور دراز ہونے اور ان کے مذاہب کے مختلف ہونے کے باوجود ایک فطری مناسبت اور نوعی اقتضاء کی وجہ سے۔

اور ضرر نہیں پہنچاتا اس (دعوی) کو اُن سنن بر کی شکلوں کا مختلف ہونا، ان کی بنیادی باتوں پر اتفاق کرنے کے بعد، اور نہ اس ''ناقص گروہ'' کا باز رہنا، جن میں اگر اہل بصیرت غور کریں گے تو ان کو ذرا شک نہیں رہے گا کہ ان کے مادہ نے صورت نوعیہ کی نافرمانی کی ہے اور ان کے مادہ نے صورت نوعیہ کے احکام کو (روبعمل آنے کا) موقعہ ہی نہیں دیا ہے۔ اور وہ لوگ جسم انسانی میں اس زائد عضو کی طرح ہیں جس کا ختم ہوجانا، اس کے باقی رہنے سے انسان کے لئے زیادہ خوبصورتی کی بات ہے۔

اور ان طریقوں کے پھیلنے کے لئے بڑے اسباب اور مضبوط تدبیریں ہیں، جن کو اُن حضرات نے پختہ کیا ہے جو وحی کے ساتھ مؤید ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں نازل ہوں! ۔ پس انھوں نے اپنے لئے لوگوں کی گردنوں پر بڑے احسانات ثابت کئے ہیں۔

اور ہم آپ کو ان طریقوں کی بنیادی باتوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، جو اُن باتوں میں سے ہیں جن پر قابل رہائش علاقوں کے باشندوں میں سے جمہور نے اتفاق کیا ہے۔ جو اُن بڑی امتوں میں سے ہیں، جن میں سے ہر امت اللہ والوں، بادشاہوں اور درست رائے رکھنے والے دانشمندوں کی گروہوں کو جمع کرتی ہے، جو عرب وعجم، یہود ومجوس اور ہندؤں میں سے ہیں ــــ اور ہم اُن طریقوں کے پیدا ہونے کی کیفیت کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ بہیمیت کی تابعداری کرنے سے قوتِ ملکیہ کی ــــ اور ہم ان طریقوں کے بعض فوائد کی تشریح کرنا چاہتے ہیں، جس طرح ہم نے ان کا بذات خود بار بار تجربہ کیا ہے اور جس تک عقل سلیم پہنچاتی ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

الاضمحلال: الانحلال: کھل جانا، پاش پاش ہونا، فنا ہونا، نیست ونابود ہونا...... تألّہ: باخدا ہونا، اللہ والا ہونا

...... المتألهون: هم علماء الحكمة الإلٰهية...... الرأى الثاقب (سوراخ کرنے والی رائے یعنی روشن رائے جو زیرِغور مسئلہ میں سوراخ کردے یعنی حل کردے)

تشریح:

(۱) کسی حکم کو اس کی علت واقعیہ سے ثابت کرنا دلیل لمی ہے اور کسی علامت سے ثابت کرنا دلیل انی ہے، جیسے آگ دھویں کی علت ہے اور دھواں علامت ہے آگ کی،، پس اگر کسی نے بھٹی میں آگ جلتی دیکھی جس کا دھواں چمنی کے ذریعہ اوپر نکل رہا ہے اور اس نے وہ دھواں نہیں دیکھا ہے اور کہا کہ آگ موجود ہے اور جب آگ موجود ہے تو دھواں بھی موجود ہوگا، پس دھواں موجود ہے تو یہ دلیل لمی ہے۔ اور اگر کسی نے صرف چمنی سے دھواں نکلتے دیکھا اور آگ نہیں دیکھی اور کہا کہ ''دھواں موجود ہے اور جب دھواں موجود ہے تو آگ بھی موجود ہوگی، پس آگ موجود ہے'' یہ دلیل انی ہے۔

دلیل لمی کو تعلیل اور دلیل انی کو استدلال کہتے ہیں اور تعلیل، استدلال سے قوی ہوتی ہے کیونکہ علت سے معلول متخلف نہیں ہوسکتا۔ اور علامت کی یہ شان نہیں، اور شاہ صاحب کا مقصود یہ ہے کہ مبحث اول میں مجازات کو ہر قسم کے دلائل سے ثابت کیا جاچکا ہے لمية المجازاة یعنی مجازات کی علت اور إنية المجازاة یعنی مجازات کی علامت یعنی علت وعلامت دونوں طریقوں سے مجازات کو ثابت کیا جاچکا ہے۔

(۲) قوله: بحكمِ مناسبةٍ فطرية أى بسبب مناسبة البر لفطرةِ الإنسان، وبسبب اقتضاء النوع للبر (سندی)

(۳) قوله: حَسْبَمَا جربنا أى نشرح بعد تجربة، لا بسمع ولا بتخمين.

باب ——— ۱

توحید کا بیان

نیکی کے کاموں میں اصل الاصول اور بہترین نیکی توحید (ایک خدا پر ایمان لانا) ہے اور توحید کی اہمیت چار وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ: نیک بختی حاصل کرنے کے لئے جو چار صفات ضروری ہیں (دیکھئے مبحث چہارم کا باب چہارم) ان میں سب سے اہم صفت اخبات (بارگاہ خداوندی میں نیازمندی) ہے۔ اور اس صفت کا حصول توحید پر موقوف ہے، کیونکہ چند خداؤں کا پرستار ششدر رہتا ہے، وہ کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ سورۃ الزمر آیت ۲۹ میں موحد ومشرک کی مثال بیان کی گئی ہے کہ ایک غلام وہ ہے جس میں کئی ساجھی ہیں، جن میں ضدا ضدی بھی ہے اور دوسرا غلام پورا کا پورا ایک ہی شخص کا ہے،

تو کیا ان دونوں غلاموں کی حالت یکساں ہوسکتی ہے؟! یعنی مشرک ہمیشہ ڈانواڈول رہتا ہے، کبھی غیر اللہ کی طرف دوڑتا ہے، کبھی خدا کی طرف، پھر غیر اللہ میں سے بھی کسی ایک پر وہ مطمئن نہیں ہوتا، کبھی کسی کی طرف رجوع کرتا ہے کبھی کسی کی طرف، ایسی صورت میں کسی ایک کے ساتھ کمال نیازمندی کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ اخبات و نیازمندی تو خالص توحید ہی سے پیدا ہوسکتی ہے پس اب قیاس کی صورت یہ بنے گی کہ: ''سعادت حقیقیہ کا حصول اخبات پر موقوف ہے، اور اخبات کی تحصیل توحید پر موقوف ہے پس نیک بختی اور سعادت مندی توحید پر موقوف ہوگی''۔

دوسری وجہ: نیک بختی کی تحصیل جن صفاتِ اربعہ پر موقوف ہے، ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی دو تدبیریں ہیں: ایک علمی دوسری عملی، اور دونوں میں مفید تر علمی تدبیر ہے۔ اور اس کی بنیاد اور اس کا مدار توحید اور صفات باری تعالیٰ کی صحیح معرفت پر ہے (تفصیل کے لئے مبحث چہارم، باب پنجم ملاحظہ فرمائیں) اور سعادت کی تحصیل انسان کی غایت قُصویٰ (سب سے بڑا مقصد) ہے پس اس کے موقوف علیہ یعنی توحید کا بھی یہی درجہ ہوگا۔

تیسری وجہ: توحید یعنی ایک خدا پر ایمان لانے سے انسان کی پوری توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے۔ اور عمدہ طریقہ پر اللہ کے ساتھ وصل کی نفس کے اندر استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جو ایک خدا پر ایمان نہیں رکھتا، بلکہ در بدر بھٹکتا ہے، وہ کہیں کا بھی نہیں رہتا۔ سورۂ لقمان آیت ۲۲ میں ہے کہ: ''جو شخص اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو، تو اس نے بڑا ہی مضبوط حلقہ (کڑا) تھام لیا'' اور وہ ہلاکت وخسران سے محفوظ ہوگیا۔ اب وہ توجہ تام کی وجہ سے لحظہ بہ لحظہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا رہے گا، تا آنکہ اس کو وصال میسر آجائے گا۔

چوتھی وجہ: احادیث شریفہ میں توحید کی اہمیت اور عظمتِ مرتبہ پر تنبیہ وارد ہوئی ہے اور اس کو تمام انواع بر (نیکی کے کاموں) میں ''دل'' کی حیثیت دی گئی ہے یعنی جس طرح جسم کے صلاح وفساد کا مدار دل پر ہے، وہ سنورتا ہے تو تمام اعضاء سنور جاتے ہیں اور وہ بگڑتا ہے تو تمام اعضاء کے اعمال غلط ہو جاتے ہیں، اسی طرح نیکی کے کاموں کی قبولیت وعدم قبولیت کا مدار توحید پر ہے۔ اگر ایمان درست ہے تو ہر نیکی مقبول ہے۔ اور ایمان میں کھوٹ ہے تو ہر نیکی ضائع ہے۔

اور توحید کا یہ مقام ومرتبہ روایات سے اس طرح ثابت ہے کہ احادیث میں بلاشرط، عموم واطلاق کے ساتھ یہ بات آئی ہے کہ: ''جس کی موت اس حالت میں ہو کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تو وہ جنت میں داخل ہوگا'' (مشکوۃ شریف حدیث نمبر ۲۶ و ۳۸) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ: ''دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے'' (مشکوۃ حدیث نمبر ۲۵ و ۳۶) اور مسلم شریف ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ: ''وہ شخص جنت سے روکا نہیں جا۔۔۔گا'' (مسلم شریف ۱: ۲۲۶ مصری) احادیث میں اس قسم کی اور بھی تعبیرات آئی ہیں۔ مثلاً متفق علیہ حدیث میں ہے کہ أدخلہ اللہ الجنۃَ، علی ما کان من العمل (اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے، خواہ اس نے کچھ بھی عمل کیا ہو) (مشکوۃ شریف حدیث نمبر ۲۷)

اور مسلم شریف میں حدیث قدسی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:"جو شخص مجھ سے زمین کے برابر گناہ لے کر ملے اور اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو، تو میں اس سے اسی کے بقدر مغفرت کے ساتھ ملوں گا" (جامع الاصول ۱۰:۳۴۰)

﴿باب التوحيد﴾

أصلُ أصولِ البِرِّ، وعمدةُ أنواعه: هو التوحيد؛ وذلك: لأنه يتوقف عليه الإخباتُ لرب العالمين، الذى هو أعظم الأخلاق الكاسبةِ للسعادة، وهو أصل التدبير العلمي الذى هو أفيدُ التدبيرين، وبه يحصل للإنسان التوجُّهُ التامُّ تلقاءَ الغيب، وتستعد نفسُه للُّحوق به بالوجه المقدس، وقد نبه النبيُّ صلى الله عليه وسلم على عِظَمِ أمره، وكونِهِ من أنواع البر بمنزلة القلب: إذا صلَح صلَحَ الجميعُ، وإذا فسد فسدالجميعُ، حيث أطلق القولَ فيمن مات لايشرك بالله شيئا: ﴿أنه دخل الجنة﴾ أو﴿حَرَّمه اللهُ على النار﴾أو﴿ لايُحْجَبُ من الجنة﴾ ونحوَ ذلك من العبارات، وحكى عن ربه تبارك وتعالىٰ:﴿ ومن لَقِيَنِيْ بِقِرَابِ الأرض خطيئةً لايشرك بي شيئاً، لقيتُه بمثله مغفرةً﴾

ترجمہ: نیکی کے کاموں میں اصل الاصول اور اس کی انواع (اقسام) میں سب سے عمدہ یعنی سب کی بنیاد: توحید ہے۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ رب العالمین کے حضور میں اخبات (انکساری) توحید پر موقوف ہے۔ اور اخبات وہ صفت ہے جو سعادت کو حاصل کرنے والے اخلاق میں سب سے بڑی (اہم) صفت ہے — اور توحید تدبیر علمی کی بنیاد ہے، جو دونوں تدبیروں میں مفید ترین تدبیر ہے —— اور توحید کی وجہ سے انسان کو غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ تام حاصل ہوتی ہے اور نہایت عمدہ طریقہ پر غیب کے ساتھ ملنے کی نفس کے اندر استعداد پیدا ہوتی ہے — اور نبی کریم ﷺ نے توحید کی جلالت شان پر اور اس کے انواع بر میں بمنزلۂ دل ہونے پر تنبیہ فرمائی ہے، جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو سب ٹھیک ہوتے ہیں اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سب بگڑ جاتے ہیں اس طرح کہ آپؐ نے بے قید (تعیم کے ساتھ) اس شخص کے بارے میں جس کی موت اس حال میں آئی ہو کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، ارشاد فرمایا ہے کہ:"وہ جنت میں جائے گا" یا "دوزخ پر اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے" یا "وہ جنت سے نہیں روکا جائے گا" اور اس قسم کی (دیگر) تعبیرات۔ اور آپ ﷺ نے اپنے پروردگار تبارک وتعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ:"جو شخص مجھ سے ملے زمین کے برابر خطاؤں کے ساتھ، درانحالیکہ اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو، تو میں اس سے اسی کے بقدر مغفرت کے ساتھ ملوں گا"

لغات: بالوجه المقدس اى بالوجه الأحسن (سندى) ... قِرابُ الشيئ (قاف کے کسرہ اور ضمہ کے

ساتھ): اندازے میں برابر۔

توحید کے چار مرتبے

جاننا چاہئے کہ توحید کے چار مرتبے ہیں:

پہلا مرتبہ: توحیدِ ذات کا ہے یعنی صرف اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود ماننا، کسی اور کو اس صفت کے ساتھ متصف نہ ماننا۔

واجب: وہ ہستی ہے جس کا عدم (نہ ہونا) ممتنع ہو یعنی اس کا وجود (ہونا) ضروری ہو۔ وجوب، وَجَبَ یَجِبُ کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں ثابت ہونا، لازم ہونا۔ اور وَاجِبٌ (اسم فاعل) بمعنی ثابت ہے۔ اور واجب الوجود کے معنی ہیں ثابت الوجود اور لازم الوجود —— پھر واجب کی دو قسمیں ہیں: واجب لذاتہ اور واجب لغیرہ۔

۱- واجب لذاتہ: وہ ہستی ہے جس کا وجود ذاتی ہو یعنی خانہ زاد ہو، وہ اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہ ہو۔ ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور کوئی ہستی واجب لذاتہ نہیں ہے۔

۲- واجب لغیرہ: وہ ہستی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجود ملا ہو، مگر وہ کبھی معدوم نہ ہو، جیسے عقول عشرہ فلاسفہ کے خیال کے مطابق واجب لغیرہ ہیں، مگر اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی چیز واجب لغیرہ نہیں ہے۔

دوسرا مرتبہ: توحید خلق کا ہے یعنی عرش، آسمان، زمین اور دیگر تمام جواہر کا خالق صرف اللہ تعالیٰ کو خالق ماننا۔

دنیا میں جو بھی چیز موجود ہے وہ یا تو جوہر ہوگی یا عرض:

جوہر: وہ ممکن ہے جو محل کے بغیر موجود ہو سکے یعنی وہ کسی ایسے محل کا محتاج نہ ہو جو اس کو موجود کرے، جیسے کپڑا، کتاب، قلم وغیرہ بے شمار چیزیں جواہر ہیں۔

عرض: وہ ممکن ہے جو کسی محل میں پایا جائے یعنی وہ پائے جانے میں، باقی رہنے میں اور متمکن ہونے میں کسی ایسے محل کا محتاج ہو جو اس کو سہارا دے، جیسے مقدار، زمانہ، اعداد، کیفیات، الوان، احوال، صفات، ملکات اور افعال عباد وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام اقوام جواہر کا خالق صرف اللہ تعالیٰ کو مانتی ہیں اور شاہ صاحب نے اسی کو توحید کا دوسرا مرتبہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ آگے اس کو متفق علیہ بتلایا ہے۔ اور اعراض کا خالق گمراہ اقوام غیر اللہ کو بھی مانتی ہیں مثلاً شفا دینا، بیمار کرنا، فقر سے ہمکنار کرنا وغیرہ کا خالق مشرکین دیوی دیوتاؤں اور اولیاء کو بھی مانتے ہیں اور معتزلہ تو افعال عباد کا خالق خود بندوں کو مانتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ توحید کے ان دونوں مرتبوں سے آسمانی کتابوں میں بحث نہیں کی گئی۔ کیونکہ ان میں کسی کا اختلاف نہیں تھا۔ عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ جو قرآن کریم کے اولین مخاطب تھے، توحید کی ان دونوں قسموں کے قائل تھے۔ بلکہ قرآن کریم کی صراحت کے مطابق توحید کے یہ دونوں مرتبے مقدمات مسلمہ میں سے

تھے۔اس لئے قرآن کریم نے ان دونوں مرتبوں کو ''مسلمہ باتوں'' کی طرح ذکر فرمایا ہے ان پر دلائل قائم نہیں کئے۔

تیسرا مرتبہ: توحید تدبیر کا ہے یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا نظم وانتظام صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہی کائنات کے مدبر ومنتظم ہیں، ان کے ساتھ کائنات کے نظم وانتظام میں کوئی شریک نہیں ہے۔ وہی پروردگار وپالنہار ہیں۔ اس مرتبہ کا دوسرا نام توحید ربوبیت ہے۔

چوتھا مرتبہ: توحید الوہیت کا ہے یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہیں۔ بندگی اور عبادت انہیں کا حق ہے۔ان کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

توحید کے یہ دونوں آخری مرتبے باہم مربوط اور لازم وملزوم ہیں یعنی تدبیر اور عبادت کے درمیان فطری ارتباط اور عادی تلازم ہے، اس لئے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکے، جو مدبر ومنتظم اور پروردگار وپالنہار ہوگا وہی عبادت کا حق دار ہوگا۔ اور عبادت اسی کا حق ہے جو کائنات کا نظم وانتظام اور پروردگاری کرتا ہے۔

نوٹ: توحید کے ان آخری دومرتبوں میں اختلاف ہے جو آگے آرہا ہے۔

واعلم أن للتوحيد أربعَ مراتبَ:

إحداها: حَصْرُ وجوبِ الوجودِ فيه تعالى، فلا يكون غيره واجبًا.

والثانية: حصر خلق العرش، والسماوات والأرض، وسائر الجواهر فيه تعالى —— وهاتان المرتبتان لم تَبْحَثِ الكتبُ الإلٰهيةُ عنهما، ولم يُخالف فيهما مشركو العرب، ولا اليهودُ ولا النصارى، بل القرآنُ العظيم ناصٌّ على أنهما من المقدَّمات المسلَّمة عندهم.

والثالثة: حصر تدبير السماوات والأرض وما بينهما فيه تعالى

والرابعة: أنه لايستحق غَيْرُه العبادةَ —— وهما متشابكتان متلازمتان لربط طبيعي بينهما.

ترجمہ: اور جاننا چاہئے کہ توحید کے چار درجے ہیں:

اول: وجود (ہونے) کے ضروری ہونے کو اللہ تعالیٰ میں منحصر کرنا، پس ان کے علاوہ کوئی واجب نہ ہوگا۔

دوم: عرش، آسمان، زمین اور دیگر جواہر کے پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ میں منحصر کرنا —— اور ان دو مرتبوں سے کتب الٰہیہ نے بحث نہیں کی۔ اور ان میں نہ عرب کے مشرکوں نے اختلاف کیا ہے، نہ یہود نے، اور نہ نصاریٰ نے۔ بلکہ قرآن عظیم تصریح کرتا ہے کہ توحید کے یہ دونوں مرتبے ان لوگوں کے نزدیک ''مسلم باتوں'' میں سے تھے۔

سوم: آسمانوں، زمین اور جو کچھ اُن دونوں کے درمیان ہے، اس کے نظم وانتظام کو اللہ تعالیٰ میں منحصر کرنا۔

چہارم: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں —— اور یہ دونوں مرتبے باہم گتھے ہوئے اور لازم

وملزوم ہیں، ان دونوں کے درمیان کسی فطری ارتباط کی وجہ سے۔

لغات: نَاصٌّ (اسم فاعل) نَصَّ (ن) نَصًّا الشيئ: نمایاں کرنا، بلند کرنا۔ نَصَّ عليه صراحت کرنا..... تَشَابَكَتِ الأمورُ: باہم مختلط ہونا..... تَلاَزَمَ الشيئان: ایک دوسرے کے ساتھ لازم ہونا، دو چیزوں کا باہم لازم وملزوم ہونا۔

تشریح: **قوله: لربط إلخ ای بين التدبير والعبادة ارتباط فطری وتلازم عادی، لاينفك أحدهما عن الآخر (سندی)**

توحید تدبیر اور توحید الوہیت میں اختلاف

توحید کے آخری دو مرتبوں میں یعنی توحید تدبیر اور توحید الوہیت (معبودیت) میں مختلف جماعتوں نے اختلاف کیا ہے۔ ان کے بڑے گروہ تین ہیں:

پہلا گروہ: ستارہ پرستوں کا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ستارے پرستش کا استحقاق رکھتے ہیں، اور امور دنیا میں ان کی عبادت مفید ہے، اور ان کے سامنے حاجتیں پیش کرنا برحق ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہمیں تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ روزمرہ کے واقعات میں، سعادت وشقاوت میں اور تندرستی اور بیماری میں ستاروں کی واضح تاثیرات ہیں، ان کے خیال میں ستارے جاندار مخلوقات ہیں۔ ان کی مادے سے مجرد ارواح ہیں یعنی وہ روحانی مخلوقات ہیں اور سمجھ بوجھ رکھتی ہیں اور وہی ارواح ستاروں کی حرکت کا باعث ہیں، جو لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں ان کے احوال سے وہ باخبر رہتی ہیں، کبھی غافل نہیں ہوتیں۔ اس قسم کے وساوس کی وجہ سے انھوں نے ستاروں کے ہیکل (مجسمے) بنائے اور ان کی پوجا شروع کردی۔ مثلاً ہندوستان کے ستارہ پرستوں نے سورج کا ہیکل (مجسمہ) ایسی مورت بنائی ہے جس کے ہاتھ میں سرخ ہیرا ہے اور چاند کا ہیکل ایک بچھڑا بنایا ہے جسے چار آدمی کھینچتے ہیں اور مورتی کے ہاتھ میں ہیرا ہے (مِلَلُ ونِحَلُ شہرستانی ۲: ۲۵۸)

> **وقد اختلف فيهما طوائفُ من الناس، مُعْظَمُهم ثلاثُ فِرَقٍ:**
>
> **[۱] النَّجَّامون: ذهبوا إلى أن النجوم تستحق العبادةَ، وأن عبادتَها تنفع في الدنيا، ورفعُ الحاجاتِ إليها حقٌّ، قالوا: قد تَحَقَّقْنَا أن لها أثرًا عظيمًا في الحوادثِ اليومية، وسعادةِ المرء وشَقَاوته، وصحتِه وسُقْمِه، وأن لها نفوسًا مجردة عاقلة تبعثُها على الحركة، ولاتَغْفَلُ عن عُبَّادها، فَبَنَوْا هياكلَ على أسمائها، وعَبَدُوها.**

ترجمہ: اور ان دو مرتبوں میں مختلف لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ اور ان کے بڑے فرقے تین ہیں:

(۱) ستارہ پرست ہیں۔ وہ لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ستارے پرستش کے مستحق ہیں اور (اس طرف گئے ہیں) کہ ان کی عبادت دنیا میں مفید ہے اور ان کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنا برحق ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ہمیں تحقیق

سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ان ستاروں کی بڑی تاثیر ہے روزمرہ کے واقعات میں، آدمی کی نیک بختی اور بدبختی میں اور اس کی تندرستی اور بیماری میں اور یہ بات بھی متحقق ہوگئی ہے کہ ستاروں کے لئے ایسے نفوس (ارواح) ہیں جو غیر مادی اور سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں، جو ان کو حرکت کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی پرستش کرنے والوں کی طرف سے غافل نہیں ہوتے۔ پس ان لوگوں نے ان ستاروں کے نام پر ہیکل (مجسمے) بنائے اور ان کی پوجا کرنے لگے۔

لغات: تَحَقَّقَ الرجلُ الأمرَ: یقین کرنا، دلیل سے جاننا...... الْهَیْكَلُ جمع هَیَاكِلُ: مجسمہ، پیکر۔ قوله: نفوسا مجردة أی عن المادة أو عن الألواث البهیمیة، قال العلامة السندی رحمه الله: والصحیح أنه لیس لها نفوس ولا أرواح، بل هی جمادات وأما حركة النجوم وغیرها من الأجرام السماویة فبید الملائكة المؤكلة علیها اه

☆ ☆ ☆

دوسرا گروہ: مشرکین یعنی مورتی پوجنے والوں کا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کی طرح بڑی بڑی چیزوں کا منتظم اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور کسی بھی معاملہ میں قطعی فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ وہ لوگ ان دونوں باتوں میں مسلمانوں کے ہمنوا ہیں۔ مگر دیگر امور میں وہ مسلمانوں کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ وہ تین باتیں کہتے ہیں۔

پہلی بات: مشرکین کہتے ہیں کہ جو نیک بندے ہم سے پہلے گذرے ہیں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب بندگی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قربِ خاص حاصل کرلیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو خلعتِ الوہیت سے سرفراز کردیا ہے اور وہ دیگر مخلوقات کی بندگی کے حق دار ہوگئے ہیں، جیسے کوئی غلام بادشاہ کی شاندار خدمت کرتا ہے تو بادشاہ خوش ہوکر اس کو ''شاہی پوشاک'' عطا کرتا ہے اور اپنی مملکت کے کچھ حصہ کا نظم ونسق اس کو سونپ دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس علاقہ کے لوگوں کی طرف سے سمع وطاعت (بات سننے اور حکم ماننے) کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان اولیاء کو بعض بعض امور کا اختیار دیدیا ہے اس لئے ان کی بندگی ضروری ہے۔

مشرکین کی یہ بات محض بے دلیل ایک دعوی ہے۔ گوکہ یہ بات صحیح ہے کہ نیک لوگوں نے خدا کی خوب بندگی کرکے قربِ خاص حاصل کرلیا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے خوش ہوکر ان کو خلعتِ الوہیت پہنایا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں، اور بادشاہ اور غلام کی تمثیل سے یہ بات ثابت کرنا غائب کو شاہد پر قیاس کرنا ہے جو کسی طرح درست نہیں قرآن کریم میں ان کا یہ دعوی یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ حکومت اور ملک صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، سورۃ الانعام آیت ۵۶ و ۵۷ میں ارشاد پاک ہے:

''آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کی تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے خیالات کا اتباع نہ کروں گا (مشرکین کا یہ خیال وہی ہے جو اوپر

مذکور ہوا) کیونکہ اس حالت میں تو میں بے راہ ہو جاؤں گا، اور راہ راست پر چلنے والوں میں نہ رہوں گا۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو میرے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل ہے مگر تم اس کی تکذیب کرتے ہو (سو) جس چیز کا تم تقاضا کررہے ہو (یعنی انکار پر عذاب لے آنا) وہ میرے پاس نہیں (یعنی میرے اختیار میں نہیں، اور وہ واضح دلیل یہ ہے کہ) حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ اللہ تعالیٰ واقعی بات کو بتلا دیتا ہے اور سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا وہی ہے"

اور سورۃ الکہف آیت ۲۶ میں ارشاد ہے:

"آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اصحاب کہف کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کو زیادہ جانتا ہے، تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے، وہ کیسا کچھ دیکھنے والا ہے اور کیسا کچھ سننے والا ہے۔ ان لوگوں کا خدا کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا ﴿ وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴾

اور سورۃ الفاطر آیت ۱۳ میں ہے کہ:

"وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے، اس نے سورج کو اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے، ہر ایک وقت مقرر تک چلتے رہیں گے، یہی اللہ تعالیٰ تمہارا پروردگار ہے، اسی کے لئے سلطنت ہے ﴿ لَهُ الْمُلْكُ ﴾ اور اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے"

یہی استدلال سورۃ الزمر آیت ۶ میں بھی ہے۔ پس جب حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور وہ اپنے حکم میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتے اور ملک اور سلطنت بھی انہی کی ہے تو اب یہ دعوی کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقرب بندوں کو خلعت الوہیت سے سرفراز کیا ہے اور ان کو بعض امور کا اختیار دے دیا ہے؟

دوسری بات: مشرکین کا یہ بھی استدلال ہے کہ اللہ تعالیٰ تو غایت درجہ برتر وبالا ہیں، ہر شخص کی براہ راست ان تک پہنچ کہاں؟ درمیان میں واسطہ ضروری ہے جو ہم کو اللہ سے قریب کرے۔ یہ وسائط اولیائے کرام اور ان کے پیکر ہائے محسوس اصنام ہیں، ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (زمر ۳) مشرکین کے خیال میں اللہ کی بندگی اس وقت تک مقبول نہیں، جب تک کہ اس کے ساتھ اولیاء کی پرستش شامل نہ کی جائے اس لئے ان کے نزدیک صرف اللہ کی عبادت کافی نہیں، بلکہ ساتھ میں اولیاء کی اور اصنام کی پرستش بھی ضروری ہے۔

مشرکین کا یہ استدلال بھی باطل ہے، گو کہ یہ بات صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ غایت درجہ برتر وبالا ہیں، مگر ساتھ ہی وہ بندوں سے غایت درجہ قریب بھی ہیں۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۶ میں ہے:

"اور جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں، تو (آپ میری طرف سے بتا دیجئے کہ) میں قریب ہی

ہوں، درخواست کرنے والے کی عرضی کو منظور کرلیتا ہوں جب وہ میرے حضور درخواست کرتا ہے۔ سولوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کریں، اور مجھ پر یقین رکھیں شاید وہ لوگ رشد وفلاح حاصل کرسکیں"

اور سورہ ق آیت ۱۶ میں ہے:

''اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں، ہم اس کو جانتے ہیں اور ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں"

اور بھلا کیوں قریب نہ ہوں؟ جو خالق و مالک ہیں وہ اپنی مخلوق کے احوال سے بے خبر کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ اور جب وہ قریب ہیں اور بندوں کی عرضیاں براہ راست سنتے ہیں تو پھر درمیان میں وسائط گردان کر دوری پیدا کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟!

تیسری بات: مشرکین کا ایک استدلال یہ ہے کہ اولیاء مرنے کے بعد سنتے، دیکھتے ہیں، وہ اپنے پرستاروں کی سفارش، ان کے کاموں کا نظم ونسق اور ان کی مدد کرتے ہیں، اس لئے ان کی بندگی ضروری ہے تاکہ وہ راضی رہیں، مگر چونکہ مجردات (روحانیات) کی طرف کامل توجہ نہیں ہوسکتی، اس لئے مشرکوں نے ان بزرگوں کے نام پر بت تراشے تاکہ ان کو قبلۂ توجہ بنائیں۔ غرض مورتیاں اصل معبود نہیں تھیں، صرف ''قبلہ نما'' تھیں مگر بعد میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے فرق نہیں کیا اور مورتیوں ہی کو معبود بنالیا۔

اس استدلال کی سخافت (بوداپن) اظہر من الشمس ہے۔ مورتیں محض بے جان جمادات ہیں۔ کیا ان کے چلنے والے پیر، پکڑنے والے ہاتھ، دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان ہیں؟ اور جب ان کے اعضاء اور خواس نہیں ہیں تو علم وادراک کہاں؟ اور نصرت وامداد کیوں کر ممکن ہے؟

[۲] والمشركون: وافقوا المسلمين في تدبير الأمور العظام، وفيما أبرم وجزم، ولم يترك لغيره خِيَرَةً، ولم يوافقوهم في سائر الأمور: ذهبوا إلى أن الصالحين من قَبْلِهم عبدوا الله وتقربوا إليه، فأعطاهم اللهُ الألوهيةَ، فاستَحَقُّوْا العبادةَ من سائر خلق اللهِ، كما أن مَلِكَ الملوكِ يخدِمه عبدُه، فَيُحْسِنُ خدمتَه، فَيُعطيه خِلْعَةَ الْمِلك، ويفوِّض إليه تدبيرَ بلدٍ من بلاده، فيستحق السمعَ والطاعةَ من أهل ذلك البلد.

وقالوا: لاتُقْبل عبادةُ الله إلا مضمومةً بعبادتهم، بل الحق في غاية التعالى، فلا تفيد عبادته تقربا منه، بل لابد من عبادة هؤلاء، ليقَرِّبو إلى الله زلفٰى.

وقالوا: هؤلاء يسمعون ويبصرون ويَشْفَعون لعُبَّادهم ،ويدبرون أمورَهم، وينصرونهم، فنحتوا على أسمائهم أحجارًا، وجعلوها قبلة عند توجُّههم إلى هؤلاء، فخلف من بعدهم خَلْفٌ

فلم يَفطِنوا للفرق بين الأصنام، وبين من هي على صورته، فظنوها معبوداتٍ بأعيانها.
ولـذلك ردَّ اللّه تعالى عليهم تارةً بالتنبيه على أن الحكم والملك له خاصة، وتارة ببيان أنها جماداتٌ﴿ اَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَا؟ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَا؟ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَا؟ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا؟﴾

ترجمہ: (۲) اور مشرکین مسلمانوں کے ساتھ ہم نوا ہیں بڑی چیزوں کے نظم ونسق میں اور قطعی اور بالجزم فیصلہ کرنے میں، وہ لوگ کسی اور کو اس کا کوئی اختیار نہیں دیتے۔ مگر وہ دیگر امور میں مسلمانوں کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ وہ اس طرف گئے ہیں کہ ان سے پہلے جو نیک بندے گزرے ہیں انھوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کی ہے اور انھوں نے اللہ کا قرب حاصل کرلیا ہے۔ پس اللہ نے ان کو الوھیت (خدائی) بخشی ہے، پس وہ اللہ کی دیگر مخلوق کی پرستش کے حقدار ہوگئے ہیں، جس طرح کہ شہنشاہ کی خدمت اس کا غلام کرتا ہے، پس وہ اس کی بہترین خدمت کرتا ہے تو بادشاہ اس کو ''شاہی پوشاک'' عطا فرماتا ہے۔ اور اس کو اپنی مملکت کے کچھ حصہ کا نظم ونسق سپرد کردیتا ہے، پس وہ اس علاقہ والوں کی طرف سے سمع وطاعت کا مستحق ہوجاتا ہے۔

اور مشرکین یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس وقت تک مقبول نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے ساتھ اُن نیک لوگوں کی پرستش شامل نہ کی جائے، بلکہ حق تعالیٰ تو غایت درجہ برتر وبالا ہیں، پس (صرف) ان کی عبادت سے ان کی نزدیکی حاصل نہیں ہوسکتی، بلکہ ان نیک لوگوں کی پرستش بھی ضروری ہے تاکہ وہ اللہ کا نہایت مقرب بندہ بنادیں۔

اور مشرکین یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (یعنی اولیاء) سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور اپنے پرستاروں کی سفارش کرتے ہیں اور ان کے کاموں کا نظم ونسق کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں، پس انھوں نے ان بزرگوں کے ناموں پر پتھر تراشے تاکہ وہ ان اصنام کو قبلہ بنائیں، جبکہ وہ ان بزرگوں کی طرف متوجہ ہوں، پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جو فرق نہیں سمجھ سکے مورتیوں کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن کی شکل پر یہ مورتیاں ہیں۔ پس ان لوگوں نے ان مورتیوں ہی کو بعینہٖ معبود سمجھ لیا۔

اور اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے کبھی تو ان پر رد کیا اس بات پر تنبیہ کرکے کہ حکم اور ملک صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، اور کبھی یہ بیان فرما کر کہ وہ مورتیاں محض جمادات (بے جان چیزیں) ہیں ''کیا ان کے ایسے پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں؟ یا ان کے ایسے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑیں؟ یا ان کی ایسی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھیں؟ یا ان کے ایسے کان ہیں جن سے وہ سنیں؟'' (سورۃ الاعراف آیت ۱۹۵)

لغات:

فیما أبْرَم میں ما مصدریہ ہے أي في الإبرام والجزم...... الخِيَرَةُ (مصدر) انتخاب کرنا، اختیار ہونا......

التعالي (مصدر) بلندی...... الزُّلفى: نزدیکی، درجہ، مرتبہ...... فَطِنَ (ن،ک،س) للأمر: ادراک کرنا، سمجھنا...... الخِلْعَةُ: وہ کپڑے جو عزت کے طور پر ملیں خِلعةُ المَلِكِ أى خِلعة تدل على ان مَلِك الأملاك جعله مَلِكًا (سندی)

☆ ☆ ☆

تیسرا گروہ: عیسائیوں کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا قرب خاص حاصل ہے، اور ان کا رتبہ تمام مخلوق سے بلند ہے سورۂ آل عمران آیت ۳۹ و ۴۵ میں آپ کو کلمة الله (اللہ کا بول) کہا گیا ہے، اس لئے ان کو "اللہ کا بندہ" نہیں کہنا چاہئے، ایسا کہنے سے ان کو دوسرے بندوں کے برابر کرنا لازم آئے گا اور اس میں ان کی کسر شان اور ان کے مقام قرب خاص کو نظر انداز کرنا ہے۔ پھر عیسائیوں میں اختلاف ہوا کہ آپ کی اس خصوصیت کی تعبیر کس لفظ سے کی جائے ان کی دو جماعتیں ہو گئیں۔

ایک جماعت: آپ کو "اللہ کا بیٹا" کہنے لگی، کیونکہ باپ بیٹے پر مہربان ہوتا ہے اور اپنی نگاہوں کے سامنے اس کی پرورش کرتا ہے۔ اور اس کا درجہ بندوں (غلاموں) سے بلند ہوتا ہے، پس یہی نام ان لوگوں کے خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے موزون ہے۔

اور دوسری جماعت: نے سیدھا آپ کو "خدا" کہنا شروع کر دیا، ان کے خیال میں واجب تعالیٰ نے آپ میں حلول کیا ہے۔ حلول کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز میں اس طرح داخل ہونا کہ دونوں میں تمیز نہ ہو سکے یعنی اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام "شیر وشکر" ہو گئے ہیں اور دوئی ختم ہو گئی ہے، اسی وجہ سے آپ سے ایسے کارنامے صادر ہوئے ہیں جو کسی انسان سے جانے پہچانے نہیں گئے مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو چنگا کرنا اور گارے سے پرندہ بنا کر اس کو زندہ کرنا۔ اور جب آپ میں اللہ تعالیٰ موجود ہیں تو آپ کا کلام، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور آپ کی عبادت اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

پھر بعد میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے وجہ تسمیہ نہیں سمجھی کہ آپ کو "اللہ کا بیٹا" یا "اللہ" کیوں کہا گیا ہے اور انھوں نے تقریباً آپ کو حقیقی بیٹا اور ہر اعتبار سے "واجب" سمجھ لیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر ان کی تردید کی کہ اللہ کے اولاد کہاں ہو سکتی ہے اور اس کی کوئی بیوی تو ہے نہیں؟!" (سورۃ الانعام آیت ۱۰۱) اور جو بعض "پاگلوں" نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو اللہ کی بیوی کہہ دیا ہے تو اس عقیدہ کو عیسائیوں میں قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ اور کہیں اس طرح تردید کی کہ صفات کمالیہ لوازم ذات واجب سے ہیں، غیر اللہ میں وہ معدوم ہیں، پھر عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے یا اللہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ سورۃ البقرۃ آیات ۱۱۶ و ۱۱۷ میں ارشاد ہے:

"اور انھوں نے کہا کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے۔ اس کی ذات اولاد سے پاک ہے، بلکہ اسی کا مملوک ہے جو کچھ بھی

آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کے محکوم ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجد (نیا پیدا کرنے والا) ہے۔ جب وہ کسی کام کا ہونا طے کرتا ہے، تو بس یہ فرماتا ہے کہ ''ہوجا'' پس وہ ہوجاتی ہے''

پس جو مملوک ومحکوم ہو وہ خدا کا بیٹا یا خدا کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور جو موجد کائنات اور قادر مطلق ہو اور جس کے اشارہ پر چیزیں وجود میں آجاتی ہوں اسے اولاد اور مددگار کی کیا حاجت ہے؟!

نوٹ: تینوں جماعتوں کے پاس لمبے چوڑے دعاوی اور بے شمار خرافات ہیں۔ شہرستانی نے اَلْمِلَلُ والنِّحَل میں صابئیں، کواکب پرستوں اور روحانیت والوں کا اور موحدوں کا ایک لمبا مناظرہ لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے پہلے گروہ کے دعاوی کا علم ہوگا۔ اور مشرکین کی خرافات نومسلم سلفی عالم مولانا عبیداللہ پائلی (متوفی ۱۳۱۰ھ) کی مشہور زمانہ کتاب تحفۃ الہند میں دیکھی جاسکتی ہے اور عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث وابنیت کی بھول بھلیوں کے لئے اظہار الحق وغیرہ ملاحظہ فرمائیں۔ قرآن کریم نے بھی توحید کے آخری دو مرتبوں سے جگہ جگہ بحث کی ہے۔ اور کافروں کے وساوس وشبہات کی سیر حاصل تردید کی ہے۔

[۳] والنصارى: ذهبوا إلى أن للمسيح عليه السلام قُربا من الله، وعُلُوًّا على الخلق، فلاينبغي أن يُسمى عبدًا، فَيُسَوَّى بغيره، لأن هذا سوءُ أدب معه، وإهمالٌ لقربه من الله، ثم مال بعضُهم عند التعبير عن تلك الخصوصية إلى تسميته ابنَ الله، نظرًا إلى أن الأب يرحم الابن، ويُرَبِّيْه على عينيه، وهو فوقَ العبيد، فهذا الاسم أولى به؛ وبعضُهم إلى تسميته بالله، نظرًا إلى أن الواجب حَلَّ فيه، وصار داخلَه، ولهذا يصدُر منه آثارٌ لم تُعْهد من البشر، مثلُ إحياء الأموات وخلق الطير؛ فكلامُه كلامُ الله، وعبادتُه هي عبادة الله، فخلف من بعدهم خَلْفٌ لم يَفْطِنوا لوجه التسمية، وكادوا يجعلون الْبُنُوَّةَ حقيقية، أو يزعمون أنه الواجب من جميع الوجوه، ولذلك ردَّ اللّٰهُ تعالى عليهم تارة بأنه لاصاحبة له، وتارة بأنه: ﴿ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، إِنَّما أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُوْلَ لَهُ: كُنْ ،فَيَكُوْنُ﴾

وهذه الْفِرَقُ الثلاثُ لهم دعاوِى عريضة، وخُرافات كثيرة، لاتخفى على المتتبع؛ وعن هاتين المرتبتين بحث القرآن العظيم، ورد على الكافرين شبهتهم ردًّا مُشْبعا.

ترجمہ: (۳) اور عیسائی اس طرف گئے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا سے قرب خاص حاصل ہے، اور تمام مخلوقات سے ان کا رتبہ بلند ہے اس لئے ان کو ''بندہ'' کہنا مناسب نہیں، ایسا کہنے سے ان کو دوسرے بندوں کے برابر کرنا لازم آئے گا، اس لئے کہ یہ (برابر کرنا) ان کی شان میں بے ادبی ہے اور ان کے تقرب الٰہی کے لحاظ کو ترک

کرنا ہے۔ پھر بعض لوگ اس خصوصیت کی تعبیر کے وقت ان کو "اللہ کا بیٹا" کہنے کی طرف مائل ہوئے، اس بات پر نظر کرتے ہوئے کہ باپ بیٹے پر مہربانی کرتا ہے، اور اپنی نگاہوں کے سامنے اس کی پرورش کرتا ہے اور اس کا درجہ غلاموں سے بلند ہوتا ہے، پس یہ نام ان کے لئے موزون ہے — اور بعض عیسائی آپ کا "خدا" نام رکھنے کی طرف مائل ہوئے، اس بات کی طرف نظر کرتے ہوئے کہ واجب تعالیٰ نے آپ میں حلول کیا ہے اور واجب تعالیٰ آپ کے اندر ہو گئے ہیں اور اسی وجہ سے آپ سے ایسے آثار صادر ہوئے ہیں جو کسی بشر سے پہچانے نہیں گئے، جیسے مردوں کو زندہ کرنا، اور پرندوں کو پیدا کرنا پس آپ کا کلام، اللہ کا کلام ہے اور آپ کی عبادت اللہ ہی کی عبادت ہے — پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے وجہ تسمیہ نہیں سمجھی اور قریب تھے کہ وہ بیٹا ہونے کو حقیقی بیٹا ہونا سمجھ لیں، یا وہ آپ کو من کل الوجوہ واجب سمجھ لیں۔ اور اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے کبھی تو ان کی تردید اس طرح کی کہ اللہ کی بیوی نہیں اور کبھی اس طرح کی کہ: "وہ آسمانوں اور زمین کے موجد ہیں جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں کہ ہو جا پس وہ فوراً ہو جاتی ہے"۔

اور ان تینوں جماعتوں کے پاس لمبے چوڑے دعوے اور بے شمار خرافات ہیں، جو تلاش کرنے والے پر پوشیدہ نہیں ہیں، اور انہی دونوں مرتبوں سے قرآن عظیم نے بحث کی ہے۔ اور کافروں کے بوگس دلائل کی سیر حاصل تردید کی ہے۔

لغات: الدّاخل: اندرونی صار دَاخِلَه: اللہ عیسیٰ کے اندر ہو گئے۔ یہی حلول ہے۔ پس یہ جملہ پہلے جملہ کے ہم معنی ہے ...... عَهِدَ الأمرَ: پہنچانا...... دعوی کی جمع دَعَاوِی اور دَعَاوَی آتی ہیں...... الخُرافة: باطل اور لغویات، بے سروپا باتیں۔

باب —— ۲

شرک کی حقیقت کا بیان

شرک: کسی مخلوق میں واجب تعالیٰ کی صفات کو ماننے کا نام ہے۔ بہ الفاظ دیگر: شرک غیر اللہ کی عبادت کرنے کا نام ہے ان دونوں باتوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، جب اللہ کی صفات کسی مخلوق میں مان لیں گے تو اب اس مخلوق کی بندگی لازم ہے۔ اور شرک پیدا اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ کسی مخلوق سے، نبی سے یا ولی سے کوئی حیرت انگیز (خارق عادت) کام صادر ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ اس کام کو اس مخلوق کا "ذاتی" فعل تصور کرنے لگتے ہیں یعنی یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ وہ بندے اس کام کے خالق ہیں۔ پھر لوگ ان بندوں کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔

شرک کی حقیقت سمجھنے کے لئے "صفات واجب" اور "عبادت" کی حقیقت جاننی ضروری ہے۔ کیونکہ خالق اور مخلوق کی صفات بہ ظاہر یکساں نظر آتی ہیں۔ حیات (زندگی) سمع وبصر (سننا، دیکھنا) قدرت (طاقت) مشیت وارادہ شرف (بزرگی) تسخیر (تابعدار بنانا) اور نفاذ حکم وغیرہ صفات کما یہ جس طرح واجب میں پائی جاتی ہیں، مخلوق میں بھی

پائی جاتی ہیں۔ اس لئے دونوں کی صفات میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ اسی وقت شرک کی حقیقت یعنی ''صفات واجب کومخلوق میں ماننے'' کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے۔

اسی طرح ''عبادت'' کسی انتہائی درجہ تعظیم کرنے کا یا کسی کے سامنے غایت درجہ خاکساری کرنے کا نام ہے۔ نفس تعظیم اور محض خاکساری کا نام عبادت نہیں۔ لہٰذا یہ جاننا ضروری ہے کہ ''غایت تذلل'' اور ''نہایت تعظیم'' کیا ہے؟ اسی سے شرک کی حقیقت سمجھ میں آئے گی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عبادت: غایت درجہ تذلل کا نام ہے۔ تذلل کے معنی ہیں خاکساری۔ عاجزی اور فروتنی کرنا یعنی عمل سے خود کو عاجز وحقیر قرار دینا اب یہ مسئلہ حل طلب رہتا ہے کہ کونسا عمل غایت تذلل ہے اور کونسا کم تر درجہ کا؟ یہ بات دوطرح سے متعین کی جاسکتی ہے۔

(۱) عمل کی حالت دیکھ کر، مثلاً قیام (کسی کے سامنے دست بستہ کھڑا ہونا) اور سجدہ (کسی کے سامنے ماتھا زمین پر ٹیکنا) دو عمل ہیں ظاہر ہے کہ قیام میں کم تر درجہ کی فروتنی ہے اور سجدہ میں اعلی درجہ کی، کیونکہ اس سے آگے عاجزی کرنے کا کوئی درجہ باقی نہیں ہے، پس سجدہ کو عبادت کہا جائے گا اور قیام کو عبادت قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۲) نیت کے اعتبار سے، یعنی جس فعل سے ایسی تعظیم مقصود ہو جیسی بندے خدا کی کیا کرتے ہیں، وہ فعل عبادت ہے۔ اور جس فعل سے ایسی تعظیم مقصود ہو جیسی رعایا بادشاہ کی یا شاگرد استاذ کی کرتے ہیں، وہ فعل عبادت نہیں، کیونکہ یہ کم تر درجہ کی تعظیم ہے۔

امتیاز کی یہی دو صورتیں ہیں، تیسری کوئی صورت نہیں۔ مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو اور برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام کو ''سلامی کا سجدہ'' کیا تھا تو ''سجدہ'' کو مطلقاً غایت تذلل اور عبادت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پس تعیین کی صورتِ اول مفید مطلب نہیں۔ صرف دوسری صورت ہی کو معیار بنایا جاسکتا ہے مگر بات ابھی تک غیر واضح ہے، ''اللہ جیسی تعظیم'' کا کیا مطلب ہے؟ لہٰذا تفصیل سماعت فرمایئے!

جب کوئی کسی کے سامنے خاکساری کرتا ہے تو وہاں دو طرف ہوتے ہیں، ایک خاکساری کرنے والے کی جانب۔ دوسری اُس ہستی کی جانب جس کے سامنے خاکساری کی جارہی ہے۔ اور تذلل کا تحقق اس وقت ہوتا ہے جب خاکساری کرنے والے میں ضعف وناتوانی، خست وکمینگی اور عاجزی ونیازمندی کا لحاظ کیا جائے اور دوسری جانب میں قوت وبزرگی، شرف وعظمت اور تسخیر ونفاذ حکم کا لحاظ کیا جائے یعنی یہ تصور کیا جائے کہ خاکساری کرنے والا ہر اعتبار سے ضعیف وناتواں، ناچیز وہیچ اور عاجز ومغلوب ہے۔ اور جس کے سامنے خاکساری کی جارہی ہے وہ ہستی قادر مطلق، بزرگ وبرتر ہے اور ہر چیز اس کے تابع فرماں ہے اور ہر حکم اس کا نافذ ہوکر رہنے والا ہے، کوئی اس کو روک نہیں سکتا، جب دونوں جانبوں میں یہ باتیں ملحوظ ہونگی تو وہ خاکساری غایت تذلل ہوگی، ورنہ نہیں۔

صفات کمالیہ کے دو درجے: یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غایت تذلل کے لئے دونوں جانبوں میں مذکورہ بالا متضاد باتوں کا لحاظ کیسے کیا جا سکتا ہے جبکہ دونوں جانب کی صفات میں یکسانیت ہے؟ یعنی خاکساری کرنے والا اور جس کے سامنے خاکساری کرتا ہے دونوں حیات، سمع، بصر، مشیت، ارادہ، قوت، شرف، تسخیر اور نفاذ حکم وغیرہ صفات کمالیہ کے مالک ہیں۔ پھر ''خاکسار کی طرف غایت درجہ ذلت'' اور واجب تعالیٰ کی طرف غایت درجہ علو (بلندی) کیسے فرض کی جا سکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صفات کمالیہ میں اگرچہ بظاہر یکسانیت نظر آتی ہے مگر حقیقت میں دونوں کی صفات میں بون بعید اور آسمان وزمین کا فرق ہے۔ اگر آدمی مخلی بالطبع ہو کر غور کرے۔ تو یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ خود آدمی صفات کمالیہ کے دو اندازے اور دو درجے کرتا ہے۔ ایک ادنی درجہ یعنی ایسی قوت و بزرگی اور ایسی تسخیر و حکم رانی جو خود اس غور کرنے والے میں اور اس کے مانند لوگوں میں پائی جاتی ہے دوسرا اعلی درجہ یعنی ایسی قوت و شرف اور ایسی تسخیر و حکم ناطق جو اللہ تعالیٰ میں ہوتا ہے، جو حدوث و امکان کے عیب سے پاک ہیں۔ اور جس طرح یہ صفات اس مخلوق میں ہوتی ہیں جس کی طرف بفرض محال اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت منتقل مانی جاتی ہے۔

غرض دونوں طرف کی صفات میں بہت بڑا فرق ہے۔ تین مثالوں سے یہ بات واضح ہوگی:

پہلی مثال: غیب کی باتوں کو جاننے کے دو طریقے ہیں، ایک: غور وفکر کرکے اور مقدمات معلومہ (جانی ہوئی باتوں) کو ترتیب دے کر جاننا، یا دانائی اور زیرکی سے جاننا، یا خواب ورؤیا سے جاننا، یا کشف والہام کے ذریعہ جاننا۔ مغیبات کو جاننے کے ان طریقوں سے ہر کوئی استفادہ کر سکتا ہے اور بعض غیوب کو جان سکتا ہے دوسرا: غیب کا ذاتی علم جو خانہ زاد ہوتا ہے، کسی سے مستفاد نہیں ہوتا، نہ اس کی تحصیل کے لئے جتن کرنا پڑتا ہے۔ مغیبات کو جاننے کے ان دونوں طریقوں میں آسمان وزمین کا تفاوت ہے۔ پس ان سے حاصل ہونے والے علم میں بھی اسی درجہ کا تفاوت ہوگا، پہلا علم مخلوقات کا ہے اور دوسرا خالق کا۔ اور دونوں میں یکسانیت تو کجا قرب و تقارب بھی نہیں ہے۔

دوسری مثال: تاثیر یعنی متاثر کرنا، تدبیر یعنی نظم وانتظام کرنا اور تسخیر یعنی تابع فرمان کرنا اور ان کے علاوہ دیگر صفات نفوذ و غلبہ کا بھی یہی حال ہے آدمی اس کے بھی دو درجے کرتا ہے ایک بمعنی مباشرت یعنی کسی کام کو بدست خود کرنا، اپنی صلاحیتوں کو اور اپنے اعضاء کو استعمال کرنا، اشیاء کی مزاجی کیفیات: حرارت و برودت وغیرہ سے مدد لینا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر کسی کام کو انجام دینا اور کسی مادہ کو متاثر کرکے کوئی چیز بنانا، پھر اس کو اپنے زیر حکم و تصرف رکھنا، دوسرا بمعنی تکوین یعنی آلات واسباب کی احتیاج کے بغیر کسی چیز کو بنانا، جو خدا کی شان ہے کہ جب وہ کسی چیز کو نیست سے ہست کرنا چاہتے ہیں تو بس ''ہوجا'' کہتے ہیں، تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس خالق و مخلوق میں یہ صفات بہ ظاہر یکساں نظر آتی ہیں مگر درحقیقت آسمان وزمین کا تفاوت ہے، دونوں میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

تیسری مثال: اسی طرح عظمت وشرف اور قوت ومقدرت کے بھی آدمی دو درجے کرتا ہے۔ ایک: بادشاہ کی عظمت جو رعایا کی بہ نسبت اس کو حاصل ہوتی ہے، جس کا تعلق عملہ کی کثرت اور مال واسباب کی فراوانی کے ساتھ ہے یا بہادر آدمی کی اور استاذ کی عظمت، جوان کو کمزور اور شاگرد کی بہ نسبت حاصل ہوتی ہے، یہ ایسی عظمت ہے جس کو خود غور کرنے والا بھی اپنے اندر کسی درجہ میں پاتا ہے۔ دوسرا درجہ: اس عظمت کا ہے جو صرف ذات متعالی (بلند وبرتر) میں پائی جاتی ہے، جس کی کوئی نہایت ہی نہیں اور جس کو الفاظ تعبیر ہی نہیں کر سکتے غور کریں، عظمت وشرف کے ان دونوں درجوں میں کس قدر تفاوت ہے؟ کوئی مناسبت ہے ان دونوں درجوں میں؟

الغرض: آپ یہ راز پانے میں ذرا بھی سستی نہ کریں، یقین کامل کے حصول تک غور وفکر جاری رکھیں جو بھی شخص اس بات کا معترف ہے کہ ممکنات کا سلسلہ ایک ایسے واجب تعالیٰ پر منتہی ہوتا ہے جو کسی کے محتاج نہیں، وہ ضرور ان صفات کمالیہ کے، جن کے ذریعہ لوگ باہم ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں، دو درجے کرے گا ایک برتر درجہ جو واجب تعالیٰ کے لئے خاص ہے، دوسرا کم تر درجہ جو ان مخلوقات کے لئے ہے جن کو وہ معترف اپنے جیسا سمجھتا ہے۔

الحاصل: شرک نام ہے صفات واجب کو کسی مخلوق میں مان کر اس کی بندگی کرنے کا یعنی ایسے افعال کرنے کا جس سے اس مخلوق کی غایت درجہ تعظیم، اور عبادت کرنے والے کی غایت درجہ خاکساری ظاہر ہوتی ہے۔

﴿باب فی بیان حقیقة الشرك﴾

اعلم أن العبادة هو التذلل الأقصى؛ وكونُ تذللٍ أقصى من غيره لايخلو إما أن يكون بالصورة، مثلُ كونِ هذا قيامًا، وذلك سجودًا؛ أو بالنية: بأن نوى بهذا الفعل تعظيمَ العباد لمولاهم، وبذلك تعظيمَ الرعية للملوك، أو التلامذةِ للأستاذ، لاثالث لهما.

ولما ثبت سجودُ التحية من الملائكة لآدم عليه السلام، ومن إخوة يوسف ليوسف عليه السلام، وأن السجود أعلى صُوَرِ التعظيم، وجب أن لايكون التميُّزُ إلا بالنية؛ لكن الأمْرَ إلى الآن غَيْرُ منقَّح، إذ المولى — مثلاً — يُطلق على معانٍ، والمراد ههنا المعبود لامُحالة، فقد أُخذ في حد العبادة.

فالتنقيح: أن التذلُّلَ يستدعي ملاحظةَ ضُعْفٍ في الذليل، وقوةٍ في الآخر، وخِسَّةٍ في الذليل، وشرفٍ في الآخر، وانقيادٍ وإخباتٍ في الذليل، وتسخيرٍ ونفاذِ حكمٍ للآخر.

والإنسان إذا خُلِّيَ ونفسَه أدرك لامُحالة: أنه يُقَدِّرُ للقوة والشرف والتسخير، وما أشبهها مما يعبَّرُ به عن الكمال، قَدْرَيْنِ: قدرًا لنفسه، ولمن يُشَبِّهُه بنفسه، وقدرًا لمن هومتعالٍ عن

وصْمَةِ الحدوث والإمكان بالكلية، ولمن انتقل إليه شيئ من خصوصيات هذا المتعالي.

فالعلم بالمغيبات يجعله على درجتين: علمٌ برَوِيَّةٍ، وترتيبِ مقدّمات، أو حَدْس، أومنامٍ، أو تلقي إلهام، مما يجد نفسه لايباين ذلك بالكلية؛ وعلمٌ ذاتي، هومقتضىٰ ذاتِ العالِم لايُلقَّاه من غيره، ولايتجشم كَسْبَه.

وكذلك يجعل التأثير والتدبير والتسخير — أيَّ لفظِ قلتَ — على درجتين: بمعنى المباشرة واستعمال الجوارح والقوى، والاستعانة بالكيفيات المزاجية، كالحرارة والبرودة، وما أشبه ذلك ممايجد نفسه مستعدةً له، استعداداً قريبا أو بعيدًا، وبمعنى التكوين من غير كيفية جسمانية، ولامباشرة شيئ وهو قوله:﴿ إِنَّمَاأَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

وكذلك يجعل العظمةَ والشرفَ والقوةَ على درجتين:

أحداهما: كعظمةِ الملِك بالنسبة إلى رعيته، مما يرجع إلى كثرة الأعوان، وزيادة الطَّوْل، أو عظمة البَطَلِ والأستاذِ بالنسبة إلى ضعيفِ البطشِ والتلميذِ، مما يجد نفسه يشارك العظيم في أصل الشيئ.

وثانيتهما: مالايوجد إلا في المتعالي جدًا.

ولاَتَنِ في تفتيش هذا السرحتى تستيقن أن المعترف بانصرام سلسلة الإمكان إلى واجب لايحتاج إلى غيره، يضطر إلى جعل هذه الصفات التي يتمادحون بها على درجتين: درجةٌ لما هنالك، ودرجةٌ لما يُشْبِهُ بنفسه.

ترجمہ: شرک کی حقیقت کا بیان: جان لیں کہ عبادت نہایت درجہ تذلل (خاکساری وفروتنی کرنے) ہی کا نام ہے۔اور کسی تذلل کا انتہائی درجہ ہونا اس کے غیر سے ممتاز ہوکر دوحال سے خالی نہیں: یا تو صورت (عمل) سے ہوگا جیسے اس کا (یعنی غیر اقصی تذلل کا) قیام ہونا، اور اُس کا (یعنی اقصی تذلل کا) سجدہ ہونا، یا نیت سے ہوگا، بایں طور کہ اِس فعل سے بندوں کے اپنے مولی کی تعظیم کا ارادہ کرے، اور اُس فعل سے رعایا کے بادشاہوں یا تلامذہ کے استاذوں کی تعظیم کا ارادہ کرے۔تیسری (یعنی صورت ونیت کے علاوہ) کوئی صورت نہیں۔

اور جب فرشتوں کا آدم علیہ السلام کو اور برادران یوسف کا یوسف علیہ السلام کو سجدۂ تحیہ کرنا ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ تعظیم کی تمام صورتوں میں سجدہ ہی اعلی قسم کی تعظیم ہے تو ضروری ہے کہ ان ہر دوقسم کے سجدوں میں امتیاز نیت ہی سے کیا جائے لیکن بات ابھی تک واضح نہیں ہے، کیونکہ لفظ مولی کا -مثال کے طور پر- کئی معنی پر اطلاق ہوتا ہے۔اور یہاں لفظ ''مولی'' سے یقیناً معبود مراد ہے، کیونکہ وہ لفظ عبادت کی تعریف میں استعمال کیا گیا ہے۔

پس منقح بات یہ ہے کہ تذلل چاہتا ہے خاکسار میں ضعف کے لحاظ کرنے کو اور دوسرے میں قوت کے لحاظ کرنے کو۔ اور ذلیل میں کمینگی اور دوسرے میں بزرگی کے لحاظ کرنے کو، اور ذلیل میں تابعداری اور نیازمندی اور دوسرے میں تسخیر ونفاذ حکم کے لحاظ کرنے کو۔

اور انسان جب مخلی بالطبع ہوکر غور کرے تو وہ لامحالہ سمجھ لے گا کہ قوت وشرف اور تسخیر کے لئے اور ان کلمات کے لئے جو مذکورہ کلمات سے ملتے جلتے ہیں، ان کلمات میں سے جن کے ذریعہ کمالات کو تعبیر کیا جاتا ہے ان سب کے لئے وہ دو اندازے کرتا ہے۔ ایک اندازہ اپنے لئے اور ان لوگوں کے لئے جن کو وہ اپنے جیسا سمجھتا ہے۔ اور دوسرا اندازہ اس ہستی کے لئے جو حدوث وامکان کے عیب سے بالکلیہ برتر ہے، اور اس شخص کے لئے جس کی طرف (بالفرض) اس برتر کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت منتقل ہوگئی ہے۔

مثلاً غیب کی باتوں کو جاننے کے آدمی دو درجے گردانتا ہے۔ ایک: غور وفکر اور جانی ہوئی باتوں کو ترتیب دے کر یا زیرکی، یا خواب یا الہام کے ذریعہ جاننا، جو ان چیزوں میں سے ہیں کہ آدمی خود کو ان چیزوں سے بالکلیہ مغائر نہیں پاتا۔ اور (دوسرا) علم ذاتی ہے، جو خود عالم (جاننے والے) کی ذات کا مقتضی ہے، وہ اس علم کو کسی غیر سے حاصل نہیں کرتا، اور نہ اس کے لئے اکتساب کی زحمت کرنی پڑتی ہے۔

اور اسی طرح تاثیر، تدبیر اور تسخیر ــــ جو لفظ چاہو استعمال کرو ــــ آدمی ان کے بھی دو درجے کرتا ہے (ایک) بمعنی مباشرت (یعنی کسی کام کو بدست خود کرنا) اور بمعنی اعضاء اور قویٰ (صلاحیتوں) کو استعمال کرنا اور بمعنی مزاجی کیفیات جیسے حرارت وبرودت سے مدد طلب کرنا (جیسے بارد وحار دواؤں سے بیماریوں کا علاج کرنا) اور اُن چیزوں کے معنی کر کے جو اِن چیزوں کے مشابہ ہیں۔ اُن میں سے کہ آدمی اپنے میں ان کی استعداد پاتا ہے، خواہ وہ قریبی استعداد ہو یا دور کی۔ اور (دوسرا درجہ) بمعنی تکوین یعنی جسمانی کیفیت کے بغیر اور کسی چیز کو بدست خود کئے بغیر بنانا، جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے کہ: ’’جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، تو بس اس سے کہتا ہے کہ ’’ہوجا‘‘ تو وہ ہوجاتی ہے (سورۂ یٰس آیت ۸۲)

اور اسی طرح آدمی عظمت، شرف اور قوت کے بھی دو درجے کرتا ہے۔

ان میں سے ایک: جیسی بادشاہ کی عظمت اس کی رعایا کی بہ نسبت، جن کا تعلق کارندوں کی کثرت اور مالداری کی زیادتی سے ہے، یا بہادر اور استاذ کی عظمت، کمزور پکڑ والے اور شاگرد کی بہ نسبت۔ یہ عظمتیں ایسی ہیں کہ آدمی خود کو پاتا ہے کہ وہ عظیم کے ساتھ نفس عظمت میں شریک ہے (کمی بیشی کا فرق الگ چیز ہے)

اور ان میں سے دوسرا درجہ: وہ عظمت ہے جو صرف ذات متعالی کے اندر ہی پائی جاتی ہے۔

اور آپ ذرا سستی نہ کریں اس راز کی تفتیش میں تا آنکہ آپ یقین کرلیں کہ سلسلۂ امکان کے ایسے واجب پر منتہی ہونے کا معترف، جو اپنے علاوہ کا قطعاً محتاج نہیں ہے، مجبور ہے ان صفات کو جن کے ذریعہ لوگ باہم ایک دوسرے کی

تعریف کرتے ہیں، دو درجوں میں گردانے کی طرف، ایک درجہ ان صفات کے لئے جو وہاں (ذات واجب میں) ہیں، اور دوسرا درجہ ان مخلوقات کے لئے جن کو وہ اپنے جیسا سمجھتا ہے۔

لغات:

تَذَلُّل: فروتنی کرنا، عاجزی کرنا، اپنے کو حقیر سمجھنا...... تَمَیَّزَ تَمَیُّزًا: جدا ہونا...... قَدَّرَ تَقدِیرًا: اندازہ کرنا الوَصْمَة: عیب...... الرَوِیَّة: امور میں غور وفکر کرنا...... الحَذَس: دانائی، زیرکی...... لَایُلَقَّاہ (فعل مضارع مجہول منفی) از تَلْقِیَة (تفعیل): وہ نہیں عطا کیا جاتا...... تجشم الأمر: مشقت سے کام کرنا...... لَا تَنِ (فعل نہی) از وَنَی یَنِیْ وَنْیًا: سست ہونا، تھکنا، کمزور ہونا...... اِنْصَرَمَ: کٹ جانا، منقطع ہونا۔

تصحیح: العظیم اصل میں العُظم تھا، جو عظیم کی جمع ہے، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

شرک وتشبیہ متوارث گمراہیاں ہیں

شرک کے معنی اوپر بیان ہوئے۔ اور تشبیہ کے معنی ہیں: "مخلوق کی صفات واجب تعالیٰ میں ماننا"۔ مخلوق کی ساری ہی صفات ناقص درجہ کی ہوتی ہیں، جیسا کہ اوپر گذرا، اور جب ناقص صفات واجب تعالیٰ میں مان لی گئیں تو خدا بھی ناقص ہوا۔ اور ناقص خدا کو مددگاروں کی ضرورت ہوگی اور مددگار معاملات میں دخیل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان شرکاء کی عبادت ضروری ہوئی۔ مشرکین میں دیوی دیوتاؤں کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ خدا کے بارے میں ان کے تصور کی اسی کمزوری پر مبنی ہے۔

غرض شرک وتشبیہ کی بیماریاں متوارث ہیں۔ نسل در نسل چلی آرہی ہیں اور یہ بیماریاں تین وجہ سے پیدا ہوتی ہیں:

پہلی وجہ: صفات کمالیہ کے دونوں درجوں میں استعمال ہونے والے الفاظ قریب قریب یکساں ہیں۔ یعنی جو الفاظ واجب تعالیٰ کی صفات کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، تقریباً وہی الفاظ مخلوق کی صفات کے لئے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سورۃ التوبہ آیت ۱۲۸ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے رَؤُف اور رَحِیم کی صفتیں استعمال کی گئیں ہیں کہ "آپ ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں" اور یہی صفتیں قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کی گئی ہیں۔ ایسے مواقع میں صفات واجب اور صفات مخلوق میں فرق مراتب کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ خدا کی رأفت ورحمت کا درجہ اور ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی شفقت ومہربانی کا درجہ اور ہے۔ اسی طرح سمع وبصر اور ید ووجہ کی صفات خالق ومخلوق دونوں کے لئے نصوص میں وارد ہوئی ہیں۔ یہاں بھی فرق درجات کرنا ضروری ہے۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جاہل یا کج فہم درجوں کا یہ فرق ملحوظ نہیں رکھتا اور نصوص شرعیہ کو غیر محل میں استعمال کرنے لگتا ہے۔ تو شرک یا تشبیہ کی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں یعنی لوگ یا تو مخلوق میں واجب جیسی صفتیں ماننے لگتے ہیں، یا مخلوق جیسی ناقص صفات واجب تعالیٰ میں مان لیتے ہیں۔ اور گمراہی کا یہ سلسلہ بہت قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔

دوسری وجہ: بارہا شرک وتشبیہ کی گمراہیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ بعض انسانوں سے، یا فرشتوں سے، یا ستاروں وغیرہ سے، ایسے حیرت زا، محیر العقول، خارق عادت آثار صادر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جن کی کوئی توجیہ ان کی عقل میں ممکن نہیں ہوتی۔ ان کو وہ کام مخلوق کی استعداد سے مستبعد معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ وہ الجھن کا شکار ہوجاتے ہیں، اور ان مخلوقات کے لئے اللہ جیسی عظمت اور اللہ جیسی قوت تسخیر مان لیتے ہیں۔ اور ان کی پوجا شروع کردیتے ہیں۔

تیسری وجہ: اللہ تعالیٰ کی صفات کی صحیح معرفت کا نہ ہونا اور ناقص معرفت کی وجہ سے مخلوق کی خداداد صلاحیتوں کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہونا بھی شرک وتشبیہ کی گمراہی کا سبب ہے۔ کیونکہ صفات کا جو ''برتر درجہ'' ہے یعنی واجب تعالیٰ کی صفات، ان کی معرفت میں سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ بعض لوگ تو موالید (جمادات، نباتات اور حیوانات) کی ''خداداد'' صلاحیتوں کو سمجھتے ہیں کہ وہ خود ان کی صلاحیتوں کے قبیل سے ہیں، کوئی مافوق الفطرت صلاحیتیں نہیں ہیں۔ مگر بعض لوگ یہ بات نہیں سمجھ سکتے، اس لئے وہ غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ نبیوں کو، فرشتوں کو، اور چاند تاروں کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس طرح وہ ان کو خدائی کا درجہ دیکر، ان کے سامنے جبہ سائی شروع کردیتے ہیں۔

فائدہ: صفات واجب کی معرفت میں جہل بسیط مضر نہیں، وہ قابل عفو ہے۔ کیونکہ ہر شخص اسی کا مکلف ہے جس کی اس کے اندر استطاعت ہے۔ قرآن کریم میں یہ قاعدہ پانچ جگہ مذکور ہے۔ پس اگر کسی میں عقل کی کمی ہو اور وہ صفات واجب کو کماحقہ نہ سمجھ سکے تو ایسا شخص قابل عفو ہے۔ صحیحین میں جو قصہ مروی ہے اس کا یہی محمل ہے۔ وہ قصہ یہ ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ایک ایسے شخص نے جس نے کبھی کوئی نیکی کا کام نہیں کیا تھا، اپنے گھر والوں سے کہا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس پر زیادتی کی تھی یعنی گناہ بہت کئے تھے، پس جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب وہ مرجائے تو ورثاء اس کو جلادیں۔ پھر اس کی آدھی راکھ جنگل میں اور آدھی راکھ دریا میں ڈال دیں۔ پس قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اس پر قدرت حاصل کرلی تو وہ اس کو ایسی سخت سزا دیں گے کہ دنیا میں کسی کو ایسی سخت سزا نہ دی ہوگی۔ پھر جب وہ مرگیا تو اس کے بیٹوں نے ویسا ہی کیا جیسا اس نے کہا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا اس نے اپنے اندر کے اجزاء جمع کئے، اسی طرح جنگل نے بھی جمع کئے اور وہ شخص درست ہوکر پیدا ہوگیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ: ''تو نے یہ حرکت کیوں کی؟'' اس نے جواب دیا: ''آپ کے ڈر سے، اے میرے رب! اور آپ (میری نیت کو) خوب جانتے ہیں'' پس اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا (بخاری کتاب التوحید باب ۳۵ حدیث نمبر ۷۵۰۶ مسلم شریف کتاب التوبہ ج ۷ ص ۷۱ (مصری) مشکوٰۃ شریف، کتاب الدعوات، باب سِعَةِ رحمة الله، حدیث نمبر ۲۳۶۹)

مذکورہ شخص اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق تو مانتا تھا مگر وہ یہ سمجھتا تھا کہ قدرت کا تعلق ممکنات سے ہے، محالات سے نہیں۔ اور جب وہ جلا دیا جائے گا اور اس کی خاک منتشر کردی جائے گی تو اس کا جمع کرنا محال ہے، اور ایسی بات وہ اپنی

ناقص فہم سے سمجھ رہا تھا، اس وجہ سے اس سے درگذر کیا گیا یہی جہل بسیط ہے جو مضر نہیں۔ مضر اور سخت مضر جہل مرکب ہے کہ صفات واجب کی صحیح معرفت حاصل نہیں ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس کو صحیح معرفت حاصل ہے۔ پھر وہ اس ناقص معرفت کے مطابق صفات کے جو مظاہر کائنات میں دیکھتا ہے ان کو خدا بنالیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ قابل درگذر ہے، نہ ہوسکتی ہے۔

غرض مذکورہ بالا وجوہ ثلاثہ کی وجہ سے ستاروں کو اور ایسے نیک لوگوں کو جن سے خارق عادت امور جیسے کشف اور قبولیت دعا کا ظہور ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی بیماری اور اللہ کو مخلوقات جیسا ماننے کی خرابی لوگوں میں متوارث چلی آرہی ہے، ہمیشہ ہی لوگ اس کیچڑ میں لت پت رہے ہیں۔

انبیاء نے شرک کی حقیقت واشگاف کردی ہے: ہر زمانہ میں حضرات انبیاء لوگوں کو شرک کی حقیقت خوب کھول کر سمجھاتے رہے ہیں۔ انھوں نے صفات کے دونوں درجوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کردیا ہے۔ اور مقدس درجہ واجب تعالیٰ کے لئے خاص کردیا ہے۔ گو الفاظ دونوں درجوں کے لئے قریب ہی قریب ہوں یا ایک ہی ہوں، جیسے لفظ ''طبیب'' بمعنی معالج وچارہ ساز ہے اور ''سیّد'' بمعنی مالک وآقا ہے، مگر چارہ سازی اور مالکیت کے دو درجے ہیں: ایک مجاز کا درجہ، دوسرا حقیقت کا درجہ، بندے مجازی معالج اور آقا ہیں، حقیقی چارہ ساز اور کامل آقا صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ درج ذیل حدیثوں میں یہی فرق واضح کیا گیا ہے۔

حدیث: حضرت ابو رِمثہ رضی اللہ عنہ کے والد خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے آپ کی پیٹھ میں مہر نبوت دیکھی تو اس کو پھوڑا سمجھا اور عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کا جو آپ کی پشت میں ہے علاج کردوں۔ میں طبیب (ماہر معالج) ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''تم مہربان (سہولت پہنچانے والے) ہو، اور طبیب اللہ تعالیٰ ہی ہیں'' (مسند احمد ۴: ۱۶۳ امشکوۃ کتاب القصاص، حدیث نمبر ۳۴۷۱)

تشریح: یعنی حکیم ڈاکٹر تو مشفق ومہربان ہوتے ہیں۔ وہ دلسوزی سے مریض کی شفا کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اور شافی مطلق اور حقیقی معالج تو بس اللہ تعالیٰ ہیں۔ غرض بعض معنی کے اعتبار سے آپ ﷺ نے انسان کے طبیب ہونے کی نفی کی ہے اور وہ وہی مقدس درجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

حدیث: حضرت عبداللہ بن الشِّخِّیر رضی اللہ عنہ قبیلہ بنو عامر کے وفد کے ساتھ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ: أنتَ سَيِّدُنا: آپ ہمارے آقا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ السيِّد اللّٰه: آقا تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ ان لوگوں نے کہا أنت أفضلُنا فضلا، وأعظمُنا طَوْلا: آپ ہم سے بہت بہتر اور بہت زیادہ مقدرت والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''یہ کہو یا اس میں سے بھی کچھ کہو (تو بہتر ہے) اور ہرگز شیطان تم کو اپنا وکیل نہ بنائے'' یعنی شیطان تم کو اپنا آلہ کار نہ بنائے (رواہ احمد وابوداؤد، مشکوۃ کتاب الآداب، باب المفاخرۃ، حدیث نمبر ۴۹۰۰)

تشریح: اس حدیث میں بھی سید (آقا) کہنے کی ممانعت ایک معنی کے اعتبار سے ہے یعنی بمعنی کامل آقا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اور غلام جو اپنے مولی کو سید کہتے ہیں یا لوگ جو اپنے بڑوں کو سید کہتے ہیں وہ ایک اور معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں۔

ناہنجاروں نے لٹیا ڈبوئی: پھر جب انبیاء کے مخصوص صحابہ اور ان کے دین کے اصل حامل دنیا سے اٹھ گئے تو ناخلف ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے دین پر چلنا چھوڑ دیا اور وہ خواہشات کے پیچھے پڑ گئے اور انبیاء کی وحی میں جو ذومعنی الفاظ آئے تھے، جیسے انجیل میں بیٹا اور محبوب کے الفاظ، ان کو غیر محل میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ تمام شریعتوں میں محبوب، شفیع اور ولی کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح نبیوں اور ولیوں سے جو خارق عادت امور صادر ہوئے یا جو کشف و کرامات اور انوار و برکات مشاہدہ میں آئے ان کو بھی انھوں نے غلط معنی پہنائے۔ اور ان حضرات کے لئے علم غیب اور تسخیر و تصرف کی صفتیں مان لیں۔ حالانکہ وہ تمام باتیں ناسوتی یا روحانی قوتوں کی کرشمہ سازی تھی۔ ایجاد و تکوین اور خدائی کمالات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

ولما كانت الألفاظُ المستعمَلة في الدرجتين متقاربةً، فربما يُحمل نصوصُ الشرائع الإلٰهية على غير مَحْمِلها؛ وكثيرًا ما يَطَّلِع الإنسانُ على أثرٍ صادرٍ من بعض أفرادِ الإنسان، أو الملائكة، أو غيرهما، يستبعده من أبناء جنسه، فيشتبه عليه الأمر، فَيُثْبِت له شَرَفًا مقدَّسًا، وتسخيرًا إلٰهيا.

وليسوا في معرفة الدرجة المتعالية سواءً، فمنهم: من يُحيط بقوى الأنوارِ المحيطةِ الغالبةِ على الموالِيد، ويعرفها من جنسه، ومنهم: من لايستطيع ذلك.

وكلُّ إنسانٍ مكلَّف بما عنده من الاستطاعة، وهذا تأويل ما حكاه الصادق المَصْدُوْق صلى الله عليه وسلم، من نجاةِ مُسْرِفٍ على نفسه، أمر أهلَه بحرقه، وتَذْرِيَةِ رَمَاده، حذرًا من أن يبعثه اللّٰهُ، ويقدِرَ عليه؛ فهذا الرجل استيقن بأن الله متصف بالقدرة التامة، لكن القدرة إنما هي في الممكنات، لافي الممتنعات، وكان يظُن أن جمعَ الرَّماد المتفرقِ نصفُه في الْبَرِّ ونصفُه في البحر، ممتنعٌ، فلم يُجعل ذلك نَقْصًا، فأُخذ بقدر ما عنده من العلم، ولم يُعَدَّ كافرًا.

كان التشبيهُ والإشراك بالنجوم، وبصالحي العباد الذين ظهر منهم خرقُ العوائد، كالكشف، واستجابة الدعاء متوارثًا فيهم.

وكل نبي يُبعث في قومه، فإنه لابد أن يُفهمهم حقيقةَ الإشراك، ويمَيِّزَ كلًّا من الدرجتين، ويَحْصِرَ الدرجةَ المقدسة في الواجب، وإن تقاربت الألفاظُ، كما قال رسول الله صلى الله

عليه وسلم لطبيبٍ: ﴿إنما أنت رفيقٌ، والطبيبُ هو الله﴾ وكما قال: ﴿السيّد هو الله﴾ يشير إلى بعض المعاني دون بعض.

ثم لما انقرض الحواريون من أصحابه وَحَمَلَةِ دينه، خَلَفَ من بعدهم خَلْفٌ أضاعوا الصلاة واتبعوا الشهوات، فحملوا الألفاظ المستعملة المشتبِهَةَ على غير محملها، كما حملوا المحبوبية والشفاعةَ التي أثبتَها اللهُ تعالى في قاطبة الشرائع لخواص البشر على غير محمِلها؛ وكما حملوا صدور خرق العوائد والإشراقاتِ على انتقال العلم والتسخير الأقصَيَيْنِ إلى هذا الذي يُرى منه؛ والحقُّ: أن ذلك كلَّه يرجع إلى قوى ناسوتية أو روحانيةٍ، تُعِدُّ لنزول التدبير الإلٰهي على وجهٍ، وليس من الإيجاد والأمور المختصةِ بالواجب في شيئ

ترجمہ: اور جب دونوں درجوں میں استعمال ہونے والے الفاظ قریب قریب یکساں تھے، تو کبھی وحی سماوی کی نصوص غیر محمل پر محمول کر دی جاتی ہیں، اور بارہا آدمی انسانوں کے بعض افراد سے، یا ملائکہ سے یا ان کے علاوہ دیگر مخلوقات سے ایسے آثار صادر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے جن کو وہ اپنے ابنائے جنس سے مستبعد سمجھتا ہے، پس معاملہ اس پر مشتبہ ہوجاتا ہے، پس وہ اس مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ جیسی بزرگی اور اللہ جیسی تصرف کی قوت ثابت کر دیتا ہے۔

اور لوگ (صفات کے) بلند درجہ کے پہچاننے میں یکساں نہیں ہیں۔ پس ان میں سے بعض وہ ہیں جو اُن انوار کی صلاحیتوں کا احاطہ کر لیتے ہیں جو موالید کو گھیرے ہوئے ہیں اور جو موالید پر چھائی ہوئی ہیں اور وہ ان کو اپنی جنس ہی سے سمجھتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض لوگ اس کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔

اور ہر انسان اس چیز کا مکلف ہے جس کی اس کے اندر استطاعت ہے۔ اور یہی مطلب ہے اس واقعہ کا جس کو صادق و مصدوق ﷺ نے نقل کیا ہے یعنی ایک سخت گنہ گار شخص کا نجات پانا جس نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا تھا کہ جب وہ مرجائے تو وہ اس کی لاش کو جلادیں اور اس کی راکھ کو اڑادیں، اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زندہ کر دیں اور قدرت حاصل کر لیں، پس یہ شخص یقین رکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ قدرت تامہ کے ساتھ متصف ہیں۔ لیکن وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ قدرت کا تعلق ممکنات سے ہے، ممتنعات سے نہیں اور وہ یہ گمان کرتا تھا کہ راکھ جس کا آدھا ہوا میں اڑادیا گیا ہو اور آدھا دریا میں بہادیا گیا ہو اس کا جمع کرنا محال ہے۔ پس اس کا یہ گمان ایمان کی کمی نہیں گردانا گیا۔ اور اس کے علم و فہم کے بقدر اس سے معاملہ کیا گیا اور وہ شخص کافر شمار نہیں کیا گیا۔ (تو) تشبیہ اور ستاروں کو اور ایسے نیک بندوں کو جن سے خارق عادت امور جیسے کشف اور دعا کی قبولیت کا ظہور ہوا، شریک گردانا لوگوں میں موروثی چیز ہوگیا۔

اور جو بھی پیغمبر اپنی قوم میں مبعوث کیا جاتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم کو شرک کی حقیقت سمجھائے اور دونوں درجوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے اور مقدس درجہ کو واجب تعالیٰ میں منحصر کرے، اگرچہ الفاظ قریب قریب

ہوں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک حکیم کو مخاطب کر کے فرمایا: ''آپ مہربان (سہولت فراہم کرنے والے) ہی ہیں اور طبیب اللہ تعالیٰ ہی ہیں'' اور جیسا کہ آپؐ نے فرمایا کہ: ''سید تو اللہ تعالیٰ ہیں'' آنحضور ﷺ (لفظ طبیب اور سید کے) بعض معانی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، نہ کہ بعض کی طرف۔

پھر جب اس پیغمبر کے ساتھیوں میں سے مخصوص حضرات کا، اور اس کے دین کے حاملین کا زمانہ گذر گیا، تو ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین آئے جنھوں نے نماز ضائع کردی اور خواہشات کی پیروی کی، پس انھوں نے ان مشتبہ الفاظ کو جو (شرائع الٰہیہ میں) استعمال کئے گئے تھے، غیر محل پر محمول کر دیا، جس طرح انھوں نے محبوبیت اور شفاعت کے الفاظ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام شریعتوں میں اپنے مخصوص بندوں کے لئے ثابت کیا ہے، غیر محل پر محمول کر دیا۔ اور جس طرح انھوں نے خارق عادت امور کے صدور کو اور اشراقات (وانوار) کو محمول کیا آخری درجہ کے علم اور آخری درجہ کی قوت تسخیر (وتصرف) کی صفتوں کے منتقل ہونے پر اس شخص کی طرف جس سے وہ باتیں دیکھی گئی ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں (خوارق وانوار) ناسوتی یا روحانی طاقتوں کی طرف لوٹتی ہیں، جو تدبیر الٰہی کے نزول کو کسی طور پر تیار کرتی ہیں۔ اور ایجاد (وتکوین) اور ان امور سے جو ذات واجب کے ساتھ خاص ہیں: کوئی تعلق نہیں۔

لغات:

الصادق (اسم فاعل) المصدوق (اسم مفعول) سچے اور سچے کئے گئے یعنی لوگ آپ کو سچا کہتے ہیں۔ صادق وہ ہے جو اپنی باتوں میں سچا ہو، اور مصدوق وہ ہے جس کی صداقت کو لوگ تسلیم کرلیں...... لما كانت الألفاظ المستعملة إلخ دور تک جملہ شرطیہ ہے، اور كان التشبيه والإشراك إلخ جملہ جزائیہ ہے۔ اورف محذوف ہے...... العوائد جمع العادة...... الإشرَاقَات جمع الإشراقة: چمک، روشنی، انوار...... الأَقْصى (اسم تفضیل) زیادہ دور، انتہائی...... المُشْتَبِهَة: متشبہ المراد، غیر ظاہر المعنی...... ناسوت: عالم اجسام، قوی ناسوتیہ: جسمانی صلاحیتیں۔ مراد یہ ہے کہ جب مواليد (اجسام) میں جسمانی یا روحانی صلاحیت پیدا ہوتی ہے تو تدبیر الٰہی نازل ہوتی ہے اور اس کے نزول کا ایک انداز ہوتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ سورۃ المائدہ آیت ۱۱۰ میں جو بار بار لفظ بِاِذنی آیا ہے اس سے یہی تدبیر الٰہی مراد ہے۔

قوله: كما حملوا المحبوبية إلخ، فإن المحبوبية أثبتها اللّٰهُ تعالى لخواص البشر بمعنى أنهم مطيعون للّٰه تعالى، خاشعون له، ناصحون لدينه، فحملها الناس على كون المحبوب مختاراً كليا أو جزئيا، وكذلك الشفاعة، أثبتها اللّٰهُ تعالى أيضًا لخواص البشر بمعنى أنهم يشفعون بعد إذن اللّٰه تعالى، فحملها الناس على أنهم في الشفاعة مختارون: يشفعون لمن شاؤا ويتركون لمن شاؤا ونجاة العصاة موقوفة على رضاهم، فالناس يجتهدون كل الجهد في إرضائهم بمحافل العرس والتضرع إليهم؛ وهذا الحمل جهل منهم بشأنهم، وشأن اللّٰه تعالى (سندى بتعديل وحذف)

قولہ: والمحق إلخ أی الحق أن صدور الخوارق والمکاشفات ثابتۃٌ بقوی ناسوتیۃ متعلقۃ بطبیعۃ الإنسان کما یلین الحدید فی ید داود علیہ السلام، أو بقوی روحانیۃ کما انشق القمر بإشارۃ سید البشر صلی اللّٰہ علیہ وسلم، لأن القوی تعد لنزول التدبیر الإلٰھی فی العالَم بوجہ ما، فإن تدبیر تلیین الحدید وانشقاق القمر کان تدبیرًا إلٰھیا، لااختیار فیہ للبشر، والمعدُّ لنزول ھذا التدبیر قواہ الناسوتیۃ کما لداود علیہ السلام أو قواہ الروحانیۃ، کما لنبینا صلی اللّٰہ علیہ وسلم(سندی بتعدیل)

شرک وتشبیہ کے بیماروں کی انواع

شرک وتشبیہ کے بیمار دوطرح کے ہیں:

① بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے جلال وعظمت، بڑائی اور بزرگی کو بالکل فراموش کردیتے ہیں۔ اور صرف اپنے خود ساختہ معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اپنی تمام حاجتیں انہیں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف قطعاً ملتفت نہیں ہوتے۔ گو وہ عقل واستدلال سے جانتے ہیں کہ موجودات کا سلسلہ پرمیشور(خدا تعالیٰ) کی ذات پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔ ہندوستان کے عام مشرکین کا یہی حال ہے۔ وہ ایشور کو مانتے ہیں، کائنات کا خالق ومالک اسی کو سمجھتے ہیں۔ مگر ساری دنیا میں ایک بھی مندر خالص بھگوان کی عبادت کے لئے نہیں ہے۔ تمام منادر کسی نہ کسی دیوی دیوتا کی عبادت کے لئے ہیں، انھیں سے وہ اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں اور انہی کی پرستش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ان کا عبادت کا رشتہ منقطع ہے۔

② اور بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آقا اور مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ وہی کائنات کے مدبر ومنتظم ہیں۔ مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو بزرگی، تقدس اور الوہیت کا جامہ پہنایا ہے اور بعض مخصوص امور میں ان کو متصرف گردانا ہے۔ اور لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ ان اولیاء کی سفارش قبول کرتا ہے، جیسے شہنشاہ، ملک کے اطراف میں اپنے نمائندے بھیجتا ہے اور ان کو بعض علاقہ کا نظم ونسق سونپ دیتا ہے، اور اہم امور کو مستثنیٰ کرکے باقی امور کا ان کو ذمہ دار بنادیتا ہے۔ اور اللہ کے جن بندوں کے حق میں ان کا یہ خیال خام ہوتا ہے، ان کو وہ ''اللہ کے بندے'' اور ''بشر'' کہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں ایسا کہنے سے ان مخصوص بندوں کو دوسرے عام بندوں کے ساتھ برابر کرنا لازم آتا ہے، اس لئے وہ ان کو ''اللہ کے بندے'' کہنے کے بجائے ''اللہ کے بیٹے'' اور ''محبوب سبحانی'' کہتے ہیں اور اپنے نام عبدالمسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بندہ) عبدالعزی (عزی نامی بت کا بندہ) عبدالمصطفیٰ (رسول اللہ ﷺ کا بندہ) غلام مصطفیٰ، غلام نبی، غلام رسول وغیرہ رکھتے ہیں۔ اہل کتاب یہود ونصاری جو توحید ورسالت کے قائل ہیں ان میں یہ مرض عام ہے۔ اسی طرح دور حاضر میں ملت مصطفوی کی اتباع کے دعوے دار بعض غالی منافقوں کا یہی

مرض ہے۔ جو دنیا میں مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ برصغیر میں وہ بریلوی اور رضاخانی کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نصیب فرمائے (آمین)

مظاہر شرک کا حکم: اصل شرک تو وہی ہے جس کی اوپر وضاحت کی گئی کہ صفات کے دونوں درجوں میں فرق نہ کیا جائے، دونوں درجوں کو باہم خلط ملط کر دیا جائے اور صفات کے برتر و مقدس درجہ کو کسی مخلوق کے لئے ثابت کیا جائے۔ مگر چونکہ احکام شرعیہ کا مدار ''مَظِنَّہ کو اصل کے قائم مقام کرنے پر ہے۔ مظنہ یعنی وہ جگہ جہاں کسی چیز کے موجود ہونے کا گمان ہو، اس کو سبب حقیقی کے قائم مقام کر کے احکام شرعیہ اس سے متعلق کئے جاتے ہیں، جیسے گہری نیند کو خروج ریح کا مظنہ ہونے کی وجہ سے اصل حدث کے قائم مقام گردانا گیا ہے۔ اور ۷۷ کلو میٹر اور ۲۴۷ میٹر کے سفر کو اصل علت'' مشقت'' کے قائم مقام کیا گیا ہے اور تمام احکام اصل علت کے بجائے سبب ظاہری سے متعلق کئے گئے ہیں۔ اسی طرح باب شرک میں کچھ محسوس چیزوں کو جو شرک کے مظان تھے شرک وکفر گردانا گیا ہے مثلاً بتوں کو یا قبروں کو سجدہ کرنا، دیوی دیوتاؤں یا ولیوں کے لئے جانور ذبح کرنا اور ان کے نام کی قسمیں کھانا وغیرہ۔

ایک واقعہ جس سے شرک کی حقیقت وا ہوئی: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے خواب میں یا مکاشفہ میں یا مراقبہ میں ایک منظر دیکھا کہ ایک چھوٹی سی زہریلی مکھی ہے جو ہر وقت دم ہلاتی رہتی ہے۔ ایک قوم اس کو پوج رہی ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہ واقعہ دیکھ کر شاہ صاحب کے ذہن میں یہ سوالات ابھرے کہ کیا ان لوگوں کی عبادت میں شرک کی وہ ظلمت پائی جاتی ہے جو بت پرستوں میں پائی جاتی ہے؟ شاہ صاحب نے غور کیا تو آپ کو وہ ظلمت نظر نہ آئی، کیونکہ ان لوگوں نے مکھی کو صرف قبلہ بنایا تھا، خود اس کی وہ بندگی نہیں کر رہے تھے اور تذلل کے دونوں درجوں میں انہوں نے خلط ملط بھی نہیں کیا تھا۔ یعنی غایت تذلل کا تحقق نہیں ہوا تھا اس واقعہ سے شاہ صاحب قدس سرہ نے مسئلہ شرک کی حقیقت پائی اور آپ کا دل اس علم سے معمور ہو گیا اور مسئلہ میں آپ کو پوری بصیرت حاصل ہو گئی یعنی توحید کیا ہے؟ شرک کیا ہے؟ توحید کے مظان کیا ہیں؟ اور شرک کے مظان کیا ہیں؟ اسی طرح عبادت و تدبیر میں کیا ربط ہے یہ سب باتیں شاہ صاحب قدس سرہ پر کھل گئیں، جو اس باب میں آپ نے ہمیں سمجھائی ہیں اور آگے بھی جگہ جگہ بیان کریں گے۔

والمَرضىٰ بهذا المرض على أصناف:

منهم: من نسي جلالَ الله بالكلية، فجعل لايعبد إلا الشركاءَ، ولايرفع حاجته إلا إليهم، لايلتفت إلى الله أصلاً، وإن كان يعلم بالنظر البرهاني أن سلسلةَ الوجود تَنْصَرِمُ إلى الله.

ومنهم: من اعتقد أن الله هو السيِّد، وهو المدبِّرُ، لكنه قد يَخْلع على بعض عبيده لباسَ الشرف والتَّألُّهِ، ويجعله متصرفا في بعض الأمور الخاصة، ويقبل شفاعَتَهُ في عباده، بمنزلة مَلِكِ الملوك يبعث على كل قُطْرٍ مَلِكًا، ويقلِّدهُ تدبير تلك المملكة، فيما عدا الأمور العظام،

فَيَتَلَجْلَجُ لسانُه أن يسمِّيَهم عبادَ اللّهِ، فَيُسَوِّيَهم وغَيْرَهم، فعدل عن ذلك إلى تسميتهم أبناءَ الله، ومحبوبي الله، وسمى نفسَه عبدًا لأولئك، كعبد المسيح، وعبد العزّى.

وهذا مرضُ جمهور اليهود، والنصارى، والمشركين، وبعضِ الغلاة من منافقي دين محمد صلى الله عليه وسلم يومَنَا هذا.

ولما كان مبنى التشريع على إقامة المظِنَّةِ مَقامَ الأصل عُدَّ أشياءُ محسوسةٌ هي مظانُّ الإشراك كفرًا، كسجدة الأصنام والذبح لها، والحَلْفِ باسمها، وأمثالِ ذلك.

وكان أولُ فتحِ هذا العلم عَلَيَّ: أن رُفع لي قومٌ يسجدون لذُباب صغير سَمِّيٍّ، لايزال يحرك ذنبه وأطرافَه، فَنُفِثَ في قلبي: هل تجد فيهم ظلمةَ الشرك؟ وهل أحاطتِ الخطيئةُ بأنفسهم، كما تجدها في عَبَدَةِ الأوثان؟ قلت: لا أجدها فيهم، لأنهم جعلوا الذباب قبلةً، ولم يَخْلِطُوْا درجةَ تذللٍ بالأُخرى؛ قيل: فقد هُديتَ إلى السر، فيومئذ مُلِئَ قلبي بهذا العلم، وصرتُ على بصيرة من الأمر، وعرفت حقيقةَ التوحيد والإشراك، وما نصبه الشرعُ مظانَّ لهما، وعرفتُ ارتباطَ العبادة بالتدبير، والله أعلم.

ترجمہ: اور اس مرض کے مریض کئی طرح کے ہیں:

بعض وہ ہیں جنھوں نے جلال الٰہی کو بالکل فراموش کردیا ہے، پس وہ صرف اپنے خودساختہ معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اپنی حاجتیں انہیں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مطلق التفات نہیں کرتے، اگرچہ دلیل برہانی سے وہ جانتے ہیں کہ وجود کا سلسلہ اللہ پر ختم ہوتا ہے (یعنی وہی موجود حقیقی ہیں اور انہیں نے ہر موجود کو وجود بخشا ہے)

اور بعض: یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آقا صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور وہی منتظم ہیں۔ لیکن کبھی وہ اپنے بعض بندوں کو، بزرگی اور خدائی کا جامہ پہناتے ہیں اور ان کو بعض مخصوص امور میں متصرف گردانتے ہیں۔ اور ان کی سفارش اپنے بندوں کے حق میں قبول کرتے ہیں، جیسے شہنشاہ ہر خطہ میں ایک بادشاہ بھیجتا ہے۔ اور اس کو اس مملکت کے نظم ونسق کا ذمہ دار بناتا ہے۔ اہم امور کے علاوہ میں۔ پس ان لوگوں کی زبان لڑکھڑاتی ہے کہ وہ ان کو ''اللہ کے بندے'' کہیں، پس وہ ان کو اور ان کے علاوہ کو برابر کردیں۔ پس وہ اس سے گریز کرتے ہیں اور ان کو ''اللہ کے بیٹے'' اور ''اللہ کے محبوب'' کہتے ہیں۔ اور خود کو ان کا بندہ کہتے ہیں، جیسے عبدالمسیح، عبدالعزیٰ۔

اور یہ عام یہود ونصاریٰ اور مشرکین اور ہمارے اس زمانہ کے آنحضور ﷺ کے دین کے بعض غالی منافقوں کا مرض ہے۔

اور چونکہ شریعت کا مبنیٰ مظنہ کو اصل کے قائم مقام گرداننے پر ہے تو کچھ محسوس چیزوں کو جو شرک کے مظان تھے

(یعنی جن سے شرک کے پیدا ہونے کا احتمال تھا) کفر گردانا، جیسے بتوں کو سجدہ کرنا، ان کے لئے جانور ذبح کرنا اور ان کے نام کی قسم کھانا اور اس قسم کی اور چیزیں۔

اور یہ علم سب سے پہلے مجھ پر اس وقت کھلا کہ میرے سامنے ایک ایسی قوم پیش کی گئی جو ایک چھوٹی سی زہریلی مکھی کے سامنے، جو ہر وقت اپنی دُم اور پر ہلایا کرتی تھی، سجدہ کررہی تھی۔ پس میرے دل میں ڈالا گیا: کیا تم ان لوگوں کے اندر شرک کی تاریکی پاتے ہو؟ اور جس گناہ نے بت پرستوں کو گھیر رکھا ہے اس نے ان کو بھی گھیر رکھا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، ان کے اندر میں وہ چیزیں نہیں پاتا، اس لئے کہ ان لوگوں نے مکھی کو قبلہ گردانا ہے۔ اور تذلل کے ایک درجہ کو دوسرے درجہ کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، کہا گیا کہ آپ نے راز پالیا۔ پس اس دن سے میرا دل اس علم سے معمور ہوگیا اور میں معاملہ میں بابصیرت ہوگیا، اور میں نے توحید وشرک کی اور جن امور کو توحید وشرک کا مظنہ گردانا گیا ہے ان کی حقیقت سمجھ لی اور میں عبادت وتدبیر میں جو ربط ہے اس سے بھی واقف ہوگیا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

لغات:

النظر البرهاني أي بالدليل العقلي...... أَلَّهَهَ تَأْلُّهً: خدا کا مرتبہ دینا...... لَجْلَجَ لَجْلَجَةً وتَلَجْلَجَ: تتلانا، ہکلانا، رک رک کر بولنا، صاف نہ بولنا...... المَرْضٰى جمع المريض.

قوله: لأنهم جعلوا الذباب إلخ أي جعلوها قبلةً فقط، ولم يختلطوا الدرجةَ السافلةَ بالدرجة المتعالية المخصوصة بالله سبحانه وتعالى، وإنما لم يحكم المصنف رحمه الله بإشراك هذا القوم، وإن كانت السجدةُ مظنةَ الإشراك بالله تعالى لأنه علم بالمكاشفة علما يقينيا أنهم لم يُثبتوا للذباب التدبيرَ والتسخير، ولم يتوقعوا منه النفع والضرر، بل جعلوه قبلةً فقط، وإنما الاعتبار بالمظان إذا لم يُعلم الحقيقةُ من جانب الله تعالى بالوحي أو المكاشفة أو بنحوهما من الإلقاء في الرُّوع (سندی رحمه الله)

قوله: ارتباط العبادة بالتدبير أي تقتضي طبيعة الإنسان أن يعبد لمدبره فقط (سندی)

باب —— ۳

مظاہر شرک یعنی شرک کی صورتوں کا بیان

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کے بارے میں یعنی کسی نبی یا ولی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اس سے جو خارق عادت آثارِ عجیبہ یعنی معجزات وکرامات صادر ہوئی ہیں وہ اس کے ذاتی افعال ہیں یعنی وہ افعال اس ہستی سے بایں وجہ صادر ہوئے ہیں کہ وہ صفات کمالیہ میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ متصف ہے جو انسانوں میں نہیں

پائی جاتی، واجب تعالیٰ کے ساتھ وہ صفت خاص ہے۔ غیر اللہ میں وہ صفت اسی وقت پائی جاسکتی ہے جب اللہ تعالیٰ کسی کو خلعت الوہیت سے نوازدیں یا کوئی فانی فی اللہ، باقی باللہ ہوجائے، یا اس قسم کے اور خرافی عقائد جو شرک میں مبتلا لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ مسلم شریف (کتاب الحج، باب التلبیہ ۸: ۹۰ مصری) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مشرکین کہا کرتے تھے:

''لبیك (ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں) لاشریك لك (تیرا کوئی شریک نہیں) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پس رسول اللہ ﷺ فرماتے: تمہارا ناس ہو! بس، بس (یعنی اس پر رکو، آگے نہ کہو، مگر مشرکین اس پر بس نہیں کرتے تھے) پس وہ کہتے: اِلَّا شریکاً هو لك تملِکُه وَمَامَلَكَ (مگر ایک شریک جو تیرا ہے، تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی چیز کا مالک نہیں (یہ ترجمہ مانافیہ کی صورت میں ہے) یا تو اس کا مالک ہے اور اس چیز کا بھی مالک ہے جس کا وہ مالک ہے (یہ ترجمہ ماموصولہ کی صورت میں ہے) مشرکین یہ کہتے ہوئے بیت اللہ کا طواف کرتے تھے''

یعنی مشرکین جو اللہ کا ایک شریک مانتے تھے اس کو خدا کی طرف سے مختار مانتے تھے، وہ لوگ اصل مختار و مالک خدا ہی کو مانتے تھے، اسی طرح مشرک اقوام معظم اشخاص کو عطائی اختیارات کا حامل مانتی ہیں۔ ذاتی اختیارات کی قائل نہیں ہیں۔ پھر وہ اس ہستی کے سامنے غایت تذلل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کی مورت بنا کر پوجتے ہیں یا اس کی قبر کو یا اس کی کسی یادگار کو سجدہ کرتے ہیں یا اس کا طواف کرتے ہیں، مرادیں مانگتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، منّتیں مانتے ہیں اور اس کے نام کی قسمیں کھاتے ہیں۔ غرض اس کے ساتھ ویسا معاملہ کرتے ہیں جیسا بندے خدا کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہی شرک ہے۔

شرک کے مظاہر: شرک ایک معنوی چیز ہے، کیونکہ وہ ایک اعتقاد ہے، جو دل کا عمل ہے۔ البتہ اس کے مظاہر (ظاہری افعال) ہیں، جو شرک پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا یا اس کے نام کی قسم کھانا وغیرہ۔ اور شریعت انہیں صورتوں، شکلوں، سانچوں اور محسوس پیکروں سے بحث کرتی ہے جن کو لوگ بہ نیت شرک اختیار کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ وہ مظاہر، شرک کی ''احتمالی جگہیں'' بن جاتی ہیں یعنی ان سے شرک پیدا ہونے کا ظن غالب ہوجاتا ہے۔ اور عادتاً بھی وہ شرک کے ساتھ لازم ہیں، ان سے منفک نہیں۔ اور شریعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان علامات وافعال ظاہری کو جو مصالح ومفاسد کے ساتھ لازم وملزوم ہوتے ہیں، اصل مصالح اور مفاسد کے قائم مقام گردانتی ہے، مثلاً بخل وسخاوت افعال قلبیہ ہیں، شریعت نے ان کی جگہ زکوٰۃ دینے نہ دینے کو رکھ دیا ہے، جو زکوٰۃ ادا کرتا ہے وہ شریعت کی نظر میں سخی ہے اور جو زکوٰۃ نہیں دیتا وہ بخیل ہے۔ اسی طرح نوم غالب کو خروج ریح کے قائم مقام کیا ہے کیونکہ بحالت نوم اصل علت کا ادراک مشکل ہے اسی طرح نفس سفر کو مشقت کے قائم مقام کردیا ہے۔ کیونکہ مشقت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی مظاہر شرک کو اصل شرک کے قائم مقام کردیا ہے کیونکہ اصل شرک جو دل کا ایک اعتقاد ہے اس کو جاننے کی کوئی صورت نہیں اب تمام احکام انہیں مظاہر پر دائر ہوں گے جو بھی بت کو یا قبر کو سجدہ کرے گا اس پر شرک کا حکم

لگایا جائے گا گو شرک کی حقیقت اس کے دل میں نہ پائی جاتی ہو۔

﴿باب أقسام الشرك﴾

حقيقة الشرك: أن يعتقد إنسانٌ في بعض المعظَّمين من الناس: أن الآثار العجيبة الصادرةَ منه إنما صدرت لكونه متصفاً بصفة من صفات الكمال، ممالم يُعهد في جنس الإنسان، بل يختص بالواجب جلَّ مجدُه، لايوجد في غيره، إلا أن يَخْلَعَ هو خِلْعةَ الألوهية على غيره، أو يَفْنَى غيرُه في ذاته، ويبقى بذاته، أو نحوُ ذلك مما يظنه هذا المعتقدُ من أنواع الخُرافات، كما ورد في الحديث: ﴿إن المشركين كانوا يُلَبُّوْنَ بهذه الصيغة: لبيك لبيك لاشريك لك، إلا شريكا هو لك، تملكه وما مَلَكَ﴾ فيتذلل عنده أقصى التذلل، ويُعامل معه معاملةَ العِباد مع الله تعالى.

وهذا معنى، له أشباح وقوالبُ، والشرعُ لايبحث إلا عن أشباحه وقوالبه التي باشرها الناس بنية الشرك، حتى صارت مظِنَّةً للشرك، ولازماً له في العادة، كسنة الشرع في إقامة العلل المتلازمة للمصالح والمفاسد مقامَها.

ترجمہ: اقسام شرک کا بیان: شرک کی حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کی نسبت یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس سے جو آثار عجیبہ صادر ہوئے ہیں وہ صرف اس وجہ سے صادر ہوئے ہیں کہ وہ صفات کمالیہ میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ متصف ہے جو جنس انسان میں نہیں پائے گئے، بلکہ وہ واجب تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ ان کے علاوہ میں نہیں پائے جاسکتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے علاوہ کو خدائی کی پوشاک پہنائیں، یا کوئی غیر اللہ، اللہ کی ذات میں فنا ہو جائے اور وہ اللہ کی ذات کے ساتھ باقی رہے یا اس قسم کی دیگر خُرافات جن کا یہ معتقد قائل ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ مشرکین حج کا تلبیہ اس طرح پڑھتے تھے لبيك إلـــخ (ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں، ہم تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، مگر ایک شریک جو تیرا ہے، اس کا اور اس کی ملکیت کا تو مالک ہے یا اس کا تو مالک ہے اور وہ مالک نہیں ہے) پس وہ اس (بڑے آدمی) کے سامنے غایت درجہ عاجزی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ویسا معاملہ کرتا ہے، جیسا بندے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

اور یہ شرک (جس کی حقیقت اوپر بیان کی گئی) ایک معنوی چیز ہے، جس کے لئے صورتیں اور سانچے ہیں اور شریعت انہی صورتوں اور سانچوں سے بحث کرتی ہے، جن کو لوگ شرک کی نیت سے اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ شرک کا مظنہ (کسی چیز کے ملنے کی احتمالی جگہ) ہوگئے ہیں اور عادتاً شرک کے لئے لازم ہیں، جس طرح شریعت کا طریقہ ہے کہ وہ ان علتوں (علامتوں) کو جو مصالح ومفاسد کے ساتھ لازم ملزوم ہیں، اُن مصالح ومفاسد کے قائم مقام گردانتی ہے۔

تشریح: اللہ کی ذات میں فنا ہونے اور اللہ کی ذات کے ساتھ باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخصیت کو اللہ کا عین گمان کیا جائے۔ اور اس کے لئے خلق وتدبیر کی صفات مان لی جائیں، جو کہ خدائی صفات ہیں۔

فائدہ:

نیت اور مظاہر کے اعتبار سے شرک کی چند قسمیں ہیں:

۱- وہ شرک جس کا مرتکب کافر، مخلّد فی النار ہے۔

۲- وہ شرک جو حرام ہے مگر اس کا مرتکب نہ کافر ہے، نہ مخلد فی النار۔ صرف گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

۳- وہ شرک جو مکروہ تحریمی ہے اور اس کا مرتکب سخت گنہ گار ہے، مگر کافر نہیں ہے۔

اور ان اقسام کو پہچاننے کا قاعدہ یہ ہے کہ جس فعل شرک کے ساتھ معظم ذات کی الوہیت، تدبیر عالم اور تصرف فی الکائنات کا عقیدہ بھی ہو تو وہ مفضی الی الکفر ہے، ورنہ نہیں، اور چونکہ یہ اعتقاد ایک مخفی امر ہے، اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں، اس لئے غایت تذلل ظاہر کرنے والے افعال کو نیت واعتقاد کا قائم مقام گردانا گیا ہے، جیسے غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور ان کی قسم کھانا، ان کی منت ماننا، ان کے نام کا وظیفہ پڑھنا اور اس طرح کے دیگر اعمال شرکیہ جو عام طور پر الوہیت کے عقیدہ ہی سے ہوتے ہیں۔

اور شرک کی نظیر ''بغاوت'' ہے بغاوت کے بعض مجرم واجب القتل ہوتے ہیں، بعض حبس دوام یا لمبی قید کے سزاوار ہوتے ہیں اور بعض زجر شدید کے مستحق ہوتے ہیں۔

پس جو شخص اسلام کا اقرار کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، زکوۃ ادا کرتا ہے اور ساتھ ہی اعمال شرکیہ بھی کرتا ہے، بزرگوں کی قبروں کو سجدہ کرتا ہے، ان کی منتیں مانتا ہے ان سے مدد طلب کرتا ہے اور اولاد مانگتا ہے، وہ مشرک تو ہے مگر کافر نہیں۔ اللہ تعالیٰ جب تک چاہیں گے وہ جہنم میں گناہوں کی سزا پائے گا مگر بالآخر نجات پائے گا۔ وہ اسلام سے خارج نہیں۔ واللہ اعلم

شرک کی صورتوں کا تفصیلی بیان

اب حضرت شاہ صاحب قدس سرہ شرک کے پیکر ہائے محسوس بیان کرتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت اسلامی میں شرک کے مظان (مواقع شرک) قرار دیا ہے اور ان کی ممانعت فرمائی ہے۔ شاہ صاحب نے اس باب میں شرک کی نو صورتیں بیان کی ہیں، جو یہ ہیں: ۱- غیر اللہ کو سجدہ کرنا ۲- حوائج میں غیر اللہ سے مدد طلب کرنا ۳- کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنا ۴- علماء ومشائخ کو تحلیل وتحریم کا اختیار دینا ۵- غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا ۶- غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنا ۷- غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا ۸- غیر اللہ کی جگہوں کا حج کرنا ۹- غیر اللہ کی طرف بندگی کی نسبت کرکے نام رکھنا۔

یہ نو چیزیں ایسی ہیں جو دل میں مکنون شرک کی غمازی کرتی ہیں۔ اور اگر دل میں ابھی شرک متحقق نہیں ہوا تو رفتہ رفتہ ہوجائے گا۔ اس لئے شریعت میں ان امور کی شدت سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ذیل میں ان تمام شکلوں کا تفصیلی بیان ہے۔

① غیر اللہ کو سجدہ کرنا

لوگ بتوں کو اور ستاروں کو سجدہ کیا کرتے ہیں، اس لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت آئی۔ سورہ حٰمٓ السجدة آیت ۳۷ میں ارشاد ہے:

''اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن، سورج، اور چاند ہیں۔ سو تم نہ تو سورج کو سجدہ کرو، اور نہ چاند کو۔ اور اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے، اگر تم کو خدا کی عبادت کرنی ہے''

اور ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ شرک فی السجدہ اور شرک فی التدبیر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جو غیر خدا کو مدبر عالم مانتا ہے وہ ضرور اس کو سجدہ کرتا ہے یا کرے گا۔ اسی طرح جو غیر خدا کو سجدہ کرتا ہے، وہ ضرور اس کو مدبر عالم سمجھتا ہے یا سمجھے گا۔ اس مبحث کے باب اول میں جو توحید کے بیان میں ہے اس بات کی طرف اشارہ آچکا ہے کہ توحید کے مراتب اربعہ میں سے آخری دو مرتبے باہم مربوط اور لازم ملزوم ہیں۔ ان میں فطری ارتباط اور عادی لزوم ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔

توحید عبادت، دین کا بنیادی اور عقلی مسئلہ ہے

فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا تھا اس کے متعلق اجماع ہے کہ وہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا، تعظیم اور سلامی کا سجدہ تھا، کیونکہ غیر اللہ کو عبادت کا سجدہ کرنا کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کفر کے کاموں کا بندوں کو حکم نہیں دیتے۔ پھر تین رائیں ہیں:

ایک رائے: یہ ہے کہ آدم علیہ السلام صرف قبلہ توجہ تھے، سجدہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کیلئے تھا۔ یہ قول صحیح نہیں ہے۔

دوسری رائے: یہ ہے کہ سجدہ آدم علیہ السلام ہی کو کیا گیا تھا، مگر یہ سجدۂ تعظیم وتحیہ تھا، سجدۂ عبادت نہیں تھا۔ اور سابقہ امتوں میں ایسا سجدہ روا تھا۔ یہ رائے صحیح ہے۔

تیسری رائے: یہ ہے کہ درحقیقت سجدہ کیا ہی نہیں گیا تھا۔ بلکہ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے انقیاد وخضوع کا اظہار کیا تھا۔ یعنی سر اطاعت خم کیا تھا، جس کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ رائے بھی صحیح نہیں ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سجدہ تو عبادت ہے، اور عبادت غیر اللہ کی جائز نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سجدہ کا حکم کیسے دیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سجدہ ہمیشہ عبادت نہیں ہوتا۔ وہ نیت کے تابع ہے۔ اگر بہ نیت تعظیم وتحیہ سجدہ کیا جائے تو وہ عبادت نہیں ہے مگر چونکہ وہ شرک کا مظنہ ہے، اس لئے ہماری شریعت میں مطلقاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا

ہے۔ اور اگر سجدہ بہ نیت بندگی ہو تو وہ عبادت ہے۔ اور فرشتوں کا سجدہ پہلی نیت سے تھا۔ کیونکہ غیر اللہ کی عبادت کی حرمت دین کا بنیادی مسئلہ ہے اور ہر طرح سے عقلی ہے یعنی اس پر دلیل عقلی قائم کی جاسکتی ہے۔ اور یہ مسئلہ ورود شرع کا محتاج نہیں۔ یہ مسئلہ کوئی فرعی مسئلہ نہیں ہے کہ ادیان کے اختلاف سے اس کا حکم مختلف ہو۔ اور اس پر دلیل قائم نہ کی جاسکے (تفصیل کے لئے تفسیر رازی ۲:۲۱۲ دیکھیں)

بعض لوگوں نے مذکورہ اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ سجدۂ عبادت سابقہ شریعتوں میں غیر اللہ کے لئے جائز تھا۔ کیونکہ وہ ایک فرعی اور فقہی حکم ہے، جو ادیان کے اختلاف سے مختلف ہوسکتا ہے۔ غیر اللہ کی عبادت کی حرمت کا مسئلہ کوئی دین کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، جس پر استدلال عقلی قائم کیا جاسکے۔ روح المعانی (۱:۲۲۸) میں اس خیال کو ذکر کر کے اس کی تردید کی گئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ بھی اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

بعض متکلمین کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ توحید عبادت یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا احکام فقہیہ میں سے ایک حکم ہے، جو اختلاف ادیان سے مختلف ہوسکتا ہے۔ اور اس پر کسی دلیل عقلی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قول اس لئے غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لازم کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو تخلیق و تدبیر میں متفرد سمجھیں یعنی یہ عقیدہ رکھیں کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو پیدا کرنے والے تنہا اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور وہی نظام عالم چلا رہے ہیں۔ وہی پروردگار، پالنہار اور مدبر و منتظم ہیں۔ سورۃ النمل آیات ۵۹-۶۴ میں ارشاد ہے:

''آپ (بیان توحید کے لئے بطور خطبہ کے) کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو، جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جن کو شریک ٹھہراتے ہیں؟

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا، اور اس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے ہم نے رونق دار باغ اُگائے، تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اُگاتے (یا وہ بہتر ہیں جن کو لوگ شریک ٹھہراتے ہیں؟) کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ مگر یہ ایسے لوگ ہیں جو دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں!

یا وہ اللہ بہتر ہے جس نے زمین کو قرار گاہ بنایا، اور اس کے درمیان نہریں بہائیں، اور اس کے استقرار کے لئے پہاڑ بنائے، اور دو دریاؤں کے درمیان ایک حد فاصل بنائی (یا شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ ان میں زیادہ تو سمجھتے ہی نہیں!

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جو بے قرار آدمی کی سنتا ہے، جب وہ اس کو پکارتا ہے، اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے، اور تم کو زمین میں صاحب تصرف بناتا ہے (یا وہ شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ تم لوگ بہت ہی کم نصیحت پذیر ہوتے ہو!

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جو تم کو خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں رستہ سوجھاتا ہے، اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے، جو بارش کی امید دلا کر دلوں کو خوش کر دیتی ہے (یا وہ شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے شرک سے برتر ہیں!

یا وہ اللہ (بہتر ہے) جو مخلوقات کو اول بار پیدا کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، اور جو آسمان اور زمین سے تم کو روزی دیتا ہے (یا وہ شرکاء بہتر ہیں؟) کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ آپؐ کہئے: تم اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم سچے ہو!

ان آیات پاک کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق بھی وہی ہے اور مدبر و منتظم بھی وہی ہے پس معبود بھی وہی ہے۔ کیونکہ خلق وتدبیر اور معبودیت میں تلازم ہے۔ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ پس برحق بات یہ ہے کہ خود مشرکین صرف اللہ تعالیٰ کو خالق مانتے تھے اور امور عظام کا مدبر و منتظم بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ اور وہ یہ بھی مانتے تھے کہ توحید تدبیر اور توحید عبادت میں تلازم ہے۔ یعنی جو خالق و مدبر ہے وہی معبود ہے، اور کوئی معبود نہیں ہوسکتا، اور جو معبود ہے وہی خالق و مدبر ہے، دوسرا کوئی خالق و مدبر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ دونوں باتوں میں فطری ارتباط ہے، جیسا کہ باب التوحید میں گذرا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر مذکورہ پانچ آیتوں میں حجت قائم کی ہے کہ جب تم اللہ ہی کو ہر چیز کا خالق اور امور عظام کا مدبر مانتے ہو تو پھر عبادت شرکاء کی کیوں کرتے ہو؟ سوچو، اُن کا عبادت کا استحقاق کہاں سے پیدا ہوگیا؟ اللہ اکبر! کیسی کامل برہان الٰہی ہے! اور کتنی مضبوط و مستحکم دلیل ہے! پس قائل کا یہ قول کہ توحید عبادت پر دلیل عقلی قائم نہیں کی جاسکتی، کیسے درست ہوسکتا ہے؟!

ونحن نريد أن ننبهك على أمور جعلها الله تعالى فى الشريعة المحمدية— على صاحبها الصلوات والتسليمات —— مظِنَّاتٍ للشرك، فنهى عنها:

فمنها: أنهم كانوا يسجدون للأصنام والنجوم، فجاء النهى عن السجدة لغير الله تعالى، قال الله تعالى: ﴿لَاتَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ، وَلَالِلْقَمَرِ، وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ﴾ والإشراك فى السجدة كان متلازماً للإشراك فى التدبير، كما أومأنا إليه.

وليس الأمر كما يَظُنُّ بعضُ المتكلمين من أن توحيد العبادة حكمٌ من أحكام الله تعالى مما يختلفُ باختلاف الأديان، لايطلب بدليل برهانى؛ كيف؟ ولو كان كذلك لم يُلْزِمهم الله تعالى بتفرده بالتخليق والتدبير، كما قال— عَزَّ من قائلٍ—: ﴿ قُلِ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى، آللّٰهُ خَيْرٌ﴾ إلى آخرِ خمسِ آيات؛ بل الحق: أنهم اعترفوا بتوحيد الخلق، وبتوحيد التدبير فى الأمور العظام، وسلّموا أن العبادة متلازمةٌ معهما، لِمَا أشرنا إليه فى تحقيق

معنى التوحيد، فذلك ألزمهم الله بما ألزمهم، ولله الحجة البالغة.

ترجمہ: اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو ان امور سے آگاہ کریں جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت محمدیہ ــــ صاحب شریعت پر بے پایاں رحمتیں اور سلام ہو ــــ میں شرک کے مظان (احتمالی جگہیں) گردانی ہیں، پس اُن سے روک دیا ہے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ لوگ بتوں اور ستاروں کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے۔ پس غیر اللہ کے آگے سجدہ کرنے کی ممانعت آئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تم نہ آفتاب کو سجدہ کرو، نہ چاند کو، اور اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے'' اور سجدہ میں شریک گردانا، تدبیر عالم میں شریک گرداننے کے ساتھ لازم وملزوم ہے، جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اور معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا بعض علمائے کلام خیال کرتے ہیں کہ توحید عبادت احکام خداوندی میں سے ایک حکم ہے، جو اختلاف ادیان کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے (اور) اس پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں کی جاسکتی۔ بعض متکلمین کی یہ بات کیونکر درست ہوسکتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ لوگوں پر لازم قرار نہ دیتے کہ وہ اسے تخلیق وتدبیر میں منفرد سمجھیں، جیسا کہ اللہ نے فرمایا ــ بات کا قائل بڑی عزت والا ہے ــــ: ''کہہ دیں: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور سلام ہو اللہ کے اُن بندوں پر جن کو اللہ نے چن لیا ہے، کیا اللہ تعالیٰ بہتر ہیں'' (اس آیت کے بعد کی) پانچ آیتوں تک پڑھ جاؤ۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ مشرکین توحید خلق اور امور عظام میں توحید تدبیر کے معترف تھے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ عبادت مذکورہ دونوں توحیدوں کے ساتھ لازم وملزوم ہے، اُس وجہ سے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، توحید کے معنی کی تحقیق میں، پس اُسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر وہ بات لازم کی ہے جو ان پر لازم کی ہے، اور کامل برہان اللہ تعالیٰ کے لئے ہے!

۲ حوائج میں غیر اللہ سے مدد طلب کرنا

مشرکین اپنی حاجتوں میں جیسے شفایابی اور مالداری میں غیر اللہ سے مدد طلب کیا کرتے تھے۔ اور اپنے مقاصد میں حاجت برآری کے لئے ان کی منتیں مانا کرتے تھے۔ اور حصول برکت کی غرض سے ان کے ناموں کی مالا جپا کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر لازم کیا کہ وہ اپنی نمازوں میں کہا کریں کہ: ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں'' (سورۃ الفاتحہ آیت ۴) اور ارشاد فرمایا: ''تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو'' (سورۃ الجن آیت ۱۸) اور پکارنے سے مراد عبادت نہیں ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، بلکہ پکارنے سے مراد استغاثہ (دادفریاد) اور طلب اعانت ہے۔ سورۃ الانعام آیت ۴۰ و ۴۱ میں ''پکارنا'' اسی معنی میں آیا ہے، ارشاد ہے:

''بتلاؤ، اگر تم پر خدا کا کوئی عذاب آپڑے، یا تم پر قیامت ہی آپہنچے تو کیا خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم

سچے ہو؟ بلکہ اسی کو (اللہ تعالیٰ ہی کو) پکارنے لگو گے، پھر جس مصیبت کے لئے تم پکارو گے اگر وہ چاہے گا تو اس کو ہٹا دے گا، اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کو بھول جاؤ گے"

اس آیت میں پکارنے سے مراد آڑے وقت میں مدد کے لئے پکارنا ہے، پس سورۃ الجن کی آیت میں بھی یہی معنی ہیں۔ پس غیر اللہ سے مدد طلب کرنے کی صراحۃً ممانعت ہوگئی۔

فائدہ:

مفسرین عام طور پر سورۃ الجن کی آیت میں دعا بمعنی عبادت لیتے ہیں۔ اور سیاق آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ پوری آیت یہ ہے ﴿وَأَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا﴾ ترجمہ: اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں، سو مت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو (ترجمہ شیخ الہندؒ) فوائد عثمانی میں ہے کہ "یوں تو خدا کی ساری زمین اس امت کے لئے مسجد بنا دی گئی ہے، لیکن خصوصیت سے وہ مکانات جو مسجدوں کے نام سے خاص عبادت الٰہی کے لئے بنائے جاتے ہیں ان کو اور زیادہ امتیاز حاصل ہے، وہاں جا کر اللہ کے سوا کسی ہستی کو پکارنا ظلم عظیم اور شرک کی بدترین صورت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خالص خدائے واحد کی طرف آؤ۔ اور اس کا شریک کر کے کسی کو کہیں بھی مت پکارو، خصوصاً مساجد میں جو اللہ کے نام پر تنہا اسی کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں"

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے: "اور جتنے سجدے ہیں وہ سب اللہ کا حق ہیں، سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو" اور حاشیہ میں لکھا ہے: "یعنی یہ جائز نہیں کہ کوئی سجدہ اللہ کو کیا جاوے اور کوئی سجدہ غیر اللہ کو، جیسا مشرکین کرتے تھے"

غرض مفسرین کی عام رائے یہ ہے کہ سورۃ الجن کی آیت میں دعا بمعنی عبادت ہے اور سورۃ الانعام کی آیت میں دعا بمعنی استغاثہ وطلب اعانت ہونے سے ضروری نہیں کہ وہی معنی سورۃ الجن کی آیت میں بھی ہوں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مقصود درحقیقت قرآن کریم سے صراحۃً طلب اعانت کی نہی ثابت کرنا ہے۔ مگر یہ بات اس آیت سے ثابت نہیں ہوتی۔

(۳) کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنا

مشرکین اپنے خودساختہ معبودوں کو "اللہ کی بیٹیاں" اور "اللہ کے بیٹے" کہتے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان آلائشوں سے پاک ہیں۔ ﴿لَمْ يَلِدْ﴾ ان کی شان ہے۔ اس لئے ایسا کہنے سے سختی سے روکا گیا۔ اور اس کی وجہ گذشتہ باب کے آخر میں بیان کی جا چکی ہے کہ مشرکانہ مزاج کی حامل اقوام بعض شخصیات کو "بندہ" کہنے میں ان کی کسر شان سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی قدر افزائی کے لئے اس طرح کی تعبیرات اختیار کرتے ہیں، جو شرک کا پیش خیمہ ہیں۔

ومنها: أنهم كانوا يستعينون بغير الله في حوائجهم: من شفاء المريض، وغِناء الفقير،

ويـنـذرون لهـم، يتـوقـعـون إنـجـاحَ مقاصدهم بتلك النذور، ويتلون أسماء هم رجاءَ بركتها، فـأوجـب الـلّـه تـعـالى عليهم أن يقولوا في صلواتهم: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ، وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ وقال تعالى: ﴿فَلاَ تَدْعُوْا مَعَ اللّهِ أَحَدًا﴾؛ وليـس الـمراد من الدعاء العبادةُ، كما قال بعض المفسرين، بل هو الاستعانة، لقوله تعالى: ﴿ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَاتَدْعُوْنَ﴾

ومنها : أنهـم كـانـوا يسـمُّـون بعضَ شركائهم بناتِ اللّه، وأبناءَ اللّه، فَنُهوا اعن ذلك أشد النهي، وقد شرحنا سِرَّه من قبل.

ترجمہ: اوران صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ اپنی حاجتوں میں یعنی مریض کی شفایابی میں اور فقیر کی مالداری میں غیر اللہ سے مدد طلب کیا کرتے تھے۔ اوران کی منتیں مانتے تھے۔ امید رکھتے تھے وہ ان منتوں سے اپنے مقاصد کے پورا ہونے کی اوران کے ناموں کی مالا جپا کرتے تھے ان ناموں کی برکت کی امید سے، پس اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر لازم کیا کہ وہ اپنی نمازوں میں کہیں: ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''پس نہ پکارو تم اللہ کے ساتھ کسی کو'' اور ''پکارنے'' سے مراد عبادت نہیں ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ بلکہ طلب اعانت ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے: ''بلکہ اسی کو پکارنے لگو گے تم، پس وہ ہٹائے گا اس کو جس کے لئے تم پکارتے ہو''

اوران صورتوں میں سے: یہ ہے کہ لوگ اپنے شرکاء (خودساختہ معبودوں) کو ''اللہ کی بیٹیاں'' اور ''اللہ کے بیٹے'' نام رکھتے تھے، پس وہ سختی کے ساتھ اس سے روکے گئے۔ اور ہم اس کا راز پہلے بیان کر چکے ہیں۔

نوٹ: کانوا یستعینون مخطوطہ کراچی میں کانوا یستغیثون اور بل هو الاستعانة بل هو الاستغاثة ہے۔

④ علماء ومشائخ کو تحلیل وتحریم کا اختیار دینا

یہود ونصاریٰ اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء ومشائخ کو رب بنائے ہوئے تھے۔ اَحبار، حِبر کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں ''بڑا عالم'' یہ یہود کی اصطلاح ہے۔ ان میں دُرویشی کا رواج نہیں ہے ان کے عوام پر علماء کا قبضہ ہے اور رُھبان، راھب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں عابد وزاہد۔ یہ عیسائیوں کی اصطلاح ہے۔ ان کے یہاں بزرگی اور ترک دنیا کو بہت اہمیت حاصل ہے اوران کے عوام پر مشائخ کا قبضہ ہے۔ غرض یہود اپنے علماء کی اور عیسائی اپنے بزرگوں کی تحلیل وتحریم کے باب میں اللہ کی اطاعت کی طرح اطاعت کرتے ہیں یعنی ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو چیز یہ لوگ حلال یا حرام کردیں وہ نفس الامر میں بھی حلال یا حرام ہو جاتی ہے۔ پس اس حلال کے کرنے میں کوئی حرج نہیں اور حرام کے ارتکاب پر مؤاخذہ ہوگا۔ ظاہر ہے ایسی اطاعت صریح عبادت ہے اور یہی ان کو رب بنانا ہے۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ جو پہلے عیسائی تھے، جب اسلام لائے تو انھوں نے سورۃ التوبہ کی آیت ۳۱ کے بارے میں اپنا

خلجان خدمت نبوی میں پیش کیا کہ یہود ونصاری اپنے علماء ومشائخ کی عبادت نہیں کرتے ہیں، پھر ان کو رب بنانے کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے دریافت کیا: کیا ان کے علماء ومشائخ جن چیزوں کو حلال یا حرام ٹھہراتے ہیں ان کو وہ لوگ حلال یا حرام نہیں سمجھتے؟ حضرت عدی نے کہا: ہاں ایسا تو وہ سمجھتے ہیں! آپؐ نے فرمایا یہی ان کو رب قرار دینا ہے (ترمذی ۲:۱۳۶)

غیر اللہ کو تحلیل وتحریم کا اختیار دینا شرک کیوں ہے؟ اللہ کے سوا کسی کو تحلیل وتحریم کا اختیار دینا شرک اس لئے ہے کہ حلال وحرام ہونے کے معنی ہیں عالم ملکوت (حظیرۃ القدس) میں نافذ ہونے والا اللہ کا تکوینی حکم کہ فلاں کام کرنے پر مؤاخذہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ حلال ہے اور فلاں کام کے کرنے پر مؤاخذہ ہوگا کیونکہ وہ حرام ہے۔ اور تکوینی حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے اور اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اب اگر احکام دینے کا اختیار غیر اللہ کے لئے مان لیا جائے تو یہ صفت تکوین میں اشراک ہے۔ اور اشراک فی التکوین اشراک فی العبادۃ کو مستلزم ہے اس لئے ممنوع ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات پیدا کرکے اس کو تکوینی احکام دے رکھے ہیں۔ سورۃ الاعراف آیت ۵۴ میں ہے:

''بیشک تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ رات پر دن کو ڈھانکتا ہے۔ دن دوڑ کر ڈھونڈھتا ہے رات کو، اور پیدا کیا سورج، چاند اور ستاروں کو، جو اس کے حکم کے تابعدار ہیں، سنو: اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم دینا ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ اللہ بڑی برکت والے ہیں جو تمام عالم کے پروردگار ہیں!''

خلق کے معنی ہیں پیدا کرنا۔ اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی احکام دینا امر ہے۔ یہ دونوں باتیں اُسی کے قبضہ واختیار میں ہیں، پس وہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ اور تمام کائنات کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تکوینی احکام دے رکھے ہیں، انسانوں کے لئے احکام بھی تکوینی طور پر پہلے عالم ملکوت میں یعنی ملأ اعلیٰ میں طے ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ احکام انبیاء پر نازل ہوتے ہیں تو تشریعی احکام کہلاتے ہیں پس مؤاخذہ اور عدم مؤاخذہ کا اصل سبب تکوینی حکم ہے، اور یہ امر یعنی تکوینی حکم دینا صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ اب اگر یہ اختیار غیر اللہ کو دیدیا جائے تو یہ شرک فی الطاعہ ہے جس کے لئے عبادت میں اس غیر اللہ کو شریک کرنا لازم ہے، اس لئے ایسا اختیار غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا حرام ہے۔

سوال: قرآن کریم میں اور بہت سی احادیث میں رسول اللہ ﷺ کی طرف تحلیل وتحریم کی نسبت کی گئی ہے، جیسے سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ میں ہے ﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ، وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ (وہ نبی امی پاکیزہ چیزیں لوگوں کے لئے حلال کرتے ہیں اور گندی چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں) جب تحلیل وتحریم کا حق اللہ ہی کا ہے تو یہ نسبت کیسی؟

جواب: یہ نسبت مجازی ہے، چونکہ رسول، اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے اس لئے علاقۂ توسط کی وجہ سے نسبت کی جاتی ہے۔ تحلیل وتحریم درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد، اس کی خبر اور قطعی علامت ہوتا ہے۔ مسند دارمی کے مقدمہ میں روایت ہے کہ حضرت جبرئیل جس طرح کتاب اللہ کی وحی لے کر

آتے تھے، احادیث کی وحی بھی لے کر آتے تھے (دارمی ۱: ۱۴۵ باب السنة قاضية على كتاب الله)

یہی سوال مجتہدین کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے کہ مسائل کی جو ان کی طرف نسبتیں کی جاتی ہیں وہ کیسی ہیں؟ تشریع (قانون سازی) کا حق تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، پھر ان ائمہ کا کام کیا ہے؟

اس کا جواب بھی یہی ہے کہ یہ نسبت بھی مجازی ہے۔ چونکہ مجتہدین مسائل شرعیہ کے ناقل ہیں اس لئے ان کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ اور نقل کرنا عام ہے خواہ نص صریح سے وہ مسئلہ بیان کریں یا کسی نص سے مستنبط کر کے بیان کریں۔ دونوں باتیں یکساں ہیں۔ وہ بہرصورت راوی ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسئلہ بتلاتے ہیں، اپنی طرف سے نہیں بتلاتے۔ علامہ ابن القیم حنبلی رحمہ اللہ نے ایک قیمتی کتاب اصول اجتہاد وفتاوی میں لکھی ہے۔ اس کا نام إعلام المُوَقِّعِيْنَ عن رب العالمين. ہے موقِّع اسم فاعل ہے تَوقِيع سے، جس کے معنی ہیں دستخط کرنا۔ پس کتاب کے نام کا مطلب ہے: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستخط کرنے والے ہیں ان کو ضروری باتوں سے باخبر کرنا یعنی مجتہدین عظام اور مفتیان کرام جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہتے ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔

فائدہ:

ہندوستان کی ایک جماعت اپنے استناد کے لئے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو ''غیر مقلد'' بتلاتی ہے۔ مگر شاہ صاحب کی اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ غیر مقلد (اہل حدیث) نہیں تھے، بلکہ مقلد تھے۔ کیونکہ غیر مقلدین تو ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ﴾ سے تقلید کی تردید کرتے ہیں اور اس کو شرک بتلاتے ہیں۔ اور شاہ صاحب مجتہدین کی طرف سے دفاع کر رہے ہیں۔ اشکال کا جواب دے رہے ہیں اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو مجتہدین کرام کو برحق سمجھتا ہو اور ان کا معتقد ہو۔ منکر تقلید کو مجتہدین کی طرف سے دفاع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟!

شریعت کی بعض باتوں سے اِباء بھی شرک کے زمرہ میں آتا ہے

جب اللہ تعالیٰ کسی رسول کو مبعوث فرماتے ہیں اور اس کی رسالت معجزات سے مؤید ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ بعض وہ چیزیں حلال کرتے ہیں جو قدیم ملت میں حرام تھیں، جیسے یہود کی ملت میں بار کا دن معظم تھا یا اونٹ کا دودھ اور گوشت حرام تھا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا اور بار کی جگہ اتوار کی حرمت آئی اور بار کی تعظیم ختم ہو گئی پھر خاتم النبیین ﷺ کا دور آیا تو جمعہ محترم قرار پایا اور اونٹ کا دودھ اور گوشت حلال قرار دیا گیا۔ اب اگر کوئی یہودی یا عیسائی مسلمان ہوتا ہے مگر اس کا دل بار یا اتوار کی تعظیم کی طرف مائل رہتا ہے یا وہ اب بھی اونٹ کا دودھ یا گوشت استعمال نہیں کرتا تو یہ باز رہنا دو وجہ سے ہو سکتا ہے:

۱- اس کو نئی شریعت کے ثبوت میں تردد ہے تو یہ نئے نبی کا انکار ہے پس وہ مسلمان نہیں۔

۲-اس کا یہ عقیدہ ہے کہ تحریم اول ناقابل نسخ ہے۔ کیونکہ سابق پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے الوہیت کی پوشاک پہنائی ہے۔ یا وہ فانی فی اللہ، باقی باللہ ہے۔ اس لئے اس نے جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے، اگر ان کو اختیار کیا جائے گا تو وہ ناراض ہوجائے گا مال یا آل میں آفت آئے گی تو یہ شخص مشرک ہے، وہ غیر اللہ کے لئے اللہ جیسی ناراضی اور غضب اور اللہ جیسی تحلیل وتحریم کا اختیار ثابت کرتا ہے پس یہ چیز بھی شرک کے زمرہ میں آتی ہے۔

فائدہ:

بعض ہندو مسلمان ہوتے ہیں اور اسلام قبول کرنے کے بعد بھی گائے کا گوشت کھانے سے اباء کرتے ہیں۔ اگر یہ انکار مذکورہ وجوہ سے ہے تو اس کا حکم گذر چکا۔ اور اگر محض طبعی نفرت ہے، کیونکہ انھوں نے زندگی بھر گائے کا گوشت نہیں کھایا اس لئے اب جی نہیں چاہتا تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ ان کو بہ تکلف اپنی طبیعت بدلنی چاہئے اور اسلام میں پورا پورا داخل ہوجانا چاہئے۔ اسی سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۸ نازل ہوئی ہے۔ ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''

یعنی ظاہر وباطن اور عقیدہ وعمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو۔ رسوم وبدعات اور خواہشات نفس کی پیروی مت کرو۔ اور مسلمان ہونے کے بعد بھی گائے کے گوشت سے اجتناب خواہش نفس کی پیروی ہے۔

ومنها: أنهم كانوا يتخذون أحبارَهم ورهبانهم أربابا من دون الله تعالى، بمعنى أنهم كانوا يعتقدون أن ما أحلَّه هؤلاء حلال، لابأس به في نفس الأمر، وأنَّ ما حَرَّمه هؤلاء حرام، يُؤَاخذون به في نفس الأمر؛ولَمَّا نزل قولُه تعالى:﴿إِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ﴾ الآيةَ، سأل عدى بن حاتم رسولَ الله صلى الله عليه وسلم عن ذلك، فقال:﴿ كانوا يُحِلُّون لهم أشياءَ، فيستحلونها، ويحرِّمون عليهم أشياء، فيحرمونها﴾

وسر ذلك: أن التحليل والتحريم عبارة عن تكوينٍ نافذٍ في الملكوت: أن الشيئَ الفُلانيَّ يؤاخذ به، أولا يؤاخذ به، فيكون هذا التكوين سببا للمؤاخذة وتركِها، وهذا من صفات الله تعالى.

وأما نسبة التحليل والتحريم إلى النبى صلى الله عليه وسلم، فبمعنى أن قولَه أمارة قطعية لتحليل الله وتحريمه؛ وأما نسبتُها إلى المجتهدين من أمته، فبمعنى روايتهم ذلك عن الشرع: من نص الشارع، أو استنباطِ معنىً من كلامه.

واعلم: أن اللّٰه تعالى إذا بعث رسولاً، وثبتت رسالتُه بالمعجزة، وأحل على لسانه بعضَ

مـاكـان حـرامـاً عـنـدهـم، ووجـد بعضُ الناس في نفسه انجِحَامًا عنه، وبقي في نفسه مَيْلٌ إلى حرمته، لِمَا وجد في ملته من تحريمه، فهذا على وجهين:

[١] إن كان لتردد في ثبوت هذه الشريعة فهو كافر بالنبي.

[٢] وإن كان لاعتقاد وقوع التحريم الأول تحريماً لايحتمل النسخ، لأجل أنه تبارك وتعالى خلـع عـلـى عبدٍ خِلعة الألوهية، أو صار فانيا في الله، باقيابه، فصار نهيُه عن فعل أو كراهيتُه له، مستوجِبًا لحِرْمٍ في ماله وأهله، فذلك مشرك بالله تعالى، مثبتٌ لغيره غضبا وسُخطا مقدَّسَيْن، وتحليلاً وتحريماً مقدَّسَيْن.

ترجمہ: اوران صورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ اپنے علماء وزہاد کو اللہ کو چھوڑ کر رب (خدا) بناتے تھے یعنی وہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جو چیز ان لوگوں نے حلال کی ہے وہ حلال ہے۔ اس کے کرنے میں نفس الامر (واقعہ) میں کوئی گرفت نہیں اور یہ کہ ان لوگوں نے جو چیز حرام کی ہے وہ حرام ہے۔ اس کی وجہ سے نفس الامر میں پکڑے جائیں گے۔ اور جب یہ ارشاد نازل ہوا کہ: ''انھوں نے اپنے علماء ومشائخ کو رب بنایا'' آخر آیت تک پڑھیے تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ لوگ ان کیلئے کچھ چیزوں کو حلال کرتے تھے پس وہ ان کو حلال سمجھتے تھے۔ اور کچھ چیزوں کو ان پر حرام کرتے تھے پس وہ ان کو حرام سمجھتے تھے''

اوراس کا راز یہ ہے کہ تحلیل وتحریم نام ہے عالم ملکوت میں نافذ ہونے والے تکوینی حکم کا کہ فلاں چیز کی وجہ سے مؤاخذہ ہوگا یا فلاں چیز کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ پس یہ تکوینی حکم مؤاخذہ اور ترک مؤاخذہ کا سبب ہوتا ہے (کیونکہ اسی تکوینی حکم کے مطابق دنیا میں تشریعی حکم نازل ہوتا ہے) اور یہ (تکوینی حکم دینا) اللہ کی صفت ہے۔

اور رہی تحلیل وتحریم کی نسبت آنحضور ﷺ کی طرف تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا ارشاد ایک قطعی علامت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحلیل وتحریم کی۔ اور رہی اس کی نسبت آپ کی امت کے مجتہدین کی طرف، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرات ان مسائل کے شریعت کی طرف سے ناقل ہیں۔ خواہ شارع کی نص سے بیان کریں یا شارع کے کلام سے کوئی معنی مستنبط کر کے بیان کریں۔

اور جان لیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی رسول کو مبعوث فرماتے ہیں اور اس کی رسالت معجزہ سے ثابت ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی زبان سے بعض وہ چیزیں حلال کرتے ہیں جو ان کے نزدیک (قدیم ملت) میں حرام تھیں۔ اور بعض لوگ اپنے دل میں اس سے اباء پاتے ہیں۔ اور ان کے دل میں اس کی حرمت کی طرف میلان باقی رہتا ہے اس وجہ سے کہ اس نے اپنی ملت میں اس کی حرمت پائی ہے، تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

۱- اگر یہ اباء اس لئے ہے کہ اس (نئی) شریعت کے ثبوت میں اسے تردد ہے تو وہ اس (نئے) نبی کا منکر ہے۔

۲- اور اگر وہ اباء اس لئے ہے کہ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ تحریم اول کا وقوع ایسی تحریم ہے جو نسخ کا احتمال نہیں رکھتی، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو الوہیت کی پوشاک پہنادی ہے یا وہ اللہ میں فنا ہوگیا ہے، اس کے ساتھ باقی رہنے والا ہے، پس اس کا کسی امر کی نہی کرنا یا اس کا کسی چیز کو ناپسند کرنا لازم کرنے والا ہے مال اور آل میں نقصان کو تو وہ شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والا ہے۔ غیر اللہ کے لئے اللہ جیسا غصہ اور اللہ جیسی ناراضگی اور اللہ جیسا تحلیل کا اور اللہ جیسا تحریم کا اختیار ثابت کرنے والا ہے۔

لغات: اِنْجَحَم (بتقدیم الجیم) اور اِنْحَجَم (بتقدیم الحاء) عن الشیئ: کفَّ ونَکَصَ وامتنع: رکنا، باز رہنا، اباء کرنا...... اِسْتَوْجَبَ الشیئَ: واجب ولازم جاننا...... الجِرْم: النقصان

☆ ☆ ☆

⑤ غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا

یہ بھی شرک کا ایک سانچا ہے، جس میں شرک ڈھل کر تیار ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے مشرکین بتوں اور ستاروں کا قرب حاصل کرنے کے لئے ان کے نام پر جانور ذبح کیا کرتے تھے۔ اور اس کی دو صورتیں ہوتی تھیں:

(۱) ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیتے تھے، جیسے ہندو "لے کالی ماتا" کہہ کر بکرے کا جھٹکا کرتے ہیں۔

(۲) معبودانِ باطل کی پرستش گاہوں (آستانوں) پر جانور لے جا کر ذبح کرتے تھے۔

قرآن کریم میں دونوں صورتوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ پہلی صورت کی ممانعت قرآن کریم میں چار جگہ آئی ہے ارشاد ہے: "جس جانور پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے وہ حرام ہے" (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۳ المائدہ ۴ الانعام ۱۴۵ النحل ۱۱۵) اور دوسری صورت کی ممانعت سورۃ المائدہ آیت چار میں آئی ہے ارشاد ہے: "جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے وہ حرام ہے" ﴿وَمَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾

⑥ غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنا

کسی جانور کا کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر غیر اللہ کی تعظیم اور تقرب حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دینے کا بھی مشرکین میں رواج تھا۔ پھر وہ نہ اس سے کام لیتے تھے، نہ ذبح کرتے تھے، نہ اس سے اور کوئی فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ فعل بھی حرام ہے اور اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ کی آیت ۱۰۳ نازل ہوئی ہے ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو، اور نہ وصیلہ کو، اور نہ حامی کو، لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں (کہ خدا تعالیٰ نے جانور چھوڑنے کا حکم دیا ہے اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں) اور

اکثر کافر عقل نہیں رکھتے (بلکہ بڑوں کی دیکھا دیکھی ایسی جہالتیں کرتے ہیں)''

مذکورہ جانوروں کی تفسیر میں مفسرین میں اختلاف ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے جو تفسیر نقل کی ہے وہ یہ ہے:

بحیرہ: وہ جانور ہے جس کا دودھ بتوں کے نام پر وقف کر دیا جاتا تھا، اس کو کوئی اپنے کام میں نہیں لاتا تھا۔

سائبہ: وہ جانور ہے جس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جیسے ہندو سانڈ کو چھوڑ دیتے ہیں۔

وصیلہ: وہ اونٹنی ہے جو مسلسل مادہ بچے جنے، درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو، تو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

حامی: وہ نر اونٹ ہے جو ایک خاص عدد تک جفتی کر چکا ہو، اُسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

مسئلہ: بتوں یا بزرگوں کے نام پر اس طرح جانور چھوڑنا حرام اور مشرکانہ رسم ہے اور بنص قرآنی حرام ہے۔ مگر اس حرام عمل سے جانور حرام نہیں ہوتا۔ بلکہ عام جانوروں کی طرح حلال رہتا ہے۔ اور یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج بھی نہیں ہوتا۔ پس اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا ہبہ کر دے تو خریدار کے لئے یہ جانور حلال ہے اور اس کی قربانی بھی درست ہے اسی طرح اگر مالک نے مندر کے پجاریوں کو یا قبر کے مجاوروں کو اختیار دے دیا ہو کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اور یہ پجاری اور مجاور اس کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دیں تو یہ بھی حلال ہے (معارف القرآن ۱:۲۲۴)

⑦ غیر اللہ کی قسم کھانا

لوگ بعض انسانوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کے نام بابرکت اور محترم ہیں اور ان کے ناموں کی جھوٹی قسم کھانا مال اور آل میں نقصان کا باعث ہے، اس لئے وہ اس کی کبھی ہمت نہیں کرتے اور نزاعات اور جھگڑوں کے موقعوں میں مخالف کو ان کے ناموں کی قسم کھلایا کرتے ہیں۔ یہ بھی حرام فعل ہے احادیث میں اس سے روکا گیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ: '' جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے (مقسوم بہ کو) خدا کے ساتھ (تعظیم میں) ساجھی بنایا'' (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ، کتاب الأیمان والنذور، حدیث نمبر ۳۴۱۹) امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض اہل علم کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث تغلیظ وتہدید پر محمول ہے یعنی غیر اللہ کی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے، ارتداد نہیں ہے (ترمذی ۱:۱۸۵ ابواب الأیمان والنذور، باب فی کراهية الحَلِف بغير الله)

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے میں یہ حمل صحیح نہیں ہے بلکہ مراد حدیث یہ ہے کہ مذکورہ عقیدہ سے غیر اللہ کی قسم کھائی جائے، خواہ یمین منعقدہ ہو یا یمین غموس۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ عقیدہ سے ایسی قسم کھانا مشرکانہ عمل اور ارتداد ہے۔ اور یمین منعقدہ وہ قسم ہے جو آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر کھائی جائے اور یمین غَموس وہ قسم ہے جو گذشتہ کسی کام پر جان کر جھوٹی کھائی جائے۔ اور جو قسم دَعم کلام (تکیہ کلام) کے لئے کھائی جاتی ہے وہ یمین لغو ہے۔ جیسے وأبیہ (اس کے

باپ کی قسم) وقرةِ عيني (میری آنکھوں کی ٹھنڈک کی قسم) یہ یمین لغو مذکورہ حدیث میں مراد نہیں ہے۔

⑧ غیر اللہ کے آستانوں کا حج کرنا

خودساختہ معبودوں کی لوگوں کے گمان کے مطابق مخصوص متبرک جگہوں کی یا نبیوں، ولیوں کی قبور وآثار کی زیارت کے لئے جانا اور اس کو موجب تقرب سمجھنا بھی شرک کا مظہر ہے۔ جیسے لوگ اجمیر وغیرہ جاتے ہیں اور اس کو باعث اجر سمجھتے ہیں اور جہلاء کا یہ اعتقاد ہے کہ سات بار اجمیر کا سفر حج کے برابر ہے۔ یہ مشرکانہ خیالات ہیں اس لئے لوگوں کو اس سے روکا گیا ہے۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ:

''اونٹ پر کجاوے نہ کسے جائیں (یعنی لمبا سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف: مسجد حرام، مسجد اقصی اور میری یہ مسجد (یعنی مسجد نبوی) (مشکوۃ باب المساجد، حدیث نمبر ۶۹۳)

فائدہ:

یہ حدیث مساجد کے تعلق سے ہے۔ مسند احمد میں مستثنیٰ منہ مذکور ہے اور وہ یہ ہے **لاينبغي للمَطِيِّ أن تُشَدَّ رحالُه إلى مسجد يبتغى فيه الصلاةَ، غير إلخ** (مجمع الزوائد ۴:۳) مگر اشتراک علت کی وجہ سے قبور وغیرہ کے حج وزیارت کو بھی شامل ہے۔ البتہ قبر کی زیارت کو ضمنی مقصد بنانا جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص اجمیر یا اس کے قریب اپنی کسی ضرورت سے گیا اور نیت یہ ہے کہ حضرت چشتی رحمہ اللہ کی قبر پر فاتحہ یعنی ایصال ثواب کے لئے بھی جائے گا تو یہ جائز ہے مستقل مقصد بنا کر دور دراز سے جانا جائز نہیں۔ یہی حکم تمام اولیاء اور انبیاء کی قبور کا ہے۔ اور سید الانبیاء ﷺ کی قبر اطہر چونکہ مسجد نبوی میں ہے اس لئے اس کی زیارت کی مستقل نیت نہیں ہوسکتی۔ اس لئے مسئلہ میں نزاع بلا وجہ ہے واللہ اعلم۔

فائدہ:

تجارتی اسفار، عزیز واقارب سے ملنے کے لئے سفر، تاریخی یا مشہور مقامات کو عبرت کے لئے دیکھنے کے لئے سفر ممنوع نہیں، وہ بالا جماع اس حدیث کا مصداق نہیں۔

⑨ غیر اللہ کی طرف بندگی کی نسبت کرنا

لوگ اپنے بیٹوں کے ناموں میں غیر اللہ کی طرف عبدیت کی نسبت کیا کرتے تھے اور عبد العزی، عبد الشمس، عبد المطلب وغیرہ نام رکھا کرتے تھے، یہ بھی شرک کا سانچا ہے۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کے بجائے ان بتوں یا ان بزرگوں کا بخشا ہوا ہے۔ اس لئے قرآن وحدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ سورۃ المائدہ آیات ۱۸۹ و ۱۹۰ میں عقیدۂ توحید کا ذکر ہے، جو اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اور اس کے ساتھ شرک کے باطل اور نامعقول ہونے کا بیان

کسی قدر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ ارشاد ہے:

وہ اللہ ایسا (قادر و منعم) ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا (اور ایک جان سے مراد تمام انسانوں کا وجود مشترک ہے) اور اسی (ایک جان یعنی وجود مشترک) سے اس کا جوڑا بنایا (یعنی عورت بھی مرد کی ہم جنس بنائی) تا کہ وہ اپنے اس جوڑے سے اُنس حاصل کرے (کیونکہ غیر جنس سے کماحقہ انسیت حاصل نہیں ہوسکتی، غرض جب وہ خالق بھی ہے اور محسن بھی ہے کہ اس کی انسیت کا سامان کیا، تو عبادت بھی اسی کی ہونی چاہئے۔ مگر طرفہ تماشا دیکھئے:) پس جب میاں نے بیوی سے قربت کی تو اس کو ہلکا سا حمل رہ گیا (جس کا شروع میں کوئی احساس نہ ہوا) سو وہ اس کو لئے ہوئے چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہوگئی (اور میاں بیوی کو حمل کا علم ہوگیا) تو دونوں میاں بیوی اللہ تعالیٰ سے جو کہ اُن کا پروردگار ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہم کو صحیح سالم اولاد دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے ساتھ شریک قرار دینے لگے (کبھی عقیدہ سے کہ یوں سمجھ بیٹھے کہ یہ بیٹا فلاں بت یا بزرگ نے دیا ہے کبھی عمل سے کہ کسی بت یا بزرگ کی طرف منسوب کردیا اور عبدالعزیٰ یا بندہ علی نام رکھ دیا) سو اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہیں"

اور ترمذی (۲:۱۳۳) اور حاکم وغیرہ کی روایات میں ہے کہ دادی حواء نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا تھا (حارث شیطان کا نام بتایا جاتا ہے) اور یہ نام رکھنا شیطان کے فریب دینے کی وجہ سے تھا، جس پر مذکورہ آیت میں شدید نکیر آئی ہے کہ یہ آدم وحواء نے شرک کیا۔ معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی طرف عبدیت کی نسبت کر کے نام رکھنا شرک ہے۔

فائدہ:

امام ترمذی رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث کو حَسَنٌ کہا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ مگر یہ روایت قطعاً باطل ہے۔ وجوہ درج ذیل ہیں:

(۱) یہ عمر بن ابراہیم بصری کی روایت ہے عن قتادة عن الحسن، عن سمرة. اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں عمر کو صدوق یعنی عمولی درجہ کا ثقہ راوی قرار دیا ہے مگر لکھا ہے کہ قتادہ رحمہ اللہ سے روایت میں یہ راوی ضعیف ہے۔

(۲) یہ حدیث مرفوع ہے یا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے؟ اس میں اضطراب (اختلاف) ہے۔ غرض یہ روایت قطعی طور پر مرفوع نہیں۔

(۳) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے لقاء اور سماع مختلف فیہ ہے، گو راجح ثبوت سماع ہے۔

(۴) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے آیت کی جو تفسیر مروی ہے وہ اس مرفوع روایت کے خلاف ہے۔ پس اگر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس یہ روایت ہوتی تو ان کی تفسیر اس کے خلاف نہ ہوتی۔ حضرت حسنؒ نے یہ تفسیر کی

ہے قال: كان هذا في بعض أهل الملل، ولم يكن بآدم (ابن کثیر)

(۵) علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان روایات کو قطعی طور پر اسرائیلی قرار دیا ہے۔ اور اس پر مفصل کلام کیا ہے۔

(۶) شرعاً اور عقلاً یہ بات ممکن نہیں کی نبی شرک کا ارتکاب کرے، چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟! اور روایت میں یہ صراحت ہے کہ آدم وحوا علیہما السلام نے مل کر یہ نام رکھا تھا (الدر المنثور ۳:۱۵۱) غرض یہ روایت عصمت انبیاء کے بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے، اس لئے مردود ہے (فائدہ ختم ہوا)

اور بے شمار احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جن صحابہ کے نام عبد العزی، عبد الشمس وغیرہ تھے، مسلمان ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام بدل کر عبد اللہ، عبد الرحمٰن اور ان سے ملتے جلتے نام رکھ دیئے تھے۔

فائدہ:

جن لوگوں کے نام عبد النبی، عبد الرسول، غلام محمد، غلام نبی، غلام رسول، نبی بخش، ولی بخش وغیرہ ہیں، ان کو اپنے نام بدل دینے چاہئیں اور اس تاویل کا سہارا نہیں لینا چاہئے کہ غلام بمعنی خادم ہے۔ اللہ کے رسول دنیا میں موجود ہوتے تو ان کا کوئی خادم ہوتا مگر جب آپ کی وفات ہوگئی تو اب کوئی خادم کیسے ہوسکتا ہے؟! یہ تاویل عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں (آمین)

دلیل عقلی: اور غیر اللہ کی طرف عبدیت کی نسبت کے غلط اور باطل ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ ساری کائنات بشمول انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اللہ کے بندے ہیں۔ سرور عالم ﷺ کے لئے قرآن کریم میں جگہ جگہ عبد (بندہ) ہونے کی صراحت موجود ہے، پھر عبد کا عبد (بندے کا بندہ) کیسے ہوسکتا ہے؟!

ومنها: أنهم كانوا يتقربون إلى الأصنام والنجوم بالذبح لاجلهم: إما بالإهلال عند الذبح بأسمائهم، وإما بالذبح على الأنصاب المخصوصة لهم، فنُهوا عن ذلك.

ومنها: أنهم كانوا يُسَيِّبُوْن السوائبَ والبحائر تقربا إلى شركائهم، فقال الله تعالى: ﴿مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ، وَلَاسَائِبَةٍ﴾ الآيةَ،

ومنها: أنهم كانوا يعتقدون في أناس: أن أسماء هم مباركة معظَّمة، وكانوا يعتقدون أن الحلفَ بأسمائهم على الكذِبِ يستوجب حِرْمًا في ماله وأهله، فلا يُقْدِمون على ذلك، ولذلك كانوا يستحلفون الخصومَ بأسماء الشركاء بزعمهم، فَنُهوا عن ذلك، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿ من حلف بغير الله فقد أشرك﴾ وقد فسره بعضُ المحدثين على معنى التغليظ والتهديد، ولا أقول بذلك، وإنما المراد عندي: اليمينُ المنعقدة واليمينُ الغموس باسم غير

الله تعالى باعتقاد ما ذكرنا.

ومنها: الحج لغير الله تعالى؛ وذلك أن يُقصَدَ مواضعُ متبركةٌ، مختصةٌ بشركائهم، يكون الحلولُ بها تقربا من هؤلاء، فنهى الشرع عن ذلك، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿لاتُشَدُّ الرحالُ إلا إلى ثلاثة مساجد﴾

ومنها: أنهم كانوا يسمُّون أبناء هم عبدَ العزّى، وعبدَ الشمس، ونحوَ ذلك، فقال الله تعالى: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ، وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا، لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا، فَلَمَّا تَغَشَّاهَا﴾ الآية، وجاء في الحديث: أن حواء سَمَّتْ ولدَها عبدَ الحارث، وكان ذلك من وحي الشيطان؛ وقد ثبت في أحاديث لاتُحصى: أن النبي صلى الله عليه وسلم غَيَّرَ أسماءَ أصحابه: عبدَ العزى، وعبدَ الشمس، ونحوَهما إلى عبد الله، وعبد الرحمن، وما أشبههما، فهذه أشباحُ وقوالبُ للشرك، نهى الشارع عنها، لكونها قوالبَ له، والله أعلم.

ترجمہ: اوران صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ بتوں اور ستاروں کی قربت ڈھونڈھا کرتے تھے، ان کے نام پر جانور ذبح کرکے، یا تو وہ ذبح کے وقت ان کے نام بآواز بلند پکارتے تھے یا ان جانوروں کو ان بتوں اور ستاروں کے مخصوص آستانوں پر لے جاکر ذبح کرتے تھے، پس لوگوں کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔

اوران صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ اپنے خود ساختہ معبودوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے سائبہ اور بحیرہ کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''نہیں مشروع کیا اللہ نے کوئی بحیرہ، اور نہ کوئی سائبہ'' آخر آیت تک۔

اوران صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ بعض انسانوں کے بارے میں اعتقاد رکھتے تھے کہ ان کے نام متبرک اور محترم ہیں اور وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے ناموں کی جھوٹی قسم کھانا آل اور مال میں نقصان کا باعث ہے، پس وہ اس پر اقدام نہیں کرتے تھے۔ اور یہی سبب تھا کہ وہ خصومت کے موقعوں پر ان کے حسب گمان اللہ کے ان ساجھیوں کے ناموں کی فریق مخالف کو قسم کھلایا کرتے تھے۔ پس ان کو اس سے منع کیا گیا۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی، اس نے خدا کے ساتھ شریک کیا'' اور بعض محدثین نے حدیث کو تغلیظ وتہدید پر محمول کیا ہے اور میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک حدیث کی مراد اُس اعتقاد سے جو ہم نے ذکر کیا غیر اللہ کے نام کی یمین منعقدہ اور یمین غموس ہے۔

اوران صورتوں میں سے غیر اللہ کا حج کرنا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اُن مقامات کا قصد کیا جائے جن کو لوگ اپنے خود ساختہ معبودوں کی مخصوص متبرک جگہیں تصور کرتے ہیں۔ ان جگہوں میں اترنا ان معبودوں کا تقرب ہوتا ہے۔ پس لوگ اس سے روکے گئے۔ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''کجاوے نہ کسے جائیں مگر تین مسجدوں کی طرف''

اوران صورتوں میں سے یہ ہے کہ لوگ اپنے بیٹوں کے نام عبدالعزی اور عبدالشمس اور اس کے مانند رکھا کرتے

تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اللہ وہ ذات ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، اور اس ایک جان سے اس کا جوڑا بنایا، تا کہ وہ اس کے پاس جا کر سکون حاصل کرے، پھر جب میاں نے بیوی سے قربت کی'' آخر آیت تک۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت حواء نے اپنے بچے کا نام عبدالحارث رکھا، اور یہ نام رکھنا شیطان کے اشارے سے تھا۔ اور بے شمار احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ناموں کو بدل دیا اور عبدالعزیٰ اور عبدالشمس اور ان کے مانند ناموں کی جگہ عبداللہ، عبدالرحمٰن اور ان سے ملتے جلتے نام رکھے۔

غرض یہ شرک کی صورتیں اور سانچے ہیں، شریعت نے ان سے اس لئے روکا ہے کہ شرک ان سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتا ہے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب ——— ۴

صفات الٰہیہ پر ایمان لانے کا بیان

صفت: وہ حالت ہے جو موصوف کے ساتھ قائم ہو اور جس سے موصوف کی پہچان ہو، جیسے قاضی، مفتی، سخی وغیرہ۔ پھر صفات کی دو قسمیں ہیں ایک صفات حسنہ یعنی خوبیاں۔ یہ صفات کمالیہ کہلاتی ہیں، دوسری صفات قبیحہ یعنی برائیاں جیسے بزدلی، بخیلی وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ذات بَحت (محض وجود) نہیں ہیں، جیسا کہ فرقہ معطّلہ کہتا ہے۔ بلکہ وہ بے شمار خوبیوں اور کمالات کے ساتھ متصف ہیں اور تمام عیوب ونقائص سے منزہ ہیں۔ اول کا نام صفات کمالیہ اور صفات ثبوتیہ ہے یعنی یہ سب صفات اللہ تعالیٰ کے لئے کمالات کو ثابت کرتی ہیں، جیسے علیم وخبیر ہونا۔ اور ثانی کا نام صفات سلبیہ ہے یعنی وہ نقائص اللہ تعالیٰ میں نہیں ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں، وہ کسی کے باپ نہیں، اور نہ ان کے ماں باپ ہیں کیونکہ وہ جنے نہیں گئے، اور نہ کوئی ان کا ہم سر ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کو صفات کمالیہ کے ساتھ متصف ماننا اعمال بِرّ میں سب سے بڑی نیکی ہے۔ یہ ایمان ہی معرفت خداوندی کا ذریعہ ہے، اسی سے بندے اور خدا کے درمیان فیضان کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور بندے پر اللہ کی عظمت وبزرگی منکشف ہوتی ہے۔ جیسے زید کو محض ایک وجود اور ایک شخص مانا جائے تو اس کا کیا حاصل؟ اس سے لوگوں کو کیا فیض پہنچے گا؟ البتہ جب اس کو خوش نویس، ادیب، عالم، فقیہ یا بزرگ جانیں گے تو لوگ اس سے فن کتابت سیکھیں گے، ادب وزبان اخذ کریں گے، علم وفقہ حاصل کریں گے یا کسب فیض کریں گے۔ خوبیوں کے ادراک کے بعد ہی استفادہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جب بندہ اللہ تعالیٰ کو خوبیوں کے ساتھ متصف مانے گا جبھی فیضان کا دروازہ وا ہوگا۔ وہ اللہ کو رزاق تسلیم کرے گا تو اس سے روزی طلب کرے گا، وہ اس کو رحیم

وکریم مانے گا تو اس سے رحم وکرم کی بھیک مانگے گا، اس کا اللہ کی صفات جلالیہ پر ایمان ہوگا تو وہ اس سے ڈر کر اپنی زندگی سنوارے گا، اور اگر کوئی کوتاہی ہوگی تو اسی سے مغفرت کا طلب گار ہوگا۔ غرض انسان کی تربیت کا تمام تر تعلق صفات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے، اسی لئے صحیحین کی حدیث میں آیا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں، جوان کو محفوظ کرے گا اوران کی نگہداشت کرے گا وہ جنت میں جائے گا'' نگہداشت کرنا یہ ہے کہ ان کو ہر وقت پیش نظر رکھے اوران صفات کی خوبو (مقتضی کو) اپنے اندر پیدا کرے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''مہربانی کرنے والوں پر رحمان مہربانی کرتے ہیں، تم زمین والوں پر مہربانی کرو، تم پر آسمان والا مہربانی کرے گا''

﴿ باب الإيمان بصفات الله تعالى ﴾

اعلم: أن من أعظم أنواع البِرِّ الإيمانَ بصفات الله تعالى، واعتقادَ اتِّصافه بها، فإنه يفتح بابا بين هذا العبد وبينه تعالى، ويُعِدُّه لانكشاف ما هنالك من المجد والكبرياء.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانے کا بیان: جان لیں کہ نیکیوں کی اقسام میں سب سے بڑی نیکی اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانا ہے اور خدا تعالیٰ کے صفات کے ساتھ متصف ہونے کا اعتقاد رکھنا ہے۔ پس بے شک یہ ایمان اِس بندے کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک دروازہ کھولتا ہے۔ اور بندے کو تیار کرتا ہے اس بزرگی اور عظمت کے انکشاف کے لئے جو وہاں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ میں ہے)

تشریح: **قوله: يفتح بابا أى باب الفيض والجود قوله: ويعدُّه أى يصير الإنسان به مستعدًا لمعرفة ما فى حضرة المَلِك من المجد والكبرياء، ولائقاً لمشاهدة الأنوار الإلٰهية (سندیؒ)**

صفات کے باب میں دشواریاں اوران کا حل

حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے سلسلہ میں چار باتیں اظہر من الشمس ہیں:

① حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا کماحقہ ادراک ممکن نہیں، کیونکہ ان کا نہ تو کسی محسوس چیز سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ کسی معقول چیز سے تخمینہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی شان عالی ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (الشوریٰ ۱۱) ہے نہ ذات میں اس کا کوئی مماثل ہے، نہ صفات میں، وہ سمیع وبصیر بے شک ہے، مگر اس کا دیکھنا سننا مخلوق کی طرح نہیں، کمالات اُس کی ذات میں سب ہیں، مگر کوئی کمال ایسا نہیں جس کی کیفیت بیان کی جاسکے، کیونکہ اس کی نظیر کہیں موجود نہیں، وہ مخلوق کی مشابہت ومماثلت سے بالکلیہ پاک اور مقدس ومنزّہ ہے، پھر اس کا قیاس واندازہ کیسے کیا جائے۔ انسان کے معقولات بھی تمام تر محسوسات سے مستفاد ہوتے ہیں۔ وہ محسوسات سے پوری طرح بلند ہوکر

نہیں سوچ سکتا[1] غرض حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے کماحقہ ادراک کی کوئی صورت نہیں۔

(۲) حق تعالیٰ کی صفات ان کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، مگر وہ ذات میں اس طرح حلول کئے ہوئے نہیں ہیں جس طرح اعراض کا ان کے محل میں حلول ہوتا ہے حلول کے لئے احتیاج ضروری ہے یعنی اعراض اپنے وجود وقیام میں محل کے محتاج ہوتے ہیں، اعراض کا بذات خود کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اور وہ بارگاہ بے نیاز احتیاج وافتقار سے منزہ ہے۔

(۳) عقل عام کی رسائی ذات وصفات تک نہیں ہے، دانائے شیراز نے کیسی پتے کی بات کہی ہے:

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم — وز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر — ماہم چناں در اولِ وصف تو ماندہ ایم

(گلستان در دیباچہ)

ترجمہ: اے وہ ذات جو خیال، قیاس، گمان اور وہم سے بالاتر ہے اور ہر اس بات سے جو لوگوں نے کہی ہے اور ہم نے سنی ہے اور پڑھی ہے۔ کتاب زندگی ختم ہوگئی اور عمر نہایت کو پہنچ گئی ہم اُسی طرح تیری تعریف کی ابتداء میں تھکے ماندے ہیں۔

یعنی ابھی تو تعریف کا ابتدائی حق بھی ادا نہیں ہوا، آپ کی پوری تعریف ہم سے کہاں ممکن ہے؟! کیونکہ تعریف معرفت کو چاہتی ہے اور عقول انسانی ذات وصفات کی غایت نہیں پاسکتے۔

(۴) ہماری لغت کے الفاظ اللہ کی ذات وصفات کو شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے الفاظ کا موضوع لہ، وہ محسوسات ومعقولات ہیں جو ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں یا ہماری عقل میں سماتے ہیں۔ اور اللہ کی ذات وصفات نہ تو ہمارے لئے محسوس ہیں، نہ ان کی ہماری عقل میں سمائی ہے۔ پھر ہم ان کو موضوع لہ بنا کر الفاظ کیسے وضع کر سکتے ہیں؟ ہماری بول چال میں مستعمل الفاظ، ہمارے ہی لئے ہیں یعنی وہ ہماری ذات وصفات کو شامل ہیں، اللہ تعالیٰ کی صفات کی کماحقہ ان سے تعبیر ممکن نہیں۔ اور اگر نئے سماوی الفاظ سے صفات کو تعبیر کیا جائے تو وہ الفاظ ہمارے لئے ناقابل فہم ہوجائیں گے، اور وہ تعبیرات بے فائدہ ثابت ہونگی۔

مگر مذکورہ دشواریوں کے باوجود لوگوں کو اللہ کی پہچان کرانا بھی ضروری ہے، کیونکہ انسان کی تربیت کا تعلق صفات باری سے ہے جیسا کہ ابھی گذرا، انسان اپنے لئے ممکن کمالات معرفت الٰہی کے ذریعہ ہی حاصل کرسکتا ہے۔ اس لئے صفات باری تعالیٰ کے بیان میں پانچ قاعدے ملحوظ رکھنے ضروری ہیں:

پہلا قاعدہ: صفات باری تعالیٰ کے بیان کے لئے جو الفاظ استعمال کئے جائیں، وہ غایات پائے جانے کے معنی میں استعمال کئے جائیں، مبادی پائے جانے کے معنی میں استعمال نہ کئے جائیں۔ مثلاً لفظ رحم ''انعام فرمانے'' کے معنی

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں علم الکلام از علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ (۱: ۹۷) تحت عنوان: وجود باری کا تصور کیوں مشکل ہے؟

میں لیا جائے ''دل مڑنے اور پسیجنے'' کے معنی میں نہ لیا جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کو بیان کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں، ان میں اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً خدا کو حَـــیّ (زندہ) سمیع (سننے والا) بصیر (دیکھنے والا) اور متکلم (کلام فرمانے والا) کہا گیا ہے۔ اور انسان کے لئے بھی یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، مگر دونوں جگہ استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کسی مخلوق کو سمیع وبصیر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔ اب اس میں دو چیزیں ہوئیں: ایک وہ آلہ جسے ''آنکھ'' کہتے ہیں، اور جو دیکھنے کا مبدأ اور ذریعہ بنتا ہے۔ دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض وغایت (دیکھنا) یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہوتا ہے۔ مخلوق کو جب ''بصیر'' کہا جاتا ہے تو یہ مبدأ اور غایت دونوں چیزیں مراد ہوتی ہیں۔ لیکن یہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا جائے گا تو وہ مبادی اور کیفیات جسمانیہ مراد نہیں لی جائیں گی جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے۔ البتہ یہ اعتقاد ضروری ہے کہ بصارت (دیکھنے) کا مبدأ اس کی ذات میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہوتا ہے، اس کو بدرجۂ کمال حاصل ہے۔ آگے یہ کہ وہ مبدأ کیسا ہے؟ اور دیکھنے کی کیا کیفیت ہے؟ تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں، ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں؟! ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ اس کی شان اقدس ہے۔ اور نہ صرف سمع وبصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہئے (ماخوذ از فوائد عثمانی در تفسیر سورۃ الاعراف آیت ۵۴) اب دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں تاکہ یہ مضمون واضح ہوکر ذہن نشین ہو جائے:

پہلی مثال: لفظ رحمت جو صفات رحمان ورحیم کا ماخذ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں: ''کسی پریشان حال اور مصیبت زدہ کو دیکھ کر دل کا پتلا ہونا (پسیجنا) اور اس کی طرف مڑنا اور مائل ہونا اور دل میں مہربانی کا جذبہ ابھرنا اور اس پر تفضل واحسان اور مہر وانعام کرنا'' اب یہاں دو چیزیں ہیں ایک ''دل'' اور اس کی کیفیات: پتلا ہونا، مڑنا، جذبۂ مہر ابھرنا یہ مبدأ اور سبب ہیں دوسری انعام واحسان جو غایت ونتیجہ ہے۔ جب انسان کو رحیم ومہربان کہا جاتا ہے تو یہ مبدأ اور غایت دونوں مراد ہوتے ہیں۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کو رحمان ورحیم کہا جاتا ہے تو صرف غایت یعنی انعام واحسان مراد لیا جاتا ہے۔ اور مبدأ کے وجود کا اعتقاد تو رکھا جاتا ہے مگر اس کی کیفیت کو اللہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

دوسری مثال: استواء علی العرش میں عرش کے معنی تخت شاہی اور بلند مقام کے ہیں اور استواء کے معنی معتدل وبرابر اور سیدھا ہونے کے ہیں۔ اور جب کوئی تخت حکومت پر بیٹھتا ہے تو ملک کا سب کام اور نظم وانتظام کرتا ہے اور اقتدار ونفوذ وتصرف کا مالک ہوتا ہے۔ اب یہاں دو چیزیں ہیں ایک تخت شاہی پر بیٹھنا یہ مبدأ اور سبب ہے دوسری نفوذ واقتدار وتصرف کا مالک ہونا یہ نتیجہ اور غایت ہے۔ اب اگر یہ صفت کسی انسان کے لئے ثابت کی جائے گی تو وہاں مبدأ اور غایت دونوں مراد ہوں گے اور مبدأ کی کیفیت کا ادراک بھی ہم کر سکیں گے۔ مگر جب یہ صفت اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت

کی جائے گی تو غایت پائے جانے کے معنی میں ہوگی یعنی آسمانوں پر اور زمین پر اقتدار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی کائنات میں متصرف ہیں۔ رہا مبدأ تو اس کے وجود کا اعتقاد تو ضروری ہے مگر اس کی کیفیت کو نہ سمجھ سکتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں پس اس کو اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالے کر دیا جائے گا۔

دوسرا قاعدہ: تمام کائنات کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہیں۔ موجودات کا ذرّہ ذرّہ ان کے تابع فرمان ہے۔ کوئی مخلوق ان کے حکم سے سرتابی کی طاقت نہیں رکھتی۔ اس مضمون کی ادائیگی کے لئے وہ تعبیرات مستعار لی جائیں گی جو بادشاہ اپنی مملکت کو مسخر کرنے اور تابع فرمان بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں، کیونکہ اس سے زیادہ واضح دوسری تعبیرات نہیں ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے لئے ملِک (بادشاہ) حاکم اور جابر وغیرہ صفات ثابت کی جائیں۔

تیسرا قاعدہ: اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان میں تشبیہات دو شرطوں کے ساتھ استعمال کی جاسکتی ہیں:

پہلی شرط: تشبیہ کے اصل لغوی معنی مراد نہ لئے جائیں، بلکہ وہ معنی مراد لئے جائیں جو عرف میں ان صفات کے مناسب ہوں، جیسے سورۃ المائدۃ آیت ٦٤ میں آیا ہے ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ﴾ (بلکہ ان کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں) یہ یہود بے بہبود کے نامعقول قول ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ (اللہ کا ہاتھ بند ہے) پر رد ہے۔ اس لئے اس آیت میں بَسطِ ید سے جود وسخاوت مراد لی جائے۔

دوسری شرط: ایسی تشبیہ استعمال نہ کی جائے جس سے مخاطبین کو واضح طور پر یہ گمان ہو کہ اللہ تعالیٰ بھی بہیمی آلودگیوں سے متصف ہوتے ہیں اور یہ بات مخاطبین کے اختلاف سے مختلف ہوسکتی ہے۔ عربی محاورات میں ایک تشبیہ ایسا وہم پیدا نہ کرتی ہو اور عجمی محاورات میں ایسا ایہام پیدا ہو رہا ہو، ایسا ممکن ہے، پس یہ تو کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سنتے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے مذکورہ وہم پیدا نہیں ہوتا، مگر یہ نہ کہا جائے کہ وہ چکھتے چھوتے ہیں، کیونکہ اس سے حیوانی تقاضوں کی طرف ذہن جاتا ہے۔ يَـذُوْق سے یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کھاتے پیتے ہیں اور ان کو بھوک پیاس لگتی ہے اور يَلْمَسُ سے یہ وہم گذرتا ہے کہ ان کی بیوی ہے **فإن ألذّ الملموساتِ النساءُ! فإذا كان له قوةٌ لامسة، يرغب لامحالة في أن يباشر ألذّ الملموسات (سندیؒ)**

چوتھا قاعدہ: صفات باری کی ترجمانی کے لئے جامع الفاظ استعمال کئے جائیں، جو کسی ایک امر میں متفق تمام معانی کو حاوی ہوں، جیسے رزاق (روزی رساں) اور مصور (صورت گر) وغیرہ اسی طرح تمام اسمائے حسنیٰ جامع الفاظ ہیں۔

پانچواں قاعدہ: جس طرح اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثبوتیہ ہیں، جن کا اثبات ضروری ہے، اسی طرح ان کی صفات سلبیہ بھی ہیں جن کی نفی ضروری ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے ہر اس چیز کی نفی کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے۔ بالخصوص وہ باتیں جو ظالموں نے شان عالی میں کہی ہیں، جیسے بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں۔ نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے، کچھ

یہودی بھی اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں، وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں اور ہندو بھی اپنے دیوی دیوتاؤں کے بارے میں کچھ اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے سورۃ الاخلاص میں اس کی نفی کی گئی ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنا، نہ وہ کسی سے جنا گیا۔

واعلم: أن الحقَّ تعالى أجلُّ من أن يُقَاسَ بمعقول أومحسوس، أو يَحُلَّ فيه صفاتٌ كحلول الأعراض في مَحَالِّهَا، أو تعالِجه العقولُ العامية، أوتتناوله الألفاظ العرفية؛ ولابد من تعريفه إلى الناس لِيُكْمِلوا كما لَهم الممكنَ لهم، فوجب:

[۱] أن تُستعمل الصفاتُ بمعنى وجودِ غاياتها، لابمعنى وجودِ مباديها، فمعنى الرحمة: إفاضةُ النِّعَمِ، لاانْعِطَافُ القلب والرِّقَّةُ.

[۲] وأن تُستعار ألفاظٌ تدل على تسخير المَلِك لمدينته، لتسخيره لجميع الموجودات؛ إذ لاعبارةَ في هذا المعنى أفصحُ من هذه.

[۳] وأن تُستعمل تشبيهاتٌ بشرطِ أن لايُقصد إلى أنفسها، بل إلى معانٍ مناسبة لها في العرف، فيراد ببسط اليد الجودُ مثلاً، وبشرط أن لايُوهم المخاطبين إيهامًا صريحاً أنه في الواث البهيمية، وذلك يختلف باختلاف المخاطبين، فيقال: يَرى ويسمع، ولا يقال: يذوق ويلمس.

[٤] وأن يُسمى إفاضةُ كلِّ معانٍ متفقةٍ في أمرٍ باسمٍ كالرزاق والمصوِّر.

[٥] وأن يُسلب عنه كلُّ مالا يليق به، لاسيما ما لهج به الظالمون في حقه، مثلُ لم يلد ولم يولد.

ترجمہ: اور جان لیں کہ حق تعالیٰ اس سے برتر ہیں کہ وہ قیاس کئے جائیں کسی معقول پر یا کسی محسوس چیز پر۔ یا ان میں صفات حلول کریں اعراض کے حلول کرنے کی طرح ان کے محل میں، یا ان تک عامۃ الناس کی عقلیں رسائی پائیں۔ یا ان کو عام بول چال کے الفاظ شامل ہوں۔ اور لوگوں کو اللہ کی پہچان کرانا بھی ضروری ہے، تاکہ لوگ اپنا وہ کمال بتمامہ حاصل کریں جو ان کے لئے ممکن ہے، پس ضروری ہوا کہ:

(۱) صفات استعمال کی جائیں ان کی غایات پائے جانے کے معنی میں، نہ کہ ان کے مبادی پائے جانے کے معنی میں۔ پس رحمت کے معنی: ''نعمتوں کا فیضان کرنا'' ہیں۔ ''دل کا مڑنا'' اور ''پتلا ہونا'' اس کے معنی نہیں ہیں۔

(۲) اور یہ کہ ایسے الفاظ مستعار لئے جائیں جو دلالت کرتے ہیں بادشاہ کے مسخر کرنے پر اس کی مملکت کو، اللہ کے مسخر کرنے کے لئے تمام موجودات کو، کیونکہ اس معنی کی ادائیگی کے لئے اس سے واضح تر کوئی عبارت نہیں ہے۔

(۳) اور یہ کہ تشبیہات استعمال کی جائیں، بشرطیکہ ان تشبیہات کے اصل معنی مراد نہ لئے جائیں، بلکہ وہ معنی مراد لئے

جائیں جو عرف میں اس تشبیہ کے مناسب ہوں۔ پس مثال کے طور پر ''بسط ید'' سے سخاوت مراد لی جائے۔ اور اس شرط کے ساتھ کہ مخاطبین کو صاف واضح طور پر یہ گمان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بھی آلودگیوں میں ہیں۔ اور یہ بات مخاطبین کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے۔ پس کہا جائے کہ ''وہ سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں'' اور نہ کہا جائے کہ ''وہ چکھتے ہیں اور چھوتے ہیں''

(۴) اور یہ کہ کسی امر میں متفق سارے معانی کے فیضان کو کسی ایک لفظ سے تعبیر کیا جائے، جیسے رزاق اور مصور۔

(۵) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ سے نفی کی جائے ہر اس چیز کی جو اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے، خصوصاً وہ باتیں جو ظالموں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں بکی ہیں مثلاً اس نے کسی کو جنا نہیں اور نہ وہ جنا گیا ہے۔

لغات: المَحلّ: اترنے کی جگہ جمع مَحَالّ...... لَهِجَ به: شیفتہ ہونا: کہنا۔

صفات پر دلالت کرنے والے بس الفاظ استعمال کئے جائیں

آدم علیہ السلام سے خاتم النبیین ﷺ تک تمام آسمانی مذاہب قواعد مذکورہ کے مطابق صفات باری تعالیٰ کے بیان کرنے پر متفق ہیں۔ اور سب کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ بس الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اور استعمال سے زیادہ ان کے بارے میں کھود کرید نہ کی جائے۔ اسلام کے ابتدائی تین دور جن کے متعلق متفق علیہ حدیث میں خیریَّتْ کی شہادت دی گئی ہے[1] اسی پر تھے۔ پھر زمانۂ مابعد میں مسلمانوں کی ایک جماعت نص شرعی اور دلیل قطعی کے بغیر ان صفات کی تاویل کرنے لگی، اور اُن کے معانی کی تحقیق کے درپے ہوئی، جبکہ احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ آیت کریمہ ﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (آل عمران ۱۹۱) کی تفسیر میں متعدد اسانید سے یہ ارشاد نبوی مروی ہے کہ ''مخلوق میں غور کرو، خالق میں غور مت کرو[2]'' اور آیت کریمہ ﴿وَأَنَّ إِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ (النجم ۴۲) کی تفسیر میں یہ ارشاد نبوی مروی ہے کہ ''پروردگار میں غور وفکر جائز نہیں[3]'' اور چونکہ صفات الٰہیہ حادث ومخلوق نہیں ہیں قدیم ہیں اور صفات کے بارے میں یہی غور کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ان صفات کے ساتھ کیسے متصف ہیں؟ اس لئے یہ خالق کے بارے میں غور کرنا ہوا جو ممنوع ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب التفسیر میں سورۃ المائدہ کی تفسیر میں (۱۳۰:۲) حدیث پاک يدُ الله مَلْىٰ، لاتَغِيْضُها نَفَقَةٌ، سَحَّاءُ الليل والنهار، أرأيتم، ما أنفق مذخلق السماءَ والأرضَ؟ فإنه لم يَغِضْ ما في يده! وكان عرشه

---

[1] مشکوۃ شریف، کتاب المناقب، باب مناقب الصحابۃ، حدیث نمبر ۶۰۰۱ [2] الدر المنثور ۲: ۱۱۰

[3] الدر المنثور ۶: ۱۳۰ اور آیت کریمہ کا لفظی مطلب یہ ہے کہ سب کو پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔ اور حضور نے آیت کے اشارہ سے یہ مضمون سمجھایا کہ غور وفکر کا منتہی اللہ ہے یعنی مخلوقات میں جتنا چاہو دوڑا لو، مگر اللہ پر پہنچ کر یہ سوچ موقوف ہو جانی چاہئے اللہ میں غور وفکر جائز نہیں۔

علی السماء وبیدہ المیزان، یخفض ویرفع[1] (اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، کوئی خرچ کرنا اس کو ناقص نہیں کرتا، رات دن سخاوت کا دریا بہانے والے ہیں۔ بتاؤ، کس قدر خرچ کیا ہے جب سے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے؟ پس نہیں کم کیا اس خرچ کرنے نے اس چیز کو جو ان کے ہاتھ میں ہے! اور اس کا تخت (تخلیقِ ارض وسماء کے وقت) پانی پر تھا۔ ان کے ہاتھ میں ترازو ہے، پست کرتے ہیں اور بلند کرتے ہیں) اس حدیث کے ذیل میں امام ترمذی نے لکھا ہے:

''ائمہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث پر ایمان لایا جائے، جس طرح وہ آئی ہے، اس کی کوئی تفسیر کی جائے نہ کوئی خیال باندھا جائے۔ متعدد ائمہ نے ایسا ہی فرمایا ہے، جن میں سفیان ثوری، مالک بن انس، ابن عیینہ اور ابن المبارک شامل ہیں (ان حضرات نے فرمایا) کہ یہ باتیں روایت کی جائیں اور ان پر ایمان رکھا جائے اور ان کی کیفیت نہ پوچھی جائے''

اور امام ترمذی رحمہ اللہ ہی نے دوسری جگہ کتاب الزکوٰۃ (۱:۸۴) میں جہاں یہ حدیث روایت کی ہے کہ: ''جب بھی کوئی شخص کسی حلال مال سے کوئی خیرات کرتا ہے ـــــ اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ مال ہی قبول فرماتے ہیں ـــــ تو رحمان اس کو دائیں ہاتھ میں لیتے ہیں۔ پھر اگر وہ صدقہ کوئی کھجور ہوتی ہے تو وہ رحمان کے ہاتھ میں بڑھتی ہے تا آنکہ وہ پہاڑ سے بڑی ہو جاتی ہے، جس طرح تم میں سے ایک شخص اپنے بچھیرے کی یا بچھڑے کی پرورش کرتا ہے'' اس حدیث کے ذیل میں امام ترمذی نے طویل کلام کیا ہے۔ اور امام مجتہد حضرت اسحاق بن راہویہ کا قول نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''ان صفات کو ہو بہو استعمال کرنا تشبیہ نہیں۔ تشبیہ یہی ہے کہ کہا جائے: (اللہ کی) سماعت (مخلوق کی) سماعت جیسی (ہے) اور (اللہ کی) بصارت (مخلوق کی) بصارت جیسی (ہے)'' (یہ امام ترمذی کی بلفظہ عبارت نہیں شاہ صاحب نے عبارت کا ماحصل بیان کیا ہے)

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱۳:۳۹۰) میں بخاری شریف کی کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ﴾ الخ میں اللہ تعالیٰ کی صفت عَیْنٌ (آنکھ) پر گفتگو کی ہے۔ اور بحث کے آخر میں کسی کا قول نقل کیا ہے کہ

''نہ تو نبی کریم ﷺ سے بہ سند صحیح صراحت مروی ہے اور نہ کسی صحابی سے کہ ان صفات (متشابہات) میں سے کسی کی بھی تاویل واجب ہے۔ اور نہ اس کے یعنی صفات متشابہات کے ذکر کی ممانعت آئی ہے۔ اور یہ بات محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیں کہ: ''جو کچھ ہم نے آپؐ پر اتارا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دیں'' اور آپؐ پر یہ آیت بھی نازل فرمائیں کہ: ''آج میں نے تم پر تمہارا دین مکمل کر دیا'' پھر یہ مسئلہ چھوڑ دیں اور امتیاز نہ فرمائیں کہ کن صفات کی نسبت اللہ کی طرف جائز ہے، اور کن کی نسبت جائز نہیں؟ اس ترغیب کے ساتھ کہ:

[1] متفق علیہ، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۹۲

"موجودین غیر موجود لوگوں کو (دین) پہنچادیں" یہاں تک کہ انھوں نے آپؐ کے اقوال وافعال واحوال وصفات اور وہ کام نقل کئے جو آپؐ کے سامنے کئے گئے۔ پس یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ حضرات متفق تھے ان صفات پر اُس طرح ایمان لانے پر جو اللہ تعالیٰ نے ان سے مراد لی ہے۔ اور مخلوق کی مشابہت سے تنزیہ واجب ہے اللہ پاک کے ارشاد سے کہ: "اس کے مانند کوئی چیز نہیں" پس جو شخص اس کے بعد اس کے خلاف ثابت کرتا ہے وہ ان کی راہ کی خلاف ورزی کرتا ہے"

وقد أجمعت المِلَلُ السماوية قاطِبَتُها على بيان الصفاتِ على هذا الوجه، وعلى أن تُستعمل تلك العبارات على وجهها، ولا يُبحث عنها أكثرَ من استعمالها، وعلى هذا مضت القرونُ المشهودُ لها بالخير، ثم خاض طائفةٌ من المسلمين في البحثِ عنها، وتحقيقِ معانيها، من غير نص ولا برهانٍ قاطعٍ، قال النبي صلى الله عليه وسلم: ﴿تفكّروا في الخلق، ولاتفكّروا في الخالق﴾ وقال في قوله تعالى: ﴿وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ﴾: ﴿لافِكرةَ في الرب﴾ والصفاتُ ليست بمخلوقاتٍ محدَثاتٍ، والتفكر فيها إنماهو أن الحقّ كيف اتّصف بها؟فكان تفكّرًا في الخالق.

قال الترمذی في حديث: ﴿يد الله مَلْأَىٰ﴾:

" وهذا الحديث، قال الأئمة: يُؤمن به كما جاء من غير أن يفسَّر، أو يُتَوَهَّم، هكذا قال غير واحد من الأئمة، منهم سفيان الثوری، ومالك بن أنس، وابن عيينة، وابن المبارك: أنه تُروى هذه الأشياء، ويُؤْمَنُ بها، ولايقال: كيف؟"

وقال في موضع آخر:

"إن إجراء هذه الصفاتِ كما هي ليس بتشبيه، وإنما التشبيهُ أن يقال: سمع كسمع، وبصر كبصر"

وقال الحافظ ابن حجر:

لم يُنقل عن النبي صلى الله عليه وسلم، ولاعن أحد من الصحابة، من طريق صحيح، التصريحُ بوجوب تأويل شيئ من ذلك يعني المتشابهات، ولاالمنع من ذكره، ومن المحال أن يأمر الله نبيه بتبليغ ما أُنزل إليه من ربه، ويُنْزِلُ عليه: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ ثم يترك هذا البابَ فلا يميز ما يجوز نسبته إليه تعالى مما لايجوز، مع حَضّه على التبليغ عنه بقوله: ﴿ليبلغ الشاهدُ الغائب﴾ حتى نقلوا أقوالَه وأفعالَه وأحوالَه وصفاتِه وما فُعل بحضرته، فدل على أنهم اتفقوا على الإيمان بها، على الوجه الذی أراده الله تعالى منها، ووجب تنزيهُه عن

مشابهة المخلوقات بقوله تعالى: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْئٌ﴾ فمن أوجب خلاف ذلك بعدهم فقد خالف سبيلَهم (انتهى)

ترجمہ: اور آسمانی مذاہب تمام کے تمام متفق ہیں اس طور پر صفات کے بیان کرنے پر، اور اس پر کہ وہ عبارتیں ہو بہو استعمال کی جائیں۔ اور استعمال سے زیادہ اُن عبارتوں کے بارے میں بحث (کھود کرید) نہ کی جائے۔ اور اسی پر گذرے وہ زمانے جن کے لئے بہتر ہونے کی گواہی دی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے سلسلہ میں بحث میں گھسی۔ اور ان کے معانی کی تحقیق کے درپے ہوئی، کسی نص شرعی اور دلیل قطعی کے بغیر۔ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''مخلوق میں غور کرو اور خالق میں غور مت کرو'' اور ﴿وَأَنَّ إِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی﴾ کی تفسیر میں فرمایا: ''پروردگار میں غور وفکر نہیں ہے'' اور صفات مخلوق وحادث نہیں ہیں۔ اور ان میں غور کرنا یہی ہے کہ حق تعالیٰ ان صفات کے ساتھ کیسے متصف ہیں؟ پس وہ خالق میں غور کرنا ہوا۔ امام ترمذی نے حدیث یَدُ اللهِ مَلْأَیٰ کے ذیل میں فرمایا:

''اور یہ حدیث: ائمہ نے فرمایا: اس پر ایمان لایا جائے، جیسی وہ آئی ہے، بغیر اس کے کہ اس کی تفسیر کی جائے یا کوئی خیال جمایا جائے۔ ایسا ہی فرمایا ہے متعدد ائمہ نے، ان میں سے سفیان ثوری، مالک بن انس، ابن عیینہ اور ابن المبارک ہیں کہ روایت کی جائیں یہ چیزیں اور ان پر ایمان رکھا جائے اور نہ پوچھا جائے: کیسے؟''

اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے دوسری جگہ فرمایا:

''ان صفات کو ہو بہو استعمال کرنا تشبیہ نہیں ہے۔ تشبیہ یہی ہے کہ کہا جائے: سماعت، سماعت جیسی اور بصارت، بصارت جیسی''

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

''نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ سند صحیح اس کی صراحت منقول ہے، اور نہ صحابہ میں سے کسی سے کہ ان میں سے یعنی صفات متشابہات میں سے کسی کی بھی تاویل واجب ہے اور نہ اس کے ذکر کی ممانعت مروی ہے۔ اور یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیں اس بات کو پہنچانے کا جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ اور آپ پر نازل فرمائیں کہ: ''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کی تکمیل کردی'' پھر اس مسئلہ کو چھوڑ دیں اور جدا نہ کریں ان صفات کو جن کی نسبت اللہ کی طرف جائز ہے اور ان کو جن کی نسبت جائز نہیں ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ترغیب دینے کے ساتھ آپ کی طرف سے دین پہنچانے پر اپنے اس ارشاد سے کہ: ''موجودین غیر موجود کو پہنچائیں'' تا آنکہ انھوں نے نقل کئے آپؐ کے ارشادات کئے ہوئے کام، حالات، صفات اور جو کچھ کیا گیا آپ کے سامنے۔ پس یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ حضرات متفق تھے اُن صفات پر ایمان لانے پر۔ اُس طور پر جو اللہ تعالیٰ نے ان عبارات سے مراد لی ہے۔ اور مخلوقات کی مشابہت سے

اللہ تعالیٰ کی تنزیہ واجب ہوئی اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے کہ: ''ان کے مانند کوئی چیز نہیں'' پس جو شخص اُن کے بعد اس کے خلاف ثابت کرے وہ ان کی راہ کی مخالفت کرتا ہے (ابن حجر کی عبارت پوری ہوئی)

تصحیح: حَضّہ اصل میں حثہ تھا، و صفاتہ اصل میں نہیں ہے، علی الإیمان بھا اصل میں بہ تھا أرادہ اللّٰہ اصل میں أراد اللّٰہ تھا وجب تنزیھہ اصل میں أوجب تنزیھہ تھا۔ تصحیح فتح الباری سے کی گئی ہے۔

سبھی صفات از قبیل متشابہات ہیں

اوپر جو بات بیان کی گئی ہے کہ صفات پر دلالت کرنے والے الفاظ استعمال کیے جائیں، ان کی تاویل کی جائے نہ معانی کی تحقیق، کتابوں میں یہ بات صفات متشابہات کے تعلق سے لکھی گئی ہے۔ اور صفات متشابہات سے وہ صفات مراد ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے مشابہ ہونا مفہوم ہوتا ہے اور جن سے اللہ تعالیٰ کا جسم دار ہونا سمجھا جاتا ہے، جیسے ہاتھ، قدم، انگلیاں، پورے، چہرہ، آنکھ، پنڈلی، آسمان دنیا پر ہر رات اترنا، میدان قیامت میں اترنا، عرش پر متمکن ہونا وغیرہ۔ صفات حقیقیہ: سمع وبصر وکلام وغیرہ کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاتی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی جن حدیثوں میں صفت ید آئی ہے وہاں مذکورہ بات لکھی ہے، اسی طرح ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی صفت عین (آنکھ) کے تعلق سے مذکورہ بات کہی ہے۔ حالانکہ یہ تفریق صحیح نہیں ہے۔ تمام ہی صفات از قبیل متشابہات ہیں، کیونکہ سبھی الفاظ سے اہل لسان کے نزدیک جو بات سمجھی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں۔ اگر صفت ضَحِك (ہنسی) اس لئے شان عالی کے لائق نہیں کہ اس کے لئے ''منہ'' ہونا ضروری ہے تو یہی چیز صفت کلام (بات کرنے) کے لئے بھی ضروری ہے۔ اور اگر صفت بَطْش (پکڑنا) اور نزول (اترنا) اس لئے محال ہے کہ ان کے لئے ہاتھ اور پیر ضروری ہیں تو سمع وبصر کے لئے بھی کان اور آنکھ ضروری ہیں۔ غرض صفات باری پر دلالت کرنے والے سبھی الفاظ از قبیل متشابہات ہیں اور سب کا ایک حکم ہے واللہ اعلم۔

أقول: ولافرق بين السمع والبصر والقدرة والضَّحِكِ والكلام والاستواء، فإن المفهومَ عند أهل اللسان من كل ذلك، غَيْرُ ما يليق بجناب القدس، وهل في الضحك استحالةٌ إلا من جهة أنه يستدعِي الفمَ؟ وكذلك الكلام؛ وهل في البطش والنزول استحالة إلا من جهة أنهما يستدعيان اليد والرجل؟ وكذلك السمع والبصر يستدعيان الأُذُنَ والعين، والله أعلم.

ترجمہ: میں کہتا ہوں اور سمع (سننا) بصر (دیکھنا) قدرت (طاقت) ضَحِك (ہنسنا) کلام (بات کرنا) اور استواء (جمنا) کے درمیان کچھ فرق نہیں، کیونکہ ان سب الفاظ سے اہل لسان کے نزدیک جو بات سمجھی جاتی ہے وہ علاوہ ہے اس

بات کے جو پاکیزہ بارگاہ کے لائق ہے۔ اور صفت ضحک میں استحالہ نہیں ہے مگر اس اعتبار سے کہ وہ منہ کو چاہتا ہے اور یہی حال صفت کلام کا ہے۔ اور صفت بطش اور صفت نزول میں استحالہ نہیں ہے مگر اس اعتبار سے کہ وہ دونوں ہاتھ اور پیر کو چاہتے ہیں اور اسی طرح سمع وبصر دونوں کان اور آنکھ کو چاہتے ہیں۔ باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: استدعى الشيئَ: طلب کرنا، پکارنا۔

صفات کے بارے میں محدثین کا موقف صحیح ہے

علامہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی رحمہ اللہ (۴۷۹-۵۴۸ھ) کے تجزیہ کے مطابق علم کلام کے چار بنیادی مسائل ہیں[1] جن کی وجہ سے اسلامی فرقوں میں سخت اختلافات اور گروہ بندیاں ہوئی ہیں۔ وہ مسائل یہ ہیں:

(۱) صفات الٰہیہ کا اثبات ونفی۔ اور بصورت اثبات صفات کی نوعیت وکیفیت کا مسئلہ۔

(۲) جبر واختیار کا مسئلہ، اور تقدیر کا اثبات ونفی۔

(۳) عقائد واعمال کا باہمی تعلق یعنی اعمال ایمان کا جزء ہیں یا نہیں؟

(۴) عقل ونقل میں بالا دستی کس کو حاصل ہے؟

ہم یہاں صفات کے مسئلہ کی قدرے وضاحت کرتے ہیں:

معتزلہ: صفات باری کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر خدا کی صفات مانی جائیں، اور قدیم مانی جائیں تو تعدُّدِ قدماء لازم آئے گا، جو تعدُّدِ آلہہ کو مستلزم ہے۔ اور حادث مانی جائیں تو خدا کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا، جو خدا کے حدوث کو مستلزم ہے۔ اس لئے معتزلہ نے یہ رائے قائم کی کہ خدا کے لئے علحدہ صفات نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی ذات ہی سے وہ تمام نتائج حاصل ہوتے ہیں جو ہم کو صفات سے حاصل ہوتے ہیں۔ خلق قرآن کا مسئلہ اسی عقیدہ کا شاخسانہ تھا۔ معتزلہ دیگر صفات کی طرح صفت کلام کے بھی منکر تھے، اس لئے وہ قرآن کریم کو کلام الٰہی اور قدیم نہیں مانتے تھے۔ ان کے نزدیک قرآن مخلوق اور حادث ہے۔ پھر معتزلہ میں سے بڑھتے بڑھتے مُعَطِّلَہ نکل آئے، جو واجب تعالیٰ کو ذات بَحت (وجود محض) مانتے ہیں۔

اہل حق: محدثین، اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک معتزلہ کا یہ موقف درپردہ خدا کی صفات کا انکار ہے، جبکہ قرآن وحدیث صفات کے اثبات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے اہل حق نے یہ رائے اختیار کی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثابت ہیں۔ اور وہ صرف من وجہ جداگانہ ہیں یعنی حقیقت ومفہوم کے لحاظ سے واجب تعالیٰ سے علحدہ ہیں اور وجود کے اعتبار سے متحد ہیں۔ اس لئے صفات نہ عین ہیں نہ غیر، بلکہ بین بین ہیں، پس تعددِ قدماء کا محذور لازم نہیں آئے گا۔

---

[1] دیکھئے شہرستانی کی المِلَل والنِّحَل (در دیباچہ)

پھر بعد میں صفات کے بارے میں اہل حق کے دو موقف ہو گئے:

پہلا موقف: تنزیہ مع التفویض: یعنی مخلوق کی مشابہت سے اللہ کی پاکی بیان کی جائے اور صفات کی کیفیت علم الٰہی کے حوالے کر دی جائے مثلاً یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا سننا، دیکھنا، جاننا، عرش پر مستوی ہونا وغیرہ مخلوقات کے سننے، دیکھنے، جاننے اور تخت شاہی پر براجمان ہونے کی طرح نہیں ہے۔ پھر یہ صفات کیسی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی ان صفات کی حقیقت بہتر جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔

یہ مسلک برحق، اسلم اور احوط ہے، محدثین کرام اور تمام اسلاف اسی کے قائل تھے، اور اسی کا نام ''سلفیت'' ہے۔ سلفیت عدم تقلید کا نام نہیں ہے[1] اور یہ تفویض بمعنی ثبوت مبدأ ہے بمعنی وجود غایت نہیں ہے، کیونکہ ان صفات کے جو معانی، غایات، مقاصد اور نتائج ہیں ان کو ماننا ضروری ہے، ورنہ قرآن کریم میں جو سات جگہ[2] استواء علی العرش کی صفت آئی ہے وہ ''بے معنی'' ہو کر رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں جو اسلاف نے کہا ہے کہ الاستواء معلوم اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ صرف لغوی معنی جاننا مراد نہیں ہے۔

پھر رفتہ رفتہ ایسا ہوا کہ بعض لوگوں نے صفات کی غایات و نتائج سے ذہن ہٹالیا، اور صفات بمعنی ثبوت مبدأ پر ان کا ذہن مرکوز ہو کر رہ گیا تو تفویض والی بات صرف زبان کی حد تک رہ گئی اور وہ لوگ تجسیم و تشبیہ کی دلدل میں پھنس گئے۔ اس طرح محدثین میں سے بڑھتے بڑھتے مُجَسِّمَہ اور مُشَبِّهَۃ نکل آئے۔ اور لوگوں کو محدثین کرام پر فقرے کسنے کا اور پھبتی اڑانے کا موقع مل گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم مانتے ہیں اور اللہ کو مخلوق کے مشابہ مانتے ہیں۔ اور اپنی بدعقیدگی چھپانے کے لئے بِلاَ کَیْف کا پردہ رکھتے ہیں، بلکہ انھوں نے محدثین کا نام ''بَلْکَفِیے'' رکھ دیا، یعنی وہ لوگ جو بلا کیف کی آڑ میں سب کچھ کہہ گذرتے ہیں۔

دوسرا موقف: تفویض مع التاویل: یعنی مخلوق کی مشابہت سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا اور صفات کا درجۂ احتمال میں اللہ کے شایان شان مطلب بیان کرنا۔ یہ متکلمین: اشاعرہ و ماتریدیہ کا مسلک ہے۔ ان حضرات نے یہ رائے اس لئے اختیار کی ہے کہ بیمار ذہنوں کو گمراہی سے بچایا جاسکے۔ کیونکہ صفات کی اگر مناسب تاویل نہیں کی جائے گی تو کمزور ایمان

---

[1] سلفیت علم کلام کا ایک مسلک ہے، فقہ اور تقلید و عدم تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس زمانہ میں لوگوں نے اس لفظ کو غلط معنی پہنائے ہیں۔ سلفیت سے عدم تقلید مراد لینا لفظ کا غیر موضوع لہ معنی میں استعمال ہے اور یہ کہنا کہ یہ اس زمانہ کی جدید اصطلاح ہے۔ ولا مشاحۃ فی الاصطلاح تو اس کا جواب یہ ہے کہ دھوکہ دہی کے لئے ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسا قادیانی اسلامی اصطلاحات: صحابہ، ام المؤمنین، مسجد، نماز، جماعت وغیرہ استعمال کرتے ہیں اور مسلمان اختلاف کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان اصطلاحات کے استعمال پر پابندی کا مطالبہ کرتے ہیں ۱۲

[2] وہ سات مقامات یہ ہیں: الأعراف ٥٣ یونس ٣ الرعد ٢ طٰهٰ ٥ الفرقان ٥٩ الٓمٓ السجده ٤ الحديد ٤ .

والے تجسیم وتشبیہ کے قائل ہوکر رہ جائیں گے جیسے استواء کی تاویل استیلاء سے نہیں کی جائے گی تو جاہل لوگ اللہ تعالیٰ کو عرش پر براجمان سمجھنے لگیں گے اور محدثین کے حلقہ میں ایسا ہوا بھی، اس لئے عوام کے عقائد کی حفاظت کے لئے اور فلسفۂ یونان سے مسموم ذہن کے علاج کے لئے یہ موقف اختیار کیا گیا۔

پھر رفتہ رفتہ اس حلقہ میں بھی بعض لوگ تاویل کی دور دراز راہوں پر پڑ گئے۔ اور تاویلات کرتے کرتے اتنے دور نکل گئے کہ انھوں نے ثبوت مبدأ کا بھی کچھ خیال نہ کیا، محدثین نے ایسے لوگوں پر سخت نقد کیا ہے اور ان کو منکر صفات اور کافر ومشرک قرار دیا ہے۔ بلکہ ان زمانہ کے جہلاء تو مطلقاً اشاعرہ وماتریدیہ کو کافر ومشرک قرار دیتے ہیں فیا لَلْعَجب! ولِضَيْعَةِ الأدب!!

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اس باب کے آخر میں انہیں تاویلات بعیدہ کے مقابلہ میں صفات باری کی صحیح اور مناسب تاویلیں (درجۂ احتمال میں مطالب) بیان کئے ہیں۔ اس ضروری تفصیل کے بعد اب ہم شاہ صاحب کی بات شروع کرتے ہیں:

متأولین یعنی صفات کی تاویلات بعیدہ اور باطلہ کرنے والے جماعت محدثین کو بدنام کرتے ہیں۔ وہ ان کو اللہ کے لئے جسم ماننے والا اور اللہ کو مخلوق جیسا قرار دینے والا کہتے ہیں اور ان کو ''بِلْ كَفِيْه'' یعنی بِلا کَیف کے پردہ میں چھپ کر بات کرنے والا کہتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ان لوگوں کی یہ زبان درازی بلا وجہ ہے، ان کی باتیں عقلاً بھی غلط ہیں اور نقلاً بھی اور وہ ائمہ دین پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان میں وہ خطا کار ہیں۔ کیونکہ صفات کے مسئلہ میں غور طلب دو باتیں ہیں:

پہلی بات: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہیں؟ اور اللہ کی صفات عین ذات ہیں یا ذات سے علحدہ چیز ہیں؟ اور سمع وبصر اور کلام وغیرہ صفات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ان الفاظ سے سرسری طور پر جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں برحق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کچھ گفتگو نہیں فرمائی، بلکہ آپؐ نے اپنی امت کو اس سلسلہ میں گفتگو کرنے سے اور بحث کرنے سے روکا ہے۔ پھر کسی کے لئے اس سلسلہ میں آگے بڑھنا اور بحث کا دروازہ کھولنا کیسے روا ہوسکتا ہے؟

دوسری بات: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کن صفات کے ساتھ متصف کرنا جائز ہے اور کن صفات کے ساتھ متصف کرنا جائز نہیں؟

اس سلسلہ میں برحق بات یہ ہے کہ اللہ کی صفات اور اللہ کے نام توقیفی ہیں، اس لئے یہ سوال ہی فضول ہے۔ اور توقیفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہم ان قواعد وضوابط کو جانتے ہیں جو صفات کے باب میں ملحوظ رکھے گئے ہیں اور

شروع باب میں ان کی وضاحت بھی کردی گئی ہے، مگر ہم اپنی طرف سے اسماء وصفات بیان کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ قرآن وحدیث میں جو اسماء وصفات آئی ہیں انہیں پر اکتفا کرنا ضروری ہے۔ لوگ اپنی طرف سے کوئی بھی صفت بیان نہیں کرسکتے۔ اور صفات تین حکمتوں کی وجہ سے توقیفی ہیں۔

پہلی حکمت: اگر لوگوں کو صفات میں غور وخوض کرنے کی اجازت دے دی جائے کہ وہ سوچ کر اللہ کے لئے جو صفات مناسب خیال کریں ثابت کرسکتے ہیں تو عقلِ نارسا کی وجہ سے بہت سے لوگ خود بھی ڈوبیں گے اور دوسروں کو بھی لے ڈوبیں گے!

دوسری حکمت: بعض صفات ایسی ہیں جن کے ساتھ فی نفسہ اللہ تعالیٰ کو متصف کرنا جائز ہے، مگر کفار میں سے کچھ لوگوں نے ان الفاظ کو غلط معنی پہنادیئے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کو اصل وجود ہونے کی وجہ سے ''باپ'' کہنا فی نفسہ درست ہے۔ اور پچھلی آسمانی کتابوں میں یہ صفت آئی بھی ہے مگر گمراہ لوگوں نے اس لفظ کو ''رشتہ کا باپ'' کے معنی میں استعمال کرنا شروع کردیا ہے اور یہ بات عام ہوگئی اور اسی غلطی کی وجہ سے انھوں نے اللہ کے لئے اولاد تجویز کردی تو آخری شریعت میں ایسی صفات کے استعمال سے روک دیا گیا تاکہ مذکورہ خرابی لازم نہ آئے۔

تیسری حکمت: بہت سی صفات ایسی ہیں جن کا ظاہری معنی میں استعمال خلاف مراد کا وہم پیدا کرتا ہے، اس لئے ان سے بچنا ضروری ہے، جیسے چھونا اور چکھنا ظاہری معنی کے اعتبار سے الواثِ بہیمیت سے آلودہ ہونے کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے، حالانکہ ملموسات اور مذوقات کے علم کے معنی لئے جائیں تو ان کا استعمال درست ہے، جیسے سمع وبصر کا استعمال درست ہے۔ اسی طرح رونا اور ڈرنا اور اس کے مانند صفات کا حال ہے کہ ظاہری معنی کے اعتبار سے ان کا استعمال عیب اور کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لئے ان کا استعمال جائز نہیں، جبکہ ضحک (ہنسنا) فَـــرَح (خوش ہونا) بشاشت، غضب (غصہ ہونا) اور خوشنودی کا استعمال درست ہے، جبکہ عوارض طاری ہونے کے اعتبار سے بات یکساں ہے۔

غرض مذکورہ بالا حکمتوں کی وجہ سے شریعت نے صفات کو توقیفی گردانا ہے اور اس باب میں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی اجازت نہیں دی۔ اور جب صفات توقیفی ہیں تو اس باب میں کنج کاوی کی حاجت کیا ہے؟ علاوہ ازیں محدثین کے نقطۂ نظر کے پیچھے ایسے مضبوط عقلی ونقلی دلائل ہیں کہ باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے، پھر ان کو بدنام کرنے اور اعتراضات کی بوچھار کرنے کے کیا معنی؟! رہی متاولین کے اقوال ومذاہب کی تردید تو اس کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں۔

واستطـال هؤلاء الخائضون على معشَر اهلِ الحديث، وسَمُّوهم مُجَسِّمَةً ومشبِّهَةً، وقالوا: هم المُتَسَتِّرُوْن بِالْبَلْكَفَةِ، وقد وضح عليَّ وضوحاً بينا: أن استطالتهم هذه ليست بشيئ، وأنهم مخطئون في مقالتهم رواية ودرايةً، وخاطئون في طعنهم أئمةَ الهدى.

وتفصيل ذلك: أن ههنا مقامين:

أحدهما : أن الله تبارك وتعالى كيف اتصف بهذه الصفات؟ وهل هي زائدة على ذاته أو عينُ ذاته؟ وما حقيقة السمع والبصر والكلام وغيرها؟ فإن المفهوم من هذه الألفاظ باديَ الرأى غيرُ لائق بجناب القدس؛ والحق في هذا المقام: أن النبي صلى الله عليه وسلم لم يتكلم فيه بشيئ، بل حَجَرَ أمته عن التكلم فيه، والبحثِ عنه، فليس لأحد أن يُقْدِمَ على ما حَجَرَهُ عنه.

والثاني : أنه أيُّ شيئ يجوز في الشرع أن نَصِفَهُ تعالى به، وأيُّ شيئ لايجوز أن نصفه به؟ والحق: أن صفاتِه وأسماءَ ه توقيفية، بمعنى إنَّا وإن عرفنا القواعد التي بَنَى الشرعُ بيانَ صفاته تعالى عليها، كما حرَّرنافي صدر الباب، لكن كثيراً من الناس لو أبيح لهم الخوضُ في الصفات لَضَلُّوا وأَضَلُّوا، وكثيرٌ من الصفات وإن كان الوصفُ بها جائزاً في الأصل، لكنَّ قوما من الكفار حملوا تلك الألفاظَ على غير مَحْمِلِهَا، وشاع ذلك فيما بينهم، فكان حكمُ الشرع النهيَ عن استعمالها، دفعاً لتلك المفسدة، وكثيرٌ من الصفات يوهم استعمالُها على ظواهرها خلافَ المراد، فوجب الاحتراز عنها، فلهذه الْحِكَمِ جعلها الشرعُ توقيفيةً، ولم يُبِحِ الخوضَ فيها بالرأى.

وبالجملة :فالضَّحِك والفَرَح والتَّبَشْبُشُ والغضب والرضا يجوز لنا استعمالُها، والبكاءُ والخوف ونحوُ ذلك لايجوز لنا استعمالُها، وإن كان المأخذان متقاربين، والمسألةُ على ما حققناه معتضَدَةٌ بالعقل والنقل، لايحوم الباطل من بين يديها ولا من خلفها، والإطالةُ في إبطال أقوالهم ومذاهبهم لها موضع آخرُ غير هذا الموضع.

ترجمہ: اوران تاویل میں گھسنے والوں نے محدثین کی جماعت کو بدنام کیا ہے، اوروہ ان کو مجسِّمہ اور مُشَبِّھَۃ کہتے ہیں۔ اورانہوں نے کہا کہ یہ لوگ ''بلا کیف'' کے پردہ میں چھپنے والے ہیں۔ اور مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ان کی یہ زبان درازی کچھ بھی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اپنی باتوں میں غلطی پر ہیں نقلاً بھی اور عقلاً بھی اور وہ خطا کار ہیں ان کے اعتراض کرنے میں ہدایت کے پیشواؤں پر۔

اوراس کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں دومقام ہیں:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اِن صفات کے ساتھ کس طرح متصف ہیں؟ اور آیا وہ صفات ذات باری سے زائد (علحدہ) ہیں یا عین ذات ہیں؟ اور سمع وبصر اور کلام وغیرہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس لئے کہ ان الفاظ سے سرسری نظر میں جو کچھ سمجھا جاتا ہے وہ پاکیزہ بارگاہ کے لائق نہیں ہے۔ اور حق اس مقام میں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کچھ گفتگو نہیں فرمائی۔ بلکہ آپؐ نے اپنی امت کو اس بارے میں گفتگو کرنے سے اور کھود کرید کرنے

سے روکا ہے، پس کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ اس چیز پر اقدام کرے جس سے اس کو روکا گیا ہے۔

اور دوسرا مقام: یہ ہے کہ شرعاً کونسی چیز جائز ہے کہ ہم اس کے ساتھ اللہ کو متصف کریں اور کونسی چیز جائز نہیں ہے کہ ہم اللہ کو اس کے ساتھ متصف کریں؟ اور حق بات: یہ ہے کہ اللہ کی صفات اور اسماء توقیفی ہیں یعنی اگرچہ ہم اُن قواعد کو جانتے ہیں جن پر شریعت نے صفات الٰہیہ کے بیان کرنے کی بنیاد رکھی ہے، جیسا کہ شروع باب میں ہم اُن قواعد کی وضاحت کر چکے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ اگر ان کو صفات میں غور وخوض کرنے کی اجازت دے دی جائے گی تو وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اور بہت سی صفات اگرچہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کرنا در اصل جائز ہے، مگر کفار میں سے کچھ لوگوں نے ان الفاظ کو غیر محمل پر محمول کیا ہے اور یہ بات ان میں پھیل چکی ہے۔ پس شریعت کا حکم ان صفات کے استعمال سے ممانعت کا ہوا، اس خرابی کو دور کرنے کے لئے۔ اور بہت سی صفات ان کا استعمال ان کے ظاہری معنی میں خلاف مراد کا وہم (خیال) پیدا کرتا ہے۔ پس اس سے بچنا ضروری ہوا۔ پس انہیں حکمتوں کی وجہ سے شریعت نے صفات کو توقیفی گردانا ہے اور عقل سے ان میں غور وخوض جائز نہیں رکھا۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ ضَحِك (ہنسنا) فَرَح (خوش ہونا) تبشبش (بشاشت) غَضَب (غصہ کرنا) اور رِضا (خوشنودی) کا استعمال ہمارے لئے جائز ہے اور رونا اور ڈرنا اور ان کے مانند کا استعمال ہمارے لئے جائز نہیں، اگرچہ دونوں (قسم کی صفات) کا ماخذ قریب قریب ہے۔ اور مسئلہ (یعنی محدثین کی رائے) اس طور پر جو ہم نے مدلل کیا ہے عقل ونقل سے تائید یافتہ ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے پھٹک سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ اور ان کے (یعنی تاویل کرنے والوں کے) اقوال ومذاہب کے ابطال میں دراز نفسی کے لئے اس جگہ کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے۔

لغات:

اِستَطَال علی عرضه: بدنامی کی شہرت دینا...... **استطال هؤلاء** کا مشار الیہ معتزلہ ہیں جو صفات متشابہات کی تاویل میں گھسے ہیں...... **البَلْكَفَة** مصدر ہے اور بلا کیفیة کا مختصر ہے، جیسے **البَسْمَلَة** مختصر ہے۔ **بسم الله** کا اور **الحوقلة** مختصر ہے **لاحول إلخ** کا...... **إن ههنا مقامين أی فی باب المتشابهات**...... **وإن كان المأخذان متقاربين أی متحدين، لأن كلا القسمين من كيفيات القلب بالنسبة إلى الإنسان (سندی)**...... **تَبَشْبُش** (مصدر) **تَبَشْبَشَ به**: کسی سے کشادہ روئی سے پیش آنا۔

صفات الٰہیہ کے معانی کا تفصیلی بیان

معتزلہ کا حال صفات الٰہیہ کے تعلق سے شتر مرغ کی طرح ہے۔ ایک طرف وہ صفات کا انکار کرتے ہیں، دوسری طرف وہ ان کی دور از کار تاویلات بھی کرتے ہیں۔ وہ بدنامی کے ڈر سے کھل کر انکار نہیں کرتے، بلکہ تاویلات کا سہارا

لیتے ہیں۔ مثلاً معتزلہ اللہ کی صفت کلام کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں کلام (اصوات وحروف) پیدا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کو مخلوق (حادث) مانتے ہیں۔ قاضی عضدالدین اَیجی رحمہ اللہ مواقف میں لکھتے ہیں قالت المعتزلة: كلامه تعالى أصوات وحروف يخلقها الله في غيره، كاللوح المحفوظ، أو جبريل أو النبي وهو حادث اھ حالانکہ ان کی یہ تاویل قطعاً نصوص کے خلاف ہے۔

اسی طرح بعض متکلمین بھی صفات کے ایسے معانی بیان کرتے ہیں جو بے جوڑ ہیں، اس لئے شاہ صاحب رحمہ اللہ سات صفات حقیقیہ یعنی صفات ذاتیہ: حیات، علم، سمع، بصر، ارادہ، قدرت اور کلام کے معانی بیان فرماتے ہیں اور تین صفات فعلیہ کی تاویل کرتے ہیں یعنی درجہ احتمال میں ان کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ وہ تین صفات یہ ہیں: ۱- خوشنودی اور شکر گذاری اور ان کی اضداد ناراضگی اور پھٹکار بھیجنا ۲- دعا قبول کرنا ۳- باری تعالیٰ کی رویت (دِکھنا، نظر آنا)

اور تمہید یہ قائم کی ہے کہ جب معتزلہ اور اشاعرہ نے صفات کی دوراز کار تاویلات کی ہیں تو ہمارے لئے بھی جائز ہے کہ ہم درجہ احتمال میں صفات کا مطلب بیان کریں۔ ہم جو معانی بیان کررہے ہیں وہ صفات کو سمجھانے میں معتزلہ وغیرہ کی تاویلات کے مقابلہ میں قریب تر اور حقیقت سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ ان کے بیان کردہ معانی کو نہ شرعاً قبول کرنا ضروری ہے، نہ دلیل عقلی اس پر مجبور کرتی ہے، نہ ان کو کوئی ترجیح حاصل ہے، نہ ان میں کوئی سرخاب کا پر لگ رہا ہے۔ البتہ ہم جو معانی بیان کررہے ہیں وہ بھی تاویلات ہیں یعنی درجہ احتمال میں معانی ومطالب بیان کررہے ہیں۔ یہ دعوی نہیں ہے کہ اللہ کی مراد یہی معانی ہیں، نہ یہ دعوی ہے کہ ہمارے بیان کردہ معانی کا اعتقاد رکھنے پر اجماع امت ہے۔ توبہ! توبہ!!

(۱) صفت حیات کا بیان: ہمارے سامنے تین قسم کی چیزیں ہیں: زندہ، مردہ اور بے جان چیزیں۔ اب غور کریں، اللہ تعالیٰ سے قریب ترین مشابہت کس کو حاصل ہے؟ ظاہر ہے کہ زندہ ہی اللہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ میت وجماد کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں۔ زندہ جانتا بھی ہے اور کسی درجہ میں دوسری چیزوں پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی علیم وخبیر ہیں، وہ کائنات کے ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں اور ساری خلقت پر اثر انداز بھی ہیں۔ مخلوقات انہیں نے پیدا کی ہے اور وہی مالک ومتصرف بھی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے صفت حیات (زندگی) ثابت کرنا ضروری ہے، وہ حَیٌّ (زندہ) ہیں اور یہ ان کی صفت حقیقیہ ہے۔ صفت حیات کا بس اتنا ہی مطلب ہم جانتے ہیں۔ آگے کی کیفیت جاننے سے ہم عاجز ہیں۔ کیونکہ زندہ تو ہمارے سامنے ہے، اس لئے ہم اس کی زندگی کی کیفیت کسی درجہ میں جانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہمارے لئے غیب ہیں اور ان کی شان لیس کمثله شيئٌ ہے، اس لئے ہم ان کی حیات کی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتے۔

(۲) صفت علم کا بیان: ہمارے لئے چیزوں کے ''ظاہر ہونے'' کا نام علم (جاننا) ہے۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ پر منکشف ہے سب چیزیں ان کے سامنے ظاہر اور کھلی ہوئی ہیں۔ ازل میں جبکہ کوئی چیز موجود نہیں تھی اللہ تعالیٰ کو سب چیزوں کا ذاتی علم حاصل تھا۔ ذاتی علم وہ ہے جس کا منشا خود ذات ہو، پھر بعد میں جب چیزیں تفصیل سے موجود

ہونے لگیں تو اللہ تعالیٰ کو ان کا علم انہیں معلومات سے حاصل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم ثابت کرنا ضروری ہے۔ وہ عَلِیمٌ (جاننے والے) ہیں۔ اور یہ بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

(۳) **صفات سمع وبصر کا بیان:** مبصرات اور مسموعات کے ظہور تام کا نام دیکھنا اور سننا ہے یعنی جو چیزیں قابل رویت اور قابل سماعت ہیں وہ خوب ظاہر ہو جائیں تو اسی کا نام ان کو دیکھنا اور سننا ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو علی وجہ الاتم حاصل ہے۔ سب چیزیں ان کے سامنے ظاہر اور کھلی ہوئی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے صفات سمع وبصر ثابت کرنا ضروری ہے۔ وہ سمیع (سننے والے) اور بَصِیر (دیکھنے والے) ہیں اور یہ بھی ان کی ذاتی صفات ہیں۔

(۴) **صفت ارادہ کا بیان:** جب ہم کہتے ہیں کہ: ''فلاں نے ارادہ کیا'' تو ہم اس سے یہی مراد لیتے ہیں کہ فلاں شخص کے دل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کے معاملات اس طرح ہیں کہ:

(۱) وہ بعض کام اس وقت کرتے ہیں جب اس کام کے پیدا ہونے کی شرط پائی جاتی ہے۔ مثلاً بادل پیدا ہونے کے بعد وہ بارش برساتے ہیں۔ تو ایک ایسی نئی چیز وجود میں آتی ہے جو پہلے نہیں تھی۔

(۲) اور بعض کام وہ اس وقت کرتے ہیں جب عالم میں استعداد پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بارش ہونے کے بعد جب زمین میں روئیدگی کی استعداد پیدا ہوتی ہے تو وہ سبزہ اگاتے ہیں۔ اور ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔

(۳) عالم بالا کے بعض مقامات میں مثلاً حظیر القدس میں یا ملأ اعلیٰ میں، بہ حکم الٰہی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اور اس پر اتفاق ہوتا ہے تو اس کے مطابق کائنات میں ایسی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں جو پہلے نہیں تھیں۔

انہیں سب صورتوں کا نام ارادہ ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفت ارادہ ثابت کی جائے۔ پس وہ مُرِیْدٌ (ارادہ کرنے والے) ہیں۔ اور یہ بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

سوال: صفت ارادہ کی اوپر جو تشریح کی گئی ہے اس سے تو اس صفت کا حادث ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ کیونکہ جب کسی نئی چیز کے وجود میں آنے کا وقت آتا ہے، اس وقت اس کے ساتھ صفت ارادہ متعلق ہوتی ہے، تو یہ صفت حادث ہوئی، ازلی نہ ہوئی؟

جواب: صفتِ ارادہ حادث نہیں ہے، وہ تو قدیم اور ازلی ہے۔ البتہ اشیاء کے ساتھ اس کا تعلق حادث ہے اور تعلق کے حادث ہونے سے خود صفت کا حادث ہونا لازم نہیں آتا۔ یہی حال صفات خلق، احیاء، اماتت، ترزیق وغیرہ کا ہے۔ یہ تمام صفات جمیع عالم کے ساتھ یکبارگی متعلق ہوئی ہیں۔ اسی طرح صفت ارادہ یعنی اللہ کا چاہنا بھی تمام عالم کے ساتھ یکدم متعلق ہوا ہے پھر چیزیں شَیْئًا فَشَیْئًا اس وقت وجود میں آتی ہیں جب ان کے ساتھ تفصیلی طور پر یعنی علحدہ علحدہ اللہ کا چاہنا متعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح صفت خلق، علم وغیرہ کا حال ہے۔ پس یہ کہنا درست ہے کہ اللہ نے یہ پیدا کیا، وہ پیدا کیا یہ جانا، وہ جانا۔ اس کام کا ارادہ کیا، اُس کام کا ارادہ کیا۔ ایسا کہنے سے ان صفات کو حادث سمجھنا غلط فہمی ہے۔

ولنا: أن نفسّرها بمعانٍ هي أقرب وأوفق مماقالوا إبانةً، لأن تلك المعاني لايتعين القولُ بها، ولايضطر الناظر في الدليل العقلي إليها، وأنها ليست راجحة على غيرها، ولافيها مزيةٌ بالنسبة إلى ما عداها؛ لاحُكماً بأن مرادَ الله مانقول، ولاإجماعاً على الاعتقاد بها، والإذعان بها، هيهات ذلك!
فنقول — مثلاً —:

[١] لما كان بين يديك ثلاثةُ أنواع: حي وميت وجماد، وكان الحي أقربَ شِبْهًا بما هنالك، لكونه عالِمًا مؤثِّرًا في الخلق، وجب أن يسمى حَيًّا.

[٢] ولما كان العلم عندنا هو الانكشاف، وقد انكشفت عليه الأشياء كلُّها،بما هي منذ مِجّةٌ في ذاته، ثم بما هي موجودةٌ تفصيلاً، وجب أن يسمى عليما.

[٣] ولما كانت الرؤية والسمع انكشافا تامًّا للمبْصَرات والمسموعاتِ، وذلك هناك بوجهٍ أتَمّ، وجب أن يسمى بصيرًا سميعًا.

[٤] ولما كان قولُنا: أراد فلانٌ، إنما نَعْنِيْ به هَاجِسَ عزمٍ على فَعْلٍ أو تركٍ، وكان الرحمن يفعل كثيرًا من أفعاله عند حدوثِ شرط،أو استعدادٍ في العالَم، فيوجب عند ذلك مالم يكن واجبًا، ويحصُل في بعض الأحياز الشاهقة إجماعٌ بعد مالم يكن، بإذنه وحكمه، وجب أن يسمى مريدًا.

وأيضًا: فالإرادةُ الواحدة الأزلية الذاتية المفسَّرةُ باقتضاء الذات لَمَّا تعلّقت بالعالم بأسره مرةً واحدةً، ثم جاءت الحوادثُ يومًا بعد يوم، صحَّ أن تُنْسب إلى كل حادثٍ حادث على حِدَتِه، ويقال: أراد كذا وكذا.

ترجمہ: اورہمارے لئے جائز ہے کہ ہم صفات کی تشریح کریں ایسے معانی سے جو اظہار حقیقت میں ان کی باتوں سے اقرب اورزیادہ ہم آہنگ ہیں۔اس لئے کہ اُن (معتزلہ کے بیان کردہ) معانی کا قائل ہونا متعین نہیں اورنہ دلیل عقلی میں غور کرنے والا ان معانی (کو ماننے) کی طرف مجبور ہے۔اوراس لئے کہ وہ معانی ان کے علاوہ معانی پر راجح نہیں ہیں۔اورنہ ان میں کوئی فضیلت ہے دیگر معانی کی بہ نسبت۔(ہم یہ معانی) یہ فیصلہ کرتے ہوئے (بیان) نہیں (کررہے) کہ اللہ کی مراد وہی ہے جو ہم کہتے ہیں۔اورنہ اجماع (کا دعوی) کرتے ہوئے ان معانی کا اعتقاد رکھنے پر اوران کا یقین کرنے پر۔بہت دور کی بات ہے وہ یعنی ناممکن ہے کہ ہم ایسا کہیں۔

پس ہم بطور مثال کہتے ہیں:

(۱) جب آپ کے سامنے تین قسم کی چیزیں تھیں: زندہ، مردہ اور بے جان چیز۔اورزندہ قریب تر مشابہت رکھنے

والا تھا اس سے جو وہاں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ سے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں اور مخلوقات پر اثر انداز ہیں، تو ضروری ہوا کہ ان کو حَیٌّ (زندہ) کہا جائے۔

(۲) اور جب علم (جاننا) ہمارے نزدیک (یعنی ہماری بول چال میں) انکشاف (ظہور) کا نام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر تمام چیزیں منکشف ہیں اس چیز سے جو ان کی ذات میں چھپائی ہوئی ہے (یعنی ازل میں اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کا ذاتی علم حاصل تھا) پھر اس چیز سے جو مفصل موجود ہے (یعنی پھر جب کائنات پیدا ہونی شروع ہوئی تو ان موجودات کے ذریعہ دوسری مرتبہ انکشاف ہوا یعنی وہ علم ازلی جو کائنات کے ساتھ یکبارگی متعلق ہوا تھا۔ اب وہ ایک ایک چیز سے علحدہ علحدہ متعلق ہونے لگا۔ یہ تعلق حادث ہے مگر صفت علم قدیم ہے، جیسا کہ ابھی صفت ارادہ کے بیان کے بعد سوال مقدر کے جواب کے طور پر یہ بات آرہی ہے) تو ضروری ہوا کہ ان کو علیم کہا جائے۔

(۳) اور جب رویت (دیکھنا) اور سمع (سننا) مبصرات (دیکھنے والی چیزوں) اور مسموعات (قابل سماعت) چیزوں کے ظہور تام کا نام تھا، اور یہ بات وہاں (یعنی اللہ تعالیٰ میں) بوجہ اتم موجود ہے تو ضروری ہوا کہ ان کو بصیر اور سمیع کہا جائے۔

(۴) اور جب ہم کہتے ہیں کہ: ''فلاں نے ارادہ کیا'' تو ہم اس سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے پختہ ارادہ کے خیال کو مراد لیتے ہیں۔ اور مہربان اللہ اپنے کاموں میں سے بہت سے کام کسی شرط کے نیا پیدا ہونے پر یا دنیا میں استعداد پیدا ہونے پر کیا کرتے ہیں، پس اس وقت وہ چیز ثابت ہوتی ہے (یعنی وجود میں آتی ہے) جو پہلے ثابت نہیں تھی۔ اور عالم بالا کے بعض مقامات میں، اللہ کی اجازت اور حکم سے ایسا اجماع منعقد ہوتا ہے جو پہلے نہیں تھا، تو ضروری ہوا کہ ان کو مُرِید (ارادہ کرنے والا) کہا جائے۔

اور نیز: پس ایک ازلی ذاتی ارادہ، جس کی تشریح کی گئی ہے: ذات (اللہ تعالیٰ) کے چاہنے کے ساتھ، جب وہ تمام عالم کے ساتھ یکبارگی متعلق ہوا، پھر رونما ہوئے واقعات (چیزیں) تدریجاً تو درست ہے کہ وہ ارادۂ واحدۃ منسوب کیا جائے ہر ہر واقعہ کی طرف علحدہ علحدہ طور پر، اور کہا جائے کہ: ''اس نے ایسا چاہا اور ایسا چاہا''

لغات وترکیب:

انها لیست راجحة کا عطف لأن میں أنَّ پر ہے...... لاحکمًا ای لا نفرها حکمًا...... اِنْدَمَجَ فی الشيء: مضبوط گڑ جانا...... هَاجِسٌ (اسم فاعل، مضاف ہے) هَجَسَ الشیءُ فی صدره: وسوسہ گذرنا، خیال آنا...... الأحیاز جمع الحَیِّز: جگہ...... الشاهقة: بلند۔

⑤ صفت قدرت کا بیان: اور جب ہم کہتے ہیں کہ ''فلاں قادر ہوا'' تو ہم اس کا یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ فلاں وہ کام کرسکتا ہے، کوئی خارجی سبب اس کو روک نہیں سکتا البتہ وہ خود ہی ارادہ بدل دے اور نہ کرے تو یہ دوسری بات ہے۔ اسی طرح ایسی ضدّین جو دونوں زیر قدرت ہوں، مثلاً کسی چیز کا کھانا اور نہ کھانا جب آدمی ان دونوں میں سے ایک پہلو کو اختیار کرے مثلاً کھالے تو بھی دوسرا پہلو زیر قدرت رہتا ہے۔ ایک پہلو کو ترجیح دینے سے اس کی ضد قدرت سے خارج نہیں ہوجاتی، جس طرح پہلے دونوں پہلو زیر قدرت تھے اب بھی دوسرا پہلو قدرت میں ہے اور ایک پہلو کو اختیار کرنا اور دوسرے پہلو کو اختیار نہ کرنا کسی مصلحت سے ہوتا ہے —— اور مہربان اللہ بھی ہر کام کرسکتے ہیں کوئی ان کو روکنے والا نہیں اور وہ جو دو مقدوروں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ اپنی مہربانی سے ایسا کرتے ہیں اور ان کا اپنا ارادہ اور فیصلہ اس کا مقتضی ہوتا ہے مثلاً انہوں نے اپنے حبیب کو سب پیغمبروں کے آخر میں مبعوث فرمایا، جبکہ وہ سب سے پہلے بھی اور درمیان میں بھی مبعوث فرماسکتے تھے، تو یہ ترجیح ان کے فضل اور ان کے چاہنے کی وجہ سے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دوسرا پہلو ان کے اختیار میں نہیں تھا، یا اب نہیں رہا، پہلے بھی دونوں امر مقدور تھے اور اب بھی ہیں۔ جب اللہ کی یہ شان ہے تو ضروری ہے کہ ان کو قادر مانا جائے۔ پس وہ قَدِیْرٌ (قدرت والے) ہیں اور یہ بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

⑥ صفت کلام کا بیان: جب ہم کہتے ہیں کہ: ''فلاں نے فلاں سے بات کی'' تو ہم اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس نے اپنے دل کی مراد الفاظ کے ذریعہ دوسرے کو بتائی۔ اور مہربان اللہ بھی کبھی اپنے بندوں پر علوم کا فیضان کرتے ہیں اور صرف معانی کا فیضان نہیں کرتے، بلکہ معانی کے ساتھ الفاظ کا بھی فیضان کرتے ہیں، جو بندے کی قوت خیالیہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور وہ علوم ومعانی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ معانی کے ساتھ الفاظ کا فیضان اس لئے کرتے ہیں کہ تعلیم زیادہ سے زیادہ واضح طور پر ہو۔ غرض جب شان عالی بھی یہ ہے تو ضروری ہے کہ ان کے لئے صفت کلام ثابت کی جائے۔ چنانچہ وہ مُتَکَلِّمٌ (بات کرنے والے) ہیں اور یہ صفت بھی ان کی ذاتی صفت ہے۔

فائدہ (۱) ذاتی صفت وہ ہے جس کی ضد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف نہ کیا جاسکے مثلاً وہ زندہ، جاننے والے اور قادر ہیں۔ ان کو مردہ ہونے اور جہالت وعجز کے ساتھ متصف نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ کی حقیقی (اصلی) ذاتی صفات کل سات ہیں جن کا بیان پورا ہوا۔ اور جس صفت کی ضد کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کو متصف کیا جاسکتا ہے وہ صفت فعلی ہے، جیسا احیاء (زندہ کرنا) اور اِماتت (مارنا) دونوں اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں۔ صفات فعلیہ بہت ہیں۔ **شیخ ابو المنتهی مغنیساوی** رحمہ اللہ **الفقه الأکبر** کی شرح میں لکھتے ہیں: **والفرق بين صفات الذات وصفات الفعل: أن كل صفة يوصف الله تعالى بضدها فهي من صفات الفعل، كالخلق، وإن كان لايوصف بضدها فهي من صفات الذات، كالحياة، والعزة، والعلم (ص۱۰۸)**

فائدہ (۲) پہلے یہ بات آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو ایک درجہ تک ہی سمجھا جاسکتا ہے، فہم کے آخری مرحلہ

میں تمام صفات از قبیل متشابہات ہیں یعنی بمعنی غایات ونتائج تو صفات کو سمجھا جاسکتا ہے مگر مبدأ کی کیفیت نہیں سمجھ سکتے پس مبدأ کے ثبوت کا اعتقاد رکھنا تو ضروری ہے، مگر اس کا ادراک مشکل ہے، واللہ اعلم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

فیضان علوم (وحی) کی صورتیں

سورۃ الشوری آیت ۵۱ میں ہے کہ: ''کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (روبہ رو) کلام کریں'' یعنی کوئی بھی بشر اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قوی کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اس کے سامنے ظاہر ہو کر اس سے بالمشافہہ کلام فرمائیں اور وہ تحمل کر سکے۔ نیز اللہ تعالیٰ عالی شان ہیں۔ ان کی شان کی بلندی بھی مانع ہے کہ وہ بشر سے روبہ رو کلام فرمائیں۔ مگر وہ بڑی حکمت والے بھی ہیں۔ ان کی حکمت مقتضی ہوئی کہ فیضان علوم کے لئے قابل تحمل شکلیں تجویز فرمائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بندوں پر چار طرح سے علوم کا فیضان فرماتے ہیں۔

پہلی صورت: اشارہ سے علوم کا فیضان کرنا یعنی اللہ تعالیٰ کوئی مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: کبھی نیند میں بصورت خواب القاء فرماتے ہیں۔ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ اس میں شیطانی تصرف نہیں ہوسکتا۔ اس صورت میں الفاظ عموماً اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتے۔ صرف ایک مضمون خواب کی شکل میں اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتے ہیں، جس کو پیغمبر اپنے الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ روایت میں ہے کہ أوّلُ ما بُدِئَ به رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصالحة في النوم (مشکوٰۃ، کتاب الفضائل، باب المبعث وبدء الوحي، حدیث نمبر ۵۸۴۱) یعنی رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز نیند میں سچے خوابوں کے ذریعہ ہوا۔

اور کبھی بیداری میں جب بندہ غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی واضح علم، جو غور وفکر کا نتیجہ نہیں ہوتا، اس کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں جیسا کہ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أُلقِي في رُوعي (میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی)

قرآن کریم میں فیضان علوم کی ان دونوں صورتوں کو لفظ وحی سے تعبیر کیا ہے، وحی کے لغوی معنی ہیں اشارہ خفیہ، جو مذکورہ دونوں صورتوں کو شامل ہے، اور عرف میں وحی کا لفظ عام ہے، فیضان علوم کی تمام صورتوں کو وحی کہا جاتا ہے مگر سورۃ الشوری کی آیت میں لغوی معنی مراد ہیں۔

دوسری صورت: اللہ تعالیٰ بلا واسطہ پردہ کے پیچھے سے بندے کو کوئی منظم و مرتب کلام سناتے ہیں۔ بندہ خوب سمجھتا ہے کہ وہ خارج سے سن رہا ہے مگر بندے کو کوئی بولنے والا نظر نہیں آتا یعنی نبی کی قوت سامعہ استماع کلام سے لذت اندوز ہوتی ہے مگر آنکھیں دولت دیدار سے متمتع نہیں ہوتیں۔

کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اسی طریقہ سے وحی فرمائی تھی اور شب معراج میں سید الانبیاء ﷺ کو کلام کی اسی صورت سے نوازا گیا تھا۔

تیسری صورت: فرشتہ متجسّد ہو کر نبی کے سامنے آتا ہے اور خدا کا کلام و پیام پہنچاتا ہے، جس طرح ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہے۔ وحی کا عام طریقہ یہی رہا ہے۔ قرآن کریم پورا اسی طریقہ سے بواسطہ جبرئیل نازل ہوا ہے۔ آنحضور ﷺ کو حضرت جبرئیل ایک دو مرتبہ تو اپنی اصلی شکل میں نظر آئے ہیں۔ مگر اکثر وہ آدمی کی شکل میں تشریف لاتے تھے۔ اس وقت آپ کی آنکھیں فرشتہ کو دیکھتیں اور کان اس کی آواز سنتے تھے اور عام طور پر جبرئیل دوسروں کو نظر نہیں آتے تھے۔ مگر کبھی وہ صحابہ کو بھی نظر آتے تھے اور صحابہ بھی ان کی بات سنتے تھے، جیسا کہ حدیث جبرئیل میں آیا ہے۔

چوتھی صورت: جب بندہ عالم ملکوت کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کے حواس مغلوب ہو جاتے ہیں یعنی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو نبی کو ایک گھنٹے کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور اس ذریعہ سے وحی کی جاتی ہے۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپؐ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"میرے پاس وحی کبھی گھنٹے کی آواز کی طرح آتی ہے۔ اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت بھاری ہوتی ہے۔ پھر وہ مجھ سے موقوف ہوتی ہے اس حال میں کہ میں اس کو یاد کر چکا ہوتا ہوں" (مشکوٰۃ، کتاب الفضائل، باب المبعث وبدء الوحی، حدیث نمبر ۵۸۴۴)

علماء نے بیان کیا ہے کہ وحی کرنے والے فرشتے اور وحی لینے والے نبی میں مناسبت شرط ہے اور یہ مناسبت دو طرح پر پیدا کی جاتی ہے کبھی فرشتہ کی ملکیت اور روحانیت نبی پر غالب آتی ہے اور نبی بشریت سے غائب ہو جاتا ہے تو مذکورہ صورت پیش آتی ہے اور کبھی نبی کی بشریت فرشتہ پر غالب آتی ہے تو فرشتہ بصورت بشر نمودار ہوتا ہے اور دوسری صورت پیش آتی ہے (مظاہر حق)

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس چوتھی صورت کی نظیر پیش کی ہے کہ جس طرح غشی (بے ہوشی) طاری ہونے پر کبھی سرخ وسیاہ رنگ نظر آتے ہیں، اسی طرح اس چوتھی صورت کو سمجھنا چاہئے۔ یہ محض ایک نظیر ہے۔ مثال نہیں جو مثل لہ کا فرد ہوتی ہے۔

[۵] ولـمـا كـان قولُنا: قَدَرَ فلانٌ، إنما نعني به: أنه يمكن له أن يفعل، ولايصدُّه من ذلك سببٌ خارجٌ؛ وأما إيثارُ أحدِ المقدورَيْنِ من القادر فإنه لاينفي اسمَ القدرة؛ وكان الرحمن قادرًا على كل شيئ، وإنما يُؤثِّر بعضَ الأفعال دون أضداده لعنايته واقتضائه الذاتي، وجب أن يسمى قادرًا.

[٦] ولـمـا كـان قولُنا: كَلَّم فلانٌ فلانًا، إنما نعني به: إفاضةَ المعاني المرادةِ، مقرونةً بألفاظ

دالة علیها، وکان الرحمنُ ربما یُفیض علی عبده علومًا، ویُفیض معها ألفاظًا منعقدةً فی خیاله، دالَّةً علیها، لیکون التعلیمُ أصرحَ ما یکون، وجب أن یسمی متکلِّمًا۔

قال اللّٰه تعالی: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ، إِلَّا وَحْيًا، أَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ، أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَايَشَآءُ، إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ فالوحی: هو النَّفثُ فی الرُّوع برؤیا، أو خلقِ علمٍ ضروری عند توجهه إلی الغیب؛ ومن وراء حجاب: أن یُسمع کلامًا منظوما، کأنه سمعه من خارج، ولم یرقائلَه؛ أو یُرسل رسولاً، فیتمثَّل المَلَکُ له، وربما یحصُل عند توجهه إلی الغیب وانْقِهَارِ الحواسّ صوتُ صَلصَلة الجَرَس، کما قد یکون عند عروض الغَشْیِ من رؤیةِ ألوانٍ حُمْرٍ وسُوْدٍ۔

ترجمہ: (۵) اور جب ہم کہتے ہیں کہ: ''فلاں شخص قادر ہوا'' تو ہم اس سے مراد لیتے ہیں کہ اس کے لئے کرنا ممکن ہے، اس کو اس سے کوئی خارجی سبب نہیں روک سکتا۔ اور رہا قادر کا دو زیرِ قدرت چیزوں میں سے ایک کو ترجیح دینا تو یہ چیز ''قدرت'' کے اطلاق کی نفی نہیں کرتی۔ اور مہربان اللہ قادر ہیں ہر چیز پر۔ اور وہ بعض کاموں کو ان کی اضداد پر اپنی مہربانی اور اپنے ذاتی چاہنے سے ترجیح دیتے ہیں، تو ضروری ہوا کہ ان کا قَادِرْ نام رکھا جائے۔

(۶) اور جب ہم کہتے ہیں کہ: ''فلاں نے فلاں سے بات کی'' تو ہم اس سے مراد لیتے ہیں معنی مراوی کے افاضہ (پہنچانے) کو، درانحالیکہ وہ ایسے الفاظ کے ساتھ مقرون ہوتے ہیں جو ان معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ اور مہربان اللہ کبھی اپنے بندے پر علوم کا فیضان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ایسے الفاظ کا بھی فیضان کرتے ہیں جو اس بندہ کی قوت خیالیہ میں منعقد ہوجاتے ہیں، جو ان علوم پر دلالت کرتے ہیں، تاکہ تعلیم زیادہ سے زیادہ صراحت کے ساتھ ہو، پس ضروری ہوا کہ ان کا نام متکلم (بات کرنے والا) رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور کسی بشر کی یہ طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے، مگر اشارہ کے طور پر، یا پردے کے پیچھے سے، یا کسی فرشتہ کو بھیج دے پس وہ خدا کے حکم سے، جو خدا کو منظور ہو، پیغام پہنچادے، وہ بڑی اونچی شان والا بڑی حکمت والا ہے۔ پس وحی: وہ دل میں کوئی بات ڈالنا ہے خواب کے ذریعہ یا اس بندہ کے غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ کرنے کی صورت میں (دل میں) نہایت واضح علم پیدا کرنے کے ذریعہ۔ اور پردے کے پیچھے سے: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی منتظم کلام سنائیں، گویا اس نے اس کو باہر سے سنا اور اس کے بولنے والے کو نہیں دیکھا۔ یا بھیجیں رسول کو: پس فرشتہ بندہ کے سامنے متمثل ہو۔ اور کبھی بندے کے غیب (اللہ تعالیٰ) کی طرف توجہ کرنے کے وقت اور حواس کے مغلوب ہونے کے وقت گھنٹے کی سی آواز حاصل ہوتی ہے، جیسے کبھی غشی طاری ہونے پر سرخ وسیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

⑦ صفات رضا وشکر، سخط ولعن اور اجابتِ دعا کا بیان: مقدس بارگاہ میں انسانوں کے لئے ایک پروگرام ہے، جس کا نوعِ بشری میں جاری کرنا مقصود ہے۔ اس لئے نبوت کا سلسلہ جاری فرمایا ہے اور انبیاء کے ذریعہ وہ نظام انسانوں کو پہنچایا ہے۔ تاکہ لوگ اس نظام پر عمل پیرا ہوں۔ اب اگر لوگ اس مطلوبہ نظام کا اتباع کریں گے تو وہ ملأ اعلی کے ساتھ لاحق ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو بشریت کی آلودگیوں سے نکال کر نورِ الٰہی کی طرف، اور اپنی بخشائشوں کی کشادگی کی طرف نکالیں گے اور ان کو نفسانی اور روحانی لذتیں، راحتیں اور نعمتیں حاصل ہوں گی یعنی وہ اپنی نیک روی پر شاداں وفرحاں ہوں گے۔ اور فرشتوں اور انسانوں کو الہام کیا جائے گا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کریں۔

اور اگر لوگ اس نظام مقصود کی خلاف ورزی کریں گے تو وہ ملأ اعلی سے دور ہو جائیں گے۔ ان پر ملأ اعلی کے توسط سے اللہ کا بغض نازل ہوگا، جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں آیا ہے[1] اور وہ دنیا ہی میں اُس طور پر عذاب الیم میں مبتلا کر دیئے جائیں گے جس کی تفصیل مبحث دوم کے باب اول میں گذری ہے۔

غرض مذکورہ وجوہ سے یہ کہنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے خوش ہوئے یا ناراض ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کے بہتر سلوک پر ان کی تعریف کی یا نافرمانی پر ان کو پھٹکارا۔ اور یہ سب صفات فعلیہ ہیں، کیونکہ ضدین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کرنا درست ہے۔

اس کے بعد ایک جملہ میں ایک سوال کا جواب ہے:

سوال: جب اللہ تعالیٰ کے پاس بندوں کے لئے ایک مطلوبہ نظام ہے تو جو لوگ اس کو اپنائیں انہیں کو پنپنے کا موقعہ دینا چاہئے، اور جو اس نظام کی خلاف ورزی کریں ان کو کیفر کردار تک پہنچا دینا چاہئے۔ حکومتیں موافقین کو محبوب رکھتی ہیں اور مخالفین کا قلع قمع ضروری خیال کرتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ مطلوبہ نظام کے مخالفین کو کیوں برداشت کرتے ہیں؟

جواب: اس عالم میں تمام امور کا مرجع درحقیقت یہ امر ہے کہ نظام عالم مصلحتِ خداوندی کے مقتضی کے مطابق جاری رہے اور مصلحت خداوندی یہ ہے کہ یہاں خیر کے ساتھ شر بھی رہے مثلاً کھیتی سے مقصود غلہ ہوتا ہے مگر بھوسا بھی ساتھ رہتا ہے، جو بالآخر جانوروں کا چارہ بنتا ہے۔ اگر اس عالم میں خیر محض ہوتی تو یہ عالم فرشتوں کی دنیا بن کر رہ جاتا، اس کا امتیاز ختم ہو جاتا، اور فرشتوں کی دنیا پہلے سے موجود تھی، اس عالم کو پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی' سورۃ البقرہ آیت ۳۰ میں فرشتوں کا یہی سوال مذکور ہے، اور آخر میں اللہ تعالیٰ کا یہی جواب ہے کہ: "میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے" یہ اُسی حکمت ومصلحت کی طرف اشارہ ہے جس کے مقتضی کے مطابق اس عالم کا کاروبار جاری ہے (جواب تمام ہوا)

اسی طرح جب بندہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات مانگتا ہے تو جو دعا نظام عالم کے مقتضی کے مطابق ہوتی ہے وہ قبول کی

---

[1] دیکھئے مشکوٰۃ شریف کتاب الآداب باب الحب فی اللہ ومن اللہ حدیث نمبر ۵۰۰۵ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے نفرت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتے ہیں کہ مجھے فلاں بندہ سے نفرت ہے تم بھی اس سے نفرت کرو الخ۔

جاتی ہے اور بندہ کو مطلوبہ چیز دے دی جاتی ہے۔ اور جس چیز کا دینا مصلحت نہیں ہوتا وہ نہیں دی جاتی۔ پس یہ کہنا درست ہے کہ: ''اللہ نے دعا قبول فرمائی یا اللہ نے دعا قبول نہیں فرمائی'' پس یہ بھی اللہ کی صفت ہے، اور فعلی صفت ہے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ نہیں فرمایا کہ: ''بندہ جو کچھ مجھ سے مانگے گا، میں اس کو ضرور دونگا'' بلکہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۶ میں یہ فرمایا ہے کہ: ''میں درخواست کرنے والے کی ہر عرضی منظور کر لیتا ہوں جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دیتا ہے'' ﴿أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ اور حدیث شریف میں اس کی تفسیر یہ آئی ہے کہ:

''مسلمان جب بھی کوئی دعا کرتا ہے، بشرطیکہ گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور عطا فرماتے ہیں: یا تو جو مانگا ہے وہ جلد دنیا ہی میں مل جاتا ہے یا اس کی دعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ کر کے رکھ لیا جاتا ہے یا اس مطلوبہ خیر کے بقدر کوئی تکلیف اس سے ہٹا دی جاتی ہے'' (رواہ احمد، مشکوۃ، کتاب الدعوات، فصل ثالث حدیث نمبر ۲۲۵۹)

یعنی بندہ کی کوئی بھی جائز دعا رد نہیں کی جاتی۔ ہر درخواست قبول کر لی جاتی ہے۔ رہا دینا نہ دینا تو یہ نظام عالم کی مصلحت پر موقوف ہے اگر مصلحت ہوتی ہے تو مطلوبہ چیز دے دی جاتی ہے، ورنہ دعا کی وجہ سے مطلوبہ چیز کے بقدر کوئی تکلیف دور کر دی جاتی ہے یا پھر اس دعا کو عبادت گردان کر نامۂ اعمال میں لکھ لیا جاتا ہے، جو آخرت میں اس کے کام آتی ہے۔ کیونکہ دعا نہ صرف یہ کہ عبادت ہے بلکہ وہ عبادت کا گودا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کا اکلوتا بیٹا ملیریا کا شکار ہو جائے اور وہ حسب عادت قلفی مانگے تو شفیق باپ اس کو جھڑک نہیں دیتا۔ بلکہ درخواست قبول کر لیتا ہے اور نوکر کو ڈرامائی انداز میں حکم دیتا ہے کہ دوڑ دوڑ قلفی لا۔ نوکر جائے گا اور واپس نہیں آئے گا۔ اور بچہ تھوڑی دیر میں اپنا مطالبہ بھول جائے گا۔ باپ بچے کو برف اسی وقت دے گا جب ڈاکٹر اجازت دے گا۔ کیونکہ باپ کو بیٹے کی زندگی سے کھیلنا نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بندوں پر باپ سے زیادہ شفیق ہیں۔ وہ بندوں کی ہر دعا قبول فرما لیتے ہیں۔ مگر دیتے وہی ہیں جس کا دینا مصلحت ہوتا ہے۔ اللہ اکبر! کیسی شان رحمت ہے!!

⑧ صفت رویت کا بیان: رویت مصدر مجہول ہے۔ رُئِـيَ يُـرىٰ رُؤْيَةً کے معنی ہیں دکھنا، نظر آنا۔ اور دکھنے کا مطلب ہمارے عرف میں مرئی کا پوری طرح سے منکشف ہونا ہے۔ اور آخرت میں صورت حال یہ ہوگی کہ جب مؤمن بندے جنت میں پہنچ جائیں گے، جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ تو وہ رب العالمین کی اس تجلی اعظم کا سر کی آنکھوں سے دیدار کریں گے جو عالم مثال کے درمیان میں قائم ہے۔ اس لئے متفق علیہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''بے شک تم اللہ کو دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو'' پس ضروری ہے کہ صفت رویت اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کی جائے۔ مگر یہ درحقیقت بندوں کی صفت ہے مگر چونکہ اس کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہوتا ہے، اس لئے مجازاً اس کو اللہ تعالیٰ کی صفت شمار کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

[۷] ولـما كان في حظيرة القدس نظامٌ، مطلوبةٌ إقامتُه من البشر، فإن وافقوه لحقوا بالملأ الأعلى، وأُخرجوا من الظلمات إلى نور الله وبَسْطَتِهِ، ونُعِّمُوْا في أنفسهم، وألهمت الملائكةُ وبنو آدم أن يُحسنوا إليهم؛ وإن خالفوا بايَنُوْا من الملأ الأعلى، وأصيبوا ببغضة منهم، وعُذبوا بنحو ماذُكر، وجب أن يقال: رَضِيَ وَشَكَرَ، أو سَخِطَ ولَعَنَ؛ والكلُّ يرجع إلى جَرَيَانِ العالَم حَسَب مقتضى المصلحة؛ وربما كان من نظام العالَم خلقُ المدعُوِّ إليه، فيقال: استجاب الدعاء.

[۸] ولـما كانت الرؤيةُ في استعمالنا انكشافَ المرئيِّ أتَمَّ ما يكون، وكان الناس إذا انتقلوا إلى بعضِ ما وُعدوا من المعاد، اتَّصلوا بالتجلي القائم وسْطَ عالَمِ المثال، ورأوه رأىَ عينٍ بأجمعهم، وجب أن يقال: إنكم سترونه كما ترون القمر ليلة البدر، والله أعلم.

ترجمہ: اور جب حظیرۃ القدس (بارگاہ مقدس) میں ایسا پروگرام تھا جس کا برپا کرنا انسانوں سے مقصود ہے۔ پس اگر لوگ اس کی موافقت کریں گے تو وہ ملأ اعلی کے ساتھ ملیں گے اور وہ تاریکیوں سے اللہ کے نور اور اللہ کی کشادگی کی طرف نکالے جائیں گے اور وہ ان کے دلوں میں راحتیں پہنچائے جائیں گے اور فرشتے اور انسان الہام کئے جائیں گے کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ اور اگر لوگ اس نظام کی مخالفت کریں گے تو وہ ملأ اعلی سے جدا ہو جائیں گے۔ اور وہ اللہ کا بغض (نفرت) پہنچائے جائیں گے ملأ اعلی کی طرف سے۔ اور سزا دیئے جائیں گے اس طور پر جو ذکر کی گئی۔ تو ضروری ہوا کہ کہا جائے: ''وہ خوش ہوا اور اس نے بندوں کے بہتر سلوک پر ان کی تعریف کی یا وہ ناراض ہوا اور اس نے نافرمانوں کو پھٹکارا'' اور سب کچھ لوٹتا ہے دنیا کے چلنے کی طرف مصلحت خداوندی کے مطابق۔ اور کبھی نظام عالم میں سے اس چیز کا پیدا کرنا ہوتا ہے جس کی دعا مانگی گئی ہے، پس کہا جاتا ہے: ''اس نے دعا قبول کی''

(۸) اور جب رویت (دِکھنا) ہمارے عرف میں مرئی کا انکشاف ہے، زیادہ سے زیادہ مکمل طور پر جو ہو سکے۔ اور لوگ جب منتقل ہوں گے بعض اُن جگہوں کی طرف جن کا وہ وعدہ کئے گئے ہیں، آخرت میں، تو وہ مل جائیں گے اس تجلی کے ساتھ جو عالم مثال کے بیچ میں قائم ہے اور وہ سب اس تجلی کو دیکھیں گے سر کی آنکھوں سے، تو ضروری ہوا کہ کہا جائے: ''بے شک تم اس کو دیکھو گے جس طرح چاند کو دیکھتے ہو چودھویں رات میں'' باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

بَسْطَة: کشادگی...... بَـایَنَ مُبَـایَنَة: ایک دوسرے سے جدا ہونا...... شَـكَـرَ: قدردانی کی، حق مانا، بہتر سلوک پر تعریف کی...... المرئی: دِکھنے والی چیز، نظر آنے والی چیز۔

☆ ☆ ☆

باب ـــــ ۵

تقدیر پر ایمان لانے کا بیان

تقدیر کے معنی: قَدَر (ض،ن) قَدْرًا وَقَدَرًا اور قَدَّرَ تقدیرًا کے معنی ہیں فیصلہ کرنا، حکم لگانا۔ کہا جاتا ہے: قَدَرَ اللّٰہُ علیه الأمرَ اور قَدَّرَ له الأمرَ: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کسی امر کا فیصلہ فرمایا، کوئی چیز اس کے لئے تجویز کی۔ شریعت کی اصطلاح میں تقدیر نام ہے قضاء وقدر کا یعنی کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ازل میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس کا نام ''تقدیر الٰہی'' ہے۔ عربی میں عام طور پر لفظ قَدَر کا استعمال ہوتا ہے اور اردو میں ''تقدیر'' کا۔ مطلب دونوں کا ایک ہے۔

قدرِ مُلْزِم کا مطلب: مُلْزِمْ (اسم فاعل) باب افعال سے ہے أَلْزَمَ الشيئَ کے معنی ہیں لازم کرنا۔ اور قدر ملزم کا مطلب ہے: اللہ کا وہ فیصلہ جو لازم کرنے والا ہے یعنی جس کے مطابق کائنات کا وجود پذیر ہونا ضروری ہے۔ اُس طے شدہ امر سے حوادث کا تخلف نہیں ہوسکتا۔

اور تقدیر معلق (لٹکی ہوئی) صرف بندوں کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے کہ: ''والدین کے ساتھ حسن سلوک عمر بڑھاتا ہے اور جھوٹ روزی گھٹاتا ہے اور دعا فیصلہ خداوندی کو پھیر دیتی ہے'' (رواہ الاصبہانی۔ ترغیب ۳:۵۹۶) یہ باتیں معلق صرف بندوں کے علم اور ظہور حوادث کے اعتبار سے ہیں علم الٰہی کے تعلق سے ہر شی طے شدہ ہے۔ ازل سے خدا کو معلوم ہے کہ کیا ہونا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ طالب علم اگر محنت کرے گا تو امتحان میں کامیاب ہوگا اور کھیلے گا کودے گا تو فیل ہوگا۔ یہ بات صرف بندوں کے اعتبار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ ان کو ازل سے وہ پہلو معلوم ہے جو ظہور پذیر ہوگا۔ بلکہ وہ پہلو انہیں کا طے کیا ہوا ہے۔ ورنہ علم الٰہی کا ناقص ہونا لازم آئے گا کہ کچھ باتیں ان کو ازل میں متعین طور پر معلوم نہیں۔ توبہ! توبہ!! ـــــ اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تعبیر میں محو واثبات کا تعلق عالم مثال سے ہے، ام الکتاب سے نہیں ہے۔ تفصیل باب کے آخر میں آرہی ہے۔

تدبیر وحدانی کا مطلب: تدبیر کے معنی ہیں نظم ونسق کرنا۔ اور وَحَدَ يَحِدُ وَحْدًا کے معنی ہیں: ''اکیلا ہونا'' صفت وحید آتی ہے۔ پس ''تدبیر وحدانی'' کے معنی ہیں ''متحدہ برتاؤ'' یعنی طے شدہ پالیسی کے مطابق سب کے ساتھ یکساں برتاؤ۔ ایسا دستوری مملکت یا ادارہ میں ہوتا ہے، ڈکٹیٹر شپ میں کوئی دستور نہیں ہوتا۔ خداوند قدوس نے خود ہی اپنی کائنات کے لئے ایک دستور تجویز فرمایا ہے۔ اسی کا نام تقدیر الٰہی اور قضاء وقدر ہے اور وہ اسی کے مطابق مخلوقات کے ساتھ دستوری معاملہ فرماتے ہیں۔

بھلی بری تقدیر کا مطلب: حدیث جبرئیل میں ایمانیات میں تُؤمن بالقدر خيره وشره آیا ہے یعنی مؤمن

ہونے کے لئے تقدیر پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، اس کے بھلے پر بھی اور اس کے برے پر بھی۔ اور ابن ماجہ کے مقدمہ میں بالأقدار كلها: خيرها وشرها حُلوِها ومُرّها آیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی تمام طے کردہ باتوں پر، خواہ وہ بھلی ہوں یا بری۔ میٹھی ہوں یا کڑوی، ایمان لانا ضروری ہے۔ ان حدیثوں میں ضمیروں کا مرجع قدر اور اقدار ہیں اور تقدیر الٰہی کا بھلا برا اور میٹھا کڑوا ہونا انسانوں کے اعتبار سے ہے یعنی خواہ وہ طے کردہ باتیں انسانوں کے لئے مفید ہوں یا مضر، میٹھی ہوں یا کڑوی یعنی اچھی لگیں یا بری سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جیسے گھی کے بارے میں تجویز الٰہی یہ ہے کہ وہ صحت بخش ہے اور زہر کے بارے میں یہ ہے کہ وہ مہلک ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ کے بارے میں طے کیا گیا ہے کہ وہ جنت نشیں کرنے والے اعمال ہیں اور کفر ومعاصی جہنم رسید کرنے والے ہیں یعنی اول انسان کے لئے مفید اور ثانی مضر اعمال ہیں۔ اسی طرح بچے کا زندہ رہنا انسان کو پسند ہے اور مرجانا ناپسند ہے۔ بہرحال یہ سب باتیں اللہ کی طرف سے طے شدہ ہیں اور ان پر ایمان لانا اور عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ کائناتی چیزوں کی حد تک ہر شخص تقدیر الٰہی کا قائل بھی ہے اور اس کا پابند بھی ہے۔ لوگ بڑی قیمت ادا کر کے گھی خریدتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں اور زہر کے پاس بھی کوئی نہیں پھٹکتا نہ کسی کو اس معاملہ میں تقدیر الٰہی پر اعتراض ہے۔ مگر جب ایمان واعمال صالحہ اور کفر واعمال طالحہ کا معاملہ آتا ہے تو انسان طرح طرح کی باتیں نکالتا ہے اور اس کا بچہ فوت ہوجاتا ہے تو جزع وفزع کی حد کردیتا ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ بدکار آدمی کفر ومعاصی کے ساتھ جنت نشیں بننا چاہتا ہے مگر کانٹے بو کر پھل کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے! اور جو چاہتا ہے کہ اس کا لاڈلا نہ مرے وہ درحقیقت اپنی مرضی مولیٰ کی مرضی پر غالب کرنا چاہتا ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے؟

تقدیر کی ضرورت: اللہ تعالیٰ مختار کل ہیں۔ وہ جو چاہیں کائنات میں تصرف کرسکتے ہیں اور وہ اپنے چاہنے میں کسی کے پابند نہیں ہیں۔ وہ اپنی مشیت میں ہر طرح آزاد ہیں۔ مگر یہ ان کا مخلوقات پر فضل وکرم ہے، اور انسان کے لئے جس کو خلافت ارضی سونپی گئی ہے ضروری بھی ہے کہ انھوں نے اپنی مشیت کو آزاد اور بے قید نہیں رکھا، بلکہ ہر چیز کو تقدیر الٰہی سے وابستہ کردیا ہے۔ کوئی امر منتظر نہیں رکھا، ہر بات طے شدہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتے تو انسان بڑی الجھنوں میں پڑ جاتا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا کہ وہ کیا کھائے اور کیا نہ کھائے، کیونکہ نتیجہ معلوم نہیں۔ اس کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کس چیز کے کیا آثار ظاہر فرمائیں گے، کیونکہ آثار ونتائج طے شدہ نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ اندھیرے میں ہوتا کہ وہ کونسی زندگی اپنائے جس سے مولیٰ خوش ہو اور کیسی زندگی اپنانے سے احتراز کرے تاکہ مولیٰ ناخوش نہ ہوں وہ ہمیشہ شش وپنج میں مبتلا رہتا، کوئی فیصلہ نہ کرپاتا، کیونکہ کوئی بات طے شدہ نہیں ہے۔ اور اب جبکہ سب باتیں طے پاگئی ہیں، انسان ہر چیز کے متعلق آسانی سے فیصلہ کرسکتا ہے۔ عقل کی روشنی یا معمولی راہ نمائی بھی اس کے لئے کافی ہے، اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہر چیز کے بارے میں عقل سے کام لینے اور اس میں غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر زندگی اور کائنات کے لئے کوئی قانون یا نظام ہی نہ ہوتا اور یہ سب کچھ بے قید مشیت ایزدی کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوتا

تو پھران میں غور وفکر کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور اگر کوئی غور وفکر کرتا بھی تو اس کا حاصل کیا ہوتا؟!

تقدیر کا دائرہ: کائنات خواہ ارضی ہو یا سماوی، اس کا کوئی ذرہ اور اس کا کوئی حال تقدیر کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اور تقدیر صرف اجمالی نہیں، بلکہ جملہ تفصیلات کے ساتھ طے شدہ ہے یعنی تقدیر میں صرف مسببات ومعمولات ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے اسباب وعلل بھی ہیں۔ ایک صحابی نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ آپؐ کیا ارشاد فرماتے ہیں اس بارے میں کہ وہ جھاڑ پھونک جس کو ہم (دکھ درد میں) استعمال کرتے ہیں اور وہ دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں اور وہ پرہیز (اور بچاؤ کی تدبیریں) جس کو ہم اپناتے ہیں، کیا یہ چیزیں قضاء وقدر کو لوٹا سکتی ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا: ''یہ سب چیزیں بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں'' (رواہ الترمذی وابن ماجہ واحمد، مشکوٰۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۹۷) رسول اللہ ﷺ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جو تدبیریں اور کوششیں کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں جن اسباب کو استعمال کرتے ہیں، وہ سب بھی اللہ کی قضاء وقدر کے ماتحت ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ مقدر ومقرر ہے کہ فلاں شخص پر فلاں بیماری آئے گی اور فلاں قسم کی جھاڑ پھونک یا فلاں دواء کے استعمال سے وہ اچھا ہو جائے گا (معارف الحدیث ۱:۱۷۱)

دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''ہر چیز تقدیر سے ہے، یہاں تک کہ آدمی کا ناکارہ (نا قابل) ہونا اور ہوشیار ہونا (رواہ مسلم۔ حوالہ بالا حدیث نمبر ۸۰) مطلب یہ ہے کہ آدمی کی صفات: قابلیت ونا قابلیت، صلاحیت وعدم صلاحیت اور عقل مندی وبے وقوفی وغیرہ بھی اللہ کی تقدیر ہی سے ہیں۔ الغرض اس دنیا میں جو کوئی جیسا اور جس حالت میں ہے وہ اللہ کی قضاء وقدر کے ماتحت ہے (معارف الحدیث ۱:۱۷۳)

اسی طرح مکلف مخلوقات کے جملہ احوال بھی قضاء وقدر کے دائرہ میں ہیں یعنی یہ طے کر دیا گیا ہے کہ جن وانس ایک جزوی اختیار رکھنے والی مخلوقات ہوں گی اور ان میں سے فلاں فلاں اپنے کسب واختیار سے یہ یہ عمل کر کے جنت میں جائیں گے اور اتنے افراد یہ یہ عمل کر کے جہنم میں جائیں گے اور دیگر مخلوقات کے لئے جزوی اختیار بھی نہیں ہوگا اس لئے وہ پاداش عمل کے قانون سے مستثنیٰ رہیں گی۔ غرض سب احوال اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ تقدیر الٰہی میں طے شدہ ہیں۔

تقدیر کا مسئلہ آسان ہے: اور تقدیر کا مسئلہ آسان ہے۔ اس میں کچھ پیچیدگی نہیں۔ یہ مسئلہ نصاریٰ کی تثلیث کی طرح نہیں ہے، جس کا راز آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا نہ آئندہ سمجھ سکے گا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا ایمانیات میں شامل ہے۔ تقدیر پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اور ایمان کا مکلف ہر عاقل وبالغ ہے اور سب لوگوں کی عقلیں یکساں نہیں ہیں۔ پس کوئی ایسا مسئلہ ایمانیات میں کیسے شامل کیا جا سکتا ہے جو ہر ایک کے لئے قابل فہم نہ ہو، ورنہ بعض لوگوں کے حق میں تکلیف مالا یطاق لازم آئے گی، جو باطل ہے پس لامحالہ یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ تقدیر کا مسئلہ ہر کس وناکس کے لئے قابل فہم ہے، کیونکہ یہ کوئی دقیق مسئلہ نہیں ہے اور ترمذی شریف (۲:۳۵) کی

روایت میں جو تقدیر کے باب میں تنازع کی ممانعت آئی ہے اور اس معاملہ میں تنازع کی وجہ سے امم سابقہ کے ہلاک ہونے کا ذکر آیا ہے۔ اس حدیث میں تنازع سے مراد بحث ومباحثہ ہے اور قضاء وقدر میں بحث ممنوع اس لئے ہے کہ یہ خدا کی صفات میں بحث ہے، کیونکہ قضاء وقدر اللہ کی صفت ہے، اور صفات میں بحث کی ذات میں غور وفکر ہے اور خالق میں غور کرنے کی ممانعت آئی ہے جیسا کہ صفات کے بیان میں گذرا۔

اور سابقہ امتوں کے ہلاک ہونے سے مراد غالباً ان کی گمراہی ہے۔ قرآن وحدیث میں ہلاکت کا لفظ گمراہی کے لئے بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس بناء پر آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اگلی امتوں میں اعتقادی گمراہیاں اُس وقت آئیں جب انھوں نے اِس مسئلہ کو حجت وبحث کا موضوع بنایا—— تاریخ شاہد ہے کہ امت محمدیہ میں بھی اعتقادی گمراہیوں کا سلسلہ اسی مسئلہ سے شروع ہوا ہے'' (معارف الحدیث ۱:۱۷۵)

تقدیر کا مسئلہ مشکل کیوں بن گیا ہے؟: اور تقدیر کا مسئلہ دو وجہ سے مشکل بن گیا ہے۔

پہلی وجہ: یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تقدیر کا مسئلہ درحقیقت صفات باری تعالیٰ کا مسئلہ ہے۔ اور صفات الٰہیہ کو ایک حد تک ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی تمام حقیقت جاننا انسان کے بس کی بات نہیں۔ صفات کے باب میں ایک حد تک پہنچ کر رُک جانا پڑتا ہے۔ اسی طرح تقدیر کے مسئلہ میں بھی ایک حد پر رکنا ضروری ہے، مگر لوگ رُکتے نہیں، سب کچھ سمجھنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ بات صفات کے تعلق سے ممکن نہیں۔ یہی بات درج ذیل حدیث میں سمجھائی گئی ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا دوزخ کا اور جنت کا لکھا جا چکا ہے'' (بس تقدیر کا مسئلہ اتنا ہی ہے) صحابہ نے عرض کیا: تو کیا ہم اس نوشتہ پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں اور عمل نہ چھوڑ دیں؟! (یہ تقدیر کے مسئلہ پر اٹھنے والا سوال ہے) آپؐ نے فرمایا: ''عمل کئے جاؤ، ہر ایک کے لئے وہی عمل آسان کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے: نیک بخت کو نیک بختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے اور بد بخت کو بدبختی کے کاموں کی۔ اور دلیل میں آپؐ نے سورۃ اللیل کی آیات ۵-۱۰ پیش فرمائیں (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۸۵)

اس حدیث میں آنحضور ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سوال کا جواب نہیں دیا، بلکہ ان کو عمل میں لگایا ہے۔ کیونکہ قضاء وقدر کے مسئلہ کو جس حد تک آپؐ نے بیان فرمایا ہے، اسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے اس سے آگے کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ اس حد پر رک جانا ضروری ہے۔ تمام صفات خداوندی کا یہی معاملہ ہے۔

رہی یہ بات کہ تقدیر کا مسئلہ صفات الٰہیہ کا مسئلہ کیسے ہے؟ تو یہ بات اس سے واضح ہے کہ عرف میں قضاء وقدر ایک ساتھ بولتے ہیں۔ یہ دو مترادف لفظوں کا عطف تفسیری کے ساتھ استعمال ہے۔ اور ''قضا'' کا صفت الٰہی ہونا قرآن کریم میں بیسوں جگہ مذکور ہے۔ مثلاً ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ (بنی اسرائیل ۲۳) اور سورۃ الاحزاب آیت ۳۸ میں ہے ﴿وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا﴾ (اور اللہ کا حکم (پہلے سے) تجویز کیا ہوا ہے) ان آیات سے قضاء

وقدر کا صفت الٰہی ہونا صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔

دوسری وجہ: ہماری صفات مفہوم کے اعتبار سے ہماری ذوات سے زائد (مغائر) ہیں اور وجود کے اعتبار سے متحد۔ اسی طرح ہماری متعدد صفات اپنے اپنے مفاہیم کے اعتبار سے جدا جدا ہیں، مگر سب ذات کے وجود میں شامل ہیں یعنی صفات، ذات کے ساتھ مل کر ایک اکائی (Unit) بناتی ہیں۔ یہی حال بلاتشبیہ ذات رب اور صفات الٰہیہ کا ہے۔ اور ہر صفت کا اپنا ایک دائرۂ کار ہے، جیسے صفت سمع کا دائرہ الگ ہے اور صفت بصر کا الگ۔ مگر کبھی ایک صفت کے دوسری صفت پر اثرات بھی پڑتے ہیں۔ اگر ان سب باتوں کو باریک بینی سے ملحوظ نہ رکھا جائے تو حقائق فہمی میں دشواری پیش آتی ہے۔ مثلاً خداوند قدوس کے تعلق سے اگر تقدیر معلق کا قائل ہوا جائے تو شمول علم کے مسئلہ پر اس کا اثر پڑے گا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ کا علم عام و تام نہیں۔ حالانکہ شمول علم کے مسئلہ میں آج تک کسی فرقہ نے اختلاف نہیں کیا۔ اسی طرح بندوں کو ان کے اختیاری اعمال میں مختار کامل مانا جائے تو عمومِ قدرت کے مسئلہ پر اثر پڑے گا۔ ماننا پڑے گا کہ کچھ چیزیں اللہ کے اختیار میں نہیں ہیں، بندوں کے اختیار میں ہیں۔ توبہ! ایسی حماقت بھری بات کون مان سکتا ہے۔

اسی طرح لوگ قضاء وقدر کے مسئلہ کو شمولِ علم کے مسئلہ کے ساتھ رَلا دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم ہے کہ ایسا ہونا ہے تو ویسا ہونا ضروری ہے، کیونکہ اللہ کا علم غلط نہیں ہوسکتا۔ پھر بندے بااختیار کیسے ہوئے؟ وہ تو مجبور محض ہوگئے! دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟! حالانکہ سوچنے کا انداز یہ ہونا چاہئے تھا کہ اگر ازل میں سب چیزوں کو طے شدہ نہیں مانیں گے تو شمول علم کی بات غلط ہوکر رہ جائے گی۔ جب کائنات کے ذرہ ذرہ پر اللہ کا علم محیط ہے تو ضروری ہے کہ ہر چیز ازل سے طے شدہ ہو، ورنہ اللہ کو ان کا علم کیسے ہوگا؟! غرض صفات کا دائرۂ کار ملحوظ نہ رکھنے سے اور ایک صفت کے دوسری صفت پر پڑنے والے اثرات کا خیال نہ رکھنے سے تقدیر کا مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ اس ضروری تفصیل کے بعد اب کتاب کے مضامین شروع کئے جاتے ہیں۔

تقدیر پر ایمان لانے کی اہمیت اور اس کے فوائد

تقدیر پر ایمان لانا افضل اعمال برّ سے ہے کیونکہ نیکی کے کاموں میں سب سے افضل ایمانیات ہیں اور ان میں بھی سب سے افضل توحید پر ایمان لانا ہے اور اسی کے درجہ میں اللہ کی صفات پر ایمان لانا ہے اور قضاء وقدر بھی اللہ کی ایک صفت ہے، پس اس پر ایمان لانا بھی بہترین نیک کام ہے۔

اور ایمانیات اعمال کے دائرہ میں اس طرح آتے ہیں کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں: اعمال قلب اور اعمال جوارح۔ اللہ کی ذات پر، ان کے بے ہمہ ہونے پر، ان کی صفات پر اور ملائکہ وانبیاء وغیرہ پر ایمان لانا اعمال قلبی میں سے ہے۔ اسی بنا پر حدیث جبرئیل میں اسلام کے بارے میں سوال کے جواب میں سب سے پہلے توحید ورسالت کی گواہی کو ذکر کیا

گیا ہے جو اعمال قلب میں سے ہے۔ پھر دیگر اعمال اربعہ ذکر کئے گئے ہیں جو اعمال جوارح میں سے ہیں۔

اور تقدیر پر ایمان کے تین اہم فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: تقدیر پر ایمان کے ذریعہ آدمی اس ہم آہنگ نظم و انتظام کو سمجھ سکتا ہے جو ساری کائنات میں جاری ہے یعنی وہ جان لے گا کہ تمام کائنات ایک منظم و متحد قانون کی پابند ہے۔ کائنات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے برتاؤ میں پوری طرح یگانگت ہے۔ سرِ مو تفاوت نہیں۔

دوسرا فائدہ: جس شخص کا تقدیر الٰہی پر ٹھیک ٹھیک ایمان ہوگا کہ ہر چیز ازل سے طے شدہ ہے، کوئی امر منتظر نہیں، ہر بات فیصل ہو چکی ہے، اس کی نگاہ اللہ کی قدرت کاملہ کی طرف اٹھی رہے گی۔ وہ دنیا و مافیہا کو خدا کا پرتو سمجھے گا۔ وہ جان لے گا کہ ہر چیز قضاء و قدر سے ہے حتی کہ اختیاری اعمال میں بھی بندوں کو جو اختیار حاصل ہے وہ اللہ کی دین ہے، انھوں نے ہی ازل میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ مکلف مخلوقات کو ایک جزوی اختیار حاصل ہو، اسی فیصلہ کی وجہ سے بندے مختار ہیں اور بندوں کا حال اس معاملہ میں ایسا ہے جیسا آئینہ میں منعکس ہونے والی صورت کا ہے کہ وہ ذی صورت کا پرتو اور ظل ہے۔ اسی طرح بندوں کو اختیار بھی خالق ارض و سماء کی طرف سے ملا ہے۔ اور جب بندہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین رکھے گا اور خود کو "مردہ بدست زندہ" سمجھے گا تو وہ ہر معاملہ پر مطمئن ہوگا۔ کسی معاملہ میں اس کو کوئی غیر معمولی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ وہ ہر حالت کو اللہ کی طرف سے سمجھے گا ﴿قُلْ: كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللهِ، فَمَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَايَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا؟﴾ (النساء ٧٨) ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہوا کہ وہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے!

تیسرا فائدہ: جس طرح دیدار خداوندی آخرت میں نصیب ہوگا مگر اس کی تیاری نمازوں کی پابندی کے ذریعہ اسی دنیا میں کرنی ہوتی ہے، جیسا کہ متفق علیہ حدیث میں آیا ہے (دیکھئے مشکوۃ شریف، کتاب احوال القیامہ، باب رؤیۃ اللہ کی پہلی حدیث نمبر ٥٦٥٥) اسی طرح تقدیر پر ایمان آدمی میں رفتہ رفتہ استعداد پیدا کرتا ہے کہ وہ خدا کی یکساں اور ہم آہنگ تدبیر وحدانی کو سمجھ سکے، گو کہ اس کا انکشاف تام آخرت میں ہوگا، مگر اس کی صلاحیت ابھی سے پیدا کرنی ضروری ہے۔ اور وہ تقدیر پر ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں تقدیر پر ایمان کی اہمیت درج ذیل دو حدیثوں سے بھی واضح ہے:

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "جو شخص بھلی بری تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا، میں اس سے بیزار ہوں" اور جس سے اللہ کے رسول بیزار و بے تعلق ہو جائیں، اس کا کہاں ٹھکانہ؟! یہ حدیث مجمع الزوائد (٢٠٦:٧) میں بحوالہ مسند ابی یعلی مروی ہے اور اس کی سند میں ایک خارجی راوی ہے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوتا تا آنکہ وہ بھلی بری تقدیر پر

ایمان نہ لائے اور تا آنکہ وہ جان نہ لے کہ جو کچھ اس کو پہنچا ہے، وہ اس کو چوک جائے ایسا نہیں ہوسکتا اور یہ بات بھی جان لے کہ جو کچھ اس کو چوک گیا ہے (یعنی نہیں پہنچا ہے) وہ اس کو پہنچ جائے ایسا نہیں ہوسکتا'' یہ حدیث ترمذی شریف (۳۷:۲) ابواب الایمان بالقدر میں ہے اور اس کی سند میں ایک نہایت ضعیف راوی ہے۔

مگر ان روایات کی تائید اُس واقعہ سے ہوتی ہے جو مسلم شریف میں مذکور ہے۔ مشہور تابعی، مَرُو کے قاضی یحییٰ بن یَعْمَر کہتے ہیں کہ بصرہ میں تقدیر کا انکار کرنے والا سب سے پہلا شخص مَعْبَد جُهَنِی (مقتول ۸۰ھ) تھا۔ پس میں اور حمید بن عبدالرحمٰن حِمْیَری حج کے ارادے سے یا عمرہ کے ارادہ سے چلے۔ اور دل میں یہ تھا کہ اگر ہماری کسی صحابی سے ملاقات ہوئی تو ان سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کریں گے جو تقدیر کا انکار کرتے ہیں۔ پس توفیق خداوندی سے ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہوگئی، جبکہ وہ مسجد میں داخل ہورہے تھے۔ پس میں اور میرا ساتھی ان کے دائیں بائیں ہوگئے۔ اور میں نے یہ خیال کیا کہ میرا ساتھی مجھی کو بات کرنے کا ذمہ دار بنائے گا، اس لئے میں نے عرض کیا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! (ابن عمر کی کنیت ہے) ہمارے علاقہ میں کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں جو قرآن کریم پڑھتے ہیں اور علم تلاش کرتے ہیں — اور یحییٰ نے ان کی اور بھی تعریف کی — مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ: ''تقدیر نہیں ہے، معاملہ اچھوتا ہے'' (ان لوگوں کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟) حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:

''جب تمہاری ان لوگوں سے ملاقات ہو تو ان کو بتلانا کہ میں ان سے بے تعلق ہوں۔ اور ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان میں سے اگر کوئی شخص اُحد پہاڑ کے بقدر سونا خرچ کرے تو بھی قبول نہیں کیا جائے گا تا آنکہ وہ تقدیر پر ایمان لائے۔ (پھر آپؓ نے حدیث جبرئیل سنائی جس میں تقدیر پر ایمان کو ایمانیات میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ حدیث مسلم شریف میں کتاب الایمان کی پہلی حدیث ہے)

اس واقعہ سے دونوں روایتوں کے مضمون کی پوری تائید ہوتی ہے، اس لئے سند کا ضعف مضر نہیں۔

﴿ باب الإيمان بالقدر ﴾

من أعظم أنواع البر: الإيمان بالقدر؛ وذلك: أنه به يُلاحِظُ الإنسانُ التدبيرَ الواحدَ الذي يَجمعُ العَالَمَ؛ ومن اعتقده على وجهه يصير طامحَ البصر إلى ما عند الله، يرى الدنيا ومافيها كالظلِّ له، ويرى اختيار العباد من قضاء الله كالصورة المنطبِعَة في المرآة، وذلك مُعِدٌّ له لانكشاف ما هنالك من التدبير الوَحْدَانيِّ — ولو في المعاد — أتم إعدادٍ، وقد نبَّهَ صلى الله عليه وسلم على عِظَمِ أمره من بين أنواع البر، حيث قال: ﴿من لم يؤمن بالقدر خيره وشره فأنا برئ منه﴾ وقال صلى الله عليه وسلم: ﴿ لايؤمن عبد حتى يؤمن بالقدر خيرِه وشره، وحتى يعلمَ أن ما أصابه لم يكن لِيُخطِئَهُ، وأن ما أَخطَأَهُ لم يكن لِيُصِيبَهُ﴾

ترجمہ: تقدیر پر ایمان لانے کا بیان: نیکی کی عظیم ترین انواع میں سے تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اُس تدبیر واحد کو پیش نظر لا سکتا ہے جو تمام عالم کو اکٹھا کرنے والی ہے۔ اور جو شخص صحیح طور پر تقدیر پر ایمان رکھتا ہے وہ اس چیز کی طرف نگاہ اٹھانے والا ہو جاتا ہے جو اللہ کے پاس ہے (یعنی اللہ کے اختیار کی طرف) وہ دنیا ومافیہا کو اللہ کے ظل (سایہ اور پرتو) کی طرح دیکھتا ہے۔ اور بندوں کو اللہ کے فیصلے سے جو اختیار ملا ہے اس کو اُس صورت کے مانند دیکھتا ہے جو آئینہ کے اندر منعکس ہوتی ہے۔ اور تقدیر پر ایمان آدمی کو پوری طرح تیار کرنے والا ہے اُس تدبیر وحدانی کے منکشف ہونے کے لئے جو وہاں (اللہ کے پاس) ہے گو کہ وہ انکشاف آخرت میں ہو۔ اور نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے آگاہ کیا ہے نیکی کی انواع میں سے تقدیر کے معاملہ کی اہمیت پر، چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص بھلی بری تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا، میں اس سے بری (بے تعلق) ہوں'' اور فرمایا: ''کوئی بندہ مؤمن نہیں ہوتا تا آنکہ وہ بھلی بری تقدیر پر ایمان لائے اور تا آنکہ وہ جان لے کہ جو کچھ اس کو پہنچا ہے وہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو چوک جائے اور یہ کہ جو اس کو چوک گیا ہے، وہ اس کو پہنچ جائے ایسا نہیں ہو سکتا''

تصحیح: ذلك مُعِدٌّ له اصل میں ذلك يُعِدُّ له تھا۔ یہ تصحیف ہے، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

تقدیر الٰہی کے پانچ مدارج ومظاہر

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لی جائے کہ لوگ شمولیت علم کے مسئلہ کو تقدیر الٰہی کے مسئلہ کے ساتھ رَلا دیتے ہیں۔ اس لئے عمومیت علم کے مسئلہ کو الگ کر لیا جائے۔ علم الٰہی کی عمومیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل میں اپنے علم ذاتی سے ان تمام حوادث (نو پید چیزوں) کو جانتے تھے جو اب تک موجود ہو چکے ہیں یا جو آئندہ موجود ہوں گے۔ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر رہ جائے یا کوئی ایسی چیز وجود میں آئے جس کو وہ ازل میں نہیں جانتے تھے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ اللہ کا جہل شمار ہوگا، علم نہیں۔ اور علم اللہ کی ذاتی صفت ہے، پس اس کی ضد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شمولیت علم کا مسئلہ ہے، قضاء وقدر کا مسئلہ نہیں اور اسلامی فرقوں میں سے کسی بھی فرقہ کو اس میں اختلاف نہیں۔

اور تقدیر الٰہی یعنی ازلی فیصلہ خداوندی کا مسئلہ جس پر احادیث مشہورہ دلالت کرتی ہیں اور جو سلف صالحین کا عقیدہ رہا ہے اور جس کو سمجھنے کی توفیق صرف علمائے محققین کو ملی ہے اور جس پر یہ اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ تقدیر اور تکلیف ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ جب سب کچھ طے ہو چکا ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ وہ قدر ملزم ہی کا مسئلہ ہے یعنی خدا کا وہ ازلی فیصلہ جو حوادث (نو پید چیزوں) کے رونما ہونے سے پہلے، ان کے ہونے کو لازم کرنے والا ہے۔ پھر اس فیصلہ خداوندی کے واجب کرنے کے مطابق ہی حوادث رونما ہوتے ہیں۔ اور ان کا پایا جانا ایسا ہے کہ نہ تو کوئی بھاگ کر اس سے بچ سکتا ہے، نہ کوئی حیلہ کارگر ہو سکتا ہے۔

یہ تقدیر الٰہی پانچ مرتبہ واقع ہوئی ہے یعنی پانچ مراحل میں ظاہر ہوئی ہے۔ جس طرح حویلی بنانے والا پہلے انجینئر سے نقشہ بنواتا ہے۔ انجینئر پہلے ذہن میں خاکہ بناتا ہے، پھر اس ذہنی خاکہ کے مطابق کاغذ پر نقشہ بناتا ہے۔ پھر معمار اس نقشہ کے مطابق موقعہ پر محل تیار کرتا ہے، اسی طرح بلاتشبیہ تقدیر الٰہی کے بھی پانچ مختلف مراحل ومظاہر ہیں۔ پہلی مرتبہ: اللہ کے علم ازلی میں تمام چیزوں کے اندازے ٹھہرائے گئے ہیں، دوسری مرتبہ: تخلیق ارض وسماء سے پچاس ہزار سال پہلے عرش کی قوت خیالیہ میں سب چیزیں موجود ہوئی ہیں، تیسری مرتبہ: تخلیق آدمؑ کے بعد جب عہد الست لیا گیا ہے اس وقت تقدیر کا تحقق ہوا ہے۔ چوتھی مرتبہ: شکم مادر میں جب روح پڑنے کا وقت آتا ہے تو تقدیر کا ایک گونہ تحقق ہوتا ہے اور پانچویں مرتبہ: دنیا میں واقعہ رونما ہونے سے کچھ پہلے تقدیر پائی جاتی ہے۔ تقدیر کے یہ مراحل خمسہ انسانوں اوران کے احوال سے متعلق ہیں۔ دیگر مخلوقات کا حال اس سے مختلف ہوسکتا ہے مذکورہ مدارج خمسہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

① تقدیر کا پہلا مرحلہ: ازل میں جبکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ آسمان وزمین، عرش وکرسی، ہوا اور پانی میں سے کوئی بھی چیز پیدا نہیں کی گئی تھی، جیسا کہ بخاری شریف (۴۵۳:۱) میں آیا ہے کہ کان اللّٰہ ولم یکن شیئٌ غیرہ یعنی صرف اللہ کی ذات تھی اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس دور ازل میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ عالَم کو تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے اور حوادث کے وجود کے وقت جو خیر اضافی ہوگی اس کو ترجیح دیتے ہوئے، بہتر سے بہتر ممکن صورت میں پیدا کریں گے، جس واقعہ کو جس وقت میں رونما کرنا عالم کی مصلحت ہوگی اور جس چیز میں زیادہ بہتری ہوگی اس اضافی خیریت کا واقعات کو وجود پذیر کرنے میں لحاظ رکھا جائے گا۔ اور یہ سب باتیں کلی شکل میں نہیں بلکہ ہر ہر جزئی امر الگ الگ علم الٰہی میں متعین ہوگیا تھا، چنانچہ حوادث (نئے پیدا ہونے والے تمام امورؔ) مرتب طور پر سلسلہ وار علم الٰہی میں موجود ہوچکے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ کا؛ جن پر کوئی امر مخفی نہیں، ایجاد عالم کا ارادہ کرنا ہی حوادث کے موجود ہونے کی صورت کی تخصیص وتعیین ہے یعنی اب جو معین باتیں معین وقت میں رونما ہورہی ہیں اس کی علت وہی ازلی تخصیص وتعیین ہے اسی طرح ابد تک کے تمام واقعات وحوادث ازل میں اللہ تعالیٰ نے فیصل فرمادیئے ہیں۔ یہی تقدیر الٰہی کا پہلا مرحلہ اور اس کا ابتدائی ظہور ہے۔

اور تقدیر کے اس پہلے مرحلہ کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں، بس اتنی بات کافی ہے کہ قضاء وقدر اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی تمام صفات ازلی قدیم ہیں پس قضائے خداوندی یعنی کائنات کے بارے میں تمام فیصلے بھی ازل میں ہوچکے ہیں۔ اور صرف اجمالاً کلی طور پر نہیں، بلکہ ہر امر جزئی طور پر مشخص ہوچکا ہے، اور اس کے لئے بس اتنی دلیل کافی ہے کہ اللہ کی تمام صفات، صفات کمالیہ ہیں کسی صفت میں نقص نہیں، پس جس طرح ازل میں اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا تفصیلی علم ہے اسی طرح قضاء وقدر کا معاملہ بھی ہے۔

واعلم: أن اللّٰہ تعالی شَمَلَ علمُہ الأزليُّ الذاتي کلَّ ما وُجد أو سیوجد من الحوادث، مُحالٌ

أن يتخلف علمه عن شيئ، أو يتحقق غيرُ ما عَلِمَ، فيكون جهلاً لاعلمًا.

وهذه مسألةُ شمولِ العلم، وليست بمسألة القدر، ولايُخالف فيها فرقةٌ من الفِرَق الإسلامية؛ إنما القدرُ الذى دلّت عليه الأحاديث المستفيضة، ومضى عليه السلف الصالح، ولم يوفَّق له إلا المحققون، ويتّجهُ عليه السؤالُ: بأنه متدافع مع الكتليف، وأنه فيم العملُ؟: هو القدرُ المُلزِمُ الذى يوجب الحوادثَ قبل وجودها، فيوجَد بذلك الإيجاب، لايدفعُه هَرَبٌ، ولاتنفع منه حيلةٌ.

وقد وقع ذلك خمس مرات:

فأولها: أنه أجمع في الأزل أن يوجِد العالَمَ على أحسنِ وجهٍ ممكنٍ، مراعيًا للمصالح، مُؤْثِرًا لما هو الخيرُ النِّسْبِيُّ حين وجوده، وكان علم الله ينتهي إلى تعيين صورة واحدة من الصور، لايشاركها غيرُها، فكانت الحوادثُ سلسلةً مترتبة مجتمعا وجودُها، لاتصدق على كثيرين، فإرادةُ إيجادِ العالَم ممن لاتخفى عليه خافيةٌ هو بعينه تخصيصُ صورةٍ وجودِه، إلى آخر ما ينجر إليه الأمر.

ترجمہ: اور جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ذاتی شامل ہے تمام اُن حوادث (نو پید چیزوں) کو جو موجود ہو چکے ہیں یا آئندہ موجود ہوں گے، محال ہے یہ بات کہ اس کا علم کسی چیز سے پیچھے رہ جائے یا پائی جائے کوئی ایسی چیز جس کو وہ نہ جانتے ہوں، پس وہ جہل ہوگا، علم نہیں۔

اور یہ اللہ کے علم کی عمومیت کا مسئلہ ہے، قضاء وقدر کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور اس میں اسلامی فرقوں میں سے کسی بھی فرقے کا اختلاف نہیں ہے۔ تقدیر کا مسئلہ جس پر احادیث مشہورہ دلالت کرتی ہے اور جس پر سلف صالحین کا عقیدہ رہا ہے اور جس کو سمجھنے کی توفیق بس علمائے محققین ہی کو ملی ہے اور جس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تقدیر، تکلیف سے متخالف ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ وہ خدا کا لازم کرنے والا فیصلہ ہی ہے جو حوادث کے ہونے سے پہلے اُن کے ہونے کو ثابت کرنے والا ہے۔ پھر حوادث پائے جاتے ہیں اس ثابت کرنے کی وجہ سے، نہ تو بھاگنا اُن واقعات کو ہٹا سکتا ہے اور نہ ان سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ مفید ہے۔

اور وہ تقدیر پانچ مرتبہ واقع ہوئی ہے:

پس ان میں سے پہلی بار: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں یہ قرار دیا کہ وہ جہاں کو پیدا کریں گے بہتر سے بہتر ممکن صورت پر، مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے اور عالم کے پائے جانے کے وقت جو خیر اضافی ہوگی اس کو ترجیح دیتے ہوئے۔ اور اللہ کا علم (ازل میں) پہنچ گیا تھا مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت کی تعیین تک، اس کے ساتھ اس

کے علاوہ صورت شریک نہیں تھی (یعنی کلی طور پر نہیں، بلکہ ازل میں اللہ تعالیٰ آئندہ پائی جانے والی ایک ایک جزئی کو علحدہ علحدہ جانتے تھے) پس حوادث (نو پید چیزیں) سلسلہ وار، بالترتیب، ان کا وجود ایک ساتھ (علم ازلی میں) تھا، وہ حوادث کثیرین پر صادق نہیں آتے تھے (یعنی وہ جزئیات تھے، کلیات نہیں تھے) پس اُسی ہستی کا ایجادِ عالم کا ارادہ کرنا، جس پر کوئی ادنی امر مخفی نہیں ہے، وہی بعینہ وجود عالم کی صورت کی تخصیص و تعیین ہے۔ اس چیز کے آخر تک جس تک معاملہ کھنچتا چلا جائے (یعنی ابد تک)

لغات:

اِتَّجَهَ إليه: متوجہ ہونا...... مُتَدافِع (اسم فاعل) تَدَافَعَ القومُ: ایک دوسرے کو ہٹانا...... آثَرَهُ إيثارًا: فضیلت دینا، ترجیح دینا...... النِّسْبي أي بالنسبة إلى كذا یعنی فلاں چیز کے لحاظ سے، اضافی طور پر...... اِنْجَرَّ: کھچنا، گھسٹنا۔

☆ ☆ ☆

(۲) تقدیر کا دوسرا مرحلہ: پھر ایک وقت آیا، جبکہ پانی اور عرش پیدا کئے جاچکے تھے، مگر ابھی زمین و آسمان پیدا نہیں کئے گئے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کے دوبارہ اندازے ٹھہرائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تمام مخلوقات کے اندازے، پہلے ازلی اندازے کے مطابق لکھ دئے۔ اور لکھنے کا مطلب بھی وہی اندازہ ٹھہرانا ہے۔ عربی زبان میں کسی چیز کے طے کرنے اور معین و مقرر کرنے کو بھی کتابت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں روزہ کی فرضیت کو ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ سے، اور قصاص کے حکم کو ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور کتابت تقدیر کے سلسلہ میں روایات میں جو لوح و قلم وغیرہ کا ذکر آیا ہے وہ سب غیر معتبر روایات ہیں، اور اسرائیلیات سے مأخوذ ہیں۔ کتاب کی قسم دوم کے شروع میں، ابواب الایمان کی روایات کی تشریح کے آخر میں، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

اور یہ دوسری مرتبہ اندازہ ٹھہرانے کا واقعہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے پیش آیا ہے۔ اس سے واقعی مدت بھی مراد ہوسکتی ہے اور بہت طویل زمانہ بھی مراد ہوسکتا ہے۔ عربی محاروات میں یہ استعمال بھی شائع ذائع ہے۔

اور اس دوسرے مرحلہ میں مقادیر کا اندازہ ٹھہرانے کی صورت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ازلی مہربانی اور عنایت سے ازل میں اپنے علم میں عالم کے لئے پہلی بار اندازہ ٹھہرایا تھا، اسی کے موافق تمام مخلوقات کو عرش کی قوت خیالیہ میں پیدا کر دیا، وہاں تمام صورتوں کو متشکل کر دیا۔ عرش کی اس قوت خیالیہ کو وحی کی زبان میں الذکر (الانبیاء ۱۰۵) کتاب مبین (الانعام ۵۹) امام مبین (یٰس ۱۲) ام الکتاب (الرعد ۳۹) اور لوح محفوظ (البروج ۲۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور لوح محفوظ اور عرش کے بارے میں یہ تصورات کہ وہ کوئی لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں از قبیل جمادات ہونگی، یہ محض عوامی تصورات ہیں۔ اور اسی تصور نے استواء علی العرش کے مسئلہ میں الجھن پیدا کی ہے۔ اس لئے یہ بات خاص طور پر یاد

رکھنی چاہئے کہ ہمارے اس مادی عالم سے پَرے جو غیر مادی چیزیں ہیں، اور جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے ان میں لفظی اشتراک کے علاوہ کچھ مناسبت نہیں اور ان کی حقیقت اور ہیئت کذائی کے بارے میں کوئی خیال باندھنا بھی درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کی حقیقت کو اور ان کی صحیح نوعیت کو بہتر جانتے ہیں۔

اور عرش کی قوت خیالیہ میں عالَم میں رونما ہونے والی تمام چیزیں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ مثلاً وہاں رسول اللہ ﷺ کی صورت، مخلوقات کی طرف آپ کی معین وقت میں بعثت کی صورت، آپ کے انذار وتبشیر کی صورت، ابولہب کے انکار کی صورت پھر اس کے دنیا میں ملعون اور آخرت میں معذب ہونے کی صورت۔ یہ سب صورتیں وہاں تفصیل سے موجود ہیں، جیسے موقعہ پر جو حویلی تیار کی جاتی ہے اس کی تمام تفصیلات کاغذی نقشہ میں موجود ہوتی ہے۔

اور تمام چیزوں کا یہ خیالی وجود عالَم میں واقعات کے رونما ہونے کا سبب ہے۔ جیسے کوئی شخص دیوار پر رکھی ہوئی کڑی پر چلے تو چونکہ پہلے سے ذہن میں گر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وہ عام طور پر گر پڑتا ہے۔ ذہن میں جو اندیشہ ہوتا ہے وہی پیر پھسلنے کا سبب بن جاتا ہے چنانچہ یہ کڑی اگر زمین پر رکھی ہوئی ہو اور اس پر آدمی چلے تو نہیں گرتا کیونکہ اس وقت ذہن میں پھسلنے کی صورت نہیں ہوتی جو اثر انداز ہو۔

> وثانيها: أنه قدَّر المقادير، ويُروى أنه كتب مقادير الخلائق كلَّها- والمعنى واحد- قبل أن يخلق السماوات والأرضَ بخمسين ألف سنةٍ، وذلك: أنه خلق الخلائق حسب العناية الأزلية في خيال العرش، فصوَّر هنالك جميعَ الصور، وهو المعبر عنه بالذكر في الشرائع، فتحقق هنالك مثلاً صورةُ محمدٍ صلى الله عليه وسلم، وبعثِه إلى الخلق في وقتِ كذا، وإنذارِه لهم، وإنكارِ أبي لَهَبٍ، وإحاطةِ الخطيئة بنفسه في الدنيا، ثم اشتعالِ النار عليه في الآخرة؛ وهذه الصورة سببٌ لحدوث الحوادث على نحوما كانت هنالك، كتأثير الصورة المنتَقَشَةِ في أنفسنا في زَلَق الرَّجل على الجِذْع الموضوع فوق الجُدران، ولم تكن لتزلَق لو كانت على الأرض.

ترجمہ: اور دوسری بار: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کا اندازہ کیا (یہ الفاظ مسلم وترمذی کی روایت میں ہیں الدر المنثور ۳:۳۲۲) اور یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے تمام اندازوں کو لکھ دیا (یہ روایت بھی مسلم شریف میں ہے) اور مطلب ایک ہے (یعنی لکھنے کا مطلب بھی اندازہ کرنا ہے) آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے۔ اور وہ یوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ازلی مہربانی کے مطابق عرش کے خیال میں تمام مخلوقات کو پیدا کیا، پس وہاں تمام صورتوں کو مصوّر کیا۔ اور اسی کو شرائع الٰہیہ میں "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس مثال کے طور پر وہاں

پائی گئی حضرت محمد ﷺ کی، آپ کے مخلوقات کی طرف فلاں وقت میں مبعوث ہونے کی، آپؐ کے لوگوں کو ڈرانے کی، اور ابولہب کے انکار کی، دنیا میں اس کے نفس کو گناہوں کے گھیرنے کی، پھر آخرت میں اس پر آگ کے بھڑکنے کی صورت۔ اور یہ صورت، حوادث (یعنی نئی وجود میں آنے والی باتوں) کے پیدا ہونے کا سبب ہے اسی طرح جس طرح عرش کے اندر موجود ہیں، جیسے دیواروں پر رکھی ہوئی کڑی پر (چلنے والے کے) پیر پھسلنے میں ہمارے دلوں میں منقش ہونے والی صورت کی اثر اندازی۔ اور اگر وہ کڑی زمین پر ہوتی تو پیر نہ پھسلتا۔

لغات:

مقادیر، مِقْدار کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں اندازہ...... تَحَقَّقَ الأمْرُ: ثابت ہونا، یک گونہ موجود ہونا...... حوادث، حادثة کی جمع ہے۔ اور یہ لفظ بار بار استعمال ہو رہا ہے۔ یہ اردو کا حادثہ نہیں ہے، بلکہ حَدَثَ(ن) حُدُوْثًا وَحَدَاثَةً سے اسم فاعل واحد مؤنث ہے جس کے معنی ہیں نو پید ہونا۔ پس اس عالم میں جو بھی بات رونما ہوتی ہے وہ حادثہ ہے۔ یہ معنی خوب ذہن نشین کر لئے جائیں...... المنتقَشة (اسم مفعول، واحد مؤنث) از اِنْتَقَشَ: نگینہ پر کندہ کرنے کا حکم دینا، نقش کئے جانے کا حکم دینا یہاں یہ لفظ بمعنی منقّش ہونے والی استعمال کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

(۳) تقدیر کا تیسرا مرحلہ: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تا کہ وہ ابوالبشر ہوں اور ان سے نسل انسانی کا سلسلہ چلے تو اللہ تعالیٰ نے عالم مثال میں ان کی تمام اولاد کو پیدا کیا۔ یہ تقدیر الٰہی کا تیسری بار ظہور ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ اور یہ زمانہ ''عہد الست'' کہلاتا ہے اور اس آیت کی تفسیر میں جو روایات آئی ہیں ان میں یہ بات مذکور ہے کہ تمام نیک اولاد موتیوں کی طرح چمک دار تھی اور تمام بری اولاد کوئلوں کی طرح سیاہ تھی۔ یہ روشنی اور تاریکی ان کی نیک بختی اور بد بختی کا پیکر محسوس ہے اور عہد الست میں تمام انسانوں کو ایسی عقل وفہم کی حالت میں پیدا کیا گیا تھا جو مکلّف ہونے کے لئے ضروری ہے۔ پھر ان کو معرفت خداوندی کا درس دیا گیا اور امتحان بھی لیا گیا۔ لوگ صد فی صد کامیاب ہوئے۔ سب نے اللہ کو پہچان لیا اور ان کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ اسی اقرار اور اسی عہد ومیثاق کی وجہ سے آخرت میں ان سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ یہ واقعہ تو انسانوں میں سے کسی کو بھی یاد نہیں۔ پھر اس کی وجہ سے مؤاخذہ کیسے درست ہے؟

جواب: بیشک یہ واقعہ لوگ بھول گئے ہیں۔ مگر اس درس سے حاصل ہونے والی استعداد یعنی خدا کی معرفت انسان میں موجود ہے، جس طرح ایک طالب علم ایک عرصہ پڑھ کر فارغ ہوتا ہے اور ایک وقت گذرنے کے بعد درس کی تمام تفصیلات بھول جاتا ہے مگر علمی استعداد بحالہ باقی رہتی ہے۔ اسی طرح انسان اس دنیا میں آ کر وہ واقعہ اگرچہ بھول گیا ہے مگر اصل استعداد باقی ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے'' اس میں فطرت سے مراد یہی معرفت

خداوندی ہے۔ کوئی خواہ خدا کا کیسا ہی انکار کرے، آڑے وقت اس کو بھی ایک مافوق الفطرت ہستی کی یاد آتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معرفتِ خداوندی اس کے گوشۂ دل میں موجود ہے، اسی کی بنیاد پر آخرت میں مؤاخذہ ہوگا۔

④ تقدیر کا چوتھا مرحلہ: شکم مادر میں جب جنین میں روح پھونکنے کا وقت آتا ہے اس وقت تقدیر الٰہی کا چوتھی بار ظہور ہوتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صادق ومصدوق رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان کیا کہ:

''تم میں سے ہر ایک کا مادۂ تخلیق اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک نطفہ کی شکل میں جمع رہتا ہے (یعنی پہلے چلّہ میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں ہوتا) پھر اس کے بعد اتنی ہی مدت تک منجمد خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں تک وہ گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار باتوں کے ساتھ ایک فرشتہ کو اس کی طرف بھیجتے ہیں۔ پس وہ اس کا عمل، اس کی موت کا وقت اور اس کا رزق لکھتا ہے اور یہ کہ وہ بد بخت ہے یا نیک بخت، پھر اس میں روح ڈالی جاتی ہے الخ (متفق علیہ، مشکوٰۃ کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، حدیث نمبر ۸۲)

اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جس طرح کھجور کی گٹھلی مناسب موسم میں بوئی جائے اور اس کی مناسب دیکھ بھال بھی کی جائے تو ماہر مالی، جو بیج، زمین اور آب وہوا کی خاصیات سے واقف ہو، جان لیتا ہے کہ وہ گٹھلی شاندار طریقہ پر اُگے گی اور بڑھے گی۔ وہ شروع ہی سے اس کے بعض احوال جان لیتا ہے۔ مثل مشہور ہے: ''ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات!'' یعنی ہونہار پودے کے آثار پہلے ہی سے اچھے نظر آتے ہیں اسی طرح جو فرشتہ جنین کی تدبیر پر مقرر ہے وہ مذکورہ چاروں باتیں جان لیتا ہے۔ سب باتیں اس پر منکشف ہوجاتی ہیں یہ تقدیر کا چوتھی بار ظہور ہے۔

⑤ تقدیر کا پانچواں مرحلہ: جب دنیا میں کسی چیز کے رونما ہونے کا وقت آتا ہے تو اس سے کچھ پہلے تقدیر الٰہی کا پانچواں اور آخری مرتبہ ظہور ہوتا ہے۔ اس وقت حظیرۃ القدس سے زمین کی طرف مثالی صورت میں وہ چیز اترتی ہے جو رونما ہونے والی ہے۔ پھر زمین میں اس کے احکام پھیل جاتے ہیں یعنی اس نازل شدہ مثالی چیز کے موافق حادثہ رونما ہوتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے اس چیز کا بار بار مشاہدہ کیا ہے۔ اس سلسلہ کے دو واقعے درج ذیل ہیں:

پہلا واقعہ: کچھ لوگوں میں نزاع واقع ہوا، اور ان میں باہمی رنجش ہوگئی۔ شاہ صاحب نے اس کے رفع کے لئے بارگاہ خداوندی میں التجا کی، تو آپ نے دیکھا کہ حظیرۃ القدس سے ایک نورانی نقطہ زمین کی طرف اترا اور آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ جوں جوں وہ پھیلتا جاتا تھا، ان کی باہمی رنجش زائل ہوتی جاتی تھی۔ اور ابھی لوگ مجلس سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ ایک دوسرے پر مہربان ہوگئے۔ اور سابقہ الفت لوٹ آئی۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ واقعہ قدرت کی عجیب نشانیوں میں سے تھا۔

دوسرا واقعہ: شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ایک بچہ بیمار پڑا۔ شاہ صاحب کا دل اس میں اٹکا ہوا تھا۔ آپ نے ظہر کی نماز کے دوران دیکھا کہ اس بچے کی موت آسمان سے اتری۔ چنانچہ اسی رات وہ بچہ فوت ہوگیا۔

وثالثها: أنه لما خلق آدم عليه السلامُ ليكون أبًا للبشر، ولِيُبْدَأ منه نوعُ الإنسان، أحدثَ في عالَم المثال صورَ بنيه، ومَثَّلَ سعادتَهم وشقاوتَهم بالنور والظلمة، وجعلهم بحيث يُكَلَّفُوْن، وخلق فيهم معرفتَه، والإخباتَ له؛ وهو أصل الميثاق المدسوس في فطرتهم، فيؤاخذون به وإن نَسُوْا الواقعةَ، إذ النفوس المخلوقة في الأرض إنما هي ظل الصور الموجودة يومئذ، فمدسوس فيها ما دُسَّ يومئذ.

ورابعها: حين نُفخ الروحُ في الجنين؛ فكما أن النواة إذ أُلقيت في الأرض في وقت مخصوص، وأحاط بها تدبير مخصوص، علم المطَّلِع على خاصية نوع النخل، وخاصية تلك الأرض، وذلك الماء والهواء: أنه يَحْسُن نباتُها، ويتحقق من شأنه على بعض الأمر، فكذلك تتلقى الملائكة المدبرة يومئذ، وينكشف عليهم الأمر في عُمُرِه، ورزقه، وهل يعمل عملَ من غلبت ملكيتُه على بهيميه، أو بالعكس؟ وأيَّ نحوٍ تكون سعادتُه وشقاوته؟

وخامسها: قبيلَ حدوثِ الحادثة، فينزل الأمر من حظيرة القدس إلى الأرض، وينتقل شيئ مثالي، فتنبسط أحكامُه في الأرض.

وقد شاهدتُ ذلك مرارًا:

منها: أن ناسًا تشاجروا فيما بينهم وتَحَاقَدُوْا، فالتجأتُ إلى الله، فرأيتُ نقطةً مثاليةً نورانيةً، نزلت من حظيرة القدس إلى الأرض، فجعلتْ تنبسط شيئا فشيئًا، وكلما انبسطت زال الحِقْدُ عنهم، فما بَرِحْنَا المجلس حتى تلاطفوا، ورجع كل واحد منهم إلى ماكان من الألفة، وكان ذلك من عجيب آياتِ الله عندي.

ومنها: أن بعض أولادي كان مريضًا، وكان خاطري مشغولاً به، فبينما أنا أصلي الظهر، شاهدتُ موته نزل، فمات في ليلته.

ترجمہ: اور تیسری بار: یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تا کہ وہ انسانوں کے جدامجد ہوں، اور تاکہ ان سے نوعِ انسانی کا آغاز کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے عالمِ مثال میں ان کی اولاد کی صورتیں پیدا کیں۔ اور ان کی نیک بختی اور بدبختی کا پیکرِ محسوس نور وظلمت کو بنایا۔ اور انہیں ایسی حیثیت میں پیدا کیا کہ وہ مکلف ہونے کے قابل ہوں۔ اور ان میں اپنی معرفت اور اپنی نیازمندی پیدا کی۔ اور وہ اس قول وقرار کی بنیاد ہے جو انسانوں کی فطرت میں چھپایا ہوا ہے، پس اس عہد ومیثاق کی وجہ سے ان کا مؤاخذہ کیا جائے گا، اگرچہ وہ اس واقعہ کو بھول گئے ہیں، کیونکہ جو نفوس زمین میں پیدا کئے جاتے ہیں وہ ان صورتوں کا پرتو ہی ہوتے ہیں جو اس میثاق والے دن میں موجود تھیں۔ پس اُن نفوس میں

وہ باتیں چھپائی ہوئی ہیں جو اُس میثاق والے دن میں ان میں چھپائی گئی تھیں۔

اور چوتھی بار: جب جنین میں روح پھونکی گئی۔ پس جس طرح سے یہ بات ہے کہ گٹھلی جب مخصوص وقت میں زمین میں ڈالی جاتی ہے اور مخصوص تدبیر اس کا احاطہ کرلیتی ہے، تو جان لیتا ہے کھجور کی نوع کی خاصیت کا اور اس زمین کی خاصیت کا، اور اس پانی اور ہوا کی خاصیت کا واقف کہ وہ گٹھلی شاندار طریقہ پر اُگے گی۔ اور وہ اس کے احوال میں سے بعض احوال کا پتہ چلالیتا ہے۔ پس اسی طرح حاصل کرتے ہیں وہ فرشتے جو اُس دن جنین کی تدبیر کرنے والے ہیں، اور منکشف ہوجاتا ہے ان پر معاملہ اس کی زندگی اور اس کی روزی کے بارے میں۔ اور کیا وہ اس شخص جیسے کام کرے گا جس کی ملکیت اس کی بہیمیت پر غالب ہے یا اس کے برعکس ہوگا؟ اور اس کی نیک بختی اور بدبختی کس نوعیت کی ہوگی (یعنی وہ اعلیٰ درجہ کا نیک ہوگا یا ادنیٰ درجہ کا۔ اسی طرح وہ اعلیٰ درجہ کا بدبخت ہوگا یا معمولی درجہ کا؟)

اور پانچویں بار: حادثہ رونما ہونے سے کچھ پہلے (تقدیر کا ظہور ہوتا ہے) پس معاملہ حظیرۃ القدس سے زمین کی طرف اترتا ہے اور ایک مثالی چیز منتقل ہوتی ہے۔ پس اس کے احکام زمین میں پھیل جاتے ہیں۔

اور میں نے اس چیز کا بار بار مشاہدہ کیا ہے:

ان میں سے ایک: یہ ہے کہ کچھ لوگ آپس میں لڑے اور ان میں رنجش پیدا ہوگئی۔ پس میں نے بارگاہ خداوندی میں التجا کی۔ پس میں نے ایک نورانی مثالی نقطہ دیکھا، جو حظیرۃ القدس سے زمین کی طرف اترا، پس وہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اور جوں جوں وہ پھیلتا تھا ان کی رنجش زائل ہوتی تھی اور ہم مجلس سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ باہم دیگر مہربان ہوگئے۔ اور ان میں سے ہر ایک اس الفت کی طرف لوٹ گیا جو پہلے تھی۔ اور یہ واقعہ میرے لئے اللہ کی عجیب نشانیوں میں سے تھا۔

اور ان میں سے ایک: یہ ہے کہ میرا کوئی بچہ بیمار تھا۔ اور میرا دل اس کے ساتھ مشغول تھا۔ پس دریں اثناء کہ میں ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا، میں نے اس کی موت کو اترتے ہوئے دیکھا، چنانچہ وہ بچہ اسی رات میں فوت ہوگیا۔

لغات وترکیب: إذ النفوس تعلیل ہے یؤاخذون کی...... دَسَّ فی التراب: چھپانا...... تَحَقَّقَ الرجلُ الأمرَ: یقین کرنا۔

محو واثبات عالم مثال میں ہوتا ہے، لوح محفوظ میں نہیں

احادیث میں نہایت وضاحت سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ حوادث کو زمین میں پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ عالم مثال میں یک گونہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ روایات اگلے عنوان کے تحت آرہی ہیں۔ پھر وہاں سے وہ چیزیں اِس عالم میں اترتی ہیں۔ اور جس طرح وہ پہلی بار عالم مثال میں پیدا کی گئی ہیں اسی طرح سے اِس عالم میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہی

سنت الٰہی ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز عالم مثال میں موجود ہوتی ہے، مگر اس دنیا میں وہ نہیں اُتاری جاتی۔ یہ اس کا محو (مٹا دینا) ہے۔ اور کبھی ایک چیز عالم مثال میں موجود نہیں ہوتی، مگر وہ اس دنیا میں پیدا کردی جاتی ہے۔ یہ عالم مثال میں معدوم کا، اس دنیا میں اثبات ہے۔ مگر ام الکتاب میں یعنی عرش کی قوت خیالیہ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، وہاں طے شدہ امر ہے۔ سورۃ الرعد آیت ۳۹ میں ہے کہ: ''اللہ پاک جو کچھ چاہتے ہیں مٹادیتے ہیں، اور جس چیز کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں۔ اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) انہی کے پاس ہے'' یعنی محو و اثبات صرف عالم مثال میں ہوتا ہے، لوح محفوظ میں نہیں ہوتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ بلا کو عالم مثال میں یک گونہ وجود بخشتے ہیں، پھر اس کو مصیبت زدہ پر اتارتے ہیں۔ اور دعا چڑھتی ہے وہ اس کو پھیر دیتی ہے۔ یہ ثابت کا محو ہے۔ اسی طرح کبھی کسی کی موت کو پیدا کرتے ہیں، پس اس کا والدین کے ساتھ حسن سلوک چڑھتا ہے اور موت کو پھیر دیتا ہے یوں عمر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

اور راز اس میں یہ ہے کہ جس طرح دواء ازالۂ مرض کے لئے سبب عادی ہے، علت نہیں ہے کہ ضرور ہی مرض دور ہوجائے۔ اور کھانا پینا شکم سیری اور سیرابی کے لئے سبب عادی ہیں اور زہر کھانا اور تلوار کی چوٹ موت کے لئے سبب عادی ہیں۔ علت نہیں ہیں، اسی طرح عالم مثال میں پیدا شدہ امر کا اترنا اس دنیا میں اس چیز کے پیدا ہونے کے لئے سبب عادی ہے، علت نہیں ہے کہ ضرور اس عالم میں وہ چیز پیدا ہو، ہو بھی سکتی ہے اور متخلف بھی رہ سکتی ہے۔ پہلی صورت اثبات کی ہے اور دوسری محو کی۔ واللہ اعلم۔

وقد بيَّنت السنةُ بيانا واضحًا أن الحوادث يخلقها الله تعالى قبل أن تُحدَث في الأرض خلقًا مَّا، ثم ينزل في هذا العالَم، فيظهر فيه كما خُلق أولَ مرة، سنةً من الله تعالى، ثم قد يُمحَى الثابتُ، ويُثْبَتُ المعدومُ بحَسَب هذا الوجود، قال الله تعالى: ﴿يَمْحُوْا اللّٰهُ مَايَشَآءُ وَيُثْبِتُ، وَعِنْدَهٗ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ مثل أن يخلق الله تعالى البلاءَ خلقا مَّا، فَيُنْزِلُه على المبتلى، ويَصْعَدُ الدعاءُ، فيرده، وقد يخلق الموت فيصعد البر ويرده.

والفقه فيه: أن المخلوق النازل سبب من الأسباب العادية، كالطعام والشراب بالنسبة إلى بقاء الحياة، وتناوُلِ السم والضرب بالسيف بالنسبة إلى الموت.

ترجمہ: اور احادیث نے یہ بات نہایت وضاحت سے بیان کردی ہے کہ حوادث کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں زمین میں پیدا کئے جانے سے پہلے، کسی درجہ میں پیدا کرنا (یعنی عالم مثال میں اس کو ایک گونہ وجود بخشتے ہیں) پھر وہ چیز اس عالم میں اترتی ہے، پس وہ اس عالم میں ظاہر ہوتی ہے جیسی وہ پہلی مرتبہ پیدا کی گئی ہے۔ یہ سنت الٰہی ہے۔ پھر کبھی ثابت مٹادیا جاتا ہے۔ اور نیست ثابت کردیا جاتا ہے اس وجود (مثالی) کے اعتبار سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مٹاتے ہیں اللہ تعالیٰ جو

چاہتے ہیں، اور ثابت کرتے ہیں (جو چاہتے ہیں) اور ان کے پاس اصل کتاب ہے" جیسے کہ اللہ تعالیٰ آفت کو کسی درجہ میں پیدا کرتے ہیں، پھر اس کو مصیبت زدہ پر اتارتے ہیں اور دعا چڑھتی ہے، پس اس کو پھیر دیتی ہے۔ اور کبھی موت کو پیدا کرتے ہیں پس حسن سلوک چڑھتا ہے اور اس کو پھیر دیتا ہے۔

اور سمجھنے کی بات اس میں یہ ہے کہ (عالم مثال سے) اترنے والی مخلوق اسباب عادیہ میں سے ایک سبب ہے (اس کے وجود ارضی کے لئے) جیسے کھانا پینا بقائے زندگی کی بہ نسبت اور زہر کھانا اور تلوار سے مارنا موت کی بہ نسبت (سبب عادی ہیں۔ پس ان اسباب کے تحقق کے بعد مسببات کا تحقق ضروری نہیں، سبب حقیقی یعنی علت کے تحقق کے بعد معلول کا تحقق ضروری ہوتا ہے)

عالم مثال کا ثبوت

بہت سی احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائناتِ خداوندی میں ایک ایسا عالم بھی ہے جس میں اعراض متجسّد (جسم دار) ہوتے ہیں جیسے بزدلی ایک عرض ہے، عالم مثال میں اس کو خرگوش کی صورت ملی ہے۔ اسی طرح تمام معنویات کے لئے وہاں مثالی اجسام ہیں، جن کے ذریعہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں اور چیزیں دنیا میں رونما ہونے سے پہلے اُس عالم میں پیدا کی جاتی ہیں۔

مبحث اول کے باب دوم میں، جو کہ عالم مثال کے بیان میں ہے، بیس حدیثیں عالم مثال کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جیسے:

۱- رشتے (ناتے) کا عرش سے لٹکا ہوا ہونا (رواہ مسلم، **کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم وتحريم قطيعتها** ۱۶:۱۱۳ مصری)

۲- فتنوں کا بارش کی طرح برسنا (باب عالم مثال حدیث ۷)

۳- دریائے نیل وفرات کو سدرۃ المنتہی کی جڑ میں پیدا کرنا، پھر ان کو زمین میں اتارنا (حوالہ بالا حدیث ۸)

۴- لوہے کو اتارنا (سورۃ الحدید آیت ۲۵)

۵- چوپایوں کو اتارنا (سورۃ الزمر آیت ۶)

۶- پورے قرآن کریم کو ایک ساتھ سمائے دنیا پر اتارنا، جبکہ قرآن ایک معنوی چیز ہے (مستدرک حاکم ۲: ۵۳۰ الدر ۶: ۳۷۰ تفسیر سورۃ القدر)

۷- جنت وجہنم کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور دیوار قبلہ کے درمیان اس طرح حاضر کرنا کہ انگور کا خوشہ لینا ممکن

ہوگیا اور آگ کی گرمی محسوس ہونے لگی (باب عالم المثال حدیث ۹)

۸-بلا اور دعا کا کشتی لڑنا یعنی کشمکش ہونا (حوالہ بالا حدیث ۱۱)

۹-آدم علیہ السلام کی اولاد کو عہد الست میں پیدا کرنا (سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲)

۱۰-عقل کو پیدا کرنا اور یہ کہ وہ سامنے آئی اور اس نے پیٹھ پھیری (باب ذکر عالم المثال، حدیث ۱۲)

۱۱-دو روشن سورتوں (بقرہ اور آل عمران) کا آنا، گویا وہ پرندوں کی دو قطاریں ہیں (حوالہ بالا، حدیث ۲)

۱۲-قیامت کے دن اعمال کا تلنا (یہ مضمون بہت سی آیات میں آیا ہے، جیسے سورۃ الاعراف آیت ۸)

۱۳-جنت کو ناگواریوں سے اور جہنم کو خواہشات سے گھیرنا (باب ذکر عالم المثال حدیث ۱۰)

ایسی اور بھی بہت سی احادیث وآیات ہیں، جن سے حدیث شریف کا معمولی طالب علم بھی واقف ہے۔ یہ سب عالم مثال کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

وقد دلَّ أحاديثُ كثيرةٌ على ثبوت عالَمٍ تتجسَّم فيه الأعراضُ، وتنتقل المعاني، ويُخلق الشيئ قبل ظهوره فى الأرض، مثلُ كون الرَّحِمِ معلَّقا بالعرش، ونزولِ الفِتَنِ كمواقع القطر، وخلقِ النيل والفرات فى أصل السدرة، ثم إنزالهما إلى الأرض، وإنزالِ الحديد والأنعام، وإنزالِ القرآن إلى السماء الدنيا مجموعًا، وحضورِ الجنة والنار بين يَدَيِ النبى صلى الله عليه وسلم وبين جدار المسجد، بحيث يمكن تناول العنقود، ويأتى حَرُّ النار، وكتعالُجِ البلاء والدعاء، وخلقِ ذرية آدم، وخلقِ العقل، وأنه أقبل وأدبر، وإتيان الزهر اوين كانهما فِرْقَانِ، ووزنِ الأعمالِ، وحفوفِ الجنة بالمكاره، والنارِ بالشهوات، وأمثالِ ذلك مما لايخفى على من له أدنى معرفة بالسنة.

ترجمہ: اور بہت سی حدیثیں ایک ایسے عالم کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، جس میں اعراض جسم دار ہوتے ہیں اور معنویات منتقل ہوتی ہیں۔ اور چیز (اس عالم میں) پیدا کی جاتی ہے زمین میں رونما ہونے سے پہلے، جیسے ناتے کا عرش سے لٹکا ہوا ہونا، فتنوں کا بارش کے قطروں کی طرح برسنا، نیل اور فرات کو سِدرہ (بیری) کی جڑ میں پیدا کرنا، پھر دونوں کو زمین کی طرف اتارنا، لوہے اور چوپایوں کو اتارنا، سارے قرآن کو ایک ساتھ دنیا والے آسمان پر اتارنا، جنت وجہنم کا حاضر ہونا آنحضور ﷺ کے سامنے اور مسجد کی دیوار کے درمیان، اس طرح کہ خوشہ لینا ممکن ہوگیا اور آگ کی گرمی آنے لگی، اور جیسے آفت اور دعا کا کشتی کرنا اور آدم علیہ السلام کی ذریت کو پیدا کرنا اور عقل کو پیدا کرنا اور یہ کہ وہ سامنے آئی اور اس نے پیٹھ پھیری اور دو روشن سورتوں کا لانا گویا وہ پرندوں کی دو ڈاریں ہیں اور اعمال کا (قیامت کے دن) تلنا اور جنت کو ناگواریوں سے گھیرنا اور جہنم کو خواہشات سے۔ اور ان کے مانند ان روایات میں سے جو پوشیدہ نہیں ہیں اس

پر جس کو احادیث کی معمولی معرفت بھی حاصل ہے۔

☆ ☆ ☆

تقدیر اور اسباب ظاہری میں تعارض نہیں

قضاء وقدر اور اسباب ظاہری میں کچھ ٹکراؤ نہیں۔ کیونکہ اسباب بھی تقدیر میں داخل ہیں۔ قضائے خداوندی کا تعلق اسباب ومسببات کے پورے سلسلہ کے ساتھ ایک ساتھ ہوا ہے۔ پہلے یہ حدیث گذر چکی ہے کہ جھاڑ پھونک، دوادارو اور احتیاطی تدابیر بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں۔ اور مقام سَرغ کے قصہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی اس کی صریح دلیل ہے۔ سرغ شام میں ایک قریہ کا نام ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ شام میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف جا رہے تھے، جب مقام سرغ میں پہنچے تو آپ کو اس وبا کی خبر ملی۔ آپ نے اس بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا کہ اس حالت میں وہاں جانا چاہئے یا واپس لوٹ جانا چاہئے؟ رائیں مختلف تھیں۔ بالآخر طے پایا کہ واپس لوٹ جانا چاہئے۔ اس وقت حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے، جو کہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، اور أمینُ هذه الأمة ان کا خصوصی امتیاز ہے اور جو تمام افواج کے سالار اعظم تھے، اور فوج امیر المؤمنین کی زیارت کے لئے بیتاب تھی، فوج کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ نے کہا: أَفِرَارًا من قدر الله؟! (کیا تقدیر الٰہی سے بھاگتے ہو؟!) یعنی آپ واپس کیوں لوٹ رہے ہیں۔ کیا یہ خیال ہے کہ اس طرح آپ موت سے بچ جائیں گے؟ آپ کو شام چلنا چاہئے۔ پوری فوج زیارت کے لئے بے تاب ہے۔ جو مقدر ہے، ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لو غَيْرُكَ قالها يا أبا عُبيدة! (کاش کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی، اے ابوعبیدہ) راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف کرنا پسند نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> ''ہاں ہم اللہ کی ایک تقدیر سے اللہ کی دوسری تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں، بتلایئے، آپ کے پاس اونٹ ہوں، آپ ان کو ایک ایسے میدان میں چرانے کے لئے لے کر پہنچیں جس کی ایک جانب سبزہ زار ہو اور دوسری جانب قحط زدہ علاقہ، بتلایئے، اگر آپ سبزہ زار میں اونٹوں کو چرائیں تو یہ تقدیر الٰہی سے نہیں ہے؟ اور اگر آپ قحط زدہ حصہ میں چرائیں تو یہ بھی تقدیر الٰہی سے نہیں ہے؟!'' (یعنی دونوں صورتیں تقدیر الٰہی میں داخل ہیں)

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ پہنچے، وہ کسی ضرورت سے غیر حاضر تھے، آپ نے حدیث شریف سنا کر لوگوں کا اختلاف ختم کر دیا۔ وہ حدیث یہ ہے کہ: ''کسی علاقہ میں طاعون پھیلنے کی اطلاع ملے تو وہاں نہیں جانا چاہئے۔ اور اگر آدمی وہاں ہو جہاں طاعون پھیل رہا ہے تو وہاں سے بھاگنا نہیں چاہئے'' یہ حدیث سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی تعریف کی اور مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی (متفق علیہ جامع الاصول ۸: ۳۶۱ کتاب

الطب، باب في الطاعون والوباء والفرار منه) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے قضاء وقدر کی ہمہ گیری ثابت ہوتی ہے (مزید تفصیل میری تفسیر ہدایت القرآن میں، سورہ یوسف آیت ۶۸ کی تفسیر میں ہے)

واعلم: أن القدر لايُزاحم سببيةَ الأسباب لِمُسَبَّبَاتِها، لأنه إنما تعلق بالسلسلة المترتبة جملةً، مرةً واحدةً، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم في الرُّقى والدواء والتُّقَاةِ، هل تَرُدُّ شيئًا من قدر الله؟ قال: ﴿هي من قدر الله﴾ وقولُ عمر رضى الله عنه في قصة سَرِغَ: " أليس إن رعيتَها في الخَصْب رَعَيْتَها بقدر الله؟ إلخ.

ترجمہ: اور جان لیں کہ تقدیر مزاحمت نہیں کرتی مسببات کے لئے ان کے اسباب کے سبب بننے سے۔ اس لئے کہ تقدیر پورے ترتیب وار سلسلہ کے ساتھ ایک بارگی جڑی ہے (یعنی سارا سلسلہ ایک ساتھ، مع اسباب ومسببات طے کر دیا گیا ہے، کوئی چیز ان میں سے منتظر نہیں) اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جھاڑ پھونک، دوادارو اور پرہیز کے بارے میں۔ کیا یہ چیزیں پھیرتی ہیں تقدیر خداوندی میں سے کسی چیز کو؟ آپؐ نے فرمایا: "یہ سب چیزیں تقدیر الٰہی میں داخل ہیں" اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے واقعہ سَرغ میں: "کیا یہ بات نہیں ہے، اگر آپ اونٹوں کو چرائیں سبزہ زار میں تو آپ ان کو چرائیں گے قضائے الٰہی سے؟ آخر تک۔

بندوں کا اختیار بھی باذن الٰہی ہے

مکلّف بندوں کو ان کے اختیاری اعمال کے کرنے نہ کرنے کا اختیار بیشک حاصل ہے، مگر ان کا وہ اختیار، اختیاری نہیں ہے، بلکہ باذن الٰہی ہے۔ کیونکہ بندوں کا عمل کرنے نہ کرنے کا اختیار تین چیزوں کا نتیجہ ہوتا ہے: ایک: بندہ جو کام کرنا چاہتا ہے اس کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے موجود ہو، کیونکہ اگر وہ کام ہی نہیں جانتا تو کرے گا کیا؟ دوم: اس کو اس کام کا فائدہ معلوم ہو، کیونکہ سمجھدار آدمی بے فائدہ کام نہیں کرتا۔ سوم: اس کام کے کرنے کا دل میں داعیہ پیدا ہو، عزم وارادہ اٹھے، تو ہی آدمی کوئی کام کرتا ہے۔ اور صورت حال یہ ہے کہ بندوں کو ان چیزوں کا سرے سے علم ہی نہیں، پھر جو اختیار ان چیزوں پر متفرع ہوتا ہے وہ اختیاری کہاں رہا؟! سورۃ التکویر کی آخری آیت ہے: ﴿وَمَاتَشَآءُ وْنَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (اور تم بدوں خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے) اور حدیث شریف میں ہے کہ: "قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، الٹتے پلٹتے ہیں ان کو جس طرح چاہتے ہیں" (رواہ مسلم وغیرہ، مشکوۃ باب الایمان بالقدر)

فائدہ یہاں ایک نکتہ ذہن نشین کرلیا جائے: اللہ تعالیٰ قادر مطلق، خالق کل ہیں، کائنات کا کوئی ذرہ نہ تو ان کی قدرت سے باہر ہوسکتا ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی خالق ہوسکتا ہے۔ پس لامحالہ بندوں کا چاہنا اور بندوں کا اختیار بھی

اللہ کی قدرت کے ماتحت ہوگا اور انہیں کو اس کا خالق ماننا ہوگا۔ اگر ایک ذرہ بھی ان کے اختیار سے باہر ہوجائے تو عموم قدرت اور صفت خلق پر اثر پڑے گا۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر بندوں کے مکلّف ہونے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس کی صورت بس یہی ہوسکتی ہے کہ بندوں کو ایک درجہ تک ہی مختار مانا جائے اور اسی پر جزا وسزا کی بنیاد قائم کی جائے۔ اور انسان کا ایک درجہ میں بااختیار ہونا اور دیگر مخلوقات کا بے اختیار ہونا بدیہی امر ہے، ہر شخص دونوں کے احوال کا موازنہ کر کے اس فرق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

> **وللعباد اختيارٌأفعالِهم، نعم لا اختيارلهم في ذلك الاختيار، لكونه معلولاً بحضورِ صورةِ المطلوبِ، ونفعِه، ونهوض داعيةٍ وعزمٍ مما ليس له علم بها، فكيف الاختيار فيها؟ وهو قوله: ﴿إن القلوب بين إصبعين من أصابع الله، يُقَلِّبُهَا كيف يشآء ﴾والله أعلم.**

ترجمہ: اور بندوں کو ان کے کاموں کے کرنے کا اختیار ہے، ہاں، ان کو کچھ اختیار نہیں ہے اُس اختیار میں۔ اس لئے کہ وہ اختیار نتیجہ ہے مطلوب کی صورت اور اس کے فائدہ کے حاضر ہونے کا اور عزم وارادہ کے اٹھنے کا، جو ان چیزوں میں سے ہیں جن کا اس کو کچھ علم نہیں، پس ان چیزوں کا اختیار کیونکر ہوسکتا ہے؟ (اس لئے کہ اختیار علم پر متفرع ہے اور جب ان چیزوں کا علم ہی نہیں تو اختیار کیسے ہوسکتا ہے؟ اور کام کرنے نہ کرنے کا اختیار ان تین چیزوں کے اختیار پر متفرع ہے اور اس کا نتیجہ ہے، پس وہ بھی مفقود ہوا) اور وہی آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بیشک دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، پھیرتے ہیں ان کو جس طرح چاہتے ہیں'' باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

باب —— ۶

عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک حق ہے

حق کے معنی ہیں ثابت شدہ چیز حَقَّ الأمْرُ کے معنی ہیں کسی چیز کا ثابت وواجب ہونا۔ اس باب میں یہ بیان ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر ایک لازمی حق ہے، جس کو ماننا اور ادا کرنا ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بالارادہ بندوں پر انعام واحسان فرمانے والے ہیں اور منعم ومحسن کی شکر گذاری ضروری ہے۔ عبادت اسی شکر گذاری کی ایک صورت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ قصد واختیار سے بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیتے ہیں۔ جو شخص بندگی کرتا ہے وہ دنیا وآخرت میں ثمرہ پاتا ہے، اور جو منہ موڑتا ہے وہ سزا پاتا ہے یعنی بندے اپنے ہی فائدے کے لئے عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے نیکی کی بڑی اقسام میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی صمیم قلب سے ایسا پختہ یقین رکھے کہ ذہن میں جانب مخالف کا کوئی احتمال باقی نہ رہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک لازمی حق ہے، اور وہ بندوں سے اسی طرح مطلوب ہے

جس طرح تمام اہل حقوق اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث میں اس حق کا ذکر ہے، وہ حدیث یہ ہے:

''آنحضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: تم جانتے ہو، بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا کیا حق ہے؟'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ بندے اُسی کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کریں۔ اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ وہ اس شخص کو عذاب نہ دیں جو ان کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے'' (مشکوۃ حدیث نمبر ۲۴)

اور یہ اعتقاد اس لئے ضروری ہے کہ جس شخص کے ذہن میں کسی بھی درجہ میں یہ احتمال باقی ہے کہ وہ ایک بیکار نکما (بے مقصد) وجود ہے، رب مختار ومرید کی طرف سے اس سے نہ تو کسی عبادت کا مطالبہ ہے اور نہ ترک عبادت پر کوئی پکڑ ہے تو ایسا شخص دہریہ (بدعقیدہ) ہے۔ وہ اگر عبادت کرے گا بھی تو بے فائدہ ہوگی۔ اس کے دل پر عبادت کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور اس کے اور پروردگار عالم کے درمیان فیضان کا کوئی دروازہ نہیں کھلے گا۔ اس کی عبادت دیگر عادات کی طرح محض ایک عادت ہوگی۔

باب الإيمان بأن العبادةَ حقُّ اللّٰه تعالى على عباده

لأنه منعمٌ عليهم، مُجازٍ لهم بالإرادة

اعلم: أن من أعظم أنواع البر: أن يعتقد الإنسانُ بمجامع قلبه بحيث لايحتمل نقيضَ هذا الاعتقادِ عنده: أن العبادةَ حقُّ اللّٰه تعالى على عباده: وأنهم مطالَبُوْن بالعبادة من اللّٰه تعالى، بمنزلةِ سائر مايطالِبُه ذَوُو الحقوقِ من حقوقهم ،قال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم لِمُعاذ: ﴿يا معاذُ! هل تدرى ما حقُّ اللّٰه على عباده، وما حقُّ العباد على اللّٰه؟﴾ قال معاذ: اللّٰه ورسوله أعلم! قال: ﴿فإن حقَّ اللّٰه على العباد أن يعبدوه، ولايشركوا به شيئًا، وحقُّ العباد على اللّٰه تعالى أن لايعذِّبَ من لايشرك به شيئًا﴾

وذلك: لأن من لم يعتقد ذلك اعتقادًا جازمًا، واحتمل عنده أن يكون سُدًى مهملا، لايُطالَب بالعبادة، ولايُؤاخَذ بها، من جهةِ ربٍ مريدٍ مختارٍ، كان دهريا، لاتقع عبادته— وإن باشرها بجوارحه— بموقع من قلبه، ولاتَفتح بابا بينه وبين ربه، وكانت عادةً كسائر عاداته.

ترجمہ: اس بات پر ایمان لانے کا بیان کہ عبادت بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس لئے کہ وہ ان پر بالارادہ

انعام فرمانے والا اوران کو بدلہ دینے والا ہے: جان لیں کہ نیکی کی عظیم ترین انواع میں سے یہ ہے کہ انسان صمیم قلب سے اس طرح اعتقاد رکھے کہ اس اعتقاد کی نقیض کا اس کے نزدیک کوئی احتمال نہ رہے کہ: عبادت اللہ تعالیٰ کا (ایک حتمی) حق ہے اس کے بندوں پر، اور یہ کہ اللہ کی طرف سے اس حق کا مطالبہ بندوں سے اسی طرح کیا گیا ہے جس طرح دیگر ارباب حقوق اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''اے معاذ! تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق ہے؟ اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا کیا حق ہے؟'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں! (یعنی مجھے علم نہیں ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: ''بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں۔ اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں، اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ اس شخص کو عذاب نہ دیں جو ان کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا''

اور یہ اس لئے ہے کہ جو شخص ایسا اعتقادِ جازم (مضبوط اعتقاد) نہ رکھے، اور اس کے ذہن میں یہ احتمال ہو کہ وہ ایک نکما مہمل وجود ہے، اس سے نہ تو عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے اور نہ بااختیار بااراده پروردگار کی طرف سے ترک عبادت پر اس کی پکڑ کی جائے گی، تو ایسا شخص دہریہ ہے۔ اس کی عبادت واقع نہیں ہوتی ۔ اگر چہ وہ اپنے اعضاء سے عبادت کرے ـــــ اس کے دل کی تھاہ میں۔ اور وہ عبادت کوئی دروازہ نہیں کھولتی اس کے درمیان اور اس کے پروردگار کے درمیان اور وہ عبادت اس کی دوسری عادتوں کی طرح ایک عادت ہوتی ہے۔

لغات:

المَجمَع: جمع مَجَامِع: جمع کرنے یا جمع ہونے کی جگہ، مجامع القلب: پورا قلب، دل کی تھاہ...... مُطَالَبٌ: اسم مفعول ہے...... الدَّهرِیّ: بددین جو عالَم کے قدیم اور غیر مخلوق ہونے کا قائل ہو، جو یہ مانتا ہو کہ یہ دنیا خودکار ہے۔

صفت ارادہ کا بیان

عنوان باب میں کہا گیا ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا حق اس لئے ہے کہ وہ بالا رادہ منعم ومُجازی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بنیادی بات جان لینی چاہئے کہ حکمت ازلیہ میں اگر چہ سب باتیں طے ہیں، قضاء وقدر نے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی، جو بات ہونی ہے یا نہیں ہونی ہے سب کا فیصلہ کر دیا گیا ہے، کوئی حالت منتظرہ نہیں ہے، مگر نصوص شرعیہ اور تصریحات علماء سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ایک صفت ارادہ بھی ہے۔ ارادہ کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرنا مثلاً زید کو کسی خاص وقت میں پیدا کرنے کا فیصلہ کرنا یہ ارادہ ہے۔ صفت ارادہ فی نفسہا مستوی الطرفین ہوتی ہے

یعنی زید کو پیدا کرنا اور نہ کرنا دونوں باتیں درست ہوتی ہیں، دونوں پہلوؤں کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوسکتا ہے مگر جب ایک پہلو کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوجاتا ہے اور کسی چیز کے کرنے کا فیصلہ کردیا جاتا ہے تو اس کا نام ارادہ ہے۔ سورۃ المائدہ کی پہلی ہی آیت میں ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں حکم کرتے ہیں ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ﴾ اور سورۃ الرحمان آیت ۲۹ میں ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتے ہیں ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ ﴾ یعنی جتنے تصرفات عالم میں واقع ہورہے ہیں وہ سب انہیں کے تصرفات ہیں، ہر آن کسی نہ کسی چیز کے ساتھ ان کا ارادہ متعلق ہوتا رہتا ہے۔ غرض شریعت میں قضاء وقدر کے ساتھ صفت ارادہ بھی ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ قصد وارادے سے انعام واحسان فرمانے والے ہیں اور بندوں کو ان کے اعمال پر دنیا وآخرت میں بدلہ دینے والے ہیں۔ اس لئے ان کی عبادت ضروری ہے۔

والأصل في ذلك: أنه قد ثبت في معارف الأنبياء وورثتهم - عليهم الصلوات والتسليمات - أنَّ مَوْطِنًا من مواطِن الجبروت، فيه إرادةٌ وقصدٌ، بمعنى الإجماع على فَعْلٍ، مع صحة الفَعْل والترك بالنظر إلى هذا الموطِن، وإن كانت المصلحةُ الفوقانية لاتُبقي ولاتَذَر شيئًا - إلا أوجب وجودَه، أو أوجب عدمَه، لاوجودَ للحالة المنتظَرة بحَسَب ذلك.

ترجمہ: اور بنیادی بات اس بارے میں (یعنی خدا کے بالا رادہ منعم ومُجازی ہونے کے بارے میں) یہ ہے کہ انبیاء اوران کے ورثاء (یعنی علماء) ـــــ ان پر اللہ کی بے پایاں رحمتیں اور سلام ہوں ـــــ کے علوم میں (یعنی نصوص شرعیہ اور تصریحات علماء سے) یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ مقامات جبروت میں سے ایک مقام میں قصد وارادہ ہے (اللہ کی ذات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو لَاهُوْت سے تعبیر کرتے ہیں، اور صفات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو جَبَرُوْت[1] سے۔ پس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ منجملہ صفات خداوندی کے ایک صفت ارادہ بھی ہے) یعنی کسی چیز کے کرنے کا فیصلہ کرنا (فعل ف کے زبر کے ساتھ مصدر ہے اور فِعل ف کے زیر کے ساتھ اسم بمعنی کام ہے) اس مقام (یعنی صفت ارادہ) کی طرف نظر کرتے ہوئے کرنا اور نہ کرنا (دونوں باتوں) کی درستی کے ساتھ (یعنی فی نفسہ صفت ارادہ مستوی الطرفین ہوتی ہے) اگرچہ بالائی مصلحت (یعنی حکمت خداوندی اور صفت قضاء وقدر) نہ تو کوئی چیز باقی رہنے دیتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے مگر وہ یا تو اس چیز کے ہونے کو واجب کرتی ہے یا نہ ہونے کو، اس (مصلحت فوقانی) کے اعتبار سے کسی حالت منتظرہ کا وجود ہی نہیں۔

☆ ☆ ☆

[1] شاہ صاحب رحمہ اللہ نے التفہیمات (۱: ۲۳۷) میں لکھا ہے:

ثم بعده الجبروت، والتعبير عنها بالصفات لسان قاصر، وأقرب ما يُعبر به عنها أنها أسماءُ ١هـ

صفت ارادہ کے تعلق سے حکماء پر ردّ

اس میں اختلاف ہے کہ نظام عالم کس طرح چل رہا ہے؟ اسباب سے مسببات کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ قدرت نے اشیائے عالم میں جو تاثیرات رکھی ہیں ان کی کارکردگی کی نوعیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں چار رائیں ہیں۔

① اشاعرہ: جریِ عادت کے قائل ہیں یعنی سنت الٰہی یہ چل رہی ہے کہ جب اسباب پائے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ مسببات کو پیدا کرتے ہیں، جب آگ کاغذ کو چھوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کاغذ کو جلاتے ہیں، آگ نہیں جلاتی۔

② معتزلہ کے نزدیک بہ طریق تولید نظام عالم چل رہا ہے۔ تولید کے معنی ہیں جننا، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عِلَل واسباب پیدا کئے ہیں اور ان میں اثر انداز ہونے والی خصوصیات پیدا کی ہیں۔ اب ان اسباب وعلل سے بطور وجوب واضطرار (Automatically) مسببات ومعمولات پیدا ہورہے ہیں۔ اب ان تاثیرات میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہے۔ توبہ!

③ حکماء اور فلاسفہ اعداد کے قائل ہیں۔ اعداد کے معنی ہیں تیار کرنا۔ وہ کہتے ہیں کہ مُبدأ فیاض نے اسباب کو تیار کردیا ہے۔ اب اُن سے وجوب عقلی کے طور پر آثار ومسببات صادر ہوتے ہیں۔ مسببات، اسباب سے متخلف نہیں ہوسکتے یعنی فلاسفہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ صرف علت اُولیٰ ہیں اور ان کا کام صرف اِعداد ہے۔ اور اسباب علل حقیقیہ ہیں، انہیں سے مسببات کا صدور ہوتا ہے۔ اب سلسلۂ عالم میں مبدأ فیاض کا کوئی دخل نہیں ہے، جیسے گھڑی بنانے والا اختیار وارادہ سے گھڑی بناتا ہے مگر جب اس کو بنا کر تیار کردیتا ہے اور اس کو چلادیتا ہے تو اب وہ چلتی رہتی ہے۔ واچ میکر کا اب اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

④ ماتریدیہ تاثیر کے قائل ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں اثر انداز ہونے والی تاثیرات پیدا کی ہیں۔ انہیں سے مسببات پیدا ہوتے ہیں اور یہ تاثیرات دستِ قدرت میں ہیں۔ مسبب الاسباب اور علت العلل اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ جلاتی آگ ہے مگر باذن الٰہی جلاتی ہے۔ یہی برحق مذہب ہے۔ تفصیل معارف السنن (۱۴۲:۱) میں ہے۔

غرض نظام عالم کے تعلق سے حکماء کا نظریہ وہ ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ اس لئے وہ صفت ارادہ بمعنی کسی کام کا فیصلہ کرنا تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ارادہ بایں معنی باطل ہے۔ ہاں ارادۂ ازلی کو وہ مانتے ہیں۔ مگر اس کے تعلق حادث کے وہ قائل نہیں، ان کے نزدیک ارادۂ ازلی نے اسباب کو تیار کردیا ہے۔ اور اب وہ اسباب خودکار ہیں۔ چیزوں کے ساتھ ارادہ کے نیا تعلق قائم ہونے کا سوال ہی نہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حکماء نے ایک بات کا تو خیال رکھا یعنی صفت ارادہ قدیمہ کو تو اس کا پورا حق دیا، مگر بہت سی باتیں ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئیں۔ وہ صفت ارادہ کے تعلق حادث کا ادراک ہی نہ کرسکے، جبکہ یہ بھی

برحق بات ہے، حکماء کے نظریہ کے خلاف خود انسان کے اندر اور کائنات میں دلائل موجود ہیں۔

حکماء کی کوتاہ بینی: حکماء صفت ارادہ کے تعلق حادث کو نہیں سمجھ سکے۔ اس کا مقام تجلیٔ اعظم اور ملأ اعلیٰ کے درمیان ہے۔ تجلیٔ اعظم سے ذات وصفات قدیمہ کے مجموعہ کو تعبیر کیا ہے اور ملأ اعلیٰ کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ صفات قدیمہ کا مخلوق کے ساتھ جو تعلق حادث قائم ہوتا ہے، اس کا مقام دونوں کے درمیان ہے یعنی وہ تعلق حادث اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں ہے مگر صفت سے بے تعلق بھی نہیں ہے۔ جیسے ہیرے کی چمک دمک نہ ہیرا ہے، نہ اس کی صفت، بلکہ اس کا اثر ہے۔ اسی طرح صفت ارادہ کے تعلق حادث کو خیال میں لانا چاہئے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے زید کو پیدا کیا تو یہاں دو چیزیں ہیں ایک اللہ کی صفت خلق جو قدیم ہے دوسری اس صفت کا زید کے وجود سے تعلق، یہ حادث ہے۔ یہ تعلق اللہ کی صفت نہیں ہے۔ البتہ اس کا اثر ہے، جیسے ہیرے کی چمک ہیرے کا اثر ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ حُسن العقیدة میں لکھا ہے: ولایقوم بذاته حادثٌ، فلیس فی ذاته ولافی صفاته حدوثٌ، وإنماالحدوث فی تعلق الصفات بمتعلقاتها حتی تظهر الأعمال، وحقیقته: أن التعلق أیضًا لیس بحادث، ولکن الحادث هو المتعلَّق، فیظهر أحکام التعلق متفاوتة لتفاوت المتعلَّقات، وهو بریئ عن الحدوث والتجدد من جمیع الوجوه (التفهیمات الإلٰهیة ۱:۱۹۷).

غرض اُس مقام میں صفت ارادہ کے تعلق سے کسی چیز کے مستوی الطرفین ہونے کے بعد، ملأ اعلیٰ کے علوم وہیئات کے تقاضے سے کسی چیز کے کرنے پر اتفاق ہوتا ہے، یہی ارادہ کا تعلق حادث ہے اور وہ صفت قدیمہ کی طرح ایک برحق حقیقت ہے، جس کے ادراک سے حکماء محروم رہ گئے اور انھوں نے اسباب کو خودکار سمجھ لیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب کو کارکن یہی صفت ارادہ کا تعلق بناتا ہے۔

حکماء کے خلاف دلیل: ایک مثال میں غور کریں اور یہ حکماء کے خلاف ''انفس'' سے دلیل ہے: ہم ہاتھ بڑھا کر۔ مثال کے طور پر۔ قلم لیتے ہیں تو ہم بدیہی طور پر جانتے ہیں کہ ہم یہ کام قصد وارادہ سے کرتے ہیں۔ حالانکہ قلم لینے کے ارادے کی بہ نسبت اور آدمی کی خداداد صلاحیتوں کی بہ نسبت قلم کا لینا اور نہ لینا یکساں ہے اور قضاء وقدر کے اعتبار سے کوئی ایک بات طے ہے۔ اسی طرح جب خاص استعداد کسی چیز کے ہونے کو لازم وواجب جانتی ہے تو خالق صُور کی طرف سے وہ چیز وجود پذیر ہوجاتی ہے اور اس میں متجدد وحادث چیز کا کسی درجہ میں دخل ہوتا ہے جیسے زمینی مادوں میں استعداد پیدا ہوتی ہے تو ان پر صورتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ اور دعا کے بعد قبولیت نازل ہوتی ہے۔

ولاعبرة بقوم یُسَمَّوْن الحکماءَ، یزعمون أن لاإرادةَ بهذا المعنی فقد حَفِظوا شیئًا، وغابت عنهم أشیاءُ، وهم محجوبون عن مشاهدة هذا الموطِن، محجوجون بأدلّة الآفاق والأنفس.
أما حجابُهم: فهو أنهم لم یهتدوا إلی موطن بین التجلی الأعظم وبین الملأ الأعلی، شبیهٍ

بالشعاع القائم بالجوهرة، ولله المثل الأعلى! ففي هذا الموطن يتمثل إجماعٌ على شيئ، استوجبه علومُ الملأ الأعلى وهيئاتُهم، بعدَ ماكان مستوىَ الفعْل والترك في هذا الموطِن.

وأما الحجة عليهم: فهي أن الواحد منا يعلم بداهةً: أنه يمدُيده ويتناول القلم- مثلاً- وهو في ذلك مريدٌ قاصدٌ، يستوى بالنسبة إليه الفعْلُ والترك، بحسب هذا القصد، وبحسب هذه القُوى المتشبِّحةِ في نفسه، وإن كان كُلُّ شيئ بحسب المصلحة الفوقانية: إما واجب الفعْل أو واجب الترك، فكذلك الحال في كل مايستوجبه استعدادٌ خاص، فينزل من بارئ الصُور نزولَ الصور على المواد المستعدة لها، كالاستجابة عقيب الدعاء، مما فيه دخلٌ لمتجدِّد حادثٍ بوجهٍ من الوجوه.

ترجمہ: اوران لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں جو'' حکماء'' کہلاتے ہیں: وہ گمان کرتے ہیں کہ بایں معنی کوئی ارادہ نہیں ہے، پس انھوں نے یقیناً ایک چیز محفوظ رکھی اور متعدد چیزیں ان سے غائب ہوگئیں اور وہ محروم رہ گئے اس مقام (یعنی صفت ارادہ کے تعلق حادث) کے مشاہدہ کرنے سے (یعنی سمجھنے سے) (اور) ان کے خلاف انفس وآفاق میں دلائل موجود ہیں۔

رہاان کا محروم رہنا: تو وہ یہ ہے کہ انھوں نے اُس مقام (یعنی تعلق حادث) کی طرف راہ نہیں پائی جو تجلّیٔ اعظم اور ملأاعلی کے درمیان ہے، جو اُس روشنی کے مشابہ ہے جو ہیرے کے ساتھ قائم ہے۔ اور اللہ کی شان اعلی ہے (یعنی ہیرے کی مثال بلا تشبیہ ہے، کیونکہ ان کی شان لیس کمثله شیئ ہے) پس اس مقام میں کسی ایسی چیز کے کرنے پر اتفاق پایا جاتا ہے جس کو ملأاعلی کے علوم اوران کی ہیئتیں واجب ولازم جانتی ہیں، اس کے بعد کہ وہ امر اس مقام میں مستوی الطرفین تھا۔

اور رہی ان کے خلاف دلیل: تو وہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بدیہی طور پر جانتا ہے کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور مثال کے طور پر قلم لیتا ہے اور وہ اس فعل میں ارادہ کرنے والا، قصد کرنے والا ہوتا ہے، درانحالیکہ یکساں ہوتا ہے اس کی نسبت لینا اور نہ لینا، اِس ارادے کے اعتبار سے، اور اِن صلاحیتوں کے اعتبار سے جو اس کی ذات میں دراز ہونے والی ہیں، اگرچہ بالائی مصلحت (قضاء وقدر اور ارادۂ قدیمہ) کے اعتبار سے ہر چیز کا یا تو کرنا ضروری ہوتا ہے یا نہ کرنا۔ پس یہی صورت حال ہے ہراس چیز میں جس کو واجب ولازم جانتی ہے مخصوص استعداد، پس وہ چیز اترتی ہے خالق صُور کی طرف سے صورتوں کے اترنے کی طرح، اُن مادّوں پر جن میں ان صورتوں کی استعداد پیدا ہوجاتی ہے جیسے دعا کے بعد قبولیت (کا اترنا اور یہ) ان چیزوں میں سے (ہے) جس میں نئی وجود میں آنے والی حادث چیز کا دخل ہے، دخل کی صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ۔

لغات وترکیب:

الحکماءَ مفعول ثانی ہے اور یُسَمَّوْن میں ضمیر جمع نائب فاعل ہے...... محجوب (اسم مفعول) چھپایا ہوا یعنی

محروم...... مَحْجُوْج (اسم مفعول) دلیل میں مغلوب ہوا ہوا...... اِسْتَوْجبَه: واجب ولازم جاننا...... اَلْمُتَشَبِّحَةُ (اسم فاعل) تَشَبَّحَ الحِرْبَاء علی العود: گرگٹ کا لکڑی پر دراز ہونا...... فینزل میں ضمیر مستتر ما موصولہ کی طرف لوٹتی ہے جو ما یستوجبه میں ہے...... نزولَ الصور منصوب بہ نزع خافض ہے أی کنزول الخ...... مما فیه دخل إلخ خبر ہے، مبتدا محذوف ہے أی هذا مما فیه إلخ.

تصحیح: یزعمون أن لاإرادة إلخ اصل میں یزعمون أن الإرادة إلخ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ پٹنہ سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

صفت ارادہ کے تعلق سے فلاسفہ کا ایک اعتراض اور اس کا جواب

فلاسفہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صفت ارادہ کا تعلق حادث ماننا مصلحت فوقانی یعنی قضاء وقدر اور ارادۂ قدیمہ کے اعتبار سے شیٔ کے وجوب سے بے خبری ہے یعنی جب قضاء وقدر نے ہر بات طے کردی ہے اور ہر ہونے والی چیز کے ساتھ ارادۂ ازلی متعلق ہو چکا ہے تو اب اس کا ہونا واجب (ضروری) ہے۔ پھر دوبارہ اس ہونے والی چیز کے ساتھ ارادہ کا تعلق ماننا پہلی بات سے جہالت ہے اور ایسی جہالت بھری بات شان خداوندی کے سزاوار کیسے ہوسکتی ہے؟ پس صفت ارادہ کے تعلق حادث کا قائل ہونا باطل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ! توبہ!! صفت ارادہ کا تعلق حادث جہالت بھری بات کیسے ہوسکتی ہے؟! وہ تو علم پر مبنی ایک حقیقت ہے اور وہ اس مقام کا پورا حق ادا کرنا ہے یعنی وہ اس حقیقت واقعیہ (تعلق حادث) کا پورا پورا اعتراف کرنا ہے۔ جہالت بھری بات تو جب ہوتی کہ کہا جاتا کہ: ''سرے سے کوئی چیز ہونی ضروری نہیں، اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں'' نصوص شرعیہ نے ایسی جہالت والی بات کی نفی کی ہے۔ شرائع خداوندی نے تقدیر پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ اور تقدیر پر ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر بات قرار پاچکی ہے اور اس کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ وہ طے شدہ بات واقع نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ پہلے یہ حدیث گذر چکی ہے کہ: ''جو احوال تجھے پہنچے ہیں وہ تجھے چوک نہیں سکتے تھے اور جو تجھے چوک گئے ہیں یعنی نہیں پہنچے ہیں وہ تجھے پہنچ نہیں سکتے تھے'' لیکن جب اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ یہ کہا جائے کہ: ''اللہ تعالیٰ ازل میں طے کر کے عاجز نہیں ہوگئے۔ اب بھی وہ قادر مطلق ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود بخود نہیں ہو رہا ہے بلکہ ارادۂ خداوندی کے تعلق حادث کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ صفت ارادہ کے تعلق حادث کے اعتبار سے اب بھی دونوں پہلوان کی قدرت میں ہیں، وہ چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں'' یہ کہنا قطعاً ایک برحق بات ہے، جہالت بھری بات کسی طرح بھی نہیں ہے۔ جہالت بھری بات تو یہ ہے کہ قضاء وقدر اور ارادۂ قدیمہ پر نظر کر کے معاذ

اللہ! اللہ تعالیٰ کو کائنات سے بے دخل اور بے بس کر دیا جائے۔

ایک مثال میں غور کریں: اور یہ مثال حکماء کے خلاف آفاقی دلیل بھی ہے: جب مادہ اٹھتی ہے یعنی مست اور پُرشہوت ہوتی ہے تو وہ مخصوص حرکات کرتی ہے، پھر جب وہ نر سے ملتی ہے تو نر اپنی والی حرکتیں کرتا ہے تو حکماء کیا حکم لگاتے ہیں: کیا دونوں کی یہ حرکات جبری (بے اختیاری) ہیں، جیسے پتھر لڑھکتا ہے؟ اگر وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں تو غلط ہے۔ یا یہ حرکتیں اختیاری تو ہیں مگر علت موجبہ کے بغیر صادر ہورہی ہیں یعنی نہ تو نر یہ مزاج کا اس میں کوئی دخل ہے نہ مادینہ مزاج کا۔ اگر حکماء یہ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ یا یہ حرکات اختیاری ہیں اور نر و مادہ میں خدا نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں ان کی وجہ سے یہ حرکتیں ہورہی ہیں، مگر یہ وجوبِ فوقانی کی محض حکایت ہیں یعنی قضاء وقدر میں جو باتیں طے ہیں یہ حرکات محض ان کی نقل (سوانگ، ڈرامہ) ہیں۔ نر و مادہ میں نہ تو بذاتِ خود کوئی ہیجان ہے نہ ان حرکات کے پیچھے ان کا اپنا کوئی مقصد ہے۔ اگر حکماء یہ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ بلکہ حق اور یقینی امر بین بین ہے یعنی نر و مادہ کی یہ اختیاری حرکات علت موجبہ (قضاء وقدر) کا نتیجہ ہیں۔ یہ حرکات نہ پائی جائیں یہ بات ممکن ہی نہیں۔ اور اس علت سے قطع نظر کرتے ہوئے نر و مادہ میں ذاتی سرور و ہیجان بھی پایا جاتا ہے۔ جو ان کا ارادہ ہے۔ اسی طرح جو شخص مقام کا صحیح حق ادا کرتا ہے اور انسان کے اختیاری اعمال کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ مصلحت فوقانی (قضاء وقدر) کا نتیجہ ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر کرتے ہوئے انسان کے لئے فی نفسہ کام کرنا اور نہ کرنا دونوں مساوی ہیں۔ پھر وہ ایک پہلو کو باختیار خود ترجیح دیتا ہے تو اس کا یہ اختیار ایک طرح سے کام کے کرنے کی یا نہ کرنے کی علت بن جاتا ہے، تو اس شخص نے سچ کہا اور نیکی کا کام کیا یعنی وہ صحیح فیصلہ تک پہنچا۔ شریعت نے تکلیف اور جزاء وسزا کا مدار اسی اختیار پر رکھا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ارادۂ ازلی کے ساتھ ایسا ارادہ بھی ثابت ہوگیا جس کا تعلق نیا قائم ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ قصد وارادہ سے منعم ومُجازی ہیں اور اس احسان کے جواب میں عبادت واجب ہے، جس کی ادائیگی یا کوتاہی پر دنیا وآخرت میں مجازات لازمی ہے۔ اور یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مدبر عالم نے تدبیر عالم کے لئے ایک شریعت واجب کی ہے تاکہ لوگ اس پر چلیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور تکلیف بالشریعہ کی مثال ایسی سمجھنی چاہئے، جیسے ایک آقا نے اپنے غلاموں کو کسی خدمت پر مأمور کیا۔ جو لوگ خدمت بجالائے، آقا ان سے خوش ہوا اور جنھوں نے نافرمانی کی آقا ان سے ناراض ہوا۔ یہی تعبیر نصوص شرعیہ میں اختیار کی گئی ہے، کیونکہ اس سے واضح تعبیر نہیں ہوسکتی، گو یہ تعبیر حقیقی نہیں ہے کیونکہ اللہ کا بندوں کو مکلف بنانے میں کوئی فائدہ نہیں، مگر شریعت میں ایسی مجازی تعبیرات بھی اختیار کی جاتی ہیں جو لوگوں میں متعارف ہوں۔ اس وجہ سے قضاء وقدر میں سب کچھ طے ہونے کے باوجود، اور ہر چیز سے ارادۂ ازلی متعلق ہوجانے کے بعد بھی نصوص میں دونوں باتیں آئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہ فیصلہ کرتے ہیں اور بندے باختیار خود اچھے بُرے کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے جزاء وسزا پاتے ہیں۔

ولعلك تقول : هذا جهل بوجوب الشيئ بَحَسب المصلحة الفوقانية، فكيف يكون في موطن من مواطِن الحق؟

فأقول: حاش للّٰه! بل هو علمٌ وإيفاءٌ لحق هذا الموطن؛ إنما الجهلُ أن يقال: "ليس بواجب أصلاً" وقد نفت الشرائعُ الإلٰهية هذا الجهلَ، حيث أثبتت الإيمانَ بالقدر، وأن ما أصابك لم يكن لِيُخْطِئَك، وما أخطأك لم يكن ليصيبك؛ وأما إذا قيل: "يصح فَعْلُه وتركه بحسب هذا الموطِن" فهو علمٌ حقٌ لامحالة، كما أنك إذا رأيتَ الفحلَ من البهائم يفعل الأفعالَ الفَحْلِيَّةَ، ورأيْتَ الأنثىٰ تفعل الأفعالَ الأُنْثوِيَّةَ، فإن حكمتَ بأن هذه الأفعالَ صادرة جبرًا، كحركة الحجر في تدحرجه، كذبتَ؛ وإن حكمتَ بأنها صادرة من غير علةٍ موجِبةٍ لها، فلاالمزاجُ الفَحْلِيُّ يوجب هذا الباب، ولاالمزاجُ الأنثوي يوجب ذلك، كذبتَ؛ وإن حكمتَ بأن الإرادةَ المتشبِّحَةَ في أنفسهما تَحْكِيْ وجوبا فوقانيًا، وتعتمد عليه، وأنها لاتفور فورانًا استقلاليًا، كأن ليس وراءَ ذلك مَرْمىً، فقد كذبتَ.

بل الحقُّ اليقينُ أمرٌ بينَ الأمرين؛ وهو: أن الاختيار معلول لايتخلف عن علله، والفعلَ المرادَ توجبه العللُ، ولايمكن أن لايكون؛ ولكنَّ هذا الاختيارَ من شأنه: أن يبتهج بالنظر إلى نفسه، ولاينظر إلى مافوق ذلك؛ فإن أدَّيْتَ حقَّ هذا الموطِن، وقلتَ: "أجد في نفسي أن الفَعْلَ والترك كانا مستويَيْنِ، وأني اخترتُ الفَعْلَ، فكان الاختيار علةً لفَعْله" صدقتَ وبررتَ؛ فأخبرتِ الشرائعُ الإلٰهية عن هذه الإرادة المتشبِّحَةِ في هذا الموطِن.

وبالجملة : فقد ثبتت إرادةٌ يتجدد تعلقُها، وثبتت المجازاةُ في الدنيا والآخرة، وثبت أن مدبر العالم دَبَّرَ العالم، بإيجابِ شريعةٍ يسلكونها، لينتفعوا بها، فكان الأمرُ شبيهًا بأن السيِّد استخدم عبيدَه، وطلب منهم ذلك، ورضي عمن خدم، وسخط على من لم يخدُم، فنزلت الشرائعُ الإلٰهية بهذه العبارة، لِمَا ذكرنا أن الشرائعَ تنزل في الصفات وغيرها بعبارة ليس هنالك أفصح ولاأبْيَن للحق منها، أكانت حقيقةً لغويةً، أو مجازًا متعارفًا.

ترجمہ: اور شاید آپ کہیں: یہ (یعنی صفت ارادہ کا تعلق حادث) مصلحت فوقانی (قضاء وقدر اور ارادۂ ازلی) کے اعتبار سے شئ کے وجوب سے بے خبری ہے۔ پس وہ بات حق تعالیٰ کے مقامات (صفات) میں سے کسی مقام میں کیسے ہوسکتی ہے؟

تو میں کہتا ہوں: معاذ اللہ! بلکہ وہ بات اس مقام (صفت ارادہ) کے حق کو جاننا اور اس حق کی پوری پوری ادائیگی

ـت، جہالت ہی ہے کہ کہا جائے: ''وہ چیز قطعاً واجب نہیں'' (یعنی اس کا ہونا قطعاً ضروری نہیں) اور شرائع سماویہ نے اس جہل کی نفی کی ہے، چنانچہ شرائع الٰہیہ نے ایمان بالقدر کو ثابت کیا ہے اور یہ کہ: ''جو چیز تجھ کو پہنچی، وہ تجھے چوکنے والی نہیں تھی، اور جو چیز تجھے چوک گئی وہ تجھے پہنچ ہی نہیں سکتی تھی'' اور رہا جبکہ کہا جائے کہ: ''اس مقام (یعنی تعلق حادث) کے اعتبار سے اُس کا کرنا اور نہ کرنا درست ہے'' تو وہ قطعاً برحق علم ہے، جس طرح سے یہ بات ہے کہ جب آپ کسی نر چوپایے کو نرینہ حرکت کرتے دیکھیں اور کسی مادہ کو مادینہ حرکت کرتے دیکھیں۔ پس اگر آپ یہ فیصلہ کریں کہ یہ حرکات ان سے اضطراراً صادر ہورہی ہیں، جیسے پتھر کا اس کے لڑھکنے کی حالت میں حرکت کرنا تو آپ نے غلط فیصلہ کیا۔ اور اگر آپ فیصلہ کریں کہ وہ حرکات کسی ایسی علت کے بغیر صادر ہورہی ہیں جو ان کو واجب کرنے والی ہے، پس نہ تو نرینہ مزاج اس سلسلہ کو واجب کرتا ہے اور نہ مادینہ مزاج اس کو واجب کرتا ہے، تو بھی آپ نے غلط فیصلہ کیا۔ اور اگر آپ فیصلہ کریں کہ وہ ارادہ جو ان دونوں کے نفوس کے ساتھ دراز ہونے والا ہے وہ بالائی وجوب کی نقل کرتا ہے اور اس پر اعتماد کرتا ہے اور یہ کہ صورت حال یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی مستقل جوش و ہیجان نہیں ہے، گویا ان حرکات کے پیچھے ان کا کوئی مقصد نہیں ہے تو بھی آپ نے غلط فیصلہ کیا۔

بلکہ حق اور یقینی امر دونوں باتوں کے درمیان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اختیار ایسا معلول ہے جو اپنی علتوں سے پیچھے نہیں رہ سکتا اور جو کام کرنا مقصود ہے اس کو علتیں واجب کرتی ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ وہ نہ ہو لیکن یہ اختیار اس کے حال میں سے یہ بات ہے کہ وہ مسرور ہو، اس کی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے، اور اس کے اوپر کی جانب نہ دیکھتے ہوئے، پس اگر آپ اس مقام (یعنی اختیار) کا حق ادا کریں اور کہیں کہ: ''میں اپنی ذات کے اندر پاتا ہوں کہ کرنا اور نہ کرنا دونوں مساوی ہیں، اور یہ کہ میں نے کرنے کو اختیار کیا ہے تو اختیار اس کے کرنے کی علت ہوگیا'' تو آپ نے سچ کہا اور نیکی کا کام کیا۔ پس شرائع سماویہ نے اسی ارادہ کے بارے میں اطلاع دی ہے جو اس مقام میں دراز ہونے والا ہے (یعنی جو خداداد صلاحیتوں سے پیدا ہوتا ہے)

اور حاصل کلام: یہ ہے کہ ایسا ارادہ یقیناً ثابت ہوگیا جس کا تعلق نیا قائم ہوتا ہے اور دنیا و آخرت میں مجازات ثابت ہوگئی۔ اور یہ بات ثابت ہوئی کہ مدبر عالم نے عالم کی تدبیر فرمائی ہے ایسی شریعت واجب کر کے جس پر لوگ چلیں تاکہ وہ اس سے فائدہ حاصل کریں۔ پس معاملہ اس سے ملتا جلتا ہے کہ آقا نے اپنے غلاموں کو کسی خدمت پر مأمور کیا اور ان سے وہ خدمت طلب کی۔ اور ان سے خوش ہوا، جنہوں نے خدمت کی، اور ان سے ناراض ہوا جنھوں نے خدمت نہ کی۔ پس ادیان سماویہ اس عنوان سے نازل ہوئے اُس وجہ سے جو ہم نے (باب الایمان بصفات اللہ میں) ذکر کی ہے کہ شریعتیں صفات وغیرہ کے سلسلہ میں نازل ہوتی ہیں ایسی تعبیر سے جس سے فصیح تر تعبیر نہ ہو اور واضح تر تعبیر نہ ہو حق بات کو بیان کرنے کے لئے، خواہ وہ تعبیر حقیقت لغویہ ہو یا مجاز متعارف ہو۔

لغت وتشریح:

المَرْمیٰ: تیر پھینکنے کی جگہ، مجازی معنی ہیں مقصد کہا جاتا ہے کلامٌ بعیدُ المرمی: دوررس کلام...... اکانت حقیقة إلخ میں ہمزہ تسویہ کے لئے ہے، جیسے لاأبالی اقُمتَ ام قعدتَ: مجھے تیرے کھڑے ہونے یا بیٹھنے کی کوئی پرواہ نہیں یعنی دونوں میرے نزدیک برابر ہیں...... حقیقت لغویہ: لفظ کے حقیقی لغوی معنی مراد ہونا۔ مجاز متعارف: لفظ کے وہ مجازی معنی مراد لینا جو عرف میں رائج ہیں، جیسے لا آکل من هذه الشجرة میں درخت کے پتے، چھلکے وغیرہ مراد لینا حقیقت لغویہ ہے اور اس کے پھل مراد لینا یا اس کی قیمت مراد لینا مجاز متعارف ہے...... پس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کے بیان میں (اور ارادہ بھی ایک صفت ہے) واضح اور عام فہم تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں۔ اور کہیں ان کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں، اور کہیں مجازی۔ پس جو لوگ صفات کے باب میں اصرار کرتے ہیں کہ ہر جگہ ان کے حقیقی لغوی معنی ہی مراد لئے جائیں، وہ مسئلہ میں غلو کرتے ہیں۔



''حق اللہ'' کی تفہیم کا طریقہ

عبادت اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک حق ہے چونکہ یہ ایک غامض علم ہے، جلدی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس لئے شرائع الٰہیہ میں یہ حقیقت ایسی تین باتوں کے ذریعہ ذہن نشین کرائی گئی ہے جو لوگوں کے نزدیک مسلّم اور بدیہی ہیں:

(۱) لوگوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر انعام و احسان فرمانے والے ہیں۔ اور مُنعم و محسن کا شکر بجالانا ضروری ہے اور عبادت نعمتوں کے شکریہ کی ایک صورت ہے۔

(۲) لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتے ہیں اور ان کی عبادت نہیں کرتے، ان کو اللہ تعالیٰ دنیا میں سخت سزا دیتے ہیں۔ عاد وثمود اور فرعونیوں کا حال سب کو معلوم ہے۔

(۳) لوگوں کو اس سے بھی واقف کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اطاعت شعاروں کو آخرت میں بہترین صلہ عطا فرمائیں گے اور نافرمانوں کو سزا دیں گے اور ان کو جہنم رسید کریں گے۔

تفہیم کے ان تین طریقوں سے تین علوم وجود میں آئے ہیں:

(۱) تذکیر بآلاء اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کرکے لوگوں کو نصیحت کرنا۔

(۲) تذکیر بایام اللہ یعنی گذشتہ نافرمان اقوام کی ہلاکت کے واقعات ذکر کرکے لوگوں کو فہمائش کرنا۔

(۳) تذکیر بالمعاد یعنی موت اور موت کے بعد کے احوال جیسے قبر و حشر اور اس کے بعد کے احوال ذکر کرکے

لوگوں کو سمجھانا۔

نوٹ: قرآن کریم میں ان تینوں علوم کی پوری پوری تشریح فرمائی گئی ہے۔

ثم مكّنت الشرائعُ الإلٰهيةُ هذه المعرفةَ الغامضةَ من نفوسهم بثلاثةِ مقاماتٍ مسلَّمةٍ عندهم، جاريةً مجرى المشهوراتِ البديهية بينهم:

أحدهما: أنه تعالى مُنعِمٌ، وشكر المنعِم واجب، والعبادةُ شكر له على نعَمِه.

والثاني: أنه يُجازِى المعرِضين عنه، التاركين لعبادته، فى الدنيا أشدَّ الجزاء.

والثالث: أنه يجازى فى الآخرة المطيعين والعاصين.

فانبسطت من هنالك ثلاثةُ علوم: علم التذكير بآلاء الله، وعلم التذكير بأيام الله، وعلم التذكير بالمعاد، فنزل القرآنُ العظيم شرحًا لهذه العلوم.

ترجمہ: پھر شرائع سماویہ نے یہ دقیق علم لوگوں کے دلوں میں بٹھایا، ان کے نزدیک مسلمہ تین باتوں کے ذریعہ جوان کے درمیان مشہور بدیہی باتوں کی طرح تھیں:

اول: یہ کہ اللہ تعالیٰ منعم ہیں اور منعم کا شکر واجب ہے۔ اور عبادت ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا ہے۔

دوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اللہ سے اعراض کرنے والے اور ان کی عبادت ترک کرنے والے ہیں، ان کو دنیا میں سخت سزا دیتے ہیں۔

سوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اطاعت کرنے والوں کو اور نافرمانی کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیں گے۔

پس یہاں سے تین علوم پھیلے: علم التذکیر بآلاء اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالمعاد، پس اترا قرآن کریم ان علوم کی تشریح کرتا ہوا۔



''حق اللہ'' فطری میلان کی تعبیر وترجمانی ہے

عہد الست میں انسانوں کو جو درس معرفت دیا گیا تھا، اس کے اثر سے ہر انسان کی فطرت میں اپنے خالق جل مجدہ کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ یہ میلان قلبی ایک مخفی امر ہے اس کا نمود اور دکھاوا (Appearance) اس کے خلیفہ (قائم مقام) اور مَظِنّہ (ملنے کی احتمالی جگہ) کے ذریعہ ہوتا ہے، اور وجدان صحیح سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس مخفی میلان کی ترجمانی یہ عقیدہ کرتا ہے کہ: ''عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے، کیونکہ وہ بالارادہ منعم ومجازی ہیں'' اور یہ عقیدہ ذہن نشین کرنے کے لئے مذکورہ علوم ثلاثہ کی ضرورت ہے اس لئے شرائع الٰہیہ میں ان علوم کی تشریح کا بہت

زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ اور مضامین پھیر پھیر کر بیان کئے گئے ہیں۔ پس جو شخص ارادۂ خداوندی کا منکر ہے، یا ثبوت حق کا انکار کرتا ہے یا مجازات کا قائل نہیں ہے وہ بددین ہے، اپنی فطرت سلیمہ کو ضائع کرنے والا ہے۔ وہ فطری میلان کے نائب وخلیفہ کو یعنی اس عقیدہ کو جو اس میلان کی جگہ رکھا گیا ہے خراب کر کے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے۔

وإنما عظُمت العنايةُ بشرح هذه العلوم: لأن الإنسان خُلق في أصل فطرته ميلٌ إلى بارئه جَلَّ مجدُه، وذلك الميلُ أمر دقيق، لايَتَشَبَّحُ إلا بخليفته ومَظِنَّته؛ وخليفَتُه ومَظِنَّته على ما أثبته الوجدانُ الصحيح: الإيمان بأن العبادةَ حقُّ الله تعالى على عباده، لأنه منعم لهم، مجازٍ على أعمالهم.

فمن أنكر الإرادةَ، أو ثبوتَ حقه على العباد، أو أنكر المجازاة فهو الدهرى الفاقدُ لسلامة فطرته، لأنه أفسد على نفسه مَظِنَّةَ الميل الفطرى، المُوْدَعِ فى جبلته، ونائبَه وخليفتَه والمأخوذَ مكانه.

ترجمہ: اور (قرآن کریم اور سابقہ شریعتوں میں) ان علوم (ثلاثہ) کی تشریح کا بہت زیادہ اہتمام اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں اپنے خالق جل مجدہ کی طرف میلان پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ میلان ایک دقیق (مخفی) امر ہے۔ وہ محسوس شکل اختیار نہیں کرتا مگر اس کے خلیفہ اور مظنہ کے ذریعہ۔ اور اس کا خلیفہ (نائب) اور اس کا مظنہ (یعنی کسی چیز کے حاصل ہونے کی احتمالی جگہ) اس طور پر جس کو وجدان صحیح نے ثابت کیا ہے: ''اس بات پر ایمان لانا ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے، اس لئے کہ وہ (بالارادہ) ان پر انعام کرنے والے ہیں (اور) ان کو ان کے اعمال کا بدلہ دینے والے ہیں''

پس جو شخص ارادۂ خداوندی کا انکار کرتا ہے، یا بندوں پر اللہ کے حق کے ثبوت کا انکار کرتا ہے یا مجازات کا انکار کرتا ہے، تو وہ شخص ایسا دہریہ (بددین) ہے جو اپنی فطرت سلیمہ کو کھونے والا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنا نقصان کیا ہے اس فطری میلان کے مظنہ کو بگاڑ کر جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور اس میلان کے نائب وخلیفہ کو اور اس کی جگہ میں لی ہوئی چیز کو بگاڑ کر۔

☆ ☆ ☆

فطری میلان ایک نورانی لطیفہ ہے

اگر آپ اس فطری میلان کی حقیقت سمجھنا چاہئیں تو جان لیں کہ وہ ایک نورانی لطیفہ ہے، جو فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے، جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لَطُفَ (ک) لُطْفًا وَلَطَافَةً کے معنی ہیں باریک ہونا، چھوٹا ہونا صفت مذکر لَطِيْفٌ اور صفت مؤنث لَطِيْفَة ہے یعنی میلان ایک باریک نورانی حقیقت ہے، جیسے مجازی محبت میں

دل کا میلان محبوب کی طرف رہتا ہے۔ یہ میلان ایک باریک قلبی کیفیت ہے، اس کا ادراک دیگر وجدانیات: بھوک پیاس کی طرح وجدان ہی سے ہوسکتا ہے، اس پر دلائل وبراہین قائم نہیں کئے جاسکتے۔ جو شخص لطائف خمسہ، سبعہ اور تسعہ کی چھان بین کرے اور ہر لطیفہ کو الگ الگ جان لے (ان لطائف کی تشریح شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کتاب الطاف القدس فی لطائف النفس (فارسی) میں اور التفہیمات ۱:۲۲۹ میں ہے) تو وہ ضرور اس نورانی لطیفہ (میلانِ قلبی) کا ادراک کرلے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس لطیفہ کے میلان کو بھی سمجھ لے گا۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس میلان کو محبت ذاتی کہتے ہیں۔ یعنی وہ محبت جو فطری ہے کسی عارض کی وجہ سے نہیں ہے۔ اور یہ لطیفہ بھی دیگر وجدانیات کی طرح دلائل سے قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔ جیسے بھوکے کی بھوک اور پیاسے کی پیاس کو دلیل سے نہیں سمجھایا جاسکتا، اسی طرح اس میلان کا بھی صرف ادراک کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وجدان صحیح حاصل ہو، دلائل سے اس کو نہ ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ سمجھایا جاسکتا ہے۔

> وإن شئتَ أن تعلم حقيقةَ هذا الميل، فاعلم: أن في روح الإنسان لطيفةً نورانيةً، تميلُ بطبعها إلى اللّٰه عزَّ وجلَّ، ميلَ الحديد إلى المغناطيس، وهذا أمرٌ مدرَكٌ بالوجدان، فكلُّ من أمعن في الفحص عن لطائف نفسه، وعرف كلَّ لطيفةٍ بِحيالها، لابد أن يُدرِكَ هذه اللطيفةَ النورانيةَ، ويُدرِكَ ميلَها بطبعها إلى اللّٰه تعالى، ويسمى ذلك الميلُ عند أهل الوجدان بالمَحبة الذاتية، مَثَلُه كمثل سائر الوجدانيات لايُقتنص بالبراهين، كجوع هذا الجائع، وعطشِ هذا العطشان.

ترجمہ: اور اگر آپ اس میلان کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہیں تو جان لیں کہ روح میں ایک نورانی لطیفہ (باریک چیز) ہے، جو فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے، جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور یہ چیز وجدان سے جانی جاتی ہے۔ پس ہر وہ شخص جو لطائف نفس کی اچھی طرح تفتیش کرے اور وہ ہر لطیفہ کو الگ الگ جان لے، ضروری ہے کہ وہ اس نورانی لطیفہ کو پالے اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف فطری میلان کو بھی سمجھ لے۔ اور اہل وجدان کے نزدیک یہ میلان محبت ذاتی کہلاتا ہے۔ اور اس کا حال دیگر وجدانیات کے حال جیسا ہے دلائل سے وہ شکار نہیں کیا جاتا جیسے مخصوص بھوکے کی بھوک، اور متعین پیاسے کی پیاس۔

لغات: فَحَصَ (ف) فَحْصًا عنه: تفتیش کرنا، کھود کرید کرنا...... بِحِيَالِها: علحدہ علحدہ، کہا جاتا ہے قَعَدَ كلٌّ على حِيَالِه: ہر ایک علحدہ علحدہ بیٹھا۔



فطری میلان کا کبھی احساس نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کی طرف فطری میلان ہر شخص میں موجود ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے خالق جل مجدہ سے محبت ہے۔ سورۃ

المطففين آیت ۱۵ ہے﴿ كَلَّا، إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴾ (ہرگز ایسا نہیں، بیشک وہ لوگ اُس دن اپنے رب سے روک دیئے جائیں گے) یعنی کفار آخرت میں دیدار خداوندی سے محروم رکھے جائیں گے اور یہ محرومی ان کے لئے سزا ہوگی۔ اگر کفار میں اللہ کی محبت اور شوق دیدار نہ ہوتا تو زیارت سے محرومی ان کے لئے سزا کیسے ہوتی؟ غرض ہر انسان کی فطرت میں محبت ذاتی گوندھ دی گئی ہے۔ مگر انسان جب سفلی تقاضوں میں یعنی آل و مال کے دھندوں میں اور خواہشات کے دباؤ میں ہوتا ہے تو اس کو اس فطری میلان کا احساس نہیں ہوتا، جیسے بے حس کرنے والی دواء (Narcotic) کی وجہ سے جراحی (چیر پھاڑ) کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ مگر جب سفلی تقاضوں کی مزاحمت ختم ہوجاتی ہے تو گویا مخدّر دواء کا اثر زائل ہوگیا، اب جس طرح تکلیف کا احساس شروع ہوتا ہے، محبت ذاتی بھی ابھرتی ہے اور فطری میلان کا پتہ چل جاتا ہے مگر کیسے اور کب پتہ چلا، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اور سفلی تقاضوں کی مزاحمت دوصورتوں میں ختم ہوتی ہے ایک: جب آدمی مرجاتا ہے، کیونکہ موت سے نسمہ (روح حیوانی) کے بہت سے اجزاء منتشر ہوجاتے ہیں اور اس کی خصوصیات اور اس کی صلاحیتیں گھٹ جاتی ہیں۔ اور نسمہ ہی سفلی تقاضوں کا سرچشمہ تھا اس لئے جب اس میں اضمحلال آجاتا ہے تو اس کے تقاضے بھی سست پڑجاتے ہیں۔ اس لئے مزاحمت باقی نہیں رہتی۔ دوسرے: ریاضتوں اور پرمشقت عبادتوں کے ذریعہ مرنے سے پہلے ہی نفس کو ماردیا جائے تو بھی سفلی تقاضوں کی مزاحمت ختم ہوجاتی ہے اور محبت ذاتی کو ابھرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

فإذا كان الإنسان في غاشية من أحكام لطائفه السفلية، كان بمنزلة من استعمل مُخَدِّرًا في جسده، فلم يُحِسَّ بالحرارة والبرودة، فإذا هَدَأَتْ لطائفُه السفلية عن المزاحمة: إما بموتٍ اضطراري يوجب تَنَاثُرَ كثيرٍ من أجزاء نسمته ونقصانَ كثيرٍ من خواصِّها وقُواها، أو بموت اختياري، وتمسُّكِ حِيَلٍ عجيبةٍ من الرياضات النفسانية والبدنية، كان كمن زال المخدِّرُ عنه فأدرك ماكان عنده، وهو لايشعر به.

ترجمہ: پس جب انسان اپنے سفلی لطائف کے احکام کے پردہ میں ہوتا ہے تو وہ اس شخص سا ہوتا ہے جس نے کوئی بے حس کرنے والی چیز اپنے جسم میں استعمال کی ہو، پس وہ گرمی، سردی کا احساس نہیں کرتا۔ پھر جب اس کے سفلی لطائف مزاحمت سے پرسکون ہوجاتے ہیں یا تو اضطراری موت کی وجہ سے جو اس کے نسمہ کے اجزاء میں سے بہت سے اجزاء کے بکھر جانے کو واجب کرتی ہے اور نسمہ کی خصوصیات اور اس کی صلاحیتوں میں سے بہت سوں کے کم ہوجانے کو واجب کرتی ہے یا اختیاری موت سے اور نفسانی اور جسمانی ریاضتوں میں سے عجیب تدبیروں کو اختیار کرنے سے، تو وہ اس شخص کی طرح ہوجاتا ہے جس سے سُن کرنے والی دواء کا اثر زائل ہوگیا۔ پس وہ اس میلان کو سمجھتا ہے جو اس کو حاصل ہے، درانحالیکہ اس کو ادراک کا شعور پہلے نہ تھا (وھو جملہ حال ہے کان کے اسم کا)

فطری میلان ضائع کرنے والوں کے احوال

انسان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق جل مجدہ کی طرف جو فطری میلان (نورانی لطیفہ) ودیعت فرمایا ہے، اگر انسان اس کو ضائع کر دیتا ہے اور زندگی بھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مائل نہیں ہوتا تو مرنے کے بعد ایسے لوگ دو قسم کے ہو جاتے ہیں:

ایک: سادہ طریقہ پر میلان کو ضائع کرنے والے یعنی جہل بسیط میں مبتلا لوگ، جن کو جہل کا ادراک ہوتا ہے یہ بے دین مسلمان ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان تو رکھتے ہیں، مگر ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ نہ نمازیں پڑھتے ہیں، نہ زکات ادا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ موت کے بعد کمال نوعی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کمال نوعی کی تفصیل مبحث رابع کے باب اول میں گذر چکی ہے —— ایسے لوگوں پر ایمان کی برکت سے موت کے بعد کچھ اخروی احوال منکشف ہوتے ہیں، مگر انکشاف تام نہیں ہوتا یعنی وہاں کی کچھ نعمتیں ان کو حاصل ہوتی ہیں، مگر وہ اخروی نعمتوں سے کامل طور پر بہرہ ور نہیں ہوتے۔ اور یہ صورت حال اس لئے پیش آتی ہے کہ ان لوگوں میں انکشافِ تام کی استعداد مفقود ہوتی ہے یعنی اعمال نہ کرنے کی وجہ سے ان کی ایمانی صلاحیت بہت ہی کمزور ہوتی ہے، اس وجہ سے اخروی احوال کا ان پر انکشاف تام نہیں ہو پاتا، اور وہ موت کے بعد حیران، پریشان اور ہکّے بکّے رہ جاتے ہیں۔

دوم: وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ فطری میلان کو ضائع کر دیا ہے، بلکہ ان کے قُوی علمیہ (دل ودماغ) غلط عقائد سے بھرے پڑے ہیں یا ان کے قُوی عملیہ (اعضاء) بدکاریوں میں مبتلا ہیں —— یہ کفار اور بد دین مسلمان ہیں۔ ان کے اخروی اور دنیوی احوال درج ذیل ہیں:

اُخروی احوال: یہ لوگ پس از مرگ کھینچا تانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کا نفس ناطقہ (روح ربانی) چونکہ عالم بالا کی چیز ہے اس لئے وہ جبروت کی طرح کھنچ جاتا ہے۔ اور ان کا نسمہ (روح حیوانی) پستی کی طرف کھنچ جاتا ہے، کیونکہ اس نے فطری میلان کے برخلاف حالت کما رکھی ہے۔ اور اس تجاذب کی وجہ سے ان کے نفوس سے ایک وحشت اٹھتی ہے اور وہ نفوس ہی پر چھا جاتی ہے اور یہ وحشت ناکی ان کے لئے مستقل سوہان روح بنی رہتی ہے۔

علاوہ ازیں کبھی برزخ اور کبھی اس کے بعد کے مواطن میں ان کے سامنے ایسے واقعات رونما ہوں گے جو اس وحشت کے ترجمان اور اس کے پیکر ہائے محسوس ہوں گے، جیسے صفراوی مزاج آدمی کو خواب میں آگ اور شعلے نظر آتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کے سامنے سانپ اور بچھو نمودار ہوں گے اور وہ ان کو ڈسیں گے۔

اور اس سزا کی بنیاد معرفت نفس کا علم ہے یعنی ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کو اور اس پر لازم ہونے والے حقوق کو پہچانے، ورنہ اس کا انجام وہ ہوگا جو اوپر مذکور ہوا۔ مشہور بزرگ یحییٰ بن معاذ رازی رحمہ اللہ (متوفی ۲۵۸ھ) کا مشہور ارشاد ہے کہ مَن عرف نفسَہ فقد عرف ربَّہ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ کیونکہ معرفتِ

نفس معرفتِ ربّ کو مستلزم ہے، پس جو شخص اس معرفت (علم) سے کورا ہوتا ہے، اس کی یہی سزا ہوتی ہے۔

دنیوی احوال: اور وہ لوگ جب تک بقید حیات رہتے ہیں، ملأ اعلیٰ کا غصہ ان کو گھیرے رہتا ہے۔ ان کا غصہ ملأ سافل کے دلوں میں اور دیگر با اختیار مخلوقات (جن وانس) کے دلوں میں اس الہام کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ ان کو ستاؤ اور ایذائیں پہنچاؤ —— چنانچہ ایسے لوگ دنیوی زندگی میں بھی تنگی کا جینا جیتے ہیں۔ ہر وقت دنیا کی حرص، ترقی کی فکر میں اور کمی کے اندیشہ میں بے آرام رہتے ہیں اور رسوائی اور بدنامی کے اندیشوں میں گھرے رہتے ہیں۔

اور اس سزا کی بنیاد لوگوں کے دلوں میں جو خیالات اور تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان کے اسباب کی معرفت ہے، جس کی تفصیل مبحث اول کے باب دہم میں گذر چکی ہے۔ جو شخص ان اسباب سے واقف نہیں ہوتا اور برے خیالات اور برے تقاضوں کا سد باب نہیں کرتا اس کی سزا یہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

حاصل کلام: یہ ہے کہ تین باتیں: جبروت کی جانب میلان، ایسے اعمال کرنا جو سفلی تقاضوں کی مزاحمت سے نجات دیں اور ایسے اعمال کے ترک پر مؤاخذہ، یہ تینوں باتیں صورت نوعیہ کا اور اس کی صلاحیتوں کا مقتضی اور اس کے وہ آثار ہیں جن کا خالق صُوَر اور واہب وجود کی طرف سے مصلحت کلیہ کے موافق ہر انسان پر فیضان ہوتا ہے۔ ایسا نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ تینوں باتیں لوگوں نے خود ہی طے کر لی ہیں، اور لوگوں نے خود ہی اپنے اوپر لازم کر لی ہیں یا ایک ریت چل پڑی ہے جس کے مطابق لوگ عمل پیرا ہیں۔ بلکہ یہ باتیں درحقیقت اس نورانی لطیفہ کے حق کی ادائیگی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچتا ہے۔ لوگ عبادت کے ذریعہ اس لطیفہ کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں اور اس کی کجی کو سنوارتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عبادت و بندگی میلان قلبی اور نورانی لطیفہ کا ایک حق ہے جو آدمی ادا کرتا ہے۔

فإذا مات الإنسان وهو غير مُقبِل على الله تعالى:

فإن كان عدمُ إقبالـه جهلاً بسيطا وفقدًا ساذجا، فهو شقي بحسب الكمالِ النوعي، وقد يُكشف عليه بعضُ ما هنالك، ولايتم الانكشاف لفقد استعداده، فبقي حائرًا مبهوتا.

وإن كان ذلك مع قيام هيئةٍ مضادَّة في قُواه العلمية أو العملية، كان فيه تجاذبٌ: فانجذبت النفسُ الناطقة إلى صُقْع الجبروت، والنسمةُ بما كسبت من الهيئة المضادَّة إلى السفل؛ فكانت فيه وحشةٌ ساطعةٌ من جوهر النفس، منبسطةٌ على جوهرها؛ وربما أوجب ذلك تمثُّلَ واقعاتٍ هي أشباح الوحشة، كما يرى الصفراوي في منامه النيرانَ والشُّعَلَ ——وهذا أصلٌ توجبهُ حكمةُ معرفةِ النفس.

وكان أيضًا فيه تحديقُ غضبٍ من الملأ الأعلى، يوجب إلهاماتٍ في قلوب الملائكة، وغيرها من ذوات الاختيار: أن تُعَذِّبَه وتُؤْلِمَه؛ ——وهذا أصلٌ تُوْجِبُهُ معرفةُ أسباب الخطرات

والدواعي الناشئة في نفوس بني آدم.

وبالجملة: فالميلُ إلى صُقع الجبروتِ، ووجوبُ العمل بما يَفُكُّ وَثاقَهُ من مزاحمة اللطائف السفلية، والمواخذةُ على ترك هذا العملِ، بمنزلةِ أحكامِ الصورةِ النوعية، وقُواها، وآثارِها الفائضةِ في كل فرد من أفراد النوع، من بارىءِ الصُّوَر ومُفيض الوجود، وفق المصلحةِ الكلية، لاباصطلاح البشر، والتزامِهم على أنفسهم، وجَرَيَانِ رسومهم بذلك فقط، وكلُّ هذه الأعمال في الحقيقة حقُّ هذه اللطيفة النورانية، المنجَذِبَة إلى الله، وتوفيرُ مقتضاها، وإصلاحُ عوجها.

ترجمہ: پس جب انسان مرجاتا ہے، درانحالیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والا نہیں ہوتا:

تواگراس کی اللہ کی طرف بےتوجہی جہل بسیط اور میلان کو سادہ گم کرنا ہوتا ہے تو وہ کم نصیب رہ جاتا ہے، کمال نوعی کے اعتبار سے۔ اور کبھی اس پر بعض وہ چیزیں منکشف کی جاتی ہیں جو وہاں (آخرت میں) ہیں۔ اور انکشاف تام نہیں ہوتا، انکشاف تام کی استعداد کے مفقود ہونے کی وجہ سے، پس وہ حیران ہکابکا رہ جاتا ہے۔

اور اگر وہ بات (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بےتوجہی) ہوتی ہے اس کے قُویٰ علمیہ اور عملیہ میں میلان کے برخلاف حالت کے قائم ہونے کے ساتھ، تو اس میں کھینچا تانی ہوتی ہے: پس نفس ناطقہ جبروت کی جانب کھنچ جاتا ہے، اور نسمہ فطری میلان کے برخلاف ہیئت کے کمانے کی وجہ سے نیچے کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ پس ہوتی ہے انسان میں وحشت، چڑھنے والی اس کے نفس کی ذات سے، پھیلنے والی نفس کی ذات پر —— اور کبھی وہ چیز واجب کرتی ہے ایسے واقعات کے رونما ہونے کو جو وحشت کے پیکر ہائے محسوس ہوتے ہیں، جس طرح صفراوی مزاج آدمی خواب میں آگ اور شعلے دیکھتا ہے —— اور یہ (سزا کی) وہ بنیاد ہے جس کو ثابت کرتی ہے نفس کی معرفت کا علم۔

اور نیز ہوتا ہے انسان میں ملأ اعلیٰ کے غصہ کا ایسا گھیرنا جو الہامات کو واجب کرتا ہے ملائکہ سافلہ کے دلوں میں، اور ان کے علاوہ ذی اختیار مخلوقات (یعنی جن وانس) کے دلوں میں کہ وہ اس کو ستائیں اور اس کو تکلیف پہنچائیں —— اور یہ (سزا کی) وہ بنیاد ہے جس کو ثابت کرتی ہے انسانوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے (بُرے) خیالات اور (برے) تقاضوں کے اسباب کی معرفت۔

اور خلاصۂ کلام: پس جبروت کی جانب میلان، اور ایسی باتوں پر عمل کا واجب ہونا جو اس کی قید کو کھولدیں سفلی تقاضوں کی مزاحمت سے، اور اس عمل کے ترک کرنے پر مؤاخذہ کا ہونا (یہ تینوں باتیں) بمنزلہ صورت نوعیہ اور اس کی صلاحیتوں کے احکام کے اور اس کے اُن آثار کے ہیں جن کا نوع کے افراد میں سے ہر فرد پر فیضان ہوتا ہے، خالق صُوَر اور واہب وجود کی طرف سے، مصلحتِ کلیہ کے موافق۔ نہیں ہیں (مذکورہ تینوں باتیں) صرف انسانوں کے اتفاق

کرنے کی وجہ سے، اورانسانوں کے ان باتوں کو اپنے اوپر لازم کرنے کی وجہ سے اوراس کے مطابق ان میں رواج چلنے کی وجہ سے۔ اور یہ سب کام (یعنی مذکورہ تینوں کام) درحقیقت اس نورانی لطیفہ کا حق ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچنے والا ہے، اوراس لطیفہ کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے اوراس کی کجی کو سنوارنا ہے۔

لغات:

الصُقع: جانب جمع اَصقَاع..... وَجَّہَ تَوجِیھًا: کے معنی ہیں رخ پھیرنا اور اصطلاحی معنی ہیں بات کو واضح کر کے سمجھانا، اس طرح بات پیش کرنا کہ کوئی الجھن باقی نہ رہے اور بات ذہن نشین ہوجائے..... مُفیض (اسم فاعل) اَفَاضَ إفَاضَۃً: بہانا، فیضان کرنا..... اِلتَزَمَ العملَ اَوِ المالَ: اپنے اوپر واجب کرلینا..... اِنجَذَبَ: کھنچ جانا..... أحدَقَ وَحَدَقَ: گھیرنا۔

ترکیب:

المیلُ اپنے دونوں معطوفات کے ساتھ مل کر مبتداء ہے اور بمنزلۃ الخ خبر ہے..... قُواھا کا عطف الصورۃ النوعیۃ پر ہے اور آثارھا کا أحکام پر..... من باری ء إلخ متعلق ہے الفائضۃ سے..... وَفقَ منصوب بنزع خافض ہے اور جار مجرور کا متعلق وہی ہے جو بمنزلۃ کا متعلق ہے..... فقط کا تعلق لا کے تینوں مدخولوں سے ہے۔

تصحیح: تُوجِبُہ دونوں جگہ اصل میں تَوجِیۃ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی اور مخطوطہ برلین سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

ہر حق: نفس کا نفس پر ہوتا ہے، سہولتِ فہم کے لئے ''حق اللہ'' وغیرہ کہا جاتا ہے

اوپر خلاصۂ کلام کے طور پر تین باتیں ذکر کی گئی ہیں: ایک: جبروت کی طرف میلانِ قلبی، دوسری: ایسے اعمال کا وجوب جو سفلی تقاضوں کی مزاحمت سے بچاویں، تیسری: ان اعمال کے ترک پر مؤاخذہ کا ہونا۔ یہ تینوں باتیں درحقیقت اس نورانی لطیفہ کا حق ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف میلان رکھتا ہے۔ مگر چونکہ یہ مضمون دقیق تھا۔ ہر کہ ومہ اس کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور میلانِ قلبی اور لطیفۂ نورانی کو سمجھنے والے بھی معدودے چند لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے عرف میں اس حق کو میلان کی طرف مضاف کرنے کے بجائے اس ذات کی طرف مضاف کیا جاتا ہے جس کی طرف وہ لطیفہ مائل ہوتا ہے اور جس کا وہ قصد وارادہ کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اس حق کو منسوب کیا جاتا ہے۔ اوراس کو حق نفس (خود اپنا حق) کہنے کے بجائے حقُّ اللہ (اللہ کا حق) کہا جاتا ہے۔ یہ گویا نفس کے بعض رجحانات کی تعیین ہے، جس رجحان کی جہت سے وہ لطیفہ اللہ کی طرف مائل ہوتا ہے یعنی نفس میں بہت سے رجحانات اور تقاضے ہوتے ہیں جیسے مال کی طرف رجحان،

خوبصورت بیوی کی طرف رجحان، جاہ ومرتبہ کی طرف رجحان اسی طرح ایک رجحان اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہوتا ہے پس جس طرح ''مال ومنال کی خواہش'' کہنا نفس کے بعض رجحانات کی تعیین ہے۔اور'' جاہ ومرتبہ کی خواہش'' کہنا بعض دوسرے رجحانات کی تعیین ہے اسی طرح عبادت کو اللہ کا حق کہنا بھی دل کے بعض رجحانات کی تعیین ہے۔ کیونکہ عبادت میلان قلبی اور لطیفۂ نورانی کے تقاضے سے وجود میں آتی ہے اور میلان ایک رجحان ہے۔ اور عبادت کو ''حق اللہ'' کہنا گویا مختصر تعبیر ہے اس لمبی عبارت کی کہ: ''عبادت نورانی لطیفہ کا حق ہے اُس لطیفہ کے اللہ تعالیٰ کی جانب مائل ہونے کی جہت سے''۔ پس شرائع الٰہیہ میں یہ حقیقت اسی مختصر، آسان تعبیر میں ادا کی گئی ہے تاکہ لوگ اپنے خداداد علوم کے ذریعہ اس کو سمجھ سکیں اور سنت الٰہی بھی یہ جاری ہے کہ دقیق مضامین کو ان کے مناسب مثالی صورتوں میں نازل کیا جاتا ہے جس طرح معنویات خواب میں ایسی صورتوں میں دکھائی جاتی ہیں جو عادۃً اس معنی کے لئے لازم ہوتی ہیں یا اس کی نظیر ہوتی ہے یا اس سے کوئی ملتی جلتی چیز ہوتی ہیں۔ پس وحی کی زبان میں سہل تر تعبیر اختیار کرتے ہوئے کہا گیا کہ: ''عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے''

اسی طرح دیگر حقوق کو بھی سمجھنا چاہئے۔ جیسے قرآن کا حق ایمان داروں پر یہ ہے کہ وہ اس کی تعظیم کریں اور اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا امت پر یہ حق ہے کہ وہ آپ سے محبت رکھیں اور آپ کی پیروی کریں۔ آقا کا غلاموں پر یہ حق ہے کہ وہ آقا کی خیر خواہی اور تابعداری کریں، والدین کا اولاد پر یہ حق ہے کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک برتیں اور رشتہ داروں کا حق صلہ رحمی ہے، اسی طرح اولاد کا ماں باپ پر، شوہر کا بیوی پر، بیوی کا شوہر پر، استاذ کا شاگرد پر، شاگرد کا استاذ پر، بادشاہ کا رعایا پر، رعایا کا بادشاہ پر اور مملوکہ جانور کا مالک پر حق ہے۔ یہ سب حقوق درحقیقت آدمی کے اپنی ذات پر اپنے ہی حقوق ہیں۔ جذبۂ بندگی کا حق ہے کہ اس جذبہ کو پورا کیا جائے، قرآن کریم پر ایمان رکھنے کا حق یہ ہے کہ قرآن کی تعظیم اور اس کے احکام کی تعمیل کی جائے، ورنہ ایمان کیا ہوا؟ جانور کے مالک ہونے کا حق یہ ہے کہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے وقِسْ علی هذا۔

غرض یہ سب حقوق نفس کے نفس پر ہیں، تاکہ نفس اپنے کمال کی تکمیل کرے، اگر وہ حقوق کی ادائیگی کرتا ہے تو اپنے نفع کے لئے کام کرتا ہے، کسی پر کوئی احسان نہیں کرتا اور اگر وہ حقوق ادا نہیں کرتا تو اپنی ذات پر ظلم وزیادتی کرتا ہے، کسی کا کوئی خاص نقصان نہیں کرتا۔

مگر ان تمام حقوق کی نسبت نفس کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ ان کی طرف کی جاتی ہے جن سے معاملہ ہے اور جن کی طرف سے مطالبہ ہے پس کہا جاتا ہے اللہ کا حق، قرآن کا حق، رسول کا حق الخ لہٰذا آپ سرسری باتوں پر نہ رکیں، بلکہ حقائق کو جس طرح کہ وہ نفس الامر میں ہیں ثابت کریں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ تحقیق ایک انمول فائدہ ہے، اس کی اہمیت سمجھنے کی کوشش کریں۔ ومن لم یَذُق لم یدرِ (جو نہ چکھے اُسے کیا پتہ چلے؟!)

ولما كان هذا المعنى دقيقاً، وهذه اللطيفةُ لاتُدركها إلا شِرْذِمَةٌ قليلة، وجب أنْ يُنْسَبَ الحقُّ إلى ما إليه مالت، وإياه قصدت، ونحوَه انْتَحَتْ، كأن ذلك تعيينٌ لبعض قُوى النفس، التي مالت من جهته، وكأن ذلك اختصارُ قولِنَا: " حقُّ هذه اللطيفة من جهة ميلها إلى الله" فنزلت الشرائع الإلٰهية كاشفةً عن هذا السر، بعبارة سهلة يفهمها البشر بعلومهم الفطرية، ويعطيها سنةُ الله: من إنزال المعاني الدقيقة، في صور مناسبة لها بحَسَب النشأة المثالية، كما يتلقى واحد منا في منامه معنىً مجردًا في صورة شيئ ملازمٍ له في العادة، أو نظيرِه وشِبْهِهِ فقيل: " العبادة حق الله تعالى على عباده"

وعلى هذا ينبغي أن يُقَاسَ حقُّ القرآن، وحق الرسول. وحق المولى، وحق الوالدين، وحق الأرحام؛ فكلُّ ذلك حقُّ نفسِه على نفسه، لِتَكْمُلَ كمالَها، ولا تقترفَ على نفسها جورًا ولكن نُسب الحقُّ إلى من معه هذه المعاملةُ، ومنه المطالبةُ، فلا تكن من الواقفين على الظواهر، بل من المحققين للأمر على ما هو عليه.

ترجمہ: اور جب کہ یہ مضمون دقیق تھا اور اس لطیفہ کا ادراک بھی معدودے چند لوگ ہی کر سکتے تھے اس لئے ضروری ہوا کہ وہ حق منسوب کیا جائے اس کی طرف جس کی طرف وہ لطیفہ مائل ہوتا ہے۔ اور جس کا اس لطیفہ نے ارادہ کیا ہے اور جس کی طرف کا اس لطیفہ نے قصد کیا ہے، گویا وہ انتساب نفس کے بعض قُویٰ (رجحانات) کی تعیین ہے، جس رجحان کی وجہ سے وہ نفس مائل ہوتا ہے۔ اور گویا وہ انتساب ہمارے اس قول کا مخص ہے کہ: "اس لطیفۂ نورانیہ کا حق، اس کے اللہ کی طرف جھکنے کی جہت سے" پس سماوی شریعتیں نازل ہوئیں اس راز کو کھولتی ہوئیں ایسی آسان تعبیر سے جس کو سمجھ لیں لوگ اپنے فطری علوم سے۔ اور دیتی ہے اس عبارت کو سنت الٰہی یعنی دقیق معانی کو نازل کرنا ان معانی کے مناسب صورتوں میں عالم مثال میں پائے جانے کے اعتبار سے، جس طرح حاصل کرتا ہے ہم میں سے ایک آدمی خواب میں محض معنوی بات کو ایسی چیز کی شکل میں جو اس معنی کے لئے عادۃً لازم ہے یا اس کی نظیر ہے یا اس سے ملتی جلتی ہے، پس کہا گیا: "عبادت اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر حق ہے"

اور اسی طرح مناسب ہے کہ سمجھا جائے قرآن، رسول، مولیٰ، والدین اور رشتہ داروں کے حقوق کو۔ پس یہ سب اس کی ذات کے اس کی ذات پر حق ہیں۔ تاکہ وہ نفس اپنے کمال کی تکمیل کرے اور اپنی ذات پر کسی ظلم کا ارتکاب نہ کرے، مگر وہ حق منسوب کیا گیا ہے اس کی طرف جس کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور جس کی طرف سے مطالبہ ہے، پس نہ ہو تو سرسری باتوں پر ٹھہرنے والوں میں سے، بلکہ ہو تو معاملہ کو ثابت کرنے والوں میں سے اس پر جس پر وہ (نفس الامر میں) ہے۔

لغات: الشِرْذِمَة: لوگوں کی قلیل جماعت، جمع شَرَاذِم وَشَرَاذِيم...... انتحى الشيئَ: قصد کیا...... حقَّق

الشیئ: ثابت کیا، واجب کیا، مؤکد کیا۔

باب ـــــ ۷

شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان

گذشتہ باب کے آخر میں قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کے حقوق کا ذکر آیا ہے۔ یہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہیں۔ اس لئے اب یہ باب شعائر اللہ کی تعظیم کے بیان میں ہے۔ شعائر اللہ کا ذکر قرآن کریم میں چار جگہ آیا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۵۸ میں صفا و مروہ نامی پہاڑیوں کو منجملۂ شعائر اللہ بتایا گیا ہے۔ سورۃ الحج آیت ۳۶ میں قربانی کے بڑے جانور: اونٹ، گائے بھینس کو منجملۂ شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ سورۃ المائدہ آیت ۲ میں مؤمنین کو مخاطب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو۔ اور سورۃ الحج آیت ۳۲ میں فرمایا ہے ﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے تو اس کا یہ شعائر اللہ کی تعظیم کرنا دل سے اللہ سے ڈرنے کی وجہ سے ہوتا ہے) فَإِنَّهَا کی تقدیر عبارت فَإِنَّ تعظيمه إياها ہے۔ ضمیر ہُ عائد ہے اور إیاها کا مرجع شعائر اللہ ہیں اور آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم دل کے تقوی کی علامت ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقوی اور خوف خدا ہوتا ہے۔

شعائر، شَعِيْرَة یا شِعَارة کی جمع ہے جس کے لغوی معنی علامت کے ہیں۔ اور اصطلاح میں شعیرۃ وہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لئے وہ مقرر کی گئی ہے، جیسے منارہ مسجد کی مخصوص علامت ہے اور شرعی ڈاڑھی مسلمان ہونے کی نشانی (یونیفارم) ہے اسی طرح وہ اعمال، اماکن اور احکام جو دین اسلام کی علامتیں اور پہچان ہیں وہ سب شعائر اللہ ہیں۔ سورۃ الحج آیت ۳۰ میں شعائر اللہ کو حُرُمَاتُ الله (اللہ کے محترم احکام) بھی کہا گیا ہے۔ پس تمام وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے نشان بندگی ٹھہرایا ہے، اسی طرح اللہ کے تمام محترم احکام شعائر اللہ ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ ارقام فرماتے ہیں:

''وشعائر الله درعُرفِ دین: مکانات وازمنہ وعلامات واوقاتِ عبادت را گویند۔ امامکاناتِ عبادت: پس مثل کعبہ وعرفہ ومزدلفہ وجمار ثلاثہ وصفا ومروہ ومنی وجمیع مساجد اند، واماازمنہ: پس مثلِ رمضان واشہر حرم وعید الفطر وعید النحر وجمعہ وایام التشریق اند، اماعلامات: پس مثلِ اذان واقامت وختنہ ونماز جماعت ونمازِ جمعہ ونمازِ عیدین اند۔ درہمہ چیزہا معنی علامت بودن متحقق ست، زیرا کہ مکان وزمان عبادت نیز از عبادت بلکہ از معبود یاد می دہد (فتح العزیز ۱:۲۷۸ در تفسیر سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۸)

شعائر اللہ کی اہمیت: ادیان سماویہ کا مدار شعائر اللہ کی تعظیم پر اور ان کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے پر ہے۔ یعنی شعائر اللہ صرف شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام ہی میں نہیں ہیں۔ بلکہ سابقہ تمام سماوی ادیان میں شعائر اللہ کا

وجود رہا ہے اور اس کی وجہ وہ ہے جس کی طرف ہم نے مبحث رابع کے باب سوم میں اشارہ کیا ہے کہ سعادت حاصل کرنے کا جو آسان طریقہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ بہیمیت سے ملکیت والے وہ اعمال کرائے جائیں جو اس کے بس میں ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ آدمی ملائکہ سے مشابہ ہوجائے گا جو انسان کی معراج کمال ہے۔ اور شعائر اللہ سے ملائکہ کو خاص مناسبت ہے، وہ ان کے گرویدہ ہوتے ہیں پس انسانوں پر بھی ان کی تعظیم وتکریم لازم ہے۔ شاہ صاحب تفہیمات (۱:۱۶۴) تفہیم ۴۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

''ونیز آگاہانیدہ اند کہ در عالم مثال حقائق شعائر الٰہیہ متمثل شدہ است، واز اں صور مثالیہ فیِ واسع بآں شعائر واصل شدہ، وملائکہ فوج فوج بآں شعائر احاطہ کردہ اند۔ ومعنی شعائر: اشیاء کونیہ محسوسہ کہ خدا تعالیٰ را بآں، عبادت تواں کرد، مانند کعبہ کہ طواف آں عبادتِ حضرتِ معبود است، ومانند قرآن کہ تلاوت آں مقرّب است بحضرتِ او، ومانند لفظ اللہ ورحمٰن وسائر اسمائے الٰہیہ کہ ذکر آنہا باو مقرّب است، ومانند صدقہ وصوم وغیر آں۔ وہرچہ از شعائر اللہ شود بر بنی آدم تعظیم او واجب است، واز حقیقت قرآن برایں ضعیف مخاطبہا می رود، وحلاوت وطراوت آں مدرک می گردد''

شعائر اللہ کیا ہیں؟: شعائر اللہ سے مراد وہ ظاہری اور محسوس چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مقرر کیا ہے کہ لوگ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور دین سے ان چیزوں کا ایسا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ لوگ ان کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ کی تعظیم سمجھتے ہیں اور ان کے حق میں کوتاہی کو اللہ کے معاملہ میں کوتاہی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً بے عمل مسلمان بھی قرآن پاک کو چومتے ہیں۔ سر پے رکھتے ہیں اور کبھی ہاتھ سے گر جائے تو نہایت پریشان ہوتے ہیں اور اس کا کفارہ دریافت کرتے ہیں۔ کیونکہ شعائر اللہ کی تعظیم لوگوں کے دلوں میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ وہ نکل ہی نہیں سکتی، الا یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں۔

﴿باب تعظيم شعائر الله تعالى﴾

قال الله تعالىٰ: ﴿ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ اعلم: أن مبنى الشرائع على تعظيم شعائر الله تعالى، والتقرب بها إليه تعالى، وذلك لِمَا أومأنا إليه: من أن الطريقةَ التى نصبها الله تعالى للناس هى محاكاةُ مافى صُقع التجرد بأشياءَ يَقْرُب تناولُها للبهيمية.

وأعنى بالشعائر: أمورًا ظاهرةً محسوسةً، جُعلت لِيُعْبَدَ اللهُ بها، واختُصّت به، حتى صار تعظيمُها عندهم تعظيمًا لله، والتفريطُ فى جنبها تفريطا فى جنب الله، ورُكز ذلك فى صميم قلوبهم، لا يخرج منه إلا أن تقطّع قلوبُهم.

ترجمہ: شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اور جو شخص دین کی یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو اس کا یہ لحاظ رکھنا دل سے اللہ سے ڈرنے سے ہوتا ہے'' جان لیں کہ شریعتوں کا مدار شعائر اللہ کی تعظیم پر اور ان کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے پر ہے۔ اور یہ بات اُس وجہ سے ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ وہ طریقہ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے مقرر کیا ہے وہ اس چیز کی مشابہت پیدا کرنا ہے جو تجرد کی جانب میں ہے (یعنی ملائکہ کے احوال اپنے اندر پیدا کرنا ہے) ایسی چیزوں کے ذریعہ جن کو لینا (یعنی اختیار کرنا) بہیمیت کے لئے آسان ہے (یعنی جو ملکی اعمال بہیمیت کے بس میں ہوں وہ اس سے کرائے جائیں، اسی سے آدمی میں ملکی احوال پیدا ہوں گے)

اور شعائر سے میری مراد وہ ظاہری، محسوس امور ہیں جو اس لئے مقرر کئے گئے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی جائے اور وہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح مخصوص ہوگئی ہیں کہ ان کی تعظیم لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہوگئی ہے اور ان کے معاملہ میں کوتاہی اللہ کے معاملہ میں کوتاہی ہوگئی ہے۔ اور وہ بات لوگوں کے دلوں کی جڑ میں گاڑ دی گئی ہے، نہیں نکل سکتی دل سے مگر یہ کہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں ان کے دل۔

لغات: حَاكَى مُحَاكَاةً: مشابہ ہونا...... تَنَاوَلَ الشيئَ: لینا...... اِخْتَصَّ بالشيئِ: خاص ہونا...... صُقْع: جانب۔

☆ ☆ ☆

شعائر اللہ کیسے تشکیل پاتے ہیں؟

شعائر اللہ قدرتی طور پر، فطری انداز سے تشکیل پاتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں کے دل کسی بات پر مطمئن ہوجاتے ہیں اور وہ بات مشہور اور شائع ذائع ہوجاتی ہے اور بدیہیات اولیہ میں شامل ہوجاتی ہے اور اس میں لوگوں کو ادنی درجہ کا شک باقی نہیں رہتا۔ اس وقت رحمت خداوندی ایسی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جن کو لوگوں کے دل اور ان کے وہ علوم جو ان میں شائع ذائع ہیں، اُن چیزوں کو واجب ولازم جانتے ہیں۔ پس لوگ ان کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان چیزوں کی حقیقت واشگاف کردی جاتی ہے، جس سے لوگ ان کی اہمیت سمجھ جاتے ہیں اور ان چیزوں کی تعظیم وتکریم کی دعوت چار دانگ عالم میں یکساں طور پر پھیل جاتی ہے۔ جب یہ صورت حال ہوجاتی ہے تو ان چیزوں کی تعظیم لوگوں پر لازم کردی جاتی ہے اور اس میں کوتاہی پر مواخذہ کیا جاتا ہے، جیسے اللہ کے نام کی قسم کھانے والا دل میں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اگر وہ قسم توڑے گا تو اللہ کے معاملہ میں کوتاہی ہوگی۔ چنانچہ حسب اعتقاد اس کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے اور قسم توڑنے پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ یہی صورت حال شعائر اللہ کے معاملہ میں لوگوں کی ہے، جب کچھ چیزیں ان کے درمیان مشہور ہوجاتی ہیں اور ان کے علوم ان چیزوں کی تابعداری کرتے ہیں یعنی ان چیزوں کی عظمت لوگ تسلیم کر لیتے ہیں تو ان کے علوم کا یہ انقیاد دو چیزیں واجب کرتا ہے:

(۱) اب رحمت خداوندی ان لوگوں پر انہیں چیزوں کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ نظام عالم کا مدار ''آسان سے آسان تر'' پر ہے اور جب لوگوں نے ان چیزوں کی اہمیت مان لی تو اب ان کے لئے ان امور کی تعظیم بجالانا آسان ہوجاتا ہے۔ اس لئے ان چیزوں کو شعائر اللہ قرار دیا جاتا ہے، تاکہ لوگ ان کے ذریعہ تقرب حاصل کریں۔

(۲) لوگوں کو مکلّف کیا جاتا ہے کہ وہ ان چیزوں کی زیادہ سے زیادہ تعظیم وتکریم کریں، اسی سے ان کو کمال مطلوب حاصل ہوگا شعائر اللہ کی ایسی تعظیم کرنا کہ بھول سے بھی اس میں خلل نہ پڑے کامیابی کا راستہ ہے۔

مثال سے وضاحت: اماکن حج: کعبہ شریف، صفامروہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور جمار ثلاثہ کا احترام لوگوں کے دلوں میں عرصہ سے بیٹھا ہوا تھا۔ عربوں کے قلوب ان مقامات کی عظمت پر مطمئن تھے اس لئے اسلام میں ان مقامات کو شعائر اللہ قرار دیا گیا اور جب بعض عرب قبائل کو صفا مروہ کے درمیان سعی میں، اساف ونائلہ نامی بتوں کی وجہ سے، حرج محسوس ہوا تو ان کو بتایا گیا کہ صفا مروہ تو شعائر اللہ ہیں۔ عرصہ دراز سے عرب ان کی تعظیم وتکریم کرتے آئے ہیں اور کفار کا ان پہاڑیوں پر اساف ونائلہ کو رکھنا ایک عارضی گندگی تھی۔ جس کو صاف کردیا گیا ہے پس جس طرح کعبہ شریف میں ۳۶۰ بتوں کی تنصیب ایک عارضی امر تھا، جس کو وہاں سے دور کردیا گیا اس لئے اب کعبہ شریف کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح صفا مروہ کی سعی میں بھی کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح اسلام میں کچھ نئی چیزوں کو، جیسے قرآن، نبی، نماز، مساجد، جماعت اور اذان وغیرہ کو بھی شعائر اللہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایمان کے تقاضے سے مسلمانوں کے نفوس اور ان کے دینی علوم ان چیزوں کے شعائر ہونے کو واجب ولازم جانیں گے، اس لئے ان چیزوں کو بھی شعائر قرار دیا گیا اور ان کی تعظیم واجب کی گئی اور ان کو تقرب الٰہی کا ذریعہ بنایا گیا۔ (وضاحت پوری ہوئی)

غرض شعائر اللہ کو اللہ تعالیٰ نے کچھ اپنے ذاتی فائدے کے لئے شعائر نہیں قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اغراض سے برتر وبالا ہے ان کے کارنامے مُعَلَّل بالاغراض نہیں ہوتے یعنی وہ کوئی کام ذاتی غرض وفائدہ کے لئے نہیں کرتے۔ وہ بندوں پر جو احکام واجب کرتے ہیں وہ بندوں کے فائدے کے لئے ہوتے ہیں۔ شعائر اللہ کی صورت حال بھی یہی ہے۔ لوگ اپنا کمال مطلوب شعائر اللہ کی غایت درجہ تعظیم کئے بغیر حاصل نہیں کرسکتے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے مسلمات کو جن پر ان کے قلوب مطمئن تھے شعائر اللہ گردانا اور حکم دیا کہ وہ اللہ کے معاملہ میں یعنی اللہ کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔

تشریع میں جمہور کا حال ملحوظ رکھا جاتا ہے: آخر میں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت ومہربانی سے جو شریعت نازل فرمائی ہے اس میں کسی ایک شخص کا حال پیش نظر نہیں رکھا ہے بلکہ جمہور پر نظر رکھی گئی ہے، گویا جمہور ہی سب کچھ ہیں۔ چنانچہ شعائر اللہ پر لوگوں کے قلوب کے مطمئن ہونے کے معاملہ میں بھی جمہور کا اعتبار کیا گیا

ہے۔ اگر جمہور مطمئن ہیں تو گویا سب لوگ مطمئن ہیں۔ بعض لوگوں کے قلوب مطمئن نہ ہوں تو ان کا اعتبار نہیں ـــــ غور کرو، اللہ کی دلیل کتنی مضبوط ہے؟ یعنی شعائر اللہ کی تعظیم کیوں لازم کی گئی اس کی کتنی معقول وجہ ہے؟!

والشعائر إنما تصير شَعائِرَ بِنَهْجٍ طبيعي، وذلك: أن تطمئن نفوسُهم بعادة وخصلة، وتصير من المشهورات الذائعة التي تَلْحقُ بالبديهيات الأوَّلية، ولا تقبل التشكيكَ، فعند ذلك تظهر رحمةُ الله في صورةِ أشياء، تستوجبها نفوسُهم وعلومُهم الذائعة فيما بينهم، فيقبلونها، ويُكشف الغطاءُ عن حقيقتها، وتبلغُ الدعوةُ الأدانِيَ والأقاصِيَ على السواء، فعند ذلك يُكتب عليهم تعظيمُها، ويكونُ الأمر بمنزلة الحالف باسم الله، يُضمر في نفسه التفريطَ في حق الله إن حنث، فيؤاخَذُ بما يُضمِرُ، وكذلك هؤلاء يشتهر فيما بينهم أمور، تنقاد لها علومُهم فيوجب انقيادُ علومهم لها: أن لاتظهر رحمة الله بهم إلا فيما انقادوا له، إذ مبنى التدبير على الأسهل فالأسهل؛ ويوجب أيضًا: أن يؤاخِذُوْا أنفسَهم بأقصى ما عندهم من التعظيم لأن كمالهم هو التعظيم الذى لايشوبُهُ إهمالٌ.

وما أوجب الله تعالى شيئًا على عباده لفائدةٍ ترجعُ إليه، تعالى عن ذلك علوا كبيرًا، بل الفائدة ترجع إليهم، وكانوا بحيث لا يُكْمَلُوْن إلا بالتعظيم الأقصى، فأُخذوا بما عندهم، وأُمروا أن لا يُفَرِّطُوا في جنب الله؛ وليس المقصودُ بالذات في العناية التشريعية حالُ فرد، بل حالُ جماعة كأنها كلُّ الناس، ولله الحجة البالغة!.

ترجمہ: اور شعائر فطری انداز پر ہی شعائر بنتے ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ لوگوں کے دل کسی عادت وخصلت پر مطمئن ہوجائیں اور وہ ایسی مشہور وشائع ذائع چیزوں میں سے ہوجائے جو بدیہیات اوّلیہ کے ساتھ مل جاتی ہیں اور وہ تشکیک کو قبول نہ کرے تو اس وقت رحمت خداوندی ایسی چیزوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جن کو لوگوں کے نفوس اور ان کے وہ علوم جو ان کے درمیان شائع ہیں، واجب ولازم جانتے ہیں، پس وہ ان چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان اشیاء کی حقیقت سے پردہ کھول دیا جاتا ہے اور پیغام پہنچ جاتا ہے نزدیک اور دور کے لوگوں تک یکساں طور پر، پس اس وقت لوگوں پر ان چیزوں کی تعظیم وتکریم لازم کردی جاتی ہے۔ اور ہوجاتا ہے معاملہ اللہ کے نام کی قسم کھانے والے جیسا، قسم کھانے والا اپنے دل میں پوشیدہ رکھتا ہے کہ: ''اگر وہ اس قسم کو توڑے گا تو وہ اللہ کے معاملہ میں کوتاہی ہوگی'' پس اس سے اس بات کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے جو وہ دل میں پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور اسی طرح یہ لوگ ہیں۔ ان کے درمیان کچھ چیزیں مشہور ہوجاتی ہیں۔ جن کے لئے ان کے علوم تابعداری کرتے ہیں۔ پس ان کے علوم کا اُن امور کی تابعداری کرنا واجب کرتا ہے کہ نہ

ظاہر ہو رحمت خداوندی ان پر مگر اس چیز میں جس کے لئے وہ تابعدار ہوئے ہیں۔ کیونکہ تدبیر الٰہی کا مدار'' آسان سے آسان تر'' پر ہے۔ اور نیز وہ انقیاد واجب کرتا ہے کہ پکڑیں وہ اپنی ذوات کو اس انتہائی درجہ تعظیم کے ساتھ جو ان کے پاس ہے۔ اس لئے کہ ان کا کمال وہ تعظیم ہی ہے جس کے ساتھ اہمال (جان بوجھ کر یا بھول کر چھوڑ دینا) ملا ہوا نہ ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کوئی بھی چیز واجب نہیں کی کسی ایسے فائدہ کے لئے جو اللہ کی طرف لوٹتا ہو، اللہ تعالیٰ اس سے بہت ہی برتر و بالا ہیں۔ بلکہ فائدہ لوٹتا ہے اُن لوگوں کی طرف۔ اور لوگوں کی صورت حال یہ ہے کہ ان کی تکمیل انتہائی تعظیم کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ پس وہ پکڑے گئے اس بات کے ساتھ جو ان کے پاس ہے اور حکم دیئے گئے وہ کہ نہ کوتاہی کریں اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں۔ اور عنایتِ تشریعیہ میں مقصود بالذات کسی ایک فرد کی حالت نہیں ہوتی، بلکہ ایک جماعت کی حالت مقصود ہوتی ہے، گویا وہ جماعت سب لوگ ہیں۔ اور اللہ ہی کے لئے کامل برہان ہے!

لغات:

أَدَانِیْ جمع ہے الأَدْنیٰ کی، جو دَنِیٌّ کا اسم تفضیل ہے بمعنی قریبی لوگ ...... أَقَاصِیْ جمع ہے الأَقْصیٰ کی، جو قَصِیٌّ کا اسم تفضیل ہے بمعنی زیادہ دور ...... **تشکیك**: شک وشبہ میں ڈالنا ...... **اِهْمَال**: جان بوجھ کر یا بھولے سے چھوڑ دینا۔

تصحیح: بل الفائدۃ اصل میں بل لفائدۃ تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

تشریح:

بدیہی: وہ چیز ہے جس کا جاننا نظر وفکر پر موقوف نہ ہو، جیسے گرمی کا تصور بدیہی ہے اور آگ گرم ہے یہ تصدیق بدیہی ہے، پھر تصدیق بدیہی میں اگر طرفین اور نسبت کا تصور حکم کے یقین کے لئے کافی ہو تو وہ بدیہی اولی ہے، جیسے کل جزء سے بڑا ہوتا ہے یہ تصدیق بدیہی اولی ہے کیونکہ جو کل اور جزء کی حقیقت سمجھتا ہے وہ فوراً مذکورہ قضیہ کی تصدیق کرے گا۔ بدیہیات اولیہ کو صرف اولیات بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بدیہی کی پانچ قسمیں اور ہیں یعنی فطریات جن کو قضایا قیاساتہا معہا بھی کہتے ہیں اور مشاہدات، متواترات، حدسیات اور تجربیات، تعریفات کے لئے آسان منطق دیکھیں، اور وجہ حصر کے لئے دستور العلماء (۲۶۹:۱) ملاحظہ فرمائیں۔

چار بڑے شعائر اللہ: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز

شعائر اللہ بہت ہیں، جیسا کہ پہلے تفصیل گذر چکی ہے۔ البتہ بڑے اور اہم شائر اللہ چار ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

① قرآن کریم: پہلے دو مثالوں میں غور کریں:

(۱) نزول قرآن کے زمانہ میں اور اس سے پہلے لوگوں میں بادشاہوں کے اپنی رعایا کی طرف جاری کئے ہوئے فرامین و

خطوط شائع وذائع تھے اور لوگ بادشاہوں کی تعظیم کے باب ہی سے ان کے خطوط کی تعظیم کو سمجھتے تھے۔اور یہ جملہ مشہور تھا کہ کلام الملوك ملوك الكلام (شاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہے) یعنی بادشاہوں کی باتوں کا، خواہ وہ زبانی ہوں یا بصورت خط، وہی مقام ہے جو خود بادشاہوں کا ہے۔غرض بڑوں کے کلام کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔

(۲) گذشتہ انبیاء کے صحیفے اور دیگر مصنفین کی کتابیں بھی لوگوں میں رائج تھیں۔بائبل میں صحف انبیاء کے علاوہ بہت سی غیر انبیاء کی کتابیں بھی شامل ہیں۔اور کسی بھی مقتدیٰ کی راہ اپنانے کے لئے اس کی کتاب کی تعظیم اور اس کی تلاوت ضروری ہے۔کیونکہ مقتدیٰ کے علوم کی پیروی اور زمانہائے دراز تک ان علوم کو سیکھنا سکھانا کسی ایسی کتاب کے بغیر جس کی تلاوت کی جائے اور جس کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کیا جائے، بہ ظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔

چنانچہ جب خاتم النبیین ﷺ کا دور آیا تو آپ کی امت کے لئے بھی ضروری ہوا کہ ان کو بھی جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ ایک کتاب دی جائے اور اس کی تعظیم ان پر لازم کی جائے تاکہ وہ اس کی تلاوت کرکے اور اس کے احکام کی تعمیل کرکے اپنے خالق جل مجدہ کا تقرب حاصل کریں۔شعائر اللہ اسی طرح تشکیل پاتے ہیں یعنی جب لوگوں کے احوال کسی چیز کے مقتضی ہوتے ہیں تو رحمت خداوندی ان کی ضرورت کی تکمیل کا سامان کرتی ہے—اور قرآن کریم کی تعظیم اور اس کے احکام کی تعمیل کے سلسلہ میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱- جب قرآن کریم پڑھا جائے تو لوگ اس کو کان لگا کر سنیں اور خاموشی اختیار کریں، رحمت خداوندی کے حق دار ہوں گے جیسا کہ سورۃ الاعراف آیت ۲۰۴ میں آیا ہے۔

۲- قرآنی تمام احکام کی فوراً تعمیل کی جائے مثلاً جن آیتوں میں سجدہ کا حکم ہے، وہاں سجدۂ تلاوت کیا جائے اور جن آیتوں میں تسبیح یا تکبیر کا حکم ہے وہاں تسبیح وتکبیر کہی جائے، جیسے سورۃ الحاقہ کی آخری آیت میں تسبیح (اللہ کی پاکی بیان کرنے) کا حکم ہے اور سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں تکبیر (اللہ کی بڑائی بیان کرنے) کا حکم ہے۔

۳- بے وضو قرآن کریم کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔جیسا کہ سورۃ الواقعہ آیت ۷۹ میں یہ حکم آیا ہے۔

ومعظَم شعائر الله أربعة: القرآن، والكعبة، والنبى، والصلوة:

أما القرآن :فكان الناس شاع فيما بينهم رسائلُ الملوك إلى رعاياهم، وكان تعظيمهم للملوك مُساوِقًا لتعظيمهم للرسائل، وشاع صُحُفُ الأنبياء، ومصنفاتُ غيرهم، وكان تَمَذْهُبُهُمْ لمذاهبهم مساوِقًا لتعظيم تلك الكتب وتلاوتها، وكان الانقياد للعلوم وتلقّيها على مرِّ الدهور بدون كتاب يُتلى ويُروى كالمحال بادىَ الرأى، فاستوجب الناسُ عند ذلك:أن تظهر رحمةُ الله فى صورةِ كتاب نازلٍ من رب العالمين، ووجب تعظيمُه:

فمنه: أن يستمعوا له، ويُنْصتوا إذا قُرِئ.

ومنه: أن يُبادِروا لأوامره، كسجدة التلاوة، وكالتسبُّح عند الأمر بذلك.
ومنه: أن لا يَمَسُّوا المصحف إلا على وضوء.

ترجمہ: اور بڑے شعائر اللہ چار ہیں، قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔

رہا قرآن: پس لوگوں کے درمیان شائع ذائع تھے بادشاہوں کے خطوط اپنی رعایا کی طرف اور لوگوں کا بادشاہوں کی تعظیم کرنا ملزوم تھا ان کے خطوط کی تعظیم کے لئے۔ اور انبیاء کے صحیفے اور دیگر لوگوں کی تصانیف بھی رائج تھیں۔ اور لوگوں کا اُن کے طریقوں کو اپنانا ملزوم تھا ان کی کتابوں کی تعظیم کے لئے اور ان کی تلاوت کے لئے۔ اور ان کے علوم کی تابعداری اور ان کو حاصل کرنا عرصہ دراز تک، کسی ایسی کتاب کے بغیر جس کی تلاوت کی جائے اور جس کو روایت کیا جائے، سرسری نظر میں ناممکن سی بات ہے۔ پس اس وقت لوگوں نے واجب ولازم جانا کہ رحمت خداوندی کسی ایسی کتاب کی صورت میں ظاہر ہو، جو رب العالمین کی طرف سے اترنے والی ہو (چنانچہ حسب تقاضا قرآن کریم نازل ہوا) اور اس کی تعظیم واجب ہوئی:

پس اس میں سے: ہے کہ لوگ اس کو سنیں اور خاموش رہیں جب وہ پڑھی جائے۔

اور اس میں سے: ہے کہ لوگ اس کے اوامر کی تعمیل کی طرف سبقت کریں، جیسے سجدۂ تلاوت کرنا، اور جیسے اللہ کی پاکی بیان کرنا، جہاں ان باتوں کا حکم دیا جائے۔

اور اس میں سے: ہے کہ لوگ قرآن کریم کو نہ چھوئیں مگر باوضو۔

لغات:

مُسَاوَقًا اسم مفعول ہے سَاوَقَهُ مُسَاوَقَةً: تَابَعَهُ وَسَايَرَهُ (المعجم الوسیط) یعنی پیروی کرنا، ساتھ ساتھ چلنا المساوقة: المتابعة، كان بعضها يسوق بعضًا۔ پیروی کرنے والا تابع اور لازم ہوتا ہے اور جس کی پیروی کی جائے وہ ملزوم اور متبوع ہوتا ہے اور بادشاہوں کی تعظیم ملزوم ہے اور خطوط کی تعظیم لازم ہے، کیونکہ وہ بادشاہوں کی تعظیم پر متفرع ہے۔ اسی طرح انبیاء کی راہ اپنانا ملزوم ہے، اور ان کی کتابوں کی تعظیم لازم ہے۔ اس لئے مُسَاوَقًا اسم مفعول ہے، اسم فاعل نہیں...... تَمَذْهَبَ: اس نے مذہب اختیار کیا، اس نے راہ اپنائی المذهب: روش، طریقہ (اردو میں مذہب بمعنی دین استعمال ہوتا ہے)

☆ ☆ ☆

(۲) کعبہ شریف: سب سے پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لئے تعمیر کیا گیا: وہ کعبہ شریف ہے (سورۂ آل عمران آیت ۹۶) انسانوں میں سب سے پہلے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام نے بحکم خداوندی اس گھر کی تعمیر کی۔ اور اس کا

طواف کیا۔ یہ مضمون بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل النبوۃ میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے۔ آدم علیہ السلام کی یہ تعمیر نوح علیہ السلام کے زمانہ تک باقی رہی۔ طوفان نوح میں وہ منہدم ہوگئی، اور اس کے نشانات بھی مٹ گئے۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا، تو آپ نے بحکم خداوندی انہی بنیادوں پر دوبارہ کعبہ شریف تعمیر کیا، جو آج تک باقی ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ اسی بنائے ابراہیمی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں جب کواکب پرستی کا زور ہوا، تو لوگوں نے سورج وغیرہ ستاروں کی روحانیت کے نام پر مندر اور گرجا گھر تعمیر کئے۔ ان کے خیال میں مجرد وغیر محسوس ہستی کی طرف متوجہ ہونے کے لئے کوئی پیکر محسوس ضروری تھا، جو اس مجرد ہستی کے نام پر بنایا جائے۔ لوگ اس کی زیارت کے لئے آئیں، اور اس سے تعلق قائم کرکے اس مجرد ذات کا تقرب حاصل کریں۔ ان کے نزدیک اس کے بغیر توجہ ممکن نہیں تھی، لوگ اول وہلہ ہی میں اس کے امکان کو رد کردیتے تھے۔

جب اس کا رواج عام ہوگیا تو لوگوں کے احوال نے واجب ولازم جانا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کے لئے بھی کوئی گھر ہو، جس کا لوگ طواف کریں، اور جس کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملا، اور انھوں نے کعبہ شریف دوبارہ تعمیر کیا، تاکہ وہ لوگوں کے لئے "قبلہ نما" بنے۔ جب کعبہ شریف تیار ہوگیا تو لوگوں کو دعوت دی گئی کہ آئیں اور اس گھر کا حج کریں، طواف کریں اور تقرب الٰہی حاصل کریں۔ سورۃ الحج آیت ۲۷ ومابعد میں اس کی تفصیل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کی دینی مصلحت کے تقاضے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے لوگوں کے فائدے کے لئے یہ گھر متعین کیا ہے اور مرور ایام کے بعد جب کعبہ کی تعظیم اللہ ہی کی تعظیم سمجھی جانے لگی اور اس کے حق میں کوتاہی اللہ کے حق میں کوتاہی تصور کی جانے لگی تو بیت اللہ کا حج فرض ہوا اور لوگوں کو بیت اللہ کی تعظیم کا حکم دیا گیا۔ مثلاً یہ احکام دیئے گئے:

۱- بیت اللہ کے طواف کے لئے طہارت ضروری ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ الطواف حولَ البیت مثلُ الصلوۃ (بیت اللہ کے گرد طواف نماز کے مانند ہے) یعنی جس طرح نماز کے لئے طہارت اور ستر عورت ضروری ہے طواف کے لئے بھی یہ چیزیں ضروری ہیں (یہ حدیث مشکوٰۃ کتاب الحج باب الطواف میں ہے)

۲- نمازوں میں بیت اللہ شریف کی طرف منہ کرنا ضروری قرار دیا گیا سورۃ البقرہ آیات ۱۴۴ و ۱۴۹ و ۱۵۰ میں یہ حکم مذکور ہے۔

۳- استنجاء کی حالت میں بیت اللہ کی طرف استقبال واستدبار کو مکروہ قرار دیا گیا۔ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ جب

تم بڑے استنجا کے لئے جاؤ تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرو، نہ اس کی طرف پیٹھ کرو، بلکہ (مدینہ کی جہت والے) مشرق کی طرف منہ کریں یا مغرب کی طرف منہ کریں (مشکوٰۃ، کتاب الطہارۃ، باب آداب الخلاء، حدیث نمبر ۳۳۴)

وأما الكعبة: فكان الناس في زمن إبراهيم- عليه السلام- تَوَغَّلُوْا في بناء المعابد والكنائس باسم روحانيةِ الشمس وغيرها من الكواكب، وصار عندهم التوجه إلى المجرد غيرِ المحسوس بدونِ هيكلٍ يُبْنٰى باسمه يكونُ الحلول فيه، والتلبُّسُ به تقربا منه، أمراً محالاً، تدفعه عقولُهم بادِيَ الرأي، فاستوجب أهلُ ذلك الزمان: أن تظهر رحمةُ الله بهم في صورة بيتٍ، يطوفون به، ويتقربون به إلى الله، فَدُعُوْا إلى البيت وتعظيمه، ثم نشأ قرن بعد قرن على علمٍ أن تعظيمه مساوِق لتعظيم الله، والتفريطَ في حقه مساوِق للتفريط في حق الله. فعند ذلك وجب حجُّه، وأُمروا بتعظيمه:

فمنه: أن لايطوفوا إلا متطهرين.

ومنه: أن يستقبلوها في صلاتهم، وكراهيةُ استقبالها واستدبارها عند الغائط.

ترجمہ: اور رہا کعبہ: پس لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں دور تک چلے گئے تھے معابد وکنائس کے بنانے میں، سورج وغیرہ ستاروں کی روحانیت کے نام سے، اور لوگوں کے نزدیک مجرد وغیر محسوس کی طرف توجہ کرنا، کسی ایسے ہیکل (مجسمہ) کے بغیر، جو اس مجرد کے نام سے بنایا گیا ہو جس میں اترنا (یعنی سفر کر کے اس کی زیارت کے لئے آنا) اور جس سے تعلق قائم کرنا، اس مجرد کا تقرب حاصل کرنا ہو، امر محال ہو گیا تھا، جس کو ان کی عقلیں سرسری نظر میں دفع کرتی تھیں۔ پس اُس زمانہ کے لوگوں نے واجب ولازم جانا کہ رحمت خداوندی ظاہر ہو، کسی ایسے گھر کی صورت میں جس کا لوگ طواف کریں اور جس کے ذریعہ وہ اللہ کا قرب حاصل کریں۔ پس لوگ بیت اللہ کی طرف اور اس کی تعظیم کی طرف بلائے گئے، پھر نسلوں کے بعد نسلیں پیدا ہوئیں اس علم پر کہ بیت اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لئے ملزوم ہے اور بیت اللہ کے حق میں کوتاہی اللہ کے حق میں کوتاہی کے لئے ملزوم ہے۔ پس اس وقت واجب ہوا حج کرنا اور لوگوں کو اس کی تعظیم کا حکم دیا گیا۔

پس اس میں سے: یہ بات ہے کہ لوگ بیت اللہ کا طواف نہ کریں۔ مگر پاک ہونے کی حالت میں۔

اور اس میں سے: یہ بات ہے کہ لوگ اس کی طرف منہ کریں اپنی نمازوں میں اور استنجاء کرتے وقت اس کی طرف منہ کرنے اور پیٹھ کرنے کا مکروہ ہونا۔

لغات: مُسَاوِقًا یہاں بھی دونوں جگہ اسم مفعول ہے ...... تَوَغَّلَ فی البلاد: جانا اور دور تک جانا ...... مَعْبَد: عبادت گاہ ...... كنيسة: یہود ونصاریٰ کی عبادت گاہ ...... تقربا منه خبر ہے یکون کی ...... أمرًا محالاً خبر ہے صار کی۔

③ نبی: نَبِیٌّ صفت مشبہ ہے۔اصل میں نَبِیْءٌ تھا ہمزہ کوی سے بدل کری میں ادغام کیا گیا ہے۔ یہ لفظ نَبَّأ تَنْبِئَۃً سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں: خبر دینا، اس کا مجرد نَبَأ (ف) نَبْأً و نُبُوْءً ا ہے جس کے معنی ہیں بلند ہونا، ظاہر ہونا۔

رسول: (بروزن فَعول) مبالغہ ہے مُرْسَل (بروزن مُفعَل) کا۔اور فعول کا استعمال اس طرح پر نادر ہی ہوتا ہے (جامع الرموز قہستانی ص ۵)

مُرسَل (اسم مفعول) اور مُرْسِلْ (اسم فاعل) اِرسال سے ہیں، جس کے معنی ہیں بھیجنا۔ مُرسَل بھیجا ہوا، فرستادہ، پیامبر۔

رسول اور نبی دونوں کے پاس تشریعی وحی آتی ہے۔ مگر نبی عام طور پر مؤمنین کو احکام پہنچاتا ہے اور رسول کفار کی طرف بھی مبعوث ہوتا ہے، بلکہ اس کی بعثت کی پہلی غرض کفار کو دعوت دینا ہی ہوتی ہے۔ پھر نبی سابق شریعت و کتاب کی تبلیغ پر مامور ہوتا ہے اور رسول کو نئی کتاب اور نئی شریعت دی جاتی ہے۔ پس ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا (اس سلسلہ کی مزید تفصیلات لغات القرآن (اردو) ج ۳ ص ۸۴۔۸۵ میں ہے) اب شاہ صاحب رحمہ اللہ کی بات شروع ہوتی ہے۔

جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کی طرف پیامبر بھیجتے ہیں جو لوگوں کو بادشاہوں کے اوامر ونواہی کی خبر دیتے ہیں اور لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان سفیروں کی بات مانیں۔ کیونکہ ان کی بات ماننا درحقیقت بادشاہوں کی بات ماننا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے بندوں کی طرف نبی اور رسول بھیجے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی لوگوں کو پہنچاتے ہیں۔ان کی تعظیم بھی لوگوں پر واجب ہے کیونکہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعظیم ہے۔سورۃ النساء آیت ۸۰ میں ہے ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا﴾ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، اور جو روگردانی کرے، سو ہم نے آپ کو ان کا نگران کر کے نہیں بھیجا) اور نبی کی تعظیم کے سلسلہ کے چند احکام یہ ہیں:

۱- نبی کی اطاعت واجب ہے۔سورۃ النساء آیت ۵۹ میں رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

۲- نبی پر درود بھیجنے کا حکم، جو سورۃ الاحزاب آیت ۵۶ میں ہے، وہ نبی کی تعظیم کے باب سے ہے۔

۳- نبی ﷺ کے سامنے بلند آواز سے بولنے کی جو ممانعت سورۃ الحجرات آیت ۲ میں آئی ہے وہ باب تعظیم سے ہے۔

④ نماز: نماز بادشاہوں کے دربار کی حضوری کے مشابہ ایک عبادت ہے، بادشاہ کے غلام جب بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور اس سے سرگوشی کرتے ہیں تو باادب دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ پس جس طرح بادشاہ سے کوئی درخواست کرنے سے پہلے اس کی تعریف میں قصیدہ پڑھتے ہیں اسی طرح نماز میں بھی دعا سے پہلے حمد وثنا کرنا

ضروری ہے، چنانچہ نماز کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہ اللہ کی حمد سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح بادشاہوں سے ملاقات کے وقت جن شرائط وقیود کا لحاظ ضروری ہے، نماز میں بھی ان کی پابندی ضروری ہے، جیسے وقت پر حاضر ہونا۔ بادشاہ کی طرف متوجہ رہنا، اِدھر اُدھر نہ دیکھنا، پاک صاف ہوکر اچھا لباس زیب تن کر کے حاضر دربار ہونا یہی سب باتیں: اوقات کی پابندی، استقبال قبلہ، طہارت بدن وثوب ومکان اور ستر عورت وغیرہ نماز کے لئے شرطیں ٹھہریں۔ پھر جب نماز شروع ہوجائے تو ہاتھ باندھ کر اللہ کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہوا اور اِدھر اُدھر بے ضرورتِ شدیدہ جھانکنا ممنوع ٹھہرا۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو (جان لے کہ) بیشک اللہ اس کے منہ کی جانب میں ہیں'' (یہ متفق علیہ حدیث کا ایک حصہ ہے جس میں نماز میں قبلہ کی طرف تھوکنے کی ممانعت آئی ہے)

وأما النبي: فلم يُسَمَّ مرسلاً إلا تشبيها برسل الملوك إلى رعاياهم، مُخبرين بأمرهم ونهيهم، ولم يوجَب عليهم طاعتُهم إلا بعد مساوَقة تعظيمهم لتعظيم المرسِل عندهم؛ فمن تعظيم النبي: وجوبُ طاعته، والصلاةُ عليه، وتركُ الجهر عليه بالقول.

وأما الصلاة: فَيُقْصد فيها التشبيهُ بحالِ عبيدِ الملِكِ عند مُثُولهم بين يديه، ومناجاتِهم إياه وخضوعِهم له، ولذلك وجب تقديم الثناء على الدعاء، ومُؤاخذةُ الإنسان نفسَه بالهيئات التي يجب مراعاتها عند مناجاة الملوك: من ضم الأطراف وترك الالتفات، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿إذا صلى أحدكم فإن الله قِبَلَ وجهه﴾ والله أعلم.

ترجمہ: اور رہا نبی: پس وہ مرسل نام نہیں رکھا گیا مگر تشبیہ دیتے ہوئے بادشاہوں کے فرستادوں کے ساتھ ان کی رعایا کی طرف (یعنی انبیاء کو رُسُل کہا ہی جاتا ہے بادشاہوں کے ایلچیوں کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ سے) جو لوگوں کو بادشاہوں کے اوامر ونواہی کی خبر دینے والے ہیں۔ اور نہیں واجب کی گئی لوگوں پر ان سفیروں کی اطاعت مگر اُن کی تعظیم کے ملزوم ہونے کے بعد لوگوں کے نزدیک بھیجنے والے کی تعظیم کے لئے (یعنی لوگوں کے نزدیک ان سفیروں کی تعظیم ان کے بھیجنے والے بادشاہ ہی کی تعظیم ہے یعنی ان کی تعظیم ملزوم ہے اور اس کے لئے مرسِل کی تعظیم لازم ہے) پس پیغمبر کی تعظیم کے باب سے ہے: اس کی اطاعت کا واجب ہونا، اس پر درود (بے پایاں رحمت) بھیجنا اور اس کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولنا۔

اور رہی نماز: پس اس میں ارادہ کیا جاتا ہے بادشاہ کے غلاموں کی حالت کے ساتھ مشابہت کا۔ ان کے کھڑے ہونے کے وقت بادشاہ کے روبرو، اور ان کے سرگوشی کرنے کے بعد بادشاہ سے اور ان کی تابعداری کرنے کے ساتھ بادشاہ کی، اور اسی وجہ سے (نماز میں) تعریف کو دعا سے مقدم کرنا ضروری ہوا اور آدمی کا اپنی ذات کو پابند کرنا ضروری ہوا ایسی ہیئتوں کے ساتھ جن کی رعایت بادشاہوں سے سرگوشی کے وقت ضروری ہے یعنی اعضاء کو ملانا (یعنی ہاتھ باندھنا

اور قدموں کو قریب کر کے کھڑا ہونا) اور ادھر اُدھر نہ دیکھنا اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے، تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کی جانب ہیں'' باقی اللہ بہتر جانتے ہیں!

لغات: مُسَاوَقَة مصدر بمعنی متابعت ہے۔اس کی وضاحت پہلے گذر چکی ہے...... مثول کھڑا ہونا مثل (ک،ن) مثولاً بین یدیه؛ کسی کے سامنے کھڑا ہونا۔

باب —— ۸

وضوء وغسل کے اسرار ورموز کا بیان

نیکی کے کاموں میں سے ایمانیات کے ذکر سے فارغ ہونے کے بعد اب اعمال اسلام کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اعمال اسلام میں سب سے اہم نماز ہے اور نماز کے لئے طہارت شرط ہے۔ اس لئے تمہید کے طور پر اس باب میں طہارت کی حکمتیں اور فوائد بیان کرتے ہیں۔ پہلے مبحث رابع کے باب رابع میں طہارت کے سلسلہ میں جو تفصیلات گذری ہیں ان پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس باب کے فہم میں مدد ملے گی۔

پاکی کے معاملہ میں تین طرح کے لوگ

طہارت کے معاملہ میں لوگوں کے تین مختلف درجات ہیں۔اعلیٰ درجہ کے لوگ وہ ہیں جو بصیرت ووجدان کی روشنی میں طہارت کا اہتمام کرتے ہیں یعنی وہ طہارت کے معاملہ میں پہلے سے بابصیرت ہوتے ہیں۔وہ ایک مقصد کی تحصیل کے لئے طہارت کا التزام کرتے ہیں۔دوسرے درجہ میں وہ لوگ ہیں جو پہلے سے تو بابصیرت نہیں ہوتے مگر جب وہ طہارت کا اہتمام شروع کرتے ہیں تو ان کو بصیرت حاصل ہوجاتی ہے۔رفتہ رفتہ ان کو طہارت کے فوائد وبرکات محسوس ہونے لگتے ہیں۔اور تیسرے اور آخری درجہ کے لوگ وہ ہیں جن کو اس دنیا میں طہارت کے نتائج حاصل نہیں ہوتے۔وہ بس ایک شرعی حکم سمجھ کر طہارت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔مگر آخرت میں وہ بھی محروم نہیں رہتے۔موت کے بعد وہ بھی طہارت کے فوائد وبرکات سے متمتع ہوتے ہیں۔تینوں درجوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا درجہ: کبھی انسان طبیعت کی کثافت اور تاریکی سے نجات پا کر حظیرۃ القدس (بارگاہ مقدس) کے انوار سے ہم کنار ہوتا ہے۔اس وقت اس شخص پر وہاں کے انوار چھا جاتے ہیں۔اور وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے فطری تقاضوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔آزاد ہونے کی صورت کیا ہوتی ہے؟ یہ سمجھنا مشکل ہے۔اس کی مختلف صورتوں میں کوئی صورت ہوتی ہے، جب یہ حالت پیش آتی ہے تو آدمی ملأ اعلیٰ کے ساتھ منسلک ہوجاتا ہے۔اور تجرید نفس یعنی مادہ سے پاک ہونے

کے اعتبار سے وہ گویا ملأ اعلیٰ کا ایک فرد بن جاتا ہے اس حالت میں انسان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ مگر یہ حالت کبھی کبھی پیش آتی ہے اور دیر تک باقی نہیں رہتی۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس حالت کو ''حالت بسط'' کہتے ہیں۔

پھر جب یہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور آدمی اپنی فطری حالت کی طرف لوٹ آتا ہے تو اس کو وہ پہلی والی حالت بار بار یاد آتی ہے اور وہ اس کے فوت ہو جانے سے پریشان ہوتا ہے۔ صوفیا کی اصطلاح میں اس حالت کو ''حالت قبض'' کہتے ہیں۔ اس حالت میں وہ کسی ایسی چیز کا مشتاق ہوتا ہے جو پہلی حالت سے مشابہ اور ملتی جلتی ہوتا کہ مجبوری کے درجہ میں اس کو غنیمت سمجھے، اور حالت اولیٰ میں سے فوت شدہ حصہ کو حاصل کرنے کے لئے اس دوسری حالت کو دام بنائے اس ترکیب سے وہ فوت شدہ حالت کے احوال میں سے کوئی حالت پالیتا ہے۔ پہلی حالت سے مناسبت رکھنے والی یہ چیز طہارت ہے۔ جب آدمی گندگیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور پاک وصاف کرنے والی چیزوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کو سرور و انشراح حاصل ہوتا ہے، جو پہلی حالت کے احوال میں سے ایک حال ہے۔ مجبوری کے درجہ میں آدمی اس کو غنیمت سمجھتا ہے اور اس سے دل بہلاتا ہے اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑتا ہے اور ہمیشہ باطہارت رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض یہ شخص علی وجہ البصیرت اپنی کھوئی ہوئی بہترین حالت کو حاصل کرنے کے لئے تدبیر کے طور پر طہارت کو اختیار کرتا ہے۔ اس کو پہلے سے طہارت کی اہمیت اور فوائد معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا درجہ: اس شخص کا ہے جس کو مخبر صادق یعنی انبیاء نے بتایا کہ طہارت انسان کا کمال ہے، وہ نصف ایمان ہے اور انسان کی اس حالت کو خالق جل مجدہٗ پسند فرماتے ہیں۔ مسواک کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ وہ منہ کی صفائی اور پروردگار کی خوشنودی کا ذریعہ ہے علاوہ ازیں طہارت میں بے شمار فوائد ہیں جن کا بیان اسی باب کے آخر میں آرہا ہے۔ اس شخص نے شہادت قلبی سے مخبر صادق کی یہ سب باتیں مان لیں اور اس کے احکام پر عمل شروع کر دیا، جب اس شخص نے طہارت کا عملی تجربہ کیا تو اس نے وہ سب باتیں برحق پائیں جو انبیاء نے بتائی تھیں۔ اور دنیا ہی میں اس پر رحمت خداوندی کے دروازے وا ہو گئے اور ملائکہ کے رنگ میں رنگین ہو گیا غرض یہ شخص عمل شروع کرنے کے بعد بابصیرت ہو گیا اور دنیا ہی میں طہارت کے فوائد لوٹنے لگا۔

تیسرا درجہ: اس شخص کا ہے جو مذکورہ باتوں میں سے کچھ بھی نہیں جانتا یعنی نہ تو وہ پہلے سے طہارت کے معاملہ میں بابصیرت ہوتا ہے، نہ عمل شروع کرنے کے بعد اس کو طہارت کے کچھ فوائد محسوس ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ مؤمن ہے، اس لئے شرعی ہدایات کے مطابق طہارت کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔

اس شخص کو اگر دنیا میں طہارت کے انوار و برکات محسوس نہ بھی ہوں تو بھی وہ محروم نہیں رہتا۔ طہارت اس میں استعداد پیدا کرتی ہے اور وہ موت کے بعد ملائکہ کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔ گویا یہ لوگ کشاں کشاں جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

﴿ باب أسرار الوضوء والغسل﴾

اعلم :أن الإنسان قد يُخْتَطَفُ من ظلمات الطبيعة إلى أنوار حظيرة القدس، فتغلب عليه تلك الأنوارُ، ويصير ساعةً مَّا بريئا من أحكام الطبيعة، بوجه من الوجوه، فينسلك في سلكهم، ويصير فيما يرجع إلى تجريد النفس كأنه منهم، ثم يُرَدُّ إلى حيث كان، فيشتاق إلى ما يناسب الحالةَ الأولى، ليغتنمه عند فقدها، ويجعله شَرَكًا لاقتناص الفائتِ منها، فيجد بهذه الصفة حالةً من أحواله،وهي: السرور والانشراح الحاصلُ من هَجْرِ الرُّجْزِ واستعمالِ المطهِّرَاتِ، فَيَعَضُّ عليها بنواجذه.

ويتلوه: إنسانٌ سمع المخبرَ الصادقَ يُخْبِر بأن هذه الحالةَ كمالُ الإنسان، وأنه ارتضاها منه بارئُه، وأن فيها فوائدَ لا تُحصى، فصدَّقَه بشهادة قلبه، ففعل ما أَمَرَ به، فوجدما أخبر به حَقًّا، وفُتحت عليه أبوابُ الرحمة، وانصبغ بصبغ الملائكة.

ويتلوه: رجلٌ لايعلم شيئا من ذلك، لكن قَادَهُ الأنبياءُ عليهم السلام وألجأوه إلى هيئات تُعِدُّ لَهُ في معاده لِلانسلاك في سِلك الملائكة، وأولئك قوم جُرُّوا بالسلاسل إلى الجنة.

ترجمہ: باب: وضوء اور غسل کے رموز کا بیان: جان لیں کہ انسان کبھی اُچک لیا جاتا ہے (یعنی یہ حالت غیر اختیاری ہے) طبیعت کی تاریکیوں سے حظیرۃ القدس کے انوار کی طرف، پس چھا جاتے ہیں اس پر وہ انوار اور وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے طبیعت کے احکام سے آزاد ہو جاتا ہے، آزاد ہونے کی صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ، پس وہ ملأ اعلی کی لڑی میں منسلک ہو جاتا ہے (یہاں مرجع کے ذکر کے بغیر ملأ اعلی کی طرف ضمیر لوٹائی ہے، کیونکہ حجت اللہ کے قاری کے ذہن میں ملأ اعلی کا تصور ہر وقت رہتا ہے) اور وہ اُن باتوں میں جن کا نفس کی تجرید سے تعلق ہے، ہو جاتا ہے گویا وہ انہیں میں سے ہے (یعنی اس کا جسم تو مادی ہے اس لئے اس حیثیت سے تو وہ ملائکہ کا فرد نہیں بن سکتا۔ مگر اس کا نفس ناطقہ مجرد ہے۔ اس لئے اس جہت سے وہ گویا فرشتہ بن جاتا ہے اسی کو ''فرشتہ صفت'' کہتے ہیں) پھر وہ لوٹا دیا جاتا ہے اُس جگہ کی طرف جہاں وہ تھا۔ پس وہ مشتاق ہوتا ہے اس چیز کی طرف جو پہلی حالت سے مناسبت رکھتی ہے تاکہ وہ اس کو غنیمت سمجھے جبکہ وہ پہلی حالت گم ہو گئی۔ اور وہ اس مناسب چیز کو دام بنائے، حالت اولی میں سے فوت شدہ کو شکار کرنے کے لئے۔ پس پالے وہ اس مناسب چیز کے ذریعہ اس فوت ہونے والی چیز کے احوال میں سے کسی حالت کو۔ اور وہ حالت سرور وانشراح ہے، جو حاصل ہوتا ہے گندگی کو چھوڑنے سے اور پاک کرنے والی چیزوں کے استعمال سے،

پس وہ اس حالت کو اپنی ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑتا ہے۔

اور اس کے بعد درجہ ہے اس شخص کا جس نے مخبر صادق سے سنا، جو اطلاع دیتا ہے کہ یہ حالت انسان کا کمال ہے اور یہ سنا کہ انسان کی اس حالت کو خالق تعالیٰ پسند فرماتے ہیں اور یہ بھی سنا کہ اس حالت (طہارت) میں بے شمار فوائد ہیں۔ پس اس نے دل کی گواہی سے اس مخبر کی تصدیق کی اور جو کچھ اس نے حکم دیا اس پر عمل کیا، پس اس نے اس بات کو برحق پایا جس کی اس مخبر صادق نے خبر دی تھی۔ اور اس پر رحمت خداوندی کے دروازے کھول دیئے گئے اور وہ ملائکہ کے رنگ میں رنگین ہو گیا۔

اور اس کے بعد درجہ ہے اس شخص کا جو اُن باتوں میں سے کچھ بھی نہیں جانتا، لیکن انبیاء نے اس کو کھینچا اور مجبور کیا، ایسی ہیئتوں کی طرف جو اس کو تیار کریں آخرت میں ملائکہ کی لڑی میں پروئے جانے کے لئے اور یہ وہ لوگ ہیں جو زنجیروں کے ذریعہ جنت کی طرف کھینچے گئے یعنی احکام کا اتباع کر کے جنت کے حقدار بن گئے۔



حدث کی قسمیں: حدثِ اصغر اور حدثِ اکبر

حدث (ناپاکی) طہارت (پاکی) کی ضد ہے۔ طہارت سے سرور وانشراح حاصل ہوتا ہے اور حدث سے انقباض وگرفتگی لاحق ہوتی ہے۔ اور وہ حدث جو واضح اور محسوس ہیں اور ان میں چار باتیں پائی جاتی ہیں: ۱- سرسری نظر میں بھی ان کے اثرات نفس میں محسوس کئے جاتے ہیں۔ ۲-: جو اس لائق ہیں ہے کہ ان کے بارے میں عام لوگوں سے گفتگو کی جائے اور ان کے بارے میں احکام دیئے جائیں، کیونکہ وہ ان کو پہچان سکتے ہیں۔ ان کے پائے جانے کی جگہیں متعین ہیں اور وہ سبیلین اور شرمگاہ ہیں۔ ۳-: وہ حدث بہ کثرت پائے جاتے ہیں ۴-: اگر طہارت کے ذریعہ ان کی تلافی کی تعلیم نہ دی جائے تو لوگوں کا بھاری نقصان ہوگا ــــ استقراء یعنی جائزہ لینے سے ایسے احداث دو جنسوں میں منحصر ہیں: ایک حدث اصغر جو موجب وضوء ہے، دوسرا: حدث اکبر جو موجب غسل ہے۔ دونوں قسموں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلی قسم: یعنی حدثِ اصغر: معدے میں پیدا ہونے والے تین فضلات: ریاح اور بول و براز میں مشغولیت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جب پیٹ میں ریاح اکٹھی ہوتی ہے یا بول و براز کا شدید تقاضا ہوتا ہے تو دل پریشان ہوتا ہے اور نفس پستی کی طرف مائل ہوتا ہے اور حیران و پریشان اور منقبض و دل گرفتہ شخص کی طرح ہوتا ہے اور نفس کے درمیان اور سرور وانشراح کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے آدمی بہجت و سرور سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر جب آدمی

فضلات ثلاثہ سے پاک وصاف ہوجاتا ہے۔ ریاح خارج ہوجاتی ہے اور بول وبراز سے ہلکا ہوجاتا ہے اور وضوء یا غسل کرتا ہے جو نفس کو صفت طہارت سے آگاہ کرتے ہیں تو وہ سرور وانشراح پاتا ہے اور وہ ایسا ہوجاتا ہے جیسے اس نے اپنی کوئی گم شدہ چیز پالی۔

دوسری قسم: یعنی حدثِ اکبر: نفس کا شہوتِ جماع میں مشغول ہونا اور اس میں ڈوب جانا ہے۔ کیونکہ یہ مشغولیت نفس کا رخ بالکلیہ طبیعت بہیمیہ کی طرف پھیر دیتی ہے اور ملکیت سے اس کا تعلق منقطع سا ہوجاتا ہے۔ ایک مثال میں غور کریں: جو چوپائے کسی خلاف فطرت کام کے لئے سِدھائے جاتے ہیں اور ان کو مطلوبہ آداب کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور وہ سرکس وغیرہ میں کرتب دکھاتے ہیں۔ اور شکاری جانور کتے وغیرہ کو شکار کرنے کا طریقہ بھوکا اور بیدار رکھ کر سکھایا جاتا ہے اور مالک کے لئے شکار روکنے کا اور اس میں سے نہ کھانے کا عادی بنایا جاتا ہے۔ اور طوطا مینا وغیرہ پرندوں کو انسانوں کی بولی سکھائی جاتی ہے۔ غرض کسی بھی جانور کو سعی بلیغ کر کے اس کی فطرت کے خلاف باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے اگر ان حیوانات کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور وہ مادّہ سے ملیں اور چند روز تک وہ شہوتِ جماع پوری کریں اور اس لذت میں ڈوبے رہیں تو ضرور وہ تعلیم بھول جائیں گے جو ان کو دی گئی ہے اور وہ بصیرت کے فقدان، جہالت اور گمراہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ انسانوں کا حال بھی ان حیوانات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے ربما ضاع العلمُ بین أفخاذ النساء (کبھی علم عورتوں کی رانوں کے درمیان ضائع ہوجاتا ہے) یعنی جو اس لذت میں ہمہ وقت منہمک رہتا ہے اس کا علم ضائع ہوجاتا ہے۔ وہ سب پڑھا پڑھایا بھول جاتا ہے۔

اور غور کرنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جماع کی خواہش کو پورا کرنا جس قدر نفس کو بہیمیت سے آلودہ کرنے میں کارگر ہے اتنا پُرخوری، لڑائی جھگڑا اور دیگر وہ چیزیں کارگر نہیں جو نفس کا رخ بہیمیت کی طرف پھیرتی ہیں اور جسے شک ہو اپنے نفس پر تجربہ کر کے دیکھ لے اور اطباء نے سنیاسیوں، تارک الدنیا راہبوں کے نفس کو بہیمیت کی طرف لوٹانے کے لئے جو تدبیر لکھی ہے اس کو پڑھے۔ یہ لوگ عرصہ تک عورتوں سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے قوت باہ کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اگر اپنی قوت باہ بحال کرنا چاہیں تو اس کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جانوروں کی جفتی دیکھیں، قوی الباہ لوگوں کے جماع کے واقعات پڑھیں اور باہ کو قوی کرنے والی غذائیں استعمال کریں اور مروخات ودُلوکات کا استعمال کریں (شرح الاسباب والعلامات ۲: ۸۳ فی مبحث علل اعضاء التناسل من الذکران، باب نقصان الباہ) رفتہ رفتہ ان کا نفس بہیمیت کی طرف لوٹ آئے گا اور ان کی مردہ قوت باہ انگڑائیاں لینے لگے گی۔ جب یہ چیزیں بہیمیت پیدا کرنے میں اتنی کارگر ہیں، تو خود جماع کی شہوت کو پورا کرنا کس قدر نفس کو بہیمیت سے آلودہ کرے گا یہ بات ظاہر ہے۔ مگر جس طرح کھانا پینا ایک فطری ضرورت ہے، جماع بھی ایک فطری تقاضا ہے اس لئے دین فطرت نے اس پر پابندی نہیں لگائی، البتہ اس کی مضرات کا علاج تجویز کیا ہے جو اگلے عنوان کے تحت آرہا ہے۔

الحدثُ الذی یُحَسُّ أَثَرُهُ فی النفس بادیَ الرأی، والذی یلیق أن یخاطَب به جمهورُ الناس، لانضباط مظانّه، والذی یَکثر وقوعُ مثلِه، وفی إهمال تعلیمه ضررٌ عظیم بالناس، منحصرٌ استقراءً فی جنسین:

أحدهما: اشتغال النفس بما یجد الإنسانُ فی معدته من الفُضول الثلاثة: الریح، والبول، والغائط، فلیس من البشر أحد إلا ویعلم من نفسه: أنه إذا وجد فی بطنه الریاحَ، أو کان حاقبا حاقنا، خَبُثَتْ نفسُه، وأَخْلَدَتْ إلی الأرض، وصارت کالحائرة المنقبضة، وکان بینها وبین انشراحها حجابٌ، فإذا اندفعت عنه الریاحُ وتَخَفَّفَ عنه الأخبثانِ، واستعمل ما یُنَبِّهُ نفسَه للطهارة، کالغسل والوضوء، وجد انشراحاً وسرورًا، وصار کأنه وَجد ما فَقد.

والثانی: اشتغالُ النفس بشَهوة الجماع، وغوصُها فیها، فإن ذلك یصرف وجهَ النفس إلی الطبیعة البهیمیة بالکلیة. حتی إن البهائمَ إذا ارتیضت ومُرِّنَتْ علی الآداب المطلوبة، والجوارحَ إذا ذُلِّلَتْ بالجوع والسَهر، وعُلِّمَتْ إمساكَ الصید علی صاحبها، والطیورَ إذا کُلِّفَتْ بمحاکاة کلام الناس، وبالجملة: کلُّ حیوان أُفرغ الجُهْدُ فی أزالةِ ماله من طبیعته، واکتسابِ مالا تقتضیه طبیعتُه، ثم قَضیٰ هذا الحیوانُ شهوةَ فرجه، وعَافَسَ الإناثَ، وغاص فی تلك اللذةِ أیاماً، لا بد أن ینسی ما اکتسبه، ورجع إلی عَمَهٍ وَجهلٍ وضلال.

ومن تأَمَّل فی ذلك عَلِمَ لا مُحالة: أن قضاء هذه الشهوة یُؤَثِّرُ فی تلویث النفس مالا یؤثره شیئٌ من کثرة الأکل، والمغامرة،وسائرِ ما یُمیل النفسَ إلی الطبیعة البهیمیة؛ وَلْیُجَرِّب الإنسانُ ذلك من نفسه، ولْیَرْجِعْ إلی ما ذکره الأطباءُ فی تدبیر الرُّهبان المنقطعین، إذا أُرید إرجاعُهم إلی النفس البهیمیة.

ترجمہ: اور وہ حدث جس کا اثر بادی الرائی میں نفس کے اندر محسوس کیا جاتا ہے اور جو اس لائق ہے کہ عام لوگوں کو اس کے بارے میں احکام دیئے جائیں، اس کی احتمالی جگہوں کے منضبط ہونے کی وجہ سے اور جن کے مانند کا وقوع بہ کثرت ہوتا ہے اور جس کی تعلیم کے چھوڑنے میں لوگوں کا بھاری نقصان ہے، جائزہ لینے سے ایسی ناپاکیاں دو جنسوں میں منحصر ہیں۔

اول: نفس کا اس چیز میں مشغول ہونا جس کو انسان اپنے معدے میں پاتا ہے یعنی تین نکمی چیزیں: ریاح، پیشاب اور پاخانہ۔ پس کوئی بھی انسان نہیں ہے مگر درانحالیکہ وہ اپنے بارے میں جانتا ہے کہ جب اس کے پیٹ میں ریاح اکٹھا

ہوتی ہے یا اس کو بول و براز کا شدید تقاضا ہوتا ہے تو اس کا دل پریشان ہوتا ہے۔ اور وہ زمین کی (پستی) طرف مائل ہوتا ہے۔ اور وہ نفس حیران و گرفتہ نفس کی طرح ہوجاتا ہے۔ اور اس کے درمیان اور اس کے انشراح کے درمیان ایک پردہ حائل ہوجاتا ہے۔ پھر جب ریاح اس سے ہٹ جاتی ہے اور وہ نہایت گندی چیزیں اس سے ہلکی ہوجاتی ہیں۔ اور وہ اس چیز کو استعمال کرتا ہے جو اس کے نفس کو پاکی سے آگاہ کرتی ہیں۔ جیسے نہانا اور وضو کرنا تو وہ انشراح و سرور کو پاتا ہے۔ اور وہ ہوجاتا ہے گویا اس نے وہ چیز پالی جس کو اس نے گم کیا تھا۔

دوم: نفس کا شہوت جماع میں مشغول ہونا ہے اور اس کا اس میں ڈوبنا ہے۔ پس بیشک یہ چیز نفس کا بالکلیہ رخ پھیر دیتی ہے طبیعت بہیمیہ کی طرف، حتی کہ چوپائے جب سدھائے جاتے ہیں اور ان کو مطلوبہ طریقوں کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور شکاری جانوروں کو جب مسخر کیا جاتا ہے بھوکا رکھ کر اور بیدار رکھ کر اور ان کو سکھلا دیا جاتا ہے شکار کو اپنے مالک کے لئے روکنا، اور پرندے جب مکلف کئے جاتے ہیں انسانوں کی بات کی نقل کرنے کے اور مختصر یہ کہ خواہ کوئی حیوان ہو جب انتہائی کوشش صرف کی جاتی ہے اس طبیعت کو ہٹانے میں جو اس میں ہے اور اس چیز کے حاصل کرانے میں جس کو اس کی طبیعت نہیں چاہتی۔ پھر جب یہ جانور اپنی شرمگاہ کی خواہش پوری کرتا ہے اور وہ مادہ کی مزاولت کرتا ہے اور اس لذت میں چندروز ڈوب جاتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس چیز کو بھول جائے جو اس نے حاصل کی ہے اور وہ لوٹ جاتا ہے بصیرت کے فقدان، جہالت اور گمراہی کی طرف۔

اور جو شخص اس میں غور کرے گا وہ لامحالہ جان لے گا کہ جماع کی خواہش کو پورا کرنا نفس کو گندہ کرنے میں ایسا کارگر ہوتا ہے جیسا کوئی دوسری چیز کارگر نہیں ہوتی یعنی کھانے کی زیادتی اور موت سے بے پرواہ ہوکر مقابلہ کرنا اور دیگر وہ چیزیں جو نفس کو طبیعت بہیمیہ کی طرف مائل کرتی ہیں، اور چاہئے کہ انسان اس چیز کا اپنے نفس پر تجربہ کرے اور چاہئے کہ وہ مطالعہ کرے اس کا جس کو اطباء نے ذکر کیا ہے تارک الدنیا راہبوں کی تدبیر کے سلسلہ میں جب ان کو نفس بہیمیہ کی طرف لوٹانے کا ارادہ کیا جائے۔

لغات:

مَظَانّ جمع مَظِنَّة گمان کی جگہ یعنی کسی چیز کے ملنے کی احتمالی جگہ...... الجارِحَة: شکاری درندہ یا پرندہ یا کتا، جمع جَوارح...... ذَلَّلَهُ: ذلیل کرنا، ـــ نا...... عَافَسَهُ: مزاولت کرنا، لینا، تعلق قائم کرنا...... العَمَه: بصیرت کا فقدان عمه (ف،س) عَمَهًا: متحیر ہونا، گمراہی میں بھٹکنا...... غامره مغامرة: موت سے بے پرواہ ہوکر لڑنا۔

تصحیح: وأخلَدَتْ اصل میں فَأَخَذَتْ تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

طہارت کی دوقسمیں: صغری اور کبری

طہارت کے چار مراتب ہیں: پہلا ظاہر کو گندگیوں سے پاک کرنا۔ دوسرا: اعضاء کو گناہوں سے بچانا تیسرا: دل کو گندے اخلاق سے صاف کرنا چوتھا: دل سے غیر اللہ کا خیال نکالدینا۔ یہ مراتب نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتے ہیں۔ آخری مرتبہ تک پہنچنے کے لئے ابتدائی مراحل سے گذرنا ضروری ہے یعنی سب سے پہلے ظاہر کی طہارت کا اہتمام ضروری ہے۔ اس کا باطن پر اثر پڑے گا تو اعضاء نافرمانیوں سے احتراز کریں گے اور طاعات کا التزام کریں گے اور ظاہری اقوال وافعال اور حرکات وسکنات کا بالضرور دل پر اثر پڑتا ہے پس دل اخلاق رذیلہ سے پاک صاف ہوجائے گا اور رفتہ رفتہ آدمی درجۂ کمال تک پہنچ جائے گا یعنی دل ماسوی اللہ سے پاک ہوجائے گا یہی آخری درجہ مطلوب ہے، ابتدائی تین مراتب اس آخری درجہ تک پہنچنے کے لئے درجات (سیڑھیاں) ہیں۔ ان میں بھی سب سے پہلا اور بنیادی درجہ ظاہری پاکی کا ہے۔ کیونکہ اس کے اثرات سرسری نظر میں بھی نفس کے اندر محسوس کئے جاتے ہیں۔ اور ظاہری پاکی اس لائق ہے کہ اس کے بارے میں عام لوگوں کو احکام دیئے جائیں کیونکہ اس طہارت کا ذریعہ یعنی پانی دنیا کے آباد ملکوں میں ہر جگہ موجود ہے اور اس کا معاملہ عام لوگوں کے قابو میں بھی آسکتا ہے اور جس کے تمام پاکیوں میں انسان کے باطن پر گہرے اثرات پڑتے ہیں اور جو لوگوں کے درمیان ایک مشہور مانی ہوئی پاکی ہے یعنی تمام لوگ پانی سے دھونے کو پاکی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ایک فطری طریقہ ہے یعنی پانی سے پاکی حاصل کرنا لوگوں کی فطرت میں داخل ہے۔، ان کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہوئی ہے۔

جائزہ لینے سے ایسی طہارت دو جنسوں میں منحصر ہے ایک طہارت کبری دوسری طہارت صغری:

(۱) طہارت کبری: پورا جسم پانی سے مل کر دھونے سے اعلی درجہ کی پاکی حاصل ہوتی ہے کیونکہ پانی پاک کرنے والا اور نجاستوں کو دور کرنے والا ہے سلیم طبیعتوں نے پانی کی یہ تاثیر مان لی ہے، اس لئے طہارت کبری نفس کو پاکیزگی کی حالت یاددلانے کا ایک اعلی اور بہترین ذریعہ ہے۔

سوال: طہارت، حدث کی ضد ہے، اور آدمی ایک ضد سے کود کر دوسری ضد پر دفعۃً کیسے پہنچ سکتا ہے؟ یعنی ابھی تو آدمی ناپاک تھا اور نہایت گندہ (نجاست کبری میں مبتلا) تھا۔ اور نہاتے ہی یک دم پاک ہوگیا اور اعلی درجہ کا پاک وصاف ہوگیا یہ بات کیسے ممکن ہے؟

جواب: کبھی انتقال دفعی ہوتا ہے یعنی احوال یکبارگی بدلتے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

پہلی مثال: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی شراب پی کر مست ہوجاتا ہے، نشہ اس پر ایسا چڑھ جاتا ہے کہ وہ پاگل سا ہوجاتا ہے، اُسے کوئی ہوش نہیں رہتا۔ اسی حالت میں بعض مرتبہ اس سے کوئی بڑی کوتاہی سرزد ہوجاتی ہے مثلاً وہ کسی کو ناحق قتل

کر دیتا ہے یا اپنا یا کسی کا کوئی غایت درجہ نفیس وقیمتی مال ضائع کر دیتا ہے تو یکا یک اس کو ہوش آجا تا ہے۔ اس کا نفس چوکنا ہوجاتا ہے اور وہ ہر بات سمجھنے لگتا ہے اور اس کا سارا نشہ ہرن ہوجاتا ہے۔ یہی انتقال دفعی ہے۔

دوسری مثال: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نحیف ونزار شخص جس میں نہ کسی کام کی طاقت ہوتی ہے نہ اٹھنے کی سکت ہوتی ہے۔ اتفاقاً اس کو سخت غصہ آجاتا ہے یا رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے یا مسابقت کی دھن سوار ہوجاتی ہے تو وہ بڑے سے بڑا کارنامہ کر گذرتا ہے یا دل دہلانے والی خون ریزی کر بیٹھتا ہے۔ یہی یکبارگی انتقال ہے۔

غرض نفس میں فوری انتقال ہوتا ہے یعنی کبھی نفس کے احوال یکبارگی بدل جاتے ہیں وہ ایک حالت میں ہوتا ہے اور اس کو فوراً ہی دوسری حالت یاد آجاتی ہے اور اصلاح نفس کی بہترین صورت بھی یہی ہے کہ یک دم آدمی بری زندگی سے نکل کر اچھی زندگی میں آجائے۔ تدریجاً اصلاح بھی ہوتی ہے مگر اس میں دیر لگتی ہے اور وہ کچھ بہت زیادہ مضبوط بھی نہیں ہوتی اور یک لخت جس کی حالت بدل جاتی ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اور بزرگوں کے متوسلین میں اس کی صدہا مثالیں ہیں کہ اچانک زندگی کی کایا پلٹ گئی اور وہ دفعۃً انسانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے پس اسی طرح طہارت کے معاملہ کو سمجھنا چاہئے کہ نہاتے ہی فوراً آدمی حدث اکبر سے نکل کر طہارت کبریٰ کا مقام پالیتا ہے۔

مگر یہ بات یعنی فوری تنبّہ اسی چیز سے حاصل ہوسکتا ہے جس کے متعلق یہ اعتقاد دل میں بیٹھا ہوا ہو کہ اس سے اعلیٰ درجہ کی پاکی حاصل ہوسکتی ہے اور ایسی چیز صرف پانی ہے۔ مٹی ضرورت کے وقت اس کا قائم مقام ہے اس میں یہ شان نہیں ہے۔ کیونکہ قدرت نے پانی کو طہور (بذات خود پاک اور دوسری چیزوں کو پاک کرنے والا) پیدا کیا ہے۔ سورۃ الفرقان آیات ۴۸ و ۴۹ میں ہے کہ: ''وہ اللہ ایسا ہے کہ باران رحمت سے پہلے بارش کی خوشخبری دینے کے لئے، بارانی ہواؤں کو بھیجتا ہے اور ہم نے آسمان سے پاک صاف کرنے والا پانی برسایا تاکہ اس کے ذریعہ مردہ زمینوں میں جان ڈال دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو سیراب کریں''۔

مردہ زمینوں میں جان پڑنے کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ پانی پڑتے ہی مردہ زمینوں میں زندگی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، جہاں خاک اڑ رہی تھی وہاں سبزہ زار بن جاتا ہے اور فن اعتبار سے یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ مردہ دل یعنی ناپاک لوگ جب پانی سے پاکی حاصل کرتے ہیں تو ان میں جان پڑ جاتی ہے۔ واللہ اعلم (آیت سے یہ استدلال شارح نے بڑھایا ہے)

(۲) **طہارت صغریٰ:** صرف اطراف بدن (سر، منہ، ہاتھ اور پاؤں) کے دھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اطراف پر اکتفا کرنے کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: دنیا کے تمام آباد خطوں میں لوگ عموماً ان اعضاء کو کھلا رکھتے ہیں، کپڑوں میں نہیں چھپاتے۔ یہی ان کا فطری طریقۂ زندگی ہے اور حدیث شریف میں جو اِشتِمالِ صمّاء کی ممانعت آئی ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے۔

صَمَّاء، أَصَمُّ کا مؤنث ہے جس کے معنی ہیں ٹھوس، سخت، مضبوط۔اور اشتمال کے معنی ہیں سارے جسم پر کپڑا لپیٹنا اور اشتمال صماء کے معنی ہیں: چادر اس طرح اوڑھنا کہ ہاتھ اندر دب جائیں اور یہ ممنوع اس لئے ہے کہ بوقت حاجت ہاتھوں سے کام نہیں لیا جاسکے گا۔اس حدیث میں اشارہ ہے کہ لوگ عموماً ہاتھ کھلے رکھتے ہیں تا کہ بوقت حاجت ان سے فوراً کام لیا جاسکے۔یہی معاملہ پیروں کا اور چہرہ کا ہے۔

غرض اطراف جسم چونکہ عام طور پر کھلے رہتے ہیں اس لئے ان کو وضو میں بار بار دھونے میں کوئی حرج اور تنگی نہیں ہے اور باقی جسم چونکہ کپڑوں میں مستور رہتا ہے،اس لئے بار بار ہرکس وناکس کے سامنے ان کو کھولنے میں اور دھونے میں حرج ہے۔

دوسری وجہ: شہری تمدن میں، جو ترقی یافتہ تمدن ہے، روزانہ اطراف بدن (ہاتھ، منہ اور پاؤں) کو دھونے کا عام رواج اور عادت ہے، اسی طرح جب لوگ سلاطین وحکام کے پاس جاتے ہیں تو بھی ان اعضاء کو دھولیا کرتے ہیں نیز جب لوگ کوئی پاکیزہ کام مثلاً کھانا یا کوئی مقدس چیز لینے کا ارادہ کرتے ہیں تب بھی وہ اطراف کو دھوتے ہیں، سارا بدن نہیں دھوتے۔غرض ان دو وجہوں سے طہارت صغری میں اطراف بدن کے دھونے پر اکتفا کی گئی ہے، سارا بدن یا چھپے اعضاء کو دھونا ضروری قرار نہیں دیا گیا۔

گہری وجوہ: اوپر طہارت صغری میں اطراف بدن کے دھونے پر اکتفا کرنے کی جو دو وجہیں بیان کی گئی ہیں وہ عام فہم اور سرسری وجوہ ہیں۔اب اس کی گہری وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔اور وہ بھی دو ہیں:

پہلی وجہ: اطراف جسم چونکہ عموماً کھلے رہتے ہیں اس لئے بہت جلد ان پر گرد وغبار جم جاتی ہے اور یہی اعضاء باہمی ملاقات کے وقت دیکھے جاتے ہیں اس لئے ان کا گرد وغبار میں اٹا پٹا رہنا مناسب نہیں۔ان کو دھوکر صاف رکھنا چاہئے تا کہ آدمی اچھا نظر آئے اور دوسرے شخص کو دیکھنے سے تکدر نہ ہو۔

دوسری وجہ: تجربہ شاہد ہے کہ اطراف دھونے سے اور چہرے اور سر پر پانی چھڑکنے سے نیند بالکل اڑ جاتی ہے اور گہری بے ہوشی بھی دور ہوجاتی ہے۔اس بات کو ہر شخص اپنے ذاتی علم وتجربہ سے جان سکتا ہے اور طب کی کتابوں کے مطالعہ سے بھی یہ بات آشکارہ ہے اطباء نے بے ہوشی، اسہال کی زیادتی اور فصد کا خون زیادہ بہنے کا علاج تبرید تجویز کیا ہے، جو اطراف پر پانی چھڑکنے سے حاصل ہوتی ہے۔غرض نماز سے پہلے وضو اسی لئے ضروری ہوا ہے کہ آدمی میں نشاط پیدا ہوجائے، نیند، کسل اور سستی دور ہوجائے اور آدمی توجہ قلبی سے عبادت کرے۔

والطهارة: التى يُحَسُّ أثَرُهَا بادى الرأى، والتى يليق أن يُخَاطَبَ بها جمهورُ الناس، لكثرة وجودِ آلَتِهَا فى الأقاليم المعمورة، أعنى الماءَ، وانضباطِ أمرها، والتى هى أوقع الطهارات فى نفوس البشر، وكالمسلَّمات المشهورة بينهم، مع كونها كالمذهب الطبيعى، تنحصر

بالاستقراء في جنسين: صغرى وكبرى:

أما الكبرى: فتعميم البدن بالغَسل والدلك، إذ الماءُ طَهور، مزيلٌ للنجاسات، قد سلَّمت الطبائع منه ذلك، فهي آلة صالحة لتنبيه النفس على خُلَّةِ الطهارة.

ورب إنسان شرب الخمر وثَمِلَ، وغلب السكرُ على طبيعته، ثم فرط منه شيئٌ: من قتلٍ بغير حق، أو إضاعةِ مالٍ في غاية النفاسة، فتنبهت نفسُه دفعة، وعَقَلَتْ، وكُشفت عنها الثمالة؛ ورب إنسان ضعيفٍ لايستطيع أن ينهض، ولا أن يباشر شيئًا، فاتفقت واقعةٌ تُنَبِّهُ النفسَ تنبيها قويا: من عروض غضب، أو حَمِيَّةٍ، أو منافسةٍ، فَعَالج معالجةً شديدةً، وسفك سَفْكا بليغاً.

وبالجملة: فللنفس انتقال دفعي، وتَنَبُّهٌ من خصلة إلى خصلة؛ هو العمدة في المعالجات النفسانية؛ وإنما يحصل هذا التنبُّهُ بما رُكز في صميم طبائعهم وجَذْرِ نفوسهم: أنه طهارة بليغة، وما ذلك إلا الماء.

والصغرى: الاقتصار على غَسل الأطراف، وذلك: لأنها مواضعُ جرت العادة في الأقاليم الصالحة بانكشافها وخروجِها من اللباس، لمذهب طبيعي، إليه وقعت الإشارةُ حيث نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن اشتمال الصَّمَّاء، فلا يتحقق حرجٌ في غَسلها، وليس ذلك في سائر الأعضاء.

وأيضا: جرت العادة في أهل الحضر بتنظيفها كلَّ يوم، وعند الدخول على الملوك وأشباههم، وعند قصد الأعمالِ النظيفة.

وفِقْهُ ذلك: أنها ظاهرة، تَسْرُعُ إليها الأوساخُ، وهي التي تُرى وتُبصر عند ملاقاة الناس: بعضِهم ببعض.

وأيضا: التجرِبة شاهدةٌ بأن غَسل الأطراف، ورشَّ الماء على الوجه والرأس يُنَبِّهُ النفسَ من نحوِ النوم والغشي المُثْقِل تنبيها قويًا؛ ولْيرجع الإنسان في ذلك إلى ما عنده من التجرِبة والعلم، وإلى ما أمربه الأطباءُ في تدبير من غُشي عليه، أو أفرط به الإسهالُ والفصدُ.

ترجمہ: اور وہ پاکی جس کا اثر سرسری نظر میں محسوس کیا جاتا ہے اور جو اس لائق ہے کہ عام لوگوں کو اس کے احکام دیئے جائیں، آبادخطوں میں آلۂ طہارت کے بکثرت پائے جانے کی وجہ سے (آلۂ طہارت سے) میری مراد پانی ہے اور طہارت کے معاملہ کے منضبط ہونے کی وجہ سے (یعنی اس کا معاملہ عام لوگوں کے قابو میں آسکتا ہے اور وہ بہ سہولت اس پر عمل کرسکتے ہیں) اور وہ طہارت جو انسانوں کے نفوس میں تمام طہارتوں سے زیادہ مؤثر ہے، اور لوگوں کے

درمیان مسلمات مشہورہ کی طرح (رائج) ہے، اس کے فطری طریقہ جیسا ہونے کی وجہ سے (یعنی یہ امر صورت نوعیہ میں تو چھپایا نہیں گیا، مگر کثرت مزاولت سے فطری امر جیسا ہوگیا ہے) استقراء سے ایسی طہارت دو جنسوں میں منحصر ہے ایک صغری دوسری کبری۔

رہی کبری: تو وہ سارے بدن کو دھونا اور ملنا ہے، کیونکہ پانی پاک، صاف کرنے والا اور نجاستوں کو زائل کرنے والا ہے۔ تمام طبیعتوں نے پانی کی یہ تاثیر مان لی ہے۔ پس طہارت کبری بہترین ذریعہ ہے نفس کو خصلت طہارت سے آگاہ کرنے کا۔

(سوال مقدر کا جواب) اور بعضا آدمی شراب پیتا ہے اور مدہوش ہوجاتا ہے اور نشہ اس کی طبیعت پر چھا جاتا ہے پھر اس سے کوئی بڑی کوتاہی سرزد ہوجاتی ہے یعنی کسی کو ناحق قتل کرتا ہے یا کوئی غایت درجہ نفیس مال ضائع کرتا ہے تو یکا یک اس کا نفس چوکنا ہوجاتا ہے اور وہ بات سمجھنے لگتا ہے اور اس کا نشہ ہرن ہوجاتا ہے —— اور بعضا انسان ضعیف ہوتا ہے، اٹھنے کی بھی اس میں سکت نہیں ہوتی اور نہ کسی کام کے کرنے کی اس میں طاقت ہوتی ہے پس اتفاقاً کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کے نفس کو بہت ہی زیادہ جھنجھوڑ دیتا ہے یعنی غصہ کا پیش آنا، یا حمیت یا منافست، پس وہ بڑے سے بڑا کارنامہ کر گذرتا ہے اور دل دہلانے والی خون ریزی کر ڈالتا ہے۔

اور حاصل کلام: پس نفس کے لئے دفعی (فوری) انتقال ہے اور ایک خصلت سے دوسری خصلت کی طرف چوکنا ہونا ہے۔ (اور) وہ (فوری انتقال) معالجات نفسانیہ (اصلاح نفس) میں نہایت قابل اعتماد چیز ہے —— اور یہ آگہی اسی چیز سے حاصل ہوسکتی ہے جو لوگوں کی طبیعتوں کی اصل میں اور ان کے نفوس کی جڑ میں گڑی ہوئی ہو کہ وہ انتہائی درجہ کی طہارت ہے اور اس قسم کی چیز پانی ہی ہے۔

اور طہارت صغری: اطراف کے دھونے پر اکتفا کرنا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ اطراف ایسی جگہیں ہیں جن کے کھلا رہنے کی اور لباس سے باہر رہنے کی قابل رہائش ملکوں میں عادت چل رہی ہے، فطری راہ ہونے کی وجہ سے (اور) اسی کی طرف اشارہ آیا ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس طرح چادر اوڑھنے سے منع کیا ہے کہ ہاتھ اندر دب جائیں (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب اللباس، حدیث نمبر ۴۳۱۵) پس کوئی حرج متحقق نہیں ہے اطراف کے دھونے میں اور یہ بات دیگر اعضاء میں نہیں ہے۔

اور نیز: شہریوں میں ان کو پاک صاف کرنے کی عادت چل رہی ہے روزانہ اور بادشاہوں اور ان کے مانند لوگوں کے پاس جاتے وقت اور ستھرے کاموں کا ارادہ کرتے وقت۔

اور اس کی گہری حکمت: یہ ہے کہ اطراف کھلے رہتے ہیں ان کی طرف میل کچیل جلدی پہنچتا ہے اور اطراف ہی وہ اعضاء ہیں جو دیکھے جاتے ہیں اور نظر آتے ہیں لوگوں کے ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت۔

اور نیز: تجربہ شاہد ہے کہ اطراف کا دھونا اور چہرے اور سر پر پانی کا چھڑکنا نفس کو چوکنا کرتا ہے، نیند اور گہری بیہوشی جیسی چیزوں سے بہت زیادہ چوکنا کرنا اور چاہئے کہ انسان لوٹے اس سلسلہ میں اس علم وتجربہ کی طرف جو اس کو حاصل ہے اور اس بات کی طرف جس کا اطباء نے حکم دیا ہے اُس شخص کے علاج میں جس پر بے ہوشی طاری ہوئی ہو یا اس کو بہت زیادہ اسہال ہونے لگے ہوں یا رگ پر نشتر لگانے سے بہت زیادہ خون آنے لگا ہو۔

☆ ☆ ☆

طہارت کے فوائد

جس طرح بعض جڑی بوٹیوں میں، بعض ادویہ میں، اور بعض کائناتی چیزوں میں متعدد اوصاف وخواص ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بعض احکام میں متعدد اسرار ورموز ہیں۔ طہارت میں بھی گوناگوں فوائد ہیں۔ ذیل میں ان میں سے آٹھ فائدے ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: طہارت ایک فطری امر ہے۔ کیونکہ وہ ارتفاق ثانی یعنی ترقی یافتہ تمدن (شہری تمدن) کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ تفصیل مبحث سوم کے باب سوم میں گذر چکی ہے۔ اور ارتفاقات کی رعایت پر کمال انسانی کا دارومدار ہے۔ کیونکہ وہ انسانی فطرت کا جز بن چکے ہیں۔ اس لئے ارتفاقات کے دیگر امور کی طرح طہارت کا بھی التزام ضروری ہے۔

دوسرا فائدہ: طہارت ملائکہ سے قریب کرنے والی اور شیاطین سے دور کرنے والی ایک صفت ہے اور انسان کی معراج کمال یہ ہے کہ وہ ملائکہ میں شامل ہو جائے اور شیاطین سے دور ہو جائے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ملائکہ پاک مخلوق ہیں، وہ پاکی کا اہتمام کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز!

تیسرا فائدہ: طہارت عذاب قبر کو ہٹاتی ہے حدیث شریف میں ہے کہ: پیشاب سے بچو، کیونکہ قبر کا عذاب بیشتر اس کی وجہ سے ہوتا ہے" (یہ حدیث صحیح ہے، اس کی تخریج نصب الرایہ ۱: ۱۲۸ میں ہے)

چوتھا فائدہ: صفت احسان پیدا کرنے میں طہارت کا بڑا دخل ہے۔ احسان کے معنی کی پوری وضاحت تو "ابواب الاحسان" میں آئے گی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اعمال کی اصل غرض تک پہنچنے کا نام "احسان" ہے اور اعمال سے اصل مطلوب تقرب الٰہی ہے جب آدمی بہ نیت اطاعت ظاہری وباطنی نظافت کا اہتمام کرتا ہے تو وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے یعنی اس کو قرب خاص حاصل ہو جاتا ہے۔ سورۃ التوبہ آیت ۱۰۸ میں ہے: "اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند فرماتے ہیں" اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ طہارت کے اہتمام کی وجہ سے محبوبیت حاصل ہوتی ہے۔ پس جس صفت سے انسان کو خدا تعالیٰ کا محبوب بننے کا شرف حاصل ہو، اس صفت کے ساتھ متصف رہنا لازم ہے۔

پانچواں فائدہ: طہارت (وضوء وغسل) کی وجہ سے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور گناہ مٹائے جاتے ہیں۔ متعدد احادیث میں اس کا تذکرہ آیا ہے کیونکہ جب صفت طہارت نفس میں راسخ ہوجاتی ہے یعنی ملکہ اور فطرت ثانیہ بن جاتی ہے تو نفس میں ملکوتی انوار کا ایک بڑا حصہ ٹھہر جاتا ہے اور متقرر ہوجاتا ہے یہی نیکیاں ہیں اور بہیمیت کی تاریکی کا بڑا حصہ مغلوب ہوجاتا ہے یعنی دب جاتا ہے، یہی گناہوں کا مٹانا ہے۔

چھٹا فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے میں جو تین چیزیں سد راہ بنتی ہیں ان میں سے ایک ''ریت رواج کا حجاب'' ہے، جس کا دوسرا نام ''حجاب دنیا'' ہے۔ مبحث رابع کے باب ششم میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے جب طہارت کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کو ایک مسلّمہ طریقہ بنالیا جاتا ہے تو وہ دنیا میں انہماک سے بچاتی ہے۔ وضو کو جو مؤمن کا ہتھیار کہا گیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ دنیا میں انہماک سے بچاتا ہے، اور تذکر کا ذریعہ بنتا ہے۔

ساتواں فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے کے حجابات ثلاثہ میں سے ایک جہالت و بدعقیدگی کا حجاب بھی ہے۔ اس کی تفصیل بھی مبحث چہارم کے باب ششم میں گذر چکی ہے۔ جب طہارت میں تین باتیں پائی جاتی ہیں تو وہ سوء معرفت یعنی اللہ کے بارے میں جہالت اور بدعقیدگی کا علاج بنتی ہے: ایک: پورے اہتمام سے وضوء وغسل کرنا جس طرح لوگ دربارِ شاہی میں جب کسی غرض سے جاتے ہیں تو پورے اہتمام سے غسل کرتے ہیں یا ہاتھ، منہ اور پاؤں دھوتے ہیں اور لباس درست کرتے ہیں اور خوب پاک صاف ہوکر اور بن سنور کر جاتے ہیں، اسی طرح عبادات کے لئے آدمی پورے اہتمام سے طہارت حاصل کرے۔ دوم: طہارت حاصل کرتے وقت شروع سے آخر تک نیت طہارت کا مستحضر رہنا۔ سوم: طہارت کے اذکار کا اہتمام کرنا۔ اگر یہ تینوں باتیں طہارت میں ملحوظ رہیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہوگی اور عظمت و اعتقاد پیدا ہوگا۔

آٹھواں فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے کے موانعات ثلاثہ میں سے ایک حجاب طبع یعنی نفس کا حجاب بھی ہے اس کی تفصیل بھی محولہ بالا مقام میں گذر چکی ہے طہارت کے اہتمام سے طبیعت عقل کے تابع ہوجاتی ہے یعنی حجاب نفس دور ہوتا ہے کیونکہ جب انسان یہ بات اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ طہارت انسان کا کمال ہے اور وہ اعضاء کو اس عقیدہ کے مطابق مشقت میں ڈالتا ہے یعنی وضوء وغسل کرتا ہے اور اس میں کوئی غرض شامل نہیں ہوتی ہے مثلاً کھیت سے آیا ہے۔ اعضاء گرد سے اٹے پڑے ہیں اس لئے دھوتا ہے۔ یہ بات نہ ہو، بلکہ کمال انسانی کی تحصیل کی غرض سے طہارت حاصل کرے اور زندگی میں یہ عمل مسلسل جاری رکھے، تو یہ چیز تمرین (Exercise) ہوجاتی ہے نفس کو عقل کے تابع کرنے کی۔ اور اس عمل سے نفس قابو میں آجاتا ہے۔

والطهارة : بـابٌ من أبـواب الإرتـفاق الثاني، الذي يتوقف كمالُ الإنسان عليه، وصار من جبلتهم؛ وفيها قُرب من الملائكة، وبُعْدٌ من الشيطان؛ وتَدْفَعُ عذابَ القبر، وهو قوله صلى الله

عليه وسلم: ﴿ استنزِهوا من البول، فإن عامةَ عذابِ القبر منه﴾؛ ولها مدخل عظيم في قبول النفس لونَ الاحسان، وهو قوله تعالىٰ: ﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾؛ وإذا استقرَّت في النفس، وتمكّنت منها، تقررت فيها شعبةٌ من نور الملكية، وانقهرتْ شعبة من ظلمة البهيمية، وهو معنى كتابة الحسنات وتكفير الخطايا؛ وإذا جُعلت رسمًا نفعت من غوائلِ الرسوم؛ وإذا حَافَظَ صاحِبُها على ما فيها من هيئات يؤاخِذُ الناسُ بها أنفسَهم عند الدخول على الملوك، وعلى النية الْمُسْتَصْحِبَة، والأذكارِ، نفعت من سوء المعرفة؛ وإذا عَقَل الإنسانُ: أن هذه كمالُه، فأَذْأَبَ جوَارِحَهُ حسبما عقَلَ، من غير داعيةٍ حسيةٍ، وأكثرَ من ذلك، كانت تمرينًا على انقياد الطبيعة للعقل؛ والله أعلم.

ترجمہ: (۱) اور طہارت اُس ارتفاق ثانی کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے جس پر کمال انسانی کا دارومدار ہے اور جولوگوں کی فطرت میں شامل ہوگیا ہے (۲) اور طہارت ملائکہ کا قرب ہے اور شیطان سے دوری ہے (۳) اور طہارت عذاب قبر کو ہٹاتی ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''پیشاب سے بچو، پس بیشک قبر کا عذاب عام طور پر اُسی کی وجہ سے ہوتا ہے'' (۴) اور طہارت کا بڑا دخل ہے نفس کے احسان کا رنگ قبول کرنے میں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور اللہ تعالیٰ خوب پاک رہنے والوں کو دوست رکھتے ہیں'' (۵) اور جب طہارت نفس میں راسخ ہوجاتی ہے اور وہ نفس میں جم جاتی ہے تو نفس میں ملکیت کے نور کا ایک حصہ متقرر (ثابت) ہوجاتا ہے اور بہیمیت کی تاریکی کا بڑا حصہ مغلوب ہوجاتا ہے، یہی نیکیاں لکھنے اور گناہوں کے مٹانے کا مطلب ہے (۶) اور جب طہارت کو ایک ریت بنالیا جاتا ہے تو وہ رسوم کی آفتوں میں مفید ثابت ہوتی ہے (۷) اور جب صاحب طہارت حفاظت کرتا ہے اُن ہیئتوں کی جو طہارت میں ہیں، جن کا لوگ اپنے آپ کو پابند بناتے ہیں جب وہ بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں اور اس نیت کی حفاظت کرتا ہے جو عمل طہارت کے ساتھ ساتھ رہنے والی ہے اور اذکار طہارت کی حفاظت کرتا ہے، تو طہارت سوء معرفت (بدعقیدگی وجہالت) میں مفید ثابت ہوتی ہے (۸) اور جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ یہ طہارت اس کا کمال ہے، پھر وہ اپنے سمجھنے کے مطابق اپنے اعضاء کو اسی کام میں لگائے رکھتا ہے، بغیر کسی محسوس داعیہ کے اور وہ بہ کثرت عمل طہارت کرتا ہے تو یہ تمرین ہوجاتی ہے طبیعت کو عقل کے تابع کرنے کی باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: اِنْقَهر: مغلوب ہونا...... غَائِلَة: مصیبت، آفت مہلک شیئ...... المستَصْحِبَة (اسم فاعل) ساتھ ساتھ رہنے والی۔ اِسْتَصْحَبَهُ: ساتھی بنا، ساتھ ہونا...... أَذْأَبَه: تھکانا، لگاتار کوشش کرنا۔

تصحیح: من نور الملكية اصل میں من نور الملائكة تھا تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆



باب ــــ ۹

نماز کے اسرار کا بیان

انواعِ برّ (نیکی کے کاموں) میں نماز کا بھی اہم مقام ہے۔ وہ دین کا ستون ہے اور باجماعت نماز تو شعائرِ دین میں سے ہے۔ طہارت کی حکمتوں سے فارغ ہو کر اب نماز کی حکمتیں بیان فرماتے ہیں۔

نماز کے تعلق سے انسانوں کی تین قسمیں

طہارت کی طرح نماز کے تعلق سے بھی انسانوں کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

پہلا درجہ: توفیقِ خداوندی بعض انسانوں کو اپنی مقدس بارگاہ کی طرف بلند کرتی ہے یعنی بغیر کسی کسب واستحقاق کے ان کو رفعت وبلندی سے سرفراز کرتی ہے۔ اس وقت ان کو پوری طرح وصالِ خداوندی نصیب ہوتا ہے اور بارگاہِ عالی سے ان پر تجلیات برسنی شروع ہوتی ہیں اور ان کے نفوس پر انوارِ الٰہی چھا جاتے ہیں تو وہ ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کے بیان سے زبان وقلم قاصر ہے۔

پھر جب وہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور آدمی اپنی سابق حالت کی طرف لوٹ آتا ہے تو پہلی حالت کے فوت ہو جانے سے آدمی کا چین ختم ہو جاتا ہے اور وہ سخت بے قرار ہوتا ہے تو وہ اپنی بے قراری کا مداوا ایک ایسی حالت سے کرتا ہے جو سفلی احوال میں اس برتر حالت سے اقرب ہوتی ہے یعنی نفس خالق جل مجدہ کی معرفت میں مستغرق ہو جائے اور آدمی اس حالت کو دام بنا کر اس برتر حالت کا کچھ حصہ حاصل کر لے جو اس کے ہاتھ سے فوت ہو گئی ہے۔ اسی حالت کا نام نماز ہے۔ نماز تین چیزوں کا مجموعہ ہے: ایسے اقوال وافعال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجالانا، خشوع وخضوع کا اظہار کرنا اور مناجات وسرگوشی کرنا جو خاص اسی مقصد کے لئے موضوع ہیں الغرض یہ حضرات وصالِ حبیب کی دولت ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو خیالِ حبیب کو اس کا قائم مقام بنا لیتے ہیں اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک نماز میں ملتی ہے۔

دوسرا درجہ: اس شخص کا ہے جس کو مخبرِ صادق یعنی انبیاء اس حالت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس حالت کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں تو وہ شخص شہادتِ قلبی سے مخبرِ صادق کی یہ دعوت مان لیتا ہے یعنی اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ بتانے والا اس کے لئے مفید بات بتا رہا ہے اس لئے وہ عمل شروع کر دیتا ہے اور وہ سب باتیں برحق پاتا ہے جن کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ بات پالیتا ہے جس کی وہ امید باندھے ہوئے ہے یعنی بالآخر اس کو بھی وصلِ حبیب کی دولت میسر آجاتی ہے۔

تیسرا درجہ: اس شخص کا ہے جو نماز کے کچھ بھی فوائد نہیں جانتا مگر چونکہ وہ مؤمن ہے اس لئے دین کے تقاضوں کی

تکمیل کے طور پر نماز پڑھتا رہتا ہے تو وہ بھی بالآخر محروم نہیں رہتا، جیسے باپ اولاد کو، ان کی ناگواری کے باوجود، مفید کاریگریاں سیکھنے پر مجبور کرتا ہے تو بالآخر وہ کامیاب ہوجاتے ہیں۔

﴿باب: أسرار الصلاة﴾

اعلم: أن الإنسان قد يُختَطف إلى الحظيرة المقدَّسة، فَيلْتَصِقَ بجناب الله تعالى أتمَّ لُصوقٍ، وينزل عليه من هنالك التجلياتُ المقدسةُ، فتغلب على النفس، ويشاهدُ هنالك مالا يقدر اللسانُ على وصفه، ثم يُرَدُّ إلى حيث كان، فلا يَقِرُّ به القرارُ، فيعالِج نفسَه بحالة هي أقرب الحالات السفلية: من استغراق النفس في معرفة بارئها؛ ويتخذُها شَرَكًا لاقتناص مافاته منها؛ وتلك الحالةُ هي التعظيم والخضوع والمناجاةُ في ضمنِ أفعَالٍ وأقوالٍ بُنيت لذلك.

ويتلوه: رجل سمع المخبرَ الصادق يدعوه إلى هذه الحالة، ويرغِّب فيها، فصدَّقه بشهادة قلبه، ففعل، ووجدما وعدبه حقًّا، وارتقى إلى ما يرجوه.

ثم يتلوه: رجلٌ ألْجَأَهُ الأنبياء إلى الصلوات وهو لا يعلم، بمنزلة الوالِدِ يَحْبِسُ أَوْلادَه على تعليم الصِّنَاعات النافعة وهو كارهون.

ترجمہ: نماز کے اسرار کا بیان: جان لیں کہ انسان کبھی مقدس بارگاہ کی طرف اچک لیا جاتا ہے۔ پس وہ پوری طرح سے اللہ کی بارگاہ کے ساتھ چپک جاتا ہے اور اس پر وہاں سے تجلیات مقدسہ نازل ہوتی ہیں، پس وہ نفس پر چھا جاتی ہیں اور وہاں انسان ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے جن کے بیان سے زبان قاصر ہے، پھر وہ اس جگہ کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جہاں وہ تھا۔ پس اس کو اس مقام میں سکون وقرار نہیں رہتا پس وہ اپنا علاج کرتا ہے ایک ایسی حالت سے جو نچلے احوال میں سے اس برتر حالت سے قریب تر ہوتی ہے یعنی نفس کا اپنے خالق جل مجدہ کو پہچاننے میں ڈوب جانا اور وہ شخص اس (سفلی حالت) کو جال بناتا ہے اس چیز کو شکار کرنے کیلئے جو اس (برتر) حالت میں سے اسکے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور وہ (سفلی) حالت ایسے اقوال وافعال کے ضمن میں (خالق کی) تعظیم وخضوع ومناجات ہے جو اسی مقصد کے لئے بنائے گئے ہیں۔

اور اس سے متصل وہ شخص ہے جس نے مخبر صادق سے سنا جو اس کو اِس حالت کی طرف بلاتا ہے اور اسکی ترغیب دیتا ہے، پس وہ شہادت قلبی سے اس مخبر کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے بتلائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتا ہے اور وہ اس چیز کو برحق پاتا ہے جس کا اس مخبر نے (نماز پر) وعدہ کیا ہے اور وہ اس نماز کے ذریعہ اس چیز کی طرف ترقی کرتا ہے جس کی اس نے امید باندھی ہے۔

پھر اس کے بعد اس شخص کا مقام ہے جسے انبیاء نے نمازوں کی طرف مجبور کیا ہے، درانحالیکہ وہ (نماز کے فوائد) نہیں جانتا ہے، جس طرح باپ اپنی اولاد کو روکتا ہے مفید کاریگریوں کے سیکھنے پر، درانحالیکہ بچے اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆



نماز کا ایک اہم فائدہ

نماز کا ایک اہم فائدہ دنیا میں یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ پریشانیوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ نعمتیں حاصل کی جاسکتی ہیں مثلاً جب کوئی بڑی پریشانی لاحق ہو، جیسے قحط سالی، آندھی یا اولے بارش کا طوفان آئے تو نماز سے مدد حاصل کرنی چاہئے، ایسے وقت میں نماز سراپا دعا بن جاتی ہے۔ کیونکہ نماز ایسے اقوال وافعال کا مجموعہ ہے جو آخری درجہ کی تعظیم ہیں اور نماز میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام ہوتی ہے جو درحقیقت دعا کی روح ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ﴾ (البقرہ ۱۵۳) یعنی صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو، اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے پس نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجۂ اولی ہوگی اور حدیث شریف میں ہے ﴿إذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلّٰی﴾ (رواہ ابوداؤد) یعنی جب کوئی اہم بات پیش آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہوجاتے (مشکوۃ باب صلوۃ التطوع حدیث نمبر ۱۳۲۵) صلاۃ الحاجہ، صلاۃ التوبہ، صلاۃ الاستخارہ اور صلاۃ الاستسقاء کی مشروعیت کی وجہ بھی یہی ہے۔ غرض باب کے آخر میں جو نماز کے فوائد آرہے ہیں وہ تو ہیں ہی، یہ ان کے علاوہ ایک اہم فائدہ ہے یعنی نماز بہت سی دنیوی الجھنوں کا حل ہے۔

وربما يسأل الإنسانُ من ربه دفعَ بلاء أو ظهورَ نعمةٍ، فيكون الأقربُ حينئذ الاستغراقَ فى أفعال وأقوال تعظيميةٍ لِتُؤَثِّرَ همتُه التى هى روح السؤال؛ وذلك ماسُنَّ من صلاة الاستسقاء.

ترجمہ: اور کبھی انسان اپنے رب سے درخواست کرتا ہے کسی مصیبت کے رفع ہونے کی یا کسی نعمت کے ظاہر ہونے کی تو اس وقت قریب تر چیز تعظیمی اقوال وافعال میں ڈوب جانا ہے، تاکہ اس کی کامل توجہ، جو کہ روح سوال ہے، اثر انداز ہو اور یہی وہ نماز استسقاء ہے جو مشروع کی گئی ہے (حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے مطلب خیز ترجمہ کیا ہے کہ جب آدمی اپنے پروردگار سے کسی مصیبت کے رفع ہونے یا کسی نعمت کے ملنے کی درخواست کرتا ہے، اس وقت زیادہ مناسب یہی ہوتا ہے کہ تعظیمی افعال اور اقوال میں مستغرق ہوجائے، تاکہ اس کی ہمت (کامل توجہ) کا جو کہ اس درخواست کی روح ہے کچھ اثر پڑ سکے (احکام اسلام عقل کی نظر میں صفحہ ۸۲)



نماز کی ہیئت ترکیبی کا بیان

نماز میں بنیادی باتیں تین ہیں:

۱- جب بندہ اللہ کی عظمت وجلال کو ملاحظہ کرے تو اسکے دل میں خشوع وخضوع پیدا ہو یعنی جب بندہ نماز کیلئے کھڑا ہو تو اس کا دل عاجزی اور نیازمندی سے لبریز ہوجائے، کیونکہ تخشع، تضرع اور تمسکن ہی نماز کی حقیقت ہے (دیکھئے ترمذی ۱:۵۱)

۲- زبان اللہ تعالیٰ کی عظمت کو اور دل کے خشوع وخضوع کو بہترین الفاظ سے تعبیر کرے۔ قراءت فاتحہ اور اذکار وتسبیحات کو نماز میں اسی مقصد سے رکھا گیا ہے۔

۳- اپنے اعضاء کو اس خشوع کے مطابق مہذب بنالیا جائے یعنی بادب کھڑا رہے، آداب کی پوری رعایت کے ساتھ رکوع وسجود کرے۔

دلیل: کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کا شکریہ انہیں تین طریقوں سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ ایک شاعر اپنے منعم مجازی کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتا ہے:

تمہاری نعمتوں نے میری تین چیزیں تمہارے حوالے کردیں
میرا ہاتھ، میری زبان اور سینہ میں پوشیدہ دل

یعنی اعضاء نیازمند واطاعت شعار ہیں، زبان ثناخواں ہے اور دل آپ کی نعمتوں کا قدرداں ہے۔ جب منعم مجازی کے سامنے ممنون احسان کا یہ حال ہے تو منعم حقیقی کے سامنے بندہ کا یہ حال کیوں نہ ہو!

تعظیمی افعال کا بیان: نماز میں جو تین چیزیں ہیں ان میں سے پہلی دو تو واضح ہیں، ان کی تفصیل کی حاجت نہیں۔ البتہ تیسری چیز کی قدرے تفصیل ضروری ہے۔ پس جاننا چاہئے کہ افعال تعظیمیہ درجہ بہ درجہ تین ہیں: قیام، رکوع اور سجدہ۔ سب سے پہلے آدمی کو راز ونیاز کی باتیں کرنے کے لئے بادب کھڑا ہونا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف منہ کرکے پوری طرح متوجہ ہونا چاہئے۔ تعظیم کا یہ سب سے پہلا درجہ ہے۔ پھر اس کے بعد کا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذلت وپستی کا احساس کرے اور اللہ تعالیٰ کی عزت وبرتری کا تصور کرے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں ہوجائے۔ یہ فعل، تعظیم میں پہلے فعل سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ تمام انسانوں اور جانوروں کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ گردن افرازی تکبر کی نشانی ہے اور گردن افگندگی نیازمندی اور عاجزی کی علامت ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

إِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (الشعراء۴)	اگر ہم چاہیں تو ان (منکرین) پر آسمان سے ایک بڑی نشانی نازل کردیں، پس انکی گردنیں اس نشانی کے سامنے پست ہوجائیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گردن کا جھکنا منقاد ہونے کی علامت ہے۔ اور فعل تعظیمی کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خاک آلود کردے، جو کہ افضل ترین عضو ہے اور جس میں تمام حواس جمع ہیں، سننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی صلاحیتوں کا چہرہ سنگم ہے۔ ایسے اشرف عضو کو کسی کی تعظیم کے لئے زمین پر رکھ دینا تعظیم کا آخری درجہ ہے۔

غرض تعظیم کی یہ تینوں صورتیں تمام انسانوں میں جانی پہچانی ہوئی ہیں۔ لوگ اپنی عبادتوں میں بھی ان کا استعمال کرتے ہیں اور جب بادشاہوں اور امراء کے سامنے جاتے ہیں تو بھی یہی طریقے اختیار کرتے ہیں، اس لئے نماز میں یہ تینوں باتیں اکٹھا کی گئی ہیں۔ اور ان میں ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ ادنی سے اعلی کی طرف ترقی ہو، پہلے قیام ہو،

پھر رکوع، پھر سجدہ کیا جائے تا کہ دم بہ دم، بتدریج خشوع وخضوع اور اپنی ذلت کا احساس بڑھتا جائے۔ اگر نماز میں صرف آخری درجہ کی تعظیم یعنی سجدہ رکھا جاتا یا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اترا جاتا تو ترقی کا یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

فائدہ: نماز کے افعال میں قعدہ بھی ہے مگر اس کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ اصلی فعل نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر رکعت کے آخر میں مشروع نہیں ہے، جبکہ ہر رکعت ایک مستقل نماز ہے اور دو رکعتیں شفع (دوگانہ یعنی دو کی جوڑی) ہے۔ تفصیل حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی توثیق الکلام میں ہے، جس کی میں نے شرح بنام: ''کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟'' لکھی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیں۔

قعدہ نماز سے بسہولت نکلنے کے لئے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ نماز کے آخری فعل سجدے میں نماز سے نکلنے میں دشواری ہے، اس لئے آدمی سجدہ سے فارغ ہو کر بہ اطمینان بیٹھ جاتا ہے اور توفیق عبادت پر حمد کرتا ہے۔ پھر معلم عبادت پر درود بھیجتا ہے، پھر اپنے لئے کچھ مانگ کر نماز سے نکل آتا ہے۔

وأصل الصلاة ثلاثة أشياء: أن يخضع القلبُ عند ملاحظة جلالِ الله وعظمتِه، ويُعَبِّرُ اللسان عن تلك العظمة وذلك الخضوعِ أفصحَ عبارةٍ، وأن يؤدِّب الجوارحُ حَسَبَ ذلك الخضوع؛ قال القائل:

أفادتكم النَّعْماءُ مني ثلاثةً يدى ولسانى والضميرَ الْمُحَجَّبا

ومن الأعمال التعظيمية أن يقوم بين يديه مناجيا، ويُقبل عليه مواجهاً، وأشدُّ من ذلك: أن يستَشْعِرَ ذُلَّهُ وعِزَّةَ ربه، فيُنَكِّسُ رأسه، إذ من الأمر المجبول فى قاطبة البشر والبهائم: أن رفعَ العنق آيةُ التيه والتكبر، وتنكيسَه آيةُ الخضوع والإخبات، وهو قوله تعالىٰ: ﴿فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ﴾؛ وأشدُّ من ذلك: أن يُعَفِّرَ وجهَهُ الذى هو أشرفُ أعضائه ومَجْمَعُ حواسِّه بين يديه.

فتلك التعظيمات الثلاث الفعلية شائعةٌ فى طوائف البشر، لايزالون يفعلونها فى صلواتهم، وعند ملوكهم وأمرائهم؛ وأحسنُ الصلاة: ماكان جامعاً بين الأوضاع الثلاثة، مترقِّيا من الأدنى إلى الأعلى، ليحصلَ الترقى فى استشعار الخضوع والتذلل؛ وفى الترقى من الفائدة ماليس فى إفراد التعظيم الأقصى، ولا فى الانحطاط من الأعلى إلى الأدنى.

ترجمہ: اور نماز میں اصلی امور تین ہیں: (ایک) یہ کہ دل عاجزی کرے اللہ تعالیٰ کے جلال وعظمت کا تصور کر کے (دوم) یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اس عظمت کو اور اپنی اس خاکساری کو بہترین الفاظ سے تعبیر کرے (سوم) یہ کہ اس خاکساری کی حالت کے موافق اعضاء کو شائستہ بنایا جائے (چنانچہ اس سلسلہ میں) کسی کا شعر ہے۔

فائدہ پہنچایا تم کو نعمتوں نے میری تین چیزوں کا میرے ہاتھ کا، میری زبان کا اور پوشیدہ دل کا

اور تعظیمی افعال میں سے یہ ہے کہ خدا کے حضور میں کھڑا ہو، سرگوشی کرتا ہوا اور ان کی طرف متوجہ رہے، چہرہ پھیرتے ہوئے — اور اس سے زیادہ یہ بات ہے کہ اپنی خاکساری اور اپنے رب کی برتری کا خیال کرے، پس سرنگوں ہو جائے، کیونکہ تمام انسانوں میں اور چوپایوں میں فطری امر میں سے یہ بات ہے کہ گردن اٹھانا غرور اور تکبر کی نشانی ہے اور گردن کو جھکانا خاکساری اور نیازمندی کی نشانی ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''پس ان کی گردنیں عاجزی سے اس نشانی کے سامنے جھک جائیں'' —— اور اس سے زیادہ یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خاک آلود کردے اپنے اس چہرہ کو جو کہ وہ اس کے اعضاء میں سب سے اشرف ہے اور جو اس کے حواس کا سنگم ہے۔

پس یہ تین فعلی تعظیمات تمام لوگوں میں رائج ہیں، لوگ ہمیشہ ان کو استعمال کرتے ہیں اپنی عبادتوں میں اور اپنے بادشاہوں اور اپنے امراء کے سامنے اور بہترین نماز وہ ہے جو ان تینوں احوال کے درمیان جامع ہو اور ادنی سے اعلی کی طرف ترقی کرنے والی ہو، تاکہ عاجزی اور خاکساری کے تصور میں ترقی حاصل ہو اور ترقی میں وہ فائدہ ہے جو تنہا غایت تعظیم میں نہیں ہے اور نہ اعلی سے ادنی کی طرف اترنے میں ہے۔

لغات: اَفْصَحَ عبارۃً مفعول مطلق ہے يُعَبِّرُ کا من غير لفظه ..... المُحْجَبُ (اسم مفعول) حَجَبَهُ: چھپانا بين يديه ظرف ہے يُعَفِّرُ کا۔

☆ ☆ ☆

نماز ہی کیوں ضروری ہے، کیا ذکر وفکر کافی نہیں؟

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے گیان دھیان کو اور اللہ کے دائمی ذکر کو کافی عبادت تصور کرتے ہیں، مگر اللہ کی شریعتوں میں اس کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ادیان سماوی میں بنیادی عبادت نماز کو قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ اللہ کی عظمت کو سوچنا، ہر وقت اللہ کا تصور قائم رکھنا، کسی حال میں بھی اللہ کو نہ بھولنا، بلکہ ہر وقت زبان سے بھی اللہ کا ذکر کرنا ایک بہترین عمل اور بڑی عبادت ہے، مگر وہ بنیادی عبادت نہیں، اللہ سے نزدیک کرنے والا بنیادی عمل نماز ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح طریقہ پر اللہ کی عظمت میں مسلسل غور وفکر کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صرف وہی لوگ مضبوطی سے اس پر عمل کر سکتے ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہو اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ عام لوگ اگر یہ طریقہ اپنائیں گے تو وہ کند خاطر ہو جائیں گے، بلکہ اصل پونجی بھی کھو بیٹھیں گے، نفع حاصل کرنا تو دور کی بات ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بیل کسی سہارے ہی سے چھت پر چڑھتی ہے، اسی طرح فکری پرواز بھی کسی پیکر محسوس کے سہارے ہوتی ہے۔ اگر کسی پیکر محسوس کے بغیر سوچنا شروع کیا جائے تو کچھ وقت کے بعد فکر تھک جاتی ہے اور عقل مبہوت ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی فکر کی بلادت ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ چونکہ غیر محسوس ذات ہیں اس لئے ان کی عظمت وجلال کو کسی پیکر محسوس کے بغیر مسلسل نہیں سوچا جا سکتا۔

اسی طرح ذکر الٰہی کے لئے بھی پیکر محسوس ضروری ہے۔ الفاظ کا سہارا لینا اور ایسے تعظیمی عمل کو وسیلہ بنانا ضروری ہے جس کو آدمی اپنے اعضاء سے کرے اور اس کے آداب کی رعایت میں خود کو مشقت میں ڈالے۔ اس کے بغیر اللہ کا ذکر محض لقلقہ (سارس کے زور سے بولنے کی آواز) ہے۔ یعنی بے معنی شور و ہنگامہ ہے اور اکثر لوگوں کے حق میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس کے برخلاف نماز ایک معجون مرکب ہے، ذکر و فکر بھی اس کے اجزاء میں شامل ہیں، کیونکہ نماز کے اجزائے ترکیبی تین ہیں:

۱- اللہ کی عظمت کو سوچنا، مگر فکر میں ڈوب کر نہیں، بلکہ ثانوی قصد سے، عرضی التفات سے اور ضمنی توجہ سے اور ایسی فکر ہر ایک کرسکتا ہے یعنی ایسی گہری فکر جس میں ماسوا کا کوئی شعور نہ رہے، یہ تو ہر ایک کے بس کی بات نہیں مگر جزوی، ثانوی اور ضمنی درجہ کی فکر جس میں ماسوا سے بے خبری نہ ہو، یہ بات ہر ایک کے لئے ممکن ہے اور نماز میں اللہ کی عظمت کو ایسا ہی سوچنا مطلوب ہے —— ہاں اگر کسی میں شہود و حضور کے سمندر میں غوطہ لگانے کی استعداد ہو تو اس کے لئے کوئی ممانعت نہیں کہ وہ اس میں غوطہ زن ہو، بلکہ یہ فکر تو اور بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ اس میں نفس کو اعلیٰ درجہ کی آگاہی حاصل ہوتی ہے مگر نماز کے تحقق کے لئے فکر کا یہ درجہ مطلوب نہیں۔

۲- نماز میں ایسی دعائیں ہیں جن میں اپنے عمل کا خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا اور اپنے چہرہ کا اللہ کی طرف متوجہ کرنا اور صرف اللہ ہی سے مدد چاہنے کو واضح کیا جاتا ہے۔

۳- نماز میں تعظیمی افعال بجالائے جاتے ہیں جیسے باادب کھڑا ہونا، اللہ کے سامنے سرنگوں ہونا اور خدا کے سامنے جبہ سائی کرنا۔

اور معجون میں جس طرح مفردات باہم دیگر مل جاتے ہیں اور ایک مرکب مزاج وجود میں آتا ہے اسی طرح مذکورہ تینوں باتیں نماز میں ایک دوسرے کے لئے بازو، تکمیل کنندہ اور یاددہانی کرنے والی بن جاتی ہیں، اسی لئے نماز عام و خاص یعنی سب لوگوں کے لئے مفید ہے اور ایک قوی الاثر تریاق ہے تاکہ ہر شخص اس سے اپنی اصلی استعداد کے مطابق استفادہ کرسکے۔

وإنما جعلت الصلاةُ أمَّ الأعمالِ المقرِّبة، دون الفكر في عظمة الله ودون الذكر الدائم، لأن الفكر الصحيح فيها لايتأتى إلا من قوم، عاليةٍ نفوسُهم، وقليلٌ ماهم، وسوى أولئك لوخاضوا فيه تبلَّدوا، وأبطلوا رأسَ مالهم، فضلاً عن فائدةٍ أخرى؛ والذكرُ بدون أن يُشرِّحه ويَعْضُدَه عملٌ تعظيمي، يعمله بجوارحه، ويَعْنُوا في إدْآبِهَا، لَقْلَقَةٌ خاليةٌ عن الفائدة في حق الأكثرين.

أما الصلاة: فهي المعجونُ المركب:

[۱] من الفكر المصروف تلقاءَ عظمةِ الله بالقصد الثاني والالتفات التبعي، المُتَأتّي من كل واحد، ولاحَجْرَ لصاحبِ استعدادِ الخوضِ في لُجَّة الشهود أن يخوض، بل ذلك مُنَبِّهٌ له أتمَّ تنبيه.

[۲] ومن الأدعية المبيّنة إخلاصَ عمله لله، وتوجيهَ وجهه تلقاءَ الله، وقَصْرَ الاستعانة في الله.

[۳] ومن أفعال تعظيمية، كالسجود والركوع، يصير كلُّ واحد عَضُدًا لآخر، ومُكَمِّلَهُ والمُنَبِّهَ عليه، فصارت نافعةً لعامة الناس وخاصتهم، ترياقًا قويَّ الأثر، ليكون لكل إنسان منه ما استوجَبَهُ أصلُ استعداده.

ترجمہ: اور نماز اللہ سے نزدیک کرنے والے اعمال کی ماں اسی لئے بنائی گئی ہے، اللہ کی عظمت میں غور کرنے کو اور اللہ کے دائمی ذکر کو یہ درجہ نہیں دیا گیا، اس لئے کہ اللہ کی عظمت میں صحیح فکر نہیں حاصل ہوتی ہے مگر ایسے حضرات سے جن کے نفوس بلند مرتبہ ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں اور ان لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگ اگر اس فکر میں گھسیں گے تو وہ کند خاطر ہو جائیں گے اور وہ اپنا اصلی سرمایہ کھو بیٹھیں گے چہ جائیکہ وہ کچھ اور فائدہ حاصل کریں (ایسے سالکین کی مثالیں موجود ہیں جو اللہ کی عظمت میں غور کرتے کرتے راستہ سے بھٹک گئے اور کہیں کے نہ رہے) اور ذکر الٰہی بدون اس کے کہ اس کی تشریح کرے اور اس کو قوی کرے کوئی ایسا تعظیمی عمل جس کو آدمی اپنے اعضاء سے کرے اور جس کی بجا آوری میں آدمی مشقت اٹھائے، ایک ایسا لقلقہ ہے جو اکثر لوگوں کے حق میں فائدہ سے خالی ہے۔

رہی نماز تو وہ معجون مرکب ہے:

۱- ایسی فکر سے جو پھیری ہوئی ہے اللہ کی عظمت کی طرف، ثانوی درجہ کے قصد سے اور ضمنی التفات سے، جو حاصل ہونے والی ہے ہر ایک سے۔ اور کوئی ممانعت نہیں ہے حضور کے بھنور میں گھسنے کی استعداد رکھنے والے کے لئے کہ گھسے وہ۔ بلکہ یہ بات اس کو کامل طور پر (عظمتِ الٰہی سے) باخبر کرنے والی ہے۔

۲- اور ایسی دعاؤں سے جو بیان کرنے والی ہیں، اپنے عمل کے خالص ہونے کو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے رخ کے پھیرنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف اور مدد طلبی کو اللہ تعالیٰ میں منحصر کرنے کو۔

۳- اور تعظیمی افعال سے، جیسے سجدے اور رکوع۔

(مذکورہ اجزائے ثلاثہ میں سے) ہر ایک دوسرے کے لئے بازو، اس کی تکمیل کرنے والا اور دوسرے کو یاد دلانے والا ہوتا ہے۔ پس ہوگئی نماز عام وخاص کے لئے مفید چیز اور قوی التاثیر تریاق، تاکہ میسر آئے ہر ایک کو اس تریاق میں سے وہ جس کو واجب ولازم جانتی ہے اس کی اصلی (فطری) استعداد۔

لغات:

تَأتَّى الأمرُ: آسان ہونا، تیار ہونا...... تَبَلَّدَ: سست وکند خاطر ہونا...... شَرَحَ الشيئَ: کھولنا، ظاہر کرنا...... عَضَدَ (ن) عَضْدًا: مدد کرنا...... عَنَا يَعْنُوْا عَنَاءً: غم میں ڈالنا، دشوار ہونا...... أَدْأَبَ إِدْآبًا: مشقت میں ڈالنا، تھکانا...... اللَّقْلَقَة: سارس کی آواز، ہر آواز جس میں حرکت واضطراب ہو...... المُتَأتِّي (اسم فاعل) من تَأتَّى الأمرُ: آسان ہونا۔

نماز کے فوائد کا بیان

ذیل میں نماز کے آٹھ فائدے بیان کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: نماز مؤمنین کی معراج ہے۔ معراج کے معنی ہیں سیڑھی یعنی نماز ترقی کا ذریعہ ہے۔ جس طرح نبی کریم ﷺ کو معراج سے سرفراز کیا گیا تھا اور وصال حبیب نصیب ہوا تھا، مؤمنین بھی نماز کے ذریعہ ترقی کرتے ہیں اور آخرت میں ان کو بھی دیدار خداوندی کی نعمت سے، جو کہ اخروی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے، بہرہ ور کیا جائے گا۔ آخرت میں تجلیات کو سہارنے کی استعداد نماز کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے متفق علیہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، چودھویں کا چاند پوری تابانی سے چمک رہا تھا آپ نے اس کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا: ''عنقریب تم اپنے پروردگار کو آشکارا آنکھ سے دیکھو گے، جیسے کہ تم اس چاند کو دیکھتے ہو، تم کوئی تکلیف نہیں دیئے جاؤ گے اس کے دیکھنے میں (یا ازدحام نہیں کرو گے تم اللہ کی رویت میں) پس اگر طاقت رکھو تم کہ نہ غلبہ کئے جاؤ تم (یعنی مشاغل تم پر غالب نہ آئیں) اس نماز پر جو طلوع آفتاب سے پہلے ہے (یعنی نماز فجر) اور اس نماز پر جو غروب آفتاب سے پہلے ہے (یعنی نماز عصر) تو کرو تم'' (مشکوۃ باب رویۃ اللہ عزوجل حدیث نمبر ۵۶۵۵)

فجر وعصر کی تخصیص یا تو اس لئے ہے کہ فجر راحت اور سستی کا وقت ہے اور عصر مشاغل دنیوی کا وقت ہے، پس جو ان دو نمازوں کا اہتمام کرے گا وہ باقی نمازوں کا بدرجۂ اولی اہتمام کرے گا اور ایک قول یہ ہے کہ جنت میں دیدار خداوندی انہیں دو وقتوں میں ہوگا (مظاہر حق) غرض رویت باری کی خوش خبری کے ساتھ نمازوں کے اہتمام کی تاکید اسی لئے ہے کہ نمازیں ہی آدمی میں دیدار خداوندی کی استعداد پیدا کرتی ہیں۔

نوٹ: الصلاۃُ معراج المؤمنین کوئی روایت نہیں ہے، لوگوں میں یہ جملہ جو حدیث کے طور پر چل پڑا ہے وہ بے اصل بات ہے۔

دوسرا فائدہ: نماز محبوبِ خدا بننے کا اور اللہ کی رحمتوں کو لوٹنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے ایک بار اپنے ایک خادم حضرت ربیعۃ بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: ''مجھ سے مانگ'' انھوں نے آپؐ سے بہشت کی رفاقت مانگی۔ آپؐ نے فرمایا: ''کچھ اور مانگ لو'' انھوں نے عرض کیا: ''میرا مطلب تو یہی ہے'' تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''تو اپنے نفس کے خلاف میری مدد کر نمازوں کی کثرت سے'' (مشکوۃ حدیث نمبر ۸۹۶ باب السجود وفضلہ) یعنی تیرا نفس تو نہیں چاہے گا، کیونکہ نفس پر نماز بہت بھاری ہے، مگر تو نفس کو مجبور کر اور بہت زیادہ نمازیں پڑھ، تاکہ میں آخرت میں ان نمازوں کے وسیلہ سے تیرے لئے اپنی رفاقت کی درخواست کرسکوں۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ آدمی نماز کی مدد سے آخرت میں بڑے سے بڑا مرتبہ حاصل کرسکتا ہے۔

اور سورۃ المدثر میں ہے کہ آخرت میں بہشتی مجرموں سے ان کا حال پوچھیں گے کہ تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا؟ وہ کہیں گے: ''ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو کھانا کھلایا کرتے تھے (یعنی زکوۃ بھی نہیں دیا کرتے تھے) اور ہم بحث کرنے والوں کے ساتھ (یعنی اسلام کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ) بحث میں شریک رہا کرتے تھے اور قیامت کے دن کو (عملاً) جھٹلایا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو موت آگئی، پس ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے گی'' (آیات ۳۹-۴۸) ان آیات میں کفار ہی کا بیان نہیں عام مجرموں کا بیان ہے، جو نافرمان مسلمانوں کو بھی شامل ہے۔ پس ان آیات کے منطوق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نماز نہ پڑھنے والے رحمت خداوندی سے محروم ہوں گے اور راندہ ہوکر جہنم میں جائیں گے اور اسی آیت کے مفہوم سے یہ بات نکلی کہ نمازوں کا اہتمام کرنے والے محبوب خدا ہوں گے، اللہ کی رحمتوں کے حقدار ہوں گے اور جنت کے عالی مقامات میں جگہ حاصل کریں گے (اللّٰھمّ اجعلنا منھم!)

تیسرا فائدہ: جب نماز آدمی میں ملکہ اور فطرت بن جاتی ہے۔ تو بندہ اللہ کے نور میں مضمحل (متلاشی، بکھرنے والا، گم) ہوجاتا ہے اور اس کی خطائیں مٹادی جاتی ہیں۔ سورۂ ہود آیت ۱۱۴ میں ہے: ''اور دن کے دونوں سروں پر اور رات کے ابتدائی حصہ میں نماز کا اہتمام کرو، یاد رکھو! نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں'' یعنی نیکیوں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ برائیوں کو مٹادیتی ہیں، جس طرح نہانے سے بدن کا میل کچیل دور ہوجاتا ہے اور خزاں کے موسم میں پتے جھڑ جاتے ہیں، نمازوں اور دوسری نیکیوں سے بھی گناہ مٹ جاتے ہیں اور نیکیاں عملی توبہ بن جاتی ہیں۔

چوتھا فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے کے حجابات ثلاثہ میں ایک جہالت و بدعقیدگی کا حجاب بھی ہے، مبحث چہارم کے باب ششم میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ جب نماز کے افعال حضور قلب اور نیت صالحہ کے ساتھ انجام دیئے جائیں تو نماز سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور دل میں اللہ کی عظمت و اعتقاد پیدا ہوتا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے نماز سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں۔

پانچواں فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے میں حجابِ دنیا بھی مانع ہے یعنی ریت رواج کا پردہ بھی حائل ہوجاتا ہے، محولہ بالا مقام میں اس کی تفصیل بھی گذر چکی ہے۔ جب نماز کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کو ایک مسلمہ طریقہ بنالیا جاتا ہے تو وہ آفاتِ دنیا سے اور رواجی برائیوں سے بچاتی ہے۔ سورۃ العنکبوت آیت ۴۵ میں ہے کہ: ''نماز کی پابندی کیجئے، بیشک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے'' ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ یعنی جب نماز فطرت ثانیہ اور خصلت راسخہ بن جاتی ہے تو رواجی برائیوں سے بچنے میں بے حد نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔

چھٹا فائدہ: نماز مسلمانوں کا شعار ہے، اس کے ذریعہ مسلمان، کافر اور منافق سے ممتاز ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''ہمارے اور ان (منافقین) کے درمیان عہد و پیمان نماز ہے، پس جس نے نماز کو ترک کردیا، وہ کافر ہوگیا'' (رواہ احمد والنسائی وابن ماجہ والترمذی فی کتاب الایمان وقال: حدیث حسن صحیح، مشکوۃ حدیث نمبر ۵۷۴ کتاب الصلوۃ) اسفار

میں ہمیں اس کا خوب تجربہ ہوتا ہے جب کوئی مسلمان لوگوں کے درمیان نماز پڑھتا ہے تو اس کے اس عمل سے دین اسلام کا تعارف ہوتا ہے۔

ساتواں فائدہ: مبحث رابع کے باب اول میں گذرا ہے کہ سعادت حقیقیہ یہ ہے کہ بہیمیت، نفس ناطقہ کی تابعدار ہوجائے اور خواہش عقل کی پیروی کرے اس مقصد کی تحصیل کے لئے نماز جیسی کوئی چیز نہیں۔ نماز نفس کو خوگر بناتی ہے کہ وہ عقل کی تابعداری کرے اور عقل کے حکم پر چلے پس سعادت حقیقیہ حاصل کرنے میں بھی نماز بڑی معین ومددگار ہوتی ہے۔

اب آخر میں ہم نماز کے ایک فائدہ کا اضافہ کرتے ہیں، جس کا قرآن کریم میں متعدد جگہ ذکر آیا ہے:

آٹھواں فائدہ: نماز اللہ پاک کو بہ کثرت یاد کرنے کا ذریعہ ہے اور اللہ پاک کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ عاشق سے کوئی پوچھے: "تجھے محبوب کی یاد میں کیا ملتا ہے؟" وہ خود تو کچھ نہیں بتلا سکے گا، مگر اس کی وارفتگی سب کچھ بتادے گی۔

ذکر، اللہ والوں کے قلوب کی غذا اور آب حیات ہے۔ اللہ پاک کی یاد ہی سے ان کے دلوں کی دنیا آباد ہے۔ پس جو لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے مولی کو یاد رکھیں وہ نمازوں کو اس کا ذریعہ اور وسیلہ بنالیں — نماز کا یہ فائدہ سورۂ ہود آیت ۱۱۴ کے آخری حصہ میں آیا ہے ﴿ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴾ (یہ نماز بڑی یاد ہے یاد کرنے والوں کے لئے) اسی طرح سورۃ العنکبوت کی مذکورہ آیت میں ہے ﴿ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ (اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے)

> والصلاةُ معراجُ المؤمنين، مُعِدَّةٌ للتجليات الأخروية، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم: ﴿إنكم سَتَرَوْنَ رَبَّكم، فإن استطعتم أن لا تُغلبوا على صلاة قبل طلوع الشمس وقبل غروبها، فافعلوا﴾ وسببٌ عظيمٌ لمحبة الله ورحمته، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ أَعِنِّيْ على نفسك بكثرة السجود﴾ وحكايتُه تعالى عن أهل النار: ﴿ وَلَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴾، وإذا تمكنت من العبد اضمحل في نور الله، وكُفِّرت عنه خطاياه: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ ولاشيئَ أنفعُ من سوء المعرفة منها، لاسيما إذا فُعلت أفعالُها وأقوالُها على حضور القلب والنيةِ الصالحة، وإذا جُعلت رسما مشهورًا نفعت من غوائلِ الرسوم نفعاً بينا، وصارت شِعَارًا للمسلم، يتميز به من الكافر، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ العهد الذى بيننا وبينهم الصلاةُ، فمن تركها فقد كفر﴾؛ ولا شيئَ في تمرين النفس على انقياد الطبيعة للعقل، وجَرَيَانِها في حُكمه، مثلُ الصلاة؛ والله أعلم.

ترجمہ: (۱) اور نماز مؤمنین کی معراج ہے، تجلیات اخرویہ کے لئے تیار کرنے والی ہے اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "بیشک عنقریب تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے، پس اگر تم طاقت رکھو کہ نہ ہارو طلوع آفتاب سے قبل اور غروب آفتاب

سے قبل کی نماز میں، تو کر و تم''

(۲)اور نماز بہت بڑا ذریعہ ہے اللہ کی محبت اور رحمت کا، اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''مدد کر تو میری تیرے نفس کے خلاف سجدوں کی کثرت سے'' اور اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کا قول نقل فرمایا ہے: ''اور ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے''

(۳)اور جب نماز بندے میں جم جاتی ہے (یعنی ملکہ بن جاتی ہے) تو بندہ اللہ کے نور میں متلاشی (فنا) ہو جاتا ہے اور اس کی خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں (ارشاد خداوندی ہے): ''بیشک نیکیاں گناہوں کو نابود کر دیتی ہیں''

(۴)اور نماز سے زیادہ کوئی چیز نافع نہیں ہے بدعقیدگی میں، خصوصاً جب نماز کے افعال واقوال حضور قلب اور نیت صالحہ سے انجام دیئے جائیں۔

(۵)اور جب نماز کو ایک مشہور ریت بنالیا جائے تو وہ رواجی برائیوں میں بیّن طور پر نفع بخش ہوتی ہے۔

(۶)اور نماز مسلمانوں کا شعار ہوگئی ہے، اس کے ذریعہ مسلمان کافر سے ممتاز ہوتا ہے، اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''نماز ہی ہم میں اور ان (منافقین) میں عہد و پیمان ہے۔ پس جو شخص نماز کو ترک کر دے وہ کافر ہو گیا''

(۷)اور نہیں ہے کوئی چیز نماز کی مانند نفس کو خوگر بنانے میں طبیعت کی تابعداری کرنے پر عقل کی اور طبیعت کے چلنے پر عقل کے حکم کے مطابق، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: غَلَبَ علیه: غالب آنا، جیتنا۔ غُلِبَ عَلَیه: ہارنا، مغلوب ہونا...... اِضْمَحَلَّ: پاش پاش ہونا، بکھر جانا، متلاشی ہونا۔

باب —— ۱۰

زکوٰۃ کے اسرار کا بیان

اس باب میں زکوٰۃ سے مراد صرف فرض زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ ہر انفاق (اللہ کے راستہ میں خرچ) مراد ہے اور اس کو زکوٰۃ انفاق کی اشرف نوع کے اعتبار سے یا لغوی معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں: طہارت و پاکیزگی۔ چونکہ راہ خدا میں خرچ کرنا مال کو بھی پاک کرتا ہے اور مالک کو بھی اس لئے اس کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ مکی سورتوں میں جو زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہے اس سے مطلق غریبوں پر خرچ کرنا مراد ہے۔ اصطلاحی زکوٰۃ ہجرت کے بعد ۲ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ چھ مختلف مقاصد کے لئے ضروری ہوا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

① ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لئے: جب کسی غریب آدمی کو کوئی بڑی حاجت پیش آتی ہے اور وہ زبان حال سے یا زبانِ قال سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتا ہے، تو اس کی وہ فریاد کرم خداوندی کے دروازے کو کھٹکھٹاتی

ہے۔ چنانچہ کبھی مصلحت خداوندی یہ ہوتی ہے کہ کسی سمجھ دار آدمی کے دل میں الہام کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی حاجت روائی کرے۔ پس جب یہ الہام اس شخص پر چھا جاتا ہے یعنی اس کا دل اس غریب کی حاجت روائی کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے اور وہ شخص اس الہام کے مطابق اس غریب کی ضرورت پوری کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اس پر چہار جانب سے برکتیں نازل ہونی شروع ہوتی ہیں اور وہ شخص اللہ کی رحمتوں کا مورد بن جاتا ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ اپنا ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک غریب آدمی نے مجھ سے اپنی کسی ضرورت میں مجبور ہو کر سوال کیا تو میں نے اپنے دل میں الہام ہوتا ہوا محسوس کیا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس الہام میں مجھے دنیا وآخرت میں اجر جزیل کی خوش خبری بھی دی گئی۔ چنانچہ میں نے اس کو دیا اور مجھ سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اور یہ سب باتیں یعنی اس حاجت مند کا کرم خداوندی کے دروازے کو کھٹکھٹانا اور الہام خداوندی کا برانگیختہ ہونا، اور اس کا میرے دل کو منتخب کرنا اور اجر وثواب کا ظاہر ہونا۔ یہ سب باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

(۴) رحمت خداوندی کے حصول کے لئے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص مصرف میں خرچ کرنا رحمت خداوندی کو حاصل کرنے کا احتمالی محل قرار پاتا ہے، اس وقت اسی محل میں خرچ کرنے سے رحمت خداوندی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً:

۱- کبھی ملأ اعلیٰ میں کسی ملت کی شان دوبالا کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو جو بھی شخص اس ملت کو بڑھانے کے لئے خرچ کرتا ہے وہ رحمت خداوندی کا مورد بنتا ہے اور اس وقت میں اس ملت کے معاملہ کو بڑھانا خرچ کرنے میں غزوۂ تبوک کی طرح ہوتا ہے، جس میں صحابہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سب کچھ پیش کر دیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال پیش کیا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی بار تین سو اونٹ، دوسری بار دو سو اونٹ اور تیسری بار تین سو اونٹ مع ساز وسامان کے لکھوائے تھے اور آپ ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا تھا کہ ماعلی عثمانَ ما عَمِلَ بعدَ هذه (مشکوۃ باب مناقب عثمان) یعنی اگر عثمان آئندہ خرچ نہ بھی کریں تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ انھوں نے خرچ کرنے کا حق ادا کر دیا۔

۲- جب قحط سالی کا زمانہ ہوتا ہے اور لوگ بھوک مری میں مبتلا ہوتے ہیں اور منشأ خداوندی ان لوگوں کو بچانا ہوتا ہے تو اس وقت لوگوں کو کھلانے سے رحمت خداوندی حاصل ہو سکتی ہے، دیگر مدّات میں خرچ کرنے سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔

غرض رحمت خداوندی کے حصول کی ان احتمالی جگہوں سے، پیغمبر ﷺ ایک قاعدہ بناتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ: "جو کسی فقیر پر اتنا اتنا خرچ کرے گا یا ایسی ایسی حالت میں خرچ کرے گا، تو اس کا یہ عمل نہایت مقبول ہوگا" چنانچہ مؤمنین یہ بات سنتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ وعدہ سچا ہے اس لئے وہ تعمیل حکم کرتے ہیں اور وہ اس وعدہ کو برحق پاتے ہیں جو ان سے کیا گیا ہے۔

﴿باب أسرار الزكاة﴾

اعلم: أن المسكين إذا عَنَّتْ له حاجةٌ، وتضرع إلى الله فيها بلسان المقال أو الحال، قَرَعَ تضرُّعُه بابَ الجود الإلهي؛ وربما تكون المصلحةُ أن يُلْهَمَ في قلب زكيٍّ: أن يقوم بسدِّ خلَّته، فإذا تغشَّاه الإلهامُ وانبعث وفقَه، رَضِيَ الله عنه، وأفاض عليه البركاتِ من فوقه ومن تحته وعن يمينه وعن شماله، وصار مرحوماً.

وسألني مسكين ذات يومٍ في حاجة اضْطُرَّ فيها، فأوجستُ في قلبي إلهامًا يأمرني بالإعطاء، ويبشرني بأجرٍ جزيلٍ في الدنيا والآخرة، فأعطيتُ وشاهدتُ ما وعدني ربي حقًا؛ وكان قرعُه لبابِ الجود، وانبعاثُ الإلهام واختيارُه لقلبي يومئذ، وظهورُ الأجر، كُلُّ ذلك بمرأى مني.

وربما كان الإنفاق في مصرفٍ مظِنَّةً لرحمة إلهية، كما إذا انعقدت داعيةٌ في الملأ الأعلى بتنويه ملةٍ، فصار كلُّ من يتعرض لتمشِيَةِ أمرها مرحوما، وتكون تمشيتُه يومئذ في الإنفاق كغزوة العسرة، وكما إذا كان أيامُ قحطٍ، وتكون أمةٌ هي أحوجَ خلق الله، ويكون المرادُ إحياءَهم؛ وبالجملة فيأخذ المخبرُ الصادقُ من هذه المَظِنَّةِ كليةً فيقول: " من تصدق على فقيرٍ كذا وكذا، أوفي حالةِ كذا وكذا، تُقُبِّلَ منه عملُهُ" فيسمعه سامعٌ وينقاد لحكمه بشهادة قلبه، فيجدما وُعِدَ حقًا.

ترجمہ: زکوۃ کی حکمتوں کا بیان: (۱) جان لیں کہ جب کسی مسکین کو کوئی حاجت پیش آتی ہے اور وہ اس سلسلہ میں زبان قال سے یا زبان حال سے بارگاہ خداوندی میں گڑگڑاتا ہے تو اس کا یہ تضرع کرم خداوندی کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے۔ اور کبھی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ کسی بھلے آدمی کے دل میں القاء کیا جائے کہ وہ اس کی حاجت روائی کے لئے اٹھ کھڑا ہو، پس جب اس کو الہام ڈھانک لیتا ہے اور وہ اس کے موافق عمل کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور اس پر برکتوں کا فیضان کرتے ہیں: اوپر سے، نیچے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔ اور وہ شخص مہربانی کیا ہوا ہوتا ہے۔

اور ایک دن ایک غریب نے مجھ سے اپنی ایک ایسی حاجت طلب کی جس میں وہ مجبور ہو گیا تھا۔ پس میں نے اپنے دل میں ایک الہام محسوس کیا جو مجھے دینے کا حکم دے رہا تھا، اور مجھے بشارت سنا رہا تھا اجر جزیل کی دنیا و آخرت میں، چنانچہ میں نے دیا اور میں نے بالکل برحق پایا اس چیز کو جس کا مجھ سے میرے رب نے وعدہ کیا تھا۔ اور تھا اس شخص کا باب کرم کو کھٹکھٹانا اور الہام کا برانگیختہ کرنا اور اس کا میرے دل کو منتخب کرنا اُس دن اور اجر کا ظاہر ہونا، یہ سب باتیں میری

آنکھوں کے سامنے تھیں۔

(۲) اور کبھی کسی خاص مصرف میں خرچ کرنا رحمت خداوندی کے حصول کا محل ہوتا ہے، جیسا کہ جب ملأ اعلیٰ میں سبب پایا جائے کسی ملت کی سربلندی کے بارے میں، پس ہر وہ شخص جو اس ملت کے معاملہ کو بڑھانے کے درپے ہوتا ہے، وہ مہربانی کیا ہوا ہو جاتا ہے۔ اور ہوتا ہے اُس معاملہ کو بڑھانا اس وقت میں خرچ کرنے کے معاملہ میں انتہائی بے سروسامانی کے وقت میں تنگی کا غزوہ کرنے کی طرح، اور جیسا کہ جب قحط سالی کا زمانہ ہو، اور مخلوقات خداوندی میں سے کوئی امت انتہا درجہ کی ضرورت مند ہو، اور مقصود خداوندی اس قوم کو زندہ رکھنا ہو، بات مختصر! پس مخبر صادق اس محل سے ایک کلیہ اخذ کرتا ہے، پس وہ کہتا ہے: ''جو شخص خیرات کرے گا کسی فقیر پر اتنی اتنی یا ایسی اور ایسی حالت میں تو اس کا یہ عمل نہایت مقبول ہوگا'' پس اس کو ایک سننے والا سنتا ہے اور شہادت قلبی سے اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ پس وہ اس چیز کو برحق پاتا ہے جس کا وہ وعدہ کیا گیا ہے۔

لغات:

عَنَّ (ن ض) عَنًّا له: سامنے ظاہر ہونا، پیش آنا...... اَوْجَس الرجلُ: محسوس کرنا...... الداعية: سبب...... نَوَّهَ تنويها الشيئَ: بلند کرنا...... مَشّٰى تَمْشِيَةً الشيئَ: چلانا...... في الإنفاق مابعد سے متعلق ہے...... مَا وُعِدَ کے بعد به عائد محذوف ہے۔

☆ ☆ ☆

(۳) حرص وبخل کے علاج کے لئے: کبھی آدمی کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ مال کی محبت اور بخل نفسانی بیماریوں میں ایک خطرناک بیماری ہے اور تحصیل کمال کی راہ میں رکاوٹ ہے، پس آدمی کو ان رذائل سے سخت اذیت پہنچتی ہے۔ اس بیماری کا علاج بس یہی ہے کہ آدمی اپنی محبوب ترین چیز راہ خدا میں خرچ کرنے کی مشق کرے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۹۲) میں ہے کہ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (تم ہرگز خیر کامل حاصل نہیں کرسکتے تا آنکہ تم اپنی پیاری چیز راہ خدا میں خرچ کرو) انفاق رذائل نفس کا بہترین علاج ہے۔ ایسی صورت میں یعنی جبکہ آدمی میں یہ رذائل موجود ہوں، اگر آدمی خرچ نہیں کرے گا تو یہ بیماریاں اس میں باقی رہ جائیں گی، اور وہ آخرت میں گنجا سانپ بن کر متشکل ہوں گی، جیسا کہ بخاری شریف کی روایت میں آیا ہے (دیکھئے مشکوۃ، کتاب الزکوۃ، حدیث نمبر ۱۷۷۴) اسی طرح اس کے ناطق وصامت اموال بھی ضرر رساں ہوں گے مسلم شریف کی طویل روایت میں یہ مضمون آیا ہے کہ جس نے اونٹوں کی زکوۃ نہیں دی ہوگی، اس کو ہموار چکنے میدان میں منہ کے بل لٹایا جائے گا اور اونٹ اس پر چل کر اس کو روندیں گے (مشکوۃ حدیث نمبر ۱۷۷۳) اور سورۃ التوبہ (آیات ۳۴ و ۳۵) میں ارشاد ہے:

''جولوگ سونا چاندی جمع کرکر رکھتے ہیں، اوران کواللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو آپ ان کوایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنادیجئے، جس دن اس کودوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھراس سے ان کی پیشانیوں اوران کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کوداغ دیا جائے گا۔ (کہا جائے گا:) یہ ہے وہ جس کوتم نے اپنے واسطے جمع کرکے رکھا تھا، سواب اپنے جمع کرنے کامزہ چکھو!''

غرض انفاق: حرص وبخل اور خودغرضی جیسے رذائل کے ازالہ میں بے حد نفع بخش ہے، جو چاہے اس نسخۂ کیمیا کو آزما کردیکھے!

وربما تَفَطَّنَتِ النفسُ بأن حبَّ الأموال والشُّحَّ بها يَضُرُّهُ ويصدُّه عما هو بسبيله، فيتأذّى منه أشدَّ تأذٍّ. ولايتمكن من دفعه، إلابتمرين على إنفاقِ أحبِّ ماعنده، فصار الإنفاق في حقِّه أنفعَ شيئ، ولولا الإنفاق لبقي الحبُّ والشح كما هو، فيتمثل في المعاد شُجاعًا أقْرَعَ، أوتمثَّلت الأموال ضارّةً في حقِّه وهو حديثُ: ﴿بُطِحَ لها بِقَاعٍ قَرْقَرٍ﴾ وقولُه تعالى: ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ الآية.

ترجمہ: اورکبھی نفس اس بات کوسمجھ لیتا ہے کہ دولت کی محبت اور مال میں بخیلی اسے سخت نقصان پہنچا رہی ہے اور اس کوروک رہی ہے اس چیز سے جس کے درپے وہ ہے (یعنی سعادت حقیقیہ کی تحصیل) پس وہ اس سے نہایت سخت اذیت محسوس کرتا ہے، اوروہ اس کو ہٹانے پر قادر نہیں، مگراس چیز کوخرچ کرنے کی مشق کرکے جواس کوسب سے زیادہ محبوب ہے، پس خرچ کرنااس کے حق میں سب سے زیادہ نفع بخش ہوجاتا ہے۔اوراگروہ خرچ نہیں کرے گا تومال کی محبت اور بخل اس کے اندراسی طرح باقی رہ جائے گا، پس وہ آخرت میں گنجے اژدہا کی شکل میں متشکل ہوگا یادولت اس کے حق میں مضرت رساں ہوکرمتشکل ہوگی اوروہ ارشادنبوی ہے: ''منہ کے بل لٹایا جائے گا وہ ان اونٹوں کے لئے چکنے ہموارمیدان میں''اورارشادربانی ہے: ''اورجولوگ سونااورچاندی جمع کرکر کے رکھتے ہیں'' آخرآیت تک پڑھیے۔

لغات:

تَفَطَّنَ: سمجھا کہا جاتا ہے تَفَطَّنْ لما أقول لك: جوکچھ میں تم سے کہتا ہوں اس کوسمجھو...... شَحَّ بالشیئ: بخل کرنا، حرص کرنا...... الشجاع: ناگ...... أقْرَع: گنجا یعنی نہایت سخت زہریلا، جس کے سرکے بال زہر کی زیادتی سے اڑ گئے ہوں...... بطحه (ف) بَطْحًا: بچھانا، منہ کے بل گرانا...... القاع: ہموارمیدان...... القَرْقَر: چکنا...... الكنز: شریعت کی اصطلاح میں وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادانہ کی گئی ہواورجس مال کی زکوٰۃ اداکردی گئی ہووہ اس وعید میں داخل نہیں۔

☆ ☆ ☆

④ بلاؤں اور آفتوں کو ٹالنے کے لئے: کبھی عالم مثال میں کسی کی موت کا فیصلہ ہو جاتا ہے یا اس پر کسی بلا کا اترنا طے ہو جاتا ہے، ایسے وقت میں اگر وہ شخص مال کی بہت بڑی مقدار راہ خدا میں خرچ کرے اور وہ خود بھی اور دوسرے نیک بندے بھی اس کے حق میں گڑگڑا کر دعا مانگیں تو اس کی موت کا فیصلہ رک جاتا ہے اور اس کی بلا ٹل جاتی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ: ''دعا ہی قضائے الٰہی کو پھیرتی ہے، اور نیکی ہی عمر میں زیادتی کرتی ہے'' (مشکوۃ کتاب الدعوات، حدیث نمبر ۲۲۳۳)

مجھے دو مرتبہ اس کا تجربہ ہوا ہے۔ میرے ایک متعلق کا انگلینڈ کے شہر بولٹن میں ایکسیڈنٹ ہو گیا ایک ماہ تک وہ شفاخانہ میں بے ہوش رہے، آخر میں ان کے متعلقین نے ایک بڑی رقم خرچ کی اور دارالعلوم دیوبند میں ختم بخاری شریف کرا کر دعا کرائی تو اللہ نے ان کو شفا عطا فرمائی۔

اسی طرح میرے ایک دوست بمبئی میں سخت بیمار ہوئے اور زندگی سے مایوس ہو گئے۔ انھوں نے بھی ایک بڑی رقم ایسے غریبوں میں بانٹی جو نمازی تھے اور ان سے دعائیں کرائیں اور دارالعلوم دیوبند میں ان کے لئے بھی ختم بخاری شریف کر کے دعاء کی گئی، تو بحمد اللہ وہ بھی شفایاب ہوئے۔ اور خود میرا معمول یہ ہے کہ جب گھر میں کوئی بیمار پڑتا ہے اور دو چار روز کے علاج سے شفا نہیں ہوتی تو میں گھر والوں کو صدقہ کرنے کے لئے کہتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے جلد مریض کو شفا بخشتے ہیں۔ غرض یہ بھی تجربہ سے برحق بات ثابت ہوئی ہے، لوگ آزما کر دیکھیں۔

وربما يكون العبدُ قد أُحيط به وقُضي بهلاكه في عالم المثال، فاندَفع إلى بذل أموالٍ خطيرة، وتضرَّع إلى الله هو وناس من المرحومين، فمحا هلاكه بنفسه بإهلاك ماله، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿لايَرُدُّ القضاءَ إلا الدعاءُ، ولايزيد في العمر إلا البِرُّ﴾

ترجمہ: اور کبھی بندے کو موت گھیر لیتی ہے، اور عالم مثال میں بندے کی ہلاکت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے پس وہ بہہ پڑتا ہے ڈھیر سا مال خرچ کرنے کی طرف اور اللہ کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور نیک لوگوں میں سے کچھ لوگ بھی، پس وہ اپنے نفس کی ہلاکت کو مٹا دیتا ہے اپنے مال کو ہلاک کر کے۔ اور وہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''قضائے الٰہی کو دعا ہی پھیرتی ہے اور عمر میں زیادتی نیکی ہی کرتی ہے''۔

☆ ☆ ☆

⑤ گناہوں سے حفاظت کے لئے: کبھی انسان سے کوئی برا کام سرزد ہو جاتا ہے، وہ اس پر نادم ہوتا ہے، مگر پھر نفس غالب آ جاتا ہے اور دوبارہ وہی گناہ ہو جاتا ہے اور ایسا بار بار ہوتا ہے تو اس صورت میں گناہ سے بچنے کا بہترین علاج یہ ہے کہ آدمی گناہ کا اچھا خاصا مالی تاوان ادا کرے تا کہ آئندہ جب نفس وہ گناہ کرنے کے لئے مجبور کرے تو وہ

تاوان نگاہوں کے سامنے رہے اور اس کو گناہ سے روک دے۔ آدمی نفس کو سمجھائے کہ اگر تو نے یہ حرکت کی تو پھر تجھے تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ اور انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ چمڑی تو دے سکتا ہے، دمڑی نہیں دے سکتا، اس لئے نفس گناہ سے رک جائے گا۔

شریعت میں جو مختلف گناہوں کے کفارے متعین کئے گئے ہیں وہ اسی مقصد سے ہیں اور کفارے تو خیر ضروری جرمانے ہیں، ان کو تو ادا کرنا ہی ہے۔ کچھ تاوان رضا کارانہ بھی متعین کئے گئے ہیں مثلاً حالتِ حیض میں بیوی سے صحبت کرنے پر ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرنے کا جو حکم ترمذی شریف کی روایت میں آیا ہے وہ اسی باب سے ہے۔ غرض آدمی کسی بھی گناہ سے بچنا چاہے یا کسی بھی نیک عمل کی پابندی کرنا چاہے اور نفس مطاوعت نہ کرے تو اس کا علاج یہی مالی جرمانہ ہے مثلاً آدمی غیبت سے بچنا چاہے یا تہجد کی پابندی کرنا چاہے تو غیبت سرزد ہونے پر اور تہجد چھوٹنے پر ایک معقول جرمانہ خود پر لازم کرے ان شاء اللہ غیبت سے بچ جائے گا اور تہجد پابندی سے ادا کرنے لگے گا۔

(۶) خاندان کی خبر گیری کرنے کے لئے: کبھی حسن اخلاق کے تقاضے سے اور کبھی خاندان کے نظام کی حفاظت کے لئے مختلف طرح کے کام کرنے ضروری ہوتے ہیں مثلاً غریبوں کا مالی تعاون کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، رشتہ داروں کا مالی تعاون کرنا، آپس میں سلام کو رواج دینا اور مختلف طرح سے لوگوں کی غم خواری کرنا۔ پس یہ سب کام شرعاً مامور بہ ہو جاتے ہیں اور سب صدقہ وخیرات شمار کئے جاتے ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ ''اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا صدقہ ہے اور نیک بات کا حکم دینا صدقہ ہے، بری بات سے روکنا صدقہ ہے......... اور اپنے ڈول میں سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈالنا صدقہ ہے'' (مشکوۃ، کتاب الزکوۃ، باب فضل الصدقۃ، حدیث نمبر ۱۹۱۱)

وربما يَفْرُطُ من الإنسان أن يعمل عملاً شريرًا، بحكم غلبة الطبيعة، ثم يطّلع على قبحه، فيندم، ثم تغلبُ عليه الطبيعةُ فيعود له، فتكون الحكمةُ في معاجلةِ هذه النفس: أن تُلْزَمَ بذلِ مالٍ خطير، غرامةً على ما فَعَلَ، ليكون ذلك بين عينيه، فيَرْدَعُه عما يقصدُ.

وربما يكون حسنُ الخلق والمحافظةُ على نظام العشيرة منحصرا في إطعام طعام، وإفشاء سلام، وأنواعٍ من المواساة، فيؤمربها، وتُعَدُّ صدقةً.

ترجمہ: اور کبھی انسان سے کوتاہی ہو جاتی ہے بایں طور کہ وہ کوئی برا کام کر گذرتا ہے، نفس کے غلبہ کی وجہ سے، پھر وہ اس کی برائی پر مطلع ہوتا ہے پس وہ پشیمان ہوتا ہے، پھر اس پر نفس غالب آجاتا ہے پس دوبارہ وہ برائی کرتا ہے۔ پس اس نفس کے علاج میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ اس پر بہت سا مال خرچ کرنا لازم کیا جائے، اس جرم کے تاوان کے طور پر جو اس نے کیا ہے، تاکہ یہ جرمانہ ہمیشہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہے پس وہ اس کو روکے اس گناہ سے جس (سے رکنے)

کا وہ ارادہ کرتا ہے۔

اور کبھی حسن اخلاق اور خاندان کے نظام کی حفاظت کا انحصار کھانا کھلانے میں، سلام کو رواج دینے میں اور مختلف قسم کی غم خواریوں میں ہوتا ہے پس وہ ان کاموں کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ چیزیں صدقہ شمار کی جاتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

زکوٰۃ کے فوائد

اب ذیل میں زکوٰۃ کے چار فائدے ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: صدقہ خیرات سے مال میں برکت ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں اس سلسلہ کا ایک واقعہ مروی ہے کہ ایک شخص جنگل میں کھڑا تھا اس نے بادل میں سے ایک آواز سنی، جو بادل کو حکم دے رہی تھی کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر، بادل کا ایک ٹکڑا علحدہ ہو کر چلا، وہ شخص بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ بادل پتھریلی زمین میں برسا، وہاں سے ایک نالی میں سارا پانی اکٹھا ہو گیا۔ وہ شخص اس نالی کے ساتھ ہولیا، پانی ایک باغ میں پہنچا، وہاں ایک شخص ہاتھ میں بیلچہ لئے ہوئے سینچائی کر رہا تھا، اس شخص نے باغ والے سے پوچھا کہ اے اللہ کے بندے! آپ کا نام کیا ہے؟ اس نے اپنا وہ نام بتایا جو اس شخص نے بادل میں سے سنا تھا۔ باغ والے نے اس شخص سے پوچھا کہ آپ میرا نام کیوں پوچھتے ہیں؟ اس نے سارا ماجرا بتایا اور دریافت کیا کہ آپ کیا عمل کرتے ہیں جو خصوصی طور پر آپ کے باغ کے لئے بارش برسی؟ باغ والے نے کہا کہ جب میرا راز تجھے معلوم ہو گیا تو سن! میں باغ کی پیداوار کے تین حصے کرتا ہوں ایک تہائی خیرات کرتا ہوں، ایک تہائی اپنی ضروریات میں خرچ کرتا ہوں اور ایک تہائی باغ کی ترقی میں خرچ کرتا ہوں (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، باب الانفاق، حدیث نمبر ۱۸۷۷)

دوسرا فائدہ: زکوٰۃ کی ادائیگی سے بندے پر رحمت خداوندی کا فیضان ہوتا ہے اور اللہ کی ناراضگی دور ہوتی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے إِنَّ الصدقةَ لَتُطفِئُ غضبَ الرب، وتدفعُ مِيتَةَ السُّوْءِ (خیرات یقیناً پروردگار کے غصہ کو بجھاتی ہے اور بری موت کو ہٹاتی ہے)

تیسرا فائدہ: بخل و حرص پر آخرت میں جو عذاب ہونے والا ہے زکوٰۃ اس کو ہٹا دیتی ہے، کیونکہ صحیح زکوٰۃ ادا کرنے والے میں حرص و بخل کے رذائل پنپ نہیں سکتے، انہیں دیر سویر اس شخص کا پیچھا چھوڑنا ہے اور جب یہ رذائل ختم ہو گئے تو آخرت میں عذاب کا سوال بھی باقی نہیں رہا۔

چوتھا فائدہ: ملأ اعلیٰ کے وہ فرشتے جو زمین کے احوال سنوارنے کی محنت کرتے ہیں، وہ صدقہ خیرات کرنے والے

کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہر صبح دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں ایک کہتا ہے اَللّٰھُمَّ! أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا (اے اللہ! خرچ کرنے والے کو عوض دے) اور دوسرا کہتا ہے اَللّٰھُمَّ! أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا (اے اللہ! مال روکے رکھنے والے کا مال تباہ کر) (متفق علیہ، مشکوۃ، کتاب الزکوۃ باب الانفاق، حدیث نمبر ۱۸۶۰)

والزكاةُ تزيد في البركة، وتطفئُ الغضب بجلبها فيضًا من الرحمة، وتدفع عذابَ الآخرة المترتبَ على الشح، وتَعْطِفُ دعوةَ الملأ الأعلى المصلحينَ في الأرض على هذا العبد؛ والله أعلم.

ترجمہ: اور زکوۃ برکت میں اضافہ کرتی ہے اور (پروردگار کے) غضب کو بجھاتی ہے، اس کے کھینچنے کی وجہ سے رحمت کے فیضان کو، اور ہٹاتی ہے آخرت کے اس عذاب کو جو بخیلی پر مرتب ہونے والا ہے اور موڑتی ہے اِس بندے پر اُن بالائی فرشتوں کی دعاؤں کو جو زمین میں اصلاح کرنے والے ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب ــــــ ۱۱

روزوں کی حکمتوں کا بیان

توحید ورسالت کی شہادت کے بعد نماز، زکوۃ، روزہ اور حج اسلام کے عناصر اربعہ ہیں۔ یعنی اسلام اللہ کی فرمانبرداری والے جس طرز حیات کا نام ہے اس کی تخلیق وتعمیر اور نشو ونما میں ان پانچوں باتوں کو خاص الخاص دخل ہے۔ نماز اور زکوۃ کی حکمتوں سے فارغ ہو کر اب روزوں کی حکمتیں بیان کرتے ہیں۔

روزوں کے تعلق سے لوگوں کی تین قسمیں

طہارت اور نماز کی طرح روزوں کے تعلق سے بھی لوگوں کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

پہلا درجہ: کبھی انسان الہام خداوندی سے سمجھ لیتا ہے کہ بہیمیت کا ہیجان اس کو سعادت حقیقیہ سے روک رہا ہے۔ سعادت حقیقیہ یہ ہے کہ بہیمیت، ملکیت کی تابعداری کرے۔ اور جب آدمی کو یہ احساس ہو جاتا ہے تو وہ بہیمیت سے سخت نفرت کرنے لگتا ہے اور وہ بہیمیت کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں پاتا کہ بھوکا پیاسا رہے اور جماع کرنا ترک کرے اور اپنے دل اور دیگر اعضاء کو قابو میں رکھے، چنانچہ وہ علاج کے طور پر اس طریقہ کو مضبوط پکڑتا ہے۔ یہی وہ اعلی درجہ کا انسان ہے، جو پہلے سے روزوں کے فوائد جانتا ہے اور علی وجہ البصیرت روزے رکھتا ہے۔

فائدہ: مفطراتِ ثلاثہ سے بچنا تو روزے کی ماہیت میں داخل ہے مگر روزے کے مقبول ہونے کے لئے ضروری

ہے کہ آدمی کھانا، پینا اور جماع چھوڑنے کے علاوہ معصیات ومنکرات سے بھی زبان ودہن اور دوسرے اعضاء کی حفاظت کرے۔ اگر کوئی شخص روزہ رکھے اور گناہ کی باتیں اور گناہ والے اعمال: غیبت اور گالی گلوچ کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے روزے کی کوئی حاجت نہیں۔ بخاری کی روایت ہے کہ **من لم یَدَعْ قولَ الزور والعملَ به، فلیس لله حاجةٌ أن یَدَعَ طعامَه وشرابه** (جو شخص روزے میں باطل کلام اور باطل کام کو نہ چھوڑے، اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں)

دوسرا درجہ: اس شخص کا ہے جس کی سمجھ میں از خود تو یہ فوائد نہیں آتے، مگر پیغمبر ﷺ کے بتلانے پر اس کا دل یقین کرلیتا ہے کہ یہ سب فوائد برحق ہیں۔ چنانچہ وہ روزے شروع کرتا ہے، اور وہ روزوں کے فوائد کا بچشم خود مشاہدہ کرتا ہے۔

تیسرا درجہ: اس مؤمن کا ہے جو نہ از خود روزں کے فوائد جانتا ہے، نہ پیغمبر کے بیان سے ادراک کرپاتا ہے۔ البتہ چونکہ وہ مؤمن ہے اس لئے ایمان بالغیب رکھتا ہے اور روزوں کی پابندی کرتا ہے تو وہ بھی محروم نہیں رہتا۔ دنیا میں اگر اس کو فوائد محسوس نہیں بھی ہوتے تو بہیمیت کے جوش کے ختم ہوجانے کی وجہ سے اعمال پر جو اچھے اثرات پڑتے ہیں، آخرت میں وہ فوائد وثمرات سامنے آجاتے ہیں۔

﴿باب أسرار الصوم﴾

اعلم: أنه ربما يتفطَّنُ الإنسانُ من قِبَلِ إلهامِ الحقِ إياه: أن سَورةَ الطبيعةِ البهيميةِ تصدُّه عما هو كمالُه: من انقيادها للملكية فَيُبْغِضُهَا، ويَطلب كَسْرَ سورتها، فلايجد ما يُغِيْثُهُ في ذلك كالجوع والعطش وتركِ الجماع والأخذِ على لسانه وقلبه وجوارحه، فيتمسك بذلك علاجا لمرضه النفساني.

ويتلوه: من يأخذ ذلك عن المخبر الصادق بشهادة قلبه.

ثم الذي يقوده الأنبياء شفقةً عليه وهو لايعلم، فيجد فائدةَ ذلك في المعاد، من انكسار السورة.

ترجمہ: اسرار صوم کا بیان: جان لیں کہ انسان کبھی سمجھ لیتا ہے اللہ تعالیٰ کے دل میں ڈالنے کی وجہ سے کہ طبیعت بہیمیہ کا جوش اس کو روک رہا ہے اس چیز سے جو اس کا کمال ہے یعنی بہیمیت کا ملکیت کی تابعداری کرنا (تفصیل مبحث رابع کے باب اول میں گذر چکی ہے) چنانچہ وہ طبیعت بہیمیہ سے نفرت کرنے لگتا ہے اور وہ اس کے ہیجان کو توڑنا چاہتا ہے، پس نہیں پاتا وہ اس چیز کو جو اس کی واررسی کرے اس معاملہ میں (کسی چیز کو) مانند، بھوک، پیاس اور ترک جماع کے اور اپنی زبان، دل اور اعضاء کو قابو میں رکھنے کے۔ پس مضبوط پکڑتا ہے وہ اُن چیزوں کو اپنے مرض نفسانی کے علاج کے طور پر۔

اور اس کے بعد اس شخص کا درجہ ہے جو یہ باتیں مخبر صادق سے لیتا ہے، اپنے دل کی گواہی سے۔

پھر وہ شخص ہے جس کو کھینچتے ہیں انبیاء ہدایت کے ذریعہ اس پر مہربانی کرتے ہوئے، درانحالیکہ وہ نہیں جانتا (روزوں کے ان فوائد کو) پس پاتا ہے وہ اس کا نفع آخرت میں، جوش کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے۔

لغات: اَغَاثَۃ: مدد کرنا، اعانت کرنا (مادہ غ وث)...... **من انکسار السورۃ** میں مِنْ اجلیہ ہے۔

☆ ☆ ☆

روزوں کے مقاصد

روزے مختلف مقاصد کے لئے ضروری ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان کے تین مقاصد بیان کئے جاتے ہیں۔

① **طبیعت کو عقل کا مطیع بنانے کے لئے:** کبھی انسان یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ اس کے لئے خوبی کی بات یہ ہے کہ طبیعت (نفس) عقل کے ماتحت رہے، مگر طبیعت باغی (سرکش) ہوتی ہے، کبھی اطاعت کرتی ہے، کبھی نہیں کرتی۔ اس لئے اس کو سدھانا ضروری ہوتا ہے اور سدھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کوئی سخت دشوار کام (ریاضت) کرے، جیسے روزے کی ریاضت۔ آدمی منت مان کر یا بغیر منت کے لمبی مدت تک روزے رکھنے کا طبیعت کو مکلّف بنائے اور جو عہد باندھے اس کو پورا کرے، اسی طرح وقفہ وقفہ سے کرتا رہے تا آنکہ طبیعت اطاعت وانقیاد کی خوگر ہوجائے۔

فائدہ: روزوں کا یہ مقصد عقلی ہے، کسی دلیل نقلی کا محتاج نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو روحانیت اور حیوانیت کا سنگم بنایا ہے۔ اس کی طبیعت میں وہ سارے مادی اور سفلی تقاضے بھی ہیں جو دوسرے حیوانوں میں ہوتے ہیں اور اس میں وہ نورانی جوہر بھی ہے جو ملأ اعلیٰ کی خاص دولت ہے اور انسان کی سعادت کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کا یہ روحانی عنصر حیوانی عنصر پر غالب رہے اور اس کو حدود کا پابند رکھے۔ اور یہ جبھی ممکن ہے کہ وہ ملکوتی پہلو کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا عادی ہوجائے اور اس کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرے۔ روزہ کی ریاضت کا خاص مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی بہیمیت کو ملکیت کی تابعداری اور فرمانبرداری کا خوگر بنایا جائے (ماخوذ از معارف الحدیث ۴: ۹۳ ملخصاً)

اس سلسلہ میں اسوۂ نبوی وہ ہے جو متفق علیہ روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نفلی) روزے شروع کرتے تھے اور اتنے دنوں تک مسلسل رکھتے رہتے تھے کہ ہم سوچنے لگتے تھے کہ اب آپ روزے بند ہی نہیں کریں گے۔ پھر بند کر دیتے تھے اور اتنے دنوں تک نہیں رکھتے تھے کہ ہم سوچنے لگتے تھے کہ اب آپؐ روزے نہیں رکھیں گے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو ماہ رمضان کے علاوہ کسی مہینہ کے مکمل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں نے جتنا ماہ شعبان میں آپؐ کو روزے رکھتے ہوئے دیکھا ہے، اتنا کسی اور مہینہ میں نہیں دیکھا (مشکوٰۃ، کتاب الصوم، باب صیام التطوع، حدیث نمبر ۲۰۳۶)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک: بہت دنوں تک نفل روزے رکھنا دوم: اس کی مدت ایک ماہ سے کم ہونی

چاہئے اس سے زیادہ مسلسل روزے رکھنا صحت کے لئے مضر ہوسکتا ہے۔

(۲) گناہوں کی حفاظت کے لئے: کبھی انسان سے کوتاہی ہوجاتی ہے اور اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے تو نفس کو سزا دینے کے لئے اتنے لمبے روزے رکھنے ضروری ہوتے ہیں جو گناہ کے مقابلہ میں اس پر بھاری ہوں، تاکہ دوبارہ اس سے وہ غلطی سرزد نہ ہو۔ رمضان کا روزہ توڑنے کے کفارے میں، ظہار کے کفارے میں، اور قتل خطا کے کفارے میں جو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے گئے ہیں وہ اسی مقصد سے ہیں۔

(۳) وفورِ شہوت کے علاج کے لئے: جب نفس عورتوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہونے لگے اور نکاح کرنے کی مقدرت نہ ہو اور برائی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو لمبے وقت تک مسلسل روزے رکھنے سے شہوت کی شدت کم ہوجاتی ہے۔ حدیث شریف میں جوانوں سے خطاب آیا ہے کہ:

"اے جوانو! تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی سکت رکھتا ہے وہ نکاح کرلے، اس لئے کہ نکاح نظر کو بہت زیادہ میچنے والا یعنی روکنے والا ہے اور شرمگاہ کی بہت زیادہ حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا وہ روزوں کو لازم پکڑے پس بیشک روزہ اس کے لئے آختگی ہے" یعنی وہ شہوت کی شدت کو توڑ دیتا ہے (مشکوٰۃ کتاب النکاح، حدیث نمبر ۳۰۸۹)

وربـمـا يطّلع الإنسان على أن انقيادَ الطبيعةِ للعقل كمالٌ له، وتكون طبيعتُه باغيةً، تنقاد مرةً ولا تـنـقاد أخرى، فيحتاج إلى تمرين، فيعمِدُ إلى عملٍ شاقٍّ، كالصوم، فيكلِّف طبيعتَه، ويلتزم وفاءَ العهد، ثم وثم، حتى يحصلَ الأمْرُ المطلوب.

وربما يَفْرُطُ منه ذنب فيلتزمُ صومَ أيامٍ كثيرةٍ، يشق عليه بازاء الذنب، ليردعه عن العود في مثله.

وربـما تاقت نفسُه إلى النساء، ولا يجد طَوْلاً، ويخاف العنت، فيكسر شهوتَه بالصوم، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿فإن الصومَ له وِجَآءٌ﴾

ترجمہ: اور کبھی واقف ہوجاتا ہے آدمی اس بات سے کہ طبیعت کی فرمانبرداری عقل کے لئے بڑی خوبی کی بات ہے اس کے لئے۔ اور اس کی طبیعت سرکش ہوتی ہے، کبھی ماتحتی کرتی ہے اور کبھی نہیں کرتی، پس وہ مشق کا محتاج ہوتا ہے، پس وہ ارادہ کرتا ہے کسی دشوار عمل کا، جیسے روزہ۔ پس وہ مکلّف بناتا ہے اپنی طبیعت کو، اور سر لیتا ہے وہ عہد و پیمان کے پورا کرنے کو، پھر اور پھر (یعنی وقفہ وقفہ سے یہ عمل کرے) یہاں تک کہ مطلوبہ مقصد حاصل ہوجائے۔

اور کبھی سرزد ہوتا ہے آدمی سے کوئی گناہ، پس وہ سر لیتا ہے اتنے زیادہ دنوں کے روزوں کو جو اس پر شاق ہوں گناہ کے مقابلہ میں تاکہ روکے وہ روزہ اس کو اس طرح کے گناہ سے۔

اور کبھی اس کا نفس مشتاق ہوتا ہے عورتوں کا اور نہیں پاتا وہ استطاعت اور ڈرتا ہے وہ زنا سے، پس توڑتا ہے وہ

شہوت کو روزے کے ذریعہ، اور یہی ارشاد نبوی ہے: ''پس روزہ یقیناً اس کے لئے آختگی (خصی ہونا) ہے''

☆ ☆ ☆

روزوں کے فوائد

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے روزوں کے چھ فوائد ذکر فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ: روزہ بہت بڑی نیکی ہے۔ اس سے ملکیت کو تقویت ملتی ہے اور بہیمیت کمزور پڑتی ہے اور روح کے چہرہ پر پالش کرنے کے لئے اور طبیعت کو مغلوب کرنے کے لئے روزوں سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور روزوں کا بہت بڑی نیکی ہونا۔ درج ذیل متفق علیہ حدیث قدسی سے واضح ہے۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''انسان کا ہر عمل بڑھایا جاتا ہے، نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مگر روزہ (اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہے) پس بیشک وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دونگا۔ آدمی اپنی خواہش اور اپنا کھانا میری وجہ سے چھوڑتا ہے، روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس کے افطار کے وقت اور دوسری خوشی: اس کے اپنے رب سے ملنے کے وقت الخ (مشکوٰۃ کتاب الصوم، حدیث نمبر ۱۹۵۹)

روزہ میرے لئے ہے: یعنی ہر عمل میں ریاء کا احتمال ہے، مگر روزہ چونکہ ایک مخفی چیز ہے اس لئے اس میں ریاء کا احتمال نہ ہونے کے درجہ میں ہے۔ روزہ خالص اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے اور وہ اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس کے ثواب کا اندازہ فرشتوں کو بھی نہیں ہوتا۔ نہ وہ نیکی کے اجر کو بڑھانے کے معروف ضابطہ کے تحت آتا ہے۔ اس کا اجر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی تجویز فرمائیں گے اور جب بندے کی اللہ کے حضور میں پیشی ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کے روزوں کا ثواب ڈکلیر کریں گے تو بندہ خوش خوش ہو جائے گا۔

دوسرا فائدہ: روزوں سے جس قدر بہیمیت کا ہیجان گھٹتا ہے اسی قدر گناہ معاف ہوتے ہیں۔ متفق علیہ روایت میں ہے: ﴿من صام رمضان إیمانا و احتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه﴾ (جو شخص ماہ رمضان کے روزے رکھے بحالت ایمان اور بامید ثواب تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں) یہی تاثیر اور خصوصیت تراویح اور شب قدر کے نوافل کی بھی اسی حدیث میں مروی ہے۔

تیسرا فائدہ: روزوں کی وجہ سے انسان میں اور فرشتوں میں نہایت گہری مشابہت پیدا ہوتی ہے اور جب موافقت اور ہم آہنگی ہوتی ہے تو فرشتے روزہ دار سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ غرض بہیمیت کے کمزور پڑنے کے بعد روزہ دار فرشتوں کی محبت کا مرکز بن جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''روزہ دار کے منہ کی بو (جو خلوِ معدہ سے پیدا ہوتی ہے) اللہ

کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے" (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۹۵۹) اور جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں، ملائکہ بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔

چوتھا فائدہ: نیک بختی حاصل کرنے میں ریت رواج کا پردہ (حجاب دنیا) بھی حائل ہوتا ہے (تفصیل مبحث چہارم کے باب ششم میں گذر چکی ہے) مگر جب روزے پورے اہتمام اور پابندی کے ساتھ رکھے جاتے ہیں اور وہ ایک مسلمہ طریقہ بن جاتے ہیں تو بہت سی رواجی برائیوں سے انسان محفوظ ہوجاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "جب تم میں سے کسی کا روزہ ہوتو چاہئے کہ وہ بیہودہ اور فحش باتیں نہ بکے اور شور وشغب نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا اس سے گالی گلوچ کرے یا جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میرا روزہ ہے" (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۹۵۹)

پانچواں فائدہ: جب کوئی جماعت جماعتی حیثیت سے روزوں کا اہتمام کرتی ہے تو اس جماعت کے سرکش زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں (یہ متفق علیہ حدیث کا مضمون ہے، مشکوٰۃ، کتاب الصوم، حدیث نمبر ۱۹۵۶)

فائدہ: ماہِ رمضان میں چونکہ اللہ کے نیک بندے طاعات وحسنات میں مشغول ومنہمک ہوجاتے ہیں اس لئے ان کی برکات سے عام مؤمنین بھی رمضان میں عبادات کی طرف زیادہ راغب ہوجاتے ہیں پھر اس ماہ میں عمل کی قیمت بھی بڑھادی جاتی ہے اس لئے بھی لوگ جنت والے اعمال میں مشغول ہوجاتے ہیں اس لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور عام لوگ بھی بہت سے گناہوں سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں اور جہنم والے اعمال سے دست بردار ہوجاتے ہیں اس لئے جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ اور نیکی اور عبادت کی اس عام فضا سے وہ تمام طبائع متاثر ہوتی ہیں جن میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے اس لئے شیاطین الانس والجن ان کو بہکانے اور گمراہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہوجاتے ہیں یعنی بیڑیوں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں۔ غرض ان تینوں باتوں کا تعلق اُن اہل ایمان سے ہے جو ماہ مبارک میں خیر وسعادت حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کفار، خدا ناشناس، خدا فراموش اور غفلت شعار لوگوں سے، جو رمضان کی برکات سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتے، ان بشارتوں کا کوئی تعلق نہیں۔

چھٹا فائدہ: روزہ دار کو اللہ تعالیٰ کا وصال نصیب ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث قدسی ﴿ **الصوم لی وانا أجزِیْ بہ** ﴾ میں معروف قراءت تو أَجْزِیْ (فعل مضارع معروف، صیغہ واحد متکلم) ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب وہ ہے جو پہلے فائدہ میں گذرا اور یہی صحیح قراءت ہے جس کی سیاق وسباق سے تائید ہوتی ہے۔ اور بعض لوگ اس کو أُجْزیٰ (فعل مضارع مجہول، صیغہ واحد متکلم) پڑھتے ہیں۔ صوفیا کے یہاں یہ قراءت معروف ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ: "روزے کے بدلہ میں، میں دیا جاتا ہوں" یعنی خود اللہ تعالیٰ روزے دار کو مل جاتے ہیں۔ یہی وصل مع اللہ ہے۔

اوراس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص بہیمیت کو مغلوب کرنے کے لئے اور نفس کی برائیاں دور کرنے کے لئے محنت کرتا ہے اور محنت کر کے نفس کو مجلّی ومصفّی کر لیتا ہے تو عالَم مثال میں اس کا ہر عمل ایک پاکیزہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور اہل اللہ میں سے جو نہایت پاکیزہ اور اونچے درجہ کے لوگ ہوتے ہیں وہ (اپنے) عمل کی اس مقدس صورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور عالَم غیب سے ان کے علم میں کمک پہنچائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ان کا ادراک قوی ہو جاتا ہے اور وہ اس عمل کی پاکیزگی اور صفائی کے راستے سے اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی مضمون حدیث شریف میں آیا ہے کہ: ''روزہ میرے لئے ہے اور میں روزے کی جزاء دیا جاؤنگا''

والصوم حسنة عظيمة، يُقَوِّي الملكية ويُضَعِّف البهيمية، ولاشيئَ مثلُه في صيقلةِ وجهِ الروح وقهر الطبيعة، ولذلك قال الله تعالى: ﴿الصوم لي، وأنا أَجْزِيْ به﴾؛ ويكفر الخطايا بقدر ما اضمحلَّ من سَورة البهيمية؛ ويحصل به تشبهٌ عظيمٌ بالملائكة، فيحبُّونه، ويكون متعلَّقَ الحب أثَرَ ضَعْفِ البهيمية، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿لخلوف فم الصائم أطيبُ عند الله من ريح المسك﴾؛ وإذا جعل رسمًا مشهوراً نفع عن غوائلِ الرسوم؛ وإذا التزمته أمة من الأمم سُلسلت شياطينُها، وفُتحت أبواب جنانها، وغلِّقت أبواب النيران عليها؛ والإنسان إذا سعى في قهر النفس وإزالة رذائلها، كانت لعمله صورة تقديسية في المثال، ومن أزكياء العارفين من يتوجه إلى هذه الصورة، فَيُمَدُّ من الغيب في علمه، فيصل إلى الذات من قِبَلِ التنزيه والتقديس، وهو معنى قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿الصوم لي وأنا أُجْزىٰ به﴾.

ترجمہ: (۱) اور روزہ ایک بہت بڑی نیکی ہے، وہ ملکیت کو قوی کرتا ہے اور بہیمیت کو ضعیف کرتا ہے۔ اور کوئی چیز نہیں ہے اس کے مانند روح کے چہرے کو پالش کرنے میں اور طبیعت کو مغلوب کرنے میں، اور اسی وجہ سے اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دونگا'' (۲) اور روزہ گناہوں کو مٹاتا ہے۔ بہیمیت کے جوش کے مضمحل ہونے کے بقدر (۳) اور روزوں کی وجہ سے بہت بڑی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے فرشتوں کے ساتھ۔ پس ملائکہ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پس وہ شخص بہیمیت کے کمزور پڑنے کے بعد فرشتوں کی محبت کے جڑنے کی جگہ بن جاتا ہے اور وہی آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''معدہ کے خالی ہو جانے سے روزہ دار کے منہ میں پیدا ہونے والی بو، اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ عمدہ ہے'' (۴) اور جب روزہ کو مشہور ریت بنا لیا جائے تو وہ رواجی برائیوں میں نفع بخش ہو جاتا ہے (۵) اور جب امتوں میں سے کوئی امت روزوں کا التزام کرتی ہے تو اس کے سرکش بیڑیوں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں اور ان کی جنتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کی دوزخ کے دروازے بھیڑ دیئے

جاتے ہیں (۶) اور جب انسان نفس کو مغلوب کرنے کی اور اس کے رذائل کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے عمل کے لئے ایک مقدس صورت عالَم مثال میں پیدا ہو جاتی ہے اور ستھرے عارفین (اہل اللہ) میں سے بعض روزہ رکھنے والے اس صورت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پس کمک پہنچائی جاتی ہے عالَم غیب سے ان کے علم میں۔ چنانچہ وہ حضرات اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچ جاتے ہیں پاکیزگی اور بزرگی کی جانب سے اور یہی معنی ہیں آپ ﷺ کے ارشاد کے کہ: ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کے بدلہ میں جزاء کے طور پر دیا جاتا ہوں''

لغات: صَقَلَ (ن) صَقْلاً الشیئَ: صاف کرنا، چکنا کرنا، پالش کرنا...... متعلَّق (اسم مفعول) جُڑنے کی جگہ، مرکز، یہ یکون کی خبر ہے، اسم ضمیر ہے جو صائم کی طرف لوٹتی ہے...... الأثَر: بعد، فوراً کہا جاتا ہے خرج فی أثرِہ: وہ اس کے بعد نکلا۔ اور علی الأثَرِ کے معنی ہیں فوراً۔



اعتکاف کا بیان

اعتکاف کے تعلق سے بھی لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: کے لوگ وہ ہیں جو اعتکاف کے فوائد کا از خود ادراک کر کے، علی وجہ البصیرت اعتکاف کرتے ہیں اور اس کے ثمرات لوٹتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آجاتی ہے کہ ان کا دنیا کے جھمیلوں میں پھنسنا سخت مضر ہے۔ ان کے دل و دماغ میں جو ہمہ وقت دنیاوی تصورات بھرے رہتے ہیں وہ ان کے لئے سخت مضرت رساں ہیں اور یہ بات بھی ان کی سمجھ میں اچھی طرح آجاتی ہے کہ ان کے لئے نفع بخش چیز یہ ہے کہ وہ دنیوی جھمیلوں کو چھوڑ کر کسی مسجد میں گوشہ نشیں ہو جائیں اور ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہیں۔ مگر حالات اس کی اجازت نہیں دیتے اور ضابطہ یہ ہے کہ جو چیز پوری طرح حاصل نہ ہو سکتی ہو، اس کو بالکل چھوڑ بھی نہیں دینا چاہئے۔ بلکہ جس قدر حاصل کرنا ممکن ہو، اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے، چنانچہ یہ شخص اپنی مشغولیت کے اوقات میں سے کچھ لمحات فارغ کر لیتا ہے اور جس قدر اس کے مقدر میں ہوتا ہے اعتکاف کرتا ہے اور اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

دوسری قسم: ان لوگوں کی ہے جن کو اعتکاف کی اہمیت اور اس کے فوائد مخبر صادق (پیغمبر ﷺ) سے معلوم ہوتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ فوائد برحق ہیں۔ چنانچہ وہ بامید فوائد اعتکاف کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔

تیسری قسم: عام لوگوں کی ہے جن سے زبردستی مجبور کر کے اعتکاف کرایا جاتا ہے، وہ کشاں کشاں اعتکاف کی طرف لائے جاتے ہیں، یہ لوگ بھی محروم نہیں رہتے۔ اگر دنیا میں ان کو اعتکاف کے فوائد حاصل نہیں بھی ہوتے تو وہ آخرت میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

وربما يتفطّن الإنسان بضرر توغُّلِه في معاشه، وامتلاءِ حواسه مما يدخل عليه من خارج، وبنفع التفرغ للعبادة في مسجد بُنى للصلوٰة، فلايمكنه إدامةُ ذلك، ومالا يُدرك كُلُّه لايترك كلُّه، فيختطف من أحواله فُرَصًا فيعتكف ما قُدِّر له؛ ويتلوه: المتَلَقِّىْ له من المخبر الصادق بشهادة قلبه؛ والعامِيُّ المغلوبُ عليه، كمامر.

ترجمہ: اور کبھی انسان سمجھ لیتا ہے دنیا کمانے میں بہت زیادہ انہماک کے ضرر کو، اور اس کے حواس کے لبریز ہوجانے کے ضرر کو ان خیالات میں جو گھستے ہیں، اس کے دماغ میں، باہر سے۔ اور سمجھ لیتا ہے وہ عبادت کے لئے ہمہ تن فارغ ہوجانے کے نفع کو کسی ایسی مسجد میں جو نمازوں کے لئے بنائی گئی ہو (یعنی جس میں پنج وقتہ پابندی سے نماز ہوتی ہو) پس نہیں ممکن ہوتا اس کے لئے یہ کام مسلسل کرنا (یعنی ہر وقت مسجد میں رہنا) اور جو چیز ساری حاصل نہ کی جاسکتی ہو اس کو بالکل چھوڑنا بھی نہیں چاہئے۔ چنانچہ وہ اُچک لیتا ہے (یعنی نکال لیتا ہے) اپنے احوال میں سے چند لمحات کو اور اعتکاف کرتا ہے وہ اتنا جو اس کی قسمت میں ہوتا ہے ــــــ اور پیچھے آتا ہے اس کے وہ شخص جو اعتکاف کے فوائد حاصل کرنے والا ہے مخبر صادق سے، اپنے دل کی گواہی سے ــــــ اور (اس کے بعد) وہ عام مسلمان ہے جس سے زبردستی اعتکاف کروایا جاتا ہے، جیسا کہ گذرا۔

لغات:

تـوغّـل فـي البلاد: جانا اور دور تک جانا وَغَلَ يَغِلُ وُغُولًا في الشيئ: داخل ہوکر چھپنا اور دور تک جانا...... المتلقي (اسم فاعل) تَلَقَّى الشيئَ: استقبال کرنا...... المغلوب عليه: ہارا ہوا، مجبور کیا ہوا۔

☆ ☆ ☆

اعتکاف کے فوائد

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اعتکاف کے دو فائدے ذکر فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا فائدہ: معتکف زبان کے گناہوں سے بچا رہتا ہے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی روزہ تو رکھ لیتا ہے یعنی مفطراتِ ثلاثہ سے تو رُک جاتا ہے مگر وہ آزادرہ کر زبان کو برائی سے نہیں بچا پاتا۔ پس اس کا بہترین علاج اعتکاف ہے۔ اعتکاف میں آدمی ہر طرف سے یکسو اور سب سے منقطع ہوکر رہ جاتا ہے اس لئے وہ ہر قسم کے گناہوں سے اور فضول باتوں سے بچا رہتا ہے۔ ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعتکاف کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ: ''وہ (اعتکاف کی وجہ سے اور مسجد میں مقید ہوجانے کی وجہ سے) گناہوں سے بچا رہتا ہے (مشکوٰۃ، باب الاعتکاف، حدیث نمبر ۲۱۰۸)

دوسرا فائدہ: شب قدر کی تلاش کرنا: شب قدر رمضان شریف میں دائر ہے اور اکثر عشرہ اخیرہ میں آتی ہے۔ انسان کبھی شب قدر کا متلاشی ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس رات میں عبادتیں کر کے ملائکہ کی لڑی میں منسلک ہو جائے۔ مگر گھر میں رہ کر راتوں میں جاگنا مشکل ہوتا ہے، پس اس کی بہترین تدبیر اعتکاف کرنا ہے۔ معتکف مسجد میں اگر سوئے گا بھی تو وہ عبادت شمار ہوگی اور اسے مفت میں شب قدر میں عبادت کرنے کا ثواب مل جائے گا۔ اوپر پہلے فائدہ میں جو حدیث ذکر گئی ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ: "معتکف کے لئے وہ سب نیکیاں جاری رکھی جاتی ہیں جو نیکیاں کرنے والا کرتا ہے"...... اور شب قدر کا تفصیلی بیان کتاب کی قسم دوم میں ابوب الصوم کے آخر میں آئے گا۔

وربما يصوم ولا يستطيع تنزيهَ لسانِه إلا بالاعتكاف؛ وربما يطلُب ليلةَ القدر واللصوقَ بالملائكة فيها، فلا يتمكن منها إلا بالاعتكاف؛ وسيأتيك معنى ليلة القدر، والله أعلم.

ترجمہ: اور کبھی آدمی روزہ رکھتا ہے اور اپنی زبان کی حفاظت نہیں کر سکتا ہے مگر اعتکاف کے ذریعہ ــــــ اور کبھی آدمی شب قدر کو تلاش کرتا ہے اور اس رات میں (عبادت کر کے) ملائکہ کے ساتھ ملنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ پس نہیں قادر ہوتا وہ شب قدر (کو پانے) پر مگر اعتکاف کے ذریعہ ــــــ اور عنقریب آئیں گے تیرے پاس شب قدر کے معنی۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب ــــ ۱۲

حج کی حکمتوں کا بیان

لفظ حج کے لغوی معنی ہیں: کسی جگہ کا ارادہ کرنا۔ زیارت اور یاترا متبادل الفاظ ہیں اور اصطلاح میں حج ایک معروف عبادت ہے جو اسلام کے پانچ ارکان میں سے آخری رکن ہے۔

حج کی حقیقت کیا ہے؟

حج درحقیقت مخصوص وقت میں اور مخصوص جگہ میں نیک لوگوں کی بہت بڑی جماعت کے اکٹھا ہونے کا نام ہے۔ اور وہ وقت ایسا ہونا چاہئے جس میں ان حضرات کی یاد تازہ ہو جن پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضل و کرم فرمایا ہے یعنی انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کی زندگیاں یاد آئیں۔ اور وہ جگہ ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں دین کی واضح نشانیاں ہوں، جہاں اکابر دین کی جماعتیں آتی رہی ہوں، وہ دین کی یادگاروں کی تعظیم کرتے رہے ہوں، وہاں وہ اللہ کے

سامنے گڑگڑاتے رہے ہوں، اللہ سے خیر کی امید باندھ کر اور گناہوں کی معافی کی آرزو لے کر وہاں حاضر ہوتے رہے ہوں۔ جب ایسے زمانہ میں اور ایسی جگہ میں نیک لوگ بڑی تعداد میں اکٹھا ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام کرتے ہیں تو ضرور رحمت خداوندی اور مغفرتِ الٰہی نازل ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: ''شیطان عرفہ کے دن میں جس قدر ذلیل، دھتکارا ہوا، حقیر اور غضبناک نظر آتا ہے اتنا کسی اور دن میں نظر نہیں آتا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ رحمت الٰہی کا نزول اور اللہ تعالیٰ کا بڑے بڑے گناہوں سے درگذر کرنا دیکھتا ہے الخ (مشکوۃ کتاب المناسک، باب الوقوف بعرفۃ، حدیث نمبر ۲۶۰۰)

﴿باب أسرار الحج﴾

اعلم أن حقيقة الحج: اجتماعُ جماعةٍ عظيمةٍ من الصالحين: في زمانٍ، يُذَكِّرُ حالَ المنعَمِ عليهم من الأنبياء والصديقين والشهداء والصالحين، ومكانٍ فيه آيات بينات، قد قصده جماعاتٌ من أئمة الدين، معظّمين لشعائر الله، متضرِّعين، راغبين وراجين من الله الخَيْرَ، وتكفيرَ الخطايا؛ فإن الْهِمَمَ إذا اجتمعت بهذه الكيفية لايتخلف عنها نزولُ الرحمة والمغفرةِ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ما رُئِيَ الشيطانُ يوما هو فيه أصغرَ، ولا أَدْحَرَ، ولا أَحْقَرَ، ولا أَغْيَظَ منه في يوم عرفة﴾ الحديثَ.

ترجمہ: حج کے رموز کا بیان: جان لیں کہ حج کی حقیقت: نیک لوگوں کی بہت بڑی جماعت کا اکٹھا ہونا ہے، کسی ایسے زمانہ میں جو یاد دلائے ان لوگوں کی حالت کو جن پر انعام کیا گیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک لوگ: اور کسی ایسی جگہ میں جس میں کھلی نشانیاں ہوں، جس کا قصد کیا ہوا کابر دین کی مختلف جماعتوں نے، شعائر اللہ کی تعظیم کرتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، رغبت کرتے ہوئے، اللہ سے بھلائی کی اور گناہوں کی معافی کی امید رکھتے ہوئے۔ پس بیشک کامل توجہات جب اکٹھا ہو جاتی ہیں اس کیفیت کے ساتھ تو پیچھے نہیں رہتا ان سے مہربانی او بخشش کا اترنا اور اس کا تذکرہ اس ارشاد نبوی میں ہے کہ: ''نہیں دیکھا گیا شیطان کسی دن، جس میں وہ نہایت ذلیل، نہایت دھتکارا ہوا، نہایت حقیر اور نہایت غضبناک ہو، اس سے عرفہ کے دن میں'' حدیث آخر تک پڑھیے۔

ترکیب: جملہ یُذَکِّرُ صفت ہے زمان کی...... معظمین وغیرہ احوال ہیں جماعات کے۔

☆ ☆ ☆

حج ہر ملت میں ہے

کچھ بے دین لوگ سوچتے ہیں کہ حج میں کتنا بڑا سرمایہ برباد ہوتا ہے؟ اور کتنا وقت کا ہرج ہوتا ہے؟ آخر حج کا مقصد

کیا ہے؟ اللہ کی عبادت تو ہر جگہ سے کی جاسکتی ہے؟ یہ دنیا کے تمام لوگوں کا دور دراز کا سفر کر کے ایک جگہ اکٹھا ہونا آخر کیوں ضروری ہے؟

شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سوال مقدر کا جواب دیتے ہیں کہ حج کی اصل تو ہر ملت میں موجود ہے، تمام قوموں میں یاتراؤں اور میلوں ٹھیلوں کا رواج ہے، اسلام میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں:

۱ — کوئی ایسی جگہ ہونی ضروری ہے جس سے لوگ برکت حاصل کریں۔ اور وہ جگہ متبرک اس لئے قرار پائی ہو کہ لوگوں نے وہاں اللہ کی نشانیوں کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا ہو۔

۲ — لوگوں کے لئے قربانیاں بھی ضروری ہیں یعنی ایسے طریقے ہونے ضروری ہیں جن سے لوگ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کریں، خواہ وہ جانور کی قربانی ہو یا کوئی اور عمل ہو۔

۳ — ایسی شکلیں بھی ضروری ہیں جو اکابر ملت سے مروی ہوں، جیسے احرام کا مخصوص لباس، سعی اور رمی جمار کی شکلیں تاکہ لوگ ان کا التزام کریں۔ ان مخصوص شکلوں سے مقربین کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان اکابر کے احوال یاد آتے ہیں۔

انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام حج ہے، جس کا رواج ہر قوم میں ہے، اسلام میں یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔

وأصلُ الحج موجودٌ فى كل أمة، لابدلهم من موضع يتبركون به، لِمَا رَأَوْا من ظهور آياتِ الله فيه، ومن قَرَابِيْنَ، وهيئاتٍ مأثورة عن أسلافهم، يلتزمونها، لأنها تذكّرُ المقرَّبين وما كانوا فيْه.

ترجمہ: اور حج کی اصل ہر امت میں موجود ہے، لوگوں کے لئے کوئی ایسی جگہ ہونی ضروری ہے جس سے وہ برکت حاصل کریں، بایں وجہ کہ دیکھی ہے انھوں نے اس جگہ میں اللہ کی نشانیوں کو نمودار ہوتے ہوئے اور ضروری ہیں قربانیاں اور ایسی شکلیں جو ان کے اکابر سے منقول ہوں، جن کا وہ التزام کریں۔ اس لئے کہ وہ شکلیں مقربین کی یاد تازہ کرتی ہیں اور وہ احوال یاد دلاتی ہیں جن میں وہ اکابر تھے۔

لغات: لِمَا میں ما مصدریہ ہے ...... من قرابین کا عطف باعادۂ جار من موضع پر ہے ...... قرابین جمع ہے قُرْبان کی قُربان: ہر وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے، خواہ وہ جانور کی قربانی ہو یا کوئی اور چیز ہو۔

☆ ☆ ☆

حج بیت اللہ ہی کا برحق ہے

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حج اور یاترا کے لئے مکہ ہی جانا کیوں ضروری ہے؟ اپنے ملک میں ایسی زیارت گاہیں

کیوں نہیں بنالی جاتیں جہاں کا حج کرلیا جائے؟ جیسے شیعوں نے ہر ملک میں کربلا اور امام باڑہ بنالیا ہے اور غایت درجہ جاہلوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ سات بار اجمیر والے خواجہ کی زیارت ایک حج کے برابر ہے۔ اور خیال ہی نہیں، وہ اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ اس سوال مقدر کا بھی جواب دیتے ہیں کہ حج بیت اللہ ہی کا برحق ہے۔ کیونکہ اس میں واضح نشانیاں ہیں۔ ایک نشانی تو حجر اسود ہے جو جنت سے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اتارا گیا ہے، جو پہلے کعبہ شریف کے اندر رکھا ہوا تھا۔ پھر اسلام سے بہت پہلے، حوادث سے بچانے کے لئے، کعبہ شریف کے ایک کونہ میں اس کو جڑ دیا گیا ہے۔ اس پتھر کی یہاں موجودگی یہ بات یاددلاتی ہے کہ یہاں انسانیت کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک آئے ہیں اور انھوں نے اس گھر کا حج کیا ہے۔

اور دوسری نشانی وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف تعمیر کیا تھا اور جس پر آج بھی آپ کے قدموں کے نشان موجود ہیں جس کو 'مقام ابراہیم' کہتے ہیں۔ یہ پتھر بھی پہلے کعبہ شریف کے اندر رکھا ہوا تھا اور اب کعبہ شریف سے باہر چند گز کے فاصلہ پر رکھا ہوا ہے۔ اس پتھر کی یہاں موجودگی بھی پتہ دے رہی ہے کہ یہاں ابراہیم علیہ السلام کے قدم آئے ہیں، گویا یہ بھی ایک تاریخی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاک ہاتھوں سے تعمیر ہوا ہے۔

بیت اللہ شریف کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بمعاونت حضرت اسماعیل علیہ السلام، طوفان نوح علیہ السلام کے بعد اللہ کے حکم سے اللہ کی وحی کے مطابق، ایک چٹیل دشوار گزار سرزمین میں از سرنو تعمیر کیا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی، عظمت اور جلالت شان کی گواہی دنیا کی اکثر اقوام دیتی ہیں۔ مسلمان اور یہود ونصاریٰ جو دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ ہیں ان کو اپنا جد امجد اور بڑا مانتے ہیں۔

غرض بیت اللہ کے علاوہ کوئی بھی مقام ایسا نہیں ہے جس کا حج کیا جائے۔ دیگر جگہیں جن کی لوگ زیارت کرتے ہیں ان میں یا تو شرک کیا جاتا ہے جیسے اجمیر شریف میں۔ میں نے بچشم خود وہاں مسلمانوں کو قبر کا سجدہ کرتے، طواف کرتے، استمداد کرتے اور مرادیں مانگتے دیکھا ہے۔ یا پھر وہ جگہیں محض من گھڑت ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، جیسے ہندوؤں کی تیرتھ گاہیں جن کی یاترا کے لئے ہندو جاتے ہیں یہ سب من گھڑت ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کا بھی اصل مذہب اسلام ہے اور اس کا قبلہ کعبہ شریف ہے اور اس کی واضح نشانی یہ ہے کہ تمام بڑے مندر قبلہ رخ بنے ہوئے ہیں یعنی ان کا دروازہ مسجد کی طرح مشرق کی جانب ہے اور بت مغرب کی جانب محراب کی جگہ میں نصب کیا گیا ہے یہ اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ یہ منادر درحقیقت مساجد ہیں، ورنہ ہندو بتائیں کہ آخر اس طرح مندر بنانے کی کیا وجہ ہے؟ اور جب اس ملک کا مذہب بھی اسلام تھا تو ان کی زیارت گاہیں بھی یقیناً کعبہ شریف اور اس کے پاس کے مقامات ہیں اور یہاں جو

تیرتھ گاہیں بنائی گئی ہیں وہ سب محض فرضی اور من گھڑت ہیں۔

وأحقُّ ما يُحَجُّ إليه بيتُ الله، فيه آيات بينات، بناه إبراهيمُ ـ صلوات الله عليه ـ المشهودُ له بالخير على ألسنةِ أكثرِ الأمم، بأمر الله ووحيه، بعد أن كانت الأرض قفرًا وَعْرًا، إذ ليس غَيْرُهُ محجوجٌ إلا وفيه إشراك أو اختراعُ مالا أصل له.

ترجمہ: اور سب سے زیادہ حقدار ان جگہوں میں جن کا حج کیا جائے بیت اللہ ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں۔ اس کو ابراہیم ـــــ اللہ کی بے پایاں رحمتیں ہوں ان پر ـــــ نے تعمیر کیا ہے جن کے لئے بھلائی کی گواہی دی گئی ہے اکثر اقوام کی زبانی (اُس گھر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے) اللہ کے حکم سے اور اللہ کی وحی کے مطابق، اس کے بعد کہ تھی سرزمین چٹیل دشوار گزار۔ کیونکہ بیت اللہ کے علاوہ کوئی حج کرنے کی جگہ نہیں ہے مگر درانحالیکہ اس میں شریک ٹھہرانا ہے یا ایسی چیز کو گھڑنا ہے جس کی کچھ اصل نہیں۔

لغات: القفر: أرض خالية، لاماء بها: چٹیل زمین...... الوعر: دشوار گزار راستوں والی سرزمین...... المحجوج: حج کرنے کی جگہ۔



حج کے مقاصد

حج مختلف مقاصد سے ضروری ہوا ہے۔ ذیل میں حج کے چار مقاصد ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا مقصد: حج سامان تطہیر ہے ـــــ حج آدمی کو گناہوں سے تو پاک صاف کرتا ہی ہے اس کے باطن کو بھی پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ کیونکہ باطن کی پاکی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ایسی جگہوں میں پہنچنا ہے جن کی نیک لوگ ہمیشہ تعظیم کرتے رہے ہوں، وہاں پہنچتے رہے ہوں اور ذکر اللہ سے ان جگہوں کو آباد کرتے رہے ہوں۔ ایسی بابرکت جگہوں میں پہنچ کر آدمی زمینی فرشتوں کی کامل توجہات کا مرکز بن جاتا ہے اور اہل خیر کے لئے ملأ اعلی (آسمانی فرشتوں) کی عمومی دعاؤں کا رخ بھی اس کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایسی جگہوں میں پہنچنے پر آدمی پر ملکوتی انوار چھا جاتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے بچشم خود اں انوار کا مشاہدہ کیا ہے۔ غرض اس طرح آدمی کا باطن بھی پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

دوسرا مقصد: حج ذکر الٰہی ہے ـــــ دین کی یادگاروں کو دیکھنا اور ان کی تعظیم کرنا بذات خود اللہ کا ذکر ہے، کیونکہ جب شعائر الٰہیہ نظر پڑتے ہیں تو خود بخود اللہ تعالیٰ یاد آجاتے ہیں جس طرح ملزوم کو دیکھ کر لازم یاد آجاتا ہے، سورج کو دیکھ کر روشنی اور آگ کو دیکھ کر گرمی ذہن میں مستحضر ہو جاتی ہے اسی طرح متبرک مقامات کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی

ہے۔ خاص طور پر جبکہ آدمی اپنی شکل وصورت بھی ایسی بنائے ہوئے ہو جس سے تعظیم ٹپکتی ہو اور ایسی شرائط وقیود کی پابندی کررہا ہو جو نفس کو بہت زیادہ چوکنا کرنے والی اور غفلت دور کرنے والی ہوں۔

تیسرا مقصد: حج وصل حبیب کی ایک شکل ہے —— کبھی آدمی کے دل میں اللہ سے ملنے کا بے پناہ جذبہ ابھرتا ہے، وہ شوقِ ملاقات میں تڑپتا ہے مگر عالم ناسوت میں وصال ممکن نہیں ہوتا تو اس کے جذبہ کی تسکین کے لئے کوئی ایسی چیز ضروری ہوتی ہے جس سے وہ دل بہلائے۔ ایسی چیز حج کی عبادت ہے اس کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے جذبہ کی تسکین کرسکے۔ اور حج باعث تسکین اس طرح ہے کہ جب محبوب سے ملنے کی دل میں تڑپ پیدا ہو اور ملاقات کی کوئی صورت نہ ہو تو دیارِ حبیب کے پھیرے لگانا، اس کی گلی کوچوں میں گھومنا بھی دل کو تسکین بخشتا ہے۔

چوتھا مقصد: حج ملی شان وشوکت اور باہمی تعارف کا ذریعہ ہے —— ہر حکومت وقفہ وقفہ سے دربار عام منعقد کرتی ہے اور اس میں مملکت کے چیدہ لوگوں کو مدعو کرتی ہے۔ اور اجتماع کے مقاصد مثال کے طور پر درج ذیل ہوتے ہیں:

۱ — خیرخواہوں کو دھوکہ بازوں سے اور تابعداروں کو سرکشوں سے ممتاز کرنا، جو دعوت پر حاضر دربار ہونگے وہ مخلص وتابعدار ہیں اور جو اجلاس میں غیر حاضر رہیں گے وہ مکار وسرکش ہیں۔

۲ — بادشاہ اور حکومت کی شہرت کرنا اور ان کا آوازہ بلند کرنا۔

۳ — باشندگان مملکت کا باہم ملنا اور ایک دوسرے سے متعارف ہونا۔

اسی طرح ملت اسلامیہ کے لئے حج کی ضرورت ہے۔ حج کے عالمگیر اجتماع میں مثال کے طور پر درج ذیل فوائد ہیں:

۱ — مخلص اور منافق میں امتیاز کرنا، جو ایمان میں سچا ہوگا۔ وہ بدنی ومالی حیثیت سے جب بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہوگا تو ضرور حاضری دے گا اور جو ایمان کا دعوے دار یہ زحمت اٹھانے سے انکار کرے گا، گو عملاً ہی سہی، وہ دعوئے محبت میں جھوٹا ہے۔

۲ — دنیا جہاں کے لوگوں کے سامنے مسلمانوں کی تعداد کا آنا کہ وہ دنیا میں کتنے ہیں؟ اور کہاں رہتے ہیں؟ اور وہ اس طرح کہ جو لوگ ہر سال حج کے لئے آتے ہیں وہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہوتے۔ پس لوگ حاجیوں کی تعداد سے اندازہ کرلیں گے کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہوسکتی ہے اور وہ کہاں کہاں رہتے ہیں؟

۳ — حج کے اجتماع میں دنیا کے بڑے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے تمدنی، سیاسی اور علمی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے، علوم وفنون اور خصوصی کمالات وامتیازات میں لوگ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں اور کمالات حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے ملیں اور معلومات کا باہم تبادلہ کریں اور یہ بات انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہے کہ وہ ساری دنیا کا سفر کرے اور ہر صاحب کمال سے کمال حاصل کرے۔ البتہ حج کا اجتماع ایک ایسا قدرتی اجتماع ہے جہاں پوری دنیا کے بڑے لوگوں سے بہ سہولت ملاقات ہوسکتی ہے اور مکہ میں اور منی

وعرفات کے میدانوں میں شاہ وگدا ایک ساتھ فرش خاک پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے استفادہ بھی کر سکتے ہیں۔

نوٹ: آج کل حاجیوں کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے اور ہوائی سفر کی وجہ سے مدتِ قیام بہت ہی مختصر ہوگئی ہے، اس لئے افادہ اور استفادہ مشکل ہوگیا ہے۔

ومن باب الطهارة النفسانية الحلولُ بموضع لم يزل الصالحون يعظّمونه، ويَحُلُّوْنَ فيه، ويُعَمِّرُونَهُ بذكر الله، فإن ذلك يجلبُ تعلقَ هِمَمِ الملائكةِ السفليةِ، ويعطف عليه دعوةَ الملأ الأعلى الكليةَ لأهل الخير، فإذاحلَّ به غلب ألوانُهم على نفسه، وقد شاهدتُ ذلك رأيَ عينٍ.

ومن باب ذكر الله تعالى رؤيةُ شعائر الله وتعظيمُها، فإنها إذا رُؤِيت ذُكِرَ اللّٰهُ، كما يُذَكِّرُ الملزومُ اللازمَ، لاسيما عند التزام هيئاتٍ تعظيميةٍ، وقيودٍ وحدودٍ تُنَبِّهُ النفسَ تنبيها عظيمًا.

وربما يشتاق الإنسانُ إلى ربه أشدَّ شوقٍ، فيحتاجُ إلى شيئٍ يَقْضِي به شوقَه، فلا يجده إلا الحج.

وكما أن الدولة تحتاج إلى عَرضةٍ بعد كل مدة، ليتميز الناصح من الغاشّ، والمنقاد من المتمرد، وليرتفع الصِّيْتُ، وتَعْلُوْ الكلمةُ، ويتعارفُ أهلها فيما بينهم، فكذلك الملة تحتاج إلى حج، ليتميز الموافق من المنافق، وليظهر دخولُ الناس في دين الله أفواجاً، وليرى بعضُهم بعضًا فيستفيدَ كلُّ واحد ماليس عنده، إذ الرغائب إنما تُكتسب بالمصاحبة والترائي.

ترجمہ: اور درون کی پاکی کے باب سے ہے ایسی جگہ میں اترنا جس کی نیک لوگ برابر تعظیم کرتے رہے ہیں اور جس میں وہ اترتے رہے ہیں (یعنی زیارت کے لئے وہاں آتے رہے ہیں) اور جس کو ذکر اللہ سے آباد کرتے رہے ہیں۔ پس بیشک یہ چیز (یعنی ایسی جگہ میں زیارت کے لئے جانا) زمینی فرشتوں کی کامل توجہات کا تعلق کھینچتی ہے اور اس پر اہل خیر کے لئے بالائی فرشتوں کی عمومی دعاؤں کا رخ موڑتی ہے۔ پس جب وہ شخص اس جگہ میں اترتا ہے تو اس کی ذات پر فرشتوں کے انوار چھا جاتے ہیں اور تحقیق مشاہدہ کیا ہے میں نے اس کا (یعنی ان انوار کا) اپنی سر کی آنکھوں سے۔

اور ذکر اللہ کے باب سے ہے شعائر اللہ کو دیکھنا اور ان کی تعظیم کرنا۔ اس لئے کہ جب شعائر اللہ نظر پڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ یاد آجاتے ہیں جس طرح ملزوم، لازم کو یاد دلاتا ہے، خاص طور پر تعظیمی شکلوں کے التزام کی صورت میں اور ایسی حدود وقیود کی پابندی کرنے کی صورت میں جو نفس کو بہت زیادہ چوکنا کرتی ہوں۔

اور کبھی انسان مشتاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے ملنے کی طرف بے حد مشتاق ہونا۔ پس اس کے لئے ضروری ہوتی ہے کوئی ایسی چیز جس کے ذریعے وہ اپنا شوق پورا کرے۔ پس نہیں پاتا وہ اس کو بجز حج کے۔

اور جس طرح یہ بات ہے کہ گورنمنٹ محتاج ہوتی ہے ایک عرصہ کے بعد دربار عام منعقد کرنے کی طرف۔ تا کہ خیر خواہ

دھوکہ باز سے، اور تابعدار سرکش سے ممتاز ہو جائے اور تا کہ شہرت پھیلے اور آوازہ بلند ہو اور مملکت کے باشندوں کا باہمی تعارف ہو، پس اسی طرح ملت بھی محتاج ہے حج کی طرف، تا کہ مخلص، منافق سے ممتاز ہو جائے اور تا کہ ظاہر ہو لوگوں کا داخل ہونا اللہ کے دین میں گروہ گروہ اور تا کہ بعض، بعض کو دیکھیں (یعنی ملاقات کریں) پس حاصل کرے ہر ایک وہ بات جو اس کو حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ رغبتیں رفاقت سے اور ایک دوسرے کی ملاقات ہی سے حاصل کی جاتی ہیں۔

لغات:

من باب إلخ خبر مقدم ہے اور الحلولُ اور رؤیة مبتدا مؤخر ہیں...... حَلَّ (ن،ض) حلاً وحُلُولاً المكانَ وبالمكانِ: نازل ہونا، اترنا...... يَجلب اور يَعطف کا فاعل ضمیر ہے جو ذلك کی طرف عائد ہے...... رأیَ عینٍ منصوب بنزع خافض ہے ای کرایِ عینٍ...... غرْضة: پیشی...... الغاش: دھوکہ باز...... الصيت: شہرت...... تَرَاءٍ ى تَرَاءِ يًا: ایک دوسرے کو دیکھنا...... ليظهر دخول الناس کا مطلب وہ ہے جو اوپر عرض کیا گیا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی بے پناہ تعداد کا اندازہ حج سے ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

حج کے فوائد

اب ذیل میں حج کے تین اہم فائدے ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: حج رواجی برائیوں سے بچاتا ہے —— مبحث رابع کے باب ششم میں یہ بات تفصیل سے گذر چکی ہے کہ ظہور فطرت کے لئے تین چیزیں مانع ہیں، ان میں سے ایک حجاب رسم ہے یعنی آدمی رواج کے چکر میں کچھ اس طرح پھنسا رہتا ہے کہ وہ کمال نوعی کی تحصیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حج کو ایک مشہور ریت بنا لیا جائے اور ہر شخص ہمہ وقت حج کے لئے فکرمند رہے تو وہ رسوم کی آفتوں سے بچ جاتا ہے۔ فضول خرچی نہیں کرتا۔ شادی بیاہ میں پیسہ نہیں اڑاتا عیش وعشرت میں دولت برباد نہیں کرتا۔ ہر وقت اس پر حج کے لئے رقم پس انداز کرنے کی فکر سوار رہتی ہے اس لئے وہ بہت سی رواجی برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ اور جب زندگی گذارنے کا ایک نہج بن جاتا ہے تو وہ حج کے بعد بھی رسوم میں پیسہ برباد نہیں کرتا۔

دوسرا فائدہ: حج اکابر ملت کے احوال یاد دلاتا ہے اور ان کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے —— ملت اسلامیہ کے اکابر سیدنا ابراہیم، سیدنا اسماعیل اور سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں۔ یہ حضرات امت اسلامیہ کے لئے اسوہ ہیں۔ حج میں ان بزرگوں کے احوال کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کی پیروی کا جذبہ ابھرتا

ہے۔ حرمین میں پہنچ کر حضور اکرم ﷺ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور آپؐ کی تریسٹھ سالہ زندگی کے شب و روز نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور شدت سے یہ جذبہ دل میں ابھرتا ہے کہ آپ ﷺ کی پیروی ہی میں دونوں جہان کی سعادت مضمر ہے۔

تیسرا فائدہ: حج مبرور سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں —— چونکہ حج کے لئے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا ہے، بڑی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور طرح طرح کی مشقتوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس لئے اگر انسان خالص اللہ تعالیٰ کے لئے حج کرے اور تمام آداب کی رعایت کے ساتھ کرے تو حج سے تمام سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ متفق علیہ روایت میں ہے کہ: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے حج کرے پس نہ تو رَفَث (زن و شوئی کی بات) کرے اور نہ کوئی اور گناہ کرے تو وہ حج سے ایسا پاک صاف ہوکر لوٹے گا جیسا وہ اس دن تھا جس دن اس کو اس کی ماں نے جنا تھا'' (مشکوٰۃ، کتاب المناسک، حدیث نمبر ۲۵۰۷) دوسری حدیث میں ہے کہ اسلام، ہجرت اور حج میں سے ہر ایک سابقہ تمام گناہوں کو ڈھادیتے ہیں (یہ خلاصۂ حدیث ہے اور روایت ترغیب منذری (۲:۱۶۳) میں ہے)

غرض حج کفارۂ سیئات ہونے میں ایمان اور ہجرت کی طرح ہے۔ ایمان قبول کرنا بھی معمولی عمل نہیں ہے، بڑے دل گردے کا کام ہے، نومسلموں کو ایمان لانے کے بعد زہرہ گداز سختیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہی حال ہجرت کا ہے۔ اعزاء و اقرباء، مال و دولت اور وطن کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی معمولی حوصلہ کا کام نہیں ہے۔ اس لئے تینوں اعمال کا صلہ یہ ہے کہ وہ سابقہ تمام گناہوں کو ڈھادیتے ہیں۔

وإذا جُعل الحجُّ رسمًا مشهوراً نفع عن غوائل الرسوم؛ ولا شيئَ مثلُه في تَذَكُّر الحالة التي كان فيها أئمةُ الملة، والتحضيضِ على الأخذ بها؛ ولما كان الحج سفراً شاسعًا، وعملاً شاقًّا، لايتم إلا بجهد الأنفس، كان مباشرتُه خالصًا لله، مكفرًا للخطايا، هادمًا لما قبله، بمنزلة الإيمان.

ترجمہ: اور جب حج کو مشہور ریت بنالیا جائے (یعنی ہر شخص حج کے لئے فکر مند رہے) تو وہ رسوم کی آفتوں سے بچاتا ہے —— اور کوئی چیز نہیں ہے حج جیسی اُس حالت کو یاد دلانے میں جس میں ملت کے اکابر تھے اور اس حالت کے اختیار کرنے پر ابھارنے میں —— اور جب حج دور دراز کا سفر تھا اور ایک ایسا دشوار کام تھا جو پورا نہیں ہوسکتا، مگر جانوں کو مشقت میں ڈال کر، تو ہوگیا حج کرنا، خالص اللہ تعالیٰ کے لئے، کوتاہیوں کو مٹانے والا اور سابقہ گناہوں کو ڈھانے والا، جیسے ایمان لانا۔

باب ـــــ ۱۴

نیکی کے مختلف کاموں کی حکمتیں

دور سے نیکی کے کاموں کے اسرار و رموز کا بیان چل رہا ہے۔ اسی سلسلہ کا یہ آخری باب ہے۔ اس باب میں چھ متفرق نیکی کے کاموں کی حکمتیں بیان کی جارہی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) ذکر اللہ کی حکمت

اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑی نیکی ہے۔ حدیث شریف میں ذکر اللہ کو سب سے اچھا نیک کام بتایا گیا ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو وہ عمل بتاؤں جو تمہارے سارے اعمال میں بہتر اور تمہارے بادشاہ کی نگاہ میں پاکیزہ تر ہے اور تمہارے درجوں کو دوسرے تمام اعمال سے زیادہ بلند کرنے والا ہے اور راہ خدا میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ اس میں خیر ہے اور اس جہاد سے بھی زیادہ تمہارے لئے اس میں خیر ہے جس میں تم اپنے دشمنوں سے بھڑو، پھر تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں! یا رسول اللہ! (یعنی ضرور ہمیں ایسا قیمتی عمل بتایئے؟) آپؐ نے فرمایا: وہ اللہ کا ذکر ہے

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ، حدیث نمبر ۲۲۶۹)

اور ذکر اللہ میں چار فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: اللہ کے ذکر اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ـــــ جب ذاکر ذکر کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے۔ ذاکر اور مذکور کے درمیان کے تمام حجابات مرتفع ہوجاتے ہیں۔ اور اس کو وصل مع اللہ کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا فائدہ: اللہ کا ذکر، اللہ کے معاملہ میں بدفہمی کا بہترین علاج ہے ـــــ جن لوگوں کو اللہ کے معاملہ میں شکوک وشبہات رہتے ہیں، وہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں تو وہ وساوس خود بخود کافور ہوجائیں گے۔ اسی طرح جو دانش مند محض سوچتے ہیں اور ذکر اللہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، وہ روز بروز شکوک کے دلدل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا بہترین علاج بھی ذکر اللہ ہے۔ وہ لوگ محبت کے ساتھ بکثرت اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں، ان شاء اللہ ان کے سب شبہات دور ہوجائیں گے۔

تیسرا فائدہ: حضوری کی کیفیت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ذکر اللہ ہے ـــــ جب بندہ بکثرت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کو نسبت یادداشت حاصل ہوجاتی ہے۔ پھر وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہتا ہے، کسی حال میں وہ

اللہ سے غافل نہیں ہوتا۔

چوتھا فائدہ: ذکر اللہ سے دل کی سختی دور ہوتی ہے ــــ قساوتِ قلبی کو دور کرنے کے لئے ذکر اللہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (قرآن) نازل فرمایا ہے، جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، جس سے اُن لوگوں کے، جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، بدن کانپ اٹھتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں'' (سورۃ الزمر آیت ۲۳)

اور حدیث شریف میں ہے کہ: ''اللہ کے ذکر کے علاوہ دیگر باتیں بہت زیادہ نہ کیا کرو، اس سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے اور لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور وہ شخص ہے جس کے دل میں قساوت ہے'' (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۲۷۶) اس حدیث میں ذکر اللہ کا استثناء اس لئے کیا گیا ہے کہ ذکر اللہ سے بجائے قساوت کے نرمی پیدا ہوتی ہے۔

اور ذکر اللہ دو شخصوں کے لئے تو خاص طور پر مفید ہے:

۱۔ اس شخص کے لئے جس کی قوت بہیمی فطری اور خلقی طور پر کمزور ہوتی ہے یا اس نے ریاضتوں کے ذریعہ اس کو کمزور کر لیا ہے۔

۲۔ اور اس شخص کے لئے جس کو فطری طور پر مجرد یعنی اللہ تعالیٰ اور محسوسات یعنی مادیات کے احکام میں خلط ملط کرنے کے خیالات نہیں آتے ہیں یعنی اس کو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہے تو اس کے لئے بھی ذکر اللہ بے حد نافع ہے۔ مثلاً یہ خیال آنا کہ جب ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ایسے خیالات اسی شخص کو آتے ہیں جو مجرد اور مادیات کے احکام میں فرق نہیں کرتا۔ مجرد پر بھی وہی احکام جاری کرتا ہے جو مادیات کے ہیں۔ مگر جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اس کو اس قسم کے خیالات نہیں آتے، ایسے لوگوں کو ذکر اللہ سے بہت زیادہ نفع پہنچتا ہے۔

فائدہ: ذکر اللہ اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے نماز، تلاوت قرآن اور دعاء واستغفار وغیرہ سب کو شامل ہے۔ مگر اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس، توحید وتمجید، اس کی عظمت وکبریائی اور اس کی صفات کمال کے بیان اور دھیان کو ذکر اللہ کہا جاتا ہے۔

﴿باب أسرار أنواع من البر﴾

منها: الذكرُ، فإنه لاحجابَ بينه وبين الله تعالى، ولاشيئَ مثلُه في علاج سوءِ المعرفة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿ألاَ أُنبئكم بأفضلِ أعمالكم؟﴾ الحديث؛ وفي كَسْبِ المُحَاضَرَةِ وطردِ القَسْوَةِ، لا سيما لمن ضَعُفَتْ بهيميتُه جبلةً، أو ضَعُفَتْ كَسْبًا، ولِمَنْ سكت خيالُه جبلةً عن خَلْطِ المجرد بأحكام المحسوس.

ترجمہ: نیکی کی متفرق اقسام کی حکمتوں کا بیان: ان اقسام میں سے ذکر اللہ ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ ذکر اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حائل نہیں ہے۔ اور ذکر جیسی کوئی چیز نہیں ہے بدعقیدگی کے علاج کے لئے اور وہ ارشاد نبوی ہے کہ: ''کیا نہ بتاؤں میں تم کو تمہارے اعمال میں سے بہترین عمل؟'' حدیث آخر تک پڑھ جایئے (اوپر یہ حدیث تفصیل سے بیان کی گئی ہے) اور (ذکر جیسی کوئی چیز نہیں ہے) حضوری کی کیفیت حاصل کرنے میں اور دل کی سختی دور کرنے میں۔ خاص طور پر اس شخص کے لئے جس کی قوت بہیمی فطری طور پر کمزور ہو۔ یا وہ عبادات شاقہ کرنے کی وجہ سے کمزور پڑ گئی ہو اور اس شخص کے لئے جس کے تصورات تھم گئے ہوں۔ فطری طور پر مجرد کو محسوس کے احکام کے ساتھ خلط ملط کرنے سے۔

لغات وترکیب: منھا خبر مقدم ہے اور الذکر مبتداء مؤخر ہے آگے بھی یہی ترکیب ہے...... **المُحَاضَرۃ** (مصدر باب مفاعلہ) ایک دوسرے کے پاس حاضر ہونا، یہاں بمعنی حضور فی جناب اللہ تعالیٰ ہے۔

② دعا کی حکمت

دعاء کے لغوی معنی ہیں مانگنا، پکارنا، مدد طلب کرنا اور اصطلاحی معنی ہیں اپنی تمام حاجات اپنے پروردگار سے مانگنا، انہی کو پکارنا اور انہی سے مدد طلب کرنا۔ اور دعا کے تین فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: دعا نسبتِ حضوری پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ــــ دعا بھی درحقیقت ذکر اللہ ہے، اس لئے جس طرح کثرت ذکر سے نسبت یادداشت پیدا ہوتی ہے بکثرت دعا مانگنے سے بھی یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی تمام حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگو، حتی کہ چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو اور نمک ختم ہو جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات حدیث نمبر ۵۲-۲۲۵۱)

دوسرا فائدہ: دعا مانگتے رہنے سے کامل تابعداری اور ہر حال میں پروردگار عالم کے سامنے حاجت مندی نگاہوں کے سامنے رہتی ہے، اسی لئے حدیث شریف میں دعا کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے (رواہ الترمذی مشکوٰۃ حدیث نمبر ۲۲۳۱)

انسان کا سب سے بڑا کمال عبدیت (بندگی) ہے۔ اور عبادت کی حقیقت ہے: اللہ کے حضور میں خضوع وتذلل اور اپنی بندگی اور محتاجی کا مظاہرہ کرنا اور دعا کا اول وآخر اپنی کامل عاجزی وبے بسی، سراپا محتاجی وبندگی اور کامل اطاعت وانقیاد کا مظاہرہ ہے اس لئے دعا بلاشبہ عبادت کا مغز اور جوہر ہے اور پیہم دعا کرتے رہنے سے بندگی کی یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہتی ہے، کبھی اوجھل نہیں ہوتی۔

تیسرا فائدہ: دعا اللہ تعالیٰ کی طرف طلب وتڑپ کے ساتھ متوجہ ہونے کا پیکر محسوس ہے اور طلب ہی رحمت کا دروازہ کھولتی ہے ــــ دعا دراصل اُن دعائیہ کلمات ہی کا نام نہیں ہے جو دعا کرنے والے کی زبان سے ادا ہوتے ہیں اُن الفاظ کو تو زیادہ سے زیادہ دعا کا لباس، قالب اور پیکر محسوس کہا جاسکتا ہے۔ دعا کی حقیقت انسان کے قلب اور اس کی روح کی طلب

اور تڑپ ہے اور وہ طلب ہی کامیابی کا راز ہے، جیسے گربہ مسکین صورت بنائے ہوئے کھانے والے کے قریب بیٹھ کر امید بھری نگاہوں سے تکتی رہتی ہے تو خود بخود آدمی کے دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس کو ٹکڑا ڈالے۔ اسی طرح جب الفاظِ دعا کے ساتھ نفس بھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور دل میں طلب اور تڑپ ہو تو مقصود ضرور حاصل ہوتا ہے۔

ومنها: الدعاء فإنه يفتح بابا عظيما من المحاضرة، ويجعل الانقيادَ التامَّ والاحتياجَ إلى رب العالمين في جميع الحالات بين عينيه، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم: ﴿الدعاءُ مُخُّ العبادة﴾؛ وهو شَبَحُ توجُّهِ النفس إلى المَبْدَأ بصفة الطلب، الذى هو السِّرُّ فى جلب الشيئ المدعوِّ إليه.

ترجمہ: اور انواعِ برّ میں سے دعا ہے۔ پس بیشک دعا نسبت حضوری کا بڑا دروازہ کھولتی ہے۔ اور کامل تابعداری کو اور ہر حال میں رب العالمین کے سامنے محتاج ہونے کو دونوں آنکھوں کے سامنے کرتی ہے اور وہ ارشاد نبوی ہے کہ: ''دعا عبادت کا مغز (جوہر) ہے'' اور دعا مبدأ (یعنی اللہ تعالیٰ) کی طرف طلب کی حالت کے ساتھ نفس کے متوجہ ہونے کا پیکر محسوس ہے اور طلب ہی وہ چیز ہے جو مانگی ہوئی چیز کو کھینچنے کا راز ہے۔



(۳) تلاوتِ قرآن اور نصیحت سننے کی حکمت

قرآن کریم کی تلاوت کرنا اور وعظ ونصیحت سننا بھی اہم نیکی کا کام ہے اور تلاوت اور وعظ میں عام خاص من وجہٍ کی نسبت ہے، کہیں دونوں جمع ہوجاتے ہیں، کہیں الگ ہوجاتے ہیں۔ جب آدمی سمجھ کر تلاوت کرے تو دونوں باتیں جمع ہوں گی۔ ورنہ محض تلاوت ہوگی اور کسی نیک آدمی کا وعظ سننا محض وعظ کا سننا ہے۔ اور تلاوت اور وعظ سننے کے دو اہم فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: جب آدمی بغور تلاوت کرتا ہے یا وعظ ونصیحت سنتا ہے اور اس کو دل میں اتارتا ہے تو اللہ کا ڈر اور اللہ سے امید اور عظمت الٰہی کے سامنے حیرانی طاری ہوتی ہے۔ نیز احساناتِ خداوندی جو قرآن کریم میں جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں اور قدرت کی کرشمہ سازی جس کا بار بار تذکرہ آتا ہے آدمی کا نفس ان مضامین میں ڈوب جاتا ہے اور خوابیدہ طبیعت جاگ اٹھتی ہے اور نفس میں ملکوتی انوار کے فیضان کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ دونوں باتیں موت کے بعد انسان کے لئے بے حد نفع بخش ثابت ہوتی ہیں اور قبر میں نکیرین کے سوالات کے صحیح جوابات دینے میں ان دونوں باتوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: جو شخص فرشتوں کے سوالات کے صحیح جوابات نہیں دے گا، فرشتے اس سے کہیں گے کہ: ''تو نے نہ تو حق کو پہچانا اور نہ تو نے قرآن کریم کی تلاوت کی'' پھر تو صحیح جوابات

کیسے دے سکتا ہے؟ تجھے امتحان میں فیل ہونا تھا جو ہو گیا (یہ روایت بخاری شریف کتاب الجنائز میں ہے حدیث نمبر ۱۳۳۸ اور ۱۳۷۴ ہے)

دوسرا فائدہ: اور تلاوت قرآن کا خاص طور پر فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے دل کا میل اور زنگ دور ہوتا ہے اور نفس سفلی کیفیات سے پاک ہوتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ: ''ہر چیز کے لئے منجن (زنگ دور کرنے کا سامان) ہے اور دلوں کا منجن اللہ کا ذکر ہے'' (مشکوۃ، کتاب الدعوات، حدیث نمبر ۲۲۸۶) اور قرآن کریم اعظم ذکر ہے پس تلاوت قرآن سے بھی دل کا زنگ دور ہوتا ہے۔

ومنها: تلاوةُ القرآن، واستماعُ المواعظ، فمن ألقى السمعَ إلى ذلك، ومكّنه من نفسه، انصبغ بحالات الخوف والرجاء والحيرة في عظمة الله، والاستغراقِ في منة الله وغيرها، فينفع من خمود الطبيعة نفعًا بينًا، ويُعِدُّ النفسَ لفيضانِ ألوانٍ ما فوقَها، ولذلك كان أنفعَ شيئ في المعاد، وهو قولُ المَلَك للمقبور: "لا دَرَيْتَ، ولا تَلَيْتَ!"؛ وفي القرآن تطهيرٌ للنفس عن الهيئات السفلية، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: ﴿لكل شيئ مِصْقَلَةٌ، ومصقلةُ القلب تلاوةُ القرآن﴾.

ترجمہ: اور انواع بر میں سے تلاوت قرآن اور نصیحتوں کا سننا ہے۔ پس جو شخص ان باتوں کی طرف کان لگاتا ہے اور ان کو اپنے دل میں جماتا ہے تو وہ رنگین ہو جاتا ہے خوف ورجاء کے احوال سے اور اللہ کی عظمت میں سرگشتگی کے ساتھ اور اللہ کے احسانات وغیرہ میں ڈوبنے کے ساتھ، پس وہ نفع پہنچاتا ہے بجھی ہوئی طبیعت کو واضح طور پر نفع پہنچانا اور وہ تیار کرتا ہے نفس کو عالم بالا کے انوار کے فیضان کے لئے اور اسی وجہ سے وہ سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے آخرت میں اور وہ فرشتہ کا مدفون سے کہنا ہے: تو نے نہ تو حق کو پہچانا اور نہ قرآن کی تلاوت کی'' ——— اور (تلاوت) قرآن میں نفس کی سفلی کیفیات سے تطہیر ہے اور وہ ارشاد نبوی ہے کہ: ''ہر چیز کے زنگ کو دور کرنے کے لئے آلہ ہے اور دل کے زنگ کو دور کرنے کا آلہ تلاوت قرآن ہے'' (یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔ اوپر جو ذکر اللہ کی حدیث ہے وہ مشکوۃ میں ہے اور اس سے بھی استدلال ہو سکتا ہے)

(۴) حسن سلوک کی حکمت

رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جوڑنا اور بستی والوں اور ملّی بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور غلاموں کو آزاد کرنا بھی نیکی کے کام ہیں، اور ان کے تین فائدے ہیں:

پہلا فائدہ: یہ تمام کام آدمی میں رحمت الٰہی اور طمانینت قلب کے نزول کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ مشکوۃ، کتاب الآداب، باب البر والصلة اور باب الشفقة والرحمة على الخلق میں اس سلسلہ کی بہت روایات ہیں۔

دوسرا فائدہ: یہ تمام کام ترقی یافتہ تمدن اور حکومت کی ضروریات ہیں۔ مبحث ثالث میں اس کی تفصیلات گذر چکی ہیں۔

تیسرا فائدہ: ان کاموں کے ذریعہ انسان فرشتوں کی دعاؤں کو اپنی طرف کھینچتا ہے یعنی ملأ اعلیٰ اُن کے لئے خیر وبرکت کی دعائیں کرتے ہیں۔

ومنها: صِلةُ الأرحام والجيران، وحسنُ المعاشرة مع أهل القرية و أهل الملّة، وفَكُّ العاني بالإعتاق، فإن ذلك يُعِدُّ لنزولِ الرحمة والطُّمَأنينةِ، وبها يتم نظامُ الارتفاق الثاني والثالث، وبها يُستَجْلَبُ دعوةُ الملائكة.

ترجمہ: اور انواع بر میں سے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جوڑنا اور بستی والوں اور مذہبی بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور قیدی (یعنی غلام) کو آزاد کر کے قید سے چھڑانا ہے۔ پس بیشک یہ کام تیار کرتے ہیں رحمت اور طمانینت کے نزول کے لئے اور ان کاموں سے ارتفاق ثانی (ترقی یافتہ تمدن) اور ارتفاق ثالث (حکومت) کے نظام کی تکمیل ہوتی ہے اور ان کاموں کے ذریعہ فرشتوں کی دعائیں کھینچی جاتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

⑤ جہاد کی حکمت

جہاد بھی اہم نیکی کا کام ہے۔ قرآن وحدیث میں اس پر بڑے اجر وثواب کے وعدے آئے ہیں۔ جہاد دفع ظلم اور رفع فتنہ کے لئے مشروع ہوا ہے اور تا قیام قیامت جاری رہے گا اور اس کی ضرورت مختلف صورتوں میں پیش آتی ہے۔ ذیل میں تین صورتیں ذکر کی جاتی ہیں جن میں جہاد ضروری ہوجاتا ہے۔

پہلی صورت: جب کوئی بدکار و بداطوار شخص سر اٹھاتا ہے اور عام لوگ اس کی حرکتوں سے پریشان ہوجاتے ہیں اور اس شخص کو فنا کی گھاٹ اتارنا نظام عالم کا تقاضا ہوتا ہے تو اس پر حق تعالیٰ کی لعنت برستی ہے اور کسی بھلے آدمی کے دل میں الہام کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو قتل کرے۔ چنانچہ اس شخص کے دل میں، بغیر کسی دنیوی سبب کے، غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور وہ شخص اپنی کسی غرض کے لئے نہیں، بلکہ منشا خداوندی کی تکمیل کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ نور الٰہی اور رحمت خداوندی میں پاش پاش ہوکر اس شخص کو کیفر کردار تک پہنچا دیتا ہے، جس سے سارا ملک اور ملک کے تمام باشندے چین کا سانس لیتے ہیں۔

دوسری صورت: کبھی کسی ایسی جابرانہ حکومت کے زوال کا فیصلۂ خداوندی ہوتا ہے جس کے باشندے کافر ہوتے ہیں اور جنھوں نے برا طریقۂ زندگی اپنایا ہوتا ہے، پس کسی پیغمبر کو اس حکومت سے لڑنے کا حکم ہوتا ہے۔ اور اس کی قوم کے دل میں جذبۂ جہاد پھونکا جاتا ہے تا کہ وہ ایک ایسی امت بن کر ابھریں جو لوگوں کے فائدے کے لئے کام کریں۔ چنانچہ وہ پیغمبر اپنی قوم کے ساتھ مل کر اس حکومت سے جہاد کرتا ہے اور رحمت الٰہی اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ اس طرح اس امت کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس حکومت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ آیات ۲۴۶-۲۵۱ میں جالوت کی حکومت کا طالوت اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں خاتمہ کا تذکرہ ہے۔ وہ اس کی واضح مثال ہے۔

تیسری صورت: کبھی درندہ صفت لوگ غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اور منکرات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں مفاد عامہ کے پیش نظر کچھ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ان لوگوں کا فتنہ فرو کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ ان کے ظلم وستم سے لوگوں کو نجات دلانی چاہئے، احکام شرعیہ کی خلاف ورزی کرنے والوں پر حدود شرعیہ قائم کرنی چاہئیں اور لوگوں کو منکرات سے روکنا چاہئے۔ چنانچہ وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اُن ظالموں سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور ان کا فتنہ فرو کرتے ہیں، جس سے لوگوں کو سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے، ایسے مجاہدین کی محنتوں کی بھی اللہ تعالیٰ قدر فرماتے ہیں۔

ومنها: الجهادُ، وذلك أن يَلْعَنَ الحقُّ انسانا فاسقًا ضارًّا بالجمهور، إعدامُه أوفقُ بالمصلحة الكلية من إبقائه، فيظهر الإلهام في قلب رجل زكي ليقتله، فينبجس من قلبه غضبٌ، ليس له سببٌ طبيعي، ويكون فانيا من مراده، باقيا بمراد الحق، ويضمحلُّ في رحمة الله ونوره، وينتفع العبادُ والبلاد بذلك.

ويتلوه: أن يَقْضِيَ الله بزوال دولةِ مُدُنٍ جائرة كفروا بالله، وأساؤا السيرةَ، فَيُؤْمر نبي من أنبياء الله تعالى بمجاهدتهم، فَيَنْفُخُ داعيةَ الجهاد في قلوب قومه، ليكون أمةً أخرجت للناس، وتشملُه الرحمة الإلهية.

ويتلوه: أن يَطَّلِع قومٌ بالرأى الكلي على حُسْنِ أن يَذُبُّوا أنفسًا سَبُعِيَّةً عن المظلومين، وإقامة الحدود على العصاة، والنهي عن المنكر، فيكون سببا لأمن البلاد وطُمَأْنينتهم، فيشكر الله له عمله.

ترجمہ: اور انواع بر میں سے جہاد ہے اور اس کی تقریب اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ پھٹکار بھیجتے ہیں کسی ایسے بدکار انسان پر جو عام پبلک کو نقصان پہنچانے والا ہوتا ہے، جس کو نابود کرنا مصلحت کلی سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے اس کو باقی رکھنے سے، پس الہام ظاہر ہوتا ہے کسی آدمی کے دل میں تا کہ وہ اس کو قتل کرے۔ پس اس کے دل سے

ایسا غصہ پھوٹتا ہے جس کے لئے کوئی مادی سبب نہیں ہوتا اور وہ شخص اپنی مراد سے فنا ہونے والا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی مراد کے ساتھ باقی رہنے والا ہوتا ہے اور مر مٹتا ہے وہ اللہ کی رحمت اور نور میں اور منتفع ہوتے ہیں لوگ اور علاقے اس قتل کی وجہ سے۔

اور اس کے پیچھے آتی ہے یہ تقریب کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرماتے ہیں ظلم پر کمر بستہ شہروں کی حکومت کے خاتمہ کا، جن کے باشندے اللہ کے منکر ہوتے ہیں اور جنھوں نے بدچلنی اپنائی ہوئی ہوتی ہے، پس اللہ کے نبیوں میں سے کوئی نبی حکم دیئے جاتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کا، پس وہ جہاد کا داعیہ پھونکتا ہے قوم کے دلوں میں، تاکہ بن جائیں وہ ایک ایسی امت جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ظاہر کی گئی ہو، اور اس نبی کے شامل ہوتی ہے رحمت خداوندی۔

اور اس کے پیچھے آتی ہے یہ تقریب کہ کچھ لوگ مصلحت کلی کو سامنے رکھ کر واقف ہوتے ہیں اس بات کی خوبی سے کہ ہٹائیں وہ درندہ صفت لوگوں کو مظلوموں سے اور نافرمانوں پر سزائیں جاری کرنے کی خوبی سے اور ناجائز کاموں سے روکنے کی خوبی سے۔ پس یہ چیز سبب بن جاتی ہے شہروں کے امن واطمینان کا۔ پس اللہ تعالیٰ قدر کرتے ہیں ان لوگوں کے اس کام کی۔

لغات وترکیب: جملہ إعدامُه إلخ صفت ہے إنسانا کی...... اِنْبَجَسَ الماءُ پانی جاری ہونا، پھوٹنا...... لیکون کی ضمیر قوم کی طرف لوٹتی ہے، قوم لفظاً مفرد ہے...... تَشْمَلُهُ کی ضمیر نبی کی طرف بھی لوٹائی جاسکتی ہے اور قوم کی طرف بھی...... شَكَرَ اللّٰهُ سَعْيَهُ: اللہ تعالیٰ اس کو اس کی کوشش کی جزاء دیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

⑥ آفات وبلیات کی حکمتیں

مؤمن کی زندگی میں بہت سے غیر اختیاری واقعات پیش آتے ہیں، جیسے مصائب وآفات اور بیماریاں وغیرہ یہ تمام چیزیں بھی مؤمن کے حق میں نیکیاں بن جاتی ہیں، چار وجوہ سے:

پہلی وجہ: مصائب کفارۂ سیئات اور باعث رفع درجات بنتے ہیں اس لئے وہ سبب خیر بن جاتے ہیں اور نیکی شمار ہوتے ہیں ــــــ کبھی بندے کے نیک عمل کی وجہ سے رحمت الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور تکوینی اسباب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس پر تنگی کی جائے تو رحمت خداوندی اس بندے کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پس وہ رحمت اس کے گناہوں کو مٹاتی ہے اور اس کے لئے نیکیاں لکھتی ہے۔ مثلاً حوض میں سے پانی نکلنے کا سوراخ بند کر دیا جائے تو پانی اِدھر اُدھر سے نکلنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں لوگ پانی کے اِدھر اُدھر سے نکلنے کو سوراخ بند کرنے کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیونکہ وہ سبب ہے۔ اسی طرح رحمت خداوندی گناہوں کو مٹاتی ہے اور نیکیاں لکھتی ہے مگر چونکہ اس کا سبب بندے کو

لاحق ہونے والی پریشانیاں ہیں جو تکوینی اسباب کے نتیجہ میں رونما ہوئی ہیں اس لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ مصائب سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

سوال: رحمت الٰہی، تکوینی اسباب کے تقاضوں کو کیوں نہیں روکتی؟

جواب: تدبیر الٰہی میں نسبۃً جو چیز بہتر ہوتی ہے اس کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شخصی مصالح کی وجہ سے شخصی فلاح کے لئے کلی نظام کو متاثر کرنا کبھی مصلحت خداوندی میں مناسب نہیں ہوتا اس لئے کلی نظام کو بروئے کار آنے دیا جاتا ہے اور ذاتی صلاح کو ذاتی فلاح کے بجائے کفارۂ سیئات اور رفع درجات کی طرف متوجہ کردیا جاتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل مبحث دوم کے باب اول میں گذر چکی ہے۔

دوسری وجہ: آفات وبلیات سے مؤمن سبق لیتا ہے اور اس کا دنیا کا انہماک گھٹتا ہے اس لئے وہ سبب خیر بن جاتے ہیں اور نیکی شمار ہوتے ہیں —— جب مؤمن پر سخت مصائب آتے ہیں تو اس پر زمین باوجود کشادگی کے تنگ ہوجاتی ہے۔ نتیجۃً اس کے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور ریت رواج کا پردہ چاک ہوتا ہے، دنیا کے جھمیلوں کو وہ کم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز سے وہ دل برداشتہ ہوجاتا ہے اس طرح حوادث اس کے لئے سبب خیر بن جاتے ہیں۔ اور کافر جب مصائب سے سنبھلتا ہے تو وہ اپنا نقصان یاد کرتا ہے کہ بیماری کی وجہ سے اتنا اتنا نقصان ہوگیا۔ اور وہ اندھا دھند دنیا میں گھستا ہے۔ نتیجۂ وہ پہلے سے بھی خبیث تر ہوجاتا ہے اور حوادث اس کے لئے سبب خیر نہیں بنتے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بیماریوں کا تذکرہ فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ جب مؤمن کو بیماری پہنچتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو عافیت بخشتے ہیں تو وہ بیماری گذشتہ گناہوں کا کفارہ بنتی ہے اور آئندہ کے لئے نصیحت بنتی ہے اور منافق جب بیمار پڑتا ہے پھر شفایاب ہوتا ہے تو اس کا حال اس اونٹ جیسا ہوتا ہے جس کو اس کے مالک نے باندھ دیا پھر کھول دیا پس وہ نہیں جانتا کہ اس کو باندھا کیوں اور کھولا کیوں؟" (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر ۱۵۷۱)

تیسری وجہ: بیماریوں سے کمزوری آتی ہے اور گناہوں میں کمی واقع ہوتی ہے اس لئے وہ سبب خیر بن جاتی ہیں اور نیکی شمار ہوتی ہیں —— پتھر جیسی ٹھوس اور بھاری برائیوں پر ابھارنے والی چیز نہایت سخت گاڑھی بہیمی قوت ہی ہے۔ پس جب آدمی بیمار پڑتا ہے اور لاغر ہوجاتا ہے اور بدل ما یتحلل میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یعنی جتنی ایزجی خرچ ہوتی ہے اس کا بدل میسر نہیں آتا تو گناہوں پر ابھارنے والی صلاحیت مضمحل ہوجاتی ہے اور جس قدر وہ کمزور ہوتی ہے اسی قدر گناہ بھی گھٹ جاتے ہیں، جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بیمار کی جماع کی حرص اور غصہ ختم ہوجاتا ہے اس کے اخلاق میں تبدیلی آجاتی ہے اور بہت سی سابقہ باتیں وہ اس طرح بھول جاتا ہے کہ گویا وہ اس میں تھی ہی نہیں اور خود آدمی ایسا بدل جاتا ہے کہ گویا وہ پہلے والا آدمی ہی نہیں۔ غرض اس طرح آفات وبلیات سے گناہوں میں کمی واقع ہوتی ہے اور وہ باعث خیر بن جاتی ہیں اور نیکی شمار ہوتی ہیں۔



چوتھی وجہ: آفات وبلیات سے دنیا ہی میں گناہوں کا معاملہ نمٹ جاتا ہے، اس لئے وہ سبب خیر بن جاتی ہیں اور نیکی شمار ہوتی ہیں — مؤمن پر جو مصائب نازل ہوتے ہیں وہ دنیا میں اس کے گناہوں کی سزا ہوتے ہیں۔ وہ دنیا سے پاک صاف ہوکر آخرت میں پہنچتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے من یُرِدِ اللّٰہُ بہ خیرًا یُصَبْ منہ (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو خیر منظور ہوتی ہے، اس پر اللہ تعالیٰ آفتیں ڈالتے ہیں) (مشکوۃ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر ۱۵۳۶) اور ترمذی کی روایت میں ہے کہ: ''جب اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کو جلدی دنیا ہی میں سزا دیدیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ برابرتاؤ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے گناہوں کی سزا روک لیتے ہیں۔ تا آنکہ اس کو قیامت کے دن پورا پورا بدلہ دیتے ہیں (مشکوۃ حدیث نمبر ۱۵۶۵) اور ترمذی کی ایک اور روایت میں ہے لایزال البلاءُ بالمؤمن فی نفسہ ومالہ وولدہ، حتی یَلْقَی اللّٰہَ تعالی وما علیہ من خطیئۃ (مؤمن کی ذات، مال اور اولاد میں برابر بلائیں آتی رہتی ہیں، تا آنکہ وہ اللہ سے ملاقات کرتا ہے اس حال میں کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا) (مشکوۃ حدیث نمبر ۱۵۶۷)

ظاہر ہے کہ یہ بات مؤمن کے لئے نہایت مفید ہے کہ اس کے گناہوں کا معاملہ دنیا ہی میں نمٹ جائے۔ اس لئے آفات وبلیات اس کے لئے سبب خیر بن جاتی ہیں اور وہ نیکی شمار ہوتی ہیں۔

مگر ہر مؤمن کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ صرف اس مؤمن کے ساتھ یہ مہربانی والا معاملہ کیا جاتا ہے جس کی بہیمیت نے اس کی ملکیت کا کسی درجہ میں پیچھا چھوڑ دیا ہو مثلاً بوڑھاپے میں جب بہیمیت کمزور پڑ جاتی ہے یا ریاضتوں کے ذریعہ بہیمیت کو رام کرلیا جائے اور آدمی میں کسی درجہ میں صلاح وتقوی پیدا ہو جائے اور ملکیت کو اس کا کام کرنے کا موقعہ ملے تو اس وقت عام طور پر دنیا ہی میں مؤمن کو اس کی برائیوں کی سزا دیدی جاتی ہے۔ اور جب تک بہیمیت کا غلبہ رہتا ہے اور آدمی برائیوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے، وہاں تک مؤمن کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ واللہ اعلم۔

ومنها: تَقْرِيْبَاتٌ تَرِدُ على البشر من غير اختياره، كالمصائب والأمراض، فَتُعَدُّ من باب البر لِمَعَانٍ:

منها: أن الرحمة إذا توجهت إلى عبد بصلاح عمله، واقتضت الأسبابُ التضييق عليه، انصرفَتْ إلى تكميلِ نفسه، فكُفِّرَتْ خطاياه، وكُتِبَتْ له الحسناتُ، كما إذا سُدَّ مجرى الماء نبع الماء من فوقه ومن تحته، فَيُنْسَبُ الإجراءُ إلى ذلك التضييق؛ والسرفيه: المحافظة على الخير النِّسبي.

ومنها: أن المؤمن إذا اشتدَّت به المصائب، ضَاقت عليه الأرض بما رحبت، فانكسر حجابُ الطبع والرسم، وانقلع قلبُه إلا عن الله؛ أما الكافر فلايزال يتذكر الفائتَ، ويغوص فى الحياة الدنيا، حتى يصير أَخْبَثَ منه قبل أن يصيبه ما أصاب.

ومنها: أن حاملَ السيئاتِ المتحجِّرةِ إنما هو البهيمية الغليظة الكثيفة، فإذا مَرِضَ وَضَعُفَ

وتحلّلَ منه أكثرُ مما يدخل فيه، اضمحل كثير من الحامل، وانتقص بقدر ذلك المحمولُ، كما نرى أن المريض يزول شَبَقُه وغضبه، وتبَدّل أخلاقُه، وينسٰى كثيرًا مما كان فيه، كأنه ليس الذى كان.

ومنها: أن المؤمن الذى انفكت بهيميته عن ملكيته نوعَ انفكاكٍ، أُخذ على سيئاته فى الدنيا غالباً، وذلك حديثُ: ﴿نصيبُ المؤمن من العذاب نَصَبُ الدنيا﴾ والله أعلم.

ترجمہ: اورانواع بر میں سے وہ تقریبات (پیش آنے والے واقعات وحوادث) ہیں، جوانسانوں پر، ان کے اختیار کے بغیر، طاری ہوتی ہیں، جیسے مصیبتیں اور بیماریاں، پس شمار کی جاتی ہیں وہ تقریبات نیکی کے قبیل سے بچند وجوہ:

۱۔ ان وجوہ میں سے یہ بات ہے کہ جب رحمتِ خداوندی کسی بندے کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اس کے نیک کاموں کی وجہ سے اور (تکوینی) اسباب اس پر تنگی کرنا چاہتے ہیں تو رحمت پھر جاتی ہے اس کے نفس کی تکمیل کی طرف، پس وہ مٹاتی ہے اس کی خطاؤں کو اور لکھتی ہے اس کے لئے نیکیاں۔ جس طرح یہ بات ہے کہ جب پانی کا سوراخ بند کردیا جاتا ہے تو پانی پھوٹتا ہے اس کے اوپر سے اور اس کے نیچے سے، پس منسوب کیا جاتا ہے بہانا اس تنگی کرنے کی طرف —— اور راز اس (رحمت کے پھرنے) میں اضافی خیر کی نگہداشت ہے۔

۲۔ اوران میں سے یہ ہے کہ جب مؤمن پر سخت مصائب نازل ہوتے ہیں تو زمین اس پر پہنائی کے باوجود تنگ ہوجاتی ہے، پس ٹوٹتا ہے نفس اور رواج کا پردہ۔ اوراُکھڑ جاتا ہے اس کا دل اللہ کے سوا ہر چیز سے —— رہا کافر تو وہ برابر یاد کرتا رہتا ہے فوت شدہ چیز کو اور غوطہ زن ہوتا ہے دنیوی زندگی میں، یہاں تک کہ ہوجاتا ہے وہ زیادہ گندہ پہلے سے، اس مصیبت کے پہنچنے سے پہلے سے جو اس کو پہنچی ہے۔

۳۔ اوران میں سے یہ ہے کہ پتھر جیسی سخت برائیوں پر ابھارنے والی چیز موٹی گاڑھی بہیمیت ہی ہے، پس جب وہ بیمار پڑتا ہے اور لاغر ہوجاتا ہے اور اس میں سے تحلیل ہوتی ہے اس سے زیادہ جو اس کے جسم میں داخل ہوتی ہے تو برانگیختہ کرنے والی صلاحیت کا کافی حصہ پاش پاش ہوجاتا ہے اور اس کے بقدر وہ برا کام گھٹ جاتا ہے جس پر ابھارا گیا ہے، جیسا کہ دیکھتے ہیں ہم کہ بیمار آدمی کی جماع کی حرص اور اس کا غصہ ختم ہوجاتا ہے اور اس کے اخلاق بدل جاتے ہیں اور وہ بھول جاتا ہے ان باتوں میں سے بہت سی باتوں کو جو اس میں تھیں۔ گویا وہ شخص، وہ شخص نہیں ہے جو پہلے تھا۔

۴۔ اوران میں سے یہ ہے کہ جب کسی مؤمن کی بہیمی قوت جدا ہوجاتی ہے اس کی ملکی قوت سے یک گونہ جدا ہونا تو سزا دیا جاتا ہے وہ اس کی برائیوں پر عام طور پر دنیا میں۔ اوراس کا تذکرہ اس حدیث میں ہے کہ: ''مؤمن کا حصہ عذاب میں سے دنیا کی مِحَن ہیں'' (یعنی دنیا میں مؤمن کو جو مِحَن ومصائب پہنچتے ہیں وہ اس کے لئے کفارۂ سیئات بن جاتے ہیں۔ یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔ مگر اس مضمون کی بہت احادیث ہیں، جن میں سے بعض اوپر لکھی گئی ہیں) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات وترکیب وتصحیح

التضییق مصری نسخہ میں اور مخطوطہ کراچی وبرلین میں دونوں جگہ التَّضَیُّق ہے جس کے معنی ہیں تنگ ہونا، اور مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ پٹنہ میں پہلی جگہ التَّضَیُّق ہے اور دوسری جگہ التَّضْیِیْق ہے یہ التضییق کی ہندی کتابت ہے مگر صحیح دونوں جگہ التضییق ہے جس کے معنی ہیں تنگی کرنا...... سُدًّتمام مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں صاد سے صُدًّ ہے مگر یہ تصحیف ہے مَجْرىٰ کے ساتھ سین سے سُدًّ ہی ہوسکتا ہے...... أَجْرَى الماءَ: بہانا...... أَخْبَثُ منه قبل کی تقدیر عبارت أَخْبَثُ مما كان قبل إلخ ہے...... المتحَجِّرة (اسم فاعل) تَحَجَّر: پتھر کی مانند ہونا۔

باب ـــــــ ۱۴

گناہوں کے مدارج

گناہ کیا ہیں؟ جس طرح قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کا مطیع کرنے کیلئے اعمال صالحہ ہیں، جو اطاعت کا پیکر محسوس، احتمالی مواقع اور انقیاد کو بدست لانے کی راہیں ہیں، اسی طرح انقیاد واطاعت کے بالکل برخلاف اور متضاد حالت کے لئے بھی اعمال طالحہ ہیں، جو نافرمانی اور عدم اطاعت کی احتمالی جگہیں اور ایسی شکلیں ہیں جن سے نافرمانی کی حالت کمائی جاسکتی ہے۔ یہی اعمال: آثام ومعاصی ہیں اور وہ سب ایک درجہ کے گناہ نہیں ہیں، بلکہ ان کے پانچ مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: کفریات کا ہے، جو سب سے زیادہ سنگین گناہ ہیں، جو آخرت میں نجات کی راہ بالکلیہ مسدود کردیتے ہیں۔ اور کفریات میں بھی بڑے گناہ دو قسم کے ہیں:

پہلی قسم کے گناہ وہ ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو نہ ماننا جو کفر ودہریت ہے یا اللہ تعالیٰ کو مخلوق جیسا ماننا جو تشبیہ ہے یا مخلوق میں کوئی خدائی صفت ماننا جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے ـــــــ اور ان گناہوں سے کمال مطلوب یعنی نجات کی راہ بالکلیہ مسدود اس لئے ہوجاتی ہے کہ ذات قدسی صفات کو اور صفت تدبیر کی کارفرمائی کو جو کائنات کے سارے نظام کو محیط ہے، پیش نظر رکھے بغیر نفس کی پاکیزگی ممکن ہی نہیں۔ جس شخص کو یہ معرفت حاصل نہیں ہوتی وہ ہمیشہ اپنی ذات میں مشغول رہتا ہے یا ایسے گورکھ دھندوں میں پوری طرح منہمک رہتا ہے کہ وہ پابندی میں نفس میں مشغولیت ہی کی طرح ہیں۔ یہ مشغولیات عدم معرفت باری تعالیٰ کا پردہ چاک نہیں کرسکتیں اور سوئی کے ناکے کے بقدر بھی معرفت خداوندی کا دروازہ نہیں کھول سکتیں اور معرفت خداوندی کے بغیر کمال مطلوب حاصل ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے یہ ایسے سنگین گناہ ہیں کہ ان سے بڑے کسی گناہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور آخرت میں اس گناہ کا مرتکب ہمیشہ کے لئے نجات سے محروم رہ جاتا ہے۔ سورۃ النساء آیت ۴۸ میں ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ

بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے۔ اور اس کے سوائے اور جتنے گناہ ہیں، جس کے لئے منظور ہوگا، وہ گناہ بخش دیں گے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا'' ـــــــ احادیث میں بھی سب سے بڑا گناہ شرک ہی کو قرار دیا گیا ہے اور جو حکم شرک کا ہے وہی کفر وتشبیہ کا بھی ہے۔

دوسری قسم: یہ ہے کہ آدمی بس دنیا کی زندگی ہی کو حقیقی زندگی اور سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ موت کے بعد کی زندگی کا قائل ہی نہ ہو، نہ کسی اخروی کمال پر اس کا ایمان ہو۔ پس جب دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہوگی تو وہ کسی کمال کی طرف قطعاً نگاہ نہیں اٹھائے گا اور نہ آخرت کے لئے کوئی تیاری کرے گا۔ اس لئے معاد کا انکار بھی بہت بڑا گناہ ہے۔

اور کمال مطلوب یعنی آخرت میں نجات حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ پر اور دنیا کے آخری دن پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ کمالات کی دو قسمیں ہیں: ایک مادی یعنی دنیوی محسوس کمال اور دوسرا روحانی یعنی اخروی عقلی کمال۔ دنیا کے اعتبار سے کیا چیزیں کمال ہیں اس کو ہر شخص جانتا ہے، اور اخروی کمال کیا ہے اس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ اس کا کمال ہونا حواس سے ادراک نہیں کیا جاسکتا، عقل ہی اس کمال کا ادراک کرسکتی ہے اور سب کی عقول اس سلسلہ میں کافی نہیں ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک ایسی حالت کا تصور کرنا پڑتا ہے جو ہر اعتبار سے حالت حاضرہ یعنی دنیوی حالت کے مغائر ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات ہر شخص کے بس کی نہیں ہے۔ عام لوگ عقلیات کو بخوبی نہیں سمجھ سکتے۔

اور اس اُخروی روحانی کمال کو سمجھنا بھی ضروری ہے، ورنہ عقلی اور مادی کمالات میں تعارض ہو جائے گا اور نتیجہ ارذل کے تابع ہوتا ہے اس لئے لوگ مادی کمال کی طرف جھک جائیں گے اور روحانی کمال کو رائیگاں چھوڑ دیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے اور شریعتیں نازل فرمائیں اور انھوں نے کمال اخروی کی تحصیل کا مظنہ ایمان باللہ وبالیوم الآخر کو گردانا۔ کیونکہ یہ وہ احتمالی جگہیں ہیں جہاں سے اخروی کمال حاصل ہوسکتا ہے۔ سورۃ النحل آیت ۲۲ میں ہے: ''پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکاری ہیں اور وہ گھمنڈ کرنے والے ہیں'' یعنی ان کے دل مادی دنیا سے ماوراء حقائق کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور انبیاء کی باتیں ماننے میں ان کی ہیٹی ہوتی ہے۔

بات مختصر: جب کوئی شخص اس مرتبۂ اولی کے گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ مرجاتا ہے اور اس کی بہیمی قوت پاش پاش ہوجاتی ہے تو اس پر غایت درجہ منافرت یعنی عدم ملائمت مترشح ہوتی ہے یعنی ملکیت سے قطعاً مناسبت نہ رکھنے والی حالت سے وہ دوچار ہوجاتا ہے اور وہ حالت اس کے گلے کا ایسا طوق بن جاتی ہے جس سے وہ تا ابد جدا نہیں ہوسکتا (اللّٰهم احفظنا منه)

﴿باب طبقات الإثم﴾

اعلم أنه كما أن لانقياد البهيمية للملكية أعمالاً، هي أشباحه ومظانُّه والسننُ الكاسبةُ له، فكذلك للحالة المضادَّة للانقياد كلَّ المضادَّةِ أعمالٌ ومظانٌّ وكواسبُ، وهي الآثام، وهي

على مراتبَ:

المرتبة الأولى: أن ينسَدَّ سبيلُه إلى الكمال المطلوب رأسًا؛ ومعظَمُ ذلك في نوعين:

أحدهما: ما يرجع إلى المَبْدَإِ، بأن لا يَعْرِفَ أن له ربا، أو يعرِفَه متصفا بصفات المخلوقين أو يعتقد في مخلوق شيئا من صفات الله، فالثاني التشبيهُ، والثالث الإشراكُ؛ فإن النفس لا تَتَقَدَّسُ أبدًا حتى تجعَلَ مطمحَ بصيرتها التجردَ الفوقانيَّ، والتدبيرَ العامَّ المحيطَ بالعالَم؛ فإذا فَقَدَتْ هذه بقيت مشغولةً بنفسها، أو بما هو مثلُ نفسِها في التَّقَيُّدِ كلَّ الشغل، لا يقدح حجابَ النُّكرة، ولا موضِعَ إبرةٍ، فهذا هو البلاء كلُّ البلاء.

والثاني: أن يعتقد أن ليس للنفس نشأةٌ غيرُ النشأةِ الجسدية، وأنه ليس لها كمالٌ آخرُ يجب عليها طَلَبُهُ، فإن النفس إذا أضمرت ذلك لم يَطْمَحْ بَصَرُهَا إلى الكمال أصلاً.

ولما كان القولُ بإثبات كمالٍ غيرِ كمالِ الجسد، لا يتأتّى من الجمهور إلا بتصور حالةٍ، تُباين الحالةَ الحاضرةَ من كل وجهٍ، ولولا ذلك لتعارض الكمالُ المعقولُ والمحسوسُ، فَمَالَ إلى المحسوس، وأهْمَلَ المعقولَ، نُصِبَ له مَظِنَّةٌ، هو الإيمان بلقاء الله واليوم الآخر، وهو قوله تعالى: ﴿فَالَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ﴾

وبالجملة: فإذا كان الإنسان في هذه المرتبة من الإثم، فمات، واضمحلت بهيميته، تَرَشَّحَتْ عليه المنافرةُ من فوقه كلَّ المنافرة، بحيث لا يجد سبيلا إلى الخلاص أبدًا.

ترجمہ: گناہوں کے درجات کا بیان: جان لیں کہ جس طرح یہ بات ہے کہ قوت بہیمیہ کو قوت ملکیہ کا مطیع کرنے کے لئے، کچھ اعمال ہیں، جو انقیاد کا پیکر محسوس، احتمالی مواقع ہیں اور انقیاد کو کمانے والی راہیں ہیں، پس اُسی طرح اس حالت کے لئے بھی جو پوری طرح سے انقیاد کے برخلاف ہے کچھ اعمال احتمالی جگہیں اور کمانے والی راہیں ہیں۔ اور وہی گناہ ہیں اور وہ چند مرتبوں پر ہیں:

پہلا مرتبہ: یہ ہے کہ بند ہوجائے آدمی کی راہ کمالِ مطلوب (نجات) کی طرف بالکلیہ۔ اور اس مرتبہ کے بڑے گناہ دو قسموں میں منحصر ہیں:

ان میں سے ایک: وہ گناہ ہیں جن کا تعلق مبدأ (اصل) یعنی اللہ تعالیٰ سے ہے۔ (اور وہ تعلق) اس طور پر ہے کہ نہ پہچانے آدمی اس بات کو کہ اس کے لئے کوئی پروردگار ہے یا جانے وہ اس کو مخلوق کی صفات کے ساتھ متصف یا اعتقاد رکھے کسی مخلوق میں اللہ کی صفات میں سے کسی صفت کا، پس دوسری صورت تشبیہ ہے اور تیسری صورت شریک ٹھہرانا ہے ——— (اور شرک و کفر سے مطلوبہ کمال کی راہ بالکلیہ مسدود اس لئے ہوجاتی ہے) کہ نفس کبھی بھی پاکیزہ نہیں ہوسکتا یہاں

تک کہ وہ اپنی بصیرت کے پڑنے کی جگہ بنائے بالائی روحانیت (یعنی اللہ تعالیٰ) کو اور عالم کو محیط کلی تدبیر کو۔ پس جب گم کرے گا نفس اس کو (یعنی اس کو ذات باری اور صفت تدبیر کی معرفت حاصل نہیں ہوگی) تو باقی رہ جائے گا وہ پھنسا ہوا اپنی ذات میں یا ایسی چیز میں جو اپنی ذات کی طرح ہے پابندی میں، پوری طرح سے پھنسا ہوا ہونا۔ نہیں توڑے گی وہ مشغولیت اللہ کے بارے میں جہالت کے پردہ کو (یعنی دنیوی مشاغل سے معرفت الٰہی حاصل نہیں ہوسکتی) اور نہ سوئی کی نوک کی جگہ کے بقدر (بھی پردہ کھولے گی) پس یہی وہ مصیبت ہے جو سب سے بڑی مصیبت ہے۔

اور دوسری قسم: یہ ہے کہ آدمی اعتقاد رکھے اس بات کا کہ نہیں ہے نفس کے لئے کوئی زندگی مادی زندگی کے علاوہ اور یہ اعتقاد رکھے کہ نہیں ہے نفس کے لئے کوئی دوسرا کمال (مادی کمال کے علاوہ) جس کی طلب نفس کے لئے ضروری ہو۔ پس جب نفس دل میں یہ بات چھپائے گا تو یقیناً وہ اپنی نظر نہیں اٹھائے گا مطلوبہ کمال کی طرف قطعاً۔

اور جب مادی کمال کے علاوہ اور کمال کے ثابت کرنے کی بات حاصل نہیں ہوسکتی عام لوگوں کے لئے مگر کسی ایسی حالت کے تصور کرنے کے ذریعے جو موجودہ حالت کے برخلاف ہو، ہر اعتبار سے اور اگر لوگ روحانی کمال نہیں سمجھیں گے تو عقلی اور مادی کمال میں تعارض ہو جائے گا، پس انسان مادہ کی طرف مائل ہوگا اور روحانی کمال کو رائیگاں چھوڑ دے گا، تو قائم کیا گیا اس روحانی کمال کے لئے مظنہ (احتمالی جگہ) اور وہ اللہ سے ملنے پر اور آخری دن پر ایمان لانا ہے اور اس کا تذکرہ اس ارشاد پاک میں ہے: ''پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دل انکار کرنے والے ہیں درانحالیکہ وہ گھمنڈ کرنے والے ہیں''

قصہ مختصر: پس جب انسان گناہ کے اس مرتبہ میں پھنسا ہوا ہوتا ہے، پس وہ مرجاتا ہے، اور اس کی بہیمیت مرجھاجاتی ہے تو نہایت درجہ منافرت اس کے اوپر سے اس پر ٹپکتی ہے، اس طور پر کہ وہ کوئی چھٹکارے کی راہ نہیں پاتا ابد تک۔

لغات وترکیب:

السننُ الکاسبة مرکب توصیفی کا عطف اشباحُه پر ہے...... کواسب جمع ہے کاسبةکی...... اِنْسَدَّ اِنسِدَادًا: بند ہونا...... تَقَدَّسَ تَقَدُّسًا: پاک ہونا...... المطمَح: مکان الرفع والنظر...... البصیرة: دل کی بینائی

التجرد: غیر مادی ہونا الفوقانی: بالائی والمراد من التجرد الفوقانی: جنابه تعالی وحضرته (سندی)...... کل الشُّغل مفعول مطلق ہے مشغولة (اسم مفعول) کا...... لایَفْدَح: نہیں توڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے قَدَحَ خِتَامَ الخَابِيَة مٹکے کی مہر کو توڑ دیا...... النُکرة ضد ہے المعرفةکی۔ حجابُ النکرة ای حجاب عدم معرفة الله تعالی...

موضِع اِبرةٍ: سوئی کی جگہ یعنی سوئی زمین پر پڑی ہو یا زمین پر سوئی کی نوک ٹیکی جائے تو جتنی جگہ اس کے نیچے آئے وہ سوئی کے بقدر جگہ کہلاتی ہے۔ عربی میں یہ غایت تقلیل کے لئے محاورہ ہے اور لایقدح کا فاعل ضمیر ہے جو الشغل کی

طرف راجع ہے...... المنافرة ضد ہے الملائمة کی یعنی وہ حالت جوملکیت کے لئے غیر مناسب ہے۔ جس سے ملکیت کو بے حد تکلیف پہنچتی ہے...... ولولا ذلك أى ولولا ذلك الإثبات أو تصور حالة مباينة...... نُصِبَ له: جزاء ہے لما كان القول إلخ کی۔

تصحیح: تَرَشَّحَتْ عليه المنافرة اصل میں وُشِّحَتْ إلخ تھا، یہ تصحیف ہے، تینوں مخطوطوں سے تصحیح کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

دوسرا مرتبہ: دین سے اعراض کا ہے ــــ اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے، ان پر شریعتیں نازل کیں تاکہ لوگ اس ہدایت سے فائدہ اٹھا کر آخرت میں سعادت ونجات پائیں۔ ملأ اعلیٰ کی پوری توجہات اللہ کے اس دین کو پھیلانے کی طرف اور اس کے معاملہ کو بڑھانے کی طرف رہتی ہے۔ مگر کچھ گھمنڈی لوگ اس دین کو قبول نہیں کرتے، اس میں ان کی ہیٹی ہوتی ہے۔ وہ لوگ نہ صرف اللہ کے اس دین کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ جب مرتے ہیں تو ملأ اعلیٰ کی تمام تر توجہات ان کے لئے ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہوجاتی ہیں اور ان کے کرتوت ان کا اس طرح احاطہ کرلیتے ہیں کہ ان سے باہر نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں یہ مخالفت حق ان کو مطلوبہ کمال حاصل کرنے سے یا تو بالکلیہ روک دیتی ہے یا قابل لحاظ کمال سے تہی دست رکھتی ہے۔ اور گناہ کا یہ مرتبہ بھی انسان کو ملت سے خارج کردیتا ہے، تمام شریعتوں کا یہی حکم ہے کہ دین قبول کرنے سے اعراض کرنے والا یا بظاہر دین قبول کرکے دین کی مخالفت کرنے والا اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے والا الاحقیقت میں مسلمان باقی نہیں رہتا۔

والمرتبة الثانية: أن يتكبر بِكِبره البهيميِّ على ما نَصَبَهُ الله تعالى لوصول الناس إلى كمالهم، وقصدتِ الملأُ الأعلى بأقصى هِمَمِها إشاعةَ أمره وتنويهَ شأنه، من الرسل والشرائع، فيُنكرها ويعاديها، فإذا مات انعطف جميعُ هِمَمِهم منافرةً له، ومؤذِيَةً إياهُ، وأحاطت به خطيئتُه، من حيث لم يجد للخروج منه سبيلاً، على أنه لاتنفك هذه الحالة من عدم الوصول إلى كماله، أو الوصولِ الذى لايُعتد به، وهذه المرتبةُ تُخرج الإنسانَ من ملةِ نبيه فى جميع الشرائع.

ترجمہ: اور دوسرا مرتبہ: یہ ہے کہ انسان اپنے بہیمی گھمنڈ سے گھمنڈ کرے اس چیز کے مقابلہ میں جس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے لوگوں کے ان کے کمال تک پہنچنے کے لئے اور ملأ اعلیٰ نے ارادہ کیا ہے اپنی غایت درجہ کامل توجہات کے ذریعہ اس کے معاملہ کی اشاعت کا اور اس کی شان کو بلند کرنے کا یعنی انبیاء اور شریعتیں، پس وہ ان کا انکار کرتا ہے اور ان سے دشمنی رکھتا ہے، پس جب وہ مرجاتا ہے تو مُڑ جاتی ہیں ملأ اعلیٰ کی ساری توجہات درانحالیکہ وہ اس کے لئے ناپسندیدہ ہوتی ہیں اور اس کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہیں اور گھیر لیتی ہیں اس کو اس کی خطائیں، اس طور سے کہ نہیں پاتا وہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ۔

علاوہ ازیں نہیں جدا ہوتی ہے یہ حالت اس کے کمال تک نہ پہنچنے سے یا اس پہنچنے سے جو کہ قابل لحاظ نہیں ہے اور گناہ کا یہ (دوسرا) مرتبہ انسان کو نکال دیتا ہے اس کے پیغمبر کی ملت سے تمام شریعتوں میں۔

ترکیب:

الکبر البیھمی: وہ کبر جو بہیمیت کے تقاضے سے پیدا ہوتا ہے..... **من الرسل والشرائع** بیان ہے **علی مانصبه** میں **ما** کا..... **لا تنفك** فعل ناقص ہے اور **هذه الحالة** اس کا اسم ہے اور **من عدم الوصول** إلخ خبر ہے۔ مولانا سندی رحمہ اللہ کی تقریر میں ہے: **لایصل إلی الکمال أو یصل ویترقی، لکنه لایصل إلی الکمال المعتدبه، بل إلی الکمال الناقص الذی لایدفع عنه المنافرة وهذا هو الکافر اھ**

☆ ☆ ☆

تیسرا مرتبہ: مہلکات کا ہے۔ یہ دو طرح کے گناہ ہیں ایک: اُن مأمورات کا چھوڑنا جن پر آخرت میں نجات کا مدار ہے، جیسے اسلام کے ارکان اربعہ اور دیگر واجبات وفرائض کو بجانہ لانا بھی تباہ کر دے گا۔ کیونکہ عمداً فرائض کا ترک گناہ کبیرہ ہے۔ دوم: ان کاموں کا ارتکاب کرنا جن کے کرنے والے پر لوح محفوظ میں لعنت کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس وجہ سے کہ وہ کام عام طور پر زمین میں بڑی خرابی کا باعث ہیں اور نفس کی اصلاح کی راہ کا روڑا ہیں ——— دونوں طرح کے گناہوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اُن احکام شرعیہ پر عمل پیرا نہ ہونا جو طبیعت کو تابعداری کا خوگر بناتے ہیں یا قابل لحاظ حد تک انقیاد کے لئے تیار کرنے والے ہیں۔ اور یہ احکام شرعیہ لوگوں کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ضعیف بہیمیت کی کیفیات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ان کے لئے بکثرت احکام شرعیہ بجالانے ضروری ہیں اور جن اقوام کی بہیمیت سخت اور گاڑھی ہوتی ہے ان کے لئے سخت احکام شرعیہ کو بکثرت کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے متواتر روزے رکھنا۔ اور شب بیداری کرنا اور دیگر ریاضتیں کرنا۔

۲۔ درندگی والے کام، جو بڑی لعنت کا سبب ہوتے ہیں، جیسے کسی کو ناحق قتل کرنا۔

۳۔ شہوانی اعمال جیسے زنا، اغلام وغیرہ

۴۔ وہ کمائیاں جو معاشرہ کے لئے سخت ضرررساں ہیں، جیسے سٹہ اور سود وغیرہ۔

مذکورہ چاروں قسم کے کام کرنے والوں کے دین میں بڑی دراڑ پڑ جاتی ہے، اس وجہ سے کہ وہ سنت راشدہ لازمہ کے برخلاف اقدام کرتے ہیں تفصیل مبحث سوم کے باب یازدہم میں گذر چکی ہے۔ اور ان کاموں کے مرتکب کو عالم بالا کی لعنت گھیر لیتی ہے۔ پس ان دونوں باتوں (دین میں رخنہ پڑنا اور لعنت کا ان کو گھیر لینا) کے نتیجہ میں وہ عذاب کا

حقدار بن جاتا ہے۔

اور اس تیسرے مرتبہ کے گناہ بڑے کبائر کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی حرمت کا اور ان کے مرتکب کے ملعون ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر زمانہ میں اس خدائی فیصلہ کی ترجمانی کرتے رہے ہیں اور لوگوں کو ان کبائر سے آگاہ کرتے رہے ہیں اور ان میں سے بیشتر تمام شریعتوں میں بالاتفاق گناہ ہیں۔ متفق علیہ روایت میں ایسے سات گناہوں کا خصوصیت سے تذکرہ کیا گیا ہے یعنی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا (یہ تو اکبرالکبائر ہے اور پہلے مرتبہ کا گناہ ہے) اور جادو کرنا، کسی کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، مڈبھیڑ کے دن پیٹھ پھیرنا اور ایماندار، بھولی، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۵۲)

والمرتبة الثالثة: تركُ ما يُنجيه، وفَعْلُ ما انعقد في الذكر اللعنُ على فاعله، من جهة كونه مَظِنَّةً غالبًا لفسادٍ كبير في الأرض، وهيئةٍ مضادَّة لتهذيب النفس:

فمنها: أن لايفعلَ من الشرائع الكاسبةِ للانقياد أو المُهَيِّئَةِ له ما يُعتد به؛ ويختلف باختلاف النفوس، إلا أن المُنْغَمِسَةَ في الهيئات البهيمية الضعيفةِ أحوجُ الناس إلى إكثارها؛ والأممُ التي بهيميتُها أشدُّ وأغلظُ أحوجُ الناس إلى إكثار الشاقِّ منها.

ومنها: أعمالٌ سَبُعِيَّةٌ، تَسْتَجْلِبُ لعنًا عظيمًا، كالقتل.

ومنها: أعمالٌ شَهَوِيَّةٌ.

ومنها: مكاسبُ ضارَّةٌ، كالقمار والربا.

وفي كل شيئ من هذه المذكورات ثُلْمةٌ عظيمةٌ في النفس، من جهة الإقدام على خلاف السنة اللازمة، كما ذكرنا؛ ولعنٌ من الملأ الأعلى يحيطُ به؛ فبمجموع الأمرين يحصل العذاب؛ وهذه المرتبةُ أعظمُ الكبائر، قد انعقد في حظيرة القدس تحريمُهَا، ولعنُ صاحبها، ولم يزل الأنبياءُ يُتَرْجِمُوْنَ ما انعقد هنالك، وأكثَرُها مُجْمَعٌ عليه في الشرائع.

ترجمہ: اور تیسرا مرتبہ: ان کاموں کو چھوڑنا ہے جو آدمی کو نجات دلانے والے ہیں۔ اور ان کاموں کو کرنا ہے جن کے کرنے والے پر لوح محفوظ میں لعنت تجویز پا چکی ہے اس کام کے عام طور پر احتمالی موقع ہونے کی جہت سے زمین میں بڑی خرابی کا (یعنی عام طور پر اس کام سے زمین میں بڑی خرابی رونما ہوتی ہے) اور ایسی ہیئت کا جو نفس کو سنوارنے کے برخلاف ہے (یعنی عام طور پر اس کام سے نفس میں ایسی ہیئت پیدا ہوتی ہے جس سے نفس بجائے سنورنے کے بگڑتا ہے)

پس مرتبۂ ثالثہ میں سے یہ بات ہے کہ آدمی عمل نہ کرے شریعت کے ان احکام پر جو تابعداری کو کمانے والے ہیں

(یعنی نفس کو تابعداری کا خوگر بناتے ہیں) یا تیار کرنے والے ہیں ایسی تابعداری کے لئے جو قابل لحاظ ہے (یعنی ان اعمال سے طبیعت میں اچھا خاصا انقیاد پیدا ہوتا ہے) اور وہ قابل لحاظ مقدار مختلف ہوتی ہے لوگوں کے اختلاف سے، البتہ جو نفس کمزور بہیمی کیفیات میں ڈوبنے والا ہے وہ سب سے زیادہ محتاج ہے احکام شرعیہ پر بکثرت عمل کرنے کی طرف، اور وہ اقوام جن کی بہیمیت سخت اور گاڑھی ہے وہ لوگوں میں سب سے زیادہ محتاج ہیں شریعت کے سخت احکام پر بکثرت عمل کرنے کی طرف۔

اور مرتبۂ ثالثہ میں سے درندگی والے کام ہیں جو بڑی لعنت کو کھینچتے ہیں، جیسے قتل کرنا۔

اور اس میں سے شہوانی اعمال ہیں۔

اور اس میں سے ضرررساں کمائیاں ہیں؛ جیسے سٹہ (جُوا) اور سود۔

اور مذکورہ بالا چاروں قسم کے کاموں میں سے ہر چیز میں بڑی دراڑ ہے نفس میں، پیش قدمی کرنے کی وجہ سے سنت راشدہ لازمہ کے خلاف پر، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، اور ملأ اعلیٰ کی بڑی لعنت اس شخص کو گھیر لیتی ہے، پس دونوں باتوں کے مجموعہ سے وجود میں آتا ہے عذاب۔ اور یہ مرتبہ کبائر میں سب سے بڑا مرتبہ ہے، طے پاچکا ہے بارگاہ مقدس میں ان کا حرام ہونا اور ان کے مرتکب کا ملعون ہونا۔ اور انبیاء برابر ترجمانی کرتے رہے ہیں اُس بات کی جو وہاں طے پاچکی ہے۔ اور تیسرے مرتبہ کے گناہوں میں سے بیشتر گناہ تمام شریعتوں میں متفق علیہ ہیں۔

ترکیب هیئة مضادّۃ کا عطف فساد کبیر پر ہے...... ثلمة مبتدأ مؤخر ہے۔

☆ ☆ ☆

چوتھا مرتبہ: قوموں اور زمانوں کا لحاظ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جو مختلف شریعتیں اور الگ الگ انداز تجویز فرمائے ہیں اور ہر شریعت میں خصوصی احکام دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا چوتھے مرتبہ کا گناہ ہے۔ مثلاً یہود پر اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ یوم السبت کی تعظیم لازم تھی۔ مالِ غنیمت حلال نہیں تھا اور غیر اللہ کے لئے سجدۂ تحیہ جائز تھا اور ہماری شریعت میں اونٹ کا گوشت حلال ہے، یوم السبت کے بجائے یوم الجمعہ کی تعظیم مقرر کی گئی ہے، مالِ غنیمت کو حلال کیا گیا ہے اور غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنا مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ پس یہود پر ان کے زمانہ میں ان کی شریعت کی پابندی لازم تھی، اور اس کی خلاف ورزی گناہ تھی اور اب ہم پر بلکہ سب پر شریعتِ محمدی کی پابندی لازم ہے اور اس کی خلاف ورزی گناہ ہے اور یہ گناہ چوتھے مرتبہ کا ہے۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم میں کسی نبی کو مبعوث فرماتے ہیں، تاکہ وہ لوگوں کو کفر کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائیں، ان کی کجی کو دور کریں اور ان کے احوال کو سنوار کر ان کو مؤدب بنائیں تو ضروری

ہوتا ہے کہ وہ نبی اپنے مشن کی تکمیل کے لئے کچھ ایسے خصوصی احکام دیں جو قوم کی کجی کو دور کرنے کے لئے اور ان کو مؤدب بنانے کے لئے ضروری ہوں۔ کیونکہ ہر مقصد کے لئے کچھ طریقے تو ایسے ہوتے ہیں جو صد فی صد کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ طریقے بڑی حد تک کارآمد ہوتے ہیں، وہ طریقے قوم کو بتانے ضروری ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر دارو گیر بھی ضروری ہے۔ اس لئے ہر شریعت میں ایسے خصوصی احکام دیئے گئے ہیں، اور ان کی خلاف ورزی کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔

اور شریعتوں کے ان خصوصی احکام کے سلسلہ میں یہ بات جان لینی چاہئے کہ توقیت یعنی احکام کے اوقات مقرر کرنے کے لئے ایسے قوانین ہیں جو توقیت کو واجب کرتے ہیں یعنی اوقات کا یہ اختلاف اصول وضوابط پر مبنی ہوتا ہے۔ جس شریعت میں جو حکم دیا گیا ہے اس کی کوئی بنیاد ہوتی ہے مثلاً کبھی کوئی امر کسی خرابی کا باعث ہوتا ہے تو اس کو ممنوع ٹھہرایا جاتا ہے یا کسی امر میں کوئی مصلحت ہوتی ہے تو اس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پھر مفسدہ اور مصلحت کا وزن بھی دیکھا جاتا ہے۔ اور اس کے اعتبار سے حرام، مکروہ (تحریمی اور تنزیہی) واجب، سنت اور مستحب وغیرہ مراتب پیدا ہوتے ہیں غرض تمام احکام ایک درجہ کے نہیں ہوتے، بعض لازمی ہوتے ہیں تو بعض اختیاری اور ان احکام کا کچھ حصہ وحی ظاہر (قرآن کریم) میں نازل کیا گیا ہے اور بڑا حصہ وحی خفی یعنی اجتہاد نبی سے ثابت ہے، جو احادیث میں مروی ہے۔

والمرتبة الرابعة: معصيةُ الشرائع والمناهج المختلفةِ باختلاف الأمم والأعصار؛ وذلك: أن اللّٰه تعالى إذا بعث نبيا إلى قوم، لِيُخرجهم من الظلمات إلى النور، ولِيُقيمَ عِوَجَهم، ولِيَسُوْسَهم أحسنَ السياسة، كان بعثُه مُتَضَمِّنًا لإيجاب مالايمكن إقامةُ عِوَجهم وسياستُهم إلا به، فلكل مقصد مَظِنَّةٌ أكثريةٌ أو دائمة، يجب أن يُؤاخَذوا عليها ويُخاطبوا بها.

وللتوقيت قوانينُ توجِبُها، ورب أمر يكون داعيًا إلى مفسدة أو مصلحة، فيؤمرون حَسَبَمَا يُدْعون إليه، ومن ذلك ماهو مأمور أو منهي عنه حتما، ومنه ما هومأمور أو منهي عنه من غير عزم؛ وأقلُّ ذلك ما نزل به الوحيُ الظاهر، وأكثرُه مالا يثبتُه إلا اجتهادُ النبي صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: اور چوتھا مرتبہ: اُن شریعتوں اور ان منہجوں کی نافرمانی کرنا ہے جو امتوں اور زمانوں کے اختلاف سے مختلف رہی ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم میں کسی نبی کو مبعوث فرماتے ہیں، تا کہ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے، اور تا کہ وہ ان کی کجی کو سیدھا کرے، اور تا کہ وہ ان کو مؤدب بنائے خوب سنوار کر، تو اس کی بعثت ان چیزوں کو واجب کرنے پر متضمن ہوتی ہے جن کے بغیر ان کی کجی کو دور کرنا اور ان کو سلیقہ مند بنانا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر مقصد کے لئے اکثری یا دائمی احتمالی موقع ہوتا ہے، جس پر لوگوں کی دارو گیر کرنا اور جس کا لوگوں کو مخاطب بنانا ضروری ہوتا ہے۔

اور احکام کے وقت کی تعیین کے لئے ایسے قوانین ہیں جو اس کو واجب کرتے ہیں اور کوئی امر کسی خرابی یا مصلحت کی طرف داعی ہوتا ہے، پس لوگ حکم دیئے جاتے ہیں اس چیز کے موافق جس کی طرف وہ دواعی ان کو دعوت دیتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو لازمی طور پر مامور بہ یا منہی عنہ ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو تاکید کے بغیر مامور بہ یا منہی عنہ ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں ظاہری وحی نازل ہوتی ہے۔ اور ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے اجتہاد سے ثابت ہوتے ہیں۔

لغات وتصحیح: سَاسَ يَسُوْسُ سِيَاسَةً: دیکھ بھال کرنا، سدھانا، آداب سکھانا، مؤدب بنانا...... **والمرتبة الرابعة** میں واؤ بڑھایا گیا ہے...... **وللتوقيت قوانين توجبها** اصل میں **وللتوقيف قوانين توجبه** تھا تصحیح مطبوعہ صدیقی اور مخطوطات سے کی گئی ہے۔



پانچواں مرتبہ: التزامات کی خلاف ورزی کرنے کے گناہ کا ہے۔ التزام کے معنی ہیں: کسی بات کو لازم کر لینا، ضروری قرار دے لینا؛ جیسے مالی یا بدنی عبادت کی منت ماننا، تلاوت یا ذکر کا کوئی وظیفہ مقرر کرنا یا رات بھر نفلیں پڑھنے کا التزام کرنا یا کسی چیز کے ترک کا مثلاً گوشت نہ کھانے کا عہد کرنا وغیرہ۔ یہ سب باتیں شریعت نے لازم نہیں کیں، نہ ملأ اعلیٰ میں ان کا کوئی حکم فیصل ہوا ہے۔ بلکہ بندہ خود اپنی کامل توجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے پس اس کے ذہن میں ایک بات آتی ہے جس کو وہ مامور بہ یا ممنوع عنہ سمجھ لیتا ہے، کسی قیاس کی وجہ سے، یا کسی طے شدہ ضابطہ پر حکم متفرع کرنے کی وجہ سے، یا کسی اور طرح سے، جیسے عوام کسی ناقص تجربہ کی بنیاد پر یا کسی حکیم کے بار بار کسی دواء کو کسی مرض میں لکھنے کی وجہ سے تاثیر کا گمان قائم کر لیتے ہیں حالانکہ وہ اس تاثیر کی وجہ نہیں جانتے، نہ کسی ماہر حکیم نے اس تاثیر کی صراحت کی ہے۔ ایسے التزامات میں آدمی اپنی ذمہ داری سے اس وقت عہدہ برآ ہوسکتا ہے جب وہ احتیاط پر عمل کرے اور جن چیزوں کا التزام کیا ہے ان کو بجالائے، ورنہ اس کے دل پر نافرمانی کا پردہ پڑ جائے گا اور اس کی اس کے گمان کے مطابق گرفت کی جائے گی۔

اور اس مرتبہ کے سلسلہ میں اصل منشأ خداوندی تو یہ تھا کہ اس کے معاملہ کو مہمل چھوڑ دیا جائے اور اس کی طرف التفات نہ کیا جائے، کیونکہ یہ چیزیں شرعاً ضروری نہیں ہیں۔ مگر انسانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان چیزوں کو واجب ولازم جانتے ہیں، اس لئے رب کریم نے ان کو وہ چیز پوری پوری دیدی جو انھوں نے واجب ولازم جانی یعنی اب شرعاً بھی ان التزامات کا وفا ضروری ہے۔

اور اس پانچویں مرتبہ کے سلسلہ میں درج ذیل نصوص وارد ہوئی ہیں:

۱ ۔ متفق علیہ حدیث قدسی ہے: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: أنا عند ظَنِّ عبدی بی یعنی میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان کرتا ہے، میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں (مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ، حدیث نمبر ۲۲۶۴) شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ کی قسم دوم میں اس حدیث کی شرح یہ کی ہے کہ جن گناہوں کے بارے میں حظیرۃ القدس میں کوئی فیصلہ قرار نہیں پایا ان میں بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ معاملہ فرمائیں گے۔ (دیکھئے اذکار واوراد اور ان کے متعلقات کا بیان)

۲ ۔ سورۃ الحدید، آیت ۲۷ میں ہے کہ: ''انھوں نے (یعنی عیسائیوں نے) رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا، لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا'' یہی التزاماتِ عبد ہیں، جن کو بندہ اپنے گمان کے اعتبار سے سر لیتا ہے۔ جن کا وفا ضروری ہے۔ عیسائیوں نے خود اپنی ایجاد کردہ رہبانیت کی رعایت پوری نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے گمان کے مطابق ان کی گرفت کی۔

۳ ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہ سختی کرو تم اپنی جانوں پر، پس سختی کریں گے اللہ تعالیٰ تم پر'' (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث نمبر ۱۸) یعنی ایسی ریاضتیں اور مجاہدے نہ کرو جن کی نفس میں طاقت نہ ہو اور مباح کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، پس سختی کریں گے اللہ تعالیٰ اور فرض کر دیں گے ان کو تم پر اور تم میں ان کی ادائیگی کی طاقت نہ ہوگی (مظاہر حق)

۴ ۔ حضرت نوّاس رضی اللہ عنہ نے نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ''نیکی خوش خُلقی ہے یعنی نیکی کی عمدہ قسم یہ ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے سینہ میں جم جائے، اور تو ناپسند کرے کہ لوگ اس سے واقف ہوں'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب الرفق حدیث نمبر ۵۰۷۳) یعنی جس امر کے بارے میں دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ گناہ ہے، پس وہ گناہ ہے۔

فائدہ: مجتہدات یعنی وہ غیر منصوص مسائل جن کے احکام مجتہدین امت نے طے کئے ہیں اور ان میں اختلافات ہوئے ہیں وہ اس پانچویں مرتبہ کے ساتھ ملحق ہیں، جو شخص جس امام کی تقلید کرتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے امام کی رائے کے مطابق عمل کرے، اگر اس کی خلاف ورزی کرے گا تو وہ معصیت شمار ہوگی اور وہ اس پانچویں مرتبہ کا گناہ تصور کیا جائے گا۔

نوٹ: اس فائدہ سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک تقلیدِ ائمہ برحق چیز ہے۔

والمرتبة الخامسة: مالم يَنُصَّ عليه الشارعُ، ولم ينعقد في الملأ الأعلى حكمُه، لكن تَوَجَّهَ عبدٌ إلى الله بمجامع همته، فاعتراه شيئ يظنه ممنوعا عنه، أو مأمورًا به، من قِبَلِ قياسٍ أو تخريج، أو نحوِ ذلك، كما يظهر للعوام تأثيرُ بعضِ الأدوية، من قِبَلِ تجربةٍ ناقصةٍ، أو دَوَرانِ حكمِ الطبيبِ الحاذقِ على علةٍ، ولايعلمون وجهَ التاثير، ولا يَنُصُّ عليه الطبيبُ، فلايخرجُ مثلُ هذا الإنسان من

العهدة حتى يأخذ بالاحتياط،وإلا كان بينه وبين ربه حجابٌ فيما يَظُنُّ، فيؤاخذ بظنه.

وأصلُ المرضيِّ في هذه المرتبة أن يُهْمَلَ أمْرُها، ولا يُلتفتَ إليها، غير أن في الوجود أنفساً يستوجبون ذلك، فيوفِّرُ عليهم الجَوَادُ ما استوجبوه، وفيها قوله تعالىٰ: ﴿أنا عند ظنّ عبدي بي﴾ وقولُه تعالى في القرآن العظيم: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾ وقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿لاتُشَدِّدُوْاعلى أنفسكم فَيُشَدِّدَ الله عليكم﴾ وقوله صلى الله عليه وسلم: ﴿الإثمُ ما حَاكَ في صدرك﴾ ويُلحق بها معصيةُ حكمٍ مُجْتَهَدٍ فيه، إذا كان مقلِّدًا مُجْمِعًا تقليدَ من يرى ذلك، والله أعلم.

ترجمہ: اور پانچواں مرتبہ: ان باتوں کا ہے جن کے بارے میں شارع نے کوئی صراحت نہیں کی ہے اور نہیں طے پایا ہے ملأ اعلی میں اس کا حکم البتہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی پوری توجہ سے متوجہ ہوا۔ پس اس کے سامنے آئی ایک ایسی چیز جس کو اس نے ممنوع عنہ یا مامور بہ گمان کیا۔ کسی قیاس کی رو سے یا تخریج کی رو سے یا اس کے مانند کسی چیز کی رو سے، جس طرح عام لوگوں کے لئے بعض جڑی بوٹیوں کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے، کسی ناقص تجربہ کی رو سے یا کسی ماہر طبیب کے کسی علت کو مدارِ حکم بنانے کی وجہ سے: درانحالیکہ نہیں جانتے وہ تاثیر کی وجہ اور نہ کسی حکیم نے اس کی صراحت کی ہوتی ہے۔ پس نہیں نکلتا اس طرح کا انسان ذمہ داری سے، تا آنکہ احتیاط پر عمل کرے، ورنہ ہوگا اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان ایک پردہ اس معاملہ میں جو اس نے گمان کیا ہے (پس اس کو کرنے یا نہ کرنے کا التزام کیا ہے) پس پکڑا جائے گا وہ اس کے گمان کے مطابق۔

اور اس مرتبہ میں اصل مرضیٔ خداوندی یہ ہے کہ اس کے معاملہ کو مہمل چھوڑ دیا جائے اور اس کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ مگر ایسے لوگ موجود ہیں جو واجب ولازم جانتے ہیں اس کو (یعنی ان کے گمان میں التزامات کی خلاف ورزی گناہ ہونی چاہئے) پس پوری پوری دے دی اس کو تخی پروردگار نے وہ چیز جس کو انھوں نے واجب ولازم جانا (یعنی ان کی خلاف ورزی کو گناہ قرار دیدیا) اور اس مرتبۂ خامسہ کے بارے میں اللہ پاک کا ارشاد (حدیث قدسی میں) وارد ہوا ہے: میں میرے ساتھ اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں'' اور قرآن عظیم میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''اور رہبانیت (ترک دنیا) کو انھوں نے گھڑ لیا، ہم نے اس کو ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ مگر (گھڑلی انھوں نے وہ چیز) محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے'' اور آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''نہ سختی کرو تم اپنی ذاتوں پر، پس سختی کریں گے اللہ تعالیٰ تم پر'' اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''گناہ وہ ہے جو تیرے سینہ میں تردد پیدا کرے'' ــــــ اور لاحق کیا جائے گا اس (مرتبۂ خامسہ) کے ساتھ مجتہد فیہ (مختلف فیہ) حکم کی نافرمانی کرنا جبکہ وہ فرمانی کرنے والا مقلد: پختہ ارادے سے اس مجتہد کی تقلید کرنے والا ہو جو وہ رائے رکھتا ہے (مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک جہری نماز میں بھی مقتدی پر فاتحہ فرض ہے اور

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سرّی نماز میں بھی مکروہ تحریمی ہے، پس جو شافعی ہے اس پر فاتحہ پڑھنا فرض ہے، نہیں پڑھے گا تو اس کی نماز نہیں ہوگی اور جو حنفی ہے وہ اگر فاتحہ پڑھے گا تو اس کی نماز مکروہ تحریمی ہوگی) باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات:

والمرتبة میں واو بڑھایا گیا ہے...... نَصَّ (ن) الشارعُ: صراحت کرنا...... مَجَامِعُ، مَجْمَع کی جمع ہے بمعنی جمع کرنے یا جمع ہونے کی جگہ، مَجَامِعُ القلب: پورا دل۔ مجامع الهمة: پوری کامل توجہ...... اِعْتَراهُ أمْرٌ: لاحق ہونا، در پیش آنا...... قیاس: علتِ جامعہ کی وجہ سے منصوص کا حکم غیر منصوص پر جاری کرنا...... تخریج: کسی امام کے طے کردہ ضابطہ پر کوئی حکم متفرع کرنا مگر یہاں قیاس وتخریج لغوی معنی میں ہیں۔ اصطلاحی معنی مراد نہیں یعنی اندازے سے یا کسی بات کو سامنے رکھ کر کوئی التزام کرنا...... دَارَ (ن) دَوْرًا وَدَوَرَانًا: گھومنا، چکر کھانا، ماہر حکیم کے حکم کا کسی علت پر گھومنا یعنی جہاں جہاں وہ علت (بیماری) پائی جائے حکیم کا اس بوٹی کو تجویز کرنا...... وَفَّرَ توفیرًا علیه حَقَّهُ: پورا حق دینا...... الجَوَاد سخی، کریم الجَوَّاد: بڑا فیاض...... حَاكَ الشیئُ في صدري: فلاں چیز میرے دل میں کھٹکی...... مُجْمِعًا (اسم فاعل) اَجْمَعَ الأمْرَ: پختہ ارادہ کرنا...... تقلیدَ مفعول بہ ہے مجمعاً کا۔

باب ـــــــ ۱۵

گناہوں کے مفاسد کا بیان

صغیرہ اور کبیرہ کی حد بندی: گناہوں کی دو قسمیں ہیں: صغیرہ (چھوٹے گناہ) اور کبیرہ (بڑے گناہ) اور گناہوں کو چھوٹا بڑا دو اعتباروں سے کہا جاتا ہے۔

ایک: نیکی اور گناہ کی حکمتوں کے اعتبار سے۔

دوم: ہر زمانہ کی مخصوص شریعت کے اعتبار سے، مثلاً: موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے اعتبار سے صغیرہ اور کبیرہ اور ہیں، اور ہماری شریعت کے اعتبار سے اور۔

کبیرہ گناہ: نیکی اور گناہوں کی حکمتوں کے اعتبار سے وہ ہے: جو قبر میں یا قیامت میں نہایت مؤکد طریقہ پر موجب عذاب ہو، اور آسائش سے زندگی گذارنے کی مفید اسکیموں کا بالکل ہی ستیاناس کردے اور فطرتِ اسلامی کے بالکل ہی برخلاف ہو۔

اور صغیرہ گناہ: وہ ہے جس سے مذکورہ مفاسد میں سے بعض مفاسد پیدا ہوسکتے ہوں یا وہ عام حالات میں ان مفاسد تک پہنچانے والا ہو، یا وہ من وجہ ان مفاسد کا سبب ہو اور من وجہ نہ ہو، جیسے ایک شخص راہ خدا میں خرچ کرتا ہے اور بال

بچوں کو فاقہ مست چھوڑ دیتا ہے تو وہ بخل کی بری عادت کا علاج تو کرتا ہے مگر فیملی لائف کو بگاڑ لیتا ہے۔

اور گناہ کبیرہ: ہماری خاص شریعت کے اعتبار سے وہ ہے: جس کی حرمت کی شریعت نے صراحت کی ہو یا شارع نے اس پر جہنم کے عذاب کی دھمکی دی ہو، یا اس گناہ کے لئے کوئی سزا مقرر کی ہو، یا اس گناہ کی برائی اور سنگینی ظاہر کرنے کے لئے اس کے مرتکب کو کافر اور ملت سے خارج قرار دیا ہو ـــــ اور جو گناہ اس قسم کا نہ ہو وہ صغیرہ ہے۔

بعض گناہ ایک اعتبار سے صغیرہ اور دوسرے اعتبار سے کبیرہ ہوتے ہیں: کبھی ایک کام نیکی اور گناہ کی حکمتوں کے اعتبار سے صغیرہ گناہ ہوتا ہے اور شریعت خاصہ کے اعتبار سے کبیرہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کبھی کسی بات کا عام رواج ہو جاتا تھا اور وہ لوگوں کی فطرت بن جاتی تھی اور اس طرح طبیعتوں میں رچ بس جاتی تھی کہ وہ ان میں سے نکل ہی نہیں سکتی تھی الا یہ کہ ان کے دل پارہ پارہ ہو جائیں۔ پھر دورِ نبوت آتا ہے اور شریعت نازل ہوتی ہے اور وہ اس کام کی ممانعت کرتی ہے تو لوگ جھگڑا کھڑا کرتے ہیں اور ڈھٹائی پر اتر آتے ہیں اور شریعت اسی مخالفت کے بقدر سختی اور دھمکی سے کام لیتی ہے، یہاں تک کہ اس گناہ کا ارتکاب ملت کی سخت دشمنی جیسا ہو جاتا ہے اور اس طرح کے گناہ پر وہی شخص اقدام کرتا ہے جو سرکش و متمرد اور بے حیا ہو، نہ وہ اللہ سے شرماتا ہو نہ لوگوں سے، جب صورت حال ایسی ہو جاتی ہے تو وہ کام شریعت کی نظر میں کبیرہ گناہ قرار پاتا ہے اگرچہ حکمت بر واثم کے اعتبار سے وہ صغیرہ ہو ـــــ مگر اس کے برعکس نہیں ہوتا یعنی جو کام حکمتِ بر واثم کے اعتبار سے کبیرہ ہو، وہ شریعت خاصہ کی نظر میں صغیرہ نہیں ہو سکتا۔

قصہ مختصر: شریعت اسلامیہ کے اعتبار سے کبیرہ گناہوں کے مفاسد کا بیان اسی کتاب کی قسم دوم میں آئے گا، وہی جگہ اس کے لئے موزون ہے، انواع بر میں بھی ہم نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ چند نیکی کے کاموں کی حکمتیں مختصر طور پر بیان کی ہیں باقی کا تذکرہ قسم دوم کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ یہاں آئندہ ابواب میں حکمتِ بر واثم کے اعتبار سے کبیرہ گناہوں کے مفاسد بیان کئے جائیں گے۔

﴿باب مفاسدِ الآثام﴾

واعلم: أن الكبيرة والصغيرة تُطلقان باعتبارين:

أحدهما: بِحَسَب حكمةِ البر والإثم.

وثانيهما: بِحَسَب الشرائع والمناهج المختصةِ بعصر دون عصر.

أما الكبيرة: بِحَسَب حكمة البر والإثم: فهي ذنب يوجب العذابَ في القبر وفي المحشر إيجابًا قويًا، ويُفسد الارتفاقات الصالحةَ إفسادًا قويا، ويكون من الفطرة على الطرف المخالف جدًّا.

والصغيرة: ما كان مَظِنَّةً لبعض ذلك، أو مُفْضيًا إليه في الأكثر، أو يوجب بعضَ ذلك من وجهٍ،

ولا يوجبه من وجهٍ، كمن يُنفق في سبيل الله وأهلُه جِيَاعٌ، فيدفع رذيلةَ البخل، ويُفسد تدبير المنزل.

وأما بحَسَبِ الشرائع الخاصة: فما نَصَّت الشريعةُ على تحريمه، أو أوْعَدَ الشارعُ عليه بالنار، أو شرع عليه حدًا، أو سَمَّى مرتكبَهُ كافرًا خارجًا من الملة، إبانةً لِقُبْحِهِ، وتغليظًا لأمره، فهو كبيرة.

وربما يكون شيئٌ صغيرةً بحسب حكمة البر والإثم، كبيرةً بحسب الشريعة؛ وذلك: أن الملة الجاهلية ربما ارتكبت شيئًا، حتى فشا الرسمُ به فيهم،لايخرج منهم إلا أن تَتَقَطَّعَ قلوبُهم، ثم جاء الشرع ناهيًا عنه، فحصل منهم لَجَاجٌ ومكابرةٌ، وحصل من الشرع تغليظٌ وتهديدٌ بحسب ذلك، حتى صار ارتكابُها كالمُنَاوَاةِ الشديدة للملّة، ولايَتَأتَّى الإقدامُ على مثله إلا من كل ماردٍ متمردٍ، لا يستحيي من الله ولا من الناس، فكُتب كبيرةً عند ذلك.

وبالجملة: فنحن نؤخر الكلامَ في الكبائر بحسب الشريعة إلى القسم الثاني من هذا الكتاب، لإن ذلك موضِعُهُ ونُنَبِّهُ على مفاسد الكبائر بحسب حكمة البر والإثم ههنا، كما فعلنا في أنواع البر نحوًا من ذلك.

ترجمہ: گناہوں کے مفاسد کا بیان: اور جان لیں کہ کبیرہ اور صغیرہ کا اطلاق دو اعتباروں سے کیا جاتا ہے:

ایک: نیکی اور گناہ کی حکمت کے اعتبار سے۔

دوم: ان شریعتوں اور منہجوں کے اعتبار سے جو کسی ایک زمانہ کے ساتھ مختص ہیں، دوسرے زمانہ کے لئے وہ نہیں ہیں۔

رہا کبیرہ: نیکی اور گناہ کی حکمت کے اعتبار سے: پس وہ، وہ گناہ ہے جو قبر میں اور میدان قیامت میں عذاب کو واجب (ثابت) کرتا ہے، نہایت قوی طریقہ پر واجب کرنا۔ یا مفید ارتفاقات کو بگاڑ دیتا ہے، نہایت قوی طور پر بگاڑ دینا، اور ہوتا ہے وہ گناہ فطرت انسانی سے بالکل ہی جانب مخالف پر۔

اور صغیرہ: وہ ہے جو احتمالی موقع ہوتا ہے ان مفاسد میں سے کچھ کے لئے، یا وہ پہنچانے والا ہوتا ہے ان مفاسد میں سے کچھ تک، اکثر حالات میں، یا ثابت کرتا ہے وہ ان مفاسد میں سے بعض کو ایک وجہ سے، اور نہیں ثابت کرتا وہ ان کو دوسری وجہ سے، جیسے وہ شخص جو راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتا ہے درانحالیکہ اس کے اہل وعیال فاقہ سے ہیں، پس وہ بخل کے رذیلہ کو تو ہٹاتا ہے اور تدبیر منزل کو بگاڑ لیتا ہے۔

اور رہا مخصوص شریعتوں کے اعتبار سے، پس وہ کام جس کی حرمت کی شریعت نے صراحت کی ہو، یا شارع نے اس پر جہنم کی دھمکی دی ہو یا اس پر کوئی حد مقرر کی ہو، یا اس کے مرتکب کو کافر، ملت سے خارج قرار دیا ہو، اس گناہ کی برائی ظاہر کرنے کے طور پر یا اس کے معاملہ کو سنگین بنانے کے طور پر، تو وہ کبیرہ ہے۔

اور کبھی ہوتی ہے ایک چیز چھوٹا گناہ نیکی اور گناہ کی حکمت کے اعتبار سے، اور وہ بڑا گناہ ہوتی ہے، شریعت کے

اعتبار سے۔ اوراس کی تفصیل یہ ہے کہ ملت جاہلیہ کبھی ارتکاب کرتی ہے کسی چیز کا، یہاں تک کہ اس کی رسم پھیل جاتی ہے لوگوں میں، نہیں نکل سکتی وہ رسم لوگوں میں سے مگر یہ کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں انکے دل، پھر آتی ہے شریعت اس سے روکتی ہوئی پس پائی جاتی ہے لوگوں کی طرف سے دشمنی اور مخالفت، اور پائی جاتی ہے شریعت کی طرف سے سختی اور دھمکی، اسی کے موافق، یہاں تک کہ ہو جاتا ہے اس گناہ کا ارتکاب ملت کی سخت دشمنی کی طرح، اور نہیں آسان ہوتا اس جیسے کام پر اقدام کرنا مگر ہر ایسے سرکش ومتمرد کی طرف سے جو نہیں شرماتا اللہ تعالیٰ سے، اور نہ لوگوں سے، پس لکھ دیا جاتا ہے وہ کام کبیرہ اس صورت حال میں۔

اور بات مختصر: پس ہم شریعت اسلامیہ کے اعتبار سے کبائر کے سلسلہ میں گفتگو کو مؤخر کرتے ہیں۔ اس کتاب کی قسم ثانی کی طرف، اس لئے کہ وہ اس کی جگہ ہے اور نیکی اور گناہ کے اعتبار سے ہم کبائر کے مفاسد پر تنبیہ کرتے ہیں، یہاں، جیسا کہ ہم نے نیکی کی اقسام کے بیان میں تقریباً ایسا ہی کیا ہے۔

لغات:

لَجَّ (ض،س) لَجَجًا وَلَجَاجَةً: سخت جھگڑا کرنا، دشمنی میں مداومت کرنا...... نَاوَاهُ مُنَاوَاةً: دشمنی کرنا..... المَنَاهِج جمع ہے المنهج کی، جس کے معنی ہیں: کشادہ راستہ۔ یہ لفظ الشرائع کا ہم معنی ہے...... المَحْشَر والمحشِر: لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ، مراد قیامت کا دن...... تَأَتَّى الأمر: آسان ہونا۔

نوٹ: مخطوطہ برلین اور پٹنہ میں یہاں عنوان باب مفاسد الآثام نہیں ہے، بلکہ سابق باب کے تحت یہ پورا مضمون ہے اور مخطوطہ کراچی میں یہاں سے مبحث خامس کے ختم تک کا مضمون ہی نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

توبہ کے بغیر کبیرہ گناہ معاف ہوسکتا ہے؟

اس پر اتفاق ہے کہ شرک وکفر توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوں گے اور اس میں اسلامی فرقوں نے اختلاف کیا ہے کہ مرتکب کبیرہ کا کیا حکم ہے؟ معتزلہ اور خوارج ہر کبیرہ گناہ کو شرک وکفر کے برابر گردانتے ہیں۔ پھر خوارج کے نزدیک مرتکب کبیرہ کافر ہے اور معتزلہ اسلام سے تو خارج قرار دیتے ہیں مگر کفر میں داخل نہیں کرتے، بلکہ بین بین حالت میں رکھتے ہیں، پس اگر مرتکب کبیرہ توبہ کئے بغیر مر جائے تو اس کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ معتزلہ اور خوارج انکار کرتے ہیں اور اہل السنۃ والجماعۃ جواز مغفرت کے قائل ہیں۔ یہ مسئلہ علم کلام کی کتابوں میں بھی مذکور ہے اور تفاسیر میں سورۃ النساء کی آیات ۴۸ و ۱۱۶ کے ذیل میں بھی زیر بحث آتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو تو نہ بخشیں گے اور اس کے

سوائے اور جتنے گناہ ہیں، ان کو جس کے لئے منظور ہوگا، بخش دیں گے۔ یہ آیتیں اہل السنۃ والجماعۃ کی دلیل ہیں۔ اسی طرح اسی سورت کی آیت ۹۳ کے ذیل میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے، تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے اور اس کو اپنی رحمت سے دور کردیں گے اور اس کے لئے بڑا بھاری عذاب ہے۔ یہ آیت فرق باطلہ کی دلیل ہے۔ غرض ہر فریق اپنے موقف پر کتاب وسنت کے دلائل رکھتا ہے۔

اس مسئلہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ کا مخلد فی النار ہونا تو کسی طرح درست نہیں۔ تمام اہل حق متفق ہیں کہ بجز کفر وشرک کے کوئی امر موجب خلود فی النار نہیں ہے۔ اور حکمت خداوندی میں بھلا یہ بات کیسے ممکن ہے کہ مرتکبِ کبیرہ کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جو کافر کے ساتھ کیا جاتا ہے؟ کافر تو حکومت کا باغی ہے اور مرتکبِ کبیرہ قانون شکنی کرنے والا شہری ہے۔ دونوں کا حکم یکساں کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے مرتکب کبیرہ کی مغفرت تو لامحالہ ہوگی۔ اب رہی یہ بات کہ بعد عذاب ہوگی یا بالکل معاف کردیا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں باتیں ممکن ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کام دو طرح کے ہیں ایک: حَسَبِ عادتِ جاریہ یعنی معمول کے مطابق، دوم: خرقِ عادت کے طور پر یعنی خلاف معمول۔ عادتِ جاریہ کا مقتضی تو یہ ہے کہ اگر مرتکب کبیرہ مقبول توبہ کے بغیر مرجائے تو اس کو ایک طویل زمانہ تک بطور سزا جہنم میں رکھیں، پھر اس کو نجات بخشیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کبھی خلاف معمول بھی کام کرتے ہیں، پس وہ اپنے فضل سے اصلی سزا جاری نہ کریں اور ایمان یا کسی خاص عمل کی برکت سے بالکل ہی معاف کردیں، تو ایسا بھی ممکن ہے۔

اور نصوص میں اس سلسلہ میں جو اختلاف ہے اس کا حل یہ ہے کہ نصوص لوگوں کے محاورات کے مطابق نازل ہوئی ہیں اور لوگ جو باتیں بولتے ہیں وہ دو جہتوں میں سے کسی ایک جہت کے ساتھ مقید ہوتی ہیں۔ خواہ جہت قضیہ میں مذکور ہو یا محذوف، محذوف ہونے کی صورت میں قرائن سے تعیین کی جائے گی ایک: عادۃً کی قید کے ساتھ قضیہ مقید ہوتا ہے، دوم: مطلقاً کی قید کے ساتھ۔ اور علم منطق میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ تناقض کے تحقق کے لئے وحدات ثمانیہ کے علاوہ اگر قضیہ موجہہ ہو تو جہت کا اتحاد بھی ضروری ہے۔ اگر دو قضیوں کی جہتیں مختلف ہوں تو ان میں تعارض نہ ہوگا۔ مثلاً یہ بات کہ: ''جو بھی زہر کھائے گا مرجائے گا'' اور یہ بات کہ: ''ضروری نہیں کہ جو بھی زہر کھائے وہ مرجائے'' ان دو باتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ پہلی بات عادۃً کی قید کے ساتھ مقید ہے یعنی سنت الٰہی یہ ہے کہ جو بھی زہر کھاتا ہے مرجاتا ہے اور دوسری بات خرق عادت کی قید کے ساتھ مقید ہے یعنی خلافِ معمول ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی زہر کھائے اور نہ مرے۔ اور جس طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کارنامے دو طرح کے ہوتے ہیں آخرت میں بھی دو طرح کے ہوں گے پس آیت قتل کا مطلب یہ ہے کہ حسب عادت جاریہ تو مؤمن کے قتل عمد کی سزا خلود فی النار ہے اور خلود سے مراد یہ ہے کہ مدتِ دراز تک جہنم میں رہے گا (تا ابد مطلب نہیں ہے) اور خرق عادت کے طور پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو بالکل

ہی بخش دیں، ایسا بھی ممکن ہے۔ آیت ۴۸ و ۱۱۶ میں اسی کا ذکر ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: حقوق العباد کا معاملہ بھی کبائر کی طرح ہے۔ عادتِ جاریہ تو یہ ہے کہ ان کی ادائیگی ضروری ہے مگر خرقِ عادت کے طور پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کے ذمہ سے حقوق العباد کو ختم کرنا چاہیں گے تو صاحب معاملہ کو راضی کردیں گے۔ صاحب معاملہ کے سامنے اس کے حقوق کا اتنا بڑا اجر بطور عوض پیش فرمائیں گے کہ وہ خوش ہوکر معاف کردے گا اور اجر موعود حاصل کرلے گا اس طرح معاملات کا قصہ پاک ہوجائے گا۔

نوٹ: تقریر میں کتاب کی ترتیب بدل گئی ہے، قارئین اس کا خیال رکھیں۔

وقد اختلف الناس في الكبيرة إذا مات العاصي عليها ولم يَتُب، هل يجوز أن يعفُوَ اللّهُ عنه أولا؟ وجاء كل فرقة بأدلَّةٍ من الكتاب والسنة؛ وحَلُّ الاختلاف عندي: أن أفعال اللّهِ تعالى على وجهين:

منها: الجاريةُ على العادة المستمرة.

ومنها: الخارقة للعادة.

والقضايا التي يتكلم بها الناسُ مُوَجَّهةٌ بِجهَتَيْنِ: إحداهما: في العادة، والثانيةُ: مطلقاً، وشرطُ التناقض: اتحادُ الجهة، مثلَ ماقرره المنطقيون في القضايا الموجَّهَةِ، وقد تُحذف الجهةُ، فيجب اتباعُ القرائن؛ فقولنا: كُلُّ من تناولَ السُّم مات، معناه: بحسب العادة المستمرة، وقولنا: ليس كلُّ من تناول السم مات، معناه: بحسب خرقِ العادة، فلا تناقض؛ وكما أن للّه تعالى في الدنيا أفعالاً خارِقةً، وأفعالاً جاريةً على العادة، فكذلك في المعاد أفعالٌ خارقة وعادية؛ أما العادة المستمرةُ: فأن يُعَاقِبَ العاصيَ، إذا مات من غير توبةٍ زماناً طويلاً، وقد تُخرق العادةُ، وكذلك حالُ حقوقِ العباد؛ وأما خلودُ صاحبِ الكبيرة في العذاب فليس بصحيح وليس من حكمة اللّه أن يفعل بصاحب الكبيرة مِثْلَ ما يفعل بالكافر سواءً، واللّه أعلم.

ترجمہ: اور لوگوں میں اختلاف ہوا ہے کبیرہ کے بارے میں، جب گنہگار اس کبیرہ پر مرجائے اور اس نے توبہ نہ کی ہو، آیا جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر کریں یا جائز نہیں ہے؟ اور ہر گروہ کتاب وسنت سے (اپنے موقف پر) دلائل لایا ہے۔ اور (نصوص میں) اختلاف کا میرے نزدیک حل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کام دو طرح کے ہیں:

ان میں سے بعض: عادتِ مستمرہ کے مطابق چلنے والے ہیں۔

اور ان میں سے بعض: عادت کے برخلاف ہیں۔

اور وہ باتیں جو لوگ بولتے ہیں دو جہتوں کے ساتھ مقید ہوتی ہیں ایک: فی العادۃ کی جہت کے ساتھ، دوم: مطلقاً

کی جہت کے ساتھ۔اور (دو باتوں میں) تناقض کے لئے جہت کا متحد ہونا شرط ہے،جیسا کہ مناطقہ نے قضایا موجّہہ کی بحث میں یہ بات بیان کی ہے۔اور کبھی جہت حذف کی جاتی ہے تو قرائن کی پیروی ضروری ہوتی ہے۔پس ہمارا قول: ''جو بھی شخص زہر کھائے گا وہ مرجائے گا'' اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی عادتِ مستمرہ یہ ہے۔اور ہمارا قول: ''ضروری نہیں کہ جو بھی شخص زہر کھائے وہ مرجائے'' یعنی عادت کے برخلاف ایسا ہوسکتا ہے، پس (دونوں باتوں میں) کوئی تعارض نہیں ہے۔اور جس طرح یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بعض کام خرقِ عادت کے طور پر کرتے ہیں اور بعض کام عادت کے مطابق چلتے ہیں، پس اسی طرح آخرت میں بھی بعض کام خرقِ عادت کے طور پر ہوں گے اور بعض کام عادت کے مطابق ہوں گے۔رہی عادتِ مستمرہ: تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگار کو سزا دیں طویل زمانہ تک، جب وہ مرجائے توبہ کے بغیر، اور کبھی اللہ تعالیٰ عادت کے برخلاف بھی کرتے ہیں۔اور اسی طرح حقوق العباد کا حال ہے۔اور رہا مرتکب کبیرہ کا ہمیشہ کے لئے عذاب میں رہنا تو وہ صحیح نہیں ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی حکمت میں سے یہ بات نہیں ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ کے ساتھ بالکل ویسا ہی معاملہ کریں جیسا کہ وہ کافر کے ساتھ کریں گے۔باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تشریح:

جہت: نسبت کی کیفیت کو کہتے ہیں اور جو لفظ اس پر دلالت کرتا ہے اس کو جہت قضیہ کہتے ہیں اور جس قضیہ میں جہت قضیہ مذکور ہوتی ہے اس کو موجہہ کہتے ہیں۔اور جہتیں متقدمین کے یہاں تین ہیں: وجوب، امکان اور امتناع اور متاخرین کے نزدیک کیفیتیں تین میں منحصر نہیں ہیں اور دو قضیوں میں تناقض کے لئے اگر دونوں قضیے موجہہ ہوں تو وحدات ثمانیہ کے علاوہ جہت میں اتحاد بھی ضروری ہے اگر جہتیں مختلف ہوں گی تو تعارض نہیں ہوگا۔تفصیل منطق کی کتابوں میں ہے۔

☆ ☆ ☆

باب — ۱۶

وہ گناہ جو آدمی کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں

گناہ دو طرح کے ہیں لازم اور متعدی۔لازم: وہ گناہ ہیں جن کا ضرر گنہ گار کی ذات تک محدود رہتا ہے اور متعدی: وہ گناہ ہیں جن کا ضرر اور لوگوں تک بڑھتا ہے۔اس باب میں لازم گناہوں کا ذکر ہے اور آئندہ باب میں متعدی آثام کا تذکرہ ہے۔

وہ گناہ جن کا ضرر آدمی کی ذات تک محدود رہتا ہے، ان کے تین درجے ہیں: ایک: اکبر الکبائر، دوم: مطلق کبائر، سوم: صغائر:

اکبر الکبائر: وہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے یعنی الحاد واستکبار۔

کبائر: اوامر خداوندی کی تعمیل نہ کرنے کے گناہ ہیں۔ مثلاً نماز چھوڑنا، زکوۃ نہ دینا وغیرہ۔
صغائر: اوامر خداوندی کو شرائط واجبہ کے مطابق نہ بجالانے کے گناہ ہیں۔
یہ اس باب کا خلاصہ ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

جب انسان کی قوت ملکیہ کو ہر چہار جانب سے قوت بہیمیہ گھیر لیتی ہے اور اس کو بے بس کر دیتی ہے تو قوت ملکیہ کا حال اس پرندے جیسا ہو جاتا ہے جو اسیر قفس ہو، جس کی دلچسپی اس بات میں ہو کہ وہ قفس کا حصار توڑ کر نکل بھاگے اور اپنی اصل جگہ میں یعنی سرسبز باغات میں پہنچ جائے، وہاں دانے چگے، مزیدار پھل کھائے اور اپنی نوع کے افراد میں شامل ہو کر شادمانی کے گیت گائے۔ مگر ہائے رے قفس کی بندشیں! ساری تمناؤں کا خون کر دیا۔ ایسا ہی کچھ حال بہیمیت کی قید میں پھنس کر ملکیت کا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان کی شدید ترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دہریہ ہو جائے یا استکبار میں مبتلا ہو جائے اور یہی سب سے بڑا گناہ ہے۔

دہریت کیا ہے؟ اور دہریت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ان فطری علوم کی مخالفت کرے جو انسان کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں یعنی معرفت الٰہی کا حق ادا نہ کرے اور پہلے اسی مبحث خامس کے باب ششم میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف اور ان کی زیادہ سے زیادہ تعظیم کرنے کی طرف میلان موجود ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں ان فطری علوم کی طرف اشارہ ہے۔ ارشاد ہے:

''اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا۔ اور ان سے انہیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے جواب دیا: کیوں نہیں! ہم گواہ بنتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بے خبر تھے''

اس آیت میں جو اشارہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی صلبی اولاد ان کی پشت سے نکالی گئی، جیسا کہ احادیث میں ہے۔ پھر اولاد کی پشت سے جس طرح قیامت تک ان کا وجود ہونے والا ہے، تمام انسانوں کو ان کے آباء کی پشت سے نکالا گیا، جیسا کہ مذکورہ آیت میں صراحت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی یعنی سب انسانوں کو اپنا دیدار کرایا اور معرفت کا درس دیا۔ پھر سب کا امتحان لیا کہ انھوں نے اپنے رب کو پہچان لیا یا نہیں؟ سب نے تاکیدات کے ساتھ جواب دیا کہ ان کو پروردگار کی کماحقہ معرفت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ کہیں کل قیامت کے روز لوگ یہ بہانہ نہ بنائیں کہ وہ معرفت باری تعالیٰ سے محض بے خبر تھے۔ پھر انسانوں کی تمام ارواح کو عالم ارواح میں ایک خاص ترتیب سے رکھ دیا گیا، جہاں سے ان کو اپنے اپنے وقت پر رحم مادر میں تیار ہونے والے جسم میں منتقل کیا جاتا ہے۔ غرض توحید باری تعالیٰ کا علم انسان کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے اور اسی معرفت پر انسان دنیا میں پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ: ''ہر بچہ فطرت پر جنا جاتا ہے'' (فتح الباری

۴۴۶:۴) یعنی انسان کی فطرت میں جو اللہ کی پہچان رکھ دی گئی ہے اس کو لے کر بچہ دنیا میں آتا ہے۔ اور اسی لئے اس کی فطرت میں اپنے خالق کی طرف میلان اور اس کی تعظیم کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ تعظیم اس وقت ممکن ہے، جب آدمی کا ایمان صحیح ہو، اس کا یہ اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ قصد واختیار سے عالم میں تصرف کرنے والے ہیں، لوگوں کو ان کے اعمالِ خیر وشر پر بدلہ دینے والے ہیں، انسانوں کو احکام کا مکلّف بنانے والے ہیں اور ان کے لئے قوانین مقرر کرنے والے ہیں، جس کا ایمان ہی صحیح نہیں اس کو نہ تو اللہ تعالیٰ کے بلند مقام کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ وہ کما حقہ تعظیم بجالاسکتا ہے۔ مثلاً جو شخص ایسے پروردگار کا انکار کرتا ہے جس کی طرف تمام موجودات کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے یعنی جس کا وجود خانہ زاد یعنی خود بخود، آپ سے آپ ہے اور ساری کائنات کو وجود اس نے بخشا ہے یا فلاسفہ کی طرح یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ پروردگار عالم معطّل (بے کار) ہیں وہ عالم میں کوئی تصرف نہیں کرتے، عقول عشرہ اور خاص طور پر عقل عاشر ہی سب کچھ کرتی ہے۔ یا وہ ایجاب ازلی سے بلا ارادہ تصرف کرتے ہیں۔ یعنی انھوں نے ازل میں سب کچھ طے کردیا ہے اسی کے مطابق سب کچھ ہوتا رہتا ہے اب اللہ کے ارادے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے یا وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے اچھے برے اعمال کا کوئی بدلہ نہیں دیں گے یا وہ اللہ تعالیٰ کو بھی دیگر مخلوقات کی طرح مانتا ہے یا وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی صفات میں شریک ٹھہراتا ہے یا اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو انبیاء کے ذریعہ شرائع کا مکلّف نہیں بنایا ہے اور انبیاء کی تعلیمات کو وہ خود ساختہ باتیں مانتا ہے تو ایسا شخص دہریہ ہے، اس نے اپنے دل میں اپنے رب کی تعظیم کا پختہ ارادہ کیا ہی نہیں اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے بلند مقام ومرتبہ کو پہچان ہی نہیں سکتا۔ اور اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو لوہے کے پنجرے میں بند ہو، جس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ سوئی کی نوک کے برابر بھی نہ ہو۔ ایسا شخص تاحیات بہیمیت کی تاریکیوں میں رہتا ہے۔ مگر جب وہ مرتا ہے تو پردہ پھٹ جاتا ہے اور ملکیت کو کسی درجہ میں نمودار ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے اور فطری میلان حرکت میں آتا ہے مگر موانع معرفت الٰہی میں آڑے آتے ہیں اور پاکیزہ مقام تک اس کی رسائی نہیں ہوپاتی تو اس کے باطن میں بڑی وحشت بھڑکتی ہے۔ وہ پروردگار کی ناراضی بھی مول لیتا ہے اور عالم بالا کے فرشتے بھی اس کو ناراضی اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر وہ ناراضگی زمینی فرشتوں پر ٹپکتی ہے اور وہ ایذا رسانیوں اور عذاب کا سبب بن جاتی ہے پس اس کو عالم مثال میں یا عالم خارجی میں یعنی قبر میں عذاب شروع ہوجاتا ہے۔

نیز انسان کی شدید ترین بدبختی یہ بھی ہے کہ وہ استکبار سے کام لے اور وہ اللہ کی شان کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردے۔ جس شان کا تذکرہ سورۃ الرحمان کی آیت ۲۹ میں آیا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ ہر وقت کسی نہ کسی شان (اہم کام) میں ہیں'' اس آیت میں شان سے مراد یہ ہے کہ ایک تو حکمت ازلی یعنی قدیم تقدیر الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں کائنات کے لئے سب کچھ طے کردیا ہے، مگر عالم کے لئے حکمتِ خداوندی کے مطابق اطوار وادوار بھی ہیں اور جب بھی کوئی

مخصوص دور آتا ہے تو پہلے اللہ تعالیٰ ہر آسمان میں اس دور کے معاملات کی وحی فرماتے ہیں اور ملأ اعلی کو اس دور کے مناسب کاموں پر لگاتے ہیں اور اس دور کے لئے ایک قانون تجویز فرماتے ہیں جو اس دور کی مصلحت کے مطابق ہو، پھر وہ قانون زمین میں اس دور کے نبی پر نازل کیا جاتا ہے۔ اور ملأ اعلی کو الہام فرماتے ہیں کہ وہ دنیا میں اس نئے انداز کو چلانے کا پختہ ارادہ کریں اور اس کے لئے ہر طرح کی سعی کریں۔ پس ان کا پختہ ارادہ انسانوں کے دلوں میں الہامات بن کر ٹپکتا ہے۔ پس جو شخص اس نئی شریعت کا انکار کرتا ہے وہ اس سے جدا ہو جاتا ہے، اس سے نفرت کرتا ہے اور لوگوں کو اس سے روکتا ہے اس کو ملأ اعلی کی سخت لعنت گھیر لیتی ہے، اور اس نے سابقہ شریعت کے مطابق جو کام کئے ہیں وہ سب اکارت ہو جاتے ہیں اور اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اور اب اس میں نیکی کے ایسے کام کرنے کی صلاحت ہی نہیں رہتی جو اس کے لئے مفید ہوں۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۹ میں ہے:

''بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اُن مضامین کو جن کو ہم نے نازل کیا ہے، دین کے واضح دلائل اور ربانی راہ نمائی میں سے، کتاب الٰہی میں ہماری طرف سے عام لوگوں کے لئے ان کو ظاہر کرنے کے بعد، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں''

اس آیت میں یہود کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تورات شریف میں خاتم النّبیین ﷺ کی صفات، آپؐ کی امت کے احوال اور آپؐ کے ظہور کے وقت اتباع کی ہدایات نازل فرمائی تھیں۔ مگر جب وقت آیا تو یہود نے استکبار سے کام لیا اور حق پوشی کی، چنانچہ ان کو اللہ تعالیٰ نے بھی مردود ٹھہرایا اور دیگر لعنت کرنے والوں نے یعنی ملأ اعلی وغیرہ نے بھی پھٹکارا۔ اور سورۃ البقرۃ کی آیت سات میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کردی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈالدیا'' یعنی ان کی ایمان کی اور اچھے کام کرنے کی صلاحیت مفقود کردی۔ اور ان کا حال اس پرندہ جیسا ہو گیا جو کسی ایسے پنجرے میں بند ہو جس میں سوراخ تو ہوں مگر اس پر اوپر سے بھاری پردہ ڈال دیا گیا ہو یعنی یہود کی کتابوں میں ہدایت کا سب کچھ سامان موجود تھا، مگر استکبار کا ان پر ایسا پردہ اوپر سے ڈال دیا گیا کہ اب ان کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

سوال: جب سب کچھ ازلی تقدیر میں طے ہے تو پھر یہ ''شان'' کیا چیز ہے؟ اور ادوار بدلنے پر نئے فیصلوں کی ضرورت کیا ہے؟

جواب: ازلی تقدیر تو قدیم ہے، اس میں حدوث کا شائبہ تک نہیں، اور یہ ''شان'' اس کے بعد کا مرتبہ ہے اور حادث ہے اور جس طرح ازلی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کے کمالات کی تشریح ہوتی ہے کہ ان کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے۔ وہ قادر مطلق ہیں، جو چاہیں فیصلہ کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی حکمتِ بالغہ سے سب کچھ ازل میں طے کر دیا ہے۔ اسی طرح اس شان سے بھی اللہ تعالیٰ کے بعض کمالات کی تشریح ہوتی ہے، مثلاً یہ بات کہ وہ ازل میں طے کر کے بے بس نہیں ہو گئے، جیسا کہ فلاسفہ کا خیال ہے۔ وہ آج بھی قادر مطلق ہیں جس طرح وہ ازل میں تھے، آج بھی ہر چیز کا آخری سرا انہی

کے قبضۂ قدرت میں ہے، چنانچہ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی اہم فیصلہ کرتے رہتے ہیں اوران کی شان برتر ہے۔

نوٹ: سوال مقدر کا یہ جواب شاہ صاحب رحمہ اللہ نے مسلسل کلام کے درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر دیا ہے۔قارئین غور کرلیں۔

﴿بابٌ فی المعاصی التی هی فیما بینه وبین نفسه﴾

اعلم:أن القوةَ الملكيةَ من الإنسان، قد اكْتَنَفَتْ بهاالقوةُ البهيمية من جوانبها، وإنما مَثَلُها فی ذلك مَثَلَ طائر فی قَفَصٍ، سعادتُه أن يخرجَ من هذا القفص، فَيَلْحَقَ بحَيِّزِهِ الأصليِّ من الرياض الأَرِيْضَةِ، ويأكلَ الحبوبَ الغاذيةَ والفواكِهَ اللذيذة من هنالك، ويدخلَ فی زُمرة أبناء نوعه، فَيَبْتَهِجَ بهم كلَّ الابتهاج؛ فأشدُّ شقاوةِ الإنسانِ أن يكون دهريًا؛

وحقيقةُ الدهری: أن يكون مناقِضًا للعلوم الفطرية المخلوقة فيه، وقد بَيَّنَّا أن له مَيْلا فی أصلِ فطرته إلى المَبْدَإِ جَلَّ جلالُه وميلاً إلى تعظيمه أشدَّ ما يجد من التعظيم، وإليه الإشارةُ فی قوله تبارك وتعالى:﴿ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ﴾ الآيةَ، وقولِهِ صلى الله عليه وسلم: ﴿كلُّ مولودٍ يولد على الفطرة﴾

والتعظيم الأقصى لايتمكن من نفسه إلا باعتقادِ تصرفٍ فی بارئه بالقصد والاختيار،ومجازاةٍ وتكليفٍ لهم، وتشريع عليهم؛ فمن أنكر أن له ربا تنتهی إليه سلسلةُ الوجود، أو اعتقدر با مُعَطَّلاً لايتصرف فی العالَم، أو يتصرف بالإيجاب من غير إرادة، أولا يُجازی عبادَه على ما يفعلون من خيروشر، أو اعتقد ربَّه كَمَثَلِ سائر الخلق، أو أشرك عبادَه فی صفاته، أو اعتقد أنه لا يكلفهم بشريعة على لسانِ نبی، فذلك الدهریُّ الذی لم يُجْمع فی نفسه تعظيمَ ربه، وليس لعلمه نفوذٌ إلى حَيِّزِ القدس أصلاً، وهو بمنزلة الطائر المحبوس فی قفص من حديد، ليس فيه منفذٌ ولاموضِعُ إبرةٍ، فإذا مات شَقَّ الحجابُ، وبرزت الملكيةُ بروزاً مّا،وتحرَّك الميلُ المفطورُ فيه، وعَاقَتْه العوائقُ فی علمه بربه، وفی الوصول إلى حيز القدس، فهاجت فی نفسه وَحشةٌ عظيمةٌ، ونظر إليها بارئُها والملأُ الأعلى وهی فی تلك الحالة الخبيثة،فأحدقت فيها بنظر السُّخط، والازدراء، وترشَّحت فی نفوس الملائكة إلهاماتُ السُّخط والعذاب، فَعُذِّبَ فی المثال وفی الخارج.

أو كافرًا، تَكَبَّرَ على الشأن الذی تَطَوَّرَ به اللّهُ تعالى، كما قال:﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ﴾

واعني بالشأن: أن للعالَم أدوارًا وأطوارًا حَسَبَ الحكمةِ الإلٰهية، فإذا جاءت دورةٌ أوحى الله تعالى في كل سماءٍ أَمْرَها، ودبّر الملأ الأعلى بمايناسبها، وكتب لهم شريعةً ومصلحةً، ثم ألهم الملأَ الأعلى أن يُجمعوا تمشيةَ هذا الطورِ في العالَم، فيكون إجماعُهم سببا لإلهامات في قلوب البشر، فهذا الشأنُ تِلْوُ المرتبةِ القديمةِ، التي لا يشوبها حدوثٌ، وهذه أيضًا شارحةٌ لبعضِ كمالِ الواجب جَلَّ مجدُه كالمرتبة الأولى، فكلُّ من باين هذا الشأنَ، وأبغضه، وصدّ عنه، أُتْبِعَ من الملأ الأعلى بلعنة شديدة تُحيطُ بنفسه، فتُحْبَطُ أعمالُه، ويقسو قلبُه، ولا يستطيع أن يكسب من أعمالِ البر ما ينفعه، وإليه الإشارة في قوله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى، مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِيْ الْكِتَابِ أُوْلٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللاَّعِنُوْنَ﴾ وقوله: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ فهذا كطير، في قفص له منافذُ، إلا أنه قد غُشي من فوقه بغاشية عظيمة.

ترجمہ: ان گناہوں کے بیان میں جو آدمی اور اس کی ذات کے درمیان ہیں: جان لیں کہ انسان کی قوت ملکیہ کو قوت بہیمیہ نے اس کی تمام جانبوں سے گھیر رکھا ہے اور قوت ملکیہ کا حال اس سلسلہ میں پنجرے میں محبوس پرندے جیسا ہی ہے۔ پرندے کی نیک بختی یہ ہے کہ وہ اس پنجرے سے نکلے، پس مل جائے وہ اپنی اصلی جگہ سے یعنی سرسبز باغات سے، اور کھائے وہ غذائی دانے اور لذیذ میوے، وہاں سے، اور داخل ہو وہ اپنی نوع کے افراد کے زمرہ میں، پس خوش ہو وہ ان کے ساتھ مل کر نہایت خوش ہونا۔ پس انسان کی شدید ترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دہریہ ہو جائے۔

اور دہریہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ان فطری علوم کو توڑنے والا ہو (یعنی مخالفت کرنے والا ہو) جو اس کے اندر پیدا کئے گئے ہیں۔ اور ہم پہلے (باب في أن العبادة حق الله إلخ میں قوله: فاعلم أن في روح الإنسان لطيفة نورانية تميل إلخ) بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت میں اللہ جل جلالہ کی طرف میلان ہے اور ان کی تعظیم کی طرف میلان ہے، زیادہ سے زیادہ تعظیم جو وہ پاتا ہے یعنی جو اس کے بس میں ہے اور اس کی طرف اشارہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارشاد میں: "اور جب لیا آپ کے رب نے آدم کی اولاد سے" آیت آخر تک پڑھیں۔ اور آپ ﷺ کے ارشاد میں: کہ "ہر بچہ فطرت پر جنا جاتا ہے"

اور غایت درجہ تعظیم کرنے پر انسان قادر نہیں ہے مگر اس اعتقاد کے ساتھ کہ اس کے خالق قصد واختیار سے تصرف کرنے والے ہیں اور بدلہ دینے والے ہیں اور لوگوں کو احکام کا مکلّف بنانے والے ہیں اور ان کے لئے قوانین مقرر کرنے والے ہیں۔ پس جو شخص انکار کرتا ہے اس بات کا کہ (۱) اس کا ایک ایسا پروردگار ہے جس کی طرف تمام موجودات کا سلسلہ منتہی ہوتا ہے (۲) یا اعتقاد رکھتا ہے ایسے معطّل (بے کار) رب کا جو عالَم میں تصرف نہیں کرتا (۳) یا ارادہ کے بغیر بالایجاب تصرف کرتا ہے (۴) یا وہ اپنے بندوں کو بدلہ نہیں دے گا اس خیر وشر پر جو وہ کرتے ہیں (۵) یا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ

اس کا رب دیگر مخلوقات کی طرح ہے (۶) یا شریک ٹھہراتا ہے وہ اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں (۷) یا اعتقاد رکھتا ہے وہ کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کسی نبی کے ذریعہ احکام کا مکلّف نہیں بنایا تو یہ شخص وہ دہریہ ہے جس نے اپنے دل میں رب کی تعظیم کا پختہ ارادہ نہیں کیا ہے اور قطعاً اس کے علم کے لئے مقام قدسی (یعنی اللہ تعالیٰ) تک پہنچنا نہیں ہے۔ اور وہ اس پرندے جیسا ہے جو لوہے کے پنجرے میں قید ہو، جس میں کوئی سوراخ نہ ہو، سوئی کی جگہ کے بقدر بھی نہ ہو۔ پس جب وہ مرجاتا ہے تو پردہ پھٹ جاتا ہے اور ملکیت نمودار ہوتی ہے کسی درجہ میں نمودار ہونا اور وہ میلان حرکت میں آتا ہے جو اس میں پیدا کیا گیا ہے اور روکتی ہیں اس کو روکنے والی چیزیں پروردگار کو جاننے سے اور پاکیزہ مقام تک پہنچنے سے۔ پس بھڑکتی ہے اس کے دل میں بڑی وحشت، اور دیکھتے ہیں اس نفس کی طرف اس کے پیدا کرنے والے اور عالم بالا کے فرشتے درانحالیکہ وہ اس خبیث حالت میں ہوتا ہے پس دیکھتے ہیں ملأ اعلیٰ اس نفس میں ناراضی اور حقارت کی نظر سے اور ٹپکتے ہیں ملائکہ (سافلہ) کے نفوس میں ناراضی اور عذاب کے الہامات، پس سزا دیا جاتا ہے وہ عالم مثال میں اور عالم خارجی میں۔

یا وہ کافر ہوجائے، گھمنڈ کرے اس ''شان'' کے سامنے جس کو اللہ تعالیٰ ادلتے بدلتے رہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''ہر وقت وہ کسی نہ کسی شان میں ہے'' اور میری مراد ''شان'' سے یہ ہے کہ عالم کے لئے حکمتِ خداوندی کے مطابق ادوار واطوار ہیں، پس جب آتا ہے کوئی مخصوص دور تو اللہ تعالیٰ وحی فرماتے ہیں ہر آسمان میں اس کے معاملہ کی اور انتظام کرتے ہیں ملأ اعلیٰ کا ان باتوں کے ساتھ جو وہ اس دور کے مناسب ہوتی ہیں۔ اور واجب کرتے ہیں ان کے لئے ایک قانون اور ایک مصلحت۔ پھر الہام فرماتے ہیں ملأ اعلیٰ کو کہ وہ دنیا میں اس (نئے) انداز کو چلانے کا (پھیلانے کا) پختہ ارادہ کریں، پس ان کا پختہ ارادہ کرنا انسانوں کے دلوں میں الہامات کا سبب ہوتا ہے (سوال مقدر کا جواب) پس یہ ''شان'' اس مرتبۂ قدیم کے بعد ہے، جس میں حدوث کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور یہ ''شان'' بھی واجب جل مجدہ کے بعض کمالات کی تشریح کرنے والی ہے، مرتبۂ اولیٰ کی طرح (جواب پورا ہوا) پس ہر وہ شخص جو اس شان کو چھوڑ کر جدا ہوتا ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے اور اس سے روکتا ہے، لاحق کیا جاتا ہے وہ، ملأ اعلیٰ کی طرف سے، ایسی سخت لعنت جو اس کے نفس کو گھیر لیتی ہے۔ پس اکارت کردیئے جاتے ہیں اس کے اعمال، اور سخت ہوجاتا ہے اس کا دل اور وہ اعمال برّ میں سے حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ان کی جو اس کے لئے مفید ہوں۔ اور اس کی طرف اشارہ ہے ارشاد باری تعالیٰ میں: ''بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اُن باتوں کو جن کو ہم نے نازل کیا ہے واضح دلائل اور ہدایت میں سے، عام لوگوں کے لئے اس کو ظاہر کرنے کے بعد کتاب الٰہی میں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور (دوسرے) لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں'' اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں: ''مہر کردی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر'' پس یہ شخص ایسے پرندے کی طرح ہے جو کسی ایسے پنجرے میں ہو جس میں سوراخ ہیں، مگر بات یہ ہے کہ اس پر بھاری پردہ ڈال دیا گیا ہے اس کے اوپر سے۔

لغات:

اِكْتَنَفَ القومُ فلانا: احاطہ کرنا...... الرياض: باغات جمع الروضة...... الأرِيْضَة: سرسبز أرَض (ن) أرْضًا وأرُض (ک) أرَاضَةً المكانُ: سرسبز اور خوش منظر ہونا...... اِبْتَهَجَ به: خوش ہونا...... العائق: ہر روکنے والی چیز، جمع العوائق، عَاقَهُ (ن) عَوْقًا عن كذا: روکنا، باز رکھنا...... هَاجَ يَهِيْجُ هَيْجًا وهَيْجَانًا: بھڑکنا برانگیختہ کرنا...... حَدَقَه بعينه: کسی کی طرف دیکھنا سے أحْدَقَ باب افعال ہے...... اِزْدَرٰى: حقیر سمجھنا...... تكَبَّر: غرور کرنا...... تَطَوَّر: تَحَوَّل من طَوْرٍ إلى طَوْرٍ...... التِلوُ: وہ چیز جو کسی چیز کے پیچھے ہو...... أُتْبِعَ (فعل مجہول) من الاتباع على زنة أُكْرِمَ.

ترکیب وتصحیح: أو كافرًا کا عطف دهريًّا پر ہے...... فإذا مات شئ اصل میں فإذا مات شفٌ تھا، تصحیح مخطوطہ برلین سے کی گئی ہے قوله: تطوَّر به الله أي: أداره وقدَّره وخلقه بطَور خاص في كل زمان (سندیؒ)

☆ ☆ ☆

دوسرے درجہ کے کبائر: یہ ہیں کہ آدمی کا عقیدۂ توحید اور تعظیم دونوں صحیح ہوں مگر وہ حکمتِ بر واثم کی رو سے جو چیزیں مامور بہ ہیں ان کا تارک ہو، نمازیں وقت پر ادا نہ کرتا ہو، زکوۃ نہ دیتا ہو، روزے نہ رکھتا ہو اور حج فرض ہو گیا ہو مگر ادا نہ کیا ہو تو اس کا حال اس شخص جیسا ہے جو ''بہادری'' کے معنی اور فائدہ تو سمجھتا ہو مگر بہادری کے وصف کے ساتھ متصف ہونے کی کوشش نہ کرتا ہو، تو محض جاننے سے کیا فائدہ؟ جاننا اور ہے اور خود بہادر بننا اور ہے، تاہم وہ اس شخص سے غنیمت ہے جو بہادری کا مطلب تک نہیں جانتا یعنی یہ صحیح العقیدہ مؤمن جو تارک فرائض ہے مگر وہ ان کے برحق ہونے کو مانتا ہے وہ اس شخص سے بہرحال بہتر ہے جو سرے سے جانتا ہی نہیں ہے یعنی دہری اور کافر سے بہتر ہے اور اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو کسی جالی دار قفس میں بند ہو، جو سبزہ زاروں کو اور میووں کو دیکھتا ہو، بلکہ عرصہ تک وہ ان میں رہ چکا ہو اور میووں سے لطف اندوز ہو چکا ہو، پھر وہ دام میں پھنس گیا ہو اور اسیر قفس ہو کر رہ گیا ہو، چنانچہ وہ بے حد مشتاق ہو ان نعمتوں کی طرف جو ان باغات میں ہیں، ہر وقت پر پھڑ پھڑاتا ہو۔ سوراخ میں چونچیں مارتا ہو اور نکل بھاگنے کے ہزار جتن کرتا ہو۔ مگر بے بس ہو، نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو ـــــــ یہ گناہ حکمت بر واثم کی رو سے کبائر ہیں۔

تیسرے درجہ کے گناہ: یہ ہیں کہ آدمی کا عقیدۂ توحید اور تعظیم باری دونوں صحیح ہوں اور وہ اوامر خداوندی کی تعمیل بھی کرتا ہو، مگر وہ ان شرائط کے مطابق اعمال بجا نہ لاتا ہو جو ان اوامر کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً نماز پڑھتا ہو مگر لومڑی کی طرح نماز میں جھانکتا ہو، مرغ کی طرح ٹھونگیں مارتا ہو، کتے کی طرح سجدے میں زمین پر ہاتھ بچھاتا ہو۔ اسی طرح روزہ رکھتا ہو مگر روزہ میں قولی اور عملی برائیوں سے نہ بچتا ہو، زکوۃ دیتا ہو مگر نکما مال نکالتا ہو۔ حج کیا ہو مگر رفث وفسوق اور

جدال سے احتراز نہ کیا ہو۔ تو اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو کسی شکستہ پنجرے میں بند ہو، جس سے نکلنا خطرہ سے خالی نہ ہو یعنی زخمی ہوئے بغیر نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو، پس اگر وہ کوشش کر کے ہزار دقتوں سے نکل بھی گیا تو بھی وہ اپنی نوع کے افراد میں پہنچ کر کچھ زیادہ مسرور نہیں ہوگا، نہ باغ کے پھلوں سے کما حقہ لطف اندوز ہوگا۔ کیونکہ اس کا سارا جسم زخمی ہے۔ اس کے پر اکھڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے نیک و بد دونوں طرح کے اعمال کئے ہیں۔ یہی معاصی حکمت بر واثم کے اعتبار سے صغائر ہیں۔

فائدہ: قیامت میں پل صراط پر سے گذرنے کی جو روایت مروی ہے، اس میں گناہ کے ان تینوں درجات کی طرف اشارہ ہے۔ بعض لوگ تو پل صراط سے گذرتے ہوئے دوزخ میں گر پڑیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے یہ پہلی قسم کے گنہ گار ہیں اور کچھ دوزخ میں گرا دیئے جائیں گے پھر وہ نجات پائیں گے، یہ دوسری قسم کے گنہ گار ہیں اور کچھ آنکس (آنکڑوں) سے زخمی ہو کر پار ہو جائیں گے، یہ تیسری قسم کے لوگ ہیں (یہ روایات بخاری شریف میں ہیں۔ دیکھیں حدیث نمبر ۷۴۳۷ و ۷۴۳۹ فتح الباری ۱۳: ۴۲۰)

وأدنى من ذلك: أن يعتقد التوحيدَ والتعظيمَ على وجههما، ولكن ترك الامتثالَ كما أُمربه في حكمة البر والإثم، ومَثَلُه كمثلِ رجلٍ عرف الشَّجاعة، ماهي؟ وما فائدتُها؟ ولكن لايستطيع الاتصافَ بها، لأن حصولَ نفسِ الشُّجاعة غيرُ حصولِ صورتها في النفس.

وهو أحسن حالاً ممن لايعرف معنى الشجاعة أيضًا، ومَثَلُه كمثل طائر في قفص مُشَبَّكٍ، يرى الخُضرةَ والفواكهَ، وقد كان فيما هنالك أيامًا، ثم طرأ عليه الحبسُ، فيشتاق إلى ماهنالك، ويضرب بجناحه، ويُدخِل في المنافذ مناقيره، ولايجد طريقًا يخرج منه، وهذه هي الكبائر بِحَسَب حكمةِ البر والإثم.

وأدنى من ذلك: أن يفعل هذه الأوامر، ولكن لا على شريطتها التي تجب لها، فَمَثَلُهُ كمثل طائر في قفص مكسور، في الخروج منه حرجٌ، ولا يُتصور الخروجُ إلا بَخَدْشٍ في جلده، ونَتْفٍ في ريشه، فهو يستطيع أن يخرج من قفصه ولكن بجدٍّ وكَدٍّ، ولا يبتهج في أبناء نوعه كلَّ الابتهاج، ولايتناول من فواكه الرياض كما ينبغي، لِمَا أصابه من الخَدْش والنَّتْف.

وهؤلاء هم الذين خلطوا عملاً صالحًا وآخر سيئًا، وعوائقُهم هذه هي الصغائر بحسب حكمة البر والإثم، وقدأشار النبي صلى الله عليه وسلم في حديث الصراط إلى هذه الثلاثة، حيث قال: ﴿ساقطٌ في النار، ومُخَرْدَل ناجٍ، ومخدوشٌ ناجٍ﴾ والله أعلم.

ترجمہ: اور اس (پہلے درجہ) سے کم تر: یہ ہے کہ اعتقاد رکھے آدمی صحیح توحید اور صحیح تعظیم کا، مگر چھوڑ دی ہو اس نے



تعمیل ان باتوں کی جن کا حکم دیا گیا ہے وہ حکمت بر واثم کی رو سے (جن کی تفصیل آثام کے بیان سے پہلے گذری ہے) اور اس کا حال اس شخص جیسا ہے جو ''بہادری'' کو پہچانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا فائدہ کیا ہے؟ مگر وہ اس کے ساتھ متصف ہونے کی طاقت نہیں رکھتا، اس لئے کہ خود بہادری کا حاصل ہونا اور چیز ہے اور دل میں اس کی صورت کا حاصل ہونا (یعنی جاننا) اور چیز ہے۔

اور وہ حالت کے اعتبار سے بہتر ہے اس سے جو بہادری کے معنی تک نہیں جانتا۔ اور اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو کسی جال دار پنجرے میں بند ہو، سبزہ زار کو اور میووں کو دیکھتا ہو، اور تحقیق رہ چکا ہو وہ اُن چیزوں میں جو وہاں ہیں کئی دن، پھر طاری ہوئی ہو اس پر قید، پس وہ مشتاق ہو ان چیزوں کی طرف جو وہاں ہیں، اور وہ اپنے پر پھڑ پھڑاتا ہو، اور سوراخوں میں اپنی چونچیں داخل کرتا ہو، اور نہ پاتا ہو وہ کوئی ایسا راستہ جس سے نکلے۔ اور یہی کبائر ہیں نیکی اور گناہ کی حکمت کی رو سے۔

اور اس (دوسرے درجہ) سے کم تر: یہ ہے کہ بجالائے وہ اِن اوامر کو (یعنی اسلام کے ارکان خمسہ وغیرہ فرائض کو) لیکن اس شرط کے مطابق نہ بجالائے جو ان اوامر کے لئے ضروری ہیں۔ پس اس کا حال اس پرندے جیسا ہے جو کسی شکستہ قفس میں بند ہو، اس سے نکلنے میں حرج (تنگی) ہو۔ اور نکلنا متصور نہ ہو مگر اس کی کھال میں خراش کے ساتھ اور اس کے پروں میں اکھڑنے کے ساتھ، پس وہ اپنے پنجرے سے نکل سکتا ہے مگر کوشش اور مشقت کے ساتھ۔ اور وہ مسرور نہیں ہوتا اپنی نوع کے افراد میں پہنچ کر پوری طرح سے مسرور ہونا۔ اور نہیں کھاتا ہے وہ باغ کے پھلوں میں سے جیسا کہ اس کو کھانا چاہئے، اُس خراش اور پر نُچنے کی وجہ سے جو اس کو پہنچی ہے۔

اور یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے نیک عمل کو دوسرے بدعمل کے ساتھ ملایا ہے۔ اور ان کی یہی رکاوٹیں وہ صغائر ہیں نیکی اور گناہ کی حکمت کی رو سے، اور تحقیق اشارہ فرمایا ہے نبی کریم ﷺ نے پل صراط کی حدیث میں ان تینوں مراتب کی طرف، چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ''آگ میں گرنے والا (اور ہلاک ہونے والا) اور آگ میں گرنے والا نجات پانے والا، اور زخمی ہونے والا نجات پانے والا'' باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات وتشریحات:

قوله: أدنى من ذلك: شروع في مراتب المسلمين أي: أخفُّ وأقلُّ شقاوةً من الدهري والكافر: مسلمٌ يعتقد التوحيد والتعظيم، كما ينبغي، لكنه لايعمل بالشرائع أصلاً اهـ (سنديؒ)...... شَبَّك الشيئ: ایک دوسرے میں ملانا، جال بنانا جس میں سوراخ رہتے ہیں...... **الشرط والشريطة بمعنىً...... وقوله: أدنى من ذلك، أي: المسلم الأدنى معصيةً من المسلم المذكور، الذي يفعل بهذه الأوامر، لكنه لاعلى شريطتها، كما يصلي بلارعاية واجباتها وسننها وغير ذلك اهـ (سنديؒ) قوله: وعوائقهم هذه أي: موانع**

هؤلاء هذه من معرفة الرب تبارك وتعالى، والوصول إلى الملأ الأعلى، هي الصغائر بحسب حكمة البر والإثم، لأن في ترك الشريطة فقط مفسدة غير عظيمة اهـ (سندیؒ)...... خَدَشَه (ض) خَدْشًا: خراش لگانا مخدوش: زخمی...... خلطوا عملاً صالحًا وآخر سيئا میں شاہ صاحب نے واوکو باء کے معنی میں لیا ہے، لأن الواو للجمع والباء للالصاق، فهما من وادٍ واحد (روح المعانی) شاہ صاحب نے سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۲ کا ترجمہ بھی یہی کیا ہے: ''آمیختہ اند عملِ نیک را با عملِ دیگر کہ بداست'' مگر آپ کے صاحب زادے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ دوسرا ترجمہ کرتے ہیں کہ: ''ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد'' اس ترجمہ کے مطابق آیت کی تفسیر میری تفسیر ہدایت القرآن میں ملاحظہ فرمائیں...... خَـــرْدَل کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ایک: دوزخ میں گرادینا دوم: ٹکڑے ٹکڑے کردینا۔ حدیث میں پہلے معنی موزون ہیں، واللہ اعلم۔

باب ــــــ ۱۷

وہ گناہ جن کا لوگوں سے تعلق ہوتا ہے

گذشتہ باب میں ''لازم'' گناہوں کا تذکرہ تھا، جن کا ضرر گنہ گار کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ اب اس باب میں ''متعدی'' گناہوں کا بیان ہے جن کا ضرر دوسرے لوگوں تک پہنچتا ہے ــــــ متعدی گناہ تین قسم کے ہیں:

۱ ۔ شہوانی گناہ یعنی زنا اور لواطت۔

۲ ۔ درندگی (ظلم) والے اعمال یعنی شراب سے بدمستی، ضرب وقتل، زہر خورانی، جادو سے ہلاک کرنا، بغاوت کی تہمت لگا کر حکومت میں مخبری کرنا۔

۳ ۔ وہ گناہ جو بدمعاملگی کے قبیل سے ہیں یعنی چوری غصب، جھوٹا دعوی، جھوٹی قسم کھانا، جھوٹی گواہی دینا، ناپ تول میں کمی کرنا، سٹہ بازی، سود خوری اور بھاری ٹیکس وصول کرنا۔

اس باب میں انہی سترہ گناہوں کی حرمت کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

انسان اور دیگر حیوانات میں فرق:

حیوانات کی مختلف المراتب انواع ہیں:

۱ ۔ وہ حیوانات جو زمین سے کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی ضروریات چونکہ محدود ہوتی ہیں اس لئے ان کو بس یہ الہام کیا جاتا ہے کہ وہ غذا کس طرح حاصل کریں؟ تدبیر المنازل (فیملی لائف) کے الہام کی ان کو حاجت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔

۲ ـ وہ حیوانات جن میں توالد و تناسل ہوتا ہے اور نر و مادہ مل کر اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کی ضروریات قسم اول کے حیوانات کی ضروریات سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کو غذائی ضروریات کے الہام کے ساتھ تدبیر المنزل (عائلی زندگی) کا بھی الہام کیا جائے۔ مثلاً پرندوں کو الہام فرمایا کہ وہ غذا کس طرح حاصل کریں؟ اڑان کس طرح بھریں؟ اپنی مادہ سے کس طرح ملیں؟ گھونسلہ کس طرح بنائیں؟ اور اپنے چوزوں کو کس طرح چگائیں؟

۳ ـ حیوانات کی اشرف نوع انسان ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے، مل جل کر زندگی گذارنا اس کی فطرت ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کے تعاون کے ساتھ ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ خودرَو گھاس غذا کے طور پر استعمال نہیں کرتا، وہ کچے میوے بھی غذا کے طور پر نہیں کھاتا، نہ اس کے بدن پر پشم اور اون ہے جس سے وہ گرم ہو، بلکہ وہ کپڑوں، مکانات اور آگ وغیرہ سے گرمی حاصل کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان کے اور بھی امتیازات ہیں جن کی وضاحت پہلے مبحث اول کے باب ہفتم میں گذر چکی ہے۔

غرض مذکورہ بالا امتیازات کی وجہ سے ضروری ہے کہ انسان کو تدبیر المنازل اور ذرائع معاش کے الہام کے ساتھ انتظام مملکت کے علوم بھی الہام کئے جائیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ دیگر حیوانات کو بوقت احتیاج فطری طور پر الہامات کئے جاتے ہیں اور انسان کو فطری الہامات زندگی برقرار رکھنے کے علوم کے بس تھوڑے سے حصہ میں کئے جاتے ہیں۔ مثلاً دودھ پیتے وقت پستان کا چوسنا، گلے میں کھراپن محسوس ہونے پر کھانسنا اور دیکھنے کا ارادہ کرنے پر پلکیں کھولنا وغیرہ۔

انسان کو اس کی تمام ضروریات فطری طور پر کیوں الہام نہیں کی گئیں؟

انسان کو اس کی تمام ضروریات فطری طور پر اس لئے الہام نہیں کی گئیں کہ ان کا خیال (قوت عاقلہ) بڑا کاریگر، کارگذار ہے۔ چونکہ قدرت نے اس کو آلۂ علم دے رکھا ہے اس لئے تدبیر المنازل اور انتظام مملکت کے سلسلہ کے علوم پانچ باتوں کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ انسان انہی پانچ ذرائع سے ضروری علوم حاصل کرتا ہے۔ وہ پانچ ذرائع یہ ہیں:

۱ ـ عائلی زندگی کو سنوارنے کے لئے اور مملکت کے نظم و انتظام کے سلسلہ میں لوگوں میں جو ریت رواج جاری ہے انسان اس سے سلیقہ سیکھتا ہے۔

۲ ـ انسان انبیائے کرام کی پیروی کر کے ان سے علوم اخذ کرتا ہے۔ انبیاء کے علوم ملکوتی انوار کے ساتھ مؤید ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی طرف وحی کئے گئے ہیں، اس لئے ان میں خطاء کا احتمال نہیں ہوتا۔

۳ ـ وہ اپنے اور دوسروں کے تجربات سے علوم پیدا کرتا ہے۔

۴ ـ وہ اپنی والی کوشش کرنے کے بعد تدبیر غیبی کا انتظار کرتا ہے اور پردۂ غیب سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس سے عبرت پذیر ہوتا ہے اور علوم اخذ کرتا ہے۔

۵ ۔ وہ استقراء (جائزہ) قیاس اور برہان کے ذریعہ امور میں غور وفکر کر کے علوم پیدا کرتا ہے۔

سوال: جب ضروری علوم اخذ کرنے کے لئے قدرت نے انسان کو قوت عاقلہ دی ہے، جو مذکورہ بالا پانچ ذرائع سے عائلی اور مُلکی زندگی کو سنوارنے کے لئے علوم اخذ کرتی ہے تو پھر تمام انسان ان علوم میں یکساں کیوں نہیں ہوتے؟

جواب: لوگوں میں ان علوم میں تفاوت، قابلیت کے تفاوت کی وجہ سے ہوتا ہے، اگرچہ قدرت کی طرف سے فیضان عام ہوتا ہے جیسے بارش کا فیضان یکساں ہوتا ہے، مگر باغ میں لالہ اُگتا ہے اور شور زمین میں خس وخاشاک! حکیم شیراز فرماتے ہیں:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست ۔۔۔ در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

اسی طرح خواب میں فیضان عام ہوتا ہے، مگر ہر خواب دیکھنے والے کو اس کی فطرت اور استعداد کے مطابق صورتیں نظر آتی ہیں۔ نیک آدمی کو مبشرات (اچھے خواب) نظر آتے ہیں، بدکو بدخواب اور بلی کو چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔ غرض مُفاض علیہ (جس پر علوم کا فیضان کیا گیا) میں پائی جانے والی وجہ، اختلاف کا باعث ہوتی ہے، کوئی آہنگر بنتا ہے، کوئی کھیتی باڑی کا ماہر ہوتا ہے تو کوئی حساب داں ہوتا ہے، اگرچہ علوم کا فیضان سب کے لئے عام اور یکساں ہوتا ہے، مُفیض (فیضان کرنے والے) کی طرف سے فیضان میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔

﴿باب الآثام التى هى فيما بينه وبين الناس﴾

اعلم: أن أنواع الحيوان على مراتب شتّٰى:

منها: مايتكوَّنُ تكوُّنَ الدِّيدانِ من الأرض؛ ومن حقِّها: أن تُلْهم من بارىءِ الصور: كيف تتغذّٰى؟ ولا تُلْهَم: كيف تُدَبِّر المنازلَ؟

ومنها: مايتناسل، ويتعاون الذكَرُ والأ نْثى منها فى حِضانة الأولاد؛ ومن حقها فى حكمة الله تعالى: أن تُلْهَمَ تدبيرَ المنازل أيضًا، فأُلهم الطيرُ: كيف يتغذى ويطير؟ وأُلهم أيضا: كيف يُسافِد؟ وكيف يتخذ عُشًّا؟ وكيف تَزِقُّ الفِرَاخَ؟

والإنسان من بينها مَدَنى الطبع، لا يتعيش إلا بتعاون من بنى نوعه، فإنه لا يتغذى الحشيشَ النابتَ بنفسه، ولا بالفواكهِ نَيِّئَةً، ولا يَتَدَفَّأُ بالوبر، إلى غير ذلك مماشرحنا من قبل؛ ومن حقه: أن يُلهم تدبيرَ المُدُنِ مع تدبير المنازل وآداب المعاش، غير أن سائر الأنواع تُلهم عند الاحتياج إلهاما جِبِلِّيًّا، والإنسانُ لم يُلهم إلهاما جبليا إلا فى حصة قليلة من علوم التعيُّش، كمصِّ الثدى عندَ الإرْتِضاع، والسُّعالِ عند البُحَّةِ، وفتح الجفون عند إرادة الرؤية، ونحو ذلك.

وذلك: لأن خيالَه كان صَنَّاعًا هَمَّامًا، ففُوِّض له علومُ تدبيرِ المنازل وتدبير المدن إلى الرسم، وتقليدِ المؤيَّدين بالنور الملكي فيما يوحي إليهم، وإلى تجربةٍ ورصدِ تدبيرٍ غيبيٍّ، ورَوِيَّةٍ بالاستقراء والقياس والبرهان.

ومَثَلُهُ في تلقي الأمرِ الشائع الواجبِ فيضانُه من بارىءِ الصُّور، مع الاختلاف الناشيئ من قِبَلِ استعداداتهم كمثل الواقعاتِ التي يَتَلَقَّاها في المنام، يُفاض عليهم العلومُ الفوقانية من حَيِّزِها، فتتشبح عندهم بأشباحٍ مناسِبةٍ، فتختلف الصور لمعنىً في المُفَاضِ عليه، لا في المُفيض.

ترجمہ: ان گناہوں کا بیان جو آدمی اور لوگوں کے درمیان میں ہوتے ہیں: جان لیں کہ جانداروں کی اقسام مختلف مرتبوں پر ہیں:

بعض: وہ ہیں جو مٹی سے کیڑوں کے پیدا ہونے کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ خالقِ صُوَر کی طرف سے الہام کئے جائیں کہ وہ غذا کیسے حاصل کریں؟ اور وہ یہ الہام نہیں کئے جاتے کہ وہ گھروں کا نظم ونسق کیسے کریں؟

اور بعض: وہ ہیں جو ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کے نر و مادہ، اولاد کی پرورش میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کو گھروں کا نظم بھی الہام کیا جائے۔ چنانچہ پرندوں کو الہام کیا گیا کہ وہ غذا کیسے حاصل کریں؟ اور وہ کس طرح اڑیں؟ اور نیز ان کو یہ بھی الہام کیا گیا کہ وہ کس طرح جفتی کریں؟ اور وہ کس طرح گھونسلہ بنائیں؟ اور وہ کس طرح چوزوں کو چُگائیں؟

اور انسان: حیوانات کے درمیان میں سے مدنی الطبع ہے۔ وہ زندگی بسر نہیں کرتا مگر اپنے بنی نوع کے تعاون سے۔ پس بیشک وہ غذا حاصل نہیں کرتا خودرَو گھاس سے، اور نہ خام میوہ جات سے، اور نہ وہ پشم سے گرم ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ ان باتوں میں سے جن کی تشریح ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اور انسان کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ اس کو تدبیر منازل اور ذرائع معاش کے ساتھ مملکت کا نظم وانتظام بھی الہام کیا جائے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ دیگر حیوانات کو بوقت احتیاج فطری طور پر الہام کیا جاتا ہے۔ اور انسان فطری طور پر الہام نہیں کیا گیا ہے مگر علوم معاش کے تھوڑے سے حصہ میں، جیسے دودھ پیتے وقت پستان کا چوسنا اور آواز میں خشونت کے وقت کھانسنا، اور دیکھنے کا ارادہ کرنے پر پلکیں کھولنا اور اس طرح کی اور باتیں۔

اور یہ بات اس لئے ہے کہ انسان کا خیال بڑا کاریگر کارگذار ہے، پس اسی کو تدبیر المنازل اور تدبیر مُدُن (نظم مملکت) کے علوم سونپ دیئے گئے ہیں ریت رواج کی طرف، اور ان حضرات کی پیروی کی طرف جو ملکوتی انوار کے ساتھ تائید کئے ہوئے ہیں ان علوم میں جو ان کی طرف وحی کئے گئے ہیں، اور تجربہ کی طرف، اور غیبی تدبیر کے انتظار کی طرف، اور جائزہ لینے کے ذریعہ اور قیاس وبرہان کے ذریعہ امور میں غور وفکر کرنے کی طرف۔

(سوال مقدر کا جواب) اور انسان کا (یا علم انسانی کا) حال امر عام (فیضان خداوندی) کے حاصل کرنے میں جس

کا فیضان خالق صُور کی طرف سے واجب (ثابت) ہے اُس اختلاف کے ساتھ جو لوگوں کی استعداد کی جانب سے پیدا ہونے والا ہے، اُن واقعات کے حال جیسا ہے جن کو خواب میں حاصل کیا جاتا ہے۔ بہائے جاتے ہیں اُن پر بالائی علوم ان کی جگہوں سے، پس متشکل ہوتے ہیں وہ لوگوں کے پاس مناسب شکلوں میں۔ پس صورتیں مختلف ہوتی ہیں، مُفاض علیہ میں پائی جانے والی وجہ سے، نہ کہ مُفیض میں پائی جانے والی وجہ سے۔

لغات وتشریحات:

تَدَفَّأ: گرم ہونا...... الوَبَر: اونٹ اور خرگوش وغیرہ کے بال جمع أوْبَار...... تَعَیُّش: اسبابِ زندگی کے لئے کوششیں کرنا...... البُحّة: آواز میں بھاری پن اور خشونت...... صَنَّاع: بڑا کاریگر...... هَمَّام: بڑا کارگذار هَمَّ بالشيئِ: ارادہ کرنا، چاہنا...... الرَّوِيَّة: امور میں غور وفکر کرنا...... المراد بالأمر الشايع هو العلم المفاض على الناس، أعم من أن يكون حدادة أو حِراثة أو نِجارة أو غيرها اهـ (سندیؒ)...... والواجب بمعنى الثابت يعني أن الإنسان يتلقى العلم الشايع المساوى، الثابتَ فيضانه من الله تعالى، ولا اختلاف فيه، وإنما الاختلاف في أفراد الناس من قِبَلِ استعدادهم، فإن الله سبحانه وتعالى ينزل العلم من حظيرة القدس على الناس، فمن كان فيه استعداد الحدادة يصير حدادًا، ومن كان فيه استعداد الحراثة يصير حارثًا، وهكذا اهـ (سندیؒ)



متعدی گناہوں کے اقسام اور ان کی حرمت کا فیضان

انسان کے تمام افراد پر، خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، شہری ہوں یا بدوی، جن علوم کا فیضان کیا گیا ہے، ان میں ایسی خصلتوں کی حرمت کا علم بھی ہے جو شہروں (مملکت) کا نظام تباہ کرنے والی ہیں، اگرچہ ادراک کے طریقے مختلف ہیں مگر تمام لوگ اپنے اپنے طریقہ پر ان باتوں کی قباحت وحرمت کو سمجھتے ہیں ــــ مملکت کا نظام درہم برہم کرنے والے گناہ تین قسم کے ہیں: (۱) شہوانی گناہ (۲) درندگی (ظلم) والے گناہ (۳) وہ گناہ جو بدمعاملگی کا نتیجہ ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

شہوانی گناہ: زنا اور ہم جنس پرستی:

تمام انسانوں میں شہوت، غیرت اور حرص کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور صنفِ نازک کی طرف نظر اٹھانے میں اور بیوی کے معاملہ میں مزاحمت برداشت نہ کرنے میں قوی مردوں کا حال سانڈ جانوروں جیسا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ سانڈ ایسے مواقع میں باہم لڑتے ہیں۔ تا آنکہ زیادہ مضبوط پکڑ والا اور زیادہ تیز طبیعت والا غالب آجاتا ہے اور کم تر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور اگر وہ جفتی کا مشاہدہ نہیں کرتا تو اس میں مزاحمت کا شعور ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر

انسان زیرک بڑا تاڑنے والا ہے، وہ اس طرح انکل کرتا ہے کہ گویا وہ دیکھ رہا ہے اور سن رہا ہے، اس لئے صحبت دیکھنا نہ دیکھنا اس کے حق میں یکساں ہے۔ مگر وہ الہام کیا گیا ہے کہ اس بات کی وجہ سے باہم لڑنا مملکت کو ویران کرنے والا ہے۔ کیونکہ تمدن کی بنیاد باہمی تعاون پر ہے اور نزاع تعاون کی راہیں مسدود کر دیتا ہے۔ نیز تمدن میں عورتوں کی بہ نسبت قوی مردوں کا زیادہ دخل ہے، اس لئے مردوں کا باہم لڑنا تباہ کن ہے۔ اس لئے انسان کو قدرت نے یہ بات الہام کی ہے کہ وہ عورت کے ساتھ اختصاص پیدا کرے اور اس کو بیوی بنائے اور اپنے بھائی کی بیوی میں مزاحمت نہ کرے یہی حرمت زنا کی بنیادی وجہ ہے ــــــ رہی عورت کے ساتھ اختصاص پیدا کرنے کی صورت تو وہ ریت رواج اور مخصوص عائلی قوانین (پرسنل لا) کے حوالہ کی گئی ہے۔ اقوام کے قوانین اور ریت رواج اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔

اسی طرح فطرت کی سلامتی عورتوں ہی میں رغبت رکھتی ہے اور قوی مرد اس معاملہ میں بھی سانڈ جانوروں کی طرح ہیں، چوپائے اس طرح کی توجہ مادینوں کی طرف ہی کرتے ہیں۔ البتہ بعض مردوں پر ردی شہوت غالب آ جاتی ہے، جیسے بعض لوگوں کو مٹی اور کوئلہ کھانے میں لذت محسوس ہوتی ہے، ایسے لوگ فطرتِ سلیمہ سے نکل جاتے ہیں۔ پھر کوئی تو اغلام پرست بن جاتا ہے اور کسی میں مفعولیت کی خواہش ابھر آتی ہے اور اُن کو ایسے کام میں مزہ آنے لگتا ہے جو فطرت سلیمہ کے خلاف ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان لوگوں کا مزاج بدل جاتا ہے اور دلوں میں بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایسے عمل میں منہمک ہو جاتے ہیں جو نسل کو قطع کرنے والا ہے۔ قدرت نے انسان میں شہوت اسی لئے پیدا کی ہے کہ اس سے نسل پھیلے مگر بداطوار لوگ فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

غرض اس فعل شنیع کی قباحت بھی لوگوں کے دلوں میں مضبوط گڑی ہوئی ہے۔ بدکار لوگ اگرچہ یہ حرکت کرتے ہیں اور اس کی قباحت کا اعتراف نہیں کرتے، لیکن اگر وہ اس فعل کی طرف منسوب کئے جائیں تو وہ شرم کے مارے مرجاتے ہیں۔ الا یہ کہ ان کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو گئی ہو، تو یہ حرکت علی الاعلان کرتے ہیں اور ذرا نہیں شرماتے۔ جب بے حیائی کا یہ مرحلہ آجاتا ہے تو ان کو سزا ملنے میں دیر نہیں لگتی جیسا کہ لوط علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا، اور یہ حرمتِ لواطت کی بنیادی وجہ ہے۔

فمن العلوم الفائضة على أفراد الإنسان جميعاً: عربِهِمْ وعجمِهِم، حَضَرِهم وبَدْوِهم– وإن اختلف طريقُ التلقي منهم– حرمةُ خصالٍ تدمّرُ نظامَ مُدُنِهِمْ، وهي ثلاثة أصناف: منها أعمالٌ شَهَوِيَّةٌ، ومنها أعمال سَبُعية، ومنها أعمال ناشئة من سوء الأخذ في المعاملات.

والأصل في ذلك: أن الإنسان متواردُ أبناء نوعه في الشهوة والغيرة والحرص؛ والفحولُ منهم يُشْبِهُوْنَ الفحولَ من البهائم في الطُّموح إلى الإناث، وفي عدم تجويز المزاحمة على الموطوءة، غير أن الفحولَ من البهائم تتحارب، حتى يغلب أشدُّها بطشا، وأحدُّها نفسًا، وينهزمُ مادون ذلك، أولا تَشْعُرُ بالمزاحمة لعدم رؤيةِ المسافَدةِ، والإنسانُ الْمَعِيُّ: يَظُنُّ الظَّنَّ

كـأنه يرى ويسمع، وأُلهم أن التحاربَ لأجل ذلك مُدَمِّرٌ لِـمُدُنهم، لأنهم لايتمدَّنون إلا بتعاون من الـرجـال، والفحولُ أَدْخَـلُ فـي التـمـدن مـن الإنـاث، فـأُلهـم إنشاءَ اختصاصِ كلِّ واحد بـزوجتـه،وتركِ المزاحمة فيما اخْتُصَّ به أخوه؛ وهذا أصلُ حرمة الزنا؛ ثم صورة الاختصاص بالزوجات أمرٌ موكولٌ إلى الرسم والشرائع.

والـفـحـولُ مـنهم أيضًا يُشْبِهُوْنَ الفحولَ من البهائم، من حيث أن سلامةَ فطرتهم لا تقتضى إلا الرغبةَ في الإناث دون الرجال، كما أن البهائم لا تلتفت هذه اللَّفْتَةَ إلا قِبَلَ الإناث، غير أن رجالاً غـلبتهـم الشهـوة الفاسدة، بمنزلة من يتلذذ بأكل الطين والحُمَمَةِ، فانسَلَخُوْا من سلامة الفطرة، يَـقـضـى هـذا شهوتَه بالرجال، وذلك صارَ مأبونا يستلذ مالا يستلذه الطبع السليم، فأعقب ذلك تـغيـرًا لأمـزجتهـم، ومرضًا في نفوسهم، وكان مع ذلك سببا لإهمال النسل،من حيث أنهم قضوا حـاجتهـم التـى قَيَّضَ اللّٰه تعالى عليهم منهم ليذرأَ بهـا نسـلَهـم، بغير طريقها، فغيروا النظامَ الذى خـلـقهـم الـلّٰه تعالى عليه، فصار قبحُ هذه الفعلة مُنْدَمَجًا فى نفوسهم، فلذلك يفعلها الفساق، ولا يعترفون بها، ولو نُسبوا إليها لماتوا حياءً، إلا أن يكون انسلاخًا قويًا فيجهرون ولايستحيون، فلا يتراخى أن يُعاقَبوا، كما كان فى زمن سيدنا لوط عليه السلام؛ وهذا أصلُ حرمةِ اللِّوَاطَةِ.

ترجمہ: پس ان علوم میں سے جو فائض ہونے والے ہیں انسانوں کے بھی افراد پر، عربوں پر بھی اور عجمیوں پر بھی، شہریوں پر بھی اور بدویوں پر بھی —— اگرچہ ان کے (علوم کو) حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہیں —— ایسی خصلتوں کی حرمت ہے جو ان کے شہروں (مملکت) کا نظام درہم برہم کردیتی ہیں۔ اور وہ تین قسمیں ہیں: بعض شہوانی اعمال ہیں، اور بعض درندگی والے اعمال ہیں، اور بعض ایسے اعمال ہیں جو بدمعاملگی سے پیدا ہوتے ہیں۔

اور بنیادی بات: اس سلسلہ میں یہ ہے کہ انسان اپنے ابنائے نوع کے ساتھ باہم ایک جگہ اترنے والے ہیں (یعنی متفق ہیں) شہوت، غیرت اور حرص میں۔ اور انسانوں میں سے قوی مرد، چوپایوں میں سے نروں کے مشابہ ہیں مادہ کے طرف نظر اٹھانے میں اور موطوءہ میں مزاحمت برداشت نہ کرنے میں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ چوپایوں میں سے نر جانور باہم لڑتے ہیں، یہاں تک کہ غالب آجاتا ہے ان میں سے جو زیادہ مضبوط پکڑ والا ہے اور جو زیادہ تیز طبیعت والا ہے، اور شکست کھاجاتا ہے جو ان باتوں میں کم تر ہے۔ یا ان میں مزاحمت کا شعور پیدا نہیں ہوتا جفتی نہ دیکھنے کی وجہ سے۔ اور انسان زیرک ہے، وہ اس طرح اٹکل کرتا ہے کہ گویا وہ دیکھ رہا ہے اور سن رہا ہے یعنی شک اور اندازے سے بھی غیرت میں مبتلا ہوجاتا ہے اور وہ الہام کیا گیا ہے کہ اس بات کی وجہ سے باہم لڑنا ان کے شہروں کو ویران کرنے والا ہے۔ اس لئے کہ لوگ متمدن نہیں ہوسکتے مگر مردوں کے باہمی تعاون سے۔ اور تمدن میں عورتوں کی بہ نسبت قوی مردوں

کا زیادہ دخل ہے۔ پس انسان الہام کیا گیا ہر ایک کا اختصاص پیدا کرنے کا اس کی بیوی کے ساتھ، اور مزاحمت نہ کرنے کا اس عورت میں جس کے ساتھ اس کا بھائی خاص کیا گیا ہے۔ اور یہ حرمتِ زنا کی بنیاد ہے ـــــ پھر بیویوں کے ساتھ اختصاص کی صورت (تو وہ) ایک ایسی چیز ہے جو ریت رواج اور قوانین (پرسنل لا) کے حوالے کر دی گئی ہے۔

اور نیز انسانوں میں سے قوی مرد، چوپایوں میں سے نروں کے مشابہ ہیں، اس اعتبار سے کہ انسانوں کی فطرت کی سلامتی نہیں چاہتی ہے مگر عورتوں میں رغبت کو، نہ کہ مردوں میں، جس طرح یہ بات ہے کہ چوپایے یہ التفات بالکل ہی نہیں کرتے ہیں مگر مادینوں کی طرف۔ البتہ یہ بات ہے کہ بعض مردوں پر شہوت فاسدہ غالب آجاتی ہے، جس طرح بعض لوگوں کو مٹی اور کوئلہ کھانے میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ پس وہ لوگ فطرتِ سلیمہ سے نکل جاتے ہیں۔ یہ اپنی شہوت مردوں سے پوری کرتا ہے اور وہ مفعولیت کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اس چیز کو لذیذ سمجھتا ہے جس کو سلیم فطرت لذیذ نہیں سمجھتی۔ پس یہ چیز پیچھے لاتی ہے ان کے مزاجوں میں تبدیلی کو، اور ان کے دلوں میں بیماری کو، اور وہ بات اس کے ساتھ نسل کو رائیگاں کرنے کا سبب ہوتی ہے اس اعتبار سے کہ ان لوگوں نے پوری کی اپنی اس حاجت کو جو اللہ تعالیٰ نے ان پر مقدر کی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کی نسل کو بڑھائیں، اس کے طریقہ کے برخلاف، پس انھوں نے اس نظام کو بدل دیا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے ـــــ پس اس فعلِ شنیع کی قباحت مضبوط گڑی ہوئی ہوگئی لوگوں کے دلوں میں، پس اسی وجہ سے ارتکاب کرتے ہیں اس کا بدکار لوگ، اور اس کی (قباحت کا) اعتراف نہیں کرتے ہیں، اور اگر منسوب کئے جائیں وہ اس فعل کی طرف تو مرجائیں وہ شرم کے مارے، الا یہ کہ ہو (فطرت سلیمہ سے) نہایت قوی نکلنا، پس علی الاعلان کرتے ہیں وہ اور نہیں شرماتے ہیں۔ پس در نگ نہیں ہوتی کہ سزا دیے جاتے ہیں وہ جیسا کہ لوط علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا، اور یہ لواطت کی حرمت کی اصل وجہ ہے۔

لغات وتشریحات:

متوارد ابناء نوعه أى مشاركهم ومزاحمهم، **تَوَارَدُوْا الماءَ**: پانی پر اکٹھا پہنچنا...... **طَمَحَ**(ف) **طَمْحًا وطموحا بصرَهُ إليه**: نگاہ اٹھنا...... **هذه الـلفتة** أى نظر الشهوة...... **يستلذ** أى كل واحد...... **أعقب ذلك** أى أورث...... **قَيَّضَ اللّٰهُ له كذا**: مقدر کرنا...... **ذَرَأَ**(ف) **ذَرَأَ اللّٰهُ الخلقَ**: پیدا کرنا...... **بغير طريقها** متعلق ہے **قضوا** سے...... **اِنْدَمَجَ فِيْ الشيئِ**: مضبوط گڑ جانا...... **إلا أن يكون** أى الانسلاخ.

☆ ☆ ☆

شراب کے نشہ میں چور رہنے کی حرمت

انسانوں کی معاش (حصولِ رزق) اور گھریلو زندگی کا انتظام اور مملکت کی حسن تدبیر عقل وتمیز پر موقوف ہے۔ اور شراب

کے نشہ میں دُھت رہنا نظام میں بڑا رخنہ، باہمی جنگ وجدال اور کینہ پیدا کرتا ہے، مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی عقلوں پر ردی شہوت غالب آجاتی ہے اور وہ اس رذیل عادت کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں اور وہ تدبیرات نافعہ کو بگاڑ دیتے ہیں، چنانچہ لوگوں میں ہمیشہ سے یہ طریقہ چل رہا ہے کہ وہ ایسے بدمست لوگوں کو ان کی حرکتوں سے روکتے ہیں اور سخت سزائیں دیتے ہیں، تاکہ لوگ تباہ نہ ہوجائیں۔ مخموریت کی حرمت کی اصل وجہ یہی ہے —— رہی مطلق شراب پینے کی ممانعت خواہ قلیل ہو یا کثیر تو اس کی وجہ قسم ثانی کے آخر میں المسکرات کے عنوان سے آئے گی۔

ومعاشُ بني آدم وتدبيرُ منازلهم وسياسةُ مُدُنهم لايتم إلا بعقل وتمييز، وإدمانُ الخمر ترجع إلى نظامهم بِخَرْمٍ قوى، ويُورث محارباتٍ وضغائنَ، غير أن أنفسا غلبت شهوتُهم الرديئة على عقولهم، أقبلوا على هذه الرذيلة، وأفسدوا عليهم ارتفاقاتِهِمْ،فلو لم يَجْرِ الرسمُ بمنعٍ عن فَعلتهم تلك لهلك الناس؛ وهذا أصلُ حرمةِ إدمان الخمر؛ وأما حرمةُ قليلها وكثيرها فلا يُبَيَّن إلا في مبحث الشرائع.

ترجمہ: اور انسانوں کی معیشت اور ان کے گھروں کا انتظام اور ان کے شہروں کی حسن تدبیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی مگر عقل وتمیز کے ذریعہ۔ اور شراب کے نشہ میں دُھت رہنا لوٹتا ہے ان کے نظام کی طرف مضبوط دراڑ کے ساتھ، اور پیدا کرتا ہے باہمی جدال اور کینوں کو، تاہم کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی عقلوں پر ان کی رڈی شہوت غالب آجاتی ہے، وہ اس رذیل عادت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگوں پر ان کی تدبیرات نافعہ کو بگاڑ دیتے ہیں۔ پس اگر جاری نہ ہوتی ریت ان کو اس حرکت سے روکنے کی تو لوگ تباہ ہوجاتے اور یہ شراب کے نشہ میں مخمور رہنے کی حرمت کی بنیاد ہے —— اور رہی قلیل وکثیر شراب کی حرمت تو وہ قوانین شرعیہ کی بحث ہی میں بیان کی جائے گی۔

لغات: أَدْمَنَ الشيئَ: ہمیشہ کرنا مُدْمِنُ الخمر: ہمیشہ شراب پینے والا...... خَرَمَ (ن) خَرْمًا: شگاف ڈالنا، سوراخ کرنا۔



ضرب وقتل کی حرمت

قوی مردوں کو بھی سانڈ جانوروں کی طرح اس شخص پر سخت غصہ آتا ہے جو ان کو مطلوب سے روکتا ہے یا جو ان کو نفسانی یا جسمانی تکلیف پہنچاتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ جانور محسوس یا خیالی مطلوب ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انسان خیالی اور عقلی مطلوب کے لئے بھی کوشاں ہوتا ہے۔ اور انسان کی آز (حرص) چوپایوں کی آز سے قوی تر ہوتی

ہے،مگر چوپایے غضب ناک ہونے پر باہم لڑتے ہیں تا آنکہ ایک شکست کھا جاتا ہے، پھر وہ کینہ بھول جاتا ہے۔البتہ بعض کینہ پرور جانور جیسے اونٹ، بیل اور گھوڑے میں سے سانڈ کینہ یاد رکھتے ہیں اور انسان کا حال یہ ہے کہ اس کے دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کو بھولتا نہیں، پس اگر جانوروں کی طرح انسانوں میں بھی ضرب وقتل اور جنگ وجدال کا دروازہ کھولدیا جاتا تو ان کا ملکی نظام تباہ ہوجاتا اور ان کی معیشت درہم برہم ہوجاتی،اس لئے ان کو قتل وضرب کی حرمت کا الہام کیا گیا —— البتہ کسی بڑی مصلحت سے قتل وضرب روا رکھا گیا ہے، جیسے قصاص وغیرہ۔

والفحولُ منهم يُشْبِهُوْنَ الفحولَ من البهائم في الغضب على من يَصُدُّه عن مطلوبٍ، ويُجرى عليه مُؤلِمًا في نفسه أو في بدنه، لكن الفحولَ من البهائم لا تتوجه إلا إلى مطلوب محسوس أو متوهم، والإنسانُ يطلب المتوهمَ والمعقولَ، وحرصُه أشد من حرص البهائم،وكانت البهائم تتقاتل حتى ينهزم واحد، ثم ينسى الحقدَ، إلا ما كان من مثل الفحول من الإبل والبقر والخيل، والإنسانُ يَحْقِد ولا ينسى، فلو فُتح فيهم بابُ التقاتُل لفسدت مدينتُهم، واختلَّت معايِشُهم فألهموا حرمةَ القتل والضرب، إلا لمصلحة عظيمة من قصاص ونحوه.

ترجمہ: اور انسانوں میں سے قوی مرد، چوپایوں میں سے نروں کے مشابہ ہیں برہم ہونے میں اس شخص پر جو اس کو مطلوب سے روکتا ہے اور جو اس پر جاری کرتا ہے تکلیف دہ چیز کو اس کی جان میں یا بدن میں۔مگر سانڈ چوپایے نہیں متوجہ ہوتے مگر محسوس یا خیالی مطلوب کی طرف، اور انسان کو شاں ہوتا ہے خیالی اور عقلی مطلوب کی طرف (بھی) اور انسان کی آز چوپایوں کی آز سے قوی تر ہے۔اور چوپایے باہم لڑتے ہیں تا آنکہ ایک شکست کھاتا ہے، پھر وہ کینہ بھول جاتا ہے،مگر وہ کینہ جو ہوتا ہے اونٹ، بیل اور گھوڑے میں سے سانڈ جیسوں سے۔اور انسان کینہ رکھتا ہے اور بھولتا نہیں۔پس اگر انسانوں میں باہم جنگ وجدال کا دروازہ کھول دیا جائے تو ان کی مملکت تباہ ہوجائے گی اور ان کی معیشت درہم برہم ہوجائے گی، پس وہ الہام کئے گئے قتل اور مار کی حرمت کے —— مگر کسی بڑی مصلحت سے، جیسے قصاص اور اس کے مانند۔



زہر خورانی، جادو سے مارنے اور بغاوت کی تہمت لگا کر حکومت میں مخبری کرنے کی حرمت

بعض لوگوں کے سینوں میں کینہ جوش مارتا ہے،جس طرح مذکورہ لوگوں کے دلوں میں غصہ بھڑکتا ہے۔مگر وہ قتل کرنے کی ہمت نہیں کرتے، کیونکہ انہیں قصاص کا یا سزا کا ڈر ہوتا ہے، پس وہ یہ حرکت کرتے ہیں کہ کھانے میں زہر ملاتے ہیں یا جادو کے ذریعہ مار ڈالتے ہیں، حالانکہ ان کا حال بھی قتل جیسا ہی ہے، بلکہ اس سے بھی سخت تر ہے۔کیونکہ

قتل ایک کھلی ہوئی حرکت ہے اس سے بچنا ممکن ہے اور ان حرکتوں سے بچنا ممکن نہیں اور بعض لوگ بغاوت کی جھوٹی تہمت لگا کر حاکم سے مخبری کرتے ہیں تا کہ حاکم اس کو قتل کر دے۔ پس یہ بھی قتل جیسا ہی گناہ ہے۔

> وهاج من الحِقْد في صدور بعضهم مثلَ ما هاج في صدور الأولين، وخافوا القصاص، فانحدروا إلى أن يَدُسُّوا السُّمَّ في الطعام، أو يقتلوا بِسِحْرٍ، وهذا حاله بمنزلة حال القتل، بل أشد منه، فإن القتل ظاهر يمكن التخلُّصُ منه، وهذه لايمكن التخلص منها، وانحدروا أيضًا إلى القذف والمشي به إلى ذي سلطان ليقتل.

ترجمہ: اور ان کے بعض کے سینوں میں بھڑکتا ہے کینہ میں سے، ویسا جیسا بھڑکتا ہے اگلوں کے سینوں میں۔ اور ڈرتے ہیں وہ قصاص سے، پس اترتے ہیں وہ اس بات کی طرف کہ وہ زہر ملائیں کھانے میں یا مار ڈالیں جادو سے۔ اور اس کا حال قتل کے حال جیسا ہے بلکہ اس سے سخت ہے۔ اس لئے کہ قتل ایک کھلی ہوئی حرکت ہے، اس سے بچنا ممکن ہے اور یہ حرکت: اس سے بچنا ممکن نہیں۔ اور اترتے ہیں نیز (بغاوت کی) تہمت لگانے کی طرف اور اس کو حاکم کے سامنے پیش کرنے کی طرف تا کہ وہ قتل کرے۔ **قوله: في صدور الأولين أي في صدور القاتلين ١هـ سندي۔**



بدمعاملگی سے پیدا ہونے والے نو گناہوں کی حرمت

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے معیشت کے یہ طریقے مقرر فرمائے ہیں: زمین سے مباح چیزیں چننا، گلہ بانی، کھیتی باڑی، کاریگریاں، تجارت، ملک وملت کی تنظیمی خدمات ـــــ ان کے علاوہ دیگر دھندوں کا عمرانی زندگی میں کوئی دخل نہیں، مگر بعض لوگ ضرررساں دھندے کرنے لگتے ہیں، جیسے چوری اور غصب۔ اس طرح کے دھندے مملکت کے لئے تباہ کن ہیں۔ اس لئے لوگوں کو ان کی حرمت الہام کی گئی اور تمام بنی آدم ان کی حرمت پر متفق ہیں۔ اگرچہ نافرمان لوگ، جب سرکشی کا بھوت ان پر سوار ہوتا ہے، تو وہ یہ دھندے کرتے ہیں۔ اور تمام انصاف پرور بادشاہ ان کا قلع قمع کرنے کی اور ان کو مٹانے کی بھرپور سعی کرتے ہیں۔

اور جب بعض لوگوں نے دیکھا کہ حکومتیں ان حرکتوں کی روادار نہیں ہیں تو وہ جھوٹے دعووں، گواہیوں اور قسموں کے ذریعہ لوگوں کا مال ہڑپ کرنے لگے یا ناپ تول میں کمی کر کے یا سٹہ کے ذریعہ یا چند در چند بڑھایا ہوا سود لے کر لوگوں کے اموال پر ظالمانہ قبضہ کرنے لگے۔ حالانکہ ان چیزوں کا حکم چوری اور غصب ہی کی طرح ہے۔ اسی طرح حکومتوں کا کمرتوڑ ٹیکس وصول کرنا بھی رہزنی جیسا ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔

والمعايش التي جعلها الله تعالى لعباده إنما هي الالتقاطُ من الأرض المباحة، والرَّعْيُ والزِّراعة والصِّناعة والتِّجارة، وسياسةُ المدينة والملة، وكلُّ كسب تجاوز عنها فإنه لا مدخل له في تمدنهم، وانحدر بعضهم إلى أكساب ضارَّة كالسرقة والغصب، وهذه كلها مدمِّرةٌ للمدينة، فأُلهموا أنها محرمة، واجتمع بنو آدم كلهم على ذلك، وإن باشرها العصاة منهم في غُلْواءِ نفوسهم؛ وسَعَى الملوكُ العادلة في إبطالها ومَحْقها، واستشعر بعضُهم سَعْيَ الملوك في إبطالها، فانحدروا إلى الدعاوى الكاذبة واليمين الغموس وشهادة الزور، وتطفيف الكيل والوزن والقمار والربا أضعافًا مضاعفة، وحكمها حكم تلك الأكساب الضارة، وأخذ العشر المُنْهِك بمنزلة قطع الطريق، بل أقبح.

ترجمہ: اور معاش کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے مقرر فرمائے ہیں، وہ صرف یہ ہیں: مباح زمین سے چیزیں چننا، اور گلہ بانی، اور کھیتی باڑی اور کاریگری اور تجارت اور ملک وملت کا انتظام کرنا۔ اور ہر وہ دھندا جو ان کے علاوہ ہے پس بیشک اس کا کوئی دخل نہیں ہے لوگوں کی عمرانی زندگی میں۔ اور اُتر پڑے بعض لوگ مضرت رساں دھندوں کی طرف جیسے چوری اور غصب اور یہ تمام پیشے مملکت کے لئے تباہ کن ہیں۔ پس لوگ الہام کئے گئے کہ یہ سب دھندے حرام ہیں اور تمام بنی آدم اس پر متفق ہیں، اگرچہ ان میں سے نافرمان لوگ ان دھندوں کو کرتے ہیں اپنے نفوس کی سرکشی میں۔ اور انصاف پرور بادشاہ کوشش کرتے ہیں ان کو قلع قمع کرنے کی اور ان کو مٹانے کی ——— اور جب بھانپ لیا بعض لوگوں نے بادشاہوں کے کوشش کرنے کو ان کے قلع قمع کرنے میں تو اتر پڑے وہ جھوٹے دعووں اور جھوٹی قسموں اور جھوٹی گواہی اور ناپ تول میں کمی کرنے اور سٹہ اور چند در چند بڑھایا ہوا سود لینے کی طرف۔ اور ان چیزوں کا حکم ان ضرر رساں دھندوں (چوری اور غصب) کے حکم کی طرح ہے۔ اور کمر توڑ ٹیکس کا لینا رہزنی جیسا ہے، بلکہ اس سے بھی برا ہے۔

لغات وتشریحات: المعایش جمع المعیشة: زندگی کا ذریعہ ...... الغُلْواء: حد سے گذرنا ...... المنهك (اسم فاعل) انهكه: سخت سزا دینا۔ اصل میں النهك تھا، تصحیح مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اور مخطوطہ پٹنہ میں بھی اسی طرح ہے۔

☆ ☆ ☆

مذکورہ بالا گناہوں کا وبال

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ مذکورہ بالا وجوہ سے، مذکورہ بالا ستر ہ امور کی حرمت لوگوں کے دلوں میں پیوست ہوگئی۔ اور جو لوگ کامل عقل اور درست رائے رکھتے ہیں اور مصلحتِ کلی (مفاد عامہ) سے بخوبی واقف ہیں، وہ ہر دور میں لوگوں کو ان معاصی سے روکتے رہے ہیں، حتی کہ وہ نکیر عام ریت بن گئی ہے اور وہ حرمت دیگر عام مشہور چیزوں کی طرح بدیہیاتِ اوّلیہ میں داخل ہو چکی ہے۔ پس اس صورتِ حال میں جب کوئی شخص ان میں سے کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو ان کامل

عقل والوں اور درست رائے والوں اور مصلحت کلی کو جاننے والوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا ایک رنگ ملأ اعلی کی طرف چڑھتا ہے، جس طرح ان کی طرف یہ الہام اترا تھا کہ یہ امور حرام ہیں اور معاشرہ اور مملکت کے لئے نہایت ضرر رساں ہیں۔

غرض جب کوئی انسان ان معاصی میں سے کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو ملأ اعلی کو تکلیف پہنچتی ہے، کیونکہ ملائکہ کا تعلق انسان سے ایسا ہی ہے، جیسا ہماری ادراک کرنے والی صلاحیتوں (عقل وفہم) کا ہم سے تعلق ہے، جس کی تفصیل مبحث اول کے باب ہشتم میں گذر چکی ہے۔ پس جس طرح چنگاری پر پیر پڑنے سے فوراً قوی ادراکیہ متاثر ہوتے ہیں اور اذیت پاتے ہیں، اسی طرح ان معاصی کے ارتکاب سے ملائکہ متاثر ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح قوی ادراکیہ سے شعائیں نکل کر طبیعت کو غمگین کرتی ہیں، ملائکہ کے اذیت پانے سے بھی شعاعیں چلتی ہیں جو اس گنہ گار کو گھیر لیتی ہیں۔ اور ملأ سافل اور زمینی مخلوقات میں سے جن میں استعداد ہوتی ہے ان کے قلوب میں داخل ہوتی ہیں کہ وہ اس گنہ گار کو اذیت پہنچائیں، اگر اذیت پہنچانا ممکن ہو اور نوشتۂ تقدیر اجازت دے یعنی اسباب معارض نہ ہوں۔ اور نوشتۂ تقدیر سے مراد وہ چار باتیں ہیں جو شکم مادر میں روح پڑنے کے وقت فرشتہ لکھتا ہے، جو اصطلاح شریعت میں ''ملائکہ کا الہام'' کہلاتی ہیں اور جو علم نجوم میں احکام طالع (نصیبہ کے احکام) کہلاتے ہیں کہ اس کی روزی کتنی ہے؟ موت کب آئے گی؟ مدت عمر کیا ہے؟ اور وہ نیک بخت ہے یا بد بخت؟ اگر اس نوشتۂ تقدیر کا اور احکام طالع کا جزاء سے تعارض ہوتا ہے تو دنیا میں جزا مؤخر کردی جاتی ہے۔ پھر جب اس کی موت آتی ہے اور موانع مرتفع ہوجاتے ہیں تو خالق تعالی اس کو سزا دینے کیلئے فارغ ہوجاتے ہیں۔ سورۃ الرحمٰن آیت ۳۱ میں ارشاد ہے کہ: ''اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہورہے ہیں'' اس وقت اللہ تعالیٰ اس گنہ گار کو پوری پوری سزا دیتے ہیں۔

وبالجملة: فلهذه الأسباب دخلت في نفوس بني آدم حرمةُ هذه الأشياء، وقام أقواهم عقلاً، وأسدُّهم رأيا، وأعلمُهم بالمصلحة الكلية يمنع عن ذلك طبقة بعد طبقة، حتى صار رسما فاشيا، ودخلت في البديهيات الأَوَّلية، كسائر المشهورات الذائعة، فعند ذلك رجع إلى الملأ الأعلى لونٌ منهم، حَسْبَمَا كان انحدر إليهم من الإلهام: أن هذه مُحَرَّمَةٌ، وأنها ضارَّةٌ أشدَّ الضرر، فصاروا كلما فعل واحد من بني آدم شيئًا من تلك الأفعال تَأَذَّوْا منه مثلَ ما يضع أحدنا رِجلَه على جمرة، فتنتقل إلى القوى الإدراكية في تلك اللمحة، وتتأذى منه، ثم صار لتأذيها خطوط شعاعية تحيط بهذا العاصي، وتدخل في قلوب المستعدين من الملائكة وغيرهم: أن يُؤْذُوه إذا أمْكن إيذاؤُه، ورَخَّصتْ فيه مصلحتُه المكتوبةُ عليه، المسماة في الشرع بإلهام الملائكة: مارزقه؟ وما أجله؟ وما عمره؟ وشقي أوسعيد؟ وفي النجوم بأحكام الطالع؛ حتى إذا مات، وهَدَأَتْ عنه هذه المصلحة، فرغ له بارئُه، كما قال: ﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ﴾ وجازاه الجزاءَ الأوفى، والله أعلم.

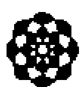
ترجمہ: اور حاصل کلام: پس ان اسباب کی وجہ سے، انسانوں کے دلوں میں، ان چیزوں کی حرمت داخل ہوگئی۔ اور

اٹھ کھڑا ہوا اُن میں سے قوی ترین عقل والا اور درست ترین رائے والا اور مصلحتِ کلی کو بہت زیادہ جاننے والا: روکتا ہے وہ ان چیزوں سے ہر دور میں، یہاں تک کہ وہ نکیر ایک عام ریت بن گئی اور ان کی حرمت بدیہیات اولیہ میں داخل ہوگئی، دیگر عام مشہور چیزوں کی طرح، پس اس وقت ان سمجھ داروں کا ایک رنگ ملأ اعلیٰ کی طرف لوٹا، جس طرح ان کی طرف الہام اترا تھا کہ یہ چیزیں حرام ہیں، اور یہ کہ یہ چیزیں سخت مضرت رساں ہیں۔ پس ہوگئے ملأ اعلیٰ، جب جب انسانوں میں سے کوئی شخص ان کاموں میں سے کوئی کام کرتا ہے تو وہ اذیت پاتے ہیں اس کام سے، جس طرح ہم میں سے کوئی شخص اپنا پاؤں رکھتا ہے کسی چنگاری پر، تو وہ چنگاری (یعنی اسکی تکلیف) اسی لمحہ ادراک کرنے والی صلاحیتوں کی طرف منتقل ہوجاتی ہے اور وہ قُوی اس سے اذیت محسوس کرتے ہیں۔

پھر ملأ اعلیٰ کے تکلیف اٹھانے کے لئے شعاعی خطوط ہوتے ہیں جو اس گنہ گار کو گھیر لیتے ہیں۔ اور وہ شعائیں ملائکہ وغیرہ میں سے استعداد رکھنے والوں کے قلوب میں گھستی ہیں تا کہ وہ اس کو اذیت پہنچائیں، جبکہ اس کو اذیت پہنچانا ممکن ہو، اور اس ایذا رسانی کی اجازت دیتی ہو اس کی وہ مصلحت جو اس پر لکھی جا چکی ہے، جو شریعت کی زبان میں ''ملائکہ کا الہام'' کہلاتی ہے کہ اسکی روزی کتنی ہے؟ اور اسکی موت کب آئے گی؟ اور اس کی زندگی کتنی ہے؟ اور نیک بخت ہے وہ یا بد بخت؟ اور جو علم نجوم میں احکام طالع (بخت کے احکام) کہلاتی ہے —— یہاں تک کہ جب وہ مرجاتا ہے اور اس سے یہ مصلحت تھم جاتی ہے (یعنی اسباب کا تعارض ختم ہوجاتا ہے) تو اس کیلئے اسکے خالق تعالیٰ فارغ ہوجاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ''عنقریب ہم تمہارے لئے فارغ ہورہے ہیں، اے دو بوجھل مخلوقو!'' اور بدلہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو پورا پورا بدلہ، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تشریحات: (۱) بدیہیات اوّلیہ: وہ قضایا ہیں کہ صرف موضوع ومحمول کے ذہن میں آنے سے عقل ان کو تسلیم کرلے، دلیل کی بالکل ضرورت نہ ہو، جیسے کُل جُز سے بڑا ہوتا ہے۔ (۲) **قوله: لون منهم أى من الذين هم أقوى عقلاً إلخ** (سندی) (۳) **فصاروا أى الملأ الأعلى وكذلك يرجع ضمير لتأذيها إلى الملأ الأعلى بتأويل الطائفة أو الجماعة.** (۴) **اِسْتَعَدَّ للأمر**: تیار ہونا **اَلْمُسْتَعِدّ**: تیار، باصلاحیت۔ (۵) طالع علم نجوم کی اصطلاح میں ستاروں کے طلوع سے شگون لینے کو کہتے ہیں اور کبھی زائچہ کو بھی طالع کہتے ہیں تفصیل کے لئے دستور العلماء ۲: ۳۱۶ و ۳۱۷ دیکھیں (۶) **قوله: فى النجوم** کا عطف **فى الشرع** پر ہے۔

بحمدہ تعالیٰ آج ۵ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ کو مبحث پنجم کی شرح مکمل ہوئی۔ درمیان میں ماہ رمضان وشوال میں برطانیہ کے سفر کی وجہ سے کام بند رہا **والحمد لله على كل حال وبنعمته تتم الصالحات. وصلى الله على النبي الكريم وعلى آله وصحبه أجمعين.**



اصطلاحات جن کی کتاب میں تشریح کی گئی ہے

شارح کے مختصر حالات

بقلم مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری: استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

ولادت باسعادت اور نام: آپ کی تاریخ ولادت محفوظ نہیں۔ البتہ والد محترم نے جب آپ ڈیڑھ، پونے دو سال کے تھے، ڈبھاڈ (آپ کا وطن) کی زمین خریدی تھی اس کا بیع نامہ موجود ہے اس کی رو سے والد صاحب نے اندازے سے آپ کا سن پیدائش ۱۹۴۰ء کا آخر مطابق ۱۹۹۷ سمت بکرمی مطابق ۱۳۶۰ھ بتایا ہے۔ آپ موضع کالیڑہ ضلع بناس کانٹھا (شمالی گجرات) میں پیدا ہوئے۔ بناس ایک ندی کا نام ہے اور کانٹھا گجراتی میں بمعنی کنارہ ہے۔ اور بناس کانٹھا ایک علاقہ کا نام ہے اور اب ایک ضلع ہے، جو بناس ندی کے جنوب میں واقع ہے، اس ضلع کا مرکزی شہر "پالن پور" ہے، جو آزادی سے پہلے مسلمان نواب کی اسٹیٹ تھی، کالیڑہ پالن پور سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر جنوب مشرق میں واقع ہے اور علاقہ پالن پور کی مشہور بستی ہے جہاں ایک عربی مدرسہ "مسلم العلوم" کے نام سے قائم ہے، جس میں متوسطات تک کی تعلیم ہوتی ہے۔

آپ کا نام والدین نے صرف احمد رکھا تھا۔ کیونکہ آپ کے ایک بڑے اخیافی بھائی احمد نامی ہیں، ان کی یاد تازہ کرنے کے لئے والدہ صاحبہ نے آپ کا نام بھی احمد رکھا تھا۔ سعید احمد آپ نے اپنا نام خود رکھا ہے، جب آپ نے مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا تو اپنا نام سعید احمد لکھوایا اس وقت سے آپ کی عالمی شہرت سعید احمد کے نام سے ہے، خاندان کے بڑے بوڑھے اب بھی آپ کو "احمد بھائی" کہتے ہیں، اگرچہ اب ایسے بوڑھے دو چار ہی رہ گئے ہیں۔

آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی یوسف دادا کا نام علی ہے جو احتراماً علی جی کہلاتے تھے۔ آپ کا خاندان ڈھکا اور برادری "مومن" ہے، جس کے تفصیلی احوال "مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینہ میں" مذکور ہیں۔

تعلیم و تربیت: جب آپ کی عمر پانچ، چھ سال کی ہوئی، تو والد صاحب نے جو ڈبھاڈ کے کھیتوں میں رہتے تھے آپ کی تعلیم کا آغاز فرمایا، لیکن والد مرحوم کھیتی باڑی کے کاموں کی وجہ سے موصوف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکتے تھے، اس لئے آپ کو اپنے وطن کالیڑہ کے مکتب میں بٹھا دیا، آپ کے مکتب کے اساتذہ یہ ہیں (۱) مولانا داؤد صاحب چودھری رحمہ اللہ (۲) مولانا حبیب اللہ صاحب چودھری زید مجدہم (۳) اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب جونکیہ رحمہ اللہ۔

مکتب کی تعلیم مکمل کر کے موصوف اپنے ماموں مولانا عبدالرحمٰن صاحب شیر اقدس سرہٗ کے ہمراہ "چھاپی" تشریف لے گئے، اور چھاپی میں اپنے ماموں اور دیگر اساتذہ سے فارسی کی ابتدائی کتابیں چھ ماہ تک پڑھیں، چھ ماہ کے بعد آپ کے ماموں دار العلوم چھاپی کی تدریس چھوڑ کر گھر آ گئے، تو آپ بھی اپنے ماموں کے ہمراہ جونی سیندھنی آ گئے، اور چھ ماہ تک اپنے ماموں سے فارسی کی کتابیں پڑھتے رہے۔

اس کے بعد مصلح امت حضرت مولانا محمد نذیر میاں صاحب پالن پوری قدس سرہٗ کے مدرسہ میں جو پالن پور شہر میں واقع ہے داخلہ لیا، اور چار سال تک حضرت مولانا مفتی محمد اکبر میاں صاحب پالن پوری اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاری

رحمہما اللہ سے عربی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں پڑھیں ـــــ مصلح امت حضرت مولانا نذیر میاں صاحب قدس سرۂ وہ عظیم ہستی ہیں، جنھوں نے اس آخری زمانہ میں مومن برادری کو بدعات وخرافات اور تمام غیر اسلامی رسوم سے نکال کر ہدایت وسنت کی شاہراہ پر ڈالا، آج علاقۂ پالن پور میں جو دینی فضا نظر آرہی ہے، وہ حضرت مولانا ہی کی خدمات کا ثمرہ ہے۔ اور حضرت مولانا محمد اکبر میاں صاحب آپ کے چھوٹے بھائی اور آپ کے دست راست تھے۔ اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاری: بخاری سے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے لئے تشریف لائے تھے، فراغت کے بعد پہلے پالن پور، پھر امدادالعلوم وڈالی گجرات، پھر جامعہ حسینہ راندیر (سورت) پھر دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی خدمات انجام دیں، اور آخر میں ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلے گئے، وہیں آپ کا انتقال ہوا، اور جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

مظاہر علوم میں داخلہ: شرح جامی تک پالن پور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے آپ نے ۱۳۷۷ھ میں سہارن پور (یو، پی) کا سفر کیا، اور مظاہر علوم میں داخلہ لے کر تین سال تک امام النحو والمنطق حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جموی قدس سرۂ سے نحو اور منطق وفلسفہ کی اکثر کتابیں پڑھیں، نیز حضرت مولانا محمد یامین صاحب سہارن پوری، حضرت مولانا مفتی یحیٰ صاحب سہارن پوری، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری رحمہم اللہ اور حضرت مولانا وقار علی صاحب بجنوری زید مجدہم سے بھی کتابیں پڑھیں۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ: پھر فقہ، حدیث، تفسیر اور فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر پہلے سال حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب بلند شہری مدظلہ العالی سے تفسیر جلالین مع الفوز الکبیر، حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندی قدس سرۂ سے ہدایہ اولین، اور حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہری رحمہ اللہ سے تصریح، بست باب، شرح چغمینی، رسالہ فتحیہ اور رسالہ شمسیہ علم ہیئت کی کتابیں پڑھیں، اور دوسرے سال مشکوٰۃ شریف، ہدایہ آخرین، تفسیر بیضاوی وغیرہ کتابیں پڑھیں، اور ۱۳۸۲ھ موافق ۱۹۶۲ء میں جو دارالعلوم دیوبند کا سوواں سال ہے دورۂ حدیث کی تکمیل فرمائی، آپ نے دارالعلوم دیوبند میں جن حضرات اکابر سے پڑھا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندی (۲) حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہری (۳) حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی (۴) حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب کیرانوی (۵) حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی (۶) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی (۷) حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مرادآبادی (۸) حضرت مولانا محمد ظہور صاحب دیوبندی (۹) فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی (۱۰) امام المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی (۱۱) مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری (۱۲) شیخ محمود عبدالوہاب محمود صاحب مصری قدس اللہ اسرارہم ونور اللہ قبورہم (۱۳) اور حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب، بلند شہری دامت برکاتہم وعمت فیوضہم۔ موصوف اپنے بعض احوال اور کتب حدیث کے اساتذہ کرام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:

''خاکپائے علماء: سعید احمد بن یوسف بن علی بن جیوا (یعنی یحیٰ) بن نور محمد پالن پوری، گجراتی ثم دیوبندی، تاریخ

ولادت محفوظ نہیں، والد ماجد رحمہ اللہ نے اندازے سے ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۰ء بتائی ہے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ۱۳۸۰ھ میں لیا، اور ۱۳۸۲ھ میں فاتحۂ فراغ پڑھا، بخاری شریف حضرت فخر المحدثین سے، مقدمۂ مسلم و مسلم شریف کتاب الایمان و ترمذی شریف جلد اول حضرت علامہ بلیاوی سے اور باقی مسلم شریف حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہری سے، اور ترمذی جلد ثانی مع کتاب العلل وشمائل اور ابوداؤد شریف حضرت علامہ فخر الحسن مرادآبادی سے، نسائی شریف حضرت مولانا محمد ظہور صاحب دیوبندی سے، طحاوی شریف حضرت مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری سے اور مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی سے، اور ان کے انتقال کے بعد جلد اول حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب دیوبندی سے، اور جلد دوم حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی سے پڑھی، اس سال موطا مالک حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی اور موطا محمد حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی کے پاس تھیں (مشاہیر محدثین وفقہائے کرام ص ۲۷، ۲۸)

اول نمبر سے کامیابی: آپ بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین، کتب بینی اور محنت کے عادی تھے، اس پر مذکورہ بالا اساتذۂ کرام کی تعلیم وتربیت نے آپ کی استعداد وصلاحیت کو بائیس سال کی عمر میں ہی بام عروج تک پہنچا دیا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم دینی درسگاہ کے سالانہ امتحان میں آپ نے اول نمبر سے کامیابی حاصل کی، جبکہ اس سال بعض پختہ استعداد والے فارغ شدہ فضلاء نے بھی دورۂ حدیث میں محض اس غرض سے داخلہ لیا تھا کہ وہ اول نمبر سے کامیاب ہوں گے۔

دارالافتاء میں داخلہ اور آپ کا پہلا شاگرد: دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد آپ نے شوال ۱۳۸۲ھ میں تکمیل افتاء کے لئے درخواست دی، یکم ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ کو آپ کا دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ہو گیا، اور حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہاں پوری کی نگرانی میں کتب فتاوی کا مطالعہ اور فتوی نویسی کی مشق کا آغاز فرمایا۔

آپ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے ہیں، اس لئے دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد اپنے بھائیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، اور راقم الحروف کو ۱۳۸۲ھ میں اپنے ہمراہ دیوبند لائے، اور حضرت قاری کامل صاحب دیوبندی کی درسگاہ میں احقر کو حفظ قرآن کریم کے لئے بٹھایا، مگر میں اپنی نااہلیت کی وجہ سے قاری صاحب مرحوم سے ٹھیک سے استفادہ نہ کر سکا تو میرے حفظ قرآن کی پوری ذمہ داری آپ نے سنبھال لی — اسی سال آپ نے سماحۃ الشیخ محمود عبدالوہاب محمود صاحب مصری رحمہ اللہ کے پاس حفظ بھی شروع کیا، جو قرآن کریم کے جید حافظ اور مصری قاری تھے، اور جامعۃ الازہر قاہرہ کی طرف سے دارالعلوم دیوبند میں مبعوث تھے۔

الغرض ۱۳۸۲ھ اور ۱۳۸۳ھ میں آپ ایک طرف کتب فتاوی کا مطالعہ، فتوی نویسی کی مشق کرتے تھے، دوسری طرف احقر کو حفظ کراتے تھے اور خود بھی حفظ کرتے تھے، اور ان کاموں میں ایسے مصروف ومنہمک تھے کہ رمضان المبارک میں بھی وطن تشریف نہیں لے گئے، اور میں بھی نہیں گیا۔ رمضان المبارک کے بعد اپنے دوسرے بھائی مولوی عبدالمجید زید مجدہم کو بھی دیوبند بلا لیا — ادھر افتاء کمیٹی نے آپ کی صلاحیتوں کو مزید پروان چڑھانے کے لئے دارالافتاء کے داخلہ میں ایک سال کی توسیع کر دی، چنانچہ ۸۴-۱۳۸۳ھ میں آپ بھائی مولوی عبدالمجید صاحب کو فارسی کی کئی کتابیں پڑھاتے تھے، مجھے حفظ کراتے تھے، خود ایک

طرف حفظ کرتے تھے دوسری طرف فتوی نویسی کی خوب مشق کرتے تھے، اور فتوی نویسی میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ چھ ماہ کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ارباب انتظام نے آپ کا معین مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں تقرر کر دیا۔

۲۱ر شوال ۱۳۸۴ھ کو مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو خیر باد کہہ کر آپ پہلے گھر تشریف لے گئے، ایک ہفتہ گھر پر قیام کیا، والدین کی زیارت کا شرف حاصل کیا، پھر بھائی مولوی عبد المجید صاحب کو جو احقر سے تقریبا دو سال بڑے ہیں اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو جو مجھ سے تقریبا سات آٹھ سال چھوٹے ہیں، اور راقم الحروف کو ساتھ لے کر راندیر (سورت) تشریف لے گئے۔ اور دارالعلوم اشرفیہ میں تدریس کا آغاز فرمایا۔

راندیر میں آپ کی خدمات: ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ سے شعبان ۱۳۹۳ھ تک (۹ سال) دارالعلوم اشرفیہ راندیر (سورت) میں موصوف نے ابو داؤد شریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، شمائل، موطین، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف مع الفوز الکبیر، ترجمہ قرآن کریم، ہدایہ آخرین، شرح عقائد نسفی، اور حسامی وغیرہ بہت سی کتابیں پڑھائیں، اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ اسی عرصہ میں موصوف نے ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں، حرمت مصاہرت اور العون الکبیر ارقام فرمائیں۔ نیز اسی زمانہ میں موصوف نے قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کی کتابوں اور علوم ومعارف کی تسہیل وتشریح کا آغاز فرمایا۔ ایک مضمون ''افادات نانوتوی'' کے عنوان سے اسی زمانہ میں الفرقان لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوا تھا، جو نہایت قیمتی مضمون ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر: موصوف کے استاذ محترم حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بخاری نے جو پہلے جامعہ حسینہ راندیر میں پڑھاتے تھے، پھر دارالعلوم دیوبند میں ان کا تقرر ہوگیا تھا۔ موصوف نے خط سے مطلع کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں ایک مدرس کی جگہ خالی ہے، لہٰذا آپ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی درخواست بھیجیں۔ موصوف نے جناب مولانا حکیم محمد سعد رشید صاحب اجمیری رحمہ اللہ کے مشورہ سے درخواست بھیج دی، اسی سال شعبان میں جب مجلس شوریٰ کا انعقاد ہوا، اور درجات عربیہ کے لئے ایک مدرس کے تقرر کا تذکرہ آیا تو حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی قدس سرہٗ نے موصوف کا نام پیش کیا اور اسی مجلس میں موصوف کا تقرر ہوگیا، موصوف کو شعبان ہی میں اس کی اطلاع دی گئی، رمضان المبارک کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے آئے، اس وقت سے آج تک موصوف دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ موصوف کی عمر میں برکت عطا فرمائیں، اور ان کے فیوض وبرکات کو عام اور تام فرمائیں! آمین یارب العالمین!

دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی خدمات: شوال ۱۳۹۳ھ سے ان سطور کے لکھنے تک موصوف نے دارالعلوم دیوبند میں جو کتابیں پڑھائیں اور پڑھا رہے ہیں ان کی تفصیل سن وار درج ذیل ہے:

۹۳-۹۴ھ میں: مسلم الثبوت، ہدایہ اول، سلم العلوم، ہدیہ سعیدیہ، جلالین شریف نصف اول مع الفوز الکبیر، ملاحسن ——
۱۳۹۴-۹۵ھ میں: مسلم الثبوت، شرح عقائد جلالی، ملاحسن، جلالین شریف نصف ثانی مع الفوز الکبیر —— ۱۳۹۵-۹۶ھ

میں: مسامرہ، دیوان متنبّی، میبذی، تفسیر بیضاوی پارہ ۲۱ تا ۲۵ ــــ ۹۷-۱۳۹۶ھ میں: دیوان متنبّی، تفسیر بیضاوی پارہ ۲۶ تا ۳۰، ملا حسن، مشکوٰۃ شریف (عارضی) ــــ ۹۸-۱۳۹۷ھ میں: مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر، حسامی (صرف قیاس) ملاحسن، سبعہ معلقہ۔ ہدایہ ربع ثانی، موطا امام مالک ــــ ۹۹-۱۳۹۸ھ میں: دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، بیضاوی شریف سورۂ بقرۃ، مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر، تفسیر مظہری پارہ ۱۶ تا ۲۰، موطا امام مالک، سراجی، نسائی شریف ــــ ۱۴۰۰ھ میں: مشکوٰۃ شریف جلد ثانی مع نخبۃ الفکر، بیضاوی شریف پارہ ۲۱ تا ۲۵، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، موطا امام مالک، سراجی ــــ ۱۴۰۱ھ میں: مشکوٰۃ شریف جلد اول مع نخبۃ الفکر، بیضاوی شریف پارہ ۲۶ تا ۳۰، تفسیر مدارک پارہ ۶ تا ۱۰، سراجی، موطا امام محمد ــــ ۱۴۰۲ھ میں: ترمذی شریف، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ابوداؤد شریف، بخاری شریف جلد ثانی موطا امام مالک، موطا امام محمد ــــ ۱۴۰۳ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، مسلم شریف جلد اول، مقدمہ ابن صلاح، رشیدیہ، ابن ماجہ ــــ ۱۴۰۴ھ میں۔ ترمذی شریف جلد اول، بیضاوی شریف سورۂ بقرہ، ہدایہ رابع، طحاوی شریف ــــ ۱۴۰۵ھ میں: ترمذی شریف جلد اول: بیضاوی شریف، سورۂ بقرہ۔ ہدایہ ثالث، بخاری شریف جلد اول، طحاوی شریف ــــ ۱۴۰۶ھ میں: ترمذی شریف جلد اول تفسیر القرآن، ہدایہ رابع، طحاوی شریف ــــ ۱۴۰۷ھ میں تخلیص الاتقان، ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ رابع، طحاوی شریف ــــ ۱۴۰۸ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ رابع، طحاوی شریف، حجۃ اللہ البالغہ ــــ ۱۴۰۹ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ رابع، طحاوی شریف، حجۃ اللہ البالغہ ــــ ۱۴۱۰ھ میں: ترمذی شریف جلد اول، ہدایہ ثالث، طحاوی شریف، پڑھائیں۔۔۔۔اور ۱۴۱۱ھ سے ان خدمات کے تذکرہ تک ترمذی شریف جلد اول، طحاوی شریف اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھا رہے ہیں۔

دیگر خدمات: مذکورہ بالا تعلیمی وتدریسی خدمات کے علاوہ موصوف نے دارالعلوم دیوبند میں جو خدمات انجام دیں، اور دے رہے ہیں انکے مفصل تذکرہ کی اس مختصر تعارف میں گنجائش نہیں، صرف چند خدمات کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱) ۱۴۰۲ھ میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب زید مجدہم نے طویل رخصت لی، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہٗ سہارن پور چلے گئے، اور کچھ مفتیان کرام نے دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس لئے ارباب انتظام نے موصوف اور راقم الحروف کو کتب متعلقہ کی تدریس کے ساتھ شعبۂ افتاء کی نگرانی اور فتوی نویسی کا حکم دیا ،جس کو بحسن وخوبی موصوف اور راقم الحروف نے انجام دیا۔

(۲) جب سے دارالعلوم دیوبند میں ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کا قیام عمل میں آیا، آپ اس کے ناظم اعلی ہیں ۱۴۱۹ھ میں آپ نے اس منصب سے سبکدوش ہونے کی مجلس شوری میں درخواست دی، مگر مجلس شوری نے منظور نہیں فرمائی۔

(۳) مذکورہ بالا خدمات کے علاوہ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم جو تحریری اور تقریری خدمت موصوف کو سپرد فرماتے ہیں اس کو بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں جس کی تفصیل طویل ہے اس مختصر تعارف میں اس کی گنجائش نہیں۔

تصنیفی خدمات: موصوف کی تصانیف جو شائع ہوکر مشرق ومغرب میں پھیل چکی ہیں، ان کا تعارف درج ذیل ہے:

(۱) **تفسیر ہدایت القرآن:** یہ مقبول عام وخاص تفسیر ہے، پارہ ۳۰ اور ایک تا ۹ حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی

صاحب رحمہ اللہ نے لکھے ہیں اور ۱۰ تا ۱۵ موصوف نے لکھے ہیں، آگے کام جاری ہے۔

(۲) الفوز الکبیر کی تعریب جدید: یہ سابقہ تعریب کی تہذیب ہے، دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں اب یہی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔

(۳) العون الکبیر: یہ الفوز الکبیر کی عربی شرح ہے، پہلے قدیم تعریب کے مطابق تھی، اب جدید تعریب کے مطابق کردی گئی ہے۔

(۴) فیض المنعم: یہ مقدمہ مسلم شریف کی معیاری اردو شرح ہے، جو ترکیب، حل لغات اور فن حدیث کی ضروری بحثوں پر مشتمل ہے۔

(۵) تحفۃ الدرر: یہ نخبۃ الفکر کی بہترین اردو شرح ہے، کتب حدیث پڑھنے والوں خصوصاً مشکوٰۃ شریف پڑھنے والوں کے لئے نہایت قیمتی سوغات ہے۔

(۶) مبادئ الفلسفہ: اس میں فلسفہ کی تمام اصطلاحات کی عربی زبان میں مختصر اور عمدہ وضاحت کی گئی ہے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

(۷) معین الفلسفہ: یہ مبادئ الفلسفہ کی بہترین اردو شرح ہے، اور حکمت وفلسفہ کے پیچیدہ مسائل کی عمدہ وضاحت پر مشتمل معلومات افزا کتاب ہے۔

(۸) مفتاح التہذیب: یہ علامہ تفتازانی کی ''تہذیب المنطق'' کی ایسی عمدہ شرح ہے کہ اس سے ''شرح تہذیب'' جو مدارس عربیہ کے نصاب درس میں داخل ہے، خوب حل ہو جاتی ہے۔

(۹) آسان منطق: یہ تیسیر المنطق کی تہذیب ہے، دارالعلوم دیوبند اور بہت سے مدارس میں ''تیسیر المنطق'' کی جگہ پڑھائی جاتی ہے۔

(۱۰) آسان صرف (دو حصے) (۱۱) آسان نحو (دو حصے) علم نحو اور علم صرف کی جو کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں عام طور پر تدریج کا لحاظ نہیں رکھا گیا، جبکہ یہ بات نہایت ضروری ہے، اس نصاب کو اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے، یہ نصاب نہایت مفید اور بہت سے مدارس میں داخل درس ہے۔

(۱۲) محفوظات: (تین حصے) یہ آیات واحادیث کا مجموعہ ہے، جو طلبہ کے حفظ کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ بہت سے مدارس ومکاتب میں داخل نصاب ہے۔

(۱۳) آپ فتوی کیسے دیں؟ یہ علامہ محمد امین بن عابد بن شامی کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح عقود رسم المفتی'' کی نہایت عمدہ شرح ہے۔

(۱۴) کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟: یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کی کتاب ''توثیق الکلام'' کی نہایت آسان عام فہم شرح ہے۔

(۱۵) حیات امام ابوداؤد: اس میں امام ابوداؤد سجستانی کی مکمل سوانح، سنن ابی داؤد کا تفصیلی تعارف، اور اس کی تمام شروحات ومتعلقات کا مفصل جائزہ سلیس اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱۶) مشاہیر محدثین وفقہائے کرام اور تذکرہ راویان کتب حدیث: اس میں خلفاء راشدین، عشرۂ مبشرہ، ازواج

مطہرات، بنات طیبات، مدینہ کے فقہائے سبعہ، مجتہدین امت، محدثین کرام، راویات کتب حدیث، شارحین حدیث، فقہائے ملت، مفسرین عظام، متکلمین اسلام اور مشہور شخصیات کا مختصر جامع تذکرہ ہے۔ حدیث کے ہر استاذ اور طالب علم کے پاس اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

(۱۷) حیات امام طحاوی: اس میں امام ابوجعفر طحاوی کے مفصل حالات زندگی، ناقدین پر رد، تصانیف کا تذکرہ، نظر طحاوی کی توضیح اور شرح معانی الآثار کا تفصیلی تعارف ہے۔

(۱۸) اسلام تغیر پذیر دنیا میں: یہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور جامعہ ملیہ دہلی کے سیمناروں میں پڑھے گئے چار قیمتی مقالوں کا مجموعہ ہے۔

(۱۹) نبوت نے انسانیت کو کیا دیا؟ یہ مقالہ جامعہ ملیہ دہلی کے ایک جلسہ میں پیش کیا گیا تھا، پہلے وہ علحدہ شائع ہوا تھا، اب اس کو اسلام تغیر پذیر دنیا میں شامل کر دیا گیا ہے۔

(۲۰) ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں: ناخن تراشنے، بغل کے بال اور زیر ناف لینے، مسواک کرنے، کلی اور ناک صاف کرنے، جسم کے جوڑوں کو دھونے، ختنہ کرنے، پانی سے استنجا کرنے، بالوں میں مانگ نکالنے، مونچھیں تراشنے اور ڈاڑھی رکھنے کے متعلق واضح احکامات، مسائل دلائل اور فضائل کا مجموعہ ہے، ڈاڑھی پر ہونے والے اعتراضوں کے جوابات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

(۲۱) حرمت مصاہرت: اس میں سسرالی اور دامادی رشتوں کے مفصل احکام، اور ناجائز انتفاع کا مدلل حکم بیان کیا گیا ہے۔

(۲۲) تسہیل ادلۂ کاملہ: یہ حضرت شیخ الہند کی مایۂ ناز کتاب ''ادلۂ کاملہ'' کی نہایت عمدہ شرح ہے اس میں غیر مقلدین کے چھیڑے ہوئے دس مشہور مسائل کی مکمل تفصیل ہے۔ موصوف نے یہ کتاب مجھے املا کرائی تھی میں نے اس کو مرتب کیا ہے، یہ شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

(۲۳) حواشی وعناوین ایضاح الادلۃ: ایضاح الادلہ حضرت شیخ الہند کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس پر موصوف نے نہایت مفید حواشی ارقام فرمائے ہیں، اور بغلی عناوین بڑھائے ہیں، یہ کتاب بھی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

(۲۴) حواشی امداد الفتاوی: موصوف نے قیام راندیر کے زمانے میں یہ حواشی لکھنے شروع کئے تھے صرف جلد اول پر کام کیا تھا جو طبع ہو گیا ہے باقی جلدوں پر کام نہیں ہوا۔ یہ حواشی بھی اہل علم میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

(۲۵) زُبدۃ الطحاوی: یہ امام طحاوی کی شہرۂ آفاق کتاب ''شرح معانی الآثار'' کی عربی تلخیص ہے، مگر جہاں تک عام طور پر طحاوی شریف پڑھائی جاتی ہے وہاں تک کام ہوا ہے یعنی کتاب الطہارۃ کے ختم تک طبع ہوئی ہے۔

(۲۶) رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغۃ (کامل ۵ جلدیں) یہ حجۃ اللہ کی مبسوط اردو شرح ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی تشریح ایک بھاری قرضہ تھا، جو ڈھائی سو سال سے امت کے ذمہ باقی تھا۔ موصوف نے جماعتِ دیوبند کی طرف سے یہ فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

تبلیغی خدمات: مذکورہ بالا تعلیمی وتدریسی اور تصنیفی مصروفیات کے ساتھ آپ ملک وبیرون ملک کے دورے کرتے رہتے ہیں، اور جو حضرات دینی باتیں سننے کے مشتاق ہیں، ان کو اپنی نوازشوں سے نوازتے رہتے ہیں، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، مختصر یہ کہ آپ دارالعلوم دیوبند کی تدریس کو حسن وخوبی انجام دیتے ہوئے اور تصنیفی کام جاری رکھتے ہوئے،

درمیان سال میں وقتا فوقتاً ملک و بیرون ملک کے مختصر دورے کرتے ہیں، اور رمضان المبارک کی طویل تعطیل میں کبھی برطانیہ، کبھی کناڈا، کبھی افریقہ اور کبھی امریکہ تشریف لے جاتے ہیں، ایک دن میں کئی کئی تقریریں کرتے ہیں، سعادت مند سامعین کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، خوف خدا و فکر آخرت اور اعمال صالحہ پر ابھارتے رہتے ہیں، حرام اور منکر باتوں سے نہایت مؤثر انداز میں باز رہنے کی تلقین فرماتے رہتے ہیں۔

انداز خطابت اور تصنیفی خصوصیات: جس طرح موصوف کا انداز خطابت نہایت مؤثر، درس نہایت مقبول اور عام فہم ہوتا ہے، اسی طرح آپ کی تمام تصانیف نہایت آسان، عام فہم اور مقبول عام و خاص ہیں، آپ کی تقریریں نہایت مبسوط اور علمی نکات سے پُر اور تحریریں نہایت مرتب، واضح اور جامع ہوتی ہیں، اسی لئے آپ کی کئی تصانیف دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہیں۔

ترقیات کا راز: استاذ محترم کو اللہ جل شانہ وعم نوالہ نے بہت سی خوبیوں اور کمالات سے نوازا ہے، آپ کا ذوق لطیف، طبیعت سادہ اور نفیس ہے، مزاج میں استقلال اور اعتدال ہے، فطرت میں سلامت روی اور ذہن رسا ہے، زود نویس اور خوش نویس ہیں۔ حق و باطل اور صواب و خطاء کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں اور حقائق و معارف کے ادراک میں یکتائے زمانہ ہیں۔

اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موصوف اپنے کاموں میں نہایت چست اور حالات کا جوانمردی سے مقابلہ کرنے والے ہیں، میں نے حضرت اقدس جیسا شب و روز محنت کرنے والا مصروف آدمی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، آپ کے تمام شاگرد جانتے ہیں کہ آپ کا درس کتنا مقبول ہے؟ اور جن حضرات کو آپ کی تصانیف دیکھنے، اور تقاریر سننے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آپ کی تصانیف اور تقاریر کتنی پر مغز، مرتب اور جامع ہوتی ہیں؟ اور آپ کے خدام جانتے ہیں کہ حضرت اقدس اپنی اور اپنے متعلقین کی کتابوں کی تصحیح و طباعت کا کتنا اہتمام فرماتے ہیں، اور اپنے بھائیوں اور اہل و عیال کی تعلیم و تربیت کا کس قدر خیال فرماتے ہیں؟

اجازت بیعت وارشاد: موصوف جس طرح علوم ظاہری میں درک و کمال رکھتے ہیں، اسی طرح علوم باطنی سے بھی بہرہ ور ہیں، مگر اس کا اس قدر اخفا فرماتے ہیں کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ صرف علوم ظاہری میں مہارت رکھتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ طالب علمی کے زمانہ سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ سے بیعت ہیں، اور دیگر بزرگان دین سے بھی فیض یافتہ ہیں، خاص طور پر حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری قدس سرہٗ کی مجالس میں مظاہر علوم کی طالب علمی کے زمانہ میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہری رحمہ اللہ سے مجاز بیعت وارشاد ہیں۔

زیارت حرمین شریفین: موصوف کئی بار زیارت حرمین شریفین کا شرف حاصل کر چکے ہیں، سب سے پہلے ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں اہلیہ محترمہ کے ساتھ پانی کے جہاز سے سفر کیا، اور فریضۂ حج ادا کیا۔ پھر ۱۴۰۶ھ میں افریقہ سے دوسرا حج کیا، چونکہ آپ پہلے فرض حج ادا کر چکے تھے اس لئے موصوف نے یہ دوسرا حج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حج بدل کے طور پر کیا۔ پھر ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں سعودی وزارت حج و اوقاف کی دعوت پر تیسرا حج کیا۔ اور ایک بار ربیع الاول ۱۴۱۴ھ

میں عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔

رحلت والدین ماجدین: جس زمانہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی اور محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ڈابھیل میں پڑھاتے تھے، اس وقت والد صاحب ڈابھیل میں پڑھتے تھے۔ اور حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہٗ کے خادم خاص تھے، مگر گھریلو احوال کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔ اس لئے اپنے صاحب زادوں کو علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا بدر عالم میرٹھی، اور محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جیسا عالم بنانے کا عظیم جذبہ رکھتے تھے، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہٗ نے والد صاحب کو یہ وصیت کی تھی کہ:

''یوسف اگر تم اپنے لڑکوں کو اچھا عالم بنانا چاہتے ہو، تو حرام اور ناجائز مال سے پرہیز کرنا، اور بچوں کو بھی ناجائز اور حرام مال سے بچانا، کیونکہ علم ایک نور ہے، ناجائز اور حرام مال سے جو بدن پروان چڑھتا ہے اس میں یہ نور داخل نہیں ہوتا'' ـــ یہ نصیحت حضرت مولانا نے والد ماجد کو اس لئے کی تھی کہ اس زمانہ میں ہماری قوم بنیوں کے سود میں پھنسی ہوئی تھی اسی زمانہ میں ہمارے دادا نے بنیے سے سودی قرض لے کر ایک زمین خریدی تھی، والد صاحب اس زمانہ میں ڈابھیل کے طالب علم تھے، والد صاحب نے اس معاملہ میں دادا سے اختلاف کیا تو دادا نے والد صاحب کو الگ کر دیا چنانچہ والد صاحب کو حرام سے بچنے کے لئے مجبوراً تعلیم چھوڑ کر اپنا گھر سنبھالنا پڑا اور تہیہ کیا کہ چاہے بھوکا رہوں مگر حرام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا تاکہ میں نہیں پڑھ سکا تو اللہ تعالیٰ میری اولاد کو علم دین عطا فرمائیں۔

چنانچہ والد صاحب: ناجائز اور حرام مال بلکہ مشتبہ مال سے بھی پرہیز کرتے تھے، اور اپنی اولاد کو بھی بچاتے تھے، اور ان کی تعلیم وتربیت کی طرف پوری توجہ فرماتے تھے، صوم وصلوٰۃ کے ایسے پابند تھے کہ میرے علم کے مطابق ان کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی، والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب نے قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا تھا سات آٹھ پارے حفظ کر لئے تھے، مگر عمر نے وفا نہ کی، ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ میں ایک رات تہجد کی نماز کے لئے اٹھے، گرمی کا احساس ہوا تو غسل کیا، کپڑے بدل رہے تھے کہ سینہ میں تکلیف شروع ہوئی، بھائی عبدالمجید کو آواز دی، بھائی عبدالمجید جلدی سے والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ والد صاحب کا پورا بدن پسینہ سے تر ہے، اور والد صاحب سینہ دبا کر چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں، جب بھائی مولوی عبدالمجید صاحب نے یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے، بھائی عبدالرحمٰن جو ایک آدھ میل کے فاصلہ پر رہتے تھے ان کو اور ڈاکٹر کو بلانے کی فکر کرنے لگے، تو والد صاحب نے فرمایا: ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں، یہ کہہ کر تھوڑی دیر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف اور راقم الحروف کی والدہ ماجدہ دین کی ضروری باتوں سے واقف، امور خانہ داری میں ماہر، نہایت سلیقہ مند، نماز روزے کا خوب اہتمام کرنے والی صالحہ عابدہ اور صابرہ شاکرہ خاتون تھیں، ۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ کو عاشورہ کا روزہ رکھ کر اپنے سب سے بڑے بھائی حضرت مولانا ولی محمد صاحب رحمہ اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا، جو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کے ڈابھیل کے زمانہ کے شاگرد ہیں۔ مغرب کے وقت روزہ افطار کیا، نماز پڑھی۔ پھر سب نے کھانا کھایا، اور سب آرام کرنے کے لئے چارپائی پر لیٹ گئے۔ جب عشا کا وقت ہوا تو والد صاحب کو اور

بھائی مولوی عبدالمجید کو آواز دے کر اٹھایا اور نماز کے لئے روانہ کیا ہماری چھوٹی بہن سارہ خاتون اپنی بچی کو لے کر لیٹی تھی، اس کو اٹھایا تا کہ عشا کی نماز پڑھے وہ اٹھ کر نماز پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔ جب عشا کی نماز پڑھ کر والد صاحب تشریف لائے تو دیکھا کہ والدہ ماجدہ کے بال چارپائی سے نیچے لٹک رہے ہیں، والد صاحب نے دو تین مرتبہ آواز دی کہ آپ اس طرح کیوں لیٹی ہیں؟ مگر والدہ ماجدہ نے کوئی جواب نہ دیا، والد صاحب نے بالوں کو درست کرنے کے لئے ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ روح پرواز کر چکی ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ والدین ماجدین کی بال بال مغفرت فرمائیں! جنت الفردوس کا مکین بنائیں! اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دیں! آمین یارب العالمین۔

بھائیوں کی تعلیم وتربیت: موصوف کے ایک اخیافی (ماں شریک) چار حقیقی بھائی اور چار حقیقی بہنیں ہیں، اخیافی کا نام احمد ہے، جو آپ سے بڑے ہیں، اور حقیقی بھائی بہنوں میں آپ سب سے بڑے ہیں، پھر بھائی عبدالرحمٰن، پھر بھائی مولوی عبدالمجید، پھر راقم الحروف، پھر بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہیں، جب آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، اس وقت بھائی عبدالرحمٰن کی عمر پندرہ سال سے زیادہ ہو چکی تھی، راقم الحروف اور بھائی عبدالمجید مکتب میں پڑھ رہے تھے، اس لئے پہلے احقر کو اپنے ہمراہ دیوبند لائے، پھر ایک سال کے بعد بھائی عبدالمجید کو بھی بلالیا۔ اور فتوی نویسی کی مشق اور کتب فقہ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہم دونوں بھائیوں کو پڑھاتے رہے۔

اہل وعیال کی تعلیم وتربیت: آپ کا رشتۂ ازدواج اور عقد مسنون آپ کے ماموں حافظ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شیرا کی بڑی صاحب زادی سے ۱۳۸۴ھ کے اواخر میں ہوا، جو قرآن کریم کے جید حافظ اور ڈابھیل سے فارغ تھے اور اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد اکثر وبیشتر ۲۴ گھنٹہ میں ایک قرآن ختم کر کے والدہ ماجدہ کو اس کا ثواب پہنچاتے تھے۔ مگر جوانی کے عالم میں دو صاحب زادیاں اور ایک صاحب زادے کو چھوڑ کر انتقال کر گئے ان کے انتقال کے بعد ان کے بچوں کی ، بچوں کے دادا اور ہمارے نانا صاحب نے اور ماموں عبدالرحمٰن صاحب شیرا نے پرورش فرمائی، اور ان کی شادیاں کیں۔

موصوف کی اہلیہ محترمہ (اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائیں!) نہایت صابرہ شاکرہ اور عابدہ زاہدہ خاتون ہیں، قرآن کریم کی جید حافظہ ہیں اور اپنے اکثر بچوں کی حفظ قرآن میں استاذ ہیں، محترمہ نے نکاح کے بعد امور خانہ داری انجام دیتے ہوئے حضرت مولانا ہی سے قرآن کریم حفظ کیا ہے، حفظ کے دوران اور حفظ کی تکمیل کے بعد اپنے صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کو حفظ کرایا اور کرا رہی ہیں —— ان ہی نیک پارسا خاتون کے بطن سے موصوف کے گیارہ صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں پیدا ہوئیں، جن میں سب سے بڑے صاحب زادے ایک حادثہ میں شہید ہوگئے، اور ایک صاحب زادی بچپن میں انتقال کر گئی، دس صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں بقید حیات ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمریں دراز فرمائیں اور سب کو علم وعمل میں اپنے والد ماجد کا جانشین بنائیں۔

مولانا نے اور بھاوج صاحبہ نے اپنے بچوں کی کس طرح پرورش اور تربیت فرمائی اس کی تفصیل طویل ہے، ان اوراق میں اس کی گنجائش نہیں، مختصر یہ کہ موصوف کو قرآن کریم سے اس قدر لگاؤ ہے کہ فارغ ہونے کے بعد پہلے خود قرآن کریم حفظ کیا،

راقم الحروف کو کرایا پھر اہلیہ محترمہ کو حافظہ بنایا۔ ان ہی کی بدولت اپنے تمام صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کو حافظ قرآن بنایا، اور اب بھاوج صاحبہ مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کے صاحب زادوں اور اپنے صاحب زادوں کی دلہنوں کو حافظ قرآن بنا رہی ہیں۔ دو دلہنیں حفظ کر چکی ہیں اور دو کر رہی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں اور کاموں میں برکت عطا فرمائیں (آمین)

ایک اہم وصیت جس کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں: لڑکوں کی موجودگی میں پوتوں کا میراث سے محروم ہونا فرائض کا ایک معروف مسئلہ ہے، اور یہ فرائض کے معروف ضابطہ الأقرب فالأقرب پر متفرع ہے۔ اسی ضابطہ سے باپ کی موجودگی میں دادا محروم رہتا ہے، بھائی کی موجودگی میں دوسرے بھائی کی اولاد محروم رہتی ہے، مگر پوتوں کے مسئلہ کو لے کر بہت سے لوگ اسلامی تعلیمات پر لب کشائی کرتے ہیں کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ لڑکے تو میراث پائیں اور پوتے پوتیاں، جو عام طور پر کمزور اور بے سہارا ہوتے ہیں، محروم رہ جائیں؟ یہ اعتراض درحقیقت مسلمانوں کے غلط طرز عمل سے پیدا ہوا ہے۔ اسلامی تعلیمات ہر طرح کامل و مکمل ہیں، مگر مسلمان ان پر صحیح طریقہ سے عمل نہ کریں تو اس کا کیا علاج؟ اسلام نے تہائی ترکہ میں میت کا وصیت کا حق تسلیم کیا ہے تا کہ وہ ایسی ناگہانی ضروریات میں اس حق کو استعمال کرے، دادا کو چاہئے کہ وہ پہلی فرصت میں پوتوں پوتیوں کے لئے تہائی میں سے وصیت کرے اور بوقت حاجت ان کے لئے بیٹوں کے حصہ سے زیادہ بھی وصیت کر سکتا ہے۔ اب اگر دادا امروز و فردا کرتا رہے یا مال کی محبت میں وصیت کی ہمت نہ کرے اور اچانک چل بسے اور پوتے پوتیاں محروم رہ جائیں تو یہ اسلامی تعلیمات کا قصور نہیں بلکہ دادا کی کوتاہی اس کی ذمہ دار ہے۔ مسئلہ کی اس ضروری وضاحت کے بعد اب میں حضرت والا کے اس مختصر تعارف کو آپ کی ایک وصیت پر ختم کرتا ہوں تا کہ جو لوگ ایسے حالات سے دوچار ہوں وہ موصوف کی طرح اپنے پوتوں پوتیوں کے لئے بروقت وصیت کر دیں، لیت و لعل نہ کریں، زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، خدانخواستہ آدمی اچانک چل دے تو ان بچوں کی پریشانی کے علاوہ دادا کا یہ عمل اسلامی تعلیمات پر اعتراض کا باعث بنے گا۔

جب مفتی رشید احمد رحمہ اللہ کی اچانک شہادت کا قصہ پیش آیا اور وطن سے تمام بھائی بہن اور اعزا تعزیت کے لئے دیوبند آئے تو بھائی صاحب نے اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور بہنوں کے سامنے مرحوم کے بچوں کے لئے یہ وصیت کی:

''جب تک میں زندہ ہوں مرحوم کے دونوں بچوں کی اپنے بچوں کی طرح پرورش کرتا رہوں گا، میری وفات کے بعد میرے ترکہ میں سے مرحوم کے ہر بچہ کو ایک لڑکے کے برابر حصہ ملے گا، کیونکہ دو لڑکوں کی میراث بھی تہائی سے کم رہے گی اور مجھے تہائی میں وصیت کا حق ہے، سب اہل خاندان اس کے گواہ رہیں (مرحوم کی اہلیہ کی دوسری جگہ شادی ہو گئی ہے)

اس وصیت کے بعد موصوف کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میرا ایک بچہ لے لیا، اور اس کے بدل میں دو بچے عنایت فرمائے، اب میرے بارہ لڑکے ہو گئے (یہ حضرت مولانا کا ایک اشارہ ہے جس کی تفصیل طویل ہے۔ مولانا پندرہ سال سے برابر اپنی اہلیہ صاحبہ سے یہ بات فرماتے رہتے تھے کہ میری قسمت میں لڑکے بارہ ہیں۔ یہ بات اس طرح پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے گیارہ میں سے ایک لے لیا اور اس کے دو دیدیئے تو بارہ کی تعداد مکمل ہو گئی)...... اللہ ان کی عمریں دراز فرمائیں، اور سب کو موصوف کی خوبیوں اور نیکیوں کا وارث بنائیں! آمین یارب العالمین۔